ہندستانی فلم کا آغاز و اِرتقا

(1913ء تا 2013ء)

مؤلف

ڈاکٹر الف انصاری

اقبال پبلیکیشنز

A-24-I قصاب پاڑہ۔ واجد علی شاہ روڈ، پوسٹ گارڈن ریچ۔ کلکتہ ۷۰۰۰۲۴

خراجِ عقیدت

ہندستان کی پہلی خاموش فلم ''راجہ ہریش چندر'' کے خالق بابائے فلم ''داداصاحب پھالکے'' کو ہندستانی فلم انڈسٹری کے سوسال مکمل ہونے پر خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔



خراجِ عقیدت

ہندستان کی پہلی متکلم فلم ''عالم آرا'' کے خالق آردیشر ایم ایرانی کو ہندستانی فلم انڈسٹری کے سوسال مکمل ہونے پر خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔



انتساب

دنیائے فلم کے عظیم فنکار

''دلیپ کمار''

کے نام



ڈاکٹر الف انصاری

الف انصاری کی مطبوعہ تصنیفات وتالیفات

تصنیفات	صفحات	سن	
سہہ رنگ	96	1980	مغربی بنگال اردو اکیڈمی سے انعام یافتہ
سید عبدالرحیم ہندوستانی فٹبال کا مسیحا	96	1990	مغربی بنگال اردو اکیڈمی سے انعام یافتہ
فلمی معلومات	128	1994	
اسپورٹس کی دنیا	240	1997	مغربی بنگال اردو اکیڈمی سے انعام یافتہ
شاعراتِ بنگلہ	285	2001	مغربی بنگال اردو اکیڈمی سے انعام یافتہ
دبستان مٹیا برج کی ادبی خدمات	191	2005	
شعرائے بنگالہ (حصہ اول)	704	2006	
شعرائے بنگالہ (حصہ دوم)	1064	2008	
باغِ سخن	168	2011	
ہندستانی فلم کا آغاز وارتقاء	1030	2011	

جملہ حقوق محفوظ بحق مولف

کتاب : ہندوستانی فلم کا آغاز وارتقاء

مؤلف : ڈاکٹر الف انصاری

طبع اول : جولائی ۲۰۱۱ء

تعداد : ڈھائی سو (250)

قیمت : پانچ سو روپے (-/500)

صفحات : 1030

کمپوزنگ : نظام، شبیر (ٹیابرج، پکڑیا تالاب، 9331948463)

طباعت (پریس):

مولف کا پتہ : I-24/A، قصاب پاڑہ، واجد علی شاہ
روڈ، گارڈن ریچ، کلکتہ۔۲۴

موبائل : 9163656234

فہرست مضامین

ہندوستانی فلم کا آغاز وارتقا
مؤلف ڈاکٹر الف انصاری

☆☆☆

فلم اور فلم بینی

دادا صاحب پھالکے نے ۱۹۱۳ء میں پہلی خاموش فلم ''راجہ ہریش چندر'' بنا کر عوام کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ ۲۰۱۳ء میں سینما کا ایک صدی مکمل ہوگا۔قبل از وقت راقم الحروف یہ کتاب دس سال کی تحقیق وجستجو کے بعد بنام ''ہندستانی فلم کا آغاز وارتقا'' (سوسالہ فلم ریکارڈس) پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔پیش نظر کتاب ''ہندوستانی فلم کا آغاز وارتقا'' میرے بچپن کے فلمی شوق کا نتیجہ ہے فلموں کے ابتدائی دور میں کم وبیش ہر شخص نے فلم ضرور دیکھی ہوگی یہ اور بات ہے کہ عمر سکے تقاضے کے تحت فلم بینی میں کمی ضرور آتی ہے۔اُن دنوں فلم کو'' آٹھواں عجوبہ'' کہا گیا کیوں کہ یہ سائنس کی نئ ایجاد تھی اور عوام وخواص کے لئے حیرت انگیز اور سستی تفریح تھی ۔ماضی میں جب بچہ ہوش مند ہوتا تھا تو اس کی توجہ کا خاص مرکز بائسکوپ (ان دنوں سینما کو بائسکوپ کہا جاتا تھا) ہوا کرتا تھا فلم بینی کے شوقین صرف بچے ہی نہیں بلکہ جوان مردو خواتین اور بوڑھے بھی تھے ۔ان میں فلم دیکھنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔لوگ نئ نئ فلموں کا ہفتوں اور مہینوں منتظر رہتے تھے ان دنوں بہت سی مشہور فلمیں جب ریلیز ہوئیں تو میں نے بچشم خود دیکھا کہ فلمی پروانے ٹکٹ کے لئے رات رات بھر قطار میں کھڑا رہا کرتے تھے ۔بلیک میں ٹکٹ خریدنے کا یہ عالم تھا کہ ایک روپے کا ٹکٹ لوگ پندرہ بیس روپے میں خریدا کرتے تھے ۔جب فلمساز ، ہدایت کار کے آصف کی شاہکار فلم ''مغلِ اعظم'' ۱۹۶۰ء میں ریلیز ہوئی تو اس فلم کا بہت شہرہ تھا۔پہلے دن کا ٹکٹ خریدنے کے لئے لوگ ایک دن قبل ہی قطار میں کھڑے ہو گئے تھے ۔کیوں کہ ان دنوں فلم سے زیادہ تفریح بخش کوئی دوسری چیز نہیں تھی ۔فلم ناظرین اس قدر جنونی تھے کہ فلم کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے سینما گھر کے دروازے تک توڑ دیا کرتے تھے ۔ٹکٹ خریدنے کے لئے مار پیٹ کی نوبت تک آ جاتی تھی ایک روایت کے مطابق ہندوستان کی پہلی بولتی فلم ''عالم آرا'' جو ۱۹۳۱ء میں ریلیز ہوئی تھی جس کے پروڈیوسر ڈاکٹر آردیشر ایرانی تھے ۔اس فلم کو دیکھنے کے لئے ممبئ کے میجسٹک سینما میں چھ ماہ تک لوگوں کو نمبر لگانا پڑا تھا۔

فلمی شائقین کو جب معلوم ہوتا تھا کہ فلاں ہیرو یا ہیروئن سینما ہال میں آنے والی ہیں تو ان کو قریب

سے دیکھنے کے لئے گھنٹوں سنیما ہال کے باہر منتظر رہا کرتے تھے۔ یہ روایت آج بھی قائم ہے جب کوئی مشہور ہیرو یا ہیروئن آتی ہیں تو انھیں دیکھنے کے لئے ایک بھیڑ اُمڈ پڑتی ہے جن میں بچے، جوان، مرد وخواتین بھی شامل ہیں ایسی کشش دوسرے شعبوں کی مشہور شخصیات میں نہیں ملتی۔ یہ شرف فلم کے ہیرو اور ہیروئن کو ہی حاصل ہے۔ کہتے ہیں کہ فلم ساز کرنانی نے اپنی فلم لیلیٰ مجنوں کی کامیابی کے لئے کلکتہ کے سنیما گھر میں موتی نما پتھروں کی کڑھی ایک ساڑی کی نمائش کی جس پر ایک لاکھ روپے کے نوٹ ٹانکے گئے تھے اور پبلسٹی یہ کی گئی تھی کہ ساڑی اس فلم کی ہیروئن مس کجن کو بطور انعام دی گئی ہے زیادہ تر لوگ فلم کے بجائے ساڑی دیکھنے آیا کرتے تھے۔

کوئی خوشی کا موقع ہو یا تہوار والدین بچوں کی تفریح کے لئے فلم دیکھنے چلے جایا کرتے تھے کیوں کہ غریبوں کے لئے سنیما ہر دور میں سستی تفریح کا ذریعہ رہا ہے۔ آج بھی نوجوانوں کی دلچسپی فلموں سے برقرار ہے یہ اور بات ہے کہ آج سائنس اور ٹکنالوجی کے سبب فلمی شائقین فلموں کو ٹیلی ویژن اور ویڈیوں کے ذریعہ اپنے گھروں میں بیٹھ کر دیکھ لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنیما ہال بند ہونے لگے لیکن فلم دیکھنا بند نہیں ہوا۔

فلموں نے ہر دور میں سماج میں رونما ہونے والی سچائیوں اپنے دور کے حالات اور واقعات کو پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلم ہر دور میں صحت مند سماج کی عکاس رہی ہے۔ فلم ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھ سکتا ہے۔ فلمیں اچھی بھی ہوتی ہیں اور فحش بھی ان دونوں کا تعلق ہمارے سماج سے رہا ہے۔ شاید یہی وجوہات ہیں کہ فلمی ناظرین نے فلم کے مثبت اور منفی دونوں اثرات قبول کئے۔ لڑکوں نے اپنے محبوب ہیرو اور لڑکیوں نے اپنی محبوب ہیروئن کا اسٹائل اپنایا۔ ملکی اور سیاسی مسائل سے پیدا ہونے والے موضوعات کو پیش کیا ہے مثلاً بچوں کے تعلیمی مسائل، بچوں کی بے راہ روی، حق وباطل کی جنگ، گاندھی جی کے نظریات، دیش بھگتی، بدعنوانی، شراب کے نتائج، چھوت چھات، ہندو مسلم اتحاد، قومی یکجہتی، عورتوں کے مسائل، بے روزگاری، فاقہ کشی، جہیز کی لعنت، بھائی بہن کا پیار، اولادوں کی نافرمانبرداری، والدین سے بغاوت، ساس بہو کی نوک جھونک، جوان اور بوڑھے کی شادی، بے میل شادی، جنسی مسائل، گھریلو پیچیدگیاں، زمینداروں کے مظالم، بورژوا طبقہ کی حکمرانی، سودیسی تحریک، حب الوطنی، پولس ڈپارٹمنٹ کی نااہلی، سرکاری دفتروں میں رشوت ستانی، سیاسی داؤ پیچ، سیاسی رہنماؤں کی غنڈہ گردی، طوائف کی زندگی، طالب علم اور استاد کے رشتے، بیواؤں کی زبوں حالی، ستی کی رسم، لڑکیوں کا

استحصال، ڈاکوؤں کا ظلم، کسانوں اور مزدورں کے مسائل، قوم اور ملک سے غداری، دہشت پسندی ،ہجرت کا کرب، عدالتوں کی ناانصافی، جرم، عدالت کے فیصلوں پر مافیا کا دباؤ، دولت کی ہوس، جدید فیشن، دوسری شادی کی مخالفت، نفرت، محبت، پریم کہانی، جیلوں میں اصلاح، باپ بیٹے کے درمیان ٹکراؤ، فرض اور رشتہ، بلیک مارکٹنگ، اسمگلنگ، دیش دشمن عناصر، فرقہ پرستی، ہندو مسلم فساد، پولس کے فرائض، تعلیم نسواں، گاؤں دیہات کی زندگی، خانگی مسائل، ازدواجی رشتوں میں دراڑ، وغیرہ۔ غرض فلمساز اور ہدایتکار صحت مند سماج کی تشکیل کے لئے بیشمار موضوعات کو پیش کر کے سماج کو آئینہ دکھانے کا فریضہ برسوں سے انجام دے رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کے پیش کردہ موضوعات سماج کے لئے جہاد ثابت ہوئے۔ اس کی ایک زندہ مثال یہ ہے۔

''ممبئ کی ایک عدالت میں میاں بیوی کے درمیان طلاق کا معاملہ عدالت میں پیش ہوا۔ طلاق دینے سے قبل مجسٹریٹ نے میاں اور بیوی کو مفید مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ طلاق دینے سے قبل میں چاہوں گا کہ آپ دونوں فلم ''سوامی'' ضرور دیکھ لو۔ اس کے بعد طلاق دے دینا مجسٹریٹ صاحب کی بات سن کر دونوں فلم دیکھنے گئے۔ فلم دیکھنے کے بعد میاں بیوی نے آپس میں صلح کر لی۔''

اس اعتبار سے یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ فلمیں صحت مند سماج کی تشکیل کے لئے سودمند ثابت ہوئی ہیں فلمی صنعت سے جڑے تمام فنکار قابلِ ستائش ہیں۔ اس کتاب میں راقم الحروف نے مشاہیر فلم ساز''ہدایت کار، موسیقار، نغمہ نگار، گلوکار، ہیرو ہیروئن، ویلن اور کامیڈین کے فلمی کارنامے پر مشتمل مضامین، فلمی معلومات اور فلمی ستاروں کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات وسانحات اور دیگر معلومات یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ راقم الحروم نے کروڑوں فلمی پروانوں کے تقاضوں کو کسی حد تک پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیوں کہ فلمی پروانوں کی ابتداء سے ہی اپنے محبوب فلمی ستاروں کی فلمیں دیکھنے اور ان کی زندگی سے متعلق معلومات حاصل کرنے کا شوق رہا ہے۔

عہد طفلی میں عام بچوں کی طرح مجھے بھی فلمیں دیکھنے کا شوق جنون کی حد تک رہا ہے گرچہ آج اس میں بہت حد تک کمی آ گئی ہے لیکن آج بھی ذہنی تفریح کے لئے ٹیلی ویژن پر اور ویڈیو کے ذریعہ پرانی فلمیں اور پرانی فلموں کے گیت کے ساتھ کامیڈی فلمیں اور کامیڈی وسماجی سیریل دیکھ لیتا ہوں۔

میں اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوں اس کا فیصلہ فلمی ناظرین اور قارئین خود کریں گے۔

اس کتاب میں فلمی ستاروں کی زندگی' ان کے فلمی کارنامے' ان کی پہلی فلمیں' اصل نام' ان کی شریک حیات' ڈبل رول اور ان سے متعلق اہم معلومات یکجا کی گئی ہیں۔ نیز فلمی قارئین اور فلم رائٹرز بھی اس کتاب سے استفادہ کریں گے۔

چوں کہ اس کتاب میں ایک سو سال کی تاریخ مرتب کی گئی ہے اس طویل عرصے میں خاموش اور متکلم فلموں میں بہت سے فلمی فنکاروں نے اپنے اپنے شعبوں میں فلمی خدمات انجام دی ہیں اس لئے تمام فنکاروں کی شمولیت اس کتاب میں ممکن نہیں تھی پھر بھی اس بات کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ خاموش اور متکلم فلموں کے مشاہیر فنکاروں کو شامل کرسکوں ممکن ہے کچھ اہم نام بھی چھوٹ گئے ہوں اور یہ ناممکن نہیں ہے۔

ممنون ہوں مشہور فلم رائٹر رشید انجم (بھوپال) اور جناب انیس امروہوی (دہلی) کا کہ انہوں نے میری فرمائش پر کئی مضامین قلم بند کئے۔ اور بالخصوص ادب' اسپورٹس اور فلم رائٹر خورشید اختر فرازی (کلکتہ) صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے بہت زیادہ تعاون کیا۔

کتاب ''ہندستانی فلم کا آغاز وارتقاء'' میں چند مضامین جن اخبارات، رسائل اور کتابوں سے لئے گئے ہیں ان مضمون نگاروں اور مدیران و مصنفین کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔

نوٹ: چند فلمی شخصیات کے نام مضامین کی عدم دستیابی کے سبب شامل نہیں ہوسکے جس کا مجھے بیحد افسوس ہے۔

ڈاکٹر الف انصاری

☆☆☆

ہندوستانی فلم کا ارتقائی سفر

ناٹک یعنی ڈرامہ ہندوستان کا قدیم فن ہے ایک روایت کے مطابق جب مراٹھی اور بنگلہ ڈرامہ کامیابی کی منزل کی طرف رواں دواں تھا تو ان ہی دنوں یوروپی ملک سے خاموش فلموں کی درآمد ہندوستان میں شروع ہوگئی تھی۔ خاموش فلموں کی آمد سے ڈرامہ تھیٹر، پروجیکشن تھیٹر میں تبدیل ہونے لگے۔ لہٰذا تھیٹر کے فنکاروں کو فکر لاحق ہوئی اور وہ اس کی بقا کی تدبیر سوچنے لگا، کافی غور و فکر کے بعد انہیں فلموں میں ہی بقا نظر آئی اور مہاراشٹر فلموں کے میدان میں پیش رو بنا۔

داداصاحب پھالکے جرمنی سے فلم کی تکنک اور فن سیکھ کر آئے اور انہوں نے ناسک میں ایک فلم اسٹوڈیو کی بنیاد ڈالی۔ کولہاپور میں باباراؤ پنٹر اور ان کے بھائی آنندراؤ پینٹر مصور، بت تراش اور آرٹ ڈائرکٹر تھے۔ انہیں انگریزی کی خاموش فلموں سے تحریک ملی انہوں نے ایسا محسوس کیا کہ بہت جلد خاموش فلموں کی نمائش کے بعد تھیٹر کا وجود خطرے میں پڑ جائیگا اس لئے باباراؤ پینٹر نے پوری قوت اور توجہ اس طرف صرف کر دی اور کافی جد و جہد کے بعد ایک مووی کیمرہ بنانے میں کامیاب ہوگئے۔

باباراؤ پینٹر نے چند روپوں میں تھوڑی سی فلم خریدی اور پہلی بار اس کیمرے سے کانگریس کے سالانہ اجلاس کی ایک ڈاکومنیٹری فلم تیار کی یہ فلم انہوں نے ملک کی نذر کر دی اس طرح پہلی ڈاکومنیٹری فلم بنانے کا اعزاز مہاراشٹر کو نصیب ہوا۔

۲۸/دسمبر ۱۸۹۵ء کو ''گرانڈ کیفے پیرس'' کی نچلی منزل میں لومیری برادران نے اپنی فوٹوگرافی کا تجربہ کیا اس تجربے سے فلم کا آغاز ہوا۔ انہوں نے ساکن تصویر متحرک کر دکھایا جس کے بعد دنیائے فلم کی کایا ہی پلٹ گئی دراصل تفریح کی دنیا میں یہ نیا انقلاب تھا۔

۱۸۸۵ء میں مشہور سائنسداں مائی برج نے پروجیکٹر کی ایجاد کی۔ اس آلے کی مدد سے فلم کو پردے پر حرکت کرتے دکھایا گیا تھا۔ لیکن ہندوستان میں سنیما فوٹوگراف کی پہلی نمائش ۷/جولائی ۱۸۹۶ء کو فرانس کے لومیری برادران نے بمبئی کے واٹسن ہوٹل میں کی تھی۔ ''ٹائمز آف انڈیا'' نے ۷/جولائی ۱۸۹۶ء کی

اشاعت میں دنیا کی پہلی فلم کا اشتہار شائع کیا تھا۔

ایک ہندوستانی فوٹوگرافر ''ہریش چند استمارام ٹھیواڈیکر'' نے پیرس سے اکیس اشرفیوں میں ایک فلمی کیمرہ خریدا۔ ۱۸۹۶ء میں اس نے اس کیمرہ سے کشتی کے ایک مقابلے کو فلمایا تھا اس کے بعد انہوں نے بندروں کی تربیت کا حال فلمایا تھا۔

ایک ہندوستانی طالب علم ''پی پرانجپے'' جو انگلینڈ کے کیمبرج یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا پوری یونیورسٹی میں نمایاں مقام حاصل کرنے پر ٹھیواڈیکر نے اسے خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے اس کے ہندوستان واپسی کے مناظر کی اسی کیمرے کی مدد سے ایک نیوز ریل تیار کیا تھا۔ اس طرح ہریش چند استمارام ٹھیواڈیکر نے پہلی بار نیوز ریل ایجاد کی۔

۱۹۱۳ء تک ہندوستان میں صرف غیر ملکی خاموش فلموں کی نمائش ہوتی رہی۔ بابائے فلم دادا صاحب پھالکے کو فلم بنانے کا بہت شوق تھا۔ اس لئے انہوں نے فلم بنانے میں کافی دلچسپی لینی شروع کر دی۔

دادا صاحب پھالکے سنسکرت کے عالم تھے۔ انہیں مصوری، موسیقی اور اداکاری سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ رفتہ رفتہ یہ لگاؤ جنون کی سرحدوں کو پار کرتا گیا۔ اپنے خواب کی تعبیر کے لئے انہوں نے سب سے پہلے J.J. School Of Arts Bombay سے فوٹوگرافی کی تعلیم حاصل کی پھر پرنٹنگ کا پیشہ اختیار کیا۔

۱۹۱۲ء میں دادا صاحب پھالکے نے ایک فلمی کیمرہ خریدا۔ فلم بنانے کے لئے فائنانسروں سے رابطہ قائم کیا۔ جب تمام چیزیں مہیا ہو گئیں تو انہوں نے فلم ''راجہ ہریش چندر'' بنانے کا اعلان کر دیا۔ مرکزی کردار کے لئے ماسٹر وٹھل اور رانی زبیدہ کی خدمات حاصل کیں۔

دادا صاحب پھالکے کے خواب کی تکمیل ۱۹۱۳ء میں ہوئی۔ جب انہوں نے ہندوستان کی پہلی خاموش فلم ''راجہ ہریش چندر'' بنا کر نمائش کے لئے پیش کی۔ یہ فلم تین ہزار سات سو فٹ لمبی تھی اس کی نمائش بمبئی کے تھیٹر ''کارونیشن'' میں ہوئی۔ اس کے بعد دادا صاحب پھالکے خاموش فلموں کے موجد کی حیثیت سے تسلیم کر لئے گئے۔

خاموش فلموں کا دور تقریباً بیس برسوں تک رہا۔ اس زمانے میں سازندے فلموں میں سچویشن کے مطابق الگ سے موسیقی دیا کرتے تھے اور ہر منظر کے لئے ایک شخص کھڑا ہو کر فلم کی کہانی سنایا کرتا تھا۔

خاموش فلموں میں زیادہ تر کہانیاں دیومالائی داستانوں پر مبنی ہوا کرتی تھیں۔ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۳۰ء تک

تقریباً دو سو خاموش فلمیں بنیں۔ دادا صاحب پھالکے نے زیادہ تر دھارمک فلمیں بنائیں جیسے ساوتری، کرشنا جنم، لنکا دھنس اور راجہ ہریش چندر وغیرہ۔

۱۹۳۰ء میں فلمی شائقین اور اہلِ نظر کے ذوق میں نئی تبدیلی کا احساس بیدار ہوا چونکہ وہ دھارمک فلمیں دیکھتے دیکھتے اکتاہٹ محسوس کرنے لگے تھے اب وہ حقیقت سے آشنا ہونا چاہتے تھے۔ لہٰذا فلمسازوں نے حالات کے پیشِ نظر دھارمک فلموں کی جگہ سماجی اور تاریخی فلمیں بنانے پر زور دیا۔

بمبئی کے فلمسازوں اور ہدایتکاروں کے لئے خوشی کی بات تھی کہ ان کی فلمیں مدراس میں بھی دکھائی جانے لگی تھیں۔ مدراس کے فلم ساز اور ہدایتکاروں کو فلمسازی میں بمبئی کے فلمسازوں سے تحریک ملی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بمبئی کے فلمساز کلکتہ میں بھی فلم بنانے لگے تھے۔

چونکہ اس دور میں دیومالائی داستانوں پر فلمیں بنائی جاتی تھیں۔ لہٰذا داستانوں کے ذریعہ تحریک آزادی کی عکاسی بھی علامتی انداز سے ہونے لگی ایسے فلمسازوں میں مشہور کانگریس رہنما پپن چندر پال کے صاحبزادے نرنجن پال اور پی سی چودھری کی خدمات پیش پیش رہیں۔ ۱۹۲۸ء میں ان کی فلم ''بم'' اور ۱۹۳۱ء میں فلم ''خدا کی شان'' نے ہندوستانی سماج میں تہلکہ مچا دیا۔

۱۹۳۱ء سے ہی دادا صاحب پھالکے خاموش فلموں کے کرداروں کو آواز دینے کے لئے تجربے اور مشاہدے کرنے لگے تھے۔ اس کے دوران صاحب پھالکے معاشی اعتبار سے بالکل قلاش ہو گئے۔ آپ قرض کے بوجھ کو برداشت نہیں کر پائے اور ایک عظیم الشان خواب کی تعبیر کے بغیر دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ اس طرح ایک فنکار کا حسین خواب ہزاروں من مٹی کے اندر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن ہو گیا۔

آخر کار اس حسین خواب کی تکمیل آردیشر ایرانی کے ہاتھوں ہوئی۔ انہوں نے ۱۹۳۱ء میں پہلی متکلم فلم ''عالم آرا'' بنا کر ہندوستانی عوام کو حیرت زدہ کر دیا۔ ۱۹۳۱ء ہی میں ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے فلمسازوں نے ۲۲/ متکلم فلمیں نمائش کے لئے پیش کیں۔

۱۹۳۳ء میں ان فلموں کی تعداد ۷۵/ ہو گئی اور پھر روز بروز اس کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ ۱۹۳۹ء میں ۱۷۱/ فلمیں نمائش کے لئے منظرِ عام پر آئیں۔

۱۹۳۱ء میں ''عالم آرا'' کی نمائش کے ساتھ ہی خاموش فلموں کا دور آہستہ آہستہ متکلم فلموں کے عہد میں تبدیل

ہوگیا۔اس طرح آردیشر ایرانی نے فلموں کے گونگے کرداروں کو زبان دی اور سنیما عوامی رابطے کا ایک وسیلہ بن گیا۔

ہالی ووڈ کے بعد سب سے زیادہ فلمیں ہندوستان میں بن رہی ہیں۔ ہندوستانی سنیما کی ترقی کی رفتار تیری سے بڑھ رہی ہے۔آج ہندوستانی فلم نے ہر اعتبار سے کافی ترقی کر لی ہے۔موسیقی کے آلات سے لے کر کیمرے کی تکنک تک ایسی ایسی ترقیاں ہوئی ہیں جن کا کرشمہ دیکھ کر دل ودماغ دنگ رہ جاتا ہے ۔امریکہ، جاپان اور جرمنی نے فلم میں استعمال ہونے والی مشینوں کی کایا پلٹ کر دکھ دی ہے۔

آئندہ پچاس سالوں میں فلم اور ٹیلی ویژن کی ترقیاں اپنے ارتقائی سفر کی کس منزل پر ہونگیں ہم آج اس کا گمان بھی نہیں کر سکتے ہیں البتہ آنے والی نسلیں اس کا منظر اپنی نگاہوں سے دیکھیں گی۔

ڈاکٹر الف انصاری

☆☆☆

ہندوستان میں فلموں کا آغاز

رشید انجم (بھوپال)

ہندوستان مختلف تہذیبوں، مختلف زبانوں، مختلف عادات واطوار اور الگ الگ رسم ورواج کا گہوارہ رہا ہے اس کے باوجود اس کی ہر تہذیب میں غنائیت، سر بسجو د رہی۔اسی لئے اس کی حرکات وسکنات اور گفتار میں تفریحی عنصر موجود رہا۔ رقص وسرود، گیت وسنگیت، راس رنگ ہر ہندستانی گھر کا لازمی حصہ مانا گیا خواہ وہ گھر متمدن شہر میں ہو یا قدامت پرست غیر متمدن بستیوں میں رہے ہوں۔سارا ہندوستان موسیقی نواز رہا ہے۔موسیقی اس کی روح تھی۔ ہر مذہبی، غیر مذہبی تقریب، تہوار، شادی بیاہ کی رسوم، خوشی وغمی، غرض ہر موقع پر جذبۂ شوق کا سب سے موثر اور دلچسپ ذریعہ موسیقی رہی ہے۔

یورپ اور دیگر مغربی ممالک جب رقص وموسیقی کی ایجاد میں مصروف تھے، ہندوستان ان فنون میں ترقی پذیر ہو چکا تھا۔البتہ فلم سازی اس سے بہت دور تھی۔ ہندوستان میں تھیٹر اور رنگ منچ اپنے عروج پر تھا اور اس کے کانوں میں فلم کی ایجاد کی بھنک پڑ چکی تھی۔ ایسے ہی وقت فرانس کے لوئر برادرس نے ۷؍جولائی ۱۸۹۶ء کو بمبئی کے ہوٹل واٹسن میں حکومت کی اجازت سے اپنی فلم The sharqe of the dragon کی نمائش شو رکھا۔شو، بے حد کامیاب ہوا اور ہندوستان کی عوام پہلی بار فلم سے واقف ہوئی۔ یہ نمائشی شو صرف مخصوص لوگوں کے لئے تھا۔ بعد میں ناولٹی تھیٹر، جو اس وقت ڈراموں کے لئے مخصوص تھا کو کرائے پر لے کر عوام کے لئے اس فلم کو دکھانے کے انتظام کئے۔ عام لوگوں نے پہلی بار سنے میجک کا کرشمہ دیکھا۔ تو ان کا مسحور ہونا لازمی تھا۔عورت کو ناچتے، ریل کو پٹری پر دوڑتے، جنگل میں سانپ کو سانپ سے لڑتے اور ایسے ہی مختلف مناظر کو دیکھنے عوام امنڈ پڑی۔ٹکٹ ایک روپیہ تھا مگر بے انتہا دلچسپی کی وجہ سے دو روپیہ کر دیا گیا تھا۔سامنے کے حصے کا چار آنے اور سب سے پیچھے کا دو روپیہ ٹکٹ رکھا گیا تھا۔ٹکٹ کی یہ شرحیں لاگو کر دی گئیں۔اعلیٰ اور معزز طبقہ عوام کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا تھا۔لہذا اس کے لئے بلند جگہوں پر نشستوں کا اہتمام کیا گیا جسے ’ریزرو باکس‘ کا نام دیا گیا۔اس ایک فلم کے بعد یوروپ سے اور بھی فلمیں انڈیا آئیں اور اسی تھیٹر میں دکھائی جاتی رہیں۔محققین ان کی تعداد ۳۴ بتاتے ہیں۔

پھرتو فلموں کی باڑھ سی آ گئی۔جس طرح ہندوستان کی سرزمین پر قبضہ جمانے اور سیاسی وفوجی تسلط پانے کے لئے آرین،مغل،ترک اورمغلوں کا تاج غصب کرنے کے لئے پرتگالی،فرانسیسی اورانگریزوں نے ہندوستان کو میدان حشر بنا رکھا تھاٹھیک اسی طرح انگریزی دورحکومت میں ثقافت پراپنا تسلط قائم کرنے کے لئے یورپی ممالک کا ثقافتی طبقہ زورآزمائش میں مشغول ہوگیا۔فرانس کے بعد جون ۱۸۹۷ء میں بمبئی کے گیٹی تھیٹر پر'سٹواٹ دیگر گراف' فلم کی نمائش ہوئی تو کلفٹن اینڈ کمپنی نے اپنے ہی اسٹوڈیو میں بنی فلموں کو دکھانا شروع کردیا۔اطالوی (اٹالین) بھی کیوں پیچھے رہتے؟انہوں نے بھی اسپلینیڈ میدان (موجودہ آزاد میدان) میں خیمہ لگا کر اپنی فلموں کی نمائش شروع کردی۔ان فلموں میں ایک فلم بمبئی میں ہی پکچرائز کی گئی تھی۔یہ وہ پہلی فلم تھی جس کی شوٹنگ بمبئی میں کی گئی تھی۔اس فلم میں چرچ گیٹ ریلوے اسٹیشن پر ایک ٹرین کو آتے،رکتے اوراس میں سے مسافروں کو اترتے دکھایا گیا تھا۔

فلم اب کاروبار بنتی جارہی تھی۔بمبئی کی طرح مغربی بنگال میں بھی فلموں کی ہلچل ہونے لگی تھی۔کلکتہ میں اسٹیون نے انگریزی فلم کا سب سے پہلا شو اسٹار تھیٹر میں رکھا اوراس کے بعد کئی فلمیں دکھائی گئیں۔

۱۸۹۸ء یہ وہ سال ہے جب کلکتہ میں واقع وارو ک ٹریڈنگ کمپنی نے پروفیسر اسٹیونس کی دیکھ ریکھ میں انگریزی زبان میں ایک فلم A Panaroma of Indian Scene of Processing بنا کراسے لندن میں دکھایا تھا۔یہ فلم آج بھی لندن فلم آرکاوز میں محفوظ ہے۔اورکہا جاتا ہے کہ برٹش فلم انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر جیمز کوئن ۱۹۶۱ء میں جب بھارت آئے توانہوں نے اس فلم کا ایک پرنٹ پنڈت نہرو کو پیش کیا تھا۔

ہریش چندسکھا رام بھٹ واڈیکر جسے بعد میں ساولے دادا کے نام سے جانا گیا۔بمبئی کا وہ پہلا فوٹو گرافر تھا جس نے فلم کی تکنیک کو سمجھنے میں پیش رفت کی۔ہندوستان میں تب تک مووی کیمرہ کا تصور بھی نہیں تھا۔واڈیکر نے سونے کی ۲۱ گنیوں کے عوض لندن سے مووی کیمرہ درآمد کیا۔اوردنگل کی کشتیوں کو کیمرہ ریل پر اتار کر پروسیسنگ کے لئے لندن بھیج دیا۔فلم ڈیولپ ہوکر آئی۔نام تھا The Wrestler ۱۸۹۷ء میں بنی یہ ہندوستان کی پہلی متحرک فلم تسلیم کی گئی اورواڈیکر کو یہ شرف حاصل ہوگیا۔اس کے بعد واڈیکر نے کئی ایک مختصر فلمیں بنا کران کی نمائش کی۔

۱۸۹۹ء میں ایک اور انڈین فلمساز تھانیوالا نے محرم کے کچھ مناظر فلما کر دکھائے۔

۱۹۰۰ء میں فلم تجارتی منڈی بن گئی۔پارسی نثراد بزنس مین خورشید جی بائلی والا نے ناولٹی تھیٹر پر قبضہ جما کر فلموں کو کاروباری شکل دے دی۔

ڈی این سمپت نے بمبئی کو نظرانداز کرکے فلموں کے کاروبار کے لئے ۱۹۰۴ء میں گجرات کے تجارتی شہر سورت کو چنا اور پروجیکٹر خرید کر فلمیں دکھانے لگا۔۱۹۰۴ء میں ہی گجراتی تاجر مانک ڈی سٹھانی نے بھی اس منافع بخش کاروبار میں حصہ لینا شروع کردیا۔

۱۹۰۴ء The title of Christ دنیا کی وہ پہلی فلم تھی جو حضرت عیسیٰ کی زندگی اوران کی تبلیغی جدوجہد پر بنائی گئی تھی۔اس فلم کی نمائش نے نہ صرف ذہنوں پراثر ڈالا بلکہ آئندہ یہی فلم ہندوستان کی پہلی فلم سنگ بنیاد بنی۔

۱۹۰۱ء میں سب سے اہم فلمساز ایک بنگالی ہیرالاسین کا نام سامنے آتا ہے۔سین کو انڈین موشن پکچرز کی تخلیق میں پہلی صف کا فلمساز مانا گیا ہے۔سین نے مووی کیمرہ تیار کیا تھا اوراس کیمرے سے ایک ڈانس ڈرامہ پکچرائز کیا۔اس کے بعد بہت سے ڈراموں کو فلم بند کیا جن میں سرلا بدھ سیتا رام دو یہ لیلا۔علی بابا اور ہری راج ڈرامے شامل تھے۔

۱۹۰۳ء میں واڈیکر نے لارڈ کرزن کی انڈیا آمد کو پکچرائز کیا۔یہ رائل وزٹ تھی۔اس کے بعد واڈیکر نے شری کرشن کا موضوع چن کر فلم بنانے کی تیاریاں کیں جن میں ان کے بے حد چہیتے بھائی بھی شامل تھے۔ابھی فلم تکمیل کے مراحل میں تھی کہ بھائی کی موت ہوگئی۔واڈیکر دل برداشتہ ہوگئے۔فلم بنانے کا ارادہ ترک کرکے ۲۱ سونے کی گنیوں میں خریدے گئے کیمرے کو صرف سات سو روپے میں بیچ دیا۔۱۹۱۱ء میں اس کیمرے کو تاجرات رام پرس رام کارندھر،دیوی دوا کر اور ایس این پاٹنکر نے مل کر خریدا تھا۔

۱۹۰۵ء میں ایک اور اہم نام مغربی بنگال کے جیوتش سرکار کا ملتا ہے۔سرکار نے بنگال کی تقسیم کے خلاف نکالے گئے احتجاجی جلوس کو عکس بند کیا تھا۔اس ڈاکومینٹری کو بمبئی کے کارونیشن تھیٹر میں دکھایا بھی گیا مگر پھر انگریز سرکار نے اسے بند کرادیا۔

۱۹۰۵ء میں ہی کلکتہ کے ایف جے مدن نے پہلی بار فلم کو ایک تنظیم سے جوڑا اور ۳۰ سے ۵۰ منٹ کی

فلمیں بنائیں۔ ان مختصر فلموں کو فیچر فلموں کا درجہ تو دیا جاسکتا تھا مگر یہ فلمیں صرف چلتی پھرتی تصویروں اور تماشے سے زیادہ نہیں تھیں اس لئے ان کی اہمیت نہیں رہی۔

واڈیکر کے کیمرے سے تینوں تاجروں نے فائدہ اٹھایا اور فلم ’ساوتری‘ بناڈالی مگر چند ٹیکنیکل خامیوں کی اور فنی خامیوں کی وجہ سے فلم بیکار ہوگئی۔ ان تینوں نے فلم ادارے کی بنیاد رکھی اور دوسری فلم ایک اہم سماجی شخصیت نارائن راؤ پیشوا کی زندگی پر بنائی۔ اس فلم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ایک مسلم عورت نے پہلی بار فلم میں کام کیا تھا۔ اس کا نام زبیدہ بتایا جاتا ہے مگر فلم سے متعلق کوئی معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔

وقت گزرتا رہا اور فلم ارتقائی منزلیں طے کرتی رہی۔ کچھ تاجر پیشہ لوگ اس فیلڈ میں آئے تو کچھ ایسے دیوانے بھی جنہیں فلم کی تخلیق سے نیک نیتی کے ساتھ بہت مخلصانہ لگاؤ تھا۔ اردو تھیٹر فروغ پر تھا اس کے ساتھ ہندی ناٹک بھی اپنا مقام بنائے ہوئے تھے یہ ناٹک زیادہ تر ہندو ماتھولاجی پر مبنی ہوتے تھے۔

۱۹۱۲ء کا سال شروع ہوگیا۔ اس سال میں سب سے اہم اور خاص نام داداصاحب تورنے کا تاریخ ساز نام ہے۔ ان کی پیدائش ۱۳/اپریل ۱۸۸۰ء کو سکل واڑی مہاراشٹر میں ہوئی تھی۔ مہاراشٹر کے ساحلی شہر مالون میں تعلیم پائی۔ ۱۸۹۶ء میں بمبئی گریوز کاٹن بجلی کمپنی میں نوکر ہوئے پھر کراچی بھیجے گئے۔ ۱۹۱۰ء میں استعفیٰ دے کر بمبئی لوٹ آئے۔ ذہن فلمسازی پر راغب تھا۔ اپنے ایک ساتھی این جی چترے کے ساتھ فلم بنانے کی اسکیم بنائی۔ مہاراشٹر کے سنت پنڈلک پر ایک ناٹک بہت مشہور ہورہا تھا۔ اسے بال کرشن کیرتی نے لکھا تھا اور کیرتی رنگ کمپنی اور شری پدسنگیت منڈلی کے زیراہتمام بمبئی میں کھیلا جارہا تھا۔ اس ڈرامے سے متاثر ہوکر داداصاحب تورنے این جی چترے کے ساتھ چار سوفٹ ریل پر اسے جوں کا توں شوٹ کرلیا اور پھر غیرضروری حصوں کو کاٹ دیا (یہ پہلی فلم ایڈیٹنگ بھی ہے) سنت پنڈلک کو ۱۸/مئی ۱۹۱۲ء میں نمائش کے لئے پیش کردیا گیا۔ یہ پہلی ڈرامیٹک فلم ضرور تھی مگر چونکہ سلولائڈ پر ڈرامے کی محض منتقلی تھی اس لئے اسے پہلی فلم نہیں مانا گیا۔ اور رام چندر گوپال تورنے پہلے فلم خالق ہونے کا درجہ نہ پاسکے مگر زیرک تھے۔ فلمسازی و ہدایت کاری کے ساتھ تورنے لکشمی فلم کمپنی ۲۶۔۱۹۲۴ء اور امپیریل کمپنی ۳۱۔۱۹۲۷ء کے چیف ڈسٹر بیوٹر کی حیثیت سے پہلا مقام حاصل کیا۔ زبیدہ اور فاطمہ کو پہلی بار فلموں میں پیش کیا۔ ۱۹۲۶ء میں فلم ’نیرا‘ میں چیف اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے۔ ۱۹۲۲ء میں مووی کیمرہ کمپنی قائم کی اور بعد میں فلمی آلات سپلائی کرنے لگے۔ ۱۹۲۹ء میں بابوراؤ

پینٹر کی شکرت میں ساؤنڈ آلات سپلائی کئے۔ پہلی بولتی فلم ’عالم آرا‘ کے لئے تورنے سے ہی آلات مہیا کئے تھے۔ امپریل کمپنی میں چیف آرگنائزر بھی رہے۔ اسی کمپنی کے لئے ۱۹۳۰ء میں سند باددی سیلر‘ اور ’دلاور‘ فلموں کو ڈائریکٹ کیا۔ ۱۹۲۴ء میں نانو بھائی وکیل کے یہاں ٹیکنیشین ہوگئے۔ ۱۹۲۶ء میں یہ کمپنی بند ہوگئی داداصاحب تورنے نے مراٹھی میں کامیڈی فلمیں بھی بنائیں۔ ان کی زیادہ تر فلموں میں مراٹھی اداکار ونکر کمنا نے کام کیا تھا۔ مراٹھی فلموں میں آرٹ ڈائریکٹر رہے اور ساؤنڈ ریکارڈسٹ بھی۔ ۱۹۳۰ء میں مدن رائے وکیل کی فلم میواڑ نوموالی۔ کا منظرنامہ بھی لکھا تھا۔ یہ ذہین فلمساز جو ہندوستان کی پہلی فلم کے خالق ہونے کے درجے سے محروم رہ گیا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں ۸۰ سال کی عمر میں بہت خاموشی سے دنیا چھوڑ گیا۔

تورنے کو جو درجہ نہیں مل سکا وہ کسی اور کے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا مگر ابھی اس تہلکہ بدوش دور میں ایک سال کا وقفہ تھا۔

☆☆☆

ہندوستانی سنیما کے پچاس سال!

پریم پال اشک (دہلی)

ہندوستان کو آزاد ہوئے پورے پچاس برس ہو گئے ہیں۔اس دوران ہم نے سماجی، اقتصادی اور ثقافتی میدان میں ترقی کے نئے افق پر کمندیں ڈالی ہیں۔اس جہت میں سنیما بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا ہے۔آج ملک کے طول وعرض میں ہم اپنی ۵۰ سالہ کارگزاریوں کا تجزیہ کر رہے ہیں اور یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس دوران ہم نے کیا کچھ کھویا ہے اور کیا کچھ پایا ہے۔اپنا محاسبہ خود کئے جانے کے صحت مند اقدام کے پیش نظر ہم ہندوستانی سنیما کے پچھلے پچاس برس کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

سنیما بیسویں صدی کا ایک موثر ترین ہی نہیں، بلکہ نئے طاقتور، صحت مند اور انقلاب آفریں ذرائع اپنا رہا ہے اس نے پوری دنیا کو ایک کنبہ تصور کئے جانے کے جذبہ کو حقیقت کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے ایک پل کا کام کیا ہے۔یہی نہیں بلکہ اس نے نئی راہیں ہموار بھی کی ہیں۔ہندستانی سنیما کی کیفیت بھی اس سے مبرّا نہیں ہے۔

کہانی اور مکالمے: آزادی سے پہلے ہندستانی سنیما بھی گھٹنوں گھٹنوں چل رہا تھا۔موضوعات بھی روایت کے غلام تھے۔کوئی بھی فلم محبت کے مثلث سے آگے بڑھتی ہی نہیں تھی۔فلمیں خواہ رومانی ہوں یا سماجی، دھارمک ہوں یا فنطاسی، ایکشن سے بھرپور ہوں یا کاسٹیوم یا تاریخی، ان میں محبت اور رومان کی چاشنی ضرور ڈالی جاتی تھی اور ہندوستانی سنیما کا یہی محور بھی تھا۔لیکن آزادی کے بعد بدلتی ہوئی اقدار کے مطابق موضوعات میں بھی تبدیلی آئی ضیاء سرحدی کی فلم، ہم لوگ اور فٹپاتھ جیسی فلموں نے چونکا دینے والی کیفیت پیدا کر دی۔فلم ''سنسار'' ہو یا ''چندرلیکھا'' یا ''مسٹر سمپت'' یا ''بہار'' ہر فلم نے خصوصاً جنوبی بھارت کے ہندی سنیما نے اپنی الگ ہی دھاک جمائی۔آزادی کے بعد بھی پہلی مرتبہ ایس ایس واسن کی چندرلیکھا اور اے وی ایم کی فلم بہار نے ہندی سنیما پر اپنی انفرادیت کا سکّہ جمایا نیز جنوبی بھارت اور شمالی بھارت میں پہلی مرتبہ یگانگت پیدا ہوئی اور سنیما کے ذریعے زندگی کی دھڑکنوں کو قریب سے جاننے کا جذبہ ابھرنے لگا۔اس کے ساتھ ساتھ آئے دن کے سیاسی موضوعات بھی کیمرے میں مقید ہو گئے۔

کہانی کے ساتھ ساتھ مکالمہ نگاری کے فن نے بھی کافی ترقی کی۔آزادی سے پہلے آنے والی ہندی فلموں کو ہندوستانی زبان کا سرٹی فیکیٹ ملا کرتا تھا لیکن آزادی کے بعد ہندی نے ہندوستانی کی جگہ لے لی۔

آزادی سے قبل کی فلموں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان فلموں کے مکالموں میں تھیٹر کا اثر زیادہ ہوتا تھا۔کئی مرتبہ مکالمے کافی طویل بھی ہوا کرتے تھے اور ثقیل بھی لیکن آزادی کے بعد مکالمہ نگاری میں روزمرہ کی زندگی کا حقیقی رنگ جھلکنے لگا اس سلسلے میں ہم لوگ ''سمادھی فٹ پاتھ'' اور مسٹر سمپت کے مکالمے بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مکالمے مشینوں کی زد سے باہر نکل کر ادیبوں کی صف میں آ گئے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی فلمیں تو اپنی عمدہ کہانی اور پُرزور مکالموں کی وجہ سے کامیاب ہوئیں۔سمادھی، شہید اور ہم لوگ اس دور کی اہم فلمیں تھیں۔اس کے ساتھ ساتھ ہماری فلموں کے مکالموں میں ملک کی مختلف علاقائی زبانوں کے الفاظ بکثرت استعمال کئے جانے لگے اور ان کا چلن بھی خوب ہوا۔

موسیقی اور نغمہ نگاری: جہاں تک موسیقی اور نغمہ نگاری کا تعلق ہے آزادی سے پہلے ۹۵ فی صد نغمے رومانی تحریر کئے جاتے تھے اور موسیقی بھی اسی انداز کی دی جاتی تھی اور اگر گانوں یا مکالموں میں کوئی سیاسی بات واضح طور پر کہنے کی کوشش کی جاتی تو سنسر بورڈ اسی وقت گردن ناپ کر فلم پر بے دردی کے ساتھ قینچی چلا دیتا یا اس پر پابندی عائد کر دی جاتی۔اس لئے عوام کو رومان کی افیون پلا کر مست کر دینا اس دور کا عام چلن تھا۔

اس زمانے میں موسیقی بھی خالص ہندوستانی انداز کی دی جاتی تھی۔سی رام چندر نے فلم ''شہنائی'' میں آنا میری جان' میری جان سنڈے کے سنڈے' نغمے کے ذریعہ مغربی انداز اپنانے کی کوشش کی۔یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔اس کے ساتھ ہی پلے بیک گلوکاری کے ساتھ گلوکار اداکاری کا بھی طوطی بولتا تھا لیکن آزادی کے بعد تکنیکی ترقی کی وجہ سے نغمہ نگاری کے فن میں بھی تبدیلی آئی نئے نئے شاعر نئے نئے خیالات اور تخیلات کی پرواز بھرتے ہوئے فلمی دنیا میں وارد ہوئے آزادی سے پہلے تو ڈی این مدھوک کا ڈنکا بجتا تھا۔فلم ''رتن'' کا گیت ''انکھیاں ملاکے'' برسوں زبان زد خلائق رہا اور ادھر پردیپ اپنے مخصوص انداز کے نغمہ نگار تھے۔لیکن موسیقاروں میں آر سی بورال، نوشاد، گوبند رام، کھیم چند پرکاش، غلام محمد اور غلام حیدر کا ڈنکا بج رہا تھا۔لیکن آزادی کے بعد نوشاد کے علاوہ شنکر جے کشن، لکشمی کانت پیارے لال، سی رامچندر، مدن موہن، روشن، خیام، جے دیو، ایس ڈی برمن، آر ڈی برمن نے اپنی دلکش دھنوں سے

تماشائیوں پر موسیقی کا سحر پھونکا اور نغمہ نگاروں میں شکیل، ساحر، مجروح، گلزار، شیلندر اور حسرت جے پوری کے نغمات بچّے بچّے کی زبان پر رہے۔ اس کے علاوہ ہماری فلمی موسیقی اس دور میں صرف ڈھولک، وائلن، سارنگی، طبلہ اور ہارمونیم تک محدود تھی۔ لیکن آزادی کے بعد اس میں کئی نئے آلات شامل ہو گئے اور خصوصاً کلیان جی آنند جی کی الیکٹرانک گٹار نے تو ملک بھر میں طوفان مچا دیا۔ جہاں تک گلوکاری کے فن کا تعلق ہے۔ پلے بیک گلوکاروں نے پورے ہندوستان کی فلم موسیقی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ آزادی سے پہلے تو صرف شمشاد بیگم، زہرہ بائی انبالے والی، شانتا آپٹے، امیر بائی کرناٹکی، راج کماری، نور جہاں اور ثریا کے علاوہ کے ایل سہگل، پنکج ملک، سریندر، کے سی ڈی، خان مستانہ اور جی ایم درانی جیسے مخصوص گلوکار اور پلے بیک گلوکار بے حد مقبول تھے لیکن آزادی کے بعد مکیش، محمد رفیع، کشور کمار، طلعت محمود اور ہمنیت کمار کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا۔ گلوکار اداکار اور اداکارائیں تو کم و بیش ناپید سی ہو گئیں صرف کشور نے برسوں اپنی اداکاری اور گلوکاری کا سکّہ جمایا۔ گلوکار اداکاروں کی جگہ پلے بیک گلوکاروں نے لے لی۔ ان میں لتا منگیشکر اور آشا بھونسلے کا طلسم ابھی تک نہیں ٹوٹا ہے۔ پچھلے پچاس برسوں میں لتا اور آشا دونوں بہنوں نے انقلاب آفریں کیفیت پیدا کی۔ ان کی آواز کے زیر و بم کی سحر انگیزی اب تک برقرار ہے۔

گراموفون ریکارڈ اور کیسٹ: جہاں تک گانوں کا تعلق ہے آزدی سے پہلے تو گراموفون ریکارڈوں اور گراموفون مشینوں کا چلن تھا۔ ریکارڈوں کی زندگی عارضی ہوا کرتی تھی۔ اس زمانے میں اہم گراموفون کمپنیوں میں ایچ ایم وی۔ کولمبیا، ٹووین ینو تھیٹرز اور ایک دوسری کمپنیوں کا چلن تھا۔ مگر آزادی کے بعد گراموفون کی جگہ ٹو ان ون اور ریکارڈوں کی جگہ آڈیو کیسٹ نے لے لی۔ ان میں ایچ ایم وی، ٹی سیریز اور ویسٹن کمپنیوں نے اپنا سکّہ جمانے کی کوشش کی۔ لیکن ان سب میں ٹی سیریز نے بازی مار لی۔ اب لوگ گراموفون ریکارڈوں کو تو بھول ہی گئے ہیں۔ ان کی جگہ اب ایچ ایف ۹۰ سی اور ۶۰ سی کے کیسٹوں نے لے لی ہے خصوصاً اسیٹر یو ساؤنڈ سسٹم نے تو سونے پر سہاگا کا کام کیا ہے اور اب پچھلے چند برسوں میں آڈیو اور ویڈیو دونوں سسٹم میں CD کمپلٹ ڈسک آ گئی ہے اور اس نے موسیقی میں ایک نئی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

اداکاری: جہاں تک فلموں میں اداکاری کا تعلق ہے۔ آزادی سے پہلے ہماری فلموں پر تھیٹر کا اثر

غالب تھا۔ طویل مقفع اور مسجع مکالمے پاٹ دار آواز میں ایک ہی سانس میں ادا کئے جانے کو فن کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ طوطے کی طرح رٹے رٹاتے مکالمے ادا کر دئے جاتے تھے۔ خواہ غلام محمد ہوں یا سریندر، کے ایل سہگل ہوں یا سہراب مودی، نور جہاں ہوں یا ثریا۔ سب کا انداز یکساں تھا۔ لیکن آزادی کے بعد فلمی اداکاری کے میدان مین انقلاب لانے کا فخر دلیپ کمار کو حاصل ہوا۔ انہوں نے پہلی مرتبہ تھیٹر اور سنیما میں امتیاز پیدا کیا۔ اپنی فطری اداکاری کے باعث ہی وہ ایک عہد آفریں شخصیت بن گئے ان کے علاوہ اشوک کمار، دیو آنند، راج کپور، موتی لال، بلراج ساہنی، سنجیو کمار، امیتابھ بچن، ونود کھنّہ، نصیرالدین شاہ کے ساتھ ساتھ سمیتا پاٹل، نرگس، مینا کماری، درگا کھوٹے، ریکھا اور للیتا پوار جیسی لاتعداد اداکاراؤں نے بھی اپنی اداکاری کے جوہر دکھا کر کروڑوں عوام کے دل جیت لئے۔

فلمی مراکز: آزادی سے پہلے شمالی ہندوستان کے فلم سازوں کا ایک اہم مرکز پنجاب میں لاہور ہوا کرتا تھا اور باقی مراکز جنوب میں مدراس، مشرق میں کلکتہ اور مغرب میں بمبئی تھے۔ آزادی کے بعد فلم سازوں کی ہوا یکسر بدل گئی۔ لاہور کا فلمی مرکز بمبئی میں منتقل ہو گیا اور جنوب میں بنگلور، حیدرآباد، تھیروانتھا پورم اور مدراس، مشرق میں کلکتہ فلم سازوں کے اہم مراکز بن گئے اور فلم سازی کا عمل اپنی پوری شدت کے ساتھ شروع ہو گیا۔ آزادی سے پہلے فلم سازی کے میدان میں ہمارا نمبر تیسرا اور چوتھا ہوا کرتا تھا۔ لیکن آزادی کے بعد فلم سازی میں ہم نے بے پناہ ترقی کی اور جاپان کے بعد ہمارا ملک دوسرے نمبر پر شمار کیا جانے لگا۔

آزادی سے پہلے ۱۹۳۱ء میں صرف ۲۸، ۱۹۴۱ء میں ۱۶۷، اور ۱۹۵۱ء میں ۲۲۰ فلمیں تیار کی گئیں۔ جب کہ آج ہر سال مختلف زبانوں کی تقریباً ایک ہزار فلمیں پردہ سیمیں کی زینت بنتی ہیں۔

سرمایہ کاری: جہاں تک فلموں میں سرمایہ کاری کا تعلق ہے آزادی سے پہلے اس باگ کی ڈور ساہوکاروں اور فائنانسروں کے ہاتھوں میں تھی۔ اور وہ ۲۰ سے ۲۵ فیصد شرح سود پر سرمایہ لگایا کرتے تھے۔ لیکن آزادی کے بعد فلم ساز اور ڈسٹری بیوٹر فائنانس کرنے لگے اور اب اس کا تعلق مافیا گروپوں سے بھی جوڑا جانے لگا ہے۔

آزادی سے پہلے ہمارے یہاں ایک فلم زیادہ سے زیادہ دس ہزار روپے میں بن جاتی تھی۔ جب سہراب مودی کی فلم ''سکندر'' آئی تو اس کی پبلسٹی کے مطابق یہ دس ہزار روپئے کی لاگت والی فلم اس دور کی سب سے مہنگی فلم قرار دی گئی۔ اس کے بعد ایس ایس داسن کی فلم ''چندرلیکھا'' پر ایک لاکھ روپئے کے سرمائے

کی بات کہی گئی۔ جب کہ آج آزادی کے بعد ایک فلم پر دس کروڑ روپے کی لاگت آتی ہے۔ کہنے کو تو یہ معمولی بات ہے لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو معمولی فلم سازوں کے لئے یہ کیفیت امید افزاء نہیں ہے کسی زمانے میں اداکار سو اور ہزار کی بات کیا کرتے تھے لیکن اب تان لاکھوں کروڑوں پر آ کر ٹوٹتی ہے۔

بند مٹھی کا کھیل: آزادی سے پہلے فلموں کی کامیابی بند مٹھی کا کھیل سمجھی جاتی تھی۔ آج بھی یہی کیفیت ہے۔ پہلے فلمیں اداکاروں کے نام پر چلتی تھیں۔ نیز نغموں اور موسیقی کے بل بوتے پر کامیاب ہوتی تھیں۔ پہلے بھی ایک باکس آفس ہٹ فلم اپنا اثر پانچ سال تک برقرار رکھتی تھی۔ آج بھی صورت حال کم وبیش وہی ہے۔ تھوڑی تبدیلی کے ساتھ آج عوام اچھی کہانی، عمدہ اداکاری اور چابکدست ہدایت کاری پر توجہ دیتے ہیں۔ اور بیشتر لوگ فلموں پر تبصرے پڑھ کر اور اخبارات میں شائع شدہ رپورٹیں دیکھ کر سنیما ہال کی طرف رخ کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کون سی فلم کب کامیاب ہو جائے، یا بیٹھ جائے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اسی بند مٹھی کے کھیل کا نام ہے تماشا، سنیما بائس کوپ یا کھیل۔ آزادی سے پہلے سنیما کو اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔ جب کہ آج لوگ اسے سنیما، مووی یا فلم کہہ کر پکارتے ہیں۔

سنیما گھر: آزادی سے پہلے ملک بھر میں ۱۵۰۰ سنیما گھر تھے۔ ان میں ۷۰۰ ٹورنگ اور ۸۰۰ مستقل سنیما گھر تھے۔ جبکہ آج ان کی تعداد ۱۵/ ہزار سے زائد ہے۔ پہلے اگر کسی فلم کی سلور جبلی ہوتی تھی تو اسے ایک کارنامہ تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن اب چونکہ ایک فلم کئی سنیما گھروں میں دکھائی جاتی ہے، کیبل آپریٹر بھی وہی فلم دکھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس فلم کے ویڈیو بھی مارکیٹ میں آجاتے ہیں اور کچھ عرصہ بعد دوردرشن اور سٹلائٹ پر بھی وہی فلم دکھادی جاتی ہے۔ لہذا سلور جبلی کا جشن تو عہد پارینہ کی بات بن کر رہ گئی ہے۔ اب تو فلم ساز ذریعہ اظہار کے ہر شعبے میں اپنی فلم کی نمائش کے حقوق فروخت کرتے ہیں۔ ملک کی آدھی سے زیادہ آبادی کیبل پر ہی فلم دیکھ لیتی ہے۔ اب تو سنیما ہال میں فلم دیکھنا جوئے شیر لانے کے مصداق تصور کیا جاتا ہے آزادی سے پہلے فلموں کے تین شو ہوتے تھے اور اب پانچ شو دکھائے جاتے ہیں۔

فلموں کے ٹکٹوں کے بلیک کا چلن تو آزادی سے پہلے بھی تھا۔ وہ زمانہ یاد کیجئے۔ جب آردیشر ایرانی کی فلم ''عالم آرا'' کے چار آنے کے ٹکٹ چار پانچ روپے میں فروخت ہوئے تھے۔ اگر آج ۲۵ روپے کا ٹکٹ سو روپے میں بلیک ہوتا ہے تو کوئی بڑی بات نہیں۔ البتہ یہ بات ضرور ہے پہلے ٹکٹوں کے لئے دھکم پیل ہوتی

تھی۔ سنیما ہال میں بنچ ہوتے تھے۔ انٹرول کے لئے واپسی کا چلن تھا۔ سیٹوں پر نمبر نہیں ہوتے تھے۔ پہلے آؤ پہلے پاؤ اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول پر عمل ہوتا تھا۔ لیکن اب تو نظم وضبط کے اصولوں پر عمل کیا جاتا ہے۔ ٹکٹ کھڑکی پر ٹکٹ قطار میں دئے جاتے ہیں۔ سیٹوں پر نمبر لگے ہوتے ہیں۔ واپسی کا کوئی چلن نہیں۔ آزادی کے بعد نظم وضبط میں رہ کر فلم دیکھنے کا سلیقہ بھی لوگوں کے اندر پیدا ہوا ہے۔

تقسیم کار: آزادی سے پہلے ڈسٹری بیوٹر فلم سازوں سے فلموں کی نمائش کے حقوق دس برس کے لئے خریدتے تھے۔ اب بھی وہی سلسلہ قائم ہے۔ یہ حقوق مختلف علاقوں تک محدود ہوتے تھے۔ سنیما گھروں کے مالکان سے ڈسٹری بیوٹر ایم جی کے طور پر کچھ فیصد رقم لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اور فلو کا بھی چلن تھا اور مجموعی آمدنی کے منافع میں فلم ساز اور ڈسٹری بیوٹر بھی حصّہ دار ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب تو سنیما گھر کرائے پر لئے جاتے ہیں۔ سنیما کے مالکان کو ہر ہفتے کرایہ مل جاتا ہے فلم خواہ چلے یا نہ چلے اس سے ان کا کوئی سروکار نہیں۔ نفع ونقصان کے ذمے دار ڈسٹری بیوٹر یا فلم ساز ہوتے ہیں کہنے کا مقصد یہ ہے کہ فلم ساز ایک فلم پر دس بارہ کروڑ اس امید سے لگاتا ہے کہ اسے تقریباً ایک ارب کی آمدنی ہونی ہوگی اگر اتنی آمدنی نہیں ہوتی تو آج جو بلیاں منانے کے باوجود فلم ناکام تصور کی جاتی ہے اب اوسط باکس آفس آمدنی گیارہ ارب روپے سالانہ ہوتی ہے اور حکومت کو ہر سال ۵/ارب روپے ٹیکسوں کی شکل میں وصول ہوتے ہیں چونکہ آزادی سے پہلے ایک فلم ایک ہی سنیما گھر میں دکھائی جاتی تھی۔ بامبے ٹاکیز کی فلم ''قسمت'' نے اپنے زمانے میں کلکتہ کے راکسی سنیما میں مسلسل تین سال تک چل کر ایک کل ہند ریکارڈ قائم کیا تھا۔ آزادی کے بعد یہ ریکارڈ جی پی سپی کی فلم ''شعلے'' نے توڑا۔ جو ایک ہی سنیما گھر میں چار سال دکھائی گئی تھی۔

ہدایت کاری: جہاں تک ہدایت کاری کا تعلق ہے آزادی سے پہلے کے ہدایت کار بھی آج جیسی فلمیں بنایا کرتے تھے اور ہدایت دینے کا انداز بھی کم وبیش یکساں تھا۔ لیکن اس زمانے کے اداکاروں ٹیکنیشینوں فلم سازوں اور ہدایت کاروں کے درمیان بے پناہ تال میل ہوتا تھا۔ باہمی محبت رواداری اوراحترام اس دور کا طرۂ امتیاز تھا۔ وقت کی پابندی سب پر لازم تھی۔ فنکار ماہانہ تنخواہ پر کام کرتے تھے۔ لیکن آج حالات یکسر بدل چکے ہیں۔ اب تو فلمساز اور ہدایت کار ایکٹروں اور ایکٹرسیوں کی اداؤں اور نخروں کے مرہون منت رہتے ہیں۔ آج جو اداکارہ یا اداکار فلم ساز اور ہدایت کار کو سب سے زیادہ تنگ

کرتا ہے۔ وہی کامیاب تصور کیا جاتا ہے۔ اداکار منہ مانگے دام وصول کرتے ہیں اور نخرے ادائیں الگ دکھائی جاتی ہیں۔ آزادی سے پہلے زیادہ تر شوٹنگ اسٹوڈیو میں ہوا کرتی تھی، اسٹوڈیو میں ہی جنگل یا جھیل کے سیٹ بنائے جاتے تھے اور شوٹنگ بھی فلور پر ہوتی تھی۔ بہت ہوا تو کوئی کوٹھی کرائے پر لے لی۔ لیکن آج زیادہ تر شوٹنگ آؤٹ ڈور ہوتی ہے اور کئی بار تو غیر ممالک میں شوٹنگ کی جاتی ہے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں یونٹ کو لے جانا تو معمولی سی بات بن گئی ہے۔

آزادی سے پہلے کے دور میں زیادہ تر توجہ کلوز اپ پر دی جاتی تھی۔ کبھی چہرے کا کلوز اپ تو کبھی آنکھ کا ہونٹوں کا کلوز اپ تو کبھی ماتھے کا۔ لانگ شاٹ اور مڈ شاٹ پر توجہ ضرورت کے مطابق ہی دی جاتی تھی ایک اداکار کے جتنے کلوز اپ ہوتے تھے وہ اتنا ہی کامیاب اداکار تصور کیا جاتا تھا۔ کانٹریکٹ میں کلوز اپ کی شرط ضرور ہوتی تھی جبکہ آزادی کے بعد اس جانب کم توجہ دی جاتی ہے۔ اب تو فطری شاٹس پر زیادہ دھیان دیا جاتا ہے آج کے زمانے میں کام کو اہمیت دی جاتی ہے۔ چہرے کو نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس زمانے میں سیدھے سادے انداز میں فلم بندی ہوا کرتی تھی۔ کیمرہ تکنیک پر زیادہ دھیان نہیں دیا جاتا تھا۔ اس دور میں نہ تو زوم تکنیک مروج تھی اور نہ ہی فریز شاٹ۔ البتہ سین کوڈیزلو رفنی انداز سے کیا جاتا تھا۔ آزادی کے بعد تو نئے نئے انداز کے کیمرے مارکیٹ میں آگئے ہیں جس سے کچھ فلم بندی کی تکنیک روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔

☆☆☆

سنیما ــــ کامیابیوں سے پُر ایک صدی

دیبو مجمدار

سنیما کی سائنس اور فن کو ساتواں فن قرار دیا گیا ہے۔ زندگی سے اس فن کا گہرا تعلق ہے۔ تفریح کے ذریعہ کے اعتبار سے سنیما بے مثل ہے۔ فلم سازی و فلم بینی کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ نئی صدی کی آمد پر سنیما میں بھی بعض تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ یہ حقیقت ہے کہ سنیما کی بالادستی ہمیشہ قائم رہے گی کیوں کہ کوئی اور ذریعہ زمان و مکان کی مختلف جہتوں کو اتنے موثر انداز میں پیش نہیں کرسکتا۔ کسی اور فن میں اتنے زیادہ لوگوں کو مختلف طریقوں سے شریک کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس میں آنکھیں، کان، ذہن، دل اور پیٹ کی بھوک سبھی شامل ہیں۔

حقیقت کی تلاش کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی سنیما کی۔ فرانس کے دو افراد لوئی لومیئر اور جارج میلیس نے جو متمول تاجروں کے بیٹے تھے فرانسیسی سنیما کی بنیاد رکھی۔ لومیئر نے پہلی مرتبہ پیرس میں ۲۸/دسمبر ۱۸۹۵ء کو پروجیکٹیڈ فلم دکھائی جس کے دیکھنے والوں نے فلم بینی کے لئے پیسہ ادا کیا تھا۔ اس سے بڑھکر کہ اس نے سنیما کو صنعت کے طور پر تصور کیا اور یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے کہ اس کی فلمیں سنیما میں حقیقت کی عکاسی کی اولین مثال تھیں۔

۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۵ء کے عرصہ میں لومیئر برادران نے لوئی کی ایجاد کو یورپ اور مغربی ممالک میں عام کیا۔ ان کا نمائندہ ۱۸۹۶ء میں ہندستان آیا۔ اس فلم کو صدی کا عجوبہ قرار دیا گیا۔ اور سب سے پہلے اہل بمبئی نے واٹسن ہوٹل میں فلم دیکھی۔ بعد میں یہ فلم نولٹی تھیٹر میں دکھائی گئی۔ ہمارے ملک میں جے ایف۔ مدن اور عبدالعلی یوسف علی نے ۱۹۰۲ء میں بایو اسکوپ سے فلموں کی نمائش شروع کی۔ ۱۸۹۶ء کے آخر تک چلتی پھرتی فلمیں مدراس اور کلکتہ میں بھی دکھائی گئیں۔

لوئی لومیئر کی ایجاد کو مستحکم بنیادوں پر ترقی دینے کا کام جورجیز میلیئر نے انجام دیا۔ لومیئر نے خود کو ڈاکومٹری فلموں تک محدود رکھا جبکہ میلیئر نے سنیما کو عوام سے قریب کیا۔ اس صدی کی ابتدا میں ہی اس نے ہالی ووڈ کے کلیدی کردار کی اہمیت کا احساس کیا۔ ڈیوڈ وارک گریفتھ نام کے ڈراما نگار نے ۱۹۰۷ء کے بعد فلم سازی کی رفتار میں اضافہ کیا۔

۱۹۱۳ء تک اس نے سنیما میں تکنیک کے مختلف تجربے کئے۔ گو اس نے کوئی ایجاد نہیں کیا مگر اس کے یہاں ڈرامائی شعور بہت گہرا تھا۔ اس کی فلمیں بہت مقبول ہوئیں۔ اس نے فلموں میں ایڈیٹنگ کی اہمیت کا بھی احساس کیا۔ اس کے ڈرامے، طریقے، جنگی فلمیں، انجیل پر مبنی رزمیے وغیرہ مقبول ہوئے۔ اٹلی کی فلموں کو ویڈیلس اور کیپر یا سے متاثر ہو کر اس نے خانہ جنگی پر فلم بنائی جس کا نام اس نے ''ایک قوم کی پیدائش'' رکھا۔ یہ فلم تھامسن ڈکسن کے فلموں اور خانہ جنگی کی کہانیوں پر مبنی تھی جو اس نے اپنے والد سے سنی تھیں۔ اس فلم پر کافی احتجاج ہوا کیوں کہ اس کا رجحان نیگرو مخالف تھا۔ رسالہ ''ٹائمز'' نے اسے ایک مکمل فلم قرار دیا تھا۔ گریفتھ نے سنیما کی سطح کو بلند کیا اور اسے ایک طاقتور ذریعہ اظہار بنایا۔

۱۹۰۸ء تک متعدد مقامات پر فلم کمپنیاں قائم ہوئیں۔ جیسے جیسے خاموش فلموں کا رواج کم ہوا اسٹوڈیو کا نظام شروع ہوا۔ ہالی ووڈ بڑے پیمانے پر فلموں کی فروخت کا مرکز بن گیا اور یورپ کے بہت سے ممالک کے لوگ ترکِ وطن کر کے یہاں آ گئے۔ کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۰ء کے درمیان ہالی ووڈ کی اہم شخصیات غیر امریکی تھیں۔ جرمنی کا کارلیملے فلموں میں آنے سے قبل کپڑوں کی تجارت کرتا تھا۔ ہنگری کا اڈیف ڈیکور فراسٹور میں صفائی کا کام کرتا تھا، پولینڈ کا سام گولڈون دستانے فروخت کرتا تھا۔ ہنگری کا ولیم فوکس بھی کپڑے کا کام کرتا تھا۔ اس طرح ہالی ووڈ میں مختلف مقامات سے تعلق رکھنے والے باصلاحیت افراد یکجا ہو گئے تھے۔

آخر میں ہم اس فن کے بارے میں ان شخصیات کی رائے پر بات کو ختم کریں گے جنہوں نے اس فن میں کمال حاصل کیا۔ چیپلین نے سنیما کو ایک ایسی دریافت قرار دیا تھا جو انسانیت کی نجات کا باعث بن سکتی تھی۔ سرگیئے اسیٹئین نے سنیما کو سائنس اور فن کا امتزاج قرار دیا تھا۔ فرٹز لینگ نے سنیما کو فنی بغاوت کا ذریعہ قرار دیا۔ اکیرا کروسوا کا خیال تھا کہ سنیما بنیادی طور پر سنیما ہے مگر اس میں ڈرامے، فلسفے، مصوّری، مجسمہ سازی اور موسیقی کی بھی خصوصیات موجود ہیں۔ غرض کہ سنیما مسلسل ارتقا پذیر ہے اور مستقبل میں بھی یہ وسیع امکانات کا حامل ہے۔

ماخوذ از۔ مغربی بنگال۔ مدیر۔ مصطفیٰ اکبر

☆☆☆

ہندوستانی سنیما کی اوّلیت

سبیر گھوش

ہندوستانی سنیما کی جڑیں اتنی ہی پرانی ہیں جتنا کہ خود سنیما۔ پیرس میں آٹھ ماہ تک طوفانی کامیابی کے بعد لومیئے برادرز کا سنیما ٹوگراف ہندوستان کے ساحلوں پر اُتر آیا۔ ۷ جولائی ۱۸۹۶ء کو اخبار ٹائمز آف انڈیا میں ''صدی کے عجوبے'' اور ''دنیا کی حیرت انگیز شئے'' کی ہندوستان میں آمد کا اشتہار شائع ہوا۔ بمبئی (اب ممبئی) کے واٹسن ہوٹل میں اُس تاریخی شام کو چار فلم اسکریننگ ہوئیں۔ داخلے کا ٹکٹ ایک روپیہ تھا۔ اس شو کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی، جسکے بعد متحرک تصویریں سال کے آخر میں کلکتہ، اور پھر مدراس (اب چینّائی) پہنچ گئیں۔

اس واقع کے دو سال بعد میڈ موائزل بلانشے کے تعاون سے پروفیسر اینڈرسن نے چرچ گیٹ اسٹیشن پر ایک ٹرین کی آمد اور پونا کی گھوڑ دوڑ فلمائیں جنہیں انہوں نے اپنے شو کے کرسمس ایڈیشن میں شامل کیا۔ جس کا نام Andersonosopograph تھا۔ تقریباً اُسی وقت اس نئے وسیلے کی شہرت نے پروفیسر سٹیون سن کے ہاتھوں اظہار پایا جنہوں نے گل ایران سے رقص کے منظر ہندوستانی مناظر اور جلوسوں کا ایک پینوراما (Panorama) فلمایا۔

پہلا ہندوستانی فلم ساز سکھا رام بھاٹاویدکر تھا (جنہیں Save Dada کے نام سے جانا جاتا تھا)۔ بھاٹاویدکر کے پاس ایک پروجیکٹر تھا، انہوں نے برطانیہ سے ایک کیمرہ درآمد کیا اور ۱۸۹۹ء میں دو مختصر فلمیں بنائیں، یعنی پہلوان، اور آدمی اور بندر۔ چار سال بعد انہوں نے آنے والی نسلوں کے لئے کلکتہ میں ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی کا واقعہ فلمایا۔ اس سلسلے میں راہ ہموار کرنے والی کوشش ۱۹۰۰ء میں ایف۔ بی تھانہ والا نے کی اور انکی شاندار Kinetoscope نیوز ریلوں نے اس کے ایک کاروباری اکائی بننے کے امکانات قائم کر دئے۔

۱۹۰۵ء کے آس پاس کلکتہ میں ہی مقیم جمشید جی فرام جی مدان نے فلموں کی تقسیم اور نمائش کا ایک جال قائم کر کے اس ایک نوخیز صنعت کی تخم ریزی کر دی۔ مدان نے ۱۹۰۲ء میں ہی خیموں کے اندر پابندی کے ساتھ فلمی شو کرنے شروع کر دئے تھے۔ پہلا مستقل سنیما گھر قائم کرنے کا سہرا بھی مدان کے

ہی سر ہے جس کا نام ایلفنسٹون پکچر پلیس (۱۹۰۷ء) تھا، آج کل اس کا نام چیلپن ہے۔ پہلی ڈرامائی فلم بنانے کی کوشش برطانوی تکنیکی شراکت سے آر۔ جی ٹورا اور این جی چترانے کی، جس کے نتیجے میں پُنڈلک نام کی فلم جو مہاراشٹر کے اسی نام کے ایک سنت پر مبنی تھی، ۱۸ مئی ۱۹۱۲ء میں کارونیشن تھیٹر بمبئی میں ریلیز ہوئی۔ یہ فلم ایک ڈبل پروگرام کے ایک حصے کے طور پر دکھائی گئی۔ پہلے حصے کا نام تھا ایک مرے ہوئے آدمی کا بچہ۔ جب تک فلم چلی ہاؤس فلم رہا۔

اس وقت دھونڈی راج گووندھا پھالکے (جنہیں دادا صاحب پھالکے کہا جاتا ہے) نے اپنی بیمہ پالیسی گروی رکھ کر تکنیکی معلومات اور ساز وسامان کی تلاش میں لندن کا رخ کیا، جہاں برٹش بائسکوپ نامی ہفت روز جریدے کے ایڈیٹر کابور نے صحیح ساز وسامان کی خریداری میں انکی مدد کی۔ ۱۹۱۱ء میں دادا صاحب پھالکے نے لائف آف کرائسٹ نامی فلم دیکھی تھی، وہ انگلینڈ سے واپس لوٹے اور دیکھی ہوئی فلم سے متاثر ہو کر انہوں نے دھارمک فلمیں بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے کی پہلی فلم راجہ ہریش چندر تھی جو ہندوستان کی سب سے پہلی مکمل فیچر فلم تھی۔ یہ فلم سب سے پہلے ۲۱/اپریل ۱۹۱۳ء کو منتخبہ مدعو سامعین کو دکھائی گئی جس کے بعد اسی سال اسے تین مئی کو بمبئی کے کارونیشن تھیٹر میں نمائش کے لئے پیش کر دیا گیا۔ جہاں یہ ۲۳ دنوں تک چلتی رہی۔ پھالکے کی لنکا دہن (۱۹۱۷ء) ہندوستان کی پہلی باکس آفس ہٹ بنی۔ ہندوستانی سنیما کو پھالکے کی دین کا اعتراف ۱۹۶۶ء میں پوری زندگی کی کارکردگی کے اعتراف کے طور پر دادا صاحب پھالکے ایوارڈ قائم کر کے کیا گیا ہے۔

نٹراج مُدالیار کی فلم کیچک ودھن (۱۹۱۶ء) جو پہلی خاموش فیچر فلم تھی کے ذریعے جنوبی ہند میں بھی فلم سازی کا جنم ہو گیا۔ بنگال بھی جاگ اُٹھا اور یہاں الفنسٹون کمپنی کے ذریعے رستم جی دوتی والا کی ڈائرکشن میں پہلی فلم بِلوا منگل بنی۔ کلکتہ میں اس سے پہلے ستیہ وادی ہریش چندر (۱۹۱۷ء) نام کی فلم بنائی جا رہی تھی، لیکن یہ بنگالی فلم نہیں تھی۔ اس کے بعد زیادہ سے زیادہ لوگوں نے فلم سازی شروع کی۔ ان میں ایس این پٹانکر نے چار حصوں میں رام ون داس (۱۹۱۸ء) تیار کی جو پہلا ہندوستانی سیریل تھا۔ فلم سازی کی اس تحریک کے نتیجے میں ۱۹۲۰ء میں بنگالی زبان کے فلمی ہفتہ وار بجولی کا اجرا ہوا۔ اس کے ایڈیٹر ممتاز ادبی شخصیتیں تھیں۔ اردشیر ایرانی کی فلم نل ومنیتی (۱۹۲۰ء) غیر ملکی اشتراک (اٹلی کے ساتھ) سے بنی پہلی ہندوستانی فلم تھی۔

دو اور ممتاز فلم ساز تھے بابوراؤ پینٹر اور سچیت سنگھ۔ سچیت پہلے ڈائریکٹر تھے جنہوں نے ایک غیر ملکی آرٹسٹ سے کام لیا۔ یہ تھیں ڈوروتھی کنگڈم اور فلم تھی شکنتلا (۱۹۲۰ء)۔ انہوں نے اسی سال لوکمانیہ تلک کے کریا کرم کو بھی فلمایا جو پہلی بصری نیوز ریل تھی۔ دوسری جانب پینٹر کی سوکاری پاش (۱۹۲۵ء) مہاجنوں کے استحصال کے شکار ایک کسان کی کہانی کا پہلا حقیقت پسندانہ تجربہ تھا۔

کسی ہندوستانی فلم کی بین الاقوامی سطح پر پہلی بار ستائش ۱۹۲۶ء میں فلم پریم سنیاس لائیٹ آف ایشیا (۱۹۲۵ء) کے لئے کی گئی جو گوتم بدھ کی حیات پر مبنی تھی۔ فلم انڈو جرمن اشتراک سے بنی اور اس کے ڈائریکٹر فرانز اوسٹین تھے۔ یہ فلم لندن میں لگاتار نو ماہ تک چلتی رہی۔ فاطمہ بیگم شاید پہلی ہندوستانی خاتون پروڈیوسر تھیں جنہوں نے ۱۹۲۵ء میں بلبلِ پرستان نامی بنا کر فلم سازی کا آغاز کیا۔ یہ فلم ۱۹۲۶ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

یہاں پہنچنے تک سنیما نے آواز بھی پالی تھی۔ ہندوستان میں دکھائی جانے والی پہلی متکلم فلم یونیورسل کی بنائی ہوئی ایک عشقیہ فلم تھی، جو الفینسٹائن پکچر پیلیس میں ۱۹۲۹ء میں دکھائی گئی۔ مدن نے ایک ریل کے متکلم فلم بنائی جو ۱۹۳۱ء میں ریلیز ہوئی۔ ہندوستان کی متکلم فلم عالم آرا اندرون ملک بنی پہلی مکمل فلم تھی۔ اسے امپریل فلم کمپنی نے بنایا اور اردشیر ایرانی نے ڈائریکٹ کیا۔ فلم میں سات گانے تھے اور ۱۴ مئی کو ۱۹۳۱ء میں بمبئی کے میجسٹک سنیما میں ریلیز ہوئی تھی۔

پہلی متکلم فلم کے ساتھ اُسی سال تین علاقائی زبانوں، بنگالی، تامل اور تیلگو میں بولتی فلمیں بنیں۔ بنگالی فلم جمائی ساستھی، امر چودھری کی ڈائریکٹ کی ہوئی ایک مزیدار کامیڈی تھی۔ تامل زبان کی فلم کالیداس تھی جسے اردشیر ایرانی کی امپریل کمپنی نے بنایا تھا جبکہ تیلگو فلم بھگت پر ہلاد کو ایچ۔ ایم۔ ریڈی نے بھارت مووی ٹون کے لئے تیار کیا تھا۔ پہلی مراٹھی فلم ایودھیا چا راجہ، وی شانتا رام نے بنائی اور گجراتی فلم نرسنگھ مہتہ جسے نانو بھائی وکیل نے بنایا تھا ایک سال بعد آئی۔ اُڑیہ فلم سیتا بیاہ ۱۹۳۴ء میں موہن اندر دیو گوسوامی نے بنائی۔ اس کے ایک سال بعد پنجابی فلم شیلا اور آسامی جوئے ماتی جیوتی پرساد اگروالا نے بنائی۔ جینتی ٹاکیز کی کنٹر زبان کی بھگت دھروا ایک سال بعد اور ایس نوتانی کی ملیالم فلم بلن مزید تین سال بعد بنی۔ فلموں میں پس منظر کی موسیقی پہلی بار دیو کی بوس نے فلم چنڈی داس (۱۹۳۲ء) میں دی۔ یہ بنگالی میں اسٹیج انداز کی ایک اہم سنیمائی توثیق تھی۔ نیم داستانی، سوانحی، سٹنٹ فلم طرز کی ہندی سنیما کی پہلی بڑی کامیاب فلم طوفان میل (۱۹۳۴ء) تھی

اور ہنٹر والی (۱۹۳۵ء) اس طرز کی دوسری سب سے بڑی فلم تھی۔ ہندی کے علاوہ انگریزی میں بھی امپیریل کی بنی فلم نورجہاں تھی اور انگریزی میں پوری فلم کرما (۱۹۳۳ء) تھی جس کی شوٹنگ انگلینڈ میں ہوئی اور جس میں روایتی میاں بیوی کے جوڑے ہمانشورائے اور دیویکارانی نے کام کیا تھا۔ پوری طرح اندرون ملک بننے والی فلم راج نرتکی (۱۹۴۱ء) تھی، جسے جے۔ بی۔ ایچ واڈیا نے بنایا تھا۔ وینس فلم فیسٹول میں بھیجی گئی فلم سیتا پہلی فلم تھی جس نے ایک بین الاقوامی انعام حاصل کیا۔

پلے بیک گانے کا طریقہ جو اصل دھارے کے کاروبار کی سنیما کا ہمیشہ کے لئے ایک حصہ بن گیا پہلی بار نیوتھیٹرس نے ہندی فلم دھوپ چھاؤں (۱۹۳۵ء) اور بنگالی فلم بھاگیہ چکر (۱۹۳۵ء) سے شروع کیا۔ گانوں کے بغیر فلم جے۔ بی۔ ایچ واڈیا کی فلم نوجوان (۱۹۳۷ء) تھی۔ پہلی animation فلم لفنگا لنگور (۱۹۳۵ء) Bocho GUtachwager نام کے ایک جرمن فوٹوگرافر نے پروڈیوس کی۔

پربھات کی فلم سنت تکارام کو وینس کے پانچویں فلم فیسٹیول (۱۹۳۷ء) میں سپیشل جیوری mention حاصل ہوئی۔ اسی دوران چنتامنی نام کی تامل فلم ایک ہی سنیما گھر میں لگاتار ایک سال تک چلتی رہی۔ موتی گڈوانی کی فلم کسان کنیا (۱۹۳۷ء) اندرون ملک بنی پہلی رنگین فلم تھی، لیکن تکنیکی وجوہات کی بنا پر بلوا منگل اور شانتارام کی سیرن دھری (۱۹۳۳ء) رنگین فلموں کا درجہ نہ پا سکیں۔

۱۹۴۶ء کا سال خصوصیت کا حامل تھا کہ اس میں انڈین پیوپلز تھیٹر ایسوسی ایشن کے لئے خواجہ احمد عباس نے دھرتی کے لال فلم بنائی جس میں حقیقت پسندانہ انداز میں ۱۹۴۳ء کے انسان کے ذریعے پیدا کئے گئے قحط میں پھنسے ہوئے ایک کسان کنبے کو پیش کیا گیا تھا۔ احمد عباس کے لکھے ہوئے سکرپٹ پر مبنی چیتن آنند کی فلم نیچا نگر کی کنیز میں توصیف کی گئی۔ یہ لوگوں کی توقعات اور امیروں کے انہیں تسلیم نہ کرنے کے عزم کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کی ایک تمثیلی کہانی تھی۔ ایک بار پھر احمد عباس کی کہانی And one did not come back پر مبنی ایک فلم ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی شانتارام کی ڈائریکشن میں بنی۔ فلم کی کہانی اُس میڈیکل ٹیم کے بارے میں ہے، جسے جواہر لال نہرو نے ماوزے تنگ کی آٹھویں آرمی کے زخمیوں کے علاج کے لئے ہندوستان سے چین بھیجا تھا۔

۱۹۴۶ء کا ایک اور اہم واقعہ، بنگالی سنیما میں ایک نئے نظام کا آغاز تھا۔ تکنیکی ماہرین کے ایک گروپ

نے اجتماعی طور پر فلم ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ اگردوت اشتراک میں ابتدا میں کیمرہ مین بوت لاہا، ساونڈ ریکارڈسٹ جتن دتہ، تمثیل کے ماہر نتائی بھٹاچاریہ اور پروڈیوسر بمل گھوش شامل تھے۔ اگرچہ انہوں نے آغاز سوپن سادھنا (۱۹۴۷ء) سے کیا لیکن بعد میں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء کی دہائی تک تجارتی طور پر جذباتی سوشل فلموں کا ایک سلسلہ پروڈیوس کیا۔

اسی دوران بمبئی ٹاکیز کی فلم قسمت نے کلکتہ کے ایک واحد تھیٹر امپائر سنیما (اب راکسی) میں لگاتار ۱۸۷ ہفتوں تک چلتے رہ کر ایک ریکارڈ قائم کیا۔ ایک اور بے مثال فلم رقص کے ماہر اودے شنکر کی کلپنا (۱۹۴۸ء) تھی جس میں شاندار بیلے رقصوں کا ایک سلسلہ تھا۔ غیر معمولی خصوصیات کی حامل ہونے کی وجہ سے اسے بیلجیم میں دوسرے عالمی فلم فیسٹیول میں انعام دیا گیا۔

اس کے ساتھ ہی کے۔ اے عباس نے سماجی اہمیت کی فلمیں بنانا جاری رکھا۔ منّا (۱۹۵۹ء) دوسری فلم تھی جس میں رقص اور گانے نہیں تھے۔ یہ ایک بچے کی کہانی تھی جسے اس کے والدین سے جدا کر دیا گیا تھا۔ بعد میں بمبئی میں بننے والی اصل دھارے کی فلموں کے لئے یہ ایک تیار فارمولا بن گئی۔ محبوب خان نے بھی سماجی اہمیت کی فلمیں بنائیں۔ ۱۹۴۰ء میں بننے والی فلم عورت کو ۱۹۵۷ء میں دوبارہ رنگین بنایا گیا۔ یہ پہلی ہندوستانی فلم تھی جسے بہترین غیر انگریزی فلم کے زمرے میں آسکر کے لئے نامزد کیا گیا۔ سہراب مودی نے پہلی ٹیکنی کلر فلم جھانسی کی رانی (۱۹۵۳ء) میں بنائی۔ سب سے زیادہ تہلکہ مچا دینے والی فلموں میں سے ایک اور فلم تھی کے آصف کی مغل اعظم جو ایک تاریخی رومانس پر مبنی تھی۔

گورودت نے ۱۹۵۹ء میں پہلی ہندوستانی سنیما اسکوپ فلم کاغذ کے پھول بنائی۔ اسی سال وی شانتارام کی فلم دو آنکھیں بارہ ہاتھ نے ہالی ووڈ فااین پریس ایسوسی ایشن، اور بہترین غیر ملکی فلم کا سیموئیل گولڈون ایوارڈ جیتے۔

عام فلمی ڈگر سے ہٹ کر فلم بنانے کی پہلی کوشش سنیمائی گھوش کی فلم بنگالی کلاسک چنا مول (۱۹۵۰ء) تھی۔ جسے P.T.A کے آرٹسٹوں کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ اس سلسلے کی عہد آفریں فلم پانچ سال بعد آئی یعنی ستیہ جیت رے کی پاتھر پنچالی جس نے ہندوستانی سنیما کو ایک نئے معنی اور ہیئت عطا کی۔ اس فلم کو نویں کینز فلم فیسٹول میں بہترین انسانی دستاویز کا Bronze دیا گیا۔ عالمی طور پر تسلیم شدہ فلم نقاد اسے دیکھ کر

حیران رہ گئے۔اسی فلم کو ۱۹۵۶ء کی بہترین فلم کا صدر جمہوریہ کا گولڈ میڈل بھی دیا گیا۔اس شاہکار کو ایڈن برا، منیلا، سان فرانسسکو، وینکوور اسٹراٹ فورڈ اور نیویارک میں بھی انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا۔ بلکہ آج تک یہ بہترین مرصّع فلم مانی جاتی ہے۔رے ایک کثیر پہلو غیر معمولی ذہین شخصیت تھے جنہوں نے عالمی سنیما میں ہندوستان کے لئے ایک مقام بنایا، اور جو ملک کے باہر ملک کے انتہائی جانے پہچانے فلم ساز ہیں۔۱۹۹۲ء میں ان کے انتقال سے پہلے انہیں پوری زندگی کے کارہائے نمایاں کے اعتراف کے طور پر آسکر ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔رے نے کل ملا کر ۳۲ فلمیں بنائیں جو سب کی سب بنگال کے مشہور فرزند رابندر ناتھ ٹیگور کی کہانیوں پر مبنی تھیں۔

اگرچہ رے نے اصل دھارے کے بیانیہ سنیما سے رخصتی کا میدان ہموار کر دیا تھا تاہم مرنال سین کی فلم بھوون شوم (۱۹۶۹ء) سے حقیقی نئے ہندی سنیما کا جنم ہوا۔

دوسری جانب رِت وِک گھٹک اس گروہ کے پہلے فرد تھے جنہوں نے اپنی انتہائی توصیف شدہ تثلیثی فلموں میگھے ڈھاکا تارا (۱۹۶۰ء) کومل گندھار اور سوبارن ریکھا میں موجدانہ انداز میں ہندو دیومالا کی علامات کو استعمال کیا۔یہ تینوں فلمیں لگاتار تین برسوں میں تیار کی گئیں۔

رے کو چھوڑ کر ہندوستان کو حاصل ہونے والے دونوں آسکر ایوارڈ برطانوی فلموں کے حصے میں آئے پہلی فلم رچرڈ اٹین برو کی گاندھی (۱۹۸۲ء) تھی جس کے ملبوسات کے لئے بھانو اتھائیا نے یہ اعزاز حاصل کیا، اور دوسری شیکھر کپور کی ایلز بیتھ (۱۹۹۹ء) جسے بہترین میک اپ کے لئے آسکر ملا۔

(ماخوذ از۔مغربی بنگال۔مدیر مصطفیٰ اکبر)

☆☆☆

خاموش تصویریں بول پڑیں

آج سے پورے ۷۵ رسال قبل ۱۴ رمارچ ۱۹۳۱ء کا دن ہندوستانی فلم کا وہ تاریخ ساز دن تھا جب پردہ سیمیں پر پہلی بار آواز کا جادو سر چڑھ کر بولا، اچانک تصویریں بول پڑیں تھیں۔یہ موقع تھا جب ہدایت کار اردشیر ایرانی کی فلم 'عالم آرا' ممبئی کے میجسٹک سنیما ہال میں ریلیز ہوئی تھی۔ہندوستان میں بننے والی اس پہلی متکلم فلم نے جہاں ایک نئی تاریخ بنا ڈالی وہیں خاموش فلموں کے دور کے خاتمے کا اعلان بھی ثابت ہوئی۔

حالانکہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں گویا فلموں کا دور 'ڈان جوآن' ۱۹۲۶ء اور 'لائٹ آف نیویارک' (۱۹۲۸ء) کی نمائش کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا لیکن اردو۔ہندی میں بنی اس فلم 'عالم آرا' کی نمائش کے ساتھ ہی ہندوستانی سنیما میں شروع ہوا۔پلے بیک گائکی اور پلے بیک موسیقی کا ایک ایسا دور جو آج تک ہندوستانی فلم کی جان اور بین الاقوامی سطح پر اس کی پہچان بنا ہوا ہے۔ہندوستان کی مقبول ترین فلم 'شعلے' میں نابینا امام صاحب کا یادگار کردار نبھانے والے اداکار اے۔کے ہنگل نے ایک خبر رساں ایجنسی (آئی این ایس) سے ایک انٹرویو میں کہا کہ جب 'عالم آرا' ریلیز ہوئی اس وقت میری عمر ۱۸۔۱۰ رہی ہوگی، میں نے اس فلم کو پیشاور میں دیکھا تھا۔عالم آرا کو یاد کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ آج کے مقابلے میں اس فلم کی آواز اور ایڈیٹنگ بہت خراب تھی تاہم اس فلم کو دیکھ کر ہم لوگ دنگ رہ گئے تھے۔فلم عالم آرا کے پروڈیوسر اور ہدایت کار اردیشر ایرانی نے اس فلم کے بنانے میں آئی دشواریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا کہ اس زمانے میں ہمارے پاس کوئی ساؤنڈ پروف اسٹیج نہیں تھا اور چونکہ ہمارا اسٹوڈیو ایک ریلوے لائن کے قریب تھا اس لئے زیادہ تر شوٹنگ رات میں کی گئی یا اس وقت کی گئی جب ریل گاڑی کی آمد و رفت کم ہوا کرتی تھی۔ہم لوگوں کے پاس ایک ہی ریکارڈنگ سسٹم تمر تھا۔جس سے ساری ریکارڈنگ کی گئی تھی، کوئی بوم بھی نہیں تھا اس لئے مائکروفون کو کیمرے کی حدود سے باہر عجب۔عجب جگہ چھپا کر رکھنا پڑتا تھا۔

بہرحال ان ساری دشواریوں کے بعد بننے والی فلم عالم آرا نے ایک ایسے دور کا آغاز کیا جس کے بعد ہندوستانی سنیما نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

عالم آرا کی لازوال کامیابی کے پیش نظر گویائی کے پروڈکشن کی ایک دوڑ شروع ہوگئی اور اس کے تین ہفتوں بعد ہی ایک اردو فلم 'شیریں فرہاد' ریلیز ہوئی جس میں 'عالم آرا' کے مقابلے تین گنے زیادہ نغمے جہاں آرا کجن اور ماسٹر نثار کی پختہ آوازوں میں شامل تھے' اس کے نغمے آر سی اے فوٹوفون پر ریکارڈ کئے گئے تھے۔ یہ فلم مزید کامیابیوں سے ہمکنار ہوئی۔ اسی سال 'جمائی سشٹی' (بنگالی) زبانوں میں ریلیز ہوئیں۔ گذشتہ پچھتر برسوں میں ہندوستانی سنیما نے کافی مقبولیت حاصل کی ہے اور فنّی اور تکنیکی اعتبار سے کافی کامیابی بھی حاصل کی ہے۔ آج ہندوستان میں کل ملا کر ہر سال تقریباً ایک ہزار چھوٹی بڑی فلمیں بنتی ہیں جو کہ تعداد کے اعتبار سے سب سے زیادہ اور امریکہ میں بننے والی فلموں کا دوگنا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس صنعت میں ساٹھ کھرب روپے کا سالانہ کاروبار ہوتا ہے اور اس سے لگ بھگ ساٹھ لاکھ لوگ جڑے ہوئے ہیں۔ نیشنل فلم آرکائیوز، پونا کے ایک افسر کے مطابق 'عالم آرا' کے بعد سے ملک میں تیس پینتیس ہزار فلمیں بن چکی ہیں۔ اگر ان میں پاکستان اور بنگلہ دیش میں بننے والی فلموں کو بھی شامل کرلیا جائے تو یہ تعداد کہیں زیادہ ہو جائے گی۔ ۱۹۴۹ء میں فلم 'اجیت' بنی جس کی شوٹنگ ۱۶/ایم ایم کے کوڈاکروم پر ہوئی اور اسے ۳۵ ایم ایم پر دکھایا گیا۔ یہ اس طرح کا پہلا تجربہ تھا۔ ۱۹۵۲ء میں شہنشاہ جذبات دلیپ کمار کی اداکاری سے مزین فلم 'آن' آئی جو کہ ہندوستان کی پہلی رنگین فلم تھی اور اس کے بعد شروع ہوا رنگین فلموں کا دور۔ اس سال 'جھانسی کی رانی' کی بھی نمائش کی گئی۔ یہ بھی رنگین تھی۔ ۱۹۵۹ء میں مشہور اداکار پروڈیوسر اور ہدایت کار گرودتّ نے بھارت کی پہلی سنیما اسکوپ فلم 'کاغذ کے پھول' بنائی۔ ۱۹۶۵ء میں بنی فلم 'اراؤنڈ دی ورلڈ' بھارت کی پہلی ۷۰/ایم ایم فلم تھی۔ ۱۹۷۵ء میں آنے والی فلم 'شعلے' اسٹیریوفونک ساؤنڈ کے ساتھ ۷۰/ایم ایم پر بننے والی پہلی فلم تھی۔ اس فلم نے باکس آفس پر کامیابی کا نیا ریکارڈ کیا جسے ۱۹۹۴ء میں بنی فلم 'ہم آپ کے ہیں کون' نے توڑ دیا۔

(بشکریہ روزنامہ اخبارِ مشرق کلکتہ)

☆☆☆

ہندستانی فلمی صنعت میں مُسلمانوں کا حصّہ

عطاءاللہ خان

پرانی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے فن فلمسازی میں ''ہالی ووڈ'' کے بعد ''بالی ووڈ'' یعنی بمبئی فلم نگری آج بھی دوسرے مقام پر ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ہندستان میں بننے ولی فلموں نے عالمی سطح پر برق رفتار فلم سازی سے فلموں کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

۱۹۱۲ء تا ۱۹۹۲ء یعنی ۸۰ سالہ عرصے میں ہندوستان میں کل ۱۴۹۰۳ فلمیں منظر عام پر آئیں (جن میں ۱۲۷۹ خاموش فلمیں بھی شامل ہیں (جو اپنے آپ میں ایک عالمی ریکارڈ ہے۔

اس مضمون کے ذریعہ ہم نے فلموں کے ۸۰ سالہ دور میں جھانک کر یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ فلموں کی اس زبردست کامیابی میں مسلم فنکاروں کا کتنا حصّہ ہے۔

فلمی جریدوں اور اخبارات کے مطابق ہندوستان کی پہلی خاموش (گونگی فلم) راجا ہریش چندر تھی جو سنڈھرسٹ روڈ بمبئی میں واقع کورونیشن تھیٹر میں ۳/مئی ۱۹۱۳ء کو نمائش کے لئے پیش کی گئی تھی جب کہ راجہ ہریش چندر سے ٹھیک ایک سال قبل ۱۹۱۲ء میں بنی فلم ''پنڈلک'' ہندوستان کی پہلی خاموش فلم تھی جسے کورونیشن تھیٹر ہی میں پیش کیا گیا تھا، اس فلم کا تذکرہ کہیں نہیں ملتا۔

پھالکے اینڈ کمپنی کے بینر تلے داداصاحب پھالکے کی ہدایت میں بنی فلم ''راجا ہریش چندر'' ۲۳ دنوں تک مذکورہ بالا سنیما گھر میں عوام سے داد تحسین حاصل کرتی رہی اور اس طرح اسٹیج سے اٹھ کر سلولائٹ کے پردے پر چلتی پھرتی تصویروں کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا۔

۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۰ء تک ۷/سال میں صرف ۲۳ فلمیں ہی بن سکیں جن میں ایک فلم تھی ''کرشن سداما'' کوہ نور پکچرس کے بینر تلے ۱۹۲۰ء میں بنی اس فلم میں مرکزی کردار نبھانے والے فنکار کا نام خلیل تھا اور شاید خلیل ہی وہ پہلا مسلم فنکار تھا جس نے آج سے ٹھیک ۷۵ سال قبل سب سے پہلے فلمی دنیا میں قدم رکھا تھا۔

۱۹۲۰ء کے بعد فلمسازی کی صنعت میں رفتاری آئی اور یکے بعد دیگرے کئی فلمیں منظر عام پر آنے لگیں۔ ان فلموں میں نئے چہروں کو اداکاری کے مواقع فراہم کئے گئے جن کی اکثریت مسلم

فنکاروں کی تھی۔ خاموش فلموں کے دور میں سب سے پہلے فلم سازی کا کریڈٹ اگر کسی خاتون کو جاتا ہے تو وہ تھیں فاطمہ بیگم۔ فاطمہ بیگم نے جو خود فاطمہ فلم کارپوریشن کی روح رواں بھی تھیں۔ ۱۹۶۲ء میں انہوں نے زبیدہ سلطانہ اور شہزادی کے ساتھ اداکاری کے جوہر بھی دکھائے تھے اس طرح خواتین میں فلمسازی کا سہرا فاطمہ بیگم کے سر بندھتا ہے۔

خاموش فلموں کا دور ۱۹۱۳ء سے ۱۹۳۴ء تک جاری رہا لیکن اس دوران ۱۹۳۱ء میں اردشیر ایرانی کی پہلی بولتی فلم عالم آرا منظر عام پر آئی جس میں ایک مسلم فنکارہ زبیدہ (جو زبیدہ دھنراج گیر کے نام سے مشہور ہوئیں) نے مرکزی کردار نبھایا تھا۔ اس طرح فلم سازی کے ساتھ پہلی بولتی فلم کی ہیروئن ہونے کا شرف بھی ایک مسلم فنکارہ ہی کو حاصل ہوا۔

فلم ''عالم آرا'' ۱۴/مارچ ۱۹۳۱ء کو بمبئی کے میجسٹک سنیما میں نمائش کے لئے پیش کی گئی تھی جس نے نہ صرف کرداروں کو آواز بخشی بلکہ فلمی نغموں کی ابتداء بھی اسی فلم سے ہوئی۔ اور ہندستانی فلموں کا سب سے پہلا نغمہ مسلم گلوکار ڈبلیوایم خان کی آواز میں صدابند ہوا۔

اس نغمے کے بول تھے:

دے دے خدا کے نام پہ پیارے
طاقت ہے گر دینے کی دے دے

فلم عالم آرا کے بعد اسی سال دوسری ریلیز ہونے والی فلم تھی ''ابوحسن'' ساگر فلم کارپوریشن کے توسط سے بنی اس فلم میں ہادی خاتون اور شہزادی نے مرکزی کردار نبھائے تھے۔ اس طرح مسلم فنکار اولین بولتی فلم عالم آرا سے ہی فلمی صنعت کی خدمات انجام دیتی رہی ہیں۔

جس طرح خواتین میں فلمسازی کی ابتداء فاطمہ بیگم سے ہوئی بالکل اسی طرح جدن بائی (اداکارہ نرگس کی والدہ فلمی دنیا کی پہلی خاتون موسیقار کہلائیں)۔ جنھوں نے ۱۹۳۵ء میں بنی فلم ''تلاش حق'' کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ ویسے جدن بائی کے دور میں ایک اور مسلم خاتون نے بھی فلموں میں موسیقی ترتیب دی تھی جنہیں کجن کے نام سے جانا جاتا ہے ان کا اصلی نام جہاں آراء تھا جہاں آرا کجن نے ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۵ء ان گنت فلموں میں گلوکاری کے فرائض بھی انجام دیئے جہاں انہیں شعبۂ موسیقی سے زیادہ

بحیثیت گلوکارہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی گلوکارہ جہاں آراء کجن اور ماسٹر نثار کے ناموں کے ساتھ ایک عالمی ریکارڈ بھی منسوب ہے مندرجہ بالا فنکاروں نے مدن تھیٹر کی فلم'' اندر سبھا'' میں کل ۷۱ نغمے گائے تھے جو ۱۹۳۲ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

۱۹۳۱ء میں جن مسلم فنکاروں نے شعبۂ اداکاری کے ذریعہ فلمی دنیا کی خدمات انجام دیں ان میں خلیل ماسٹر نثار، ڈبلیوایم خان، جلو، جہاں آرا کجن، زبیدہ، زیب النساء، یعقوب، محبوب خان فلم مدرانڈیا کے خالق محبوب خان اوران کی بیوی سردار اختر کے نام قابل ذکر ہیں۔

مسلم فنکار فلموں میں نہ صرف اداکاری اور فلمسازی کے شعبوں سے وابستہ رہے بلکہ انہوں نے ایک وقت نغمہ نگاری، موسیقی اور گلوکاری کے فن کو بھی جلا بخشی اور اپنے فن کو فلموں کے ذریعہ ملک کے گوشے گوشے تک پہنچایا۔

فن گلوکاری میں ڈبلیوایم خان، ماسٹر نثار، خاں مستانہ جی ایم درانی، طلعت محمود، محمد رفیع، انور، شبیر کماراور محمد عزیز کے نام کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ایک طرف طلعت محمود نے اپنی منفرد اور نقرئی آواز سے عوام کے دلوں کو موہ لیا تو دوسری جانب محمد رفیع کی سحرانگیز آواز نے پورے ملک میں دھوم مچادی۔ ہائی پچ کے گیتوں میں محمد رفیع نے بقیہ تمام گلوکاروں کو پیچھے چھوڑ دیا رفیع صاحب نے فن گائیکی نئے طرز اور لفظوں کی ادائیگی کو ایسے انداز بھی دیئے جو اپنی مثال آپ ہیں۔

رفیع صاحب کے نغموں کو سن کر بہ آسانی بتایا جاسکتا ہے کہ یہ نغمہ کس اداکار پر فلمایا گیا ہوگا۔ یہ ملکہ فلمی دنیا کے کسی اور گلوکار کو حاصل نہ تھا۔

بالکل اسی طرح خواتین میں جہاں آرا کجن خورشید، امیر بائی کرناٹکی، زہرہ بائی امبالے والی بیگم اختر فیض آبادی، نورجہاں، ثریا شمشاد بیگم اور مبارک بیگم جیسی جادوئی آوازیں مسلم گھرانوں ہی سے فلمی دنیا میں آئی تھیں نورجہاں جنہیں آج بھی ملکۂ ترنم کے نام سے جانا جاتا ہے گلوکاری کے ساتھ ساتھ اداکاری میں بھی بے مثال ثابت ہوئی ہیں، نورجہاں اور ثریا کے بعد آج تک فلمی دنیا کو ایسی ہیروئن نہ مل سکی جو بیک وقت دونوں شعبوں میں یکساں مقبول ہو یعنی اداکاری میں بھی یکتا اور گلوکاری میں بھی منفرد۔

ہندستان کی مشہور و معروف مغنیہ لتا منگیشکر بھی فن گائیکی کے ابتدائی دنوں میں ملکۂ ترنم نورجہاں

کی نقل کیا کرتی تھیں۔فلم ''رتن'' اور انمول گھڑی کے نغمے آج بھی عوام میں پہلے دن کی طرح مقبول ہیں اور نئے نغموں پر سبقت رکھتے ہیں۔

امیر بائی کرناٹکی اور زہرہ بائی امبالے والی کی دل سوز آواز ۵۵ سال کا طویل عرصہ گذر جانے کے بعد آج بھی عوام کے دلوں کو گرما رہی ہے۔۱۹۴۴ء میں ریلیز ہونے والی ہندستان کی پہلی ڈائمنڈ جبلی فلم ''رتن'' کو کون فراموش کرسکتا ہے ۔جس میں امیر بائی اورزہرہ بائی کے نغموں ''اکھیا ملا کے جیا بھرما کے..... ''اور''او جانے والے بالموا لوٹ کے آ... نے دھوم مچادی تھی۔نوشاد کی موسیقی سے سجی یہ گیتوں بھری فلم اپنے نغموں کی بدولت آج بھی عوام میں مقبول ہے۔

مورخ جب ہندستانی فلموں کی تاریخ مرتب کرے گا تو اس میں نور جہاں ،ثریا کے ساتھ شمشاد بیگم کا ذکر بھی ضرور ہوگا۔شمشاد بیگم کو خواتین پلے بیک سنگرس کا محمد رفیع کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ ہائی پچ کے نغمے شمشاد بیگم اسی خوبی سے گایا کرتی تھیں، جس طرح رفیع صاحب اپنے گیت پیش کیا کرتے۔شمشاد بیگم کی آواز میں جو کھنک تھی وہ کسی بھی گلوکارہ کو حاصل نہیں جسے موسیقار او پی نیر نے دیگر موسیقاروں کے مقابلے زیادہ بہتر طریقے سے پیش کیا۔ویسے شمشاد بیگم نے اپنے دور کے ہر چھوٹے بڑے موسیقاروں کے ساتھ کام کیا ہے لیکن او پی نیر نے جو گیت شمشاد سے گوائے وہ زیادہ مقبولیت لئے ہوئے تھے۔مثلاً فلم ''آر پار'' کا ٹائٹل گیت'' کبھی آر کبھی پار لاگا تیر نظر''،فلم سی آئی ڈی کا نغمہ بوجھ میرا کیا نام رے ندی کنارے۔۔۔اور'' کہیں پہ نگاہیں کہیں پہ نشانہ۔۔۔'' وغیرہ وغیرہ۔

شمشاد بیگم اور مبارک بیگم کے فلموں سے سنیاس لینے کے بعد کسی مسلم گلوکارہ کی آواز کانوں تک پہونچی تو وہ تھی اداکارہ اور گلوکارہ سلمیٰ آغا۔

حالانکہ اپنی پہلی ہی فلم نکاح سے سلمیٰ نے اداکاری اور گلوکاری میں عوام سے اپنا لوہا منوالیا تھا اور شاید وقتی طور پر شائقین یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ سلمیٰ آغا کی شکل میں ملکۂ ترنم نور جہاں اور خوش شکل ثریا کی واپسی ہوئی ہے لیکن یہ محض خوش فہمی ثابت ہوئی۔

☆☆☆

مسلم طرز معاشرت پر بنیں شاہکار فلموں کی تاریخ

مسلم معاشرہ کی نمائندگی ماضی میں ہندی فلمسازوں کا پسندیدہ موضوع تھا۔فضلی برادران، شوکت حسین رضوی، کے آصف، محبوب خان، اے آر کاردار، ایس ایم یوسف، سہراب مودی جیسے صف اول کے فلمسازں نے بڑی محنت اور عرق ریزی اور گہری تحقیق سے مسلم معاشرے اور طرز زندگی وفکر کی نمائندگی کرنے والی فلمیں بنا کر اپنی فلموں اور شخصیت کو تاریخ کے اہم اوراق میں محفوظ کرلیا تھا۔زینت، ہمایوں، اعلان، ایک دن کا سلطان، درد، نیک پروین، حاتم طائی اور پھول جیسی فلموں نے اپنے عہد کی شاہکار فلموں کا مقام حاصل کر لیا تھا ماقبل اور مابعد چند ایسی بھی فلمیں آئیں جو مسلم کردار کو پردہ سیمیں پر پیش کرکے انہیں زندہ جاوید بنادیا جن میں ''میرے محبوب، محبوب کی مہندی، میرے حضور، چودھویں کا چاند، دیار مدینہ، دیدار یار، مرزا غالب، میرے غریب نواز'' شامل رہیں۔لیکن حالیہ عرصہ میں جو فلمیں مسلم کرداروں اور معاشرہ پر بنائی گئیں صرف متنازعہ ثابت ہوئیں انہیں دیکھنے اور پرانی مسلم معاشرتی فلموں سے تقابل کرنے سے صرف یہ احساس ہوتا ہے کہ اس دور کے فلمساز اپنی شخصیت اور کرداروں کو ایک معیار اور اپنے کارنامہ کو تاریخ بنانا چاہتے تھے جبکہ آج کے فلمساز انہیں صرف روپیہ بٹورنے کا ایک آسان اور سستہ ذریعہ بنائے ہوئے ہیں یہاں ہم نے ہندوستانی فلم انڈسٹری کی تاریخ سے مسلم طرز معاشرت پر بنی چند شاہکار فلموں کا جائزہ لیا ہے۔۱۹۳۱ء میں ملک کی پہلی بولتی فلم کا آغاز ہی مسلم معاشرتی فلم سے ہوا جسے ''عالم آرا'' کا نام دیا گیا تھا۔جسے پروڈیوسر، ڈائرکٹر آردشیر ایرانی نے اس دور میں چالیس ہزار روپیوں کی لاگت سے تکمیل کیا تھا امپیریل مووی ٹاون کے بینر پر بنائی گئی اس فلم میں رانی زبیدہ، ماسٹر وٹھل، اور پرتھوی راجکپور نے مرکزی کردار ادا کئے تھے موسیقار فیروز شاہ ایم مستری اور بی ایرانی کی موسیقی میں اس فلم میں سات گیت رکھے گئے تھے جس کا ایک گیت'' دے دے خدا کے نام پہ'' آج بھی سنا جاتا ہے جسے ڈبلیو ایم خان نے اپنی آواز دی تھی یہ فلم بامبے میجسٹک سنیما میں ۱۴ر مارچ ۱۹۳۱ء کو ریلیز کی گئی جسے دیکھنے کے لئے عوام کا ایسا ہجوم امڈ پڑا تھا کہ لوگ حیرت زدہ ہوکر رہ گئے اس فلم کی کامیاب نمائش کے بعد ہندی فلم انڈسٹری نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا۔''نجمہ'' محبوب خان نے بہترین مسلم سماجی اور ایک تاریخی فلم ''ہمایوں'' بنائی تھی اپنی فلم نجمہ میں انہوں نے جس مشاقی، لیاقت، صدق دلی کے ساتھ مسلم طرز معاشرت کی آئینہ داری کی جس کی سوجھ بوجھ فنی خلوص کے ساتھ نجمہ دوشیزہ سے ڈاکٹر یوسف کی واردات عشق

پیش کی وہ فراموش نہیں کی جاسکتی اس فلم میں محبوب خان نے دو مجبور محبت کرنے والوں کی واردات عشق بڑی سوجھ بوجھ گہری نظر عمیق مطالعہ کے ساتھ حسن کی بے بسی، بیکسی، محبت کی ناکامی اور جذبات پر فرض کی برتری، کلام پاک پر لئے جانے والے عہد کی عظمت کا ایسا خوبصورت افسانوی پیکر تراشا تھا جس کی کسک ایک صدی گزر جانے کے بعد آج بھی ہزاروں لاکھوں دلوں میں کرچی بنی تڑپاتی رہتی ہے فلم میں اشوک کمار، وینا اور کمار کے کرداروں کو جان مل گئی ''ھمایوں'' تاریخی پس منظر میں محبوب خان نے نرگس، اشوک کمار، وینا، چندر موہن، شاہنواز اور ہمالیہ والا جیسے غیر معمولی فنکاروں کو لے کر ہمایوں کے عہد پر بڑی شاندار دلوں کو چھو لینے والی فلم بنائی تھی۔ ایک راجپوت بہن کا مغل شہزادے ہمایوں کی کلائی پر راکھی باندھ کر بھائی بنانا راکھی کی لاج رکھنے اور بہن کی عزت بچانے کی خاطر ہمایوں کا ہندوستان ہاتھ سے کھو دینا، اکبر کا امرکوٹ میں جنم، راجپوت پھوپھی کی گود میں پرورش، شیر خان کی شورش، ہمایوں کے بھائیوں کی بیوفائی، ایران کے بادشاہ شاہ طہماپ کی مدد، ہمایوں کا ریگستان میں نماز ادا کرتے ہوئے دشمن کے اچانک حملے کے وقت مومنانہ وقار، انہماک کے ساتھ نماز میں مشغول رہتے ہوئے پورے خشوع وخضوع سے اس کی ادائیگی، ہندوستان چھوڑتے وقت راجپوت رانا سے اس کا عہد پورا کرنا جملہ واقعات محبوب خان نے جس شاہی دبدبے وقار شان وشوکت اور سجا سنوار کر پورے ڈرامائی التزام واہتمام کے ساتھ پیش کئے تھے کہ وہ قابل دید بن گئے۔ مرحوم کے آصف نے فلم ''پھول'' میں چوٹی کے فنکاروں کو انگوٹھی میں نگینہ کی طرح جڑ دیا تھا اس فلم کے اہم کردار تھے پرتھوی راجکپور، ثریا، وینا، یعقوب، فلم میں سلیم نامی اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکٹر کو اپنی شادی کے موقع پر شادی سے انکار کرتے ہوئے تحریک خلافت میں شامل ہوتا بتایا گیا تھا اس فلم کا ایک ایک منظر بالخصوص اس کا جذباتی کلائمکس آج بھی لاکھ چاہنے پر بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا وجاہت مرزا اس کے مصنف تھے۔ ''پکار''، مغل شہنشاہ نورالدین جہانگیر کی انصاف پسندی عدل پروری پر سہراب مودی نے اپنے وقت کی یہ شاہکار فلم بنائی تھی شہنشاہ جہانگیر کے کردار میں چندر موہن، نسیم بانو، مہرالنساء کے کردار میں ڈنکے بجا دیئے تھے خصوصاً ایک معمولی سی دھوبن (سردار اختر) کے زنجیر عدل کھینچنے پر انصاف دینے والے فلم کے نقطہ عروج میں جہاں ناظرین خود کو شہنشاہ جہانگیر کے ساتھ پھانسی کے تختے پر لٹکا محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں وہیں مغلوں کی عدل پروری اور انصاف پسندی پر عش عش کر اٹھتے ہیں کمال امروہی کے مکالمے ''پکار'' کے ماتھے کا جھومر ثابت ہوئے۔ ''درد'' اے آر کاردار نے زر کثیر کے صرفہ سے رئیس احمد جعفری کے شہرہ آفاق ناول کے حقوق حاصل کر کے ''درد'' بنائی تھی جس میں کاردار نے امیری، غریبی کے درمیان جذباتی کشمکش، حسن وعشق

کے درمیان دیواریں، فرض ومحبت کا ٹکراؤ، یتیموں کی حالت زار کو کچھ ایسی سوجھ بوجھ ہنرمندی اور فنی بیدار مغزی کے ساتھ پیش کیا تھا جسے بھلائے بھلایا نہیں جاسکتا، شمشاد بیگم اور ثریا کی آواز میں نعت ''بیچ بھنور میں آن پھنسا ہے دل کا سفینہ شاہ مدینہ شاہ مدینہ'' شکیل خمار اور نوشاد کی لگاتار محنت سیدھے عوام کے دلوں میں اتر کر روح کے تاروں کو جھنجھنانے کا باعث بنی اس اعتبار سے کاردار کی درد آج بھی اپنے وقت کی بے مثال فلموں میں گنی جاتی ہے۔ ''مغلِ اعظم'' پروڈیوسر ائرکٹر کے آصف کی ۱۹۶۰ء میں بنی ''مغل اعظم''، فلمی تاریخ کے سو سالہ ریکارڈ کی آج بھی غیر معمولی فلم رہی اس سے قبل یا اس کے بعد اس قدر اور اس طرز کی بھاری صرفہ کے ملبوسات اور سیٹس کی کوئی شاہکار فلم دوبارہ نہ بن سکی فلم کی شروعات پر فلمساز سیٹھ شیراز علی حکیم نے ۲۵ تا ۳۰ لاکھ کے اخراجات کا اندازہ لگایا تھا لیکن کچھ ریل بننے کے بعد ابتدائی اسٹار کاسٹ یعنی انارکلی کا کردار نرگس، شہنشاہ اکبر کے کردار میں چندر موہن کو لیا گیا تھا نرگس اور دلیپ کمار کے حالات کشیدہ ہونے کی وجہ سے کردار تبدیل کر دیئے گئے جس کی وجہ فلم کو از سر نو شروع کرنا پڑا اسی لئے اس کی کاسٹ ایک کروڑ پر جا رکی۔ شیش محل کے سیٹ پر ۱۵ لاکھ سے زائد لاگت آئی تھی جو اس زمانے کی ایک بڑی فلم کا بجٹ ہوتا تھا اس سیٹ کی تعمیر ہنرمندی کا شاہکار تھی بعد ازاں اس فلم کو ایک ارب پتی شاہ پور جی اور پالن جی نے مکمل سرمایہ فراہم کیا ۱۰ سال کی لگاتار محنت کے بعد بالآخر یہ فلم ایک مثالی بن گئی۔ نوشاد کی موسیقی نے سب کی دل پذیرائی کی شکیل بدایوانی نے نغمات لکھنے میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا تھا فلم کے مکالمے احسن رضوی، کمال امروہی، وجاہت مرزا کے خون جگر کا نتیجہ تھے بہر حال کے آصف نے ایک مکمل فلم بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی قیمتی سیٹ، لاجواب آرائش، جنگی مناظر اس پیمانہ پر فلمائے گئے تھے کہ ان پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا ایسی فلم اس سے پہلے ملک کی فلمی صنعت میں کبھی نہیں بنائی گئی اور نہ ہی آئندہ اس کا امکان ہے کے آصف نے ایک ایسے خواب کو حقیقت میں ڈھال دیا جسے دنیا والے دیوانے کا خواب کہا کرتے تھے اگر کے آصف دنیا میں کچھ اور نہیں کرتے اور صرف مغل اعظم ہی بنا کر دنیا سے رخصت ہو جاتے تب بھی وہ برصغیر میں ممتاز مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ڈھائی فلموں کے ہدایتکار کے آصف نے مغل اعظم کے بعد سینکڑوں فلمیں بنانے والے ہدایتکاروں کو پیچھے چھوڑ یا حقیقت میں کے آصف نے اپنی زندگی میں صرف ڈھائی فلموں کی ہدایت دی تھی۔ ''پاکیزہ'' پروڈیوسر ڈائرکٹر کمال امروہی کی سال ۱۹۷۲ء میں بنی فلم پاکیزہ اپنے وقت کی ایک اور غیر معمولی فلم ثابت ہوئی اس فلم کی تیاری کا آغاز ۱۹۵۸ء میں ہوا لیکن سال ۱۹۶۴ء میں کمال امروہی اور مینا کماری کی ازدواجی زندگی میں دراڑ پیدا ہوگئی اور علیحدگی عمل میں آئی ان تنازعات میں پاکیزہ جیسی عظیم

فلم بھی برف دان کی نذر ہوگئی اس دوران مینا کماری شراب نوشی کی عادی ہوگئیں تب انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس فلم کو مکمل کیا جائے اور ہوا بھی کچھ ایسا ہی پاکیزہ بن گئی تو مینا کماری کا انتقال ہوگیا اس رومانی فلم کی اہم ذمہ داری فلم کے کرداروں راجکمار، اشوک کمار، نادرہ، وینا گیت کار غلام محمد اور موسیقار نوشاد کے کاندھوں پر تھی فلم کے مجرے اور شاعری، ٹریمنٹ اور سینماٹوگرافی نے اسے تاریخ کے اوراق میں بند کر دیا فلم کی اہم ضرورت اس کے مکالمے اور غیر معمولی فلمائے گئے گیت تھے۔ فلم فروری ۱۹۷۲ء میں ریلیز ہوئی اس کے ٹھیک ایک ماہ بعد یعنی ۳۱ / مارچ کو اسی سال مینا کماری کا انتقال ہوا۔ ''لیلیٰ مجنوں'' یہ فلم جملہ پانچ بار بنائی گئی لیکن سال ۱۹۷۶ء میں بنی لیلی مجنوں نے کامیابی کے وہ ریکارڈ قائم کئے جسے عوام بھلا نہ پائیں گے۔ ۱۹۳۱ء میں دوبار اس تاریخی موضوع پر فلمیں بنیں۔ ۱۹۴۵ء میں نائیر اور نظیر کی ہدایت میں اسی کو دہرایا گیا جس میں سورن لتا اور نذیر نے مرکزی کردار ادا کئے تھے۔ رفیق غزنوی اور گوند رام نے موسیقی سے سجایا تھا ۱۹۵۲ء میں کے امرناتھ کی ہدایت میں بنی فلم میں شمی کپور اور نوتن نے لیلی مجنوں کے کردار نبھائے تھے غلام محمد کی موسیقی میں طلعت محمود کا گایا گیت ''چل دیا کاروان لٹ گئے ہم یہاں'' آج بھی یاد ہے لیکن ۱۹۷۶ء میں پروڈیوسر ڈائرکٹر ایچ ایس راویل کی ہدایت میں بنی لیلی مجنوں نے خوب نام کمایا رشی کپور رنجیتا، ڈینی اسرانی کے مرکزی کرداروں پر فلم نے بھاری کامیابی حاصل کی تھی مدن پال کی موسیقی اور اس فلم کے گیت ''لیلی مجنوں دو بدن ایک جان تھے''۔ ایک دیوانہ تیری یاد میں آہیں بھرتا ہے، اس ریشمی پازیب کی جھنکار کے صدقے، برباد محبت کی دعا ساتھ لئے جا، قومی سطح پر کامیابی کے ریکارڈ قائم کئے تھے۔ ''امراؤ جان'' پروڈیوسر ڈائرکٹر مظفر علی موسیقار خیام کی ۱۹۸۱ء میں ریلیز ریکھا، فاروق شیخ، نصیر الدین شاہ، راج ببر کی اسٹار کاسٹ اور خیام کی موسیقی پر بنی ایک تاریخی فلم تھی یہ لکھنو کی ۱۸۹۰ء میں امراؤ جان طایفہ پر میر ہادی حسن رسوا کی ناول پر بنائی گئی فلم تھی جس نے ریکھا کو اس کردار میں رہتی دنیا تک امر بنا دیا آشا بھونسلے کی آواز ''ان آنکھوں کی مستی کے''، جستجو جس کی تھی اس کو، اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے'' امراؤ جان آج بھی زندہ جاوید بن گئی اس فلم کے لئے سال ۱۹۸۱ء میں ریکھا نے بہترین اداکارہ خیام کو بہترین موسیقار اور آشا بھونسلے کو بہترین گلوکارہ کے نیشنل ایوارڈس عطا کئے گئے۔ ''نکاح'' پروڈیوسر ڈائرکٹر بی آر چوپڑہ کی ۱۹۸۲ء میں کامیابی کے ریکارڈ بناتی آگے بڑھنے والی ایک تاریخی فلم ثابت ہوئی جس میں مسلم سوشیل ڈرامہ نکاح اور طلاق کے حساس موضوع کو پردہ سیمیں پر پیش کرنے کی جرات مندانہ کامیاب کوشش کی گئی تھی پاکستانی اداکارہ سلمٰی آغا کی شاندار اداکاری اور گیتوں نے اسے کامیابی کی چوٹی پر پہنچا دیا تھا نیلوفر (سلمٰی آغا) کی

اپنے بچپن کے دوست وسیم (دیپک پراشر) سے شادی اور طلاق پھر اپنے کالج کے ساتھی حیدر (راج ببر) سے عقد ثانی پھر نا اتفاقیاں بی آر چوپڑہ نے نکاح اور طلاق کی اہمیت کو واضح کیا تھا فلم کے گیت ''فضا بھی ہے جواں جواں، غلام علی کی غزل چپکے چپکے رات دن، چہرہ چھپا لیا ہے۔ ابھی الوداع مت کہو'' نے فلم کی کامیابی کا بہت ساتھ دیا لیکن موجودہ طور پر فلمسازوں نے صرف دولت کے حصول کے لئے مسلم طرز معاشرت کو بگاڑ کر ایک نیا متنازعہ موضوع ہی چھیڑ دیا فلمسازوں نے کرداروں کا استحصال کرتے ہوئے ایسی فلمیں بنانی شروع کیں جو ملک کے امن کے ماحول کو بگاڑنے کا کام کرتی ہیں مہیش بھٹ کی ''زخم'' جسے نیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا تھا اس فلم میں ہدایتکار نے ایک مسلم لڑکی کی غیر مسلم لڑکے سے محبت، شادی اولاد پھر اس لڑکی کی متنازعہ آخری رسومات کو پردہ سیمیں پر پیش کیا تھا۔ جس میں پوجا بھٹ، اجئے دیوگن اور ناگرجنا نے مرکزی کردار نبھائے تھے۔ ۱۹۹۵ء میں بنی بامبے بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی پروڈیوسر جمو سگندھ ڈائرکٹر منی رتنم کی اس فلم نے کافی ہنگامے کھڑے کئے فلم کے تنازع کی وجہ سے سنجیدہ شائقین نے اسے مسترد کر دیا فلم میں اروِند سوامی اور منیشا کوائرالا نے مرکزی کردار نبھائے تھے سال ۲۰۰۰ میں ڈائرکٹر خالد محمد نے بامبے کے ۱۹۹۳ء کے فسادات سے ایک کہانی اٹھائی جسے فضاء کے نام سے مکمل کیا گیا جس میں ایک بہن کو اپنے بھائی کی تلاش کو پیش کیا گیا جیہ بچن کی عرصہ بعد اداکاری، کرشمہ کپور، ریتک روشن، نیہا، منوج باجپائی، انو ملک اور اے آر رحمان کی دھنوں کے باوجود یہ فلم بری طرح ناکام رہی اسی سال یعنی ۲۰۰۱ء کے اختتام پر بنی فلم ''غدر ایک پریم کتھا'' ایسے ہی تنازع پر مبنی فلم تھی اس متنازعہ فلم کو شائقین کے مشتعل جذبات اور غضب سے روکا نہیں جا سکا بہر حال وقفہ وقفہ سے اس طرح کی متنازعہ فلموں کا سلسلہ تو جاری ہے لیکن ماضی کی طرح مسلم طرز معاشرت پر اس طرح کی صاف ستھری شاہکار فلمیں بننا اب ناممکن ہی ہے۔

(بشکریہ اخبار مشرق کلکتہ)

☆☆☆

ہندی فلموں پر اُردو کا جادو

پروفیسر محمد منصور عالم، ممبر پبلک سروس کمیشن، مغربی بنگال

اردو زبان وادب کی تاریخ بہت قدیم نہیں ہے لیکن اس کے پھلنے پھولنے کا انداز بڑا دلچسپ اورنرالا ہے یہ زبان ہندستان میں پیدا ہوئی۔ یہیں پروان چڑھی اورابتدائی دشوارگزارراہوں سے ہوتی ہوئی اسی سرزمین پر ترقی کی منزلیں طے کیں۔ اس زبان نے اپنی شیرینی، لطافت، فصاحت وبلاغت اوراپنی مخصوص طرز ادا سے سب کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ کہیں اس نے نسیم سحر بن کر دلوں کو مسرت وتازگی بخشی ہے تو کہیں اس کی جادو بیانی قلب کو گرما کر مجاہد کی شان پیدا کرتی ہے۔ اس کے شیریں الفاظ قاری پر اپنا اثر قائم کئے بغیر نہیں رہتے۔ یہ طوطی شکر بار ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ کانوں میں رس گھولنے لگتا ہے۔ یوں تو اس کی ترقی وترویج میں شاعروں، ادیبوں، صوفیوں اور عالموں کا زبردست ہاتھ رہا ہے لیکن عہد حاضر میں اسکو جو شاندار مقبولیت اور شہرت نصیب ہوئی ہے اس میں ہندی فلموں کا بھی اہم حصہ رہا ہے۔ فلم ایک ایسا ذریعہ ابلاغ ہے جس نے اردو کو گھر گھر پہنچا دیا۔ اس زبان کی ہمہ گیری کا اندازہ تو اس امر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ فلموں کی مدد سے برصغیر کی حدود پھلانگ کر کرۂ ارض کے بہت سے خطوں میں پھیل گئی ہے۔ اس کی مقبولیت کے پیش نظر اسے دنیا کی مشہور یونیورسیٹوں کے نصاب میں داخل کرلیا گیا ہے۔

فلم کی ایجاد اردو کے حق میں بہت مفید بلکہ نعت عظمیٰ ثابت ہوئی۔ جب ہندستانی زبان میں فلمیں بنانے کا شوق پیدا ہوا تو پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ عوام کس قسم کی زبان پسند کرتے ہیں یا کون سی زبان لوگوں کے دلوں میں اتر کر ان کی دلچسپی کا سامان مہیا کرسکے گی۔ انہیں سوائے اردو کے کسی اورزبان میں یہ خوبی نظر نہیں آئی۔ چونکہ ہندی فلموں میں محبت کے علاوہ اوربھی موضوعات ہوتے ہیں اور ہر موضوع کے لئے مناسب الفاظ اردو میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اس لئے کہانیوں، نغموں (گیت) اور مکالموں کی ادائیگی کے لئے فلمی پروڈیوسر اور ڈائریکٹروں کے سامنے اردو سے بہتر اورموثر ترین زبان کوئی اورنہ تھی۔ اس کے لئے اردو کے شاعروں، ادیبوں، کہانی کاروں اور مکالمہ نگاروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جنہوں نے اردو کے شہہ

پاروں سے فلموں کو مرصع کردیا۔ ہندی فلموں کے لئے بڑے پیمانے پر مکالمے لکھے گئے۔ ماحول سے ملتے جلتے گیت لکھے گئے۔ عمدہ عمدہ کہانیوں نے جنم لیا جن کی زبان اردو تھی اور صرف اردو، لیکن افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ ایسی فلموں کو جن کی زبان اردو اور خالص اردو تھی، ہندی کا سرٹیفکیٹ دیا گیا۔

ہندی فلموں نے اردو ادب کی ان تمام مشہور داستانوں کو فلما کر ان کی شہرت اور مقبولیت میں چار چاند لگادیئے اور اردو کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ اس حقیقت سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے کہ ایک دیکھی جانے والی کہانی پڑھی جانے والی کہانی کی بہ نسبت زیادہ موثر ہوتی ہے کیونکہ ایک کہانی کو بیک وقت ایک ہی شخص پڑھ کر متاثر ہوتا ہے جبکہ وہی کہانی جب فلم کے پردے پر دکھائی جاتی ہے تو بیک وقت ہزاروں اشخاص مثبت یا منفی اثر قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ اردو ادب کی مشہور اور معرکتہ الآرا داستانوں مثلاً قصہ چہار درویش، قصہ حاتم طائی، شیرین فرہاد، لیلیٰ مجنوں، گل صنوبر، شہزادی، علی بابا چالیس چور، انارکلی، (ڈرامہ)، امراؤ جان ادا (ناول) وغیرہ کو ہندی فلموں نے حیات جاودانی بخش دی۔ آج یہ کہانیاں کتابوں کے صفحات سے اڑ کر عوام کے دلوں میں جابسی ہیں۔ ان کتابوں کے مصنفین اس بات کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے کہ ان کی کہانیاں اتنی مقبول ہوسکے گی۔ ان کہانیوں کے علاوہ اردو کے مشہور ناولوں پر مبنی فلمیں بھی بنائی جاچکی ہیں۔ مثلاً راجندر سنگھ بیدی کی ''ایک چادر میلی سی'' اور منشی پریم چندر کے مشہور ناول ''غبن'' اور ''کفن'' بھی فلم کے پردے کی زینت بن چکے ہیں۔ شطرنج کے کھلاڑی ''ستیہ جیت رائے'' کی مشہور فلم تھی جو پریم چند کی کہانی سے ماخوذ تھی۔ ان کے علاوہ جتنی بھی فلمی کہانیاں لکھی گئیں ان میں بیشتر کے خالق اردو کے ادیب ہی تھے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ چنانچہ عزم بازید پوری سے لے کر راہی معصوم رضا تک کہانی کاروں کی کھیپ ہمیں فلم انڈسٹری میں نظری آتی ہے۔ ان میں نوے فیصد کہانی کاروں کا تعلق اردو ادب سے ہی ہے۔

اردو کی کہانیوں نے عوام میں اتنی مقبولیت حاصل کرلی ہے کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ آج آپ جس کسی سے پوچھئے وہ آپ کو لیلیٰ مجنوں، یا شیرین فرہاد کی انمول محبت کی داستان شروع سے آخر تک سنادے گا۔ حاتم طائی کی کہانی آسانی سے دہرادے گا۔ یہی نہیں بلکہ حاتم طائی پر پڑنے والی تمام مصیبتوں کا نقشہ کھینچ کر آپ کے سامنے رکھ دے گا۔ ایسا صرف ہندی فلموں کی وجہ سے ہی ہوسکا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس ہندی زبان پر مشتمل فلمیں مثلاً امر پالی اور سنگھرش لوگوں کی دلوں میں نہیں اتر سکیں۔

کہانی کے بعد مکالمے فلم کی جان ہوتے ہیں اوراس امر میں اردو کوایک اہم مقام حاصل ہے۔فلموں میں وسیع پیمانے پر مکالمے لکھے گئے جن میں اردو الفاظ کی بھرمار تھی۔اردو کے قیمتی مقولے اورالفاظ فلمی داستان کی زینت بنے۔ابرار علوی، وجاہت مرزا، امان اللہ، شمس بازید پوری، کمال امروہی، سلیم جاوید اور قادر خان کے مکالمے آج بھی لوگوں کے دلوں کو گرماتے ہیں۔اردو کے خواہ ہندو مکالمہ نویس ہوں یا مسلمان دونوں نے عوام کو یکساں طور پر متاثر کیا۔فلموں کے ابتدائی دور میں منظوم مکالمے بھی لکھے گئے۔سہراب مودی نے اپنی بیشتر فلموں کے لئے منظوم مکالمے لکھوائے اورانہیں عوام میں مقبول کیا۔

نکل چلنے کی حسرت بڑی مشکل سے نکلے گی
کلیجہ چیر دے گی بددعا دل سے نکلے گی

جیسے شعر عوام میں زبان زد ہوگئے تھے اس لئے کہ ایسے اشعار کی زبان اردو تھی۔مغل اعظم ،انارکلی، مرزا غالب، برسات کی رات، شعلے، پالکی، چودھویں کا چاند، پاکیزہ، رضیہ خان، صاحب بی بی غلام اور امراؤ جان ادا جیسی فلموں کے مکالمے آج بھی عوام کی زبان پر ہیں۔اوران کے کانوں میں رس گھولتے ہیں۔مکالموں نے عوام میں جان من، میرے محبوب، میرے صنم، اومحبوبہ، صاحب عالم، عالم پناہ اور باملاحظہ ہوشیار وغیرہ جیسے لفظوں کو عام کیا۔مکالمہ نویسوں کی جو تعداد فلموں میں نظر آتی ہے ان میں نوے فیصد اردو کے ہی آدمی ہیں۔

ہندی فلموں کے لئے ماحول سے ملتے جلتے گیت بھی لکھے گئے اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔جب فلموں میں گانے کا رواج شروع ہوا تو جن نغمہ نگاروں کی پہلی کھیپ فلم انڈسٹری کے دروازے پر پہنچی ان میں بیشتر حضرات اردو کے مشہور شاعر تھے، چنانچہ شکیل بدایوانی سے شہریار تک اردو شعراء کی ایک لمبی فہرست بنتی ہے جنھوں نے فلموں کا سہارا لے کر اپنے اردو نغموں کو لافانی بنادیا۔جوش ملیح آبادی، ساحر لدھیانوی، راجہ مہدی علی خان، قمر جلال آبادی، ندا فاضلی، نازش پرتاپ گھڑی، مجروح سلطان پوری، فیض احمد فیض، امیر قزلباش حسرت جے پوری اور سردار جعفری چوٹی کے شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں جنھوں نے فلموں کے ذریعہ اردو ادب کی بے بہا خدمات انجام دیں۔ان شعراء نے ہندی فلموں میں گھٹیا قسم کے گیت نہیں لکھے بلکہ ادب کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا اوراپنے خالص ادبی کلام سے لوگوں کے دلوں کو مسحور کیا۔ہندی فلموں نے

جو دراصل اردو فلمیں ہیں۔غزل کو جو مقبولیت اور شہرت بخشی وہ ایک کھلی حقیقت ہے۔غزل کو اتنی مقبولیت خود ان کے تخلیق کاروں کے عہد میں بھی نہیں ملی تھی۔یہی وجہ ہے کہ بنگالی ہو یا آسامی، مدراسی ہو یا راجستھانی غزل ہر شخص گنگناتا ہے۔خاص طور پر غالب اوران کی غزلوں کو ہندی فلموں نے اتنا مشہور کردیا ہے کہ صدیوں تک اس کی شیرینی اور چاشنی سے لوگ محظوظ ہوتے رہیں گے۔اردو کے شعراء کے دم سے نام نہاد ہندی فلموں پر اردو چھائی رہی۔آج جتنی بھی ہندی فلمیں (اردو میں کہیں یا لوگوں کی زبان میں ہندی) بنتی ہیں سب کا دارومدار اردو پر ہی ہوتا ہے۔یوں تو ٹھیٹھ ہندی میں بھی فلمیں بنتی ہیں لیکن وہ لوگوں کو متاثر نہیں کرسکتیں۔اس کی وجہ سنسکرت کے ثقیل اور بھونڈے الفاظ ہیں جو سننے والوں کے کانوں پر گراں گزرتے ہیں۔خود ہندی والے حضرات بھی ایسی ہندی سے پرہیز کرتے ہیں۔مثلاً جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں امرپالی کی زبان خالص ہندی تھی۔جوایک ہفتہ پورا ہونے سے قبل ہی پردے سے اتر گئی۔اس لئے کہ عوام نے اس کی زبان سمجھنے سے معذوری ظاہر کردی۔تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جن فلموں کے نام، زبان اور کہانیاں اردو میں ہیں ان فلموں کو بجائے اردو سند دینے کے سرکار انہیں ہندی سند سے نوازتی رہی ہے۔''برسات کی رات'' پہلی فلم تھی جسے مرحوم ساحر لدھیانوی کی کوشش سے اردو کی سند نصیب ہوئی۔اس کے بعد دیگر کئی فلموں کے لئے اردو کی سند حاصل کرنے میں کامیابی ملی۔ہندی فلموں نے ☆☆☆ اردو زبان کی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے اور آج بھی کررہی ہے۔ہندی فلموں کے بیشتر نام اردو میں ہوتے ہیں جو اس زبان کی مقبولیت کی دلیل ہیں۔یہ نام بہ آسانی ہر کس وناکس کی زبان پر بھی چڑھ جاتے ہیں۔مثلاً مرزا غالب، داغ، الہلال، تیرانداز، نیا دور، عزت، شاندار، شرافت، پیغام، آوارہ، آہ، انسانیت، رستم وسہراب، عالم آرا، نکاح، مغل اعظم، نمک حرام، دشمن، دیدار، آرزو اور انسانیت جیسے ہزاروں فلمی نام اردو کے ہی ہیں۔

فلمی سیلاب زور پکڑا تو اس کے تیز دھارے ملک کے گوشے گوشے میں چلنے لگے اور کثرت سے لوگ اس سیلاب میں بہہ گئے۔کیا امیر کیا غریب، سب فلموں کے اسیر ہوئے۔ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم رہی ہے جن لوگوں نے ایک بار بھی سینما نہیں دیکھا ہو۔فلموں کے ذریعہ جو نکتہ لوگوں کو سمجھایا جاتا ہے وہ جذبات سے پر ہوتا ہے۔اس کا اثر دل ودماغ پر براہ راست پڑتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج یورپ کے بیشتر ممالک میں طالب علموں کو فلم کے ذریعہ تعلیم دینے کا رواج عام ہوگیا ہے۔

یوں تو ملک کی دوسری صوبائی زبانوں میں فلمیں بنتی ہیں۔مغربی بنگال میں بھی ایک بڑی صنعت قائم ہے جہاں بنگلہ زبان میں فلمیں تیار ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود ہندی فلمیں جو دراصل اردو فلمیں ہوتی ہیں۔ بنگالی طبقے میں کافی مقبول ہیں۔ ہمارے بنگالی بھائی ایک حد تک اردو بولنے اور سمجھنے کے قائل ہو گئے ہیں اور یہ کرشمہ صرف ہندی فلموں کا ہی ہے۔اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ بنگلہ میں فارسی اردو کے بیشمار الفاظ در آئے ہیں جس سے بنگالیوں کو سمجھنے میں دشواری کم ہوتی ہے۔

بنگال علم وادب کا گہوارہ ہے۔ یہاں کے لوگ ساری دنیا میں پھیل کر اپنے ہنر کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ ہمارے لئے باعث فخر ہے کہ ہندی فلموں کے ابتدائی دور سے لے کر آج تک جتنے اداکار، اداکارائیں، نغمہ نگار، میوزک ڈائرکٹر، فلم پروڈیوسرز اور فلم ڈائرکٹرز نے فلموں میں اپنا کردار نبھایا ہے۔ان میں اکثریت بنگالیوں کی رہی ہے۔ جنہوں نے اردو کو بہت قریب سے جانا ہے، اس میں نغمے گائے ہیں۔ موسیقی ترتیب دی ہے، مکالمے ادا کئے ہیں اور یہی نہیں اردو سیکھنے کے لئے باقاعدہ اردو اتالیق کا سہارا بھی لیا ہے۔اس طرح اردو ان کی زندگی کا حصہ بن چکی ہے بلکہ ان کی روٹی روزی کے حصول میں معاون ثابت ہوتی ہے۔اگر وہ اردو نہ جانیں تو ان کو فلموں میں کام بھی نہیں ملتا۔آج ان ہی کی ریاست میں اردو یتیم ہو کر رہ گئی ہے۔اسے سرکاری طور پر تسلیم کرنے میں حکومت جھجھک رہی ہے۔ یہ اچھی طرح جانتے ہوئے کہ یہ زبان کسی زمانے میں بنگالیوں کی خاص اور چہیتی زبان رہی ہے۔ بنگالی حضرات اردو کے ادیب وشاعر بھی ہوئے ہیں۔جنم جنم جے مترا سے لے کر موجودہ دور میں شانتی رنجن بھٹاچاریہ تک اس زبان کے گرویدہ بلکہ اسیر ہوئے ہیں۔ان تمام باتوں سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی پتہ نہیں کیوں ہماری سیکولر حکومت اردو کو دوسری سرکاری زبان تسلیم کرنے میں پس وپیش کر رہی ہے۔

حکومت مغربی بنگال ایک سیکولر حکومت ہے۔جمہوری طریقے سے چلائی جانے والی تحریک کو نہ صرف پسند کرتی ہے بلکہ خود اس پر عمل بھی کرتی ہے۔ایسا نہیں کہ اس نے اردو کے لئے کچھ نہیں کیا ہے۔اردو اکاڈمی کا قیام، مختلف کالجوں میں اردو پڑھانے کا انتظام، مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کا اہتمام اس کے وہ کارنامے ہیں جو بھلائے نہیں جاسکتے۔آج سالہا سال سے انجمن ترقی، اردو ہند (بنگال شاخ) اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لئے مہذب اور جمہوری تحریک چلا رہی ہے لیکن افسوس کہ حکومت کے کانوں

پر جوں تک نہیں رینگ رہی ہے۔ایسی صورت میں اب وقت آگیا ہے کہ ہمارے بنگالی بھائی بالخصوص بالی ووڈ کے کلاکار حضرات آگے بڑھیں اور اس پیاری اور دلکش زبان کے تحفظ اور بقا کے لئے حکومت سے گفت وشنید کریں اور اسے اس کا جائز مقام دلائیں۔ یہ کوئی بھیک نہیں ہے بلکہ آئین کے مطابق اردو کا حق ہے۔اس لئے کہ وہ اسی اردو کی بدولت اپنی فلموں کو شہرت ومقبولیت کی بلندی پر پہنچا رہے ہیں۔ایسا کر کے وہ اپنی روٹی روزی نہ صرف حلال کر سکیں گے بلکہ اس کے ساتھ انصاف بھی کر پائیں گے۔ بنگلہ زبان جس نے فارسی اور اردو سے اخلاق ومٹھاس حاصل کیا ہے اپنی بہن اردو کو اپنے سینے سے لگانے کے لئے بیتاب ہے شرط یہ ہے کہ اس ریاست کے ارباب حل وعقد اسے یہ موقع عنایت فرمائیں۔

☆☆☆

ہندستانی فلم انڈسٹری میں اُردو ادیب وشعراء کا حصّہ

قطب الدین خان

اردو کے ادیب وشعراء نے جہاں ادب کی نشو ونما میں اپنا گراں قدر کردار ادا کیا وہیں انہوں نے ادب کو عوامی بنانے یا عوام کی ایک بڑی تعداد کے سامنے لے جانے کے لئے فلموں کا بھی سہارا لیا۔ فلموں کے ذریعہ اپنا پیغام پہنچانا بھی ان کا ایک مقصد تھا۔ کیونکہ ۲۰؍ویں صدی کا سب سے مؤثر ذریعہ ابلاغ فلم ہی تھا اور فلم جیسے طاقتور میڈیا کے ذریعہ ادیب' شعراء اور عوام کے درمیان رابطے قائم ہوتے ہیں۔ اردو کے ادیب وشعراء نے فلموں میں کہانیاں' گیت' غزلیں اور قوالیاں لکھ کر ایک بڑا کردار ادا کیا۔ مکالمہ نگاروں نے بھی اردو کی بے پناہ مقبولیت کے باعث تھیٹریکل زبان کی حیثیت سے اردو کو ایک مستقل مقام دلوایا۔ چنانچہ ہندستان میں اردو کی مقبولیت کم ہورہی ہے لیکن تھیٹر اور سنیما میں اردو کی مقبولیت ہنوز برقرار ہے۔ آیئے اردو کے شعراء اور ادیبوں کے فلمی رول پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور ابتداء سے اب تک ہندستانی فلموں کے اردو ادیب وشعراء کا ایک جائزہ لیتے ہیں۔

منشی پریم چند: اردو جدید افسانے کے امام پریم چند نے فلمی دنیا کا رخ محض مالی منفعت کے لئے نہیں کیا بلکہ ان کا مقصد عوام تک زیادہ سے زیادہ پہنچنا تھا۔ ویسے گاندھی جی کے گورکھپور میں تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں پمفلٹ بانٹنے کی وجہ سے منشی پریم چند کی نوکری جاتی رہی تھی اور وہ مالی خسارے میں ضرور تھے لیکن ممبئی جانے کا مقصد بھی ایک قسم کا تحریکی عمل تھا چنانچہ ڈائرکٹر ایم بھونانی نے جون ۱۹۳۴ء میں انہیں ۸؍ہزار ماہوار تنخواہ پر بلایا اور ''مزدور'' اور ''نوجیون'' لکھوائی۔ مزدور کی کہانی اور مکالمے لکھے اور پریم چند نے اس میں مزدور یونین کے صدر کا مختصر رول بھی کیا تھا۔ لیکن ڈائرکٹر نے دباؤ میں آکر فلم کی کہانی بدل دی۔ پریم چند جنھوں نے خود یہ فلم ڈیڑھ سال بعد بنارس میں دیکھی۔ لکھتے ہیں ''میں جن اردوداں کے ذریعہ یہاں تک آیا تھا ایک بھی پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ جتنا میں ڈائرکٹر کے ساتھ تعاون کرسکتا تھا کیا لیکن یہ لوگ جس ڈھنگ سے کہانیاں بناتے ہیں اس سے رتی بھر بھی ہٹ نہیں سکتے اور یہ لوگ ویلگریٹی Vulgarity کو انٹرٹینمنٹ ویلو Entertaintment value کہتے ہیں۔ میں نے ایسی کہانیاں لکھی ہیں جنہیں سماج کے ہر طبقہ کو دیکھنا

چاہیئے۔ لیکن ان لوگوں کو ڈر یہ رہتا ہے کہ ایسی فلمیں نہیں چلیں گی۔ اک نظریاتی شخص کو یہاں کتنے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں....... '' پریم چند نے ایک اور کہانی ''نوجیون'' لکھی اس فلم میں بھی پریم چند کے ارمانوں کا خون کیا گیا۔ مہالکشمی سینےٹون کے شری نانو بھائی وکیل نے پریم چند کی ادبی دنیا میں شہرت سے متاثر ہوکر ان کے ناول ''بازارحسن'' عرف سیوا سدن Seva Sadan کو فلمانے کے حقوق صرف ساڑھے سات سو میں خریدے۔ اس فلم کی مہورت میں مشہور قائد کے ایم منشی کی اہلیہ لیلاوتی منشی شریک ہوئیں۔ اس موقع پر پریم چند نے کہا کہ ''اگر میرے اس ناول سے سماج کا کوئی بھلا ہوسکے تو میں اپنے آپ کو'' کرتارتھ'' مانوں گا۔ پریم چند کا یہ ناول سماجی اعتبار سے اس لئے اہم تھا کہ اس میں شریف خاندان کی ایک معصوم لڑکی عصمت فروشی پر مجبور ہوجاتی ہے۔ لیکن فلمی ہدایت کار نے اس ناول کا کچومر ہی نکال دیا۔ پریم چند نے اپنے آپ کو اس سے الگ کرلیا۔ لیکن بعد میں یہی ناول کو اس کی اصلی شکل میں ۱۹۳۸ء میں کے سبرامینم نے مشہور رقاصہ ایم ایس سبالکشمی کو لے کر بنایا۔ اس کا نام رکھا سیوا سدن Seva Sadan فلم بہت کامیاب رہی۔ منشی پریم چند ایک سال سے بھی کم عرصہ ممبئی رہ پائے اور اپریل ۱۹۳۵ء میں بنارس لوٹ گئے۔ فلمی دنیا میں ان کو جو تلخ تجربہ ہوا اس کے بارے میں انہوں نے لکھا کہ ''ایک ادیب کے لئے سنیما مناسب جگہ نہیں ہے میں اس لائن میں اس لئے آیا تھا کہ شاید مالی اعتبار سے کچھ مطمئن ہوسکوں۔ مگر اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ میری خام خیالی تھی اس لئے میں پھر ادبی خدمات میں لگ رہا ہو''۔

پریم چند کی وفات کے بعد ان کی کہانیوں اور ناولوں پر مبنی گیارہ فلمیں آئیں۔ ان میں دو بچوں کے لئے تھیں اور ایک فلم تامل اور تیلگو میں چلڈرن فلم سوسائٹی نے ۱۹۷۰ء میں ''عید مبارک'' ہندو مسلم اتحاد پر بنائی۔ پریم چند کی کہانی ''کفن'' Kafan پر مبنی تیلگو زبان میں شہرہ آفاق ڈائرکٹر مرنال سین نے ۱۹۷۸ء میں بنائی ایک فلم بنائی (ایک گاؤں کی کہانی) یہ فلم بہت خوبصورت بنی اور اسے حکومت ہند نے بھی اعزاز سے نواز اور کئی بین الاقوامی فلمی میلوں میں بھی یہ دکھائی گئی۔ مشہور ہدایتکار اے آر کاردار نے پریم چند کی اردو کہانی عورت کی فطرت کو ''سوامی'' کے نام سے فلمایا، ۱۹۴۶ء میں ایک اور کہانی گوشہ عافیت کو فلمایا۔ ۱۹۵۸ء میں ''ہیراموتی'' (اداکار بلراج ساہنی نروپارائے) بنی۔ گودان ۱۹۶۳ء میں بنی اس میں راج کمار ہیرو تھے۔ مگر فلم زیادہ نہ چل سکی۔ ۱۹۷۷ء میں رشی کیش مکھرجی نے ''غبن'' بنائی جو پریم چند کی فلموں میں سب سے

کامیاب ثابت ہوئی۔ سنیل دت اور سادھنا نے بہترین اداکاری کی ۱۹۷۸ء میں پریم چند کے افسانے شطرنج کے کھلاڑی کے نام سے دیا لیکن فلم باوجود بہترین کوششوں کے زیادہ کامیاب نہ رہی۔ یہ تمام فلمیں پریم چند کی وفات کے بعد بنیں، پریم چند کا تعلق ممبئی سے صرف مضمون کی ابتداء کی تین فلموں تک ہی رہا۔ پریم چند مالی لحاظ سے مفلس ہی رہے اور اسی حالت میں انتقال کیا۔

شکیل بدایوانی: شکیل بدایوانی کو بھلے ہی اس سنگدل فلمی دنیا نے بھلا دیا ہو لیکن اچھی موسیقی اور پرانے فلمی گانوں کے شائقین نے انہیں نہیں بھلایا ہے۔ بے مثال فلمی گانے لکھنے والے اس شاعر نے نہ صرف یہ کہ ہندستانی فلموں کو بے مثال گیت دیئے بلکہ فلمی موسیقی کو عمدہ گانوں سے لیس کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ ہندستانی فلموں کے سنہرے دور یعنی ۱۹۵۰ء۔۱۹۷۰ء میں اگر شکیل صاحب کو ہی سب سے بڑا گیت کار مانا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس سنہرے دور کی یادگار فلموں کے یادگار ہدایت کار تھے کے آصف، محبوب خان، اے آر کاردار، ایس یوسنی وغیرہ وغیرہ اور ان سب کے لئے پہلی ترجیح تھی۔ شکیل بدایوانی اور نوشاد کی جوڑی...... شہنشاہ فن دلیپ کمار کی لاجواب فلموں کی موسیقی کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔ ایک نظر ہم نوشاد اور شکیل کی جوڑی کی فلموں پر ڈالیں تو تعجب ہوگا کہ اتنی کامیاب فلمیں اور وہ بھی یکے بعد دیگرے کس طرح دی گئیں۔ نوشاد/شکیل بدایوانی جوڑی کی فلمیں شروع ہوتی ہیں۔ انوکھی ادا ۱۹۴۸ء، بابل ۱۹۵۰ء، داستان ۱۹۵۰ء، دیوار ۱۹۵۱ء، آن ۱۹۵۲ء، امر ۱۹۵۴ء، اڑن کھٹولا ۱۹۵۵ء، مدرانڈیا ۱۹۵۷ء، مغل اعظم ۱۹۶۰ء، گنگا جمنا دل دیا درد لیا (۱۹۶۶ء) سنگھرش ۱۹۶۸ء، اور رام اور شیام ۱۹۶۷ء اور اگر غلام محمد جو نوشاد صاحب کے اسسٹنٹ تھے ان کی فلم مرزا غالب کو بھی شامل کر لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ہندوستانی فلمی دنیا میں شاید اتنی زیادہ مشہور ہٹ فلمیں کسی اور موسیقار اور ہدایت کار جوڑی نے نہیں دیں۔

شکیل بدایوانی کی شہرت کے لئے آن، مدرانڈیا، مغل اعظم اور گنگا جمنا ہی کافی تھیں۔ لیکن دیگر فلموں کے گانے آج بھی مقبول ہیں۔ مثال کے طور پر بابل کا ۶۵ سالہ پرانا گیت ''چھوڑ بابل کا گھر موہے پی کے نگر'' برصغیر کے ہر گھر میں شادی کے موقع پر بجایا جاتا ہے۔ عام فلموں سے ہٹ کر شکیل بدایوانی صاحب کی بعض فلمیں ایسی رہیں جن میں موقع کے لحاظ سے گانے لکھنا مشکل کام تھا۔ مثلاً مدرانڈیا میں دیہاتی کسانوں کے لوک گیت جس لاجواب انداز میں شکیل صاحب نے لکھے ہیں اس کی مثال آج ملنی مشکل ہے۔ ملاحظہ ہو ُدکھ

بھرے دن بیتے رہے بھیا، متوالا جیا' فرفر کرتی چھم چھم کرتی گاڑی ہمری جائے وغیرہ وغیرہ.... شکیل نوشاد اور دلیپ کمار کی ایسی ہی مشکل سچویشن والی فلم تھی۔ گنگا جمنا.... گنگا جمنا میں پہلی بار بھوج پوری زبان کا استعمال ہوا تھا۔ بھوجپوری گانے لکھنا ایک اردو شاعر کے لئے آسان کام نہ تھا لیکن گنگا جمنا کے گانے شکیل صاحب نے بے مثال لکھے جو آج بھی مقبول ہیں اور نوشاد کی دھنوں پر ایسے فٹ بیٹھے کے آج تک ان کی موسیقیت کانوں میں رس گھولتی ہے۔ گنگا جمنا کے یہ گانے ''نین لڑ جئی تو'' یا ''ڈھونڈ و رے ساجنا'' یا ''نامانوں نامانوں رے'' کے بارے میں شکیل صاحب سے جب پوچھا گیا کہ آپ نے یہ گانے کیسے لکھے تو شکیل بدایوانی صاحب نے کہا کے میں نے اس علاقے میں جا کر بھوجپوری میں گانے لکھے۔ شکیل صاحب اور دلیپ کمار کی اس کامیاب کوشش کے بعد کئی دیگر اداکاروں نے بھی بھوجپوری گانے لکھوا کر (امیتابھ بچن کھائی کے پان بنارس والا) گائے مگر وہ بات جو گنگا جمنا میں تھی نہ آسکی۔ شکیل بدایوانی نے موسیقار روی کے ساتھ ایک عمدہ فلم کے گیت لکھے اور وہ بھی فلم لاجواب ہوئی یعنی ''چودھویں کا چاند''۔ شکیل بدایوانی کا فلمی سفر ان کے انتقال کے ساتھ فلم رام اور شیام کے بعد ختم ہو گیا لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اتنے نامور شاعر کی نہ کوئی یاد مناتا ہے اور نہ ہی شکیل صاحب کا آج کوئی نام لیوا ہے۔ خود موسیقار اعظم نوشاد بھی اپنے اس دیرینہ رفیق کو بھلا بیٹھے ہیں۔ فلمی شاعری کی وجہ سے اردو ادبی دنیا بھی شکیل صاحب کو وہ مقام نہیں دیتی جو ان کا حق ہے۔ لیکن دنیا بھر میں پھیلے فلمی گانوں کے شائقین شکیل صاحب کو ان کے یادگار اور لازوال فلمی گیتوں کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

☆☆☆

ہندی فلموں میں ہندوستان کی کمی

حسن کمال

اچھی فلم کسے کہتے ہیں؟

یہ سوال اگر مختلف ذہنی سطح رکھنے والے لوگوں سے پوچھا جائے تو اس کے جوابات بھی ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد ہوں گے۔ مثال کے طور پر فلم بینوں، بلکہ فلم سازوں کا بھی ایک بڑا حلقہ اس سوال کا جواب یہی دے گا کہ اچھی فلم وہ ہے جو پیسہ دے کر ٹکٹ لینے والوں کو دو تین گھنٹے کے لئے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دے جس میں تفریح کا ایسا اور اتنا مواد موجود ہو کہ آدمی کو کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ ملے اور وہ کچھ دیر کے لئے ایسی دنیا میں پہنچ جائے جو اس دنیا اور اس دنیا کے جنجال سے بہت دور ہو___ سماجیات اور عمرانیات کے ماہر اس سوچ کو بڑی آسانی سے ''فرار پسندی'' قرار دیں گے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اکثریت کے لئے تفریح Entertainment کی یہی تعریف ہے۔

بالکل دوسرے قطب پر ایک حلقہ چھوٹا موٹا ہی سہی، ایسا بھی ملے گا، جس کی نظر میں فلمسازی بھی اپنی شخصیت کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ یہ حلقہ ادب اور فلم دونوں میدانوں میں موجود ہے۔ اور داخلیت کی تہوں میں اترنے کو فن کی معراج قرار دیتا ہے __ یہ حلقہ تجریدی اور علامتی اظہار کو ترجیح دیتا ہے۔ ترسیل (Communication) اس حلقہ کے لئے کوئی قابلِ توجہ حقیقت نہیں۔ فلموں میں نام نہاد ''نئی لہر'' کا اسکول اسی حلقہ پر مشتمل ہے۔ یہ حلقہ گودارو (فرانس)، کروساوا (جاپان) اور فلینی مائکل انجیلیو انیٹسونی (اٹلی) جیسے فلم ڈائریکٹروں کی دُہائی دیتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان عظیم فن کاروں کے فن کی داد دینا شاید ابھی ہندوستانی فلم بینوں کے لئے کافی عرصہ تک ''بس کی بات'' نہ ہو۔

لیکن ان قطبین سے ہٹ کر فلم بینوں کی ایک بڑی تعداد ہے جو ان دونوں اسکولوں کے بین بین چلتی ہے۔ انہیں آپ چاہیں تو ''درمیانہ رو'' یا اوسط درجے کا ذہن رکھنے والے لوگ کہہ لیں___ لیکن فلم ہو یا ادب، اس کی مقبولیت کا معیار یہی قارئین یا تماش بین رہے ہیں۔ یہ حلقہ تعلیم یافتہ اور نیم تعلیم یافتہ بلکہ کبھی کسی غیر تعلیم یافتہ افراد پر مشتمل ہوتا ہے___ اور گھوم پھر کر چلتی اسی کی ہے___ کیونکہ فلمسازوں اور فلم دیکھنے والوں

کی بڑی تعداد اسی طبقہ سے آتی ہے___ اوسط درجہ کا ذہن رکھنا اگر کوئی گالی ہے (دانشوروں کے خیال میں یقیناً ہوگی) تو سب سے پہلے میں خود کو اس گالی کا حق دار، بلکہ طلب گار سمجھتا ہوں۔

یہی وہ طبقہ ہے جس نے ہندوستان میں بننے والی ان بے شمار فلموں کی داد دی ہے، جن میں تفریح کے ساتھ کچھ سوچنے سمجھنے کا مواد بھی فراہم کیا گیا ہو۔'دنیا نہ مانے' ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی' پڑوسی' دو آنکھیں بارہ ہاتھ (وی شانتا رام)۔ نجمہ' انمول گھڑی' انداز' آن' مدرانڈیا' (محبوب خان)' دو بیگھہ زمین' مدھومتی' بندنی' سجاتا (بمل رائے)' داغ' سیما' پتیتا' (امیہ چکرورتی)' ایک ہی راستہ' گم راہ' قانون' دُھول کا پھول' سادھنا' نکاح' (بی۔آر۔چوپڑہ)۔ پیاسا' چودھویں کا چاند' (گرودت) برسات' آوارہ' شری ۴۲۰' جس دیش میں گنگا بہتی ہے' پریم روگ (راج کپور) ٹیکسی ڈرائیور' افسر' حقیقت' ہیر رانجھا' (چیتن آنند) مغل اعظم' (کے آصف) ان سب اور ان جیسی تمام فلموں کو پسند کرنے اور انہیں کلاسیکی کامیابی سے ہم کنار کرانے والوں کو میں اسی طبقہ سے متعلق جانتا ہوں۔ میں ان فلموں کی افادیت جس میں صاف ستھری تفریح کے ساتھ کچھ ذہنی خوراک بھی شامل ہے، کا قائل ہوں۔ میں نے اوپر جن فلموں کا ذکر کیا ہے، اس کو قطعی فہرست کا نام نہیں دیا جا سکتا___ لیکن معیار کے لحاظ سے اس زمرے میں شامل دوسری بہت سی فلمیں بھی اس پیمانے پر پوری اترتی ہوں گی۔

تشویش یہ دیکھ کر شروع ہوتی ہے کہ آج بننے والی فلموں کی اکثریت اس پیمانے پر بھی (صاف ستھری سوچ کے پہلو کے ساتھ) پوری نہیں اترتیں، بلکہ اس سے خاصی دور جا چکی ہیں___ یہ سب کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ کب ہوا؟ اور کب تک ہوتا رہے گا___ آیئے، ان سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔

سب سے پہلے تو اسی دعوے کا جائزہ لیا جائے کہ آج کی ہندی یا ہندوستانی فلم نے بہت ترقی کر لی ہے اور وہ دنیا کی کسی بھی لمبی انڈسٹری (یا فلم) سے آنکھیں ملا سکتی ہے___ ایسا نہیں کہ اس دعویٰ میں کوئی دم نہ ہو لیکن اس کی تصدیق یا تردید کرنے سے پہلے ان عناصر کا جائزہ لینا ضروری ہے جن کے ''ظہور ترتیب'' سے فلم بنتی ہے۔

فلم کی تشکیل دو اہم ستونوں پر ہوا کرتی ہے۔ ان میں سے ایک کا تعلق مشینی یا غیر مشینی تکنیک سے ہے اور دوسرے کا خالصِ جمالیات اور جمالیاتی قدروں سے پہلے شعبے میں کیمرہ' ریکارڈنگ، مکسنگ، ایڈیٹنگ، ساؤنڈ ایفکٹ اور وہ تمام چیزیں آتی ہیں جو مشینوں کی مرہون منت ہیں___ دوسرے شعبے میں کہانی منظرنامہ،

مکالمہ،موسیقی اورجذبات نگاری وغیرہ کودخل ہے۔

جہاں تک مشینوں کاتعلق ہے،کیمرے سے لے کر موسیقی کے آلات تک کی دنیا میں زبردست انقلاب آیا ہے۔ایسی ایسی مشینیں اورکیمرے کے ایسے ایسے لینس ایجاد ہوئے ہیں جس کا کرشمہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔امریکہ،جاپان اورجرمنی نے خصوصاً فلم میں استعمال ہونے والی مشینوں کی کایاپلٹ کر رکھ دی ہے__یہ مشینیں جونتائج بہم پہنچاتی ہیں وہ بے حدتحیّر کن ہیں__تصویراورآواز کے ایسے کمالات آج کی فلموں میں دیکھنے کو ملتے ہیں جن کا آج سے بیس تیس برس پہلے تصوّر بھی ممکن نہیں تھا__سنیما اسکوپ فلم سے لے کر ویڈیو فلم تک ایسی تکنیکی ترقی ہوئی ہے،جس کی مثال نہیں ملتی۔

موسیقی کے میدان میں اب''سنتھے سائزر'' ایک مقبول عام ساز یا موسیقی کی مشین ہے،جس کا استعمال ہرگانے کی موسیقی میں ضروری سمجھا جانے لگا ہے__یہ ایک برقی آلہ ہے جس سے کمپیوٹر کی تکنیک سے مختلف سازوں کی آواز نکالی جاسکتی ہے__یہ بیک وقت بیس بیس سازوں کی جگہ استعمال ہوسکتا ہے۔

کیمرے کے لینس بھی اتنے ہوگئے ہیں کہ چھوٹی سی چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز کو آسانی سے فریم میں لیا جاسکتا ہے۔ساؤنڈ ریکارڈنگ کے شعبے میں بھی اسی طرح بے پناہ انقلاب برپا ہوچکا ہے__ایڈیٹنگ کی نئی مشینوں سے فاسٹ کٹنگ اورسپرامپوزنگ کے کرشمے دکھائے جاسکتے ہیں__ظاہر ہے کہ اس کے سبب فلم کی رفتاراوراس کی تکنیک کے معیار پر جواثر پڑا ہے اسے ایک مثالی ترقی کہا جاسکتا ہے اوراس لحاظ سے فلم سازی گزشتہ بیس برس میں سوبرس کی چھلانگ لگا چکی ہے۔

لیکن کیا یہی بات فلم کے اس ستون یا شعبہ کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے،جس کا تعلق جمالیات اورجمالیاتی قدروں سے ہے۔جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے،فلم کا یہ حصّہ ایسی اشیاء پرمبنی ہوتا ہے جن کا تعلق انسانی ذہن سے ہے یا اگر فلم والوں کی زبان میں کہئے تو ان کا تعلق دل کو چھونے والی باتوں سے ہوتا ہے__اس پر ترتیب واراورتفصیل سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔

فلم کی عمارت کی بنیاد کا پہلا پتّھر کہانی ہے__کہانی کے میدان میں ہماری فلم انڈسٹری کتنی آگے گئی ہے؟اگر بحث ہوتو شاید نتیجہ یہی نکلے کہ آگے کی جگہ پیچھے گئی ہے__شاید یہ کہا جائے کہ آج بھی ایسی فلمیں بنتی ہیں جن میں کہانیاں ہوتی ہیں اوراچھی ہوتی ہیں__''دیوار'' سے''اردھ ستیہ'' تک اگر

سینکڑوں نہیں تو پچاسوں ایسی فلمیں ہیں جن کی کہانی کی خوب صورتی کی دہائی دی جاسکتی ہے۔لیکن اگر فی صد نکالا جائے تو معاملہ دو سے آگے نہیں بڑھے گا__ہندی فلم انڈسٹری ڈیڑھ دوسو فلمیں ہرسال بناتی ہے،ان میں سے اگر دو چار فلمیں ایسی ہوں جن میں کہانی پر زور دیا گیا ہو،تو اس سے بات نہیں بنتی__اکثریت ایسی فلموں کی ہے جن میں یا تو کہانی کا سرے سے وجود ہی نہیں،یا اگر ہے تو پھر وہی کہانی اسی سال بننے والی چالیس دیگر فلموں میں دہرائی جاچکی ہوتی ہے__ایک ہی کہانی پر(اگر اسے کہانی کہا جاسکتا ہے تو) کئی کئی فلمیں ایک ساتھ بننا ایک مرض کی طرح عام ہے۔

کہانی کا نہ ہونا ہی اصل میں سب سے بڑا مسئلہ ہے__۱۹۶۰ء کی نصف دہائی تک بہرحال کہانی پر زوردیا جاتا رہا ہے اوردوسری بہت سی فلموں کے باوجود ہرفلم میں اچھی بُری کہانی ہوتی ضرور تھی__اس کے بعد کہانی دوسرے نمبر پر چلی گئی__پہلے نمبر پر ایک اور چیز آگئی جسے فلمی اصطلاح میں Treatment کہا جاتا ہے__اسے آسان زبان میں طرزِ ادا کہہ لیجئے__جس طرح قدیم لکھنؤ اسکول کی شاعری میں زیادہ اہم یہ نہیں سمجھا جاتا تھا کہ شعر میں بات کیا کہی گئی ہے بلکہ زیادہ اہمیت اس کو دی جاتی تھی کہ بات کیسے کہی گئی ہے__یعنی اسے کس شاعر نے کس طرح باندھا ہے__غالب نے شاید اسی پر پھبتی کسی تھی:

تیرے تو سن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں

فلم کو بھی یہ طرزِ ادا لے ڈوبی۔ٹریٹمنٹ کے چکّر میں کہانی فراموش کردی گئی__بالکل اسی طرح جس طرح تفریح کے چکّر میں سماجی مسائل کو یکسر بھلا دیا گیا__لیکن کہانی کا یہ زوال بے وجہ بھی نہیں آیا__اس کے اسباب ہیں اورنمایاں اسباب ہیں۔یہ ضرور ہے کہ ان اسباب پر سنجیدگی سے توجّہ نہیں دی گئی۔

پچھلی دو دہائیوں میں ہندوستانی فلم مکمل طور پر بڑے شہروں اورخصوصاً بمبئی کی عکاسی بن کر رہ گئی ہے__فلموں سے ہندوستان کا چھوٹا شہر تقریباً غائب ہوچکا ہے۔چھوٹے شہروں کے کلچر کو ماضی کی چیز سمجھ لیا گیا ہے ہندوستان کے دیہات کا تو ذکر ہی کیا۔ڈاکوؤں کے تھیم پر بننے والی فلموں میں ہندوستان کا جو دیہات نظر آتا ہے،وہ دراصل بمبئی کے چاندبولی علاقے میں بنا ہوا ایک مستقل گاؤں ہے،جس میں اُلٹ پھیر کی جاتی رہتی ہے__یہ بنایا ہوا گاؤں ہے اس لئے اس کا کلچر بھی اتنا ہی مصنوعی ہے__اگر میرا خیال غلط نہیں

ہے تو ’’گنگا جمنا‘‘ شاید وہ آخری فلم تھی جس میں تھوڑا بہت، اچھا بڑا شمالی ہندوستان کا ایک گاؤں نظر آیا تھا۔

یہ مانا کہ اب دیہی زندگی بھی بدل چکی ہے ــــ وہاں بجلی پہنچ چکی ہے ــــ سڑکیں بن گئیں ہیں، لیکن وہاں جو زندگی دھڑکتی ہے اس میں اب بھی ہندوستانیت کی بو باس موجود ہے اور اسے اب بھی ہندوستان کی تہذیب کی اکائی تصوّر کیا جا سکتا ہے۔

ہوا یہ کہ اب فلموں میں یہ رجحان جڑ پکڑ چکا ہے کہ کوئی نیا تجربہ کرنے کی بجائے مغرب بلکہ امریکہ میں بنی ہوئی ہٹ فلموں کا چربہ اتار لیا جائے ــ یہی سبب ہے کہ فلمیں بھی ایک طرح کی بننے لگی ہیں اور ان میں ہندوستانیت کا فقدان بھی بڑھتا چلا گیا ہے۔

شانتا رام، محبوب خاں، بمل رائے، گرودت، بی، آر چوپڑہ اور اسی قسم کے دیگر ڈائریکٹروں کے بعد جس نئی نسل نے ہندی فلم سازی کی باگ ڈور سنبھالی، وہ تقریباً تمام کی تمام اپنی جڑوں اپنی دھرتی سے کٹے ہوئے مغرب زدہ جوانوں پر مشتمل تھی۔ یہ نسل وہ تھی جس کی نہ صرف تعلیم و تربیت مغربی طرز کے اسکولوں میں ہوئی تھی، بلکہ یہ وہ نسل تھی جو اپنی مادری زبان سے بھی ناواقف تھی، چاہے اس کی مادری زبان کچھ بھی کیوں نہ رہی ہو۔ یہ نسل ہندوستان میں پیدا ہونے والے ادب سے ناواقف تھی ــــ اس نسل نے ہندوستانی زندگی کو مغربی عینک سے دیکھا تھا (مغرب کی اصطلاح ہم عادتاً استعمال کرتے ہیں، دراصل اب تو سارا مغرب، امریکہ میں سمٹ کر رہ گیا ہے) اس نسل کے ذہنی رہنما ہندوستان کے پرانے اور ان کے پیش رو فلم ساز نہیں تھے۔ ان کا آدرش امریکی ڈائریکٹر ہیں۔ ادب تک ان کی رسائی امریکی فنکشن تک محدود ہے ــــ یہی وہ نسل ہے جو فلم سازی کے میدان میں اترتی ہے تو کہانی کے نام پر اس کے پاس یا تو ہالی ووڈ کی فلمیں ہوتی ہیں یا چیز، ہیرالڈ روبنس اور لٹر میکلین کی کتابیں ــــ یہ لوگ اچھّی ہندی یا اچھّی اردو کے مستحل نہیں ہو سکتے ــــ ہندی کے نام پر ان کی معلومات کی حد بمبیّا زبان ہے ــــ ظاہر ہے کہ جب یہ مکالمے یا گانے لکھواتے ہیں تو پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ لکھا جائے وہ ان کی سمجھ میں آنا چاہئے ــــ یہ اپنی زبان اور اپنی سمجھ کو ہندوستانی فلم دیکھنے والی تمام آبادی کی زبان اور سمجھ قرار دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زبان اور اس کے ساتھ مکالموں کا معیار پست تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ مزہ یہ ہے کہ یہ اپنی ناواقفیت کو عوام کے سستے پن پر معمول کرتے ہیں اور اصرار

کرتے ہیں کہ عوام وہی چاہتے ہیں جو یہ چاہتے ہیں۔ اس نسل کی ’’پریرنا‘‘ (تحریک) کا سرچشمہ مغرب اور خصوصاً امریکہ میں ہے ــــ ان کے جسم ہندوستان میں ہیں، لیکن ان کا دل و دماغ مغرب میں ہے ــــ یہی وجہ ہے کہ انہیں ہندوستانی جذبات کو سمجھنے اور ان کی صحیح عکاسی کرنے میں دقّت محسوس ہوتی ہے یہ لوگ ہندوستان میں صرف بمبئی کی زندگی سے واقف ہیں، اور بمبئی کی سوچ اور بمبئی کی قدروں کا اطلاق سارے ہندوستان پر کرتے ہیں ــــ حالانکہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ہندوستان کی یہ مالی راج دھانی ہندوستان میں ہوتے ہوئے بھی باقی ہندوستان سے کافی دور ہے ــــ علاقائی فلمیں نسبتاً اپنی زمین سے قریب ہوتی ہیں، اس لئے علاقائی فلمی صنعت کا ہندی فلمی صنعت کے مقابلہ میں حال زیادہ بہتر ہے۔

بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ آج کل جس قسم کی ایکشن پر مبنی فلمیں بن رہی ہیں، ان پر اصرار کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ ایک عام ہندی فلم کی لمبائی عموماً تیرہ ہزار فٹ ہوتی ہے جس میں عموماً پانچ گانے اور خاصی مار دھاڑ شامل ہوتی ہے ــــ پانچ گانے لگ بھگ چار پانچ ہزار فٹ تک ہوتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ گذشتہ چند برس میں فلموں میں ڈانس ڈائریکٹر کی اہمیت اچانک بڑھ گئی ہے۔ اور اکثر گانے اسی کی مرضی کے مطابق فلمائے جاتے ہیں ــــ بعض صورتوں میں تو فلم کا ڈائریکٹر گانوں کو فلمائے جانے کے وقت سیٹ پر موجود ہی نہیں رہتا ــــ صرف ڈانس ڈائریکٹر ان گانوں کو فلماتے ہیں ــــ اس طرح چار پانچ ہزار فٹ فلم مکمل طور پر ڈانس ڈائریکٹر کی تحویل میں ہوتی ہے ــــ

اس طرح کل چار پانچ ہزار فٹ فلم ڈائریکٹر کے اپنے حصے میں آتی ہے جس میں وہ کہانی، جذبات کے اُتار چڑھاؤ اور دیگر لوازم کی نگرانی کرتا ہے ــــ ظاہر ہے کہ ایک سنجیدہ اور صاف ستھری فلم بنانے میں ڈائریکٹر کو تمام کی تمام فلم کی ذمہ داری قبول کرنا ہوتی ہے ــــ موجودہ صورتِ حال میں اس کی ذمہ داری اور کام دونوں کم ہو جاتے ہیں۔ اور آج کے ڈائریکٹر اس صورت حال کو ترجیح دیتے ہیں ــــ کام کم اور پیسہ حسبِ منشا ــــ ظاہر ہے اس سے بہتر فلم سازی اور کیا ہو سکتی ہے؟

آج مشینوں کا قد انسان کے قد سے بہت اونچا ہو چکا ہے۔ مشینوں کی یہ بالا دستی انسانی صلاحیتوں پر حاوی ہوتی جا رہی ہے ــــ ذرا سوچئے کہ آج ہر چند کہ کیمروں کی بدولت فوٹو گرافی نہایت شان دار نظر آتی ہے لیکن کیا ان کیمروں کے پیچھے کھڑے ہوئے فوٹو گرافروں کا مقابلہ (مثال کے طور پر) فریدوں ایرانی سے

کیا جاسکتا ہے، جنہوں نے ایک معمولی کیمرے کو بولنا سکھا دیا تھا۔

موسیقی کے میدان میں بھی یہی نقشہ نظر آتا ہے۔ گانوں کی درمیانی میوزک بہت لمبی بھی ہوگئی اور بہت جاندار (اکثر پُرشور) لمبی ___ لیکن جہاں تک گانوں میں نغمگی (MELODY) کا سوال ہے، آج کے گانوں کا شاید ایک فی صد ہی آج سے بیس سال قبل کے گانوں کی خوشگواری کے آگے ٹک پائے ___ یہاں بھی مغربی موسیقی کی بے جا اور کبھی کبھی ظالمانہ تقلید نے ستیاناس کر رکھا ہے ___ یہاں بھی بمبئ کی پسند کو سارے دیس کی پسند مان لیا گیا ہے۔

ایک واقعہ یاد آ گیا۔ مشہور فلم ساز' بی آر چوپڑہ فلم طوائف کے لئے ایک جوان ہیرو کو لینا چاہتے تھے جس کی پہلی فلم سپر ہٹ ہوئی تھی ___ کہانی سننے کے بعد سپر ہٹ ہیرو نے کہا ''انکل! یہ آپ مجھے کیسی کہانی سُنا رہے ہیں ___ یہ آداب عرض اور سلام اور شاعرانہ ڈائیلاگ مجھے راس نہیں آتے ___ مجھے تو کوئی ایسی فلم دیجئے جس میں گٹار لے کر گانا گاتے ہوئے دکھایا جاؤں ___'' فلم میں گٹار کی گنجائش نہیں تھی اس لئے کسی اور ہیرو کو لے لیا گیا ___ لیکن ایک دن پبلک نے اسی ہیرو کے ہاتھ سے گِٹار چھین لیا۔

اس واقعہ کو سنانے سے کسی کی تحقیر مقصود نہیں تھی ___ صرف اس ذہنیت کی طرف اشارہ کرنا تھا جو اس نسل پر سوار ہے اور جس کے نتیجے میں ہندی فلم ہندوستان سے دور ہوتی چلی جارہی ہے۔

اس مضمون کے بعض قارئین مجھے شاید شدید قسم کا رجعت پرست اور مغرب دشمن سمجھیں گے لیکن ایسا ہے نہیں ___ مجھے اعتراض صرف یہ ہے کہ اوّل تو مغرب کی 'بندر نقل' مضر رساں ثابت ہو رہی ہے، دوسرے ہم مغربی فلموں کے پہلوں سے فیض یاب نہیں ہو رہے ہیں، جن میں انسانی زندگی گوناگوں صفات کی عکاسی کی جاتی ہے۔ اور جن کی وجہ سے مغربی فلمیں ہماری ہی دنیا اور ہماری ہی زندگی کا کوئی حصہ لگتی ہیں۔

آج کی بیشتر فلموں کے کردار ایسے ہوتے ہیں جن پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ کردار ہمارے اِردگرد پیدا بھی ہوتے ہیں یا نہیں؟ یہ کردار ہم میں سے ہیں یا کسی اور سیّارے سے تعلق رکھتے ہیں؟

اب رہا سوال کہ یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟ تو اس ضمن میں بس اتنا عرض کرنا کافی ہے کہ ایک ہی جیسی فلموں کے باکس آفس پر مسلسل ناکام ہونے کے بعد فلم والوں کو یہ سوچنا پڑے گا کہ اس روش میں تبدیلی بہت ضروری ہے۔ میں اس چینی مقولے کا بے حد قائل ہوں کہ '' آپ بہت سے لوگوں کو کچھ دن تک اور کچھ لوگوں کو

بہت دن تک بے وقوف بنا سکتے ہیں۔''

ضرورت اس بات کی ہے کہ فلم انڈسٹری پر سے مغرب زدہ بمبیّا نسل کا تسلط ختم ہو اور فلم ساز، کہانی کار اور ڈائریکٹر ان چھوٹے شہروں سے آئیں، جہاں ہندوستان کا کلچر پنپتا ہے اور اس کا دل دھڑکتا ہے، اس ساعت کا انتظار تمام فلم بینوں کو بھی ہے۔

یاد رکھئے کہ عوام کی پسند پر ساری ذمہ داری تھوپنا، بڑی غیر ذمہ داری کا ثبوت دینا ہے ___ بھوکے کو کھانا چاہئے ___ اگر کھانا خراب بھی ہے تو بھوکا کھالے گا_ سنیما ہندوستان کی سب سے سستی تفریح ہے اور اس کے نام پر جو کچھ دکھایا جائے گا لوگ اس میں سے اچھا برا چن لیں گے۔ لیکن اچھی فلم کو عوام کبھی نظر انداز نہیں کرتے ___ دیوار، کبھی کبھی، چھوٹی سی بات، اردھ ستیہ، نِکاح، آج کی آواز، ارتھ، اور 'امراؤ جان' تک یہی کہانی نظر آتی ہے ___

☆☆☆

فلموں میں کوٹھے

پریم پال اشک

ہمارے ادب میں طوائفوں کی زندگی اور کوٹھے کے ماحول پر افسانے اور ناول آٹے میں نمک کے برابر لکھے گئے ہیں۔ لیکن اس موضوع پر لاتعداد فلمیں بنی ہیں۔ یوں تو ہر فلم میں کوٹھے کا کوئی نہ کوئی سین یا ایک آدھ مجرا ٹھونس دیا جاتا ہے۔ مگر ہمارے یہاں ایسی فلموں کی بھی کمی نہیں ہے کہ جن میں آزادانہ طور پر کوٹھے کے ماحول کی عکاسی ہوتی رہی ہے۔ یہ نمائندگی خاموش فلموں کے دور میں بھی ہوئی اور بولتی فلموں کے عہد میں بھی۔

خاموش دور میں طوائف کی زندگی کو سردار چندولال شاہ اور مس گوہر نے ۱۹۲۸ء میں اپنی فلم ''وشوموہنی'' میں غالباً پہلی بار پیش کیا۔ اس فلم کی کہانی کافی موثر تھی اور اس کے ساتھ ہی اس فلم کی یہ خصوصیت بھی تھی کہ اس میں مس گوہر نے تین بہنوں کا رول ایک ساتھ ادا کیا تھا۔ اس فلم کی فوٹوگرافی بھی کافی خوبصورت تھی۔

بولتی فلموں کے عہد میں طوائف پر مبنی مذکورہ موضوع پر بننے والی فلموں کا سیلاب آ گیا۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی ۱۹۳۲ء میں جڑی جب کہ مہالکشمی سینےٹون نے اس فلم کے مہورت پر مرحومہ شریمتی لیلاوتی منشی کی زیرِ صدارت ایک اجلاس بھی ہوا۔ اس میں پریم چند نے کہا تھا کہ اس ناول سے اگر سماج کا کچھ بھلا ہو جائے تو میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھوں گا۔ یہ فلم ایک طوائف کی زندگی اور کردار پر مبنی تھی اور اس ناول میں طوائفوں کے مسائل اور سماج میں ان کے مقام کے پہلو پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ لیکن منشی پریم چند کا یہ ناول عوام میں جتنا مقبول ہوا فلم بینوں کو تو کیا پورے سماج کو اس کا فلمی روپ اچھا نہیں لگا کیوں کہ فلمساز نے اس کہانی اور کرداروں کے ساتھ اس حد تک چھیڑ چھاڑ کی تھی کہ منشی پریم چند خود فلم دیکھ کر شش و پنج میں پڑ گئے تھے کہ فلم کی یہ کہانی انہوں نے خود لکھی ہے یا کسی اور نے۔

مگر یہ کارواں رکا نہیں' چلتا رہا۔ آخر ۱۹۳۸ء میں وی شانتارام نے پربھات فلمز کے جھنڈے تلے ایک ایسا کارنامہ کر دکھایا جو ہماری فلمی تاریخ میں سنگِ میل ثابت ہو گیا۔ یہ فلم تھی ''آدمی'' شانتارام کا یہ قدم دوسرے فلمسازوں کے لئے تحریک کا موجب ہوا۔ اس فلم میں ایک عورت کے مختلف روپ پیش کئے

گئے تھے۔ اس فلم میں ایک عورت کی مجبوری ظاہر کی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ ایک عورت کو پیشے کے لئے کس طرح مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اس کے نازک جذبات۔ بے بسی لاچار۔ غم۔ دکھ۔ اور محبت کو حقیقی انداز سے پیش کیا گیا تھا۔ فلم میں شانتا ہبلیکر شاہو مودک رام مراٹھے اور سندر بائی نے لاجواب اداکاری کی تھی۔ اس فلم میں شانتا ہبلیکر نے ایک طوائف کا رول ادا کیا تھا۔ جو ایک پولیس کانسٹیبل (شاہو مودک) سے پیار کرنے لگتی ہے۔ آخر وہ اپنی قربانی سے شاہو مودک کو جینے کا ایک نیا انداز سکھا دیتی ہے۔ دراصل شانتا رام کی یہ فلم نہیں تھی بلکہ سماجی انقلاب کی جانب ایک صحت مند قدم تھا۔

۱۹۴۴ء میں سنٹرل اسٹوڈیو بمبئی کے جھنڈے تلے فلمساز ہدایتکار اور فلم ایکٹر سہراب مودی کی زیرِ ہدایت ایک نہایت اہم فلم ''پرکھ'' آئی۔ اس فلم کی کہانی پنڈت سدرشن نے لکھی تھی۔ اس میں ایک طوائف کی ماں کی مجبوری یاس اور ناامیدی کی عکاسی کی گئی تھی اور اسے نہایت دردناک انداز سے پیش کیا گیا تھا۔ اس فلم کی ہیروئن مہتاب تھی۔ اس نے اس فلم میں اپنی زندگی کا بہترین رول ادا کیا تھا۔ غالباً مہتاب کی بے مثل اداکاری سے خوش ہو کر سہراب مودی نے مہتاب کو شادی کے روپ میں بونس ادا کیا تھا۔ علاوہ ازیں اس فلم میں یعقوب نے ولن کے طور پر جلوہ گر ہو کر تماشائیوں کے دل لوٹ لئے تھے۔

پاکستان بننے کے فوراً بعد ڈائریکٹر ولی صاحب کی فلم پتلی آئی تھی۔ بھارت میں یہ ان کی آخری فلم تھی۔ اس کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ اس فلم کی کہانی ایک کال گرل اس کے دلال اور ایک جیب کترے کے گرد گھومتی ہے۔ فلم کی ہیروئین ممتاز شانتی تھی۔ دلال کا رول پران نے اور جیب کترے کا کردار یعقوب نے بڑے دھانسو انداز سے نبھایا تھا۔ اگرچہ یہ فلم باکس آفس پر ناکام رہی لیکن ممتاز شانتی' پران اور یعقوب کی اداکاری بے مثل تھی۔ خاص طور پر پران کے سگریٹ کے چھلّے اب تک فراموش نہیں کئے جا سکتے۔

نیا سنسار کے جھنڈے تلے خواجہ احمد عباس کی فلم ''انہونی'' آئی۔ اس میں دو بہنوں کی کہانی پیش کی گئی تھی۔ حالات نے ان میں سے ایک کو ایک خانہ دار خاتون بنا دیا اور دوسری کو طوائف اس میں نرگس نے یادگار رول ادا کیا تھا۔ میرے خیال میں مستقبل کے مورخ اور نقاد جب نرگس کا فنی تجزیہ کریں گے تو فلم ''انہونی'' کو سرِفہرست رکھا جائے گا اور اسے اس کے فلم کیریر کی بہترین فلم تصور کیا جائے گا۔

۱۹۵۷ء میں گرودت کی ایک جاندار اور بھرپور فلم ''پیاسا'' آئی تھی۔ اس میں ایک شاعر

اور ایک طوائف کے مسئلے کو بڑے سنجیدہ اور سلجھے ہوئے انداز سے پیش کیا گیا تھا۔ اس میں گرودت ہیرو تھا اور وحیدہ رحمان ہیروئن۔ اور ''گھائل کی گتی گھائل جانے'' کے مصداق گرودت کی سماجی تلخیوں کا سارا زہر امرت سمجھ کر وحیدہ خود پی لیتی ہے۔ اس فلم میں بتایا گیا تھا کہ ہمارا ظالم سماج فنکاروں کا ان کی زندگی میں احترام نہیں کرتا بلکہ ہر قدم پر ان کو ایکسپلائٹ کرتا ہے۔ فنی نقطہ نظر سے ''پیاسا'' گرودت کے فلم کیریر کا ایک کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔

۱۹۵۸ء میں نرگس اور پران کی فلم ''عدالت'' آئی تھی۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ ایک بے بس عورت کو طوائف بننے پر کس طرح مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اس فلم میں نرگس اور پران کی اداکاری لاجواب تھی۔

اسی سال بی۔ آر چوپڑہ کی فلم ''سادھنا'' درحقیقت ۱۹۵۸ء میں آنے والی اہم فلموں میں سے ایک تھی۔ اس فلم میں بی۔ آر چوپڑہ نے ایک ایسی طوائف کا کردار پیش کیا جو گھر بسانے کی خواہاں ہے اور یہی تڑپ اس کے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ آخر اسے سماج کس طرح قبول کرتا ہے اس کی عکاسی بڑے صاف ستھرے ڈھنگ سے کی گئی تھی۔ اس فلم کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس پر شانتا رام کی فلم ''آدمی'' کا گہرا اثر تھا۔ لیکن علم و عمل کا جو پیغام شانتا رام نے دیا تھا بی۔ آر چوپڑہ نہ دے سکے۔

۱۹۵۸ء میں پشپا پکچرز کے جھنڈے تلے اے ناڈیاڈ والا کی فلم ''مہندی'' آئی یہ فلم اردو کے شہرۂ آفاق ناول امراؤ جان ادا پر مبنی تھی۔ ناول بہت خوبصورت ہے لیکن طوائف کی زندگی پر اچھی طرح روشنی ڈالنے والی یہ فلم بری طرح پٹ گئی۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کا جواب ڈائریکٹر سے طلب کیا جا سکتا ہے۔ اس فلم میں کرن دیوان ہیرو تھا۔ اور جے شری ہیروئن تھیں۔ سچ پوچھیے تو کیفیت کریلے اور نیم چڑھے کی سی ہو گئی۔

۱۹۶۳ء میں فلم بھارتی کے جھنڈے تلے نتن بوس کی فلم ''نرتکی'' آئی۔ اس فلم میں بھی ایک طوائف کا کردار پیش کیا گیا تھا۔ اور دکھایا گیا تھا کہ ایک طوائف کو تحصیل علم کا شوق تھا۔ مگر دھندے کا معاملہ، دلالوں کی چیخ چیخ اور کوٹھے پر بیٹھنے والی نائیکا کی بک بک جھک جھک ہمیشہ آڑے آتی رہتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس فلم کی ہیروئن نمی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ فلم ''سادھنا'' کی نقل تھی۔ سادھنا باکس آفس پر ہٹ ہو گئی اور یہ فل فلاپ۔

۱۹۶۴ء میں بمل رائے پروڈکشن کے جھنڈے تلے فلم ساز ہدایت کار بمل رائے نے فلم ''بے نظیر''

بنائی۔ اس فلم کا ہیرو ششی کپور اور ہیروئن مینا کماری تھی۔ ساتھ اشوک کمار بھی تھا۔ اگر چہ یہ فلم بھی ایک طوائف کی زندگی اور کردار کی ترجمان تھی لیکن اپنے مقصد میں ناکام رہی۔ ویسے بھی یہ فلم فلاپ تھی۔

۱۹۶۶ء میں چارو مترا کے بینر میں مشہور بنگالی ناول اتر پھالگنی پر مبنی فلم ''ممتا'' آئی۔ اس میں ایک طوائف کے جذبۂ ایثار کی داستان کو بڑے موثر انداز سے پیش کیا گیا تھا۔ اور طوائف کے کردار کی بڑے خوبصورت ڈھنگ سے عکاسی کی گئی تھی۔ اس کے ڈائریکٹر اسیت سین تھے۔ اس میں سچترا سین اور اشوک کمار نے کام کیا تھا۔ سچترا سین کا ڈبل رول تھا۔ اور اداکاری کے اعتبار سے اسے سچترا سین کی بہترین فلموں میں سے ایک کہا جا سکتا ہے۔

۱۹۷۰ء میں پرساد پروڈکشنز کی فلم ''کھلونا'' آئی۔ اس میں ایک طوائف کو کوٹھے سے اتار کر ایک خانہ دار خاتون بنانے کے سوال کو بڑے دلچسپ ڈھنگ سے پیش کیا گیا تھا۔ ممتاز کو سنجیو کمار کی دیکھ بھال کے لئے تعینات کیا جاتا ہے۔ جب کہ سنجیو کمار پاگل ہے۔ ممتاز اس کا نفسیاتی طور پر علاج کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ فلم باکس آفس کے تمام ٹکٹوں سے بھرپور تھی۔ لیکن زیادہ جاندار نہ تھی کیونکہ اس سے قبل ''سوئم سدھا'' اور ''بہورانی'' جیسی خوبصورت فلمیں آ چکی تھیں۔ ان کا موضوع بھی ایک جیسا تھا۔ البتہ کھلونا سے ایک پہلو پر ضرور روشنی پڑی کہ طوائف بھی ہمارے سماج کا ایک سودمند حصہ ہے۔ اس فلم میں سنجیو کمار مرحوم کی اداکاری لاجواب تھی اور لکشمی کانت پیارے لال کی موسیقی بھی کچھ کم مقبول نہ ہوئی۔

۱۹۷۱ء میں بابورام اشارہ کی سپرہٹ فلم ''چیتنا'' آئی۔ یہ ایک منہ پھٹ کال گرل سے کافی کوشش کے بعد شادی کر لینے والے ایک نوجوان کی کہانی ہے۔ لیکن جب لڑکی کو پتہ چلتا ہے کہ اس کے بطن میں کسی اور کا بچہ پل رہا ہے تو وہ خودکشی کر لیتی ہے اور فلم کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ کافی بولڈ تھی۔ اس میں ریحانہ سلطان نے اپنی زندگی کا معرکتہ الآرا رول ادا کیا تھا۔

اسی دوران ڈاچی فلمز کے جھنڈے تلے نامور افسانہ نگار، فلم ساز اور ہدایت کار راجندر سنگھ بیدی مرحوم نے فلم ''دستک'' بنائی۔ درحقیقت انہوں نے یہ بہت خوبصورت فلم بنائی تھی۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ ایک نیا شادی شدہ مسلم جوڑا ایک ایسے علاقے میں مکان کرایے پر لیتا ہے جو اصل میں بازارِ حسن ہے۔ اور وہ مکان بھی کسی طوائف کا کوٹھا ہوتا ہے۔ لوگ اس فلم کی ہیروئن ریحانہ سلطان کو بھی ایک

طوائف سمجھ کر تماش بینی کے لئے آنے لگتے ہیں تاک جھانک کرتے ہیں، آوازے کستے ہیں اس سے اس جوڑے کو جو ذہنی اذیت پہنچتی ہے، اس کی عکاسی بیدی نے اپنی اس فلم میں نہایت موثر اور حسین انداز سے کی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی اس فلم کے لئے واقعی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ویسے بھی یہ فلم ہٹ ہوئی تھی۔ اس فلم میں سنجیو کمار مرحوم کو بھارت ایوارڈ ملا تھا۔

۱۹۷۲ء میں اس دہے کا سب سے بڑا کارنامہ انجام پایا۔ یہ تھی کمال امروہی کی بھارت میں سب سے پہلی رنگین سنیما اسکوپ فلم ''پاکیزہ'' واقعی پاکیزہ تھی۔ اس میں ایک طوائف کی زندگی، کردار اور ماحول پر بڑے بھرپور انداز سے روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس فلم میں نوابی عہد کی عکاسی بھی کر دی گئی تھی۔ اس فلم میں دکھایا گیا تھا کہ ایک طوائف کو زندہ رہنے اور سماج میں اپنا مقام حاصل کرنے کے لئے کتنے دکھ، کتنی اذیتیں اور کشٹ برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اس فلم کے زوردار' پراثر' چٹکیلے اور دل میں اتر جانے والے مکالمے پوری فلم کی جان تھے اور کئی مقامات پر تو ضرب الامثال بن جانے کے قابل تھے۔ علاوہ ازیں مینا کماری' اشوک کمار' دینا اور نادرہ کی اداکاری بھی لاجواب تھی یہی نہیں بلکہ غلام محمد کی دلنشین موسیقی اور مجروح سلطان پوری کے مجروں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا اور میں تو کہوں گا کہ یہ فلم نہیں تھی بلکہ حسن کا اڈتا ہوا سمندر تھا۔ جس میں سے ہماری تہذیب کے موتی بھی نکالے جا سکتے ہیں۔

اسی دوران فلم ساز رام دیال اور ہدایت کار سکندر رکھنہ مرحوم کی فلم ''پربھات'' آئی۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ ایک بھولی بھالی لڑکی کو جسم فروشی کے لئے کس طرح مجبور کیا جاتا ہے۔ اور اسے اس گندگی سے نکالنے کے لئے کتنی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ کلکتہ کے سوناگاچی اور بمبئی کے فارس روڈ اور بھنڈی بازار کی ایک جھلک اس فلم میں بھی دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ اس میں کوٹھے کے ماحول کو بڑے دلچسپ اور جذبات انگیز انداز سے پیش کیا گیا تھا۔ اس فلم میں زاہدہ، جے کوشلیا' شیاما' کمل کپور اور روپیش کمار نے کام کیا تھا۔ لیکن روپیش کمار نے دلال کا رول ادا کر کے پوری فلم کو لوٹ لیا تھا۔ دراصل ''پربھات'' کو روپیش کمار کی فلمی زندگی کا نقطۂ عروج کہا جا سکتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہ کردار اسی کے لئے لکھا گیا تھا۔ اگرچہ فلم انتہائی ڈرامائی تھی لیکن اسے بار بار دیکھنے کو جی اس لئے چاہتا رہتا ہے کہ اس کے مکالمے بہت زوردار' موثر اور چٹکیلے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس فلم کو جہاں روپیش کمار کی جاندار اداکاری کے لئے یاد رکھا جائے گا وہاں ارجن دیو رشک کے مکالمے بھی

دلوں کو گرماتے رہیں گے۔ انہیں مکالموں کی وجہ سے اس فلم کو دوبارہ سنسر کیا گیا تھا۔ لیکن نئے ایڈیشن میں اتنی کتربیونت کر دی گئی تھی کہ پوری فلم بے جان ہو کر رہ گئی تھی۔

چیتن آنند کی فلم ''ہنستے زخم'' کسے یاد نہ ہوگی۔ اس میں بھی ایک کال گرل کی درد بھری داستان پیش کی گئی تھی۔ مگر فلم پر یہ راج ونش کی بے جان اداکاری کے باعث ڈوب گئی۔

دراصل یہ مطالعہ فلم ''منورنجن'' کے تذکرہ کے بغیر ادھورا رہے گا۔ یہ مشہور انگریزی فلم ''ارملا ڈوس'' کی فریم بائی فریم کاپی تھی۔ جس کا ذکر فلم کے ٹائٹلز میں کر دیا گیا تھا۔ اس فلم کے پرڈویوسر ایف۔ سی۔ مہرہ، ڈائریکٹر شمی کپور اور مصنف ابرار علوی تھے۔ ہیرو سنجیو کمار اور ہیروئن زینت امان۔ اس فلم میں بھی کوٹھے کا ماحول پیش کیا گیا تھا۔ پوری فلم کانسٹیبل سنجیو کمار مرحوم اور طوائف زینت امان کے گرد گھومتی ہے۔ لیکن یہ فلم ہندوستانی ہونے کے باوجود ہمارے ماحول سے میل نہیں کھاتی۔ اور سارا ماحول یورپی نظر آتا ہے۔ جیسی طوائفیں اس فلم میں دکھائی گئی ہیں۔ اگر واقعی ایسا ماحول ہمارے یہاں ہے تو پھر کیا کہنے لیکن

''آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں''

''منورنجن'' اپنی جگہ خوب فلم تھی۔ فلم کی کامیڈی بھی جاندار تھی اور ابرار علوی کے مکالموں نے تو غضب ہی ڈھایا تھا۔ دراصل اس فلم کے ہیرو ابرار علوی ہی تھے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ فلم ہمارے ماحول کے اس پسماندہ طبقے کی نمائندگی نہیں کرتی۔

اس تجزیہ کا ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارا سنیما وقتاً فوقتاً ہمارے سماجی موضوعات کو بیئرر چیک سمجھ کر باکس آفس کے بنک میں کیش کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس میں طوائف کا موضوع بھی شامل ہے۔ اگر چیک کیش ہو گیا تو موضوع ہٹ اور اس پر دھڑا دھڑ فلمیں بننے لگیں اور اگر ڈس آنر ہو گیا تو چیک کو ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتا ہے۔

☆☆☆

ہندوستانی فلم اور قومی یکجہتی

بدرالحسن (مغربی بنگال)

قومی یکجہتی کے تصور کو تقویت پہنچانے اور اسے عام کرنے میں ہندوستانی فلم نے ایک گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔

قومی یکجہتی کی ضرورت کو آج جتنی شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا گیا۔ ویسے جب ہم قومی یکجہتی کی بات کرتے ہیں تو ہمارے تحتِ شعور میں ہندو مسلم اتحاد ضرور ہوتا ہے۔

ہندوستان کو اختلاف میں اتفاق اور انکتا میں ایکتا کا نمونہ سمجھا جاتا رہا ہے کیونکہ مذہبی، لسانی اور ثقافتی اختلافات کے باوجود یہاں کئی صدیوں سے سب لوگ مل جل کر رہتے آرہے ہیں۔

ہندو مسلم اتحاد انگریزوں کے دورِ حکومت میں ایک اہم مسئلہ بن گیا تھا۔ غیر ملکی حکمراں ہندوستان کے دو بڑے فرقوں میں نااتفاقی و ناچاقی پیدا کر کے اس ملک پر راج کرنا چاہتے تھے۔ ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر وہ آخری دم تک عمل کرتے رہے اور جاتے وقت ملک کا بٹوارا کر گئے۔

جنگِ آزادی کے ابتدائی مرحلے ہی سے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ گاندھی جی اور علی برادران اس اتحاد کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ خلاف تحریک میں شامل ہو کر گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد کو بڑی تقویت پہنچائی۔

ہندوستان میں ہندو مسلم فساد پہلی بار منظّم طریقے سے ۱۹۲۸ء میں ہوا تھا۔ محدود پیمانے پر رونما ہونے کے باوجود اس فساد نے ہندوستانی رہنماؤں کے لئے ایک لمحہ فکریہ فراہم کیا اور آزادی کے حصول میں ہندو مسلم اتحاد کو ناگزیر سمجھا جانے لگا۔ اس زمانے میں فلم کمپنی کے جھنڈے تلے فلمیں، بنتی تھیں۔ ہدایت کار، اداکار، میوزک ڈائرکٹر وغیرہ خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ اس وقت کی مشہور فلم کمپنیوں میں نیو تھیٹر (کلکتہ)، پربھات فلمز، بمبئی ٹاکیز، نیشنل اسٹوڈیو، پرکاش پکچرس، مزوا موویٹون، رنجیت موویٹون وغیرہ کافی مشہور تھیں۔

نیو تھیٹر، پربھات تھیٹرز، بمبئی ٹاکیز وغیرہ سماجی اور صاف ستھری تفریحی فلموں کے لئے مشہور

تھیں۔ پرکاش پکچرس زیادہ تر دھارمک فلمیں (رام راج، بھرت ملاپ وغیرہ) بناتی تھیں اور مزوا مووی ٹون کے سہراب مودی تاریخی فلموں کے معاملے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ سکندر اعظم، پکار، جھانسی کی رانی جیسی فلموں کو آج بھی لوگ یاد کرتے ہیں۔

پربھات فلمز میں بابوراؤ پٹڈھارکر اور وی شانتا رام دو ایسی ہستیاں تھیں جنھوں نے موضوعاتی فلموں کو رواج دیا۔ آزادی کے موضوع پر ''امر جیوتی'' بڑھاپے کی شادی کے خلاف ''دنیا نہ مانے'' اور عصمت فروشی کے خلاف ''آدمی'' جیسی فلمیں پیش کرنے کا سہرا پربھات فلمز ہی کے سر ہے۔

ملک کی سیاسی حالت کے پیش نظر وی شانتا رام نے پربھات فلمز کے جھنڈے تلے ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر ایک ناقابل فراموش فلم ''پڑوسی'' بنائی اس میں دو کلیدی کردار تھے۔ ہندو کا رول کریکٹر ایکٹر مظہر خان اور مسلمان کا رول گجانن جاگیردار نے نبھایا۔ یہ دونوں اپنے وقت کے مشہور اداکار تھے۔ جاگیردار تو نسبتاً کم عمر تھے۔

بعد ازاں جب وی شانتا رام نے پربھات سے رشتہ توڑ کر اپنی فلم کمپنی راج کمل کے نام سے کھولی تو سماجی، اصلاحی اور موضوعاتی فلموں کا سلسلہ جاری رکھا۔

لسانی بنیاد پر ریاستوں کی تنظیم نو اور قومی یک جہتی کے پس منظر میں شانتا رام کی فلم ''تین بتی چار راستہ'' کو ایک منفرد مقام حاصل ہے اس میں کرن دیوان کے علاوہ سندھیا، ششی کلا، نروپا رائے، شیلا رمانی اور سمرتی بسواس نے مختلف ریاستوں کی نمائندگی کے باوجود قومی اتحاد کا نمونہ پیش کیا تھا۔ مذہبی رواداری کا پرچار کرنے والوں میں کبیر داس کو ایک تاریخی اہمیت حاصل ہے اور مذہبی بھید بھاؤ کے بالکل خلاف تھے۔ آزادی کے بعد ان کی زندگی سے متعلق ایک سوانحی فلم ''بھگت کبیر'' کلکتہ ہی میں بنی تھی۔ بھارت بھوشن نے جس کا دیہانت کچھ دنوں پہلے ہوا کبیر کا رول ادا کیا تھا۔ میرا خیال ہے یہ اس کی پہلی فلم تھی اس میں جولاہے کا کردار مظہر خان اور اس کی بیوی کا کردار مہتاب نے ادا کیا تھا۔

قومی یکجہتی کی راہ میں چھوت چھات بھی ایک بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی ہے۔ گاندھی جی نے اس کی بیخ کنی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی مگر آج بھی ہریجنوں اور نیچ ذات والوں سے امتیازی سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔

اس موضوع پر سب سے پہلے بمبئی ٹاکیز نے ''اچھوت کنیا'' نام کی فلم بنائی جس میں اشوک کمار اور دیویکارانی نے بھومیکا نبھائی تھی۔

آزادی کے بعد اس موضوع پر بمل رائے نے ''سُجاتا'' (سنیل دت، نوتن) بنائی جو نہایت کامیاب فلم ثابت ہوئی۔

ہمارے ملک میں پیار ومحبت کی کہانیاں اکثر فلمائی جاتی ہیں اور وہ بھی نہایت عامیانہ انداز میں۔لڑکے لڑکی میں کہیں اتفاقیہ ملاقات ہوئی، پیار ہوا، ایک درخت کے گرد دونوں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہے، ساتھ ہی ساتھ کوئی پھڑکتا سا گیت بھی گاتے رہے۔پھر بیچ میں ایک بدمعاش آدھمکا، ڈیڑھ دوگھنٹے تک وہ بیچ کی دیوار بنارہا، آخر میں لڑکا اور لڑکی بیاہ کے بندھن میں بندھ گئے۔کبھی کبھی منہ کا مزہ بدلنے کے لئے لیلیٰ مجنوں قسم کی ٹریجڈی بھی پیش کردی۔

آزادی کے بعد پیارمحبت کے پس منظر میں دوقابلِ ذکر فلمیں منظر عام پر آئیں۔ایک تو مجبور'' جس میں ایک ہندو لڑکے اور ایک مسلم لڑکی کے معاشقے کو نہایت خوبصورتی سے پیش کیا گیا تھا۔شیام اور منور سلطانہ نے مرکزی کردار ادا کئے تھے۔

یہ فلم تقسیم ملک کے فوراً بعد نمائش کے لئے پیش ہوئی تھی۔اس کا ایک گیت

اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں
انگریزی چھورا چلا گیا
وہ گورا گورا چلا گیا

بےحد مقبول ہوا تھا۔

دوسری فلم چیمین (CHEMEEN) تھی جو ملیالم زبان میں بنی تھی۔اس میں ایک ہندو لڑکی اور ایک مسلم لڑکے کی ناکام محبت پیش کی گئی تھی۔اس فلم کو ملک میں اور ملک سے باہر بھی بےحد سراہا گیا۔

اس زمرے کی دوسری فلموں میں ''لاہور'' (کرن دیوان نرگس) چھلیا (راج کپور، نوتن) گیتا کی سوگند (سنجے خان سائرہ بانو) اور حنا (رشی کپور، زیبا بختیار) کے نام شامل ہیں۔

فلموں میں کچھ چھوٹے موٹے کردار بھی ہوتے ہیں جو تراشے ہوئے نگینے (Cameo Roles)

سمجھے جاتے ہیں۔ان کے ذریعہ بعض اوقات قومی یکجہتی کا خوبصورت مظاہرہ کیا جاتا ہے۔فلم ''گرم کوٹ'' (بلراج ساہنی، نروپارائے) میں جینت نے پٹھان، اناڑی (راج کپور، نوتن) میں للیتا پوار نے کرسچین مالکن اور سہاگ رات (جتندر راج شری) میں محمود نے جمن کا رول ادا کیا۔

قومی یکجہتی کے علاوہ ہماری فلموں نے بین الاقوامی سطح پر خیرسگالی اور خوشگوار تعلقات کے لئے بڑا کام کیا۔اس ضمن میں ہندی فلم ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی (دی شانتا رام جے شری) اور بنگلہ فلم ''نیل آ کا شیر نیچے (کالی بنرجی) کے نام ذہن میں آتے ہیں جن کے ذریعہ ہند۔چین تعلقات کو استوار کرنے کی کوشش کی گئی۔ہندی فلم پردیسی (اوبگ اسٹری زینوف، نرگس پدمنی) میں روس اور بنگلہ فلم کابلی والا چھبی بسواس، ٹنکو ٹیگور) میں افغانستان سے خیرسگالی کے جذبات کا اظہار کیا گیا۔ہند پاک تعلقات کو بہتر بنانے کے سلسلے میں حنا (رشی کپور، زیبا بختیار) کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔

پردہ سیمیں سے قطع نظر، ٹیلی ویژن کی آمد کے بعد چھوٹے پردے پر بھی قومی یکجہتی کے موضوع پر کئی فکر انگیز فلمیں پیش ہوچکی ہیں۔

ڈائرکٹر تپن سنہا کی ٹیلی فلم ''آدمی اور عورت'' (امل پالیکر، مہوا رائے چودھری) کا ذکر بطور خاص کیا جاسکتا ہے۔ایک ہندو جوان بےانتہا مشکلات کا سامنا کرکے ایک حاملہ عورت کو اسپتال پہنچانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ڈیلیوری کے بعد جب وہ عورت سے ملتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس نے دراصل ایک مسلم خاتون کے لئے اتنی تکلیف اٹھائی۔اس وقت نوجوان کے چہرے پر ایک عجیب تاثر ہوتا ہے۔تپن سنہا کی ہدایت کاری کا یہ کمال کہ زبان سے نہ کہنے کے باوجود خاموشی کے وسیلے سے بہت کچھ کہہ دیا گیا ہے۔

رات گئے دکھائی جانے والی فلموں میں ''درشتی کون'' (زرینہ، نیا اداکار مظہر خاں) بھی ایک پیاری فلم تھی۔یہ ایک نوبیاہتا مسلم جوڑے کی کہانی ہے جسے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہنا پڑتا ہے۔رمضان المبارک کے روزے رکھنے اور عید کا تہوار منانے میں انھیں بڑی دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے لیکن اپنے غیرمسلم پڑوسیوں کی مدد سے وہ ان دشواریوں پر قابو پالیتے ہیں۔

ڈائرکٹر نرمل سنگھ کی ٹیلی فلم بھیاجی (اے کے ہنگل) بھی قومی یکجہتی کے موضوع پر ایک کامیاب کوشش ہے۔

قومی یکجہتی کے لئے ہماری سرکار ترسیل وابلاغ کے کم وبیش تمام ذرائع کا استعمال کررہی ہے

لیکن پچھلے دنوں ''دوردرشن'' پر ریلوے کی طرف سے دو اشتہاری فلمیں دیکھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ محض نعرہ بازی ہے۔

ایک فلم میں یہ دکھانا مقصود تھا کہ بے لائسنس قلیوں کی خدمات حاصل نہ کیجئے۔ ایک آدمی بیوی بچے کے ساتھ ریل سے اترتا ہے اور پلیٹ فارم پر کھڑے ایک نوجوان قلی کو جو لنگی پہنے ہوئے ہے اپنا سامان حوالے کر دیتا ہے۔ اسٹیشن کی بھیڑ بھاڑ میں وہ لڑکا سامان سمیت غائب ہو جاتا ہے۔

دوسری فلم کا مقصد یہ ہے کہ چلتی گاڑی میں زنجیر نہ کھینچئے۔ اس میں ایک مسافر کو مع اہل وعیال سفر کرتے دکھایا گیا ہے۔ وہ شیروانی، علی گڑھ پاجامہ اور ٹوپی پہنے ہوئے ہے۔ اس کا بچہ کھیل کھیل میں زنجیر کھینچنے کی کوشش کرتا ہے۔

ان دونوں فلموں کے ذریعہ دراصل مذہبی عصبیت پھیلانے اور مسلمانوں کو بے وجہ بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ریاستی اور سرکاری سبھی حکومتوں کو چاہئے کہ اس قسم کی فلموں کی نمائش فوراً بند کر دے۔

☆☆☆

فلموں میں مسلم سماج

انیس امروہوی

ہندوستانی فلم انڈسٹری کی تاریخ میں ہمیشہ سے ہی مسلم سوشل فلموں کو ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ دور چاہے کوئی بھی رہا ہو، یا تو چند مسلم کرداروں کے ساتھ یا پھر مکمل طور پر مسلم سوشل فلمیں بنتی رہی ہیں۔ یہاں تک کہ پہلی ہندوستانی متکلم فلم عالم آرا بھی ایک طرح سے مسلم سوشل فلم ہی تھی، حالانکہ اس میں مذہبی رنگ زیادہ تھا۔

دراصل فلمی صنعت کے آغاز میں مسلم تہذیب کا اثر عوام پر زیادہ رہا ہے۔ اس لئے اس دور میں اسی طرح کی کہانیوں پر بہت بڑی تعداد میں فلمیں بنائی گئیں اور ان میں مسلم کرداروں کو پیش کیا گیا۔ بعد میں بھی مسلم سوشل فلمیں بنتی رہی ہیں۔

جہاں تک کامیاب فلموں کا سوال ہے تو ایسی فلموں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ مسلم تاریخی فلموں کو چھوڑ کر محبوب خان کی نجمہ، گرودت کی چودھویں کا چاند، ایچ۔ ایس۔ رویل کی میرے محبوب اور لیلیٰ مجنوں، جاں نثار اختر کی بہو بیگم، سہراب مودی کی مرزا غالبؔ، آر۔ چندرا کی برسات کی رات، ونود کمار کی میرے حضور، ایس۔ یو۔ سنی کی پالکی، کمال امروہوی کی پاکیزہ، راجندر سنگھ بیدی کی دستک، ایس۔ ایم۔ ستھیو کی گرم ہوا، ششی کپور کی جنون، یش چوپڑا کی نوری، مظفر علی کی گمن اور امراؤ جان، بی۔ آر۔ چوپڑا کی نکاح، ساگر سرحدی کی بازار، اور ساون کمار کی صنم بے وفا وغیرہ کچھ ایسی ہی فلمیں ہیں جنہیں ہر نظریے سے کامیاب اور معیاری مسلم سوشل فلمیں کہا جا سکتا ہے۔ ان فلموں میں کافی حد تک مسلم معاشرے اور تہذیب کی صحیح جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔

ان کے علاوہ کچھ تاریخی مسلم سوشل فلمیں بھی ہیں، جن میں سہراب مودی کی کامیاب ترین فلم پکار تھی، جس نے تاریخی فلموں کا انداز ہی بدل دیا تھا۔ اس فلم میں مغل حکمرانوں کی شان وشوکت کو فلمایا گیا تھا۔ فلم کی کہانی اور مکالمے کمال امروہوی نے لکھے تھے، جو اتنے مقبول ہوئے تھے کہ بعد میں جتنی بھی تاریخی فلمیں بنیں، ان میں پکار کے انداز کو ہی اپنایا گیا۔

کے۔آصف کی تاریخی فلم مغل اعظم نے کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کئے تھے۔اس فلم کی کہانی اور مکالمے لکھنے والوں میں کمال امروہوی بھی شامل تھے۔مغل اعظم اعلیٰ سیٹوں،زوردار مکالموں اور کرداروں کی بے مثال اداکاری کی وجہ سے آج بھی یاد کی جاتی ہے اور آج بھی بھیڑ کھینچنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

فلم ساز ٹُلا رام جالان کی فلم انارکلی موسیقی اور گیتوں کی وجہ سے اپنے زمانے کی کامیاب ترین فلم کہی جاسکتی ہے۔حالانکہ شیخ مختار کی فلم نور جہاں بھی ایک اچھی فلم تھی،لیکن پھر بھی ناکام ہوگئی تھی۔جس کی وجہ سے شیخ مختار کو ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جانا پڑا۔کافی بھاگ دوڑ کے بعد پاکستان میں شیخ مختار نے جنرل ضیاء الحق سرکار سے اس فلم کو پاکستان میں ریلیز کرنے کی اجازت لے لی تھی۔مگر قست نے ان کا ساتھ نہ دیا اور فلم کی ریلیز کے کچھ دن بعد ہی انکا انتقال ہوگیا۔پاکستان میں نور جہاں کو اچھی خاصی کامیابی ملی۔

اس سلسلہ میں مزاحیہ اداکار اوم پرکاش کو بھی کافی تلخ تجربہ ہوا۔انہوں نے اعلیٰ پیمانے پر فلم جہاں آرا بنائی۔فلم کی موسیقی،گیت اور سیٹ وغیرہ سب ہی کچھ اچھے تھے،مگر فلم زیادہ کامیاب نہ رہی۔اس سلسلے کی ایک کڑی فلمساز اے۔کے۔نڈیاڈ والا کی فلم تاج محل بھی تھی،جس کے ڈائریکٹر ایم۔صادق تھے۔یہ فلم کافی کامیاب رہی لیکن جتنی کامیابی سہراب مودی کی پُکار،کے۔آصف کی مغل اعظم اور ٹُلا رام جالان کی انارکلی نے حاصل کی تھی،اتنی کامیابی دوسری تاریخی فلموں کو نہ مل سکی۔

شاہجہاں،بابر،ہمایوں،عدل جہاں گیر،رضیہ سلطان(پرانی)،نوشیروانِ عادل وغیرہ ایسی ہی تاریخی فلمیں ہیں جو باکس آفس پر کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کرسکیں۔

۱۹۷۲ء میں فلم پاکیزہ کی غیر معمولی کامیابی کے بعد جب فلم ساز وہدایت کار اور مصنف کمال امروہوی نے رضیہ سلطان بنانے کا اعلان کیا تو لگا کہ شاید یہ فلم مغل اعظم جیسی کامیابی حاصل کرے گی۔مگر کئی سال کی محنت اور بڑے بڑے دعوؤں کے بعد جب اُس وقت کی سب سے مہنگی فلم رضیہ سلطان سنیما کے پردے پر پہنچی تو بری طرح ناکام ہوگئی۔جبکہ فلم کی موسیقی و گیت کافی جاندار تھے۔حالانکہ یہ تمام فلمیں تاریخی فلموں کے درجے میں آتی ہیں،لیکن ان میں مسلم معاشرے کے ایک خاص طبقے کی تہذیب کو ہی اجاگر کیا گیا تھا،جو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی بناوٹی سا لگتا ہے۔

مسلم سوشل فلموں کے نام پر اب تک جتنی بھی فلمیں بنائی گئی ہیں،ان میں زیادہ تر فلمیں ایسی ہیں جن میں مذہبی جذبات ابھار کر پیسہ کمانے کا فارمولہ اپنایا گیا ہے۔زینت،شان خدا،میرے

غریب نواز،نیاز اور نماز،دیار مدینہ،دین اور ایمان،اولیائے اسلام،سلطان ہند اور نواب صاحب جیسی فلمیں اس کی مثال ہیں۔ایک طرف میرے غریب نواز،نیاز اور نماز نے دوسری فلموں کے مقابلے میں اچھا بزنس کیا تو دوسری طرف نواب صاحب جیسی فلم،جس کو دستک جیسی عمدہ فلم کے ہدایت کار راجندر سنگھ بیدی نے لکھا اور ڈائریکٹ کیا مگر یہ فلم ناکام رہی۔ایسی فلموں کو پوری طرح سے مسلم سوشل فلمیں بھی نہیں کہا جاسکتا،کیوں کہ اس میں زیادہ سے زیادہ مذہب کا سہارا لیا گیا تھا۔حالانکہ ایسی فلموں سے آج تک مذہب کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے۔

مسلم سوشل فلموں کے نام پر جو فلمیں آئی ہیں،ان کا بھی ایک خاص ٹرینڈ بن کر رہ گیا ہے۔کچھ خاص چیزیں ہی مسلم سوشل فلم کے اہم اور لازمی حصے بن کر رہ گئے ہیں۔مثلاً ہیرو کا شاعر،قوال یا نواب ہونا،شعر وشاعری کا ایک مقابلہ ہونا،ایک طوائف اور اس کے تین چار مجرے اور کرداروں کا کارٹون اسٹائل میں میک اپ۔یہی سب کچھ مسلم سوشل فلموں کا فارمولہ بن کر رہ گیا ہے۔ایک گھریلو پردہ نشین عورت جو ایک سین میں برقعہ استعمال کرتی ہے تو اگلے ہی سین میں بے پردہ نظر آجاتی ہے۔کسی کردار کی موت پر اذان سنادی جاتی ہے۔جبکہ ایسے موقع پر یٰسین شریف پڑھتے دکھانا چاہئے۔کرداروں کے میک اپ میں عجیب طرح کی داڑھی لگادی جاتی ہے۔جبکہ مسلم بزرگوں میں بھی بنا داڑھی کے بڑی تعداد میں لوگ مل جائیں گے۔یہ ٹھیک ہے کہ میک اپ سے کرداروں کو زیادہ باا ثر بنایا جاسکتا ہے۔لیکن اس طرح سے کرداروں کو کارٹون بنادینا کہاں تک مناسب ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے ان کرداروں کے ساتھ پوری مسلم تہذیب کا مذاق اڑایا جارہا ہے۔

اس سلسلہ کی مسلم سوشل فلموں میں ایک جیسے کردار دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک چکی ہیں،دماغ بوجھل ہوگیا ہے۔آخر ہندوستانی مسلمانوں میں انجینئر،ڈاکٹر،وکیل،کلرک،فوجی،بیوپاری،ٹیکسی ڈرائیور،مزدور،صنعت کار اور چھوٹے بڑے دکاندار بھی تو ہوتے ہیں۔پان چباتا ہوا،جگالی کرتا ہوا شاعر اور نواب آخر کب تک مسلم سوشل فلموں کے ہیرو بنتے رہیں گے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا قدم ایس۔ایم۔ستھیو نے فلم گرم ہوا میں اٹھایا تھا۔پرانی روایت سے ہٹ کر انہوں نے اپنے کردار کو بے حد اور یجنل ڈھنگ سے پیش کیا تھا۔اس کے بعد راجندر سنگھ
☆☆☆
بیدی نے فلم دستک میں ایک مڈل کلاس کے مسلمان کلرک کے ساتھ گزرتے ہوئے حادثات اور اس کے مسائل بڑے جذباتی انداز سے پیش کئے تھے۔مظفر علی نے اپنی پہلی ہی فلم گمن میں ایک بے

روزگار نوجوان اور پھر ٹیکسی ڈرائیور کے رول میں فاروق شیخ کو پیش کر کے اس روایت کو توڑا جو لوگوں نے مسلم سوشل فلموں کے کرداروں کے لئے اپنا رکھی تھی۔

نئی فلموں میں سنجے خان کی فلم عبداللہ نئی ٹیکنیک پر بنائی گئی ایک بہترین فلم ثابت ہوئی۔ مظفرعلی کی امراؤ جان کے بارے میں اس لئے کچھ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ یہ فلم مرزا ہادی رسوؔا کے مشہور اور اردو کے پہلے مکمل سماجی ناول امراؤ جان ادا پر بنائی گئی تھی جو کہ ایک اچھی فلم ثابت ہوئی تھی۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ہماری سرکار کی سرپرستی میں پنپنے والے سینسر بورڈ نے اسے ہندی فلم کا سرٹیفکٹ دیا جبکہ اس فلم کو اردو زبان کی فلم کا سرٹیفکٹ ملنا چاہئے تھا۔

ہندوستان کے کروڑوں مسلمان آج بھی مختلف مسائل سے دوچار ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی کا ان پر بھی اتنا ہی اثر پڑتا ہے جتنا دوسروں پر۔ بے روزگاری کا مسئلہ، کاروباری مسائل اور سیاسی معاملات وغیرہ کا مسلمانوں پر زیادہ اثر پڑتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ کوئی فلمی مصنف یا ہدایت کار مسلمانوں کے دوسرے مسائل پر توجہ نہیں دیتا۔ صرف مذہبی معاملات وجذبات اور عشق ومحبت کو ہی بنیاد بنا کر بے حد گھٹیا درجے کی فلمیں آ کر کب تک بنائی جاتی رہیں گی۔ جب کہ مسلم کرداروں کے ساتھ اعلیٰ قسم کی سوشل کہانیوں پر بھی فلمیں بنائی جا سکتی ہیں۔ اس دور میں جتنی بھی فلمیں مسلم کرداروں کو لے کر بنائی گئی ہیں ان میں چند فلموں کو چھوڑ کر کوئی فلم مسلمانوں کے موجودہ مسائل کو اجاگر نہیں کرتی۔ جبکہ آج کے دور میں فلم بھی اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

ان چند فلموں میں سب سے پہلا نام آتا ہے گرم ہوا کا، جس میں مسلمانوں کے سماجی وسیاسی حالات پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے اور ایک بڑے مسئلے کو سامنے رکھا گیا ہے۔ دوسرے نمبر پر راجندر سنگھ بیدی کی صاف ستھری فلم دستک ہے جو مسلم سوشل فلموں کی پرانی روایات سے ہٹ کر بنائی گئی تھی۔ تیسرے نمبر پر مظفرعلی کی فلم گمن کا نام لیا جا سکتا ہے جس میں ایک مسلم بے روزگار نوجوان کے کچھ مسائل بہت اچھے ڈھنگ سے پیش کئے گئے تھے لیکن ایسا لگتا ہے کہ مظفرعلی بھی راہ سے بھٹک گئے ہیں اور آخر تک پہنچتے پہنچتے ایک بڑے شہر کی پریشانیوں کا معاملہ اٹھا کر اپنی بات پوری کر دیتے ہیں۔ انہوں نے ان تمام مسائل کو نظرانداز کر دیا جو وہ شروع میں لے کر چلے تھے۔ اسی طرح ساگر سرحدی کی بازار بھی عام روایت سے ہٹ کر ایک بہترین اور موضوعاتی مسلم سوشل فلم تھی جس میں حیدرآباد کے مسلم سماج کی نوجوان لڑکیوں اور ان کے مجبور و بے بس والدین کے

مسائل کی بہترین عکاسی کی گئی تھی۔ فلم ممو کے بعد شیام بینیگل کی ہدایت میں بنی فلم سرداری بیگم بھی عام اور روایتی مسلم سوشل فلموں سے کچھ الگ ایک فلم ہے۔ حالانکہ اس فلم کا مرکزی خیال کلاسیکی موسیقی کی ایک بہترین گلوکارہ سرداری بیگم کے اطراف گھومتا ہے۔ مگر اس میں جو کردار پیش کئے گئے ہیں، وہ زندگی کے زیادہ قریب ہیں اور اس روایتی پن سے بالکل مختلف ہیں، جس میں آج تک فلمی مسلم کردار جکڑے ہوئے ہیں۔

جہاں تک مسلم تہذیب اور معاشرت کا سوال ہے، تو اس سلسلے میں کمال امروہوی کی فلم پاکیزہ ایک مثالی فلم کہی جا سکتی ہے۔ حالانکہ اس فلم کی کہانی کے مرکز میں ایک طوائف کی بے چارگی کو نمایا طور پر پیش کیا گیا ہے اور اس فلم کا پس منظر وہ جاگیردارانہ سماج ہے جس میں عورت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ مگر اس کے برخلاف پوری فلم میں مسلم تہذیب کی عکاسی بے حد سچائی کے ساتھ پیش کی گئی، اور اس فلم کے تمام کردار اپنی اپنی حقیقتوں کے ساتھ پردے پر پیش کئے گئے ہیں۔

پچھلے کچھ برسوں میں کئی مسلم سوشل فلموں کا اعلان ہوا تھا، جن میں نورانی صاحب کی وطن، چیتن آنند کی سلیم انارکلی، فیروز خان کی گل بکاؤلی وغیرہ ایسی فلمیں ہیں جو اگر بن گئی ہوتیں اور بزنس کے اعتبار سے کامیاب بھی ہو گئیں ہوتیں تو بھی لگتا نہیں کہ یہ آج کے ہندوستانی مسلم معاشرے کی صحیح معنوں میں عکاسی کر سکتیں۔

گذشتہ چند برسوں میں مسلم کرداروں کو لے کر جو فلمیں بنائی گئی ہیں ان کو ہم مکمل طور پر مسلم سوشل فلموں کے زمرے میں نہیں رکھ سکتے۔ راجکپور کی فلم حنا، منی رتنم کی فلم بامبے، خالد محمود کی فلم فضاء، جے۔ پی۔ دتہ کی فلم غدر، گلزار کی فلم ماچس یا پھر مشن کشمیر، ایل۔ او۔ سی۔ وغیرہ چند ایسی ہی فلمیں ہیں جن میں مسلم کردار تو ہیں مگر یہ فلمیں مسلم سوشل فلمیں نہیں ہیں اور نہ ہی ان میں مسلم تہذیب یا معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے۔

آج ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کے مسائل اور جن حالات میں وہ جی رہے ہیں۔ اس کی سچی تصویر پیش کرنے والی کچھ فلمیں آئیں، تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ یہ بھی اس سماج کا ایک حصہ ہیں، اور ہر وقت پان چبانا یا جھک جھک کر آداب عرض کرنے کے علاوہ ان کو کچھ اور بھی کام ہیں۔

☆☆☆

ہندی فلموں میں مسلم طرزِ معاشرت

رشید انجم (بھوپال)

ماضی بعید اور ماضی قریب میں جن ہندوستانی فلموں میں مسلم طرزِ معاشرت کو نمائندگی دی گئیں وہ فلمیں سنیما کی تاریخ کے اوراق پر محفوظ ہیں۔ ہندوستان میں فلموں کے آغاز ۱۹۱۳ء سے ہی اولاً ہندو مائیتھولوجی پر جو فلمیں بڑی تعداد میں تخلیق کے مراحل سے گزریں، اس دور میں تو نہیں مگر جیسے جیسے سنیما ارتقائی ادوار طے کرتا گیا، فلم کے موضوعات بھی بدلتے گئے۔ ابتدائی دور میں جو دوسرے فلم ساز سنیما کے تخلیقی سفر میں شامل ہوئے ان کی طرز فکر جدا پائی گئی۔ دراصل اس طرزِ فکر کا محرک وہ اسٹیج تھا جو اردو تھیئٹر کے نام سے جانا گیا اور جہاں اردو ڈراموں کا ایک طویل سلسلہ قائم تھا۔ اسی اردو تھیٹر نے جب سنیما کے توسط سے فلموں میں اپنا وجود درج کرایا تو ہماری فلموں میں وہ معاشرہ ترتیب پایا جس میں ایک خاص تہذیب اور طرزِ زندگی کو نمائندگی دی گئی تھی۔ فلم شائق آغاز سے ہی اردو زبان کی لطافت، شگفتگی اور شیریں لب ولہجہ کا گرویدہ رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آغاز سے اب تک اردو زبان ہماری فلموں سے اپنا دامن نہیں چھڑا پائی۔ اردو زبان کی اسی شگفتہ ساز ''برکت'' نے مسلم طرز معاشرت کو فلموں کی اس جمالیاتی کیفیت سے آشنا کیا جس کی بازگشت صدی گزرنے کے بعد بھی گونج رہی ہے۔ ہندوستان کا ہر وہ فلم بین طبقہ یا فرد جو علاقائی زبانوں کا اسیر رہتا آیا ہے یا وہ افراد جو اردو زبان سے ناواقف ہیں، ہر وہ فلم، ہندوستان کے غیر اردو داں علاقوں میں بھی کامیاب رہی جس میں اردو زبان کے مکالمے اور نغمے ہوا کرتے تھے ہیں۔ اور وہ فلم بھی کامیاب رہی جس میں مسلم طرز معاشرت دکھایا جاتا رہا ہے۔ ایسی کئی فلموں کی مثال دی جاسکتی ہے۔ مثلاً نور جہاں، عدل جہانگیر، تاج محل، انارکلی، مغلِ اعظم، میرے محبوب، میرے حضور، چودھویں کا چاند، بے نظیر، رضیہ سلطانہ، پاکیزہ اور امراؤ جان وغیرہ، یہ چند فلمیں ہیں جو مثال کے طور پر پیش کی گئیں۔

سنیما کی تاریخ ایسی فلموں کی امانت دار ہے اور اس کے اوراق شاہد ہیں کہ مسلم معاشرے، مسلم تہذیب (خواہ وہ سماجی ہو، تاریخی ہو یا عام زندگی سے متعلق ہو) فلم بین کو متاثر کرتی رہی ہے۔ ان میں

تمام فلمیں ہی کامیاب نہیں رہیں، مگر جو باکس آفس پر کمزور رہیں یا باکس آفس کلکشن نہیں کر پائیں۔ فلم بین کو کہیں نہ کہیں متاثر کرنے میں ضرور کامیاب رہیں۔ مسلم تہذیب نے جب ہندوستان کی وسیع تر سماجی، سیاسی، جغرافیائی زمین کو اپنی گرفت میں لیا تو سنسکرت اور ہندی کے علاوہ دیگر زبانوں کا پروردہ یہ ملک اپنے محدود ماحول کا اسیر تھا اور کسی اور معاشرے سے واقف نہیں تھا اولاً عربوں کی آمد اور صوفیائے اکرام کے ورود سے اس ملک کا نظام مرتعش ہوا۔ زاں بعد ترک، مغلوں اور پٹھانوں نے جب ہندوستان کے سیاسی نظام پر اپنا سیاسی اقتدار قائم کیا تو یہاں کا طرز زندگی بھی اثر انداز ہوا۔ اور عوام فارسی، ترکی اور اردو زبان کے ساتھ مسلم طرزِ معاشرت سے نہ صرف واقف ہوئے بلکہ اس وسیع ملک کی دور دراز بستیاں بھی اس معاشرت کی طلسمی کیفیات کو جذب کرنے سے خود کو روک نہ پائیں۔ مسلم حکمرانوں نے اس ملک کا تمام تمدنی اور سماجی ڈھانچہ ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ صدیاں اس نظام حکمرانی کی گواہ ہیں کہ نہ صرف خواص بلکہ عوام کے گھروں میں فارسی اور پھر اردو زبان روزمرہ کا لہجہ اور تخاطب بن چکی تھی۔

نظام بدلا، انگریز آیا تو اپنی تہذیب اور اس معاشرہ سے ہندوستانی ذہنوں پر اثر انداز ہوا اس کے باوجود کہ انگریز کو نفرت اور حقارت گردانتے ہوئے کوئی بھی ہندوستانی انگریز کی زبان اور اس کی طرز معاشرت کو اپنانے سے گریز نہیں کر سکا۔ لیکن اردو زبان اپنی رواں دواں بول چال اور شائستہ تخاطب سے شکست پذیر نہیں ہوسکی۔ اردو شاعری نے سب سے اہم کردار ادا کیا وہ اس طرح کہ کسی زبان میں شاعری کا وہ لہجہ، وہ جمال، وہ تشبیری ضابطہ اور نغمگی کی شدت میں ڈھلتا زبان کی مینا کاری کا نقش گر احساس مفقود رہا ہے۔ شعری اور نثری دونوں طرح اردو زبان ہر ذہن کو مسخر کرنے میں کامیاب رہی اور جب فلموں نے زبان حاصل کی تو فلمیں اردو زبان سے ہی آبرومند رہیں اور آج بھی ہیں۔

عرق ریز گہری تحقیق سے یہ ثابت ہوا کہ خاموش فلمی دور میں ایسی فلمیں بن کر تیار ہوئیں جو خالص مسلم طرزِ معاشرت پر مبنی تھیں۔ ہندوستان پر یوں تو مختلف خاندانوں نے صدیوں حکومت کی لیکن مغلوں کے حکمرانی دبدبے، ان کی شان وشوکت، انصاف پسند فطرت اور ان کی محلاتی زندگی نے ہندوستان کے ہر فرد کو اپنی طلسماتی قوت میں اسیر کرلیا۔ اس طلسماتی قوت کی کشش ہر فرد نے تب محسوس کی جب فلم سازوں نے اسے اپنا موضوع بنا کر فلموں کی تخلیق کی۔ صرف مغل حکمرانوں کے تقریباً ہر بادشاہ کو فلموں کا

کلیدی کردار بنایا گیا اور وہ فلمیں گوکہ موضوع کے لحاظ سے یکساں تھیں مگر ان کے پیش کش اور منظر نامے کی سحر انگیز تپش کبھی کمزور ثابت نہیں ہوئی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کی مکالماتی زبان تو تھی ہی اردو شاعر نے بھی جب راگ راگنیوں کے قلب میں دھڑکتے فلمی نغموں کا روپ اختیار کیا تو ہر دیکھنے اور سننے والا اس جادو صفت ''آشوب'' سے خود کو بچا نہیں پایا اور ان کا پابند ہوتا چلا گیا۔

خاموش اور متکلم عہد میں مسلم طرز معاشرت کو جن فلموں میں پیش کیا گیا۔ وہ فنٹاسی بھی تھیں۔ جادوئی اور کرشماتی فلمیں بھی تھیں۔ تاریخ سے اخذ کیے واقعات پر مبنی بھی تھیں اور روحانیت کی آخری حدوں کو چھوتی فلمیں بھی تھیں۔ وہ فلمیں بھی تیار ہوئیں، پاکیزگی جن کا ایموشنل ٹریٹمنٹ رہا۔ اور وہ فلمیں بھی جو ایمان یقین کے ساتھ ہی اولیاء اکرام کی صوفیانہ تعلیم پر مبنی رہیں۔ مسلمانوں کے ایک طبقے کے اعتقاد (قبر پرستی) کی مظاہر تھیں۔ وہ فلمیں بھی جو اردو زبان وادب کی قد آور شخصیات کی ادبی اور شعری خدمات پر مبنی تھیں۔ ان سبھی فلموں میں مسلم طرز معاشرت اور طرزِ حیات کو فلم کی بندشیں دی گئیں۔

یہ سلسلہ شروع ہوا خاموش فلموں کی تخلیق کے اس عہد سے جب اردشیر ایرانی نے اپنی فلم سازی کا آغاز کیا۔ ابتدائی خاموش عہد میں داستان الف لیلیٰ کی کچھ کہانیوں پر فلمیں بنائی جا چکی تھیں۔ مثلاً 'گلِ بکاؤلی' (۱۹۲۴ء)۔ اس قسم کی فلمیں فنٹاسی تھیں۔ اردشیر ایرانی نے ۱۹۲۶ء میں آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے کو منتخب کیا اور 'صیدِ ہوس' کے نام سے خاموش فلم بنالی۔ گو یہ بے زبان فلم تھی مگر مسلم ماحول کو اسی فلم سے پہلی بار بڑھاوا حاصل ہوا۔ انھیں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے، ہمانشو رائے نے ۱۹۲۷ء میں 'شیرازی' اور 'لَو آف اے گریٹ مغل پرنس' اور اردشیر ایرانی نے 'انارکلی' بنائیں۔ ۱۹۲۸ء میں اردشیر ایرانی نے فلم 'نور جہاں' بنائی جو مغل بادشاہ جہانگیر کے انصاف پسند دورِ حکمرانی کی پہلی مرعوب کن فلم تھی۔ زاں بعد اسی فلم نور جہاں کو ۱۹۳۱ء میں زبان دیدی گئی۔

طوالت سے بچنے کے لیے میں چند اہم فلموں کا ہی ذکر کروں گا۔ جن میں مسلم طرزِ معاشرت کو کمال خوبی اور ہنر مند فلم سازی سے تخلیق کیا گیا تھا۔ متکلم فلموں کی ابتدا ہی مسلم طرزِ حیات پر بنائی گئی فلم ''عالم آرا'' ۱۹۳۱ء سے ہوئی تھی۔ یہ فلم کسٹیوم تھی مگر اس کا پورا پس اور پیش منظر مسلم ماحول کی عکاسی کرتا تھا۔ اسی خاموش دور میں وہ فلمیں بھی بنائی گئیں جو عشق ومحبت کی لازوال داستانوں کو بیان کرتی تھیں۔ لیلیٰ مجنوں،

شیریں فرہاد، سونی مہیوال، وامق وعذرا، ہیر رانجھا، مرزا صاحباں وغیرہ۔ یہ تمام فلمیں شدّتِ جذبات اور عشق کی بے پناہ کیفیات سے معمور ہیں۔ یہ تمام فلمیں گوکہ مسلم ماحول کی عکاس ہیں۔ لیکن الگ الگ طرزِ معاشرت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جیسے لیلیٰ مجنوں سرزمینِ عرب کے ماحول کی منعکس ہے۔ شیریں فرہاد ایرانی طرزِ معاشرت کی۔ 'سوہنی مہیوال' 'مرزا صاحباں' اور 'ہیر رانجھا' ہندوستان کے پنجاب علاقے کے اس ماحول کی عکاس ہیں جو ہندو مسلم کی ملی جلی تہذیب رہی۔ ان فلموں کے علاوہ زیادہ تر اردو فلمیں تیار ہوئیں جو صرف الف لیلیٰ اور قصّہ ہزار داستان سے اخذ کی گئی تھیں۔ مثلاً حاتم طائی، حاتم طائی کی بیٹی، حاتم طائی کا بیٹا، علاؤالدین اور جادوئی چراغ، علی بابا اور چالیس چور، گل بکاؤلی، گل صنوبر، شاہی لکڑ ہارا، تھیف آف بغداد، چہار درویش، سیرِ پرستان، سخی لٹیرا، بلبلِ ایران، لعل یمن، سندباد جہازی وغیرہ۔ ایسی فلمیں بھی آئیں جو طبع زاد اور دو ڈراموں پر مبنی تھیں۔ 'صیدِ ہوس' 'خوابِ ہستی' 'یہودی کی لڑکی' 'پاک دامن رقاصہ' 'زہرِ عشق' 'نیکی کا تاج' اور 'نیک پروین' وغیرہ۔ مغل بادشاہوں کے عشق، حسن تدّبر، جنگی فراست اور عدل وانصاف پر اب تک جو فلمیں تیار کی گئیں وہ محلات کے اندرون شاہی مسلم ماحول کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ 'نور جہاں' (۱۹۲۸ اور ۱۹۳۱ء) 'انارکلی' (۱۹۲۷ء اور ۱۹۳۵ء اور ۱۹۵۳ء) 'عدل جہانگیر' (۱۹۳۴ء اور ۱۹۵۵ء) 'جہاں آرا' ۱۹۳۵ء 'پکار' ۱۹۳۹ء، 'تاج محل' (۱۹۴۱ء، ۱۹۶۳ء اور ۲۰۰۵ء) 'شہنشاہ بابر' (۱۹۴۴ء) 'ہمایوں' (۱۹۴۵ء) 'شاہجہاں' (۱۹۴۶ء) 'ملکۂ عالم نور جہاں' (۱۹۴۵ء اور ۱۹۶۷ء) بابر، لال قلعہ، اور مغل بادشاہوں کے علاوہ جن بادشاہوں، یا بادشاہ زادیوں نے ہندوستان پر حکومت کی یا ہندوستان کے قطعہ ارض پر حکمراں رہے۔ ان پر جو فلمیں بنائی گئیں ان فلموں میں مغلِ سلطنت سے بالکل جدا مسلم طرز معاشرت دکھایا گیا ہے۔ ایسی فلمیں ہیں۔ 'سلطانہ چاند بی بی' (۱۹۲۶ء) 'باز بہادر اور ٹیپو سلطان' (۱۹۵۹ء) 'نواب سراج الدولہ' (۱۹۶۷ء) 'رضیہ سلطانہ' اور 'رضیہ سلطانہ' (۱۹۸۳ء) ان بادشاہوں اور بادشاہ زادیوں کے علاوہ جن بیرون ہند باصلاحیت اور منصف مزاج مسلم حکمرانوں اور جاں باز مجاہدوں پر فلمیں بنیں ان میں سپاہیانہ مسلم شان نمایاں تھیں۔ 'شاہِ بہرام' (۱۹۳۵ء) 'غازی صلاح الدین' (۱۹۳۹ء) 'بیرم خاں' (۱۹۴۶ء) 'رستم سہراب' (۱۹۴۰، ۱۹۴۱ اور ۱۹۶۳ء) نوشیروانِ عادل (۱۹۵۷ء) ان میں رستم سہراب اور شاہِ بہرام علاقہ فارس کی ماورائی داستان

پرمبنی فلمیں تھیں۔ اہلِ فارس آتش پرست تھے مگر چونکہ ان کے نام نسبتاً مسلم تھے اور ان کا ماحول بھی مسلم معاشرے سے ملتا جلتا رہا اس لیے اسے مسلم طرزِ زندگی کی نمائندگی حاصل ہوئی ان کے علاوہ 'ہلاکو' (۱۹۵۶ء) 'خاقان' اور 'چنگیز خان' (۱۹۵۷ء) میں وہ ماحول دکھایا گیا تھا جو تھا تو غیر اسلامی مگر مسلم طرزِ معاشرت سے ملتا جلتا تھا۔ یہودی کی بیٹی (۱۹۵۷ء) یہودی کی لڑکی (۵۷۔۱۹۳۳ء) اور یہودی (۱۹۵۸ء) سکندر (۱۹۴۰ء) سکندرِ اعظم (۱۹۶۵ء) اور نادر شاہ (۱۹۶۸ء) یہ فلمیں مختلف ماحول کی عکاس رہ کر بھی مسلم طرزِ معاشرت پرمبنی رہیں۔ 'پاک دامن' (۱۹۳۱ء) 'پاک دامن رقاصہ' (۱۹۳۲ء) 'خدا دوست' 'شانِ سبحان' اور 'نورِ ایمان' (۱۹۳۳ء) 'فدائے توحید' (۳۶۔۱۹۳۴ء) 'خاک کا پتلہ' 'نیکی کا تاج' 'نورِ اسلام' 'شانِ خدا' اور 'میرا ایمان' (۱۹۳۴ء) اللہ کا انصاف (۱۹۳۵ء) نورِ وحدت (۱۹۳۶ء) خدا کا فیصلہ (۱۹۳۶ء) فخرِ اسلام (۱۹۳۷ء) نئی تعلیم (۱۹۴۹ء) 'دیارِ حبیب' نورِ یمن' (۱۹۵۶ء) 'ہمارا حج' اور شانِ حاتم (۱۹۵۸ء) 'حاتم طائی کی بیٹی' اور 'عبداللہ' (۱۹۶۰ء) 'زیارت گاہِ ہند' (۱۹۷۰ء) 'میرے غریب نواز' (۱۹۷۳ء) 'دیارِ مدینہ (۱۹۷۵ء) 'نورِ الٰہی' نیاز ونماز' (۱۹۷۶ء) 'سلطانِ ہند' (۱۹۷۸ء) 'اولیائے اسلام' 'دین اور ایمان' اور 'مدینے کی گلیاں' (۱۹۷۹ء) 'فرضِ اسلام' 'لبیک' 'سید وارث شاہ' 'بابا حاجی ملنگ' اور 'قوتِ پروردگار' (۱۹۸۰ء) 'خواجہ کی دیوانی' اور ولئی اعظم' (۱۹۸۱ء) 'بندۂ نواز' (سلطانِ دکن) اور 'کعبہ' (۱۹۸۲ء) 'بسم اللہ کی برکت' (۱۹۸۳ء) یہ وہ فلمیں تھیں جو اسلام کی بنیادی تعلیم ایک خدا پر ایمان، فرائض حق ویقین پرمبنی تھیں ہی لیکن ان میں وہ مسلم ماحول منعکس ہوا جو غربت اور فقیرانہ شان کا مظہر تھا۔ ایسی فلمیں بھی بنائی گئیں جو عصمت اور پاکیزگی کا ایمان پرور انتخاب تھیں۔ 'پاک دامن رقاصہ' 'روشن آرا' (۱۹۳۲ء) 'امینہ' (۱۹۳۴ء) 'عصمت کا موتی' (۱۹۳۵ء) 'چراغِ حسن' (۱۹۳۵ء) 'رشیدہ' 'سلیمہ' 'یاسمین' (۱۹۳۵ء) 'پاک دامن' (۱۹۴۰ء) 'نجمہ' (۱۹۴۳ء) 'عصمت اور 'بیگم' (۱۹۴۴) 'بھائی جان' اور 'زینت' (۱۹۴۵ء) 'نرگس' 'نیک پروین' 'ریحانہ' (۱۹۴۶ء) 'عابدہ' اور 'درد' (۱۹۴۷ء) 'انجمن' شہناز' اور شوہر (۱۹۴۸ء) 'بانو' 'چلمن' اور 'کنیز' (۱۹۴۹ء) 'رشید دلہن' اور 'پردہ' (۱۹۵۰ء) 'عبرت' (۱۹۵۴ء) 'پاک دامن' اور 'نیلوفر' (۱۹۵۷ء) 'نیک خاتون' (۱۹۵۹ء) 'لبنا' (۱۹۸۱ء) 'سلمٰی' (۱۹۸۵ء) 'انجمن' (۱۹۸۶ء) یہ فلمیں مسلم خواتین کو محور بنا کر فلم کے سانچے میں

ڈھالی گئی تھیں ان فلموں میں اس ماحول کی نمائندگی ہوئی جو محلوں سے لیکر عام سماجی زندگی کا مظاہر ہے۔ ان تمام فلموں میں عورت کے پاکیزہ اور عفّت مآب کردار کو پیش کیا گیا تھا۔ جو شوہر کے ظلم سہہ کر، معاشرے کی نفرت کا شکار ہوکر آفات وغربت کی کرب خیزیت میں بھی صبر کا دامن نہیں چھوڑتی اور بالآخر بنا کسی تکبر اور خودنمائی کے فتح یاب ہوتی ہے۔

فلم پھول (۱۹۴۵ء) کے۔آصف مرحوم کی پہلی فلم تھی جس میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلم ڈاکٹر کو عین نکاح کے موقع پر شادی سے انکار کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا جو تحریک خلافت میں شامل ہوکر وطن پرست نوجوانوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ فلم 'درد' (۱۹۴۶ء) کا رداری وہ ناقابلِ فراموش فلم جس میں یتیم و بے کس بچوں کی حالتِ زار، امارت وغربت کے درمیان طبقاتی خلیج اور عشق وحسن کا باہمی ربط، سماج ومعاشرے کی ناقبولیت کو کمال ہنرمندی سے کاردار نے پیش کیا تھا۔ ہندوستان کے عام مسلانوں کے معاشرتی نظامِ حیات اور تباہ ہوتی اقدار پر کئی موثر فلمیں تخلیق کی گئیں۔ 'افضل' 'عید کا چاند' 'زہرِ عشق' (۱۹۳۳ء) 'دردِ دل' اور 'سلطانہ' (۱۹۳۴ء) 'آہِ مظلومان' (۱۹۳۵ء) 'شہیدِ محبت' (۱۹۳۶ء) 'بسمل کی آرزو اور خان بہادر' (۱۹۳۷ء) 'مراد' (۱۹۳۹ء) 'مسلم کا لعل' (۱۹۴۱ء) 'آدابِ عرض' (۱۹۴۳ء) 'بڑے نواب صاحب' اور 'بیگم' (۱۹۴۴ء) 'غزل' (۱۹۴۵ء) 'خان صاحب' (۱۹۴۶ء) 'دامن' (۱۹۵۱ء) 'چاندنی چوک' 'ناز' 'دروازہ' (۱۹۵۴ء) 'میرا اسلام' (۱۹۵۷ء) 'لالہ رخ' (۱۹۵۸ء) 'سلام محبت' (۱۹۶۰ء) 'آسمان محل' (۱۹۶۴ء) 'شطرنج کے کھلاڑی' (۱۹۷۷ء) اور 'دہلیز' (۱۹۸۶ء) ایسی فلمیں بھی بنائی گئیں جو اردو شعرو ادب کی قد آور شخصیات کی حیات اور معاملات کی عکاس رہیں۔ 'عمر خیام' (۱۹۴۶ء) 'شاعر' (۱۹۴۹ء) 'مرزا غالب' (۱۹۵۴ء) 'شاعرِ کشمیر مہجور' (۱۹۷۲ء) اور 'محافظ' (شاعر نور لکھنوی) (۱۹۹۳ء) میں وہ ماحول پیش ہوا جسے ہم خالص اردو شعر وادب سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

ان تمام فلموں کے سرسری جائزے کے بعد اب آیئے ان فلموں پر جنھوں نے اپنی تخلیق کے دور میں زبردست کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ اور جو آج تک فلم بین کو متاثر کرتی آرہی ہیں۔ دہلی، حیدرآباد اور لکھنؤ یہ تین شہر وہ ہیں جو ایک ہی تہذیب کی الگ الگ نمائندگی کرتے آئے ہیں۔ ان تینوں شہروں میں قدرِ مشترک مسلم طرزِ

معاشرت ضرور ہے مگر تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ یہ فرق ہے اردو زبان کا لہجہ اور اس کی اثر آفریں نزاکت کے ساتھ لباس اور ذائقے ان تینوں شہروں میں لکھنؤ اپنی رومان پرور حکایات لیے ہمارے ہونٹوں پر پھول کی پتی کے پہلے بوسے کی مانند دھڑکتا آ رہا ہے۔فلم سازوں نے ہماری اس جذباتیت سے فائدے اٹھائے اور وہ فلمیں تخلیق کیں جن فلموں نے ہمارے طلب اور تلاش کو نغمہ بدوش کہانیوں سے شرابور کر دیا۔ان میں وہ فلمیں خاص ہیں جو لکھنؤ کی رومان پرور سرزمین پر فلمائی گئیں اور نوابانِ اودھ کے ساتھ اہلِ اودھ کی طرزِ معاشرت کے ساتھ تخلیق کی گئیں متاثر کن فلمیں ہیں۔

بڑے نواب صاحب (۱۹۴۴ء) بیگم (۱۹۴۵ء) مہندی (۱۹۵۸ء) چودھویں کا چاند (۱۹۶۰ء) میرے محبوب اور بے نظیر (۱۹۶۳ء) غزل (۱۹۶۴ء) عید کا چاند اور آسمان محل (۱۹۶۴ء) بہو بیگم (۱۹۶۶ء) پالکی اور میرے حضور (۱۹۶۷ء) محبوب کی مہندی اور پاکیزہ (۱۹۷۱ء) شطرنج کے کھلاڑی (۱۹۷۷ء) نواب صاحب اور جنون (۱۹۷۸ء) امراؤ جان (۱۹۸۱ء) نکاح، بازار اور دیدارِ یار (۱۹۸۲ء) طوائف (۱۹۸۵ء) انجمن اور دہلیز (۱۹۸۶ء) تہذیب (۲۰۰۳ء) ان میں زیادہ تر فلمیں لکھنؤ کی رومان پرور معاشرے کی دین ہیں۔ان تمام فلموں کے جائزے سے یہ ثابت ہوا کہ ہماری فلموں میں نہ صرف اردو زبان، شعروشاعری، بلکہ مسلم طرزِ معاشرت کو ایک حقیقت پرور عکاسی کے ساتھ پیش کیا گیا۔

☆☆☆

فلموں سے ادب کا رشتہ

اشرف عثمانی دیوبندی

فلم میں ادب ضرورتاً اور برائے نام لیا جاتا ہے اس کے باوجود فلم مکمل طور پر ادب کی رہین منت نظر آتی ہے فلم ایک ترکیبی عمل سے وجود پاتی ہے چنانچہ اس کو تخلیقی چیز نہیں کہا جا سکتا۔ایک چیز جس کی تکمیل میں بہت سے فنکاروں اور محنت کشوں کے ذہنی، اشتراک، تکنیکی مہارت اور جسمانی مشقت کا عمل دخل ہو تخلیقی زمرے میں کیسے آسکتی ہے؟ محض ان بنیادوں پر اس کو تخلیق کہنے کا کوئی منطقی جواز نظر نہیں آتا، لیکن اس کے باوجود یہ کہنا اخلاقی مجبوری ہے کہ وہ چیز جس کو فلم کہا جاتا ہے، خود تخلیقی شے چاہے نہ ہو لیکن تخلیقی ادب کی کوکھ سے پیدا ہوتی ہے۔ایک معیاری فلم کا تصور ایک کہانی، افسانے یا ڈرامے کی تخلیق سے قبل مشکل ہے۔اردشیر ایرانی کی پہلی ٹاکی فلم ’’عالم آرا‘‘ (۱۹۳۱ء) پہلے پارسی تھیٹر کا مقبول ڈرامہ ہوا کرتا تھا جسے سلولائڈ پر منتقل کر دیا گیا ہے اس وقت سے لے کر عہد حاضر تک اردو ادب کے مشہور افسانے، کہانیاں اور ڈرامے فلموں میں ڈھلتے رہے ہیں، خاموش فلموں میں بھی کچھ اسی طرح ہوتا رہا۔

فلم اور ادب کے باہمی رشتوں کا تناظر نہایت وسیع ہے۔فلم سے اردو، ہندی، بنگالی، تامل ملیالم اور پنجابی وغیرہ کے ادب سے ایک رشتہ ہے لیکن فلم کی تعمیر وترقی میں سب سے زیادہ اہم رول نبھانے والا اردو ادب کو مانا گیا ہے کیونکہ اردو ہندوستان کے عوام کی محبوب زبان ہے یہی محبوبیت اس وقت فلم میں بھی پیدا ہوجاتی ہے جب اس میں اردو مکالمے بولے جاتے ہیں یا نغمات اردو میں رنگے ہوتے ہیں اردو زبان میں لکھے مکالموں اور نغمات نے ہمیشہ مقبولیت کی بلندیوں کو سَر کیا ہے۔دراصل ہندوستانی فلم کی اساس ہی اردو پر رکھی گئی۔پہلی ٹاکی فلم ’’عالم آرا‘‘ کے مکالمے منشی ظہیر نے اردو میں لکھے تھے (منشی ظہیر وہی ہیں جنھوں نے ’’ایک رات‘‘، من کی جیت، اور ’پریم سنگیت‘ جیسی فلموں میں مزاحیہ رول کئے تھے) اسی فلم میں اردو کے سات نغمے بھی تھے۔برصغیر کی تاریخ میں پہلا فلمی نغمہ بھی ریکارڈ ہوا تو اس کی زبان بھی اردو تھی ’’دے دے خدا کے نام پہ بابا‘‘ ہمت ہے گر دینے کی دیدے بابا (یہ نغمہ گونگی فلموں کے اداکار ڈبلیو ایم خاں کی آواز میں تھا جس کی موسیقی سید زاہد علی نے ترتیب دی تھی۔اس کے الفاظ بھی اردو کے تھے۔

”بدلہ دلائے یارب تو ستمگروں سے“

ہندوستانی عوام کی پسند اور ناپسند کے رجحان کے سبب سے گیت ونغمات کو فلم میں روز اول سے اہمیت حاصل ہے گرچہ شروع وقتوں میں غزل، قوالی ٹھمری، خیال، امیر خسرو کی کہاوتیں اور لوک گیت وغیرہ ہی فلموں میں بھرے جاتے رہے جو عموماً کتابوں کا ”سرقہ“ ہوتے تھے ۱۹۴۰ء تک فلمی دنیا میں شاعروں کی خاصی کمی رہی۔ کوئی بڑی کمپنی ہی کسی شاعر کو لایا کرتی تھی، یوں تو تنویر نقوی ۱۹۳۱ء میں ہی فلموں میں پہونچ گئے تھے اور ان کے بعد کیدار شرما، علامہ آرزو لکھنوی اور دیوان شرما وغیرہ بھی فلموں سے وابستہ ہوگئے تھے لیکن اس دور میں شاعروں کی باقاعدہ کوئی منفرد حیثیت نہیں ہوتی تھی۔ (شکیل بدایوانی سے پہلے والوں کے سلسلہ میں تو بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے) انتہا یہ کہ علامہ آرزو لکھنوی جیسا مستند شاعر کو بھی ۱۹۳۶ء میں اداکاروں کا ”س ق“ درست کرانے کے واسطے بلایا گیا تھا، پر جس تضاد کے ساتھ فلم میں نغمات کی مانگ بڑھنے لگی۔ نیز یہ حقیقت عیاں ہوتی گئی کہ ”ادب زندگی کی تفسیر ہے۔ اور ادب کے بغیر حقیقت نگاری ناممکن ہے، اسی تیزی کے ساتھ فلمی دنیا میں شاعروں کی مانگ اور اہمیت بڑھتی گئی، دیکھتے ہی دیکھتے نگارستان فلم کے سارے باب شاعروں اور ادیبوں پہ وا ہوگئے ہر بڑا ادیب وشاعر (خصوصیت سے ترقی پسند) فلم کی طرف دوڑنے لگا۔ پھر ایک دور ایسا بھی آیا کہ فلمی دنیا بیشمار نغمہ نگاروں اور کہانی، افسانے، نیز منظر نامے لکھنے والے ادیبوں وشاعروں سے کچھا کچھ بھر گئی اور سعادت حسن منٹوؔ، کرشن چندرؔ، راجندر سنگھ بیدی، رامانند ساگرؔ، خواجہ احمد عباسؔ، عصمت چغتائیؔ، ساحر لدھیانویؔ، شکیل بدایونیؔ، مجروح سلطان پوریؔ، راجندر کرشن، جاں نثار اخترؔ، کیفیؔ اعظمی اور علی سردار جعفری جیسے ادباء وشعراء فلمی افق پر چھا گئے۔ فلم کی کہانی منظر نامے، مکالمے لکھنے کا کام ادیبوں اور گیت ونغمات تخلیق کرنے کا کام شاعروں کے سپرد ہوا (یاد رہے ابتداء میں یہی کام عام آدمی سے لیا جاتا تھا جو کسی ناول، افسانے یا کہانی وغیرہ پر منظر نامہ تیار کرتا اور کئی شاعروں کے دیوان سے مختلف قسم کی غزلیں، کہانی اور سچویشن کے اعتبار سے ”سرقہ“ کرتا) اسی کے ساتھ ساتھ فلم میں سنجیدگی آتی گئی اور اس کا معیار بلند ہوتا گیا۔

اردو ادیبوں اور شاعروں نے فلمی زبان کو شستہ اور نستعلیق بنایا ہے عوام کی عقل وفہم کی سطح سے ہم آہنگ

کیا اور اسی چیز نے فلم کو عوام میں مقبول کر دیا۔ عوامی مقبولیت کے بغیر نہ فلم کی کامیابی ممکن ہے اور نہ فلمی دنیاء کی بقاء۔ اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو زیادہ تر کامیاب فلموں کے پیچھے اردو افسانہ نگاروں اور مکالمہ نویسوں یا اردو نغمہ نگاروں کا نمایاں رول خاص طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

فلمی اقدار کا گراف آج کتنا بھی نیچے آگیا ہو پر آج بھی یہ کہنا درست ہوگا کہ ہر فلم کا وزن، کہانی، منظر نامہ، مکالمے اور نغمات کے ترازو پر تلتا ہے۔ ذی شعور فلم بین انہی کو فلم کی روح سمجھتا ہے، عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ انعام یافتہ فلموں کی کہانیاں منظر نامے، مکالمے اور نغمے اردو کے مشہور ترین ادباء شعراء کے لکھے ہوتے ہیں۔ مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ عالمی نمائش کے لئے منتخبہ فلموں میں ایسی فلم نہیں ہوتی جن میں ادب کی چاشنی نہ ہو۔

جہاں تک معیاری اور عمدہ کہانی، منظر نامے اور مکالموں کی بات ہے تو یہ سچ ہے کہ ان کی پرکھ ہر آنکھ کو نہیں ہوتی۔ اس کی باریک بینی اور نہ شعور کی گہرائی درکار ہوتی ہے لیکن فلمی نغمات کے بارے میں تسلیم شدہ حقیقت یہ ہے کہ ان سے ہر خاص وعام یکساں طور پر متاثر ہوتا ہے، مثلاً آج بھی بے شمار پرانی فلمیں ایسی ہیں جنہیں کوئی دیکھنا پسند نہیں کرتا' لیکن ان کے گیت ونغمات زندہ جاوید ہیں۔ ابتداء سے لیکر عہد حاضر تک بہت سی فلمیں ایسی بھی ملتی ہیں جن کی کامیابی محض گیت ونغمات کی جانداری کے سبب ہوسکی۔ اس کے برعکس بھی کچھ ایسا ہے کہ اچھی فلمیں بھی گیت ونغمات کی بے بسی کی وجہ سے ناکام ہوگئیں۔ تاریخ فلم سے ان فلموں کے نام چن لئے جائیں جن کے گیت ونغمات اردو نغمہ نگاروں (شاعروں) کی تخلیقات پر مبنی ہیں اور ان فلموں کے نام بھی اٹھا لئے جائیں جن متشاعروں کی تک بندی کو گیت ونغمات کا نام دیا گیا تو دونوں کے تقابل سے یہ نتیجہ آنا ضروری ہے کہ اول الذکر گیت ونغمات کا شباب وجوانی اور ان کی مٹھاس ہمیشہ اور ہر دور میں حتیٰ کہ دورِ حاضر میں بھی یکساں طور پر رہا ہے انہیں آج بھی ”سدابہار“ کہا جاتا ہے ان کے برعکس ثانی الذکر کی عمر اور جوانی اس بھکتے چراغ کی مانند ہوتی ہے جو گل ہونے سے قبل خوب روشن تو ہوتا ہے لیکن یکایک اس کی روشنی فنا بھی ہوجاتی ہے۔ فلم ”قربانی“ کے ”ڈسکو گانے“ جس کے ریکارڈوں کی فروختگی نے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا تھا، اس کے علاوہ ”تتک تتک تو تیا جما لو' ہم تو بمبو میں تمبو لگائے بیٹھے' او نیلی ٹوپی والے' اوئے اوئے... جیسے بے انتہا بجنے والے گانے آج کہاں ہیں؟ جبکہ اس کے برخلاف اردو نغمات جن میں شعریت پائی جائے وہ عہد حاضر کے ہوں یا گئے وقتوں کے ان کی عمر دراز ہوتی ہے 'تصویر بناتا ہوں تصویر نہیں بنتی' نہ ملتا غم تو

بربادی کے افسانے کہاں جاتے' اس طرح کے سالوں پرانے بے شمار نغمات آج بھی ہرجگہ سنائی دیتے ہیں اور ہر خاص و عام ان کو پسند بھی کرتا ہے اس میں شک نہیں کہ گیت ونغمات میں وجد آفریں ترنگیں پیدا کرنا موسیقی کا کام ہے پر موسیقی تنہا کیف وسرور اور نشاط انگیزی پیدا نہیں کرسکتی جب تک اس کو خوبصورت الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش کا سہارا نہ ملے۔ کیونکہ انسان کا دماغ روح اور وجدان الفاظ و بیان کی طلسماتی تاثیر سے بچ نہیں سکتا۔ انسان کا طرۂ امتیاز ہی یہ ہے کہ اس کے پاس جذبات اور احساسات کے ہم وزن الفاظ اور قوت گویائی ہے جب یہ مان لیا جاتا ہے کہ ارتقاءِ انسانی میں ''الفاظ'' کا سب سے بڑا حصّہ ہے تو بات سمٹ کر فلموں تک بھی آ ہی جاتی ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ متکلم فلموں کے بقا و استحکام میں ادب اور خاص طور پر اردو ادب کا بڑا حصہ ہے اور اس کریڈٹ کا بڑا حصّہ فلمی دنیا کے اردو شعراء کو پہونچتا ہے جنھوں نے پورے ماحول میں الفاظ کی نغمگی بکھیری ہے۔

یہاں یہ کہنا منشا نہیں ہے کہ فلم میں خالص اردو ادب کا استعمال ہوتا آیا ہے، فلم میں ادب کا درجہ اس وقت رو بہ زوال ہے، جنہیں فلمی ادیب کہا جاتا ہے وہ دنیائے ادب کے مستند ادیب ہوتے ہیں لیکن ان تمام مستند شعراء و ادباء نے عوام کی عقل وفہم اور ان کے پیمانوں کو سامنے رکھتے ہوئے فلمی نگارشات پیش کی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان میں زیادہ تعداد ان نگارشات کی ہے جو نقادوں کے نزدیک ادب کے زمرے میں نہیں آتیں لیکن اس حقیقت سے کوئی منکر نہیں کہ ان تمام نگارشات میں ادب کی چاشنی ضرور شامل ہے جس کے ذریعے فلم جیسی سطحی چیز کا معیار بھی بلند ہو جاتا ہے۔ اس کو مجبوری کہہ لیجئے یا ضرورت کہ فلمی دنیاء سے وابستہ ہر ادیب و شاعرِ عوام کی ذہنی سطح سے سمجھوتا کرنے پر مجبور و بے بس ہے۔ جو ایسا نہیں کر پاتے انہیں اس نگری سے ہجرت کرنا پڑتی ہے۔ ٹالسٹائی نے بہت پہلے ایسے فلمی سمجھوتے کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''وہ دن دور نہیں جب ہینڈل سے گھومنے والی ایک مشین (کیمرہ) ہم ادیبوں کی زندگی چکر میں ڈال دے گی اور دنیا میں لکھنے لکھانے کا نیا سلسلہ شروع ہوگا''۔

واقعی ایسا ہوا بھی کیمرہ نے ادیبوں اور شاعروں کو چکر میں ڈال دیا ان میں بہت سے ایسے ہیں جو اس مشین سے سمجھوتا کرنے پر مجبور ہیں چنانچہ ان کی نگارشات خالص ادب میں شمار نہیں ہوتیں چونکہ یہ فطری طور پر شاعر و ادیب ہوتے ہیں اس لئے ان کی نگارشات وتخلیقات سطحی بھی نہیں اس

طرح ایک معتدل معیار قائم ہو جاتا ہے جو ہر خاص و عام کے لئے پسندیدہ ہوتا ہے۔ اس کو عوامی ادب بھی کہا جاسکتا ہے اسی پر فلم کی بنیادیں ٹکی ہوتی ہیں۔

بردک نے کہا تھا ''لائق مردوں اور عورتوں کے لکھے احساسات اور خیالات کو اس طرح ترتیب دینا کہ پڑھنے (اور سننے) والے کو مسرت اور انبساط ہو ادب ہے'' اس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ ایک دل چھوتی کہانی' حقیقت سے میل کھاتے منظر نامے' جذبات کی صحیح عکاسی کرتے مکالمے' روح پرور اور نشاط انگیز نغمے صرف ادباء وشعراء کی کاوشوں سے ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔ اس پس منظر میں ادیبوں اور شاعروں کو فلم سے علیحدہ کر کے فلم کا تصور کیا جائے تو فلم کا معیار کیا رہ جاتا ہے۔

فلم کی کہانی' مکالمے اور نغمے اکثر اردو افسانہ نگاروں' ادیبوں اور شاعروں کے ہوتے ہیں حتیٰ کے فلم کے نوّے فیصد نام بھی اردو میں ہوتے ہیں لیکن اردو کے ساتھ یہ امتیاز مستقل برتا جاتا ہے کہ خالص اردو فلموں کو بھی ''ہندی سرٹیفکٹ زور زبردستی دے دیا جاتا ہے۔ مظفر علی جیسے لوگ یا ناصر حسین جیسی فلمی شخصیتیں چند ہی ہیں جو اپنی فلم کا سرٹیفکٹ اردو کا لیتے ہیں لیکن زیادہ تعداد ایسے فلمسازوں کی ہے جو اُردو میں فلم بنا کر فلم کا سرٹیفکٹ دوسری زبان کا قبول کر لیتے ہیں' اس میں ان فلمسازوں کی خطا بھی کیا جب حکومتی میشنری بھی اردو کو فنا کرنے میں جٹی ہوئی ہے اس سے نہ صرف انصاف کا خون ہو رہا ہے بلکہ حکومتی مشینری بھی فلم کی دنیا میں بدنام ہوتی ہے۔

☆☆☆

حب الوطنی سے سرشار فلمی نغمے

ایم قمر علیگ

جنگ آزادی کے دوران ہندوستان کے بے شمار شعرا نے حب الوطنی پر مبنی غزلوں اور نظموں کی تخلیق کی تھی جو آزادی کے پروانوں کے دلوں میں ایثار قربانی کا جذبہ پیدا کرنے میں بہت اہم مقام رکھتی ہیں۔اخبارات ورسائل نے بھی اپنا کردار ادا کیا تھا۔معروف نثر نگار اور شعراء پر برطانوی حکومت سخت نگرانی رکھتی تھی کیونکہ آزادی کے متوالے نشر واشاعت کے ذریعہ بھی آزادی کی تحریک کو مضبوط بنا رہے تھے۔دنیا کی تاریخ میں جب کبھی بھی کسی ملک میں انقلاب آتا ہے تو وہ اچانک نہیں آتا بلکہ بتدریج اس کی ارتقا ہوتی ہے۔تحریری جنگ جسے ہندی میں ''شبدیدھ'' کہتے ہیں،بہت زیادہ طاقتور ہوتا ہے کیونکہ ہم خیالات پیدا کرنے میں یہ ایک اہم ذریعہ ہوتا ہے اسی لیے روس میں کمیونزم کے عظیم رہنما اور دانشور لینن نے ایک بار کہا تھا مجھے ایک قلم سے اتنا ڈر لگتا ہے جتنا ایک کروڑ تلواروں سے نہیں لگتا۔اس وقت ۱۹۱۷ء میں لینن زار شاہی سے نجات حاصل کرنے کے لیے انقلابی تحریک کی قیادت کر رہے تھے۔اسی دوران عظیم ادیب پشکن نے بھی اپنی تخلیقات کے ذریعہ تحریک میں مزید روح پھونک دی تھی۔اس سے قبل فرانس کے انقلاب میں بھی اسی طرح کی مثالیں سامنے آتی ہیں۔ ہندوستان میں حالانکہ ۱۸۵۷ء میں ہی آزادی کا صور پھونکا جا چکا تھا اور مجاہدین کی قیادت کرنے کی پاداش میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو جلاوطن کی سزا دے کر رنگون بھیج دیا گیا تھا۔اس کے بعد مجاہدین آزادی کو معتوب کرتے ہوئے انگریزوں نے ہمارے ملک پر ۹۰ برس تک حکومت کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔رفتہ رفتہ انقلاب کا شعلہ تابناک ہوتا چلا گیا۔اس دور کے شعرا اور ادیب اپنی تخلیقات میں جذبات کی ترجمانی کرنے لگے۔

ہندوستان ری پبلکن ایسوسی ایشن (۱۸۲۴) کے بانیان رکن اور ۹ اگست ۱۹۲۵ء کو لکھنؤ کے نزدیک' کاکوری' واقعہ کی پاداش میں جام شہادت نوش فرمانے والے عظیم وطن پرست رام پرساد بسمل کی زبان پر یہ غزل ''سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے'' پورے ملک میں آزادی کے پروانوں کے درمیان نہایت مقبول ہوگئی تھی جس کو آزادی کے بعد ۱۹۶۴ء میں پردہ سیمیں پر نمودار ہونے والی

منوج کمار کی فلم ''شہید'' میں ایک جذباتی منظر کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بھی یہ غزل حب الوطنی کی بیش بہا ترجمانی کر رہی ہے۔حب الوطنی سے سرشار ایک گیت ''اے میرے وطن کے لوگو ذرا آنکھ میں بھر لو پانی'' آنجہانی پردیپ جی نے لکھا تھا۔داداصاحب پھالکے ایوارڈ یافتہ ملک کی عظیم گلوکارہ لتا منگیشکر نے نہایت جذباتی انداز میں گایا تھا۔اس گیت کو سن کر ہندوستان کے اولین وزیراعظم آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کی آنکھیں بھی نم ہوگئی تھیں۔آج بھی یہ گیت ملک کے گوشہ گوشہ میں تقریباً تمام قومی تقریبات میں بجایا جاتا ہے۔

چین ہمارا پڑوسی ملک ہے اور زمانہ قدیم سے ہمارے اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات رہے ہیں لیکن ۱۹۶۲ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کے دورِ اقتدار میں اس نے ہمارے ملک پر حملہ کر دیا تھا۔اہل وطن نہ صرف اس پر انگشت بہ دنداں تھے بلکہ محو حیرت بھی تھے کہ کیا کوئی دوست پڑوسی ملک اپنے ہمسایہ ملک پر حملہ کرسکتا ہے۔اس جنگ میں ہماری فوج کے بہت سے سپاہی اور افسران شہید ہوگئے تھے۔اسی جنگ سے متاثر ہوکر ۱۹۶۴ء میں چیتن آنند نے فلم ''حقیقت'' بنائی تھی۔اس فلم کا ایک گیت ''کر چلے ہم فدا جان وتن ساتھیوں'' کیفی اعظمی نے لکھا تھا جس کو محمد رفیع اور ہمنواؤں نے موسیقار مدن موہن کی ہدایت میں گایا تھا۔اس گیت میں حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ بھرا ہے۔جس منظر نامہ میں اس گیت کو فلمایا گیا تھا وہ بھی اثر انگیز ہے اور وطن پرستی کے جذبہ کو برقرار رکھنے کی تحریک دیتا ہے۔

آزادی سے قبل ریلیز ہونے والی جن دو فلموں میں وطن پرستی کے جو دو گیت پیش کئے گئے تھے ان کا ذکر کرنا بھی یہاں مناسب ہوگا۔سہراب مودی کی فلم ''سکندر'' (۱۹۴۱) میں ایک گیت۔''جیتے دیش ہمارا، بھارت ہے گھر بار ہمارا'' پیش کیا گیا تھا۔اس گیت کو پنڈت سدرشن نے لکھا تھا اور موسیقار میر صاحب اور رفیق غزنوی کی ہدایت میں شیلا اور ساتھیوں نے گایا تھا۔

حب الوطنی پر مبنی ہونے کی وجہ سے بامبے سنسر بورڈ کے ذریعہ چھاؤنی علاقوں میں اس کے دکھائے جانے پر پابندی عائد کردی گئی تھی مگر اس گیت سے انگریزوں کو ہندوستانیوں کے عزائم کا احساس ہوگیا تھا۔۱۹۴۳ء میں ایک فلم ''قسمت'' کے نام سے بنائی گئی تھی اس فلم کا گیت۔''آج ہمالیہ کی چوٹی سے پھر ہم نے للکارا ہے۔دور ہٹو اے دنیا والو ہندوستان ہمارا ہے''۔کوارون کمار نے انل بسواس کی موسیقی میں

گایا تھا اس کے نغمہ نگار پردیپ تھے۔ چالیس کی دہائی میں وجود میں آنے والا یہ گیت آج بھی مقبولیت کا ریکارڈ قائم کئے ہوئے ہے۔ آزادی کے ایک سال بعد یعنی ۱۹۴۸ء میں دلیپ کمار کی فلم ''شہید'' ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم کا گیت ''وطن کی راہ میں وطن کے نوجواں شہید ہو'' راجہ مہدی علی خاں کا تحریر کردہ تھا جسے غلام حیدر کی موسیقی میں محمد رفیع اور خان مستان نے گایا تھا۔ حالانکہ یہ گانا دو گلوکاروں کی آواز میں صدابند کیا گیا تھا لیکن آج بھی رفیع صاحب کے بہترین وطن پرستی کے نغموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس گیت کو سننے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق آزادی سے قبل ہوئی ہوگی۔ اس گانے کے بول اور خیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حب الوطنی کا جذبہ مزید بیدار کرنے کے لیے وجود میں لایا گیا تھا۔ علاوہ ازیں کسی فلم کے مکمل ہونے میں عمومی طور پر ایک سال تو لگ ہی جاتا ہے۔ ویسے بھی دلیپ کمار ایک سال میں ایک ہی فلم کرنے کے لیے پہلے ہی سے مشہور ہیں بہرکیف ریڈیو پر جب بھی یہ نغمہ سنائی دیتا ہے جنگ آزادی کے لیے کی جانے والی جدوجہد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

مادر وطن کی شان میں جذبہ عقیدت کی ترجمانی کرنے والا بنکم چندر چٹرجی کا نغمہ ۱۹۵۲ء میں فلم ''آنند مٹھ'' میں پیش کیا گیا تھا۔ اس فلم میں گیتا بالی نے بھی کام کیا تھا۔ اس نغمہ کو لتا منگیشکر نے ہیمنت کمار کی ہدایت میں گایا تھا۔ یہ نغمہ یعنی ''وندے ماترم، سجلام، سپھلام، ملیج شیتلام'' آج بھی قومی ترانے کے بعد خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ قومی تقریبات میں اسے بڑے اہتمام کے ساتھ گایا جاتا ہے۔

۱۹۵۴ء میں فلم ''جاگرتی'' ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم کے دو گیت بہت مقبول ہوئے تھے۔ ''ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کے'' اور ''آؤ بچو تمہیں دکھائیں جھانکی ہندوستان کی'' ان دونوں گانوں کے تخلیق کار پردیپ تھے اور ان کی موسیقی ہیمنت کمار نے ترتیب دی تھی۔ پہلے گانے کو محمد رفیع نے گایا تھا اور دوسرے کو بذات خود پردیپ اور ان کے ساتھیوں نے اپنی پرکشش آواز میں گایا تھا۔ اول الذکر گیت میں جہاں تحریک آزادی میں پیش آنے والے مصائب کا ذکر کیا گیا ہے وہیں اس بات کی بھی تائید کی گئی ہے کہ حصول آزادی ایک بیش قیمت اثاثہ ہے جس کی آبیاری کرنا آئندہ نسل نو کا فریضہ ہے۔ جب کہ دوسرے گیت میں وطن عزیز کی عظمت کے گن گائے گئے ہیں۔

۱۹۵۷ء میں فلم ساز ہدایت کار بی آر چوپڑہ کی فلم ''نیا دور'' ریلیز ہوئی تھی۔ حالانکہ یہ فلم صنعتی تغیر پر مبنی

تھی۔ مزدوروں کے ذریعہ لکڑی کے کٹان کی بجائے آرا مشین اور گھوڑے تانگہ کی بجائے موٹر گاڑی چلنے سے پیدا شدہ صورتحال کی منظر کشی کی گئی تھی۔ لیکن اس فلم میں ساحر لدھیانوی کا ایک گیت ''یہ دیش ہے ویر جوانوں کا'' بھی تھا جسے محمد رفیع اور بلبیر نے موسیقار او پی نیر کی ہدایت میں گایا تھا۔ یہ گیت بھی وطن عزیز کی محبت اور اس کی شان سے مزین تھا۔ حصول آزادی کے بعد ایسے بہت سے گانے تحریر کئے گئے اور فلمائے گئے جن میں مادر وطن سے محبت اور آزادی کو مضبوط کرنے کے خیال کی ترجمانی کی گئی۔ ۱۹۶۱ء میں ڈاکو کی زندگی پر مبنی دلیپ کمار کی فلم ''گنگا جمنا'' منظر عام پر آئی۔ اس میں ایک پاٹھ شالہ کا منظر بھی دکھایا گیا تھا۔ ماسٹر ایک پیڑ کی چھاؤں میں بچوں کو جمع کر کے ایک گیت ''انصاف کی ڈگر پہ بچو دکھاؤ چل کے'' گاتا ہے۔ یہ گیت شکیل نے لکھا تھا اور موسیقار نوشاد کی ہدایت میں ہیمنت کمار اور ہمنواؤں نے گایا تھا۔ ہمارے ملک کے رہنماؤں کے مطابق ''بچے ملک کا مستقبل'' ہیں اور ممکنہ قیادت انہیں کے ہاتھوں میں ہوگی اس لیے ان کا حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہونا نہایت ضروری ہے۔ ۱۹۶۳ء میں ایک فلم منظر عام پر آئی تھی۔ اس فلم کا نام ''پھول بنے انگارے'' تھا۔ اس فلم کا گیت ''وطن پر جو فدا ہوگا، امر وہ نوجواں ہوگا'' محمد رفیع نے موسیقار کلیان جی آنند جی کی ہدایت میں گایا تھا۔ اس گانے کے تخلیق کار آنند بخشی تھے۔ اس گیت میں یہ پیغام تھا کہ وطن پر شہید ہونے والے جوانوں کا خون رائیگاں نہیں جاتا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتا ہے۔ ملک کی تاریخ ان کو فراموش نہیں کر سکتی۔ فلم ''لیڈر'' (۱۹۶۴ء) کے لئے شکیل نے ایک بہت ہی خوبصورت گیت ''اپنی آزادی کو ہم ہرگز مٹا سکتے نہیں'' لکھا تھا۔ جس کو نوشاد کی موسیقی میں محمد رفیع نے نہایت دلکش انداز میں گایا تھا۔ دلیپ کمار کی یہ فلم انگریزی دور کے نوابی نظام پر مبنی تھی۔ اس گانے میں اس خیال کا اظہار کیا گیا تھا کہ ہمیں اپنی آزادی جان سے زیادہ عزیز ہے اور ہم کسی کے سامنے سر نہیں جھکا سکتے۔ ''لیڈر'' کا یہ گیت بھی بہت زیادہ مقبول ہوا اور آج بھی شاہکار گیتوں میں اس کا شمار کیا جاتا ہے۔

ہمارے ہندوستان کو سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا کیونکہ قدرت نے یہاں پر تمام وسائل عطا کر رکھے ہیں۔ فلموں اور گیتوں میں بھی اس خیال کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں دو فلموں کے گیتوں کا ذکر کرنا بھی مناسب ہوگا۔ ۱۹۶۵ء میں فلم ''سکندر اعظم'' کا یہ گیت ''جہاں ڈال ڈال پر سونے کی چڑیاں'' محمد رفیع نے ہنس راج بہل کی موسیقی میں گایا تھا۔ اس گیت کے خالق راجندر کرشن تھے۔ دوسری فلم ''اپکار'' (۱۹۶۷ء) تھی

جس میں گلشن باورا کے گیت ''میرے دیش کی دھرتی سونا اگلے'' مہندر کپور نے کلیان جی آنند جی کی موسیقی میں گایا تھا۔ یہ دونوں گیت وطن عزیز کی خوشحالی اور عظمت بیان کرتے ہیں۔

علامہ اقبال کا ترانہ ''سارے جہاں سے اچھا'' سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔فلموں کے علاوہ اس کے بارے میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ جب ہندوستانی خلاباز فضا میں پہنچے تو سیٹلائٹ پر آنجہانی وزیر اعظم اندرا گاندھی سے بات ہوئی۔محترمہ گاندھی نے جب خلاباز سے پوچھا کہ وہاں سے ہندوستان کیسا نظر آتا ہے تو اس نے کہا۔''سارے جہاں سے اچھا''۔

☆☆☆

فلموں میں ہولی

پریم پال اشک

جی ہاں، ہولی کھیل ہی پیار، محبت' اتحاد اور ایکتا کا ہے۔ رنگ میں ڈوبی ایک ایک پچکاری دوست اور دشمن دونوں کو ایک کر دیتی ہے۔اور اس کا فضا میں اڑتا ہوا گلال، چاندی کی طرح کھنکنے قہقہوں کی بارش کرنے لگتا ہے۔رنگوں کی یہی پچکاریاں مرمریں جسموں کو رنگوں میں شرابور کر دیتی ہیں۔ اور چہروں کو رنگین بنانے والا یہی عبیر اور گلال کبھی کبھی ہیرو، ہیروئن اور وِلن تینوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔اور ان تینوں کو ایک ہی رنگ میں اس انداز سے رنگ دیتا ہے کہ ہولی کا ایک ایک سیکیونس فلم کی پوری کہانی کا ایک اٹوٹ انگ بن کر رہ جاتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ ہولی سیکیونس اسی فلم کے لئے فلمایا گیا ہو، ایسے ہی ہولی کے چند سیکیونس مجھے یاد آ رہے ہیں۔

سب سے پہلے مجھے یاد آ رہی آج سے بیس بائیس برس قبل محبوب کی فلم 'مدر انڈیا' کی۔ یہ آج سے تقریباً ۳۸،۳۷ سال قبل بنی فلم 'عورت' کا رنگین چربہ تھا۔'مدر انڈیا' کا ہولی سیکونس بہت اہم ہے۔اس سین میں سب سے پہلے نامور موسیقار نوشاد کی ہدایت شکیلؔ مرحوم کی ہولی چلتی ہے۔اس ہولی سیکیونس میں سنیل دت، چنچل، عذرا، راجندر کمار، اور ان کے ساتھی حصّہ لیتے ہیں۔گیت کے بول یوں تھے۔اس گیت کو شمشاد بیگم نے بڑے دل کش انداز سے گایا تھا۔

''ہولی آئی رے
کنہیا
رنگ برسے سنا دے ذرا بانسری
بھر گلال رنگ مورا انگنوا
اپنے ہی رنگ، رنگ موہے سجنوا''

شکیل نے یہ ہولی بڑے دل کش انداز میں لکھی ہے۔اس گیت میں ہماری تہذیب اور تمدن کا پورا رچاؤ موجود ہے۔خالص لوک گیتوں کا سا انداز ہے۔عذرا کنہیا لال کی لڑکی ہے۔اس گانے کے بعد سنیل دت چنچل سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہے۔اور اسی بنا پر کہانی نقطۂ عروج تک پہنچتی ہے۔

آج سے تقریباً پندرہ سال قبل او پی رلہن کی ایک فلم 'پھول اور پتھر' آئی تھی۔اس کا ہولی سین بھی کافی دلچسپ تھا۔اس فلم میں مینا کماری ایک بیوہ بنتی ہے۔دھرمیندر اسے اپنے گاؤں میں لے آتا ہے۔وہاں وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہولی کھیلتا ہے۔اس موقع پر مجروحؔ کی لکھی یہ ہولی کورس کی شکل میں گائی جاتی ہے:

لائی ہزاروں رنگ ہولی
کوئی تن کے لئے من کے لئے
کوئی تو بھر پچکاری
کوئی رنگ نظر متواری
کھائے بھیگے بدن ہچکورے.....لائی.....

یہ گیت مینا کماری کے کردار کے ساتھ ساتھ ہمارے سماج میں بیواؤں کی مجبوریوں کی طرف بھی واضح اشارہ کرتا ہے:

''لائی ہزاروں رنگ ہولی
کوئی تن کے لئے کوئی من کے لئے''

مینا کماری بیوہ ہونے کی وجہ سے ہولی نہیں کھیل سکتی....اسی لئے تو شاعر نے کہا ہے:

''تن کے رنگ کو سارا جگ جانے
من کے رنگ کو کوئی نہ پہچانے''

اگر کوئی رنگ پہچانتا ہے تو وہ صرف دھرمیندر ہے، وہی اسے قدم قدم پر سہارا دیتا ہے۔

سات آٹھ سال ہوئے راجندر سنگھ بیدی کی فلم ''پھاگن'' آئی تھی۔اس کا ہولی سیکوئنس فلم کی کہانی کا ایک جز ولاینفک تھا۔اس میں پیوند کاری کا احساس کہیں نہیں ہوتا تھا۔کہانی میں تال میل رکھنے والے اب تک میں نے جتنے ہولی سیکوئنس دیکھے ہیں ان میں مجھے پھاگن کا سیکوئنس سب سے زیادہ پسند آیا ہے۔مجروحؔ کی لکھی اور ایس ڈی برمن کی خوبصورت دھن میں ترشی ہولی رنگ ونور کے حسین اندردھنش کے ساتھ دعوتِ فکر ونظر بھی دیتی ہے۔

سب سے پہلے مجروحؔ کی لکھی اور ایس ڈی برمن کی دُھن میں ترَشی یہ ہولی گائی جاتی ہے۔

''پیا سنگ کھیلو ہوری، ساون آیا رے''

جی ہاں، وحیدہ رحمان اور دھرمیندر آپس میں ازدواجی بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔دھرمیندر ایک معمولی گھر کا فرد ہے۔جب کہ وحیدہ کا مائیکہ ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔دھرمیندر وحیدہ کے مائیکے میں آکر اس کے ساتھ ہولی کھیلتا ہے۔وحیدہ نے نئی ساڑی پہن رکھی ہے۔وہ ساڑی خراب ہونے کے ڈر سے ہولی کھیلنا نہیں چاہتی۔لیکن دھرمیندر خوشی اور مسّرت کے جھولے میں جھولتا رنگ بھری پچکاری وحیدہ کی ساڑی پر چھوڑ دیتا ہے۔جس کے نتیجے میں اس کی نئی ساڑی خراب ہو جاتی ہے۔وحیدہ تاؤ میں آجاتی ہے اور اس کی ماں دھرمیندر پر کراری چوٹ کرتی ہے، اور کہتی ہے کہ'' آپ کی مہینے بھر کی تنخواہ کے برابر میری بیٹی کی اس ایک ساڑی کی قیمت ہے۔''اس پر وحیدہ صرف اتنا کہتی ہے کہ اگر آپ نئی ساڑی خرید کر نہیں دے سکتے تو آپ کو ساڑی خراب کرنے کا بھی حق نہیں ہے''۔

بس یہی بات دھرمیندر کو لگ جاتی ہے۔اس کے بعد کہانی اپنی رفتار پکڑتی ہے۔دھرمیندر وحیدہ کو چھوڑ دیتا ہے۔اور جہاں بھی وہ کام کرتا ہے وہ اپنی تنخواہ سے ساڑیاں خرید کر اکٹھی کرتا ہے اور ان سے ایک اچھا خاصہ ساڑی ایمپوریم بنالیتا ہے۔آخر ان ساڑیوں کو آگ لگ جاتی ہے۔بہرحال یہ ہولی سیکوئنس فلم 'پھاگن' کی بنیاد ہے۔اس سیکوئنس کی فلم بندی سے راجندر سنگھ بیدی کے ایک عمدہ افسانہ نگار کے ساتھ ایک چابکدست ہدایت کار ہونے کا ثبوت بھی مل گیا ہے۔

چند سال قبل پرکاش پکچرز کے جھنڈے تلے ہرسکھ بھٹ کی زیر ہدایت فلم 'ہولی آئی رے' آئی تھی۔اس فلم کا ہولی سیکوئنس بھی کہانی کی بنیاد تھا۔اور یہ کہانی میں پوری طرح جذب ہو گیا تھا۔اس کا ہولی گیت اندیور کے زورِ قلم کا نتیجہ تھا۔ہولی کا تہوار بسنت کا پیغام دیتا ہے۔اور بسنت رُت میں کام دیوا پنے تیرِ نظر سے حسن اور عشق دونوں میں خواہشِ وصل کا ایک طوفان برپا کردیتا ہے۔اس کے گیت میں بھی انہیں جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔گیت کے بول ملاحظہ فرمائیے۔

ہولی آئی رے، ہولی آئی رے
انگ انگ میں اگن جگاتی
مدن جگاتی
جُھومتی گاتی ہولی آئی رے''

ہولی کا دن ہے۔منگل سنگھ کی بیٹی سہاگی (مالاسنہا) ٹھاکر گوپال سنگھ کے بیٹے سمر (پرکاش تھاپا) کے دامِ فریب میں گرفتار ہو کر اپنی زندگی کا انمول رتن کھو بیٹھتی ہے۔آخر امید سے ہو جاتی ہے۔سمر اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔اور جھگڑے میں اس کا قتل ہو جاتا ہے۔ہولی سیکوینس ہی اس فلم کی کہانی کی بنیاد ہے۔کہانی میں کہانی کار سے زیادہ ڈائریکٹر کا کمال دیکھنے کو ملتا ہے۔اور وہ بھی خالص بمبیّا فلمی انداز میں اسی فارمولے کے سہارے کہانی آگے بڑھتی ہے۔لیکن جہاں تک ہولی سین کا تعلق ہے اس کہانی کا ایک اٹوٹ انگ تصّور کیا جانا چاہیئے۔

کچھ سال ہوئے فلم ساز تاراچند برجاتیہ کی فلم 'میرے بھیّا' آئی تھی۔اس کا ہولی سیکوینس بھلائے نہیں بھولتا۔یہ بھی فلم کی کہانی کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔فلیش بیک میں وجے اروڑہ کے بچپن کا سین چلتا ہے۔ہولی کا دن ہے۔وجے اروڑہ اپنی بہن ناظمہ کے ساتھ گھر میں ہولی کھیل رہا ہے۔اس فلم میں پرن گپتا وجے اروڑہ کا باپ بنا ہے۔وجے اروڑہ گھر میں اپنی بہن کے ساتھ ہولی کھیل رہا ہے۔اسے گھر سے باہر جانے کی ممانعت ہے۔تبھی گلی کے چند آوارہ لڑکے اس کے گھر آجاتے ہیں اور وہ اس سے باہر گلی میں ہولی کھیلنے پر اصرار کرتے ہیں۔اور اسے زبردستی باہر لے جاتے ہیں۔وہ اپنے باپ کو بتائے بغیر پچکاری لے کر ہولی کھیلنے نکل جاتا ہے۔اور بھلے لڑکوں کے بجائے آوارہ اور بدمعاش لڑکوں کے ساتھ ہولی کھیلنے لگتا ہے۔آخر جب شام کو گھر لوٹتا ہے تو اس کا باپ اس کی خوب پٹائی کرتا ہے اس کے نتیجے میں وجے اروڑہ انہیں بدمعاش اور آوارہ لڑکوں کی صحبت میں بیٹھ کر بگڑ جاتا ہے۔

اس فلم کے ہولی سیکونس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں گانا کوئی نہیں۔لیکن گانے کے بغیر بھی یہ سین بڑا دلچسپ ہو گیا۔

چند سال ہوئے سنیل دت کی فلم 'زخمی' آئی تھی۔فلم باکس آفس کے تمام چاٹ مسالوں سے بھرپور تھی۔کہانی چالو ٹائپ کی تھی۔کہانی اور ہولی کے تہوار کو آپس میں ملانے والا ایک سین بھی تھا۔اور ساتھ میں ہولی گیت بھی تھا۔گوہر کانپوری کے اس گیت کو سنیل دت اپنے ساتھیوں کے ساتھ گاتا ہے۔گیت کے بول تھے:

آئی رے آئی ہولی
مستانوں کی ٹولی

آئی طوفان دلوں میں لئے
آئی ہولی

فلم میں طارق، راکیش روشن اور سنیل دت بھائی ہیں۔ریناراۓ کا باپ ایک جج ہے۔وہ سنیل دت کو قتل کے ایک جھوٹے مقدمے میں سزا دے دیتا ہے۔راکیش روشن اور طارق کو جج کے اس فیصلے پر سخت غصّہ آتا ہے۔انتقام کے جذبے کی آگ میں جھلس کر وہ رینا کو اغوا کر لیتے ہیں۔جب سنیل دت کو پتہ چلتا ہے تو اسے بہت بُرا لگتا ہے۔وہ ہولی کے دن اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہولی کھیلنے کے بہانے ان کے گھر پہنچ جاتا ہے۔اس گیت میں آگے چل کر اس کا واضح اشارہ بھی مل جاتا ہے۔

''زخمی دلوں کا بدلہ چکانے آئے ہیں دیوانے''

وہ اس طرح ریناراۓ کو چھڑا لاتا ہے۔

۱۹۷۵ء میں رمیش سپّی کی سپر ہٹ فلم 'شعلے' بھی آئی تھی۔اس فلم میں باکس آفس کے سب لٹکے موجود ہیں۔اس میں بھی ایک ہولی سیکوینس ہے۔آنند بخشی کی لکھی اور آر ڈی برمن کی دھن میں ترشی ہولی اس انداز سے گائی گئی ہے:

''ہولی کے دن کھل جاتے ہیں
رنگوں میں رنگ مل جاتے ہیں''

اس ہولی میں ہولی کی ٹھٹھولی تو ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ گلے شکوے بھول کر دوست اور دشمن بھی گلے مل جاتے ہیں:

''گلے شکوے بھول کر
دوست دشمن بھی گلے مل جاتے ہیں''

کہتے ہیں علم وعمل میں زمین آسماج کا فرق ہوتا ہے۔'شعلے' کے اس ہولی سیکوینس نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے۔فلم میں ہولی کا سچویشن گیت سیکوینس کے بالکل برعکس جاتا ہے۔پورے گیت میں دوست دشمن کے گلے ملنے کی بات کی گئی ہے لیکن پوری فلم میں دوست اور دشمن کہیں بھی گلے ملتے نظر نہیں آتے دوست دوست رہتا ہے اور دشمن دشمن۔

گاؤں میں ہولی کا تہوار منایا جا رہا ہے۔تبھی گبّر سنگھ (امجد خاں) اپنے ساتھیوں کے ساتھ

گاؤں پر حملہ کر دیتا ہے۔ سنجیو، دھرمیندرا اور امیتابھ سے امجد کا سامنا ہو جاتا ہے۔ وہاں دونوں مخالف گروہوں کی طاقت گولیوں سے تولی جاتی ہے۔ فلم کی کہانی کے سلسلے میں اس ہولی سیکیونس کی فلم میں صرف اتنی ہی اہمیت ہے کہ اس کے آخری اور فیصلہ کن مقابلے سے قبل دھرمیندر، امجد اور امیتابھ کو ایک دوسرے کی طاقت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

آخر میں ایک انوکھی ہولی کا ذکر کروں گا۔ یہ ہے فلم 'نورنگ' کی ہولی۔ آج سے تقریباً ۲۴۔۲۳ سال قبل وی شانتارام کی فلم 'نورنگ' آئی تھی۔ اس فلم کے ہولی سین کا فلم کی کہانی کے ساتھ براہ راست تعلق نہ ہونے کے باوجود بلاواسطہ طور پر اٹوٹ تعلق نظر آتا ہے۔ اس فلم میں ایک شاعر کے کردار، اس کے جذبات، احساسات اور تخیلات کی عکاسی شانتارام نے بڑے خوبصورت انداز سے کی ہے۔ اور ہماری تہذیب کے کئی دل کش پہلو نمایاں کئے ہیں۔ اسی تہذیب اور تمدن کی عکاسی اس فلم کے ہولی سیکیونس میں بھی کر دی گئی ہے۔ فلم دیکھ کر ایک خاص موڈ اور مزاج کا احساس ہوتا ہے۔ فلم کے ساتھ ہماری تہذیب اور سماج کے ساتھ رشتے استوار کرنے میں شانتارام نے کمال کیا ہے۔ اس فلم کی ہولی بھرت ویاسؔ نے لکھی تھی۔ موسیقار سی رام چندر نے اسے خالص ہندوستانی انداز میں ساز اور آواز کے سانچے میں ڈھالا تھا اس میں مہی پال اور سندھیا اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہولی کھیلتے ہوئے گاتے ہیں:

"آیا ہولی کا تیوہار
اڑے رنگ کی بوچھار
تو ہے ناز نخرے دار
متوالی رے
موہے میٹھی لگے توری گالی رے

بھرت ویاس کے الفاظ میں ہولی کی ٹھٹھولی قابلِ دید تھی اور قابلِ داد بھی۔ اب تک ہندی فلموں میں بلاواسطہ طور پر جتنے ہولی سیکیونس فلمائے گئے ہیں اور ہولی گیت لکھے گئے ہیں۔ ان میں فلم 'نورنگ' کا یہ ہولی سیکیونس مجھے بہترین نظر آیا ہے۔ جو دل و دماغ پر وجد کی سی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔

☆☆☆

حب الوطنی اور ہندی سینما

اعجاز الرحمٰن

ہندوستان میں سینما کے آغاز کا وہی دور ہے جب عالمی سطح پر دوسری جنگ عظیم میں پھنسے برطانیہ کی ہندوستان پر پکڑ ڈھیلی پڑ رہی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں نشاۃ ثانیہ آچکا تھا اور آزادی، خودمختاری اور حب الوطنی کا جذبہ ہر خاص و عام میں پیدا ہو چکا تھا اس لیے سماج کی عکاسی کرنے والے ہر فنون لطیفہ پر ان جذبات کا حاوی ہونا ایک فطری عمل تھا جبکہ تھیئٹر اور سینما کے ابتدائی دور میں موضوعات کے طور پر اخلاقیات اور سماجی رواداری ہی چھائے ہوئے تھے مگر یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اخلاقیات اور سماجیات کے یہی پہلو انسانی بقا اور آزادی کے بھی سبق سکھاتے ہیں۔ خاموش فلموں کے اپنے حدود تھے اور اس دائرے میں سماجی و ثقافتی جذبات کی عکاسی کی جا سکتی تھی۔ پھر بھی بیدار سماجی شعور کا اظہار ان فلموں میں بھی بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

چالیس کی دہائی میں جہاں نغمات و موسیقی بولتی فلموں کی مقبولیت کے ستون بن گئے وہیں ہندوستانی سینما نے خود کو محض تفریح اور فنون کے علاوہ سماجی تبدیلی کا ایک پراثر اسلحہ بھی ثابت کیا۔ سہراب مودی نے پرتھوی راج کپور کے ساتھ 'سکندر' بنائی اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ملک میں آزادی کی لہر تیز ہونے لگی اور اس لہر نے ہندوستانی سینما پر بھی پُرزور اثر ڈالا۔ حب الوطنی کے جذبے میں ڈوبی رنگین فلمیں بڑے پیمانے پر بننے لگیں مگر اس وقت انگریزوں کی سخت سینسر شپ تھی جس کی وجہ سے فلمکاروں کو بہت محتاط ہو کر کام کرنا پڑتا تھا۔ ممبئی کی کوہِ نور کمپنی کے لیے ہومی ماسٹر نے اداکار و ہدایت کار کی شکل میں "کالا ناگ" نام کی فلم بنائی جس میں شہر کے غیر سماجی عناصر کی کارگزاریوں کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ یہ وہی دور تھا جب 'دھرتی کے لعل' نام کی فلم منظر عام پر آئی۔

تیس چالیس اور پچاس کی دہائیوں میں بے شمار فلم بنانے والی کمپنیاں وجود میں آئیں اور اپنی کہانی، اداکاری، نغمہ و موسیقی کی وجہ سے بھرپور کامیابی حاصل کی۔ ان میں دلیپ کمار اور منوج کمار کی فلم 'شہید' دیوآنند اور نوکیتن کی 'حقیقت' قابل ذکر فلمیں ہیں جن میں حب الوطنی کے جذبات کو بھرپور

طریقے سے ابھارا گیا ہے۔ دراصل جنگ آزادی کے اختتام اور ملک کی آزادی کے فوراً بعد ہندوستانی ادب، شاعری اور فنون لطیفہ کا سب سے مقبول موضوع حب الوطنی ہی رہا ہے۔ یہ وہی دور تھا جب چند ولال شاہ اور گوہر بائی نے رنجیت فلمس کے بینر تلے 'اچھوت' 'گن سندری' 'مس ۱۹۳۳' 'تان سین' اور 'یوگن' جیسی رومانی فلموں کے ساتھ ساتھ سہراب مودی نے منروا موی ٹون کے پرچم تلے 'پرتھوی بلبھ' اور 'جھانسی کی رانی' جیسی فلمیں بنائیں۔

آزادی کے بعد انگریزوں کا سنسر شپ ختم ہوتے ہی دیش پریم بمل رائے کی 'دو بیگھا زمین' خواجہ احمد عباس کی 'نیا سنسار' وغیرہ وجود میں آئیں۔ یہ وہی دور تھا جب راج کپور نے ''جاگتے رہو' اور محبوب نے اپنی پرانی فلم 'عورت' کی ریمیک کو 'مدر انڈیا' کے نام سے پیش کیا۔

ہندوستانی فلموں میں حب الوطنی کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں ملک کو دیوی کا درجہ حاصل ہوا ور دھرتی کو ماں کا وہاں فلمیں خواہ کسی بھی موضوع پر کیوں نہ بنائی جائیں حب الوطنی کے جذبات سے لبریز مکالمے اور نغموں کو نمک مرچ کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے اور فلموں کی کامیابی بھی بہت حد تک ایسے جذبات کے اظہار پر مبنی ہوتی ہے۔ اگر ہم خالص حب الوطنی والی فلموں کی فہرست تیار کریں تو اس میں امیتابھ بچن کی 'دیس پریمی' منوج کمار کی 'کرانتی' دلیپ کمار نوتن 'کرما' ودھو ونود چوپڑا کی ۱۹۴۲۔اے لو اسٹوری' دیو آنند کی 'ہم دونوں' راجندر کمار کی 'للکار' دھرمیندر کی 'آنکھیں' کے علاوہ 'ہندوستانی، پردیس' مرد'، 'لگان'، 'باڈر'، 'رنگ دے بسنتی'، 'بھگت سنگھ'، 'منگل پانڈے'، 'سرفروش' ایسی فلمیں ہیں جن کو دیکھنے کے بعد حب الوطنی کے جذبے سے مضطرب ہوئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔

☆☆☆

دیش بھکتی اور ہمارے فلم ساز

نثار احمد صدیقی

بالی ووڈ میں زیادہ تر بننے والی فلمیں کمرشیل ہوتی ہیں۔ یہاں فلم ساز ویسی فلموں میں روپیہ لگانا چاہتے ہیں جو باکس آفس پر سوپر ہٹ ثابت ہو اور ان کی جیب بھر جائے۔ ایسے میں سنجیدہ موضوع پر مبنی فلموں کی کمی صاف طور پر محسوس کی جاتی ہے۔

''دیش بھکتی'' بھی ایک ایسا موضوع ہے جس پر فلم ساز روپیہ خرچ نہیں کرنا چاہتے۔ مثال کے لئے ۱۹۹۷ء کو ہی لیا جائے۔ اس سال ریلیز ہونے والی تین ساڑھے تین سو ہندی ناموں میں صرف ''باڈر'' کو ہی دیش بھکتی فلم مانا جاسکتا تھا باقی ناموں میں یا تو وہ بھائیوں کے بچھڑنے اور ملنے کی کہانی ہے یا پھر پریمی پریمیکا کے آم کی ڈالی کے نیچے مٹک مٹک کر گیت گانے کی۔ ''پردیش'' اور ''پیار ہو گیا'' فلموں میں بھی دیش بھکتی کے نام پر فلم ساز و ہدایت کار نے اپنے فرض ادا کر کے چھٹکارا پالیا تھا۔

ویسے ''باڈر'' فلم کو ہندی سنیما تماش بینوں نے جس طرح پسند کیا اور جس طرح سے اس کا ٹکٹ بلیک ہوا اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ دیش بھکتی فلموں کی پذیرائی تماش بین کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر کسی سنجیدہ موضوع پر بڑے بڑے کلاکاروں کے ساتھ دیش بھکتی والی فلم بنائی جائے تو اس کے چلنے کی امید عام فلموں کے مقابلے میں تھوڑا زیادہ ہے کم نہیں۔ جیسے یہی دتّا کی فلم ''باڈر'' میں سنی دیول، جیکی شراف، سنیل شیٹی، اکشے کھنّہ، تبّو اور پوجا بھٹ جیسے جانے پہچانے کلاکاروں نے کام کیا تھا اور تماش بینوں نے انہیں اپنی زمین کی حفاظت کے لئے وطن کی سرحد پر جان کی بازی لگاتے ہوئے دیکھ کر تالیاں بجائی تھیں، اس فلم سے ڈسٹر بیوٹروں کو بھی کافی فائدہ ہوا تھا۔

اس فلم میں ۱۹۷۱ء کے زمانے میں راجستھان کی سرحد پر پاکستان کے خلاف ہندوستانی فوج کی ایک حصہ کی بہادری اور حوصلہ کی ہمت افزائی کی گئی تھی۔ اس فلم میں جاوید اختر کی تحریک کردہ اردو گیت ''سندیش آتے ہیں، ہمیں تڑپاتے ہیں، کہ گھر کب آؤ گے'' کو عام تماش بینوں کے درمیان کافی مقبولیت ملی تھی۔

۱۹۷۱ء میں بھارت پاک جنگ سے پہلے ۱۹۶۲ء میں بھارت اور چین کے درمیان بھی سرحد پر جنگ

ہوچکی تھی اس وقت ہندی چینی بھائی بھائی کا نعرے کو منھ چڑھاتے ہوئے چینی فوج نیفا، لداخ اور ہندوستانی سرحد کے اندر داخل ہوگئی تھی۔ تب اردو کے مایہ ناز شاعر کیفی اعظمی کی تحریر کردہ گیت محمد رفیع کی آواز میں

کر چلے ہم فدا جان وتن ساتھیو
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو

نے اس فلم کو کافی مقبولیت دلائی تھی بعد میں اسی جنگ پر چیتن آنند نے ''حقیقت'' نام کی ایک فلم بنائی تھی جس میں فیروز خاں اور دھرمیندر جیسے کلا کاروں نے کام کیا تھا۔ دیش بھکتی فلموں کی فہرست میں ''اودیر پاتھے'' ''ہم راہی'' ''آنند مٹھ'' ''شہید'' ''لیڈر'' ''ہندوستان کی قسم'' ''جاگرتی'' ''سرفروش'' ''کرانتی'' ''میجر صاحب'' ''شہید بھگت'' اور ''رنگ دے بسنتی چولا'' وغیرہ جیسی فلموں کے نام بڑی عزت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ بنگلہ زبان میں بنی فلم ''اودیر پاتھے'' (اس فلم کی ہندی ''ہم راہی'' ہے) میں تو گرودیو کی تحریر کردہ مشہور گیت ''جن گن من...'' بھی شامل کیا گیا تھا۔ لیکن ۲۲/ جولائی ۱۹۴۷ء کو اسے راشٹریہ گیت کا درجہ مل جانے کے بعد اسے اس فلم سے ہٹا دیا گیا تھا کیونکہ سینما ہال میں بیٹھ کر راشٹریہ گیت کو سننا توہین تھی۔

اس وقت ''ہم راہی'' فلم سے بھی اس گیت کو نکال دیا گیا تھا۔ اس کو نکالنے کے بعد یہ اصول بنایا گیا کہ کسی بھی فلم کے آخر میں ''جن گن من...'' کا بیک گراؤنڈ سے آواز ہو تو تماش بین اپنی کرسی کے پاس کھڑے ہوجائیں۔ لیکن ہندی سینما گھر کے تماش بینوں کا کیا کہنا ہے کہ فلم کے آخر میں ہونے کے بعد ہر کسی کو ۵۲ سیکنڈ کے لئے کھڑا رہنا وقت برباد کرنا لگتا تھا۔ اس لئے اسے بھی بند کر دیا۔ بعد میں ونود چوپڑا نے فلم ''۱۹۴۲۔ اے لو اسٹوری'' سے اسے پھر لاگو کرنے کی کوشش کی لیکن یہ اوندھے منھ گر پڑے۔ راشٹریہ گیت سننے کے لئے ۵۲ سیکنڈ تک کھڑے رہنے کی ان کی اپیل پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔

ہمارے راشٹریہ گیت ''وندے ماترم'' فلم ''آنند مٹھ'' میں شامل تھی۔ یہ فلم آنند مٹھ نام کے ایک ناول پر مبنی تھی۔ جسے بنکم چندر چٹر جی نے تحریر کیا تھا۔ ناول اور فلم دونوں میں انگریزی حکومت اور مقامی زمینداروں کے خلاف سنیاسیوں کے غدر کا قصہ ہے۔

''سنیاسی غدر'' کے علاوہ بھارت کی آزادی کی جنگ کے سو سالوں کی تاریخ میں کئی ایسے موضوع ہیں جن پر فلم بنائی جانی چاہیے۔ ۱۸۵۷ء کے اول شہید منگل پانڈے، جلیانوالہ باغ اور سبھاش چندر بوس پر ہی

فلمیں بنی ہیں۔ ۱۳/ اپریل ۱۹۱۹ء کو امرت سر کے جلیانوالہ باغ میں ہوئے قتل عام کو اسی نام والی فلم میں دکھایا گیا تھا۔ اس فلم کی کہانی مائیکل ڈائر سے لے کر اودھم سنگھ کے قتل کئے جانے تک تحریر کی گئی تھی۔ سبھاش چندر بوس بابو کی کوششوں کو ''شہید'' اور ''انڈین'' فلموں میں پیش کیا گیا تھا۔ ''شہید'' کی کہانی پوری طرح آزاد ہند فوج کے ذریعہ کوہیما پر قبضہ کرنے جانے کی کہانی ہے۔ اس فلم میں دادا منی اشوک کمار کے اہم کردار تھے۔ فلم ''انڈین'' میں سبھاش بوش کو فلش بیک میں فلم کے ہیرو کمل حسن کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے دکھایا گیا۔ اتی این اے کے ذریعہ اتر پورب کے حصہ پر قبضہ کرنے کی کوششوں کو بھی فلم ''انڈین'' میں دکھایا گیا تھا۔ یہ فلم ہندی آبادی میں ''ہندوستانی'' نام سے ریلیز کی گئی تھی۔

فلم لیڈر، پکار، کرانتی، جاگرتی وغیرہ کو خاص کر اس کے اردو گیتوں کی وجہ سے دیش بھکتی فلموں کی فہرست میں رکھا جاتا ہے۔ ''لیڈر'' فلم کا گیت ''اپنی آزادی کو ہم ہرگز مٹا سکتے نہیں'' آج بھی لوگوں کی زبان پر مچلتا رہتا ہے۔ یہی حال ''جاگرتی'' فلم کے اردو گیتوں کا بھی ہے۔ ''آؤ بچو تمہیں دکھائیں جھانکی ہندوستان کی'' اور ''ہم لائیں ہیں طوفان سے کشتی نکال کے، اس دیش کو رکھنا مرے بچو سنبھال کے'' اس گیت کو آج بھی دیش پر خطرہ منڈلانے پر سنا جاتا ہے۔

فلم پکار کا گیت ''میرے دیش کی دھرتی سونا اگلے اگلے ہیرا موتی'' بھی کافی مقبول ہے۔ اس فلم کو فلم ساز منوج کمار نے سابق وزیر اعظم لال بہادر شاستری کے ''جے جوان جے کسان'' کے نعرہ سے متاثر ہو کر فلمایا تھا۔ ویسے منوج کمار کو دیش بھکتی فلم کا ہیرو کہا جاتا ہے اور انہیں بھارت کمار کہا جاتا ہے۔ ۱۹۴۲ء کے بھارت چھوڑ واندولن کی اردگرد پر مبنی فلم ''۱۹۴۲/ اے لو اسٹوری'' ہے اس فلم میں ہماچل پردیش کے ایک گاؤں ''کاسونی'' میں ایک انگریز افسر کا قتل اور کرانتی کاریوں کا قصہ ہے۔ مرکزی رول انیل کپور اور منیشا کوائرالا نے ادا کیا ہے۔ انوپم کھیر اور جیکی شراف اس فلم میں کرانتی کاریوں کے رول میں ہیں۔ آزادی میں حصہ لینے والے اہم بہادروں پر بھی بہت ساری فلمیں بنی ہیں۔ جس میں گاندھی کو ان میں پہلے درجہ پر رکھا جاتا ہے۔ ریچرڈ اٹن برو نے اپنی اس فلم میں ایمانداری دکھاتے ہوئے وپن کیگ سیلے کو چند سیکنڈ کے لئے پردے پر گاندھی جی کے حقیقی روپ میں دکھایا ہے۔ شیام بینگل کی ''دی میکنگ آف مہاتما'' بھی گاندھی جی پر ہی فلم ہے۔

بھارت اور دکھن افریقہ کی سرکاروں کے تعاون سے بنی اس فلم میں دکھایا گیا ہے کہ دکھن افریقہ میں گوری سرکار کے قانون سے بے پرواہ ہوکر کس طرح گاندھی جی ایک عام شخص سے مہاتما بنے۔ اس فلم میں رجت کپور، گاندھی جی کا اور پلوی جوشی کستور با گاندھی کے رول ادا کئے تھے۔ گاندھی جی کے علاوہ ولبھ بھائی پٹیل اور ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی زندگی پر بھی فلمیں بن چکی ہیں۔ مرد آہن پٹیل پر فلم ساز کیتن مہتا نے ''سردار'' نام سے فلم بنائی تھی اس فلم میں پریش راول مرکزی رول میں تھے۔ اسی طرح امبیڈکر کی زندگی پر فلم ساز جبار پٹیل نے فلم بنائی تھی۔ جس میں مرکزی رول ملیالم فلموں کے مشہور ومقبول ایکٹر ماموٹی نے ادا کیا تھا۔

ان فلموں سے متاثر ہوکر پاکستان کی سرکار نے محمد علی جناح کی زندگی پر فلم بنائی تھی۔ جس میں ڈرا کیولا کے رول ادا کرنے والا کرسٹوفارلی نے جناح کا کردار ادا کیا تھا۔ خیر یہ ان کا معاملہ ہے ہمیں تو ابھی اس بات پر دھیان دینا ہے کہ آزادی کے بعد کے ۵۵ سالوں کے درمیان آزادی کے متوالوں کی زندگی پر جو فلمیں بنی چاہیے تھیں وہ نہیں بن سکی ہیں۔ حکومت ہند اور ہمارے سنجیدہ فلم سازوں کو اس پر دھیان دینا چاہیے تا کہ ہماری آئندہ نسل ہماری آزادی کے متوالوں کے بارے میں جان سکیں اور ان سے متاثر ہوکر اپنے وطن کے لئے جان نچھاور کرسکیں۔

☆☆☆

تحریک آزادی اور ہماری فلمیں

انیس امروھوی

ہندوستان کی آزادی کی تحریک یوں تو ۱۸۵۷ء کی جدوجہد سے ہی شروع ہوگئی تھی مگر انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور چالاکیوں نے اس تحریک کو اپنے ظلم وستم سے دبا کر ہندوستان کو غلام بنالیا اور پورے ہندوستان پر قبضہ کرلیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فوٹوگرافی کی تکنیک میں نت نئے تجربے ہو رہے تھے اور تصویر کو متحرک بنانے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ دوسرے ممالک میں پردے پر چلتی پھرتی تصویروں کو ابھارنے کی کوشش ۱۸۹۳ء میں ہی کامیابی کی طرف گامزن ہوچکی تھی۔ ہمارے یہاں ہندوستان میں اپنے طور پر بھی کوششیں جاری تھیں۔

اس زمانے میں ہندوستان میں اس طرح کی کئی کتابیں شائع ہوئیں، جن میں تمام صفحات پر ایک جیسی تصویریں چھپی تھیں مگر ہر تصویر پچھلی تصویر سے تھوڑی سی مختلف تھی۔ جب اس کتاب کے صفحات کو تیزی سے الٹا جاتا تو ایسا لگتا تھا جیسے اس کتاب میں چھپی تصویر متحرک ہو اٹھی ہو۔

پہلے پہل ۱۸۹۶ء میں ہندوستان کے شہر ممبئی (بمبئی) میں بیرون ممالک سے چھوٹی چھوٹی خاموش فلموں کی آمد شروع ہوئی اور ۷/جولائی ۱۸۹۶ء کو لومیئر برادرس نے ممبئی کے واٹسن ہوٹل میں 'میجک لائٹس' کے نام سے ایک چھوٹی سی فلم کی نمائش کی۔ اس طرح فلموں کو عوام نے اور تھیٹر کے مالکوں نے بہت پسند کیا۔ طویل فیچر فلموں کے سلسلے کو ہندوستان میں شروع کرنے کا سہرا دادا صاحب پھالکے کو جاتا ہے۔ انہوں نے 'لائف آف کرائسٹ' نام کی فلم سے متاثر ہوکر بڑی جدوجہد سے فلم 'راجہ ہریش چندر' کو ہندوستان میں تیار کیا اور ۱۹۱۳ء میں اس خاموش فلم کی نمائش کی۔ اس طرح ہندوستان میں خاموش فلموں کا سفر شروع ہوگیا حالانکہ ۱۹۰۰ء میں گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور نے گراموفون پر پہلی بار خود اپنی ہی آواز میں 'بندے ماترم' گانا ریکارڈ کرایا تھا مگر ۱۹۳۱ء میں ہندوستانی فلموں کو بھی بولنا آگیا اور آردیشر ایرانی نے ہندوستان کی پہلی بولتی فلم 'عالم آرا' کی نمائش کی۔ یہی وہ دور تھا جب ہندوستان کی آزادی کی تحریک بھی زوروں پر تھی۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ہندوستان کے نوجوان، آزادی کے متوالے

پوری طرح انگریزوں کو ہندوستان سے بھگا دینے کا فیصلہ کر چکے تھے اور گاندھی جی کی قیادت میں مکمل آزادی کی قرارداد پاس ہو چکی تھی مگر ایسے وقت میں بھی ہماری فلموں میں آزادی کی تحریک کے اثرات کم دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے کئی وجوہات ہیں۔ ایک تو انگریز حکومت کی قائم کردہ پابندیاں اور ظلم وستم، جس کی وجہ سے کوئی بھی فلم ساز ایسے موضوع کو اپنانے سے اپنا دامن بچاتا تھا، جس سے انگریز حکومت کے غضب کا شکار ہونے کا خطرہ لاحق ہو۔ دوسرے برطانوی حکومت نے ۱۹۲۲ء میں پریس سینسر شپ قائم کیا اور اس کے دائرہ کار میں ہندوستانی سنیما کو بھی جکڑ لیا جس کی وجہ سے اگر کوئی فلم ساز تحریک آزادی کو موضوع بنا کر فلم بنا بھی لیتا تو اس کی نمائش پر پابندی لگ سکتی تھی۔ ایک اور خاص وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک ہندوستانی فلموں کا مزاج صرف دیومالائی یا جادوئی کہانیوں تک محدود تھا اور لوگ اسی کو پسند کرتے تھے۔

خاموش فلموں کے دور میں بھی ممبئی میں کئی لوگوں نے ہمت کر کے سیاسی مقاصد کو پس منظر میں رکھ کر کئی اہم فلمیں بنائیں، جو مقبول بھی ہوئیں۔ فلم 'کس کا قصور' بیوہ عورتوں کے مسائل کو لے کر بنائی گئی تھی مگر اس کے علاوہ 'گوری بالا' اور 'رام رحیم' میں سیاسی تحریک کو ایک خاص انداز میں پیش کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستانی قومیت کا جذبہ اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے عنصر کو بھی ان فلموں میں شامل کیا گیا تھا۔ تحریک آزادی کی کامیابی اور مقبولیت کے لیے ملک میں ہندو مسلم اتحاد کی سخت ضرورت تھی اور اسی موضوع کو مرکزی خیال بناتے ہوئے لکشمی پکچرز نے ۱۹۲۵ء میں 'سورن' نام سے ایک ایسی فلم کی نمائش کی جس میں مغل تاریخ کے ایک واقعہ کے ذریعہ ہندو مسلم اتحاد کا پیغام ہندوستانی عوام کو دیا گیا تھا۔

فلم 'دی بم' میں بھی انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے پر اکسایا گیا تھا اس لیے برٹش سینسر اور بھی ہوشیار ہو گیا اور اس نے اس فلم کو بری طرح کاٹ دیا تھا۔ وی شانتا رام نے فلم 'اودے کال' بھی ان ہی دنوں بنائی تھی۔ اس زمانے میں کوہِ نور اسٹوڈیو میں ایک خاص قسم کی ریلی کا اہتمام کر کے بھی فلم والوں نے تحریک آزادی میں حصہ لیا۔ اس کے بعد ہی 'انڈین فلم ایسوسی ایشن' کا قیام عمل میں آیا تھا اور ایک دن کی مکمل علامتی ہڑتال بھی کی گئی تھی۔

اسی دوران ایک اور فلم 'غصہ' کی نمائش ہوئی۔ اس فلم میں ہندوستانی سماج کا پچھڑاپن دکھایا گیا تھا اور گاندھی جی کی طرح دکھائی دینے والا ایک کردار بھی اس فلم میں تھا جسے مکند نام کے ایک اداکار نے ادا کیا تھا۔

۳۶-۱۹۳۵ کے آتے آتے ملک بھر میں ہندوستانی فلموں کے ناظرین سنجیدہ اور غور طلب موضوعات پر بننے والی فلموں کو دیکھنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گئے تھے۔ فلم بینوں کا یہ رویہ دوسری جنگ عظیم کے وقت تک اور پھر ہندوستان کی آزادی کی سنہری صبح کے آنے تک برقرار رہا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ زیادہ تر فلم بین متوسط طبقہ کے تھے یا پھر اونچی سوسائٹی کے لوگ تھے۔ فلم ساز کے سی بروا نے روایت سے ہٹ کر اور کھوکھلی آزادانہ روش کے درمیان پھنسے انسانوں کے درد کو فلم 'منزل' اور فلم 'مایا' میں بڑے ہی پر اثر انداز میں پیش کیا جس نے ہمارے فلم بینوں کے ذہن ودل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ دیوکی بوس نے فلم 'سنہرا سنسار' میں سماج کی نابرابری کے مسئلہ کو پیش کیا۔ اس کے ساتھ ہی واڈیا کی فلم 'جے بھارت' اور وجے بھٹ کی 'پاسنگ شو' اور محبوب خان کی 'دکن کوئن' جیسی فلمیں بھی خاصی کامیاب رہیں۔ ان فلموں میں کسی نہ کسی طور پر دیش بھکتی اور تحریک آزادی کا جذبہ چھپا ہوا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں مشہور فلم ساز وہدایت کار محبوب خان نے ہی فلم 'روٹی' کی نمائش کی جس کے ذریعہ انہوں نے ہندوستانی عوام کو پیغام دیا کہ انسان کو اپنا حق مانگنے سے نہ ملے تو چھین لینا چاہیے۔ یہ فلم سامراجی نظام کے خلاف ایک بہت اثر دار ہتھیار تھی لہٰذا انگریزی حکومت نے اس پر پابندی لگا دی۔ ہومی واڈیا کی فلم 'ویر پربھات' میں برٹش حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی بات کو بڑے ہی پر اثر انداز اور سلیقہ سے پیش کیا گیا تھا۔

۱۹۴۶ء میں چیتن آنند نے فلم 'نیچا نگر' پیش کی۔ اس فلم میں انگریز حکومت کے ذریعہ معصوم ہندوستانیوں پر ڈھائے گئے مظالم کی تصویر کشی بڑے خوبصورت انداز میں کی گئی تھی۔ اس فلم کی کہانی اردو کے ممتاز افسانہ نگار حیات اللہ انصاری نے تحریر کی تھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کو یہ فلم اس قدر پسند آئی تھی کہ ۱۹۴۷ء میں جب نئی دہلی میں پہلی ایشیائی کانفرنس منعقد ہوئی تو پنڈت نہرو کی خواہش کے مطابق یہ فلم کانفرنس کے ڈیلی گیٹس کو دکھائی گئی۔

اس زمانے میں انگریز حکومت کی سخت سنسر شپ کی وجہ سے بہت سی باتیں راست طور پر نہ کہہ کر بالواسطہ بھی کہی گئیں۔ مثلاً وی شانتا رام کی فلم 'پڑوسی' ہندو مسلم ایکتا پر بنائی گئی فلم تھی۔ فلم میں دکھایا گیا تھا کہ ہندو اور مسلمان خاندان آپس میں مل جل کر رہتے ہیں مگر باہری طاقتیں اپنے مقاصد حاصل کرنے کی غرض سے انہیں آپس میں لڑا دیتی ہیں۔ دوست بچھڑ جاتے ہیں، بعد میں انہیں طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کے پاس صرف یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ان کا دوبارہ ملن تب ہوتا ہے جب ایک

باندھ کے ٹوٹنے کی وجہ سے وہ سب موت کی آغوش میں ہوتے ہیں۔

فلم 'قسمت' بامبے ٹاکیز کی فلم تھی جسے ایس مکھرجی کی ہدایت میں بنایا گیا تھا۔ حالانکہ یہ فلم جرائم کے واقعات پر مبنی ہلکی پھلکی مزاحیہ قسم کی فلم تھی مگر اس فلم کا ایک گانا 'دور ہٹو اے دنیا والو، ہندوستان ہمارا ہے' نے بڑی شہرت حاصل کی اور تحریک آزادی کے متوالوں کو جھومنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی حب الوطنی کا جذبہ بھی لوگوں میں بیدار رہوا۔ اس گیت کی ایک لائن 'تم نہ کسی کے آگے جھکنا، جرمن ہو یا جاپانی' ایک طرح سے انگریزوں کی طرف ہی اشارہ تھا اور گاندھی جی کے نعرہ 'انگریز بھارت چھوڑو' کی ہی ترجمانی کرتا تھا۔ ان دنوں یہ گانا ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر تھا۔

اسی طرح دوسرے فلم سازوں نے بھی انگریزی سنیسر بورڈ کی پریشانیوں سے بچنے کے لیے ایسی حکایت آمیز اور دیوی دیوتاؤں کی کہانیوں پر مبنی علامتی فلمیں بنائیں۔ حالانکہ ان کا مقصد لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔

۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کا وقت ہندوستانی سنیما کے لیے بے حد اہم رہا ہے۔ ایسے وقت میں جب دوسری جنگ عظیم ختم ہو رہی تھی اور ہندوستان کو آزادی ملنے ہی والی تھی، ہر طرح کے فن کے میدان میں تبدیلی کی لہریں نمایاں ہونے لگی تھیں، ہماری فلموں نے بھی ایسے ماحول میں کروٹ لی اور کچھ لوگوں نے ہمت کر کے خاص طرح سے تحریک آزادی کو موضوع بنا کر فلمیں بنانے کا ارادہ کر لیا۔ ادھر بنگال میں بھی نوجوانوں میں ایک خاص طرح کی لہر چل رہی تھی، تب وہاں بی این سرکار نے 'ہمراہی' فلم بنائی۔ پربھات کی فلم 'ہم ایک ہیں' کی کہانی بھی پوری طرح قومی یکجہتی کے دھارے میں پروئی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں لیک سے ہٹ کر بننے والی فلموں کے موضوعات بائیں بازو کی تحریک سے متاثر ہونے لگے کیونکہ اس دور کے لکھنے والے زیادہ تر ادیب اور شاعر اسی تحریک سے وابستہ تھے۔ اس طرح کی تحریک کو اِپٹا سے بھی کافی مدد ملی اور اس تحریک کا جذبہ فلموں پر حاوی ہوتا گیا۔

دیکھا جائے تو تحریک آزادی کو موضوع بنا کر ہندوستان کی آزادی سے پہلے کوئی بہت زیادہ کام نہیں ہو سکا تھا۔ ۲۹/اگست ۱۹۱۸ء کو لوک مانیہ تلک نے خاص طور پر کانگریس کا اجلاس ممبئی میں بلایا تھا۔ اس وقت بابوراؤ پینٹر نے اپنے دو معاون داملے اور فتح لعل کے ساتھ لے کر اس اجلاس کی فلم بندی

کی تھی مگر یہ فلم اس وقت کہیں پر بھی دکھائی نہ جا سکی تھی اور جب ۱۹۲۰ء میں بابوراؤ پینٹر ہی کی فلم 'سیرندھی' کی ممبئی کے میجسٹک سنیما میں نمائش ہوئی تو اس فلم کو بھی 'سیرندھی' کے ساتھ ہی جوڑ کر دکھایا گیا مگر اس فلم کی نمائش سے قبل ہی یکم اگست ۱۹۲۰ء کو بال گنگا دھر تلک کا انتقال ہو چکا تھا۔

۱۹۳۵ء میں ایسٹرن کمپنی نے فلم 'پربھات کی بیٹی' بنائی تھی۔ اس کی ہدایت پریمانکور آتھرتھی نے کی تھی اور کہانی کے ایل وِرمانی کی تھی۔ اس فلم میں بھی آزادی کی بات کو اٹھایا گیا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں محبوب خان نے 'وطن' نام سے ایک فلم بنائی تھی جو حب الوطنی پر مبنی کچھ نکات کو لے کر پیش کی گئی تھی۔

ملک کی آزادی کے ساتھ ہی فلم والوں کو بھی اپنی مرضی کے موضوعات پر فلم بنانے کی آزادی ملی اور بڑی تیزی سے تحریک آزادی اور حب الوطنی کے موضوعات پر فلمیں بننے لگیں۔ وی شانتا رام نے ۱۹۴۹ء میں فلم 'اپنا دیش' بنائی۔ نتن بوس نے ۱۹۵۰ء میں 'مشعل' بنائی۔ شیام مکھرجی نے ۱۹۵۰ء میں ہی اشوک کمار کو لے کر فلم 'سنگرام' بنائی۔ ۱۹۵۲ء میں فینس پکچرز نے آر ایس چودھری کی ہدایت میں فلم 'جلیان والا باغ' بنائی اور پھر ۱۹۳۵ء میں منروا موی ٹون کے بینر سے سہراب مودی نے فلم 'جھانسی کی رانی' پیش کی۔ ۱۹۵۴ء میں فلمستان نے 'جاگیرتی' بنائی۔ ۱۹۵۴ء میں ہی 'شہید اعظم بھگت سنگھ' کی نمائش ہوئی جو مکمل طور پر تحریک آزادی پر مبنی فلم تھی۔

اس سلسلہ کی سب سے مشہور اور بہترین فلم 'شہید' تھی جس نے تحریک آزادی کے متوالے نوجوانوں کو جوش و خروش سے لبالب بھر دیا۔ فلمستان کی اس فلم کے خالق رمیش سہگل تھے اور دلیپ کمار کی ہیروئن کامنی کوشل تھیں۔ چندر موہن، لیلا چٹنس اور رام سنگھ نے بھی اس فلم میں اہم رول ادا کیے تھے۔ فلم کے مکالمے اور منظر نامے نے ہندوستانی عوام کے سینوں میں ایک جوش بھر دیا تھا۔ اسی نام سے ایک دوسری فلم ۱۹۶۵ء میں بھی بنی۔ اس دوسری فلم 'شہید' میں منوج کمار کے ساتھ اور کئی نامور اداکار اور اداکارائیں تھیں۔ یہ فلم بھی کافی مقبول ہوئی۔ ۱۹۶۵ء میں ہی آئی۔ ایس جوہر نے ایک فلم 'جوہر محمود اِن گوا' بنائی۔ یہ فلم بھی تحریک آزادی کے موضوع پر مبنی تھی مگر اس فلم میں خاص طور پر گوا کی آزادی کو ہی موضوع بنایا گیا تھا۔ منوج کمار کی فلم 'کرانتی' بھی تحریک آزادی کے ہی موضوع پر ایک بڑی فلم تھی۔ یہ فلم بھی کافی کامیاب رہی۔

ان سب فلموں کے علاوہ بھی کئی فلمیں ایسی آئیں جن میں ہندوستان کی تحریک آزادی کے کچھ حصے

فلمائے گئے یا کہانی میں اس دور کے چند واقعات پیش کیے گئے۔اس سب کے باوجود اتنے بڑے ملک کی آزادی کی اتنی بڑی تحریک پر جو کام دنیا کی سب سے بڑی فلم انڈسٹری میں ہونا چاہیے تھا، میرے خیال سے وہ نہیں ہو پایا ہے۔آزادی سے قبل تو برطانوی حکومت کا سنیسر بورڈ آڑے آتا تھا مگر اب تو ایسی کوئی رکاوٹ نہیں۔آزادی کے موضوع پر سب سے بڑی فلم 'گاندھی' کو ہی کہا جاسکتا ہے۔اس فلم میں بڑے پیمانے پر گاندھی جی کی زندگی اور اس وقت کے حالات کی عکاسی ہوئی مگر یہ فلم ہندوستانی فلم نہیں کہی جاسکتی۔کیا اس طرح کی کسی بڑی فلم کی امید ہم ہندوستانی سنیما سے بھی کر سکتے ہیں؟

☆☆☆

علاقائی ادبی تخلیقات پر بنائی گئی ہندوستانی فلم

رشید انجم (بھوپال)

ہندوستانی فلم صنعت کی ابتداء دھارمک پرانک فلموں سے ہوئی تھی۔۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۰ء تک صرف انھیں موضوعات پر فلمیں بنائی جاتی رہیں۔داداصاحب پھالکے کے علاوہ جو فلم ساز اس صنعت میں آئے انھوں نے بھی یہ فارمولا آز مایا کیونکہ ان فلموں میں محیرالعقول واقعات کی بھرمار ہوا کرتی تھی (جو آج بھی ہے) جن سے دیکھنے والوں کا شوق نکتۂ عروج کو چھوتا تھا لیکن جیسے جیسے یہ انڈسٹری ارتقائی منزلیں طے کرتی گئی ایسے فلم سازوں کا اضافہ ہوتا گیا۔جو روشن خیالات کے حامل تھے۔ایسے فلم ساز گنتی کے ہی سہی لیکن ان میں بندھی ٹکی روش سے ہٹ کر اور فلم صنعت کو طلمساتی مظاہرے سے نکال کر سماجی، تہذیبی، اخلاقی اقدار سے جوڑنے کا جذبہ بھی تھا۔اس انحراف نے فلم شائق کو فرسودگی کے ہجوم سے نکال کر جب زندگی کے آداب اور اس کے اپنے ساماجک ماحول سے روشناس کرایا تو فلموں میں تخلیقی فنکاری بھی آئی، شائق کو نئے موضوعات کی تجلی بھی ملی اور خیالات میں ندرت بھی آ گئی۔انسانی ذہن ہر انقلابی یا انحرافی شئے کا متلاشی رہا ہے۔اس نے روشن اور خودشناس فن کو جلد ہی قبول کرلیا۔اور فلم صنعت کو شائستگی ملی ادبی تخلیقات پر بنائی گئی فلموں سے کلاسیکی نظم وضبط کی سوغات بھی شائق کو حاصل ہوگئی۔ایسا نہیں ہوا کہ طلمساتی فارمولے سے فلم ساز یا شائق تائب ہوگئے ہوں۔دونوں طرح کے موضوع ساتھ ساتھ چلتے رہے اور ان فلموں کو دیکھنے والوں میں بھی کمی نہیں آئی۔بہرحال آیئے مختصراً ایسی فلموں کا جائزہ لیا جائے جو خالصتاً ادبی شہہ پاروں پر تخلیق کی گئی۔تاریخ کے اوراق پر جو حقیقت درج ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ فلموں کے خاموش دور میں ہی ادبی شہ پاروں پر فلموں کی تخلیق ہونے لگی تھی۔علاقائی زبان میں سب سے پہلا نام جس تخلیق کار کا سامنے آیا وہ نہ صرف بنگال بلکہ ہندوستان کی عظیم ہستی رابندرناتھ ٹیگور کا ہے۔بہتر یہ ہوگا کہ علاقائی فلموں کی تفصیل پیش کردی جائے جو مختلف علاقائی زبانوں کی ادبی تخلیقات پر پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

۱۹۱۵ء فلم ''وِش وِرکش'' (خاموش بنگلہ) یہ فلم سنسکرت ناٹک پر مبنی تھی۔

رابندرناتھ ٹیگور: ۱۹۲۲ء فلم ''سیکری فائز'' ۱۹۲۷ء اور ۱۹۳۰ء فلم ''بلیدان'' ۱۹۴۶ء فلم ''ملن'' (ہندی) اور ''نوکا ڈوبی'' (بنگلہ) ۱۹۶۱ء فلم ''کابلی والا'' فلم ''چرو شاخ'' (بنگلہ اصل کہانی نشٹ بنڈ)۔اسی کہانی پر ستیہ

جیتے رے ٹے بنگلہ فلم ''چاروہ لتا'' بنائی تھی۔اور ۲۰۰۷ء میں اسی کہانی پر فلم ''ٹیگور دل سے'' ہندی میں بن کر تیار ہوئی۔دراصل یہ ناول ٹیگور کے اس حقیقی رومان پر مبنی ہے جو انھوں نے اپنی بھابھی کا دمبری سے کیا تھا۔کادمبری بے اولاد تھی اور ٹیگور سے لگاؤ کی وجہ سے خاندان نے اسے الگ تھلگ کر دیا تھا۔جب زیادہ بدنامی ہوئی تو کادمبری نے خودکشی کر لی جسے ٹیگور خاندان نے دبانے کی کوشش بھی کی۔

کے۔ایم۔منشی: بنگال کے ناول نگار تھے ان کے ایک ہی بنگلہ ناول ''پرتھوی وللبھ'' پر تین بار ۱۹۲۲ء، ۱۹۲۴ء اور ۱۹۴۳ء میں ہندی فلمیں بنائی گئیں۔

بنکم چندر چٹو پادھیائے: اس بنگلہ ادیب کے چار ناولوں کو فلم کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ ۱۹۲۹ء فلم ''کپال کنڈلا'' (خاموش) ۱۹۳۹ء فلم ''کپال کنڈلا'' (متکلم ہندی) ۱۹۵۰ء فلم ''مشعل'' (ہندی) اور ۱۹۵۲ء فلم ''آنند مٹھ'' (ہندی)۔

شرت چند چٹر جی: بنگلہ ادب کا ہندی میں سب سے مشہور نام ایک ہی ناول دیوداس پر کئی بار فلمیں بنائی گئیں۔۱۹۲۸ء فلم ''دیوداس'' (خاموش) ۱۹۳۵ء فلم ''دیب داس'' (بنگلہ) اور ''دیوداس'' (ہندی) ۱۹۳۶ء ''دیوداسا'' (تامل) ۱۹۵۵ء فلم ''دیوداس'' (ہندی) ۲۰۰۲ء فلم ''دیوداس'' (ہندی) اور ۲۰۰۴ء فلم ''دیب داس'' (بنگلہ)۔ان کا دوسرا اہم ناول پرنیتا پر اسی نام سے پہلے ہندی میں ۱۹۵۳ء میں فلم آئی۔ اسی کہانی کو تھوڑا سا موڑ دے کر فلم ساز اور ہدایت کار انل گانگولی نے ۱۹۷۶ء میں فلم ''سنکوچ'' بنائی تھی۔۲۰۰۵ میں پھر ''پرنیتا'' کے نام سے بنگال کے قدرے پس منظر پر فلم بنائی گئی تھی۔ان کے دیگر ناولوں پر ہندی فلمیں تخلیق کی گئیں۔۱۹۴۰ء فلم ''چنگاری'' (اصل کہانی۔پنڈت موشائے) ۱۹۴۸ء فلم ''پتھ کے دعویدار'' (اصل کہانی۔سویا ساچی) ۱۹۳۹ء اور ۱۹۶۹ء فلم ''بڑی دیدی'' (اصل کہانی۔میج دیدی) ۱۹۵۳ء فلم ''شکست'' ۱۹۵۴ء فلم ''براج بہو'' اور فلم ''چھوٹی ماں'' ۱۹۶۲ء فلم ''سوتیلا بھائی'' ۱۹۶۷ء فلم ''منجھلی دیدی'' ۱۹۷۴ء فلم ''چرتر ہین'' فلموں کے علاوہ ان کے دو سیریل ''چرتر ہین'' اور ''شری کانت'' بھی نیشنل چینل سے ٹیلی کاسٹ ہوئے۔

ہری نارائن آپٹے: مراٹھی کے اس ادیب کے مراٹھی ناول پر ۱۹۳۳ء میں وی۔ شانتا رام نے فلم ''سنگھ گڑھ'' بنائی تھی۔

ماماوار یرکر: مراٹھی ادیب کی کہانی پر ۱۹۳۴ء میں فلم ''ولاسی ایشور'' (مراٹھی) فلم بنائی گئی تھی۔

انوپال منڈل: ۱۹۴۰ء میں بنگلہ ناول ''می مانسا'' پر ہندی میں فلم ''بہورانی'' آئی تھی۔۱۹۴۴ء میں ناول ''اوتھیر پاتھیر'' پر بنگالی میں اور اسی نام سے اور ہندی میں ''ہمراہی'' کے نام سے ول رائے نے فلم بنائی تھی۔اس فلم کی دلچسپ بات یہ تھی کہ ٹیگور کا ترانۂ ہند ''جن گن من ادھینا یک'' سب سے پہلے اس فلم میں کورس میں گایا گیا تھا۔اور ٹیگور کا ہی دوسرا بنگلہ گیت ''مدھ گندے بھرمر دو اسکندھ چھایا'' اس فلم میں ریکھا ملک نے گایا تھا۔۱۹۵۲ء فلم ''یاترک'' پر بھودیو کمار سانیال کے بنگلہ ناول مہاپرشانت پاتھے پر بنائی گئی۔بنگلہ کے اس مشہور ناول پاتھر پنچالی پر ستیہ جیت رے نے ۱۹۵۵ء میں دو فلمیں ''اپورو سنسار'' اور ''اپراجیتو'' بنگلہ میں بنائی تھی۔

بمل متر: بنگلہ ادب کا وہ کامیاب ناول نگار جس کے تراجم نہ صرف ہندی بلکہ انگریزی اور دیگر زبانوں میں بھی کیے گئے۔

۱۹۶۱ء میں بی۔آر چوپڑا نے فلم ''دھرم پُتر'' اور ۱۹۶۲ء میں گرودت نے ان کے کلاسک ناول پر ہندی فلم ''صاحب بیوی اور غلام'' تخلیق کی تھی۔اس کے علاوہ ان کا ایک ٹی۔وی۔سیریل ''اکائی دہائی سیکڑہ'' بھی نوئے کی دہائی میں نیشنل چینل نے ٹیلی کاسٹ کیا تھا۔۱۹۷۱ء میں ان کی ایک بنگلہ کہانی پر ہندی میں فلم ''ادھوری کہانی'' بنائی گئی تھی۔

سنسکرت زبان کے کئی ناٹکوں پر ہندی فلم میں مختلف دور میں فلمی پردے پر جلوہ گر ہوئی۔

بھوبھوتی بھوشن: ان کے سنسکرت ناٹک ''مالتی مادھو'' پر ۱۹۳۳ء اور ۱۹۵۱ء میں اسی نام سے دو فلمیں آئیں تھیں۔

کالی داس: سنسکرت زبان کا سب سے اہم نام ان کے تخلیقی ناٹک ''شاکنتلم'' پر فلم ''شکنتلا'' کے نام سے ہندی میں دو فلمیں ۱۹۳۱ء اور ۱۹۴۳ء میں بنی تھیں۔

شودرک: قدیم سنسکرت زبان کا معروف تخلیق کار۔مشہور زمانہ ناٹک ''مرچ واٹکا'' پر ایک ہی نام ''وسنت سینا'' سے ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۴ء، ۱۹۴۲ء، اور ۱۹۷۶ء میں مختلف فلم سازوں نے الگ الگ اسٹار کاسٹ کے ساتھ پانچ فلمیں بنائیں۔اسی ناٹک پر جو آخری فلم بن کر بہترین فلموں میں شمار ہوئی وہ ۱۹۸۴ء کی فلم ''اتسو'' تھی جسے ششی کپور نے گریش کرناڈ کی ہدایت میں تیار کیا تھا۔

بھگوتی چرن شرما: ان کا ہندی ناول ''چتر لیکھا'' کو موضوع بنا کر اسی نام سے ۱۹۴۱ء اور ۱۹۶۴ء میں ایک ہی فلم ساز کیدار شرما نے دو بار فلمیں بنا کر ریلیز کی تھیں۔

’’آمر پالی‘‘ ہندی کا وہ مشہور ناول جس پر اسی ٹائیٹل سے ۱۹۴۵ء اور ۱۹۶۶ء میں دو فلمیں آئیں۔

فنیشور ناتھ رینو: ان کی ہندی کہانی ’’مارے گئے گلفام‘‘ پر گیت کار شیلیندر نے اپنی پہلی اور آخری فلم ’’تیسری قسم‘‘ ۱۹۶۶ء میں بنائی تھی جو بعد میں ہندی کلاسک فلموں میں شمار کی گئی۔

گوترا انتر سبودھ گھوش: ان کی ہندی کہانی پر فلم ’’ایک ادھوری کہانی‘‘ ۱۹۷۱ء میں تیار ہوئی تھی۔

جینیندر کمار: ان کی ہندی کہانی پر ۱۹۷۸ء میں فلم ’’تیاگ پتر‘‘ بنی تھی۔اس کے علاوہ ’’بھوون شوم‘‘ نیز فلم ’’سارا آکاش‘‘ اور فلم ’’انو بھو‘‘ ۱۹۶۹ء کی ہندی مختصر کہانیوں پر بنائی گئی متاوازن نئے سنیما کی ابتدائی فلمیں تھیں۔۱۹۷۱ء میں موہن راکیش کی ہندی کہانی ’’اساڑھ کا ایک دن‘‘ کے موضوع پر اسی نام سے فلم نئے سنیما کی زینت بنی تھی۔

بھیشم ساہنی: ہندی ادب کا اہم نام۔۱۹۸۴ء میں ان کی ہندی کہانی پر فلم ’’موہن جوشی حاضر ہو‘‘ بنی جس میں انھوں نے رول بھی کیا تھا۔ان کی سب سے اہم تخلیق ’’تمس‘‘ ہے جس پر ۱۹۷۸ء میں نیشنل چینل پر سیریل دکھایا گیا تھا۔

گلشن نندا: نہ صرف ہندی بلکہ اردو کے بھی مقبول ناول نگار تھے۔۱۹۶۵ء فلم ’’کاجل‘‘ ۱۹۶۸ء فلم ’’نیل کمل‘‘ ۱۹۷۰ء فلم ’’کٹی پتنگ‘‘ ۱۹۷۳ء فلم ’’جھیل کے اس پار‘‘ ۱۹۷۴ء ’’اجنبی‘‘ اور ۱۹۸۶ء میں فلم ’’پالے خاں‘‘ گلشن نندا کے ناولوں پر بنائی گئیں۔

راجیندر سنگھ بیدی: ۱۹۵۵ء میں ان کی اردو کہانی پر فلم ’’گرم کوٹ‘‘ اور پنجابی کہانی پر ۱۹۸۶ء میں فلم ’’ایک چادر میلی سی‘‘ تخلیق ہوئی۔

امریتا پریتم: پنجابی زبان کی مقبول ترین ادیبہ۔ان کی کہانیوں کے تراجم پر ۱۹۷۵ء میں فلم ’’دھرتی ساگر اور سیپیاں‘‘ اور تقسیم ملک کے پس منظر پر ان کی تخلیق پر فلم ’’پنجر‘‘ ۲۰۰۴ء میں اسکرین کی زینت بنی۔

کملیشور: ہندی ادب کے ذہین تخلیق کار۔ان کے ہندی ناول ’’کالی آندھی‘‘ پر فلم ساز گلزار نے فلم ’’آندھی‘‘ ۱۹۷۵ء میں بنائی تھی۔کہانی ’’بدنام گلی‘‘ پر ۱۹۷۷ء میں فلم ’’بدنام بستی‘‘ اور ۱۹۸۰ء میں فلم ’’ایک بار کہو‘‘ نئے سنیما کی بہترین فلمیں چنی گئیں۔

خواجہ احمد عباس: اردو اور ہندی فلموں کے ماہر فلم ساز اور اردو ادب کے قد آور قلمکار خواجہ احمد عباس کی مختصر انگریزی کہانی ’’Tho one who come back‘‘ کے مرکزی خیال پروی۔شانتا رام نے

۱۹۴۶ء میں فلم ’’ڈاکٹر کوٹینس کی امر کہانی‘‘ بنائی تھی۔

کے۔آر۔نارائن: ان کی انگریزی کہانی ’’مسٹر سمپت‘‘ پر اسی نام سے ۱۹۵۳ء میں فلم بنی تھی۔دوسرا ناول ’’The guide‘‘ پر وجے آنند نے فلم ’’گائڈ‘‘ ۱۹۶۸ء میں تیار کی۔ان کی انگریزی مختصر کہانیاں ’’The malgudi days‘‘ پر ۱۹۸۶ء میں ’’مالگڑی کی کہانیاں‘‘ ٹی۔وی۔سیریل کی شکل میں نیشنل چینل نے ٹیلی کاسٹ کی تھی۔

ملک راج آنند: ان کی انگریزی کہانی Three Leaves and a bud پر ۱۹۶۳ء میں خواجہ احمد عباس کی ہندی فلم ’’ہمراہی‘‘ تیار کی گئی۔

خوشونت سنگھ: ان کی انگریزی ناول (جس کے تراجم بھی ہوئے) Train to Pakistan پر اسی نام سے ۱۹۹۷ء میں ہندی فلم بنائی گئی تھی۔

۱۹۵۰ء میں روسی مصنف گوگول کے ناول کا انگریزی ترجمہ ’’انسپکٹر جنرل‘‘ پر چیتن آنند نے فلم ’’افسر‘‘ بنا کر پیش کی تھی۔رشین مصنف روستو وسکی کے شہرۂ آفاق ناول The crime and punishment کو موضوع بنا کر ۱۹۵۶ء میں رمیش سہگل نے بے حد جذباتی فلم ’’پھر صبح ہوگی‘‘ تخلیق کی۔۱۹۸۰ء میں انگریزی ناول ’’ڈاکٹر جیکل اینڈ ہائڈ پر ہندی فلم ’’چہرے پہ چہرا‘‘ بنی تھی جس میں امول پالے کرنے بہترین اداکاری کی تھی۔

ولیم شیکسپیر: مغرب کا سب سے قد آور ڈرامہ نویس جس کے ڈراموں پر ہر زبان میں فلمیں بنائی گئیں۔ہندی اسکرین بھی ان ڈراموں پر مبنی فلموں سے منّور رہا۔۱۹۳۵ء فلم ’’ہیملیٹ‘‘ ۱۹۴۱ء فلم ’’مرچنٹ آف وینس‘‘ ۱۹۴۷ء فلم ’’رومیو جولیٹ‘‘ ۱۹۵۴ء فلم ’’ہیملیٹ‘‘ (ہندی نام خون کا خون) ۱۹۸۱ء فلم ’’انگور‘‘ (Comedy of errors) ۲۰۰۳ء فلم ’’مقبول‘‘ (Macbeth) اور ۲۰۰۶ فلم ’’اومکارا‘‘ (Othelo)۔ان کے علاوہ ۱۹۸۸ء میں منصور خاں نے رومیو جولیٹ کی کہانی کو فلم ’’قیامت سے قیامت تک‘‘ میں نئے انداز سے پیش کیا تھا۔

☆☆☆

ہندی فلموں میں رام

پریم پال اشک

ہمارے فلم سنسار کو بھگوان رام کی دل کش شخصیت روزِ ازل ہی سے متاثر کرتی رہی ہے۔مریادا پرشوتم بھگوان رام آئے تو تھے دنیا کے پاپ کاٹنے لیکن بھارت کے ہالی ووڈ بمبئی جیسے شہر میں آ کر وہ عجیب سنکٹ میں پھنس گئے۔ ہر نامور فلم ساز نے ان کی شخصیت کو پردۂ سیمیں پر پیش کرنے کی الٹی سیدھی کوششیں کیں اور اس کے ساتھ اپنے کروڑوں رام بھگت فلم بینوں کے گناہ بخشوانے میں نو سو چوہے بھی کھا لیے، اور حج بھی کر لیا۔

بھگوان رام کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ۱۹۱۲ء سے مسلسل پیش کیا جاتا رہا ہے۔ رامائن پر سب سے پہلی فلم مختصر فلم کے طور پر ''رامائن کا ایک کانڈ'' کے زیر عنوان ۲ رنومبر ۱۹۱۲ء کو گیٹی تھیٹر میں ریلیز کی گئی تھی۔ یہ فلم سنیما ڈی لکس کے لئے خاص طور پر بنی تھی اور اسے ہندوؤں کے عظیم رزمیہ پر مشتمل ایک خصوصی کشش کہا گیا تھا۔ اس میں رام کو لنکا میں راکشسوں کے راجہ راون کو شکست دے کر قتل کرنے اور پھر ہاتھیوں، رتھوں وغیرہ کا ایک عظیم جلوس دکھایا گیا تھا۔ یہ فلم ایک ہفتہ چلی اور اس کا اچھا استقبال ہوا تھا۔لیکن اس کی لمبائی کا پتہ نہیں چل سکا۔ کیونکہ اس کے ساتھ کئی اور فلمیں بھی چلتی رہی تھیں۔

ان سات دہوں میں اب تک تقریباً اکسٹھ فلمیں پردۂ سیمیں کی زینت بن چکی ہیں۔ان میں سے سولہ فلمیں خاموش دور میں اور ۴۵ فلمیں متکلم دور میں آئیں۔ اگر اوسط نکالی جائے تو خاموش فیچر فلموں کے دور میں ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۰ء تک کے پندرہ برسوں میں ایک فلم کی اوسط پڑتی ہے۔ جب کہ بعد کی پانچ دہائیوں میں بھی سال میں ایک فلم آئی۔ان میں چند فلموں کے نام اور سنسر کے سال کے ساتھ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

خاموش فلمیں: لنکا دہن (۱۹۱۵ء) رام بن باس (۱۹۱۸ء) اہلیہ ادھار (۱۹۱۹ء) شری رام جنم (۱۹۲۰ء) سیتا سوئمبر (۱۹۲۰ء) لوکش (۱۹۲۱ء) رامائن (۱۹۲۲ء) رام راون یدھ (۱۹۲۴ء) سیتا وواہ (۱۹۲۴ء) رام راجیہ ویوگ (۱۹۲۸ء) سیتا سوئمبر (۱۹۲۹ء) لنکا (۱۹۳۰ء) لنکا دہن (۱۹۳۰ء) سیتا ہرن (۱۹۳۰ء) **متکلم فلمیں:** لنکا دہن (۱۹۳۲ء) رامائن (۱۹۳۳ء) سیتا سوئمبر (۱۹۳۳ء) رامائن (۱۹۳۴ء) سیتا (۱۹۳۹ء) بھرت ملاپ (۱۹۴۲ء) رام راجیہ (۱۹۴۳ء) ستی سیتا (۱۹۴۶ء) رام بان (۱۹۴۶ء) سیتا سوئمبر (۱۹۴۸ء)

شری رام بھگت ہنومان (۱۹۴۸ء) رام پرتگیا (۱۹۴۹ء) رام وواہ (۱۹۴۹ء) رام درشن (۱۹۵۰ء) شری رام اوتار (۱۹۵۰ء) رام جنم (۱۹۵۱ء) لنکا دہن (۱۹۵۲ء) رامائن (۱۹۵۴ء) بال رامائن (۱۹۵۵ء) رام نومی (۱۹۵۶ء) رام راون یدھ (۱۹۵۷ء) رام لکشمن (۱۹۵۷ء) رام بھگت ہنومان (۱۹۵۷ء) رام بھگت وبھیشن (۱۹۵۸ء) رامائن (۱۹۶۰ء) رام لیلا (۱۹۶۱ء) سمپورن رامائن (۱۹۶۱ء) لوکش (۱۹۶۷ء) رام راجیہ (۱۹۶۷ء) سمپورن رامائن (۱۹۷۳ء) رام نومی (۱۹۷۵ء) رام کی لنکا فتح کی سب سے پہلی جھلک ہندوستانی فلم سازی کے جدِ امجد دادا بھائی پھالکے نے ۱۹۱۵ء میں لنکا دہن کے نام سے پیش کی۔ یہ تین ہزار فٹ لمبی فیچر فلم تھی۔اور ایک انگریزی فلم بلائینڈ فیتھ کے ساتھ دکھائی گئی تھی۔ یہ سنیما آرٹ میں بھارت کی ترقی کا ایک لاجواب ثبوت تھا۔ایک ہفتے میں اس نے آمدنی کے تمام ریکارڈ توڑ دئے۔اس لیے اسے بھارت کی اولین باکس آفس فلم کہلانے کا شرف حاصل ہو گیا۔ٹکٹ کھڑکی پر اتنی بھیڑ ہوگئی کہ اسے قابو میں رکھنا مشکل ہو گیا۔دادا بھائی پھالکے نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ دس دن کے اندر اس فلم نے ۳۲ ہزار روپیہ کمایا۔ پونہ میں پبلک نے سنیما گھر کے دروازے توڑ دئے۔اور مدراس میں اس فلم کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس فلم کی گراس انکم یعنی ٹکٹوں کی آمدنی پولیس کی زیر حفاظت بیل گاڑیوں میں بھر کر لے جائی جاتی تھی۔

۱۹۱۸ء میں بمبئی میں فرینڈز اینڈ کمپنی نے رام بن باس بنائی۔ یہ بھارت میں تیار ہونے والی پہلی سیریل فلم تھی۔اس فلم کی طوالت پچیس ہزار فٹ تھی۔اور اسے تین چار حصوں میں دکھایا گیا تھا۔یہی نہیں بلکہ اس فلم کو مقبول کرنے کے لیے پہلی بار زندہ ناچ گانے کا پروگرام پیش کیا گیا تھا۔اس فلم کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں رول کرنے کے لیے کلکتہ کی دو لڑکیاں اوشا اور گوہی کو خاص طور پر بلوایا گیا تھا۔

۱۹۲۲ء میں کلکتہ میں مدن تھیٹریکل کمپنی والوں نے ایک فلم رامائن بنائی اس فلم کے ۱۲۰ ابواب تھے۔ ہر ہفتے اس فلم کے ساتھ ابواب دکھائے جاتے تھے۔یعنی اس فلم کا شو تین دن میں مکمل ہوتا تھا۔اس اعتبار سے یہ اب تک کی طویل ترین فلم ہوئی۔

بھگوان رام کی شخصیت کو صحیح معنوں میں ابھارنے کا سہرا بنگال کے جادوگر دیو کی بوس کے سر بندھا، انہوں نے ۱۹۳۹ء کے قریب ایسٹ انڈیا کے جھنڈے تلے ایک موثر اور یادگار فلم 'سیتا' بنائی تھی۔ مرحوم پرتھوی راج کپور، ترلوک کپور اور درگا کھوٹے اس کے خصوصی اداکار تھے۔ رام کا رول

پرتھوی راج کپور نے اور سیتا کا رول درگا کھوٹے نے اور 'لو' کا ترلوک کپور نے کیا۔

اس کے بعد پرکاش پکچرز نے رامائن کی پوری داستان کو چار فلموں 'بھرت ملاپ'، 'رام راج'، 'رام بان' اور 'سیتا سوئمبر' میں فلما کر دھارمک فلموں میں ایک ایسا ریکارڈ قائم کیا جواب تک نہیں ٹوٹ سکا۔ ان فلموں میں رام کے جنم سے لے کر سیتا کے زمین دوز ہونے تک کے واقعات فلمائے گئے۔ اور بھرت ملاپ اور رام راج نے تو باکس آفس کے نئے ریکارڈ قائم کیے ان چاروں فلموں میں رام اور سیتا کے رول پریم ادیب اور شوبھنا سمرتھ نے ادا کئے۔ ان سب فلموں میں سب سے اچھی رام راج تھی۔ اس کی خوبصورت فوٹو گرافی، دل نشین موسیقی، موثر مکالموں بھرت ویاس کے دل کش گیتوں اور بھرپور کردار نگاری کے ذریعہ رامائن کے زریں عہد کی عکاسی کی گئی تھی۔ پریم ادیب اور شوبھنا سمرتھ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ بھولے بھالے عوام تو انہیں رام اور سیتا کی جوڑی سمجھتے تھے۔ اور ان کی تصویر دیکھتے ہی ان کے سر عقیدت سے جھک جاتے تھے۔

رام راج کے خصوصی پرنٹ سنسر کرا کر گاندھی جی کو ان کے آشرم میں یہ فلم دکھائی گئی تھی۔ ۱۹۵۵ء میں چلڈرن فلم سوسائٹی نے 'رام راج' اور 'بھرت ملاپ' دونوں فلموں کے ٹکڑے جوڑ کر بال رامائن تیار کی تھی۔

۱۹۶۷ء میں پرکاش پکچرز نے اپنی پرانی فلم 'رام راج' کو نئے انداز سے پیش کیا۔ اور جب فلم کی کاغذی تیاریاں مکمل ہونے لگیں تو وجے بھٹ نے سیتا کے رول کے لیے شوبھنا سمرتھ کی بیٹی نوتن سے بات کی تو اس نے کہا کہ اگر یہی رول اس نے ادا کیا تو قدرتی طور پر لوگ ماں بیٹی کے رول کا موازنہ کریں گے۔ اور وہ اسے مناسب نہیں سمجھتی بعد میں یہی رول بینا رائے نے ادا کیا تھا۔

نئی فلم رام راج رنگین ہونے کے باوجود اپنے اندر کوئی کشش پیدا نہیں کر سکی۔ سارے ماحول میں ہی تصنع تھا۔ کیا سٹیس، کیا ہدایت کاری' کیا اداکاری' کچھ بھی تو دل کش نہ تھا۔ پریم ادیب اور شوبھنا سمرتھ کی رام اور سیتا کی جوڑی کا تو یہ عالم تھا کہ باشندِ گان ہند انہیں کی مسکراہٹ پر مسکراتے اور انہیں کی اشک شوئی پر آنسو بہاتے تھے۔ نئی 'رام راج' کی کیفیت اس کے بالکل برعکس تھی۔ رام کے رول میں کمار دگھے کی رونی صورت، سپاٹ شخصیت، غیر ہموار آواز اور غلط تلفظ نے فلم کو پوری طرح ڈبو دیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ بینا رائے روتی بھی تو ہنستی نظر آتی تھی۔ اس فلم کے گیت بھی بھرت ویاس نے لکھے تھے اور موسیقی وسنت ڈیسائی مرحوم نے دی تھی۔ ۱۹۷۳ء میں مدراس کی ایک فلم 'سمپورن رامائن' آئی۔ اس

میں پوری رامائن کو بڑے پیارے اور دل کش انداز سے پیش کیا گیا تھا۔ یہ فلم اگرچہ ہر اعتبار سے خوبصورت تھی لیکن کمزور ڈبنگ نے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔

دو ایک مستثنیات کو چھوڑ کر ہماری بمبیا فلموں نے مریادہ پرشوتم بھگوان رام کی سوانح حیات کو پردۂ سیمیں پر پیش کرتے وقت بھی فلم کو بمبیا قسم کے چالو فارمولے میں ڈھالتے ہوئے اس میں سستے ناچ گانے، بھونڈا مزاح اور اشتعال انگیز موسیقی کو ٹھونسا جاتا رہا۔ انگریزی میں بائبل پر بنی کئی فلموں کا شمار کلاسیکل فلموں میں ہوتا ہے۔ لیکن افسوس تو اس بات پر ہے کہ ہماری دھارمک فلمیں عام طور پر اسٹنٹ فلمیں ہی ہوتی ہیں۔ حالت تبھی سدھر سکتی ہے، اگر رشی کیش مکھرجی، اسیت سین، بی آر چوپڑہ اور شکتی سامنت جیسے نامور ہدایت کار دھارمک موضوعات اور پوران کی تھیموں پر فلمیں بنائیں۔

ایک بار جب ستیہ جیت رے نے اعلان کیا تھا کہ وہ مہا بھارت کی رزمیہ داستان کو فلمائیں گے تو امید بندھی تھی کہ ان سے ترغیب و تحریک حاصل کر کے شاید کوئی ذہین ہدایت کار رامائن کو بھی فلمائے جانے کے معاملے پر غور کرے۔ لیکن بعد میں ستیہ جیت رے نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ ورنہ رامائن اور مہا بھارت تو ایسی رزمیہ داستانیں ہیں۔ جن سے ہمارے ملک کے ادیبوں کو لاتعداد پلاٹ ملتے رہے ہیں۔ صرف ایسے ذہین چابکدست ہدایت کار چاہیں تو ان کا صحیح استعمال کر سکتے ہیں اور دوسری طرف یہ ہمارے سنسر کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ ایسی دھارمک فلمیں عوام کے جذبۂ عقیدت کا مذاق نہ اڑانے پائیں اور ان کرداروں کو بھونڈے انداز سے پیش کرنے کی جسارت نہ کی جائے۔ وجاہت مرزا۔ ونے چٹرجی۔ علی رضا۔ سریندر پرکاش۔ اندرراج آنند اور باسو چٹرجی۔ ان بیس ناموں میں صرف نو نام۔ رمیش پنت۔ اختر الایمان۔ سلیم جاوید۔ وجاہت مرزا۔ علی رضا۔ ابرار علوی ڈاکٹر راہی معصوم رضا اور کملیشور ہی ہندی یا اُردو کو بطور زبان اپنائے ہیں۔ باقی کوئی پنجابی ہے کوئی بنگالی۔ کوئی مراٹھی اور جنوبی بھارت کا باشندہ ہے۔ لہٰذا یہاں بھی پلڑا غیر ہندی نژاد کا بھاری ہو گیا ہے۔

بھارت میں بننے والی کسی اور زبان کی فلموں کی یہ کیفیت نہیں ہے۔ بنگالی۔ مراٹھی۔ گجراتی۔ تامل۔ تیلگو۔ ملیالم اور کنٹر زبانوں میں بننے والی فلموں کے ڈائریکٹر اداکار موسیقار گائیک۔ نغمہ نگار اور مصنف اسی زبان کو بولتے ہیں جس زبان میں وہ کام کر رہے ہوتے ہیں

مستثنیٰ قرار دیئے جانے کی بات الگ ہے۔لیکن ہندی فلموں کے تین اہم شعبوں ۔ہدایت کاری اداکاری اور موسیقی کے میدان میں تو ہندی نژاد طبقہ خال خال ہی نظر آتا ہے۔

اس سے بڑا مذاق اور ستم ظریفی اور کیا ہوسکتی ہے۔ایسی تمسخر آمیز حالت میں یہ کیسے امید کی جاسکتی ہے کہ ہندی فلمیں اپنے علاقے ماحول اور طبقہ کی حقیقت آمیز عکاسی کرسکیں گی۔دراصل ہندی فلمیں حقیقت پسند ماحول اور فطری اور قدرتی انداز تب اپنا سکتی ہیں اگر ان کی فلم سازی مہاراشٹر جنوبی بھارت یا بنگال کے بجائے اتر پردیش۔دلّی۔مدھیہ پردیش۔بہار اور راجستھان جیسے ہندی نژاد علاقوں میں ہو اور ان فلموں میں کام کرنے والے ڈائریکٹر۔ایکٹر۔ایکٹریسیس۔موسیقار نغمہ نگار اور مصنف بھی ہندی خطے سے تعلق رکھتے ہوں۔

جب تک یہ نہیں ہوتا ہمیں بمبیّا اور مدراسی فارمولوں پر مبنی بارہ مصالحوں کی چاٹ والی تفریح اور منورنجن ڈنڈورا پیٹتی فراریت پسند فلمیں دیکھ کر بار بار اپنا تین گھنٹے کا قیمتی وقت برباد کرنا پڑے گا۔

☆☆☆

وطن پرستی کے جذبے سے سرشار فلمیں

نرگس فراز

ہندوستانی فلمیں غلامی کے اس دور میں وجود میں آئی تھیں جب ملک فرقہ پرستی کی آگ میں جل رہا تھا۔فلموں نے بولنا شروع کیا تو اشارے کنایوں میں انگریزی حکومت کے خلاف صدائیں بلند ہونے لگیں، جنگ آزادی کے اس دور میں ہر شخص وطن پرستی کے جذبے سے سرشار نظر آتا تھا۔آزادی کے ان شیدائیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے فلمساز ایسی ہی کہانیوں کو لے کر فلمیں بنانے لگے جس سے ان کے دلوں میں مزید وطن پرستی کا جذبہ بیدار ہو، مثلاً آزادی کی لڑائی، اس کے فوجی، پڑوسی ممالک سے جنگ اور دہشت گردی سے متعلق فلمیں۔غلامی کے اس دور میں ہدایت کار دبی زبان اور اشاروں میں وطن پرستی کی بات کہہ پاتے کیونکہ اس کی ذراسی بھی بھنک ملنے پر انگریز حکومت فلم کی نمائش پر پابندی عائد کردیتا تھا۔بامبے ٹاکیز کی فلم 'قسمت' (۱۹۴۲ء) میں پردیپ کے لکھے نغمہ 'دور ہٹواے دنیا والو ہندوستان ہمارا ہے' میں مخفی وطن پرستی کا ذکر اکثر کیا جاتا ہے۔فلم 'بندھن' کا نغمہ 'چل رے نوجواں' نے بھی جواں دلوں میں خوب جوش وولولہ پیدا کیا تھا۔وی شانتا رام کی فلم 'اُدے کال'' میں پرچم لہرانے کے سین کو لے کر انگریزوں نے اعتراض کیا تھا، انہیں کی فلم 'پڑوسی' میں ہندو مسلم اتحاد کا بے حد خوبصورت پیغام تھا۔

آزادی ملنے کے ساتھ ہی فلمسازوں کے لب بھی آزاد ہوئے اور وطن پرستی پر مبنی معنویت سے لبریز فلمیں پردۂ سیمیں پر اپنا جلوہ بکھیرنے لگیں۔پچاس کی دہائی کی فلموں میں آزادی کی خوشی، ملک کی تعمیر نو کا جوش وولولہ اور سماجی اصلاح کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔۱۸۴۸ء میں منظر عام پر آئی فلم ''شہید' میں دلیپ کمار نے ایک انقلابی کا کردار نبھایا تھا۔اسی وقت سہراب مودی نے لکشمی بائی کی زندگی پر 'جھانسی کی رانی' (۱۹۵۲ء) بنائی۔شرت چندر کے ناول 'پتھ کے دعویدار' کو لیکر فلم 'سوے واچی' بنی جس پر انگریزوں نے طویل عرصہ تک پابندی عائد کر رکھی تھی۔

۱۹۶۰ء کی دہائی میں چین اور پاکستان سے ہوئی جنگوں نے فلمسازوں کو ایک نیا موضوع دے دیا۔وطن پرستی پر مبنی فلمیں جذبات کو ابھارنے میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔عموماً بیشتر فلمیں جیتی ہوئی

جنگوں پر ہی بنتی ہیں اور وہی باکس آفس پر کامیاب بھی ہوتی ہیں، ہاری ہوئی جنگوں پر بنائی گئی زیادہ تر فلمیں ناکام ثابت ہوئی ہیں، لیکن ہدایت کار چیتن آنند نے اس سوچ کو اپنی فلم ''حقیقت'' سے غلط ثابت کر دیا تھا، انہوں نے ۱۹۶۲ء میں چین سے ہوئی جنگ میں ہماری شکست کو لیکر فلم 'حقیقت' بنائی جو وطن پرستی پر بنی فلموں میں اب تک کی سب سے کامیاب فلم مانی جاتی ہے۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان سے ہوئی جنگ میں ہندوستان کو فتح حاصل ہوئی تھی اور ایک نیا ملک بنگلہ دیش وجود میں آیا تھا، چیتن آنند نے اسی موضوع کو لے کر فلم ''ہندوستان کی قسم'' بنائی جو باکس آفس پر ناکام رہی جبکہ فلمساز جے پی دتہ نے اسی موضوع کو لے کر فلم 'بارڈر' سے خوب تعریفیں حاصل کیں مگر کارگل جنگ (۱۹۹۹ء) پر بنی 'ایل اوسی کارگل' سے وہی کامیابی دوبارہ نہ دہرا سکے۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب جنگ آزادی کا نقطۂ آغاز تھا، منوج کمار کی فلم 'کرانتی' (۱۹۸۲ء) اسی انقلاب کے ارد گرد گھومتی ہے۔ کئی فلمسازوں نے جنگ آزادی کے تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر بھی فلمیں بنائی ہیں۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی زندگی پر بھی فلم بنی، کیتن مہتا نے پولس بغاوت کے مرد مجاہد منگل پانڈے پر فلم 'منگل پانڈے دی رائزنگ' بنائی۔ جنگ آزادی کے مجاہدوں میں سبھاش چندر بوس اور بھگت سنگھ عوام اور فلمساز دونوں کے سب سے زیادہ چہیتے رہے ہیں، لیکن نیتا جی پر بنی کوئی بھی فلم باکس آفس پر زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔ بھگت سنگھ کی حیات پر بنی فلموں میں صرف منوج کمار کی 'شہید' (۱۹۶۵ء) کو ہی کامیابی مل سکی۔ ۲۰۰۲ء میں فلمسازوں نے بھگت سنگھ پر کئی فلمیں بنائیں لیکن ناظرین نے بالی ووڈ کی اس بھیڑ چال کو پسند نہیں کیا گرچہ ناقدین نے ہدایت کار راج کمار سنتوشی کی فلم ''The Legend of Bhagat singh'' کو خوب سراہا۔

وطن پرستی کے نام پر فلمسازوں نے گاندھی کے نام سے خوب دولت کمائی۔ گاندھی کے علاوہ قومی رہنماؤں کی زندگی پر بنی ہدایت کار کیتن مہتا کی فلم ''سردار''، جبار پٹیل کی 'باباصاحب امبیڈکر'، شیام بینیگل کی "Boss The Unforgotten Hero" جیسی فلموں نے خوب شہرت پائی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنے دور میں مہاتما گاندھی کے بعد دوسرے سب سے مقبول لیڈر اور وطن کے پہلے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو پر 'گاندھی' جیسی کوئی فلم نہیں بنی۔

پاکستان میں پنپ رہی دہشت گردی بھی ہمارے وطن پرست فلمسازوں کو مسلسل مختلف کہانیاں فراہم کر رہی ہیں۔ ہدایت کار جان میتھو ماتھن کی فلم 'سرفروش' (۱۹۹۹ء) کے ساتھ ہی فلمساز ہندوستان میں دہشت گردی پھیلانے کے لئے پاکستان کا نام کھلے عام لینے لگے ہیں۔ 'دل سے'، 'مشن کشمیر' اور 'یہاں' وغیرہ فلموں میں جموں وکشمیر کو پاک دہشت گردی سے متاثر ریاست کے طور پر ہی پیش کی گیا ہے۔

بلاشبہ دہشت گردی نے ملک میں فرقہ پرستی اور آپسی اختلافات کے بیج بوئے ہیں لیکن کئی ہدایت کار دہشت گردی کو فرقہ پرستی کے ایسے عینک سے دیکھتے ہیں جس میں کسی مخصوص طبقہ کو ہی منفی کردار میں پیش کیا جاتا ہے، ان کی فلمیں دہشت گردی سے پیدا زخم پر مرہم کے بجائے مرچ لگاتی ہیں اور سماج میں منافرت کو ہوا دیتی ہیں۔ کئی فلموں میں اقلیتی فرقہ کی نمائندگی کرنے والے کرداروں نے چیخ چیخ کر اپنی وطن پرستی اور نیک نیتی کے ثبوت دیئے ہیں۔ دہشت گردی کے موضوع پر آئی 'بلیک اینڈ وہائٹ فلم' "A Wednesday" 'دھوکہ' اور 'نیویارک' جیسی حالیہ ریلیز فلمیں قومی و عالمی سطح پر لوگوں کی منفی سوچ کو اجاگر کرتی نظر آتی ہیں۔

منفی سوچ کے حامل ہدایت کاروں کو سمجھنا ہوگا کہ دوسروں کے جذبات کو ٹھیس پہنچا کر جشن منانا وطن پرستی نہیں ہے بلکہ وطن کے نقاب پوش دشمنوں اور سماجی مسائل کو منظر عام پر لانا، اپنے فرائض کو ایمانداری سے نبھانا اور ملک کی ترقی میں مثبت رول ادا کرنا وطن پرستی ہے۔ 'سودیش'، 'لگان'، 'رنگ دے بسنتی' اور 'چک دے انڈیا' جیسی فلمیں کھیل کھیل میں وطن پرستی کا یہی پیغام ہمیں دے جاتی ہیں۔ ہندوستانی سنیما کی تاریخ میں وطن پرستی پر بنی فلمیں ایک مختلف اور اہم باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان فلموں نے وقت وقت پر ناظرین کے سوئے جذبات کو بیدار کر کے وطن پرستی کے لئے جاں نثار ہو جانے پر آمادہ کیا ہے۔

☆☆☆

حب الوطنی سے سرشار فلمی گیت

بے نظیر بیگم

حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے والے فلمی نغموں کا سلسلہ خاصا پرانا ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ قومی یکجہتی اور سالمیت کی بات کرنے والے یہ نغمے ہمیں آج بھی صحیح راہ دکھاتے ہیں۔ سلور اسکرین پر یہ قومی ترانے جب بھی ہمیں دیکھنے و سننے کو ملتے ہیں تو دل کو چھو جاتے ہیں۔ ویسے ہی ریڈیوز پر بھی جب وطن پرستی کے نغموں کو سننے کا موقع ملتا ہے تو ہم اسے ضائع ہونے دینا نہیں چاہتے۔ ۲۶/جنوری کے قومی تہوار کے موقع پر یہ نغمے گلی کوچوں میں خوب سنائی دیتے ہیں۔

فلم 'سن آف انڈیا' کا گیت ''ننھا منھا راہی ہوں، دیس کا سپاہی ہوں، بولو میرے سنگھ جے ہند .... جے ہند'' جب فضاؤں میں گونجتا ہے تو ہر ہندوستانی کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے اور ایک چھوٹا سا اسکاؤٹ بوائے اپنے ارادوں کی جھانکی پیش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ شکیل بدایوانی کی زیر قلم اس نغمے کو اپنی آواز سے شانتی ماتھر نے سجایا ہے اور اس کی موسیقی نوشاد نے تیار کی ہے۔

محمد رفیع اور کورس کا گایا ہوا فلم 'لمبے ہاتھ' کا گیت ''پیار کی راہ دکھا دنیا کو جو نفرت کی آندھی، تم میں ہی کوئی گوتم ہوگا، تم میں ہی ہوگا کوئی گاندھی'' آج بھی بہت مقبول ہے۔ اس میں آنے والی نسل سے امید کی جا رہی ہے کہ کوئی مہاتما پھر پیدا ہوگا، اس قومی گیت کو جی ایس کوہلی نے اپنی موسیقی سے سجایا ہے۔ پردیپ کے زیر قلم حب الوطنی کے گیتوں کی مہک آج بھی ملک کے لوگوں کو راحت پہنچاتی ہے۔ فلم 'جاگرتی' کے نغمے ''آؤ بچو تمہیں دکھائیں جھانکی ہندوستان کی، اس مٹی کو تلک کرو یہ دھرتی ہے بلیدان کی، وندے ماترم .... وندے ماترم .....'' اور ''دے دی ہمیں آزادی بنا کھڈگ بنا ڈھال، سابرمتی کے سنت تو نے کر دیا کمال .... رگھوپتی راگھو راجا رام ....'' آج بھی بچوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح لتا منگیشکر کا گایا ہوا نغمہ ''اے میرے وطن کے لوگوں ذرا آنکھ میں بھر لو پانی، جو شہید ہوئے ہیں ان کی ذرا یاد کرو قربانی'' آج بھی ہمیں جنگ آزادی میں شہید ہوئے لوگوں کی یاد دلاتا ہے۔ لتا جی کی آواز میں جب یہ نغمہ ہمارے فوجی جوان روبرو ہو کر سنتے ہیں تو ان میں غضب کا جوش و جنون پیدا ہو جاتا ہے۔

اسی طرح بھرت ویاس کی زیر تحریر فلم 'دو آنکھیں بارہ ہاتھ' کا نغمہ ''اے مالک تیرے بندے ہم، ایسے ہوں ہمارے کرم، نیکی پر چلیں اور بدی سے ٹلیں تاکہ ہنستے ہوئے نکلے دم....'' آج بھی لاکھوں اسکولوں میں بطور دعا پڑھا جاتا ہے۔ انل بسواس کے زیر موسیقی اور لتا منگیشکر کے ذریعے گائی ہوئی یہ دعا پاکستان میں بھی اپنا خاصا اثر رکھتی ہے۔ فلم 'بالک' میں بھرت ویاست نے باپو کے نام لکھی ایک چٹھی کے ذریعے نغمے میں ملک کے حالات کو پیش کیا ہے، اسے بھی لتا منگیشکر نے اپنی دلفریب آواز دے کر مقبول بنا دیا ہے۔ نغمہ نگار نے ملک میں ہو رہے ٹکراؤ، شراب خوری، ظلم وستم، لیڈران کے بدکردار اور دل بدلی پر چوٹ کی ہے۔

وطن پرستی کا جذبہ پیدا کرنے والے نغموں میں ایک نغمہ ''جہاں ڈال ڈال پر سونے کی چڑیا کرتی ہیں بسیرا...وہ بھارت دیس ہے میرا... جہاں ستیہ، اہنسا اور دھرم کا پگ پگ لگتا ڈھیرا۔ وہ بھارت دیس ہے میرا....جے بھارتی، جے بھارتی''۔ محمد رفیع کا گایا ہوا ہے۔ فلم 'سکندر اعظم' کا یہ گیت ہندوستانی ثقافت کی جھلک پیش کرتا ہے۔ اسی طرح فلم 'مدر انڈیا' کا گیت ''دنیا میں ہم آئے ہیں تو جینا ہی پڑے گا، جیون ہے اگر زہر تو پینا ہی پڑے گا'' ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ ہمیں ہر حال میں زندگی کو جینا چاہئے، حالات کے سامنے کبھی ہتھیار نہ ڈالو، محنت کے بل بوتے پر ایماندار بن کر رہو۔

قومی تہواروں کے موقع پر فلم 'گنگا جمنا' کا حب الوطنی سے سرشار ایک گیت ''انصاف کی ڈگر پہ بچو دکھاؤ چل کے، یہ دیش ہے تمہارا نیتا تمہیں ہو کل کے....'' ہیمنت کمار نے گایا تھا۔ ہمارے اسکولی اساتذہ ہمیں انسانیت اور بھائی چارہ کا جو سبق پڑھاتے ہیں، اسی بات کو یہاں پیش کیا گیا ہے۔ اگر ہمارے قدم صحیح راہ پر چلتے ہوئے نہیں ڈگمگائے تو ہم ثابت قدم رہ کر دنیا کو اچھا بنانے کی طاقت رکھتے ہیں۔

عظیم مجاہد آزادی شاعر اشفاق اللہ کا حب الوطنی پر مبنی نغمہ ''سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے، دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے'' اس زمانے میں مجاہدین آزادی کے دلوں میں جوش وجنون پیدا کر دیتا تھا۔ فلم 'شہید' میں اس گیت کو جس خوبصورتی سے فلمایا گیا ہے، اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس گیت کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے بول ''وقت آنے پہ تجھے بتا دیں گے اے آسماں، ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے'' جب سنائی دیتے ہیں تو شہیدوں کی شہادت ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے اور آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

فلم 'لیڈر' کا گیت ''اپنی آزادی کو ہم ہرگز مٹا سکتے نہیں، سر کٹا سکتے ہیں لیکن سر جھکا سکتے نہیں'' خود مختاری اور خودداری کی بات کو دہراتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس نغمے کو سن کر احساس ہوتا ہے کہ اتنی دقتوں سے ملی آزادی کو ہم یوں ہی کیسے گنوا سکتے ہیں۔ یہ بات ہمیں ہر لمحہ ذہن نشین رکھنی چاہئے۔ اسی طرح انسانیت کا پیغام دیتا ہوا ایک نغمہ ''انسان کا انسان سے ہو بھائی چارہ، یہی پیغام ہمارا....یہی پیغام ہمارا....'' کو منا ڈے نے گایا ہے۔ اس کے علاوہ مہندر کپور نے فلم 'پورب پچھّم' میں ایک گیت ''ہے پریت جہاں کی ریت صدا'' میں گیت وہیں کے گاتا ہوں، بھارت کا رہنے والا ہوں، بھارت کی بات سناتا ہوں'' بڑی خوبصورتی سے گایا ہے۔ اس کے علاوہ فلم 'کابلی والا' کا نغمہ دیکھیں ''اے میرے پیارے وطن اے میرے بچھڑے چمن تجھ پہ دل قربان، تو ہی میری آرزو تو ہی میری جستجو تو ہی میری جان'' اس گیت میں تقسیم وطن کے دوران وطن چھوڑنے کا غم پنہاں ہے۔ اسی طرح فلم 'ہندوستانی' کا گیت ''چھوڑو کل کی باتیں کل کی بات پرانی، نئے دور میں لکھیں گے ہم مل کر نئی کہانی....ہم ہندوستانی، ہم ہندوستانی'' نئے دور کی بات کر رہا ہے۔

حالیہ برسوں میں فلم سازوں کا رجحان وطن پرستی پر مبنی فلموں اور گیتوں سے کم ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے، جو ایک جمہوری ملک کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ امید ہے کہ ہندی فلم صنعت کے لوگ بھی وطن پرستی کے نغموں کو ترجیح دیں گے۔

☆☆☆

ہندستانی فلم اور ادبی عناصر

فیاض احمد وجیہ

کسی بھی فن پارہ میں ادبی عناصر اور ادبی احساس (Literary Sense) کا مفہوم کیا ہے؟ اس بنیادی سوال کے دائرہ کار میں ہی اس مضمون کی Thesis کو روشن کرنا مقصود ہے۔ ادب کے مختلف النوع اسالیب بیان کی طرح فلم بھی ایک سماجی فن پارہ ہے، اور یہ بات بے حد روشن ہے کہ سماج ایک Given reality ہے۔ چنانچہ ادب کا کوئی بھی امتیازی اسلوب ہے، وہ اپنے تخیل کی راست گوئی کو منہا کر کے کسی فکری دائرہ کی تعمیر نہیں کر سکتا۔ دراصل یہ فکری دائرہ انسان، سماج اور اس عہد کی سائیکی کی تجریدی مصوری ہے، جس میں زندگی کی علامتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ ادب اپنے امتیازی اسلوب میں انہی علامتوں کو نئے معانی پہناتا ہے، فلم بھی فنون لطیفہ کی اس خوبی کا سب سے موثر اور طاقتور اسلوب ہے۔ ہندوستانی فلموں نے زندگی کی علامتوں کو کس اسلوب اور انداز میں معنی پہنایا ہے، اس کے دائرہ اثرات میں کتنی وسعت اور آفاقیت ہے۔ بعض ایسے ہی امور کے تجزیہ وتعارف میں Literary Sense کو بہ خوبی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ دراصل فلم میں ادبی احساس کی تشکیل، فنون لطیفہ میں تخلیقی بھید واسرار سے الگ کوئی نامیاتی شئے نہیں ہے۔ اس کی ادبی تھیوری بھی تخلیق متون کی شعریات سے کم وبیش متعلق ہے۔ فنون لطیفہ کے اکثر اسالیب بیان ہی کی طرح جب کوئی بیانیہ اس موثر اسلوب میں منقلب ہوتا ہے تو بادی ا لنظر میں گمان گزرتا ہے کہ یہ حقیقی دنیا کا ہو بہو اظہار نہیں ہے۔ بعض ایسے ہی مقام پر Given reality اور Interpreted reality کا وصل وفراق بیانیہ کے قالب میں روشن ہوتا ہے، اور احساس جمال کے منطق میں زندگی کا حقیقی رنگ نئے علاقوں میں تیر کر ایک حقیقی نقطہ بن جاتا ہے۔ رنگ وروشنی کی Metaphy sics میں کرداروں کا تفاعل اور ناظرین کا تہذیبی متن اس احساس کو ہمہ گیر بناتے ہیں۔ دراصل فلم ایک بیانیہ آرٹ ہے، جو اپنے موثر اسلوب میں زندگی کے گہرے سے گہرے رنگ کو عام ناظرین کی سائیکی میں بھی شامل کرتا ہے۔ تخلیقی بیانیہ کی طرح اس کا بھی ایک Visible sense ہوتا ہے جو اس کو مرتب کرتا ہے، اس کے Invisible sense کی تعمیر بھی کرتا ہے اس میں ناظرین کے تہذیبی متن کا دخل ہی اس کے غیاب کو سیاق فراہم کرتا

ہے۔یہاں ہم بیانیہ کے ایک پورے پروسس کو نظر انداز نہیں کر سکتے چوں کہ:

"When we say we'understand'a narrative we mean that we have found a satisfacatory realationship or set of relationships between these two worlds''(1)

یعنی حقیقی اور فکشن ورلڈ کا وصل وفراق.......،اس طرح اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کا حقیقی رنگ بیانیہ کی تہوں میں لپٹا ہوتا ہے۔اوران تہوں کو کھولے بغیر کسی بھی آرٹ کے معنی ومفہوم کا تعین ممکن نہیں ہے۔سعادت حسن منٹو نے ۱۹۴۲ء کے آس پاس یہ بات کہی تھی کہ ''ہندوستان میں ابھی تک آرٹ کے صحیح معانی پیش نہیں کیے گیے''۔(2) کئی معنوں میں یہ بات اب بھی درست ہے لیکن اس عرصۂ حیات میں ہندوستانی فلموں میں اپنے قالب کو اور زیادہ روشن اور مستحکم کیا ہے۔اس لیے ہمارے ہاں بعض ایسی فلمیں بھی موجود ہیں، جو آرٹ کے معانی کے تعین میں بے انتہا اہمیت رکھتی ہیں۔بالخصوص نئی نسل کی تروتازگی اور تخلیقی جدت نے ادب اور آرٹ کے صحیح تناظر کو پیش کیا ہے،اس نقطۂ نظر کی تفصیل اور وضاحت سے پہلے چند اور پہلوؤں کو نشان زد کرنا ضروری ہے۔میں نے جس تروتازگی اور تخلیقی جدت کی بات کہی ہے،اس کو منٹو کے ہی ایک خیال کی روشنی میں دیکھتے ہیں:

''ہندوستان میں ٹھیٹ ہندوستانی فلم بننے چاہئیں۔ہمارے وہ سوشل فلمیں جو آج کل سینکڑوں کی تعداد میں سنیماؤں کے پردے پر چلتی ہیں۔کیا ہندوستانی تہذیب کے آئینہ دار ہیں؟ اس کا جواب موٹے قلم سے یہ ہونا چاہیے 'نہیں' آپ ان فلموں میں کبھی 'ہندوستانیت' کو امریکی لباس میں دیکھتے ہیں اور کبھی امریکہ دھوتی کرتے میں نظر آتا ہے، جو بے حد مضحکہ خیز ہے،ان کو سوشل فلم کہا جاتا ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح ہرا یکٹر خود کو آرٹسٹ کہتا ہے''۔(3)

یہاں ٹھیٹ ہندوستانی فلم سے وہی Literary sense مراد ہے،جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔میں یہاں چند فلموں کے نام ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں،اس کے بعد قارئین خود فیصلہ کر لیں گے کہ منٹو کے اس قول کی تعبیر میں ہندوستانی فلم کا دامن آج بھی تنگ ہے یا نہیں(؟) A Wednesday، لگان، رنگ دے بسنتی، سودیش، ویرزارا، فراق، پاپ، بلیک اینڈ وہائٹ، جس دیش

میں گنگا رہتا ہے، اوم کارا، رین کوٹ۔۔۔یہ فلمیں اپنے سماجی سروکار اور ٹھیٹ 'ہندی' سروکار کی وجہ سے لینڈ مارک کی حیثیت رکھتی ہیں۔لیکن آج بھی ایسی فلموں کی بہتات ہے،جن کے پیش نظر منٹو نے 'ہندی تہذیب' کے آگے سوالیہ نشان قائم کیا ہے۔فارمولہ فلموں کا نظریہ اور غور وفکر کا فقدان ہی ایسی بعض مضحکہ خیز صورتحال کا باعث ہے۔مشہور ومعروف فلم 'امراؤ جان' کے ہدایت کار سید مظفر علی نے بھی جواہر لال نہرو یونیورسٹی (4) میں پبلک میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے ان پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا تھا اور فلموں کے سماجی سروکار کو اپنے نقطۂ نظر کی روشنی میں مرتب کرتے ہوئے ان کا خیال تھا کہ حرص وطمع کی منطق اور فارمولہ فلموں کے صارفی نظریہ میں اس کا ادبی جمال اور حسن کہیں کھو گیا ہے۔نئے آئیڈیاز اور کلاسکی متون کی اکثر فلم کاروں کے نزدیک کوئی قدر نہیں ہے۔زندگی کے معنیاتی حوالوں پر غور کیے بغیر فقط اپنے ناظرین کی برہنہ خواہشات کو Cash کرنا ہی ان کا اصل مقصود ہے۔روح کی سیرابی کے لیے مغربی دنیا 'رومی' کی روحانیت میں پناہ لے رہی ہے،اور ہمارے ہاں نہ اصل زندگی سے کوئی سروکار ہے اور نا ہی تصوف کے فکری حوالے کی پیشکش کی کوئی کوشش (واضح ہو کہ ان دنوں سید مظفر علی ''رومی'' کے تصورات ونظریات کو فلم کے موثر اسلوب میں ڈھالنے میں مصروف ہیں)۔انہوں نے اپنی فلموں میں ادب اور زندگی کے حسین امتزاج کو ہمیشہ ایک تہذیبی سیاق میں پیش کیا ہے۔مظفر علی کی ہدایت کاری کا نمونہ کم وبیش ان کی دو فلموں 'امراؤ جان' اور 'انجمن' میں ناظرین ملاحظہ کر چکے ہیں۔مرزا ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان ادا پر تین فلمیں بنائی گئیں،لیکن 'مہندی' (پشپا پکچرز) اور حالیہ ریلیز 'امراؤ جان' میں ناول کی روح دو فیصدی بھی موجود نہیں ہے کیوں۔مظفر علی کی 'امراؤ جان' سے ہم کہیں کہیں اختلاف ضرور کر سکتے ہیں۔لیکن اس کے ادبی حسن اور مجموعی آہنگ میں ناول کی روح کو شدید طور پر محسوس کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتے تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس فلم کی تشکیل میں ناول نگار کے نقطۂ نظر کو ہر ہر سطح پر نمایاں کرنے کی صد گونہ کوشش کی گئی ہے۔ریکھا، نصیر الدین شاہ، اور فاروق شیخ وغیرہ کی لاثانی اداکاری کے علاوہ، وہ تمام نقوش جو اس تہذیب کی یادگار ہیں ان کو بھی اس فلم میں مستحکم کرداروں کے طور پر قائم کیا گیا ہے۔نئی شاعری کے مشہور شاعر شہریار نے کرداروں کی روح میں اتر کر نغمے لکھے اور شہرہ آفاق فن کارہ آشا بھونسلے نے لفظوں کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس کے ادبی حسن کو نکھار دیا،اس لیے یہ فلم بھی ناول کی طرح ہی کلاسک میں شمار کی جائے گی۔اسی ناول پر بنائی گئیں مذکورہ دو فلمیں کسی کو اب یاد بھی رہ گئی ہیں،حالیہ

'امراؤ جان' کے ناظرین اس نقطہ کو بہ خوبی سمجھ سکتے ہیں کہ فارمولہ فلموں کا نظریہ اور بھدی تقلید کے جراثیم نے ایک ہی فن پارہ کے دوسرے اسلوب کو کتنا مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔مظفر علی کی ہی فلم 'انجمن' (شبانہ اعظمی اور فاروق شیخ) میں ان کی زندگی کو دیکھنے کا نظریہ بہت واضح ہے،عورتوں کی بغاوت میں ترقی پسند شعریات کی تعبیر وتصریح ضرور نظر آتی ہے لیکن زندگی کو فطری صورت میں گامزن کرنے کی کوشش کسی نام نہاد نظریہ کی ترجمانی سے زیادہ ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کا عمل ہے۔میرے خیال میں یہی اس فلم کی ادبی جمالیات ہے۔ان حوالوں سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ادب اور آرٹ کے نظریہ سے بھی فلمیں بنائی جا رہی ہیں،لیکن ایسے ہدایت کار زیادہ ہیں جن کو ادب کے صحیح تصور سے کوئی غرض نہیں ہے۔مظفر علی جیسے بعض ہدایت کار اس رمز سے آگاہ ہیں کہ فلم کے ذریعہ تماشائی سماج کے ذہن ودل سے بہ خوبی مکالمہ کیا جا سکتا ہے۔دراصل فلم اپنے جداگانہ اسلوب میں تفریح اور تربیت دونوں کا بے حد موثر وسیلہ ہے،اس لیے اس سے بے پناہ کام لیے جا سکتے ہیں۔ان باتوں کی طرف منٹو نے بھی بڑے بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے:

''فلم کے عالمگیر اور ہمہ رس اثر کے پیش نظر ہمارا خیال ہے کہ ہندوستانی عوام کے اذہان کو بیدار کرنے کے لیے ایسی فلموں کی ضرورت ہے جو کوئی نئی بات سکھائیں اور جن کو دیکھ کر تماشائی تفریح حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ سنیما ہال سے باہر نکلتے وقت اپنے دماغوں کی آغوش میں غور وفکر کے جراثیم بھی لیتے جائیں''۔(5)

بہت واضح انداز میں منٹو نے فلم کے دائرہ اثر میں اس نقطہ کو روشن کیا ہے کہ غور وفکر کے جراثیم سے ہی ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آئے گا۔دراصل وہ ہماری فلموں میں ایک نوع کا Literary sense چاہتے تھے،اس لیے انہوں نے ادبی ذوق کی بحالی کے لیے یہ مطالبہ بھی کیا:

''اگر پبلک میں پست مذاق کے لوگ موجود ہیں تو اس کے ذمہ دار ہمارے پروڈیوسر ہیں جو مذاق کی پستی کی طرف لے جاتے ہیں......جادو کے لایعنی قصے اور پریوں کی فرضی کہانیوں میں اتنی دلچسپی نہیں ہے جتنی کہ ہمارے پروڈیوسر سمجھتے ہیں۔پبلک ایسی فلم چاہتی ہے جس کا تعلق براہ راست ان کے دل سے ہو۔جسمانی حیات سے متعلق چیزیں زیادہ دیر پا نہیں ہوتیں مگر جن چیزوں کا تعلق روح سے ہوتا ہے،دیر تک قائم رہتی ہیں''۔(6)

یہاں منٹو نے پست مذاق اور جسمانی حیات کے تصور میں پروڈیوسر کے اس ذہنی رویہ کو بھی نشان زد کیا ہے،جس کی موجودہ تعبیر میں ہم فارمولہ فلموں کو ہندوستانی پردہ پر رنگ اور روشنی کی بیہودہ صورت میں آج بھی دیکھ رہے ہیں۔یہاں مشرق کی طہارت ہے اور نہ ہی جنسی جمال کا تخلیقی اظہار،ایسی فلمیں سماج اور معاشرہ کو کس طرف لے جا رہی ہیں،یہ ایک اہم سوال ہے۔جنسی جمال کے اظہاریہ میں اگر ''پاپ'' ایسی کوئی فلم بنتی ہے تو بے ساختہ منٹو کے پانچ دن کے پروفیسر کی یاد آتی ہے،جس میں فطری تقاضوں کی نفی کے تصور پر کاری ضرب لگائی گئی ہے۔اسی طرح ''رام تیری گنگا میلی'' کی اداکارہ (مندا کنی) جب اپنے شیر خواہ بچے کو چھاتی کھول کر امرت کی بوندیں پلاتی ہے تو مجھے اسی روسی افسانہ نگار کے فن کی یاد آتی ہے جس میں ایک عورت اپنے ممتا کے درد سے بے قابو کو ہو کر اس اجنبی نوجوان کے منھ میں اپنی چھاتی ڈال دیتی ہے،جو اس کو بہت دیر سے ایک نوع کی بے چینی میں مبتلا دیکھ کر اپنے اندر کے حیوان کو دلا سا دیتا ہے اور اس عجیب وغریب حادثہ کو جب وہ کوئی معنی پہنانا چاہتا ہے تو اس کی قلب ماہیت اس طرح ہوتی ہے کہ وہ عورت اپنا بچہ گھر بھول آئی ہے،اس لیے اس نوجوان کی بے حد شکر گزار ہے اور اپنی اس غلطی کے لیے معافی کی طلب گار بھی۔یہاں اس نوجوان کی سائیکی میں ناظرین کی ننگی آنکھوں کے لیے بہت کچھ ہے۔اس آئینہ میں بہ طور اداکارہ مندا کنی کا چہرہ کتنا پرنور نظر آتا ہے،اس کو ناظرین بہ خوبی محسوس کر سکتے ہیں۔کسی بھی فلم کا ادبی جمال اس کو زندگی کے کن تناظرات میں متشکل کر سکتا ہے،یہ محض اس کی ایک مثال ہے اور ایسی متعدد مثالیں ہماری بعض بہترین فلموں میں موجود ہیں۔یہاں کسی فلم کا تجزیہ مقصود نہیں ہے بلکہ یہ عرض کرنا ہے کہ ہماری فلمیں اپنے Literary sense کی وجہ سے ایک نئے آفاق کی جستجو میں کتنا اہم رول ادا کر سکتی ہیں۔ہندوستانی فلم میں ایک الگ طرح کے اسلوب کو قائم کرنے والے ممتاز اداکار عامر خان نے علاقائی اسلوب کی نمائندگی کرنے والے معروف اداکار، روی کشن کو انٹرویو (7) دیتے ہوئے بعض ایسے ہی پہلوؤں کو روشن کیا تھا،انہوں نے خاص طور سے اس بات پر زور دیا تھا کہ میں فلم محض تفریح کے لیے نہیں کرتا ہوں۔میں چاہتا ہوں کہ عوام کو کچھ سیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملے،وہ میری فلموں سے کچھ لے کر اپنے گھر جائیں۔منٹو نے بہت پہلے ہندوستانی فلموں سے یہ توقع قائم کی تھی:

''ہمیں اس وقت ایسی فلمیں درکار ہیں جو ہمیں کچھ سکھائیں۔......ہمیں اپنی زبان سے پیار کرنا سکھایا جائے۔ہمیں اپنے وطن سے پیار کرنے کا سبق دیا جائے۔ہمیں محبت کے حقیقی معنوں

سے آشنا کرایا جائے، ہمارے سامنے کتاب انسانیت کے اوراق کھولے جائیں''۔(8)

ہندوستانی فلموں میں اس نظریے کی ترجمانی کرنے والے ایک بڑے فن کار عامر خان ہیں۔ان کی اکثر فلمیں زندگی کی تفسیر میں ادبی جمال کا حسن پیش کرتی ہیں۔ میں یہاں صرف چند فلموں کے سیاق کو ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔''رنگ دے بسنتی'' کا بیانیہ اپنی اصل صورت میں ہندوستان کی تاریخ آزادی کے بعض ایسے ہیرو کی کہانی ہے جن کو تاریخی متون میں بھی ہر سطح پر نظرانداز کیا گیا ہے۔اس کی اصل اسپرٹ اور کرداروں کے تفاعل کو آج کے سیاسی اور سماجی حالات سے ہم آہنگ کر کے نہ صرف آزادی کے ان دیوانوں کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے بلکہ موجودہ دور میں اس کی معنویت اور اہمیت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔''منگل پانڈے'' کے کرداروں میں بھی عامر خان نے یہ کوشش کی ہے کہ اس دیوانے کی قربانی کوئی نسل اپنے سینے سے لگائے، چوں کہ ہندوستانی تاریخ میں ان کو صحیح جگہ نہیں دی گئی ہے۔اسی طرح ''لگان'' میں جدوجہد آزادی کو ایک نئے رنگ یعنی کرکٹ میچ کے مقابلہ کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے، اس فلم میں چھوا چھوت ایسی لعنت کو بھی Discuss کیا گیا ہے، اور انسانی عظمت واعتماد کے ترانے بھی گائے گئے ہیں۔''تارے زمین پر'' معصوم ذہنوں کو حوصلہ عطا کرنے والی ایسی فلم ہے جو علم وہنر کے فطری اسلوب کو پیش کرتی ہے۔ان کی حالیہ فلم ''تھری ایڈیٹس'' بھی ان کے نقطہ نظر کی ترجمانی میں ہندوستانی فلم کا ایک نیا موڑ ہے۔مزاحیہ اسلوب میں بنائی گئی اس فلم میں زندگی کے بے حد گہرے اور ہمہ گیر حوالے اس طور پر در آئے ہیں کہ ادب کے شاہ کار مزاح پاروں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مزاح میں زندگی کے کتنے گہرے دکھ ہوتے ہیں۔انسان کی ذہنی آزادی اور فطری زندگی اس فلم کا مرکزی نقطہ ہے۔چھوٹی چھوٹی باتیں کس طور پر زندگی کا حوالہ بنتی ہیں، اس فلم میں اس کے تشخص کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ایک طرح سے آرٹ کے صحیح معانی کو یہ فلمیں قائم کرتی ہیں۔زندگی کو ایک اور نئے اسلوب میں پیش کرنے والے فن کار شاہ رخ خان کا نقطہ نظر بھی اس باب میں بے حد روشن ہے کہ فلمیں محض چند ساعتوں کی تفریح نہیں بلکہ زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے کا ایک روشن اسلوب ہیں۔ان کی فلمیں عشقیہ اقدار اور حسن وعشق کی منطق میں بعض دفعہ کتھارسس کے عمل کو ناظر کی آنکھوں میں روشن کر دیتی ہیں تو بعض مرتبہ حوصلہ بھی عطا کرتی ہیں۔اس تعلق سے کم وبیش ان کی دو فلمیں ''دیوداس'' اور ''محبتیں'' یادگار ہیں۔ان کے ہاں محبت اور پریم کی ایک الگ معنیاتی فرہنگ وضع ہوئی

ہے۔اس حوالے سے ان کی فلمیں ''دل والے دلہنیا لے جائینگے''،''دل تو پاگل ہے''،''کچھ کچھ ہوتا ہے''،''اوم شانتی اوم''،''دل سے''،''رب نے بنادی جوڑی''،''پردیس'' اور ''کبھی خوشی کبھی غم'' کے تناظرات کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ان کے اسلوب میں نیا رنگ بھرنے والی کئی فلمیں ایک نوع کے ادبی احساس کی زائیدہ ہیں۔''سودیش'' میں اپنے گاؤں اور ملک کے تعلق سے جس تعمیری سوچ کو پیش کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری نسل کتنی حساس ہے۔اپنی کاویری اماں کے گاؤں میں چند دنوں کے لیے مقیم امریکہ میں Nasa میں کام کرنے والا نوجوان ہندوستان کے مسائل، مثلاً بجلی، ٹیلی مواصلات اور تعلیمی پسماندگی وغیرہ کو دیکھ کر جن باتوں کو اپنے اندر محسوس کرتا ہے اور اس کی قلب ماہیت ہوتی ہے وہی دراصل اس کا ادبی اور سماجی سروکار ہے۔''ویرزارا'' ایسی فلم میں حسن وعشق کا بے حد انوکھا تصور ہے۔اس میں جسمانی عشق کے بجائے روحانیت کا عظیم فلسفہ نظر آتا ہے۔دراصل تقسیم نے افسانہ اور ناول کی طرح ہماری فلموں کو بھی کئی موضوعات دیے، لیکن اکثر فلمیں جس نقطہ نظر کی ترجمانی میں بنائی گئی ہیں، وہ انسانی جذبات کی صحیح عکاس نہیں ہیں۔ان میں ایک نوع کی فرقہ وارانہ ذہنیت کی بے جا مداخلت ہے اور بعض فلموں میں ''ہیرو ورشپ'' کے رومانی تصور کو نمایاں کرنے کی غیر فطری کوشش کی گئی ہے۔ایک موقع پر ہندوستان کے پہلے وزیراعظم جواہر لال نہرو نے فلموں سے یہ مطالبہ کیا تھا:

عرض یہ کرنا ہے کہ ہمارے فلم سازوں نے ادبی احساس سے الگ ایک ایسی دنیا بسائی ہے، جس میں انسانی عظمت کے سروکار معدوم ہیں۔مشترکہ تہذیب کو مستحکم کرنے کے بجائے نئی نسل کے ذہن کو پراگندہ کیا جارہا ہے۔ایسے ماحول میں 'ویرزارا' کی معنویت اور بڑھ جاتی ہے، چوں کہ اس میں دلوں کی سرحدوں کو مٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔انسانی عظمت کے فلسفہ میں سرحدوں کی نفی کرتے ہوئے ایسے گیت بنے گئے جو ہر طرح کے سیاسی اور نام نہاد مذہبی نظریات سے بلند ہیں۔اس فلم میں جاوید اختر کی اس نظم نے اس نقطہ نظر کی عمدہ ترجمانی کی ہے:

میں قیدی نمبر ۷۸۶ جیل کی سلاخوں سے باہر دیکھتا ہوں/ دن مہینے سالوں کو یگ میں بدلتے دیکھتا ہوں/ اس مٹی سے میرے باؤجی کی کھیتوں کی خوشبو آتی ہے/ ۔۔۔/ ۔۔۔/ یہ بارش میرے ساون کے جھولوں کو سنگ سنگ لاتی ہے۔۔۔/ وہ کہتے ہیں یہ تیرا دیش نہیں/ پھر کیوں میرے دیش جیسا لگتا ہے/ وہ کہتا ہے میں

اس جیسا نہیں/ پھر کیوں مجھ جیسا وہ لگتا ہے/ ۔۔۔وہ کہتے ہیں میرا دیش اس کا نہیں/ پھر کیوں میرے گھر وہ رہتی ہے۔۔۔الخ۔اس فلم کے ادبی تناظرات میں حسن وعشق کا روحانی نظریہ انسانی سماج کی سالمیت کے ہر ہر پہلو کا روشن زاویہ ہے۔اسی طرح ''چک دے انڈیا'' میں حب الوطنی کے ہر پہلو اقلیتی طبقہ کے انسان کی اس صورت کو پیش کیا گیا ہے،جس کے چہرہ پر 'غدار' لکھ دیا گیا ہے۔یہ فلم ان افکار وخیالات کی کتھارسس ہے جس میں ایک طبقہ دوسرے اقلیتی طبقہ کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔شاہ رخ خان نے اپنے اس نقطہ نظر کو اور پھیلاتے ہوئے ''مائی نیم از خان'' ایسی فلم بھی بنائی ہے،ان کے مطابق ''میں اپنی اس فلم کے ذریعہ مسلمانوں کی جو اسٹیریو ٹائپ امیج بنادی گئی ہے اس کو توڑنا چاہتا ہوں.....مٹھی بھر لوگوں کی وجہ سے ایک بہترین قوم کو ہدف ملامت بنائے جانے کی گہری سازش چل رہی ہے۔(10)اس فلم میں حجاب کے اسلامی تشخص اور بعض ایسے انسان جو انسانی عظمت کے فلسفہ میں یقین رکھتے ہیں۔ان کی روشنی میں شرم وحیا کے فطری اظہار کو بھی بحال کرنے کی عمدہ کوشش کی گئی ہے۔ان حوالوں کا مقصود عامر خان یا شاہ رخ خان کو Icon بنا کر پیش کرنا نہیں ہے بلکہ ہماری فلموں میں Literary sense کا گزر کس طور پر ہوا ہے،اس کے بعض رخوں کو محض نشان زد کرنا ہے۔ناظرین بعض ایسے ہی رخوں کو ہماری ان فلموں،مثلاً رین کوٹ، لیجنڈ آف بھگت سنگھ،وہ وہ،ٹریفک سگنل،پیج تھری،ہلہ بول،سکندر،ہم ساتھ ساتھ ہیں،تارے زمیں پر،ہم آپ کے ہیں کون،راجا ہندوستانی،لائف ان اے میٹرو،یہ میرا انڈیا،اپ ہرن،گنگا جل،اجازت،حاصل اور منورما وغیرہ میں بہ خوبی محسوس کر سکتے ہیں۔میں نے قدیم اسلوب کو خاطر نشان نہیں رکھا ہے،چوں کہ اپنے ناظرین سے بھی یہ فلمیں یک گونہ التفات چاہتی ہیں۔لیکن میں چند فلموں کے تعارف کو ضروری خیال کرتا ہوں۔اس سے فلموں کے ارتقائی اسلوب کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

ہماری فلموں کے ارتقائی اسلوب اور ڈھنگ کی تفہیم اس رو سے بھی ہوسکتی ہے کہ ہم بعض نمائندہ حوالوں کو یہاں ایک تسلسل میں پیش کردیں،چنانچہ ہم اس باب میں سب سے پہلے عورت کی تصویر ملاحظہ کرتے ہیں۔امرجیوتی،دنیا نہ مانے،جہیز،صبح کا تارا، براج بہو،پری نیتا،یہودی کی لڑکی،مدر انڈیا،مرچ مسالہ،سوامی،ان پڑھ،صاحب بیوی اور غلام،نکاح،پرکھ،پاکیزہ،منڈی،موسم،طوائف،اور پریم روگ محض چند مثالیں ہیں،جس میں عورت کی کئی تصویریں ہیں۔کہیں جہد مسلسل ہے تو کہیں پدری سماج کے مطلق

العنانیت ہے۔کبھی یہ عورت باغی ہے تو کبھی ایثار ووفا کی دیوی،غرض ''عورت'' اور انسان کے بیچ کی دوری کو کم کرنے کی ایک اچھی کوشش ان فلموں میں نظر آتی ہے۔شیام بینیگل کی فلم ''منڈی'' (۱۹۸۳ء،غلام عباس کے افسانہ 'آنندی' پر مبنی) میں اس طوائف کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے،جس کو یہ مہذب سوسائٹی حاشیے میں بھی جگہ دینے پر آمادہ نہیں ہے۔ناری نکیتین اور بعض دوسرے سیاسی اور سماجی ادارے کی نفی اور ان کی مصنوعی سوچ کی اصلیت میں یہ فلم بہت کچھ کہتی ہے۔یہ پریم چند کی فکر سے توانائی حاصل کرتی ہے تو منٹو کے فن کے باطن کو بھی نمایاں کرتی ہے۔قلی قطب شاہ اور بہادر شاہ ظفر کی تخلیقی سائیکی نے اس کے بیانیہ کو یادگار بنادیا ہے۔محبوب کی شہرۂ آفاق فلم ''مدر انڈیا'' میں عورت کا باطن اور دیہی زندگی کا گھاؤ اس طرح حل ہوگئے ہیں کہ کوئی بھی ناظر اس کو بھلا نہیں سکتا۔اس فلم کا بے حد مشہور نغمہ ہندوستانی عورت کے باطن کو اس طرح پیش کرتا ہے۔

دنیا میں ہم آئے ہیں تو جینا ہی پڑے گا/ جیون ہے اگر زہر تو پینا ہی پڑے گا/ گر گر کے مصیبت میں سنبھلتے ہی رہیں گے/ جل جائیں مگر آگ پر چلتے ہی رہیں گے/ غم جس نے دیے ہیں وہی غم دور کرے گا/ عورت ہے وہ عورت جسے دنیا کی شرم ہے/ سنسار میں بس لاج ہی ناری کا دھرم ہے/ زندہ ہے جو عزت سے وہ عزت سے مرے گا/ مالک ہیں ترے ساتھ نہ ڈر غم سے تو اے دل/ محنت کرے انسان تو کیا کام ہے مشکل۔۔۔اسی طرح راج کپور کی لاثانی فلم ''پریم روگ'' میں بیوہ عورت کی سائیکی کو معنی پہنانے کا انداز ناظرین کی آنکھوں میں آج بھی زندہ ہے۔اس کے علاوہ کئی ایسی فلمیں ہیں جو عورت کی روایتی تصویروں کو توڑتی ہیں،اور ان کے جسم وجان میں حرارت پیدا کرتی ہیں۔دراصل ہندوستانی فلموں کو ایک خاص تسلسل میں ملاحظہ کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ پریم چند اسکول کے موضوعاتی تنوع اور اصلاحی نقطہ نظر سے اس آرٹ کو فیض حاصل ہوا ہے۔اس کے برعکس آج کے سنیما میں نسائی رنگ موضوعات کو بہت زیادہ اعتبار حاصل نہیں ہے۔ ماڈرن معاشرہ کی عورتوں کے مسائل پر ایک اچھی فلم ''اُپس'' آئی تھی،''پاپ'' ایسی فلم میں مذہبی عقیدہ کے نام پر فطری خواہشات کو کچلنے کی کوشش میں 'گھاؤ کی منطق' نظر آتی ہے۔عورت کے باطن اور اس کے دکھ کو پیش کرنے میں سب سے اہم فلم ''لجا'' ہے۔اس میں موضوعاتی تنوع کے ہر پہلو عورت اور اس کا دکھ ہے۔ضعیف العقیدہ سماج اور حاشیائی کرداروں کی کہانی بھی اس کو ایک سیاق عطا کرتی ہے۔اس میں عورت جب روایتی خول سے باہر نکلتی ہے تو اس کو بے حیا قرار دے کر ان کی زندگی کو عذاب کردیا جاتا ہے۔یہی عورت جب اپنے

وجود کو ''ننگا'' کر کے لجا اور شرم کی فطری تعریف وضع کرتی ہے تو یہ معاشرہ بیہودگی کی حد تک ننگا نظر آتا ہے۔لیکن ادبی احساس سے معمور ایسی فلمیں بہت کم ہیں، اکثر فلمیں ایسی ہیں جس میں اداکارائیں خود کو بیوٹی کوئن ثابت کرنے کے لیے اپنے بدن کا بھدا پن دکھاتی ہیں۔ان کے ہاں زندگی کا کوئی مخصوص نقطہ نظر نہیں ہے۔مابعد صورتحال میں بھی عورت کا کوئی توانا کردار نظر نہیں آتا، البتہ بعض فلموں میں مرد حاوی سماج کی نفی کی گئی ہے۔ان فلموں میں کوئی تعمیری سوچ بار نہیں پاسکی ہے، چوں کہ ہندی سیاق کے بجائے مغرب کی ظاہر داری اس میں شریک ہے۔اگر عورت کے پاس خوبصورت جسم ہے تو اس کے اندر کا گھاؤ بھی نظر آنا چاہیے۔ ان اعتراضات کے باوجود امید افزا بات یہ ہے کہ ہندوستانی فلموں میں حقیقی انسان کی واپسی ہوئی ہے۔ متنازعہ فلم ''Water'' کا بیانیہ ناظرین کو یاد ہوگا۔تانیثی آگہی کے باب میں یہ بے حد خوبصورت فکری مظاہرہ ہے، ہندو سماج میں بیوہ عورت کا دکھ اور گاندھی کا نقطہ نظر اس طرح حل ہوئے ہیں کہ مذہب کی فطری تعریف وضع ہوگئی ہے۔اس میں مغربی تہذیب کا انسانی سروکار بھی ایک اہم تناظر ہے۔علاقائی اسلوب کی فلموں میں سطحیت اور بھدا پن ضرور ہے، لیکن اس میں زندگی کا حقیقی رنگ بھی ہے۔ان فلموں کی سطحیت میں مین اسٹریم سنیما کا بہت زیادہ دخل ہے، مگر گھر اور خاندان کا یہی سیاق اس کے روشن مستقبل کا اشاریہ ہے۔علاقائی اسلوب کے موضوعات سے مین اسٹریم سنیما کو درس لینا چاہیے، دراصل "Western Canon of aesthetics" سے ایک نوع کا بُعد نہایت ضروری ہے۔اگر اس جمال سے کچھ لینا ہی ہے تو اس کے ادبی احساس کو اپنے طور پر بروئے کار لایا جائے۔سائنسی فکشن میں شاید ان کی برابری ممکن نہیں ہے، لیکن انسانی عظمت کے کئی ایسے سروکار ہیں جن میں ہمارے ہاں ان سے زیادہ امکانات ہیں۔

قدیم اسلوب کی فلموں کا ایک توانا پہلو یہ بھی ہے کہ تفریح کے متوازی سماجی، تاریخی اور عمرانی حوالوں کو اکثر خاطر نشان رکھا گیا ہے۔دو بیگھہ زمین، نیا دور، بوٹ پالش، پیاسا، آنند، ندیا کے پار، دوستی، کھلونا، میرا نام جوکر، مغلِ اعظم، نکاح، رام اور شیام، مدھومتی، آدمی، راجا اور رنک اور کئی ایسی فلمیں ہندوستانی سنیما کو اعتبار بخشتی ہیں۔دلیپ کمار کی نیا دور کو دوام حاصل ہے، چوں کہ آدمی اور انسان کی جنگ میں ٹھیٹ ہندی مسائل اور حقیقی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔اس اسلوب کی بعض فلموں میں ترقی پسند شعریات کے اکثر زمینی حقائق ناظرین کو متوجہ کرتے ہیں۔'نفسیاتی اور تصوراتی تفریح' کو اول تو قبول کرنا ہی محال ہے، حقیقی

زندگی میں اس کے مضر اثرات کا نتیجہ ہم اپنے آس پاس دیکھ سکتے ہیں۔میڈیا عوامی شعور کو کسی بھی طور پر استعمال کرے، اینگری ینگ مین اور ہیرو ورشپ کے خیالی تصور کو دوام حاصل نہیں ہوسکتا۔آج بھی باغبان اور بلیک، ایسی فلمیں ہیں جو اپنے ادبی اور سماجی سروکار کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہیں۔قدیم اور جدید اسلوب کی منطق کو ندا فاضلی کے ایک خیال کی روشنی میں پیش کیا جاسکتا ہے:

''دلیپ، راج کپور، شمی کپور، دیوآنند سب اس عہد کی پیداوار تھے جب فن اور تجارت میں تھوڑا بہت فرق تھا۔یہی وصف اس دور کی موسیقی میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔......بات دراصل یہ ہے کہ شخصیات کے ظہور کے لیے جو معاشرہ اور معاشرتی اقدار چاہیے ہوتی ہیں، وہ ہر دور کے نصیب میں نہیں ہوتیں۔''(11)

ان باتوں سے جزوی طور پر اتفاق کیا جاسکتا ہے، چوں کہ فن اور تجارت میں آج بھی فرق ہے۔فن کی حرمت وہاں مجروح ہوئی ہے جہاں جنسی بیہودگی نے ناظرین سے فکر و شعور کا دامن چھین لیا ہے۔ایسی فلموں کی بھرمار ہے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہماری فلموں سے فن غائب ہوگیا ہے، فن کا دائرہ اور وسیع ہوا ہے۔قدیم اسلوب کی فلموں کا ایک سیاق ضرور ہے، لیکن اس کی معنویت روز افزوں اس لیے ہے کہ جدید اسلوب کی فلمیں اسی تسلسل میں زیادہ ہمہ گیر ہیں۔رہی بات شخصیات کے ظہور کی تو یقین مانیے کہ قدیم اسلوب کے اکثر اداکاروں کے ہاں کرداروں کی حقیقی نفسیات کا فقدان نظر آتا ہے، اس میں Style of narration بھی شامل ہیں۔دلیپ کمار کے عہد میں چند اداکار ہی ایسے ہیں جن کے ہاں Psychology of character کی توانا صورت ہے۔نئی نسل نے بڑی حد تک اس کمی کو پورا کیا ہے۔قدیم اسلوب کی موسیقی میں انسان اور زندگی کا حوالہ زیادہ گہرا ہے، عصری سنیما میں اس رو سے زوال یقیناً ہوا ہے، اکثر فلمیں ایسی ہیں جہاں موسیقی و نغمہ، بیانیہ کی تعمیر سے زیادہ ایک قسم کی بے تعلقی کو راہ دیتے ہیں۔لیکن ہماری اچھی فلمیں اس باب میں بھی ہمیں مایوس نہیں کرتی ہیں۔اس تعلق سے یہاں ایک ایسی فلم کا ذکر مقصود ہے، جس کے لسانی ملاحظات کو بالعموم محسوس نہیں کیا گیا ہے۔یہ ٹھیٹ ہندوستانی فلم ''اوم کارا'' ہے، جس میں راجستھان کے پس منظر اور پیش منظر کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔لسانی ملاحظات اور Psychology of character کے اکثر متعلقات میں یہاں کا ثقافتی کردار اپنے حقیقی رنگ میں زندہ ہوگیا ہے۔گالیوں کے فطری اظہار میں کرداروں کا وجودی نشان مؤثر اسلوب میں نظر آتا

ہے۔گلزار کے نغمہ۔زباں پہ لاگا لاگا رے نمک عشق کا اور بیڑی جلئی لے جگر سے پیا۔۔۔۔ اپنے ادبی اور ثقافتی سروکار کی وجہ سے بہت اہم نظر آتے ہیں۔راجستھانی لب ولہجہ میں اس کا بیانیہ ہر اعتبار سے فن کے قالب کو روشن کرتا ہے۔'مہندی میں یہ حال ہے تو شادی میں کیا ظلم ڈھائے گی میری بہن/ جانور پال رکھا ہے تو نے اپنے اندر۔۔۔۔'ان دو مثالوں سے یہ واضح کرنا ہے کہ اس کا تہذیبی متن کتنا وسیع ہے۔اس کو کاج، دیہہ، ٹانگ، دُر، لُول، کتے من ایسی لفظیات کے تناظر میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔گلزار نے اپنے نغمہ (جو بہ ظاہر بھدا معلوم ہوتا ہے) میں 'ہو جا پڑوسی کے چولہے سے آگ لئی لے' اور شہد چٹا دے ایسے تہذیبی متون کو شامل کر کے ایک نوع کے ادبی احساس کی تشکیل میں صد گونہ کامیابی حاصل کی ہے۔اس ادبی احساس میں صدیوں پرانی تہذیب کا نقشہ ابھر گیا ہے۔

جدید اسلوب کی بعض نمائندہ فلموں میں اس نوع کی فلموں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، چوں کہ ان عصری سائیکی کا حد درجہ خیال رکھا گیا ہے۔اس تعلق سے نندتا داس کی فلم ''فراق''فن وفکر کی تجسیم کی چیدہ مثال ہے، یہ فلم گجرات Genocide اور اس کے بعد کی سائیکی کو مؤثر اسلوب میں پیش کرتی ہے۔اقلیتی طبقہ کے الگ الگ نمائندوں پر اس کے اثرات کس طور پر مرتب ہوئے یہ فلم اس کا خالص ادبی اظہار ہے۔ایک معصوم بچہ کے کردار کو اس میں علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔بعض لوگوں نے اس فلم کے مندرجات کو سمجھے بغیر اس پر یہ اعتراض کیا کہ ایک خاص زاویہ سے (مذہبی) اس کو بنایا گیا ہے، لیکن اس میں بہت واضح طور پر انسان دوستی کا ثبوت (ایک خاص طبقہ کی عورت کی ممتا میں ایک غیر مذہبی بچہ کی تصویر اور ولی دکنی کے مزار کے انہدام کی منطق میں اس کو بالخصوص محسوس کیا جا سکتا ہے۔) دیا گیا ہے۔اس فلم میں کہیں بھی کسی مذہب کو زیر کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ مذہبی جنون کے سیاسی نشہ کو نشانہ بنایا گیا ہے۔اس فلم کے Metaphor اور ادبی شعریات کی داد دیتے ہوئے کہنا چاہیے کہ آرٹ کی صحیح معنی کی یہ تعبیر ہے۔اس کے مرکزی رول میں جادو جگانے والے شہرہ آفاق اداکار نصیر الدین شاہ نے بہت اچھی بات کہی ہے کہ 'فراق فلم کو صرف ایک ہی زاویے سے دیکھنا چاہیے کہ یہ ایک انسان دوست فلم ہے'(12)

''بلیک اینڈ وہائٹ''ایسی فلم ملک وسماج میں ناسور بن رہے 'دہشت گردی' کے جراثیم کی بیخ کنی کی کوشش ہے۔اس میں حبیب تنویر جنھوں نے ایک شاعر اور ادیب کا رول کیا ہے، جب اپنے گھر کی چہار

دیواری میں اس جراثیم کو دیکھتے ہیں تو صدمہ سے ان کی روح پرواز کر جاتی ہے۔ان کی موت اس فلم میں ایک علامت بن گئی ہے، جو ناظرین سے مسلسل مکالمہ کرتی ہے۔انل کپور ایسے اداکار نے اُردو کے پروفیسر کے رول میں اس جراثیم کے نمائندہ ذہن کی جس طور سے تربیت کی ہے اور قرآنی تعلیمات کو عام کیا ہے، وہ دراصل انسانی سروکار کا عظیم درشن ہے۔یہ فلم اپنے مؤثر اسلوب میں کئی رخوں کو پیش کرتی ہے، مثلاً اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے، قرآنی تعلیمات میں کہیں بھی انسانی عظمت کی نفی نہیں کی گئی ہے، شعروادب کا نظریہ ہمیشہ آفاقی ہوتا ہے اور دہشت گردی صرف اور صرف سیاسی جنون کا نتیجہ ہے، جس کی فکری جڑیں ہماری سوسائٹی میں بہت اندر تک پیوست ہیں۔دہشت گردی کے بعض اور پہلوؤں کو ایک مخصوص اور قوی نقطہ نگاہ سے ''A wednesday'' میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، اس میں ایک عام آدمی کے غم وغصہ اور ردعمل کو پیش کیا گیا ہے۔

اُو۔ہنری کے ایک افسانہ سے انسپائر ہو کر بنائی گئی فلم ''Rain coat'' میں بیانیہ کی داخلیت کا تمام تر حسن سمٹ آیا ہے۔اس کے ادبی جمال میں زماں ومکاں کے تصور سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، دراصل انسان اور اس کی زندگی کی داخلیت اپنی فطرت میں ایسی سچائی ہے جس کا آفاقی نقطہ بے حد روشن ہے۔کسی بھی فن پارہ میں یہ ورلڈ ویو کی بہت عمدہ مثال ہے۔

ہندوستانی فلم کے ان تناظرات سے واضح ہے کہ ادبی احساس سے معمور فلمیں بنائی جا رہی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی تعداد خاطر خواہ نہیں ہے، تعداد اور جنس کوئی بہت اہم مسئلہ ہے بھی نہیں۔غور وفکر کی بات یہ ہے کہ ہیرو ورشپ کے رومانی تصور، افلاطونی عشق اور ایکشن اور ان سب سے بڑھ کر جنسی بیہودگی نے انسان اور سماج کے درمیان ایک دوری پیدا کر دی ہے۔فنون لطیفہ کی طرح فلم بھی سماج سے ہی مواد حاصل کرتا ہے۔لیکن اس کی تعمیر وتخریب میں بھی یہ پیش پیش ہے۔سہراب مودی، محبوب خان، بلراج ساہنی، بی۔این سرکار، کے۔آصف، کے۔سی بوکاڈیا، کمال امروہوی، ستیہ جیت رے، سید مظفر علی اور مہیش بھٹ وغیرہ کی اسپرٹ کو اپنے فن میں تسلسل عطا کرنے والے کئی ہدایت کار عصری سنیما کو قوت بخش رہے ہیں۔لیکن آج کے گاؤں کی تصویر سے اکثر ہدایت کاروں کا کوئی سروکار نہیں ہے، فن کے حقیقی احساس کے تحفظ کے لیے ہدایت کاروں کو اس باب میں پیش قدمی کرنی

ہوگی۔ دیہی ہندوستان کا بلندی سے نظارہ کرنے کے بجائے ان کرداروں کی سائیکی میں اترنا نہایت ضروری ہے،فطرت سے مکالمہ کرنا ہے تو فنون لطیفہ کے لیے اس مٹی میں خاطر خواہ مواد ہے۔

ہندوستانی سنیما کی مین اسٹریم اور بعض علاقائی اسلوب کی فلموں کو ادبی احساس اور تر وتازگی عطا کرنے میں اُردو کے لسانی تناظرات کی اہمیت مسلم ہے۔دراصل ہندوستانی فلم کے رگ و پے میں اردو زبان وادب کا حسن اور اس کی حرارت روز اول سے موجود ہے۔’’عالم آرا‘‘(جوزف ڈیوڈ کے ڈرامہ’عالم آرا‘ پر مبنی پہلی بولتی فلم،۱۹۳۱ء) سے لے کر اب تک جتنی بھی فلمیں بنائی گئی ہیں،ان میں اردو کی لسانی جمالیات کے تناظرات کو(بیانیہ،مکالمہ،نغمہ اوران سب سے بڑھ کر تلفظ کی ادائیگی) ناظرین ملاحظہ کرسکتے ہیں۔یہاں ایک سوال فطری طور پر پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستانی فلموں کو’ہندی‘ سنیما کیوں کہا جاتا ہے۔جبکہ اس کے لسانی تنوع اور فطرت میں یہ خوبی موجود ہی نہیں ہے۔یہاں یہ بات خاطر نشان رہنی چاہیے کہ فلم کی شعریات حد درجہ عوامی ہوتی ہے۔پریم پال اشک بعض پہلوؤں کو روشن کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’اس امر کی جانب توجہ دلانی بھی بہت ضروری ہے کہ برٹش حکومت کے دوران بھی اگرچہ سینسر بورڈ کا اردو کے تئیں رویہ منافقانہ ہی رہا اور حکام اردو سرٹیفکٹ جاری کرنے سے کتراتے رہے اور اس کے بجائے ہندوستانی زبان کے نام پر فلم سرٹیفکٹ جاری کرتے رہتے تھے جبکہ ہندوستانی نام کی کوئی چڑیا کم از کم ہندوستان میں اڑتی نظر نہیں آتی تھی۔ یہ برٹش حکومت کی عوام کو بیوقوف بنانے کی ایک چال تھی۔ اس زمانے میں عوام کی زبان واضح طور پر اردو تھی یا ہندی۔ مشترک زبان یعنی ہندوستانی تو صرف ایک بولی تھی زبان نہیں اور فلموں کی زبان اردو تھی۔‘‘(13)

اشک نے اپنی Thesis میں بولی اور زبان کے فرق کو ملحوظ رکھ کر جو مقدمہ قائم کیا ہے،وہ ایک تلخ سچائی ہے۔مگر فلموں کے اسلوب اور مزاج دیکھ کر یہ عرض کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے کہ ہماری فلموں کو ہندوستانی (جس میں اردو کا حسن اکثر شامل ہے) ہی کہنا چاہیے،چوں کہ ٹھیٹ،ہندوستانی ماحول اور جدید لسانی صورت حال (انگریزی علاقائی بولی اور اردو) کے منظر نامہ میں ہندی نہ عوام کی زبان ہے اور نا ہی سنیما کی۔دراصل برٹش حکومت کا منافقانہ رویہ آج کے جمہوری نظام میں تعصب کا رنگ اختیار کرچکا ہے،اس لیے ہندوستانی اسلوب کی فلمیں ہندی کے نام پر پیش کی جارہی ہیں۔ندافاضلی کا یہ خیال بہت اہم ہے:

’’فلم انڈسٹری میں نہ کتابی اُردو چلتی ہے،نہ کتابی ہندی،فلموں نے عام آدمی کی زبان کو فروغ دیا ہے۔یہ زبان امیر خسرو اور کبیر سے چلتی ہوئی آرزو کی سریلی بانسری سے ملتی ہوئی ابن انشا اور ناصر کاظمی تک آتی ہے۔ان شعرا کے یہاں جو زبان ہے وہی زبان فلموں کی زبان ہے۔‘‘(14)

ندافاضلی نے دوسرے لفظوں میں یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ اُردو کی فطری ساخت نے عوام اور سنیما کے بیچ ایک پل کا کام کیا ہے۔دراصل ہندوستان کا فطری مزاج اس کا اُردو چہرہ ہی ہے۔

حوالہ جات:

The nature of narrative, Robert Scholes, oxford university press (1966) P82

☆کلیات منٹو2 سعادت حسن منٹو،لاہور،علم وعرفان پبلشرز2005 صفحات568۔

☆ایضاً،ص567-68

☆پبلک میٹنگ،سیدمظفر علی،ستلج ہاسٹل،جواہر لال نہرو یونیورسٹی،5/اپریل2009۔

☆کلیات منٹو سعادت حسن منٹو،علم وعرفان پبلشرز2005ص569۔

☆ایضاً،ص569۔

☆مہوا۔ٹی۔وی۔انٹرویو،روی کشن۔

☆کلیات منٹو2 سعادت حسن منٹو،لاہور،علم وعرفان پبلشرز2005ص570۔

☆ہندوستانی سنیما کے پچاس سال،پریم پال اشک،نئی دہلی،موڈرن پبلشنگ ہاؤس2000ص99۔

☆راشٹریہ سہارا،عزیز برنی (مدیر)،نئی دہلی،23/جنوری2010ص3۔

☆بزم سہارا،عزیز برنی (مدیر)،نئی دہلی،جنوری2010ص61۔

☆ذہن جدید،زبیر رضوی (مرتب)،نئی دہلی،شمارہ۔53ص160۔

☆ہندوستانی سنیما کے پچاس سال،پریم پال اشک،نئی دہلی،موڈرن پبلشنگ ہاؤس،2000ص143۔

☆بزم سہارا،عزیز برنی (مدیر)،نئی دہلی،جنوری2010ص61۔

☆☆☆

ہماری فلموں کا سیاسی شعور

پریم پال اشک (دہلی)

فلمیں ہمارے سماج، ہمارے ماحول اور ہماری ذہنی کیفیتوں کی صحیح نمائندگی کرتی ہیں۔ ان میں ہم اپنے ماضی، حال اور مستقبل کی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک کہانی بیک وقت ایک یا دو قارئین پر اپنا بالواسطہ اثر چھوڑ جاتی ہے۔ جب کہ ایک فلم ایک ہی بار ہزاروں تماشائیوں کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ اور کئی بار تو ایک فلم ہی پوری قوم کی کایا پلٹ کر رکھ دیتی ہے اور حاکمان وقت کے ایوانوں میں زلزلے بھی لے آیا کرتی ہے۔

اس کا سب سے پہلا ثبوت ہمیں ۱۹۲۸ء میں خاموش فلموں کے دور میں ملا۔ فلم تھی ''بامب''۔ اس کے ہدایت کار تھے۔ ایس۔ آر۔ چودھری۔ اس فلم میں ہندو مسلم اتحاد اور عوامی بیداری پر زور دیا گیا تھا اور گاندھی جی کے پیغام کو صحیح انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ اس فلم میں گاندھی جی کا رول ایک پارسی اداکار کاؤس جی مکندا نے ادا کیا تھا اور ہیروئن تھی سلوچنا۔

برطانوی حکومت اس فلم سے بوکھلا اٹھی اور اس پر پابندی عائد کر دی آخر اس فلم سے عوامی بیداری کے حامل مناظر نکال دینے پڑے اور اس کی جگہ مذہبی جذبات مشتعل کرنے والے مناظر نے لے لی۔ اس کے ساتھ ہی فلم کا نام بدل کر ''خدا کی شان'' عرف 'گلوری آف گاڈ' رکھ دیا گیا۔ فلم تو سنسر سے پاس ہو گئی لیکن کمپنی حکومت برطانیہ کی عتاب نگاہی کا شکار ہو گئی۔

اس کے ایک سال بعد جگدیش فلم کمپنی کے ساتھ تقریباً یہی کھیل کھیلا گیا۔ فلم تھی ''امر کیرتن''۔ اس کے ہدایت کار تھے جینت ڈیسائی۔ اس فلم میں باردولی تحریک کی عکاسی کی گئی تھی۔ اسی طرح بولتی فلموں کے دور میں ایسے ایسے ہدایت کار آئے جنہوں نے حق بات بہ بانگ دہل کہنے پر کبھی خوف محسوس نہیں کیا۔ ان میں محبوب کا نام سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔ اس کی ایک ہی فلم ''روٹی'' نے ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا جس سے برٹش سامراج کی بوسیدہ دیواریں ہل گئی تھیں۔

اس سے قبل ۱۹۳۷ء میں ایک فلم ''دی ریتھ'' آئی تھی۔ اس فلم پر بھی پابندی صرف اس لئے لگائی گئی

تھی کہ اس کے ہیرو کی شکل گاندھی جی سے مشابہ تھی۔

آج کے دور میں قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کو سیاسی بیداری کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے۔ پورے ملک کو ایک لڑی میں پرونے اور سیاسی استحکام کا خواب شانتا رام کے ساتھ ساتھ موہن سہگل۔ بی۔ آر۔ چوپڑہ۔ خواجہ احمد عباس پرمود چکرورتی۔ ایم۔ ایس۔ سیتھیو نے دیکھا اور انہوں نے فلم ''پڑوسی''، ''تین بتی چار راستہ''، ''نئی دہلی''، ''ہمارا گھر''، ''دھرم پتر''، ''جہاں پیار ملے'' اور ''گرم ہوا'' جیسی خوبصورت اور صحت مند فلمیں بنا کر اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کر کے دکھایا۔

ہم نے جن کوششوں سے آزادی حاصل کی ہے ہمارے نوجوان بھارت ماتا کی آن اور مریادہ پر جس طرح ہنستے ہنستے تختۂ دار پر جھول گئے اور گولیاں اور لاٹھیاں کھا کھا کر بھی ظلم و تشدد کی پروا کئے بغیر اپنی منزل پر مستانہ وار جس طرح آگے بڑھتے رہے اس کی مثال ہندوستان کی پوری تاریخ میں ملنی محال ہے۔

ہماری فلموں میں اسی دور کی عکاسی کے ساتھ ساتھ اس عہد کی سیاسی قدریں بھی ہمارے سامنے ابھر کر آتی رہیں۔ ان میں سہراب مودی، محبوب، رمیش سہگل، نتن بوس، ہیمن گپتا، بمل رائے، پال زلز، للت مہتہ، دتا دھرم ادھیکاری، شانتا رام، لیکھ ٹنڈن، شری رام شرما، کیدار شرما اور مرنال سین جیسے ذہین اور تجربہ کار ہدایت کاروں نے جھانسی کی رانی، ایک ہی راستہ، وطن، شہید (پرانی) سمادھی (پرانی) مشعل، سن بیالیس، آندولن (پرانی) ہمراہی، آزادی کی راہ پر، آزاد ہندوستان، زلزلہ، شوخیاں، آنند مٹھ، سنگھ گڑھ، شہید (نئی) سبھاش چندر بوس، بندنی، آندولن (نئی)، اور مرگیہ جیسی فلمیں پیش کر کے ہمارے فلم بینوں میں سیاسی بیداری کی دتا دھرم ادھیکاری نے 'مہاتما' اور ول آ ہو جانے للت سہگل کے ایکانکی ڈرامہ 'بتیا ایک آ کار کی' پر مبنی ایک انگریزی فلم 'فایو پاسٹ فایو میں' گاندھی جی کی زندگی اور ان کے فلسفۂ حیات کو نہایت موثر انداز سے پیش کیا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ہماری فلموں میں ایک ایسا عنصر بھی شامل ہو گیا جس نے ذہین فلم سازوں اور ہدایت کاروں کی ہر کوشش پر پانی پھیرنے کی ناکام کوشش کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اگر کسی ہدایت کار فلمساز نے کوئی فلم بنانے کا اعلان کیا تو چند پست ذہنیت کے فلمساز ہدایت کاروں نے کم مدت میں مہارانی جھانسی، شہید اعظم، بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد، اور نیتا جی سبھاش چندر بوس جیسی لچر، بے ہودہ اور نوٹنکی ٹائپ فلمیں تیار کر ڈالیں۔ ۱۹۷۵ء میں راج ہنس کھنہ کی فلم 'جیون سنگرام' بھی کسی نوٹنکی نما سٹنٹ فلم سے

کسی درجہ کم نہ تھی۔ اس طرح ایسے فلمسازوں نے محنتی اور دیدہ ور ہدایت کار فلمسازوں کی ساکھ بگاڑنے کی کوشش کی۔ لیکن انہیں ہر قدم پر منہ کی کھانی پڑی سورج گہرے بادلوں میں چھپ جانے کے باوجود آسمان کا سینہ چیر کر اپنی روشنی دنیا تک پہنچا ہی دیا کرتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ کلکتہ کے نیو تھیٹرز کے ذکر کے بغیر یہ مطالعہ ادھورا رہے گا۔ فلم 'چندر شیکھر' میں سراج الدولہ کے عہد کے ایک ہندو راجہ اور انگریزوں کے مقابلے اور فلم سبیہ ساچی میں ایک انقلابی کی زندگی پیش کی گئی تھی۔

علاوہ ازیں انڈین پیپلز تھیٹرز ایسوسی ایشن نے چھٹے دہے میں ایک چھوٹی سی مگر بہت بڑی اور خوبصورت فلم لال بتی بنائی تھی۔ اس کے ہدایت کار بلراج ساہنی تھے۔ اور ہیرو بھی وہی تھے۔ ان کی زیر ہدایت بننے والی یہ پہلی اور آخری فلم تھی اس فلم میں تحریک آزادی کا ایک باب نہایت موثر انداز سے پیش کیا گیا تھا۔ ہدایت کار نے کہانی کی گرفت کو کہیں ڈھیلا نہیں چھوڑا۔ اس کا اسکرین پلے نہایت چست تھا اور فلم میں بلا کا سسپنس تھا۔

آئے دن رونما ہونے والے نت نئے سیاسی واقعات نے بھی ہمارے دانشمند فلمسازوں اور تجربہ کار ہدایت کاروں کو بڑھ چڑھ کر متاثر کیا۔ اور انہوں نے چونکا دینے والی کیفیتیں پیدا کیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ہمارے تماشائیوں میں بے پناہ سیاسی بیداری پیدا کی۔ ۱۹۰۳ء میں 'دلی دربار' پر مبنی ایک شارٹ فلم آئی تھی۔ ۱۹۱۰ء میں 'دلائی لامہ' پر ایک شارٹ فلم تیار کی گئی تھی یہ بھارت کی اوّلین سیاسی فلم تھی۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران غلامی' پنا' گاؤں کی گوری' بدلتی دنیا اور لال حویلی جیسی فلمیں آئیں۔ جن میں جنگ کا پراپیگنڈہ کیا گیا تھا۔ اس دوران ترکی کے مصطفٰے کمال پاشا کے کارناموں پر مبنی ایک فلم کمال پاشا بھی آئی تھی۔

ملک کی آزادی کے بعد بھی ہماری فلموں پر جنگ کا اثر برقرار رہا اور برما چھوڑ کر بھارات آنے والے ہندوستانیوں کے موضوع پر فلمستان نے ایک باکس آفس سپر ہٹ فلم شبنم بنائی تھی۔ اس فلم کی یوں تو کوئی خاصیت نہ تھی لیکن قمر جلال آبادی کے گیت اور ایس۔ ڈی۔ برمن کا سنگیت لاجواب تھا۔ علاوہ ازیں دلیپ کمار اور کامنی کوشل کے ساتھ ساتھ جیون نے شاندار اداکاری کی تھی۔

جنگ کا اثر ہماری فلموں پر اس حد تک برقرار رہا کہ بمل رائے نے چندر دھر گلیمری کی شہرۂ آفاق کہانی ''اس نے کہا تھا'' پر مبنی اس نام سے ایک فلم بنا ڈالی۔ اس میں پہلی عالمی جنگ میں بھرتی ہونے والے ایک سکھ سپاہی کی داستانِ محبت اور جذبۂ ایثار کی عکاسی کی گئی تھی۔ فلم کا ہیرو سنیل دت اور ہیروئین نندہ تھی۔ لیکن یہ فلم ناکام رہی۔

اس کے بعد نوکیتن کے لئے امرجیت نے فلم ''ہم دونوں'' بنائی۔ اس میں دیو آنند، سادھنا اور نندہ تھے۔ دیو آنند نے دوسری عالمی جنگ میں خدمات انجام دینے والے دو فوجی افسروں کے کردار نہایت خوبصورت انداز سے ادا کئے تھے اور اس نے ڈبل رول ادا کیا تھا۔ فلم کے موسیقار جے دیو تھے اور گیت ساحر کے تھے۔ یہ فلم ہر اعتبار سے کامیاب رہی۔

علاوہ ازیں دوسری عالمی جنگ کی عکاسی راما نند ساگر نے اپنی فلم ''للکار'' میں بھی کی تھی۔ لیکن فلم بری طرح پٹ گئی۔

ملک آزاد ہوا تو اس کے ساتھ ہی تقسیم کا ہولناک سانحہ بھی رونما ہوا۔ اس موضوع پر جیمنی دیوان کی ایک حقیقت آمیز فلم ''لاہور'' آئی تھی۔ اس میں تقسیم وطن کی تلخی کو نہایت موثر انداز سے پیش کیا گیا تھا۔ اور دکھایا گیا تھا کہ اگر جذبے صادق ہوں تو نہ کوئی ہندو ہندو رہتا ہے نہ مسلمان مسلمان۔

آزادی کے بعد ملک کو حیدرآباد، کشمیر اور گوا کی لڑائیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ علاوہ ازیں چین اور پاکستان سے تین بڑی جنگیں لڑنی پڑیں۔ اوّل الذکر لڑائیوں سے متاثر ہو کر ایس۔ ایم۔ یوسف نے 'حیدرآباد' بنائی۔ وینا اور الناصر کی فلم 'کشمیر' گوا کی لڑائی کے موضوع پر ''تو ہی میری زندگی'' اور خواجہ احمد عباس کی فلم 'سات ہندوستانی' جیسی خوبصورت اور دلکش فلمیں آئیں۔ ان سے ہمارے فلم شائقین کو دعوت فکر و نظر بھی ملی۔

اس کے ساتھ ہی چند موقع پرست خود غرض اور پست بورژوا ذہنیت کے حامل فلمساز ہدایت کاروں نے ہماری سیاسی تحریکات کا مذاق اڑاتے ہوئے بھونڈے مذاق، سیکس اور پھوہڑ قسم کی ڈائریکشن سے صرف سستی شہرت، حاصل کرنے اور اپنی جیبیں گرم کرنے کے جذبے کو ہی اپنا شعار بنا لیا۔ ''جوہر محمود ان گوا''۔ ''جوہر ان کشمیر'' آگے بڑھو (جے بنگلہ دیش) جیسی چوتھے درجے کی گھٹیا۔ لچر بے ہودہ اور واہیات فلمیں بنا کر جہاں اپنی ذہنی پستی کا ثبوت دیا وہیں ذہین اور تعلیم یافتہ فلم بین طبقے کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کی بھی کوشش کی۔

لیکن ہمارے فلم بینوں نے فریب ومکر کے اس شیشے کو پاش پاش کردیا۔یعنی ایسے فلم پروڈیوسر ڈائریکٹر کی فلم ''جوہر محمود ان گوا'' کے سوا اور کوئی فلم نہیں چلی۔

جب چینی حملے پر مبنی فلم ''حقیقت'' آئی تو یہ ثابت ہوگیا کہ جینیس جینیس ہی ہوتا ہے۔یہی مثال چیتن آنند پر صادق آتی ہے۔انہوں نے اس فلم سے یہ ثابت کردیا کہ ایک ذہن ہدایت کار اپنی ذہانت کے بل بوتے پر صحرا میں گل کھلانے سے کبھی نہیں چوکتا۔'حقیقت' بھارت میں تیار ہونے والی پہلی جنگی فلم تھی۔چینی حملے پر مبنی دو فلمیں اور آئیں ''پھول بنے انگارے'' اور ''شطرنج'' لیکن یہ دونوں فلمیں بری طرح پٹ گئیں۔

فلمساز ہدایت کار جے اوم پرکاش کی فلم امن اور مشہور افسانہ نگار اور ہدایت کار و یدراہی کی فلم دراڑ میں جنگ کے بعد رونما ہونے والے اثرات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔امن میں دوسری عالم جنگ میں جاپان پر گرائے گئے ایٹم بم کے اثر اور دراڑ میں ۱۹۶۵ء کی بھارت پاکستان جنگ کے بعد کے اثرات کی عکاسی کی گئی تھی۔ امن زیادہ موثر ثابت نہ ہوئی۔کیونکہ ۱۹۴۵ء کے قریب شانتارام کی اس سے بہتر فلم ''ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی'' آچکی تھی۔جوشولا پور کے ڈاکٹر دوارکا داس کوٹنس کی داستانِ حیات پر مبنی تھی۔اس میں ہندوستانی ڈاکٹر دوسری عالمی جنگ میں چینیوں کو ڈاکٹری امداد بہم پہنچانے چین جاتا ہے کیونکہ وہاں مہاماری (چیچک) پھیلی ہوئی تھی۔ وہیں مرگی کی وجہ سے اس کی موت ہوجاتی ہے فلم امن ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی کا ہو بہو چربہ تھی۔

جنگی فلموں کا تذکرہ چل رہا ہے تو دو تین مزید جنگی فلمیں بھی قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کی نمائندگی دارا سنگھ نے اپنی فلم ''میرا دیش میرا دھرم'' میں کی اور بنگلہ دیش کی تحریک آزادی پر روشنی ڈالی۔اس کوشش میں اس نے کافی حد تک اخلاص اور صدق دلی کی مثال پیش کی۔ ۱۹۷۴ء میں فلمساز ہدایت کار چیتن آنند کی فلم ''ہندوستان کی قسم'' آئی۔یہ فلم فارمولہ بازی کی شکار ہوگئی۔ اس لئے یہ فلم ''حقیقت'' کا مقابلہ نہ کرسکی۔

۱۹۷۳ء میں نیفا کے چند قبائلی بغاوت پر آمادہ ہوئے تو ایک فلم ''یہ گلستاں ہمارا'' آئی۔اس فلم کی کہانی فرضی تھی اور حقیقت سے دور۔

۱۹۷۴ء میں فلمساز ہدایت کار جے اوم پرکاش کی فلم ''آکرمن'' آئی۔یہ فلم ۱۹۶۵ء کی بھارت پاکستان جنگ پر مبنی تھی۔فلم ہر اعتبار سے ناکام رہی۔

طلباء میں بے چینی اور انہیں سیاست کی دلدل میں دھکیلنے کے خلاف دو بہت زوردار فلمیں ''نئی عمر کی نئی فصل'' اور گلزار کی ''میرے اپنے'' آئیں ''میرے اپنے'' مشہور بنگلہ فلم ''اپن جان'' کا چربہ تھی۔ان دونوں فلموں میں طلباء کی بے چینی اور انہیں سیاست کی وادیٔ خارزار میں دھکیلے جانے کے نتائج بڑے موثر انداز سے پیش کئے گئے تھے اور انہیں سچے، ایماندار اور وفا شعار شہری بننے پر زور دیا گیا تھا۔

لیڈروں کے داؤ پیچ' ہتھکنڈوں اور انتخاب کی اسٹنٹ بازی کی صحیح عکاسی مسٹر سمپت 'جہاں پیار ملے' گلزار کی فلم ''آندھی'' اور امرت ناہٹہ کی فلم ''قصہ کرسی کا'' میں بڑے فنکارانہ ڈھنگ سے کی گئی تھی۔خاموش فلموں کے دور میں ۱۹۲۹ء میں اس موضوع پر پہلی فلم میونسپل الیکشن آئی تھی۔'قصہ کرسی کا' ہندوستانی فلم انڈسٹری کی پہلی فلم تھی جس نے سیاسی داؤ پیچ میں آنکھ کھولی۔

ڈاکوؤں سے ہتھیار ڈلوانے کے مسئلے کو سماجی روپ دیا دلو با بھاوے نے اور اس پر سیاست کی چاشنی چڑھائی جے پرکاش نارائن نے لیکن اس مسئلے کو فلم کے سانچے میں ڈھالا راج کپور نے اس نے اس تحریک کی روح تک پہنچنے کی کوشش کی۔اسے صحیح معنوں میں سمجھا اور اسے پردۂ سیمیں پر فلم ''جس دیش میں گنگا بہتی ہے'' کے روپ میں پیش کیا۔کیا فوٹوگرافی' کیا ڈائریکشن' کیا مکالمے ہر زاویۂ نگاہ سے یہ ایک قابل ستائش کوشش کی تھی۔

سماج واد ہمارے فلم پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں کا ایک محبوب موضوع رہا ہے۔غریب گھر کی لڑکی یا امیر گھر کا لڑکا یا اس کے برعکس دونوں آپس میں پریم لیلا رچاتے ہیں۔والدین کو چھوڑ کر علیحدہ راہ پر چلنے لگتے ہیں۔آخر والدین پشچا تاپ کے اتھاہ ساگر میں ڈوب جاتے ہیں۔یہ موضوع ہمارے پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں کو اپنے مایا جال میں پھنساتا رہا ہے یا دوسری طرف گاؤں کے ظالم اور سود خور زمیندار کا مقابلہ ان پڑھ اور بھولے بھالے کسانوں سے ہوتا رہا ہے۔سماج واد کے موضوع کو چھوتی ہوئی اس مرکزی خیال پر اب تک لاتعداد فلمیں بن چکی ہیں۔ان میں محبوب اور ضیا سرحدی کی سیاسی بیداری ابھر کر سامنے آتی رہی ہے۔

اس سلسلے میں ان کی ہر کوشش قابل تعریف تھی۔محبوب کی 'عورت' اور اس کا نیا روپ 'مدر انڈیا' اور 'روٹی' نے محبوب کو ایک عہد آفریں شخصیت بنا دیا اور دوسری طرف فلم ڈائریکٹر ضیا سرحدی نے ہماری

فلموں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے اور ہمارے فلم بینوں کو باشعور کرنے کے سلسلے میں جو قدم اٹھایا اس نے ایک تاریخ ساز حیثیت اختیار کر لی۔ ضیا سرحدی کی جو دو فلمیں اشتراکیت کی تحریک کو آگے بڑھانے میں پیش پیش رہیں وہ تھیں ''ہم لوگ'' اور ''فٹ پاتھ''۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ضیا سرحدی گھبرا کر پاکستان نہ بھاگ جاتے تو آج یہ متوازی سینما کے جنم داتا ہوتے۔

اگر یہاں خواجہ احمد عباس کا ذکر نہ کیا جائے تو موضوع سے ناانصافی ہوگی۔ انہوں نے ہماری فلموں میں سوشلزم کی صحیح تصویر پیش کی۔ فلم ''دھرتی کے لال'' میں انہوں نے غریب اور بھوکے بھارت کی بدحالی کی عکاسی کی تو فلم ''منا'' میں غریبی میں پھنسے ایک معصوم بچے کے جذبات پیش کئے۔ جب انہوں نے فلم ''پردیسی'' بنائی تو بھارت روس دوستی کا ایک نیا باب کھلا۔ بھارت اور روس کے اشتراک سے تیار ہونے والی یہ پہلی ہندوستانی فلم تھی۔ اس سے جہاں ہندوستانی اور روسیوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملا وہاں آپس میں ہمارے سیاسی تعلقات اور بھی مضبوط ہو گئے۔ ادھر فلم ''آسمان محل'' میں انہوں نے ہمارے بورژوا طبقے کے تاناشاہی ملبے سے سماج وادی نظام کی بنیاد ڈالی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان کی ہر فلم کا ہر کردار عوام کا نمائندہ تھا۔

اس کے ساتھ ہی فلم ڈائریکٹر بمل رائے کی صرف ایک فلم ہندوستان کی پوری فلم تاریخ پر بھاری نظر آتی ہے۔ انہوں نے فلم ''دو بیگھہ زمین'' میں ہمارے دبے کچلے کسان بھائیوں کی زندگی اور کردار کی صحیح تصویر پیش کر دی تھی۔

۱۹۷۵ء میں بلیز ایڈورٹائزنگ کی طرف سے شیام بنیگل کی زیر ہدایت بڑی خوبصورت اور جاندار فلم ''انکور'' آئی۔ شیام بنیگل کی یہ فلم اس کے اعلیٰ سیاسی شعور کی ترجمان تھی۔ اسی ایک فلم کے باعث اس کا شمار صف اوّل کے ہدایت کاروں میں ہونے لگا۔ موضوع اور اس کے ٹریٹمینٹ دونوں اعتبار سے فلم انکور کے ہر ایک فریم میں ہدایت کار نے اپنی سوجھ بوجھ، دیدہ وری اور اپج کا ثبوت دیا ہے۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ دبا کچلا مزدور طبقہ کس طرح زمینداری نظام کے ظلم و ستم برداشت کرتا ہے اور کس طرح بغاوت کا انکور پھوٹتا ہے۔ اس فلم میں شبانہ اعظمی، سادھو مہر، اننت ناگ سب نے اپنا اپنا رول بخوبی انجام دیا تھا۔ خاص طور پر شبانہ اعظمی نے اپنی پہلی فلم میں ہی ذہن کا ایک ایک تار جھنجھنا دیا تھا۔ فلم کیا تھی صحیح معنی میں ترقی پسند شاعری تھی۔ اس کے ایک سال بعد شیام بینیگل کی ایک اور فلم ''نشانت'' آئی۔ اصل میں یہ ''انکور'' کی

دوسری کڑی تھی۔ جس میں انقلاب کا مکمل تصور پیش کیا گیا تھا۔

ہماری فلموں میں کارخانہ داروں، مل مزدوروں کے جھگڑوں اور ان کے مسائل کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ ۱۹۳۴ء میں پریم چند کی کہانی مل مزدور پر مبنی فلم ''مل مزدور'' آئی۔ یہ ایک ناکام ترین کوشش تھی۔ اچھی خاصی کہانی کو چوں چوں کا مربّہ بنا دیا گیا تھا۔ آخر پریم چند جی کو فلمی دنیا سے مایوس ہو کر علمی دنیا میں لوٹ آنا پڑا۔

آزادی سے قبل محبوب کی فلم ''روٹی'' میں بھی مل مالکوں کی سرمایہ دارانہ ذہنیت اور مزدوروں کے ٹوٹتے ہوئے رشتوں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

آزادی کے بعد جیمنی کی فلم 'پیغام' آئی۔ یہ فلم ہمارے تماشائیوں کے لئے سوشلزم کا صحیح پیغام لے کر آئی۔ لیکن سوشلزم کی ان کڑوی گولی پر باکس آفس کی چاشنی چڑھا دی گئی۔

باکس آفس کی چاشنی کی گہری پرت چڑھی تھی رشی کیش مکرجی کی فلم ''نمک حرام'' پر مشہور انگریزی فلم بیکٹ کا ہندوستانی روپ تھا۔ اس میں کارخانہ داروں اور مزدوروں کے جھگڑوں کو رشی کیش مکرجی نے مخصوص انداز سے پیش کیا تھا۔ اس میں گلزار کے زوردار مکالموں کے ساتھ اوم شیو پوری، رضا مراد، امیتابھ بچن اور راجیش کھنہ نے یادگار رول ادا کئے تھے۔ خاص طور پر امیتابھ بچن نے تو ایک ایک فریم میں اپنی شخصیت کے نقوش چھوڑے تھے۔

اس کے بعد تاپن سنہا کی فلم ''سگینہ'' آئی۔ اس میں بھی کمیونزم اور خاص طور پر مارکسزم کا نظریۂ حیات پیش کیا گیا تھا۔ موضوع کے اعتبار سے تو فلم جاندار تھی مگر تاپن سنہا باکس آفس کے چکر میں پھنس گئے اور دلیپ کمار کی بے جا دخل اندازی کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ فلم فلاپ ہوگئی۔ نئی لہر یا متوازی سینما کے پروردہ فلمساز اور ہدایت کار بھی سیاسی موضوعات خاص طور پر سوشلسٹ موضوع فلمانے میں کسی طرح پیچھے نہیں رہے۔ ارون کول کی نئی فلم ''ایک ادھوری کہانی'' میں ایک مل مالک کی دھوکہ دھڑی۔ لالچ۔ عیاری اور مزدور کی بے بسی کو بڑے حسن اور دلفریب انداز سے پیش کیا گیا تھا غالباً یہ ارون کول کی پہلی ہندی فلم تھی۔ لیکن بہت خوب تھی۔ امید ہے ان کا یہ پہلا قدم آخری قدم ثابت نہ ہوگا۔ بلکہ وہ اس صحرا میں نئے گل کھلاتے رہیں گے۔

جب ہدایت کار اور فلمساز مذکورہ موضوعات سے اکتا کر گھبرا جاتے ہیں تو وہ کاسٹیوم فلموں میں آ کر پناہ لیتے ہیں۔ بے وقوف اور ظالم راجہ، عیار وزیر، ان دونوں میں سے کسی کی لڑکی، بے بس اور مظلوم عوام کا بہادر،

جیالا نمائندہ‘ راجہ یا وزیر کی لڑکی سے اس کا معاشقہ حکومت کے خلاف عوام کی بغاوت۔ آخر میں راجہ یا وزیر کا عوام کے اس نمائندے کے ہاتھوں قتل اور جمہوری نظام کا قیام یہی زاویہ نگاہ ہماری کاسٹیوم فلموں میں پیش کیا جاتا رہا ہے خواہ یہ آردیشر ایرانی کی ’عالم آرا‘ ہو یا ورما فلم کی بادل محبوب کی آن ہو یا جیمنی کی چندرلیکھا‘ نشان‘ یا ’منگلا‘ واہنی فلمز کی ’ایک تھا راجہ‘ ہو یا پسی فلمز کی ’شہنشاہ چاٹ مصالحہ سب کا ایک ہے فلم چاہے من موہن ڈیسائی کی ’دھرم ویر‘ دیکھئے یا پرمود چکرورتی کی ’آزاد‘ کوئی فرق نہیں پڑتا۔

بہر حال راج محلوں کی سیاسی چالوں اور سازشوں کو سمجھنے کا واحد ذریعہ یہی کاسٹیوم فلمیں ہیں۔ تبھی تو کہتے ہیں کہ ہر ایک فلم ساز اور ہدات کار کی پہلی اور آخری فلم تخلیق کاسٹیوم فلم ہی ہوا کرتی ہے۔ اکثر یہی بات بچے اور بوڑھے تماشائیوں پر بھی پوری اترتی ہے۔

☆☆☆

بنگال میں ہندی سنیما: ابتدا اور ترقی

ڈاکٹر خالدہ حسینی

پرانے زمانے میں خاموش فلمیں دکھائی جاتی تھیں اور پردے پر تصویر دکھلانے کے ساتھ ساتھ پس پردہ بولنے کا رواج تھا۔ عوام کی تفریح اسی طرح ہو جاتی تھی۔

کلکتہ میں پہلے پہل فلمی صنعت کی طرف توجہ دینے والوں میں جے ایف میڈن، جی این گنگولی اور پی این سرکار تھے۔

۱۹۲۳ء میں میڈن صاحب نے ٹالی گنج میں ایک فلم اسٹوڈیو قائم کیا جس کا نام ’’میڈن اسٹوڈیو‘‘ رکھا۔ یہیں سے پورے بنگال اور ملک میں فلم کی اشاعت کے لئے ایک نئی تحریک کی ابتداء ہوئی۔ اس تحریک کو آگے بڑھانے میں ’’اندراپوری اسٹوڈیو‘‘ کا نام سرِ فہرست تھا۔ ویسے جے ایف میڈن ہی کو جدید فلم کا جنم داتا کہا جاتا ہے۔

میڈن تھیٹر بننے کے بعد پی این گنگولی نے بارانگر میں ایک اور اسٹوڈیو بنایا۔ اس کا نام ’’ایم پی اسٹوڈیو‘‘ رکھا گیا۔ ۱۹۳۱ء میں جی این سرکار نے ’’نیو تھیٹر‘‘ نامی ایک تیسرا اسٹوڈیو ٹالی گنج کے چنڈی تلہ میں کھول دیا۔ اس کے بعد انور شاہ روڈ پر ’’کالی فلم اسٹوڈیو‘‘ قائم کیا گیا‘ جواب حکومتِ بنگال کے زیر سرپرستی ہے۔ اس کا تبدیل شدہ نام ٹیکنیشین ۲ ہے۔ اس میں کام کرنے کے لئے دو فلور متعین کر دئے گئے ہیں اور اسی میں کچھ گنجائش نکال کر حکومتِ مغربی بنگال نے سنگیت اکیڈمی قائم کر دی ہے۔

’’کالی فلم اسٹوڈیو‘‘ بننے کے بعد ہی ’’کالکا فلمز‘‘ نام سے ایک اور اسٹوڈیو قائم ہوا۔ ۱۹۵۲ء میں ٹیکنیشین اسٹوڈیو پرائیوٹ لمیٹیڈ کے نام سے اس کا تعارف ہوا۔ اسی اسٹوڈیو میں ستیہ جیت رے نے اپنی پہلی فلم ’’پاتھر پانچالی‘‘ بنائی تھی۔ اس میں شوٹنگ کے لئے تین فلور ہیں۔

اس کے بعد کچھ نئے اسٹوڈیو بھی قائم ہوئے۔ بابو لال چوکھریا نے ’’نامینا تھیٹر‘‘ کے پاس پرنس انور شاہ روڈ پر ’’بھارت لکشمی اسٹوڈیو‘‘ کے نام سے ایک اسٹوڈیو بنوایا۔ اس کے بعد ’’ایم پی اسٹوڈیو‘‘ کی دوسری طرف ’’نیشنل اسٹوڈیو‘‘ قائم ہوا۔ اسی وقت تلجلہ میں ’’ایور گرین اسٹوڈیو‘‘ پھر بہالا میں کے سی فلمز اور پرنس انور شاہ روڈ پر بابو لال چوکھریا کا ’’بھارت لکشمی اسٹوڈیو‘‘ بنا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے اسٹوڈیو بنے اور بند

ہوگئے۔لیکن فی الحال جوموجود ہیں ان میں ''رادھا فلم اسٹوڈیو'' کا نام بہت اہم اور یادگار ہے' کیونکہ وہیں سے کلکتہ دوردرشن نے ۱۹۷۵ء میں اپنا کام شروع کیا تھا۔

اسٹوڈیو کے علاوہ اس دور میں جو اہم فلم لیبوریٹریاں بنیں ان میں ''اروڑا اسٹوڈیو لیبوریٹری (جو آج مدالیے ۱۔۲ بلرام گھوش روڈ پر ہے)''فلم سروس اور چنڈی گھوش روڈ پر'' انڈین فلم لیبوریٹری پرائیوٹ لیمیٹیڈ ہے'' اس میں کچھ تو آج بند پڑی ہیں۔اس کے علاوہ حکومتِ مغربی بنگال نے ''رویابن'' نام سے ایک لیبوریٹری ٹیکینشین ۱ کے اندر بنوائی ہے۔

کلکتے میں پہلی ہندی فلم ''چا بک والی'' ۱۹۳۱۔۱۹۳۲ء میں بھارت لکشمی پروڈکشن کے تحت میڈن تھیٹر میں بنی۔یہ فلم بنیادی طور سے گیتوں پر مبنی تھی۔اس کے علاوہ ۱۹۳۳ء میں نیوتھیٹر اسٹوڈیو کے بینر تلے ایک فلم ''پران بھگت'' تیار ہوئی۔اس فلم کے پروڈیوسر دیو کی بوس تھے۔اور خاص اداکار پہاڑی سانیال'اور اُوماششٹی اور کے سی دے تھے۔اس کے بعد پروڈیوسر نیتن بوس نے ''چنڈی داس'' نام کی ایک فلم بنائی۔نثار اور مختار بیگم نے اس میں اصل کردار نبھایا تھا۔اس کے علاوہ کندن لال سہگل اور اوماشسٹی چنڈی تھیں۔

تیسری دہائی میں جو مشہور فلمیں بنیں وہ پرنس کی ہدایت کاری میں بنی فلم ''دیوداس'' تھی۔یہ فلم نیوتھیٹر میں بنی تھی۔کندن لال سہگل اور جمنا داس اس کے خاص اداکار تھے۔پروڈیوسر نیتن بوس نے نیوتھیٹر کے بینر تلے پہاڑی سانیال، اوماششٹی اور کے سی دے جیسے فن کاروں کو لے کر ''دھوپ چھاؤں'' جیسی فلم بنائی۔

پرفلا گھوش کی ہدایت اور رادھا رمن بھٹا چاریہ کے سنگیت کے ساتھ ساگر کمپنی کی سرپرستی میں ''ابوالحسن'' فلم بنی۔ہادی، بیجو'اور شہزادی اس میں خاص اداکار تھے۔انہی کی ہدایت اور اس کمپنی کی سرپرستی میں ''ویرابھیمنو'' فلم بنی تھی۔

۱۹۴۱ء میں فنی مجمدار کی ہدایت اور نیوتھیٹر کی سرپرستی میں ''ڈاکٹر'' نام کی ایک فلم بنی۔اس فلم کو اچھی خاصی شہرت حاصل ہوئی تھی۔اس میں پنکج ملک، پتا اور اندرا چودھری خاص اداکار تھے۔اس بینر تلے بمل رائے کی ہدایت میں ۱۹۴۴ء میں ''ہمراہی'' بنی جس میں خاص اداکار رادھا رمن بھٹا چاریہ اور رتنا بوس وغیرہ تھے۔یہ فلم بھی اس زمانے میں خوب مشہور ہوئی تھی۔

اس کے بعد فلم ساز کارتک چٹرجی نے ملینا دیوی اور شنکر کو لے کر ''چھوٹا بھائی'' نام کی ایک فلم

بنائی۔۱۹۴۶ء۔۱۹۴۵ء کے دوران پروڈیوسر سُشیل مجمدار نے کانن دیوی اور جوہر گنگولی کو لے کر ''ہاسپٹل'' نام سے ایک فلم کا کام شروع کیا۔اس کے بعد پرمتھیس بروا نے اپنی ہدایت میں فلم ''جواب'' بنائی۔پرستھیس بروا، کانن دیوی اور جمنا وغیرہ اس فلم کے خاص اداکار تھے۔اس دوران اسیت برن اور بھارتی دیوی کو لے کر فلم ''واپس'' بنائی گئی۔اس وقت اور بھی فلمیں بنیں جو مشہور بھی ہوئی تھیں ان میں ایک فلم ''غریب کی توپ'' تھی۔اس کے ڈائرکٹر اور ہیرو بیہول داس پنچولی تھے اور رام پیاری ہیروئن تھیں۔اس کے علاوہ پنچولی ہی کی ہدایت میں ''انصاف کی توپ'' تقدیر کی توپ' سیوک اور ''پرتی پوجا'' نام کی فلمیں بنی تھیں۔جن میں انہوں نے خود اداکاری بھی کی تھی۔

پھر ۱۹۵۱ء میں پروڈیوسر کارتک چٹرجی نے وسنت چودھری اور اروندھتی دیوی کو لے کر ''بانترک'' نام سے ایک فلم بنائی اور دیو کی بوس نے ابھی بھٹا چاریہ اور انو بھا گیت کو لے کر فلم ''رتن دیپ'' پروڈیوس کی۔

چھٹی دہائی میں کلکتہ اسٹوڈیو کو فلم سازی میں ایک بڑا دھچکا لگا لیکن ساتویں دہائی میں کچھ اچھی فلمیں بنیں۔ان میں اسیت سین کی ہدایت میں بنی فلم ''ممتا'' بھی تھی۔اس میں سنجیو کمار اور سُچترا سین نے کام کیا تھا۔اسی دہائی کے آخر میں مرنال سین نے اپنی ہدایت میں ''بھوون شوم'' بنانا شروع کیا۔اتپل دت اور سہا سین مولے اس کے خاص اداکار تھے۔اس کے بعد تپن سنہا نے اپنی مشہور فلم ''سفید ہاتھی'' بنائی۔

آٹھویں دہائی میں کچھ اور آرٹ فلمیں بھی بنیں جیسے ''شطرنج کے کھلاڑی'' کو ستیہ جیت رے نے ڈائرکٹ کیا تھا۔یہ فلم ۱۹۷۱ء میں بنی تھی۔''شطرنج کے کھلاڑی'' ایک لحاظ سے انوکھی اور رائے کی واحد ہندی فلم ہونے کی وجہ سے خاص مقبول ہوئی۔تپن سنہا کی ہدایت اور اتّم کمار، شرمیلا ٹیگر اور اتپل دت کی اداکاری سے مشہور فلم ''امانش'' بنی۔یہ سچ ہے کہ اس دور میں جو فلمیں بنیں وہ اپنی پُر زور کہانی اور خوبصورت اداکاری سے خاصی مشہور ہوئیں۔ان کے علاوہ بھی اس وقت کافی فلمیں بننی شروع ہوئی تھیں۔لیکن وہ مکمل نہ ہوسکیں۔ہدایت کار مرنال سین کی ''کھنڈر''، جینیسس، ایک ادھوری کہانی، ایک دن اچانک اور مرگیہ جیسی فلمیں بہت مشہور ہوئیں۔

ان سب کے علاوہ اور بھی کافی پرانی فلمیں ہیں جیسے پریورتن، اس کے ڈائرکٹر ڈی ایس سلطانیہ تھے۔''گرہ لکشمی'' (ہدایت کار سیوک اور اداکار اجیت کمار اور کوشیلا وغیرہ)۔پتی بھکتی، کماری اور ودھوا، دِل

جانی، مستانہ، گردھر گوپال کی بُرا، تقدیر کی توپ، ڈاکو کا لڑکا، وغیرہ اسی دور کی فلمیں تھیں۔ تپن سنہا کی فلم ''ایک ڈاکٹر کی موت'' بھی بنی تھی جس کے خاص اداکار شبانہ اعظمی اور پنکج کپور تھے۔ اس کے بعد کلکتہ میں ہندی فلموں کا پروڈکشن تقریباً بند ہو گیا۔ پانچویں دہائی کو کلکتہ سنیما کا زرّیں دور کہا جاتا ہے۔ اس دوران کلکتہ میں کافی فلمیں بنیں اور وہ باکس آفس پر ہٹ بھی ہوئیں۔ لیکن اسی دہائی کے آخر اور چھٹی دہائی کے شروع میں کچھ فلمیں فلاپ بھی ہوئیں۔ اس سے کلکتہ فلم انڈسٹری کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ حالانکہ اسی دوران سنیما کی دنیا میں پہلی بار پست درجے کی کہانیوں کو داخل ہونے کا موقع ملا۔

۱۹۴۸ء میں بمل رائے نے ایک اچھی فلم ''پہلا آدمی'' بنانی شروع کی لیکن اس فلم کو فلاپ کرنے کے لئے اسی زمانے میں اسی کہانی کی بنیاد پر ایک فلم ''سمادھی'' بنائی گئی۔ ۱۹۴۹ء میں یہ فلم ریلیز ہوئی۔ ناظرین نے اسے بہت پسند کیا اور نتیجے میں بمل رائے کی فلم ''پہلا آدمی'' پٹ گئی۔

۱۹۸۱ء سے فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن (این ایف ڈی سی) اور دوردرشن کی وجہ سے فلمی دنیا کی ترقی کے دروازے کھلے۔ اسی دوران کچھ ٹیلی فلمیں اور ٹی وی سیریل بننے شروع ہوئے۔ ستیہ جیت رائے نے دوردرشن کے لئے ہندوستان میں پہلی ٹیلی فلم ''سدکتی'' بنائی۔ اوم پوری، شبانہ اعظمی، موہن اگاسے وغیرہ اس کے خاص اداکار تھے۔ مرینال سین نے ایک ٹیلی فلم ''تصویر اپنی اپنی'' بنائی۔ ایک دودرشن سیریل بھی انہوں نے بنایا جس کا نام ''کبھی دور کبھی پاس'' تھا۔ کلپنا لاجمی نے ۱۹۸۸ء میں ''لوہت کنارے'' نام کا ایک سیریل تیار کیا۔ ستیہ جیت رائے کی ''سدگتی'' کو دلی دوردرشن نے ۲۵/اپریل ۱۹۸۲ء کو ٹیلی کاسٹ کیا تھا۔

پھر ستیہ جیت رائے کے بیٹے سندیپ رائے نے ۸۵-۱۹۸۴ء میں ''ستیہ جیت رائے پریزنٹس'' نام سے ایک سیریل دور درشن کے لئے بنایا۔ ششی کپور، اوم پوری، موہن اگاسے، سادھو مہر، نینا گپتا، پنکج کپور، پیریا پاٹھک اور تنوجا وغیرہ اس سیریل کے خاص اداکار تھے۔ اس کی کہانی اسکرپٹ اور سنگیت خود ستیہ جیت رائے کا تھا۔ سندیپ رائے نے بعد میں ''ٹارگیٹ'' نام سے ایک فلم بنائی۔ اس کے خاص اداکار اوم پوری، موہن اگاسے، انجن شری واستو اور گنیش مکھر جی تھے۔ (ماخوذ۔ مغربی بنگال۔ مدیر مصطفٰی اکبر)

فلم ڈائرکٹر گوتم چودھری نے نصیر الدین شاہ اور شبانہ اعظمی کو لے کر فلم ''پار'' بنائی۔ بدھا دیب داس گپتا نے انو کپور اور راجیشوری رائے چودھری کی اداکاری والی فلم ''باغ بہادر'' بنائی۔ اتپلند و چکرورتی نے سمتا پاٹل

اور اوم پوری کو لے کر ''دیوشیشو'' بنائی اور گوتم چودھری نے ''مینو کا سپنا'' نام کا ایک ٹی وی سیریل تیار کیا۔

بنگال کے مشہور ناول نگاری بھوتی بھوشن کی ایک کہانی کی بنیاد پر بدھا دیب داس گپتا نے ''ارّنیک'' نام سے ایک سیریل بنایا۔ ہدایت کار شنکر بھٹا چاریہ نے ''سارے جہاں سے اچھا'' راجا داس گپت نے ''جنگل کی گہرائی'' اور گوتم بنر جی نے ''داغ'' بنائی۔ داغ میں نوین نشچل، وینا اور کشوری نے خاص اداکاری کی ہے۔ راجا داس گپت نے ٹیلی فلم ''انتم راتری کا کاریہ'' اس دوران بنایا تھا۔ ونئے چٹر جی نے رابندر ناتھ ٹیگور کی کہانی کی بنیاد پر ایک سیریل ''درپ ہرن'' کی ابتدا ۱۹۸۱ء میں کی تھی۔ ۱۹۹۲ء میں گوتم بوس نے بنجارا اور ۱۹۹۳ء میں سدیپ چکرورتی نے ''نام گم جائے گا'' نام سے ایک سیریل کا کام شروع کیا تھا۔ اس میں ہیما مالنی اور تپلیشور اور پرساد بطور اداکار تھے۔ اسی دوران پینکی چودھری نے ''آرکشن'' نام کا سیریل بنایا اور ''بلیدان'' نام کی ایک فلم بھی بنائی۔

اسی سال زی۔ ٹی وی کی درخواست پر کلکتہ میں پہلا ہندی ٹی۔ وی۔ سیریل بنانے
کی ذمہ داری ڈائرکٹر اندرنیل بنر جی کو سونپی گئی ہے۔۔۔

☆☆☆

بنگلہ فلمیں تاریخ کے آئینے میں

خاور حسن

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ایک شخص جب شمال مشرقی امریکہ کے ایک چھوٹے سے شہر کی مقامی لائبریری میں گیا تو ۵ ہندوستانی فلموں کے کیسٹس کو دیکھ کر چونک گیا کیوں کہ ان میں سے ۴ بنگلہ فلموں کے کیسٹس تھے اور وہ چار ستیہ جیت رے کی فلمیں تھیں۔ دراصل آج بین الاقوامی سطح پر ہندوستانی فلموں کو جو مقبولیت مل رہی ہے اس کی بنیاد ستیہ جیت رے نے ہی ڈالی تھی۔ کیوں کہ دنیائے سنیما سے ہندوستانی فلموں کو بہتر طور پر متعارف کرانے والے وہ پہلے شخص تھے اور آج بھی وہ واحد ایسے شخص ہیں جس نے ہندوستان کے لیے سب سے اچھی فلم کا آسکر انعام حاصل کیا ہے۔ ان کی یہ فلم ''پاتھیر پنچالی'' تھی۔

بنگلہ فلموں نے جس طرح معیار کو قائم رکھا اور معیار کی وجہ سے وہ بین الاقوامی سطح پر پسند کی گئیں اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ بنگلہ فلم ساز و ہدایت کاروں نے کبھی اس بات کا رونا نہیں رویا کہ ان کے پاس اچھی کہانی نہیں، کہانیوں کا قحط ہے اور نہ اُول جلول چیزیں یہ کہہ کر دکھائیں کہ عوام یہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہاں یہ بات بھی ہے کہ بنگلہ زبان کے بولنے والے اپنی زبان، تہذیب وثقافت سے جس طرح لگاؤ رکھتے ہیں، کم زبانوں کے بولنے والوں میں یہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس لیے بھی ایسا ہے کہ بنگلہ بولنے والے ڈھائی تین گھنٹے صرف Entertainment کے نام پر ضائع نہیں کر سکتے۔ شاید اسی لیے بھی اکثر بنگلہ فلمیں ناولوں پر مبنی ہوتی ہیں، ان میں ادبی ناول بھی شامل ہیں۔ لیکن ایسے تجربات ہندی فلموں میں کم ہی ہوئے۔ اس کی ایک وجہ تو ہندی فلم انڈسٹری کا ہالی ووڈ کے تئیں حد درجہ جھکاؤ ہوسکتا ہے اور دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ بنگلہ زبان میں ہندی اور اردو کے مقابلے بہت پہلے سے اچھے ناولوں کے لکھنے کی شروعات ہوچکی تھی اور بنگلہ میں جس تعداد میں معیاری ناول لکھے گئے، اردو اور ہندی میں نہیں لکھے گئے۔ بنگلہ ادیبوں خاص کر شرت چندر چٹر جی نے جس طرح چھوٹے چھوٹے موضوعات کو برتا، جس طرح معمولی باتوں کو اہمیت دی اور خیال کی نازکی کو سمجھانے کی کوشش کی اور جس طرح اپنے حساس ہونے کا اظہار کیا اسی طرح بنگلہ میں فلم بنانے والے ہدایت کاروں نے بھی ان کا حق ادا کیا یہی وجہ ہے کہ

جذبات کی پیش کش میں بنگلہ فلمیں فرانسیسی فلموں جیسی ہی ہیں۔

یہاں یہ بتانا ضروی ہے بنگلہ فلموں کی تاریخ ہندی فلموں کی تاریخ سے کم پرانی نہیں۔ لومئیر بھائیوں کی پہلی محترک فلم کی ایجاد ۱۸۹۵ کے صرف ۶ سال بعد ہی ہیرالال سین نے ۱۹۰۱ میں ایک Royal Biscope بنایا اس میں بنگلہ ڈرامے کے رقص کے مناظر کی مختصر سی فلم بندی دکھائی جاتی تھی۔ ۱۹۱۹ میں ''بلوا منگل'' نامی پہلی بنگلہ فلم بنی۔ یہ بغیر آواز کی فلم تھی۔ بنگلہ میں پہلی بولتی فلم ۱۹۳۱ میں پریم انکورا تارتھی نے ''دینا پونا'' نام سے بنائی۔ یہی وہ سال تھا جب ہندی میں بھی پہلی بولتی فلم ''عالم آرا'' کے نام سے بنی۔ شرت چندر چیٹر جی کے ناول پر مبنی فلم ''دیوداس'' پہلی بار بنگلہ میں ہی ۱۹۳۵ میں پی سی بروا نے بنائی۔ اس کے بعد ایک بنگالی ہدایت کار بمل رائے نے اسے ہندی میں دلیپ کمار کو لے کر بنایا جس سے دلیپ کمار کی اداکارانہ زندگی کو ایک سمت ہی نہیں ملی، ہندی فلموں کو بھی ایک نئی دِشا ملی۔ ''دیوداس'' کی ریمیک کا سلسلہ یہیں نہ رُکا' شاہ رخ خان کو بھی لے کر یہ فلم بنائی گئی۔ اس طرح اب تک سات بار ''دیوداس'' بنی اور ہٹ رہی۔ جو لوگ شیکسپئیر کی باتیں کرتے ہیں کہ ان کے ڈراموں پر ۴۰۰ سے زیادہ فلمیں بن چکی ہیں، انہیں شرت چندر چٹر جی کو بھی نہیں بھولنا چاہئے۔

بنگلہ کی پہلی مقبول ترین ہیروین کانن دیوی تھیں لیکن بنگلہ فلموں کا سنہرا دور اتّم کمار لے آئے اور وہ بھی خاص کر تب جب ان کی جوڑی سچترا سین کے ساتھ جمی۔ یہ دونوں پہلی بار ۱۹۵۳ میں ''سارے چواتور'' میں آئے۔ یہ ایک کامیڈی فلم تھی۔ اس کے ہٹ ہونے کے بعد کئی اور فلموں میں بھی دونوں ساتھ آئے۔ ویسے اُتم کمار ستیہ جیت رائے کی فلم 'ناٹک' میں اداکاری کے لئے جانے جاتے ہیں وہیں سچترا سین کو زیادہ شہرت دلوائی بلکہ ہندوستانی فلموں کے تئیں احترام کا جذبہ پیدا کرنے کا ذریعہ بھی بنے۔ ستیہ جیت رائے کی فلم ''پاتھر پنچالی (چھوٹی سڑک کا گیت)'' بھی جسے ۱۹۵۵ میں اچھی فلم کا آسکر ملا، یہ فلم ایک ناول پر مبنی تھی اور یہ ناول بھوتی بھوسن بنر جی نے تحریر کیا تھا۔ اس ناول پر مبنی ستیہ جیت رے نے کئی فلمیں بھی بنائیں۔

ستیہ جیت رے کے علاوہ بھی کئی ایسے ہدایت کار ہوئے جنھوں نے بنگلہ فلموں کے معیار اور اس کی شہرت کو برقرار رکھا۔ دراصل فلم کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں بنگالیوں نے اپنی مخصوص چھاپ نہ چھوڑی ہو۔ کچھ اداکار تو ایسے بھی ہیں جنھوں نے

ہندی فلموں میں مقبولیت حاصل کی جو بہت کم اداکاروں کونصیب ہوتی ہے۔ایسے اداکاروں میں جیہ بہادری (بچن)،شرمیلا ٹیگور، پردیپ کمار،راکھی بسواس (گلزار)چٹرجی اور متھن چکروتی کا شمار ہوتا ہے۔یہ بنگلہ فلموں کی کشش ہی ہے کہ ایسے اداکاروں کی آج بھی کمی نہیں جو بنگلہ فلموں میں کام کرنا باعث فخر سمجھتے ہیں اور انہیں اس بات کی امید رہتی ہے کہ ان کا شمار ایسے اداکاروں میں ہونے لگے گا جو اداکاری کی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔

☆☆☆

پانی میں آگ

نعمان قیصر

بارش اور بالی ووڈ کا رشتہ بہت پرانا ہے۔اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ بارش ہی بالی ووڈ کو زندگی اور دلبستگی کے علاوہ رومانس اور محبت عطا کرتی ہے۔برسات کے موسم میں پپیہے وجد کے عالم میں رقص کرتے ہیں،کوئل اور مورنی رقص وسرور میں مست رہتی ہیں۔بارش کی بوند اور شبنم کی پھوار محبوب کے دل میں وصال کی جوت جگاتی ہیں جس کی وجہ سے ملاقات کی خواہش انگڑائی لینے لگتی ہے۔بارش سے ندی،نالے جل تھل ہوجاتے ہیں، ہر طرف ہریالی اور شادابی پھیل جاتی ہے، پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے دل ودماغ معطر ہوجاتے ہیں۔ایسے رومانی ماحول اور موسم سے بھلا بالی ووڈ کیوں کر بچ پاتا۔وہ بھی جذب دروں میں ڈوب کر روح پرور''ٹپ ٹپ برسا پانی، پانی نے آگ لگائی'' جیسے جذبات میں طوفان بپا کرنے والے نغمے پر جھوم اٹھتا ہے۔ان فلموں سے شائقین کا رشتہ زیادہ جذباتی اور مستحکم ہوتا ہے جن میں ہیرو اور ہیروئن بارش میں بھیگ کر رومانس کا اظہار کرتے ہیں۔

برسات کے دام میں بالی ووڈ اس وقت سے گرفتار ہے جب اس کے پیر پالنے میں ہی تھے۔رنگین فلموں سے قبل بلیک اینڈ وہائٹ فلمیں بنتی تھیں۔۱۹۱۳ء میں فلم''راجہ ہریش چندر'' بنی جو قدیم اقدار وروایات پر مبنی تھی۔فلم کے ابتدائی مرحلے کی وجہ سے اس میں بہت سی کمیاں تھیں جن کی وجہ سے بالی ووڈ سے فلمی شائقین کا رشتہ زیادہ مستحکم نہیں ہوسکا تھا۔لیکن بالی ووڈ کا ارتقائی سفر جاری رہا اور اب عالم یہ ہے کہ زندگی کی تمام جہتوں کا احاطہ بحسن وخوبی بالی ووڈ کررہا ہے۔

بارش میں بھیگتے جسموں کی انگڑائی اور رومانی مناظر بہت سی فلموں میں قید ہیں جن میں عشق کی سرشاری اور جذبہ وجنوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ایک طویل عرصہ گزرنے کے باوجود''رام تیری گنگا میلی'' میں مندا کنی کا بارش میں بھیگ کر چٹانوں پہ رقص اب بھی ناظرین کے دل کو گدگداتا ہے۔مدھوبالا اور کشوردا ہندی سینما کے انتہائی مقبول فنکار رہے ہیں۔ان کی اداکاری کا سحر اب بھی سر چڑھ کر بول رہا ہے۔۱۹۵۸ء میں فلم''چلتی کا نام گاڑی'' میں پردۂ سیمیں پر دونوں ایک ساتھ حسن اور اداکاری کے جلوے بکھیرتے نظر آئے۔بارش میں بھیگتے ہوئے انہوں نے جو نغمہ گایا ہے اس کی حلاوت آج بھی شائقین کے کانوں میں رس گھولتی ہے۔بارش کی بوندوں کو اپنے آنچل میں سمیٹنے والی شرمیلی لڑکی کے ناز وادا میں جو

کشش اور رقص میں جو فنکاری ہے اس سے آج کی ہیروئنیں محروم ہیں۔

۱۹۹۴ء میں ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' میں کاجول اور ''مہرا'' میں روینہ ٹنڈن نے بارش میں بھیگتے ہوئے جس فن کا مظاہرہ کیا ہے وہ بھی لاجواب ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں مصنوعی بارش کی وجہ سے وہ فطری پن قائم نہیں ہو سکا ہے جس کا بالی ووڈ متقاضی ہے۔ چونکہ اس میں بارش کے لیے اسٹوڈیوں میں ہی مخصوص انتظام کیے گئے تھے جس کی وجہ سے فطری پن پیدا نہ ہو سکا۔

تقریباً ۶۰ کی دہائی میں ایسی بہت سی فلمیں ریلیز ہوئیں جن میں کہیں فطری تو کہیں مصنوعی بارش سے رومانی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں منظر عام پر آنے والی فلم ''پرکھ'' میں سادھنا مرکزی رول میں تھی۔ یہ فلم بھی بالی ووڈ کی کامیاب ترین فلموں میں سے ایک ہے۔ اس فلم کا مشہور نغمہ ''او سجنا برکھا بہار آئی'' جتنا شیریں ہے اتنا ہی رومانٹک بھی۔ کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر سادھنا نے بارش کی ترنگوں کو جذب کرتے ہوئے جو نغمہ سرائی کی ہے وہ آج بھی عشاق کے دلوں میں پیار کے جوت جگاتی ہے۔ انھیں دنوں ریلیز ہونے والی فلم ''کالا بازار'' کا یہ نغمہ بھی رومانس کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اس نغمے کو آج بھی لوگ یاد کرتے ہیں اور دل کو مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ ''زندگی بھر نہیں بھولیں گے وہ برسات کی رات''۔ اس نغمہ میں برسات کی رات کا تحیر اور ہجر کی تپش کا اظہار ہے۔ ۱۹۶۳ء میں منظر عام پر آنے والی فلم ''وہ کون تھی'' ایسی ہی فلم ہے جس میں سادھنا کی اداکاری نے لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا۔ لتا منگیشکر کی جادوئی آواز نے اس لذت و سرشاری کو دو آتشہ کر دیا اور آج بھی لوگ اسے نہ صرف یاد کرتے ہیں بلکہ کہیں سنائی دے تو اسے ٹھہر کر سنتے ہیں۔ اس نغمہ کی محبوبیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں آنسو اور بارش میں مماثلت دکھائی گئی ہے کہ بارش سے زمین بھیگتی ہے اور آنسو کی لڑی سے دل کی کائنات غرق ہوتی ہے اور دل گرد و غبار کو دھو کر باطن کو ہلکا بھی کر دیتی ہے۔

اس عہد کی فلموں کی مقبولیت اور تادیر زندہ رہنے کی وجہ یہ قطعی نہیں تھی کہ ان میں رومانس کے مناظر فلمائے جاتے تھے، یا ان میں رنگ رلیاں منائی جاتی تھیں یا ہیرو ہیروئن بے حجابانہ ملتے تھے۔ یہ چیزیں تو ماضی کی بہ نسبت آج زیادہ ہیں، لیکن ان کے باوجود آج کی بیشتر فلمیں ریلیز ہونے کے ساتھ ہی گمنامی کے غار میں چلی جاتی ہیں۔ ماضی کی فلموں میں حسن کے ساتھ ساتھ فن پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی اور اداکارہ بھی سنجیدگی سے اپنے رول پر توجہ دیتی تھی۔ پہلے کی ہیروئنوں کی ادائیں بولتی تھیں، لیکن آج ان کے جسم اور ملبوسات بولتے ہیں۔ اسی وجہ سے تمام حربوں کے باوجود ان کی اداؤں کا جادو سر چڑھ کر نہیں بولتا۔

۱۹۶۰ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''کشمیر کی کلی'' کے نغمے ''اشاروں اشاروں میں دل لینے والے'' اور ''دیوانہ ہوا بادل'' کہانی اور فنکاروں کی بہترین اداکاری کی وجہ سے ناظرین نے اسے قبولیت اور محبوبیت کی ایسی سند سے نوازا جس کے سامنے دیگر اعزازات اور انعامات پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں فلم ''آرادھنا'' ریلیز ہوئی تو اس نے کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کئے اور اس کا نغمہ ''روپ تیرا مستانہ'' کو شائقین اب تک فراموش نہیں کر پائے ہیں۔

نغمہ محض تفریح کا سامان ہی فراہم نہیں کرتا بلکہ بوقت ضرورت اس کا ورد کلفت و آلام سے نجات کا باعث بھی ہوتا ہے۔ اس روایت کی پاسداری بالی ووڈ میں بھی نظر آتی ہے۔ یہ نغمہ دیکھیں جس میں کسان قحط کی صورت میں بھگوان سے یوں گویا ہوتا ہے۔ ''اللہ میگھ دے، پانی دے''۔ ۱۹۶۶ء میں فلم ''گائڈ'' کا یہ نغمہ قحط کی پریشانی کو ظاہر کرتا ہے، خشک سالی سے محض کسان ہی پریشان نہیں ہوتا بلکہ عام انسان کی زندگی بھی اس سے مفلوج و متاثر ہوتی ہے۔ ۱۹۷۴ء میں فلم ''روٹی کپڑا اور مکان'' کا یہ نغمہ ''ہائے ہائے یہ مجبوری، یہ موسم اور یہ دوری، تیری دو ٹکیوں کی نوکری سے میرا لاکھوں کا ساون جائے'' معشوق کی جدائی کے درد و کرب کو بیان کرتا ہے۔ بارش کی بوندیں کسانوں کے لیے ہی مسرت کا پیغام نہیں لاتیں بلکہ فرہاد و شیریں کے پیروکاروں کے لیے بھی وصل کی سوغات لے کر آتی ہیں۔ لیکن اگر انھیں وصال نصیب نہ ہو تو ان کی حسرت سینے میں ہی دم توڑ دیتی ہے۔ نغمہ ''ہائے ہائے یہ مجبوری'' اسی درد و غم کا بیان ہے۔ ۲۰۰۱ء میں عامر خان کی ریلیز ہونے والی فلم ''لگان'' کا یہ نغمہ ''گھنن گھنن گھن'' یا پھر ''کالے میگھا کالے میگھا پانی تو برسا، بجلی کی برسات نہیں بوندوں کی باڑ چلا'' میں بھی بارش کی طلب کا اظہار ہے۔ گھنگھور گھٹائیں پھیل جائیں لیکن بارش نہ ہو تو عوام بالخصوص کسان دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ ان نغموں میں یہی کیفیت ہے بجلی کڑکتی ہے لیکن بارش نہیں ہوتی اسٹوڈیو میں مصنوعی بارش کرائی جاتی ہے۔ اس لیے اس میں بارش کا وہ حقیقی لطف نہیں جو مطلوب ہے۔ ۱۹۷۰ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''منزل'' میں مرکزی رول میں موسمی چٹرجی اور امیتابھ بچن تھے۔ اس فلم کا ایک نغمہ فطری بارش میں فلمایا گیا ہے۔ ایسی بارش جس میں سمندر کی لہریں گیٹ وے آف انڈیا کی دیواروں سے سر پٹکتی ہیں اور پورا ممبئی شدید بارش کی زد میں ہے۔ دونوں عالم وجد میں سڑکوں پر رقص کرتے ہیں تو پورا ممبئی جذباتی طور پر اس رقص میں شامل ہو جاتا ہے۔ ماحول، فضا اور موسم کی ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ امیتابھ اور موسمی کے رقص و سرور نے ایسا رومانی سماں باندھ دیا جس کا احساس بہت دنوں تک ناظرین کو رہا۔ یہ فطری بارش کا ہی کمال تھا

جس کی وجہ سے لذت و انبساط کی کیفیت دوبالا ہوگئی تھی۔

وقت بدلا، حالات بدلے تو لوگوں کی پسند اور معیار بھی بدل گئے۔ بالی ووڈ میں بارش کے ساتھ نغموں کو فلمانے کا طریقہ بھی بدل گیا۔ بارش، ندی، پیڑ، پودا، پہاڑ غرض کہ قدرتی ماحول اور مناظر کی شوٹنگ اسٹوڈیو کی محدود اور مختصر دنیا تک سمٹ کر رہ گئی۔ بارش کے منظر کی شوٹنگ کے لیے شاور کے سیٹ لگائے گئے۔ ۱۹۸۲ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''نمک حلال'' کا وہ سین بہت مشہور ہوا جس میں امیتابھ بچن اور سمیتا پاٹل تھیں۔ سفید بھیگی ساڑی میں ملبوس سمیتا پاٹل اور امیتابھ کے رقص نے ایسی رومانی فضا قائم کردی جو آج کے ناظرین کے شعور اور حافظے میں محفوظ ہیں۔

۱۹۸۶ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''مسٹر انڈیا'' میں انل کپور اور شری دیوی ایک ساتھ تھے۔ اس نغمے کی شوٹنگ بھی بارش میں ہوئی تھی۔ اس کا یہ نغمہ ''کاٹے نہیں کٹتے یہ دن، یہ رات'' بہت مقبول ہوا تھا۔ اندھیری رات، ہو کا عالم، آسمان پر پھیلے ہوئے کالے کالے بادل، سرد لہراتی ہوا، رم جھم بارش میں انل کپور کے ساتھ شری دیوی کا رقص آج بھی ناظرین کو گدگداتے ہیں۔

۲۰۰۳ء میں فلم ''چمیلی'' ریلیز ہوئی اس میں کرینہ کپور طوائف کے کردار میں ہے۔ نغمہ ''بھاگے رے من'' پر اس کا رقص آج وہی مزہ دیتا ہے۔ ۲۰۰۸ء میں منظر عام پر آنے والی فلم ''گرو'' جس میں ایشوریہ رائے کلیدی رول میں ہیں۔ اس کا یہ نغمہ ''برسا رے میگھا، آزادی کے جذبے کو فروغ دیتا ہے''۔ پورا نغمہ آغوش فطرت میں فلمایا گیا ہے۔ ندی، پہاڑ، پیڑ، پودے، پھول، کشتی، گاؤں، گلیاں، جانور اور پرندوں کی شوٹنگ سے فلم بہت حد تک فطرت سے قریب ہوگئی ہے۔ لڑکی گھر سے بھاگ رہی ہے اور اپنی خوشیوں میں بارش کی پھواروں میں شریک کر رہی ہے۔ فلم کی نمایاں خوبی یہی ہے کہ وہ فطری پن، معصومیت اور سادگی جو بالی ووڈ سے غائب ہوتے جارہے تھے وہ اس میں پوری طرح جلوہ فگن ہیں۔ فطری بارش کی بجائے مصنوعی بارش میں فلمائے جانے والے ہر نغمہ کے لئے تقریباً ۲۰ ہزار لیٹر سے زائد پانی خرچ کیا جاتا ہے جبکہ آج بھی ہندوستان کے بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں لوگوں کو صاف پانی پینے کے لیے بھی میسر نہیں۔ وہاں ۲۰ ہزار لیٹر پانی کا اسراف بیجا غور وفکر کی دعوت دیتا ہے کیونکہ 'جل ہی جیون ہے'۔ جل کے بغیر زندگی کا تصور بھی محال ہے۔

☆☆☆

ہندوستانی فلموں میں قوالی

انیس امروہوی (دہلی)

گزشتہ صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائی تک ہندوستانی فلموں کا مزاج بالکل مختلف تھا۔ اس زمانے کی فلموں میں موسیقی اور گانوں کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی اور فلم میں گیتوں کے ذریعہ کہانی کو بھی آگے بڑھایا جاتا تھا۔ فلمی نغمہ نگار بھی صرف 'تک بندی' نہیں کیا کرتے تھے بلکہ فلمی نغموں میں بھی اپنا شاعرانہ وقار بنائے رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان نغموں میں وہ کشش ہے جو آج کے نئے گیتوں میں نہیں ہے۔ حالانکہ دورِ جدید میں موسیقی کے نئے نئے آلات اور طور طریقوں میں کافی تبدیلی آئی ہے، مگر ان سب کے باوجود آج اچھے سے اچھے فلمی نغمے کی عمر ایک برس سے زیادہ نہیں ہو پاتی اور لوگوں کو زیادہ دنوں تک آج کے فلمی گیت یاد نہیں رہ پاتے، جب کہ پرانے فلمی نغمے بیس تیس برس تک لوگوں کو یاد رہتے تھے اور عوام و خواص ان کا سننا پسند کرتے تھے۔ ان نغموں کی مقبولیت کی بہترین مثال یہ ہے کہ آج بڑے بے ڈھنگے پن سے پرانے فلمی نغموں کے 'ری مکس' بنائے جارہے ہیں اور نئی نسل کی بے راہ روی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کئی ریکارڈنگ کمپنیاں کافی پیسہ کما رہی ہیں۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس طرح کے 'ری مکس' بنانے کے لئے ان کو پُرانے مقبول فلمی نغموں کی ہی ضرورت پڑتی ہے۔

فلمی نغموں میں جہاں اُداسی بھرے، یا بہت زیادہ شوخی بھرے گیت مقبول ہوتے تھے، وہیں فلمی نغموں میں قوالی کو بھی ایک خاص مقام حاصل تھا اور کئی فلمیں تو قوالی کی مقبولیت کی وجہ سے ہی کامیاب ہوسکی ہیں۔ آج بھی پرانی فلموں کی کوئی قوالی ہم ریڈیو پر سنتے ہیں تو چلتے چلتے قدم رک جاتے ہیں اور سامعین ایک خاص قسم کے رنگ میں اپنے آپ کو شرابور محسوس کرتے ہیں۔ ''ہمیں تو لوٹ لیا مل کے حسن والوں نے....'' جیسی فلمی قوالیاں آج بھی سامعین کے دلوں پر گہرا اثر چھوڑتی ہیں۔

اس سب کے باوجود کیا وجہ ہے کہ نئی فلموں میں سے قوالی یکسر غائب ہوگئی ہے؟ کیا اب اس معیار کی قوالیاں ہمارے فلمی شاعر نہیں لکھ پارہے ہیں؟ کیا اس معیار کی قوالیوں کی دُھنیں ہمارے فلمی موسیقار نہیں بنا پارہے ہیں، یا پھر آج کا فلم بین طبقہ ہی فلموں میں قوالی سننے کو تیار نہیں ہے؟

قوالی کا فن بڑا لمبا سفر طے کرکے ہماری ہندوستانی فلموں تک پہنچا ہے۔ پہلے قوالی صوفیوں اور بزرگوں

کی خانقاہیں اور درگاہوں پر نہایت عقیدت کے ساتھ سنی جاتی تھی، اور اس میں جو کلام پڑھا جاتا تھا، وہ بھی تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا۔ بعد میں جب یہ فن عشقیہ شاعری کا رنگ اختیار کرتا چلا گیا اور جلسوں اور محفلوں کی شان بڑھانے لگا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ہماری فلمیں اس فن سے دور رہتیں؟ لہٰذا فلموں نے بھی دیگر فارمولوں کی طرح قوالی کو ایک کامیاب فلمی فارمولہ کے طور پر اپنا لیا۔ جس طرح فلموں میں کیبرے، تشدد، سیکس، اور عدالت کے سین فلموں کو کامیاب بنانے کے فارمولے کے طور پر استعمال ہوتے تھے، اسی طرح قوالی کو بھی فلم کی کامیابی کا فارمولہ بنا کر پیش کیا جانے لگا۔

تقریباً پندرہ بیس برس تک فلموں میں قوالی کا سنہرا دور چلا اور اس دور میں کچھ بہترین قوالیوں نے تو دھوم مچا دی اور ان قوالیوں کے سامنے گیت، غزل سب پھیکے نظر آنے لگے۔ ہر فلمساز اپنی فلم میں ایک قوالی ضرور ڈالنے کی ضد اپنے ہدایتکار اور موسیقار سے کرنے لگا۔

ہماری ہندوستانی فلموں میں ایک سے بڑھ کر ایک بہترین قوالیاں موجود ہیں۔ جیسے...."شرما کے یہ سب کیوں پردہ نشیں آنچل کو سنوارا کرتے ہیں..." فلم: چودھویں کا چاند، "آہیں نہ بھرے شکوے نہ کئے، کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا..." فلم: زینت، "وہ اپنی یاد دلانے کو اک عشق کی دنیا چھوڑ گئے..." فلم: جگنو، "ہمیں تو لوٹ لیا مل کے حسن والوں نے..." فلم: ہلال، "نہ تو کارواں کی تلاش ہے..." فلم: برسات کی رات، "سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اُصولوں سے..." فلم: دشمن، "یاری ہے ایمان میرا یار میری زندگی..." فلم: زنجیر، "جھوم برابر جھوم شرابی..." فلم: فائیو رائفلز، "حال کیا ہے دلوں کا نہ پوچھو صنم..." فلم: انوکھی ادا، "چاندی کا بدن سونے کی نظر..." فلم: تاج محل، "تیری محفل میں قسمت آزما کر ہم بھی دیکھیں گے..." فلم: مغلِ اعظم وغیرہ چند ایسی ہی قوالیاں ہیں جنہیں بے حد پسند کیا گیا۔ ان قوالیوں کی خوبی یہ ہے کہ ان کے بول، شعر اور الفاظ کانوں میں رس گھولتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان قوالیوں کے بول سننے والے کو یاد بھی ہو جاتے ہیں اور آج برسوں بعد بھی ان فلمی قوالیوں کو سننے کو دل چاہتا ہے۔

فلمی قوالیوں کی شروعات میں اسمٰعیل بھائی کی قوالیاں بے حد مقبول ہوئیں اور انہوں نے فلموں میں قوالی کو ایک خاص مقام دلوانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے بعد شکیلہ بانو بھوپالی، نور جہاں، شمشاد بیگم، محمد رفیع، حبیب پینٹر قوال، جانی بابو قوال، عزیز نازاں، منا ڈے، آشا بھونسلے وغیرہ نے قوالی کو مقبولیت کی معراج

تک پہنچانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔

فلمی قوالی کے فن میں مقابلۂ قوالی کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ عام طور پر اس میں دو ٹیمیں آمنے سامنے ہوتی ہیں۔ ایک مردوں کی ٹیم اور اس کے مقابلے میں عورتوں کی ایک ٹیم....اور دونوں سوال جواب کے انداز میں ایک دوسرے پر مدلّل الزام تراشی کے انداز میں حملے کرتے ہیں۔ یہ انداز ناظرین کو بہت پسند آتا تھا۔ دلیل جتنی زیادہ مضبوط ہوگی، ناظرین کو اتنا ہی زیادہ لطف آئے گا۔ اس کے ساتھ ہی قوال کی ادا، موسیقی، روم، الفاظ کی ادائیگی اور قوالی کے بول قوالی کی اہمیت کو اور زیادہ بڑھا دیتے تھے۔

یاد کیجئے فلم مغلِ اعظم کی قوالی....ایک طرف بہار کے روپ میں میں نگار سلطانہ فلم کا ایک برا کردار، اور دوسری طرف انارکلی کے روپ میں فلم کی ہیروئن مدھوبالا کے درمیان فیصلہ کرنے والا شہزادہ سلیم (دلیپ کمار) بیٹھا ہوا ہے۔ اس قوالی کے ذریعہ پوری فلم کی کہانی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ ہیروئن کا کردار اور اس کا مستقبل اسی قوالی میں بیان کر دیا گیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ....

محبت ہم نے مانا زندگی برباد کرتی ہے
یہ کیا کم ہے کہ مر جانے پہ دنیا یاد کرتی ہے
کسی کے عشق میں دنیا لٹا کر ہم بھی دیکھیں گے

اسی طرح فلم چودھویں کا چاند میں لڑکیوں کے جمگھٹ میں ہیرو اپنی معشوقہ کو تلاش کرتا ہے۔ اس کی متلاشی نگاہیں اور چوری چوری تاک جھانک پر ساری سہیلیاں یوں چھینٹا کشی کرتی ہیں....

شرما کے یہ سب کیوں پردہ نشیں آنچل کو سنوارا کرتے ہیں
کچھ ایسے نظر والے بھی ہیں جو چھپ چھپ کے نظارہ کرتے ہیں

اشوک کمار، مینا کماری اور پردیپ کمار کی فلم بہو بیگم کی مشہور قوالی......

ایسے میں تجھ سا ڈھونڈھ کے لاؤں کہاں سے میں

.....اور محمد رفیع، لتا منگیشکر کی آوازوں میں نہایت خوبصورتی سے فلمبند کی گئی قوالی....

میری تصویر لے کر کیا کرو گے تم

.....بھی فلمی قوالیوں کے سلسلے کی مقبول اور یادگار قوالیاں ہیں۔ اسی طرح فلم سادھنا کی قوالی.....

آج کیوں ہم سے پردہ ہے.....

.....نے بھی خاصی شہرت حاصل کی تھی۔

فلم میرے حضور میں بھی ہیروئن مالا سنہا اور ہیرو جتندر آمنے سامنے ہو کر ایک قوالی کا مقابلہ پیش کرتے ہیں اور یہاں ہار جیت کا فیصلہ ہیرو کے خاص دوست اور دل ہی دل میں ہیروئن کو چاہنے والے نواب سلیم احمد خاں یعنی راجکمار کو کرنا ہے۔قوالی ہوتی ہے اور جیت کا فیصلہ ہیرو اور ہیروئن دونوں کے ہی حق میں ہوتا ہے۔ اُس قوالی کے بول تھے.....

کیا کیا نہ سہے ہم نے ستم آپ کی خاطر
یہ جان بھی جائے گی صنم آپ کی خاطر

یا پھر فلم آرزو میں سب سہیلیاں ہیروئن سادھنا کو گھیرتی ہیں.....

جب عشق کہیں ہو جاتا ہے
تب ایسی حالت ہوتی ہے

یاد کیجئے فلم وقت کی وہ قوالی، جب بلراج ساہنی اپنی ہی بیگم کی تعریف یوں کرتے ہیں.....

اے میری زہرہ جبیں، تجھے معلوم نہیں
تو ابھی تک ہے حسیں اور میں جواں

فلم قوالیوں کے سلسلے میں ایک قوالی ابھی بھی میل کا پتھر بنی ہوئی ہے اور آج بھی فن قوالی کی لاج بنائے ہوئے ہے۔فلم برسات کی رات کی محمد رفیع وغیرہ کی آواز میں گائی ہوئی یہ قوالی.....

نہ تو کارواں کی تلاش ہے، نہ تو ہمسفر کی تلاش ہے
میرے شوق خانہ خراب کو، تیری رہ گزر کی تلاش ہے

فلم دھرم پُتر میں ہندوستانی قومی اتحاد کو اجاگر کرتی ہوئی یہ قوالی بھی لوگ آج تک بھول نہیں پاتے ہیں.....

یہ مسجد ہے وہ بُت خانہ
چاہے یہ مانو چاہے وہ مانو
مقصد تو ہے دل کا سمجھانا
چاہے یہ مانو چاہے وہ مانو

اب ذرا یاد کیجئے فلم پالکی کا وہ منظر جس میں ایک طرف فلم کی ہیروئن وحیدہ رحمٰن ہے، جس کی شادی دھوکہ سے ایک بڑے نواب رحمٰن سے ہو جاتی ہے اور دوسری طرف وہی نواب ہیروئن کا شوہر ہے جو ہیرو شاعر راجندر کمار کا باوفا دوست بھی ہے اور ان کے درمیان میں بے بس اور حساس دل شاعر فلم کا ہیرو راجندر کمار ہے۔قوالوں کی دو پارٹیاں بامعنی انداز میں قوالی گا رہی ہیں.....

میں ادھر جاؤں یا اُدھر جاؤں
بڑی مشکل میں ہوں کدھر جاؤں

اسی طرح روٹھے ہوئے، اداس اور غمزدہ دوست امیتابھ بچن کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھیرنے کے لئے دوسرے پٹھان دوست پران کے جذبات کے اظہار کے لئے بھی فلم زنجیر میں قوالی کا ہی سہارا لیا گیا تھا.....

گر خدا مجھ سے کہے کچھ مانگ اے بندے مرے
میں یہ مانگوں محفلوں کے دور یوں چلتے رہیں
یاری ہے ایمان میرا یار میری زندگی

فلمساز و ہدایتکار کمال امروہوی کی فلم شنکر حسین میں قوالی ایک نئے رنگ میں پیش کی گئی ہے۔یہ انداز مغربی اتر پردیش کے چند ضلعوں، رامپور، بریلی، مرادآباد اور امروہہ میں کافی مقبول ہے اور ''چہار بیت'' کے نام سے مشہور ہے۔اس میں بھی گانے والوں کی دو ٹولیاں ہوتی ہیں اور ایک خاص انداز میں آمنے سامنے بیٹھ کر فی البدیہہ مصرعے سوال جواب کی طرح ادا کئے جاتے ہیں اور موسیقی کے نام پر ایک خاص طرز پر صرف 'دف' بجایا جاتا ہے۔شنکر حسین کی قوالی اسی انداز کی چہار بیت تھی، جس کی موسیقی خیام نے تیار کی تھی اور کیف بھوپالی نے اس کے بول یوں لکھے تھے.....

اچھا اُنہیں دیکھا ہے بیمار ہوئیں آنکھیں.....

فلم پتلی بائی جو کہ ایک عورت ڈاکو کی زندگی پر مبنی فلم تھی، اس فلم کی قوالی نے تو مقبولیت کا نیا ریکارڈ قائم کیا تھا کیونکہ یہ قوالی عورت اور مرد کی ایک دوسرے پر فضلیت کو بیان کرتی ہوئی مقابلہ قوالی تھی، اس کے بول تھے......

کیسے بے شرم عاشق ہیں یہ آج کے
ان کو اپنا بنانا غضب ہو گیا

فلمی دُنیا سے قوالی کے روایتی انداز کے جاتے جاتے جن فلمی قوالیوں نے شہرت حاصل کی، ان میں ''میں

تیرے در پہ آیا ہوں.....''فلم: لیلیٰ مجنوں''چہرہ چھپالیا ہے کسی نے نقاب میں.....''فلم: نکاح''اشاروں کو اگر سمجھو راز کو راز رہنے دو.....''فلم: دھرما''ہے اگر دشمن زمانہ غم نہیں.....''فلم: ہم کسی سے کم نہیں''پل دو پل کا ساتھ ہمارا.....''فلم: دی برننگ ٹرین''کاہے بیٹھو ہو چہرہ چھپائے.....''فلم: سلمٰی اور آخر میں سب سے زیادہ مقبول ہونے والی قوالی ''پردہ ہے پردہ، پردہ کے پیچھے پردہ نشیں ہے.....''فلم: امر اکبر انتھونی کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ایک زمانہ میں یوسف آزاد کی گائی ہوئی قوالی.....''سنو جی بڑا لطف تھا جب کنوارے تھے ہم تم.....''اور عزیز نازاں کی گائی ہوئی قوالی.....''جھوم برابر جھوم شرابی.....''کو بھی کافی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستانی فلموں میں قوالی ایک اہم ضرورت بن کر اُبھری اور قوالی کو عام انسان تک پہنچانے میں فلموں نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔تقریباً پندرہ بیس برس تک فلموں میں قوالی کا سنہرا دور چلا اور اس دور میں کچھ بہترین قوالیوں نے تو دھوم ہی مچادی اور ان قوالیوں کے سامنے گیت، غزل سب پھیکے نظر آنے لگے۔ہر فلمساز اپنی فلم میں ایک قوالی ضرور ڈالنے کی ضد اپنے ہدایتکار اور موسیقار سے کرنے لگا۔ایک کے بعد ایک عمدہ قوالی کا دور شروع ہوا۔نظر، حسن، عشق، شراب، مسکراہٹ، تبسم، ادا، بانکپن، کاجل اور پردہ وغیرہ بہت سے عنوانات پر قوالیاں لکھی جانے لگیں، اور یہ بہترین موسیقی کی وجہ سے جلد ہی عوام وخواص میں مقبول بھی ہوگئیں۔

آج ان قوالیوں کو گانے والے زیادہ تر گلوکار نہیں رہے اور ان گلوکاروں کے ساتھ ساتھ فلموں سے قوالی بھی غائب ہوتی چلی گئی۔آج اس طرح کی شدت والی قوالی لکھنے والے شاعر بھی نہیں رہے۔حالانکہ فلموں سے قوالی کے غائب ہونے کی کچھ خاص وجوہات نہیں ہیں۔نئی نسل کے سامعین کی دلچسپی تیز رفتار مغربی بے ہنگم موسیقی میں زیادہ بڑھتی گئی اور انہوں نے قوالی جیسے روایتی فن کو فراموش کرنا شروع کر دیا۔گزشتہ چند برسوں میں جو چند قوالیاں فلموں میں آئی بھی ہیں وہ اس معیار کی نہیں ہیں جنہیں برسوں یاد رکھا جائے۔اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔آج کے موسیقار بھی قوالی کی مخصوص طرزوں سے ناواقف ہی نظر آتے ہیں۔اس لئے اس بات کی توقع بھی بہت کم ہے کہ آنے والی فلموں میں اس فن کے لئے کوئی بہترین جگہ نکل سکتی ہے۔ایک زمانے میں فلموں کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جانے والا فلمی قوالی کا فن صرف یادِ ماضی بن کر رہ گیا ہے۔

☆☆☆

دادا صاحب پھالکے

انیس امروہوی (دہلی)

۳۰/اپریل ۱۸۷۰عیسوی کو دھنڈی راج گووند پھالکے کا جنم مہاراشٹر صوبہ کے ناسک شہر سے انتیس کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک قصبے تریمبکشور کے ایک برہمن خاندان میں ہوا تھا۔ان کے والد کا نام داجی شاستری پھالکے تھا جو بمبئی کے ولسن کالج میں سنسکرت پڑھاتے تھے۔۱۸۹۳عیسوی میں پھالکے نے اپنی کمپنی ''پھالکے فلمس'' قائم کی اور مکمل طور پر ہندوستان میں پہلی فیچر فلم ''راجہ ہریش چندر'' بنائی، جو مئی ۳/۱۹۱۳ء میں ریلیز ہوئی۔اس فلم کے رائٹر، ڈائریکٹر، کیمرہ مین، پروسیسنگ، پرنٹنگ اور ایڈیٹنگ تک کا کام خود پھالکے نے کیا تھا۔اس فلم میں نسوانی کردار ادا کرنے کے لئے کوئی عورت تیار نہیں ہو رہی تھی، لہذا اے۔سالنکے نام کے ایک مرد سے تارامتی کا کردار ادا کروایا گیا۔اس فلم میں ڈی۔ڈی۔دابکے نے راجہ ہرش چندر اور پھالکے کے بیٹے بھال چندر نے روہتاش کے کردار ادا کئے تھے۔

آبائی وطن میں ہی پھالکے کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔اس کے علاوہ اپنے مخصوص خاندانی پس منظر کی وجہ سے ویدوں، پرانوں، اپنشدوں اور شاستروں کی بھی اچھی خاصی معلومات ان کو حاصل ہوگئی تھی، جو بعد میں دیو مالائی قسم کی فلم سازی میں ان کے بہت کام آئی۔اس کے بعد وہ اپنے والد کے پاس بمبئی کے جے۔جے اسکول آف آرٹس میں داخلہ لے لیا۔

۱۸۸۷عیسوی میں بڑودہ کے کلا بھون میں داخلہ کے ساتھ ہی انہیں بڑے بھائی کے ساتھ رہائش اختیار کرنی پڑی۔ان دنوں کلا بھون کے کرتا دھرتا پروفیسر گجّر تھے جنہیں باصلاحیت فنکاروں کو تلاش کرنے کا بڑا شوق تھا۔انہوں نے پھالکے کی صلاحیتوں کو پہچان کر کلا بھون کے فوٹوگرافک اسٹوڈیو کی ذمہ داری ان کو سونپ دی۔اس کا پورا فائدہ پھالکے نے اٹھایا اور وہاں کے کتب خانہ سے بھی ان کو فیض حاصل ہوا۔

دادا صاحب پھالکے کی عمر اس وقت تقریباً چالیس برس کی ہوگی۔جب فائن پرنٹنگ کا ان کا کاروبار بالکل ختم ہوگیا۔بے دلی کے عالم میں وہ ۱۹۱۰ء میں ایک دن اپنے چند دوستوں کے ساتھ کرسمس شو دیکھنے گئے۔وہاں اس دن خصوصی طور پر امریکہ کی ایک فلم ''لائف آف کرائسٹ'' دکھائی

گئی ۔ پھالکے کے لئے اس طرح کی فلم دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہ اس کرشمے سے اتنا متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسی وقت دل میں یہ ٹھان لیا کہ وہ بھی اسی طرز پر رامائن اور مہابھارت کی کہانیوں اور کرداروں پر فلمیں بنائیں گے۔ وہ خود برہمن تھے۔ ان کے والد نے ان کو بمبئی کے جے۔ جے۔ اسکول آف آرٹس میں تخلیقی فن کی تعلیم دلوا کر ان کا حوصلہ بڑھایا تھا۔ وہاں انہوں نے مصوری کے علاوہ اسٹیج کی سجاوٹ اور تھوڑی بہت جادوگری بھی سیکھی تھی۔ اس کے بعد بڑودہ کے کلا بھون میں انہوں نے فوٹوگرافی کی تعلیم بھی حاصل کی تھی اور فوٹوگرافی میں استعمال ہونے والے کیمیکل بنانے کے لئے بھی تجربے کئے تھے۔ یہ سب فنکاری بعد میں فلمسازی کے لئے ان کے بہت کام آئی۔

ان ہی دنوں کتابوں کی ایک دکان میں دادا صاحب پھالکے کو ایک انگریزی کتاب ''دی اے بی سی آف سینما فوٹوگرافی'' (The A B C of Cinematography) حاصل ہوگئی، مگر وہ ان کی زیادہ مدد نہ کرسکی۔ پھر بھی انہوں نے اس کو بار بار پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی اور اس طرح بہت سی تکنیکی باتیں ان کو سمجھ میں آگئیں اور فلمسازی کا ان کا شوق شدّت اختیار کرتا گیا۔

بڑودہ سے واپسی پر ان کی شادی ہوگئی اور آئندہ چند برسوں تک زندگی گزارنے کے لئے پھالکے کو فوٹوگرافی اور ناٹک کمپنیوں کے لئے مناظر کی تصویر کشی کرنے کا کام کرنا پڑا۔ ۱۹۰۰ء میں ان کی دوسری شادی سرسوتی بائی نام کی ایک خاتون سے ہوئی جن سے ان کے چھ لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ان کی پہلی بیوی اور بیٹا چیچک کی بیماری سے مرچکے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں انہوں نے حکومت ہند کے شعبۂ آثار قدیمہ میں فوٹوگرافی اور ڈرافٹ مین کی ملازمت اختیار کرلی۔ اسی دوران وہ اپنے شوق کی تسکین کے لئے تصویروں کے ہاف ٹون بلاک بنانے کا کام بھی کرتے رہے۔ ایک بار مشہور مصوّر راجہ روی ورما کی تصویروں کے ہاف ٹون بلاک بنانے پر ان کو بمبئی کی ایک نمائش میں چاندی کا تمغہ بھی انعام میں ملا۔ اس کے بعد انہوں نے ''پھالکے انگریونگ اینڈ پرینٹنگ ورکس'' کے نام سے بلاک بنانے اور پرینٹنگ کا کام شروع کردیا۔ اس کامیابی کے بعد انہوں نے ''لکشمی آرٹ پرنٹنگ ورکس'' کے نام سے فائین پرنٹنگ کا کام بھی شروع کردیا۔ ان سب کامیابیوں سے حوصلہ پاکر وہ تین کلر میں چھپائی کی غرض

سے جدید مشینیں خریدنے کے لئے ۱۹۰۹ء میں جرمنی بھی گئے۔

اس کے بعد ایک سال تک دادا صاحب پھالکے لگاتار مختلف سنیما گھروں کے چکر لگاتے رہے اور اس نئی نئی ایجاد کی تکنیکی باریکیوں کا جائزہ لیتے رہے۔ انہوں نے پانچ ڈالر کی قیمت سے ایک کیمرہ بھی خریدا جس سے وہ مختلف مواقع کی تصویریں بھی اتارتے رہے۔ ان سب کاموں میں ان کی بیوی سرسوتی بائی نے ان کو پورا تعاون دیا۔

اگلے ایک برس لگاتار بیس بیس گھنٹے کام کرتے ہوئے انہوں نے ایک ڈاکیومنٹری فلم ''مٹر کے بیج کا وکاس'' یعنی ارتکاء کی تخلیق کی۔ اس کے لئے انہوں نے ایک گملے میں مٹر کا ایک بیج بویا اور ہر دن کے حساب سے ایک تصویر اتارتے چلے گئے۔ بعد میں سب تصویروں کو جوڑ کر انہوں نے یہ دستاویزی فلم تیار کی تھی۔ اس فلم کی بنیاد پر انہیں کچھ قرضہ مل گیا اور کچھ پیسہ انہوں نے اپنی لائف بیمہ پالیسی کو رہن رکھ کر حاصل کیا، اس طرح یکم فروری ۱۹۱۲ء میں دادا صاحب پھالکے فلمسازی سے متعلق جانکاری حاصل کرنے اور اس کے لئے ساز و سامان خریدنے انگلینڈ چلے گئے۔

اس سفر کے دو ماہ بعد جب دادا صاحب پھالکے انگلینڈ سے واپس آئے تو ان کے پاس ولیمسن کیمرہ، ایک پروجیکٹر، ایک پرنٹنگ مشین اور فلمسازی سے متعلق وہاں کی تکنیکی جانکاری اور تجربہ بھی ساتھ تھا۔ وہ ہندوستان کے پہلے Foreign Returned فلمی تکنیشین بھی بن گئے۔ ہندوستان واپس آکر انہوں نے مزید پونجی حاصل کرنے کے لئے بیوی کے گہنے گروی رکھے اور فلم ''راجہ ہریش چندر'' کا کام شروع کردیا۔ اس فلم کے لئے سب کچھ ان ہی کو کرنا تھا۔ لوگوں کو اداکاری سکھانا، اسکرپٹ لکھنا، کیمرہ چلانا اور پروڈکشن کرنا، خوبصورت ہیرو ہیروئنوں کی جگہ تیسرے درجے کے اسٹیج اداکار اور طوائفیں دستیاب تھیں۔ ہیروئن کے کردار کے لئے کوئی عورت تیار نہ تھی۔ یہاں تک کہ ایک طوائف نے بھی حقارت سے اس فلم میں کام کرنے سے انکار کردیا۔ لہٰذا بعد میں ہوٹل کے ایک باورچی کا معاون اے۔ سالنکے نام کا ایک مرد یہ نسوانی کردار ادا کرنے کیلئے تیار ہوگیا۔ برسات کا موسم ختم ہوتے ہی پھالکے نے دادر کے مین روڈ پر متھرا بھون میں اپنا اسٹوڈیو بنایا اور سیٹ تیار کرکے فلمسازی کا کام شروع کردیا۔

فلم ''راجہ ہریش چندر'' پہلی بار چند مخصوص لوگوں کو ۲۱ر اپریل ۱۹۱۳ء کو بمبئی کے اولمپیا سنیما میں دکھائی گئی اور ۳ر مئی ۱۹۱۳ء کو یہ فلم بمبئی کے کارونیشن تھیٹر میں عام لوگوں کی نمائش کے لئے پیش کی گئی تھی۔اس فلم کی لمبائی ۳۷۰۰ رفٹ تھی۔ جو چار ریلوں کے ذریعہ لگ بھگ سوا گھنٹے میں دکھائی گئی۔اس فلم کو بنانے میں دادا صاحب پھالکے کو تقریباً آٹھ ماہ کا وقت لگا تھا۔پہلی بار یہ فلم ۲۳ر دن تک ایک ہی سنیما میں لگا تار چل کر کامیابی حاصل کر چکی تھی۔

اپنی پہلی فلم ''راجہ ہرش چند'' بمبئی میں بنانے کے باوجود دادا صاحب پھالکے چند دوسری پریشانیوں کی وجہ سے بمبئی میں فلمسازی کرنے میں دقتِ محسوس کررہے تھے، حالانکہ بمبئی میں فلمسازی سے متعلق ساز وسامان آسانی سے دستیاب ہوسکتا تھا۔انہیں لگا کہ یہ کام ناسک میں ہی زیادہ اطمینان سے ہوسکتا ہے۔ناسک شہر کے جنوبی حصہ میں ان کو ایک ایسی جگہ مل گئی جہاں شہروں والی بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ بڑا ہی پرسکون ماحول تھا۔وہاں شری کرشن کا ایک مندر تھا اور اس کے آس پاس کا بڑا علاقہ ایک نیک دل انسان شری بھاوے کی ملکیت تھا اور اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتے تھے۔مختلف قسم کے درختوں کی وجہ سے وہ جگہ کافی پرکیف لگتی تھی۔شری بھاوے نے مندر کے پاس ہی پھولوں کا ایک باغیچہ اور اس کے درمیان میں ایک فوارہ بھی بنوایا تھا۔ناسک سے تریمکیشور جانے والے راستے میں ایک مقام پراونٹ واڑی آتا ہے۔جہاں ایک بڑا کنواں ہمیشہ پانی سے بھرا رہتا تھا۔اسی کنویں سے ایک بڑی سی نالی کے ذریعہ پانی اس فوارے تک لایا جاتا تھا۔کچھ وقت کے بعد شری بھاوے نے یہ تمام جگہ شری ویدنامی ایک گجراتی کو بیچ دی اور مندر کی مورتی بھی وہ اپنے ساتھ لے گئے۔بعد میں دادا صاحب پھالکے نے یہ جگہ شری وید سے کرایہ پر حاصل کرلی اور وہیں اپنا اسٹوڈیو قائم کیا۔فوارے اور حوض کی وجہ سے یہ جگہ ''حوض کا بنگلہ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

دادا صاحب پھالکے نے فلمسازی کے لئے ''حوض کا بنگلہ'' والی جگہ پر بہت سی تبدیلیاں کرآئیں۔اپنی کمپنی کا صدر دفتر، فلم پروسیسنگ کے لئے لیبارٹری اور شوٹنگ میں استعمال ہونے والے مور، طوطے، ہرن اور خرگوش اور بندر جیسے چرند پرند پالنے کے لئے الگ انتظام کیا۔کھلی جگہ میں محل اور آشرم کے سیٹ بھی بنوائے، کیونکہ اس زمانے میں فلموں کی شوٹنگ سورج کی روشنی میں ہی ہوا کرتی

تھی۔کل ملا کر پھالکے نے اس مقام کو کافی خوشنما بنا دیا۔دادا صاحب نے اپنی پہلی فلم کی کامیابی سے حوصلہ پا کر اسی سال اپنی دوسری فلم ''بھسماسُر موہنی'' بنائی اور اس فلم میں نسوانی کردار ادا کرنے کے لئے ان کو دو خاتون بھی مل گئیں۔اس فلم میں پہلی بار پاروتی کا کردار درگا بائی گوکھلے او موہنی کا کردار ان کی بیٹی کملا بائی گوکھلے نے ادا کیا تھا۔یہ دونوں ماں بیٹی تھیں۔کملا گوکھلے آج کے مشہور کریکٹر ایکٹر وکرم گوکھلے کی دادی تھیں۔کملا بائی گوکھلے کے شوہر رگھوناتھ گوکھلے بھی اسٹیج پر اداکاری کرتے تھے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے کئی ناٹکوں میں نسوانی کردار ادا کئے تھے۔جب کہ کملا بائی گوکھلے کئی ناٹکوں میں مردانہ کردار ادا کرچکی تھیں۔یہ لوگ مہاراشٹر کے کونکن علاقے کے رہنے والے تھے۔کملا بائی گوکھلے کے بیٹے اور وکرم گوکھلے کے والد چندر کانت گوکھلے اب تک ۸۷ر برس کی عمر میں بھی شوقیہ طور پر اداکاری کرتے ہیں۔دادا صاحب پھالکے کی بنائی دوسری فلم ''بھسماسُر موہنی'' ۱۹۱۶ء میں ریلیز ہوئی تھی اور اس کے بعد ۱۹۱۷ء میں ان کی بنائی دو فلمیں ''ستیہ وان ساوتری'' اور ''لنکا دہن'' ریلیز ہوئیں۔فلم ''لنکا دہن'' مین اے۔سالنکے سے رام اور سیتا، دونوں کے کردار کراکے پھالکے نے ایک طرح سے ڈبل رول کی روایت ہی قائم کی۔بمبئی کے ''ویسٹ اینڈ سنیما'' میں دس دن چل کر ۳۲ر ہزار روپئے کی آمدنی سے اس فلم نے باکس آفس پر کامیابی کا پہلا ریکارڈ بھی قائم کیا۔ان دونوں فلموں نے ہی ہندوستانی عوام کا دل جیت لیا اور پھالکے صاحب نے اپنی کامیابی سے حوصلہ پا کر ۱۹۱۸ء میں فلم ''دی برتھ آف شری کرشن'' بنائی۔

اس کے ایک برس بعد ہی انہوں نے اپنی بیٹی منداکنی کو ہیروئن لے کر فلم ''کالیامردن'' ۱۹۱۹ء میں پیش کی۔اس سال انہوں نے کل ملا کر تین فلمیں بنائیں۔اسی درمیان انہوں نے ایک دستاویزی فلم ''ہاؤ فلمز آر میڈ'' بنائی، جس میں پہلی بار فلمسازی کی تکنیک پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی تھی۔

دادا صاحب پھالکے کی بنائی زیادہ تر دھارمک فلموں کی کامیابی اور ان کی طرف فلم بینوں کی توجہ کی خاص وجہ سے ان فلموں میں جادو، چمتکار اور کرشموں کے ایسے مناظر کی بھرمار ہوتی تھی جو ٹرک فوٹوگرافی (Trick Photography) سے تیار کئے جاتے تھے۔ایسے مناظر کو دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے اور بار بار ایسے ہی مناظر دیکھنا چاہتے تھے۔اس ٹرک فوٹوگرافی کے تجربے کے لئے انہوں

نے ''دی میجک آف پروفیسر کیلفا'' نام کی فلم بھی بنائی۔ جس طرح ۱۹۱۷ء میں ریلیز ان کی فلم ''لنکا دہن'' کو بڑی کامیابی ملی تھی، اس سے متاثر ہوکر اگلے برس ۱۹۱۸ء میں چند دوسرے ساجھی داروں کو شامل کرکے دادا صاحب نے ''پھالکے فلمس'' کی جگہ ایک نئی ''ہندوستان فلم کمپنی'' قائم کی اور اس بینر سے بنی فلم ''شری کرشن جنم'' بھی کافی کامیاب ہوئی۔ ۱۹۱۷ء میں جنم اشٹمی کے دن یہ فلم مجیسٹک تھیٹر میں ریلیز ہوئی اس فلم نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۹۳۱ء تک اس ایک ہی فلم نے کل تین لاکھ روپے کمائے، جو ان دنوں کے حساب سے بہت زیادہ آمدنی تھی۔ ان کی اگلی فلم ''کالیا مردن'' ۱۹۱۹ء میں آئی۔ اس فلم میں پھالکے کی ٹرک فوٹوگرافی کے مناظر نے دھوم مچادی۔

ان کی فلموں میں کرشن کا کالا ناگ سے لڑنا، ہنومان کا آسمان میں اڑنا اور ان کی پونچھ کے ذریعہ لنکا میں آگ لگانا جیسے مناظر نے پھالکے کو ٹرک فوٹوگرافی کے لئے الگ سے ایک نئی پہچان دلائی تھی۔ لیکن چند برسوں میں ہی ساجھی داروں سے تال میل ٹھیک نہ بیٹھنے کی وجہ سے دادا صاحب پھالکے ۱۹۲۱ء میں اس کمپنی سے الگ ہوکر بنارس چلے گئے اور وہاں رہ کر ہی ناٹک لکھنے شروع کردیئے۔ پانچ برس بنارس میں رہ کر جب وہ واپس بمبئی آئے تو فلمی دنیا کا طرز زندگی ہی بدل چکا تھا۔ اس درمیان کلکتہ میں ''کوہ نور'' اور بمبئی میں ''مہاراشٹر کمپنی'' تیزی سے امریکی فلموں کی نقل میں فلمیں بنارہی تھیں۔ لہذا دادا صاحب پھالکے اس نئے ماحول میں خود کو زیادہ بہتر محسوس نہ کرسکے۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۰ء تک پھالکے اپنے کام میں پوری محنت اور لگن سے لگے رہے۔ اپنی دیو مالائی فلموں کے ذریعہ انہوں نے ذات، برادری، چھوا چھوت، توہم پرستی اور فرقہ پرستی کے خلاف انتہائی ترقی پسند طرز پر کام کیا۔ ان کی اس روایت کو بعد میں بھال جی پنڈھارکر اور وی۔ شانتارام جیسے باصلاحیت فلمسازوں نے بھی قائم رکھا۔ خاموش فلموں کا یہ سنہرا دور تھا۔ اس کے بعد ۱۴/مارچ ۱۹۳۱ء کو ہندوستان کی پہلی متکلم فلم ''عالم آراء'' آردیشر ایرانی نے پیش کی۔ دادا صاحب نے ۱۹۳۲ء میں اپنی آخری خاموش فلم ''ستیو بندھ'' بنا کر اپنے آپ کو اس کاروبار سے الگ کرلیا۔ کافی عرصہ تک دادا پھالکے فلمی دنیا سے الگ تھلگ رہے اور اس طرح ان کی مالی اور گھریلو حالات بھی خراب ہوتے چلے گئے۔ ۱۹۳۷ء میں کولہاپور سِنے ٹون نے اپنی مراٹھی اور ہندی میں ایک ساتھ بننے والی فلم ''گنگا اوترن'' کی ہدایت کی ذمہ

داری کے ساتھ مکالمے اور موسیقی کا کام بھی ان کو سونپا گیا۔ اس فلم میں دادا صاحب نے ایک بار پھر اپنی ٹرک فوٹوگرافی کے جلوئے دکھائے۔ یہ فلم ان کی متکلم پہلی اور اکلوتی فلم ثابت ہوئی۔

ہندوستانی سنیما کے اس باوا آدم نے اپنی زندگی کے آخری چند برس بڑی کسمپری کے عالم میں گزارے۔ ان کے آخری دنوں کا ایک واقعہ جو فلمساز و ہدایتکار پنڈت کیدار شرما نے ایک بار سنایا، وہ یہ تھا کہ ایک دن بمبئی کے رنجیت اسٹوڈیو کے باہر دادا صاحب پھالکے خاکی پینٹ اور ایک ڈھیلی ڈھالی سی قمیض پہنے کھڑے تھے۔ کیدار شرما جب اسٹوڈیو سے باہر نکلے تب پھالکے نے پہلے تو ان کے کام اور فلمسازی میں ان کے ہنر کی تعریف کی اور پھر کہا کہ کیا وہ اپنے اسٹوڈیو میں ان کو کوئی کام دلوا سکتے ہیں؟ یہاں تک کہ پھالکے صاحب اسٹوڈیو میں کیمرے صاف کرنے اور ان میں تیل ڈالنے کے لئے تیار تھے۔ کیدار شرما نے ان کو اسٹوڈیو کے مالک چندولعل شاہ کے پاس بھیج دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سیٹھ چندولعل شاہ نے نہ صرف انہیں کام دینے سے انکار کردیا بلکہ چوکیدار سے کہہ کر اسٹوڈیو کے باہر نکلوادیا۔ یہ وہی دادا صاحب پھالکے تھے جنہوں نے ہندوستان جیسے بڑے ملک میں فلم انڈسٹری کی بنیاد کی پہلی اینٹ رکھی تھی اور اس کام کے لئے اپنی بیوی کے گہنے تک بیچ ڈالا تھا۔ بعد میں اس پورے منظر کو گرودت نے اپنی بے مثال فلم ''کاغذ کے پھول'' میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا تھا، اور رشی کیش مکرجی نے اپنی فلم ''گڈی'' میں جس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ کچھ اسی طرح کا حال فلمی دنیا کے ایک بڑے ستون بابوراؤ پینٹر کا بھی ہوا تھا۔ بعد میں چندولعل شاہ کے بارے میں بھی سنا گیا کہ وہ اپنے آخری دنوں میں اپنے ہی اسٹوڈیو کے باہر اپنی بنائی ہوئی فلموں کے فوٹو اور پوسٹر بیچتے ہوئے پائے گئے۔ آج دادا صاحب پھالکے کے نام پر قائم ہندوستان کا سب سے بڑا فلمی اعزاز ''دادا صاحب پھالکے ایوارڈ'' کو حاصل کرکے ہمارے فلمی دنیا کے لوگ اپنے آپ پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ اعزاز فلمی دنیا میں اپنی زندگی کے بیش قیمت ماہ و سال گزار کر کچھ کر گزرنے والے فنکاروں کو دیا جاتا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ حکومت ہند نے قائم کیا تھا اور اس برس پہلا ایوارڈ حاصل کرنے والی ایک خاتون اداکارہ دیویکا رانی تھیں۔ حکومت ہند کے محکمہ ڈاک تار نے دادا صاحب پھالکے کے سوویں جنم دن کے موقع پر ۳۰/اپریل ۱۹۷۱ء کو ایک خصوصی ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا تھا۔ بمبئی میں دادر علاقے

کی ایک سڑک کا نام بھی ان کے نام پر داداصاحب پھالکے روڈ رکھا گیا ہے۔

داداصاحب پھالکے نے اپنی زندگی کے چونسٹھویں برس میں اپنی اکلوتی متکلم اور آخری فلم ''گنگاوترن'' ۱۹۳۷ء میں بنائی تھی۔کل ملا کر انہوں نے تقریباً بیس فیچر اور ستانوے دستاویزی فلمیں بنائیں، مگر ان کی مالی حالت ہمیشہ خستہ ہی رہی۔۷۱/برس کی عمر میں ۱۶/فروری ۱۹۴۴ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔انہوں نے اپنی عمر کے آخری کئی برس گمنامی میں ہی گزارے۔مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب جب ہندوستانی سینما کی بات ہوگی، داداصاحب پھالکے کے نام کا تذکرہ ضرور ہوگا۔

☆☆☆

خان بہادر اردلیشر ایرانی۔پہلی بولتی فلم کے خالق

رشید انجم (بھوپال)

آردلیشر ایرانی ۵/دسمبر ۱۸۸۶ء کو مہاراشٹر کے شہر پونہ میں آباد پارسی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مروان جی ایرانی پونہ میں آلات موسیقی کی تجارت کرتے تھے۔بمبئی کے جے جے آرٹس اسکول و کالج میں ان کی تعلیم ہوئی۔اردو اور انگریزی میں ڈگریاں حاصل کیں۔گھرانہ زیادہ متمول نہیں تھا۔ہوش سنبھالا تو مدرسی کا پیشہ اپنایا۔پھر کیروسین کی تقسیم کے نگراں مقرر ہوئے کچھ عرصہ پولس کے حفاظتی دستے میں ملازمت کی اور جب یہ بھی راس نہ آیا تو والد کی تجارت میں ہاتھ بٹانے لگے۔فنونِ لطیفہ سے خاص دلچسپی نے انھیں مستقل مزاج نہیں ہونے دیا۔پارسی تھیٹر عروج پر تھا لیکن پونہ پیشوائی شہر ہونے کے ناطے مراٹھی ثقافت کے زیر اثر تھا، اس لئے بمبئی کو منتخب کیا اور تھیٹر سے وابستہ ہوگئے۔آغا حشر اور نارائن پرساد بیتاب وغیرہ کے ڈراموں کی دھوم تھی۔اردشیر ایرانی کبھی کبھی ڈراموں میں اداکاری بھی کر لیتے تھے مگر ان کی نگاہ تھیٹر کی فنی باریکیوں پر رہتی تھی۔اس فن کا مطالعہ بہت خاموشی سے جاری رکھا۔بمبئی میں خاموش فلموں کی ہلچل شروع ہوچکی تھی۔انھوں نے فلموں کے تخلیقی اور تکنیکی مشاہدے کے علاوہ کیمرہ ورک کو بھی سمجھنے کی کوشش کی اور وہ پوری طرح فلموں کی جانب راغب ہوگئے۔

مغربی ممالک سے درآمد خاموش فلمیں خیمہ لگا کر عوام کو ایک آنہ، آدھ آنہ ٹکٹ پر دکھائی جارہی تھیں۔ایسے ہی ایک تاجر عبدالعلی یوسف علی سے اردشیر ملے تو دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوگئے اور یہ تاثر پارٹنر شپ میں تبدیل ہوگیا۔۱۹۰۵ء میں محض ۱۹ سال کی عمر میں اردشیر نے بھی ٹینٹ سنیما قائم کر لیا اور دونوں مغربی فلمیں دکھانے لگے۔ان کی تاجرانہ پالیسی نے جلد ہی بالی ووڈ کو دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا اور بالی ووڈ کے فلم تقسیم کار ادارے یونیورس پکچرس نے ہندوستان میں اردشیر کو اپنا نمائندہ مقرر کر دیا۔

۱۹۱۲ء میں داداصاحب تورنے نے پہلی ڈرامیٹک فلم ''سنت پنڈولک'' فلم فیتے پر منتقل کی اور ۱۹۱۳ء میں داداصاحب پھالکے ہندوستان کی پہلی خاموش فیچر فلم ''راجہ ہریش چندر'' بنا کر تاریخی شخصیت بن گئے۔داداصاحب پھالکے کی فلموں کا S u b j e c t دھارمک دیومالا کہانیاں

رہا۔اردشیر ایرانی کا ذہن اس سے آگے کی پلاننگ میں مصروف تھا۔ وہ ایسا کارنامہ انجام دینا چاہتے تھے، جس سے ان کا نام دادا صاحب پھالکے سے کم تر نہ رہے۔

اُن کی تاجرانہ ذہنیت نے سب سے قبل فلموں کے غیر منظّم تقسیم کار طریقے کو محسوس کیا۔ انھوں نے باہر سے درآمد غیر ملکی فلموں اور ہندوستان میں بن رہی فلموں کے لیے تجارتی اصول وضع کئے اور امریکی یونیورس پکچرس ڈسٹری بیوٹرس کے نام سے آزاد اور ذاتی Agency قائم کر ڈالی یہ ہندوستان کا سب سے پہلا تقسیم کار ادارہ تھا۔ اس ایجنسی کے قیام سے جہاں فلموں کے تخلیق کاروں اور نمائش گاہوں میں فلم دکھائے جانے والے تاجروں کے درمیان تجارتی رابطہ قائم ہوا وہاں دیگر نمائشی تنظیم بھی آئی اور ڈسٹری بیوٹرا ایجنسی کو بھی مالی منفعت حاصل ہونے لگی۔

اس جانب سے مطمئن ہونے کے بعد اردشیر ایرانی نے دوسری اہم ترین ضرورت پر توجہ مبذول کی۔ وہ ضرورت تھی سنیما ہال کی کمی۔ فلموں کو اب تک تھیٹر کی عمارت یا پھر کسی کلب کو کرائے پر لے کر دکھایا جاتا تھا۔ اکثر یہ عمارتیں حاصل نہیں ہو پاتی تھیں جس سے فلم کی نمائش پر اثر پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ نشستوں کا غیر معقول انتظام، پروجیکٹر اور پردے کے مابین تکنیکی اڑچنیں بھی آتی تھیں۔ جس کی وجہ سے یکسوئی قائم نہیں ہو پاتی تھی۔ اردشیر نے ان اہم بنیادی مسائل کو شدت سے محسوس کیا۔ فنی اور تجارتی جائزہ بھی لیا اور ایک ایسی عمارت کی تعمیر پر غور کرتے رہے جس میں وہ ساری سہولیات حاصل ہوں جو ایک فلم کی نمائش کے لیے لازمی ہوتی ہیں۔ ان کے پاس سرمائے کی کمی تھی جسے ان کے پارٹنر عبدالعلی یوسف علی نے پورا کر دیا اور دونوں کے مشترکہ سرمائے سے ہندوستان کا پہلا سنیما ہاؤس تعمیر کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔

۱۹۱۴ء میں اس سنیما ہاؤس کا نام الیگزنڈر رکھا گیا مگر چند تجارتی مجبوریوں کی وجہ سے ۱۹۱۸ء میں اسے میجسٹک نام میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ بمبئی کے گرگام میں واقع تھا۔ ۱۹۳۹ء میں جیوتی ٹاکیز میں ضم ہو کر ان کے بیٹے شاپور جی کے قبضے میں آ گیا جو فلم ''مغلِ اعظم'' کے فائنانسر بھی تھے اور پھر بڑھتی آبادی میں یہ تاریخی سنیما ایسا گم ہوا کہ آج کوئی اس کی صحیح نشاندہی بھی کرنے سے قاصر ہے۔

سنیما ہاؤس کی تعمیر سے فلم تخلیق کاروں کی کئی پریشانیوں کا سدِ باب ہو گیا۔ اس جانب سے مطمئن ہونے کے بعد اردشیر ایرانی نے فلموں کی تخلیق کی جانب توجہ مبذول کی۔ فلم ڈسٹری بیوشن اور سنیما ہاؤس

کے مالک ہونے کی حیثیت سے بے شمار منافع حاصل کر چکے اردشیر ایرانی نے اپنی ذاتی فلم کمپنی کے قیام پر غور کیا۔ عبدالعلی یوسف علی ان کے سب سے قریبی با اعتماد پارٹنر تھے لیکن فلم کمپنی کے قیام میں ایک گجراتی تاجر بھوگی لال دوبے کی پارٹنرشپ قبول کر لی۔ ۱۹۲۰ء میں اسٹار فلم کمپنی نے وجود پایا ۱۹۲۱ء میں اس فلم کمپنی کی پہلی فلم ''ویرا بھی مینو'' منی لال جوشی کی ہدایت میں بنا کر ۱۹۲۲ء میں ریلیز کی مگر یہ تجربہ منافع بخش ثابت نہیں ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں وہ مدراس گئے جہاں رگھوپتی وین کیا اور ان کے بیٹے پرکاش وین کیا کی پارٹنر شپ میں اسٹار آف دی ایسٹ فلم کمپنی کی بنیاد ڈال کر ''بھیم پرتگیہ'' بنائی اور کچھ دھارمک فلمیں بنا کر ناکامیابی سے دل برداشتہ ہو کر بمبئی لوٹ آئے۔

۱۹۲۵ء میں انھوں نے ایک اور بڑا کارنامہ کر دکھایا بمبئی میں رائل آرٹ اسٹوڈیو، ہالی ووڈ کی طرز تعمیر پر قائم کیا جسے ہندوستان کا پہلا اور سب سے بڑا Magor silent erastudio کا درجہ حاصل ہوا۔

۱۹۲۶ء میں انھوں نے بالآخر اپنی ذاتی فلم کمپنی ایمپیریل فلمز کی داغ بیل ڈالی۔ اردشیر ایرانی نے اس بار تاریخی Subject چنا اور موہن بھونانی کی ہدایت میں شیواجی کی شخصیت پر مبنی فلم ''میواڑ سنگھ'' بنائی جو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکی۔ اردشیر ایرانی نے آغا حشر کاشمیری کو دعوت دی۔ آغا حشر نے اپنے ڈرامے ''خوابِ ہستی'' کا فلم اسکرپٹ تیار کیا۔

موہن بھونانی کی ہدایت میں بنی اس فلم کی کامیابی نے ایمپیریل فلمز کمپنی کو مستحکم کر دیا۔ ۱۹۲۷ء میں ریلیز اس فلم سے ہی سب سے پہلی بار فلم نائٹ شفٹ کا آغاز ہوا تھا۔

''خوابِ ہستی'' گو بے زبان تھی مگر مسلم ماحول میں فلمائی گئی تھی۔ پہلی بار اردو ماحول کو اس فلم سے بڑھاوا حاصل ہوا۔ ''نور جہاں'' ایمپیریل کمپنی کی وہ دوسری فلم تھی جس میں مغلیہ سلطنت کے جاہ وجلال کو پہلی بار پیش کیا گیا تھا۔ ملکہ نور جہاں کے تاریخی حادثے کو واقعاتی تصور دے کر بادشاہ جہانگیر کے غیر جانبدار انصاف کو کمال ہنرمندی سے فلمایا گیا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں ریلیز اس فلم نے بے پناہ کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۳۱ء میں ''عالم آرا'' کے بعد اردشیر نے اس فلم کو عذرا میر کی ہدایت میں زبان دے دی اور پھر کامیاب رہے (یاد رہے ۱۹۳۹ء میں اسی واقعہ پر کمال امروہی نے فلم ''پکار'' بھی بنائی تھی) ''نور جہاں'' ۱۹۳۱ء کی وہ پہلی فلم تھی جو بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں تخلیق ہوئی تھی اور ہندوستان کی یہ پہلی انگریزی زبان کی فلم بھی تسلیم کی گئی ہے۔

۱۹۲۷ء میں اردشیر ایرانی نے ایک اور کارنامہ انجام دیا۔ مغل شہزادہ سلیم اور انارکلی کی ہنگامہ خیز محبت پر مبنی فلم ''انارکلی'' محض سات دن کی مختصر شوٹنگ میں مکمل کر کے پیش کر دی۔ امتیاز علی تاج کے ڈرامے پر بنی اس فلم کی خصوصیت یہ تھی کہ پہلی بار تاریخی مقامات پر اسے فلمایا گیا اور صرف سات دن کی ہنگامی شوٹنگ نے ریکارڈ قائم کیا تھا۔

اس فلم میں جس کا اردو نام ''انارکلی'' رکھا گیا تھا، ایک اینگلو انڈین لیڈی روبی میئر نے پہلی بار انارکلی کا رول ادا کیا تھا۔ جو بعد میں سلوچنا کے نام سے مشہور ہوئی تھیں۔

۱۹۲۹ء میں امریکہ اور پھر یورپ کے بیشتر فلم سازوں نے فلموں کو آواز دینے کے آلات ایجاد کر لیے تھے مگر ہندوستان کی فلموں میں اس تکنیک کے پہونچنے میں دوسال کا عرصہ لگ گیا۔

۲۵ر مئی ۱۹۲۹ء کو پہلی Partely sound فلم ''دی جاز سنگر'' امریکہ میں ریلیز ہوئی اور ۴۰ فیصد بولتی فلم Show boat بمبئی کے ایکسیل سئیر تھیٹر میں دکھائی گئی تھی جسے دیکھ کر اردشیر ایرانی نے بولتی فلم بنانے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ ان دنوں ڈیوڈ جوزف کا ایک ناٹک بہت مقبول ہو رہا تھا۔ اردشیر ایرانی نے ڈیوڈ جوزف سے اس کا اردو Version تیار کرایا اور وہ اپنے ساتھی ستم بھڑوچہ کے ہمراہ لندن چلے گئے جہاں ایک ماہ تک انھوں نے ریکارڈنگ سسٹم کی ٹریننگ لی اور بمبئی پھر واپس آ گئے۔ عبدالعلی یوسف علی اب بھی ان کے پارٹنر تھے۔ بمبئی آ کر پورے منصوبے بند طریقے سے ساؤنڈ فلم بنانے کی تیاری میں منہمک ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور فلم ساز پہل کرتا اردشیر ایرانی فلم کو آواز دینے میں کامیاب ہو گئے۔ فلم ''عالم آرا'' ہندوستان کی پہلی بولتی فیچر فلم تھی جس نے فلم انڈسٹری کو روشن اور طاقتور اظہار کے دور میں داخل کر دیا۔

اور اردشیر ایرانی ہندوستان کی پہلی بولتی فلم کے خالق کی حیثیت سے فلم کی تاریخ کا عہد ساز حصہ بن کر امر ہو گئے۔ ۱۹۳۱ء میں فلم ''شیریں فرہاد'' بنائی جس میں ماسٹر نثار نے فرہاد اور جہاں آرا کجن نے شیریں کے رول نبھائے تھے اس سال انھوں نے اپنی خاموش فلم ''نورجہاں'' کو بھی زبان دے کر دوبارہ بنایا تھا۔

۱۹۳۳ء میں انھوں نے ہندوستان کی مکمل پہلی انگریزی فلم Temple Bells بنائی جس کا ہندوستانی نام ''سلوچنا'' بھی تھا اور روبی میئر عرف سلوچنا ہیروئن تھیں۔ اس سال ان کی فلمی اور سماجی خدمات کے اعتراف میں برٹش سرکار نے انھیں خان بہادر کے خطاب سے نوازا اس سال انھوں نے فارسی زبان میں

فلم ''دخترِ لور بار ایرانی دروز امروز'' بنائی جو ایران کی پہلی فلم تسلیم کی گئی تھی۔

۱۹۳۵ء میں اپنی خاموش فلم ''انارکلی'' کو نئے سیٹ اپ کے ساتھ متکلم بنایا لیکن اسٹار کاسٹ وہی رکھی۔ اس فلم کی بے پناہ کامیابی نے فلم کی ہیروئن روبی میئر کو انڈین اسکرین کی پہلی خاتون اسٹار اداکارہ کا اعزاز دلا دیا۔

۱۹۳۷ء میں اردشیر ایرانی نے Cinecolour film process کی تکنیک پر ہندوستان میں پہلی Colour lab قائم کی جس کا افتتاح برٹش گورنر لارڈ بریبورن نے کیا تھا۔ اس کلر لیب میں ۱۹۳۷ء کی پہلی ہندوستان کی کلر فلم ''کسان کنیا'' کی تخلیق عمل میں آئی۔ داداصاحب پھالکے بذاتِ خود ان سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی خاموش فلم ''ستیو بندھ'' کو زبان دینے کے لیے اردشیر ایرانی کی خدمات حاصل کیں۔ چالیس ہزار کی لاگت سے اس فلم کو زبان تو مل گئی مگر فلم نفع بخش ثابت نہیں ہو سکی۔ اردشیر ایرانی ہندوستان کے وہ پہلے اور آخری فلم ساز تھے جنھوں نے اپنے دور میں فارسی، عربی، انگریزی، روسی، برمیز اور پشتو جیسی بین الاقوامی زبانوں کے علاوہ ہندوستان کی اردو ہندی، گجراتی، مراٹھی، تلگو، تامل، کنڑ، ملیالم زبانوں میں بھی فلمیں بنا کر تاریخی حیثیت حاصل کی تھی۔

ٹاکی فلموں کی سلور جوبلی تقاریب کے موقع پر ۲۲ر دسمبر ۱۹۵۶ء میں انھیں مرکزی سرکار نے ''فادر آف انڈین ٹاکی'' کا اعزاز دیا تھا۔ ان کے انتقال کے پانچ سال بعد ۱۹۷۸ء میں بمبئی کے کینیڈی برج کا نام دے کر اردشیر ایرانی برج کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔

تقریباً ایک سو پچاس فلموں کا خالق اور ہندوستان فلم انڈسٹری کو عہد ساز دور سے جوڑ کر عظیم کارنامے انجام دینے والا یہ شخص ۸۳ سال کی عمر میں محض چار ماہ کی علالت کے بعد ۱۴ر اکتوبر ۱۹۶۹ء کو بمبئی پارسی اسپتال کے جنرل وارڈ میں چپ چاپ دنیا سے رخصت ہو گیا۔

آج کا کوئی فلم شائق اس عظیم انسان سے پوری طرح واقف نہیں ہے۔ داداصاحب پھالکے نے بے شک پہلی خاموش فلم تخلیق کی مگر اردشیر ایرانی نے نہ صرف فلموں کو زبان دی بلکہ لاتعداد فنی، تعمیری اور تخلیقی کارنامے بھی انجام دیے جب کہ داداصاحب پھالکے کو فلم کا موجد مان کر (اس کے علاوہ ان کا اور کوئی کارنامہ نہیں ہے) انڈیا گورنمنٹ نے داداصاحب پھالکے کے نام سے بڑا ایوارڈ جاری کیا ہوا ہے۔ یہی نہیں ان کے

نام سے مہاراشٹر بمبئی میں پھالکے اکاڈمی بھی قائم ہے اور بمبئی کی فلم انڈسٹری کو ان کے نام سے موسوم کیا جا چکا ہے۔لیکن افسوس خان بہادر اردشیر ایرانی کی خدمات،تعاون اور غیر معمولی کارناموں کو صرف ایک فلائی اور سے جوڑ کر انھیں نظر انداز کر دیا گیا۔اردشیر ایرانی اگر ہالی ووڈ یا کسی اور ملک میں فلموں سے وابستہ شخصیت ہوتے تو شاید یوں محروم نہ رکھے جاتے۔یہ ہندوستان ہی ہے جو قابل قدر ہستیوں کو تعصب کا شکار بنا کر فراموش کرنے میں آپ اپنا جواب ہے۔

آج امیتابھ،ایشوریہ رائے اور شاہ رخ خان کے موی مجسموں کو بنا کر انھیں یاد رکھنے کی پبلسٹی کی جاتی ہے۔لیکن مشاہدہ سے ثابت ہے کہ یہ صرف اداکار ہیں ان سے ہٹ کر ان کو فنی،ارتقائی،تکنیکی،تاریخی اور سماجی اشتراک فلم انڈسٹری یا ملک کو نہیں ملا جس پر ہم یا ہماری نسل کو بجا طور پر فخر ہو سکے۔اردشیر ایرانی کو نظر انداز کیا جانا ذہنی فرقہ پرست دیوالیہ پن پر ہی محمول کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

عظیم ہدایت کار۔کے۔آصف

محمد عبدالسلام

کے آصف (کریم الدین آصف) ہندوستانی فلمی صنعت کی وہ قدآور شخصیت ہیں جو انڈسٹری کے قیام سے آج تک اپنی قابلیت کا لوہا منوانے والے ہدایتکاروں کی فہرست میں آج بھی سب سے اوپر ہیں بھلے ہی ان ہدایتکاروں نے سینکڑوں کامیاب فلمیں دی ہوں لیکن اپنے مکمل کیریئر میں صرف اور صرف ساڑھے تین فلمیں بنانے والے کے آصف فلمی تاریخ کے لیے آج بھی سب سے زیادہ اہم اور عظیم ہیں ان کی تاریخی فلم ''مغلِ اعظم'' کی وجہ سے فلمی تاریخ میں مرحوم کے آصف کا نام ہمیشہ جاوداں رہے گا وہ فطری طور پر رومانی تھے لاہور میں ان کی پہلی بیوی اور بچے ہونے کے باوجود وہ یاسمین نام کی لڑکی سے عشق کر بیٹھے معاملہ شادی تک نہیں پہنچ سکا عشق میں ناکام ہو کر وہ مجنوں کی طرح دردر کی خاک چھاننے لگے تھے یہ بات ان کے ماموں جان نذیر (جو اپنے وقت کے اسٹار تھے) کو ناگوار گزری انہوں نے کے آصف صاحب کی اس حالت کو اس وقت کی مشہور ترین ہیروئن اور کتھک ڈانسر ستارہ دیوی کے سامنے رکھی اور ان سے پانچ ہزار روپئے لیکر فلم بنانے کا منصوبہ بنایا کے آصف کی نگرانی میں یہ فلم بننے والی تھی ان دنوں عبدالرشید کاردار (اے آر کاردار) کی فلم کمپنی سے ستارہ دیوی جڑی ہوئی تھیں ستارہ دیوی کو آصف صاحب کی حالت پر ترس آرہا تھا آخر کار دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے کے آصف کے دل میں یاسمین کی جدائی سے جو خلاء پیدا ہوا تھا اس کو ستارہ دیوی نے پُر کر دیا ستارہ دیوی اور کے آصف کا پیار پروان چڑھنے لگا جبکہ دوسری طرف خود نذیر بھی ستارہ سے پیار کرتے تھے ستارہ دیوی کی مدد سے جو فلم بنا رہے تھے اس میں کے آصف نے دلچسپی نہیں دکھائی لہٰذا نذیر نے فلم بنانے کا منصوبہ ہی ترک کر دیا دلچسپ بات یہ تھی کہ نذیر کو ستارہ اور کے آصف کے عشق کا علم نہیں تھا اور نہ ہی ستارہ کو کے آصف کی پہلی بیوی اور بچوں کے بارے میں کچھ معلوم تھا اب نذیر نے اپنا فرض نبھاتے ہوئے کے آصف کے لئے ایک ٹیلرنگ شاپ کھول دی جس میں دس بارہ ٹیلر کام کرنے لگے۔لیکن کے آصف اپنے ہی اک ملازم ٹیلیر کی بیٹی سے آنکھیں چار کر بیٹھے ان کے اس رومان نے ان کا بیڑہ ہی غرق کر دیا ہزاروں کا خسارہ ہو گیا نذیر کو یہ دوکان بند کرنی پڑی کے آصف اور ستارہ دیوی ایک ساتھ تیرا کی اور دیگر کھیل کھیلتے ایک طرح سے ستارہ دیوی کے آصف

کے پیار میں بری طرح گرفتار ہو چکی تھیں فلم بنانے کا خواب تو کے آصف صاحب دیکھ ہی چکے تھے انہوں نے ستارہ دیوی کو لیکر فلم ''سلمٰی بنانے کا منصوبہ تیار کیا مہورت کی تاریخ طے کر کے وہ کسی کام سے دہلی چلے گئے جب مہورت کا دن قریب آیا تبھی کے۔آصف کا کہیں اتہ پتہ نہیں تھا بعد میں نذیر کے کہنے پر ستارہ دیوی نے سلمٰی کی شوٹنگ شروع کر دی جب کے۔آصف کی واپسی ہوئی تو انہیں یہ بات بہت ہی بری لگی کہ ستارہ نے ان کا انتظار نہیں کیا انہوں نے طیش میں آکر فلم بنانے کا پروگرام ہی منسوخ کر دیا۔۱۹۴۴ء میں کے آصف نے خاموشی سے دہلی میں شادی رچالی یہ بات جب نذیر کو معلوم ہوئی تو انہوں نے آپے سے باہر ہو کر کے۔آصف کی پٹائی کر دی نذیر کی بہن یعنی آصف کی والدہ نے ستارہ دیوی سے منت سماجت کی کہ وہ کے۔آصف کو چھوڑ کر نذیر کو اپنا لیں مگر ان میں دو پریمیوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا ستارہ دیوی اُس زمانے میں ایک فلم میں پرتھوی راج کپور وینا، یعقوب، درگا کھوٹے، آغا، ستارہ دیوی کے علاوہ پہلی بار ثریا کو کام کرنے کا موقع ملا فلم ''پھول'' کے شروع ہوتے ہی کے۔آصف اور ہیروئن وینا میں عشق کی کھچڑی پکنے لگی اسی وجہ کو لیکر کے آصف اور ستارہ دیوی میں جھگڑا شروع ہو گیا پھر کے آصف نے اپنی بیوی ستارہ دیوی کو یہ یقین دلایا کہ یہ سب دل بہلائی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں فلم ''پھول'' کے ریلیز ہوتے ہی کے آصف کی شہرت کے ڈھول بجنے لگے لیکن جب بیوی نے فلم میں لگائے گئے سرمایہ کا تقاضہ کیا تو وہ بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ ٹال دیئے آزادی کے بعد کے۔آصف نے اپنا خود کا پروڈکشن شروع کیا فلم ''جوار بھاٹا'' میں دلیپ کمار کے کام سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی فلم ''انارکلی'' میں انہیں سلیم کا رول دینے کا فیصلہ کیا۔لیکن دلیپ کمار کے دبلے پن کی وجہ سے یہ رول سپرو کے حصہ میں چلا گیا۔وینا اور نرگس ''انارکلی'' میں مرکزی کرداروں میں تھیں لیکن دس ریل بنتے ہی اکبر کا رول نبھانے والے اداکار چندر موہن چل بسے فینا نسر سراج سیٹھ جو اپنا فلیٹ فروخت کر کے چلے گئے اور انارکلی مکمل کرنے کا یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا اب کے آصف نے دلیپ کمار اور نرگس کو لیکر فلم ''ہلچل'' بنانے کا فیصلہ کیا اس فلم کے دوران انہیں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا انہیں اپنی بیوی کے زیور بیچ کر فلم مکمل کرنی پڑی یہ فلم زبردست ہٹ رہی ہلچل کے بعد کے آصف نے پھر سے انارکلی کو بنانے کا ارادہ کیا اس کا نیا نام ''مغلِ اعظم'' رکھا گیا سراج سیٹھ کے علاوہ شاہ پورجی، پالن جی نے بھی فلم پر سرمایہ لگانے کا فیصلہ کیا اس زمانے میں کے آصف کو ''مغل اعظم'' بنانے کے لیے ایک کروڑ پینتیس لاکھ

روپیوں کی ضرورت تھی لہٰذا اس فلم کے لیے بینک سے کافی قرض لیا گیا۔''مغلِ اعظم'' کی بہار کے روپ میں نگار سلطانہ کا انتخاب ہوا نگار کے شوہر یوسف نے انہیں یہ کردار کرنے سے منع کیا تھا بعد میں اس رول کو کرنے پر یوسف نے نگار کو طلاق دے کر اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لیے الگ کر دیا اب کے آصف نگار کے ہاں آنے جانے لگے بات یہاں تک بڑھ گئی کہ ایک روز انہوں نے نگار سے نکاح بھی کر لیا ستارہ دیوی کو یہ بات کھلنے لگی انہوں نے کے آصف کے خلاف عدالت کے دروازے پر دستک دینے کی دھمکی دے دی مگر کے آصف ٹس سے مس نہ ہوئے وہ اپنے ارادے کو بدلنے کے لیے بالکل تیار نہ تھے ادھر نگار اپنی اور کے آصف کی شادی کی خبر کو بالکل بے بنیاد بتا رہی تھی۔ستارہ دیوی اپنے شوہر کے آصف کے کارناموں سے بہت تنگ آ چکی تھیں ان کے دل میں کے آصف کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کی تمنا جاگ اٹھی کے آصف ''مغل اعظم'' کی شوٹنگ جۓ پور میں کر رہے تھے کہ ایک دن شوٹنگ کے مقام پر ستارہ دیوی آ ٹپکی ان کے آنے کی کے آصف کو خبر نہ تھی وہیں انہوں نے کے آصف اور نگار کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا لیکن ستارہ دیوی نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی زندگی میں کوئی دوسری عورت آئے آخر تنگ آ کر انہوں نے کے آصف سے رشتہ توڑ کر پرتاپ باروٹ سے رشتہ جوڑ لیا یعنی شادی کر لی۔''مغل اعظم'' نے کے آصف کو نام دیا، دولت دی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی زندگی میں دلیپ کمار کی بہن اختر آئیں نگار کو تو اختر اور کے آصف کی شادی پر افسوس نہیں تھا مگر ستارہ دیوی کو یہ سنکر شدید صدمہ ہوا ان سے دور ہونے کے باوجود بھی ستارہ دیوی کے دل سے کے آصف نکل نہ پائے وہ دل ہی دل میں انہیں چاہتی تھیں ''مغلِ اعظم'' کے بعد کے آصف نے ''لو اینڈ گاڈ'' (محبت اور خدا) پر کام کرنا شروع کر دیا اور فلم کے ساتھ کئی ٹریجڈیز ہوئے فلم کے ہیرو گرو دت کی موت کے بعد کئی ہستیاں یکے بعد دیگر چل بسیں اسی فلم کے دوران سنجیو کمار کا انتقال بھی ہوا۔بات ۸/مارچ ۱۹۷۲ء کی ہے کے آصف گو پی کرشن کے ذریعہ اپنی سابقہ بیوی ستارہ دیوی کو ۹/مارچ کے دن ملنے کی اطلاع دی مگر ۹/مارچ کے روز ستارہ دیوی کا ایک شو تھا۔لہٰذا ۱۵/مارچ کو ملنا طے پایا لیکن ۹/مارچ کی شام ۳۰۔۶ بجے ہی کے آصف اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔کے آصف کی موت کے بعد ان کی بیوہ اختر نے فلم ''محبت اور خدا'' کے فائنانسر رشید عربا سے شادی رچالی۔

☆☆☆

بھارت رتن ۔ ستیہ جیت رے

ڈاکٹرالف انصاری (مغربی بنگال)

مختلف شعبۂ حیات میں کچھ ایسی عظیم شخصیتیں ہوتی ہیں جن کے سبب ملک وقوم کا نام ساری دنیا میں روشن ہوتا ہے ان ہی عظیم شخصیتوں میں ایک باکمال اور ممتاز فلمساز وہدایت کار ستیہ جیت رے کا ہے بنگال کے اس رتن کی ولادت ۲ ؍مئی ۱۹۱۲ء کو گورپار کے ایک بنگالی خاندان میں ہوئی آپ کے والد سوکمار رے اپنے دور کے بنگلہ ادب کے ایک اعلیٰ پایہ کے مزاح نگار تھے جن کے فن سے عظیم شاعر رابندر ناتھ ٹیگور بھی متاثر تھے۔

ستیہ جیت رے نے ۱۹۴۰ء میں پریسیڈنسی کالج کلکتہ سے گریجویشن کیا مزید تعلیم کی طرف آپ کا رجحان نہ تھا انھیں عہدِ طفلی سے ہی تصویریں بنانے کا شوق تھا اس شوق کی تکمیل کی خاطر انھوں نے آرٹ کا مطالعہ کرنے کے لیے شانتی نکیتن کے کلا بھون میں داخلہ لیا جہاں انھوں نے آرٹ کی تعلیم نندلال بوس اور ونود بہاری مکھرجی سے حاصل کی۔ آرٹ کا کورس مکمل کرنے کے بعد انھوں نے ڈی جی کیور اینڈ کمپنی ایک Advertising Agency میں ملازمت اختیار کرلی۔ اس کمپنی میں ستیہ جیت رے نے تصویروں اور ٹائپوگرافی کو ہندوستانی روپ میں ڈھال کر قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔

ستیہ جیت رے کے دادا بنگالی زبان میں ایک ادبی رسالہ ''سندیش'' پابندی سے نکالا کرتے تھے یہ بچوں کا ایک معیاری رسالہ تھا۔ دادا کے انتقال کے بعد انھوں نے اپنی ادارت میں رسالہ ''سندیش'' کا دوبارہ اجراء کیا جس میں آپ چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھ کر اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کیا کرتے۔ بعد ازاں ان کے ادبی ذوق اور فکر میں توانائی آتی گئی۔ کہانیوں کے علاوہ انھیں فلم سازی، موسیقی، اور ناول نگاری سے بھی دلچسپی تھی۔

ستیہ جیت رے نے بنگالی ادب کی کئی کتابیں تصنیف کیں اسی طرح بچّوں کے معیار اور ان کے ذہن کے عین مطابق کتابیں لکھیں جن میں سے بعض کتابوں کے تیس ایڈیشن شائع ہوئے اپنے

رسالہ کے لیے انھوں نے سائنس کے موضوع پر اور جاسوسی کہانیاں بھی لکھیں جو بچوں میں بیحد مقبول ہوئیں۔ بچوں کے ادب کی خدمت کے عوض میں انھیں ودیا ساگر میموریل ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔

ستیہ جیت رے نے بنگلہ ادب کے علاوہ انگریزی میں بھی کئی تصانیف پیش کیں لیکن بنگلہ ادب کے مقابل انگریزی تصانیف کم ہیں۔ انگریزی زبان میں انھوں نے زیادہ تر مضامین فلم اور سیمنار کے لیے قلمبند کیے ٹیگور کی شاعری بنکم چندر چڑجی کی نثری تخلیقات اور مصوّر نندلال بوس کے ادبی ماحول سے آپ بیحد متاثر تھے اسی ماحول سے انھیں ذہنی تحریک ملی جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے ہندوستانی ماحول بالخصوص بنگال کے گاؤں کی زندگی کی عکاسی کرنے میں پوری قوت اور توانائی صرف کردی انھوں نے اپنی کہانیوں کو فرضی واقعات اور تصنع سے پاک رکھ کر حقیقی زندگی کی تصویر کشی کی اور وہی حقیقت نگاری ان کی فلموں کی روح بنی چونکہ آپ جدت پسند تھے اسی لیے اپنی کہانیوں اور فلموں میں عصری مسائل اور گاؤں کی حقیقی زندگی کو پیش کرتے رہے۔

ستیہ جیت رے نے اپنے دیرینہ خواب کی تکمیل کے لیے ایک فلم بنانے کا خاکہ تیار کیا فلم کی تکمیل کے لیے انھوں نے مختلف ذرائع سے قرض لیے ریاستی حکومت نے فلم کے حقوق کے لیے دولاکھ روپے قرض دیا۔ اس فلم کے لیے انھوں نے اپنی بیوی کے کنگن تک گروی رکھ دی تھی بہت ہی جانفشانی اور مسلسل جدوجہد کے بعد انھوں نے ۱۹۵۵ء میں اپنی پہلی فلم ''پاتھر پنچالی'' بنائی جسے فلمی دنیا کی تاریخ میں بین الاقوامی شہرت ملی چند ناگزیر حالات اور معاشی بحران کے سبب یہ فلم صرف بنگال، دلی، ممبئی اور مدراس میں نمائش کے لیے ریلیز کی جاسکی۔ کافی تگ ودو کے بعد اس فلم کو فرانس کے فلمی میلے میں شامل کرنے میں کامیاب ہوئے فرانس کے فلمی شائقین اور ماہر ناظرین نے اس فلم کی فنّی خوبیوں اور ان کی بے مثال ہدایتکاری کا صدق دل سے اعتراف کیا اس فلم کو دو قومی ایوارڈ اور دو بین الاقوامی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

''پاتھر پنچالی'' کی بے مثال کامیابی پر رے، صاحب کا ستارہ عروج پر پہنچ گیا۔ جس کے سبب ان کی ہمت بڑھی اور ان کا حوصلہ بلند ہوا اس کے بعد انھوں نے اپنی دوسری فلموں میں اپنے جذبات اور فن کا کھل کر مظاہرہ کیا۔ کہتے ہیں کہ آپ جدت پسند تھے اس لیے انھیں نئی نئی چیزیں پیش کرنے کی

چاہت جنون کی حد تک تھی۔جس شعبے میں بھی آپ نے قدم رکھا کامیابی نے قدم چومے مثلاً آپ ایک عظیم فلمساز و ہدایت کار کے علاوہ اعلیٰ پائے کے مصوّر، باکمال موسیقار، ممتاز شاعر نمائندہ ادیب اور ایک اچھے خوش نویس بھی تھے ''رے'' نے ایک نئے پرنٹ کا رواج قائم کیا تھا جو ''رے رومن (Ray Roman)'' کے نام سے مشہور ہوا۔

ستیہ جیت رے کی جنونی کیفیت کا یہ عالم تھا کہ فلم سازی کے شعبہ میں قدم رکھنے سے قبل اس کی باریکیوں سے واقفیت کے لیے ۱۹۵۰ء میں لندن گئے جہاں انھوں نے ایک سو پچیس دنوں تک قیام کیا اس دوران انھوں نے دو سو فلمیں دیکھیں جس کے بعد انھیں فلمسازی کی تحریک ملی جب آپ بحری جہاز سے ہندوستان آ رہے تھے تو دورانِ سفر انھوں نے اپنی پہلی فلم ''پاتھر پنچالی'' کا اسکرپٹ اور ڈائلاگ لکھا۔

۱۹۷۵ء میں ''رے'' نے ایک فلم ''آرنیرون راتری'' بنائی جس میں انھوں نے ملک میں بیروزگاری کے سنگین مسئلہ کو پیش کیا اس سال ان کی دوسری فلم ''پری دواندی'' بھی ریلیز ہوئی انھوں نے ہندوستانی عوام کو بیشمار معیاری اور یادگار فلمیں دیں جن میں ''پاتھر پنچالی'' ''اپور سنسار''،''جلسہ گھر''،''دیوی''،''مہانگر''،''چارولتا''،''سچا یدھ''،''شاکھ پروشا کھا''،''پراجتو''،''اگنگ'' اور ''پارس پتھر'' زیادہ مقبول ہوئیں علاوہ ازیں گوپی گائن باگھا بائن ''سونار کیلا'' ہیرس راجہ دیشے'' جیسی کمرشیل، تفریحی، اور میوزیکل فلمیں بنائیں۔''رے'' کی دلچسپی ہندی فلموں سے کبھی نہیں رہی کسی مجبوری یا مصلحتاً تاجدار اودھ واجد علی شاہ کی زندگی پر مبنی ہندوستانی زبان میں ایک فلم ''شطرنج کے کھلاڑی'' بنائی لیکن یہ فلم وہ تاثر نہیں چھوڑ سکی جوان کی بنگلہ زبان میں بنی چند فلموں نے عوام وخواص کے دل و دماغ پر چھوڑی ہیں حالانکہ شطرنج کے کھلاڑی، انگلینڈ میں سپر ہٹ ثابت ہوئی۔

ستیہ جیت رے نے اپنی زندگی میں صرف چھتیس فلمیں بنائیں جس میں انھوں نے اپنی باریک بینی دوراندیشی، اورفنی صلاحیتوں کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔فلم سازی اورفلم کو عالمی سطح پر روشناس کرانے، اورترقی کے لیے انھوں نے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دیں۔سخت جانفشانی اور مسلسل

جدوجہد سے ہندوستانی فلموں کو بیرونی ممالک کی معیاری فلموں کی صف میں لا کھڑا کیا۔امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک نے بھی ان کی فنی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے کارناموں اور فلمی خدمات کو کافی سراہا۔شانتی نکیتن کے ایک معروف مصوّر ونود بہاری مکھوپادھیائے جو نابینا تھے ان سے متاثر ہوکر انھوں نے ان کی زندگی پر ایک فلم ''اتراگنی'' بنائی جسے حکومتِ ہند نے گولڈ مڈل سے نوازا۔اپنے عہد کی مشہور رقاصہ بالاسرسوتی، کی زندگی کو اپنی فلم ''چارولتا'' میں پیش کیا۔

ستیہ جیت رے کی فنکارانہ صلاحیتوں سے متاثر ہوکر فرانس کے صدر نے انھیں حکومت فرانس کے اشتراک سے ایک فلم بنانے کی پیشکش کی تھی معاوضے کی ادائیگی کے لیے ان کے روبرو، بلینک چیک (Blank Cheque) پیش کیا تھا۔''بایاں محاذی حکومت نے ان کی فلمی خدمات کے اعتراف میں ان کے نام سے (Satyajeet Ray film and Television Institute) تعمیر کر کے انہیں شاندار اخراج عقیدت پیش کیا ہے۔

ملکی اور بیرونی ممالک نے عظیم ہدایت کار ستیہ جیت رے کو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر انھیں اوران کی فلموں کو بیشمار اعزازات وایوارڈ سے نوازا یہ شرف کسی ہندوستانی فلمساز یا ہدایت کار کو حاصل نہیں ہوا۔اس عظیم ہدایتکار فلمساز کو جو اعزاز دیئے گئے ان کی تفصیل اس طرح ہے ۱۹۵۵ء میں فلم ''پاتھر پنچالی'' کو منیلا میں ڈپلوما آف میرٹ۔روم میں گولڈن کارماؤن ایوارڈ سان فرانسیسکو میں ''رینکن انعام'' اسٹرافورڈ میں بہترین فلم ایوارڈ ڈنمارک میں بہترین یوروپی فلم ایوارڈ ٹوکیو میں بہترین غیر یوروپی فلم ایوارڈ ۱۹۵۶ء میں ان کی فلم اپراجیتو کو اسپین انعام ۱۹۵۷ء میں گولڈن لائف آف سینٹ مارلنس نیوز اور تنقیدی ایوارڈ ۱۹۵۸ء میں سان فرانا سسکو میں بہترین ہدایتکار اور بہترین فلم ایوارڈ ۱۹۵۸ء میں فلم ''پارس پتھر'' کو صدر جمہوریہ ایوارڈ فلم ''جل ساگر'' کو ماسکو میں بہترین فلم ایوارڈ ۱۹۵۹ء میں بہترین موسیقی کے لیے پینسل تمغہ ایوارڈ ۱۹۵۹ء میں فلم ''اپر سنسار'' کو صدر جمہوریہ ایوارڈ ۱۹۶۰ء میں مدرلینڈ ٹرافی ''ایڈنبرا میں ڈپلوما آف میرٹ، فلم دیوی کو صدر جمہوریہ ہند کا ایوارڈ ۱۹۶۱ء میں ایک ڈاکومینٹری فلم رابندر ناتھ ٹیگور کو'لاکورتو'' میں بہترین ڈاکومینٹری فلم کا گولڈن سیل ایوارڈ اسی سال فلم ''تین کنیا'' کو صدر جمہوریہ ہند کا ایوارڈ ملبورن میں

پراپری انعام ۱۹۶۲ء میں برلن میں ''سیلائرس گولڈن لاریل ایوارڈ'' ۱۹۶۳ء میں فلم ''مہانگر'' کو صدر جمہوریہ ہند کا ایوارڈ ۱۹۶۴ء میں برلن میں خصوصی اور تنقیدی ایوارڈ ۱۹۶۹ء میں فلم ''گوپی گائن باگھا بائن'' کو صدر جمہوریہ ہند کا طلائی تمغہ ''ایڈ ڈلاڈ'' اور آک لینڈ میں بہترین ہدایتکاری کے لیے ایوارڈ ۱۹۷۰ء میں ٹوکیو میں سلور کراس انعام اور بہترین ہدایتکار کا انعام اور ایک خصوصی ایوارڈ میرٹ سرٹیفکیٹ کے ساتھ بہتر فلم کا ایوارڈ بھی دیا گیا۔

۱۹۷۱ء میں فلم ''پرتی درندی'' کو صدر جمہوریہ ہند کا ایوارڈ اور بہترین ہدایتکاری کے لیے ایوارڈ ۱۹۷۲ء میں وینس میں خصوصی انعام ۱۹۷۲ء میں ''سیما بودھ'' کو صدر جمہوریہ ہند کا طلائی تمغہ اور وینس میں ''نی پریکی'' ایوارڈ ۱۹۷۳ء میں فلم ''رشی سنکٹ'' کو صدر جمہوریہ ہند کا پینل تمغہ ''بہترین موسیقی کے لیے ایوارڈ ''برلن میں گولڈن ایرا ایوارڈ'' شکاگو میں گولڈن ہوگو ایوارڈ ۱۹۷۴ء میں فلم ''سونارکیلا'' کو بہترین ہدایتکاری بہترین اسکرپٹ اور بہترین فلم کے لیے حکومت مغربی بنگال نے ایوارڈ دیا ۱۹۷۴ء میں تہران میں بچوں کے بین الاقوامی فلم میلہ میں گولڈن اسٹیپو ایوارڈ ۱۹۷۷ء میں ان کی پہلی ہندی فلم ''شطرنج کے کھلاڑی'' کو قومی ایوارڈ ۱۹۷۸ء میں فلم جوئے بابا نیلوناتھ کو بچوں کی بہترین فلم کے لیے صدر جمہوریہ ہند کا ایوارڈ ۱۹۷۹ء میں شکاگو میں ''گولڈن ہوگو ایوارڈ'' ۱۹۸۰ء میں سائپرس میں خصوصی ایوارڈ اسی سال ان کی فلم ''ہیرس راجہ دیشے'' کو صدر جمہوریہ ہند کا بہترین فلم بہترین موسیقی اور گیتوں کے لیے انعام ۱۹۹۱ء میں فلم ''آگنتک'' کو بہترین فلم بہترین ہدایتکاری کے لیے طلائی کنول اور پچاس ہزار روپے اور پچیس ہزار قومی انعام کی شکل میں دیا گیا۔

فلمساز، ہدایت کار ستیہ جیت رے کی فلمی خدمات قابلِ تحسین اور نا قابلِ فراموش ہیں آپ ہندوستان کے واحد ہدایتکار اور فلم ساز ہیں جنھیں ''بھارت رتن'' جیسے عظیم خطاب سے سرفراز کیا گیا اس کے بعد یہ اعزاز عظیم گلوکارہ لتا منگیشکر کو دیا گیا۔ یہ ایوارڈ بالخصوص ملک کے عظیم قومی رہنماؤں سماجی خدمت گار اور سائنس داں کو پیش کیا جاتا ہے۔ ۱۹۷۵ء میں British Freedom نے فلمساز وہدایت کار ستیہ جیتے رے کو بیسویں صدی کی نصف صدی کا بہترین ہدایت کار تسلیم کیا ان کی فلمی

خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ۱۹۹۲ء میں امریکن انسٹی ٹیوٹ نے واشنگٹن میں ان کی فلموں کی نمائش کا اہتمام کر کے انھیں شاندار اخراجِ عقیدت پیش کیا۔ ۱۹۷۸ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے ستیہ جیت رے کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری تفویض کی اور فرانس کے صدر متراں نے سب سے بڑا اعزاز ''لیزی ڈی آنر'' خود ان کی خدمت میں پیش کیا۔ ہالی ووڈ نے ستیہ جیت رے کی عظیم فلمی خدمات کے اعتراف میں برطانیہ کا فیلوشپ آف دی ''برٹش ایوارڈ'' فلپائن نے ''سگاسا'' اور فرانس نے Legend the Honour اعزاز سے نوازا۔

ستیہ جیت رے کو مختلف اکاڈمی اور یونیورسٹیوں نے بھی خصوصی اعزاز دے کر ان کی خدمات کو سراہا ان میں British films festival Award دہلی یونیورسٹی نے ڈی لٹ ۱۹۷۸ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی نے ڈی لٹ، کی اعزاز ڈگری سے سرفراز کیا۔ انھیں ہندوستانی فلم انڈسٹری کا پروقار ایوارڈ ''داداصاحب پھالکے ایوارڈ'' بھی ملا۔ آپ ہندوستانی فلم کے ایک ایسے انمول رتن تھے جن کی قدر و قیمت کا اندازہ دنیا کے عظیم دانشوروں نے کیا۔ انھوں نے اپنے ملک کا سر فخر سے بیرونی ممالک میں بلند کیا حکومت ہند نے بھی اپنے عظیم سپوت کو وفات سے چند روز قبل ملک کا سب سے بڑا اعزاز ''بھارت رتن'' پیش کر کے ان کی فلمی خدمات کا اعتراف کیا۔

☆☆☆

عظیم ہدایت کار۔محبوب خان

شاہنواز عالم

محبوب خان فلمی دنیا کا وہ نام ہے جس کی فلمیں عام آدمی کے مسائل کو بڑی بیباکی سے بیان کرتی تھیں۔یوں تو محبوب خان نے کئی بہترین فلمیں بنائی مگر ''مدر انڈیا'' فلم ایک ایسا شاہکار تھی جس نے ان کا نام فلمی دنیا کی تاریخ میں امر کردیا۔اس فلم سے محبوب خان کو بے پناہ شہرت ملی مگر اس سے نقصان یہ ہوا کہ لوگ ان کی بنائی دوسری اچھی فلموں کے نام بھول گئے، کچھ ایسے ہی جیسے کے آصف کی ''مغل اعظم'' کے علاوہ دوسری کوئی فلم، عام طور پر لوگوں کو جلد یاد نہیں آتی ہیں۔محبوب خان صرف فلمساز تھے انہیں کمیونزم سے کوئی واسطہ نہیں تھا وہ تو جواہر لال نہرو کے مداح تھے جن کے لئے خاص طور سے انہوں نے ایک فلم ''سن آف انڈیا'' بھی بنائی تھی مگر محبوب خان کی فلموں میں ہمیشہ عام آدمی کے مسائل کی ترجمانی ہوتی تھی۔

فلم انڈسٹری میں محبوب خان ایک معروف نام ہے مگر یہاں جانے کے لئے جو ٹھوکریں کھائیں اس کا اندازہ صرف انہیں کو تھا۔فلمی دنیا میں آج وہ ایک قد آور بت کی حیثیت رکھتے ہیں مگر اس بت کو زمانے کی گردشوں نے سنوارا ہے اسی لئے ان کی فلموں کی سمجھ ان میں خداداد تھی۔اپنی اسی سمجھ اور صلاحیت کی بناء پر محبوب خان بالی ووڈ میں ایک ایسی شخصیت بن کر ابھرے جن کے ذکر کے بغیر ہندی فلموں کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔وہ جواہر لال نہرو کے زبردست حامی اور مداح تھے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ۱۹۶۲ء میں ''سن آف انڈیا'' بنائی۔حالانکہ وہ فلم فلاپ ہوئی مگر نہرو سے ان کی عقیدت کم نہیں ہوئی۔اسے اتفاق کہیں یا نہرو سے ان کی محبت وعقیدت کہ ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال کے کچھ گھنٹے بعد ہی محبوب خان کا بھی انتقال ہوگیا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندی فلموں کی تاریخ میں وہ زندہ جاوید ہوگئے مگر اس کے پیچھے ان کی سخت محنت اور جانفشانی چھپی ہوئی تھی۔۱۹۳۰ء کی دہائی کی بات ہے جب رمضان خان نام کا ایک لڑکا اپنے گھر سے بھاگ کر ممبئی پہنچا تھا فلموں میں کام کرنے کے لئے۔اس لڑکے کو امپیریل اسٹوڈیو کے دروازے پر کھڑے دربان نے ایک دو نہیں تقریباً تیرہ مرتبہ یہ کہہ کر بھگا دیا کہ کمپنی میں لڑکوں کی نہیں لڑکیوں کی ضرورت ہے۔مگر

اس لڑکے نے ہار نہیں مانی اور ایک دن اسے اندر جانے کا موقع مل گیا۔اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسے کام بھی مل گیا۔تیس روپئے مہینہ تنخواہ مقرر ہوئی۔اسی اسٹوڈیو کی ایک فلم ''علی بابا چالیس چور'' کے چالیس چوروں میں سے ایک چور کا رول اسے ملا تھا۔یہی وہ لڑکا ایک دن محبوب خان کے نام سے فلمی دنیا کی تاریخ میں مشہور ہوا۔۱۹۳۵ء میں انہیں ساگر کمپنی کی فلم ''ججمنٹ آف اللہ (Judgement Of Allah)'' میں بطور آزاد ہدایت کار کام کرنے کا موقع ملا، پھر کچھ اور فلمیں بھی انہوں نے ڈائریکٹ کیں۔

۱۹۴۲ء میں محبوب خان نے اپنی فلم کمپنی محبوب پروڈکشن کی شروعات کی۔حالانکہ اس سے پہلے ایک ناول ''مدر'' پر آپ فلم ''عورت'' ۱۹۴۰ء میں بنا چکے تھے۔یہ الگ بات ہے کہ ان کی یہ فلم کامیاب نہیں ہوئی اور اس فلم کو دوسرا ٹریٹمنٹ دیکر ''مدر انڈیا'' کے نام سے ۱۹۵۷ء میں پھر بنایا اور اس فلم نے ایک تاریخ لکھ دی۔محبوب خان کی فلم شروع ہوتی تھی تو اس شعر سے

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

اس کے بعد ہنسوا اور ہتھوڑا نظر آتا تھا۔حالانکہ محبوب خان کمیونسٹ نہیں تھے مگر سرمایہ داری اور ظلم کے خلاف احتجاج کی صاف آواز ان کی فلم میں سنائی دیتی تھی۔محبوب خان کی روح اور ناظرین کی نبض سے اچھی طرح واقف تھے۔فلموں کا پریمیر بیرون ممالک کرنے کی ابتداء بھی غالباً محبوب خان نے کی تھی اور اپنی فلم ''آن'' کا پریمیئر لندن میں کیا تھا۔ان کی فلم ''مدر انڈیا'' فلموں کی تاریخ کا ایک شاہکار بن گئی اور آسکر ایوارڈ میں یہ آفیشیل طور پر ہندوستان کی پہلی انٹری تھی۔یہ فلم آخری دور میں صرف ایک ووٹ سے بیٹ فارن فلم کا ایوارڈ جیتنے سے چوک گئی۔تب ہی سنیل دت نے کہا تھا کہ ہالی ووڈ ''مدر انڈیا'' کی روح کو نہیں پہچان پایا۔بہرحال آج محبوب خان ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر اپنی فلموں کے ذریعہ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور جب تک فلم انڈسٹری رہے گی محبوب خان کا نام عزت واحترام کے ساتھ لیا جاتا رہے گا۔

☆☆☆

بمل رائے۔حسّاس اور باشعور فلم ساز

رشید انجم (بھوپال)

بمل رائے فلم انڈسٹری کے ان فلم سازوں کی قطار میں سب سے آگے ہیں جنہیں میل کا پتھر کہا گیا ہے۔فلمیں بنانا ان کا شوق بھی تھا اور دیوانگی بھی۔دولت کمانا ان کا نظریہ کبھی نہیں رہا۔وہ تو احساس اور جذبۂ خودی سے مالا مال تھے۔وہ فلمیں بناتے تھے اپنے لئے آرٹسٹوں کے لئے اور اپنے ان چاہنے والوں کے لئے جو ان کی فلمیں دیکھ کر ان کے ہر فن کار کو اپنے نزدیک پا کر خود سے متعارف ہوتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کی فلمیں کلاسک انڈین موویز میں سب سے پہلے شمار کی جاتی ہیں۔بمل رائے ۱۹۰۹ء میں ڈھاکہ کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔وہ اپنے والدین کی پانچویں اولاد تھے۔ڈھاکہ کے جگنّا تھ کالج میں تعلیم حاصل کی۔زمینداری ان کے خون میں شامل تھی۔لیکن مزاج میں عام آدمی کی تکلیف، دکھ درد اس کی زندگی کی کربناک حقیقتیں بسی تھیں۔۱۹۳۰ء میں فلموں کا شوق انھیں کلکتہ لے آیا۔نیو تھیٹر بنگال کی سب سے معروف فلم کمپنی تھی۔پی سی بروا اس کمپنی کے سربراہ تھے۔بمل رائے نیو تھیٹر میں ملازم ہو گئے نتن بوس نیو تھیٹر میں فوٹو گرافر اور ہدایتکار تھے۔بمل رائے نے اپنے کیریئر کی شروعات کیمرا مین کی حیثیت سے کی۔وہ پی سی بروا کی فلموں میں کیمرا مین رہے۔بروا ان کی لیاقت سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ ان سے فلموں کے اسکرپٹ پر بھی مشورہ لینے لگے۔۱۹۳۳ء میں والدین نے ان کی شادی ونودنی رائے سے کر دی۔ابھی شادی سے لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ پی سی بروا نے ۱۹۳۴ء میں شرت چند چٹرجی کے بنگلہ کلاسک ناول دیوداس پر فلم بنانے کی تیاری شروع کر دی۔بمل رائے ان کے معاون خاص تھے۔۱۹۳۵ء میں سہگل اور جمنا کی یہ فلم ریلیز ہو کر مقبول ہوئی۔بمل رائے کیمرہ مین سے لیڈ ینگ فوٹو گرافر ہو گئے۔یہ فلم سہگل کی اداکاری وگلوکاری سے یاد کی جاتی ہے تو بمل رائے کی فوٹو گرافی کی وجہ سے یادگار درجہ حاصل ہے۔شوٹنگ کے دوران ہی انھوں نے طے کر لیا تھا کہ موقعہ ملنے پر وہ دیوداس کو اپنے انداز میں بنائیں گے۔

پی سی بروا نے اپنی اگلی فلم''ماں'' کی ہدایت انہیں سونپ دی۔''گریا داب''اور''مایا''۱۹۳۶ء''مکتی''۱۹۳۷ء امر ملک کی''بڑی دیدی''۔۱۹۳۹ء اور''اودیر پاتھیر'' کے علاوہ امر ملک کی''براج بہو'' اور''ابھینیتری''۱۹۴۰ء ان کی اسی دور کی بہ حیثیت فوٹو گرافر اور ہدایت کار کامیاب فلمیں ہیں۔ان فلموں سے کلکتہ فلم انڈسٹری ایک نئے اور تخلیقی دور میں داخل ہوئی۔منوج بھٹا چاریہ کے لئے ۱۹۵۰ء میں انھوں نے بنگلہ فلم''تتھاپی'' لکھی تھی۔دیویکا رانی اور ہمانشو رائے کو بمل رائے کی فلم''ماں'' اور''دیوداس'' نے بہت متاثر کیا تھا۔بمل رائے ۱۹۵۰ء میں ان کے بلاوے پر بمبئی آکر بمبئی ٹاکیز سے وابستہ ہوئے۔۱۹۵۰ء میں ہی انھوں نے نیو تھیٹر کلکتہ کے لئے فلم''پہلا آدمی''۔ہندی میں بلراج ساہنی اور سمرتی بسواس کو لے کر بنائی۔ایک زبان سے دوسری زبان کے ربط پر یہ فلم بنی تھی۔آدمی زخم اٹھاتا ہے اور جب زبان کے رشتے خون کے رشتوں پر حاوی ہوتے ہیں تو وہ زمین کو تقسیم کر دیتا ہے۔

نئے ہندوستان کے افق پر آزادی کا جو سورج طلوع ہوا اس نے سرمایہ دارانہ نظام کو ہی روشن کیا۔عام مزدور پیشہ آدمی، کسان اور غریب طبقے تک اس کی ایک کرن بھی نہیں پہونچی۔کلکتہ کی سڑکوں پر آج بھی ساٹھ سال کے آزاد ہندوستان میں آدمی ہاتھ رکشہ کھینچنے پر مجبور ہے۔کسان آج بھی آسمانی برسات پر انحصار کرتا ہے۔

بمل رائے نے یہ سارے مناظر بذات خود دیکھے تھے۔اس حقیقت کو وہ ساری دنیا کے سامنے لانا چاہتے تھے۔بمبئی ٹاکیز چھوڑ کر انہوں نے اپنا ذاتی فلم پروڈکشن بمل رائے کے نام سے قائم کر لیا تھا۔۱۹۵۳ء میں اس کے تحت انہوں نے فلم''دو بیگھہ زمین'' کی تخلیق کی۔بلراج ساہنی، نروپا رائے، رتن کمار، مینا کماری، نانا پلسیکر، نوندو گھوش، نور نے اپنی زندگی کے یادگار رول ادا کئے تھے۔اسی فلم سے جگدیپ بطور چائلڈ آرٹسٹ فلموں میں پہلی بار آئے تھے۔سلیل چودھری کی موسیقی میں شیلیندر کے دل میں اتر جانے والے گیتوں سے لتا منگیشکر اور منّا ڈے نے اپنی سدابہار آوازوں کا جادو جگایا تھا۔بلراج ساہنی نے رکشہ کھینچنے کی مشق کلکتہ کی سڑکوں پر کی تھی۔بمل رائے نے کسی کاسٹیوم ڈایزائنر کی خدمات حاصل نہیں کی تھی۔وہ

چور بازار سے سین کی ڈمانڈ کے مطابق کپڑے خریدتے، انہیں جگہ جگہ سے پھاڑ کر ضرورت کے مطابق پیوند لگاتے اور پھر اداکاروں کو پہنا کر سین شوٹ کرتے تھے۔ اس طرح آزادی کے بعد ہندوستان کی یہ اوریجنل فلم تیار ہوئی جسے نہ صرف ۱۹۵۳ء کی بہترین فلم تسلیم کیا گیا بلکہ فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا بلکہ یہ وہ پہلی فلم بھی تھی جسے کارلووی ری کے فلمی میلے میں بھی بھیجا گیا تھا اور بلراج ساہنی کو فلم فیئر کا بہترین اداکار کا اعزاز بھی ملا تھا۔

اشوک کمار اپنا پروڈکشن قائم کر چکے تھے۔ ''دو بیگھہ زمین'' سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی ذاتی فلم ''پرنیتا'' کی ہدایت بمل رائے کو سونپ دی۔ ۱۹۵۴ء کی یہ فلم شرت چندر کے ناول پر پہلی بار بنائی گئی تھی۔ اشوک کمار، مینا کماری اور اشیت برن نے مرکزی کردار ادا کئے تھے۔ بھرت ویاس کے گیتوں کو ارون کمار مکرجی نے دھنوں سے سجایا تھا۔ آشا بھونسلے کا گیت ''گورے گورے ہاتھوں میں مہندی رچا کے نینوں میں کجرا ڈال کے''۔ منّا ڈے کا گیت ''چلے رادھے رانی انکھیوں میں پانی، اپنے موہن سے مکھڑا موڑ کے، آج بھی اتنے ہی دل کش ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں انہوں نے شرت چندر چٹر جی کے ناول ''براج لو'' پر ہندی میں ''براج بہو'' اپنے پروڈکشن سے تخلیق کی۔ اس فلم کو وہ بہت پہلے بنگلہ میں ''براج لو'' کے اصل نام سے منوج بھٹاچاریہ کے لئے بنا چکے تھے۔ کامنی کوشل، ابھی بھٹا چاریہ مرکزی کردار تھے۔ پریم دھون کے گیت۔ ''سنو سیتا کی کہانی۔ وہ محلوں کی رانی چھوڑ گھر بار چلی بن باس، کسی نے قدر نہ جانی، کو سلیل چودھری نے محمد رفیع کی جذباتی آواز میں ریکارڈ کیا تھا۔

۱۹۵۴ء میں ہی انہوں نے سبودھ بوس کے بنگلہ ناول ''جیا یا ترا'' پر ہندی میں نوکری بنائی۔ کشور کمار، محمود، جگدیپ، نور، وزیر محمد خان (مشہور گلوکار) نے کام کیا تھا۔ فلم میں گیت کار شیلیندر اور پریم دھون نے بھی اداکاری کی تھی۔ سلیل چودھری نے شیلیندر کے گیت ''چھوٹا سا گھر ہوگا بادلوں کی چھاؤں میں'' کشور کمار اور شیلا بیلے کی آوازوں میں ریکارڈ کیا تھا۔ اس فلم کے یہ گیت ''ہر حسین چیز کا طلبگار ہوں'' کشور کمار اور ''جھومے رے کلی بھنورا الجھ گیا کانٹوں میں'' گیتا دت کی آوازوں میں یادگار ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں ہی منشی پروڈکشن بمبئی کے لئے انہوں نے فلم ''باپ بیٹی'' ڈائریکٹ کی۔ رنجن اور بے بی تبسم مرکزی

باپ بیٹی کے رول میں تھے۔ یہ پہلی فلم تھی جو ہیروئن کے Love Interest سے محروم باپ بیٹی کے جذباتی رشتوں پر پوری پاکیزگی سے تخلیق کی گئی تھی۔

شرت چندر چٹر جی کے دو ناولوں پر بھی بمل رائے نے فلمیں بنائیں تو اس بنگلہ ادیب کو سمجھنے کا موقع ملا۔ ان کے دل میں ''دیوداس'' بنانے کی خلش موجود تھی۔ اب وہ خود فلم ساز تھے۔ دیوداس کا ہندی اسکرپٹ خود تیار کیا چونکہ ہندی پر عبور نہ تھا اس لئے اردو و ہندی کے معروف ادیب راجندر سنگھ بیدی کی خدمات مکالمہ نویس کی حیثیت سے حاصل کیں۔ دلیپ کمار میں انہیں دیوداس نظر آیا۔ بنگلہ سے پارو کے لئے سچترا سین اور تامل سے وجینتی مالا کو چندرمکھی کے کرداروں کے لئے منتخب کر لیا۔ ایس ڈی برمن کی موسیقی، ساحر کے نغمے، بمل رائے کی ہدایت اور فوٹو گرافی اور دلیپ کمار کی جذبات کی آخری حدوں کو چھوتی اداکاری آج کے دیوداس سے سینکڑوں میل آگے ہے۔ اس فلم میں بمل رائے نے کیمرے سے گفتگو کی ہے۔ کیمرے سے جذباتی اور المیاتی مناظر کی تشبیہات سے ابھارا ہے۔ دلیپ کمار نے مکالموں سے کم اپنی آنکھوں، چہرے کے تاثرات اور باڈی لینگوئج سے دیوداس کی خاموش، مہر بہ لب محبت کو پوری فنکارانہ شدت سے پیش کیا ہے۔ انہوں نے صرف چہرے کے تاثرات سے المنا کی بیان کی ہے۔ ان کا پورا سراپا جسمانی گفتگو بن کر ابھرا ہے۔ ''دیوداس'' نے کامیابی کے نہ صرف باکس آفس ریکارڈ قائم کئے تھے بلکہ انڈین فلم ہسٹری میں اس فلم کا نام سب سے اوپر درج کرا لیا۔ ۱۹۵۶ء میں اس فلم نے تین ایوارڈ حاصل کئے۔ دلیپ کمار کو بہترین اداکار، وجینتی مالا کو بہترین اداکارہ اور موتی لال کو بہترین معاون اداکار کے فلم فیئر ایوارڈ حاصل ہوئے۔

۱۹۵۸ء میں ان کی دو اہم فلمیں آئیں۔ ''مدھومتی'' اور ''یہودی''۔ ''مدھومتی'' ان کے ذاتی پروڈکشن کی فلم تھی جس میں دلیپ کمار، وجینتی مالا اور پران نے کام کیا تھا۔ یہ فلم پنر جنم پر ہارٹ ٹچنگ سبجیکٹ تھی۔ سلیل چودھری نے اپنے کیریر کا سب سے کامیاب اور کمرشیل میوزک دیا تھا۔ یہ فلم پچاس کی دہائی کی سب سے بڑی ہٹ فلم تھی۔ اسے پانچ ایوارڈ ملے۔ بہترین فلم، بہترین ہدایت، بہترین موسیقی، بہترین فوٹو گرافی (دلیپ گپتا) اور بہترین

سپورٹنگ اداکار (جانی واکر) قرار دئے گئے۔

''یہودی'' میلوڈرامہ اور کاسٹیوم فلم تھی۔ اس فلم پر پارسی تھیٹر کا اثر تھا مگر بمل رائے نے اس کو یادگار فلم بنا دیا تھا۔ دلیپ کمار، مینا کماری، سہراب مودی، نگار سلطانہ اور تواری وغیرہ نے اپنے کرداروں سے انصاف کیا تھا۔ دیوداس میں نذیر حسین نے دیوداس کے ملازم کا جذباتی کردار ادا کر کے متاثر کیا تھا مگر یہودی میں اس کے برعکس نگیٹو کردار نبھایا تھا۔ بمل رائے نے پہلی بار شنکر جے کشن کی موسیقی لی تھی اور بمبئی ٹاکیز کے تحت ساوک واچا کے لئے بنایا تھا۔

۱۹۵۹ء میں انہیں ''سجاتا'' کے لئے نوتن سے بہترین کوئی اداکارہ مناسب نہیں لگی۔ مدر انڈیا کے بعد سنیل دت اسٹار بن گئے تھے اور ان کا ریٹ بھی بڑھ گیا تھا۔ بمل رائے سنیل دت کو کاسٹ کرنا چاہتے تھے مگر فلم کا بجٹ اجازت نہیں دیتا تھا۔ مگر وہ ہمت کر کے سنیل دت کے پاس پہونچ گئے۔ ''میں آپ کو لینا چاہتا ہو۔ آپ بڑے اسٹار ہیں۔ میری فلم چھوٹی ہے۔ آپ کی پرائز نہیں دے سکتا۔ صرف پچیس ہزار اگر قبول ہوں تو فلم کر لیجئے۔'' سنیل دت نے فلم قبول کر لی۔ فلم میں کام کیا اور اپنے تاثرات اس طرح بیان کئے۔ ''اس فلم سے مجھے پچیس لاکھ کا تجربہ حاصل ہوا۔'' نوتن نے اس فلم میں اچھوت لڑکی کا رول ادا کیا تھا۔ مجروح کے گیت اور ایس ڈی برمن کے سنگیت نے اس فلم کو ناقابلِ فراموش بنا دیا۔ ''سجاتا'' سال کی بہترین فلم، بمل رائے بہترین ڈائریکٹر اور نوتن بہترین اداکارہ کے فلم فئیر اعزاز سے نوازے گئے۔

۱۹۶۰ء میں بمل رائے کی فلم ''پرکھ'' آئی۔ سادھنا، وسنت چودھری، موتی لال کی لاجواب اداکاری اور بہترین موضوع و کہانی پر مبنی اس فلم نے بھی بمل رائے کو کامیاب ہدایت کار اور موتی لال کو بہترین سپورٹنگ ایکٹر کے اعزاز دلا دئے۔

۱۹۵۹ء میں ہی نوتن نے نیوی کمانڈر رجنیش بہل سے شادی کر لی اور فلموں سے کنارہ کش ہوگئیں۔ ۱۹۶۱ء میں بمل رائے پروڈکشن کے بینر تلے بمل رائے نے ہمین گپتا سے فلم ''کابلی والا'' ڈائریکٹ کرائی۔ اس فلم نے انسانی رشتوں کو ایک روحانیت دے کر اسے ناقابل فراموش بنا دیا۔ ۱۹۱۸ء میں رابندر ناتھ ٹیگور کی یہ کہانی شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۵۶ء میں تپن سنہا

نے اسے فلم کا بنگالی Version دیا اور بمل رائے نے ہمن گپتا کے ساتھ اسے ہندی کا روپ دیا۔ ٹیگور کی اس لافانی کہانی کو ہیمن گپتا نے ایک بت تراش کی مانند فلم پردے پر پیش کیا کہ یہ ایک زندہ دستاویز بن گئی۔ پیشکش اور اسٹار پرفارمینس کے ساتھ بلراج ساہنی نے Colourfull Contrast Manneris فنکارانہ بلندیوں کر سر کیا تھا۔ کیمرے نے ان اعلیٰ انسانی قدروں کو عکس دیا تھا جو سیدھی دلوں سے تعلق رکھتیں ہیں اور انسان کی خاکی نسبتوں کو دائمی ادوار سے جوڑتی ہیں۔ سلیل چودھری نے پھر ایک بار پریم دھون کے لکھے گیت کو ایک الوہی طرز میں ڈھالا تھا اور ''اے میرے پیارے وطن۔ اے میرے بچھڑے چمن، تجھ پہ دل قربان''۔ گیت منّا ڈے کی گائیکی کا لاثانی نغمہ بن گیا۔ اس گیت میں فارسی موسیقی کی ہلکی روم ہے جسے مینڈولن کے Effects دے کر سلیل چودھری نے آواز کو موسیقی کی تائید دی تھی۔ اس گیت کو جب سنو تو محسوس ہوتا ہے جیسے فاصلوں کی برف سورج کا لمس پا کر قطرہ قطرہ دل کے خالی کشکول میں ٹپک رہی ہو۔

۱۹۶۲ء میں سادھنا کو لے کر فلم ''پریم پتر'' کی تکمیل ہوئی اور ۱۹۶۳ء میں بمل رائے نے ایک انقلابی فلم پلان کی۔ اس فلم کی ہیروئن باغی کردار تھی جو بے حد معمولی ہوتے ہوئے بھی فضول بندھنوں سے بغاوت کرتی ہے اور قاتل بن کر قانون کی اسیر ہو جاتی ہے۔ کلیانی فلم ''بندنی'' کا وہی خاتون کردار تھی جس کے لئے انہیں نوتن کی ضرورت محسوس ہوئی اور نوتن واپس آ گئیں۔ نوتن نے پھر ایک بار ثابت کر دیا کہ کلیانی ان کے اندر ہی کہیں خاموش چھپی بیٹھی تھی اور باہر نکلنے کا موقع تلاش کر رہی تھی۔ اس فلم کو تین ایوارڈ ملے۔ بہترین فلم، بہترین ڈائریکشن اور لاجواب پرفارمر (نوتن)!

۱۹۶۴ء میں انہوں نے ''لائف اینڈ میسیج آف سوامی وویک آنند'' اور ۱۹۶۵ء میں ''گوتم دی بدھا''۔ پر دو ڈاکومینٹری فلمیں بھی بنائی تھیں۔

بندنی کے بعد انہوں نے فلم ''سہارا'' شروع کی۔ بکاؤ ستارے شرمیلا ٹیگور اور دھرمیندر کو کاسٹ کیا۔ پہلا شیڈول مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ بیمار ہو گئے۔ ان کے معاون خصوصی دیبوسین گپتا نے شیڈول مکمل کیا اور دو ہفتے کی شوٹنگ روک دی گئی۔ دراصل فلم اور Over بجٹ ہوگئی تھی جس کی

وجہ سے بمل رائے بحران میں آ گئے۔ دیبوسین گپتا نے چھوٹے بجٹ کی فلم بنانے کا مشورہ دیا۔ شکسپئر کے ڈرامے پر بنگلہ میں بنی فلم ''بھرانتی بلاس'' کو ہندی میں بنانے کے لئے دیبوسین کی ضد پر بمل رائے تیار ہو گئے۔ ''دو دونی چار'' کے نام سے گلزار نے گپتا کے ساتھ بیس دن میں اسکرپٹ مکمل کرلیا۔ یونائیٹڈ پروڈیوسرز فورم میں اسکا اسٹوری سیشن رکھا گیا۔ پروجیکٹ کو منظوری ملی اور بمل رائے نے ڈائریکشن کی کمان سنبھال لی۔ فلم فلور پر گئی مگر قدرت کامیابی کے ساتھ زندگی کا دروازہ بھی بند کر چکی تھی۔ فلم نے آدھا راستہ طے کیا تھا۔ کہ ۱۹۶۶ء میں بمل رائے چل بسے۔ فلم انڈسٹری کے لئے یہ نقصانِ عظیم تھا۔ یہ ایک یگ ایک عہد کی موت تھی۔

کچھ مہینوں بعد فلم دوبارہ شروع ہو کر مکمل ہوئی مگر باکس آفس پر ویرانیاں اتر آئی تھیں۔ فلم پہلے دن دم توڑ گئی۔ ''سہارا'' ہرشی کیش مکھرجی نے شرمیلا کی جگہ سائرہ بانو کو لے کر مکمل کی لیکن وہ بھی بمل رائے کے تصور کو نہ چھو سکی۔

ان کی دیگر فلموں میں ''پریوار'' ۱۹۵۶'، ''اپرادھی کون'' ۱۹۵۷ء شامل ہیں۔ ان دونوں فلموں کو بمل رائے کے لئے اسیت سین نے ڈائریکٹ کیا تھا۔

گلزار اور ہرشی کیش مکرجی جیسے فنکار بمل رائے کی دین ہیں۔

گلزار نے بمل رائے کی تخلیقی زندگی پر فلم پلان کی تھی۔ ''امرت کُمبھ کی کھوج'' لیکن یہ فلم پایۂ تکمیل تک نہیں پہونچ سکی۔ ''بھارت'' بنانے کا خواب بھی بمل رائے کی موت کے بعد بے تعبیر رہ گیا۔

۴۰ سال ہو گئے بمل رائے کو دنیا سے روپوش ہوئے مگر کثیف دھوئیں کا مرغولہ بھی انہیں روپوش رکھنے میں بے اثر رہا۔ کلرفل فلموں کے اس شور شرابے میں بلیک اینڈ وہائٹ فلموں کا جادو ہمیشہ ہمیں بمل رائے کی جانب راغب کرتا رہے گا۔ آج بمل رائے ایک تاریخ بن چکے ہیں۔ مگر ان کی تخلیق، زبان، نگاہ، آواز کی طرح ہمارے ذہنوں پر قابض رہے گی۔

☆☆☆

ہندوستانی سنیما کی عہد ساز شخصیت۔وی شانتا رام

عاصم شہنواز شبلی

ہندوستانی سنیما میں وی شانتا رام ایک عہد کا نام ہے۔ انہوں نے فلم کو جو شعور اور آگہی عطا کی اور فلمی دنیا میں جس لگن اور محنت سے خدمات انجام دیں، اس کا ذکر ہندوستانی سنیما کی تاریخ میں زرّیں حروف میں کیا جائے گا اور آنے والی نسلیں ہمیشہ ان کا نام عزت اور احترام سے لیا کریں گی ___ شانتا رام نے سنیما کے میدان میں متعدد بار پہل کاریاں کیں۔ وہ پچھلے سات دہوں سے فلمی دنیا سے وابستہ ہیں۔ درحقیقت مہاراشٹر میں جو مقام چھترپتی شیواجی کو حاصل ہے، وہی مقام شانتا رام کو ہندوستانی سنیما میں عطا ہوا۔ اگر شیواجی چھترپتی تھے تو شانتا رام کو چترپتی کہا جا سکتا ہے۔

ہندوستانی سنیما کی یہ بزرگ ترین، ہستی بذاتِ خود ایک ادارہ ہے۔ انہوں نے سنیما اور تھیٹر میں جو امتیاز پیدا کیا اور ہمارے سماج کو سنیما کی اہمیت اور افادیت کا جو احساس دلایا، اسے کسی بھی طور پر فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستانی سنیما کی اس عہد آفریں شخصیت کی پیدائش ۱۸/نومبر ۱۹۰۱ء کو مہاراشٹر میں کولہا پور کے مقام پر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے کولہا پور میں حاصل کی۔ بچپن میں شانتا رام ایک ریلوے ورکشاپ میں قلی کا کام کرتے تھے۔ اور ان کی ماہانہ تنخواہ صرف پندرہ روپے تھی۔ اور جب وہ سولہ سال کے ہوئے تو ایک تھیٹر میں فالتو اوقات میں سائن بورڈ پینٹ کرنے کا کام کرنے لگے۔ اس سے ان کی آمدنی میں پانچ روپے ماہانہ کا اضافہ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ اس تھیٹر میں پردے اٹھانے کا کام کرنے لگے۔ اس تھیٹر کا نام گندھروونا ٹیک منڈلی تھا۔ یہیں سے ان کی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ہوا۔ تھیٹر میں آنے پر ان کا رابطہ ایک نئی قائم کردہ فلم کمپنی مہاراشٹر فلم کمپنی سے ہو گیا۔ یہاں وہ اسسٹنٹ فوٹوگرافر کے طور پر شامل ہو گئے۔ اس وقت اس کمپنی کے مالک اور دادا صاحب پھالکے کے شاگرد بابوراؤ پینٹر ایک تاریخی اور دھارمک فلم 'سیرندھری' بنا رہے تھے۔ انہوں نے شانتا رام کو ایک ذہین اور ہونہار نوجوان تصوّر کرتے ہوئے فلم سے متعلقہ ہر کام میں شامل کرلیا۔ یہاں وہ کمپنی میں جھاڑو لگانے سے لیکر آنے والے لوگوں کو پانی پلانے، پردے رنگنے، سین سینریاں بنانے، لائٹ دینے اور کیمرہ مین کے معاون کے طور پر خدمات انجام دینے لگے۔ انہوں

نے یہاں کڑی جسمانی محنت کی ۔ بابوراؤ پینٹر شانتارام کے استاد تھے۔اوراگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو داداصاحب پھالکے کی ساری ریاضت ،محنت ،لگن اور پہل کاری کے تمام عناصر بابوراؤ پینٹر کے ذریعہ شانتارام کو وراثت میں مل گئے مہاراشٹر فلم کمپنی میں شانتارام نے فلم سازی کے تمام رموز سیکھ لئے اور آخر کولہاپور میں ۱۹۲۷ء اپنا فلم سازادارہ 'پربھات' فلم کمپنی قائم کیا۔

۱۹۲۳ء میں بابوراؤ پینٹر نے شیواجی پر ایک فلم سنگھ گڑھ بنائی۔اگرچہ یہ شانتارام کی پہلی فلم نہیں تھی لیکن اس فلم میں انہوں نے ۲۰ سال کی عمر میں ۸۰ سال کے بوڑھے کا کردار ادا کیا تھا۔اس سے قبل ۱۹۲۱ء میں شانتارام کو فلم سریکھا ہرن میں بھگوان کرشن کا کردار ادا کرنے کا موقع ملا۔یہی ان کی پہلی فلم تھی۔لیکن بحیثیت ہیرو ان کی پہلی فلم 'ساوکاری پاش' تھی۔جس میں انہوں نے ایک غریب نوجوان کسان کا رول ادا کیا تھا۔یہ فلم ۱۹۲۵ء میں آئی تھی۔اوراس کے ہدایت کار بھی بابوراؤ پینٹر تھے۔

۱۹۲۷ء میں بابوراؤ پینٹر نے مہاراشٹر فلم کمپنی کے جھنڈے تلے فلم نیتاجی پالیکر پیش کی اوراس فلم کی ہدایت کاری کے فرائض شانتارام نے انجام دئے۔نیتاجی پالیکر شانتارام کی زیر ہدایت بننے والی پہلی فلم تھی۔اس فلم میں انہوں نے شیواجی کا کردار بھی ادا کیا تھا۔

اس کے بعد ۱۹۳۰ء میں انہوں نے ایک فلم سوراجیہ تورن بنائی۔اس فلم کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے اس فلم کے ذریعہ شیواجی کے کردار کے آئینے میں انگریز اوران کے دور کے حالات سے نبردآزمائی کی کوشش کی تھی۔ برٹش سرکار نے اس فلم پر کڑی پابندی لگادی آخر شانتارام کو اس فلم کو پاس کرانے کے لئے اس فلم کے چند مناظر میں تبدیلی کرنی پڑی۔اس فلم کا نام بھی بدل کر ''اودے کال'' رکھ دیا گیا۔اور جب انہوں نے ۱۹۳۵ء میں دھرماتما پیش کی تو اس فلم کے ساتھ بھی وہی حشر ہوا۔اس فلم کا نام پہلے مہاتما تھا۔لیکن بعد میں اس کا نام بدل کر دھرماتما رکھ دینا پڑا۔کیوں کہ حکومت کو اس فلم کے ذریعہ مہاتما گاندھی کے کردار کی عکاسی نظر آئی تھی۔ ۱۹۲۷ء کے بعد ۱۹۳۰ء میں شانتارام نے ایک فلم 'رانی صاحبہ' بنائی۔اس فلم کی ہیروئن چھ سال کی ایک بچی تھی۔

شانتارام اپنی زندگی میں ہی روایت بن چکے ہیں۔انہوں نے سنیما کو ایک منفرد مدرسۂ فکر عطا کیا ہے، جسے شانتارام اسکول سے منسوب کیا جاتا ہے۔یہی اسکول ان کا علامتی انداز ہے جو تماشائیوں کو دعوتِ فکر عطا کرتا ہے۔

شانتارام نے تکنیک کے اعتبار سے اپنی فلموں میں کئی تجربے کئے ہیں۔فلم 'دنیا نہ مانے' میں

انہوں نے پہلی بار پوری فلم میں بیک گراؤنڈ موسیقی کے بجائے صوتی اثرات کا استعمال کیا۔اس کے بعد پڑوسی میں آخری منظر میں دریا پر باندھ کا شاٹ ایک چھوٹی سی میز پر فلمایا جو ایک کارنامے سے کم نہ تھا۔اس کے علاوہ انہوں نے اپنی فلم 'آدمی' میں پہلی مرتبہ موزوں ترین مواقع کے مطابق فریز شاٹ تکنیک کا استعمال کیا۔یہی نہیں بلکہ انہوں نے اس فلم میں پہلی مرتبہ تماشائیوں میں قومی یکجہتی کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے ایک گیت میں ملک کے چھ مختلف علاقوں کی بولیاں استعمال کیں۔اس کے علاوہ فلموں کی شوٹنگ کے لئے کرین اورٹرالی کا سسٹم شانتارام نے شروع کیا اوراس کے ساتھ ہی دن کے وقت رات کے مناظر فلمانے کا سہرا بھی شانتارام ہی کے سر بندھتا ہے۔

شانتارام نے اپنی فلموں میں سماجی بیداری کو اپنا لائحہ عمل بنایا اورخوبی تو یہ ہے کہ کوئی بھی سماجی موضوع ان کی زد سے باہر نکل نہیں سکا۔ ہندو مسلم اتحاد اورقومی یکجہتی کے موضوع پر انہوں نے 'پڑوسی' اور تین بتی چار راستہ' چھوا چھوت کا قلع قمع کرنے کے لئے' دھرماتما' مذہبی کٹر پنتھی اورانسانوں اور جانوروں کی قربانیوں کے خلاف آواز اٹھانے کے امرت منتھن ،عورتوں پر مردوں کی بالادستی اور جہیز کی لعنت پر 'امرجوتی' اور 'دہیز' بے میل شادی اور بیوہ کی شادی پر 'دنیا نہ مانے' اور 'صبح کا تارا' جیلوں میں قیدیوں کی اصلاح کے لئے 'دوآنکھیں بارہ ہاتھ' مزدوروں کی استحصال کی عکاسی کے لئے 'سرنگ' شعرا اورفن کاروں کو راہ راست پر لانے کے لئے 'متوالا شاعر' 'نورنگ' گیت گایا پتھروں نے' اور 'جل بن مچھلی' 'نرت بن بجلی' ڈاکٹروں میں خدمتِ خلق کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے 'ڈاکٹر کوٹنس کی امرکہانی' جیسی اعلیٰ اورعمدہ فلمیں بنائیں۔یہی نہیں بلکہ فن کارانہ جست انہوں نے 'جھنک جھنک پائل باجے' میں لگائی۔اس میں کوئی شک نہیں مراٹھی ہونے کی وجہ سے شانتارام کا ہندی (شین قاف) درست نہ تھا۔اسی لئے ان کی اداکاری میں جھول آتا رہا۔لیکن انہوں نے اپنی جس فلم میں بھی کام کیا صبر وتحمّل محنت اورلگن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔اسی لئے انہوں نے اپنی اداکاری کو فطری بنانے کے لئے ڈپلی کیٹ کا استعمال نہیں کیا۔فلم 'دوآنکھیں بارہ ہاتھ' میں جیلر کا کردار ادا کرتے وقت آخر میں سانڈوں سے مڈبھیڑ کے دوران انہیں اپنی آنکھوں سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا خطرہ مول لینا پڑا تھا اور چھ ماہ ہسپتال میں گزارنے پڑے تھے۔شانتارام نے ۱۹۳۳ء میں ہندوستانی سنیما کو پہلی رنگین فلم 'سیرندھی' عطا کی۔اس کا رنگین پرنٹ برلن میں تیار ہوا تھا۔شانتارام نے ہمیشہ سچّا اور کھرا سودا کیا۔جب ان کی کمزورترین فلم 'لڑکی سیہ پادری کی' بمبئی میں نہ چلی تو پورے ہندوستان سے اس فلم کے سلسلے میں ڈسٹری

بیوٹروں سے جو رقم لی تھی لوٹا دی۔ شانتا رام اپنی فلموں کے پرنٹ ہندی اور مراٹھی دونوں زبانوں میں بناتے تھے۔ شانتا رام نے اپنی ۶۰ سالہ فلمی زندگی میں ایک فن کار کو شان سے جینے کا سلیقہ سکھایا۔ ان کی فلموں کی جہاں عوامی سطح پر خاطر خواہ پذیرائی ہوئی وہاں انہیں قومی اور بین الاقوامی اعزازات سے بھی سرفراز کیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں ان کی مراٹھی فلم 'امر بھوپالی' ۱۹۵۶ میں 'جھنک جھنک پائل باجے' ۱۹۵۸ء میں 'دو آنکھیں بارہ ہاتھ' اور ۱۹۶۳ میں گیت گایا پتھروں نے' کو قومی اعزازات سے سرفراز کیا گیا۔ اور اس کے علاوہ ۱۹۵۲ء میں ان کی مراٹھی فلم 'امر بھوپالی' کو بہترین صدابندی کے لئے کانز فلم فیسٹول میں (نیشنل ڈی لاسنیما ٹوگرافک پریس ایوارڈ) ان کی دستاویزی فلم 'اسپرنگ کمز ٹو کشمیر' کو برلن فلم فیسٹول میں سلور بیئر (SILVERBEAR) ۱۹۵۶ء میں اور 'دو آنکھیں بارہ ہاتھ کو ۱۹۵۸ء میں ایک سماجی مسئلے کی بہترین عکاسی پر خصوصی سلور بیئر (SILVERBEAR)' اسی فلم پر انٹرنیشنل کیتھولک سنیما ٹوگرافک بیورو کا خصوصی اعزاز موریئل گولڈن ایسوسی ایشن انٹرنیشنل فلم ایوارڈ اور ہالی ووڈ فارن پریس ایسوسی ایشن کا غیر ملکی زبان کی بہترین فلم کے اعزاز سے بھی سرفراز کیا گیا۔

یہی نہیں بلکہ ۱۹۳۵ء میں ان کی فلم 'امر جوتی' وینس فلم فیسٹول' ۱۹۴۲ میں 'شکنتلا' نیویارک میں، ۱۹۴۷ میں 'ڈاکٹر کوٹنس' کی امر کہانی' وینس کے فلمی میلوں میں دکھائی گئیں۔ ان فلموں کی وہاں خوب دھوم مچی۔

۱۹۸۰ء میں شانتا رام کو ناگپور یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔ ۱۹۸۶ء میں شانتا رام نے ۱۹۸۵ء کا دادا صاحب پھالکے اعزاز قبول کیا۔ اس سے قبل انہیں پدم شری کے اعزاز سے سرفراز کئے جانے کا اعلان کیا گیا لیکن انہوں نے یہ اعزاز لینے سے انکار کر دیا۔ اور اب شانتا رام نے مراٹھی زبان میں اپنی سوانح عمری لکھی ہے۔ جو شائع ہو چکی ہے۔ اور جس کے تراجم ہندی اور انگریزی میں بھی آ رہے ہیں۔

۲۶/اکتوبر ۱۹۹۰ء کو یہ عہد آفریں شخصیت راہئی ملکِ عدم ہوگئی۔

☆☆☆

ہدایت کار۔ سہراب مودی

خورشید اختر فرازی

سہراب مودی (۱۸۹۷۔۱۹۸۴) ایک ہندوستانی پارسی اسٹیج فلم ایکٹر، ڈائریکٹر اور پروڈیوسر تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کئی یادگار اور ناقابل فراموش فلمیں بنائیں جس میں خون کا خون لاجواب فلم ثابت ہوئی جو شیکسپیئر کے ڈرامہ ہیملٹ پر مبنی تھی، اس کے علاوہ سکندر، پرتھوی ولبھ، جھانسی کی رانی، مرزا غالب، نوشیروانِ عادل (۱۹۵۷) میں بنائیں۔ ان کی فلموں میں ہمیشہ ایک خاص پیغام ہوا کرتا تھا اور اس میں خاص طور پر سماجی اور قومی مسائل پیش کئے جاتے تھے جن کے انداز کو بی آر چوپڑہ نے اپنایا تھا۔

۱۹۸۰ء میں سہراب مودی کو دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا اور ان کی موت کے بعد ایک سال بعد ہی ممبئی کی بدنام زمانہ چور مارکٹ سے ایک انٹیک ڈیلر کے پاس سے وہ ایوارڈ برآمد ہوا اور اس ڈیلر نے دعویٰ کیا کہ یہ ایوارڈ انھوں نے براہ راست ان کے لڑکے مہیلی سے خریدا تھا۔ مہیلی نے نہ صرف اپنے والد کے تمام ایوارڈز اور جائداد فروخت کر کے دبئی میں سکونت اختیار کر لی تھی بلکہ ہندوستان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا تھا۔

۱۹۵۰ء میں بمبئی کی منروا تھیٹر میں سہراب مودی کی ایک یادگار فلم ''شیش محل'' کی نمائش ہوئی تھی اس موقع پر سہراب مودی خود بھی تھیٹر میں موجود تھے، انہوں نے فلم کے دوران ایک شخص کو آگے کی سیٹ پر آنکھ بند کر کے بیٹھے دیکھا جس سے سہراب مودی کو دلی تکلیف ہوئی کہ ایک شخص ان کی فلم دیکھنے آیا اور وہ بھی آنکھیں بند کر کے بیٹھا ہے انھوں نے ٹکٹ چیکر سے کہا کہ اس شخص کو ہال سے چلے جانے کو کہیں اور ان کے ٹکٹ کے پیسے واپس کر دیں۔ لیکن ٹکٹ چیکر نے آ کر ان سے کہا کہ وہ شخص تو بے چارہ اندھا ہے اور صرف سہراب مودی کے ڈائیلاگ سننے کے لئے آیا ہے۔

بمبئی میں پیدا ہوئے سہراب مودی پارسی اسٹیج کے اداکار تھے انھوں نے چند خاموش فلموں میں بھی کام کیا لیکن جیسے ہی ہندی فلم میں آواز کا اجرا ہوا انھوں نے خاموش فلموں میں کام کرنا

بند کر دیا۔ انہیں شیکسپیر کے ڈراموں سے عشق تھا اور وہ ان کے ہر ڈرامے کو فلمانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے بھائی کے تھیٹر یکل کمپنی کے ساتھ پورے ہندوستان کا دورہ کیا تھا وہ اپنے ڈائیلاگ کے سہارے فلم بینوں کو باندھے رکھتے تھے اور ناظرین ان کی فلموں میں صرف ان کے ڈائیلاگ سننے کے لئے جاتے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں جب سے بولتی فلموں کا آغاز ہوا اس کے ساتھ ہی ساتھ تھیٹر یکل کی دنیا کا زوال شروع ہوگیا۔

۱۹۳۶ء میں سہراب مودی نے منروا موی ٹون کو لانچ کیا۔ ان کی پہلی فلم ۱۹۳۶ء میں بیٹھا زہر بنی جو شراب کی لت چھڑانے کے لئے تھی۔ ۱۹۳۸ء میں انھوں نے فلم طلاق بنائی جس میں ایک ہندو عورت کو اپنے شوہر سے طلاق لینے کا حق دلانے پر زور دیا۔ خون کا خون ہیملیٹ پر مبنی تھی جس میں انھوں نے پہلی مرتبہ نسیم بانو (والدہ سائرہ بانو) کو پیش کیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں صدائے ہوس بنائی جو شیکسپئر کے کنگ جان پر مبنی تھی، یہ دونوں فلمیں فلاپ ہوگئیں۔ ۱۹۳۹ء میں انھوں نے ایک سپر ہٹ فلم ''پکار'' بنائی جس میں چندر موہن، نسیم بانو کو مرکزی کردار میں پیش کیا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں سکندر بنائی اور مرکزی رول پرتھوی راج کپور کو دیا۔ ۱۹۴۳ء میں پرتھوی ولبھ بنائی جو کہ اس زمانے کی بہترین فلم مانی گئی۔

فلم پکار مغل شہنشاہ جہانگیر کے کورٹ کی کہانی ہے جس میں جہانگیر کے انصاف کا ساری دنیا نے لوہا مان لیا تھا جب اس کی ہر دلعزیز بیگم نے تیر چلا کر ایک دھوبی کو مار دیا جس کے عوض میں وہ اپنی بیگم کو سزائے موت سناتا ہے لیکن بعد میں خون بہانے کے عوض میں ہرجانہ ادا کرنے پر جان بخشی ہوتی ہے اور جہانگیر اپنی بیگم سے کہتے ہیں ''تو اگر کشتہ شدی آہ چی می کروم'' اس فلم میں چندر موہن، سہراب مودی اور نسیم بانو کی اداکاری عروج پر تھی۔ اس کے ساتھ کمال امروہی کے ڈائیلاگ نے فلم کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیئے تھے۔

سکندر کو سہراب مودی کی سب سے زبردست فلم قرار دیا گیا ہے جس میں سکندر کا رول پرتھوی راج نے اور راجہ پورس کا رول سہراب مودی نے ادا کیا تھا۔ اس فلم کو کسی بھی ہالی ووڈ کی بڑی فلم جیسے بین ہور، دی ٹین کمانڈ زمنٹس سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ اسے ہر دور کا ماسٹر پیس فلم قرار دیا

گیا۔ سہراب مودی نے ۱۹۳۸ء میں فلم جیلر بنائی تھی جو کامیاب نہ ہوسکی تھی لیکن ۱۹۵۸ء میں دوسری مرتبہ جب وہ فلم بنائی تو وہ بیحد کامیاب ہوئی تھی۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے فلم بھروسہ بھی بنائی تھی۔

۱۹۴۶ء میں جب سہراب مودی اور نسیم بانو میں اختلافات پیدا ہوگئے اور نسیم بانو نے سہراب مودی سے منھ موڑ لیا تو ۱۹۵۷ء میں انھوں نے اداکارہ مہتاب سے شادی کرلی تھی جو ان سے عمر میں ۲۰ سال چھوٹی تھی۔ ۱۹۴۴ء میں فلم پرکھ میں انھوں نے مہتاب کو ہیروئن کے رول میں پیش کیا تھا۔ جو پرتھوی ولبھ منشی پریم چند کے ناول پر مبنی تھی۔

جھانسی کی رانی فلم کے لئے انھوں نے ہالی ووڈ کے ٹکنیشین کو بلایا تھا۔ اس فلم میں مہتاب نے جھانسی کی نوجوان رانی کا کردار ادا کیا تھا جس نے ۱۸۵۷ء کے غدر میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اس فلم میں سہراب مودی نے اس کے مشیر خاص راج گرو کا رول ادا کیا تھا۔ لیکن اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود یہ فلم فلاپ ہوگئی اور مودی کا دل ٹوٹ گیا تھا۔

بہرکیف ۱۹۵۴ء میں مرزا غالب بنائی جس میں بھارت بھوشن اور ثریا کو لیا اور یہ فلم زبردست ہٹ ثابت ہوئی تھی۔ یہ فلم بہادر شاہ ظفر کے دور مغلیہ کے آخری دور کی کہانی تھی۔ ۱۹۵۴ء کی ریلیز اس فلم کو بہترین فیچر فلم کے طور پر صدارتی گولڈ میڈل سے سرفراز کیا گیا تھا۔ اس فلم میں انھوں نے بہت سارے اعلیٰ شعراء جیسے ذوق، مومن، تشنہ، شیفتہ اور غالب کو پیش کیا تھا۔ اس فلم میں ثریا کو پہلی مرتبہ بہترین رول ادا کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس فلم کی چند غزلیں جیسے

(۱) آہ کو چاہئے ایک عمر اثر ہونے تک
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

(۲) نکتہ چیں ہے غم دل

(۳) دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے

(۴) یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا

اس فلم میں غالب کی غزلیں ثریا کی آواز میں فلمبند کی گئی تھیں جسے سننے کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے ثریا کو شاباش دیتے ہوئے کہا تھا کہ تم نے غالب کو پھر سے زندہ

کر دیا۔ ۱۹۵۵ء میں کندن، ۱۹۵۸ء میں نوشیروانِ عادل اور جیلر بھی مودی کی بہترین فلمیں ثابت ہوئیں سہراب مودی ۸۶ سال کی عمر میں کینسر کے مرض میں مبتلا ہوکر انتقال کر گئے ان کی یادگار فلمیں حسب ذیل ہیں۔

خون کا خون (۱۹۳۵) جیلر (۱۹۳۸۔۱۹۵۸) سکندر، پرتھوی ولبھ، شیش محل پکار (۱۹۵۰) جھانسی کی رانی (۱۹۵۲) کندن (۱۹۵۵) راج ہٹ (۱۹۵۶) نوشیروان عادل (۱۹۵۷) یہودی (۱۹۵۸) جیلر (۱۹۵۸) پہلی رات (۱۹۵۹) وہ کوئی اور ہوگا (۱۹۶۷) جوالا (۱۹۷۱) ایک ناری ایک برہمچاری (۱۹۷۱) رضیہ سلطان (۱۹۸۳)۔

☆☆☆

کمال امروہی

تاجدارِامروہوی

جس زمانے میں امتیاز علی تاج کے شاہکار ڈرامے 'انارکلی' نے ملک بھر کے ادبی حلقوں میں دھوم مچا رکھی تھی، امروہہ کا ایک نوعمر ادیب سیّد امیر حیدر کمال لاہور کی ادبی دنیا میں وارد ہوا۔ لیکن کچھ مدت بعد ہی وہ اردو ادب کو خیرباد کہہ کر فلمی کہانیاں لکھنے کے لئے بمبئی چلا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ ادبی محاذ چھوڑ کر نہ جاتا تو اپنی ذہانت وفراست کی بدولت اردو ادب میں ایک منفرد اور امتیازی مقام حاصل کر لیتا، تاہم وہ فلمی دنیا کی چکا چوند میں ایسا کھویا کہ اسے ادب کی جانب سے توجہ دینے کی فرصت ہی نہ ملی اور اس طرح اردو ادب ایک ذہین وزیرک ادیب سے محروم ہوگیا، مگر اس نے اپنی پہلی کہانی ہی لکھ کر فلمی دنیا میں ایسا کمال کر دکھایا کہ لوگ اس کا اصلی نام بھول گئے اور انہیں صرف کمال امروہی ہی یاد رہ گیا۔

کمال امروہی کی ولادت سترہ جنوری انیس سو اٹھارہ کو امروہہ کے ایک سادات گھرانے میں ہوئی۔ ابتداء میں انہوں نے اپنے چچازاد بھائی رئیس امروہی کے ساتھ گھر پر ہی مختلف اساتذہ سے اُردو فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ لیکن بعد ازاں انہیں تعلیم کے لئے دہرہ دون بھیج دیا گیا کیونکہ گھر والوں کے زیادہ لاڈ پیار سے وہ کچھ حد تک بگڑ گئے تھے اور ہر وقت کوئی نہ کوئی شرارت کرتے ہی رہتے تھے دہرہ دون سے ہی انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا، پھر واپس امروہہ آ گئے لیکن وہ وہاں زیادہ دن نہ رہ سکے، ان کی کسی بات پر خفا ہوکر ان کے بڑے بھائی نے انہیں تھپڑ مار دیا۔ اس پر خفا ہوکر انہوں نے گھر سے بھاگ کر لاہور جانے کے لئے اپنی بہن کا کنگن چرالیا اور سو روپئے میں بیچ کر لاہور کا ٹکٹ کٹالیا۔

لاہور میں قیام کے دوران انہوں نے ایم۔او۔ایل کی سند حاصل کی اور کہانیاں اور مضامین لکھ کر اپنی گزر بسر کرتے رہے۔ پھر فلموں میں قسمت آزمانے کے لئے بمبئی چلے گئے جہاں ان کی تخلیقی صلاحیت سے متاثر خواجہ احمد عباس نے ان کا تعارف بمبئی ٹاکیز کے مالک ہمانشورائے سے کرایا جنہوں نے ان کی کہانی ''آہوں کا منار'' پر فلم بنانے کا پروگرام بنایا۔ مگر اس سے پیشتر کہ فلم کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہمانشورائے کی وفات ہوگئی۔ اسی دوران انہوں نے اپنی ایک فلم کہانی 'جیلر' بیچنے کے لئے منروا موی ٹون کے مالک سہراب مودی سے بات چیت کی۔ کہتے ہیں کہ مودی صاحب پہلی نظر میں ان سے ذرا متاثر نہ ہوئے لیکن کمال

صاحب نے ان سے اپنی تحریر کردہ کہانی کو ایک بار سننے کی استدعا کی، جسے ان چاہے من سے انہوں نے قبول کرلیا۔ مگر کہانی سننے کے بعد وہ اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسے تین سو روپے معاوضہ کے عوض خرید لیا۔ اب رہ گئی فلم کے مکالمے لکھنے کی بات کو مودی صاحب نے انہیں بتایا کہ وہ فلم کے مکالمے اپنی فلم کمپنی کے ملازم لالہ منشی سے لکھوائیں گے کیوں کہ مکالمے لکھنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔ اس پر کمال صاحب نے انہیں کہا کہ وہ بغیر معاوضہ کے ڈائیلاگ لکھ کر دیں گے جنہیں وہ پسند آنے کی صورت میں استعمال کر سکتے ہیں اور جب وہ ڈائیلاگ لکھ کر لائے تو سہراب مودی کو اتنے پسند آئے کہ انہوں نے اسے فلم میں استعمال کرنے کے لئے قبول کرلیا۔ اس کے بعد وہ منروا سے وابستہ ہوگئے ہوئے اور اس طرح انیس سو اڑتیس میں ان کی اچھوتی کہانی پر مبنی فلم جیلر، نمائش کے لئے پیش کی گئی جس میں اہم اداکار تھے سہراد مودی، شیلا، صادق علی اور لیلا چٹنس اور سہراب مودی یہ فلم صرف کمال امروہی کے لئے نہیں بلکہ سہراب مودی اور ان کی فلم کمپنی کی شہرت و مقبولیت کا باعث بنی۔ چونکہ اس سے پیشتر اس انوکھے موضوع پر ایک حسین عورت اپنے بدصورت شوہر کو چھوڑ کر اپنے خوبصورت عاشق کے ساتھ بھاگ جاتی ہے اور پھر اپنی ننھی بچی کی فرقت میں تڑپتی اور زار و قطار روتی ہے اور اپنے کئے پر پچھتاتی ہے چونکہ اس انوکھے موضوع پر کوئی فلم نہیں بنی تھی اس لئے اس بے حد پسند کیا گیا اور ہر ایک کی زبان پر اس فلم کی کہانی اور مکالمے تھے۔

جیلر کی کامیابی کے بعد انہوں نے عدلِ جہانگیر کو بنیاد بنا کر فلم پکاری کی کہانی لکھی جس میں دو راجپوتوں رانا سنگر رام سنگھ اور اُودے سنگھ کی دشمنی اول الذکر کے بیٹے منگل سنگھ اور اور آخر الذکر کی بیٹی کنور کے عشق کی داستان اور عدل مہانگیر کو دکھایا گیا تھا۔ انیس سو انتالیس میں پیش کی گئی اس فلم میں جہانگیر کے رول میں چندر موہن اور رانا سنگرام کے کردار میں سہراب مودی کے مکالموں نے ملک بھر میں دھوم مچادی۔ غالباً یہ ملک کی پہلی فلم تھی جس کے ڈائلاگ فلم بینوں کو زبانی یاد ہو گئے تھے اور جنھیں لوگ کبھی فراموش نہیں کر پائے خصوصاً مغلیہ دربار میں جہانگیر اور رانا سنگرام سنگھ کے مکالمے۔

آئندہ برس ان کی دو فلمیں 'بھروسہ' اور 'میں ہاری' منظر عام پر آئیں۔ پہلی فلم سہراب مودی کی ہدایت میں تیار ہوئی تھی اور اس کے اہم اداکار چندر موہن، مظہر خان، سردار اختر، شیلا اور مایا دیوی تھے جبکہ دوسری فلم میں ہاری، گجانن جاگیردار کی زیرِ ہدایت بنی تھی اور اس میں نسیم، نوین یا گنکِ، مایا دیوی وغیرہ نے اہم کردار نبھائے۔ انتیس سو تینتالیس میں ڈائریکٹر ظہور راجہ نے مادھوری، پہاڑی سانیال، رادھا رانی جیسے مقبول اداکاروں کو لے کر ان کی کہانی پر فلم مذاق بنائی لیکن وہ ناکام ہوگئی۔ اس کے بعد انتیس سو پینتالیس میں کے آصف نے ان کی تحریر کردہ کہانی پر فلم 'پھول' پیش کی جس میں اس دور کے بڑے بڑے اداکاروں (وینا، ستارا، ثریا، پرتھوی

راجکپور، مظہر خان، درگا کھوٹے، یعقوب واسطی، دیپک اسمعیل، اشرف خان، آغا اور جلوبائی) نے کام کیا تھا اور اتنی بڑی کاسٹ کی وجہ سے غیر معمولی اور ملک گیر پبلیسٹی ملی تھی۔ آئندہ برس ان کی کہانی پر دوبارہ فلمیں منظر عام پر آئیں۔ ایک تھی اے۔ آر۔ کاردار کی شاہجہاں اور دوسری کیریکٹر گجانن جاگیردار کی ہدایت میں بننے والی فلم بہرام خان۔ اس کے علاوہ انتیس سو سینتالیس میں انہوں نے اختر حسین کے ادارے نرگس آرٹ کنسرن کے لئے فلم ''رومیو جیولیٹ'' تحریر کی جس میں رومیو کا رول سپرد نے اور جولیٹ کا رول نرگس نے ادا کیا تھا۔

تقسیم ملک کے بعد کچھ عرصہ افراتفری میں گزرا، پھر انہوں نے اپنی کہانی ''محل'' پر پہلی بار اپنی ڈائرکشن میں فلم بنانے کا پروگرام بنایا۔ انتیس سو انچاس میں نمائش کے لئے پیش کی گئی۔ اس فلم کے موسیقار مرحوم کھیم چندر پرکاش تھے۔ یہ فلم کئی لحاظ سے منفرد اور یادگارِ فلم تھی اور اسے سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اس فلم میں مدھوبالا کی سحر انگیز خوبصورتی اور سنجیدہ اداکاری نے اسے صف اوّل کی ہیر بنا دیا تھا اور لتا منگیشکر کے مسحور کن گانوں ''آئے گا آنے والا......'' ''مشکل ہے بہت مشکل......'' اور ''دل نے پھر یاد کیا......'' نے انہیں پلے بیک سنگر کی حیثیت سے صحیح معنوں میں ایک الگ پہچان عطا کی۔

''محل'' کے بے حد کامیابی سے متاثر ہو کر انہوں نے انیس سو پچاس میں اسی نام سے اپنا نجی ادارہ محل پکچرز قائم کیا اور فلمسٹار مینا کماری کو ہیروئین لے کر فلم دائرہ، کی تخلیق کی جسے انیس سو ترپن میں نمائش کے لئے پیش کیا گیا عوام نے اسے بالکل پسند نہ کیا اور عام معنوں میں یہ فلم فلاپ ہوگئی۔ حالانکہ کہانی اور ڈائریکشن کے نقطۂ نظر سے یہ ایک اعلیٰ پائے کی ایسی سنجیدہ فلم تھی جس کے بعد فلموں کی تاریخ ادھوری معلوم ہوتی ہے۔ دراصل اس کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ اس فلم میں ہیروئن آپس میں بات تک نہیں کرتے۔ بھلا عام فلم بین اسے کیسے پسند کرتا وہ تو ہیروئین کی اچھل کود اور گانے بجانے کے مناظر کا عادی ہو چکا تھا۔ لہذا عام ڈگر سے ہٹ کر ہونے کی وجہ سے باکس آفس پہ یہ بری طرح پٹ گئی۔

اس فلم کے علاوہ مینا کماری کو لے کر فلم 'انارکلی' (بینا رائے، پردیپ کمار) اور کے۔ آصف کی (مغل اعظم، بن رہی تھیں۔ آخر الذکر کہانی اور مکالمے ان ہی کے تحریر کردہ تھے حالانکہ بطور کہانی نویس ان کا نام نہیں دیا گیا تھا۔

انیس سو اکہتر میں ان کی معرکتہ آلارا فلم ''پاکیزہ'' منظر عام پر آئی جس میں مینا کماری، راجکمار، دینا اور راشوک کمار نے اداکاری کے جوہر دکھائے تھے اور اس کے پرزور اور دلِ پذیر مکالموں مسحور کُن موسیقی اور دلکش گانوں نے عوام کا دلِ جیت لیا تھا۔ اس فلم کی مقبولیت کا یہ عالم تھا

کہ شملہ سمجھوتے کے دوران جب پاکستانی مہمانوں کو یہ فلم دکھائی گئی تو اس فلم سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ایک صحافی نے پاکستان جا کر امتیازات میں لکھا تھا کہ عموماً مقبول فلم کو کھڑکی توڑ کہا جاتا ہے لیکن اگر یہ فلم پاکستان میں دکھائی جائے تو فلم بینوں کا بے پناہ رش کھڑکیاں ہی نہیں سنیما دیواریں توڑ دے۔

انیس سو تیرا میں انہوں نے اپنی آخری فلم ''رضیہ سلطان'' پیش کی جوان کی عمدہ ہدایت کاری اور مکالموں، خیام کی اعلیٰ موسیقی، بڑے بڑے بیش بہا سیٹوں اور ہیما مالنی، دھرمندر اور سہراب مودی جیسے بڑے بڑے اسٹار کے باوجود کامیاب نہ ہو پائی اور معاشی طور پر ان کی کمر ٹوٹ گئی۔

کمال امروہی نے مجنوں، ساتواں آسمان اور آخری مغل وغیرہ کئی فلموں کی تیاری کا وقتاً فوقتاً اعلان کیا لیکن یہ فلمیں نہیں بن سکیں اور ان کی زیرِ ہدایت صرف فلمیں محل، دائرہ، پاکیزہ اور رضیہ سلطان ہی بن پائیں لیکن یہ شرف صرف انہیں ہی حاصل ہے کہ ان کی چاروں فلمیں کسی نہ کسی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ ہندوستانی فلمی صنعت میں جہاں سیکڑوں فلموں کو ہدایت دینے والے ڈائریکٹروں کا آج کوئی نام لیوا نہیں۔کمال امروہی ہمیشہ یاد رکھے جائے گے کیونکہ ان کی ہر فلم میں کوئی نہ کوئی انفرادیت ضرور تھی۔محل صرف پہلی سسپنس فلم ہی نہیں تھی بلکہ وہ ان میں سرِ فہرست بھی ہے۔اسی طرح ''دائرہ'' واحد سنجیدہ فلم تھی جس میں ہیرو ہیروئین آپس میں کوئی بات چیت نہیں کرتے۔ پاکیزہ کو ہندوستانی سنیما کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے اور ان کی رضیہ سلطان بھی کہانی، مکالموں، گیتوں اور بڑے بڑے سیٹوں کی وجہ سے تاریخی فلموں میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔

کمال امروہی نے مجنوں، ساتواں آسمان وغیرہ کئی فلمیں بنانے کا وقتاً فوقتاً اعلان کیا تھا جو کسی سبب نہ بن پائیں۔اسی طرح کچھ عرصہ پیشتر انہوں نے 'آخری مغل' بنانے کا اعلان کیا تھا حالانکہ رضیہ سلطان کی ناکامی سے وہ دلِ برداشتہ ہو چکے تھے اور اس پر آئی غیر معمولی لاگت نے انہیں مالی طور پر توڑ دیا تھا مگر عمر رسیدگی، بیماری اور بعض دیگر وجوہ سے وہ اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے اور گیارہ فروری انیس سو تیرانوے کو ان کی وفات کے ساتھ ہی ان کے 'آخری مغل' کے خواب نے بھی دم توڑ دیا۔

☆☆☆

فلم ساز ہدایت کار ۔نتن بوس

پریم پال اشک

کلکتہ کے فلمساز ادارے نیوتھیئٹرز نے ہندوستانی سنیما کو دیوکی بوس، پی سی بروا اور نتن بوس یہ تین تابناک ہیرے عطا کئے ۔فلم ساز ہدایت کار نتن بوس جہاں سنیما کو سماجی مسائل سمجھنے اور سمجھانے کا ذریعۂ اظہار بنایا وہاں اس کے حسن اور تاثر کو بھی برقرار رکھا۔اور بنگال اسکول کی حقیقت نگاری کو تقویت دی۔ وہ ۱۸۹۷ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے اور کلکتہ میں ہی تعلیم حاصل کی ۔مگر گریجویٹ نہ بن سکے ۔ان کے والد کا نام ہمیند ر موہن بوس تھا۔ وہ اپنے دور کے کلکتہ کے ایک مشہور کارخانہ دار تھے ۔اُن کے ۹ لڑکے تھے ۔نتن بوس ان کے تیسرے لڑکے تھے ۔ان کے والد نے لومئیر آٹو کروموکلر پروسس کے ساتھ بھارت میں رنگین فوٹوگرافی کا چلن شروع کیا۔ ۱۹۲۱ء میں انہوں نے ان کارنیشن اور 'چور کا نتا' نامی خاموش فلموں کی فوٹوگرافی کی ۔اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے فلم سازی شروع کر دی۔اسی سال انہوں نے پوری کی رتھ یاترا کے زیرِ عنوان نیوز ریل تیار کی ۔ اور اس کام کے لئے نتن بوس کو ولیم رپن ڈولف ہرسٹ کی انٹرنیشنل نیوز ریل کارپوریشن سے ۱۰۳ ڈالر ملے ۔

اس کے بعد نتن بوس نے نیوتھیٹرز میں تیکنیکی مشیر، کیمرہ مین اور ہدایت کار کے طور پر شرکت اختیار کر لی ۔ وہاں تیس کے دہے میں انہوں نے یادگار فلمیں تیار کیں ۔ جن میں دلیشر ماٹی ،جبین مرن، دیدی، کاشی ناتھ جیسی بنگلہ فلمیں اور چنڈی داس ،لگن، پرایا دھن، مجرم ملن اور مشعل جیسی ہندی فلمیں شامل تھیں ۔ ان کی ہر فلم میں چست ہدایت کاری اور جذبات نگاری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں ۔ اس کے بعد انہوں نے بمبئی میں 'گنگا جمنا' اور 'دیدار' جیسی سُپر ہٹ فلمیں پیش کیں ۔ ہماری فلموں میں پلے بیک موسیقی اور گانوں کی پہلے سے ریکارڈنگ کا سلسلہ نتن بوس نے شروع کیا۔ جب انہوں نے فلم کاشی ناتھ بنائی تو گیتوں کے مناظر کے دوران کیمرہ کے بندھے ٹکے زاویے شاٹ لینے کے چلن کو حتی الامکان خیر باد کہہ دیا۔

خاموش فلموں کے دور میں ایسٹرن فلم کمپنی، آرئین فلم کمپنی اور اروڑہ فلم کمپنی میں خدمات انجام دیں۔

پونہ کے فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ کے قیام میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا اور چند برسوں تک اسی ادارے میں بحیثیت لیکچرر خدمات انجام دیں۔ اور فلم سازی کے اپنے نصف صدی کے تجربات سے نئی نسل کے فلم سازوں کو مستفیض کیا۔

انہوں نے نتن بوس لیمیٹڈ' بمبئی کے زیرِ عنوان اپنا فلم ساز ادارہ قائم کیا اور دردِ دل اور امر سہگل نامی فلمیں بنائیں۔ ۱۹۷۸ء میں انہیں ۱۹۷۷ء کا دادا صاحب پھالکے اعزاز عطا کیا گیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد وہ دارِ فانی سے کُوچ کر گئے۔

☆☆☆

ہندوستانی فلموں کے بے تاج بادشاہ۔ ایل وی پرساد

عنصری بیگم

متعدد ہندی، تامل اور تیلگو فلموں کے خالق، دادا صاحب پھالکے ایوارڈ اور راجہ سینڈو ایوارڈ پانے والے مشہور و معروف فلم ساز اور ہدایت کار ایل وی پرساد ۲۲/جون کو مدراس میں ۸۷ سال کی عمر میں چل بسے اور ہم ایک عظیم فلم ہستی سے محروم ہو گئے ایک ایسی فلمی ہستی جو شاید دوبارہ نہ پیدا ہو سکے۔ پرسادؔ کو ہندی فلموں میں ایک تاریخی حیثیت حاصل تھی۔ انہوں نے صرف ہندی، تامل، تیلگو اور ملیالم فلموں کو پروڈیوس اور ڈائریکٹ ہی نہیں کیا بلکہ ان چاروں زبانوں کی فلموں میں اداکاری بھی کی ان کا سب سے بڑا کمال تو یہ تھا کہ انہوں نے تین زبانوں کی بولنے والی پہلی فلم میں اداکاری کی۔ ہندوستانی فلم صنعت میں انہیں جو مقام حاصل ہے کسی دوسرے کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکا۔ انہوں نے اپنی فلمی زندگی کا آغاز ایک ایکٹر کی حیثیت سے کیا لیکن وہ ایکٹر کے ساتھ ساتھ پروڈیوسر اور ڈائریکٹر بھی ہوئے اور سبھوں سے خراج تحسین وصول کیا۔ ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے حکومت ہند نے ۱۹۸۲ء میں انہیں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے نوازا تھا۔ حکومت تامل ناڈو کی طرف سے راج سینڈو ایوارڈ انہیں دوبارہ عطا کیا گیا جنوبی ہند فلم چیمبر آف کامرس کے وہ کافی دنوں تک صدر رہے۔

اکینینی لکشمی ورا پرساد راؤ یعنی ایل روی پرساد کی پیدائش یکم جنوری ۱۹۰۸ء کو آندھرا پردیش کے ایلورو میں ہوئی۔ بچپن میں تعلیم سے انہیں زیادہ دلچسپی نہیں تھی اسی لئے نوجوانی میں ہی وہ بمبئی چلے گئے اور ۱۵ برسوں تک بمبئی کی خاک چھانتے رہے ان پندرہ برسوں کے دوران انہوں نے بہت ساری نوکریاں کیں جن میں گیٹ کیپری بھی شامل ہے۔ بولتی فلموں کا دور شروع ہوا تو انہوں نے پہلی بولتی ہندی فلم عالم آرا، پہلی بولتی تامل فلم کالی داس اور پہلی بولتی تیلگو فلم پرہلادمیں بے نظیر ایکٹنگ کی۔ بمبئی کی فلم صنعت میں انہیں جوانی کے دور میں ہی شاندار کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔

بمبئی سے جب وہ مدراس واپس ہوئے تو انہوں نے تیلگو فلم ''گرہ پرویسم'' کی ڈائرکشن کی۔ اس فلم کے ہیرو بھی وہی تھے اس طرح وہ آگے بڑھتے گئے اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کی انہیں فرصت ہی نہیں مل سکی۔

انہوں نے ۶۰ فلمیں ڈائریکٹ کیں جن میں تامل، تیلگو اور ہندی فلمیں شامل ہیں اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے ۵۰ سے زائد فلموں کو پروڈیوس کیا۔

’مند ہارا‘ نامی فلم تین زبانوں میں بنائی گئی اور تینوں کے ڈائرکٹر وہی رہے حالیہ برسوں میں ان کی ہندی فلم ’’ایک دوجے کے لئے‘‘ بہت ہی کامیاب ثابت ہوئی تھی ان کی ہندی فلموں میں کھلونا، ملن، چھوٹی بہن، ہمراہی، سسرال، راجہ اور رنک اور دادی ماں وغیرہ بہت کامیاب ثابت ہوئی تھیں۔ ۱۹۸۰ء میں انہوں نے ایک تامل فلم راجہ پروائی میں ایک اہم رول کیا تھا اور اس کے بعد انہوں نے فلمی دنیا سے ریٹائرمنٹ لے لی تھی اس فلم کے پروڈیوسر کمل ہاسن تھے۔

ایل وی پرساد نے فلم صنعت کے لئے جو بےنظیر خدمات انجام دیئے ہیں انہیں فراموش کرنا آسان نہیں ہے۔ انہوں نے ۱۹۶۵ء میں مدراس میں پرساد اسٹوڈیوز اور ۱۹۷۶ء میں پرساد کلر لیب قائم کئے کوڈ کیم میں مدراس میں ۷۰ ایم ایم پروجیکشن اور ریکارڈنگ تھیٹر قائم کیا جو ملک میں اپنی نوعیت کا پہلا فیکٹر تھا۔ پرساد اسٹوڈیوز اور لیبوریٹوریز اپنی کارکردگی کے لحاظ سے نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ملک میں جتنی بھی زبانوں میں فلمیں تیار ہوتی ہیں ان میں یہ مددگار و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

☆☆☆

فلم ساز و ہدایت کار۔ بی۔ آر۔ چوپڑہ

خورشید اختر فرازی (مغربی بنگال)

بلدیوراج چوپڑہ (بی آر چوپڑہ) جو ۴ رنومبر ۲۰۰۸ء کو ۹۴ سال کی عمر میں چل بسے ان کی پیدائش ۲۲ راپریل ۱۹۱۶ء کو لدھیانہ (پنجاب) میں ہوئی تھی۔ وہ فلمساز و ہدایت کار یش چوپڑہ اور دھرم چوپڑہ کے بڑے بھائی تھے۔ ان کی موت کی خبر سنکر عظیم اداکار دلیپ کمار رو پڑے اور کہا کہ ہندی فلموں سے باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ دلیپ کمار نے کہا کہ میں نے بہت سارے فلمسازوں اور ہدایتکاروں کے ساتھ کام کیا، لیکن اس شخص کو میں نے دوسروں سے بہت بلند پایا جو ایک سچے محبّ وطن اور سیکولر انسان تھے، انھوں نے زندگی بھر ہندو مسلم فساد کو روکنے اور ان کی مذمّت کرنے میں گزار دی وہ ایک ایسے اصلاح پسند انسان تھے جن کی نظر میں انسان کی قیمت سب سے زیادہ تھی، وہ ترقی کے نام پر انسان کے ہاتھ کٹوا دینے کے نفسیات سے زیادہ تھی، وہ ترقی کے نام پر انسان کے ہاتھ کٹوا دینے کے نفسیات پر یقین نہیں رکھتے تھے، ان کے اندر انسانیت سے بھر پور ایک ایسی جوالامکھی تھی جو باہر آنے کے لئے بے چین تھی، ان کی تمام فلمیں ایک سبق آموز دستاویزات کی حیثیت رکھتی ہیں، وقت، گمراہ، نیا دور، دھول کا پھول، اتفاق، قانون جیسی فلمیں اس کی مثال ہیں، دلیپ کمار کی بیگم سائرہ بانو نے بھی انہیں زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ فلم آدمی اور انسان میں ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ صحیح معنوں میں آدمی اور انسان کسے کہتے ہیں۔

بی آر چوپڑہ ہندی فلموں کے ایک ایسے فلمساز و ہدایت کار رہے ہیں جنھوں نے اپنی ہر فلم بامقصد بنائی اور ہر فلم لوگوں کے لئے ایک پیغام ثابت ہوئی، انھوں نے کبھی بھی اس خیال سے فلم نہیں بنائی کہ ان کی فلمیں تجارتی نکتہ نظر سے کامیاب ہوں اور وہ خوب دولت بٹور سکیں۔ اگر انہیں دولت ہی بٹورنا ہوتا تو وہ بھی منموہن سنگھ ڈیسائی، ایف سی مہرہ، پرکاش مہرہ اور ڈیوڈ دھون جیسے ہدایتکاروں کی صف میں نظر آتے، ان کی زندگی کا مقصد اچھی، صاف ستھری فلمیں بنانا تھیں تاکہ ان فلموں کے ذریعہ لوگوں کو

جو پیغام ملے اس کی بدولت وہ اپنی زندگی کا نصب العین متعین کرسکیں۔ ان کی کسی بھی فلم کو سامنے رکھا جائے تو اس کا احساس ضرور ہوگا کہ وہ ایک مکمل طور پر سماجی آدمی تھے اور سماج کے اندر کی گندگیوں کو باہر نکالنا چاہتے تھے، ان کی پرانی فلموں میں سادھنا، ایک ہی راستہ ایسی فلمیں تھیں جس کے ذریعہ انھوں نے سماج کی ٹھکرائی ہوئی ان عورتوں کی زندگی بہتر بنانے کی کوشش کی تھی جو برائیوں کے دلدل سے نکل کر باہر آنا چاہتی تھیں، ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ کوئی باہمت مرد آگے بڑھے اور ان کا ہاتھ تھام لے۔ چوپڑہ صاحب نے یہ ہمت بھی اس لئے کی تھی کہ انہیں سماج کے چند گھناؤنے رسم سے بے پناہ نفرت تھی، کوئی نوجوان لڑکی اگر بیوہ ہوجائے تو وہ دوسری شادی نہیں کرسکتی، اپنے شوہر کی چتا کے ساتھ جل کرستی ہوجائے تو بہت خوب اورنہیں تو زندگی بھر نوکرانی بن کر جھوٹے کھانے کھا کر اپنی زلفیں ترشوا کر زندگی گزارے اور ننگے فرش پر سوئے، ظالم سماج کے ان فرسودہ اور ناخواندگی سے بھر پور رسموں کے خلاف چوپڑہ صاحب نے علم بغاوت بلند کی تھی، ان کی نظر میں فاحشائیں بھی نئی زندگی گزارنے کی اہل تھیں، کیونکہ انہیں فاحشا اور عصمت فروش بنانے والے مرد ہی تھے، وہی مرد جو عورت کی چھاتی چوس کر جوان اور مرد ہوئے، انہی مردوں نے عورت کی چھاتی کو بیوپار بنایا، فلم سادھنا (سنیل دے، وجنتی مالا) ان کی ایک ایسی ہی ولولہ انگیز اور انقلابی فلم تھی جس نے ارباب ایوان کی بنیادی تک ہلا دی تھیں اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ عورت کی اس تنزلی کے پیچھے کوئی اورنہیں مرد ہی ہیں۔

فلم ''دھول کا پھول'' (راجندر کمار، مالا سنہا، نندہ، منموہن کرشن) بی آر چوپڑہ کی ایک ایسی ہی انقلابی فلم تھی اور اس فلم میں بھی انہوں نے لوگوں کو ایک پیغام دیا تھا کہ لڑکا اور لڑکی کو آپس میں تعلقات اس حد تک نہ بڑھانے چاہئے کہ وہ تعلقات آگے چل کر لڑکی کے پیٹ میں پلنے لگے، اس فلم کی کہانی بھی ایسی ہی ایک بدنصیب لڑکی کے اردگرد گھومتی ہے جو غریب اور کالج کے ایک دوست کے ساتھ محبت میں اس حد تک آگے بڑھ جاتی ہے کہ اس کی بدنامی ایک وجود کی شکل میں آنے کے لئے تیار نظر آتی ہے لیکن وہ لڑکا اُسے دھوکا دے کر طرح طرح کے طوفان آتے ہیں اور وہ کس کس طرح سے دنیا کا سامنا کرتی ہے۔ یہ سب رونگٹے کھڑے کر دینے والے مناظر ہیں۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے اور اچھا برا کچھ نہیں دیکھتی

یہ فلم بھی سبق آموز حقائق کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔ ۲۲/اپریل ۱۹۱۶ء کی پیدائش بی آر چوپڑہ نے دور غلامی میں آنکھیں کھولی تھیں اور انہیں احساس تھا کہ ہندستانی کس طرح سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، انگریزوں کی مشینیں کس طرح سے مزدوروں کے ہاتھ قلم کررہی ہیں، اسی خیال کو سامنے رکھ کر بی آر چوپڑہ نے فلم ''نیا دور'' بنائی جس میں دلیپ کمار، وجنتی مالا، چاند عثمانی، اجیت، جانی واکر، رادھا کرشن، منموہن کرشن اور ڈیزی ایرانی نے کام کیا تھا۔ اس فلم کی اصل کہانی مزدور اور مشین کے درمیان جنگ تھی، جو مزدور اسی درخت کو دو دن میں کاٹ سکتا تھا اسی درخت کو ایک مشین پانچ منٹ میں کاٹ سکتی تھی جس یکّہ سواری کے ذریعہ چار گھنٹوں کے مسافت طے ہوتی تھی وہیں سفر تیز رفتار بس کے ذریعہ دس منٹ میں طے ہوسکتی تھی، جس کا حل مزدوروں کا صفایا اور چوپڑہ صاحب نے اس کا حل یہ نکالا کہ مشین بھی آئے اور ترقی بھی ہو، مگر مزدوروں کے ہاتھ سلامت رہیں اور ان کے لئے کوئی متبادل انتظام ہو۔ اس فلم میں جذبات کی عکّاسی، بہترین اداکاری خوبصورت گیت، بہترین موسیقی وغیرہ نے مل کر فلم کو بیحد خوبصورت بنا دیا تھا۔

بی آر چوپڑہ کی فلمیں جن میں سے کئی فلموں کے وہ صرف پروڈیوسر رہے ڈائریکٹر نہیں، ان کی ایک طویل فہرست ہے، اس ضمن میں ان کی دو فلموں کے نام خاص طور پر لئے جاسکتے ہیں جن میں انھوں نے ایک بھی گیت نہیں رکھا تھا مگر یہ دونوں فلمیں باکس آفس میں سپرہٹ ثابت ہوئیں جن میں سے ایک ۱۹۶۰ء کی ریلیز ''اتفاق'' (راجیش کھنہ، نندہ سجیت کمار) ہیں۔ فلم قانون میں چوپڑہ صاحب نے پھانسی کی سزا موقوف کردینے کی وکالت کی تھی اور ان کے خیال میں پھانسی کی سزا نہیں ہونی چاہئے کیونکہ کبھی کبھی ایسے لوگ بھی پھانسی پر چڑھ جاتے ہیں جو بے گناہ ہوتے ہیں اور جھوٹے ثبوتوں اور جعلی گواہوں کے بیان پر وہ تختہ دار پر چڑھا دیئے جاتے ہیں مگر بعد میں یہ ثبوت بھی ملتا ہے کہ وہ بے گناہ تھے مگر اس کے بعد انہیں زندگی تو نہیں ملتی۔ اسی لئے انھوں نے پھانسی کے بجائے ۱۴ سال کی عمر قید کی وکالت کی تھی۔ کیونکہ پھانسی کے بعد مجرم کا جسم بے جان ضرور ہوجاتا ہے مگر جرم تو زندہ رہتا ہے اور دوسروں میں منتقل ہوجاتا ہے۔ انھوں نے عدالت سے

گزارش کی تھی کہ وہ مجرم کو ختم کرنے کے بجائے جرم کو ختم کرنے پر ترجیح دیں۔ بی آر چوپڑہ نے فلم ''دشمن'' (راجیش کھنہ، مینا کماری) کی فلم کی کہانی اور اسکرپٹ لکھنے والے کی تعریف کی تھی جس نے سزا دینے کا نیا انداز پیش کیا تھا۔ فلم دشمن میں راجیش کھنہ شرابی کبابی اور عیاش ٹرک ڈرائیور ہے جس کی غلطی سے ایک کسان کی موت ہو جاتی ہے اور عدالت میں جج (رحمٰن) موت کا بدلہ موت دینے کے بجائے ڈرائیور کو سزا کم دیتے ہیں کہ وہ کسان کی فیملی کی کفالت کا بار اپنے ذمہ لے۔ چوپڑہ صاحب نے اس کہانی کے مرکزی خیال کو بیحد سراہا تھا۔

فلم ''اتفاق'' میں نوجوان راجیش کھنہ پر بیک وقت دو قتل کا الزام عائد ہو جاتا ہے اور وہ نیم پاگل ہو جاتا ہے اور سبھی اُسے قاتل تصور کرتے ہیں لیکن کہانی کا اسرار آخر میں یہ ثابت کر دیتا ہے کہ وہ بالکل بے قصور اور بے گناہ ہے اور اس طرح سے وہ پھانسی پانے سے بچ جاتا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی ریلیز وقت (راج کمار، سنیل دے، ششی کپور، سادھنا، شرمیلا، رحمٰن، مدن پوری اور بلراج ساہنی) اور ۱۹۶۹ء کی ریلیز ''آدمی اور انسان'' (دھرمیندر، سائرہ بانو، ممتاز، اجیت اور فیروز خان) بھی چوپڑہ صاحب کی انوکھی تخلیقات تھیں وقت کب پلٹ جائے یہ کوئی کہہ نہیں سکتا، امیر منٹوں میں غریب اور غریب منٹوں میں امیر بن جائے، اس فلم کی کہانی یہی ہے، آدمی اور انسان میں دکھایا گیا ہے کہ آدمی تو سبھی ہیں لیکن انسان کوئی کوئی ہوتا ہے۔ جھوٹ، نفرت، رشوت خوری، چوری، چغل اور بدکاری سے پاک انسان دھرمیندر کا مقابلہ اس فلم میں ایک شیطان صفت آدمی (فیروز خان) سے ہوتا ہے اور آخر میں جیت سچّائی کی ہوتی ہے۔

مندرجہ ذیل میں بی آر چوپڑا کی فلمسازی اور ہدایت کاری والی فلموں کی ایک فہرست ذیل میں دی جا رہی ہے۔

افسانہ (۱۹۵۱ء)، ایک ہی راستہ (۱۹۵۶ء)، نیا دور (۱۹۵۷ء)، سادھنا (۱۹۵۶ء)، دھول کا پھول (۱۹۵۹ء)، قانون (۱۹۶۰ء)، دھرم پتر (۱۹۶۱ء)، گمراہ (۱۹۶۳ء)، وقت (۱۹۶۵ء)، ہمراز (۱۹۶۷ء)، آدمی اور انسان (۱۹۶۹ء)، اتفاق (۱۹۶۹ء)، داستان (۱۹۷۲ء)، دھند (۱۹۷۳ء)، چھوٹی سی بات (۱۹۷۵ء)، ضمیر (۱۹۷۵ء)، کرم (۱۹۷۷ء)۔ ☆☆☆

راما نند ساگر

مظہر جمیل

تین سال قبل کی بات ہے جب دوردرشن نے شہروں کے ساتھ گاؤں میں بھی اپنے پر پھیلائے تو اسے بہت زیادہ پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔ فرانس میں ''چرس'' فلم کی شوٹنگ کے دوران فلمساز و ہدایت کار راما نند ساگر نے وہاں کے ٹی وی پروگرام دیکھے تو انہیں محسوس ہوا کہ عام ناظرین تک رسائی حاصل کرنے والے اس رابطہ کا بخوبی استعما کیا جا سکتا ہے۔ اپنے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے انہوں ۱۹۸۷ء میں ''دادا دادی کی کہانی'' اور ''وکرم بیتال'' نامی سیریل بنائے۔ یہ ایسی داستانیں تھیں جنہیں موسم سرما کی طویل راتوں میں دادی اور ماؤں سے سن کر بچے رضائیوں میں دبک جاتے لیکن اس میں دلچسپی پھر بھی برقرار رہتی ہے۔ ناظرین کے کثیر طبقہ نے جب اسے سر آنکھوں پر بٹھایا تو انہوں نے ''رامائن'' کو ٹی وی سیریل کے طور پر پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ یہ ان کی رام بھکتی کا اظہار تھا۔ رام چرت مانس کا عکسی روپ جب دوردرشن کے توسط سے گاؤں اور قصبوں کے گھروں، بازاروں اور گلی کوچوں تک پہنچا تو اس نے مقبولیت کے پرچم بلند کئے۔ اتوار کی صبح ۹ بجے جب یہ سیریل دکھایا جاتا تو اس وقت کوچہ و بازار ویران ہو جاتے اور ہر طرف سناٹے کی حکمرانی ہو جاتی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے کسی نے جادو سے سبھی کو مسحور کر دیا ہو۔

لاہور کے اصل گرو کے ایک امیر و کبیر خاندان میں ۲۹/دسمبر ۱۹۲۷ء کو تولد ہونے والے راما نند ساگر کا حقیقی نام چندر موکول تھا۔ بچپن میں ان کے والد کی ممانی نے انہیں گود لے لیا اور ایک نیا نام رام نند انہیں دیا۔ شری نگر کے پرتاپ کالج میگزین میں ان کی پہلی نظم ''پریتم پرتیکشا'' ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی تو انہیں محسوس ہوا کہ وہ اپنی تخلیقی استعداد کے بل بوتے پر خود کو منوا سکتے ہیں۔ اسی دوران جہیز کے لالچ میں ان کے والدین نے راما نند کی شادی کرنی چاہی جس کی مخالفت کے سبب انہیں گھر بدر ہونا پڑا۔ روزی روٹی اور اپنے ذاتی صرفہ کے لئے انہیں چوکیدار اور ٹرک کلیز کا کام کرنا پڑا۔ پھر بھی انہوں نے اپنی تخلیقی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ رامانند چوپڑا، راما نند بیدی اور راما نند کشمیری جیسے

ناموں کا سہارا لیتے ہوئے رامانند ساگر تک پہنچے۔ پنجاب یونیورسٹی سے گولڈ میڈل حاصل کر کے وہ دہلی کے اردو روزنامہ کے ادارتی شعبہ سے وابستہ ہوگئے۔ بعدازاں روزنامہ ''ملاپ'' میں انہوں نے شمولیت اختیار کی۔ جمنا داس اختر ان کے کام سے اتنا متاثر ہوئے کہ انہیں نیوز ایڈیٹر بنادیا۔ رامانند ساگر نے چند کہانیاں تقسیم ہندوپاک پر لکھیں۔ ان کا ناول ''اور انسان مرگیا'' ادبی حلقوں میں مباحثہ کا باعث بنا۔ دہلی سے ممبئی کا سفر اسی تخلیقی استعداد کو فروغ دینے کے لئے تھا۔

۱۹۴۸ء میں جب راجکپور کی اولین فلم باکس آفس پر ناکام ثابت رہی تھی۔ ایک پارٹی کے دوران راجکپور سے ساگر ملے جو اپنی اگلی فلم کے لئے کسی بہترین اسکرپٹ کی تلاش میں تھے۔ شری نگر کے پس منظر میں لکھی گئی کہانی ''برسات'' راجکپور کو بے حد پسند آئی جس پر انہوں نے نرگس کو لے کر ایک کامیاب فلم بنائی۔ اس سے رامانند ساگر کو اندازہ ہوا کہ خود بھی فلموں کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں انہوں نے ''ساگر آرٹس'' کی بنیاد ڈالی جس کے بینر تلے بننے والی پہلی فلم ''مہمان'' ناکامی سے دوچار ہوئی۔ اس کے سبب وہ قرض میں ڈوب گئے اور معاشی مسائل کے شکار ہوگئے۔ ان کی تخلیقی استعداد سے فلم انڈسٹری واقف ہوچکی تھی۔ چنئی کے جیمنی اسٹوڈیو کے مالک ایس ایس واسن نے انہیں اپنے پاس بلایا اور انہیں پیغام، گھونگھٹ اور ہمراہی جیسی فلموں کی اسکرپٹ لکھنے کا موقع دیا۔ جب ان کی معاشی حالت بہتر ہوگئی تو وہ ایک بار پھر ممبئی لوٹ آئے۔ پھر انہوں نے آرزو، آنکھیں، گیت ،للکار، جلتے بدن، چرس، پریم بندھن، سلمہ جیسی مشہور فلمیں بنائیں۔ پھر وہ ٹی وی کی طرف رخ کئے اور ''رامائن'' جیسا مقبول سیریل بنایا جس نے ہندوستانی ٹیلی ویژن کو ایک نئی راہ دی۔ اس کے بعد ان کی کمپنی نے کئی سیریل بنائے۔ اپنے آخری وقت میں وہ ''سائی بابا'' کی پروڈیوس کررہے تھے جو ان دنوں اسٹار پلس پر دکھایا جارہا ہے۔ بہرحال ۸۷ سال کی عمر میں ۱۲؍دسمبر ۲۰۰۵ء کو وہ اس دنیا کو چھوڑ گئے۔

☆☆☆

ہندی سنیما کا روشن چراغ تھے۔ رشی کیش مکھرجی

اعجاز الرحمٰن

آنند جیسی فلموں سے لوگوں کے دلوں کو چھونے والا فلم ساز، ایک زندہ دل انسان اور ایک عہد ساز ہدایت کار گزشتہ اتوار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندستانی سنیما سے رخصت ہوگیا۔ ۸۴ سال کی عمر میں لمبی بیماری کے بعد اتوار کو تقریباً ۴۰۔۴ بجے لیلاوتی اسپتال ممبئی میں رشی کیش مکھرجی اس کوچۂ فانی کو الوداع کہہ گئے اور خبر سنتے ہی بے ساختہ ذہن میں یہ نغمہ گونجنے لگا ''زندگی کیسی ہے پہیلی ہائے''۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی موت کے بعد پھر کوئی فلم ساز ''سب کچھ سیکھا ہم نے، نہ سیکھی ہوشیاری' جیسے انسانی جذبات کو روپہلے پردے پر انسانی کردار میں ڈھال پائے گا اور 'میں ہوں ڈان' کے اس دور میں 'چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہیں یادیں بڑی' یا 'مسافر ہوں یارو نہ گھر ہے نہ ٹھکانہ مجھے چلتے جانا ہے'' کا راگ الاپے گا۔ کہتے ہیں وقت بہت بڑا مسیحا ہوتا ہے اور بڑے سے بڑا نقصان بھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ مدھم ہوجاتا ہے مگر یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بےنوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

۳۰؍ستمبر ۱۹۲۲ء میں کولکاتا میں پیدا ہوئے رشی کیش مکھرجی نے ۱۹۵۱ء میں ممبئی کا سفر کیا اور فلموں میں اپنی قسمت آزمانے لگے۔ ۱۹۵۷ء میں انہوں نے ویمل رائے کے ساتھ دلیپ کمار کی اداکاری والی فلم 'مسافر' سے اپنے فلم کیریئر کی شروعات کی۔ یہ دور تھا جب ملک آزاد ہوچکا تھا اور اب جنگ آزادی کی تحریک سے الگ اپنے دامن کو نہارنے کی ضرورت تھی۔ اس تبدیلی کے دور میں رشی کیش مکھرجی نے جب خود کو ایک فلمساز کے طور پر قائم کیا تو ہندوستان کے عام آدمی کی زندگی اور اس کے پیچ وخم کو اپنی فلم کا موضوع بنایا۔ کبھی 'ابھیمان' اور 'آنند' جیسی فلموں سے ایک عام آدمی کی زندگی کے چیلنجز کی عکاسی کر کے اس پر فتح پانے اور رشتوں کی نزاکت کو سمجھنے کے نئے باب کا آغاز کی تو کبھی 'چپکے چپکے' جیسی فلم بنا کر روزمرہ کی پیچیدگیوں کو ہلکے

پھلکے انداز میں سلجھانے کی کوشش کی۔ رشی کیش مکھرجی کی مقبول فلموں میں ۱۹۵۹ء کی 'اناڑی' ۱۹۶۹ء 'ستیہ کام' ۱۹۶۰ء 'انورادھا' ۱۹۷۳ء میں 'ابھیمان'، 'نمک حرام' ۱۹۷۰ء، 'آنند' ۱۹۶۲ء 'اصلی نقلی' ۱۹۶۶ء آشیروارد' ۱۹۶۱ء میم دلی دلی ۱۹۷۲ء چپکے چپکے ۱۹۸۰ء میں 'خوبصورت' ۱۹۹۹ء 'جھوٹ بولے کوا کاٹے' کے علاوہ 'نیلی جھوٹی (گڈی ۱۹۷۰) 'گول مال' اور 'باورچی' جیسی فلمیں قابل ذکر ہیں۔

رشی کیش مکھرجی نے 'نمک حرام'، 'ابھیمان'، 'گڈی' اور 'باورچی' جیسی فلموں کی کہانی لکھی تو ۱۵ دوسری فلموں کی ایڈیٹنگ بھی کی۔ یعنی رشی دا فلمی دنیا کے ایک مکمل فنکار تھے۔ ان کی انہیں خوبیوں کی بدولت ۱۹۶۰ء میں 'انورادھا' فلم کے لیے انہیں پریسیڈینٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے بعد ۲۰۰۰ میں داداصاحب پھالکے ایوارڈ کے ساتھ ساتھ ۲۰۰۱ء میں پدم وی بھوشن سے سرفراز کیا گیا۔ تقریباً ۴۶ فلموں کے باتجربہ کار فلم ساز کو سینسر بورڈ کے صدر کا عہدہ بھی مل چکا ہے۔ متوسط طبقے سے جذباتی لگاؤ رکھنے والے رشی دا کو روپہلے پردے پر صاف ستھری تفریح پیش کرنے کے جذبہ کے ساتھ ساتھ فلم سے ان کا لگاؤ دیوانگی کی حد تک تھا اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کالج کی تعلیم پوری کرنے سے پہلے ہی کولکاتہ کی فلم انڈسٹری کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا اور آخرکار نیوتھیئٹر سے جڑ گیے۔ کمرشیل فلموں میں انہیں پہلی کامیابی ۱۹۵۹ء میں فلم 'اناڑی' سے ملی۔ جس کے اہم کردار میں راج کپور اور نوتن تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے پیچھے مڑکر نہیں دیکھا۔ ۱۹۶۰ء میں 'انورادھا' ریلیز ہوئی جسے پریسیڈینٹ ایوارڈ ملا اور اس کے بعد رشی دا نے ایک سے بڑھ کر ایک فلمیں بنائیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یہ فلمیں اپنے موضوعات کے نئے پن، مہذب مزاج اور عام آدمی سے جڑے ہونے کے فنکارانہ احساس کے لیے باکس آفس سے لیکر سنیما کے تجزیہ نگار تک کے دلوں کو جیتنے میں کامیاب رہیں۔ اس میں 'اصلی نقلی'، 'انوپما'، 'آشرواد'، 'ستیہ کام' جیسی فلموں کے نام شمار کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۷۰ء میں ریلیز ہوئی 'آنند' جس کا شمار ہندوستانی سنیما کی کلاسک فلموں میں کیا جاتا ہے۔ اس فلم میں راجیش کھنہ نے ایک ایسے زندہ دل نوجوان کا کردار نبھایا جسے معلوم ہے کہ کینسر آہستہ آہستہ اسے موت کے قریب لے جا رہا ہے۔ اس اداکاری کو راجیش کھنہ کی بہترین اداکاری تصور

کیا جاتا ہے۔ ۷۰ کی دہائی کے بعد رشی دا نے کئی ایسی فلمیں بنائیں جو متوسط طبقے کی زندگی کی تہوں کو بڑی خوبصورتی سے کھولتی تھیں اور ان میں شامل اقدار حیات، ان کی پیچیدگیوں اور کمزوریوں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرتی ہیں۔ ایسی فلموں میں (گڈی ۱۹۷۱ء)، 'باورچی ۱۹۷۲ء'، 'ابھیمان ۱۹۷۳ء'، 'نمک حرام ۱۹۷۳ء'، 'اور ملی ۱۹۷۵ء جیسی سدابہار فلمیں شامل ہیں۔ مگر ان سب میں سب سے زیادہ دھوم مچائی شاندار کامیڈی 'چپکے چپکے ۱۹۷۵' اور 'گول مال' ۱۹۷۹ نے کہتے ہیں کہ امیتابھ بچن اور دھرمیندر جیسے اداکاروں کے اندر چھپے جوہر کو بھی رشی دا نے ہی بخوبی پہچانا اور دھرمندر سے 'چپکے چپکے' اور امیتابھ سے 'ابھیمان' اور میلی' جیسی کامیاب فلمیں کروائیں جس سے ان دونوں اداکاروں کی ایک خاص پہچان بنی۔

☆☆☆

ہدایت کار۔ اسماعیل مرچنٹ

عطاءاللہ خان

مئی مہینہ فلمی دنیا کے لئے نہایت ہی منحوس ثابت ہوا۔ اس ماہ میں صرف ہندستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کی فلم انڈسٹری کا بہت بڑا نقصان ہوا۔ اس ماہ کی ۱۵؍تاریخ کو ہندی فلم انڈسٹری کے مشہور ومعروف اور ہردلعزیز اداکار وسیاست داں سنیل دات نے اپنے چاہنے والوں کو گہرا صدمہ دیا۔ اسی تاریخ کو بالی ووڈ کے نامور فلمساز وہدایت کار اسماعیل مرچنٹ کا انتقال ہوگیا۔

اسماعیل مرچنٹ ۲۵؍دسمبر ۱۹۳۶ء کو ممبئی میں پیدا ہوئے۔ اتفاق کی بات یہ کہ ان کی وفات بھی ۲۵ تاریخ کو ہی ہوئی لیکن وہ مہینہ دسمبر کا نہیں بلکہ مئی کا ہے۔ میمن خاندان میں پیدا ہونے والے اسماعیل مرچنٹ کا پیدائشی نام اسماعیل نور محمد عبدالرحمٰن تھا۔ نل بازار میں ان کے والد کی کپڑوں کی دکان تھی۔ انکی ابتدائی تعلیم ممبئی کے انجمن اسلام اسکول میں ہوئی اس کے بعد انہوں نے سینٹ زیویئرس کالج سے گریجویشن کیا اور نیویارک یونیورسٹی سے ایم بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے سب سے پہلی فلم ''دی کریشن آف وومن'' بنائی۔ اس فلم کے لئے ۱۹۶۱ء میں انہیں آسکر کے لئے نامزد کیا گیا۔ اس کے علاوہ اس فلم کو کانز میلے کے لئے بھی چنا گیا تھا۔ اس میلے کے دوران اسماعیل مرچنٹ کی ملاقات آئیوری سے ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر محض ۲۴ سال تھی۔ ان دونوں میں اس قدر گہری دوستی ہوگئی کہ دونوں نے مل کر کام کرنے کا فیصلہ کیا اور مرچنٹ آئیوری نامی ایک پروڈکشن ہاؤس شروع کیا۔ اس پروڈکشن ہاؤس کی پہلی فلم ''دی ہاؤس ورلڈر'' تھی۔ اس کے بعد اس گروپ نے تین ایسی فلمیں بنائیں جن کا تعلق ہندوستان سے تھا۔ ان میں شیکسپیئر والا (۱۹۶۵) دی گرو (۱۹۶۹) اور بامبے ٹاکیز (۱۹۷۰) شامل ہیں اس پروڈکشن ہاؤس نے تقریباً ۵۰ فلمیں بنائیں۔ انہوں نے چھ آسکر انعام جیتے اور چار انعام بہترین فلم کے لئے جیتے تھے۔ فلمیں پروڈیوس کرنے کے علاوہ اسماعیل مرچنٹ نے کئی فلموں اور ٹی وی فیچرس کی ہدایت کاری بھی کی ہے۔ ان میں ''مہاتما اور پاگل لڑکا'' نامی ایک چھوٹا سا فیچر

فلم ہے جبکہ دوسرا فیچر برطانیہ کے چینل ۴ کے لئے تھا جس کا نام کوریئسن آف بامبے'' (ممبئی کے درباری) تھا اس طرح مرچنٹ آئیوری پروڈکشن کے تحت ۳۰ سال تک فلمیں بنائی جاتی رہیں۔

اسماعیل مرچنٹ فلمساز کے علاوہ بہت اچھے باورچی بھی تھے۔ انہوں نے کھانوں کے تعلق سے کئی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ انکی لکھی ہوئی کتابوں میں اسماعیل مرچنٹ کے ہندستانی کھانے، اسماعیل مرچنٹ کا فلورینس، اسماعیل مرچنٹ کے پسندیدہ کھانے وغیرہ ہیں، ان کے علاوہ انہوں نے ۱۹۸۸ء کی فلم ''ڈی ڈیسور'' کی تیاری پر ایک کتاب لکھی تھی اور دوسری کتاب فلم ''ڈی پروپرائیٹر'' کی تیاری پر لکھی تھی۔ ان کی حالیہ کتاب کا نام ''مائی پیسیج فرام انڈیا'' اے فلم میکرز جرنی فرام بامبے تو ہالی ووڈ این بیانڈ'' (میرا ہندوستان سے گذر: ایک فلمساز کا ممبئی سے ہالی ووڈ اور اس سے بھی آگے تک کا سفر) ہے ان سب کے علاوہ اسماعیل مرچنٹ سماجی خدمات میں بھی پیش پیش رہے ہیں۔

☆☆☆

خواجہ احمد عباس ادیب صحافی اور فلم ساز

سہیل ارشد (مغربی بنگال)

خواجہ احمد عباس گزشتہ صدی میں ہندوستان کی عظیم کثیر الجہات شخصیتوں میں سے ایک تھے۔ وہ ایک جادو بیاں مقرر، روشن دماغ دانشور، اعلیٰ مفکر، عظیم افسانہ نگار و ڈرامہ نگار اور تاریخ ساز فلمساز تھے۔ سب سے ہم بات یہ کہ وہ ایک عظیم صحافی تھے۔ انہوں نے کل ۷۰ کتابیں تصنیف کیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے اردو ہندی اور انگریزی میں ہزاروں مضامین لکھے جو ہفتہ وار بلٹز، بامبے کرانیکل اور ملک کے دیگر اخبارات ورسائل کی زینت بنے۔ ان کی شخصیت کی اتنی پرتیں ہیں اوران کے کارنامے اتنے مختلف النوع کہ ان پر کئی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ وہ قلم کے سپاہی تھے اورانہوں نے اظہار کے تینوں ذرائع....صحافت، فلم، ادب....کا استعمال اپنے عہد کے ہندوستان کے افلاس زدہ، مظلوم، ناخواندہ، فرقوں میں بٹے ہوئے، تنگ ذہن اورسیاسی شعور سے عاری عوام کو امن، محبت، دیش بھکتی، بھائی چارہ اورانقلاب کا درس دینے کے لئے کیا۔

خواجہ احمد عباس کی پیدائش پانی پت میں جون ۱۹۱۴ء میں ہوئی۔ وہ اردو کے مشہور شاعر مولانا الطاف حسین حالی کے نواسے تھے اوران کا شجرۂ نسب مشہور صحابی حضرت ایوب انصاریؓ سے ملتا تھا۔ ان کی والدہ مسرور خاتون ایک نیک اور دیندار خاتون تھیں۔ خواجہ صاحب نے ابتدائی تعلیم حالی مسلم اسکول پانی پت میں حاصل کی جہاں انہوں نے اردو فارسی، عربی اورانگریزی پڑھی۔ اس کے بعد وہ علی گڑھ چلے آئے اور مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے اور ایل۔ایل۔بی کی ڈگری لی۔ ان کے خاندانی پس منظر، دینی ماحول جس میں انہوں نے پرورش پائی اور بعد میں جدید علوم سے ان کی آشنائی نے ان کے افکار، نظریات اور شخصیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ لہٰذا وہ تاعمر ایک سیکولر ذہن، جفاکش، بااصول اور پرہیزگار انسان بنے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلم انڈسٹری سے وابستہ ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی سگریٹ کو منہ تک نہیں لگایا اور نہ ہی زندگی کی فحش آسائشوں میں مبتلا ہوئے۔

آگے چل کر جب ان کا شعور بالیدہ ہوا تو انہوں نے وطن عزیز کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا پایا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک طرف غیر ملکی حکمراں ہمارے ملک کی دولت کولوٹ رہے ہیں اور دوسری طرف صدیوں پرانے جاگیردارانہ نظام نے غریبوں اور پسماندہ طبقے کا جینا دوبھر کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ انگریزوں کی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی نے ہندوستانیوں کو مذہب کی بنیاد پر تقسیم کر دیا تھا جو مسلم لیگ اور ہندو سبھا جیسی فرقہ پرست تنظیموں کے قیام کا سبب بنی۔

خواجہ احمد عباس کے ذہن اور دردمند دل پر ملک وقوم کی اس بدحالی کا گہرا اثر پڑا اورانہوں نے اسے دور کرنے کے لئے قلم کا سہارا لیا۔ اسطرح وہ عوام کے ادیب بن گئے۔ جن کا اپنا نصب العین اپنا مشن تھا۔ انہوں نے تخلیقی ادب کو شہزادوں اور پریوں کی کہانیاں اور روایتی عشقیہ افسانے لکھنے میں صرف نہیں کیا۔ ''ادب برائے ادب'' ان کے نزدیک ایک بے معنی نظریہ تھا۔ وہ اپنے ادب کے وسیلے سے اپنے ہم وطنوں کی ذہنی پرورش اور آزادی کی طرف رہنمائی کرنا چاہتے تھے۔ انہیں غلامی کی زنجیروں سے، فرقہ پرستی سے، جہالت سے اوران تمام برائیوں سے نجات دلانا چاہتے تھے جن میں سماج مبتلا تھا۔ انہی دنوں ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا اور وہ اس سے بہت متاثر ہوئے۔ جلد ہی وہ اس تحریک کے ایک سرگرم رکن بن گئے۔ حتیٰ کہ جب انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا تو خواجہ صاحب کو اس کا پہلا جنرل سکریٹری بنایا گیا دراصل انجمن ترقی پسند مصنفین کے تمام جلسے یا تو سجاد ظہیر کے مکان پر ہوتے یا عباس کے فلیٹ پر۔ انہوں نے اپنے صحافتی سفر کا آغاز عبداللہ بریلوی کے اخبار ''بامبے کرانیکل'' سے کیا جہاں انہیں قلمی تبصرہ نگار اور جرائم نگار دونوں کی حیثیت سے کام کرنا پڑا۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ صحافتی زندگی کے تقاضوں، ان کے قوت مشاہدہ اور وسیع مطالعے نے انہیں بسیارنویس ادیب بنا دیا۔ جس کی وجہ سے وہ فی البدیہہ کسی بھی موضوع پر مضمون لکھ سکتے تھے۔

۱۹۲۷ء میں ان کی پہلی کہانی ''ابابیل'' شائع ہوئی اور ادبی حلقوں میں کافی پسند کی گئی۔ بعد ازاں اس کہانی کو جرمنی سے شائع شدہ ایک نئی کہانیوں کے انتخاب میں شامل کیا گیا۔ اس کتاب میں عباس صاحب کے علاوہ ہندوستان سے ملک راج آنند اور ٹیگور کی کہانیاں بھی شامل

تھیں ۔ انہوں نے ۲۰۰ سے بھی زائد افسانے اور ۸عظیم ناولوں کی تخلیق کی ۔ اپنی زیادہ تر کہانیوں میں انہوں نے پلاٹ روزمرہ زندگی کے واقعات اور اخبار کی سرخیوں سے اخذ کئے ۔لہذا بنگال کی قحط، فرقہ وارانہ فسادات، آزادی کے بعد دیہی ترقیاتی منصوبے، غربت ومعاشی عدم مساوات، بے روزگاری وغیرہ ان کے افسانوں کے چند اہم موضوعات ہیں ۔''ایک لڑکی' نیلی ساڑی' پاؤں میں پھول' میں کون ہوں' پیرس کی ایک شام' گیہوں اور گلاب' نئی دھرتی نئے انسان وغیرہ ان کی مشہور کہانیاں ہیں ۔ان کے افسانوں کی طرح ناولوں میں بھی انہوں نے انسانی اقدار، سماجی انصاف ،قومی یکجہتی وغیرہ موضوعات کو کامیابی سے برتا ہے۔''چار دل چار راہیں' سات ہندوستانی' میرا نام جوکر' دو بوند پانی' اور انقلاب'' ان کے اہم ناول ہیں ۔ان میں موخرالذکر کامیاب ترین ناول ہے جس کا ترجمہ روسی ہندی اور انگریزی میں ہوا ۔''سات ہندستانی'' پرانہیں قومی یکجہتی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ۔انہوں نے اپٹا سے وابستگی کے دوران کامیاب ڈرامے لکھے ۔ بنگال قحط پر'' دھرتی کا لال'' کسانوں کے مسائل پر' دو بیگھہ زمین' اور گاندھی کے قتل پر گاندھی اور غنڈہ'' ایسے ڈرامے ہیں جنھوں نے ہندوستانی عوام کے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ۔

انہوں نے افسانوں اور ناولوں وڈراموں کے علاوہ سوانح حیات بھی لکھے ۔''لال گلاب کی واپسی اندا گاندھی کی سوانح حیات ہے جبکہ میں کوئی جزیرہ نہیں'' ان کی خودنوشت سوانح ہے ۔ساتھ ہی ان کے عہد کے سماجی ،سیاسی اور معاشی پہلوؤں کا آئینہ بھی ۔

بہرحال ان کی شخصیت کا ایک پہلو ان کی بے باکی بھی تھا ۔ وہ کسی بھی موضوع پر اپنی بے باکانہ رائے دینے سے نہیں ہچکچاتے ۔صحافتی تحریریں ہوں' افسانہ ہو' یا ڈرامے ہر جگہ انہوں نے سنجیدہ موضوعات اور سنگین مسئلوں پر انجام سے بے پرواہ ہوکر اپنے افکار ونظریات کا اظہار کیا جس کی وجہ سے وہ اکثر تنازعوں میں گھرے رہے ۔ ان کی کہانی ''سرکشی'' کی اشاعت پر مسلمان برآفروختہ ہوئے تو''بارہ گھنٹے'' کی اشاعت پر ہندوؤں نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ۔ ان کی ایک کہانی ''سردار جی'' پر سکھوں نے واویلا مچایا اور ان کے خلاف مقدمہ دائر کیا ۔خیر وہ مقدمہ

دوسماعتوں کے بعد خارج کردیا گیا ۔لیکن سب سے بڑا ہنگامہ ان کے اس بیان پر ہوا جو انہوں نے فسادات کے موضوع پر مبنی رامانند ساگر کے ناول ''اور انسان مرگیا'' کے دیباچے میں دیا ۔انہوں نے فسادات کی تمام تر ذمہ داری انگریزوں پر تھوپنے کی تنقید کی اور ان میں ملوث تمام فرقوں ہندو، مسلم لیگ، ہندو سبھا حتی کہ کمیونسٹ پارٹی کو بھی آڑے ہاتھوں لیا اور کہا کہ انہوں نے عوام کو صرف کھوکھلے نعرے دیئے اور ان کی ذہنی تربیت کے لئے کچھ نہیں کیا ۔ان میں سیاسی شعور پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہیں ہے اور نہ ہی اپنے کرداروں کو انسانی اقدار سکھائے ۔ان کے اس بیان سے ایک حشر برپا ہوگیا ۔کمیونسٹوں نے انہیں عوام کا دشمن اور سامراجیت کا ایجنٹ قرار دیا انہیں ''اپٹا'' اور دوسری تنظیموں سے نکال دیا گیا اور ان کے خلاف ایک مہم چھیڑ دی گئی ۔مگر خواجہ صاحب اپنے موقف پر اٹل رہے ۔

فلموں کے میدان میں بھی ان کے کارنامے کافی اہم ہیں ۔ بامبے کرانیکل میں فلموں پر تبصرہ لکھنے کے دوران وہ فلموں کے قریب آئے اور فلمسازی کے رموز سے واقف ہوئے ۔ ابتداء میں تو انہوں نے فلموں کی اسکرپٹ اور مکالمے لکھے مگر بعد میں باقاعدہ طور پر فلموں کی ہدایت دینے لگے ۔ ہدایت کار کے حساب سے ان کی پہلی فلم ''دھرتی کا لال'' تھی جو ان کی اپنی کہانی پر مبنی تھی ۔ آگے چل کر انہوں نے اپنے بینر ''نیا سنسار'' تلے درجنوں فلمیں بنائیں ۔''نیا سنسار'' جو ان کی ایک فلم کا بھی نام ہے ۔ ہندوستانی سنیما میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے ۔ کیونکہ اس فلم کے ساتھ ہی ہندوستان میں متوازی سنیما کا آغاز ہوا ۔ان کی فلم ''نکسلائٹ'' نے جو دہشت گردی کے موضوع پر تھی ، اٹلی میں انعام حاصل کیا جبکہ ان کی فلم شہر اور سپنا کو صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا ۔اس کے علاوہ راج کپور کی کئی سپرہٹ فلموں کے لئے کہانیاں اور منظر نامے لکھے جن میں ''آوارہ''، ''بابی''، ''شری ۴۲۰''، ''میرا نام جوکر''، ''رام تیری گنگا میلی'' اہم ہیں ۔ان فلموں نے آر کے فلمز کو کافی مالی استحکام بخشا مگر مزے کی بات یہ ہے کہ خود ان کی اپنی فلمیں باکس آفس پر ناکام رہیں جس کی ایک وجہ یہ رہی کہ انہوں نے مالی فائدے کے لئے اپنے اصولوں اور نظریات سے سمجھوتہ نہیں کیا ۔ وہ فلموں کو اپنے پیغامات اور افکار کو عوام تک پہنچانے کا ذریعہ سمجھتے تھے ۔

حالانکہ انہیں ایک ادیب وفلمساز کی حیثیت سے کافی مقبولیت ملی مگر وہ خود ایک صحافی

کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔۱۹۴۶ء میں جب ''بامبے کرانیکل'' بند ہوگیا تو ''بلٹز'' کے مدیر ڈاکٹر آر کے کرنجیا نے انہیں بلٹز کا آخری صفحہ لکھنے کی پیش کش کی اس طرح وہ بلٹز کا آخری صفحہ لکھنے لگے اور تاعمر لکھتے رہے۔اس طرح اپنی زندگی کے ۵۰ سال انہوں نے صحافت میں گذارے۔صحافت ہی ان کا اوڑھنا بچھونا رہی۔صحافت سے ان کے عشق کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے یہ وصیت کردی تھی کہ ان کے مرنے کے بعد اردو، ہندی اور انگریزی بلٹز کے آخری صفحات سے ہی ان کا کفن تیار کیا جائے اور اسی میں انہیں دفنایا جائے۔

قلم کے اس مجاہد کا انتقال یکم جون ۱۹۸۷ء کو ہوا۔آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کی انقلاب آفریں تحریریں ہمیشہ ان کی یاد دلاتی رہیں گی اور ہر بحران اور کشمکش کے دور میں ہماری رہنمائی کرتی رہیں گی۔

☆☆☆

ہدایت کار۔موسیقار۔نغمہ نگار۔۔۔تپن سنہا

خورشید اختر فرازی

ہدایتکار، موسیقار، نغمہ نگار اور فلمساز تپن سنہا جنہیں ۲۰ جون کو بنگال کے گورنر شری گوپال کرشن گاندھی کے ہاتھوں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ ملا تھا اس حقدار کے مستحق تھے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ جس طرح سے بستر مرگ پر ستیہ جیت رے کو آسکر ایوارڈ ملا تھا، اس ایوارڈ کے تپن سنہا بھی حقدار ہیں، بنگال کے فلمساز و ہدایتکاروں میں بلا شبہہ ستیہ جیت رے، رشی کیش مکھرجی، بمل رائے، تپن سنہا اور مرنال سین کے نام لئے جاسکتے ہیں جس میں اس وقت ایک اور نام گوتم گھوش کا شامل ہوگیا ہے۔بمل رائے اور رشی کیش کا تعلق بھی بنگال سے تھا یہ اور بات ہے کہ ان دونوں نے زندگی کا بیشتر حصّہ بمبئ میں گزارا اور ہندی فلمیں بھی بنائیں لیکن ان دونوں گریٹ کا تعلق بھی اسی سرزمین بنگالہ سے ہے اسے حقیقت کو کوئی بھی فراموش نہیں کرسکتا۔

۸۵/ویں سال میں قدم رکھنے والے تپن سنہا کی عظمت ان کی فلموں سے اجاگر ہوتی ہے اور خاص طور پر ۱۹۷۰ء میں جب انھوں نے انقلابانہ روش اختیار کرتے ہوئے ناقابل فراموش بنگلہ فلم ''سگینہ مہتو'' بنائی، یہ فلم دارجلنگ کے مزدوروں کی زندگی پر بنائی گئی تھی جس میں مزدور یونین کی شنگھٹنوں کو جوڑ توڑ کے ذریعہ مالکان کو بھڑکانے اور انہیں بلیک میل کرنے کے لئے ایک انتہا پسند لیڈر انیل بسواس نے ایک دیہاتی سگینہ (دلیپ کمار) کا سہارا لیا جس کا مزدوروں کے درمیان کافی رعب تھا، مزدور یونین کی سنگٹھن کو توڑنے کی سازش اس فلم میں نمایاں کرکے پیش کی گئی، اس فلم میں انھوں نے پہلی مرتبہ دلیپ کمار اور سائرہ بانو کو لیا، دلیپ کمار کی زبان سے نصف بنگلہ اور نصف ہندی کا امتزاج لوگوں کو بیحد پسند آیا، اس فلم نے بنگال میں باکس آفس کا ریکارڈ توڑ دیا، کلکتہ کے لائٹ ہاؤس میں اس فلم نے سلور جبلی منائی، علاوہ ازیں دیگر جگہوں پر یہ فلم پلاٹینم جبلی ہوئی اور کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دلیپ کمار اپنی پہلی بنگلہ فلم میں اس قدر کامیاب ہوجائیں گے کہ بنگال کے مہانائیک اتم کمار کی بھی بولتی بند ہوجائے گی، اس زمانے میں بنگال کے اسٹار کلاکاروں میں اتم کمار،

رنجیت ملک، سمترا چٹرجی وغیرہ تھے اوران کی کوئی بھی فلم سلور جبلی سے آگے نہیں بڑھی تھی، حتیٰ کہ ہر نامور، انتھونی فرنگی، نائیک وغیرہ بھی، لیکن سگینہ مہتو نے زبردست ریکارڈ بنایا، اس فلم میں سروپ داس نے بھی کام کیا تھا۔ اور بنگلہ فلم کی حددرجہ مقبولیت سے متاثر ہوکر تپن سنہا نے اُسے ہندی میں ڈب کیا جس میں دلیپ کمار، سائرہ بانو، اوم پرکاش، سروپ دت سمیتا سانیال انیل بسواس نے کام کیا اور ہندی میں بنی یہ فلم بھی لوگوں کو دلیپ کمار کی اداکاری کی وجہ سے بیحد پسند آئی اور خاص طور پر اس فلم میں یہ گیت ''سالا میں تو ساب بن گیا'' لوگوں کو بیحد پسند آیا اوران لوگوں کی زبان پر یہ گیت گونجنے لگا۔ لیکن یہ فلم بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوئی اور مشکل سے ۱۰۰ دن ہی چل سکی۔

تپن سنہا اپنی فلموں میں مختلف سماجی مسائل کو پیش کرتے تھے اور بطور ہدایتکار وہ چاہتے تھے کہ فلم بین ان کی فلموں کو ہر طرح سے پسند کریں۔ زندہ دل تپن سنہا نے کئی دہائیوں تک لوگوں کو محظوظ کیا، اگرچہ شروع میں انھوں نے ایک ساؤنڈ ریکارڈ ڈسٹ کی حیثیت سے اپنے کیریر کا آغاز کیا تھا۔ بعد میں انھوں نے ہدایتکاری کا شعبہ سنبھالا۔

۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے تپن سنہا نے کلکتہ یونیورسٹی کے الحاق سے بی ایس سی آنرز پاس کیا اور ۱۹۴۶ء میں کلکتہ نیو تھیٹر میں ساؤنڈ انجینئر کے طور پر کام شروع کیا، اپنے عہد نو جوانی میں وہ امریکی اور ہالی ووڈ کی فلموں سے بیحد متاثر تھے اور چارلس ڈیکنس کے ناول ''اے ٹیل آف ٹو سٹیز'' نے انہیں بیحد متاثر کیا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں وہ لندن گئے اور وہاں انھوں نے فلم بنانے کی تکنیک سیکھی۔

رابندر ناتھ ٹیگور کی نظمیں ان کے حوصلوں کو بڑھانے میں معاون ثابت ہوئیں اور خاص طور پر ان کی تحریریں ''کابلی والا، ہنگری اسٹون (کھدیتو پاسکان) اتیتھی نے متاثر کیا۔ ہندستان واپس آکر ان کی توجہ فلم بنانے میں صرف ہوئیں۔ انھوں نے ٹیگور کی کہانیوں پر تین فلمیں تیار کیں جن میں کابلی والا، ہنگری اسٹون اور اتیتھی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

تپن سنہا کی ہدایت میں بنی پہلی فلم ''انکش''، تھی جو نرائن گنگو پادھیائے کے ناول ''سینک'' پر مبنی تھی۔ ''ہائے بازارے'' بن پھول کی سدا عنبریں تھی جس میں ایک بے لوث خدمت کرنے والے ڈاکٹر، ان کے مریضوں اور ایک دور دراز کے پسماندہ گاؤں کو دکھایا گیا تھا جہاں ایک ڈاکٹر کی بیحد

ضرورت تھی۔ شنکر کی کہانی پر انھوں نے ایک اچھی فلم ''اک جا چھیلو دیش'' بنائی جو ایک پاگل سائنسداں کی زندگی پر تھی جو ایک ایسی دوا ایجاد کر رہا تھا جس میں اس کے ماضی کی داغدار اور بے ایمان زندگی خود بخود سامنے آسکتی تھی۔ اس کے بعد لوہو کوپٹ'' جس میں انھوں نے ''بسوز دپسر راجہ'' کو پیش کیا جو بچوں کے لئے ایک تھیٹر خیز اور جاسوسی فلم تھی۔ ان کی فلم ''ہنسولی بینکرا پاکھتا'' بھی بیحد اچھی فلم تھی۔

۱۹۵۷ء میں ان کی فلم'' کابلی والا'' کو برلن فلم فیسٹویل میں جگہ ملی جس میں مرکزی کردار بلراج ساہنی نے ادا کیا تھا۔ اس فلم میں انھوں نے موسیقی بھی دی تھی اور انہیں بحیثیت موسیقار ایک مشہور گیت ''اے میرے وطن تجھ پہ دل قربان ہو'' کو ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ وہ ایک عظیم فلمساز اور ہدایتکار ہونے کے بعد بھی بچوں کا سا دل رکھتے ہیں اور اپنے جذبات کی ترجمانی انھوں نے ''ٹیپو ہولیوستّی'' میں کی اس کے بعد ان کی فلم ہارمونیم اور سفید ہاتھی نے بھی بیحد کامیابی حاصل کی۔

اگرچہ ان کی فلم ''زندگی زندگی'' (سنجیو کمار، مالا سنہا) ناکام رہی لیکن اتیتھی جو راجندر ناتھ ٹیگور کی زندگی پر مشتمل تھی اور ٹوسیل (ایک کامیڈی فلم) یا جھیندر بندی (زینڈا کا ایک دیسی قیدی) بیحد کامیاب فلمیں ثابت ہوئیں۔ تپن سنہا نے ٹیگور کی زندگی پر ایک اور فلم ''کھونیکرا تیتھی'' بنائی تھی، اس کے علاوہ آروہی جس میں ایک ضعیف شخص کی زندگی کو دکھایا تھا۔ سگینہ مہتو میں انھوں نے ظلم کے خلاف آواز بلند کی تھی، اس فلم میں ایک معمولی انسان کس طرح سے مزدوروں کا لیڈر بنتا ہے دکھایا گیا ہے۔ کانکنوں کی بے بس زندگی پر مبنی فلم'' کالا ماٹی''، تھی جس میں پہلی مرتبہ کانکنوں کی بے بسی دکھائی گئی تھی، ان کی فلم'' راجہ'' میں ایک بیروزگار نوجوان کی کہانی پیش کی گئی تھی اس نے اپنی زندگی میں برائیاں، ناانصافی اور صرف غربت دیکھی تھی۔ ان کی فلم'' آپن جن'' ایک بیحد خوبصورت فلم تھی اس میں بھی ایک نوجوان بیروزگار کی کہانی پیش کی گئی تھی۔ جو اپنی زندگی سے تنگ آکر نکسلی تحریک میں شامل ہو جاتا ہے۔ تپن سنہا نے پہلی مرتبہ اپنی فلم ''نرجن سائیکا تے'' میں ایک نوجوان کی دوسری شادی کی حمایت کی تھی۔ ان کی فلم'' بن چار مربگان'' چارلی چپلن کی زندگی پر مشتمل تھی۔ اس فلم میں انھوں نے ایک بڑی دنیا میں ایک چھوٹے انسان کی بے بسی دکھائی تھی۔ کھدیتو پاسان نامی فلم

میں انھوں نے ایک مرتبہ پھر سے گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور کی زندگی کا ایک حصّہ پیش کیا تھا۔ جا تو گر ہیو میں انھوں نے ایک میاں بیوی کے آپسی تعلقات کو فلمایا تھا۔ اور ایک ایسے دور میں انھوں نے یہ فلم بنائی تھی جب اس دور میں یہ ساری باتیں متروک تھیں اور اسے پیش کر کے انھوں نے بڑی ہمت سے کام لیا تھا۔ تپن سنہا کی فلم ''آتنک'' میں جرائم پیشہ لوگوں کی زندگی کو دکھایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ آدمی اور عورت اور ایک ڈاکٹر کی موت نامی فلموں میں انھوں نے اپنی حسّاس زندگی کے جذبات پیش کئے تھے۔ اس سال انہیں بہترین ہدایتکار کا ایوارڈ بھی ملا تھا۔ تپن سنہا کی فلم ''وہیل چیئر'' میں انھوں نے ایک ڈاکٹر کی زندگی پیش کی تھی۔ اس کے علاوہ ''عدالتے ایک ٹی مئے'' ''انتاردھن'' میں انھوں نے خواتین پر ہونے والے مظالم پیش کئے تھے۔

تپن سنہا نے بچوں کے لئے ''آج کا رابن ہڈ'' بھی بنائی جس کے لئے حکومت سے تعاون بھی ملا۔ اور فلم کے پروڈیوسر جالان نے اس فلم کی تاشقند، برلن، صوفیہ اور دیگر غیر ملکی شہروں کے فلم فیسٹویل میں اُسے پیش کیا۔ ۱۹۸۷ء میں انھوں نے چند دستاویزی فلمیں بھی بنائیں۔ انھوں نے ٹی وی کے لئے ایک فلم ''ڈائر آف دی سنچری، ''صدیوں کی بیٹی'' بنائی جو ٹیگور کی کہانی پر مشتمل تھی۔ انھوں نے جاسوسی سیریل ٹی وی کے لئے ''ہوٹو میر نقشہ'' عجائب گھر عجب کتھا'' بھی بنائی جو بیحد دلچسپ فلمیں تھیں۔ ابھی اسی چند سال کے دوران انھوں نے بچوں کے لئے ایک فلم ''انوکھا موتی'' بھی بنائی تھی۔

☆☆☆

ابتدائی فلمی دور کے ذہین فلمساز: ضیاء سرحدی

رشید انجم

ضیاء سرحدی: اردو اور ہندی سینما کا یہ ذہین فلمساز و ہدایت کار ۱۹۱۴ء میں پیشاور میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۳۳ء میں محض ۱۵ سال کی عمر میں وہ فلموں میں آ گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نامی کلکتہ میں قائم تھی۔ یہ ہندوستان میں بنگال کا پہلا ساؤنڈ اسٹوڈیو تھا۔ ضیاء اس فلم کمپنی میں کام کرنے لگے۔ ایک سال بعد وہ بمبئی آ گئے اور یہاں ساگر فلم کمپنی میں ملازم ہو گئے۔ یہیں ان کی ملاقات محبوب خان سے ہوئی اور یہ پہلی ملاقات پیش خیمہ بنی جب ۱۹۵۶ء میں ضیاء سرحدی نے محبوب خان کی فلم ''آواز'' کی ہدایات دیں۔ ۱۹۳۴ء میں محبوب خان اپنی فلم ''منموہن'' کی تیاری کر رہے تھے۔ ضیاء سرحدی کو اس فلم میں بطور اداکار محبوب خان نے پہلا چانس دیا۔ ۱۹۳۶ء میں یہ فلم ریلیز ہو کر کامیاب رہی۔ ۱۹۳۷ء میں ساگر فلم کمپنی بمبئی کی اگلی فلم ''جاگیردار'' بھی محبوب خان نے ہی ڈائریکٹ کی تھی اور ضیاء سرحدی نے پھر اس میں ایک کردار نبھایا تھا۔ ساگر فلم کمپنی اور محبوب خان نے ان کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے ۱۹۳۸ء میں فلم ''ابھیلاشا'' کی ہدایت کا موقع دیا۔ اس فلم میں ضیاء سرحدی کے ساتھ دوسرے ہدایت کار مہیند رٹھاکر تھے۔ اس فلم کا دوسرا نام ''پوسٹ مین'' بھی رکھا گیا تھا۔ اس وقت ضیاء سرحدی کی عمر بیس سال تھی۔ فلم کامیاب رہی تو ضیاء سرحدی کے جوہر کھلے۔ پہلی فلم ''منموہن'' جس میں ضیاء نے اداکاری کی تھی، اس فلم کی خوبی یہ تھی کہ اس فلم کا اسکرپٹ بھی ضیاء نے لکھا تھا اور اس فلم کے پورے دس گانے بھی ضیاء کے ہی تحریر کردہ تھے۔ اسی طرح محبوب خان کی دوسری فلم ''جاگیردار'' میں اداکاری کے ساتھ اس فلم کے چھ گانے ضیاء سرحدی نے ہی لکھے تھے۔ اتنی کم عمری میں فلم کی اتنی سوجھ بوجھ سب کو حیرت زدہ کر گئی تھی۔ محبوب خان تو ان کے گرویدہ ہو چکے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں سروج موویٹون نے ضیاء سرحدی کو ایک فلم بنانے کے لیے مدعو کر لیا۔ فلم کے دو نام تجویز ہوئے تھے۔ ''مدھر ملن'' اور ''افسانہ'' اس فلم کا مکمل اسکرپٹ اور سبھی پانچ گانے ضیاء سرحدی نے ہی لکھے تھے۔ ہدایت کار بھی ضیاء سرحدی ہی تھے۔ ۱۹۳۹ء میں ''بھولے بھالے'' کو انھوں نے ڈائریکٹ کیا اور ۱۹۴۱ء میں جب محبوب خان نے نیشنل اسٹوڈیو بمبئی کے لیے

فلم بنانے کا منصوبہ بنایا تو اس کے لیے انھوں نے ضیاء سرحدی کی قابلیت سے فائدہ اٹھایا۔ فلم تھی ''بہن'' اور اس فلم کو محبوب خان نے ہی ڈائریکٹ کیا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ رنجیت مووی ٹون کے بھی اہم اسکرپٹ رائٹر رہے۔ ضیاء سرحدی یوں تو ترقی پسند تحریک سے براہِ راست وابستہ نہیں رہے لیکن ان کی فلموں پر اس تحریک کا اثر ضرور غالب رہا اور اس دور کے تبصرہ نگاروں نے ان کی فلموں کو اسی تحریک کے روشن اور ارتقائی خیالات کے باب سے تشبیہہ دی تھی۔ انڈین پیوپلس تھیٹر ایسوسی ایشن چونکہ اس عہد میں اپنے پورے زوروں پر تھا اس لیے ضیاء سرحدی کا اس کی قربت قبول کرنا لامحالہ امر بنا۔ یوں بھی وہ نوعمر تھے اور اپنی فلموں کو عام ڈگر سے ہٹ کر بنانے کے قائل تھے۔ کہا تو یہ بھی گیا ہے کہ ضیا در پردہ مارکسسٹ تھے۔ اپٹا کے ڈراموں اور فلموں کے طریقۂ فلمسازی و ڈرامے کی پیش کش کا اثر ان کی ''ہم لوگ''، ''فٹ پاتھ'' اور ''آواز'' فلموں میں صاف طور پر نہ صرف محسوس کیا گیا بلکہ دیکھا بھی گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری جنگِ عظیم اپنی تمام ہولناکیوں کے بعد آخری سانس لے رہی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک ہوا اور ضیاء سرحدی پاکستان ہجرت کر گئے۔ لیکن ہندوستانی فلم صنعت سے ان کا رشتہ بدستور قائم رہا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد بھی انھوں نے فلم ''انوکھا پیار'' (۱۹۴۸) ''دل کی دنیا'' (۱۹۴۹) اور ''کھیل'' (۱۹۵۰) فلمیں لکھی تھیں۔ ان فلموں میں ان کے نغمے بھی تھے۔ ۱۹۵۲ء کی مشہور فلم ''بیجو باؤرا'' میں ضیاء سرحدی کے ہی مکالمے تھے۔ ۷۰ کی دہائی میں انھیں تحسین پیش کیا گیا اور ان کی کچھ اہم و خاص فلمیں بمبئی میں شو منعقد کر کے دکھائی گئی تھیں۔

ضیاء سرحدی کی فلمیں (بطور اداکار): ۱۹۳۶ ''منموہن'' ۱۹۳۷ ''جاگیر دار'' ''کل کی بات'' ۱۹۳۹ ''جیون ساتھی'' ۱۹۴۰ ''سجنی'' ۱۹۴۲ ''غریب'' ''آواز'' ۱۹۴۵ ''بڑی ماں'' ۱۹۴۷ ''اعلان'' ۱۹۴۸ ''انوکھا پیار'' ۱۹۴۹ ''دل کی دنیا'' ۱۹۵۰ ''کھیل'' ۱۹۵۱ ''ہملوگ'' ۱۹۵۳ ''فٹ پاتھ۔

بطور گیت کار: ۱۹۳۷ ''جاگیردار'' ۱۹۳۸ ''ہم تم اور وہ'' ۱۹۴۳ ''نادان'' ۱۹۴۵ ''یتیم'' ۱۹۴۷ ''اعلان'' ۱۹۴۸ ''انوکھا پیار'' ۱۹۴۹ ''دل کی دنیا'' ۱۹۵۰ ''کھیل''۔

بطور ہدایتکار: ۱۹۳۸ ''ابھیلاشا'' ''افسانہ'' ۱۹۳۹ ''بھولے بھالے'' ۱۹۴۲ ''سوپن'' ''آواز'' ۱۹۴۳ ''نادان'' ۱۹۴۵ ''یتیم'' ۱۹۵۱ ''ہم لوگ'' ۱۹۵۳ ''فٹ پاتھ''۔

بطور مصنف: ۱۹۳۶ء ''منموہن''۔ ۱۹۳۷ء ''جاگیر دار''۔ ''کل کی بات'' ۱۹۳۹ ''جیون ساتھی''۔ ۱۹۴۰ء ''سجنی'' ۱۹۴۲ء ''غریب''۔ ''آواز'' ۱۹۴۵ء ''بڑی ماں''۔ ۱۹۴۷ء ''اعلان''۔ ۱۹۴۸ء ''انوکھا پیار''۔ ۱۹۴۹ ''دل کی دنیا''۔ ۱۹۵۰ء ''کھیل'' ۱۹۵۲ء ''بیجو باؤرا۔

☆☆☆

فلم ساز۔ پرکاش مہرہ

یامین انصاری

کہتے ہیں کہ ایک مرد کی کامیابی میں کہیں نہ کہیں کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم کہیں کہ کسی فلم اداکار کی اداکاری اور فنکاری نکھارنے میں کہیں نہ کہیں فلم ساز یا ہدایت کار کا ہاتھ ہوتا ہے، تو بیجا نہ ہوگا۔ امیتابھ بچن ہندوستانی فلموں میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امیتابھ بچن نے فلموں کے ذریعہ جو کامیابیاں اور بلندیاں حاصل کیں ہیں، ان میں پردے کے پیچھے سے ایک شخص کا اہم رول رہا ہے۔ ہم بات کر رہے ہیں فلم ساز پرکاش مہرہ کی۔ جب بھی امیتابھ بچن کی کامیابی اور ان کی بے مثال اداکاری کا ذکر آئے گا، تب تب پرکاش مہرہ کا نام ضرور سامنے آئے گا۔ جی ہاں، پرکاش مہرہ، جواب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ انہوں نے نہ صرف امیتابھ بچن کے اداکارانہ جوہر کو پہچانا، بلکہ انہیں ہندوستانی فلموں میں اعلی مقام تک پہنچنے کا راستہ بھی دکھایا۔ اس کے علاوہ پرکارش مہرہ نے ہندی فلموں کو ایک نئی سمت بھی دی۔ اگرچہ ان کا شوق اور ان کی خواہش فلموں میں نغمہ گو کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرنے کی تھی، لیکن اپنی بے مثال صلاحیتوں سے انہوں نے ہدایت کاری میں نئی نئی بلندیاں حاصل کیں اور وہ فلمی دنیا کے لئے ایک مثال بن گئے۔

پرکاش مہرہ کی پیدائش مغربی اتر پردیش کے بجنور میں ۱۳/ جولائی ۱۹۳۹ء کو ہوئی، لیکن ان کا بچپن بریلی میں بھی گزرا۔ بجنور سے انہوں نے ہائی اسکول کیا، اس کے بعد وہ دہلی آ گئے، لیکن ان کا شوق اور ان کے تابناک مستقبل کا راستہ تو ممبئی کی طرف جاتا تھا۔ لہٰذا وہ کمسنی میں ہی ممبئی کی جانب کھنچے چلے آئے۔ ۱۹۵۰ء کے آخر میں پہلے کچھ فلمسازوں کے ساتھ معاون کے طور پر کیریر کی شروعات کی۔ اس کے بعد خود فلمسازی کے میدان میں اتر گئے۔ پھر کبھی انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور اپنے کیریر اور ہندی فلموں کو بلندیوں تک لے گئے۔ ابتدا میں اگرچہ انہیں اپنے کیریر کو آگے بڑھانے کے لئے جدوجہد کرنی پڑی، لیکن کیریر کی شروعات کے ۱۸ سال بعد وہ اچانک ہندی فلموں میں ایسے سورج کی طرح طلوع ہوئے کہ جس کی روشنی ہندوستانی سنیما میں چہار سو

پھیلی۔ششی کپور کے ڈبل رول والی فلم’’حسینہ مان جائے گی‘‘ میں جب پرکاش مہرہ نے اپنے ہنر کا جادو بکھیرا، تو فلمی دنیا میں ہر کوئی ان کا لوہا ماننے لگا۔اس فلم نے انہیں ایک نئی شناخت دی اورانہوں نے بتا دیا کہ ان کا حوصلہ اوران کے ارادے بہت بلند ہیں۔انہوں نے دکھا دیا کہ وہ ہندی فلموں کو نئی سمت دینے اور بلندیوں تک لے جانے کا مادہ رکھتے ہیں۔

امیتابھ بچن کو لے کر بنائی فلم’’زنجیر‘‘اس فلم سے پرکاش مہرہ اورامیتابھ بچن کی قسمت کا ستارہ چمکا۔حیران کردینے والی بات یہ ہے کہ پرکاش مہرہ نے صرف ایک روپے میں امیتابھ کوفلم’’زنجیر‘‘ کے لیے سائن کیا تھا۔اسی فلم کے بعد امیتابھ بچن کو’’اینگری ینگ مین‘‘ کا خطاب ملا۔فلم’’زنجیر‘‘ سے شروع ہوا، امیتابھ کا یہ سفر’’صدی کے عظیم اداکار‘‘ کے خطاب تک پہنچا۔فلم’’زنجیر‘‘ میں امیتابھ کی اینٹری کیسے ہوئی، اس سے متعلق ایک قصہ آج بھی بالی ووڈ میں مشہور ہے۔دراصل پرکاش مہرہ نے اپنی اسی فلم کے لیے پہلے دیوآنند سے رابطہ کیا، وہاں بات نہیں بنی۔اس کے بعد راجکمار سے بھی بات نہیں بن پائی۔راجکمار فلم میں امیتابھ اور پران دونوں کے رول کرنا چاہتے تھے۔جو ممکن نہیں تھا۔ پرکاش نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ وہ اس فلم میں دھرمیندر کو لینے کے بارے میں سوچ رہے تھے لیکن پران نے ان سے امیتابھ کا ذکر کیا۔امیتابھ اس وقت’’بامبے ٹو گووا‘‘ فلم میں مصروف تھے۔بہرحال سلیم جاوید سے بات چیت ہوئی اور امیتابھ بچن کو سائن کرلیا گیا۔اس کے بعد فلم تیار ہوئی اوراس کی کامیابی نے ہندی فلموں میں ایک نئی عبارت لکھی۔اس کے بعد پرکاش اورامیتابھ کی جوڑی نے ایک کے بعد ایک ٦ سپرہٹ فلمیں دیں۔زنجیر، شرابی، ہیرا پھیری، لاوارث، نمک حلال اور مقدر کا سکندر جیسی سپر ہٹ فلمیں بنا کر واقعی امیتابھ کو مقدر کا سکندر بنا دیا۔

پرکاش مہرہ ہندی سینما کے پہلے ڈائریکٹر تھے، جنہوں نے بالی ووڈ میں اپنا مقام بنایا۔انہوں نے ہالی ووڈ کے مشہور ڈائریکٹر فینک یانڈ ولینو کے ساتھ مل کر’’دی گاڈ کنکشن‘‘ فلم بنائی۔ان کی بے پناہ صلاحیتوں کے اعتراف میں انہیں ٢٠٠٦ میں انڈیا پکچر ڈائریکٹرس ایسوسی ایشن کی جانب سے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ پیش کیا گیا۔اس کے علاوہ ٢٠٠٨ء میں انڈیا موشن پکچر پروڈیوسرس ایسوسی ایشن نے بھی انہیں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا۔پرکاش مہرہ نے جن اہم

اور کامیاب فلموں میں ہدایت کاری کی، ان میں’’میلہ‘‘(١٩٧١)’’سمادھی‘‘(١٩٧٢)’’آن بان‘‘(١٩٧٢)’’ایک کنواری ایک کنوار‘‘(١٩٧٣)’’ہاتھ کی صفائی‘‘(١٩٧٤)’’ہیرا پھیری‘‘ (١٩٧٦)’’خلیفہ‘‘(١٩٧٦) ’’آخری ڈاکو‘‘(١٩٧٨)’’دلیش دروہی‘‘(١٩٨٠)’’جوالہ مکھی‘‘ (١٩٨٠)’’نمک حلال‘‘(١٩٨٢)’’آؤ پیار کریں‘‘(١٩٨٣)’’شرابی‘‘(١٩٨٤)اور’’جادوگر‘‘(١٩٨٩)شامل ہیں۔

جن فلموں کے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر دونوں رہے ہیں۔ان میں’’زنجیر‘‘(١٩٧٣)’’مقدر کا سکندر‘‘(١٩٨٧)’’لاوارث‘‘ (١٩٨٩)’’مقدر کا فیصلہ‘‘(١٩٨٧) ’’ایماندار‘‘(١٩٨٧)’’محبت کے دشمن‘‘(١٩٨٩)’’زندگی ایک جوا‘‘(١٩٩٢) اور’’بال برہم چاری‘‘ شامل ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے’’دلال‘‘(١٩٩٣)اور’’گھنگھرو‘‘(١٩٨٣)جیسی فلموں کوصرف پروڈیوس کیا۔

☆☆☆

فلم ساز و ہدایت کار۔ گلشن کمار

غلام رسول

گلشن کمار ایک ایسے شخص کا نام ہے جس نے بہت ہی کم عرصے میں فلمی دنیا میں اپنی شخصیت کی پہچان کرالی۔ ۱۹۷۸ء سے لیکر ۱۹۹۶ء تک یعنی ۱۸ سالہ فلمی کیریر میں انہوں نے جو عزت، شہرت اور دولت حاصل کی ہے بہت ہی کم لوگوں کو یہ نصیب ہوئے ہیں۔ گلشن کمار کا خاندان پاکستان کے جھنگ کا رہنے والا ہے۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے دوران انکے والد دہلی چلے آئے۔ اس وقت ان کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح انہوں نے پھل کا کاروبار شروع کیا۔ پہلے پہل گلشن کمار کے والد دہلی کے دریا گنج میں فٹ پاتھ پر پھل بیچا کرتے تھے اور اس طرح ان کی زندگی اطمینان سے گزر رہی تھی۔ اسی دوران ۱۹۵۶ء میں دہلی میں ہی گلشن کمار کی ولادت ہوئی۔ جب کچھ بڑے ہوئے تو علاقے ہی کے ایک اسکول میں تعلیمی سلسلہ شروع کیا۔ پھر دہلی دیش بندھو کالج سے گریجویشن کیا۔ گریجویشن مکمل کرنے کے بعد وہ اپنے والد کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے لگے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک الگ جوس کی دکان کھول لی اور دیکھتے دیکھتے پھل کا ایک بڑا تاجر بن گئے اور اس کاروبار سے انہوں نے کروڑوں کی آمدنی حاصل کی۔

پھل کے کاروبار سے الگ ہٹ کر گلشن کمار نے ایک نئی تجارت کی طرف قدم بڑھایا اور میوزک انڈسٹری قائم کی۔ ۱۹۷۸ء میں انہوں نے میوزک کی شکل وصورت میں نکھار لایا اور اس کو ایک نئی جہت عطا کی۔ اس طرح انہوں نے نوئیڈا میں کیسٹ کی ایک فیکٹری قائم کی جہاں آڈیو کیسٹ کو اس وقت دس اور پندرہ روپے میں فروخت کیا جب عام طور پر ایک کیسٹ ۲۵ روپے یا اس سے زیادہ میں فروخت ہوتے تھے۔ ٹی سیریز کے کیسٹ پر ''جے ماتا دی'' لکھا ہوا ہوتا تھا۔ آڈیو کیسٹ کی دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد انہوں نے بلیک اینڈ وہائٹ اور رنگین ٹیلی ویژن تیار کرنے شروع کردیئے۔ اس کے علاوہ میگنیٹک ٹیپس، کمپکیسٹ ڈیک، آڈیو سسٹم اور سی ڈی پلییئر بھی تیار کئے اور انہیں بازار میں کم قیمت پر فروخت کیا۔ میوزک انڈسٹری میں گلشن کمار نے جو دھوم مچایا کہ کیا کہنے، وہ ایک ذہین تاجر کے علاوہ قابل اور باصلاحیت انسان کی پرکھ بھی جانتے تھے۔ انہوں نے ایک مہاجر

جوہری کی طرح پتھر کو تراش کر نگینہ بنادیا۔ فلمی دنیا میں نئے نئے گلوکاروں کو متعارف کرایا۔ سب سے پہلے انہوں نے گیت سنگیت میں انقلاب لایا۔ پرانے، مدھر اور درد بھرے گیتوں کو نئے گلوکاروں کی آواز میں ڈبنگ کرائی اور ٹی۔ سیریز کے نام سے کیسٹ جاری کئے۔ اس طرح ان کا یہ تجربہ حد درجہ کامیاب رہا۔ انہوں نے انورادھا پوڈوال کی آواز میں لتا منگیشکر اور آشا بھونسلے کے گیت کی ریکارڈنگ کرواکے بازار میں ٹی۔ سیریز کے نام سے نئے کیسٹ جاری کئے۔ اس کے بعد انورادھا پوڈوال کی آواز میں بھجن اور بھگتی گیت پر مشتمل سیکڑوں البم جاری کئے۔ انہوں نے سونو نگم اور کویتا سے بھی گیت گوائے۔ کمار شانو کی آواز میں کشور کمار کے گیت کے البم تیار کئے۔

گلشن کمار آڈیو کیسٹ وغیرہ کے علاوہ ایک اچھے فلمساز اور ہدایت کار بھی ثابت ہوئے۔ انہوں نے سب سے پہلی فلم ''لال ڈوپٹہ ململ کا'' کی فلمسازی کی۔ اس فلم کے گیت اس قدر مقبول ہوئے کہ ہر نکڑ، گلی اور دکانوں میں بجا کرتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے فلم ''عاشقی'' بنائی جو کافی مقبول ہوئی۔ اس میں ایسے رسیلے گیت پیش کئے کہ وہ فلم میگا ہٹ ثابت ہوئے۔ اس کے علاوہ دل ہے کہ مانتا نہیں، آجا میری جان اور قسم تیری قسم نامی فلمیں پروڈیوس کیں۔ گلشن کمار بطور ہدایت کار فلم ''بیوفا صنم'' بنائی جس میں اپنے چھوٹے بھائی کشن کمار کو ہیرو کے طور پر پیش کیا۔ اس میں زیادہ تر پاکستان کے مشہور قوال عطاء اللہ خان کی گائی ہوئی غزلوں کو پیش کیا، جس کی ایک غزل ''اچھا صلہ دیا تو نے میرے پیار کا...'' کافی مشہور ہوئی، بہر حال ماتا وشنو دیوی کے بھگت اور ہندوستانی میوزک انڈسٹری کے بے تاج بادشاہ گلشن کمار، جنہوں نے ایسی ایسی نئی چیزیں پیش کیں کہ انکے دوسرے ہم عصر اور ہم پیشہ لوگوں کی چمک ماند پڑگئی۔ میوزک کی ایک نئی پہچان دینے والی کی موت مافیا گروہ کے ہاتھوں ۱۲/ اگست ۱۹۹۷ء کو صبح دس بجے ہوئی جب وہ شمال مغربی ممبئی کے بھارت نگر کے ایک مندر سے پوجا کرکے باہر نکل رہے تھے۔ اس طرح ۳۵۰ کروڑ روپے کے مالک کی موت کا سبب ''پیسہ'' کی دشمنی بنا اور دنیا سے خالی ہاتھ لوٹ جانا پڑا جیسا کہ یہاں آئے تھے۔

☆☆☆

فلم ساز ہدایت کار۔شکتی سامنت

خورشید اختر فرازی

فلمساز وہدایتکار شکتی سامنت جن کا انتقال ۱۹ اپریل ۲۰۰۹ء کو ہوا وہ ہندی اور بنگلہ فلموں کے ایسے خالق تھے جنہیں ۱۹۷۰ء کی دہائی میں آسمان کی اونچائی جیسی شہرت حاصل ہوئی اوران کی فلمیں یکے بعد دیگرے سلور، گولڈن اور پلاٹینم جبلی ہوئیں جس کی وجہ سے وہ شہرت، عزت، دولت کے بام عروج پر پہنچے ان کی پیدائش مغربی بنگال کے ضلع بردوان میں ہوئی تھی لیکن ابتدائی تعلیم انھوں نے دہرہ دون میں حاصل کی۔ جہاں دوران تعلیم وہ اپنے انکل کے یہاں رہتے تھے۔۱۹۴۴ء میں انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے گریجویشن مکمل کی۔گریجویشن مکمل کرنے کے بعد انھوں نے ممبئی جا کر فلم اداکار بننے کی کوشش کی اوراس کوشش میں وہ بمبئی کے ہوکر رہ گئے لیکن کام نہ ملنے کے بعد انھوں نے بمبئی سے ۲۰۰ کیلومیٹر دور داپولی کے ایک اسکول میں ٹیچر کی نوکری کر لی، لیکن ۱۹۴۸ء میں وہ باقاعدہ فلمی دنیا سے منسلک ہوگئے اور گیان مکھرجی، ستیش نگم اور فنی مجمدار کے ساتھ بمبئی ٹاکیز میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے طور پر کام کرنے لگے۔

شکتی سامنت نے اپنی ہدایت میں پہلی فلم ۱۹۵۴ء میں بنائی جس کا نام ''بہو'' رکھا اس فلم میں کرن دیوان، اوشا کرن، ششی کلا اور پران تھے، اوراپنی چند دیگر فلموں کی کامیابی کے بعد ۱۹۵۶ء میں انسپکٹر، ۱۹۵۶ء میں شیرو (شیخ مختار، اشوک کمار) ڈیٹکٹیو (پردیپ کمار، شکیلہ) اور ۱۹۵۷ء میں ہل اسٹیشن بنائی۔ ۱۹۵۷ء میں انھوں نے اپنی فلم پروڈکشن ''شکتی فلمز'' کی داغ بیل ڈالی اوراس بینر کے پرچم تلے پہلی مرڈر مسٹری فلم ''ہوڑہ برج'' بنائی جس میں اشوک کمار، مدھو بالا کے این سنگھ تھے۔ یہ فلم او پی نیّر کی موسیقی، محمد رفیع، آشا بھونسلے کی آواز اور مدھو بالا کی خوبصورتی کی وجہ سے سپرہٹ ثابت ہوئی۔اس فلم کا مشہور گیت ''آیئے مہرباں''۔ بیحد مشہور ہوا جس میں آشا بھونسلے نے بالکل گیتا دت کے انداز میں گیت گایا تھا۔ اور جب یہ گیت مدھو بالا پر فلمایا گیا تو لوگ اس گیت کے دیوانے ہوگئے تھے اوراس فلم کی زبردست کامیابی شکتی سامنت کی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہوئی تھی۔

کل ملا کر شکتی سامنت نے ۴۳ فیچر فلمیں بنائیں جن میں ۳۷ ہندی اور ۶ بنگلہ فلمیں شامل ہیں شکتی

سامنت کی بہترین فلموں میں ہوڑہ برج کے علاوہ چائنا ٹاؤن (شمی کپور، شکیلہ) کشمیر کی کلی'' (شمی کپور، شرمیلا ٹیگور' این ایوننگ ان پیرس (شمی کپور، آشا پاریکھ) آرادھنا (راجیش کھنّہ، شرمیلا ٹیگور) کٹی پتنگ (راجیش کھنّہ، شرمیلا ٹیگور) آمنے سامنے (ششی کپور، شرمیلا ٹیگور) امانش (اتم کمار، شرمیلا ٹیگور) آنند آشرم (اتم کمار، شرمیلا ٹیگور) امر پریم (راجیش کھنّہ، شرمیلا ٹیگور) سپرہٹ فلمیں ثابت ہوئیں لیکن امیتابھ اور زینت امان کے ساتھ بنی فلم ''دی گریٹ گیمبلر'' سپرفلاپ ہوگئی تھی۔

شکتی سامنت نے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء کی دہائی میں زیادہ تر شمی کپور کے ساتھ کام کیا اور ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں راجیش کھنّہ کے ساتھ چند فلمیں ایسی بھی بنائیں جن میں معاون پروڈیوسر ان کی اہلیہ اوران کے بھائی بھی رہے۔شکتی نے چند فلمیں اپنے بیٹے اشیم سامنت کے لئے ڈائریکٹ کیں۔شکتی سامنت کی تین کلاسیک فلمیں ''ہوڑہ برج''، ''آرادھنا'' اور ''برسات کی ایک رات'' (امیتابھ، راکھی) کو پرتیش نندی کمونیکشن نے کارٹون فلموں کے طور پر بھی پیش کیا۔شکتی سامنت کا انتقال ان کے سانتا کروز کی رہائش گاہ میں شام کے ۵ بجے ۱۹ اپریل ۲۰۰۹ء کو ہوئی، وہ گزشتہ چند ہفتوں سے علیل تھے، دو ماہ قبل انہیں دل کا دورہ بھی پڑا تھا۔

شکتی سامنت کو آرادھنا، انوراگ (ونود مہرہ، موسمی چٹرجی) اور مانش پر بہترین ہدایتکار کے طور پر فلم فیئر ایوارڈ بھی ملا تھا۔انہیں کئی لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈز بھی ملے جیسے زی سائن ایوارڈ برائے لائف ٹائم اچیومنٹ ۲۰۰۲ء میں اس کے علاوہ کئی دیگر ایوارڈز مع زی ایوارڈز بھی ملے۔وہ پانچ برسوں تک انڈین موشن پکچرز ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہے۔سنٹرل بورڈ آف فلم سرٹیفکیشن کے صدر ے سال تک رہے اس کے علاوہ ستیہ جیت رے فلمز اور ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ کے صدر بھی رہے۔

فلم این ایوننگ ان پیرس اور آمنے سامنے میں انھوں نے شرمیلا ٹیگور کو جو بکنی لباس پہنایا تھا اس کی وجہ سے انہیں شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ان دونوں فلموں میں شرمیلا نے ایسی عریانیت دکھائی تھی کہ ان فلموں کے نام سنکر ہی سیف علی خان کو طیش آجاتا ہے۔ویسے شرمیلا اور راجیش کو لیکر امر پریم نام کی ایک ایسی یادگار اور ناقابل فراموش فلم بنائی جسے لوگ کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے۔اس فلم میں راجیش کھنہ اور شرمیلا ٹیگور کو فلم فیئر ایوارڈ ملنا چاہئے تھا مگر افسوس ایسی بہترین، ناقابل فراموش فلم کو ایک بھی ایوارڈ نہیں

ملا جبکہ سپر ڈائریکشن کی وجہ سے سہی شکتی سامنت کو بہترین اداکار کا ایوارڈ ملنا چاہئے تھا۔ مگر انھوں نے کبھی بھی کوئی شکایت نہیں کی اور نہ ہی طنز کیئے۔ فلم اجنبی میں راجیش، زینت اور یوگیتا بالی کولیکر گلشن نندہ کے سپر ہٹ ناول پر مبنی بہترین فلم بنائی تھی اس کے علاوہ راجیش کھنہ اور ہیما مالنی کولیکر گولڈن جبلی فلم ''محبوبہ'' بنائی تھی مگر اس فلم کو بھی کوئی ایوارڈ نہیں دیا گیا۔ فلم چائنا ٹاؤن میں شمی کپور اور شکیلہ کو لیکر ایک سپر ہٹ سسپنس فلم بنائی تھی دیوانند اور مدھو بالا کے ساتھ جعلی نوٹ، شمی کپور اور پدمنی کے ساتھ سنگاپور، راجیش کھنہ اور ببیتا کو لیکر راز، کشور کمار اور مدھو بالا کو لیکر ناؤٹی بوائے، منوج کمار اور شرمیلا کو لیکر ساون کی گھٹا، راجیش اور آشا پاریکھ کے ساتھ کٹی پتنگ، شمی کپور اور آشا پاریکھ کے ساتھ پگلا کہیں کا، شمی کپور، لینا چندرورکر کے ساتھ جانے انجانے، سنجیو کمار اور شرمیلا کو لیکر چتر ہین جیسی بہترین فلمیں بنائیں۔

مندرجہ ذیل میں شکتی سامنے کی فلمیں ایک نظر میں :-

بہو (۱۹۵۵)، انسپکٹر (۱۹۵۶)، ہل اسٹیشن (۱۹۵۷)، شیرو (۱۹۵۷)، ہوڑہ برج (۱۹۵۸)، ڈیٹیکٹیو (۱۹۵۸)، انسان جاگ اٹھا (۱۹۵۹) جعلی نوٹ (۱۹۶۰)، سنگاپور (۱۹۶۰)، ناؤٹی بوائے (۱۹۶۲)، چائنا ٹاؤن (۱۹۶۲)، راز (۱۹۶۳)، کشمیر کی کلی (۱۹۶۴)، ساون کی گھٹا (۱۹۶۴)، این ایوننگ ان پیرس (۱۹۶۷)، آرادھنا (۱۹۶۹)، کٹی پتنگ (۱۹۷۰)، پگلا کہیں کا (۱۹۷۰)، جانے انجانے (۱۹۷۱)، امر پریم (۱۹۷۱)، انوراگ (۱۹۷۲)، چتر ہین (۱۹۷۴) اجنبی (۱۹۷۴) امانش (۱۹۷۵) محبوبہ (۱۹۷۶)، انورودھ (۱۹۷۷)، آنند آشرم (۱۹۷۷)، دی گریٹ گیمبلر (۱۹۷۹)، خواب (۱۹۸۰)، برسات کی ایک رات (۱۹۸۱) اور الگ الگ (۱۹۸۵) راجیش کھنّہ، ٹینا منیم۔

☆☆☆

یش چوپڑا۔ رومانی فلموں کے بادشاہ ہدایت کار

عطاء اللہ خان

یش چوپڑا واحد ہدایت کار ہیں جنہوں نے بمل رائے، گرودت اور راج کپور کے ساتھ ڈائریکشن کے میدان میں قدم رکھا۔ ان بڑے بڑے ڈائریکٹروں کی موجودگی میں انہوں نے بھی باکمال فنکاری کا مظاہرہ کیا جو کسی طرح بھی ان کے ہم عصر سے کم تر نہیں ہیں۔ ان کی پہلی فلم ''دھول کا پھول'' ۱۹۵۹ء میں آئی تھی جو فرقہ پرستی کے خلاف تھی۔ اپنے چالیس پینتالیش برس کے فلمی سفر میں یش جی نے رومان کے الگ الگ رنگ اور رویوں کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اس دور میں جب جسم سے لے کر جوتے تک سیکسی ہوتے ہیں انہوں نے حسین رنگوں اور پھولوں کے درمیان کبھی پت جھڑ کے گرتے پتوں کے بیچ رومان کو اپنے مخصوص جمالیاتی زاویئے سے فلم بند کیا ہے۔ ان کی فلموں کی موسیقی اور گیت بھی انسان کو رومان کی حسین وادیوں میں پہنچا دیتے ہیں۔ ان کی فلموں کے نغموں میں ایک عجیب سی رومانی کیفیت ہوتی ہے جس میں جذبوں کی میٹھی میٹھی کسک بڑی شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔ محبت کی پر اسرار، ان دیکھی اور ان بوجھی گہرائیوں میں اُترنا انہیں خوب آتا ہے۔

بالی ووڈ میں رومان کے اس بادشاہ کے کارناموں کو ایک برطانوی ادیبہ نے ایک کتاب کی صورت میں ڈھال دیا ہے۔ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز (لندن) کی پروفیسر ڈاکٹر ریچل ڈوائر نے اپنی کتاب ''یش چوپڑہ۔ ففٹی ایرس آف انڈین سنیما'' میں ان کی زندگی، فلم اور فن کو تخلیق و تجربے کا موضوع بنایا ہے۔ ریچل کو بی اے میں سنسکرت کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہندستانی تہذیب سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اسی کے ساتھ انہیں گجراتی صوفی شاعری سے بھی لگاؤ ہوگیا۔ یش چوپڑا سے انکی ملاقات فلم ''دل تو پاگل ہے'' کے سیٹ پر ہوئی تھی۔ انہیں اعتراف ہے کہ یش چوپڑا ستیہ جیت رے نہیں ہیں لیکن وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ مجھے ان کا انداز پسند ہے۔ عام روش کی مقبول فلموں میں بھی وہ جدت طرازی سے کام لیتے ہیں۔ ریچل کے مطابق یش چوپڑا ایک حیرت انگیز موضوع ہیں۔ یہ کتاب لکھنا ان کے لئے آسودگی اور اطمینان بھرا تجربہ رہا۔ اپنے بارے میں کتاب لکھنے والی مصنفہ کے بارے میں یش جی بتاتے ہیں کہ وہ بے حد موڈی خاتون ہیں۔ انہوں نے نہ جانے کن ذرائع سے اتنی ڈھیر ساری

معلومات جمع کرلیں اورانہیں محفوظ بھی رکھا۔انہوں نے مزید یہ بتایا کہ ان سے ملاقات کا وقت طے کیا مگرانہوں نے کتاب سے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا۔حالانکہ وہ اتنی دورلندن سے ممبئی صرف اس لئے آئی تھیں۔رتچل ، پنجابی ،اُردو اور ہندی میں گفتگو کرلیتی ہیں جس سے اُنہیں اس کام میں کافی مدد ملی۔یش چوپڑہ کے متعلق تفصیلی معلومات انکے ہم عصر فلمسازوں، ہدایت کاروں، تکنیکی ماہرین اور انکے ساتھ کام کرنے والے اداکاروں سے ملاقات کرکے حاصل کی۔ان کی تمام فلموں کا ایک ایک کرکے، ان کے تھیم اور تکنیک کے لحاظ سے ان کا تجزیہ کیا ہے۔اس کے علاوہ ان کی خوبیوں اور خامیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔اتنا ہی نہیں کتاب میں تصاویر اور پوسٹرس بھی شامل کرلئے گئے ہیں۔

مشہور ادیبہ رتچل ڈوائر لکھتی ہیں کہ اس فلم ساز، ہدایت کار نے اپنی مسلسل کوششوں سے مقبول سنیما کو عام دھارے کی روایت سے الگ رکھا۔وہ ایک صاحب طرز، موثر اور زندگی کے عمومی رشتوں کی منظر کشی کرتے ہیں اسی لئے ان کی پہلی فلم ''دھول کا پھول'' فرقہ پرستی کے خلاف اور رشتوں کے احترام پر مبنی تھی۔جبکہ دیوار، ترشول اور سلسلہ وغیرہ جذباتی اور حساس موضوعات کی فلمیں ہیں۔عام رومانی فلموں کی طرح یش چوپڑہ کی فلموں میں ویلن نہیں ہوتے بلکہ حالات اور تقدیر ہی ان کے ویلن ہیں۔رتچل کہتی ہیں کہ وہ ہندستانی تہذیب کے سفیر ہیں۔یش چوپڑہ کا جنم ۱۹۳۲ء میں لاہور میں ہوا تھا۔ممبئی آنے کے بعد کچھ عرصے تک وہ آئی ایس جوہر کے معاون بھی رہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کتاب کا پیش لفظ لتا منگیشکر نے لکھا ہے۔پس منظر میں لتا جی نے لکھا ہے کہ ''یش جی کے لئے نغمے گانا میرے لئے زیادہ آسان ہے مگر ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا بہت مشکل کام ہے۔میں مائک پر ہوتی ہوں تو تصویریں انہیں گیت پر اداکاری کرتے، ہیروئن کو کیمرے کے لینس سے جھانکتے حتیٰ کہ رقص کرتے دیکھ سکتی ہوں۔اس سے مجھے گیت کا مزہ آتا ہے۔

☆☆☆

یش جوہر یادوں کے جھروکے سے

غلام رسول

فلم انڈسٹری میں چند ایسے فلمساز ہیں جو اپنی یادگار فلموں کی وجہ سے فلمی پریمیوں کے دل پر راج کرتے ہیں۔جب بھی فلمی پریمیوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں فلمساز کی فلم ریلیز ہونے والی ہے، پہلے سے ہی وہ بیتابی سے اس کا انتظار کرتے ہیں اور سینما ہالوں میں آتے ہیں ایک بھیڑ امنڈ پڑتی ہے۔کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ سب فلمساز جو بھی فلم بناتے ہیں انکی کہانیاں ٹھوس، اسکرپٹ جاندار اور تمام باتیں معیاری اور دلکش ہوتی ہیں۔انہیں میں سے ایک نام یش جوہر کا ہے جنگی فلمیں زیادہ تر فلمی پریمیوں کے لئے تفریحی اور معیاری وسبق آموز ہوتے ہیں۔بڑے ستارے، خوبصورت سیٹ اور دلکش لوکیشن بنانے والے یش جوہر ہندی فلموں کے ناظرین کی نبض جانتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایک کے بعد ایک ہٹ فلمیں بالی ووڈ کو دیں۔

مشہور فلمساز یش جوہر نے کچھ ماہ قبل ہی ایک تقریب میں کہا تھا کہ ہم ہندستانی بہت ہی جذباتی اور اخلاق مند ہوتے ہیں۔ہماری رسم ورواج، تہذیب وثقافت اور رہن سہن بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔اس لئے میں جذبات کو ذہن میں رکھ کر اور مرکز بنا کر ہی فلمیں بناتا ہوں۔پیار، تیاگ اور گھریلو رشتے کی کہانیاں ناظرین کو خوب بھاتی ہیں۔۱۹۵۰ء میں ایک اسٹیل فوٹوگرافر کے روپ میں کیریر شروع کرنے والے یش جوہر بعد میں فلمساز دیو آنند کے بینر نوکیتن فلم کمپنی میں پروڈکشن کنٹرولر بنے اور ''گائیڈ'' اور ''جیول تھیف'' جیسی فلموں کے پروڈیوس سے جڑ گئے۔۱۹۷۶ء میں انہوں نے اپنی پروڈکشن کمپنی ''دھرما پروڈکشن'' بنائی اور اس بینر تلے سب سے پہلی فلم ''دوستانہ'' بنائی۔اس فلم کے ڈائریکٹر راج کھوسلہ تھے جبکہ امیتابھ بچن، شتروگھن سنہا اور زینت امان اس کے اہم ستاروں میں سے تھے۔بعد میں انہوں نے دنیا، مقدر کا فیصلہ، گمراہ، ڈپلیکیٹ اور اگنی پتھ جیسی فلمیں بنائیں۔یش جوہر کی پروڈکشن میں ''کچھ کچھ ہوتا ہے'' اور ''کبھی خوشی کبھی غم'' کی ہدایت ان کے بیٹے کرن جوہر نے کی۔جوہر کو ہمدرد دوست پسند اور جینٹل مین پروڈیوسر کے طور پر مانا جاتا تھا۔

بڑے ستارے، خوبصورت اسٹیج اور دلکش لوکیشن فلموں کی جان ہوا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ گذشتہ سال انہیں کی پروڈکشن میں اور انکے بیٹے کرن جوہر کی ہدایت میں کامیاب اور سپر ہٹ فلم ''کل ہو نہ ہو'' بنی تھی اور اس فلم نے کئی ایوارڈ حاصل کئے۔

ہندی فلمی دنیا میں اہم خدمات کے اعتراف میں لیش جوہر کو اسی سال ''ائفا'' اور ''جی سینے ایوارڈ'' کے تحت لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ دیا گیا تھا۔ امیتابھ بچن نے مئی میں سنگاپور میں منعقد ائفا ایوارڈ پروگرام میں لیش جوہر کے بارے میں کہا تھا کہ ''وہ ایک بڑے فلم پروڈیوسر تو ہیں ہی، ساتھ میں وہ ایک عظیم انسان بھی ہیں۔'' لیش جوہر ۱۹۲۹ء میں پیدا ہوئے اور اپنے کیریر میں انہوں نے کئی نشیب وفراز دیکھے۔ فلمی دنیا میں انہوں نے اپنے ۵۰ سالہ فلمی سفر کے دوران کئی کامیاب فلمیں تو دیں ساتھ ہی وہ بہت ہی ملنسار، ہمدرد اور اخلاق مند انسان تھے۔ وہ کسی بھی گروپ ازم سے پرے تھے۔ ہر ایک کے ساتھ ان کے تعلقات بہت ہی خوشگوار اور دوستانہ تھے۔ بقول سنیل دت ''ان کا بیٹا جب ۱۹۹۳ء کے بم بلاسٹ میں پھنسا تو وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے میرا بھر پور ساتھ دیا تھا۔'' بہر حال لیش جوہر ۷۵ سال کی عمر میں ۲۶ ؍جون کی رات تقریباً ۱۰ بجے اس دنیا سے چل بسے لیکن اپنی یادگار فلموں کی بدولت وہ ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔

☆☆☆

ایک انوکھے ہدایت کار۔منی رتنم

منی رتنم ایسے انوکھے فلم ہدایت کار ہیں۔ جو ہندوستانی قدیم روایتی کہانیوں کے کرداروں کو جدید طریقے سے پیش کر کے بامعنی فلمیں بناتے ہیں۔ 'روجا'، 'بامبے'، 'دل سے'، 'یووا' اور 'گرو' جیسی فلموں کے خالق منی رتنم انوکھے اس وجہ سے بھی ہیں کیونکہ انھوں نے فلم ہدایت کاری کا نہ تو کوئی باقاعدہ کورس کیا اور نہ ہی کہیں سے ٹریننگ لی۔ ان کی فلموں کی کامیابی کا دارومدار جہاں ان کے انوکھے کردار ہوتے ہیں، وہیں ان کی فلموں سے اٹھنے والے تنازعات بھی کامیابی کا باعث بنتے ہیں۔

ہندوستانی سنیما میں منی رتنم جیسے فلم ہدایت کار انوکھے ہیں۔ تمل اور ہندی میں فلمیں بنا کر منی رتنم نے جو بین الاقوامی مقبولیت حاصل کی ہے۔ وہ چونکا دینے والی بات ہے۔ اس لیے کہ منی رتنم نے فلم ہدایت کاری کا کہیں سے کوئی کورس یا ٹریننگ نہیں لی ہے۔ فلمی دنیا میں کوئی ان کا رشتہ دار بھی نہیں ہے۔ جاپان کے فلم ساز اکیرا کوروساوا کی فلموں سے متاثر ہو کر اور خاص کر ان کی فلم ایڈیٹنگ کے فن سے متاثر ہو کر منی رتنم نے تقریباً ویسا ہی راستہ اپنایا ہے۔

منی رتنم نے ہندوستانی قدیم کہانیوں کے کرداروں کو جدید طریقے سے پیش کر کے نئے معانی دینے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ جیسے فلم 'روجا' میں ستیہ وان ساوتری کی کہانی کو آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں دہشت گردی موت کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔ اسی طرح آج کے سماج میں جو حادثات ہوتے ہیں، اسے بھی منی رتنم نے اپنی فلموں کی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ مثلاً 'گرو' فلم میں گاؤں کے ایک معمولی شخص کی کہانی ہے کہ وہ کیسے اپنی کوششوں اور چال بازیوں سے بڑا صنعت کار بن جاتا ہے۔ ان کی فلم 'نائگن' میں اپنے وقت کے ڈان رہے وردراجن مدالیر کی زندگی کے نشیب وفراز کے ساتھ ساتھ زوال کی داستان بھی بیان کی گئی ہے۔

منی رتنم کی کئی فلمیں موضوع بحث رہی ہیں، اس وجہ سے ان کی خوب شہرت ہوئی ہے۔ ان کی نئی ریلیز فلم 'راون' ہے، جو تمل کے ساتھ ہندی میں بھی ریلیز ہوئی ہے۔ اس میں رامائن کے کردار راون کو جدید نظریے سے پیش کیا گیا ہے۔ فلم 'گرو' کی جوڑی ابھیشک بچن اور ایشوریہ رائے کو انہوں نے فلم 'راون' میں دہرایا ہے۔ راون کے ریلیز ہونے کے موقع پر منی رتنم کی ان فلموں کا ذکر کرنا مناسب ہوگا جو ہندی میں بھی ریلیز ہوئی ہیں۔

انجلی: ہندی میں بڑے فلم سازوں کے ذریعے بچوں پر فلم بنانے سے پہلے منی رتنم ۱۹۹۰ء میں یہ فلم لے کر سامنے آئے تھے۔ ڈاؤن سنڈروم سے متاثر ایک ننھی، معصوم اور خوبصورت انجلی کی یہ کہانی فلم بینوں کو دل کی

گہرائیوں تک متاثر کرتی ہے۔فلم میں یہ خاص طور پر دکھایا گیا ہے کہ کسی بیماری سے متاثر بچے کو سماج اور آس پاس کے لوگ کس طرح اپنانے سے کتراتے ہیں۔اس فلم میں بے بی شاملی سے منی رتنم نے بہترین اداکاری کرائی ہے۔

روجا: شمالی ہندوستان کے فلم بینوں کو ذہن میں رکھ کر 'روجا' کی اسکرپٹ تیار کی گئی اور اسے ہندی میں ڈب کر کے پیش کیا گیا۔کشمیر سے کنیا کماری تک کے لوکیشن اور اسکرپٹ کا تانا بانا فلم میں بنا گیا۔اس فلم کے ذریعہ ستیہ وان ساوتری کی قدیم کہانی کو دہشت گردی کی سرزمین پر خوبصورتی کے ساتھ پیش کرنے میں منی رتنم کامیاب رہے ہیں۔رحمان کی موسیقی اور منی رتنم کی پیشکش کی وجہ سے لوگ بے حد متاثر ہوئے۔

بامبے : روجا کی کامیابی کے بعد منی رتنم کی خود اعتمادی کافی بڑھ گئی اور انہوں نے فلم 'بامبے' بنائی۔یہ فلم ریلیز ہوتے ہی تنازعات سے گھر گئی تھی۔بامبے کے ۱۹۹۳ء کے فسادات پر مبنی اس فلم میں ایک ہندو لڑکے سے مسلمان لڑکی کی محبت اور شادی سے متعلق کہانی پر سخت گیر عناصر نے اس فلم پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا تھا، اتنا ہی نہیں کچھ دہشت گردوں نے منی رتنم کے گھر پر بم بھی پھینکے تھے۔اس فلم میں فسادات کی بہترین منظر کشی کی گئی ہے۔منیشا کوئیرالا کی بہترین اداکاری رحمان کی سریلی موسیقی کا بھی اس فلم کی کامیابی میں بڑا حصہ ہے۔

دل سے: ایک بار پھر دہشت گردی منی رتنم کی فلم کا حصہ بنی۔ایک لڑکی جو انسانی بم بن کر اپنی زندگی کو ختم کرنے والی ہے، محبت کے چکر میں پڑ کر زندگی سے پیار کرنے لگتی ہے۔پریتی زنٹا نے اس فلم سے اپنے کریئر کی شروعات کی تھی۔شاہ رخ خان اور منیشا کوئیرالا جیسے اسٹار ہونے کے باوجود یہ فلم باکس آفس پر ناکام رہی۔ منی رتنم کو اس فلم کی ناکامی سے بہت صدمہ ہوا۔

یووا: فلم 'یووا' میں نوجوان طبقے کی دشواریوں کی گہرائی سے چھان بین کر کے ان کے غصّے کو پیش کیا گیا ہے۔کلکتہ کی سڑکوں پر نوجوان طبقہ کی مڈبھیڑ کے مناظر حیران کن اور فلم بینوں کو ہلا دیتے ہیں۔ابھیشیک بچن کو اس فلم سے نئی پہچان ملی۔اس فلم میں کئی اسٹارس ہونے کے باوجود کامیابی کے پیش نظر اوسط رہی۔

'گرو': فلم 'گرو' میں بالواسطہ طور پر دھیرو بھائی امبانی کی جدوجہد، ترقی اور کامیابی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ابھیشیک بچن کو اسٹار کی حیثیت اسی فلم کے ذریعے ملی۔

بشکریہ (راشٹریہ سہارا۔(امنگ) ۲۷/جون ۲۰۱۰ء)

☆☆☆

ہدایت کار۔اداکار وجے آنند

خورشید اختر فرازی

وجے آنند ''گولڈی'' صحیح معنوں میں گولڈ تھے بلکہ پیور گولڈ جس میں کوئی دورائے نہیں ہوسکتی اپنے تین بھائیوں چیتن آنند، دیو آنند کے درمیان وجے آنند سب سے چھوٹے بھائی تھے۔آج چیتن اور وجے آنند ہمارے درمیان نہیں، لیکن ان دونوں کی یادیں کبھی بھی دلوں سے بھلائی نہیں جاسکتیں، ویسے وجے آنند کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ اچھے ادکار تھے یا ایک اچھے ہدایت کار، کیونکہ بحیثیت ہدایتکار تو ان کی حیثیت مسلم تھی لیکن بحیثیت اداکار بھی وجے آنند نے اپنی اداکاری کا جادو جگا دیا تھا اور اس میں کوئی دورائے نہیں کہ بحیثیت اداکار بھی انہوں نے اپنی حیثیت منوالی تھی۔رشی کیش مکھرجی کی فلم ''کورا کاغذ'' میں جیا بہادری، ڈبل کراس میں ریکھا اور آسا سچدیو، میں تلسی تیرے آنگن کی میں آشا پاریکھ اور نوتن کے ساتھ، چیتن آنند کی فلم ''فنٹوش'' اور ''حقیقت'' میں ایک جذباتی اداکار کے طور پر وجے آنند نے نمایاں رول ادا کیا تھا۔خاص طور پر کورا کاغذ ایک ایسی سپر ہٹ فلم ثابت ہوئی تھی جس نے فلم بینوں کو سنجیدہ فلم دیکھنے پر مجبور کر دیا اور اس فلم کے بعد خوشبو، پریچے، آنند جیسی سنجیدہ فلموں نے کمرشیل فلموں کو بالکل دبا کر رکھ دیا تھا اسی زمانے میں آندھی، باورچی، جیسی انوکھی سنجیدہ مزاحیہ فلمیں بھی ریلیز ہوئیں۔وجے آنند نے بطور ایکٹر اپنی صلاحیت کا لوہا منوالیا تھا بلکہ اس زمانے میں وہ اپنے سپر اسٹار بھائی دیو آنند سے بھی زیادہ مقبول ہیرو مانے جانے لگے تھے اور یہ بات بھی بہت عجیب ہے کہ وجے آنند نے بحیثیت ہدایتکار بیس برسوں تک اپنی صلاحیت دکھائی اور اس کے بعد وہ ہیرو کے طور پر سامنے آئے، وجے آنند کی نظر میں سب سے اچھی اور کامیاب ہیروئن وحیدہ رحمٰن تھی اور انہوں نے ہر ممکنہ کوشش کی تھی کہ کسی فلم میں اسے وحیدہ رحمٰن کے مقابل ہیرو کا رول ملے لیکن ایسا ممکن نہیں ہوا، اگرچہ گرودت نے پیاسا سی آئی ڈی، جیسی فلمیں بنا کر وحیدہ رحمٰن کو متعارف کرایا تھا۔سی آئی ڈی میں ڈائریکشن راج کھوسلہ کی تھی لیکن پروڈکشن انچارج گرودت تھے اور گرودت کو ہی وحیدہ رحمٰن کا گاڈ فادر تسلیم کیا جاسکتا ہے۔لیکن فلم

گائیڈ میں وجے آنند نے وحدہ رحمٰن کو ایک ایسی ہیروئن بنا دیا جس کے بعد اس کا موازنہ مینا کماری، نرگس اور مدھو بالا جیسی بڑی ہیروئنوں کے ساتھ کیا جانے لگا۔ کیونکہ گائیڈ ایک ایسی کلاسیکی فلم تھی جس کے ڈائریکشن کی تعریف ستیہ جیت رے جیسے عظیم ترین ہدایتکار نے بھی کی تھی۔ بحیثیت ڈائرکٹر وجے آنند نے نوکیتن کے لئے کئی کامیاب فلمیں بنائیں جن میں فنٹوش فلم کا نام قابل ذکر ہے۔اس فلم میں دیوآنند کو ایک پاگل کے کردار میں پیش کیا گیا تھا۔جس سے فلم کے ویلین کے این سنگھ ایک معاہدہ کرتے ہیں کہ ایک مخصوص تاریخ میں خودکشی کرلے گا اور اس سے پہلے وہ اس کی زندگی کا ایک لاکھ روپے کا بیمہ کراتے ہیں تاکہ اس کے مرجانے کے بعد وہ اس کے بیمہ کی رقم حاصل کرلیں۔اس فلم میں دیوآنند کی اداکاری انتہائی عروج پر تھی۔اس فلم کا ایک گیت ''اے میرے ٹوپی پلٹ کے آ'' بیحد مشہور ہوا تھا۔اس کے علاوہ نوکیتن کی ''نو دو گیارہ'' کی ہدایت بھی بہت شاندار تھی جس میں دیوآنند اور کلپنا کارتک کی جوڑی تھی، اسی فلم کی تکمیل کے بعد دیوآنند نے کلپنا کارتک سے شادی کرلی تھی، آج بھی دیوآنند اور کلپنا کارتک ایک ہی بنگلے کے اوپر نیچے رہتے ہیں لیکن پچھلے ۳۷ برسوں سے دونوں میں بات چیت نہیں ہوتی ہے۔

نو دو گیارہ کے علاوہ افسر بھی بیحد کامیاب فلم رہی جس میں دیوآنند ایک چائے باغات کے ایک سخت افسر بنے تھے اور ثلنی جیونت ایک مظلوم مزدور، بعد ازاں دیوآنند اور وجے آنند میں ناچاقی ہوگئی اور کالا پانی، جعلی نوٹ وغیرہ میں راج کھوسلہ کی ڈائریکشن رہی، لیکن فلم ''کالا بازار'' کے لئے دیوآنند نے پھر سے وجے آنند کو لیا اس فلم میں دیوآنند کو فلموں کے ٹکٹ کی کالا بازاری کرتے دکھایا گیا ہے۔ یہ فلم بیحد شاندار رہی۔ پھر ناصر حسین نے فلم ''جب پیار کسی سے ہوتا ہے'' کے لئے وجے آنند کو ڈائریکشن سونپی اور شمی کپور کو ہیرو کے طور پر لینے کے لئے کہا تو وجے آنند نے شمی کپور کے مقابلے میں دیوآنند کو لینے کی سفارش کی کہ اس فلم میں چند بیحد جذباتی سین ہیں جس کے لئے شمی کپور سے زیادہ دیوآنند مناسب رہیں گے اور ان کی پسند شامل رکھی گئی اور وہ فلم پلاٹینم جبلی ہوئی لیکن شمی کپور وجے آنند کی مخالفت کی وجہ سے اس سے کھنچے کھنچے رہنے لگے تھے انہوں نے اس وقت ناصر حسین کو دیوآنند کی جگہ پر شمی کپور کو لینے کا مشورہ دیا جب ناصر حسین

نے تیسری منزل کی ہدایت انہیں سونپی تھی۔تیسری منزل ایک ہٹ فلم ثابت ہوئی۔ جسے آل ٹائم گریٹ فلم سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ یہ فلم ملک کے بیشتر حصوں میں ۱۱۰ رہفتوں تک چلی اور اس نے باکس آفس کے اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے تھے۔اسی زمانے میں دیوآنند کی نوکیتن کی یادگار فلم ''گائیڈ'' کے لئے وجے آنند کو ڈائریکشن کی ذمہ داری دی گئی اور گائیڈ ایک ایسی فلم ثابت ہوئی جس نے ہندی فلموں کی سوچ ہی بدل ڈالی۔ایسی لاجواب اداکاری دیوآنند، وحیدہ رحمٰن، کشور ساہو، الہاس، انور حسین لیلا چٹنس نے کی کہ اس فلم کو لوگوں نے بار بار دیکھی گائیڈ فلم خاص طور پر یوروپ میں بہت زیادہ مقبول ہوئی اس فلم کو ۱۱ فلم فیئر ایوارڈز ملے۔

وجے آنند نے نوکیتن کے بینر تلے ''جیول تھیف'' جیسی یادگار اور کامیاب ترین فلم کی بھی ہدایت دی تھی جس میں دیوآنند، وجنتی مالا، اشوک کمار، ہیلن، فریال، انجو مہندرو، سپرو اور نذیر حسین نے کام کیا تھا۔فلم جیول تھیف ہندی فلم میں ایک انقلاب لے کر آئی جس کے بعد اسی قسم کے موضوعات پر تقریباً ۵۰۰ فلمیں بنیں جن میں ۱۰۰ فلمیں یقیناً سپرہٹ ثابت ہوئیں۔ بعدازاں جوشیلا (دیوآنند، راکھی، ہیما مالنی) بنارسی بابو، چھپے رستم جانِ من، عشق عشق وغیرہ کی ہدایت بھی وجے آنند نے دی لیکن یہ فلمیں زیادہ کامیاب نہ ہوئیں۔ بعد میں دیوآنند نے خود ہی ڈائرکشن دینے کا فیصلہ کیا اور دو یادگار اور کامیاب ترین فلمیں 'ہرے راما ہرے کرشنا، اور پریم پجاری کی ہدایت دی اور یہ دونوں فلمیں سپرہٹ ثابت ہوئیں لیکن اس کے بعد دیوآنند کی ہدایت میں بنی ایک درجن فلمیں لگاتار ناکام ہوئیں۔

۱۹۹۵ء میں وجے آنند کو فلم سنسر بورڈ کا چیف بنایا گیا تھا مگر انہوں نے زیادہ دنوں تک اپنے آپ کو احمقوں کی انجمن میں شامل نہیں رکھا اور رسی تڑا کر بھاگ نکلے، جس کے بعد آشا پارکھ کو فلم سنسر بورڈ کا چیف بنادیا گیا تھا۔

وجے آنند کے ساتھ بڑے بھائی چیتن آنند اور منجھلے دیوآنند ۱۹۹۵ء میں قطعی طور پر بات چیت کرنا بند کردیا تھا اور اس کے ساتھ سارے رشتے توڑ لئے تھے جب وجے آنند نے انتہائی بے شرمی اور چھچھورے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی سگی بہن کی بیٹی سے شادی کرلی تھی۔

وجے آنند ''فری لو'' کے قائل تھے اور وہ رشتوں کے درمیان تمیز کرنا نہیں جانتے تھے بڑے بھائی چیتن نے بھی اپنی فلموں کی مخصوص ہیروئن پریہ درشنی کو اپنے ایک فلیٹ میں رکھیل بنا کر رکھ چھوڑا تھا۔ پریہ نے فلم حقیقت، ہنستے زخم، ہیر رانجھا، قدرت وغیرہ میں دھرمندر، نوین نیشچل، راجکمار اور راجیش وغیرہ کے ساتھ کام کیا تھا اور یہ تمام فلمیں چیتن آنند کی تھیں۔ انہوں نے پریہ کو کسی دوسرے پروڈکشن میں کام کرنے کی اجازت نہیں دی تھی، پریہ کا ابھی چار سال قبل چیتن آنند کے بھانجے ٹینو آنند کے ہاتھوں بہیمانہ طور پر قتل ہوگیا اور ٹینو آنند اب بھی جیل میں ہیں۔ پریہ کے قتل سے ایک سال قبل چیتن آنند گزر گئے تھے اور انہوں نے اپنی ساری جائیداد، تین بنگلے، ۷ گاڑیاں اور فلم اسٹوڈیوز وغیرہ پریہ کے نام کر دیئے تھے جس کی بنا پر چیتن آنند کے لواحقین ان سے بیحد جلنے لگے تھے۔

چیتن، دیوا اور وجے، یہ تینوں بھائی بالکل راجکپور، شمی کپور، اور ششی کپور نیز اشوک کمار، کشور کمار، اور انوپ کمار کی طرح سے ٹرپیل مزاج کے تھے۔ چیتن بیحد سنجیدہ، متین، کم گفتار، اور خاموش طبع تھے۔ دیو آنند کیسے ہیں یہ سبھی جانتے ہیں لیکن وجے آنند کو خدا نے لاجواب دماغ اور بہترین سوچنے سمجھنے کی صلاحتیں عطا کی تھیں۔ گائیڈ، جیول تھیف، نو دو گیارہ، فنٹوش، تیسری منزل، جب پیار کسی سے ہوتا ہے'' جیسی لاجواب اور ناقابل فراموش فلمیں دیکھنے کے بعد اندازہ ہوجاتا ہے کہ وجے آنند کس پائے کے ہدایتکار تھے، ان کی نجی زندگی کیا تھی اس سے قطع نظر ان کی عظمت اپنے نام''وجے'' کی طرح سے اسم بامسمی تھے کیونکہ انہوں نے زندگی میں کبھی بھی کسی سے اپنی شکست نہیں مانی اور جو بھی ان کے ساتھ دوڑنے لگا اسے انہوں نے فوراً ہی پٹکا دیا البتہ موت جب آئی تو دوسروں کی طرح سے وہ بھی اکیلے گئے۔

ادب، فلم اور صحافت کا ستون کملیشور پرساد

ڈاکٹر منور حسن کمال

کملیشور پرساد سکسینہ جنہیں ہندی، اردو کی ادبی دنیا کملیشور کے نام سے جانتی ہے، ضلع مین پوری (یوپی) میں ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ الہٰ آباد یونیورسٹی سے ہندی میں ایم اے کیا۔ ان کی پہلی کہانی ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی، لیکن انہیں شہرت ۱۹۵۷ء میں اس وقت ملی، جب ان کی کہانی 'راجہ نربسیا' شائع ہوئی۔ اس کہانی نے انہیں راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ان میں پریم چند اور پھنیشور ناتھ 'رینو' کے اوصاف ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان کی 'نیلی جھیل'، 'بیان'، 'مردوں کی دنیا'، 'تلاش'، 'سانس کا دریا'، 'زندے مردے'، 'قصبہ کا آدمی' اور 'اسمارک' ایسی کہانیاں ہیں جو ہندی ادب کی ہی نہیں دنیا کے کسی بھی ادب میں ممتاز مقام پانے کی اہلیت رکھتی ہیں۔

وہ 'واما'، 'نئی کہانیاں'، 'ساریکا'، بھی منتخب کیا گیا۔ 'کتھا یاترا'، 'گنگا'، 'انگت' اور 'شری ورشا' جیسے اہم رسالوں کے مدیر رہے۔ خاص طور سے انہوں نے 'ساریکا' کو ہندی ادب کی ایسی میگزین کے طور پر متعارف کرایا کہ 'ساریکا' ہندی ادب کا جزولازم بن گئی۔ وہ دوردرشن کے ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل کے اہم عہدہ پر سرفراز ہوئے اور دوردرشن کے سیریلوں کو عوام وخواص سب کے لیے مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ٹیلی ویژن کے لیے انہوں نے 'چندر کانتا'، 'یگ' اور 'بے تال پچیسی' جیسے سیریلوں کے ڈائیلاگ اور اسکرپٹ لکھیں۔ انہوں نے 'دی برننگ ٹرین'، 'آندھی' اور موسم جیسی فلموں کی اسکرپٹ لکھ کر ہندی فلموں کو نئی اونچائیوں پر پہنچایا۔ ان کے ناول 'ایک سڑک ستاون گلیاں'، 'ڈاک بنگلہ'، 'تیسرا آدمی'، 'کالی آندھی'، 'سمندر میں کھویا آدمی'، 'ٹوٹے ہوئے مسافر'، 'وہی بات'، 'آگامی اتیت'، 'صبح دوپہر شام'، 'ریگستان'، 'چندرکانتا' اور 'کتنے پاکستان' ادب کی دنیا میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان میں 'کتنے پاکستان' تو ایک تاریخ رقم کر چکا ہے۔ اس کے ایک درجن ایڈیشن صرف ہندی میں شائع ہو چکے ہیں۔ کتنے پاکستان اردو میں پاکستان میں بھی شائع ہوا اور ہندوستان میں بھی۔ یہاں اس کو صلاح الدین پرویز کے ادارہ مکتبہ استعارہ نے (مترجم خورشید عالم) نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی

امینہ قاضی نے 'کتنے پاکستان' کو انگریزی پیراہن عطا کیا، جسے 'پینگوئن' نے چھاپ کر پوری دنیا میں متعارف کرایا۔ دنیا کی تقریباً ۲۰ زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ 'کتنے پاکستان' کو ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس ناول کو 'شکھر ساہتیہ سمان' کے لیے بھی منتخب کیا گیا۔

۱۹۶۰ء کے آغاز میں جب 'نئی کہانی تحریک' کا آغاز ہوا تو کملیشور اس تحریک کے سربرآوردہ افراد میں شامل تھے۔ انہوں نے اس تحریک کے حوالے سے نئی کہانی کو بام عروج پر پہنچانے میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ اپنی تمام تخلیقات میں وہ ایک قصہ گو کی طرح سامنے آتے ہیں۔ وہ حقیقی معنی میں سماج کے ترجمان تھے۔ وہ بے خوف اور نڈر ہو کر اپنی بات کہنے میں ذرا تامل نہیں کرتے تھے۔

معروف ناقد گوپی چند نارنگ نے 'کتنے پاکستان' کو 'انسانیت کے اتھاہ درد کی کراہ' سے تعبیر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں 'کملیشور کے ناول 'کتنے پاکستان' میں ایک آفاقی تصور ہے۔' انہوں نے صرف ہندوستانی تاریخ وتہذیب کے حوالے سے نہیں، بلکہ پوری انسانی تاریخ کے حوالے سے اپنے ناول میں گفتگو کی ہے اور انسان پر بپا ہونے والی قیامتوں اور عذابوں کا دردناک احوال رقم کیا ہے، کیونکہ بنیادی طور پر ادیب دنیا کے ہر ملک کا باشندہ ہوتا ہے اور ایک سچا تخلیق کار کسی جغرافیائی سرحد میں محدود نہیں ہوتا۔ دنیا کا ہر ملک اس کا اپنا ملک ہوتا ہے۔ اس لیے کائنات کے سینے پر جو بھی تیر لگتے ہیں، وہ سب تیر لوٹ کر تخلیق کار کے سینے میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ یہ صرف ہندوستانی تاریخ اور تہذیب کا درد نہیں ہے، بلکہ کائنات کا درد ہے، جو اس تخلیق کے سینے میں سمایا ہوا ہے۔ معلوم نہیں کملیشور نے کتنے برس انسانیت کے اس اتھاہ درد کی کراہ کو اپنے اندر بھگتا ہوگا۔ نیل کنٹھ کی طرح اس کا زہر پیا ہوگا اور پھر اسے تخلیق کار کے امرت میں بدلا ہوگا۔ سچا تخلیق کار بار بار مرتا ہے اور بار بار اپنے لفظوں کے ذریعہ جی اٹھتا ہے۔

کملیشور کے ناولوں میں ہمیں ایک ایسی بوقلمونی نظر آتی ہے جو تحریر سے آنکھوں کے رشتے کو منقطع نہیں ہونے دیتی۔ ایک ایسی کشش سے ہم روشناس ہوتے ہیں، جو ہمیں اپنے دل کے اندر بہت اندر تک کبھی فرحت بخش اور کبھی روح فرسا احساس سے ہمکنار کرتی ہے۔ کملیشور نے مدتوں انسانی تہذیب اور اس کے رشتوں پر غور وخوض کیا ہے۔ ان کا یہی ادراک ان کی تحریروں کی جان ہے۔ وہ پہلے حقائق کو ایک شارح کی طرح بیان کرتے ہیں۔ پھر اسی طرح تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی منظرنامہ تشکیل دیتے ہیں کہ قاری خود اپنی ذات کو اس کا محور تصور کرتا ہے۔

پروفیسر شمیم حنفی کے مطابق ان کی شخصیت ایک انتہائی بے چین، سرگرم اور اندوہ پرور روح سے مملو ہے۔ وہ اضطراب آسا انسانی معاشرے کی تماشائی بھی ہے اور آپ اپنا تماشا بھی۔ صحافت، فلم سازی اور ماس میڈیا سے صرف اپنے شب چراغ کے ساتھ اپنی تنہائی سے الجھتی ہوئی ایک روح، جس کے لیے ادراک اور اظہار کا کوئی بھی وسیلہ، کوئی بھی آخری وسیلہ اور مرحلہ نہیں ہے، جس کے لیے لکھنا اور مختلف زاویوں سے اپنا اظہار کرنا ایک سماجی مشن بھی ہے اور ایک داخلی مجبوری بھی۔

یہی وجہ ہے کہ کملیشور کی تمام تخلیقات میں کئی کئی جہتیں نظر آتی ہیں، جن سے ہم ایک ہی وقت میں مختلف سطحوں سے مکالمہ قائم کر سکتے ہیں بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شخصیت میں ایک ادیب، ایک دانشور، ایک سماجی مفکر اور ایک ایسا حقیقت پسند کالم نگار نظر آتا ہے، جس کی جھولی میں کئی زمانوں، کئی زمینوں اور زمان ومکاں کے کئی رشتوں کے تجربے یکجا نظر آتے ہیں۔

افسوس ۳۰۰ سے زیادہ کہانیاں، ایک درجن ناول اور درجنوں فلموں اور سیریلوں کے ڈائیلاگ اور اسکرپٹ لکھنے والی یہ عظیم شخصیت ۲۷/جنوری ۲۰۰۷ کی رات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گئی۔ اب آسمان کے خون کے آنسو دیکھنے والا کوئی نہیں، اب بنجر زمین کی کاشت میں کون اپنی جان کھپائے گا، اب سماج کی رسوائیوں کو کون بے نقاب کرے گا اور اب 'نئی کہانی' کا جنم داتا کہاں پیدا ہوگا، یہ دیکھنے کے لیے کتنی صبحیں، کتنی شامیں، کتنے دن، کتنی راتیں اور کتنے ماہ وسال گزریں گے، اس کا جواب خود 'نئی کہانی' کے پاس بھی نہیں۔ اس لیے کہ کملیشور کے انتقال سے 'نئی کہانی' بیوہ ہو گئی، اس کے سر کی چادر اتر گئی۔

آنجہانی کملیشور کے تئیں اہم شخصیات کے تاثرات

کملیشور نے ہندی کہانیاں ٹیلی ویژن اور فلموں کے اسکرپٹ لکھ کر ہندی کے بہترین ادیب کے طور پر اپنی شناخت قائم کی۔

ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام (صدر جمہوریہ، ہند)

کملیشور ایک کثیر جہتی شخصیت تھے، ادب اور صحافت کے ذریعہ انہوں نے سماج کی جو خدمت کی ہے اس کے لیے انہیں ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

بھیروں سنگھ شیخاوت (نائب صدر جمہوریہ، ہند)

کملیشور ایک تعمیر پسند اور بصیرت والے قلمکار تھے۔ ان کے انتقال سے ایک بڑا خلا پیدا ہوا ہے اور ان کا انتقال پوری دنیا کے لیے ایک نا قابل تلافی نقصان ہے۔

شیلا دیکشت (وزیراعلیٰ، دہلی)

کملیشور نے ادب اور صحافت کی مدد سے معاشرے کی نا قابل فراموش خدمت کی ہے۔

سونیا گاندھی (چیئر پرسن کانگریس)

وہ ایک عظیم صحافی اور ادیب تھے ان کی وفات سے ہندی دنیا کا زبردست نقصان ہوا ہے۔

شاہد صدیقی (قومی جنرل سکریٹری اور پارلیمانی رکن سماج وادی پارٹی)

کملیشور کے انتقال سے ہندی اور اردو ادب کا نا قابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ کملیشور ادب کی ترقی پسند روایت کے علمبردار تھے۔ انہوں نے ترقی پسند دانشوری کی نہرو وادی روایت کو آگے بڑھایا۔ کہانی کار اور ناول نگار کی حیثیت سے ان کا مقام ہندی کے اول درجے کے تخلیق کاروں میں ہے۔ عملی طور پر انہوں نے اردو اور ہندی کے ادیبوں کے درمیان پل کا کام کیا اور ہر قسم کی فرقہ واریت، سیاسی اور ادبی موقع پرستی اور تنگ نظری کے خلاف تاعمر سرگرم کملیشور ایک ایسے ادیب اور دانشور تھے جن سے اردو و ہندی ادیبوں کی نئی نسلوں کو ہمیشہ ایک نیا حوصلہ اور تحریک ملی۔

وشوناتھ ترپاٹھی (صدر)، ارجمند آراء (جنرل سکریٹری) انجمن ترقی پسند مصنفین، دہلی شاخ

یہ ہمارے لیے بڑے افسوس اور غم کا مقام ہے کہ ہم نے ادب اور صحافت کے ایک ایسے ستون کو کھو دیا جس کی وجہ سے صحافت اور ادب کی عمارت میں شگاف نظر آنے لگا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ کملیشور نے ادب وصحافت کے تعلق سے سماج اور معاشرے کی نا قابل فراموش خدمت کی ہے۔

شاہد پرویز (ڈائریکٹر راجیو گاندھی انسٹی ٹیوٹ آف اردو ایجوکیشن)

وہ اہم ادیب ہی نہیں ایک عوامی دانشور تھے۔ انہیں ہندوستانی سماج، سیاست اور ڈپلومیسی ان تینوں پر اپنی فکر اور پریشانیوں کو کہانی کے ذریعہ ظاہر کرنے کے فن میں کمال حاصل تھا۔

اشوک واجپئی (صحافی وادیب)

☆☆☆

تاجدارِ موسیقی ''نوشاد علی''

ڈاکٹر الف انصاری (مغربی بنگال)

سُروں کے شہنشاہ موسیقار اعظم نوشاد صاحب کے فن اور شخصیت کے متعلق اب تک اتنے صفحات سیاہ کئے جا چکے ہیں کہ مزید اُن کے فن پر کچھ لکھنا میرے قلم کی بساط نہیں' سوچتا ہوں' ایک عظیم شخص' عظیم فنکار اور ایک باکمال شاعر کے بارے میں کیا لکھوں؟ جب جب میں نے ان کی فنی خوبیوں پر خامہ فرسائی کرنے کی جرأت کی تو میرے اعصاب نے جواب دے دیا۔ پھر بھی میری کم مائگی اور بصیرت کی کمی نے اُن کے لازوال کارناموں اور بے مثال فنی خوبیوں کے مطالعہ اور مشاہدہ کے بعد جو کچھ محسوس کیا انہیں قلمبند کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

موسیقار اعظم نوشاد صاحب کا تعلق لکھنوا سکول آف میوزک سے تھا۔ موسیقی کی ابتدائی تعلیم آپ نے اُستاد یوسف علی خاں، اُستاد ببّن خاں، اُستاد بندے علی خاں اور اُستاد غربت علی خاں سے حاصل کی۔ مغربی سازوں میں نوشاد صاحب کو پیانو سے بڑی رغبت اور الفت تھی۔ ابتدائی دنوں میں آپ نے ایک پیانو بجانے والے کی حیثیت سے ملک کے نامور موسیقار اُستاد جھنڈے خاں کے ہاں ملازمت کی۔ عرصہ تک ''جنرل فلم سٹی، رنجیت موی ٹون اور بنات والا ریکارڈنگ کمپنی'' سے وابستہ رہے۔ رنجیت فلمز میں ملازمت کے دوران انھیں اس وقت کے معروف میوزک ڈائرکٹر کھیم چند پرکاش (شہرت یافتہ فلم 'محل' کے موسیقار) کی ماتحتی میں اسسٹنٹ میوزک ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا۔ بحیثیت اسسٹنٹ میوزک ڈائرکٹر نوشاد نے اس زمانے کی نغمہ بار فلمیں محل' پردیسی' مسافر' تان سین' اور بھگت سُورداس میں کھیم چند پرکاش کے ساتھ دُھنیں تیار کرنے میں کافی مدد کی۔

نوشا صاحب کی صلاحیت کو سب سے پہلے وجے بھٹ نے پہچانا اور انھیں پرکاش پکچرز میں میوزک دینے کی پیشکش کی اُن ہی دنوں ہدایت کار رائے آر کاردار نے ممبئی میں اپنی نئی فلم کمپنی کی بنیاد

رکھی تھی ۔انھیں اپنی فلم کے لئے ایک قابلِ اعتماد اور مستقل میوزک ڈائرکٹر کی ضرورت تھی جو اُن کے فارمولے میں بھر پور تعاون دے سکے ان کی دور بین نگاہ نوشاد صاحب پر پڑی اور انھوں نے اپنی کمپنی کے لئے نوشاد صاحب کا انتخاب کرلیا۔اے آر کاردار کی بہت ساری فلموں میں نوشاد صاحب نے موسیقی دی جنمیں شاردا' جادو' جیون' سنجوگ' قانون' قیمت' گیت' ناٹک' شاہ جہاں' درد' دلگی اور دلاری کے نام قابل ذکر ہیں ان فلموں نے سلور و گولڈن جوبلی منائیں ۔ان فلموں کی کامیابی بلاشبہ نوشاد صاحب کی بنائی ہوئی ہوشربا دھنوں کے سبب ہوئی شاہ جہاں' جادو' درد' دُلاری اور دلگی کے دلکش نغمے آج بھی موسیقی کے رسیاؤں کے کانوں میں رس گھولتے ہیں ۔اُن نغموں کے سننے کے بعد عوام وخواص کے دل ودماغ میں ایک سُرور کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔

اے آر کاردار کے ساتھ معاہدے کے باوجود نوشاد صاحب کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ ان کی فلموں میں موسیقی دینے کے علاوہ دوسرے پروڈیوسروں اور ہدایتکاروں کی فلموں میں موسیقی دے سکیں چنانچہ اُنھوں نے دو مخصوص ہدایتکاروں ایم صادق اور ایس ۔یو۔سنّی کی فلموں کے لئے بھی موسیقی ترتیب دی۔

مذکورہ فلموں کی کامیابی کے بعد فلمی دنیا کے تمام دروازے اُن کے لئے وا ہو گئے ایک موسیقار کی حیثیت سے اُن کے انمول اور لافانی گیتوں نے ملک کے چپّے چپّے میں دھوم مچا دیئے ۔اب آپ منزلِ مقصود کی طرف تیزی سے گامزن تھے ۔

کلکتہ کے سنیما ہال پیراڈائز میں پہلی بار جب اُنکی فلم رتن دکھائی گئی تو یہ فلم چند ہفتوں میں اُتر گئی لیکن جب کچھ دنوں بعد ہی کلکتہ کے پیراماؤنت ہال میں دوبارہ لگی تو اُس کی شہرت اور مقبولیت کے چرچے ان کے بنائے ہوئے گیتوں کے سبب آسمان کی بلندی کو چھونے لگے ۔اب کلکتہ کی شاہراہوں اور گلیوں میں اُن کے گیتوں کے چرچے ہونے لگے ہر شخص کی زبان پر نوشاد صاحب کی بنائی ہوئی مدھر دھنوں سے لبریز گیت سنے جانے لگے اس فلم نے گولڈن جوبلی منائی فلم کی کامیابی کا راز اس کے سحر انگیز نغموں میں پوشیدہ ہے ۔جنھیں آج بھی لوگ گنگناتے ہیں اس فلم کی بے مثال کامیابی نے نوشاد کو شہرت کی بلندی پر پہنچا دیا ۔

جیسے ''انکھیا ملا کے جیا بھرما کے چلے نہیں جانا'' اور ''ساون کے بادلوں ان سے یہ جا کہو'

اور ''کیا مل گیا بھگوان'' اس زمانے کے ان شاہکار گیتوں نے فلم ''رتن'' کو دائمی شہرت عطا کی اور نوشاد صاحب کے فن سے متاثر ہو کر ڈائرکٹر محبوب خاں نے انھیں ''محبوب پروڈکشن'' میں مستقل میوزک ڈائرکٹر کی حیثیت سے شامل کرلیا۔ پھر ایک دور ایسا آیا جب محبوب خاں اور نوشاد کی مقبول جوڑی نے ہندوستان میں دھوم مچا دی محبوب خاں نے اپنی بیشتر فلموں جیسے امر' انداز' آن' اعلان' انمول' گھڑی' انوکھی ادا' مدر انڈیا' سن آف انڈیا وغیرہ میں نوشاد کو میوزک ڈائرکٹر کی حیثیت سے شامل کیا اسی طرح نوشاد نے بھی فلموں میں روحانی موسیقی سے جان ڈال دی اور یہ تمام کی تمام فلمیں یادگار بن گئیں محبوب کی ڈائرکشن اور نوشاد کی موسیقی فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھی گئی اگر ان فلموں میں نوشاد کی موسیقی نہ ہوتی تو شاید یہ فلمیں اتنی کامیاب نہ ہوتیں ۔

نوشاد کی تخلیق کردہ شاہکار موسیقی سے متاثر ہو کر کے آصف نے اپنی شاہکار فلم ''مغلِ اعظم'' میں موسیقی دینے کے لئے منتخب کیا۔ڈائرکٹر کے آصف کی دور اندیشی اور نظرِ انتخاب کی داد دینی ہوگی کہ انہوں نے ایک تاریخی فلم جس کا تعلق مغل شہنشاہ اکبر اور سلیم سے تھا اس کے لئے نوشاد کا انتخاب کیا کیونکہ اس عہد (شہنشاہی عہد) کی موسیقی کو صرف اور صرف نوشاد صاحب ہی ترتیب دے سکتے تھے جب فلم ریلیز ہوئی تو دنیا نے دیکھا کہ نوشاد صاحب نے اس فلم کے لئے جو دھنیں تیار کیں اور بیک گراؤنڈ موسیقی دی اس کا جواب نہیں ۔فلم دیکھنے والے جب مغلیہ دربار میں تان سین کے راگ کو یا موہے پنگھٹ پہ نندلال چھیڑ گئیو رے ''یا پھر پیار کیا تو ڈرنا کیا'' جیسے حسین مناظر کو دیکھتے اور سنتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لئے خود کو مغلیہ دور کے دربار میں پاتے ہیں ۔ یہ بہت بڑی بات ہے ان حسین مناظر کو فلمانے کے لئے ڈائرکٹر کے آصف بھی مبارک باد کے مستحق ہیں ۔

فلم 'مغلِ اعظم' ہر اعتبار سے ایک شاہکار فلم تسلیم کی گئی ہے لیکن اکبر اعظم کے کردار پرتھوی راج کپور نے بڑی خوبصورتی سے ادا کر کے اپنے کردار کو لافانی بنا دیا۔جب کہ فلم کے ڈائیلاگ رائٹر وجاہت مرزا' کمال امروہی' امان اللہ خان امان اور احسن رضوی نے اپنے مکالموں کے ذریعہ فلم کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔فلم کی تاریخ میں ایسے مکالمے اب تک قلمبند نہیں کئے جا سکے ۔اسی طرح موسیقار نوشاد صاحب نے اپنی دلفریب اور سحر انگیز موسیقی سے فلم کو امر بنا دیا ہے ۔

بحیثیت پروڈیوسر نوشاد صاحب نے دو فلمیں جادو اور داستان بنائیں دونوں ہی فلمیں موسیقی کے اعتبار سے سپرہٹ ثابت ہوئیں فلم جادو میں نوشاد صاحب نے مغربی طرز کی جو دھنیں پیش کیں وہ آج کے مغرب زدہ موسیقاروں کے لئے ایک سبق ہے آج سے ۵۰ سال قبل نوشاد نے اس فلم میں موسیقی دی تھی۔ انہوں نے اس فلم میں جو ساز استعمال کئے وہ آج کے فلمی شائقین کے لئے سننے سے تعلق رکھتے ہیں اس فلم میں انہوں نے مغربی طرز کی جو دھنیں بنائی ہیں وہ آج کی مغربی دھنوں سے ممتاز نظر آتی ہیں اس کے باوجود انہوں نے ہندوستانی اور مشرقی تہذیب کا دامن نہیں چھوڑا ہے اس فلم کے مغربی طرز پر مبنی گیتوں کو سننے کے بعد یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اگر نوشاد صاحب روایت سے انحراف کر کے مغربی موسیقی کو اپنا لیتے تو کافی دولت کما لیتے لیکن انہوں نے ہندوستانی موسیقی کو مغرب زدہ نہیں بنایا اور اپنے فن کو دولت پر ترجیح نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ نوشاد صاحب اپنی ۶۵ سالہ فلمی زندگی میں اپنے اسلاف' اور ہندوستانی موسیقی کے رسیاؤں کے دلوں میں محفوظ ہیں۔ بقول نوشاد ''ہندوستانی موسیقی ہماری اپنی ہے اس میں لوگ گیت کو خاص مقام حاصل ہے یہ ہماری زمین کے ہیں ان پر ہمارا حق ہے ہم انھیں خوبصورت سازوں سے آراستہ کر کے بڑھا سکتے ہیں۔ قدیم اور روائتی ہونے کے باوجود ہندوستانی موسیقی میں زندگی کی رمق پائی جاتی ہے جب کہ مغربی سنگیت میں ہمیں یہ بات نظر نہیں آتی ہماری موسیقی میں ایکتا' روحانیت اور محبت کے بیج ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی موسیقی ایک ہے اس لئے میرے اور ملک کے کئی سینئر موسیقاروں کے گیت آج بھی دونوں قوموں کے لوگ یکساں طور پر پسند کرتے ہیں اور گنگناتے ہیں۔''

نوشاد صاحب کے مذکورہ اقتباس میں کتنی صداقت ہے اس کا اندازہ ان کی شاہکار اور موسیقی سے لبریز فلموں بیجو باوٗرا' انداز' دیدار' بابل' میلہ' اُڑن کھٹولہ' چاندنی رات' مغلِ اعظم' رتن' امر' مدر انڈیا' آن' انمول گھڑی' انوکھی ادا' گنگا جمنا' داستان' درد' آدمی' ساز اور آواز' شباب' میرے محبوب' پالکی' سوہنی مہیوال' سنگھرش' رام اور شیام لیڈر' دلاری' دلگی' کوہِ نور' جادو' شاہ جہاں اور دل دیا درد لیا سے لگایا جا سکتا ہے۔

نوشاد صاحب کے عزیز دوست اور نامور فلمساز وجے بھٹ نے جب پرکاش پکچرز کے بینر

تلے اپنی شاہکار فلم بیجو باوٗرا' بنانے کا ارادہ کیا تو ان کی نگاہِ انتخاب موسیقار نوشاد پر پڑی کیونکہ ان کی نگاہ میں ہندوستانی اور کلاسیکی موسیقی دینے والا فلمی دنیا میں کوئی دوسرا موسیقار موجود نہیں تھا جو پوری خوداعتمادی کے ساتھ یہ ذمّہ داری نبھا سکتا۔ جب فلم کے تمام گانے مکمل ہو گئے اور جب فلم ریلیز ہوئی تو بیجو باورا کے گیت نے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیائے موسیقی میں تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ یہ فلم موسیقی کے اعتبار سے نوشاد صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور ہندوستانی فلم انڈسٹری کا عظیم شاہکار ہے۔ کہتے ہیں کہ اس فلم کی کلاسیکی دھنوں کو ترتیب دینے کے لئے نوشاد نے ملک کے ہر ماہر کلاسیکی گلوکاروں کی خدمات بھی حاصل کیں جن میں استاد جی ڈی پلسکر پنڈت اوم کارناتھ' اور استاد امیر خاں نے ان کی موسیقی میں اپنے فن کا بے پناہ مظاہرہ کیا اس فلم کے تقریباً تمام گیت آج بھی بیحد مقبول ہیں اس فلم میں نوشاد صاحب نے محمد رفیع صاحب سے ایک بھجن ''من تڑپت ہری درشن کو آج'' اور ''اُو دنیا کے رکھوالے سن درد بھرے میرے نالے'' جیسے گیت گوا کر محمد رفیع کو شہرت کی بلندی پہنچا دیا۔ فلم کے بھجن کو سننے کے بعد چند لمحوں کے لئے انسانوں کے دلوں میں ایک اضطرابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے دانشورانِ موسیقی کی نگاہ میں اس بھجن کو دنیائے فلم میں اوّلیت کا درجہ دیا گیا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس شاہکار بھجن کو فلمی دنیا کے تین عظیم مسلم فنکاروں نے تخلیق کیا۔ لکھا شکیلؔ بدایونی نے محمد رفیع نے اپنی درد بھری آواز سے سحر پیدا کیا ہے اور نوشاد صاحب نے موسیقی سے سجایا۔

کہتے ہیں کہ جب نوشاد صاحب فلمی دنیا میں اپنا قدم رکھنے کے لئے لکھنوٴ سے ممبئ آئے تو ممبئ کے براڈوے سنیما کے سامنے ایک پان والے کی دکان کے نیچے اپنا قیام کیا۔ رات یہاں بسر کرتے اور روزآنہ صبح اٹھ کر پیدل ممبئ کے اسٹوڈیو اور پروڈیوسروں کے گھروں کا چکر لگاتے اور شام ہوتے ہی لوٹ جاتے۔ آخر ان کی کوشش رنگ لائی اور فلم انڈسٹری سے جُڑ گئے کئی فلموں میں موسیقی دی۔ جب آپ کی فلم ''بیجو باوٗرا'' نے براڈوے سنیما میں گولڈن جوبلی منائی تو نوشاد صاحب کو سنیما کے مالک نے اس پرمسرّت موقع پر سنیما ہال میں آنے کی دعوت دی۔ نوشاد صاحب آئے کچھ دیر سنیما کی بالکونی پر ٹہلتے رہے اور اس پان کی دکان کو بغور دیکھنے

لگے تبھی پاس کھڑے ڈائرکٹر وجے بھٹ نے آپ سے مخاطب ہوکر پوچھا۔

نوشاد صاحب کیا دیکھ رہے ہیں؟ وجے بھٹ سے مخاطب ہوکر نوشاد صاحب نے کہا مجھے اُس فٹ پاتھ سے اس فٹ پاتھ تک آنے میں ۱۵ سال کا عرصہ لگ گیا۔

نوشاد صاحب کی سرپرستی میں کندن لال سہگل، سریندر، شنکر گنگولی، خان مستانہ، جی ایم درّانی، طلعت محمود، محمد رفیع، مکیش، ہمنت کمار، مہندر کپور، مناڈے اورعزیز، گلوکاراؤں میں لتا منگیشکر، نور جہاں، شمشاد بیگم، اوما دیوی (ٹن ٹن) امیر بائی، زہرا بائی آف انبالہ، کرناٹکی، ثریا، مبارک بیگم، اورآشا بھونسلے نے بیشمار سُریلے اورلافانی نغمے پیش کئے آپ جسے ٹن ٹن (اوما دیوی) کے نام سے جانتے ہیں وہ اپنے زمانے کی ایک مشہور گلوکارہ تھی اُس نے صرف چند ہی فلموں میں گیت گائے لیکن جوبھی گیت اُس نے گائے ہیں وہ نوشاد کی فلموں ہی کے لئے گائے کیونکہ اُس نے عہد کیا تھا کہ نوشاد صاحب کی فلموں کے علاوہ کسی دوسرے موسیقار کی فلم میں نہیں گائے گی آخری دم تک اُس نے ایفائے وعدہ کیا اُس کے چند مشہور گیت کے بول یہ ہیں۔فلم ''انوکھی ادا'' میں ''ہوک اٹھے من میں تورہا نہیں جائے'' فلم ''درد'' میں'' جھوم خوشی سے جھوم'' اور'' افسانہ لکھ رہی ہوں دلِ بیقرار کا'' وغیرہ۔

نوشاد صاحب نے صرف چند مخصوص گیت کاروں کے ساتھ اپنی جوڑی بنائی تھی۔نوشاد صاحب کا کہنا تھا کہ''ایک اچھے موسیقار اورایک ذہین شاعر کے اشتراک اورتعاون سے موسیقی زیادہ کامیاب ہوسکتی ہے یہ سلسلہ دیگر موسیقاروں اورگیت کاروں کے ساتھ آج بھی قائم ہے'' نوشاد صاحب کے اس اصول پر چل کر چند موسیقاروں نے چند گیت کاروں کے ساتھ جوڑی بنا کر اچھے اچھے گیت ترتیب دیئے۔

نوشاد کے ساتھ شکیل بدایونی، خمار بارہ بنکوی، مجروح سلطان پوری، تنویر نقوی اورڈی این مدہوک کی جوڑی نے فلمی دنیا کو ایسے ایسے گیت دیئے جو آج بھی بیحد مقبول ہیں۔نوشاد اورشکیل بدایونی کی جوڑی زیادہ کامیاب رہی نوشاد اورشکیل بدایونی کی جوڑی کی جن فلموں کے گیت سپر ہٹ ہوئے ان شاہکار فلموں کے نام یہ ہیں۔

امر، دیدار، بابل، اڑن کھٹولہ، میلہ، مغلِ اعظم، آدمی، آن، لیڈر، سنگھرش، دل دیا درد لیا، گنگا جمنا، کوہِ نور، رام اورشیام، ساز اور آواز، بیجو باوَرا، میرے محبوب، شباب، پالکی، مدرانڈیا، سوہنی مہیوال، اورسن آف انڈیا وغیرہ۔

نوشاد صاحب اپنی دھنیں زیادہ تر پیانو پر بنایا کرتے تھے جب موڈ بن جاتا تھا تو کمرے میں چلے جاتے جہاں ان کے سوااورکوئی نہیں ہوتا۔ پیانو کے پاس بیٹھ کر سگریٹ پیتے پاس ہی ٹیپ ریکارڈ رہتا جب دُھن بنجاتی تو اُسے ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ کر لیتے۔نوشاد صاحب موسیقی میں سازاورآواز کو بڑی اہمیت دیتے فلم کے ماحول، پس منظراورمنظر کی مناسبت سے مختلف سازوں سے کام لیتے۔

فلم ''انداز'' میں پیانو دلاری میں گھنگرو، دلّگی میں بانسری، داستان کے ایک رقص میں بین ''(داستان کی ایک دھن کو برسو ریڈیو سیلون کے پروگرام میں سنا گیا) بیجو باورا، میں ستار اورمینڈ ولین، کوہِ نور، میں مردنگ'' دیدارا اورمیلہ میں ہارمونیم، انوکھی ادا، میں شہنائی اورفلم جادو میں کٹکٹی اورسیکسو فون، شاہ جہاں میں رُباب، انداز، چاندنی رات، اور انوکھی ادا میں شہنائی اور پیانو، دیوانہ میں وائلن، گنگا جمنا میں سارنگی، کوہِ نور میں جلترنگ وغیرہ۔

ان فلموں کو مختلف سازوں کے خوبصورت اورانوکھے استعمال نے امر بنادیا اُن کے سحرانگیز گیت صدیوں ہمارے ذہنوں کو مسرُور مدہوشی، اورسکون عطا کرتے رہینگے اس فن کو نوشاد صاحب نے ''موڈ میوزک'' کا نام دے رکھا تھا۔فلمی شائقین اچھی طرح واقف ہیں کہ دلیپ کمار پرفلمائے گئے گیت رفیع اورطلعت کی آواز میں زیادہ مقبول ہوئے اوردلیپ کمار نے بھی اُن کی آواز اورساز میں اپنے تاثرات کو ڈھالا ہے۔لیکن نوشاد صاحب نے دلیپ کمار پر فلمائے گائے گیتوں کے لئے میلہ اورانداز میں مکیش کو دیدار میں رفیع کو اور بابل میں طلعت محمود کی آواز کو اپنایا۔ ان تینوں گلوکاروں کے گیت اپنی جگہ بے مثال ہیں۔نوشاد صاحب نے طرزوں کی مناسبت سے تینوں گلوکاروں کی آوازیں موزوں کی تھیں۔

نوشاد صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے گلوکاروں کی آوازوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے دھنیں تیار کیں مثلاً فلم ''شاہ جہاں'' میں کے ایل سہگل کی عمر کا خیال کرتے ہوئے ایسی طرز بنائی کہ

جوانی اور بڑھاپے کی آواز میں فرق محسوس نہ ہو۔فلم ''انمول گھڑی'' میں سریندر کے لئے نوشاد صاحب نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا۔مثلاً سہگل کی آواز میں یہ جاوداں نغمہ ''غم دیئے مستقل کتنا نازک ہے دل یہ نا جانا'' اور جب دل ہی ٹوٹ گیا ہم جی کے کیا کریں گے''۔اور سریندر کی آواز میں ''کیوں یاد آرہے ہیں گذرے ہوئے زمانے'' پیش کئے جاسکتے ہیں۔

گذشتہ ۶۵ سال سے ہندوستانی فلم صنعت پر حکومت کرنے والے موسیقار اعظم نوشاد کے زمانے میں کتنے ہی موسیقار آئے اور چلے گئے لیکن نوشاد صاحب بے مثال فنی صلاحیتوں کے سہارے آج بھی زندہ جاوید ہیں نوشاد صاحب کے بعد بہت سے اچھے موسیقاروں نے مثلاً ایس ڈی برمن' سردار ملک' سی راچندر' خیام' غلام محمد' شنکر جے کشن' مدن موہن' روی' اوپی نیّر' سجاد حسین' محمد شفیع' لکشمی کانت پیارے لال' آرڈی برمن اور نوشاد نے نغمے ترتیب دیئے لیکن وہ نغمے وقت کی رفتار کے ساتھ فضا میں گم نہیں ہوئے نوشاد صاحب اور چند موسیقاروں کی بعض فلموں کے کیسٹ کے آج بھی اس قدر Demand ہیں کہ ملتے نہیں۔

نوشاد صاحب ایک اچھے اور عظیم موسیقار ہی نہیں بلکہ اچھے کہانی کار اور بلند پائے کے شاعر بھی تھے آپ کا ایک شعری مجموعہ ''آٹھواں سُر'' کے نام سے شائع ہوکر ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکا ہے فلم شباب' اڑن کھٹولہ' میلہ' بابل' دیدار' پالکی' اور ساز اور آواز جیسی فلموں کی کہانیاں اُن کے ہی زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔لیکن نوشاد صاحب ایک کہانی کار نغمہ نگار کی بہ نسبت اپنی شاہی موسیقی کی بدولت شہنشاہِ موسیقی کہلاتے ہیں ان کی موسیقی روح کی تسکین' ذہنی غذا اور تنہائی میں کانوں کے راستے دل و دماغ کی گہرائیوں میں پہنچ کر ذہنی اور دماغی سکون عطا کرتی ہے۔نوشاد صاحب کی فنکاری کا اعتراف اہل فن نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

''نوشاد ہندی فلمی موسیقی کی رُوح ہیں ان کے تذکرہ کے بغیر تاریخ موسیقی ادھوری رہے گی نوشاد ہندوستانی فلم انڈسٹری کے وقار ہیں ان جیسا فنکار صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔''

(موسیقار ایس۔ڈی۔برمن)

''نوشاد صاحب نے موسیقی کو نئی زندگی عطا کی اُنکی دھنیں سننے والوں کے دلوں میں اتر جاتی ہیں

انھوں نے موسیقی کو نئی زندگی' عظمت اور تازگی بخشی ہے''۔

(موسیقار سردار ملک)

''یوں تو برصغیر میں ایک سے ایک موسیقار موجود ہیں لیکن نوشاد صاحب کی موسیقی کا جواب نہیں وہ میرے محبوب موسیقار ہیں ان کی دھنوں پر گیت گانا سخت مشکل کام ہے۔لیکن جس گلوکار نے گالیا سمجھ لیجئے وہ گلوکار بن گیا۔نوشاد ہندستانی فلمی صنعت کی آبرو ہیں''۔

(ایک امریکی دانشور)

نوشاد صاحب نے اپنی کلاسیکی اور ہندوستانی موسیقی کے ذریعہ ہندوستانی تہذیب' آرٹ اور کلچر کی نہ صرف حفاظت کی ہے بلکہ قدم قدم پر ان کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اُنھوں نے اپنے فن کا کبھی سودا نہیں کیا۔اگر ایسا کرتے تو اپنی عظمت اور شناخت کھو بیٹھتے اور آج اُنکی موسیقی کی داستان بھی دوسرے موسیقاروں کی طرح قصۂ پارینہ بن چکی ہوتی۔ آج کے بیشتر موسیقار حصولِ دولت کے لئے فن کا سودا کر رہے ہیں نتیجتہً انکے بنائے ہوئے گیتوں کو لوگ چند مہینوں میں بھول جاتے ہیں جبکہ نوشاد' شنکر جے کشن' ایس۔ڈی۔برمن' سی راچندر' مدن موہن' غلام محمد' روی' خیام اور آر۔ڈی۔برمن کے گیت آج بھی مقبول ہیں۔ آج کے موسیقاروں کے گیتوں میں شوروغل' ہنگامہ اور عُریانیت کے عناصر ملتے ہیں۔ایسی موسیقی ہماری ہندوستانی تہذیب کا حصّہ کسی طرح نہیں کہلا سکتی اور نہ ہی پائدار ہوسکتی ہے اسی لئے نوشاد صاحب نے مغربی موسیقی کی کبھی نقالی نہیں کی انہوں نے دولت پر فن کو ترجیح دی اور ہندوستانی موسیقی کو ہر لحاظ سے زندہ رکھا۔اس کا قتل نہیں کیا۔نوشاد ایک موسیقار کی حیثیت سے فلمسازوں کے سامنے شرطیں رکھتے کہ میں آپ کی مرضی کے مطابق موسیقی نہیں دے سکتا آپ ان سے کہتے آپ کم وقتوں میں زیادہ فلمیں بنانا چاہتے ہیں اور میں زیادہ وقتوں میں کم فلموں میں موسیقی دینا چاہتا ہوں یہ میرا اصول ہے جسے میں کسی حال میں توڑ نہیں سکتا۔گرچہ نوشاد صاحب نے فلم داستان' جادو' انداز' دیدار' رام اور شیام' گنوار' لیڈر اور ساتھی میں مغربی سازوں کا استعمال کیا ہے لیکن وہ غیر معیاری اور سطحی نہیں ہیں ان فلموں میں بھی آپ نے

ہندوستانی کلچر اور تہذیب کا دامن نہیں چھوڑا ہے بڑی ہی متانت اور سنجیدگی' سے مغربی شراب کو مشرقی جام میں ڈھال کر اس طرح پیش کیا ہے کہ گراں نہیں گذرتا اور روح جھوم اٹھتی ہے۔

حکومت ہند نے نوشاد صاحب کے عظیم کارناموں اور لازوال فنی خدمات سے متاثر ہوکر پدم شری' پدم بھوشن' اور دادا صاحب پھالکے ایوارڈ کے علاوہ بہت سارے بلند پایہ اور پروقار اعزازات سے نواز کر اُن کے فن اور موسیقی کا اعتراف کیا ہے۔ ان کے نام سے لکھنو اور دوسرے شہروں میں نوشاد سنگیت اکیڈیمیاں بھی قائم ہوئیں ایسی شہرت اور مقبولیت ہندوستانی فلم انڈسٹری کی بہت کم شخصیتوں کو نصیب ہوئی ہیں۔ نوشاد نے حال ہی میں ہندوستان کی سب سے مہنگی اور ممتاز فلم ''تاج محل'' کی موسیقی ترتیب دی جو ان دنوں پاکستان میں دھوم مچا رہی ہے اور فلم کے نغمے عوام کو بیحد مسحور کر رہے ہیں۔

موسیقار اعظم نوشاد صاحب کے سانحہ ارتحال پر ملک کی ممتاز سیاسی اور فلمی ہستیوں نے اظہار تعزیت ان الفاظ میں کیا۔

وزیر اعظم من موہن سنگھ: موسیقار نوشاد کی موت سے نغمہ و موسیقی کا ایک باب ختم ہوگیا کلاسیکی موسیقی سے کسی بھی طرح کا سمجھوتہ کرنے کی ضد کے باوجود لوک گیتوں پر ان کی گرفت مضبوط رہی۔

نائب صدر جمہوریہ بھیرو سنگھ سخاوت: نوشاد نے کلاسیکی موسیقیت کو عوام میں مقبول بنانے میں کافی جدوجہد کی آپ انسانیت کے جیتے جاگتے شاہکار تھے۔

اسپیکر لوک سبھا سومناتھ چٹر جی: موسیقار نوشاد نے لوک گیتوں اور کلاسیکل موسیقی کا نایاب تال میل پیدا کیا ہندوستانی موسیقی کے کئی سُر کی تخلیق کی۔

وزیر اعلیٰ اتر پردیش ملائم سنگھ: موسیقی کی دنیا میں ایک منفرد مقام بنانے والے موسیقار نوشاد کو سنگیت کا آٹھواں سُر بھی کہا جاتا ہے ان کی موت سے موسیقی کی دنیا میں جو نقصان ہوا اس کی تلافی ممکن نہیں۔

وزیر اعلیٰ مہاراشٹر ولاس راؤ دیش مکھ: نوشاد صاحب ایک باصلاحیت اور بلند مرتبہ موسیقار تھے انہوں نے اپنی سحر انگیز دھنوں کے ذریعہ ہندوستانی فلم سنگیت کی جو خدمت کی اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا نوشاد صاحب نے حصولِ دولت کے لئے کبھی اصول کا سودا نہیں کیا۔ نوشاد صاحب کا سنگیت سیکولرزم کا بے مثال نمونہ ہے ان کی وفات سے سنہری موسیقی کے دور کا خاتمہ ہوگیا۔

لتا منگیشکر: نوشاد صاحب نے موسیقی کے ذریعہ اپنی فلموں میں بہت سے تجربات کئے انہوں نے چہروں کو صرف موقع ہی نہیں دیا بلکہ ان کا کیریر بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

دلیپ کمار: نوشاد صاحب انڈین فلم میوزک کے مسیحا اور God father تھے ان کے انتقال سے مجھے جو دکھ پہنچا ہے وہ ناقابل بیان ہے انہوں نے کتنے ہی ذرّوں کو آفتاب بنایا جن میں میرا نام بھی شامل ہے نوشاد صاحب کی شکل میں دنیائے موسیقی کے عظیم ترین فنکار لائق احترام شخصیت اور ممتاز شاعر و ادیب کی موت واقع ہوگئی وہ مشرقی تہذیب وتمدن کا بہترین نمونہ تھے ان کی موسیقی ہر اعتبار سے دوسرے موسیقاروں سے منفرد اور لازوال ہے ان کی رحلت سے میں ٹوٹ گیا۔

موسیقار خیام: نوشاد صاحب میرے ہم عصر ہوتے ہوئے بھی مجھ سے Senior تھے ان کی موسیقی نے انڈین فلم میوزک کو نئی جہت اور نیا رخ عطا کیا میں نے اور مجھ جیسے بہت سے موسیقاروں نے نوشاد صاحب کی موسیقی سے علم اور روشنی حاصل کی نوشاد صاحب نے جو دھنیں بنائیں وہ ہماری تہذیبی وراثت کا حصہ ہیں ان کے جیسا فنکار صدیوں میں پیدا ہوتا ہے وہ بلاشبہ Genious اور تاریخ ساز Legendary موسیقار تھے۔

آشا بھونسلے: نوشاد صاحب کے سنگیت کو کوئی نہیں بھول سکتا ان کے گیت سدابہار ہیں وہ سنگیت کے بے تاج بادشاہ تھے نوشاد صاحب مشرقی تہذیب وثقافت کی علامت تھے انہوں نے ہم تمام بہنوں اور دیگر گلوکاروں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی وہ ایک قدآور اور لائق احترام فنکار تھے۔

اسکرپٹ رائٹر و شاعر جاوید اختر: نوشاد صاحب کی موت ہندوستانی فلمی صنعت کا عظیم ترین نقصان ہے وہ انڈسٹری کے معماروں میں تھے مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں ملا جس کا فسوس ہے ایک موسیقار کی حیثیت سے ان کا سب سے بڑا کارنامہ فلمی گیتوں میں ہندوستانی موسیقی کی روح کو ڈالنا تھا نوشاد صاحب نے ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کو سہل اور آسان بنا کر عوام کے سامنے پیش کیا میں ان کے ایک ایک گانے کی خوبیوں پر گھنٹوں تبصرہ کرسکتا ہوں۔ نوشاد' شکیل بدایونی' محمد رفیع اور لتا کے ایسے ایسے گیت منظر عام پر آئے جن کی تعریف ممکن نہیں ان کی موسیقی نغمگی سے بھرپور اور کیف آگیں ہے جب تک دنیا میں موسیقی زندہ رہے گی نوشاد صاحب زندہ رہینگے۔

استاد امجد علی: نوشاد صاحب ایک مکمل موسیقار تھے انھیں مشرقی موسیقی کے ساتھ مغربی موسیقی کی بھی جانکاری تھی انہوں نے لوک گیتوں اور ہندوستانی راگ راگنیوں پر مشتمل جو دھنیں بنائیں وہ بے مثال ہیں فلم انڈسٹری میں وہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب وثقافت کی پہچان تھے میں نے نوشاد صاحب جیسا موسیقار آج تک نہیں دیکھا یہ نوشاد صاحب ہی تھے جن کے سنگیت میں کے ایل سہگل جیسے مایا ناز گلوکار کے علاوہ کلاسیکل سنگیت کے عظیم گلوکار استاد بڑے غلام علی خاں، استاد امیر خاں، اور پنڈت جی ڈی پلسکر نے گیت گائے۔ فکر وفن' نت نئے تجربات اور لافانی دھنوں کی وجہ سے نوشاد صاحب زندہ جاوید رہینگے۔

لیکن آسمانِ موسیقی کا یہ آفتاب ۵رمی ۲۰۰۶ء کو غروب ہوگیا ان کی موت پر آج دنیائے موسیقی افسردہ اور غمگین ہے ایسی ہی شخصیتوں کے بارے میں علامہ سر محمد اقبال نے فرمایا ہے کہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

☆☆☆

فلم سنگیت کا میلوڈی کنگ۔انل بسواس

انیس امروہوی

۷رجولائی ۱۹۱۴ء کو بری سال، جواب بنگلہ دیش میں ہے، کے ایک متوسط خاندان میں انل بسواس کا جنم ہوا۔ان کے والد کا نام جے۔سی۔بسواس تھا۔انل بسواس نے صرف چار برس کی عمر میں ہی اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنا شروع کردیا تھا۔ان کی پہلی استاد ان کی والدہ ہی بنیں اور وہ ایک اچھے طبلہ نواز بن گئے۔جن دنوں انل بسواس اسکول میں تھے،تو گاندھی جی کی سول نافرمانی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا، ایسے وقت میں انل بسواس رِولیوشنری پارٹی کے قریب آئے اور آزادی کی تحریک میں شامل ہوگئے۔اس دوران وہ چار بار جیل بھی گئے۔

اپنے والد جے۔سی۔بسواس کے انتقال کے بعد ۱۹۳۰ء میں صرف سولہ برس کی عمر میں ماں، بھائی اور بہن کی ذمہ داری اُن کے کاندھوں پر آگئی اور انل بسواس کلکتہ آگئے۔شعور کی آنکھیں کھلتے ہی انل بسواس نے موسیقی سے اپنے آپ کو وابستہ پایا اور ساری زندگی اس وابستگی کو قائم رکھا۔ایک بار''میگافون کمپنی'' کے مالک جے۔این۔گھوش نے ان کا گانا سنا اور اپنی کمپنی کے لئے کام دے دیا۔یہاں ان کا کام گیت لکھنا اور موسیقی ترتیب دینا تھا۔اس کمپنی سے ان کو ایک گانے کے صرف پانچ روپے ملا کرتے تھے۔

تھوڑے ہی عرصے کے بعد انل بسواس''رنگ محل تھیٹر'' سے وابستہ ہوگئے اور وہاں انہوں نے اداکاری کے ساتھ گیت گانے اور آرکسٹرا سنبھالنے کا کام بھی کیا۔''رنگ محل تھیٹر'' میں رہتے ہوئے ہی انل بسواس نے موسیقی کے اسرار ورموز سے واقفیت حاصل کی، دادرا،ٹھمری اور خیال جیسے اہم فنون میں مہارت حاصل کی۔''رنگ محل تھیٹر'' میں انھوں نے تین سال تک کام کیا۔اسی دوران''پتی ورتا'' اور''مہانشا'' جیسے بنگالی ناٹکوں میں انھوں نے موسیقی ترتیب دی۔

کلکتہ کے دورانِ قیام انل بسواس کی ملاقات انقلابی شاعر نذرالاسلام سے ہوئی اور تقریباً ایک برس تک انھوں نے نذرالاسلام کے ساتھ کام کیا۔بعد میں ہیرین بوس کے بلانے پر انل بسواس کلکتہ سے بمبئی آگئے۔کیونکہ وہ کلکتہ سے آئے تھے اور وہاں انھوں نے ناٹکوں کے لئے موسیقی ترتیب دینے کا کام کیا تھا، اس لئے بمبئی میں ان کا اچھا استقبال ہوا۔ہندوستانی فلموں میں موسیقی ترتیب دینے کی شروعات انل بسواس نے فلم''بھارت کی بیٹی'' سے کی۔لیکن انھوں نے اس فلم کے بارہ میں سے صرف تین گانوں کی موسیقی بنائی تھی۔

صحیح معنوں میں فلم ''بسنت'' ایسی پہلی فلم تھی جس میں انہوں نے مکمل موسیقی ترتیب دی۔مگر کچھ وجوہات کی بنا پر اس فلم کے ٹائٹل میں ان کا نام نہ دے کر ان کے دوست پنالال گھوش کا نام دیا گیا تھا۔اس کے بعد فلم ''زمیندار'' میں انھوں نے سنگیت دیا جو کافی مقبول ہوا تھا۔

۱۹۳۷ء میں فلمساز وہدایت کار محبوب خان کے لئے انھوں نے پہلی بار موسیقی ترتیب دی اور ۱۹۴۲ء تک انل بسواس ان کے ساتھ کام کرتے رہے۔دونوں نے کئی اچھی فلمیں تیار کیں،جن کے گانے بہت پسند کئے گئے۔

نوجوانی کے دنوں میں انل بسواس انقلابی خیالات کے تھے اور اسکول کے دنوں میں ہی ان کا تعلق بنگال کی انقلابی تحریک ''جگانتر'' سے ہوگیا تھا۔ اس لئے ۱۹۴۳ء میں بامبے ٹاکیز کی فلم ''قسمت'' میں جب انھوں نے موسیقی ترتیب دی تو کوی پردیپ سے ایک انقلابی گانا.....''دور ہٹو اے دنیا والوں ہندوستان ہمارا ہے'' لکھوا کر ریکارڈ کرایا تھا۔تمام ملک میں اس گانے کی دھوم مچ گئی اور تحریک آزادی کے اس دور میں یہ گانا عوام میں بے حد مقبول ہوا تھا اور اسی گانے پر بنگال جرنلسٹ ایسوسی ایشن کی طرف سے انل بسواس کو بہترین موسیقار کا ایوارڈ دیا گیا تھا۔

۱۹۴۲ء سے ہی انل بسواس نے بامبے ٹاکیز میں کام کرنا شروع کردیا تھا۔فلم ''اچھوت کنیا'' میں ان کی ترتیب دی ہوئی موسیقی پر دیویکارانی کا گایا ہوا گیت....''میں بن کی چڑیا بن کے،بن بن ڈولے رے'' اس زمانے میں کافی مقبول ہوا تھا۔انل بسواس نے فلمی سنگیت کی دنیا کو بہت سے نئے گلوکاروں سے متعارف کرایا۔ایک طرف انھوں نے بیگم اختر،راج کماری،زہرہ بائی امبالے والی اور پارول گھوش جیسی آوازوں کو موقع دیا تو دوسری طرف ستارہ دیوی جیسی ماہر رقاصہ سے بھی گانا گوالیا۔طلعت محمود،مکیش اور مینا کپور تو ان کے لئے مثال بن گئے تھے۔ اس کے علاوہ سدھا ملہوترا اور سندھیا مکھرجی جیسی گلوکاراؤں نے بھی انل بسواس کی ہدایت میں ہی اپنی فلمی زندگی کا آغاز کیا۔بہت سے گلوکاروں نے اپنی فلمی سفر کا آغاز انل بسواس کی ہی ہدایت میں کیا۔گلوکار مکیش نے ۱۹۴۶ء میں فلم ''پہلی نظر'' کے گیت.....''دل جلتا ہے تو جلنے دے'' کے ساتھ فلمی دنیا میں قدم رکھا۔ان کے اس گیت میں کندن لعل سہگل کا اثر بہت زیادہ نمایاں تھا۔بعد میں انل بسواس نے انہیں سمجھایا کہ اگر اچھا گلوکار بننا ہے تو کسی کے اثر میں نہ آؤ بلکہ اپنا خود کا انداز اختیار کرو۔اس کے بعد مکیش کا اپنا انداز بنتا چلا گیا۔

طلعت محمود کو انل بسواس نے پہلی بار فلم ''آرزو'' میں گانے کا موقع دیا تھا۔ان کا پہلا ہی گانا....'' اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل جہاں کوئی نہ ہو'' اتنا مقبول ہوا تھا کہ لوگ آج بھی اس گانے کو گنگناتے

ہیں۔ابتداء میں طلعت محمود کی آواز میں ایک خاص قسم کی لرزش تھی جسے وہ شروع میں دبانے کی کوشش کرتے تھے مگر انل بسواس نے کہا کہ تم اس لرزش کو ہی اپنا انداز بناؤ اور اسے دبانے کی کوشش نہ کرو۔تب سے یہ مخصوص لرزش ہی طلعت محمود کی پہچان بن گئی۔

اداکارہ گلوکارہ ثریا نے فلم ''ہماری بات'' میں اپنا پہلا گانا....''بستر بچھا دیا ہے تیرے در کے سامنے'' انل بسواس کے سر بندھتا ہے۔اسی طرح اس دور کی سب سے کامیاب فلم ''قسمت'' کا سنگیت بھی انل بسواس نے ہی تیار کیا تھا۔حالانکہ یہ فلم اس دور میں چلنے والے موضوعات سے ہٹ کر تھی،اس لئے شروع میں تو ڈر تھا کہ فلم چلے گی بھی یا نہیں۔فلم کی ناکامی کا مطلب تھا انل بسواس کے فلمی کیریر کو زبردست جھٹکا لگنا،مگر فلم چلی اور خوب چلی۔کلکتہ کے ایک سنیما ہال میں فلم ''قسمت'' لگاتار تین سال آٹھ ماہ تک چلتی رہی، جو اپنے زمانے کا عالمی ریکارڈ تھا اور اس بے پناہ کامیابی میں بھی انل بسواس کی موسیقی کو بے حد دخل تھا۔

فلمی موسیقی کو لے کر انل بسواس کے اپنے کچھ اصول تھے۔وہ کسی دوسرے کی شرط پر موسیقی تیار کرنے کو تیار نہیں تھے۔چھٹی دھائی کے آخر میں جب فلمی دنیا میں کالے دھن کی زیادتی کی وجہ سے اور سستی مقبولیت حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کے سمجھوتے ہونے شروع ہوگئے تھے،تب انل بسواس کے لئے بمبئ میں ٹِکے رہنا مشکل ہوگیا اور وہ دہلی آگئے۔اس کے بعد انھوں نے بمبئ کی صرف دو ہی فلموں میں موسیقی ترتیب دی۔ایک فلم تھی موتی لعل کی ''چھوٹی چھوٹی باتیں'' اور دوسری گرودت کی فلم ''سوتیلا بھائی''۔ان دونوں فلموں کے لئے انل بسواس کو بہترین موسیقی کے خصوصی انعام سے نوازا گیا۔

انل بسواس کو ایک ملال زندگی بھر رہا، وہ یہ کہ ان کی موسیقی میں کبھی نورجہاں اور کے۔ایل۔سہگل نے گانا نہیں گایا تھا۔ایک بار ایک فلم پر کام شروع ہوا تھا جس میں یہ تینوں ایک ساتھ ہوسکتے تھے۔اس فلم کی ہدایت نورجہاں کے شوہر شوکت حسن رضوی کو کرنی تھی۔مگر اسی دوران نورجہاں اور شوکت حسن رضوی کے درمیان اختلافات ہوگئے اور شوکت پاکستان چلے گئے۔فلم کا کام وہیں رک گیا۔اس کے بعد سہگل کے ساتھ کام کرنے کا موقع انل بسواس کو کبھی نہیں ملا۔

ایک بار انل بسواس روس کے دورے پر تھے۔وہاں انھوں نے مقامی فنکاروں کو دیسی سازوں سے سمفنی بجاتے سنا۔انھوں نے سوچا یہ تجربہ کیوں نہ ہندوستان میں کیا جائے۔اس کے لئے انھیں ایک مضبوط پلیٹ فارم کی ضرورت تھی۔لہٰذا وہ بمبئ چھوڑ کر دہلی آگئے اور آکاش وانی سے وابستہ ہوگئے۔دہلی آکر انھوں نے تقریباً بارہ برسوں تک آکاش وانی میں پروڈیوسر اور چیف پروڈیوسر کے بطور کام کیا

اور یہاں سے ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو تقریباً سمیٹ لیا۔ نئی نسل کی بے تکی اچھل کود اور شور وغل میں وہ اپنے آپ کو فٹ محسوس نہیں کر رہے تھے۔ اس لئے دہلی کی ہی ایک کمپنی میں جنرل منیجر کے بطور خاموشی سے کام کرتے رہے اور اس طرح دہلی کے ہی ہو کر رہ گئے۔

دوردرشن کے پہلے ٹی۔ وی۔ سیریل ''ہم لوگ'' کی موسیقی بھی انل بسواس نے ہی ترتیب دی تھی۔ انل بسواس کی ترتیب دی ہوئی موسیقی میں بانسری کو خاص اہمیت حاصل تھی جو، ان کے لئے پنالال گھوش بجایا کرتے تھے۔ اسی طرح فلمی موسیقی میں سیکسوفون کا استعمال سب سے پہلے انل بسواس نے ہی شروع کیا تھا۔ سیکسوفون ان کے لئے رام سنگھ بجایا کرتے تھے۔ فلمی موسیقی میں آرکیسٹرا کا استعمال بھی سب سے پہلے انل بسواس نے ہی کیا تھا جو بہت کامیاب رہا۔ انھوں نے فلمی موسیقی کو ناٹک اور اسٹیج کی موسیقی کے انداز سے الگ کر کے اپنی پہچان قائم کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہندوستانی راگ راگنیوں کا بھرپور استعمال انل بسواس کی ترتیب دی ہوئی موسیقی میں ملتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ موسیقار اعظم کہے جانے والے نوشاد علی بھی انل بسواس کی دھنوں کے قائل ہیں۔

فلم سنگیت کی دنیا میں میلوڈی کنگ کہلائے جانے والے موسیقار انل بسواس اپنی موسیقی کے ذریعہ الفاظ کو مفہوم دینے کے قائل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ موسیقی سے الفاظ میں روح پھونکی جاسکتی ہے۔

انل بسواس نے دوشادیاں کیں۔ ان کی دونوں بیویوں کا بھی ان کے فلمی کیریئر میں قابل قدر تعاون شامل رہا۔ ان کی پہلی بیوی اداکارہ آشالتا نے انل دا کے ساتھ مل کر کئی یادگار فلمیں بنائیں، جن میں ''لاڈلی، بڑی بہن'' اور ''ہمدرد'' کا نام بطور خاص لیا جاسکتا ہے۔ انل دا کی دوسری بیوی مینا کپور ایک مشہور گلوکارہ رہی ہیں اور انل دا کے لئے ہی انھوں نے گلوکاری سے سنیاس لے لیا تھا۔

آکاش وانی سے ریٹائرمنٹ کے بعد انل بسواس ''دی انڈین ریکارڈ مینوفیکچرنگ کمپنی'' کی دہلی کی شاخ کے منیجر کے بطور کام کر رہے تھے۔ ۸۸/ برس کی عمر میں ۳۰/ مئی ۲۰۰۳ء کو دو ماہ کی لمبی بیماری کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بیٹے اُتپل بھی میوزک ڈائریکٹر ہیں۔ انل دا کے نام سے مشہور بسواس کے خاندان میں ان کی بیوی مینا کپور، دو بیٹے اُتپل اور امیت، اور ایک بیٹی شکھا ہیں۔

☆☆☆

موسیقار۔ سچن دیو برمن

ہریش تیواری

یاد ہے کہ ۵۰ کی دہائی میں ریڈیو پر گانا آتا تھا 'دھیرے سے جانا بگین میں رے بھنورا' گلوکار کی آواز میں شیرینی تھی اور دھن میں دل کی گہرائیوں تک جانے والی کشش۔ یہی تھا گلوکار اور موسیقار سچن دیو برمن کے فن کا وہ سریلا سمندر جس میں ایک بار جو بھی ڈوبا پھر ابھر نہ سکا۔

ہم نے برمن دادا کی جو بھی تصویر دیکھی، جوانی کو الوداع کرتی ہوئی دیکھی مگر جو بھی دھن سنی وہ آج ۶۰۔ ۶۵ سال کی ہونے پر بھی ۱۶ ویں سال جیسی سریلی اور مسحور کر دینے والی لگی۔ پان کی گلوکاری منہ میں دبائے سنجیدہ مزاج برمن دادا کہہ رہے تھے 'بھوئی، ینگ اتیج میں بومبائی نئی آنے کا بوجھا رہا، کہیں ایکٹر نہ بن جاؤ'۔ اپنی بنگلہ ٹائپ ہندی کو آگے نہ بڑھا کر انہوں نے جو کہا اس کا مطلب تھا 'تری پورہ اسٹیٹ کا راج کمار، بادشاہوں جیسے ٹھاٹ باٹ چھوڑ کر باؤل گلوکاروں، فقیروں کے پیچھے بھاگتا پھرتا اور گھنٹوں ان کے گیت سن کر جھومتا رہتا۔ لوگ سنگیت کا سریلا پن اس قدر ننھے سچن کے دل و دماغ پر چھاتا چلا گیا کہ اسی میں رچ بس گئے۔ دوست دو تھے رامائن کا پاٹھ کرنے والا نوکر مادھو اور لوک سنگیت کی کوک گلے میں لیے دوسرا نوکر انور۔ وہ نوکر نہیں، دراصل ان کے گرو تھے۔

انہی دنوں کے ماحول میں وہ حادثہ بھی ذہن میں ابھرتا تھا جس نے موسیقی کے تئیں ان کے یقین کو بہت ہی مضبوط بنا دیا۔ وہ اسکول کے دن تھے، کوملّا سے کہیں دور میلے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہ ٹرین میں بغیر ٹکٹ لیے چڑھ گئے تھے۔ لوٹتے وقت ٹی ٹی کے ذریعہ دبوچ لیے گئے اور سب کے ساتھ برمن دادا بھی ایک اندھیری کوٹھری میں بند کر دیے گئے۔ ڈر کے مارے رونے لگے کہ راجہ کا لڑکا بغیر ٹکٹ پکڑا گیا۔ ان میں ایک طالب علم موہت تھا جس نے روتے ہوئے سچن کو ترکیب سکھائی کہ وہ بھٹیالی کا باول جیسا کچھ گانا سنا دے تو بات بن سکتی ہے۔ بس سچن نے روتے روتے گانا شروع کر دیا تو کشیدگی بھرے ماحول میں سریلی جھنکار چھڑ اٹھی۔ تبھی دروازہ کھلا، اسٹیشن ماسٹر کی

بزرگ والدہ آئیں، سچن کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں پھر کچھ ہی دیر بعد ہاتھوں میں لڈو لیے سب کے سب دوست کھلکھلاتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کی طرف بڑھ رہے تھے۔بس، اس وقت سے مچھلیاں پھنسانے کے لیے جال پھینکتے ہوئے ملاح، دھنیں بنانے والے جوگی، اکتارہ بجانے والے نیم برہنہ فقیروں کی بے پناہ دولت لٹاتے ہوئے دیکھ کر برمن دادا ان کے پیچھے پیچھے لگ گئے اور اپنی جھولی بھرتے گئے۔ پھر معلوم ہوا اس چکر میں جوانی نکل گئی، سر کے بال بھی نکل گئے۔ دانت بھی ہلنے لگے اور وہ ممبئی کی جوانی اور حسن سے لبریز فلمی دنیا کے پھاٹک پر کھڑے ہیں۔موسیقی کے اس ہیرے کو فلمی موسیقی کے کئی جوہریوں نے پہچان لیا لہذا دھڑلے سے برمن دادا فلموں میں چل پڑے۔ پہلی فلم اشوک کمار کی 'آٹھ دن' ملی تبھی ایک ناخوشگوار واقعہ دیکھنے کو ملا۔ چھپ کر دیکھا تو دل کو ٹھیس لگی باورچی تال کے ساتھ روٹیاں بیلتا جاتا تھا اور گاتا جاتا تھا 'انکھیا ملا کے جیا بھرما کے چلے نہیں جانا'۔غصہ تو بہت آیا مگر یہ احساس بھی ہوا کہ موسیقی کی کامیابی اس کے مزاج میں ہے بس 'دو بھائی' فلم میں گیتا دت کے ذریعہ گائے گئے 'میرا سندر سپنا بیت گیا' سے ان کا سریلا سفر شروع ہوا جوان کی آخر سانس یعنی ۱۹۷۵ء تک چلتا رہا۔

فلم 'بازی' (۱۹۵۱ء) کے بعد دیو آنند اور گرو دت کے ساتھ برمن دادا کا جو اتحاد بنا وہ ہندوستانی فلمی موسیقی کا سنہری دور میں بننے والا سب سے سریلا ساتھ تھا۔ دیو آنند کے لیے جہاں انہوں نے 'ٹیکسی ڈرائیور، کالا پانی، سولہواں سال' وغیرہ فلموں کی موسیقی تیار کی، وہیں گرو دت کی کلاسیکل فلموں 'پیاسا' اور 'کاغذ کے پھول' کو اپنی موسیقی سے یادگار بنا دیا۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائی میں سی رام چندر، شنکر جے کشن، او پی نیئر، نوشاد جیسے موسیقار جہاں بھاری بھرکم آرکیسٹرا کو ترجیح دیتے رہے وہاں برمن دادا نے 'جانے کیا تو نے کہی'، 'آجا پنچھی اکیلا ہے' 'سجاتا' اور 'بندنی' جیسی فلموں میں بہت ہی کم سازندوں کے ساتھ ایسی مقبول دھنیں بنائیں جو اس وقت کی ہی نہیں اب بھی اور آگے بھی مقبول رہیں گی۔

گلوکارہ لتا منگیشکر سے کچھ دنوں تک ان کی ان بن رہی مگر بعد میں لتا کو احساس ہوا کہ برمن دادا کی سریلی دھنوں کے ساتھ وہ ناانصافی ہوتی ہوئی نہیں دیکھ سکتیں۔ برمن دادا کی

صحت بھی آڑے آ رہی تھی مگر تبھی فلم 'گائڈ'، 'جویل تھیف'، اور 'ارادھنا' جیسی فلموں کی موسیقی نے ثابت کر دیا کہ برمن دادا کا سریلا اثر فلموں سے ختم نہیں ہو سکتا۔ فلم 'ارادھنا' سے راجیش کھنّہ سپر اسٹار بنے تو کشور کمار نے محمد رفیع جیسے دگجّ گلوکار کو آؤٹ کر دیا۔ مگر برمن دادا کا کہنا تھا 'ہم کو، سوچ کہوں تو گائڈ کا میوزک ہی پوسند ہے'۔

جب نوجوان تھے تو ٹینس کے کھلاڑی تھے۔ گلے پر اثر پڑنے کے ڈر سے بعد میں ٹینس کو چھوڑ دیا مگر کھلاڑیوں کو بلا کر پارٹی دیتے رہتے تھے۔ 'شرمیلی' اور بعد میں 'ابھیمان' ان کی آخری فلمیں تھیں۔ پھر ۱۹۷۵ء میں دادا چلے گئے۔

☆☆☆

موسیقار۔ ماسٹر غلام حیدر

رفعت صدیقی

آج ماسٹر غلام حیدر کے نام سے نئی نسل کی موسیقی کا کوئی شیدائی واقف نہیں ہے لیکن ۱۹۴۸ء میں ان کا تخلیق کیا ہوا، راجہ مہدی علی خاں کا تحریر کردہ اور محمد رفیع، خان مستانہ اور کورس کی آوازوں میں گایا ہوا فلم ''شہید'' (دلیپ کمار، کامنی کوشل) کا یہ گیت ''وطن کی راہ میں وطن کے نوجواں شہید ہو'' اُن دنوں ہر محبّ وطن کے دل کی دھڑکن بن گیا تھا۔

ماسٹر غلام حیدر کا تعلق پنجاب سے تھا۔ پیشہ کے اعتبار سے وہ دندان ساز تھے لیکن موسیقی کا ذوق انہیں بچپن سے تھا۔ چونکہ پہلے زیادہ تر ناٹک ہی اسٹیج کئے جاتے تھے اس وجہ سے غلام حیدر بھی ایک ناٹک کمپنی میں ہارمونیم بجایا کرتے تھے اس طرح انہیں ''ماسٹر جی'' کہا جانے لگا جو بعد میں ان کے نام ہی کا ایک حصہ بن گیا۔ ناٹکوں سے غلام حیدر His master's voice کی جانب آئے اور گیتوں کی دھن بنانے لگے۔ جلد ہی وہ فلموں میں میوزک ڈائریکٹر بن گئے۔ ان کی پہلی فلم ''خزانچی'' تھی جس کے گیتوں نے سارے ملک میں تہلکہ برپا کر دیا تھا۔ فلمی دنیا میں جب انہوں نے قدم رکھا تو اس وقت فلمی موسیقی پر بنگال کے موسیقاروں پنکج ملک، آرسی بورال، کے سی ڈے اور تمیر برن وغیرہ کا راج تھا۔ فلمی موسیقی پر بنگالی رنگ چھایا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ کے ایل سہگل جیسے فنکار جو خود پنجابی تھے۔ اسی رنگ میں ڈھل گئے تھے۔ جب ''خزانچی'' ریلیز ہوئی تو اس کے گیتوں کی پنجابی شگفتگی نے راتوں رات انہیں قبولیت کی معراج پر پہنچا دیا۔ بعد میں کئی برسوں تک یہ حال رہا کہ جب بھی ان کا نام، فلم کے پردے پر آتا تھا تو تھیٹر کا ہال تالیوں سے گونج اٹھتا تھا۔ ''خزانچی'' کی موسیقی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ فلم کے سارے کے سارے ۹ گیت شمشاد بیگم نے گائے تھے جنہیں اس فلم میں غلام حیدر نے ہی متعارف کروایا تھا۔ درحقیقت انہیں صلاحیت پہچاننے کا غیر معمولی ادراک تھا، شمشاد بیگم کے علاوہ انہوں نے نور جہاں نسیم اختر، ایس ڈی باتش اور زینت بیگم جیسے فنکاروں کو متعارف کروایا تھا۔ نور جہاں کی پہلی فلم خاندان (۱۹۴۲ء) کا یہ گیت ''تو کون سی بدلی میں مرے

چاند ہے آجا'' بے حد مقبول ہوا۔ ان کی بنائی ہوئی دھن نہ سریلی اور سیدھی سادھی ہوتی تھی بلکہ ان میں کلاسیکل موسیقی اور لوک گیتوں کا بڑا خوبصورت امتزاج پایا جاتا تھا جیسے یہ گیت۔ ساون کے نظارے ہیں، ہم آنکھ مچولی کھیلیں گے، اک یاد کسی کی یاد رہی، اب تو نہیں دنیا میں کہیں اپنا ٹھکانہ، دل میرا توڑا، ہائے کہیں کا نہ چھوڑا، اک تیرا سہارا، بے درد ترے درد کو سینے سے لگا کے وغیرہ۔

ایک عہد ساز فلمی موسیقار غلام حیدر نے اپنی بیگم امراؤ ضیا سے بھی ایک نعت ''میرا اسلام لے جا، یثرب کو جانے والے'' گوائی تھی جو کافی قبول ہوئی تھی۔ روشن آرا بیگم کو، جو برصغیر کی ایک معروف کلاسیکل موسیقی کی گلوکارہ تھیں اور جنہیں پاکستان منتقل ہونے کے بعد کافی مقبولیت حاصل ہوئی تھی، غلام حیدر نے ہی پہلی بار کے آصف کی فلم ''پھول'' میں گانے کا موقع دیا تھا۔ لتا منگیشکر جیسی فنکارہ آج بھی غلام حیدر کا نام بڑی عقیدت سے لیتی ہیں کیونکہ ایک طرح سے انہوں نے ہی لتا کو ہندی فلموں میں گانے پر مائل کیا تھا۔ غلام حیدر اتنے باصلاحیت موسیقار تھے کہ چلتے پھرتے دن اور رات کسی بھی وقت وہ دھنیں بنا لیتے تھے بقول لتا منگیشکر ہم دونوں ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ٹرین کا انتظار کر رہے تھے کہ اچانک غلام حیدر صاحب نے اپنا ۵۵۵ سگریٹوں کا ٹن بجایا اور ایک دھن گنگنانے لگے پھر اُسے خود گا کر مجھے سنایا اور مجھ سے بھی گوایا۔ یہی دھن فلم مجبور کے لئے لتا کی آواز میں ریکارڈ کروائی گئی اور وہ دھن تھی ''دل میرا توڑا ہائے کہیں کا نہ چھوڑا، تیرے پیار نے'' تقسیم کے بعد غلام حیدر پاکستان چلے گئے۔ وہاں بھی انہوں نے چند فلموں کی موسیقی دی جیسے ''گلنار'' وغیرہ لیکن جلد ہی انتقال ہو گیا اس باصلاحیت اور منفرد اسٹائل کے میوزک ڈائریکٹر نے صرف ۱۹ فلموں میں موسیقی دی لیکن اپنی سریلی اور منفرد دھنوں سے فلمی موسیقی کی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے اپنا مقام محفوظ کرلیا ہے۔

☆☆☆

موسیقار۔ شنکر جے کشن

خورشید اختر فرازی

موسیقار اعظم اور کلاسیک سنگیت کے شہنشاہ اگر نوشاد علی تھے تو میلوڈی کے بادشاہ یقیناً شنکر جے کشن تھے جن کی اسٹار جوڑی نے ۴۰، ۵۰، ۶۰ اور ۷۰ کی دہائیوں میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ اگر ہندی فلموں کے سنہرے دور کی بات کی جائے تو یقیناً شنکر جے کشن کا نام نمایاں حرفوں میں لکھا جائے گا جنھوں نے اپنے مدھر سنگیت کے ذریعہ چالیس برسوں تک لوگوں کا نہ صرف دل بہلایا بلکہ باغ باغ کر دیا تھا۔ اگرچہ اس زمانے میں میلوڈی کے بادشاہوں میں روشن۔ مدن موہن (شہنشاہ غزل) نوشاد علی کلاسک سنگیت کے بادشاہ تھے جن کے سنگیت سے لکھنؤ گھرانے کی بو باس آتی تھی، سلیل چودھری جو کہ مغربی دھنوں کو انڈین کلاسیکل انداز میں ڈھالنے میں ماہر تھے او پی نیّر جنھوں نے مغربی دھنوں کو ایشیا میں پھیلا دیا، جے دیو جو لوک گیت کو سجانے کے ماہر تھے ایس ڈی برمن، جن کے اندر گیتوں کو خوبصورت انداز میں ڈھالنے اور انڈین اور یوروپین دھنوں کو سجانے کی صلاحیت تھی، انہی عظیم موسیقاروں کے درمیان شنکر جے کشن بھی تھے اور انھوں نے جو راہ اپنا لی اس کی وجہ سے وہ ہر پروڈیوسر، ہیرو، ہیروئن اور ڈسٹری بیوٹرس کے چہیتے بن گئے، اگر ان کے درمیان لکشمی کانت پیارے لال اور کلیان جی آنند کا نام نہ لیا جائے تو یقیناً ان دونوں عظیم موسیقاروں کے ساتھ انصافی ہوگی۔ اگرچہ شنکر جے کشن بھی لوک گیت کو تیار کرنے کے فن میں یکتا تھے، مثال کے طور پر ۱۹۶۶ء کی ریلیز ''تیسری قسم'' کا یہ گیت چلتے مسافر لے بھیا اور ۱۹۶۵ء کی ریلیز آرزو کی یہ غزل ''چھلکے تیری آنکھوں سے شراب اور زیادہ'' اس کے علاوہ راک اینڈ رول جیسے گیت ۱۹۶۷ء کی ریلیز ''برہمچاری میں'' آج کل تیرے میرے پیار کے چرچے ہر زباں پر'' اور ۱۹۵۷ء کی ریلیز ''بسنت بہار'' کا یہ گیت ''سر نہ سجا کیا گاؤں مائی'' اپنی جگہ پر بہت خوب ہیں اور شنکر جے کشن کو ہر فن میں یکتا ثابت کرتے ہیں۔

شنکر اور جے کشن نے مل کر ۲۲ ر برسوں کے دوران تقریباً ۲۰۰ فلموں میں سنگیت دیئے اور ان دونوں کی ذہانت کی وجہ سے ہندی فلموں میں ایسے ایسے خوبصورت اور ناقابلِ فراموش گیت سننے کو ملے، جن گیتوں کو سننے کے لئے آج بھی ہمارے کان ترستے ہیں۔ ان دونوں نے مل کر جو ۲۰۰ سے زائد فلموں میں موسیقی دیئے تو کم از کم ۱۶۰ فلمیں ایسی ضرور تھیں جو سلور، گولڈن اور پلاٹینم جبلی ہوئیں جن میں آوارہ، برسات، سنگم، جس دیش میں گنگا بہتی ہے، آئی ملن کی بیلا، شطرنج، کل آج اور کل، آہ، میرا نام جوکر، امن، جھک گیا آسمان، آس کا پنچھی، جب پیار کسی سے ہوتا ہے، میرے حضور، لال پتھر، راج کمار، جانور، لو ان ٹوکیو، کنیا دان، پیار ہی پیار جیسی سپر ہٹ فلموں کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔

۱۹۴۰ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیان شنکر جے کشن واحد موسیقار تھے جنھوں نے ہر بڑے اداکار کی فلموں میں موسیقی دی، جن میں راج کپور، دلیپ کمار، اشوک کمار، بلراج ساہنی، سنیل دت، ششی کپور، شمی کپور، منوج کمار، راجندر کمار، دھرمیندر کے نام قابل ذکر ہیں ۱۹۵۸ء کی ریلیز یہودی (دلیپ کمار، مینا کماری) میں شنکر جے کشن کی میوزک تھی، ۱۹۶۶ء میں راجندر کما، وجنتی مالا کی فلم سورج، ۱۹۵۷ء میں بھارت بھوشن کی فلم بسنت بہار، ۱۹۵۶ء کی ریلیز بلراج ساہنی، نوتن، شوبھا کھوٹے کی فلم ''سیما'' ۱۹۶۶ء کی ریلیز پردیپ کمار، نرگس اور فیروز خان کی ''رات اور دن'' ۱۹۶۱ء میں دیو آنند، سادھنا کی فلم ''اصلی نقلی'' ۱۹۶۲ء کی ریلیز منوج کمار، مالا سنہا کی ''ہریالی اور راستہ'' ۱۹۶۲ء کی ریلیز شمی کپور، کلپنا اور للیتا پوار کی فلم ''پروفیسر'' ۱۹۶۹ء کی ریلیز ششی کپور، آشا پاریکھ، اچلا سچدیو کی فلم ''کنیا دان'' ۱۹۶۴ء کی ریلیز بسواجیت اور سائرہ بانو، جینت کی فلم ''اپریل فول'' ۱۹۶۵ء کی ریلیز جوئے مکھرجی، آشا پاریکھ، پران، محمود کی فلم ''لو ان ٹوکیو'' ۱۹۶۸ء کی ریلیز دھرمیندر، وجنتی مالا کی فلم ''پیار ہی پیار'' ۱۹۶۷ء کی ریلیز راج کمار، مالا سنہا، جتندر کی فلم ''میرے حضور'' اور ۱۹۷۱ء کی ریلیز راج کمار، ہیما مالنی، راکھی، ونود مہرہ کی فلم ''لال پتھر'' جیسی سپر ہٹ فلموں کی موسیقی شنکر جے کشن نے ترتیب دی تھی۔

شنکر جے کشن کی جوڑی کا اصل نام شنکر سنگھ رگھوونشی اور جے کشن دیا بھائی پنچل تھا، شنکر کی پیدائش

۱۵/اکتوبر۱۹۲۲ءکو پنجاب میں ہوئی اور ۱۹۸۹ءکو ان کا انتقال لندن کے ایک اسپتال میں ہوا۔شنکر پہلے اپنے زمانے کے مشہور موسیقار جوڑی حسن لال ۔ بھگت رام کے اسسٹنٹ تھے ۔ بعدازاں وہ آندھرا پردیش کے حیدرآباد میں جا کر رہنے لگے ۔ جے کشن کی پیدائش ۱۹۲۹ء میں گجرات کے قصبہ پنچل میں ہوئی اور ۱۹۷۱ء میں ان کی موت ہوگئی موسیقار بننے سے پہلے جے کشن ایک کارپینٹر (بڑھئی) تھے۔راج کپور نے آر کے بینرس کے پرچم تلے پہلی فلم ۱۹۴۹ء میں برسات بنائی تو ان دونوں کو فلمی دنیا سے بطور موسیقار متعارف کرایا تھا۔اس فلم کے لئے شنکر کو ۷۰۰ روپے اور جے کشن کو ۵۰۰ روپے معاوضہ ملے تھے۔اس فلم کے چند سپر ہٹ گانے جیسے ''جیا بے قرار ہے آئی بہار ہے اور ''برسات میں ہم سے ملے'' حد سے زیادہ مقبول ہوا اور بچے بچے کی زبان پر یہ گیت ازبر ہوگیا۔ برسات ہی وہ فلم تھی جس نے شنکر اور جے کشن کو ایک مضبوط بندھن سے باندھ دیا جو طویل برسوں تک جاری رہا۔ وہ راج کپور کے آر کے بینرس کے پرچم تلے ہر فلم میں شنکر جے کشن کی جوڑی نظر آئی جو برسات ،آوارہ ،آہ ،سنگم ،میرا نام جوکر،شری ۴۲۰ اور کل آج اور کل تک چلی۔

۱۹۵۰ء میں راج کپور کی فلم آہ ،آوارہ اور شری ۴۲۰ میں شنکر جے کشن کے ہٹ گیتوں نے کمال کر دیا تھا۔آوارہ کا یہ گیت ''پیار ہوا اقرار ہوا، پھر پیار سے کیوں ڈرتا ہے دل، اور ''رمیّا وستاویّا رمیّا وستاویّا'' بے حد مشہور ثابت ہوا تھا۔اس کے بعد سنگم میں ''دوست دوست نہ رہا'' ہر دل جو پیار کرے گا، میرے من کی گنگا اور تیرے من کی جمنا کا بول رادھا بول سنگم ہوگا کہ نہیں ۔ اور یہ میرا پریم پتر پڑھ کر'' وغیرہ سپر ہٹ گیت ثابت ہوئے تھے۔

شنکر جے کشن کو کل ملا کر ۹ مرتبہ فلم فیئر ایوارڈز سے نوازا گیا۔ ۱۹۶۵ء کی ریلیز گمنام (منوج ،نندہ، پران ،محمود) میں راک اینڈ رول گیت ''جان پہچان ہو'' بیحد مشہور گیت ثابت ہوا تھا۔ ویسے راج کپور کا کہنا ہے کہ شنکر جے کشن کی اصل صلاحیت کھل کر ''میرا نام جوکر'' میں نظر آئی جس میں چند گیت جیسے ''اے بھائی ذرا دیکھ کے چلو'' جینا یہاں مرنا یہاں اس کے سوا جانا کہاں ، بہت ہی پسند کیا گیا تھا۔ جے کشن جہاں رقص کے گیتوں کو سجانے میں ماہر تھے وہیں شنکر بیک گراؤنڈ موسیقی دینے میں ماہر تھے ۔ ان دونوں نے متعدد فلموں میں

راگ بھیروں کو مختلف انداز میں پیش کرنے کا دعویٰ کیا تھا۔

شنکر جے کشن نے جہاں سب سے زیادہ مکیش کو موقع دیا لیکن محمد رفیع کو بھی بہت ساری فلموں میں لیا اور ایسے ایسے ہٹ گیت تیار کئے جن کی مثال نہیں دی جاسکتی جیسے سسرال ،ہمراہی، آس کا پنچھی ،سنگم، پیار ہی پیار، آرزو، دھرتی، ہمراہی، امن، جھک گیا آسمان جیسی ہٹ فلموں میں محمد رفیع کو لیا،شنکر جے کشن عام طور پر شیلیندر اور حسرت جے پوری کو نغمہ نگار کے طور پر لیتے تھے اور رفیع نے زیادہ تر حسرت کے لکھے گیتوں کو گایا جب کہ مکیش نے ہمیشہ ہی شیلندر کو فوقیت دی ،فلم آئی ملن کی بیلا میں شنکر جے کشن کے سنگیت کو محمد رفیع نے اپنی آواز کے سحر میں گم کر دیا تھا۔فلم آرزو میں ہی شنکر جے کشن کی سنگیت اور محمد رفیع کے گیت جیسے اے نرگس مستانہ،بس اتنی شکایت ہے اور چھلکے تیری آنکھوں سے شراب اور زیادہ وغیرہ آج بھی کانوں کو رس گھولتے نظر آتے ہیں۔ جہاں شنکر جے کشن کو ۹ مرتبہ فلم فیئر ایوارڈز سے نوازا گیا وہیں رفیع صاحب کو ۸ مرتبہ فلم فیئر ایوارڈز ملے۔

رفیع اور لتا کی جوڑی کو سب سے زیادہ نوشاد کے بعد شنکر جے کشن نے موقع دیا اس مشہور موسیقاروں کی جوڑی نے سب سے زیادہ رفیع اور لتا کے ڈوئیٹ گانوں کو ترجیح دی ،شنکر جے کشن کے مشہور گیتوں میں سجن رے جھوٹ مت بولو خدا کے پاس جانا ہے، دل میرا ایک آس کا پنچھی ، دل ایک مندر ہے، یہ رات بھیگی بھیگی یہ مست ہوائیں، مڑ مڑ کے نہ دیکھ مڑ مڑ کے، اور گلوکارہ شاردا کے ساتھ فلم سورج میں تتلی اڑی ،فلم داغ (۱۹۵۵ء) میں دلیپ کے ساتھ یہ گیت ''کوئی نہیں میرا اس دنیا میں'' اور ۱۹۷۱ء میں کشور کمار کے ساتھ انداز میں یہ گیت زندگی ایک سفر ہے سہانہ'' ان کی انفرادیت کو بلند کرتا نظر آتا ہے۔

☆☆☆

دنیائے موسیقی کا معتبر نام۔خیام

گزشتہ دنوں ۵۵ ویں فلم فیئر ایوارڈ تقریب میں مشہور و معروف موسیقار خیام کو آشا بھونسلے کے ہاتھوں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔اس سے پہلے اتر پردیش حکومت نے انہیں مرحوم موسیقار نوشاد علی اسمرتی ایوارڈ سے سرفراز کیا تھا۔خیام بالی ووڈ کے ایسے موسیقار ہیں جنہوں نے کم فلموں میں موسیقی دی ہے،مگر ان کے گیت اور دھنیں لافانی ہیں۔ان کے گیت روزانہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر کسی نہ کسی شکل میں سنائے اور دکھائے جاتے ہیں۔آج سے ۶۰ سال پہلے ان کی موسیقی فلم کے پردے پر سنائی دی تھی۔

خیام کا پورا نام محمود ظہور خیام ہاشمی ہے۔ان کی پیدائش ۱۸ فروری ۱۹۲۷ء کو پنجاب کے جالندھر ضلع کے نواب شہر میں ہوئی تھی۔ان کا پورا کنبہ بیحد مہذب اور تعلیم یافتہ تھا۔چار بھائی اور ایک بہن،سب سے بڑے بھائی امین گھر کا ٹرانسپورٹ بزنس دیکھتے تھے،دوسرے بھائی مشتاق جنرل مینجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے،تیسرے بھائی گلزار ہاشمی شاعری کرتے تھے،لیکن چھوٹی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔خیام اپنے والد کے چوتھے بیٹے تھے جو موسیقی کے شوق کی وجہ سے پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کر کے گھر سے بھاگ گئے تھے۔موسیقی اور اداکاری کے شوق کی وجہ سے گھر والے ان سے اتنا ناراض تھے کہ انہیں گھر سے بھاگنا پڑا۔

صرف خیام کے ماموجان کو گیت وسنگیت سے لگاؤ تھا،انہوں نے ہی ممبئی میں خیام کو بابا چشتی سے ملوایا،جو بی آر چوپڑہ کی فلم 'یہ ہے زندگی' کی موسیقی تیار کر رہے تھے۔بابا نے انہیں اپنا اسسٹنٹ تو بنا لیا مگر کہا کہ پیسہ ویسہ کچھ نہیں ملے گا۔

فلم کے سیٹ پر خیام اور چوپڑہ صاحب صحیح وقت پر پہنچتے تھے۔باقی لوگ دیر سے آتے تھے۔جب مہینے کے آخری دن سب کو تنخواہ دی گئی تو صرف خیام خالی ہاتھ رہے۔یہ دیکھ کر چوپڑہ صاحب نے بابا سے پوچھا'' انہیں پیسے کیوں نہیں دیے؟'' جواب ملا'' ٹریننگ پریڈ میں یہ مفت میں کام کر رہے ہیں''۔چوپڑہ صاحب کو یہ بات پسند نہیں آئی،انہوں نے فوراً اکاؤنٹنٹ سے ۱۰۰ روپے خیام کو دلائے۔اپنی ہتھیلی پر اتنے روپے دیکھ کر خیام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔چوپڑہ صاحب کی اس مہربانی کو انہوں نے ہمیشہ یاد رکھا۔

بابا چشتی نے خیام کو اسسٹنٹ تو بنا لیا تھا مگر صرف کھانا پینا اور کھولی کا کرایہ ادا کرتے تھے۔خیام دوستوں کے ساتھ جب کبھی کسی ریستوران یا ہوٹل میں جاتے تو ان کی جیب خالی رہتی تھی،ہر بار بل دوست

ادا کرتے تھے،یہ ان کے جیسے خوددار شخص کو ناگوار گزرتا تھا۔ایک بار بڑے بھائی سے پیسے مانگنے گئے،بھائی نے پوچھا'' کام کرتے ہو تو کتنا ملتا ہے؟ خیام نے جیسے ہی کہا کہ مفت میں کام کرتے ہیں،ویسے ہی بھائی نے تڑاتڑ چانٹے جڑ دیے اور کہا کہ مفت کے نوکر کو پھوٹی کوڑی نہیں دیں گے۔

بڑے بھائی کے سخت رویے سے افسردہ ہو کر انہوں نے فوج میں بھرتی ہونے کا ذہن بنایا۔اخبار میں اشتہار پڑھا کہ ٹریننگ کے بعد نوجوان سپاہیوں کو دلکش تنخواہ ملے گی۔دو سال تک خیام نے سپاہی کی نوکری کی،کافی پیسہ جمع کیا،پھر موسیقی کا شوق ممبئی کھینچ لایا۔

فلم اور ٹیلی ویژن انڈسٹری کے ڈائریکٹر پنکج راگ اپنی کتاب 'دھنوں کی مایا' میں خیام کی موسیقی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ 'موسیقی میں سکون کی بات ہو تو خیام یاد آتے ہیں۔بھاگ دوڑ،پریشانی،شور شرابے کے درمیان بھی خیام کی موسیقی ایک پرسکون،خوشنما مہک کی آغوش میں لے لیتی ہے''۔خیام کی اپنی ایک خاص طرز رہی ہے،روایتی طرز موسیقی سے الگ اپنی دھن کے مالک نظر آتے ہیں۔خیام کو اداکاری کا بھی شوق رہا ہے۔موسیقار حسن لال کی مدد سے انہوں نے فلم 'رومیو اینڈ جولیٹ' میں اداکاری کی تھی۔گلوکارہ زہرہ بائی امبالے والی کے ساتھ ایک مشترکہ گیت گانے کا موقع بھی دیا تھا۔''دونوں جہاں تیری دنیا سے ہار کے.....'' کچھ فلموں میں خیام نے شرما جی کے نام سے موسیقی دی تھی،مگر یہ معلوم نہیں ہو پایا کہ انہیں دوسرا نام رکھنے کی ضرورت پیش کیوں آئی؟

بھلے ہی مین اسٹریم کے سنیما،گیت سنگیت میں خیام آج شامل نہ ہوں،پھر بھی وہ اپنی سطح پر سرگرم ہیں۔دو سال پہلے انہوں نے فلم 'میں پھر آؤں گا' کی موسیقی تیار کی تھی۔یہ فلم ڈاکٹر کرشنا کانت پانڈریا کے ناول پر مبنی تھی،اس کے پانچ گیتوں کو الکا یاگنک،سندھی چوہان اور کویتا کرشنا مورتی نے گایا تھا،منشی پریم چند کی کہانی 'بازارِ حسن' پر مبنی فلم '۱۹۱۸ء اے لو اسٹوری' خیام کی پسندیدہ فلم ہے۔اس فلم میں ایک داروغہ کی بیٹی حالات سے مجبور ہو کر ناچ گانے کے دھندے میں آ جاتی ہے،اس فلم میں موسیقی دے کر ایک طرح سے انہوں نے منشی پریم چند کو خراج عقیدت پیش کی تھی۔آج کل کی موسیقی کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ ''شوئے بدتمیزی''۔

(بشکریہ۔امنگ۔نوئیڈ)

☆☆☆

موسیقار گلوکار ۔ پنکج ملک

انیس امروہوی

موسیقار و گلوکار پنکج ملک کا جنم ۱۰ر مئی ۱۹۰۵ء کو کلکتہ کے ایک متوسط بنگالی خاندان میں ہوا تھا۔ ان کے خاندان میں حالانکہ موسیقی کی کوئی ایسی خاص روایت نہیں تھی مگر ان کے والد من موہن ملک صاحب کو روایتی موسیقی کا بہت شوق تھا اور وہ مذہبی رسومات کی ادائیگی کے وقت بہت سے سازندوں اور بھجن وغیرہ گانے والوں کو بلایا کرتے تھے۔ لہٰذا پنکج ملک کو موسیقی سے دلچسپی کم عمری میں ہی ہوگئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے کالج کی تعلیم درمیان میں ہی چھوڑ کر موسیقی کی طرف دھیان دینا شروع کر دیا۔ ابتداء میں ہی انہوں نے درگا داس بنرجی اور دِنیندر ناتھ ٹیگور سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔

پنکج ملک کی یہ خوش قسمتی ہی تھی کہ جلد ہی ان کا تعلق عالمی شہرت یافتہ شاعر و موسیقار و مصنف اور نوبل انعام یافتہ رابندر ناتھ ٹیگور کے خاندان سے ہوگیا۔ جس کی وجہ سے ٹیگور کے اثرات ان کی زندگی اور موسیقی دونوں پر یکساں طور پر پڑے۔

۱۹۲۷ء میں جبکہ پنکج ملک کی عمر ۲۲ر برس کی تھی، انہوں نے ایک موسیقار کے طور پر انڈین براڈ کاسٹنگ کمپنی میں ملازمت حاصل کرلی۔ ۱۹۲۹ء میں پنکج ملک نے ایک گلوکار کے طور پر کلکتہ میں ریڈیو کے لئے آڈیشن دیا تھا اور آر۔سی۔ بورال اس وقت کلکتہ ریڈیو اسٹیشن پر پروگرام ڈائیریکٹر تھے۔

پنکج ملک نے اس زمانے میں فلموں سے ناطہ جوڑا جب ہندوستانی سنیما اپنی بے زبانی سے آواز موسیقی اور مکالموں کی طرف سفر شروع کر رہا تھا..... یہ وہ دور تھا جب میوزک ریکارڈنگ کی تکنیک ابھی اپنے شروعاتی دور میں تھی۔

۱۹۳۵ء تک کلکتہ کے نیوتھیئٹر کی بنیادیں کافی گہرائی تک پیوست ہوچکی تھیں۔ ایک صبح نتن بوس موسیقار و گلوکار پنکج ملک کو اپنے ساتھ اسٹوڈیو لے جانے کے لئے ان کے گھر پہنچے۔ پنکج ملک باتھ روم میں تھے۔ اس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر کا رواج شروع ہو چکا تھا۔ اور دور کہیں سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ اِدھر باتھ روم میں پنکج ملک اس گانے کے ساتھ سُر ملا رہے تھے۔ جس طرح نیوٹن کے ذہن میں پیڑ سے

زمین پر سیب کے گرتے ہی زمین کی قوتِ کشش کا خیال بجلی کی طرح کوندا تھا، اُسی طرح نتن بوس کے دل میں پلے بیک کا خیال اچانک آگیا۔ نتن بوس اس زمانے میں بنگالی فلم ''بھاگیہ چکر'' بنا رہے تھے اور اس فلم کے ہندی ورژن کا نام ''دھوپ چھاؤں'' تھا۔ پلے بیک کی تکنیک میں جو پہلا گانا ریکارڈ کیا گیا، آر۔سی۔ بورال (رائے چند بورال) کی موسیقی میں پارول گھوش اور پہاڑی سانیال کی آوازوں میں تھا اور اس کے بول تھے.... ''میری پریم کی نیّا چلی جل میں.....''

پنکج ملک نے سب سے پہلے کلکتہ کے نیوتھیئٹر میں کے۔سی۔ ڈے اور سہگل جیسے فنکاروں کو ٹریننگ دینے اور ان کو ٹھیک ڈھنگ سے کام لینے کے لئے ملازمت شروع کی۔ میوزک ڈائریکٹر کے طور پر ان کو سب سے پہلے ۱۹۳۳ء میں فلم ''یہودی کی لڑکی'' سے کام ملنا شروع ہوا۔ نیوتھیئٹر میں رہ کر انکو آر۔سی۔ بورال جیسے لوگوں کا ساتھ ملا۔ اس کے بعد آر۔سی۔ بورال کے ساتھ ہی پی۔سی۔ بروا کی لازوال فلم ''دیوادس'' (۱۹۳۵ء) میں بھی کام کرنے کا موقع ملا، جہاں سہگل نے.... ''دکھ کے دن اب بیتت ناہی....'' جیسے گیتوں کی تخلیق کی۔ اس کے علاوہ ''مایا'' اور ''گرہ داہ'' (۱۹۳۶ء)، ہیم چندر کی فلم ''کروڑ پتی'' (۱۹۳۶ء) اور نتن بوس کی ۱۹۳۷ء میں ریلیز ہوئی فلم ''پریسیڈینٹ'' قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد آزادانہ طور پر پنکج ملک نے ۱۹۳۷ء میں فلم ''مکتی'' کے نغمے اپنی موسیقی سے سجائے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کلکتہ کے نیوتھیئٹر میں سہگل کے داخلے سے سب سے زیادہ نقصان گلوکار اور موسیقار پنکج ملک کو ہی ہوا تھا۔ پنکج ملک بنیادی طور پر بنگال کے گلوکار تھے اور ان کا ہندی/ اردو کا تلفظ بھی بہت زیادہ عمدہ نہیں تھا۔ سہگل اور پنکج ملک کی آواز کا فرق فلم ''دھرتی ماتا'' (۱۹۳۸ء) کے نغمے.... ''دنیا رنگ رنگیلی بابا....'' میں آسانی سے پہچانا جاسکتا ہے۔ پنکج ملک اور اوما ششی کے بعد جب اس گیت میں سہگل کی آواز ابھرتی ہے.... ''دکھ کی ندیا جیون نیا، آشا کے پتوار لگے....'' تو سارے ماحول میں ایک متاثر کن گونج سی پیدا ہوجاتی ہے۔ اپنی آواز میں ایسی میٹھی گونج پیدا کرنے کے لئے سہگل آفاقی گلوکار کے طور پر یاد کئے جاتے ہیں۔ یہ بات پنکج ملک کی آواز میں کبھی پیدا نہ ہوسکی۔ جس کا نقصان ان کو اُٹھانا پڑا۔

پنکج ملک نے موسیقار گلوکار کے طور پر اپنی پہچان بنانے کے بعد اداکاری کی طرف بھی رخ کیا اور فنی مدار کی فلم ''کپال کنڈلا'' میں ایک بوڑھے گلوکار کا رول ادا کیا اور ایک ناقابل فراموش گانا.... ''پیا ملن کو جانا....'' بھی گایا۔ اس کے بعد دیوکی بوس کی فلم ''نرتکی'' اور بروا کی فلم ''زندگی'' میں بھی اداکاری کی۔ ۱۹۴۱ء

میں پنکج ملک نے نیوتھیٹر کی فلم ''ڈاکٹر'' میں موسیقی ترتیب دینے کے ساتھ فلم کے ایسے ہیرو کا رول بھی ادا کیا جو ایک گلوکار اسٹار ہے۔ یہ فلم پورے ملک میں کامیاب ہوئی اور اس فلم کے گانے بھی مقبول ہوئے۔

۱۹۳۷ء میں نیوتھیئٹر کی ایک فلم کے لئے پنکج ملک موسیقی ترتیب دے رہے تھے۔ اس فلم کے ہدایتکار پی۔سی۔ بروا تھے۔ پنکج ملک ٹیگور کے پاس ان کی ایک نظم ''دِنیر شیشے'' کو اس فلم کے لئے ریکارڈ کرانے کی اجازت لینے کے لئے گئے۔ ٹیگور نے بخوشی اجازت دے دی اور نہ صرف یہ بلکہ ٹیگور نے فلم کی کہانی میں بھی دلچسپی دکھائی اور فلم کے ٹائٹل کے لئے ''مکتی'' نام کی تجویز پیش کی۔ ٹیگور نے اپنی مزید دو نظموں کو فلم کے لئے پیش کیا اور ان میں موسیقی کی باریکیوں کو خیال میں رکھتے ہوئے نظم ''دِنیر شیشے'' کے کئی الفاظ بھی تبدیل کئے۔ ''مکتی'' فلم سے پہلے بنگال میں بھی رابندر سنگیت زیادہ مقبول نہیں تھا۔ فلم ''مکتی'' کے بعد ہی رابندر سنگیت کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ پنکج ملک خود ریڈیو پر رابندر سنگیت پر پابندی سے تقریر کیا کرتے تھے۔ اس میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ پنکج ملک کی ریاضت کے بغیر رابندر سنگیت اتنا زیادہ مقبول عام نہیں ہوسکتا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران کئی نئے لوگ فلم انڈسٹری سے جڑے اور پرانی طرز کا اسٹوڈیو سسٹم ختم ہونے لگا۔ تب کئی جانے مانے فنکار، ہدایتکار اور تکنیکی لوگ کلکتہ سے بمبئی آ گئے۔ نیوتھیئٹر بھی بمبئی آ گیا، مگر پنکج ملک نے کلکتہ نہیں چھوڑا۔ انہوں نے ۱۹۴۴ء میں فلم ''میری بہن'' کی موسیقی تیار کی جو بے حد مقبول ہوئی۔ اس فلم کے لئے ہیرو کے طور پر کے۔ ایل۔ سہگل بطور خاص بمبئی سے کلکتہ گئے تھے۔ اس فلم کے تقریباً تمام نغمے مقبول ہوئے تھے۔ نیوتھیئٹر کے لئے کے۔ ایل۔ سہگل کی یہ آخری فلم تھی۔

نیوتھیئٹر کی فلم ''مکتی'' سے پنکج ملک نے رابندر سنگیت کو فلمی موسیقی سے ہمکنار کیا۔ اس کے بعد جب بھی انہیں موقع ملا، تو انہوں نے فلمی نغموں میں رابندر ناتھ سنگیت کا خوبصورتی سے استعمال کیا۔ پنکج ملک کی کوششوں اور کامیابیوں سے ہی متاثر ہوکر دوسرے موسیقاروں کو بھی رابندر سنگیت استعمال کرنے کا حوصلہ ملا، اور آج بھی یہ چلن موجود ہے۔

پنکج ملک خود کہا کرتے تھے کہ....''رابندر سنگیت میری زندگی ہے اور اِسی میں میری نجات ہے۔ یہ صرف سنگیت ہی نہیں، بلکہ میرے لئے اس سے بھی کہیں زیادہ کچھ اور ہے۔ یہ سنگیت مجھے اس دنیا سے کہیں دور، بہت دور، چاند، سورج اور ستاروں سے بھی آگے لے جاتا ہے، جہاں رنگ برنگی روشنی کی

لکیریں گہرے اندھیرے کو روشن کرتی ہیں۔''

پنکج ملک کی زندگی کا اصل مقصد عظیم گلوکار بننے کا نہیں تھا، بلکہ اُن کا حسین خواب تھا رابندر سنگیت کی گہرائی میں ڈوبنا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس زندگی کے بعد بھی وہ اسی گہرائی میں ڈوبے رہیں۔ پنکج ملک کے گائے ہوئے نغمے ہندوستانی موسیقی کی انمول وراثت ہیں اور پنکج ملک کی موسیقی نے ان نغموں کو انمول بنا دیا ہے۔ حالانکہ پنکج ملک کے تعاون کے بغیر بھی رابندر ناتھ ٹیگور، کندن لعل سہگل اور کانن دیوی کا رتبہ بہت اونچا ہوتا ہے مگر پنکج ملک کی موسیقی نے انہیں اور زیادہ بلند درجے پر پہنچا دیا ہے۔

پنکج ملک ایسے پہلے موسیقار تھے جنہوں نے رابندر سنگیت کی خصوصیات اور اُن مختلف جہتوں کو پہچانا جن کی فلموں کے سنگیت کو اُن کے شروعاتی دنوں میں زیادہ ضرورت تھی۔ جن دنوں خاموش فلموں کو آواز ملی، تو ایسی موسیقی کی ضرورت تھی جس میں ایک نئے ہندوستان کی جھلک بھی شامل ہو۔ ٹیگور کے گیتوں میں پنکج ملک کو یہ خوبی نظر آئی۔ رابندر سنگیت، ہندوستانی کلاسیکل موسیقی، لوک سنگیت اور کچھ مغربی موسیقی کو ملا کر پنکج ملک نے اپنی الگ ہی پہچان بنائی۔ ۱۹۲۹ء میں مشہور فلم نمائش کار ہرین گھوش نے جب خاموش فلموں ''چور کانٹا'' اور ''چابار موئے'' کے ساتھ آرکسٹرا کا انتظام کرنے کے لئے پنکج ملک کو مدعو کیا، تو پنکج ملک نے رابندر سنگیت کا استعمال ان فلموں کی پس منظر موسیقی کے لئے کیا تھا۔ اس زمانے میں پنکج ملک کا رابندر سنگیت کی مقبولیت میں چار چاند لگانے کے لئے یہ ایک تاریخی قدم تھا، جسے اس وقت بہت کم لوگوں نے سمجھا تھا۔

ایک اور تاریخی کام، جو پنکج ملک نے کیا، وہ یہ تھا کہ انہوں نے پہلی بار رابندر سنگیت کو بنگالی سے ہندی میں ترجمہ کیا، اور اس طرح کیا کہ بنگالی سے ہندی ترجمہ کرتے وقت اس کی اصل روح، احساس، مٹھاس اور تال اور لے کو بھی ملحوظ رکھا۔ پنکج ملک کو اس خاص کام میں بھی بھرپور کامیابی ملی، اور اس کا اثر بمبئی کی فلمی دنیا پر بھی گہرا ہوا۔ شروع کے دنوں میں انل بسواس، سچن دیو برمن اور ہیمنت کمار اور پھر ان کے بعد کی نئی نسل میں راہل دیو برمن اور پپّی لہری نے بھی اُسی طرز پر رابندر سنگیت کا استعمال کیا۔ نہ صرف یہ بلکہ نوشاد، رِوندر جین اور راجیش روشن جیسے غیر بنگالی موسیقاروں نے بھی ٹیگور کی میلوڈی کا ہندی فلموں میں بھرپور استعمال کیا۔ کچھ موسیقاروں نے رابندر سنگیت کو اپنی ضرورت کے مطابق ڈھالا بھی اور کچھ نے اصل رابندر سنگیت کو ہی مزید آگے بڑھایا۔

پنکج ملک نے ہندی فلموں کے لئے گیت ضرور اپنی موسیقی سے ترتیب دئے، مگر ان کا خاص دھیان

ٹیگور کے گیتوں پر تھا۔ حالانکہ شانتی نکیتن سے اُن کا دور کا بھی واسطہ کبھی نہ رہا، پھر بھی ان کی ترجیحات میں رابندر سنگیت ہی رہا۔ وہ کلاسیکل موسیقی کے استاد تھے، مگر قطعی طور پر دقیانوسی نہیں تھے۔

پنکج ملک نے رابندر سنگیت کے جو ہندی تراجم کئے، وہ بہت کم ریکارڈ کئے گئے۔ ان میں سے زیادہ تر گیت انہوں نے اسٹیج پر یا پھر ریکارڈ پر گائے۔ ۱۹۶۴ء میں انہوں نے بمبئی میں رابندر سنگیت کا ایک خاص شو اسٹیج کیا تھا، جس کو کچھ لوگوں نے ریکارڈ کرلیا تھا اور بعد میں اسی ریکارڈنگ کو ڈجیٹل تکنیک سے دوبارہ ریکارڈ کر کے موسیقی کے شائقین کے لئے البم کی صورت میں پیش کیا۔ مشہور گلوکار منا ڈے نے بھی رابندر سنگیت پنکج ملک سے ہی سیکھا تھا اور وہ ان کو اپنا چاچا مانتے تھے۔ پنکج ملک میوزیکل ریسرچ فاؤنڈیشن نے ۱۹۶۴ء میں بمبئی میں ہوئے۔ اس پروگرام میں گائے ہوئے پنکج ملک کے گیتوں کا البم دو کسیٹ میں بنایا اور اس البم کا نام ''پنکج ملک لائیو ان کنسرٹ'' رکھا گیا۔

پنکج ملک نے رابندر سنگیت کے نہ صرف گلوکار کے طور پر بلکہ اس کو نئی نسل تک پہنچانے والے ایک استاد کے بطور بھی کافی مقبولیت حاصل کی۔ فلم، ریڈیو اور گراموفون جیسے جدید میڈیا کو استعمال کرتے ہوئے پنکج ملک نے رابندر سنگیت کا کافی پرچار کیا اور اسی کے لئے اپنی زندگی وقف کردی۔ ۱۹۷۸ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو ایک روزنامہ اخبار نے ان کے حوالے سے لکھا کہ......... ''آج ٹیگور کی دوبارہ موت ہوگئی ہے۔'' یہ الفاظ پنکج ملک کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے سب پر بھاری تھے۔

پنکج ملک نے موسیقی کے موضوع پر تقریباً چار کتابیں بھی تصنیف کی ہیں جن میں صحیح معنوں میں موسیقی کے راگوں کی تصویریں پیش کی گئی ہیں اور ہندوستانی کلاسیکل میوزک کے بارے میں تفصیلات درج کی ہیں۔

پنکج ملک نے تقریباً پانچ ہزار دھنیں ترتیب دیں۔ پنکج ملک کو ان کی زندگی میں ہی کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ سب سے پہلے ان کو ۱۹۴۵ء میں بنگالی فلم ''دوئی پروش'' کے لئے بہترین میوزک ڈائیریکٹر کا اعزاز ملا۔ ۱۹۵۶ء میں ''سنگیت رتنا کر'' کے اعزاز سے ان کو نوازا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں حکومت ہندی کی طرف سے ان کو ''پدم شری'' کا اعزاز عطا کیا گیا۔ ۱۹۷۵ء میں ''رابندر ٹیگور آچاریہ'' کے اعزاز سے نوازا گیا۔ ۱۹۷۲ء کا ''دادا صاحب پھالکے ایوارڈ''، پنکج ملک کو ۱۹۷۳ء میں دیا گیا جو فلمی دنیا کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔

۷۳ برس کی عمر میں ۱۹۷۸ء میں ان کا انتقال کلکتہ میں ہوا۔

☆☆☆

موسیقار۔ راہل دیو برمن

۱۹۵۶ء کے بعد کی بات ہوگی جب پیڈر روڈ پر واقع پر بھوکنج میں اکثر آشا بھوسلے سے ملاقات کرنے جانا ہوتا تھا تب اکثر بالکنی میں جھولتے ہندولے میں چائے کا کپ لیے راہل دیو برمن بیٹھے ہوئے نظر آجاتے تھے۔ بلند آواز میں اس وقت آشا بھوسلے کہتی تھیں صبح صبح یہ پنچم آجاتا ہے۔ اب سارے بچے اس کے ساتھ گھر میں دھماکہ کریں گے۔ میں ان دنوں آشا بھوسلے پر مضمون لکھ رہا تھا جس کا عنوان 'کوکن کنتھی کی کرون کتھا' تھا۔ جب وہ مضمون شائع ہوا تو ایک ریکارڈنگ میں راہل سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پرجوش طریقہ سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولے ''آشا جی کے بارے میں بہت اچھا لکھا۔' پہلی بار دیدی کے بجائے آشا جی جیسا ان کا مخاطب کرنا دال میں کچھ کالا جیسا لگا تو بعد میں اپنے آپ سفید ہوگیا، جب دونوں نے شادی کرلی۔

اس جوڑی کی بے حد سریلی کرامات نے پورے ملک کے سامعین کو مسحور کردیا جب فلم 'ہرے راما ہرے کرشنا' کے گیت 'دم مارو دم'... سے پورا ملک گونج اٹھا۔ یہ گیت غیر ملکی پاپ سنگیت اور ہندوستانی سروں میں ڈھلا ہوا ایسا سریلا اور نایاب تجربہ تھا جو راہل دیو برمن کی طرز موسیقی اور آشا بھوسلے کی نشیلی آواز کو نئی بلندیوں کے ساتھ نئی توسیع دیا تھا۔ ساتھ ہی موجودہ فلمی موسیقی کی دھارا کو نئی طرز پر اتارنا تھا مگر اسی سال یعنی ۱۹۷۱ء میں راہل نے لتا منگیشکر کے سروں کو ایک اور جادو بھری دھن میں ڈھال کر سامعین کو حیران کردیا۔ وہ گیت تھا 'رینا بیتی جائے، شیام نہ آئے'...۔

ایسا چمتکار راہل نے دس سال پہلے یعنی ۱۹۶۱ء میں بھی کر کے دکھایا تھا۔ جب انہوں نے اپنی پہلی فلم 'چھوٹے نواب' میں لتا سے 'گھر آجا گھِر آئے...' جیسا لاجواب گیت گوایا تھا۔ بعد میں لتا اور راہل کے والد سچن دیو برمن میں کھٹ پٹ ہوگئی تو راہل لتا کو منانے کے بہانے آشا کے یہاں آنے لگے کیونکہ دونوں بہنیں مشترکہ کنبہ کے ماتحت اپنے اپنے وسیع فلیٹ میں آس پاس

رہتی تھیں، وہیں لتا کا انتظار کرتے کرتے...خیر یہ کہانی پھر کبھی۔

راہل دیو کا پنچم نام اس لیے پڑا کیونکہ جب وہ روتے تھے تو پانچویں ہفتے تک جا پہنچتے تھے۔تھوڑے بڑے ہوئے تو اپنے والد کے اسسٹنٹ بن گئے۔ پھر مزاحیہ اداکار محمود سے دوستی ہوگئی۔ان دنوں محمود کہتے تھے' بھائی! پنچم کو پکچر دینا اس لیے بھی ضروری ہوگیا کہ اس نے دھنیں سنا سنا کر میری ناک میں دم کر دیا۔ کارکا دروازہ نہ ہوا ڈرم ہوگیا جسے وہ مار مار کر بری طرح پچکا دیتا تھا۔ پھر میں بھی جانتا تھا وہ ایرا غیرا نہیں ایس ڈی برمن کا بیٹا ہے'۔لیکن 'چھوٹے نواب' کے بعد بھی پنچم کو کہیں کام نہیں ملا اور وہ اپنے والد کے ساتھ ہی کام کرتے رہے۔تب یہ بات بھی پھیلی کہ راجیش کھنہ کی پہلی ہٹ فلم' آرادھنا' کے ہٹ گیت' میرے سپنوں کی رانی کب آئے گی تو...' کی دھن پنچم نے بنائی ہے۔

پانچ سال بعد مزاحیہ اداکار محمود نے جب فلم' بھوت بنگلہ' ان کے حوالہ کی تو وہاں بھی پنچم' اسسٹنٹ میوزک ڈائریکٹر' بنے رہے۔لیکن ۱۹۶۷ء میں جب فلم' پڑوسن' میں پھر محمود نے انہیں موسیقی کی ذمہ داری دی تو' میرے سامنے والی کھڑکی میں ایک چاند سا ٹکڑا رہتا ہے...' گیت کو عوام نے سرآنکھوں پر بیٹھایا۔فلم' پڑوسن' کے گیت' ایک چتر نار...' نے بھی کم اثر نہیں جمایا اور دیکھتے ہی دیکھتے راہل برمن ایک فروخت ہونے لائق موسیقار ہوگئے۔اب جتنے بڑے بینر تھے وہ راہل کو سائن کرنے کے چکر میں رہنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ۱۹۴۷ء کے بعد آئی موسیقاروں کی نسل بڑھتی جارہی تھی۔او۔پی۔نیّر، شنکر جے کشن،سی رام چندر،نوشاد، مدن موہن جیسے موسیقار فلمی موسیقی کی مین اسٹریم سے کٹتے جارہے تھے یا ان کی زندگی کے دن پورے ہوگئے تھے۔راہل کے لیے یہ ان کی جدوجہد کا وقت تھا۔گلوکار کشور کمار کے ساتھ وہ اپنی سریلی دھنوں کا جادو بکھیر رہے تھے۔اپنی بیوی آشا کی آواز کو بھی نئے ایام دے رہے تھے مگر لتا منگیشکر کے تئیں ان کا یقین پہلے جیسا ہی برقرار تھا۔وہ کہتے تھے' آئی ایم پراؤڈ جو لتا دیدی جیسی گلوکارہ کے دور میں رہ رہا ہے۔

۷۰ کی دہائی پوری طرح سے راہل کے نام تھی۔ وہ راجیش کھنہ کے سپر اسٹار ہونے کا دور تھا۔'کٹی پتنگ، نمک حرام، امر پریم' کی موسیقی نے جہاں ملک بھر میں دھوم مچا دی وہیں' ہرے راما

ہرے کرشنا اور جوانی دیوانی' جیسی فلموں نے انہیں ملک کی نئی نسل کا چہیتا موسیقار بنادیا۔' آندھی اور' کنارہ' جیسی فلموں میں گیت کار گلزار کے ساتھ انہوں نے' تم آ گئے ہو...' اور' نام گم جائے گا...' جیسے یادگار گیت دیے۔راہل نے ہندوستانی شاستریہ سنگیت اور غیر ملکی موسیقی کا جو دلکش سنگم کیا بعد میں وہ روایت بن گیا۔' دیوار، شعلے، ہم کسی سے کم نہیں' جیسی بڑی فلموں کو جو اتنے ہی بڑی سطح کا موسیقار چاہیے تھا وہ راہل کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔۷۰ کی دہائی میں فلمی موسیقی کو اپنی مٹھی میں سمیٹنے والے راہل نے ۸۰ کی دہائی میں بھی' لو اسٹوری، بیتاب اور راکی' جیسی جوانی کے عشق پر مبنی فلموں میں ہٹ گیت دیے۔مگر تب تک ان کی اسٹائل کی نقل کرنے والے اور انہی کی دھنوں کو خرد برد کرنے والے موسیقاروں کے آنے سے فلم ساز سستے داموں میں راہل ٹائپ میوزک خریدنے لگے۔' ساگر' اور' اجازت' جیسی فلموں کے بعد راہل اچانک غائب ہوگئے۔

ان دنوں راہل بڑے پیمانے پر بننے والی فلم ۱۹۴۲ء اے لو اسٹوری' میں موسیقی دے رہے تھے۔میری رائے میں ۱۹۹۴ء میں ریلیز ہونے والی وہ فلم گزشتہ صدی کی آخری میوزیکل ہٹ فلم تھی۔گیت چاہے' ایک لڑکی کو دیکھا تو ایسا لگا...' ہو یا' رم جھم رم جھم...' راہل نے ہر دھن میں ایسا جادو انڈیلا تھا جو سالوں بعد بھی نہیں ٹوٹا۔وہ زمانہ پھر آنے والا تھا جب راہل دیو برمن کو فلم صنعت سر پر بیٹھا لیتی مگر وہ پہلے ہی اس دنیا سے کنارہ کر گئے۔

(بشکریہ۔راشٹریہ سہارا۔کلکتہ)

☆☆☆

موسیقار۔او۔پی۔نیّر

رشید انجم

نام: اونکار پرساد نیّر، نام بطور موسیقار: او پی نیّر،
پیدائش: ۱۶؍جنوری ۱۹۲۶ء لاہور، انتقال: اتوار ۲۸؍جنوری ۲۰۰۷ء تھانے مہاراشٹر، پہلی فلم: آسمان ۱۹۵۲ء ممبئی۔کل فلمیں: ۷۲

ساری عمر: دولت، شہرت اور عزت کے حصول کے لئے انسان سفرِ حیات طے کرتا ہے۔عروج پر بھی پہونچتا ہے اور پھر اس کی کوئی کوتاہی، نامناسب عمل یا انتہا پسندی اسے زوال پذیر کرنے کا سبب بن جاتی ہے اور وہ گمنامی میں چلا جاتا ہے۔او۔پی۔نیّر کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔وقت نے انھیں نوازا۔زمانے نے شفاعت دی اور ان کی ایمان دارانہ کاوشوں نے انھیں عروج دیا۔او۔پی۔نیّر ہندوستان کی فلم انڈسٹری کے وہ اکلوتے موسیقار تھے جنھوں نے باقاعدہ موسیقی کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔وہ معمولی تعلیم یافتہ نوجوان عزم لیے موسیقی کی دنیا میں وارد ہوئے تھے جالندھر ریڈیو اسٹیشن سے اپنے مستقبل کی ابتداء کی۔تب سہگل عروج پر تھے اور ان کی گائیکی سارے ملک میں اپنا وقار قائم کرچکی تھی۔ایسے دور میں او۔پی۔نیّر نے سی ایچ آتما کی آواز میں ایک گیت ''پریتم آن ملو دکھیا جیا بلائے پریتم آن ملو'' ریکارڈ کرلیا لیکن سہگل کی حیات تک یہ گانا ریلیز نہیں ہوسکا۔سہگل کی موت (۱۹۴۶ء) کے بعد یہ گانا ریلیز ہوا۔تعریف یہ ہے کہ نیّر اور آتما کو اس گانے کا کل معاوضہ پندرہ روپیے ملا تھا۔یہ معاوضہ قلیل تھا مگر ان کے حوصلے کو جلا بخش گیا۔کامل دس سال انھوں نے صبر وتحمل سے کام لیا۔

۱۹۵۲ء میں آخر ان کو صبر کا صلہ مل ہی گیا۔دل سکھ ایم۔پنچولی لاہور سے بمبئی آچکے تھے۔ ناصر خان اور شیاما کو لے کر اپنی فلم ''آسمان'' شروع کی تو اپنے ہم وطن او۔پی۔نیّر کو موسیقی کا موقع دے دیا۔اس فلم کے نغمہ نگار پریم دھون تھے۔اس فلم میں کل ۸ گانے تھے۔تین سی ایچ آتما، ایک راجکماری اور ۴ گانے گیتا دت نے گائے تھے۔نوشاد۔شنکر جے کشن، ایس ڈی

برمن، بلوسی رانی، عزیز ہندی، کھیم چند پرکاش، سی راجچندر انل بسواس، غلام محمد، علی اکبر خان، شیام ہندی، روشن، وسنت ڈیسائی، نثار بنرجی، ہنسراج بہل، حسن لال بھگت رام، غلام حیدر، عابد حسین خان، خورشید انور، اے آر قریشی اور مدن موہن جیسے ماہرفن اور استادان موسیقی کے درمیان اپنی فنکارانہ حیثیت ثابت کرنا ایک ایسے شخص کے لیے کاردار وتھا جو موسیقی کی ابجد اور اس کے رموز سے بھی واقف نہ ہو مگر او۔پی۔نیّر کو الوہی ذہن ملا تھا۔انھوں نے صرف ہارمونیم ڈھولک طبلہ اور مٹکی کو موسیقی کی بنیاد بنا کر اپنی دھنوں کو ترتیب دیا اور اتنے کم سازوں کے ساتھ وہ طرزیں بنائیں کہ آج بھی ان کا ثانی کوئی دوسرا موسیقار نہیں بن پایا۔۱۹۵۲ء میں ہی پی ایل سنتوشی کی کامیڈی فلم ''چھم چھما چھم'' (ریحانہ، کشور کمار اور پران) میں سنتوشی کے نغمات کو دھنوں میں ڈھالنے کا موقع ملا یہ وہ پہلی فلم تھی جس میں نیّر نے آشا بھوسلے، شمشاد بیگم اور کشور کمار کی آوازوں کا صحیح استعمال کیا، ۱۹۵۳ء میں گرودت کی پہلی فلم ''بازی'' میں مجروح سلطان پوری کا ساتھ ہوا تو محمد رفیع اور طلعت محمود نے ان کی دھنوں پر اپنی آوازوں کا جادو جگایا۔مدھم اور بہت ہی کم ساز کا استعمال کرتے ہوئے طلعت محمود کی آواز میں یہ غزل ریکارڈ ہوئی تھی ''مجھے دیکھو حسرت کی تصویر ہوں میں۔جو بن بن کے بگڑی وہ تقدیر ہوں میں'' گیتا دت کا گایا یہ مدہوش کن گیت ''ذرا سامنے آ۔ذرا آنکھ ملا، تیرا شکریہ کردوں ادا'' اسی فلم کا ہے۔

اس فلم کے گیت ضرور چلے مگر اصل مقام انھیں گرودت کی ذاتی فلم ''آر پار'' (۱۹۵۴ء) سے ملا۔شکیلہ، شیاما گرودت اور جانی واکر کو دھیان میں رکھ کر مجروح کے گیتوں کی وہ دھنیں بنائیں کہ آج دہائیوں بعد بھی ان گیتوں کی تازگی برقرار ہے۔ گرودت نے انھیں اپنی اگلی دو فلموں ''مسٹر اینڈ مسز ۵۵'' اور ''سی۔آئی۔ڈی'' ۱۹۵۶ء میں موسیقی کا موقع دیا اور ان دونوں فلموں کا میوزک ہٹ ثابت ہوا۔

وہ بے حد نشیلے موسیقار تھے۔ان کی بنائی طرزوں موسموں کی نشیلی رتوں کا مخملی احساس دل ذہن اور شریانوں میں نشہ بن کر اٹھکھیلیاں کرتا تھا۔شمشاد بیگم کی کھنک دار آواز، گیتا دت کی مسحور کن نغمگی، آشا بھوسلے کی بے انت بھنوروں پر رقص کرتی آتش بداماں محمد رفیع کی بیباک گائیکی اور نغمہ بدوش پھول کی

مسکراہٹوں سے جھانکتی کشورکمار کی اوڈلے اوڈلے او۔پی۔نیّر کی ہی دین تھی۔او۔پی۔نیّر کی موسیقی میں پنجاب کی سرزمین کے مست انداز کا جوشیلا پن بھی تھا اور بنگال کا سحر خیز جمال بھی فلم ''ڈھاکے کی ململ'' ۱۹۵۶ء میں انھوں نے سی ایچ آتما سے پھر ایک یادگار گیت ''دیا تو جلا سب رات رے بالم پرلوٹ نہ آئے''۔گوا کر آتما کو ہمیشہ کے لیے امر کر دیا تھا۔اس گیت کو نیّر کی بیوی سروج نیّر نے لکھا تھا۔

او۔پی۔نیّر نے اپنی کسی بھی فلم میں لتا منگیشکر سے پلے بیک نہیں لیا۔ان کے اختلافات میں انا کا مسئلہ تھا لیکن اس کے باوجود لتا نے ہمیشہ ان کو عزّت کی نگاہ سے دیکھا۔کہا جاتا ہے کہ مدھیہ پردیش کے ایک چھوٹے سے شہر شیو پوری میں اپنی جوانی کے پانچ سال بسر کیے تھے۔۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء تک ان کی آواز اور ان کی دھنوں سے شیو پوری کے گلی کوچے گونجے تھے۔ان کے چچا وہاں روڈ ویز میں ملازم تھے اور وششٹ کالونی میں رہتے تھے۔او۔پی۔نیّر نے اپنا ایک گروہ ترتیب دیا تھا جس میں ڈھولک نواز ہریا ماسٹر، بھگوان لال چوکسے، سالک رام شرما، رام چرن ڈنڈوتیا، منوہر سنگھ سسودیا، ایک ناتھ کانٹے اور پی جی منگل مورتی شامل تھے۔ہارمونیم، ڈھولک، مٹکی اور بانسری بجانے میں یہ لوگ ماہر تھے اور اس گروہ نے ہی او۔پی۔نیّر کو فلم انڈسٹری تک پہونچانے میں نمایاں کارنامہ انجام دیا تھا۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب او۔پی۔نیّر بمبئی فلم انڈسٹری کے مشہور موسیقار بن گئے تو ایک بار پھر شیو پوری لوٹے۔اس بار آشا بھوسلے ان کے ہمراہ تھیں۔ان کے دیرینہ ساتھی بھگوان لال چوکسے کملا گنج میں رہتے تھے۔ان کے چھوٹے سے مکان کے سامنے ایک درخت تھا جس کے آگے پیٹے بچھے تھے۔آشا بھوسلے نے ان پٹیوں پر بیٹھ کر او۔پی۔نیّر کی بنائی دھنوں پر کئی گیت گائے تھے اور نیّر ان کے احسان مند رہے کہ آشا نے انھیں اتنی عزت بخشی تھی۔۲

او پی نیّر کو بمبئی میں جو میوزک ارنجیر ملے وہ بھی باکمال تھے۔ان میں سیکسوفون کے ماہر منوہری سنگھ گٹار نواز سردار ہزارا سنگھ قابلِ ذکر ہیں۔نیّر کی موسیقی کو صحیح مقام تک پہونچانے میں ان کے معاون اور میوزک ارنجیر سیبسٹین ڈیوزا کا بہت بڑا ہاتھ رہا۔انھوں نے صرف لوک سنگیت کا استعمال ہی اپنی فلموں میں نہیں کیا بلکہ راگ راگنیوں پر Base کرتی دھنیں بھی بنائیں۔فلم ''نیا دور'' کا مشہور بھجن آنا ہے تو آ راہ میں کچھ پھیر نہیں ہے''۔میں مشہور سارنگی نواز

پنڈت رام نارائن نے سارنگی کا استعمال کیا اور اس بھجن کو امر بنا دیا۔فلم ''راگنی'' ۱۹۵۸ء میں اندور کے شاستری گائیک استاد امیر خان سے ''جوگیا میرے گھر آئے'' جیسا پکے راگ پر گیت گایا تو اس فلم میں جاں نثار اختر کا یہ گیت ''چھیڑ دیے میرے دل کے تار کیوں، باج رہی پایل مدھو ماتی''۔استاد امانت علی اور فتح علی سے گوا کر ثابت کر دیا کہ انھیں نہ صرف عام سروں پر عبور حاصل ہے بلکہ وہ راگنیوں پر بھی قادر اور با استطاعت ہیں۔

فلمی موسیقار کو لازم ہوتا ہے کہ وہ فلم کی سچویشن، کردار کی اندرونی بیرونی کیفیات، کہانی کی مطابقت سے اٹھتی بنتی لہروں اور فلم سے لطف اندوز ہونے والے عام فلم بین کے ذوق کو دھیان میں رکھ کر اپنی دھنیں ترتیب دے۔او۔پی۔نیّر کے متعلق بلاتردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی کسی بھی فلم کا کوئی بھی گیت کبھی بھی اور کسی بھی دور میں کمزور یا کمتر ثابت نہیں ہوا۔موسیقاروں کی لمبی چوڑی بھیڑ میں او۔پی۔نیّر کی دھنوں کو صاف طور پر پہچان لیا جاتا ہے اور گانے کے بول کان میں آتے ہی ذہن قبول کرنے میں شمہ برابر بھی دیر نہیں کرتا کہ یہ دھن صرف او۔پی۔نیّر کی دھن ہے۔وہ ہاتھ میں جلتی سگریٹ دبائے پیانو پر دھن سیٹ کرتے تھے۔ان کی ذہانت خداداد تھی۔بہت کم سازوں کی مدد سے او۔پی۔نیّر نے ہندوستانی فلموں کو وہ موسیقی دی جس کی مثال ملنا ناممکن ہے۔خوبصورت چہرے پر دلکش مسکراہٹ سجائے یہ عظیم موسیقار جب کبھی بھی پردے پر آتا تو فلمی موسیقی کی پوری تاریخ آنکھوں کے آگے متحرک ہو جاتی تھی۔سفید لباس، سفید چمکتے جوتے اور سر پر ایک خاص انداز کا فلیٹ کیپ لگائے یہ شخص اپنی مثال آپ تھا اور کوئی دوسری مثال اس سے نسبت نہیں رکھتی تھی۔

''جانے کہاں میرا جگر گیا جی''۔(مسٹر اینڈ مسز ۵۵)''کہیں پہ نگاہیں کہیں پہ نشانہ''(سی آئی ڈی ۱۹۵۶ء)''میری نیندوں میں تم میرے خوابوں میں تم''۔(نیا انداز ۱۹۵۶ء)''اڑیں جب جب زلفیں تیری''(نیا دور ۱۹۵۷ء)''یوں تو ہم نے لاکھ حسیں دیکھے ہیں''(تم سا نہیں دیکھا ۱۹۵۷ء)''ایک پردیسی میرا دل لے گیا''(پھاگن ۱۹۵۸ء)''پیار پر بس تو نہیں ہے میرا لیکن پھر بھی''(سونے کی چڑیا ۱۹۵۸ء)''آپ یونہی اگر ہم سے ملتے رہے''(ایک مسافر ایک حسینہ ۱۹۶۲ء)''یہ چاند سا روشن چہرہ''(کشمیر کی کلی

۱۹۶۴ء) ''جائیے آپ کہاں جائیں گے'' (میرے صنم ۱۹۶۵ء) ''سویرے کا سورج تمھارے لیے ہے'' (ایک بار مسکرادو۔۱۹۶۹ء) ''چین سے ہم کو کبھی آپ نے جینے نہ دیا (میرا وچن گیتا کی قسم ۱۹۷۵ء) اور وہ بے شمار گیت جنھیں کبھی فراموش نہیں کیے جاسکتے ہیں؟

۱۹۵۲ء سے ۲۰۰۰ء تک فلم ''آسمان'' سے ''جے بھوانی'' تک او۔پی۔نیّر کا فلمی سفر کامیابی اور لاثانی موسیقی کا دور تھا۔لیکن جیسا کہ زمانے کا دستور ہے، وقت کے ساتھ جس طرح موسم اور راتوں میں تبدیلیاں آتی ہیں۔مزاجوں اور رسوم میں بدلاؤ پیدا ہوتے ہیں،فلموں میں بھی تبدیلیاں آئیں تو موسیقی شور شرابے کی مرہون ہوگئی اور او۔پی۔نیّر حاشئے پر چلے گئے۔فلم انڈسٹری کا ہی نہیں انسانی وجود کا بھی یہ عمل ہے،سورج جب تک دھوپ اور تازگی وحرارت دیتا ہے تب تک اس کی افادیت ہے۔او۔پی۔نیّر بھی اسی سفاک فطرت کے شکار ہوئے اور بالآخر گمنامی میں فوت ہوئے افسوس وہ لوگ بھی ان کے جنازے میں شریک نہیں تھے جن کو بامِ عروج پر پہونچانے میں نیّر نے اہم کردار ادا کیا تھا۔

☆☆☆

ایک مترنم گلوکار موسیقار۔ہیمنت کمار

ہریش تیواری

۱۹۵۰ء کے بعد موسیقی کا جو یادگار دور ہندوستانی فلمی تاریخ میں درج ہوا،اس کا مجسمہ ہیمنت کمار جیسے ہیرو اور موسیقار کے طور پر موسیقی کے شیدائیوں کے دل میں بنا ہوا ہے۔'یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں،سن جا دل کی داستاں فلم 'جال' کی اس دھن پر مسحور کردینے والی آواز یاد آتی ہے تو ذہن میں سوئے ہوئے کئی دوسرے گیت بھی جاگنے لگتے ہیں اور بادلوں کی طرح برس کر تن من کو سروں کی بارش میں بھگو دیتے ہیں۔گلوکاری کے ساتھ ساتھ موسیقار کے طور پر ہیمنت کمار نے ایک سے ایک نایاب دھُنیں بنائیں اور شنکر۔جے کشن،نوشاد،سچن دیو برمن،او پی نیّر،سی رام چندر،روشن جیسے اونچے پہاڑوں کے درمیان سے اپنی سریلی گنگا نکالی جو ہمیشہ بہتی رہی۔یوں تو گلوکار و موسیقار کے طور پر اس وقت سی رام چندر اور سچن دیو برمن فلمی موسیقی میں موجود تھے مگر دونوں کے گلے کی کچھ حدود تھیں۔برمن دادا کی آواز میں ایسا سریلا پن تھا جس کی لوک سنگیت کو زیادہ ضرورت ہوتی ہے تو سی رام چندر 'شعلہ جو بھڑکے،دل میرا دھڑکے،جیسی سریلی اور یادگار دھن پر ہی گا سکتے تھے۔ہیمنت کمار کی آواز میں اپنی الگ خصوصیت تھی اور ایسا لچیلا پن جو کامیاب گلوکاری کی مثال ہوتا ہے۔محمد رفیع،منّاڈے،مکیش،طلعت محمود جیسے گلوکاروں کے ہوتے ہوئے انہوں نے فلمی موسیقی کے میدان میں اپنی موجودگی درج کرائی۔سچن دیو برمن کی موسیقی کی ہدایت میں فلم 'سزا' کے لیے انہوں نے 'آ گپ چپ گپ چپ پیار کریں' گایا تو فلم 'سزا' کے گانے 'یہ رات یہ چاندنی' نے انہیں ہندستان بھر میں مشہور کر دیا۔انہیں پنکج ملک یادوں کا سفر ہریش تیواری اور سہگل کی روایت کا گلوکار ماننے والے بھی اس بات پر رضامند ہیں کہ ان کے پاس ایک نرالا سر تھا جو گلوکار کے طور پر ان کا الگ مقام مقرر کرتا تھا۔اپنے وقت کے تین عظیم اداکار یعنی اداکاری میں جہاں راج کپور کے گلے کے لیے مکیش اور منّاڈے طے کیے گئے تھے تو دلیپ کمار کے لیے محمد رفیع اور مکیش کے سرفٹ بیٹھتے تھے۔دیو آنند کے گلے میں کشور کمار کی آواز جچتی تھی مگر خود کشور کمار اس زمانہ میں 'سنگنگ اسٹار' تھے اوران کی آواز آسانی سے مہیا نہیں ہو پاتی تھی۔دیو آنند کو ہیمنت کمار کی شکل میں آواز کا متبادل مل گیا۔

دیو آنند کے لیے 'ہے اپنا دل تو آوارہ' جیسے درجنوں گیت گا کر ہیمنت کمار نے ہندستانی نوجوانوں کے دل کے ان رومانی جذبات کو اجاگر کر دیا جو فلمی گیتوں میں اپنے دل کی شخصیت ڈھونڈتا ہے۔ان کے دل میں بسے

ہوئے شاستریہ سنگیت کی خصوصیت فلم 'انارکلی' کے گیت 'جاگ دردِ عشق جاگ، چھیڑ کے آنسوؤں کا راگ' میں بخوبی کھلی۔ اس کے علاوہ 'بے قرار کرکے ہمیں یوں نہ جایئے'، 'تیری دنیا میں جینے سے تو بہتر ہے کہ مرجائیں'، 'جب جاگ اٹھے ارماں تو کیسے نیند آئے' جیسے کئی گیت ہیں جو ہیمنت کمار کی یاد ہمیشہ تازہ رکھیں گے۔

ہیمنت کمار فلموں میں گانے کے استاد طلعت محمود کی طرح اپنے پرائیوٹ گانوں سے شہرت پا چکے تھے۔ 'آنچل میں کیوں باندھ لیا مجھے پردیسی کا پیار' اور 'بھلا تھا کتنا اپنا بچپن' جیسے ان کے پرائیوٹ گانوں کی مقبولیت فلمی گیتوں کو شرمندہ کرنے والی تھی۔ موسیقار کی حیثیت سے ان کی آمد ایسے وقت میں ہوئی جب ہر موسیقار کے پاس اپنی خاص طرز تھی۔ شاستریہ اور لوک سنگیت کے ساتھ رویندر سنگیت کا سریلا اثر اپنی دھنوں کے ذریعہ انہوں نے روایت کے طور پر پیدا کیا۔ یہ روایت باکس آفس پر ہمیشہ بھیڑ کھینچتی رہی۔ پھر 'ناگن' اس کی مثال ہے۔ اس فلم کی موسیقی ہیمنت کمار کی عجیب وغریب تخلیقی صلاحیت کی ایسی مثال ہے جو انہیں اول درجہ کے موسیقاروں کی فہرست میں رکھتی ہے۔ وہ ۱۹۵۰ء کی دہائی کا نصف تھا جب سارے ملک میں فلم 'ناگن' کے گیت گونج اٹھے۔ لتا منگیشکر کے ذریعہ گایا گیا 'تن ڈولے میرا من ڈولے' گھر گھر میں گایا جانے لگا۔ اس کے علاوہ 'سن ری سکھی موہے سجنا بلائے'، 'میرا دل یہ پکارے آجا' اور 'اونچی اونچی دنیا کی دیواریں سیّاں توڑ کے میں آئی رے تیرے لیے سارا جگ چھوڑ کے' لتا کے سروں میں ایسے گیت تھے جن پر وقت کی بے رحمی بے اثر رہی۔ 'ناگن' میں خود ہیمنت کمار 'او زندگی کے دینے والے خوشی میری چھین کے بتا تجھے کیا ملا' کیا خوب گایا تھا۔ ان کی محبت کی یہ پکار ایک میٹھی سی چبھن بن کر آج بھی دل کے تار تار ہلا دیتی ہے۔ فلم 'ناگن' کی موسیقی ہر دور کے موسیقاروں کے لیے چیلنج تو بنی ہی رہے گی۔ ساتھ ہی ہر دور کے شائقین کے دل کے تاروں پر کھنکتی رہے گی۔

پھر اسی دہائی میں ان کی ایک اور فلم نے سریلا ہنگامہ برپا کیا جس کا نام 'شرط' تھا۔ 'نہ یہ چاند ہوگا نہ تارے رہیں گے'، 'دیکھو وہ چاند چھپ کے کرتا ہے کیا اشارے' جیسے ان کے گیت اور لتا منگیشکر کا سولو گیت 'میری تقدیر کے مالک' فلم موسیقی کی ایسی یادیں ہیں جو وقت کی دھول سے ہمیشہ محفوظ رہیں گی۔ موسیقار کے طور پر ان کی فلمیں 'صاحب، بیوی اور غلام'، 'انوپما'، 'کابلی والا' وغیرہ ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔

☆☆☆

موسیقار۔ روشن

خورشید اختر فرازی

چند عظیم اور ناقابل فراموش موسیقاروں میں ایک نام روشن کا بھی تھا جن کی موسیقی صحیح معنوں میں ذہن کو روشن کر کے رکھ دیتی تھی، روشن، ہر قسم کے گیت، مکھڑے، غزل اور قوالی کی دھن بنانے میں یکتا تھے اور جس انداز کی موسیقی وہ دیتے اس معیار کی موسیقی کوئی اور نہیں دے سکتا تھا۔ روشن کے دو صاحبزادے راکیش روشن اور راجیش روشن نے بھی فلمی دنیا میں الگ الگ شعبوں میں کافی نام کمایا، راکیش روشن عرصے تک فلموں میں ہیرو کا رول ادا کرتے رہے، پرایا دھن، ایک کنوارا ایک کنواری، آخر کیوں، زخمی، مدہوش، جیسی سپر ہٹ فلموں میں انھوں نے اداکاری کی اور جب اداکاری سے الگ ہوئے تو سپر ہٹ فلموں کی ہدایت کاری اور فلمسازی میں ایک ریکارڈ بنایا، خون بھری مانگ، کرشن، کوئی مل گیا، کرن ارجن اور اب کائٹ جیسی فلم کو پیش کرنے والے ہیں اور بطور ایک فلم ساز ہدایت کار انھوں نے ہندی فلموں میں اپنے لئے ایک خاص پوزیشن بنائی۔ راکیش روشن کے بڑے بھائی راجیش روشن ایک بہترین موسیقار بنے، پہلی ہی فلم جولی میں انھوں نے بہترین موسیقی دی جس کے بل بوتے پر انہیں دھڑا دھڑ فلمیں ملنے لگیں لیکن وہ بعد میں صرف راکیش روشن کی فلموں میں موسیقی دینے کے معاہدہ پر معاہدہ بند ہوئے۔ اگرچہ جولی اور کنوارا باپ ان کی یہ دو ایسی فلمیں تھیں جن کے گیت سپر ہٹ ثابت ہوئے تھے۔ جولی یہ انگریزی گیت مائی ہارٹ از بیٹنگ (Myheaet is beating) نے بین الاقوامی سطح پر شہرت حاصل کی تھی اور کنوارا باپ کا یہ گیت ''سج گئی دیکھو میری امّاں سنہرے برقعے میں اپنے کئی ریکارڈوں کو توڑنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اور راجیش روشن چاہتے تو اس زمانے میں لکشمی کانت پیارے لال، آرڈی برمن، بھپی لہری وغیرہ کو بھی پیچھے چھوڑ سکتے تھے لیکن انھوں نے قناعت پسندی سے کام لینا ضروری سمجھا۔

روشن ۱۴/جولائی ۱۹۱۷ء میں گجرانوالہ (پاکستان) میں روشن لال ناگرتھ کے نام سے پیدا ہوئے تھے اور انھوں نے اوائل عمری ہی سے موسیقی کی طرف دھیان دیا تھا ان کے پہلے استاد نہر بار وے تھے اور انہی کے ساتھ وہ ہندوستان چلے آئے تھے انھوں نے لکھنؤ کے موریس کالج میں سنگیت کی تعلیم حاصل کی بعد آزادی استاد علاؤالدین خاں سے انھوں نے موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں وہ سارنگی کنگ بندو خان کے ساتھ

شامل ہوگئے۔جن سے انھوں نے سارنگی بجانا سیکھا اس کے بعد وہ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے منسلک ہوگئے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۰ء کے دوران انھوں نے آل انڈیا ریڈیو کے لئے کئی پروگرام میں سنگیت دیئے۔اس کے بعد وہ ممبئی چلے آئے تاکہ میوزک ڈائریکٹر کے طور پر فلموں میں قسمت آزمائی کرسکیں۔۱۹۴۸ء میں جبکہ وہ جدوجہد کی زندگی گزار رہے تھے اس وقت ان کی ملاقات مشہور ہدایتکار اور فلم ساز کیدار شرما سے ہوئی ان دنوں کیدار شرما نیکی اور بدی نامی فلم بنا رہے تھے اور اس فلم کے موسیقار اسنہال بھٹکر تھے لیکن کیدار شرما جو کہ روشن سے بہت متاثر ہو چکے تھے انھوں نے بھٹکر سے بات کرنے کے بعد روشن کو اس فلم کی موسیقی دینے کے لئے منتخب کرلیا اور ۱۹۴۹ء میں فلم نیکی اور بدی ریلیز ہوئی لیکن بدقسمتی سے فلم فلاپ ہوگئی، فلم فلاپ ہوجانے کے باوجود کیدار شرما نے ۱۹۵۰ء میں جب ''باورے نین'' بنانے کا فیصلہ کیا تو انھوں نے روشن ہی کو موقع دیا اور روشن دوسرا موقع ملنے کے بعد پوری دلجمعی کے ساتھ اس کی موسیقی تیار کرنے لگے اور اس فلم کے دو گیت ''خیالوں میں کسی کے'' اور ''سن بیری بالم'' بہت مشہور اور ہٹ ثابت ہوئے تھے۔

۱۹۵۰ء کے دوران روشن کے تعلقات طلعت محمود اور مکیش کے ساتھ بہت بہتر ہو چلے تھے روشن نے ۱۹۵۲ء میں ہٹ فلمیں ''ملہار''، ''شیشم'' اور ''انہونی'' دیں اور ان تینوں فلموں کے گیت کلاسیکل ہونے کے ساتھ ساتھ نئی طرز کی موسیقی سے لبریز تھیں جیسے یہ گیت ''تارے ٹوٹے دنیا دیکھے'' جو فلم ملہار کا ہٹ گیت ثابت ہوا۔لیکن چونکہ وہ بہت ہی شرمیلے اور الگ تھلگ رہنے والے انسان تھے، اس وجہ سے معاشی اعتبار سے انہیں بڑی فلمیں نہیں ملیں۔روشن نے اپنے عروج کے وقت میں دو نغمہ نگار اندیور (ملہار) اور آنند بخشی (واللہ کیا بات ہے، دیور غیرہ) میں متعارف کرایا جس کے یہ گیت ''بہاروں نے میرا چمن لوٹ کے، خزاؤں کو الزام یہ کیوں دے دیا'' بیحد مشہور رہوا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ فلم سازوں اور ہدایتکاروں نے روشن کی صحیح پہچان کرلی اور پھر انہیں بہت ساری بڑی فلمیں بھی ملیں، چونکہ روشن ''قوالی'' کی دھنیں بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ کرتے تھے اور اس معاملے میں وہ روی، نوشاد، ایس ڈی برمن، او۔پی۔نیّر وغیرہ سے بلند تھے اور سب سے بڑھ کر شنکر جے کشن بھی قوالی کی دھن بناتے ہوئے روشن سے صلاح ومشورہ ضرور کرلیا کرتے تھے۔

۶۰ کی دہائی میں روشن نے کئی کامیاب فلمیں دیں۔

☆☆☆

موسیقار۔اے۔آر۔رحمان

نوراللہ خان

ایٹمی ہتھیار، جنگ وجدال، تشدد، قتل وغارتگری اور دہشت گردی جیسے خوفناک مسائل سے دوچار اس دور میں عمدہ موسیقی پُر سوز آواز والے فنکاروں کے ذریعہ گائے جانے والی کوئی بھی غزل فلمی نغمہ یا شاعرانہ تخلیق، تناؤ کے شکار ہمارے اعصاب ودماغی سکون کے لئے کسی مرہم سے کم نہیں ہوتی۔انسان اپنے آس پاس کے ماحول اور زندگی کی تلخ حقیقتوں سے کتنا ہی مایوس وپریشان کیوں نہ ہو، عمدہ موسیقی اور ایک باصلاحیت گلوکار کی فنکارانہ تخلیق اس کی روحانی تازگی اور اس کے خراب موڈ کو ٹھیک کرنے میں بہت اہم رول ادا کرتی ہے۔ویسے تو کلاسیکی اور فلم موسیقی اور استاد علاؤالدین خاں، بسم اللہ خاں، پنڈت روی شنکر، امجد علی خاں، استاد ذاکر حسین اور موسیقار نوشاد، شنکر جے کشن، لکشمی کانت پیارے لال، او پی نیر، ایس ڈی برمن اور رویندر جین جیسے متعدد باصلاحیت فنکار اور موسیقار صرف قومی سطح پر ہی نہیں، بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا لوہا منواتے رہے ہیں، تاہم گزشتہ چند برسوں کے دوران فن موسیقی میں قومی وعالمی سطح پر اپنی انمٹ چھاپ چھوڑنے والے ہونہار فنکاروں میں ایک نیا نام جو تیزی کے ساتھ ابھر کر سامنے آیا ہے وہ ''سلم ڈاگ ملینیئر''، ''روجا''، ''بامبے''، ''دل سے''، ''تال'' اور ''جودھا اکبر'' جیسی فلموں کی سحر انگیز موسیقی کے خالق وموجد اے آر رحمٰن کا ہے۔مقبول ترین فلم ''سلم ڈاگ ملینیئر کے لئے دو آسکر ایوارڈز اور عالمی شہرت حاصل کرنے والے مدراس کے مایہ ناز موسیقار اے آر رحمٰن نے اب موسیقی کے نوبل انعام کہے جانے والے دو گریمی ایوارڈز بھی حاصل کر لئے ہیں۔موسیقی کے ماہر کا ماننا ہے کہ ۵۲ ویں گریمی ایوارڈز میں اے آر رحمٰن کی اس غیر معمولی کامیابی سے ہندوستانی موسیقاروں کے لئے موسیقی کے عالمی بازار میں کچھ نئے مواقع پیدا ہوئے ہیں۔بقول پاپ گلوکار کیلاش کھیر ''رحمٰن کی اس کامیابی سے بین الاقوامی سطح پر اپنی شناخت کو تسلیم کرانے کی سمت میں ہم نے ایک اور مسافت طے کرلی ہے''۔رحمٰن کو یہ انعامات ڈین بوئیل کی عالمی شہرت یافتہ فلم ''سلم ڈاگ ملینیئر'' کے لئے ان کے ذریعہ ترتیب کردہ موسیقی میں موشن پکچر کے لئے بہترین ساؤنڈ ٹریک اور بہترین

گانے ''جے ہو'' کے لئے دیئے گئے ہیں۔ بہترین گانے کے زمرے میں معروف شاعر و قلم کار گلزار تنوی شاہ کو بھی فلمی نغمہ ''جے ہو'' کے لئے ان کے ساتھ ہی اس انعام سے سرفراز کیا گیا ہے۔ رحمٰن ایسے پہلے ہندوستانی موسیقار ہیں جنہیں گزشتہ برس آسکر انعامات سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ ان کی اس نمایاں کامیابی کے مدنظر حکومت ہند نے بھی ان کو ملک کے تیسرے سب سے بڑے اعزاز پدم بھوشن سے سرفراز کیا تھا۔

رحمٰن اس سے قبل اینڈریو لائیڈ ویبر کی ''بامبے ڈریمز'' جیسی بین الاقوامی پروڈکشنز میں بھی اپنی موسیقی کے جوہر دکھا چکے ہیں، تاہم ''سلم ڈاگ ملینیئر'' ہی وہ پہلی فلم تھی، جس نے ایک موسیقار کے طور پر عالمی سطح پر ان کی ماہرانہ صلاحیت کی شناخت طے کی تھی اور جن کے ذریعہ وہ مغربی ناقدین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ تاہم اس غیر معمولی کامیابی کے بعد بھی انہوں نے انکساری اور کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے اتنا ہی کہا ہے ''یہ بہت حیرت انگیز واقعہ ہے۔ میں کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ مجھے گریمی ایوارڈز سے نوازا جائے گا۔ بہتر تو یہی ہے کہ ایوارڈ کی توقع ہی نہ کی جائے۔ میں تو صرف اپنے کام کو جاری رکھنے کا متمنی ہوں.... مجھے امید ہے کہ اس سے ہندوستانی تخلیق کاروں کے لئے کچھ نئے راستے وا ہوں گے.... میں امید کرتا ہوں کہ یہ ایوارڈ مستقبل میں چیزوں کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوگا''۔ رحمٰن نے ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد 'روجا' اور 'بامبے' جیسی مقبول فلموں کے ڈائریکٹر منی رتنم، جن کی ان دونوں فلموں کو انہوں نے اپنی لازوال موسیقی سے سجایا وسنوارا تھا اور ممبئی میں اپنے خیر خواہ شیکھر کپور و سبھاش گھئی کا بھی شکریہ ادا کیا ہے۔ رحمٰن کے بارے میں منی رتنم کی اہلیہ سہاسنی رتنم نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے ''رحمٰن کبھی یہ سوچ کر کام نہیں کرتے کہ تماش بین ان کے کام کو پسند کریں گے یا نہیں۔ ان کی کوشش ہمیشہ محض یہ ہوتی ہے کہ وہ کچھ مختلف کرکے دکھائیں''۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایوارڈس اس نوجوان و باصلاحیت موسیقار کا تعاقب کرتے رہتے ہیں۔ قومی سطح کے چار انعامات کے ساتھ ہی ساتھ بہترین اوریجنل اسکور اور ''سلم ڈاگ میلینئر'' میں ان کے گانے 'جے ہو' نے بہترین سانگ کے لئے دو آسکر انعامات تو حاصل کئے ہی تھے، اس کے علاوہ امریکہ اور یوروپ میں بھی ان کو اس نغمہ اور موسیقی کی ماہرانہ صلاحیت کے لئے کئی انعامات سے نوازا جاچکا ہے۔ انہیں بہترین موسیقی کے لئے ۲۰۰۸ء کے Bafta Critics

Choice Award، براڈ کاسٹ فلم کرٹیک ایسوسی ایشن کی جانب سے بہترین کمپوزر اور کرٹیک چوائس ایوارڈ، بی ایم آئی فلم اینڈ ٹی وی ایوارڈ، گولڈن گلوب ایوارڈ فور دی بیسٹ اوریجنل اسکور، ایم ٹی وی مووی ایوارڈ فور دی بیسٹ سانگ فرام اے مووی' بیسٹ اوریجنل اسکور کے لئے شکاگو فلم کرٹیکس ایسوسی ایشن ایوارڈ اور فلم کے لئے تحریر کردہ بہترین نغمہ کے لئے ورلڈ ساؤنڈ ٹریک ایوارڈ جیسے متعدد انعامات سے سرفراز کیا جاچکا ہے۔ ایک اسٹیج پروڈکشن 'لارڈ آف دی رنگ اور ایک چینی فلم' واریرز آف ہیول اینڈ ارتھ' کو اپنی بے مثال موسیقی سے سجانے اور سنوارنے کے علاوہ فلم 'بامبے' کے لئے ترتیب کردہ ان کی تھیم موسیقی پر تبصرہ کرتے ہوئے ٹائم رسالے نے اسے ''ایسی ۱۰۰ البموں میں شامل کرنے کی سفارش کی تھی، جنہیں اپنی موت سے قبل کسی بھی شخص کو ضرور سن لینا چاہئے''۔ اس کے علاوہ اے آر رحمٰن ایسے پہلے ہندوستانی موسیقار ہیں، جنہوں نے انفرادی زمرے میں یہ گریمی ایوارڈ حاصل کئے ہیں۔ اس سے قبل جن ہندوستانی موسیقاروں کو گریمی ایوراڈز سے سرفراز کیا جاچکا ہے، ان سبھی کو یہ ایوارڈز مغربی موسیقاروں کے اشتراک سے ترتیب دی جانے والی ان کی مشترکہ کوشش کے لئے ہی دیئے گئے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں پنڈت روی شنکر نے جو پہلا گریمی ایوراڈ حاصل کیا تھا وہ ان کی اور یہودی مینوہن کی مغربی کلاسیکی پر مبنی موسیقی کی ایک ملی جلی کوشش کا ہی نتیجہ تھا۔ پنڈت روی شنکر کو دوسرا اور تیسرا مغربی موسیقاروں کے ساتھ ان کی مشترکہ پیش کش کے لئے ہی ۱۹۷۲ء اور ۲۰۰۱ء میں دیا گیا تھا۔ اسی طرح طبلہ نوازی کے مشہور فنکار استاد ذاکر حسین کو ۱۹۹۱ء میں بیسٹ ورلڈ میوزک البم اور ۲۰۰۹ء میں Contemporary ورلڈ میوزک البم کے لئے جو کہ دوسرے فنکاروں کے ساتھ ان کی ایک ملی جلی مشترکہ کوشش ہی کا نتیجہ تھی، گریمی ایوارڈز سے سرفراز کیا گیا تھا جبکہ وشوموہن بھٹ نے بھی ۱۹۹۴ء میں یہ انعام دوسرے مغربی فنکاروں کے ساتھ کی گئی ایک مشترکہ کوشش' بیسٹ ورلڈ میوزک البم کے تحت ہی حاصل کیا تھا۔ ان کے ایک ساتھ رسول پوکٹی کے مطابق ''یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ رحمٰن کو جو بھی ایوارڈ دیا جاتا ہے، وہ ہر طرح سے اس کے لائق و مستحق ہوتے ہیں اور مجھے پورا یقین تھا کہ انہیں ایک دن ضرور اس ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا جائے گا۔ 'سلم ڈاگ ملینیئر' کا ساؤنڈ ٹریک اور خاص طور پر اس کے نغمہ 'جے ہو' کی پوری دنیا میں ستائش کی گئی ہے۔ رحمٰن کی اس کامیابی کو عالمی سطح پر تخلیقی شعبے میں ایک طرح سے

ہندوستان کے سپر پاور بن کر ابھرنے کا نقیب مانا جاسکتا ہے۔مشہور فلم ساز وہدایت کار شیکھر کپور کا کہنا ہے کہ اے آر رحمٰن اب سلم ڈاگ سے آگے بڑھ کر ہالی ووڈ پر قبضہ کی جانب گامزن ہیں۔

مشہور شاعر قلم کار وفلم ساز گلزار کا کہنا ہے کہ رحمٰن ہمارے دور میں پیدا ہونے والے عظیم موسیقار ہیں۔رحمٰن مقبول ہندوستانی موسیقی کا عالمی چہرہ ہیں اور بجا طور پر ہمارے لئے یہ ایک قابل فخر حقیقت ہے'۔'جے ہو' نغمہ کو عالمی سطح پر جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے اس کی ایک بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ بین الاقوامی سطح پر اے آر رحمٰن کی شناخت اب ہماری موسیقی کے ایک سفیر کے طور پر کی جانے لگی ہے۔رحمٰن کی اس نمایاں کامیابی کے پورے ملک میں منائے جانے والے جشن میں لوگوں نے شاید اس بات کو بھلا دیا ہے کہ رحمٰن کے ساتھ نغمہ نگار گلزار کو بھی گریمی ایوارڈ اور ٹرافی سے نوازا گیا ہے، کیونکہ وہ آسکر ایوارڈز کی ہی طرح انعامات کے تقریب میں لاس اینجلز میں شرکت نہیں کر پائے تھے اس لئے ان کی ٹرافی انہیں بعد میں بھیجی جائے گی۔رحمٰن کے ساتھ آسکر انعام حاصل کرنے والے ان کے ساتھی پوکٹی کا کہنا ہے کہ جہاں ایک طرف آسکر انعامات کو کسی بھی ایکٹر کی معراج مانا جاتا ہے، وہیں دوسری جانب گریمی ایوارڈز کسی بھی موسیقار کے لئے ایک بہت بڑی کامیابی اور قدر ومنزلت کا درجہ رکھتے ہیں۔اب جبکہ اے آر رحمٰن اس ایوارڈ کو حاصل کر چکے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پوری دنیا توجہ اور دلچسپی سے ہماری طرف دیکھ رہی ہے۔ہندوستانی موسیقاروں کا دور اب شروع ہو چکا ہے، جس کا انہیں ایک ریسٹورینٹ میں 'جے ہو' گانے کی دھن پر کچھ نوجوانوں کو رقص کرتے دیکھ کر بیحد خوشی ہوئی تھی۔اگر چہ یہ نوجوان گانے کے بول سمجھنے سے قاصر تھے، لیکن وہ اس کی موسیقی و لے پر بیحد والہانہ انداز میں رقص کر رہے تھے، جو کہ اس نغمہ کی دل کو چھو لینے والی موسیقی کا ہی نتیجہ تھا''۔انہوں نے کہا کہ رحمٰن کے ساتھ تعلق ان کے لئے ایک قابل فخر امر ہے۔وہ ایک ایسے انسان ہیں، جنہوں نے فاصلوں اور سرحدوں کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے اور آج پوری دنیا ہی ان کی لازوال موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔

☆☆☆

موسیقار ۔ روی

خورشید اختر فرازی

ایس ڈی برمن، نوشاد علی، مدن موہن، کلیان جی آنند، لکشمی کانت پیارے لال، شنکر جے کشن، سلیل چودھری جیسے عظیم موسیقاروں کے درمیان ایک نام روی کا بھی ہے۔روی ایک ایسے بہترین موسیقار رہے ہیں جنہوں نے ہمیشہ تازگی سے بھر پور موسیقی کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ وہ کسی سے بھی کم نہیں ہیں۔روی نے ہندی، ملیالم، پنجابی، گجراتی، تیلگو اور کنٹر زبانوں میں بنی فلموں میں موسیقی دی وہ انتہائی نرم گفتار، ملنسار، پرخلوص انسان ہیں اور اپنی ساری اچھائیاں انھوں نے اپنی موسیقی میں بھر دی تھیں اور یہی وجہ ہے کہ ہندی فلموں میں ان کی موسیقی کو سننے کے بعد ہمیشہ ہی ایک تازگی کا احساس ہوا۔۳/ مارچ ۱۹۲۶ء کو روی کی پیدائش ہوئی اور ان کی فلموں نے سلور، گولڈن اور پلاٹینم جبلی تک منائی لوگ روی کی موسیقی کو کبھی بھی بھول نہیں سکتے، خاص طور پر ''وقت'' چودھویں کا چاند، گمراہ، پھول اور پتھر، ہمراز، دوکلیاں جیسی فلموں کے گیت آج بھی ذہن کو گرماتے ہیں۔ویسے تو روی نے محمد رفیع کو بہت ساری فلموں میں ساتھ لیا لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے فیوریٹ سنگر مہندر کپور ہی تھے۔اور اس زمانے میں مہندر کپور اور روی کی جوڑی کو لازم وملزوم سمجھا جاتا تھا۔فلم ہمراز، گمراہ آدمی اور انسان میں انھوں نے خاص طور پر مہندر کپور کو لیا لیکن وقت اور چودھویں کا چاند دو ایسی فلمیں ہیں جن میں خاص خاص گیت محمد رفیع کے ہی تھے۔

روی ۲۰۰۶ء میں چینئی میں سنسکریتی کلاشری ایوارڈ لینے پہنچے تھے جہاں انھوں نے اپنی زندگی کی موسیقی کا سفر کے بارے میں طویل گفتگو کی اور ان تمام یادوں کو یکجا کیا جب مختلف پلے بیک سنگروں خصوصاً لتا، رفیع، آشا، مہندر، مناڈے اور کشور کمار کے ساتھ کام کیا۔ان کی نظر میں گیتا دت کی بیحد عزت تھی اور وہ انہیں ایک ناقابل فراموش سنگر تسلیم کرتے تھے، دیویندر گوئل نے انہیں سب سے پہلے اپنی فلم وطن میں لیا اور وہ اس یادگار لمحے کو کبھی بھی بھول نہیں سکتے، اس فلم کا ایک گیت ''چندا ماما دور کے، جو کہ مہالکشمی اسٹوڈیو میں ریکارڈ کیا گیا تھا وہ گیت آج بھی دلوں میں گدگدیاں پیدا کرتا ہے۔

فلم وقت کے چند ناقابل فراموش گیتوں میں کل جہاں بستی تھی خوشیاں، آج ہے ماتم وہاں وقت لایا تھا بہاریں، وقت لایا ہے خزاں۔او میری زہرہ جبیں، تجھے معلوم نہیں، تو ابھی تک ہے حسیں اور میں جواں، تجھ پہ قربان میری جان میری جان۔اس طرح لپٹ کے آپ کی بانہوں میں آگئے۔آگے بھی

جانے نہ تو۔ پیچھے بھی جانے نہ تو، جو بھی ہے بس ایک پل ہے۔ راما نند ساگر کی فلم ''آنکھیں'' میں ہر طرح کے جذبات کا اعلان ہے۔ آنکھیں، شبنم کبھی شعلہ کبھی طوفان ہے آنکھیں۔ غیروں پہ کرم اپنوں پہ ستم اے جانِ وفا یہ ظلم نہ کر۔ ملتی ہے زندگی میں محبت کبھی کبھی۔ دے دے تجھ کو رام تجھ کو اللہ دے دے، دے داتا کے نام تجھ کو اللہ رکھے، بی آر چوپڑہ کی فلم آدمی اور انسان میں بھی روی نے بہت ہی اچھی اچھی دھنیں بنائی تھیں، فلم گمراہ بی آر چوپڑہ کی سب سے بہترین فلم ہے جس میں یہ گیت۔ تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا۔ ہم آپ کی آنکھوں میں دل کو بسا لیں تو۔ ہم موند کے پلکوں کو زلفیں ہی گرا دے تو، او پی رلہن کی فلم پھول اور پتھر میں۔ شیشے سے پی یا پیمانے سے پی، یا میری آنکھوں کے میخانے سے پی، پر پی دیوانے، خوشی سے جی دیوانے، ایم صادق کی فلم ''چودھویں کا چاند'' میں ''ملی خاک میں محبت، جلا دل کا آشیانہ، بہو بیگم میں، نہ تو کارواں کی تلاش ہے نہ تو ہمسفر کی تلاش ہے وغیرہ چند ایسے گیت ہیں جس نے روی کو فن کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا تھا۔ روی نے کہا کہ میری زندگی میں دیویندر گوئل اور ہیمنت کمار بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ گوئل نے مجھے سب سے پہلے وچن میں موقع دیا اور ہیمنت کمار نے مجھے اپنا اسسٹنٹ بنا کر میرے حوصلوں کو جگایا اور میں ان دونوں کا احسان کبھی بھی بھول نہیں سکتا۔

اپنے خاندان کے بارے میں روی نے بتایا کہ میرے والدین کنہیا لال شرما اور تاروانی نے میری مخالفت نہیں کی تھی جب میں نے انہیں بتایا کہ میں سنگر بننا چاہتا ہوں تو انہوں نے مجھے ممبئی بھجوانے کا پورا انتظام کیا تھا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کا اپنا فیوریٹ کمپوزر کون ہے تو انھوں نے کہا کہ مجھے سبھی کمپوزر اچھے لگتے ہیں لیکن میں سی رامچندر کو بہت زیادہ پسند کرتا ہوں۔ ان دنوں تاروں کی مدد سے ریکارڈنگ ہوا کرتی تھی اور میرا پہلا گیت جو تاروں کی مدد سے ریکارڈ کیا گیا اس کے کمپوزر سی رامچندر رہی تھے جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ تو سنگر بننے کا خواب لے کر آئے تھے پھر وہ کمپوزر کیسے بن گئے؟ اس پر انھوں نے کہا کہ میں تنہا گیت گانے کا خواہشمند تھا اور میوزک ڈائریکٹرس مجھے صرف کورس میں شامل کرتے تھے۔ آخری گیت جو میں نے کورس میں گایا وہ ہیمنت کمار کی کمپوزنگ میں ''وندے ماترم'' تھا اسی اسٹوڈیو میں پہلی بار میری ملاقات ہیمنت کمار سے ہوئی تھی اور انھوں نے مجھے اسسٹنٹ بننے کی پیشکش کی تھی۔ انھوں نے میری صلاحیت دیکھی اور پھر مجھے مکمل موسیقار بننے میں پوری مدد دی۔ میں نے صرف اپنی کمپوزنگ کی فلموں میں گیت گائے۔ میں نے کئی درجن گیت گائے اور ۵۰/ سے زائد نغمے خود لکھے۔ جب مشہور نغمہ نگار مجروح سلطان پوری کا انتقال ہو گیا تب مجھے اپنی فلموں کے گیت خود

ہی لکھنے پڑے تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کو کل ملا کر ۴۳ ایوارڈز ملے، ان سبھوں میں آپ کو سب سے بہترین ایوارڈ کون سا لگا، اس پر انھوں نے کہا کہ صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو قومی ایوارڈ میرے لئے سب سے بڑا اور پر وقار ایوارڈ تھا۔ لیکن اسی زمانے میں جب اور بڑے ایوارڈز مجھے ملے اور وہ بھی پانچ پانچ مرتبہ میں ان بڑے ایوارڈوں کو فراموش نہیں کر سکتا۔ روی کی ۲۰۰ ہندی فلموں ہیں انہیں سب سے زیادہ چودھویں کا چاند، دو بدن، گمراہ، ایک پھول دو مالی، وقت، نیل کمل لگے۔ نیل کمل کا یہ گیت۔ آجا تجھ کو پکارے میرا پیار اور بابل کی دعائیں لیتی جا جا تجھ کو سکھی سنسار ملے۔ بیحد پسند ہے فلم دو بدن میں رفیع کے چند گیت بیحد مشہور ہوئے تھے، روی سب سے زیادہ محمد رفیع کو ہی پسند کرتے تھے۔ مندرجہ ذیل میں ان کی کمپوزنگ والے چند گیت ملاحظہ کریں۔

ا۔ آشا بھونسلے محمد رفیع ڈوئیٹ۔ جب لیا ہاتھ میں ہاتھ (وچن ۱۹۵۵) (۲) آشا بھونسلے۔ کیسے کہوں میں بات (گہرا داغ ۱۹۶۳) (۳) محمد رفیع۔ یہ وادیاں یہ فضائیں بلا رہی ہیں تمہیں (گمراہ ۱۹۶۳ء) (۴) لتا منگیشکر۔ آپ کی عنایتیں آپ کے کرم (وندنا۔ ۱۹۷۵ء) (۵) لتا منگیشکر۔ لو آ گئی ان کی یاد وہ نہیں آئے (دو بدن۔ ۱۹۶۵ء) (۶) لتا منگیشکر۔ بدلے بدلے میرے سرکار نظر آتے ہیں (چودھویں کا چاند ۱۹۶۰ء) (۷) مہندر کپور۔ آپ آئیں تو (گمراہ ۱۹۶۳ء) (۸) لتا منگیشکر۔ اے میرے دلِ ناداں تو غم سے نہ گھبرانا (ٹاور ہاؤس ۱۹۶۲ء) (۹) محمد رفیع۔ آشا مجھے پیار کی زندگی دینے والے (پیار کا ساگر ۱۹۶۱ء) (۱۰) محمد رفیع۔ حسن سے چاند بھی شرمایا ہے۔ تیسری صورت نے غضب ڈھایا ہے (دور کی آواز ۱۹۶۴ء) (۱۱) لتا منگیشکر۔ ہزار باتیں کہے زمانے (گھٹنا ۱۹۷۴ء) (۱۲) محمد رفیع۔ بھلا کرنے والا بھلائی کئے جا (گھر سنسار ۱۹۵۷) (۱۳) لتا منگیشکر۔ سب کچھ لٹا کے ہوش میں آئے تو کیا کیا (ایک سال ۱۹۵۷ء) (۱۴) سلمٰی آغا۔ فضا بھی ہے جواں جواں (نکاح ۱۹۸۲ء) (۱۵) محمد رفیع۔ رازِ دل ان سے چھپایا نہ گیا (اپنا بنا کے دیکھو ۱۹۶۲ء)

☆☆☆

موسیقار۔ مدن موہن

ڈاکٹر عقیل احمد عقیل

جب ہم کبھی سنجیدہ، روحانیت سے بھرپور، دل کو چھو لینے والے سنگیت کی بات کرتے ہیں تو اردو غزل کو سنگیت میں ڈھالنے والے عظیم اور ناقابل فراموش میوزک ڈائریکٹر آنجہانی مدن موہن کو ہم کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے، اگرچہ اس دور میں ایس ڈی برمن، موسیقار اعظم نوشاد علی، غلام محمد، روی، روشن، سلیل چودھری اور ہیمنت کمار کا طوطی بول رہا تھا لیکن جب کبھی بھی فلمساز و ہدایت کاروں نے اپنی فلم میں سنجیدہ غزل اور خاموش سکون کی تلاش والے گیتوں کو رکھا تو انہیں سب سے پہلے مدن موہن کا نام ہی یاد آیا۔ مدن موہن ان گنے چنے موسیقاروں میں سے ایک تھے جن کا نام ہمیشہ بڑی عزت و احترام کے ساتھ لیا گیا۔ اپنے ۲۵ سالہ فلمی دور میں انھوں نے تقریباً ۱۰۰ فلموں میں سنگیت کا جادو جگایا جن میں سے چند اہم فلموں کے نام ہیں ''عدالت، دیکھ کبیرا رویا، بھائی بھائی، نیلا آکاش، سنجوگ، من موجی، وہ کون تھی، میرا سائی، غزل، ان پڑھ، آپ کی پرچھائی، حقیقت، چراغ، جہاں آرا، ہیر رانجھا، دستک، باورچی، ہنستے زخم، موسم، لیلیٰ مجنوں، ہندستان کی قسم وغیرہ۔

اگرچہ مدن موہن مغربی طرز کے انگریزی دھنوں کو بھی بہت ہی اچھی طرح سے سجا سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے ہلکے قسم کی کلاسیکل موسیقی کو جگہ دی اور اس انداز نے انہیں بین الاقوامی سطح پر شہرت کے بامِ عروج تک پہنچایا۔ وہ خاص طور پر غزل کو ایک خاص دھن عطا کرتے تھے اور اسی بناء پر انہیں غزل کنگ کا خطاب دیا گیا تھا۔ وہ ہمیشہ روایتی ہندوستانی موسیقی کو ترجیح دیتے تھے اور مغربی دھنوں کو انھوں نے حتی الامکان نظر انداز کیا۔ ستار بجانے میں انہیں کمال حاصل تھا اور وہ خاص طور پر اپنی فلموں میں لتا منگیشکر اور محمد رفیع کو ترجیح دیتے تھے ۱۹۵۸ء کی ریلیز فلم جیلر میں ان کی تیار کردہ گیت ''ہم پیار میں جلنے والوں کو چین کہاں آرام کہاں'' بیحد مشہور ہوا تھا۔

۱۹۶۵ء میں وہ بھی پہلی مرتبہ بمبئی میں فلموں میں موسیقی دینے کے لئے آئے۔ وہ ایک بیحد حساس، غیور اور خوددار قسم کے انسان تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ کسی فلم کے لئے گیت تیار کر رہے تھے تو

ایک موسیقار بہت ہی بے سرے انداز میں ستار بجا رہا تھا اور یہ دیکھ کر انہیں اس قدر غصہ آیا کہ انھوں نے ہاتھ مار کر ریکارڈنگ روم کا گلاس توڑ دیا۔ انھوں نے انتہائی غصّے کے عالم میں اس سے کہا کہ تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ اس قدر بے سرا بجاتے ہوئے میرے آرکسٹرا پارٹی میں شامل ہوئے۔ بعد میں اس نے معافی مانگی تو مدن موہن بھی نرم پڑ گئے، اس وقت وہ ۱۹۶۶ء میں ایک سسپنس فلم ''میرا سایہ'' کا وہ گیت تیار کر رہے تھے۔ ''نینوں میں بدرا چھائے''

۱۹۷۳ء میں چیتن آنند کی بیحد جذباتی فلم ''ہنستے زخم'' کے ایک گیت کی ریکارڈنگ '' آج سوچا تو آنسو بھر آئے۔ عمر گزری ہمیں مسکرائے'' کے موقع پر لتا منگیشکر بھی بیحد جذباتی ہو گئی تھیں اور گیت کے ختم ہونے سے پہلے ہی وہ رونے لگی تھیں۔ جس کے بعد مدن موہن نے فوراً لتا سے کہا کہ وہ گھر چلی جائے، وہاں آرام کرے پھر واپس ایک ریکارڈنگ روم میں آئے۔ دوسرے دن اس گیت کی دوبارہ ایک ریکارڈنگ ہوئی اور یہ گیت ناقابلِ فراموش بن گیا۔

مدن موہن کا پورا نام مدن موہن کوہلی تھا اور وہ ۲۵ رجون ۱۹۲۴ء کو بغداد (عراق) میں پیدا ہوئے ان کے والد رائے بہادر چنی لال بالی ووڈ کے مشہور فلم ساز تھے اور ان کا پروقار فلمستان اسٹوڈیو بھی تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے موقع پر مدن موہن نے برٹش انڈین آرمی جوائن کرلی اور ان کے انتخاب کے بعد برٹش آرمی سے ہی انہیں کمیشن ملا، لیکن مدن موہن کا نرم دل فوجی زندگی سے الگ تھا۔ ان کا دل ان سے کچھ اور کہہ رہا تھا کہ اس فوجی زندگی سے نکلو اور دنیا میں نغمے بکھیرو۔ انھوں نے صرف تین چار برس برٹش آرمی کی نوکری کی پھر میوزک کمپوز کرنے لگے، پھر انھوں نے برٹش آرمی کی نوکری ترک کی اور لکھنؤ چلے آئے اور وہاں آل انڈیا ریڈیو کے لئے کام کرنے لگے، طلعت محمود اور ملکہ غزل بیگم اختر کے ساتھ انھوں نے کئی غزلیں ریکارڈ کرائیں۔ مدن موہن ۱۹۴۰ء کے دور میں انیل بسواس کے اسسٹنٹ تھے جو اس زمانے کے بہت ہی مشہور میوزک ڈائریکٹر مانے جاتے تھے۔ مدن موہن کے چند مشہور گیت'' تم مل گئے ہو (ہنستے زخم) دو گھڑی جو پاس آ بیٹھے (گیٹ وے آف انڈیا) تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے (چراغ) ہم پیار میں جلنے والوں کو چین کہاں، آرام کہاں (جیلر)

مدن موہن نے لتا کے علاوہ گیتا دت کی آواز کو بھی استعمال کیا۔ فلم (''بھائی بھائی'' ۱۹۵۶ء) اے دل مجھے بتا دے تو کس پہ آ گیا ہے، آنکھیں ملانے کیلئے (چندن ۱۹۵۸ء) صبا سے یہ کہہ دو کہیں اور جائیں (بینک مینجر ۱۹۵۹ء) کوئی شکوہ بھی نہیں کوئی شکایت بھی نہیں (نیند ہماری خواب تمہارے (۱۹۶۶ء) اور جھمکا گرا رے بریلی کے بازار میں (میرا سایہ ۱۹۶۶ء) اور اسی فلم کا یہ گیت ''تو جہاں جہاں چلے گا میرا سایہ ساتھ ہوگا'' اور یہ گیت ''نینوں میں بدرا چھائے'' یہ تمام گیت کرشن چندر کے لکھے ہوئے تھے جسے مدن موہن نے بڑی خوبصورتی سے تیار کیا تھا۔ ویسے مدن موہن کے فیوریٹ شاعر راجہ مہدی علی خاں تھے اور فلم نیا آ کاش کا یہ گیت ''آخری گیت محبت کا سنا دوں تو چلوں (۱۹۶۷ء) (ریلوے پلیٹ فارم (۱۹۵۵ء) کا یہ گیت ''بستی بستی پر بت پر بت گاتا جائے بنجارہ، اب بھی کانوں میں رس گھولتا نظر آتا ہے۔ وہ محمد رفیع کو اپنا فیوریٹ گلوکار تصور کرتے تھے۔

۱۹۶۴ء کی ریلیز ''وہ کون تھی'' میں ''نینا برسے رم جھم رم جھم'' اس کے علاوہ اگر مجھ سے محبت ہے تو تم میری قسم لے لو (ان پڑھ ۱۹۶۲ء) عدالت ۱۹۵۸ء۔ سنجوگ (آپ کی نظروں نے سمجھا پیار کے قابل مجھے) جانا تھا ہم سے دور بہانے بنا لئے اور ''وہ بھولی داستاں لو پھر یاد آ گئی'' وغیرہ ایسے گیت تھے جن کا نعم البدل کوئی نہیں۔

اس کے علاوہ ''میری بینا تم بن روئے (دیکھ کبیرا رویا ۱۹۵۷ء) یہ راگ بھیروں تھا۔'' حال دل انہیں سنایا نہ گیا (جہاں آرا ۱۹۶۴ء) دو دل ٹوٹے دو دل ہارے (ہیرارانجھا) یہ دنیا یہ محفل میرے کام کی نہیں (ہیر رانجھا) ہمسفر آج اپنا چھوڑ چلے (آخری داؤ ۱۹۵۸ء) اور اسی فلم کا یہ گیت ''تجھے کیا سناؤں میں دل ربا....میری زندگی کا سوال ہے'' یہ ہوا یہ رات یہ چاندنی (سنگدل ۱۹۵۲ء) اس گیت کی تیاری پر استاد سجاد خان مدن موہن پر بگڑ اٹھے تھے اور انھوں نے ان پر ان کے انداز کو اپنا لینے کا الزام عائد کیا تھا۔ بعد میں مدن موہن نے خود اس کا اقرار کیا کہ یہ دھن دراصل سجّاد حسین ہی کی ہے اور وہ انہیں نئے انداز میں ڈھال کر ایک تجربہ کر رہے تھے۔ حقیقت کا یہ گیت محمد رفیع کی آواز میں ''اب تمہارے حوالے وطن ساتھیوں'' ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یادگار بن گیا ہے۔ بعد

میں انو ملک نے اسی انداز میں فلم بورڈر میں ''کہ گھر کب آؤ گے'' اپنایا تھا۔

ایک مرتبہ جب بڑے غلام علی خان نے مدن موہن کی راگ بھیروں میں تیار کردہ یہ گیت ''قدر جانے نہ'' سنا تو انھوں نے مدن موہن کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا کہ تمہارے اندر ایک سچی لگن ہے اور تم دنیا میں بہت نام کماؤ گے۔ استاد کی اس بات پر مدن موہن نے کہا تھا کہ یہ الفاظ میرے لئے آسکر ایوارڈز سے بھی بڑھ کر ہیں۔ جب موسیقارِ اعظم نوشاد علی نے مدن موہن کی تیار کردہ یہ گیت سماعت کی ''یہ حسرتوں کے داغ'' اور ان کو یہ شکایت ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے اور ''جانا تھا ہم سے دور بہانے بنا لئے۔ (عدالت ۱۹۵۸ء) تو انھوں نے کہا کہ اس دور کا سب سے ذہین اور عمدہ موسیقار مدن موہن ہی ہے، لتا منگیشکر کی آواز میں ''قدر جانے نہ'' جب او۔ پی۔ نیّر نے سنی تو کہا کہ مدن جی ہی لتا کی آواز کو صحیح ڈھنگ سے استعمال کر سکتے ہیں واضح رہے کہ او۔ پی۔ نیّر نے کبھی بھی لتا منگیشکر کی آواز کا استعمال نہیں کیا۔

مدن موہن نے اس کے علاوہ (مدہوش ۱۹۵۱ء) میں ''میری یاد میں تم نہ آنسو بہانا'' (آشیانہ ۱۹۵۲ء) میں پاگل تیرا منوا پاگل'' فلم سنجوگ (۱۹۶۱ء) بھولی ہوئی یادیں مجھے اتنا نہ ستاؤ اور ۱۹۷۵ء میں فلم موسم کا یہ گیت ''دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن۔ دیکھ کبیرا رویا'' کون آیا میرے من کے دوارے'' طلعت کی آواز میں ''ہم سے آیا نہ گیا تم سے بلایا نہ گیا....بھائی بھائی میں کشور کمار کی آواز میں ''میرا نام عبدالرحمٰن اور (من موجی ۱۹۶۲ء) میں ضرورت ہے ضرورت ہے، شریمتی کی سیوا کرے جو بن کی۔ اور ۱۹۵۹ء میں چاچا زندہ باد کا یہ گیت ''اے حسینوں نازنینوں یاد رکھے جانے کے قابل ہیں۔

☆☆☆

شکیل بدایونی کے نغموں میں سماجی سروکار

نشاط حسن نشی

شکیل بدایونی فلمی نغمہ نگاروں میں امتیازی حیثیت کے حامل ہیں جنہوں نے ادبی دنیا میں بھی اپنی شناخت قائم کی ہے اور غزلیہ شاعری کو نئے رنگ وآہنگ دیے ہیں۔ ساحرلدھیانوی نے سچ لکھا ہے کہ ''جگر اور فراق کے بعد آنے والی پود میں شکیل بدایونی ہندوستان کے واحد شاعر ہیں جنہوں نے اپنے فن کے لیے غزل کا میدان منتخب کیا ہے اور قدیم مگر جامع اور دلکش صنف سخن کو جس میں ہمارے ماضی کا بہترین ادبی اور تہذیبی اثاثہ موجود ہے، نہ صرف اپنایا ہے بلکہ اسے زندگی کے بدلتے ہوئے رجحانات اور جدید تصورات سے ہمکنار کرتے ہوئے اس میں نئے رنگ بھی بھرے ہیں۔'' انہوں نے اپنی فلمی شاعری میں بھی تغزل کو برقرار رکھا ہے اور وہاں بھی ان جمالیاتی صفات کا پاس رکھا ہے جن سے غزل عبارت ہے۔ جس طرح ان کی غزلیہ شاعری میں پاکیزگی اور طہارت ہے اسی طرح ان کی فلمی شاعری میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے لکھا ہے کہ شکیل کے اندرونی تجربوں کی معنی آفرینی اور ندرت کافی متاثر کرتی ہے۔ انداز بیاں کا چوٹیلا پن، لہجے کی طہارت، پاکیزگی، تغزل کی رمزیت اور ایمائیت بھی قابل غور ہے۔ ان کے جذباتی عناصر میں زندگی کے نقوش پوشیدہ ہیں۔ غزل کی اشاراتی زرخیزی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنے تجربوں میں شدت پیدا کی ہے۔ غنائیت اور نغمگی دیرپا اور پائیدار نظر آتی ہے۔''

شکیل بدایونی کی شاعری میں آہنگ کی کیفیت اور تخیل اور جذبے کی ہم آہنگی ہے بقول شکیل الرحمٰن ''وہ رومانی شاعر ہیں اور ان کے خواب نہایت ہی البیلے اور دلفریب ہیں۔'' یہی وجہ ہے کہ قاری ان کے خوابوں کی رومانیت سے مسحور ہو اٹھتا ہے مگر ان کی شاعری میں صرف خوابوں کی رومانیت نہیں بلکہ سماجی شعور بھی ہے اور یہ معاملہ صرف ان کی غزلیہ شاعری کا نہیں ہے بلکہ فلمی نغموں کا بھی ہے جہاں ان میں خواب اور رومان ہیں وہیں سماجی سروکار بھی ہیں۔ وہ اپنے نغموں میں ان مسائل کو جگہ دیتے ہیں جن کا تعلق عام انسانی زندگی سے ہے۔ وہ تمام مسئلے جو سماج کا حصہ ہیں کہ جن

کی وجہ سے سماج میں پیچیدگیاں جنم لیتی ہیں۔ انہوں نے اپنے فلمی نغموں میں بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ خواہ وہ مسئلہ خاندانی انتشار کا ہو، رشتوں میں دراڑ کا ہو، غربت، بھوک، دہشت یا ظلم وجبر کا ہو، ان کے نغموں میں سماج سے جڑے یہ تمام مسائل جگہ پاتے رہے ہیں اور یوں بھی فلمی نغمہ نگاری میں عوامی زندگی اور احساسات کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ اس لیے شکیل بدایونی نے اپنے فلمی نغموں میں سماجی مسائل کو ترجیحی طور پر پیش کیا ہے اور اپنے افکار وخیالات کی عوام تک ترسیل کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انہوں نے جتنی فلموں کے لیے نغمے لکھے ان میں بیشتر فلمیں سماجی موضوعات پر مبنی ہیں فلموں کے موضوعات اور سچویشن کے اعتبار سے انہوں نے ایسے نغمے تخلیق کیے جن سے سماج کو مثبت پیغام ملے۔ فلم 'درد' کا یہ نغمہ بھی دراصل ان کے سماجی شعور ہی کا عکاس ہے۔

ہم درد کا افسانہ دنیا کو سنادیں گے
ہر دل میں محبت کی ایک آگ لگا دیں گے
ہوجائے گی پھر دنیا آباد یتیموں کی
گونجے گی زمانے میں فریاد یتیموں کی
روتے ہوئے نغموں سے طوفان اٹھادیں گے

اس نغمے میں جس دردمندی اور محبت کا بیان ہے اس درد کا بہت ہی گہرا رشتہ ہمارے سماج سے ہے۔ ہمارے سماج میں یتیموں کی کثرت ہے، یہ وہ طبقہ ہے جس کے لیے درد کا احساس ہر دل میں ہے۔ شکیل بدایونی نے اس نغمے میں یتیمی کے درد کو بیان کیا ہے اور اس کے ذریعہ ہمارے سماجی اور اجتماعی ضمیر کو للکارا ہے۔

احسان یتیموں کی تقدیر پہ کر ڈالو
فریاد ہے دل والو فریاد ہے دل والو

یہ سماج کے نام ایک انتہائی دردمندانہ پیغام ہے۔ شکیل بدایونی کے دل میں غریبوں اور بے کسوں کا درد تھا، شاید انہوں نے سماج کے اس طبقے کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ فلم 'میلہ' کا یہ نغمہ بھی ان کی دردمندی کے احساس کا مظہر ہے

غریبوں پر جو ہوتی ہے جفائیں کون سنتا ہے
زمانے میں دکھے دل کی صدائیں کون سنتا ہے
غم کا فسانہ کس کو سنائیں
ٹوٹا ہوا دل کیسے دکھائیں

شکیل بدایوانی کے لیے سب سے بڑا مسئلہ انسانیت اور محبت کی مشعل جلانے کا تھا کہ اسی سے سماج کو روشنی ملتی ہے اور اسی سے سماج صحت مند ہوتا ہے۔ سماج دراصل نام ہی ہے ایک دوسرے سے ربط کا، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شامل ہونے کا۔ فلم 'انوکھی ادا' کا یہ نغمہ بھی انسانیت سے گہرے لگاؤ کی عکاسی کرتا ہے۔

منزل کی دھن میں جھومتے گاتے چلے چلو
بچھڑے ہوئے دلوں کو ملاتے چلے چلو
دو دن کی زندگی میں کوئی کیوں اٹھائے غم
نغمے خوشی کے سب کو سناتے چلے چلو
انسانیت تو پیار محبت کا نام ہے
انسانیت کی شان بڑھاتے چلے چلو

شکیل بدایوانی نے دکھ درد کے احساس کو شیریں زباں دی ہے اور اس احساس کو جگایا ہے جس سے انسانوں کے درمیان آپسی رشتے مستحکم ہوں۔ انہوں نے سماج کے ایسے لوگوں کے خلاف آواز بلند کی ہے جو انصاف کا راستہ بھول کر ظلم و جبر کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور اپنے عمل سے سماج کے اس طبقے کو اذیت پہنچاتے ہیں جنہیں دنیا سے محبت کی شدید ضرورت ہے۔ فلم 'امر' کا یہ نغمہ شکیل بدایونی کے ذہن کی شیریں تعبیر سامنے لاتا ہے، جس میں انسانیت کا درد بھی ہے، عدل وانصاف کی روایت کی وہ روشنی بھی جس سے کائنات کا نظام مربوط اور منظم رہتا ہے۔

دکھ دے کے جو دکھیا سے نہ انصاف کرے گا
بھگوان بھی اس کو نہ کبھی معاف کرے گا

یہ سوچ لے ہر بات کی داتا کو خبر ہے
ہے پاس ترے جس کی امانت اسے دے دے
نردھن بھی ہے انسان محبت اسے دے دے

شکیل بدایوانی نے سماج کے ہر رنگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کے بنتے بگڑتے رشتے کو محسوس کیا تھا، سماج کے بدلتے رویے پر ان کا یہ طنز دیکھئے۔

چلو اچھا ہوا اپنوں میں کوئی غیر تو نکلا
اگر ہوتے سبھی اپنے تو بیگانے کہاں جاتے

فلم 'امر' کا یہ نغمہ سماج کے اسی رنگ کو واضح کرتا ہے جہاں انسان کو اپنوں سے بھی غیرت اور اجنبیت کا صلہ ملتا ہے۔ اپنوں کی بیگانگی پر یہ گہرا طنز ہے۔ شکیل بدایوانی نے سماج کے اونچے، نچلے طبقات، مختلف زمروں اور خانوں میں بٹے ہوئے لوگوں کو نفسیات کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ انسانی افراد کی اس تقسیم سے انہیں نفرت بھی ہے اور وحشت بھی۔ وہ انسانوں کے مابین مساوات کے قائل ہیں اور اسی تصور مساوات کی تعبیر فلم 'شباب' کے اس نغمے میں نظر آتی ہے۔

محلوں میں رہنے والے ہمیں تیرے در سے کیا
نگری ہے اپنی پیاری ہمیں اونچے گھر سے کیا
چھوٹا بڑا نہ کوئی برابر ہیں سب یہاں
پیدا کیا جس نے اسی کا ہے یہ جہاں
اس کا ہی آسرا ہے ہمیں دنیا بھر سے کیا
محلوں میں رہنے والے......
او دینے والو ہمیں نہ دولت کی بھیک دو
جھولی ہے دل کی خالی محبت کی بھیک دو
بھوکے ہیں اک نظر کے ہمیں مال و زر سے کیا
محلوں میں رہنے والے......

'مدر انڈیا' کا یہ گیت بھی اسی سماجی دردمندی سے عبارت ہے جہاں پوری دنیا کے لئے روٹی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔اس نغمے میں بھی اسی انسانیت کی تلاش ہے جو اچھائیوں اور برائیوں کا مرکب ہے۔

نہ میں بھگوان ہوں نہ شیطان ہوں
دنیا جو چاہے سمجھے میں تو انسان ہوں
مجھ میں بھلائی بھی مجھ میں برائی بھی
لاکھوں ہیں میل دل میں تھوڑی صفائی بھی
تھوڑا سا نیک ہوں تھوڑا بے ایمان ہوں
نہ میں بھگوان ہوں، نہ شیطان ہوں
نہ کوئی راج ہے نہ سر پہ تاج ہے
پر ہمارے دم سے اس دھرتی پہ لاج ہے
تن کا غریب ہوں من کا دھنوان ہوں
نہ میں بھگوان ہوں.......
جیون کا گیت ہے سر میں نہ تال میں
الجھی ہے ساری دنیا روٹی کے جال میں
کیسا اندھیرا ہے میں بھی حیران ہوں
نہ میں بھگوان ہوں...........

شکیل بدایوانی نے زندگی کی خوشیوں، دکھ، زندگی کی رونقوں اور ویرانیوں کو بھی اپنے نغموں میں پیش کیا ہے۔سماج کا ہر وہ رنگ جو انسانی ذہن کو مرتعش یا مضطرب کرسکتا ہوا سے انہوں نے اپنے نغمے کا حصہ بنایا ہے۔فلم 'سونی مہیوال' میں خوشی اور غم کے دو متضاد احساس کو انہوں نے مربوط کرکے پیش کیا ہے اور یہ احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ دکھ اور سکھ ایک ہی آنگن کے پھول ہیں جو کبھی کھل جاتے ہیں تو کبھی مرجھا جاتے ہیں۔زندگی شاید اسی کا نام ہے۔غم اور خوشی دونوں زندگی سے

جڑے ہیں۔شکیل بدایونی کا یہ نغمہ ملاحظہ کریں اس میں دو احساس ایک ساتھ جمع ہوگئے ہیں جس کی وجہ سے نغمے میں عجب سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

عید کا دن ہے تیرے بن ہے پھیکا
آجا آجا کہ دن ہے خوشی کا
ہم اکیلے اور یہ میلے عید ہے اور تیری یاد ہے
چاند نکلا نہ میری خوشی کا عید کیسی جو غم ہو کسی کا
میں قفس میں غم کے بس میں زندگی میری برباد ہے
عید مل جا کہ دل کا مٹے غم جانے اگلے برس ہوں نہ ہوں ہم
کچھ بھروسہ نہیں زندگی کا، آجا آجا کہ دن ہے خوشی کا

شکیل بدایونی کو سماج میں ظلم اور جبر کے بڑھتے شکنجے کا بھی احساس تھا اور اس کا بھی خیال کہ آج کے دور کا انسان، انسان کا دشمن ہے۔انہوں نے انسانی قدروں کے زوال پر بھی افسوس کا اظہار کیا ہے۔دنیا کو ایک ستمگر کی شکل میں دیکھا ہے۔سماج کے یہ وہ رنگ ہیں جو ہر جگہ آسانی سے نظر آجاتے ہیں۔شکیل نے اپنے نغمے میں سماج کا یہ منظر پیش کیا ہے۔فلم 'کوہ نور' کا یہ نغمہ دیکھئے۔

یہ کیا زندگی ہے یہ کیسا جہاں ہے
جدھر دیکھئے ظلم کی داستاں ہے
کہیں ہے قفس میں کسی کا بسیرا
کہیں ہے نگاہوں میں غم کا اندھیرا
کہیں دل کا لٹتا ہوا کارواں ہے
یہاں آدمی آدمی کا ہے دشمن
یہاں چاک انسانیت کا ہے دامن
محبت کا اجڑا ہوا آشیاں ہے
یہ بے رحم دنیا سمجھ میں نہ آئی

یہاں کررہے ہیں ستمگر خدائی
نہ جانے تو اے دنیا والے کہاں ہے

شکیل کا بنیادی پیغام محبت تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سماج میں چلنے والی نفرت کی آندھیوں کا رخ موڑنے کے لیے محبت کے چراغ روشن کئے۔ مذہبی بنیادوں پر منافرت کے منطق کو مسترد کرتے ہوئے وحدت انسانی کا پیغام دیا اور یہ بھی احساس دلایا کہ جس دل میں پیار نہ ہو وہ انسان نہیں پتھر ہے۔ فلم 'مغل اعظم' میں یہی وہ احساس محبت ہے جو سامعین کے دلوں میں بھی محبت کے چراغ جلا دیتا ہے۔ انہوں نے محبت کی راہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو ختم کرنے اور راہ محبت میں شہید ہونے والے کے جذبے کی ستائش کی ہے۔

پیار کی آندھی رک نہ سکے گی نفرت کی دیواروں سے
خون محبت ہو نہ سکے گا خنجر سے تلواروں سے
پیار کے دشمن ہوش میں آ ہو جائے گا برباد
زندہ باد زندہ باد اے محبت زندہ باد
مرجاتے ہیں عاشق زندہ رہ جاتی ہے یاد
زندہ باد زندہ باد اے محبت زندہ باد
عشق بغاوت کر بیٹھے تو دنیا کا رخ موڑ دے
آگ لگا دے محلوں میں اور تاج شاہی توڑ دے
سینہ تانے موت سے کھیلے کچھ نہ کرے فریاد
زندہ باد زندہ باد اے محبت زندہ باد
تاج حکومت جس کا مذہب پھر اس کا ایمان کہاں
جس کے دل میں پیار نہ ہو وہ پتھر ہے انسان کہاں
پیار کے دشمن ہوش میں آ ہو جائے گا برباد
زندہ باد زندہ باد اے محبت زندہ باد

شکیل بدایونی نے فلموں کے لیے جو نغمے لکھے ہیں ان میں انہوں نے سماجی احساسات کی بھرپور عکاسی کی ہے اور سماج کے دکھ درد کو اپنے دل میں جذب کر کے شاعری کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ اپنی شاعری میں سماجی سروکار کی عکاسی سے ان کا مقصد صحت مند سماج کی تشکیل وتعمیر ہے وہ سماج کے منفی رجحانات اور رویے کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے جن سے انسان کی بنیادی قدریں مجروح ہوتی ہیں اور جس کی وجہ سے انسانیت زوال کی منزلوں کی طرف بڑھتی ہے۔ وہ اس افتراق اور انتشار کے سخت خلاف تھے جس سے سماج خانوں اور طبقوں میں بٹ کر اپنے بنیادی جوہر سے محروم ہو جاتا ہے۔ سماج کا بنیادی جوہر ربط باہمی ہے اور یہی مفقود ہو جائے تو پھر سماج کی کیا معنویت رہ جاتی ہے۔

شکیل بدایونی کی شاعری میں سماجی استحکام، اتحاد اور سالمیت کے مثبت اشارے ملتے ہیں۔ شکیل بدایونی نے سماج کو مقدس خوابوں کے ساتھ ساتھ روشن خیالات بھی دیے ہیں اور سماج کو ان کی بہت بڑی عطا ہے کہ انہوں نے سماجی مسائل کی دانشورانہ تعبیر وتفہیم کے بجائے عوامی تعبیر پر زیادہ توجہ دی ہے تاکہ ترسیل کی دشواری نہ ہو اور جس طبقے تک وہ اپنا پیغام پہنچانا چاہتے ہیں وہ من وعن پہنچ جائے۔ شکیل بدایونی اپنے اس مقصد میں کامیاب اور کامران نظر آتے ہیں انہوں نے سماج کے منفی قدروں اور مثبت قدروں کی مابین خط امتیاز کھینچ کر عوام کو اس راستے کے لیے آمادہ کیا ہے جس سے سماج محبت اور وحدت کی ایک لڑی میں سما جائے۔ صرف فلمی نغموں میں ہی شکیل نے ایسا نہیں کیا بلکہ ان کی غزلیہ شاعری میں بھی سماجی شعور اور احساس تابندہ نظر آتا ہے۔

شکیل بدایونی صرف ایک فلمی نغمہ نگار نہیں تھے بلکہ ان کی ادبی حیثیت بھی مسلم ہے۔ انہوں نے ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری، جاں نثار اختر اور کیفی اعظمی کی طرح فلم اور ادب دونوں میں اپنے کمالات کے جوہر دکھائے، یہ اور بات کہ فلمی نغمہ نگاری ان کی شہرت کا سبب بنی، مگر غزلیہ شاعری میں بھی ان کا مقام بلند ہے۔ فراق گورکھپوری نے ان کے بارے میں لکھا ہے ''شکیل کی شاعری میں کچھ منزلیں آتی ہیں کہ وہ بھرپور جذبوں، ولولوں اور حوصلوں کی شاعری بن جاتی ہے'' تو جگر مرادآبادی نے ان کی شاعرانہ عظمت کا یوں اعتراف کیا ''شکیل شاعر فطرت ہیں، شاعر کاریگر نہیں۔ ان کا کلام محض لفظی طلسم بندیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ حقیقتاً ان کا کلام ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔''

شکیل بدایونی کا مجموعہ 'رعنائیاں'، 'شبستاں'، 'رنگینیاں'، 'اس بات کا ثبوت ہیں۔ایسا نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی نغمہ نگاری نے ان کی غزل کو مجروح کیا۔تاج سعید نے یہ صحیح لکھا ہے''اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ گیت نگاری شروع کرنے کے بعد اردو غزل کا ایک تابندہ ستارہ غروب ہوگیا بلکہ شکیل نے اردو غزل کے ملائم ورموز اوراس کی تابندگی کی ہمراہی میں گیتوں کے لیے بھی غزل کی زبان استعمال کرنے کی کوشش کی اور کئی جگہ اسے کامیابی بھی حاصل ہوئی۔'' بہرحال یہ کہا جاسکتا ہے کہ فلم اورادب دونوں ہی میں شکیل بدایونی نے گہرے نقوش مرتسم کیے ہیں۔

شکیل بدایونی مشہور وممتاز شاعر ہیں۔انہوں نے 'درد، ناٹک، میلہ، انوکھی ادا، دلّگی، امیر، ہزارراتیں، شاعر، چوربازار، لیلیٰ مجنوں، حور عرب، مستانہ، چودھویں کا چاند، نازنین، گھونگھٹ، یادیں، بابل، دیدار، آن، بیجو باورا، اڑن کھٹولہ، امر، شباب، مدرانڈیا، سونی مہیوال، کوہ نور، مغل اعظم، گنگا جمنا، سنگھار، جان پہچان' جیسی فلموں کے نغمے لکھے ہیں اوران میں سے زیادہ تر فلموں کی خوبی یہ ہے کہ ان کی موسیقی نوشاد جیسے موسیقار نے ترتیب دی تھی جس کی وجہ سے ان کے نغمے بہت مشہور ہوئے۔دوہنسوں کا جوڑا بچھڑ گیورے، چودھویں کا چاند ہو، موہے پنگھٹ پہ نندلال، محبت کی جھوٹی کہانی پہ روئے، کوئی پیار کی دیکھے جادوگری، دوستاروں کا زمین پر ہے ملن ہے آج کی رات، محبت کی راہوں میں چلنا سنبھل کے، میرا سلام لے لو دل کا پیام لے لو، تو گنگا کی موج میں جمنا کی دھارا، مان میرا احسان ارے نادان، بدلے بدلے مرے سرکار نظر آتے ہیں۔تو میرا چاند میں تری چاندنی، افسانہ لکھ رہی ہوں دل بے قرار کا آنکھوں میں رنگ بھرے انتظار کا' جیسے نغمے آج بھی مشہور ومقبول ہیں اوران تمام فلموں اورنغموں میں سماج کے مختلف رنگ پیش کیے گئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شکیل کی سماجی آگہی کا دائرہ نہایت وسیع اور بسیط ہے۔

☆☆☆

ساحر لدھیانوی کے فلمی نغمے

گلشن کھنہ

ساحر لدھیانوی جن کا اصلی نام عبدالحئی تھا ۱۹۲۱ء میں لدھیانہ (پنجاب) میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ مزید تعلیم کے لئے گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں داخل ہوئے مگر اپنے شعری ذوق کی وجہ سے وہاں سے نکال دیے گئے۔اس کے بعد انھوں نے دیال سنگھ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا مگر وہاں سے بھی اپنے ایک معاشقے کی وجہ سے نکال دیے گئے۔ساحر نے کالج کی زندگی کو تعلیمی مقصد کے حصول کا ذریعہ کبھی بھی نہ بنایا۔صرف شاعری ہی انکا اوڑھنا بچھونا تھی۔کالج میں رہ کر وہ کوئی ڈگری تو حاصل نہ کر سکے مگر کالج کی زندگی نے انھیں شاعری کا ایک خوبصورت مجموعہ ''تلخیاں'' دیا جس کی تقریباً تمام نظمیں کالج کے ماحول کی ترجمان اور عکاس تھیں۔ ساحر کے باغیانہ گیت۔ رومان پرور نظمیں۔معاشقے اور جذباتی شاعری اور ہنگامی نظمیں سب کالج کی فضا کی مرہون تھیں۔ ''تلخیاں'' ان کا پہلا مجموعہ کلام تھا جو جذباتی۔رومانی اور انقلابی شاعری کا دلکش امتزاج تھا۔ اس کی اشاعت سے ساحر کی شہرت ملک بھر میں پھیل گئی۔خاص کر جب ساحر صاحب نے اپنی شہرہ آفاق نظم ''تاج محل''، لکھی تو یہ دہلی کے مشہور ادبی رسالے ''آج کل'' میں شائع ہوئی۔ اس نظم نے سارے ہندوستان میں دھوم مچادی اور بچے بچے کی زبان پر یہ شعر گونجنے لگا۔

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

ادب کے ساتھ ساتھ ساحر کو فلمی دنیا سے بھی بچپن سے ہی دلچسپی تھی۔انھوں نے بہت سی فلموں کی تصویریں ایک بڑی سی کاپی میں چسپاں کر رکھی تھیں اور کئی بار ممبئی جانے کا ارادہ بھی کیا مگر اکیلے وہاں جانے کا شاید حوصلہ نہیں تھا۔اگست ۱۹۴۷ء میں جب ملک کی تقسیم ہوئی تو ساحر کچھ مدت تک لاہور میں رہے اور اپنی والدہ کے ساتھ میکلوڈ روڈ پر سکونت اختیار کی۔

پھر کچھ عرصہ بعد ممبئی چلے گئے ان کا مجموعہ کلام تلخیاں خاص و عام میں بہت مقبول ہو چکا تھا۔ ممبئی کے قیام کے دوران ایک سیٹھ نے اپنی فلم کے گانے لکھوانے کے لیے انھیں بلوایا اور ساحر کی عمر اور چہرے مہرے کو دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا آپ ہی ساحر لدھیانوی ہیں؟''

''جی ہاں یہ کتاب میری ہی تحریر کردہ ہے'' ساحر نے جواب دیا۔

اُس سیٹھ نے دوبارہ ساحر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نہیں نہیں تم ساحر نہیں ہو سکتے۔ وہ تو ایک عظیم شاعر ہے اور تم تو ابھی بچے ہو۔'' یہ کہہ کر ساحر کو وہاں سے رخصت کر دیا۔ ساحر جب پہلی بار ممبئی پہنچے تو وہ تک بند فلمی شاعروں کے خلاف جہاد کرنا چاہتے تھے وہ چاہتے تھے کہ فلمی شاعری بھی ادبی شاعری کی طرح وقیع ہو جائے۔ مگر ان دنوں ڈی۔ این۔ مدھوک جیسے شاعر کا ممبئی کا فلم انڈسٹری میں طوطی بولتا تھا اور ان کے لکھے ہوئے فلمی گیت ہرا یرا غیرا گنگنا تا پھرتا تھا مگر ساحر صاحب نے تہذیب سے گرے ہوئے یا سستی شہرت حاصل کرنے والے گیت کبھی نہ لکھے۔ ان کی ادبی شاعری کی آواز دن بدن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ مشاعروں میں ادبی محفلوں میں اور آل انڈیا ریڈیو پر اپنی شعری تخلیقات پیش کرتے تھے اور ان کی مقبولیت دن بدن بڑھتی جا رہی تھی اور وہ برصغیر کا انتہائی مقبول ترین شاعر مانے جانے لگے تھے اور ایسے شاعر کو لوگ دیکھنے۔ سننے اور ملنے کے لیے بیتاب رہتے تھے۔ ساحر جب بھی مشاعروں میں جاتا تو اس کی پذیرائی کے لیے شہر کا شہر امڈ آتا تھا۔ ساحر کی شاعری روایتی شاعری سے قطعاً مختلف تھی۔ وہ اپنے احساس اور تجربات کو مارکسی فلسفے میں سمو کر شعر کہنے کا فن جانتے تھے۔ انھوں نے جمہور اور دختر انِ جمہور کے حقوق کی حفاظت کے لیے اپنے آپ کو اور اپنے قلم کو وقف کر دیا اور کہا:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ساحر لدھیانوی ممبئی پہنچ کر قریب ڈیڑھ دو برس تک فلموں کے گیت لکھنے کے لیے جد و جہد کرتے رہے۔ مگر کامیابی کوسوں دور تھی۔ وہ جب بھی کبھی کسی اسٹوڈیو میں جاتے تو بڑے بڑے پروڈیوسر ڈائریکٹر انھیں دیکھ کر احتراماً کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہو جاتے لیکن جب فلم کے گیتوں

کی بات چلتی تو سب یہی کہتے ''ساحر صاحب آپ برصغیر کے بلند مرتبہ شاعر ہیں اور ہم آپ کا اور آپ کی شاعری کا بے حد احترام کرتے ہیں بلکہ آپ کے دیرینہ مداح ہیں۔ لیکن فلم پر لاکھوں روپیوں کی لاگت آتی ہے اس لیے آپ کے گیت لے کر ہم اپنا نقصان نہیں کرنا چاہتے کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ ایک اچھا ادبی شاعر فلم کے لیے اچھا نغمہ نگار بھی ثابت ہو سکتا ہے۔'' یہاں تک کہ مشہور افسانہ نگار عصمت چغتائی کے شوہر شاہد لطیف جو ایک کامیاب پروڈیوسر ڈائریکٹر بھی تھے اور ''ضدی'' و ''آرزو'' جیسی ہٹ فلمیں بنا چکے تھے۔ نے ایک دن ساحر سے کہا:

''ساحر صاحب آپ کی شعری اور ادبی صلاحیتوں سے ہمیں انکار نہیں۔ دنیائے سخن میں آپ کا امتیازی مقام ہے۔ اس کے باوجود آپ سے فلم کے گانے لکھوانا ایک بڑا خطرہ لینے کے مترادف ہے۔''

ساحر کی فلمی جد و جہد کے ایام طویل اور کڑے ہوتے جا رہے تھے اور ابھی تک قسمت نے یاوری نہیں کی تھی اور ساحر اپنے دوستوں کے ساتھ اندھیری سے چرچ گیٹ تک بس یوں ہی گھومتے رہتے تھے۔ ایک دن وہ ماٹونگا میں پروڈیوسر موہن سہگل کے گھر بیٹھے تھے کہ سہگل صاحب نے ساحر لدھیانوی سے کہا ''ساحر تم ایک کام کرو۔ ان دنوں فلم انڈسٹری میں ایس۔ ڈی۔ برمن میوزک ڈائریکٹر کی بہت مانگ ہے لیکن اسے کوئی ڈھب کا گیت لکھنے والا نہیں ملتا۔ تم کل صبح جا کر اس سے مل لو وہ نئی صلاحیتوں کی قدر کرنے والا میوزک ڈائریکٹر ہے۔ اگر تم نے اس کی مرضی کے مطابق پسند کا گانا لکھ لیا تو یقیناً تم سے پوری فلم کے گیت لکھوائے گا۔''

موہن سہگل کی بات ساحر کے دل میں اتر گئی۔ دوسرے دن وہ ایس۔ڈی۔ برمن سے وقت لے کر گرین ہوٹل کھار چلا گیا۔ ساحر نے کمرے میں پہنچ کر اپنا تعارف کروایا۔ برمن دا بنگالی تھا وہ ساحر کے ادبی مقام کو نہیں پہچانتا تھا مگر پھر بھی ساحر صاحب کو اس نے خوش آمدید کہا اور فلم کے گانے کی دھن اور سچویشن سمجھائی۔ ان دنوں فلم انڈسٹری میں یہ عام رواج تھا کہ نغمہ نگار سے پہلے موسیقار سے کنٹرکٹ کیا جاتا تھا۔ اس کے گیتوں کی مختلف دھنیں سنی جاتی تھیں اور جو دھنیں پروڈیوسر ڈائریکٹر کو پسند آ جاتی تھیں انھیں باقاعدہ ایگریمنٹ کر کے اپنی آنے والی فلم کے لیے محفوظ کر لیا جاتا تھا۔

دھنوں کے بعد مسئلہ گیتوں کے بولوں اور سچوایشن کا ہوتا تھا اور پھر اسی سچوایشن کے مطابق نغمہ نگاروں سے بول لکھوائے جاتے تھے۔ ایس۔ڈی۔برمن ساحر صاحب کو ساتھ لے کر کاردار اسٹوڈیو پہنچے اور وہاں پر ساحر نے برمن دا سے فرمائش کی کہ وہ اپنی دھن ایک بار پھر سنائیں۔ برمن ہارمونیم پر دھن سنا رہے تھے اور ساحر صاحب ساتھ ساتھ گانا لکھتے جا رہے تھے۔ بول تھے:

ٹھنڈی ہوائیں، لہرا کے آئیں، رات ہے جواں، تم ہو کہاں کیسے بلائیں، ٹھنڈی ہوائیں۔ گانے کے بول پروڈیوسر ڈائریکٹر اے۔آر۔کاردار کو بہت پسند آئے اور انھوں نے اسے اپنی فلم ''نوجوان'' میں شامل کرلیا۔ اس کے بعد ساحر لدھیانوی اور ایس۔ڈی۔برمن کا ایسا گروپ بنا جو فلم انڈسٹری پر چھا گیا اور فلم انڈسٹری کو بہترین گیتوں اور خوبصورت دھنوں سے روشناس کرایا۔ ساحر لدھیانوی اور ایس۔ڈی۔برمن کی ایک بڑی مشہور اور کامیاب جوڑی بن گئی۔ دیو آنند نے جب اپنے ادارے نوکیتن کے لیے ''بازی'' بنانے کا اعلان کیا تو گیت ساحر لدھیانوی سے ہی لکھوائے۔ ایس۔ڈی۔برمن نے ہی انھیں اپنی خوبصورت دھنوں سے سجایا اور سنوارا۔ بازی کے گیت گلی گلی، اور ہر کوچے میں گونجنے لگے:

اور پھر اسی فلم کا یہ گیت تو ذہنوں کو چونکا دینے والا تھا:

تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنا لے
اپنے پہ بھروسہ ہے تو یہ داؤ لگا لے
ڈرتا ہے زمانے کی نگاہوں سے بھلا کیوں
انصاف تیرے ساتھ ہے الزام اٹھا لے

ساحر کی یہ آواز۔ یہ آہنگ فلمی گیتوں کی دنیا کے لئے نیا اور انوکھا تھا مگر ساحر اپنے ادبی گیتوں کے زور پر اپنی اس آواز کو روز بروز تیز کرتا چلا گیا۔ بازی باکس آفس پر نہایت کامیاب رہی تھی اس کے بعد ساحر صاحب کو اپنا مستقبل درخشاں نظر آنے لگا تھا اور ان میں بلا کی خوداعتمادی آ گئی تھی۔ اب ساحر کو بہت سی فلمیں ملنے لگی تھیں۔ برمن دا اور دوسرے کئی موسیقاروں کے ساتھ ان کے گیت اور میوزک سپرہٹ ہوتے گئے اور ساحر شہرت کی بلندیوں پر اڑنے لگے۔ فلم ''برسا کی رات'' میں

ساحر کی جوڑی موسیقار روشن کے ساتھ تھی۔ ساحر صاحب نے اس فلم کے لئے جو گیت تحریر کیے اور اپنی مثال آپ تھے۔ اس فلم کی یہ قوالی:

نہ تو کاررواں کی تلاش ہے نہ تو راہبر کی تلاش ہے
میرے شوق خانہ خراب کو تری رہ گذر کی تلاش ہے

اور پھر یہ سدا بہار اور دلنشیں گیت:

میں نے شاید تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے
اجنبی سی ہو مگر غیر نہیں لگتی ہو
وہم سے بھی جو ہو نازک وہ یقین لگتی ہو
ہائے یہ پھول سا چہرہ یہ گھنیری زلفیں
میرے شعروں سے بھی تم مجھ کو حسیں لگتی ہو

برسات کی رات اپنی خوبصورت اور سدا بہار نغموں کی وجہ سے ہی باکس آفس پر توقع سے زیادہ کامیاب رہی تھی۔ ہدایت کار بی آر چوپڑا نے بھی اپنی سپرہٹ فلموں، گمراہ نیا دور، سادھنا، دھول کا پھول۔ ہمراز۔ جیسی فلموں کے گیت ساحر لدھیانوی سے تحریر کروائے۔ چوپڑا صاحب کی سب فلمیں ساحر کے گیتوں کی وجہ سے ہی کامیابی کے جھنڈے گاڑتی چلی گئیں۔ ہدایت کار گرودت کی فلم پیاسا کے نغمے بھی ساحر صاحب نے ہی لکھے تھے اور انھیں نغموں کی وجہ سے ''پیاسا'' نے ملک بھر میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی تھی۔ پیاسا میں پیش کی گئی ساحر کی یہ نظم۔ جو موسیقار ہیمنت کمار نے گائی تھی آج بھی اتنی ہی مقبول ہے جتنی فلم کی ریلیز کے وقت تھی۔

جانے وہ کیسے لوگ تھے جن کے پیار کو پیار ملا
ہم نے تو جب کلیاں مانگیں کانٹوں کا ہار ملا
خوشیوں کی منزل ڈھونڈی تو غم کی گرد ملی
چاہت کے نغمے چاہے تو آہ سرد ملی
دل کے بوجھ کو دونا کر گیا جو غم خوار ملا

ساحر لدھیانوی نے ایک نغمہ نگار کی حیثیت سے فلم انڈسٹری میں داخل ہو کر فلمی گیتوں کے معیار

کو بہت بلند کیا اور ان کو ادبی رنگ میں رنگ کر ایک طرف حسن بیان عطا کیا تو دوسری طرف تخیل کی لطافت اور جذبات کی پاکیزگی بخشی۔ ساحر نے فلموں کو ایسے گیت بھی دیے جو سیاسی اور سماجی شعور سے بھی لبریز تھے۔ یہ ایک بہت بڑا قدم تھا جو ساحر نے بڑی دلیری سے اٹھایا تھا۔ انھوں نے بہت سے دوسرے فلمی شاعروں کی طرح فلمی دنیا کو گندگی میں نہیں ڈبویا تھا بلکہ اپنے قلم کی قوت سے فلمی گیتوں کو اگر ایک طرف حسن لطافت اور نزاکت عشق کا درد اور کسک بخشی تو دوسری طرف سماجی، مادی اور اقتصادی شعور بھی دیا۔ سماجی شعور سے بھرپور عورت کی بے حرمتی کے بارے میں یہ نظم جو بی۔ آر چوپڑا کی فلم ''سادھنا'' میں پیش کی گئی تھی۔ ملاحظہ فرمائیں۔

عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا کچلا جب جی چاہا دھتکار دیا
تلتی ہے کہیں دیناروں میں، بکتی ہے کہیں بازاروں میں
ننگی نچوائی جاتی ہے عیاشوں کے درباروں میں
یہ وہ بے عزت چیز ہے جو بٹ جاتی ہے عزت داروں میں

ساحر صاحب نے ادب کے ساتھ ساتھ فلم کے میدان میں جو کارنامے سرانجام دیے انھیں بالی ووڈ کی تاریخ کبھی نہیں بھلا سکے گی۔ انھوں نے بے تکے لفظوں کے جنگل میں بامقصد شاعری کے گلاب کھلائے اور اپنے فلمی نغموں کو ایک نرالا اور پروقار انداز عطا کیا۔ ساحر کے گیتوں کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا ترقی پسندانہ مواد ہوتا تھا۔ اس نے بڑی جرأت اور قوت کے ساتھ اپنے گیتوں میں یہ آواز اٹھائی تھی۔ وہ ہمارے ناحق اور غیر مساوی سماج کا دشمن بھی تھا اس لیے تو اس نے یہ نظم تحریر کی تھی۔

وہ صبح کبھی تو آئے گی۔ وہ صبح کبھی تو آئے گی
دولت کے لیے جب عورت کی عصمت کو نہ بیچا جائے گا
چاہت کو نہ کچلا جائے گا، غیرت کو نہ بیچا جائے گا
اپنے کالے کرتوتوں پر جب یہ دنیا شرمائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

ساحر کی یہ نظم فلم ''پھر صبح ہوگی'' میں پیش کی گئی تھی۔ اس میں مستقبل کے سہانے خوابوں کا ذکر ہے۔ یعنی وہ وقت کبھی تو آئے گا جب انسان کی قدر کی جائے گی اور جب عورت کی عصمت کو چند سکوں کے عوض نیلام نہیں کیا جائے گا۔ جب لوگ بھوکے ننگے نہیں رہیں گے۔ جب بوڑھے اور لاوارث بچے بے سہارا ہونے پر در در کی ٹھوکریں نہیں کھائیں گے۔ فلم ''دھول کا پھول'' میں جب ایک غریب مسلمان کو ایک لاوارث بچہ ملتا ہے تو ساحر اسے تخیل میں ڈھال کر اس طرح پیش کرتے ہیں:

تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا
اچھا ہے ابھی تک ترا کچھ نام نہیں ہے
تجھ کو کسی مذہب سے کوئی کام نہیں ہے
جس علم نے انسانوں کو تقسیم کیا ہے
اس علم کا تجھ پر کوئی الزام نہیں ہے
تو بدلے ہوئے وقت کی پہچان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

اس کے علاوہ ساحر کے ان درد بھرے نغموں کو کون بھلا سکتا ہے۔ جیسے:

یہ محلوں یہ تختوں، یہ تاجوں کی دنیا
یہ انساں کے دشمن سماجوں کی دنیا
میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی
جائیں تو جائیں کہاں، سمجھے گا کون یہاں
درد بھرے دل کی زباں

اور پھر یہ مشہور نظم جو شاید انھوں نے اپنے لیے ہی تحریر کی تھی اور یش چوپڑا کی فلم ''کبھی کبھی'' میں پیش کی گئی تھی۔

میں پل دو پل کا شاعر ہوں، پل دو پل میری کہانی ہے

پل دو پل میری ہستی ہے ، پل دو پل میری جوانی ہے
مجھ سے پہلے کتنے شاعر آئے اور آ کر چلے گئے
کچھ آہیں بھر کر لوٹ گئے ، کچھ نغمے گا کر چلے گا
وہ بھی ایک پل کا قصہ تھے ، میں بھی اک پل کا قصہ ہوں
کل تم سے جدا ہو جاؤں گا ، جو آج تمھارا حصہ ہوں
کل اور آئیں گے نغموں کی کھلتی کلیاں چننے والے
مجھ سے بہتر کہنے والے ، تم سے بہتر سننے والے
کل کوئی مجھ کو یاد کرے ، کیوں کوئی مجھ کو یاد کرے
مصروف زمانہ میرے لیے کیوں وقت اپنا برباد کرے

ساحر لدھیانوی نے اپنے بے شمار معیاری نغموں کے ذریعہ فلمی شاعری کو عزت بخشی ۔ وقار بخشا اور اردو شاعری کو زندہ رکھا ۔ اردو کو دوام اور احترام کی منزل پر پہنچانے کے بعد وہ ایک نئی منزل کو روانہ ہو گیا ۔ ہمیشہ کے لیے آج ساحر ہمارے درمیان نہیں ہے مگر اس کے لاکھوں سدا بہار اور شاداب ادبی اور فلمی نغمے ہمارے دلوں میں تا ابد گونجتے رہیں گے ۔

☆☆☆

کیفی اعظمی کا سیاسی اور فلمی سفر

پروفیسر یاسمین اختر

اُردو کے عظیم اور نا قابلِ فراموش شاعر کیفی اعظمی کی پیدائش ۱۹۱۹ء میں میزوان، اعظم گڑھ (اتر پردیش) میں ہوئی تھی اور ۸۳ سال کی عمر میں ان کا انتقال ۱۰ رمئی ۲۰۰۲ء کو ہوا اور ان کی موت کے ساتھ ہی اُردو کا ایک ایسا روشن چراغ بجھ گیا جس کی لو سے آنے والی کئی نسلیں فیضیاب ہوتی رہیں گی ۔ کیفی اعظمی جن کا اصل نام سیّد اختر حسین رضوی تھا وہ اتر پردیش کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں میزوان میں ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے ۔ ان کے والد سیّد فتح حسین رضوی اگر چہ ایک زمیندار تھے لیکن انھوں نے اپنی زندگی کی شروعات بطور تحصیلدار کے شروع کی تھی ۔ اور بعد میں اتر پردیش کے دیگر اضلاع میں وہ ملازمت کرتے رہے ۔ انھوں نے اپنے بچوں کو ایسے اسکول میں بھیجا جہاں جدید تعلیم کا رواج تھا اور خاص طور پر انگریزی پڑھائی جاتی تھی ، اگر چہ ان کے خاندان کے لوگوں نے اس پر سخت اعتراض کیا تھا کہ انگریزی فرنگیوں کی زبان ہے اور مسلمانوں کو یہ زبان نہیں سیکھنی چاہئے کیونکہ یہ ان سامراجیوں کی زبان ہے جو ہندوستان کو غلام بنا رکھا ہے ۔ بالآخر ان کے رشتہ داروں کی جیت ہوئی اور کیفی اعظمی انگریزی میڈیم اسکول میں پڑھ نہ سکے ، ان کے خاندان والے انہیں مولوی بنانا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ وہ صرف عربی تعلیم حاصل کریں ۔ ان کے رشتہ داروں نے انہیں لکھنؤ کے ایک بڑے مدرسہ سلطان المدارس میں داخلہ دلایا تھا لیکن ان کی جو ذہنیت تھی اس کی وجہ سے سلطان المدارس کے حکّام کو بہت ساری پریشانیاں ہوئیں ، مدرسے میں انھوں نے طلباء یونین بنالی اور ان پر زور دیا کہ اگر ان کے مطالبات تسلیم نہیں کئے جاتے ہیں تو وہ ہڑتال شروع کر دیں گے اس کے بعد ان کے خاندان کے بزرگوں کا یہ خواب ٹوٹ گیا جو انہیں ماہر عربی داں اور مولوی بنانے کا دیکھ رہے تھے ، اگر چہ اعظمی جدید تعلیم حاصل کرنے سے قاصر رہے لیکن انھوں نے لکھنؤ میں کئی امتحانات میں حصہ لیا اور بعد میں الہٰ آباد یونیورسٹی تک پہنچے جہاں انھوں نے عربی میں ماسٹر ڈگری حاصل کی ۔ اس کے بعد فارسی اور اردو میں بھی انہوں نے ماسٹر ڈگری حاصل کی اور وہ ٹریپل ایم اے کرنے کے بعد ایک اعلیٰ زباں داں بن گئے ۔

۱۱ رسال کی عمر میں کیفی نے پہلی غزل لکھی جس کا پہلا مصرعہ تھا ''اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے'' بعد

ازاں انھوں نے مشاعروں میں شرکت کرنا شروع کردی اور باقاعدہ غزل پڑھنے لگے مانی جیسی شخصیت کی صدارت میں انھوں نے غزل پڑھی اور مشاعرہ لوٹ لیا، اگرچہ بیشتروں کا خیال اور ساتھ ہی ساتھ ان کے والد کا بھی یہ خیال تھا کہ یہ غزل ان کی نہیں، ان کے بڑے بھائی کی ہے۔لیکن جب بڑے بھائی نے اس کی تردید کردی تو اُردوداں حلقوں میں ان کی غزل کا پوسٹ مارٹم ہونا شروع ہوگیا کہ انھوں نے اتنی کم عمر میں اتنی اچھی غزل کیسے کہی اور یہ خیال ان کے دماغ میں کیسے آیا۔انھوں نے ایک دوسری غزل کا ایک مصرعہ انہیں پیش کیا اور کہا کہ وہ انہیں ایک اچھا شاعر تسلیم کرلیں گے اگر وہ اسی مصرعہ کی طرح میں پوری غزل لکھ دیں، کیفی نے یہ چیلینج قبول کرلیا اور پوری غزل اس کی مصرع طرح میں لکھ دی اور اس غزل نے غیر منقسم ہندستان میں ایک تہلکہ مچادیا اور خاص طور پر جب اس غزل کو ملکہ غزل بیگم اختر نے اپنی آواز دی۔

کیفی نے ۱۹۴۲ء میں ہندستان چھوڑو تحریک کے دوران اُردو اور فارسی کی تعلیم ترک کردی تھی اور بعد میں وہ مکمل طور پر ایک مارکسی بن گئے اور ۱۹۴۳ء میں انھوں نے باقاعدہ طور پر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی رکنیت حاصل کرلی ان کی اس تحریک کے دوران ترقی پسند مصنفین کی نظران پر پڑی اور انھوں نے ان کے اندر ایک لیڈر شپ (قائدانہ) صلاحیت دیکھی۔انھوں نے ان کے اندر ایک انقلابی شاعر کو بھی پایا۔۲۴ رسال کی عمر میں انھوں نے کانپور میں ایک ٹکسٹائکس مل ایریا میں کمیونزم کی تحریک کو آگے بڑھایا، مکمل طور پر مارکسی لبادہ اوڑھنے کے بعد انھوں نے عیش وآرام کی زندگی کو خیرآباد کہا اور ایک زمیندار کے بیٹے ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے آپ کو عیش وطرب کی زندگی سے دور کردیا۔ بعدازاں ان سے کہا گیا کہ وہ اپنی تحریکوں کا رخ بمبئ کی طرف موڑ دیں۔محنت کشوں اور مزدوروں کے ساتھ مل کر کام شروع کریں، اسی دوران ان کی ملاقات ایک دوسرے انقلابی شاعر علی سردار جعفری کے ساتھ ہوئی جو اپنا ایک اخبار ''قومی جنگ'' نکالتے تھے اور وہ ان کے ساتھ مل کر قومی جنگ میں کام کرنے لگے۔اس دوران انھوں نے مشاعروں میں شرکت کرنا بند نہیں کی تھی اور آل انڈیا کی بنیاد پر وہ تمام جگہوں پر آل انڈیا مشاعرہ میں شرکت کرتے تھے۔

۱۹۴۷ء میں انھوں نے حیدرآباد کے ایک مشاعرے میں شرکت کی جہاں ان کی ملاقات ایک خوبصورت لڑکی شوکت سے ہوئی اور وہ ان پر فریفتہ ہوگئے اور ان سے شادی کرلی، شوکت کیفی بعد میں ایک مشہور فلم اور تھیٹر کی اداکارہ ثابت ہوئیں۔ ان سے دو بچّے

ہوئے، ایک شبانہ اعظمی جس کی پیدائش ۱۹۵۰ء میں ہوئی، دوسرا بابا اعظمی، شبانہ ملک کی ایک بہترین اداکارہ ثابت ہوئی اور بابا اعظمی ایک بہترین کیمرہ مین بنے۔

دیگر اُردو شعراء کی طرح سے کیفی نے غزل پر طبع آزمائی کی اور ان کی رومانی غزلیں ناقابلِ فراموش ثابت ہوئیں۔ترقی پسند مصنفین اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ساتھ ان کی گہری قربت کے باوجود کوئی ان سے ان کی شاعری کو جدا نہ کرسکا۔انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ غریب کسانوں پر زمینداروں، لینداروں اور ساہوکاروں کے ظلم وستم کو اجاگر کیا۔حکومت کی طرف سے بے توجہی کو انھوں نے خاص طور پر اپنا موضوع بنایا۔ان کی شاعری کو کسی بھی انداز میں پروپیگنڈہ نہیں کہا جاسکتا تھا۔وہ اپنی انفرادیت کی دنیا میں محوخرام تھے ان کی تحریروں میں جذبات آفرینی بھرپور رہی، انھوں نے سماج کے بے رحم رسومات کے خلاف بھی آواز اٹھائی، بیواؤں کی دوسری شادی پر زور دیا۔

کیفی کا پہلا مجموعہ کلام ''جھنکار'' ۱۹۴۳ء میں شائع ہوکر منظر عام پر آیا۔اس کے بعد آخری شب، سرمایہ، آوارہ سجدے، کیفیات، نئ گلستاں بھی منظر عام پر آئی۔انھوں نے اردو بلٹز میں ایک سیریل ''ایک آواز سنو'' بھی لکھی ان کی بہترین نظموں میں عورت، مکان، دائرہ، سانپ اور بہوروپالی شامل ہیں انھوں نے پہلی مرتبہ فلم بزدل کے لئے گیت لکھے جس کی ہدایت شاہد لطیف نے دی تھی۔ ۱۹۵۶ء میں یہودی کی بیٹی، ۱۹۵۸ء میں مس پنجاب میل اور عید کا چاند میں گیت لکھے۔اس زمانے میں خواجہ احمد عباس، بمل رائے، ساحرلدھیانوی، جاںنثار اختر، مجروح سلطان پوری اور کیفی نے مل کر ہندستانی فلم اور گیتوں کا انداز بدل دیا تھا۔۱۹۷۰ء میں ہیر رانجھا میں پوری فلم کے ڈائیلاگ منظوم انداز میں لکھی جو ایک نیا تجربہ تھا۔لیکن فلم کے سپرہٹ ہونے پر یہ تجربہ بھی کامیاب رہا۔انھوں نے ۱۹۵۹ء میں گرودت کے کاغذ کے پھول، ۱۹۶۴ء میں چیتن آنند کی حقیقت اور فلم کہرا، ۱۹۶۶ء میں انوپما، اس کی کہانیاں ۱۹۶۹ء میں ہندستان کی قسم، ۱۹۷۱ء میں شعلہ اور شبنم، ۱۹۷۲ء میں باورچی، پاکیزہ، ۱۹۷۳ء میں ہنستے زخم، ۱۹۸۲ء میں ارتھ اور ۱۹۸۳ء میں سلطان فلم کے گیت لکھے۔انھوں نے ۱۹۹۵ء کی ایک فلم نسیم میں دادا کا یادگار رول بھی ادا کیا تھا۔

☆☆☆

ایک منفرد فلمی نغمہ نگار گلزار

خسرو متین

ہندستانی فلمی صنعت میں بہت کم لوگوں کو اس بات کا اعزاز حاصل ہے کہ جنھوں نے فلم سازی کے مختلف شعبوں میں اپنی انفرادیت اور صلاحیتوں کے چراغ روش کیے ہیں۔ پورن سنگھ عرف گلزار بھی انھیں لوگوں میں سے ایک ہیں۔ وہ بہترین اور حساس نغمہ نگار، کامیاب ہدایت کار، فطری مکالمہ نویس اور چست اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

گلزار نے فلم انڈسٹری میں اب سے تقریباً چالیس سال قبل بحیثیت ایک نغمہ نگار کے قدم رکھا۔ فلم ''بندنی'' میں موسیقار ایس۔ ڈی۔ برمن نے ان سے نغمہ لکھوایا۔ وہ نغمہ اپنے لب ولہجہ اور لفظیات کے اعتبار سے کامیاب اور مقبول ہوا۔گلزار کے قدم فلم انڈسٹری میں جم گئے۔نغمہ تھا۔

مورا گورا رنگ لے لے
موہے شیام رنگ دے دے

کئی فلموں میں کامیاب نغمہ لکھنے کے باوجود گلزار کے اندر کا فنکار بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ بقول غالبؔ ''کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لئے'' کے مصداق جیسے ہی گلزار کو ہدایت کاری کا موقع ملا انھوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور پھر فلم ''میرے اپنے'' وجود میں آئی۔ یہ فلم نہ صرف باکس آفس پر کامیاب رہی بلکہ فلمی ناقدوں نے بھی اس کو خوب سراہا۔ بے روزگار نوجوانوں کے مسائل پر مبنی اس فلم میں مینا کماری نے ایک بوڑھی عورت کا لازوال کردار ادا کیا تھا۔ فلم کی ہدایت کے علاوہ گلزار نے اس فلم کی کہانی، منظر نامے، مکالمے اور نغمہ بھی تحریر کیے تھے۔ اپنی فلم کے ذریعہ ہی گلزار نے اپنے قلم اور صلاحیتوں کا فلم انڈسٹری سے اعتراف کرا لیا تھا۔اس فلم کا نغمہ ''کوئی ہوتا جس کو اپنا ہم کہہ لیتے یارو!'' تنہائی کے شدید کرب کی عکاسی کرتا ہے۔اسی طرح مینا کماری پر فلمایا گیا یہ گیت ''رات اکیلی آئے۔ چاند کٹورا لائے'' نئی امیجری پیش کرتا ہے۔

فلم سازی ایک مہنگا اور دقت طلب مشغلہ ہے اس لیے فلم بناتے وقت ناظرین کی پسند کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ فلم سے وابستہ فنکار بھی کسی نہ کسی سطح پر اپنے فن سے سمجھوتہ کرتے ہیں۔ چاہتے ہوئے بھی

اپنی انفرادیت کو برقرار نہیں رکھ پاتے۔ بحیثیت شاعر کو کئی سطحوں پر سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ موسیقار اپنی طرز پر گیت لکھواتا ہے۔ فلم ساز اور ہدایت کار گیت کو زیادہ سے زیادہ عوامی بنانے پر زور دیتے ہیں۔ چونکہ نغمہ نگاروں کے علاوہ ہر چھوٹے بڑے فلمی شاعر کے یہاں یہ سمجھوتے واضح طو پر نظر آتے ہیں۔ مگر گلزار ایک ایسے نغمہ نگار ہیں جو اپنے نغموں میں نئی لفظیات، اچھوتے خیال اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہیں۔ فلمی نغموں کے شور سے گلزار کی آواز دور ہی سے پہچانی جاتی ہے۔

ہزار راہیں مُڑ کے دیکھیں کہیں سے کوئی صدا نہ آئی
بڑی ادا سے نبھائی تم نے ہماری تھوڑی سی بے وفائی
جہاں سے تم موڑ مڑ گئے تھے وہ موڑ اب بھی وہیں پڑے ہیں
ہم اپنے پیروں میں جانے کتنے بھنور لپیٹے ہوئے کھڑے ہیں
ہزار راہیں..... ....
تمھیں یہ ضد کہ ہم بلاتے ہمیں یہ امید کہ وہ پکاریں
ہے نام ہونٹوں پہ اب بھی لیکن، آواز میں پڑ گئیں دراڑیں
ہزار راہیں..... .... (فلم 'تھوڑی سی بے وفائی')

نام گم جائے گا، چہرہ بدل جائے گا، میری آواز ہی پہچان ہے
وقت کے ستم کم حسیں نہیں، آج ہیں یہاں کل کہیں نہیں

کانوں میں اک بار پہن کر لوٹائی تھی
پت جھڑ کی وہ شاخ ابھی تک کانپ رہی ہے
وہ شاخ گرادو۔ میرا وہ سامان لوٹا دو
(فلم 'اجازت')

وہ شام کچھ عجیب تھی۔ یہ شام بھی عجیب ہے
وہ کل بھی آس پاس تھی، وہ آج بھی قریب ہے
(فلم 'خاموشی')

ہم نے دیکھی ہے ان آنکھوں کی مہکتی خوشبو
پیار کو پیار ہی رہنے دو کوئی نام دو
صرف احساس ہے یہ روح سے محسوس کرو
ہاتھ سے چھو کے اسے رشتوں کا الزام نہ دو
(فلم 'خاموش')

گلزار چونکہ بنیادی طور پر اردو کے آدمی ہیں اس لیے انھوں نے کلاسیکی وجدید ادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے لیکن ان کی طبیعت کا میلان جدید ادب کی طرف مائل ہے۔ ہندو پاک کے معیاری جرائد ان کے مطالعہ میں رہتے ہیں۔ اکثر ان کی شعری ونثری تخلیقات ان جرائد کی رونق بنتی رہتی ہیں۔ جدید ادب کے نمائندہ رجحانات سے انھوں نے بخوبی استفادہ کیا ہے۔نئی لفظیات اورنئی امیجری اسی مطالعہ کے باعث ان کے کلام میں ازخوددرآئی ہے۔ایک انٹرویو میں گلزار نے اس بات کا اعتراف بھی کیا۔گلزار کی قوت متخیلہ بڑی زبردست ہے۔ وہ بالکل سامنے کی بات کو آسان اور سادہ لفظیات میں ایک اچھوتے انداز میں کہنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ سننے والا چونک جاتا ہے اور بے ساختہ اس کے منھ سے نکل پڑتا ہے، ارے یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے مگر ہم نے کبھی اس طرف سوچا ہی نہیں۔لفظوں کے ذریعے خوبصورت پینٹنگ بنانا گلزار کو بخوبی آتا ہے۔

ہواؤں پہ لکھ دو ہواؤں کے نام
ہم انجام پردیسیوں کا سلام
یہ کس کے لیے ہے، بتا کس کے نام
اور پنچھی تیرا یہ سریلا پیام
شاخ پر جب دھوپ آئی ہاتھ چھونے کے لیے
چھاؤں پر چھم سے نیچے کودی ہنس کے بولی آیئے
یہاں صبح سے کھیلا کرتی ہے شام
ہواؤں پہ لکھ دو...........(فلم 'دو دونی چار')
دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے
جاڑے کی نرم دھوپ اور آنگن میں لیٹ کر
آنکھوں پر کھینچ کر تیرے آنچل کے سائے کو
اوندھے پڑے رہیں، کبھی کروٹ لیے ہوئے
دل ڈھونڈتا ہے..... ....
یا گرمیوں کی رات ہو۔ پروائیاں چلیں
ٹھنڈی سفید چادروں پہ جاگیں دیر تک
تاروں کو دیکھتے رہیں چھت پر پڑے ہوئے
دل ڈھونڈتا ہے..... ...... (فلم 'موسم')
ایک اکیلا اس شہر میں۔ رات میں اور دوپہر میں آب ودانہ
ڈھونڈتا ہے، آشیانہ ڈھونڈتا ہے
دن خالی خالی برتن ہے اور رات ہے جیسے اندھا کنواں
ان سونی اکیلی آنکھوں میں آنسو کی جگہ آتا ہے دھواں
جینے کی وجہ تو کچھ بھی نہیں مرنے کا بہانہ ڈھونڈتا ہے
ایک اکیلا اس شہر میں..... ....
ان عمر سے لمبی سڑکوں کو منزل پہ پہنچتے دیکھا نہیں
بس دوڑتی پھرتی رہتی ہیں، ہم نے ٹھہرتے دیکھا نہیں
ایک اکیلا اس شہر میں...... ......(فلم 'گھروندہ')

تقسیم ملک سے قبل پنجاب کے دیہات ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کے گہوارے تھے۔ دونوں قومیں ہولی اور دیوالی کی مانند عید اور بقرعید کو بھی اسی جوش وخروش اور عقیدت سے مناتی تھیں۔ غیر مسلم بھی جمعہ کے دن کا احترام کرتے تھے۔گلزار نے جب ہوش سنبھالا تو اس مشترکہ تہذیب کو اپنے رگ وپے میں دوڑتا ہوا محسوس کیا۔ پورن سنگھ کب گلزار بن گیا اسے پتہ ہی نہ چلا۔ممبئی آنے کے چالیس برس بعد بھی وہ اس مشترکہ تہذیب کو نہیں بھولے۔مشترکہ تہذیب کی یہ پھول جھڑیاں گلزر کے نغموں میں جابجا چھوٹتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

فلم ماچس دہشت گردی جیسے حساس موضوع پر بنائی گئی گلزار کی ایک کامیاب فلم تھی۔ جہاں کہیں گلزار کو موقع ملا انھوں نے اپنے نغموں کے ذریعے اسی مشترکہ تہذیب کی علامتوں کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ لوہے کے چمٹے سے کتے کو مارنا، جمعے کے جمعے سرمہ لگانا، کٹوری میں کھیر کھلانا، چپہ چپہ چرخہ چلے وغیرہ۔ اسی طرح فلم دل سے کے نغمہ چھیاں چھیاں میں تعویز کی طرح اور آیتوں کا ذکر کرکے نئی بات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

جدید لہجہ کے شاعر کمار پاشی کا ایک شعر ہے؂

لفظوں کی دھن میں ہاتھ سے معنی نکل گئے
رنگوں کے اہتمام میں صورت بگڑ گئی

گلزار کے یہاں رنگوں کا اہتمام بھی ہے اور لفظ تازہ کی دھن بھی ہے مگر نہ تو ان کے ہاتھ سے معنی نکلے ہیں اور نہ رنگوں کے اہتمام میں صورت بگڑتی ہے بلکہ جو بات کہنا چاہتے ہیں ایک وسیع تناظر میں بڑے ہی فطری اور خوبصورت انداز سے ابھرتی ہے۔ ایک سچا اور کھرا فنکار جب کسی لفظ کو اپنے تجربات کی بھٹی میں تپا کر پیش کرتا ہے تو وہ لفظ اپنی تمام اجنبیت چھوڑ کر لندن کی طرح دمکنے لگتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ یہ لفظ اسی مقام کے لیے بنا ہے۔ گلزار کے کلام پر یہ بات صادق آتی ہے۔ مثلاً

گیلا من شاید بستر کے پاس پڑا ہو۔ (فلم 'اجازت')
جینے کی تم سے وجہ مل گئی۔ (فلم 'آندھی')
آواز میں پڑ گئیں دراڑیں۔ (فلم 'تھوڑی سی بے وفائی')
وادی میں گونجتی ہوئی خاموشیاں سنیں۔ (فلم 'موسم')
آنکھوں سے بھیگے بھیگے ہو سپنے لیے ہوئے (فلم 'موسم')
کنوارے لبوں کی قسم توڑ دو۔ (فلم 'بھول نہ جانا')
چھاؤں چھم سے نیچے کودی۔ (فلم 'دو دونی چار')
آنکھیں جب دے رہی ہوں آوازیں۔ (فلم 'سیما')

☆☆☆

نظموں کی نئی تکنیک کا شاعر۔ اختر الایمان

پرویز شکیل الرحمٰن

جدید نظمیہ شاعری کا ایک معتبر نام اختر الایمان بھی ہے جن کے شعری مجموعوں نے اردو کی نظمیہ شاعری کو نیا تحرک بخشا۔ تاریک سیارہ (۱۹۴۳ء) گرداب (۱۹۴۶ء) آب جو (۱۹۵۹ء) یادیں (۱۹۶۱ء) بنت لمحات (۱۹۶۹ء) نیا آہنگ (۱۹۷۷ء) سروساماں (۱۹۸۳ء) زمین زمین (۱۹۹۰ء) ان کے مجموعہ ہائے شعر ہیں۔ جن میں ان کے مختلف موضوعات پر نظمیں ہیں۔ 'زمستاں سرد مہری کا' ان کا آخری مجموعہ کلام ہے جو سلطانہ ایمان اور بیدار بخت نے مرتب کیا ہے۔ بیدار بخت نے ان کی منتخب نظموں کا انگریزی ترجمہ Query of the Road کے نام سے شائع کیا۔ ان کی خودنوشت ''اس آباد خرابے میں'' اردو کی مقبول ترین خودنوشت ہے۔

فلموں سے بھی اختر الایمان کی وابستگی رہی۔ انھوں نے بہت سی فلموں کی کہانیاں لکھیں، دو مسافر (۱۹۷۸ء) ضمیر (۱۹۷۵ء) نیا نشہ (۱۹۷۳ء) کنوارا بدن (۱۹۷۳ء) آدمی اور انسان (۱۹۶۹ء) ہمراز (۱۹۶۷ء) پتھر کے صنم (۱۹۶۷ء) غبن (۱۹۶۶ء) میرا سایہ (۱۹۶۶ء) پھول اور پتھر (۱۹۶۶ء) بھوت بنگلہ (۱۹۶۵ء) گمراہ (۱۹۶۳ء) نیلی آنکھیں (۱۹۶۲ء) فلیٹ نمبر ۹ (۱۹۶۱ء) قانون (۱۹۶۰ء) وغیرہ فلمیں بہت مشہور ہوئیں۔ مکالمہ، کہانی اور اسکرین پلے انھوں نے لکھے۔ دھرم پتر، گمراہ، وقت، پتھر کے صنم، داغ مشہور فلمیں ہیں۔ بعض فلموں پر انھیں فلم فیئر ایوارڈ بھی ملے۔ دھرم پتر اور وقت دونوں فلموں میں بہترین مکالمے کے ایوارڈ سے سرفراز اختر الایمان کو ۱۹۶۲ء میں 'یادیں' پر ساہتیہ اکاڈمی کا باوقار ایوارڈ بھی ملا اور اقبال سمان سے بھی سرفراز ہوئے۔

اختر الایمان نجیب آباد بجنور میں ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے۔ مولوی فتح محمد ان کے والد تھے۔ ذاکر حسین کالج سے بی اے کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے پریویس ہی کر پائے کہ تلاش معاش کے لیے ممبئی کا رخ کیا اور ایک زمانے تک فلم نگری سے وابستہ رہے۔ اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو سے بھی ان کی وابستگی رہی۔ ۹ مارچ، ۱۹۹۶ء میں ان کا انتقال ممبئی میں ہوا۔

گیت کار، گلوکار۔ بہزاد لکھنوی

ڈاکٹر رضوان احمد

ہمیں کس طرح بھول جائے گی دنیا
کہ ڈھونڈے سے ہم سا نہ پائے گی دنیا

بہزاد لکھنوی کا نام صرف چند مقبول گلوکاروں کے گائے ہوئے نغموں ہی تک محدود ہو کر رہ گیا ہے لیکن وہ اپنے دور کے بے حد مقبول و معروف شاعر تھے۔

بہزاد لکھنوی کو نہ صرف اردو زبان پر زبردست دسترس حاصل تھی بلکہ انہیں ہندی، اودھی، فارسی اور عربی زبان پر بھی زبردست درک حاصل تھا۔ اسی لئے ان کی شاعری میں ان تمام زبانوں کے الفاظ ملتے ہیں۔ ان کی شاعری بھی صرف چند اصناف تک محدود نہیں ہے بلکہ انہوں نے غزل کے علاوہ نظمیں، بھجن اور فلمی گیت بھی خاصی تعداد میں لکھے۔ اپنے وقت میں انہیں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کو لسان العصر کے خطاب سے یاد کیا گیا۔ بہزاد لکھنوی کے ایک درجن سے زائد شعری مجموعے ان کی زندگی میں ہی شائع ہو چکے تھے اور آخری عمر میں تو انہوں نے اپنے آپ کو نعتوں تک محدود کر دیا تھا اور انہوں نے عشق رسول میں خوب ڈوب کر نعتیں لکھیں۔ اسی باعث انہیں زائر حرم کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

بہزاد لکھنوی کی شاعری صرف لکھنؤ کے خارجی عوامل سے متاثر نہیں ہے کیونکہ لکھنؤ کی شاعری پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس میں خارجی باتوں کا ذکر زیادہ ملتا ہے لیکن بہزاد جہاں خارجی محاسن کا ذکر کرتے ہیں وہیں وہ داخلیت کی جانب سفر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں جہاں کلاسیکی رچاؤ ہے وہیں زبان کے محاسن کا چٹخارہ بھی ملتا ہے۔ انہوں نے جہاں اپنے خیالات کو ذہن کی بھٹی میں تپایا ہے وہیں زبان کی چاشنی ان کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ کسی شاعر سے متاثر نہیں انہوں نے اپنی علیحدہ راہ نکالی تھی اور ہمیشہ اسی شاہراہ پر چلتے رہے۔ ان کی رومانی شاعری نے بہیترے شعرا کو اس کی جانب راغب کیا اور وہ ان کی اتباع پر مجبور ہوئے۔ زبان پر زبردست دسترس کے سبب انہیں نثر لکھنے پر بھی قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے کئی کہانیاں لکھیں لیکن خاص طور پر انہوں نے لکھنؤ کی جو یادداشتیں لکھیں ان میں

زبان کا ذائقہ بڑی شدت سے ملتا ہے۔ خاص طور پر ان کے ایک کردار حکیم بڈھن کے حوالے سے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ مطالعہ کرنے کی چیز ہے اور اس طرز نگارش کو تو کوئی فراموش کر ہی نہیں سکتا۔

بہزاد لکھنوی کی پیدائش ۱۹۰۰ء میں لکھنؤ کے ایک تعلیم یافتہ اور متوسط خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا ادبی حلقوں میں رہا اس لئے انہیں بچپن سے ہی شاعری کا چسکہ لگ گیا تھا اور اوائل عمری سے ہی انہوں نے اشعار موزوں کرنے شروع کر دیئے تھے۔ پھر ادبی نشستوں میں حصہ لینے لگے اور جلد ہی ان کا نام ادبی حلقوں میں وقار کے ساتھ لیا جانے لگا۔ انہیں فلمی دنیا سے بھی بلاوے ملے اور وہ فلمی دنیا میں چلے گئے جہاں انہوں نے ایک درجن سے زائد فلموں میں گانے لکھے اور ان کے گانے اس زمانے میں بے حد مقبول ہوئے جو بچے بچے کی زبان پر تھے۔ خاص طور پر 'آگ' فلم کے لئے مکیش کا گانا تو آج بھی سنا اور گنگنایا جاتا ہے:

زندہ ہوں اس طرح کہ غم زندگی نہیں
جلتا ہوا دیا ہوں مگر روشنی نہیں
گو مدتیں ہوئی ہیں کسی سے جدا ہوئے
لیکن یہ دل کی آگ ابھی تک بجھی نہیں

یا پھر 'آگ' فلم کا ان کا یہ گیت بہت ہی مقبول تھا:

دیکھ چاند کی اور مسافر دیکھ چاند کی اور
کہیں کا دیپک کہیں کی باتی آج بنے ہیں جیون ساتھی
دیکھ ہنسا ہے چاند مسافر دیکھ چاند کی اور

بہزاد کی بہت سی غزلوں اور گیتوں کو بیگم اختر نے اپنی آواز دے کر زندہ جاوید بنا دیا تھا۔ جیسے اس غزل کے دو اشعار:

دیوانا بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے
ورنہ کہیں تقدیر تماشا نہ بنا دے
اے دیکھنے والو! مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو
تم کو بھی محبت کہیں مجھ سا نہ بنادے

بہزادلکھنوی کی غزلوں اورگیتوں کوصرف بیگم اختر کی ہی آوازنہیں ملی بلکہ زہرہ بائی امبالے والی، شمشادبیگم،لتامنگیشکر،مکیش اوراس زمانے کےمشہورگلوکاروں نے گایا تھااوران کی یہ غزل تو تقریباً تمام گلوکارائیں گا چکی ہیں۔موجودہ دورمیں اس غزل کونیرہ نورنے امرکردیا ہے:

اے جذبہ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے
منزل کے دوگام چلوں اور سامنے منزل آجائے
اے دل کی خلش چل یونہی سہی چلتا تو ہوں ان کی محفل میں
اس وقت مجھے چونکا دینا جب رنگ پہ محفل آجائے
اے رہبر کامل چلنے کو تیار ہوں پر یہ یاد رہے
اس وقت مجھے بہکا دینا جب سامنے منزل آجائے

ان کے علاوہ بھی متعدد ایسے گیت اوربھجن ہیں جو بچے بچے کی زبان پر تھے۔یہ الگ بات ہے کہ آج فلمی یاادبی دنیامیں کہیں بھی بہزادلکھنوی کا ذکرنہیں آتا۔فلمی دنیاتو خیرفراموش کردہ لوگوں کی دنیا ہے چونکہ اس کا تعلق سلولائڈ سے ہےاورسلولائیڈ کی عمرہی وقتی ہوتی ہے۔اس لئےفلمی دنیامیں اگرکسی ادیب اورشاعرکوفراموش کردیا جاتا ہےتو یہ کوئی اہم بات نہیں ہےلیکن طویل شعری ونثری خدمات کے باوجود بہزادلکھنوی کی خدمات کوفراموش کردیا گیا تو یہ اپنے آپ میں ایک عبرت کا مقام ہے۔حالانکہ بہزاد کا اپنے بارے میں خیال یہ تھا:

ہمیں کس طرح بھول جائے گی دنیا
کہ ڈھونڈے سے ہم سا نہ پائے گی دنیا

بہزادلکھنوی کا انتقال ۱۰/اکتوبر۱۹۷۴ء کراچی میں ہوااوران کا مقبرہ وہاں کی ایک بڑی شاہرہ پر قائم ہے جسے شاہراہ بہزاد کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

☆☆☆

مجروح سلطان پوری

ممبئ ۔۲۴ مئی (یو این آئی) زندگی کے ہرفلسفہ اور ہر رنگ پر چار دہائیوں سے زیادہ عرصہ تک تین ہزار سے زیادہ گیت لکھنے والے مشہور شاعر اورنغمہ نگار مجروح سلطان پوری کا زندگی کے تئیں نظریہ کچھ ایسا تھا کہ

ایک دن بک جائے گا ماٹی کے مول
جگ میں رہ جائیں گے پیارے تیرے بول

مجروح کے والد پولیس میں سب انسپکٹر تھے اورانہیں اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ مجروح نے لکھنؤ کے تکمیل الطب کالج میں طب کی تعلیم حاصل کی اورمطب کرنے لگے۔ اتر پردیش کے شہر سلطان پور میں یکم اکتوبر ۱۹۱۹ء کو پیدا ہونے والے مجروح کو بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا اور وہ اکثر سلطان پور کے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ اس سے انہیں بہت شہرت ملی اور طبابت ترک کر کے انہوں نے اپنی ساری توجہ شاعری میں مرکوز کردی۔ اس دوران ان کی ملاقات ان کے بعد کے مشہور شاعر جگر مرادآبادی سے ہوئی۔

مجروح ۱۹۴۵ء میں صابوصدیق انسٹی ٹیوٹ کے زیراہتمام ایک مشاعرہ میں شرکت کے لئے ممبئ آئے جہاں مشہورفلم ساز اور ہدایت کار اے آر کاردار ان کی شاعری سے بہت متاثر ہوئے اورانہیں اپنی فلم میں گیت لکھنے کی پیش کش کی لیکن مجروح نے کاردار صاحب کی یہ پیشکش نامنظور کردی کیونکہ وہ فلموں میں گیت لکھنا معیوب سمجھتے تھے۔مگر جگر صاحب نے انہیں مشورہ دیا کہ فلموں میں گیت لکھنے میں کوئی برائی نہیں اوراس سے وہ اپنے گھر کی کفالت کر سکتے ہیں چنانچہ مجروح جگر صاحب کے مشورہ پرفلموں میں گیت لکھنے پر رضامند ہوگئے۔مشہور موسیقار نوشاد نے انہیں ایک دھن سنائی اوران سے اس پر گیت لکھنے کے لئے کہا۔ مجروح نے اس دھن پر جو گیت لکھا اس کا مکھڑا تھا کہ'ان کے گیسو بکھرے بادل آئے جھوم کے'۔ مجروح کے گیت لکھنے کے ڈھنگ سے نوشاد کافی متاثر ہوئے

اورانہوں نے اپنی نئی فلم 'شاہ جہاں' کے لئے ان سے گیت لکھنے کے لئے کہا۔شاہ جہاں بہت کامیاب رہی اوراس کے بعد انہوں نے محبوب خان کی انداز اورایس فاضل کی مہندی جیسی فلموں میں اپنے گیتوں کی کامیابی کے بعد فلم دنیا میں بطور نغمہ نگار اپنی شناخت قائم کرلی۔

شاہ جہاں کے بعد مجروح سلطان پوری اورموسیقار نوشاد کی جوڑی نے انداز (۱۹۴۹ء) ساتھی (۱۹۶۸ء) پاکیزہ (۱۹۷۱ء) تانگے والا (۱۹۷۱ء) دھرم کانٹا (۱۹۸۲ء) اورگڈو (۱۹۹۵ء) جیسی فلموں میں ایک ساتھ کام کیا۔اپنے اشتراکی نظریات کی وجہ سے مجروح صاحب کوکئی بار دقتوں کا سامنا کرنا پڑا جن میں جیل جانا بھی شامل ہے۔مجروح کوحکومت نے مشورہ دیا کہ اگروہ معافی مانگ لیتے ہیں تو انہیں رہا کردیا جائے گا مگر وہ اس کے لئے تیارنہیں ہوئے اورانہیں دوسال جیل میں گزارنے پڑے۔جیل میں رہنے کی وجہ سے مجروح کے کنبہ کی مالی حالت کافی خراب ہوگئی اورفلم سازاوراداکار راج کپور نے ان کی مدد کرنی چاہی مگر مجروح نے ان سے بھی انکار کردیا۔اس کے بعد راج کپور نے ان سے گیت لکھنے کی فرمائش کی مجروح نے ان کے لئے 'ایک دن بک جائے گا ماٹی کے مول' گیت لکھا جس کے عوض راج کپور نے انہیں ایک ہزار روپیہ دیئے۔تقریباً دوسال جیل میں رہنے کے بعد مجروح جوش وخروش کے ساتھ فلمی دنیا میں واپس آئے اور ۱۹۵۳ء میں فلم فٹ پاتھ اورآرپار کے کامیاب گیتوں کے ذریعہ ایک بار پھر اپنا سکہ جمالیا۔ان کی فلمی زندگی میں موسیقار ایس ڈی برمن کے ساتھ ان کی جوڑی بہت کامیاب رہی۔

پیئنگ گیسٹ (۱۹۵۷ء)،نودوگیارہ (۱۹۵۷ء) سولہواں سال (۱۹۵۸ء)،کالا پانی (۱۹۵۸ء)،چلتی کا نام گاڑی (۱۹۵۸ء)،سجاتا (۱۹۵۹ء)،ممبئی کا بابو (۱۹۶۰ء)،بات ایک رات کی (۱۹۶۲ء)،تین دیویاں (۱۹۶۵ء)،جیول تھیف (۱۹۶۷ء)،تین دیویاں (۱۹۶۵ء) جیول تھیف (۱۹۶۷ء) اورابھیمان (۱۹۷۳ء) اس جوڑی کی سپرہٹ فلموں میں شامل ہیں۔ مجروح سلطان پوری کی گراں قدر خدمات کے پیش نظر ۱۹۹۳ء میں انہیں فلمی دنیا کے سب سے بڑے اعزاز داداصاحب پھالکے ایوارڈ سے نوازا گیا۔اس کے علاوہ ۱۹۶۴ء کی فلم دوستی میں اپنے گیتوں کے لئے انہیں فلم کا بہترین نغمہ نگار کا ایوارڈ بھی ملا۔مشہور فلم ساز اور ہدایت کار ناصر حسین کی فلموں

کے لئے مجروح نے سدابہار گیت لکھ کر ان کی فلموں کو کامیاب بنانے میں بہت اہم رول ادا کیا۔ان فلموں میں تیسری منزل، بہاروں کے سپنے، پیار کا موسم، کارواں، یادوں کی بارات، ہم کسی سے کم نہیں، زمانے کو دکھانا ہے جیسی سپرہٹ فلمیں شامل ہیں۔مجروح نے چار دہائیوں سے بھی زیادہ کی مدت میں تقریباً ۳۰۰ فلموں میں گیت لکھے جن کی تعداد تین ہزار تک پہنچی ہے۔اپنے ان گیتوں سے سامعین کو محفوظ کرنے والے مشہور شاعر اور گیت کار ۲۵ رمئی ۲۰۰۰ء کو اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

بشکریہ ہفتہ وار اجالا۔کلکتہ

☆☆☆

حسرت جے پوری کی نغمہ نگاری

غازی معین

ممتاز شاعر اور مقبول فلمی نغمہ نگار حسرت جے پوری نے ہندوستانی فلموں کو شاعری سے بھرپور نغمے عطا کئے ہیں۔ ان کے گیتوں میں بھی اردو شاعری کی دلکشی موجود ہوتی ہے۔ حسرت جے پوری نے اپنے نغموں میں اردو غزل کی خوبصورتی پیوست کردی ہے۔ وہ عمدہ شاعر تھے لیکن ان کی شاعری میں گیت کاری کا عنصر نہیں ملتا۔ بلکہ ان کی گیت کاری میں شاعری کی شوخیاں موجود ہیں۔ ساحر لدھیانوی اور مجروح سلطان پوری کی طرح ان کے نغموں میں بھی وہی کشش پائی جاتی ہے جو دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔

کسی بھی قسم کی کہانی، سچویشن اور موسیقی سے ہم آہنگ نغمے لکھنے کے فن میں حسرت جے پوری ماہر تھے۔ اور ان کی اسی مہارت نے انہیں ہندوستانی فلم انڈسٹری میں ان کو ایک انفرادیت بخشی ہے۔ فلمی نغمہ تحریر کرنا ایک تکنیکی Art ہے۔ یہی سبب ہے کہ مختلف بڑے شعراء بھی اس میدان میں اپنے قدم قائم کرنے میں ناکام رہے۔ Music کی لے میں الفاظ کو سجانے کے Talent میں جن نغمہ نگاروں کو مہارت حاصل تھی ان میں حسرت جے پوری ناقابل فراموش نام ہے۔ حسرت جے پوری نے اپنے زمانے میں خوبصورت، من موہک، یادگار اور دلکش گیت کاری کی۔ حسرت کے پاس پرکشش لفظوں کا ایک ایسا ذخیرہ موجود تھا، جس سے وہ Lyrics میں جان ڈال دیتے تھے۔ تصور اور خیالات کے ساتھ ساتھ سنگیت کی ڈوری میں مدھر لفظوں کو ایسے پیش کرتے تھے کہ سنتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم بھی ان کے ہم خیال ہیں۔ آج بھی ان کے نغمے پسند کئے جاتے ہیں۔ حسرت جے پوری میں نغمے لکھنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ مقبول ترین اور مصروف نغمہ نگار رہے۔ وہ صرف تک بندی نہ کرکے اچھی شاعری کرتے تھے۔ ان کے نغمے آج بھی لوگوں کی زبان پر مچلتے ہوئے مل جائیں گے۔ یہی حسرت صاحب کے لئے بہت بڑا انعام اور اعزاز ہے۔

دراصل ہندی فلمی دنیا میں حسرت کی شکل میں ایک باصلاحیت نغمہ نگار کا وجود تھا جن کے قلم میں بے

پناہ روانی تھی اور خیالات میں جادو سا اثر تھا۔

حسرت جے پوری کا اصل نام اقبال حسین تھا۔ ۱۵/اپریل ۱۹۲۲ء کو جے پور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے نانا فدا حسین اردو اور فارسی زبان میں شاعری کرتے تھے۔ ایام طفلی سے ہی حسرت جے پوری شعر و شاعری کے دیوانے تھے۔ اردو زبان میں ماہر تھے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں روزگار کی تلاش میں ممبئی گئے۔ اسی عمر سے وہ مشاعرے Attend کرنے لگے تھے۔ اور اپنی ڈائریاں غزلوں، نظموں سے بھرنے لگے تھے۔ ممبئی میں بس کنڈکٹری کی ملازمت کی اور انتہائی معمولی کھولی میں دن کاٹنے لگے۔

ایک دفعہ ایک مشاعرے میں پرتھوی راج کپور نے ان کی ایک نظم ''مزدور کی تلاش'' سنی اور انہوں نے اپنے فرزند راج کپور سے حسرت صاحب کو بلوایا۔ راج کپور نے ان سے کچھ اور غزلیں سنیں تو انہیں لگا کہ حسرت جے پوری میں نغمہ نگاری کی صلاحتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ حسرت نے اپنا پہلا فلمی نغمہ لکھا۔ ''جیا بے قرار ہے، چھائی بہار ہے....پھر تقریباً پچاس برسوں تک وہ نغمہ نگاری سے جڑے رہے۔ آج کے مقبول موسیقار انو ملک حسرت صاحب کے رشتے میں بھانجے ہیں۔

ناصر حسین کی فلم میں حسرت کی غزل ''تری زلفوں سے جدائی تو نہیں مانگی تھی'' مقبولیت کی چوٹی پر پہنچ گئی تھی۔

۳۴ برس کی عمر میں حسرت صاحب کی شادی کانپور کی بلقین بیگم سے ہوئی تھی۔ ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ ایک دن ایسا بھی آیا جب کھولی میں رہنے والے حسرت جے پوری نے 'جوہو' ممبئی میں اپنے ذاتی بنگلہ ''غزل ولا'' کی بنیاد رکھی تھی۔ انہیں غزل سے جنون کی حد تک پریم تھا۔

حسرت جے پوری کو کئی انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔ انہیں دوبار فلم فیئر ایوارڈ بہترین Lyrincs writer کے لئے ملا۔ (''بہار و پھول برساؤ'' اور ''زندگی اک سفر ہے سہانا'' کے لئے Best Lyricst Awards ان کے یادگار لمحے تھے۔ راجستھان شری ترین سمان ۱۹۸۱ء میں جوش ملیح آبادی عالمی ایوارڈ اور متعدد بار سلور جوبلی ایوارڈ بھی انہیں حاصل ہوئے۔ لتا منگیشکر ایوارڈ کے علاوہ ایک اسکالر نے ان کی شخصیت اور فن پر پی۔ ایچ۔ ڈی بھی کی ہے۔

حسرتؔ جے پوری کو اپنے ہم عصروں اور عزیزوں کی بے وفائی کا کافی شکوہ تھا۔حسرت صاحب کا انتقال پر ملال ۱۷ ستمبر ۱۹۹۹ء کو ہوا۔انھوں نے جذباتی رومانی اور غم بھرے نغمے تحریر کئے۔ایک فلم کا گیت انھوں نے لکھا تھا جس کا مکھڑا تھا۔''تم مجھے یوں بھلا نہ پاؤ گے ...'' آج اس Song نے حقیقی صورت اختیار کر لی ہے۔واقعی انہیں کبھی نہیں فراموش کیا جا سکتا۔

وہ عام فہم لفظ میں منفرد نغمے لکھ دیتے تھے۔گیتوں میں سندر تشبیہات دے کر وہ اسے امر بنا دیا کرتے تھے۔ان کے فلمی نغموں کی ایک طویل List ہے۔راج کپور کے علاوہ حسرتؔ جے پوری وی شانتا رام کے بھی Favourite نغمہ نگار تھے۔ان کی فلم ''جھنک جھنک پائل باجے'' ''طوفان اور دیا''، ''سہرا''، ''گیت گایا پتھروں نے'' میں بھی حسرتؔ جے پوری نے کئی ہٹ Song تحریر کئے تھے۔ان کے کچھ سپر ہٹ گیت اس طرح ہیں۔

''جیا بےقرار ہے.....''، ''میں زندگی میں ہر دم روتا ہی رہا ہوں.....(فلم ''برسات'')۔

''یہ دل جو جلا، ایک آگ لگی، آنسو جو بہے برسات ہوئی بادل کی طرح آوارہ تھے ہم، ہنستے بھی رہے روتے بھی رہے۔(فلم ''آوارہ'')

''تم مجھے یوں بھلا نہ پاؤ گے، جب کبھی بھی سنو گیت مرے، سنگ سنگ تم بھی گنگناؤ گے.......(فلم ''پگلا کہیں کا'')

''آنسو بھری ہیں یہ جیون کی راہیں........(فلم ''پرورش'')

''صدقے تیری چال کے.......(فلم ''مسٹر ایکس'')

''سن لے تو دل کی صدا........(فلم ''تیرے گھر کے سامنے'')

''میں دیر کرتا نہیں دیر ہو جاتی ہے........(فلم ''حنا'')

''دنیا بنانے والے کیا تیرے من میں سمائی''

''آجا سجن مدھر چاندنی میں ہم'' (فلم ''چوری چوری'')

''برسات میں تم سے ملے ہم ہم سے ملے تم برسات میں'' (فلم ''برسات'')

''تم سے ملی نظر کہ مرے ہوش اڑ گئے'' (فلم ''جھک گیا آسمان'')

''آجا رے اب، مرا دل پکارا''..........(فلم ''آہ'')

''سن صاحباں سن، پیار کی دھن'' (فلم ''رام تیری گنگا میلی)

''او محبوبہ ترے دل کے پاس ہی ہے مری منزل مقصود'' (سنگم)

''تیری پیاری پیاری صورت کو کسی کی نظر نہ لگے۔'' (سسرال)

''چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ'' (آرزو)

''یہ میرا پریم پتر پڑھ کر کے تم ناراض نہ ہونا'' (سنگم)

''تمہیں دیکھا، تمہیں چاہا، تمہیں پوجا میں نے''

''جس کے سپنے میں روز آتے رہے۔''

''ترے مرے پیار کے چرچے ہر زبان پر۔''

بالی ووڈ میں اکثر جوڑیاں ہٹ ہوتی ہیں لیکن حسرتؔ صاحب کے دور میں چار درویش ہٹ ہوئے تھے وہ تھے موسیقار شنکر اور جے کشن اور گیت کار شیلندر اور حسرتؔ جے پوری۔شنکر' جے کشن' شیلندر' حسرت۔ان چار فنکاروں نے مل کر ایک سے بڑھ کر ایک تجربے کئے۔بے مثال نغمے فلم انڈسٹری کو دئے۔واقعی فلم کے جس قدر کامیاب، آسان اور دل کو چھو لینے والے گیت حسرتؔ جے پوری نے لکھے، اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

ان کی ایک غزل جو کسی گلوکار نے گائی ہے بے حد پیاری ہے۔

چل مرے ساتھ ہی چل، اے میری جان غزل
ان سماجوں کے بنائے ہوئے بندھن سے نکل

ان کے نغموں میں ایسی خاصیت اور انوکھا انداز ہے کہ کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ایسی بات نہ تھی کہ صرف تقدیر نے ہی ان کا ساتھ دیا بلکہ ان کی انتھک محنت اور صلاحیت کا بھی اس شہرت میں برابر ہاتھ تھا۔دراصل انہوں نے اپنی لگن، مسلسل جد و جہد، کچھ کر گزرنے کے جذبے اور عزم مستحکم سے وہ مقام حاصل کیا ہے۔کچھ پرتھوی راج کپور کی حوصلہ افزائی، کچھ اپنی مشقت، کچھ راج کپور کی مہربانیاں اور کچھ تقدیر کا تماشا۔حسرتؔ جے پوری بس کنڈکٹر سے بے

مثال نغمہ نگار بن گئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ راج کپور ہی انہیں فلموں میں لائے۔ اور وہ بھی راج کپور کی فلم ''برسات'' سے ''حنا'' تک وابستہ رہے۔ راج کپور کے متعلق حسرتؔ جے پوری نے کہا تھا۔ ''اللہ کے بعد مجھ پر اگر کسی کی مہربانی ہے تو راج کپور کی۔''

حسرتؔ جے پوری نے اپنے نغموں کے ذریعہ نغمہ نگاری کی اہمیت کو بھی ثابت کر دیا ہے۔ ان کی زندگی میں کئی اتار چڑھاؤ آئے۔ اس لئے گیتوں میں بھی کسک، چبھن، درد اور دنیا کی بے وفائی کا احساس بخوبی ہوتا ہے۔ لفظوں کی بازیگری اور خیالوں کی جادوگری کوئی ان کے گیتوں سے ہی سیکھے۔ حسرتؔ، شیلندر، شنکر جے کشن اور لتا منگیشکر کی ایک پوری ٹیم تھی۔ ان کی مشترکہ کوششوں سے کئی لازوال نغمے وجود میں آئے۔ حسرتؔ صاحب کی موت پر لتا جی نے کہا تھا....''میں نے حسرتؔ صاحب کے لکھے ہوئے بے شمار گیت گائے ہیں، وہ بہترین گیت کار تھے اور ہمارے رشتے دوستی جیسے تھے۔ میں اب ایک ہمدرد دوست سے محروم ہوگئی ہوں۔'' موسیقار نوشاد نے بھی ان کے انتقال پر افسوس ظاہر کیا تھا اور کہا کہ ''حسرتؔ صاحب ایک نیک دل انسان اور باصلاحیت شاعر تھے۔''

حسرت صاحب کی ٹیم کے بقیہ تین درویش شنکر، جے کشن اور شیلندر نے ان سے قبل ہی دنیا کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ حسرتؔ صاحب کو ہندی، اردو، انگریزی اور بھوجپوری زبانوں کی اچھی معلومات حاصل تھی۔ وہ شیلندر سے ہندی کی گہرائیاں سیکھا کرتے تھے اور شیلندر ان سے اردو کی باریکیاں۔ حسرتؔ جے پوری کی ایمانداری کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ ہر گانے کی Situation اور موسیقی کی باریکیوں میں ڈوب جاتے تھے اور اس کے مطابق نغمے کو بڑی لگن سے لکھا کرتے تھے۔ حسرتؔ جے پوری نے پچاس برسوں میں دو سو سے بھی زیادہ فلموں کے نغمے لکھے۔

ان کے دور میں حسرتؔ صاحب کی اتنی مقبولیت تھی کہ ہر طرف ان کے ہی نام کی گونج سنائی پڑتی تھی۔ وہ زندگی کے آخری لمحے تک تخلیقی کاموں میں مصروف رہے۔ اسّی سالہ حسرت جے پوری چاہے عمر کے مطابق بوڑھے ہو گئے تھے مگر ان کا دل اور ذہن تب بھی جوان تھا۔ ہندوستانی فلم انڈسٹری میں شنکر جے کشن، حسرتؔ جے پوری اور شیلندر نے مل کر ایک نئی تاریخ مرتب کی تھی۔

ایک جگہ حسرتؔ صاحب تحریر کرتے ہیں.....''شاعری میرے بچپن کا شوق ہے

اور یہ شوق کبھی کامیاب نہ ہوا ہوتا اگر میں نے محبت نہ کی ہوتی۔ محبت کا جذبہ دل میں نہ ہو آدمی کچھ نہیں بن سکتا، کچھ نہیں کر سکتا، اور جان لیجئے آدمی تب تک کامیابی حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کی زندگی میں عورت کا دخل نہ ہو۔''

حسرت صاحب نے روشن دنوں کو پانے کے لئے بے شمار تاریخ راتیں دیکھیں۔ تنہائی، بے وفائی اور درد والم کے گھاؤ سہے۔ حسرتؔ جے پوری کو دوسرے شاعروں میں جگر مرادآبادی، مجروحؔ، کیفی اعظمی، آنند بخشی اور ویندر جین پسند تھے۔ ایک انٹرویو کے دوران ان سے پوچھا گیا تھا کہ آپ سے ڈسکو Disco لکھنے کو کہا جائے تو کیا ردعمل ہوگا؟ حسرتؔ صاحب کا جواب تھا نا بابا، بھوکے رہنا پڑا تو رہ لیں گے، مگر ایسے گیت نہ لکھیں گے۔

ایک انٹرویو میں جب حسرتؔ صاحب سے پوچھا گیا تھا کہ انو ملک آپ کے بھانجے ہیں، انہوں نے آپ کو زیادہ Chance کیوں نہیں دیا تو حسرتؔ جے پوری کا جواب تھا۔۔۔ کچھ نہ پوچھئے تو بہتر خون کے رشتے بے گانے ہو جاتے ہیں اور بے گانے ہی اپنے ہو جاتے ہیں یہی سمجھئے۔

عمر نے ان کا چہرہ بے حد بدلا کر دیا تھا لیکن تھکاوٹ نے ان کے حوصلے پست نہیں کئے تھے۔ لکھنے کی خواہش ان میں آخری لمحوں تک باقی تھی۔ آخر میں حسرت صاحب کا لکھا ہوا ایک گیت یاد آ رہا ہے جو فلم ''جی چاہتا ہے'' کا ہے۔ موسیقار کلیان جی آنند جی تھے اور گلوکار مکیش کی آواز میں ریکارڈ ہوا تھا۔ ہم چھوڑ چلے ہیں محفل کو یاد آئے کبھی تو مت رونا۔

☆☆☆

بالی ووڈ کے مقبول نغمہ نگار جاوید اختر

جاوید اختر.... بالی ووڈ کے سب سے زیادہ معاوضہ لینے والے نغمہ نگار ۱۷ جنوری ۱۹۴۵ء کو گوالیار، مدھیہ پردیش میں پیدا ہوئے۔ ان کی پہلی وجہ شہرت اسکرپٹ رائٹنگ اور مکالمہ نگاری کی تھی لیکن ان کے نغمات بھی ہر جگہ مقبول ہیں۔ ان کے خاندانی پس منظر کا ان کی شخصیت پر بہت گہرا اثر ہے۔ اردو ادب کے تین بڑے شعرائے کرام یعنی ان کے والد جاں نثار اختر اور اسرارالحق مجاز لکھنوی (ماموں) کے علاوہ کیفی اعظمی (سسر) نے ان کے ادبی ذوق کو نکھارا۔ ۱۹۶۴ء میں گریجویشن کے بعد فلم انڈسٹری سے وابستگی کا خیال اور مستقبل کے خواب سجائے وہ ممبئی پہنچے اور معروف فلم ڈائریکٹر کمال امروہوی کے اسسٹنٹ بنے۔ ۱۹۶۹ء میں ''سپی فلمز'' جوائن کیا۔ ۱۹۷۱ء میں ماضی کے اداکار سلیم خان (بالی ووڈ اسٹارز سلمان، ارباز اور سہیل خان کے والد) کی رفاقت میں اپنے کیریئر کی پہلی فلم ''انداز'' کا اسکرپٹ ''سلیم جاوید'' کے نام سے لکھا۔ دونوں رائٹرز گیارہ سالہ پارٹنر شپ ۱۹۸۲ء میں ختم ہوئی۔ اس دوران انہوں نے کل اٹھارہ فلموں کے اسکرپٹ اور مکالمے لکھے۔ ان میں بعض اپنے زمانے کے سپر ہٹ فلمیں ہوئیں۔ ان میں ہاتھی میرے ساتھی، سیتا اور گیتا، یادوں کی بارات، زنجیر، دیوار، شعلے، ایمان دھرم، ترشول، کالا پتھر، دوستانہ، کرانتی اور شکتی شامل ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں سلیم خان سے الگ ہونے کے بعد جاوید اختر نے اپنے نام سے دوبارہ بحیثیت اسکرپٹ/ ڈائیلاگ رائٹر فلمیں کیں۔ ان میں بیتاب دنیا، مشعل میری جنگ، ساگر، زمانہ، ڈکیٹ، مسٹر انڈیا، جو شیلے، میں آزاد ہوں، روپ کی رانی چوروں کا راجہ، پریم، کبھی نہ کبھی، لکشیہ شامل ہیں۔ حال ہی میں اپنے بیٹے فرحان اختر کی ڈائریکشن میں ''ڈان'' کا اسکرپٹ لکھا۔ پہلی شادی ۱۹۷۹ء میں معروف اسکرپٹ رائٹر ہنی ایرانی سے ہوئی۔ ان سے دو بچے بیٹا فرحان اختر (فلم ڈائریکٹر) اور ایک بیٹی زویا اختر ہیں۔ بعد ازاں ۱۹۸۳ء میں انہیں طلاق دے کر بالی ووڈ کے معروف اداکارہ اور موجودہ رکن پارلیمنٹ شبانہ اعظمی سے شادی کی۔ نغمہ نگاری کا آغاز فلم ''سلسلہ'' کے لئے اپنا پہلا مشہور گیت ''دیکھا ایک خواب تو یہ سلسلے ہوئے'' لکھ کر دھوم مچا دی اب تک تقریباً سو سے زائد فلموں کے گیت لکھ چکے ہیں جن میں فلم

سلسلہ، لو اسٹوری ۱۹۴۲، مسٹر انڈیا، مشعل، جو شیلے، ارجن، لاوارث، پھر بھی دل ہے ہندستانی، ساگر، تیزاب، بارڈر، سودیس، کسنا، منگل پانڈے، سلام عشق، کبھی الوداع نہ کہنا، ڈان، نمستے لندن، تارارم پم پم گانے بہت مشہور ہوئے۔ ۱۹۹۵ء میں ایک مجموعہ کلام ''ترکش'' شائع ہوا۔ غزل ''سنگم'' کے نام سے ہے جس میں گلوکار نصرت فتح علی خان کی کمپوزنگ اور گائیکی کے علاوہ جگجیت سنگھ نے بھی ان کا ساتھ دیا ہے۔

''دیکھا ایک خواب تو یہ سلسلے ہوئے.....'' فلم ''سلسلہ'' کے لئے اپنے پہلے ہی خوبصورت گیت سے نغمہ نگاری کا آغاز کرنے والے جاوید اختر کے فنی سفر کی کہانی کچھ عجیب سی ہے۔ انتہائی غربت میں دیکھے ہوئے خوابوں کے اس سلسلے کا اختتام اتنے اعلیٰ مقام پر ہوگا کہ وہ ہندستان میں سب سے زیادہ معاوضہ لینے والے شاعر بن جائیں گے۔ شاید انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔ یقیناً جب ایک راستہ بھٹکا ہوا مسافر اتنی شاندار منزل پا جائے تو اسے قسمت کی مہربانی ہی کہا جا سکتا ہے۔ جاوید اختر نے اپنی ذات میں چھپے ایک مست و بے خود نغمہ نگار اور دلوں کو چھونے والے مصنف کو کب تلاش کیا ان کا کہنا ہے ''مجھے لکھنے کا شوق ورثے میں ملا ہے یا یوں کہئے کہ شاید یہ میرے خون میں شامل ہے۔ ویسے زمانہ طالب علمی میں شعلہ بیاں مقرر میری پہلی پہچان تھی۔ اس وقت کہیں کچھ لکھنے کی خواہش بھی سر اٹھاتی رہتی تھی مگر سچ پوچھیں تو قلم اٹھانے کی میری ہمت نہیں ہوا کرتی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہمارے بڑوں نے یہ بتایا تھا کہ لکھنے سے پہلے پڑھنا ضروری ہے۔ پہلی تحریر شاید کالج کے دوستوں کی طرف سے وہ رومانوی خطوط تھے جو میں نے سولہ یا سترہ برس کی عمر میں ان کی فرمائش پر لکھے تھے۔ اسی طرح جب میں نے باقاعدہ شاعری شروع کی تو اس وقت ۳۲ سال کا تھا۔

''ناقدین آپ کی شاعری کو گلزار کے مقابل دیکھتے ہیں! آپ ذاتی طور پر کس نغمہ نگار کی شاعری سے متاثر ہوئے''؟

جاوید اختر کہتے ہیں: ''میں گلزار صاحب کی بہت عزت کرتا ہوں وہ ایک بہت ہی اچھے شاعر ہیں۔ میں ان کی شاعری کے متعلق تو زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ اپنے نغمات کے بارے میں یہی کہوں گا کہ میں گیت کی شاعری میں اس بات کو مدنظر رکھتا ہوں کہ اس کی زبان سادہ ہو۔ تاکہ ایک عام آدمی تک اس کی رسائی ممکن ہو سکے۔ اگر میرے گیت میں موجود پیغام آسانی سے شاعری کے رموز سے ناواقف عام آدمی تک پہنچ جائے تو یہ میرے لئے باعثِ اطمینان ہے۔ مجھے ان لوگوں سے اختلاف ہے جو اظہارِ

خیال کے لئے مبہم اور پیچیدہ اسلوب کی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ جہاں تک میرے پسندیدہ نغمہ نگار کا تعلق ہے تو ہمارے یہاں کئی ایک اچھے شاعر گزرے ہیں جنہوں نے اپنے گیتوں اور غزلوں کے ذریعہ زبردست شہرت پائی۔ ان میں ساحر لدھیانوی سرفہرست ہیں۔ انہوں نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا۔ ان کا ہر گیت بڑے غضب کا ہے۔ انہوں نے اپنے گیتوں کو کبھی کمرشلائز نہیں کیا بلکہ اپنے نغمات میں چھپے پیغام کو لوگوں تک پہنچایا اس کے بعد شیلندر بہت باکمال شاعر تھے۔ ان کے علاوہ مجروح سلطان پوری، جاں نثار اختر، راجہ مہدی علی خان، بھرت ویاس، پردیپ، کیفی اعظمی، اور انجان، اس طرح یہ ایک پوری خوبصورت کہکشاں ہے جس کے رنگ انتہائی جاذب نظر ہیں۔''

''کہتے ہیں کہ پہلے نام رکھا جاتا ہے اور اس کے بعد عرفیت لیکن آپ کے ساتھ معاملہ کچھ اور ہے آپ کی عرفیت پہلے پسند کی گئی اور نام بعد میں رکھا گیا؟'' (مسکراتے ہوئے) جی ہاں! ہوا کچھ یوں کہ میری پیدائش گوالیار مدھیہ پردیش کے ایک چھوٹے سے اسپتال میں ہوئی۔ اس وقت میرے والد جاں نثار اختر اور ان کے کچھ قریبی دوست بھی موجود تھے۔ میرے والد نے جب ان سے پوچھا کہ بیٹے کا نام کیا رکھا جائے تو انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ نے جو نظم اپنی بیوی کے لئے کہی ہے کہ....!! کے مصرعے سے ''جادو'' لے لو۔ یوں میرا پہلا نام جادو رکھا گیا لیکن جب مجھے اسکول میں داخل کروانے کا وقت آیا تو میرا نام ''جاوید اختر'' رکھا گیا۔ یوں شاید میں دنیا کا واحد شخص ہوں جس کی عرفیت پہلے اور نام بعد میں رکھا گیا''۔ فلموں سے اپنی دلچسپی کے حوالے سے بچپن کا یہ یادگار واقعہ سناتے ہیں ''جب میں پانچ یا چھ سال کا تھا اور گریڈ ون میں اچھے نمبروں سے پاس ہوا تو والد نے پوچھا کہ اس خوشی میں چڑیا گھر چلو گے یا فلم دیکھنے؟ میں نے ان سے کہا کہ جی فلم دیکھنے جانا ہے یوں میں نے پہلی فلم ''آن'' دیکھی۔

۱۹۶۴ء میں فلم ڈائریکٹر بننے کا خواب آنکھوں میں سجائے ممبئی آنے والے جاوید اختر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے فلم انڈسٹری کے ابتدائی دور میں بھوک وافلاس کی بڑی بھیانک شکل دیکھی۔ ان کا اگر دن فٹ پاتھ پر گزرا تو راتیں پارک اسٹیشن میں گزاریں۔ تین تین دن فاقے کئے۔ اس وقت کے معروف فلم ڈائریکٹر کمال امروہی کے اسسٹنٹ ملازم ہوئے۔ پہلا اسکرپٹ ایس ایم ساگر کے لئے سلیم خان اور جاوید اختر نے مل کر پانچ ہزار روپے میں لکھا اور یوں ڈھائی ہزار روپے حاصل کرنے کے بعد

پسی فلمز جوائن کیا۔ وہاں ساڑھے سات سو روپے ماہانہ پر ملازم ہوئے اور سلیم جاوید کے نام سے ۱۹۷۱ء میں پہلی فلم ''انداز'' کا اسکرپٹ تحریر کیا۔ اس فلم سے انہیں بریک تھرو ملا اور رفتہ رفتہ خوش حال ہونا شروع ہوئے، فلم ''شعلے'' نے جہاں انہیں اور ہندی سنیما کو عزت اور پیسے سے نوازا وہیں دونوں اسکرپٹ رائٹرز سلیم اور جاوید اختلافات کا شکار ہو گئے تاہم خوش اسلوبی سے علیحدگی اختیار کی۔ جاوید اختر نے سلیم خان سے الگ ہونے کے بعد دوبارہ فلموں کے لئے اکیلے ہی اپنے نام سے لکھنا شروع کر دیا۔

زندگی کا پہلا گانا کب اور کیسے لکھا فلمی شاعری کو ایک نیا آہنگ دینے والے جاوید اختر کہتے ہیں ''۱۹۷۹ء میں یش چوپڑا ایک فلم بنا رہے تھے اور بضد تھے کہ میں اس کے لئے گیت لکھوں۔ جب کہ مجھے نغمہ نگار نہیں بننا تھا، اس لئے میں انہیں مسلسل ٹالتا رہا لیکن وہ بھی اڑے رہے کہ چاہے کچھ بھی ہو، گانے تو تمہیں ہی لکھنے ہیں۔ چنانچہ میں بہت مجبوری میں لکھنے بیٹھا۔ رات بھر گانے لکھتا رہا اور پھر انہیں پھاڑتا رہا۔

کیونکہ میرے اوپر ایک شاعر باپ کا بیٹا ہونے کا شدید دباؤ تھا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں لوگ یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ اتنے بڑے شاعر کے بیٹے نے کیسا خراب گانا لکھا ہے....! بہرحال میں نے ایک گیت لکھ کر دیا ''دیکھا ایک خواب تو یہ سلسلے ہوئے'' یہ گیت یش چوپڑا کو اتنا پسند آیا کہ انہوں نے اس فلم کا نام ہی ''سلسلہ'' رکھ دیا۔ اس گیت سے مجھے اتنی پذیرائی ملی کہ سچ پوچھیں تو مجھے بہت مزہ آیا اور پھر میں نغمہ نگار ہی بن بیٹھا''۔

کسی خوبصورت نغمے سے جڑے دلچسپ واقعے کو یاد کرتے ہوئے انہوں نے بتایا ''ودھو ونود چوپڑا نے اپنی فلم ''لو اسٹوری ۱۹۴۲'' کے لئے بہت ہی میٹھے بول کی فرمائش کی۔ سچویشن کے مطابق لڑکی کی تعریف میں وہ گانا تھا۔ کچھ دنوں بعد شبانہ کو سجتے سنورتے دیکھ کر خیال آیا کہ واقعی یہ بہت حسین ہے۔ اپنی نظر سے شبانہ کو دیکھتے ہوئے جس خیال نے جنم لیا، اسے میں نے کاغذ پر منتقل کرنا شروع کر دیا۔ میں چاہتا تھا کہ ہر تعریف اس کی ہو اور وہ بھی سب سچی...! شاید میں نے آج تک کوئی گانا اتنے دل سے نہیں لکھا وہ گانا ہے ''ایک لڑکی کو دیکھا تو ایسا لگا جیسے''! اس گانے کے لئے کمار سانو ریہرسل کرنے کے بعد جب فائنل ریکارڈنگ کے لئے اسٹوڈیو پہنچے تو آر ڈی برمن نے ریکارڈنگ کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ کمار سانو قدرے گندے حلئے میں بغیر شیو کئے ریکارڈنگ پر پہنچ گئے تھے۔ آر ڈی برمن نے اس سے کہا کہ پہلے اچھی طرح تیار ہو جاؤ پھر گانا گانا۔ اس نے تھوڑا سا احتجاج ضرور کیا لیکن ریکارڈنگ اسی وقت ہوئی جب کمار سانو مکمل طور پر تیار ہو کر گانے آئے''۔

کیا یہ سچ ہے ہنی ایرانی سے شادی کا پروپوزل آپ کے دوست سلیم خان کی طرف سے بھیجا گیا تھا اور اس کی عکاسی فلم ''شعلے'' میں آپ دونوں نے کی بھی ہے کہ جب امیتابھ، دھرمیندر کے لئے ہیما مالنی کا رشتہ مانگنے موسی کے پاس جاتا ہے''؟

(مسکراتے ہوئے) ''ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔ میرا یہ رشتہ سلیم خان ہی کے کہنے سے ہوا تھا۔ انہوں نے اس کی والدہ سے بات کی اور معاملے کو آگے چلایا تھا۔ ویسے میری پہلی ملاقات ہنی ایرانی سے فلم ''سیتا اور گیتا'' کے سیٹ پر ہوئی تھی اور چار ماہ بعد ہماری شادی ہوگئی لیکن ۱۹۸۳ء میں طلاق ہوگئی۔ ہم آج بھی اچھے دوست ہیں۔ میں اس کی بہت عزت کرتا ہوں اور وہ میری۔ اس کا اندازہ ہمارے ہونے والے دونوں بچوں فرحان اور زویا اختر کی بھرپور شخصیت سے لگایا جا سکتا ہے''۔

''کہتے ہیں شبانہ اعظمی اور آپ کی دوستی مثال ہے۔ وہ جاوید اختر جو اپنے دوستوں کے لئے رومانوی خط لکھتا تھا اس کی دوستی محبت میں کب تبدیل ہوئی''؟

(مسکراتے ہوئے) ''یہ بتانا کہ دوستی محبت میں کب تبدیل ہوئی بالکل ایسے ہی ہے جیسے میں کسی سے پوچھوں کہ آپ کا بچہ کب بڑا ہوا۔ میرے والد اور شبانہ کے والد ایک دوسرے کے بہت گہرے دوست تھے۔ انہوں نے ترقی پسند مصنفین کی تحریک بڑے بھرپور انداز میں ایک ساتھ چلائی تھی۔ میں اور شبانہ ایک دوسرے کو بہت کم عمری سے ہی جانتے تھے۔ پھر ۱۹۷۶ء میرے والد کے انتقال کے بعد کیفی صاحب کی مجھ پر بڑی شفقتیں رہیں۔ ہمارے بہت سے مشترکہ دوست بھی تھے۔ ۸۰ کی دہائی کے آغاز پر ہماری کچھ زیادہ ہی ملاقاتیں ہونا شروع ہوگئیں۔ دونوں نے محسوس کیا کہ ہمارے درمیان ذہنی ہم آہنگی موجود ہے۔ یوں ہم رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ شبانہ صرف میری بیوی ہی نہیں بلکہ میری محبوبہ اور سب سے بڑھ کر میری اچھی دوست ہے۔ یوں سمجھیں کہ ''میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے....! اگر یہ مصرعہ برسوں پہلے مجاز نے نہ لکھا ہوتا تو شاید میں یہ مصرعہ شبانہ کے لئے لکھتا''۔

اپنے بچوں فرحان اور زویا اختر سے وہ بہت مطمئن ہیں۔ دونوں ڈائریکشن کے شعبے میں ہیں۔ والدین

کے برخلاف انگریزی اسکولوں سے پڑھے ان کے بچوں کو اردو سے واقفیت نسبتاً کم ہے۔ فرحان اختر کا شمار بالی ووڈ میں ''دل چاہتا ہے''، ''لکشیہ'' اور ''ڈان'' کے بعد ٹاپ ڈائریکٹرس میں ہونے لگا ہے۔

ہر باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد بھی کامیابی سمیٹے۔ کیا فرحان اور زویا کو بھی ٹپس دیتے ہیں؟ اس حوالے سے جاوید اختر کہتے ہیں ''دیکھئے آج کے دور میں باپ کا دل کیا چاہتا ہے، صرف یہ کافی نہیں۔ بلکہ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آج کے بچے کیا چاہتے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ نئی نسل ہم سے بہتر سوچ رہی ہے اور اچھا کام کر رہی ہے۔ میں اپنے بچوں کو صرف اسی وقت رائے دیتا ہوں جب وہ مجھ سے رائے طلب کرتے ہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ میرے مشورے پر عمل بھی کریں۔ میں ان سے بات کر کے سیکھتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے نہیں سیکھتے تو اس میں ان کا نقصان ہے۔ زویا کا کیریئر بھی اچھا دکھائی دیتا ہے۔ وہ بالکل اپنی ماں ہنی ایرانی جیسی اچھی اسکرپٹ ڈائریکٹر ہے۔ اس کا کیریئر شروع ہونے والا ہے۔ میری نیک تمنائیں اور مدد دونوں ان کے ساتھ شامل ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بچوں کے ساتھ بھی ایسا ہو جیسے میں اپنے والد کو مس کرتا ہوں۔ فرحان اختر ایک کریٹو بچہ ہے وہ کیا سوچ رہا ہے۔ کبھی کبھی شیئر کرتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ صحیح راستہ پر گامزن ہے۔

بشکریہ اخبار مشرق (گلدستہ) کلکتہ

☆☆☆

نغمہ نگار۔ راجہ مہدی علی خان

محمد غوث (جبیل، سعودی عرب)

راجہ مہدی علی خان کی پیدائش ۱۹۲۸ء میں وزیر آباد میں جو اب پاکستان میں ہے ہوئی تھی۔ راجہ تعلیم یافتہ نہایت اعلیٰ ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے راجہ مہدی علی خان کی والدہ حمیدہ بیگم اپنے دور کی عمدہ شاعرہ تھیں۔ جن کا ایک مجموعہ کلام ''نوائے حرم'' کے نام سے شائع ہوا۔ راجہ مہدی علی خان کے ماموظفر علی خان نامور صحافی مالک و مدیر روزنامہ ''زمیندار'' تھے۔ فلمی دنیا کو زمانۂ قدیم سے عیش وعشرت بلکہ شہرت و دولت اکٹھا کرنے والی جگہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے ہر قسم کے فنکار اپنی صلاحیتوں پر پُر اعتماد ہوکر فلمی دنیا کا رخ کرتے ہیں فلمی دنیا میں بے شمار اعلیٰ درجہ کے شاعروں نے قدم جمانے کی کوششیں کیں ان میں بہت سے اپنی منفرد گیت نگاری سے بے پناہ کامیاب ہوئے۔ فلمی گیت نگاری جو ادبی شاعری سے بالکل مختلف ہے مگر فلمی شاعری میں ادبی رنگ ایک الگ بات ہے ادبی شاعری میں شاعر کا ذہن آزاد ہوتا ہے وہ کسی بھی موضوع کو اپنے شعروں میں پرو لیتا ہے۔ مگر فلمی شاعری کہانی، کردار، مناظر و مکالمات کو مخصوص طور پر پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہے۔ فلمی شاعری کو طرح طرح کی رومانی، درد بھرے، جذباتی مجرے، بھجن، قوالیاں، نت نئے انداز سے لکھتے پڑھتے ہیں پھر موسیقار، گیتوں کو دلکش گلوکاروں اور گلوکاراؤں کی آواز میں اپنی دلفریب دھنوں میں گواتا ہے۔ جو شاعر فلمی ضرورت کے مطابق اور فلمساز، ہدایت کار، مکالمہ نگار کے ساتھ اپنی سوچوں کو ذہن میں رکھ کر لفظوں میں ظاہر نہیں کر سکتا وہ چاہے کتنا ہی بڑا ادبی شاعر ہو اسے فلمی گیت نگاری میں ناکام قرار دیا جاتا ہے۔ جو شاعر فلمساز، ہدایت کار، مکالمے نگار اور موسیقار کے نظریات بالخصوص فلمی ضرورت کے تحت جب دل کو چھو جانے والے گانے لکھتا ہے تو شہرت اور دولت اس شاعر کے پاؤں چومنے لگتی ہے۔ جس طرح ماضی میں شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، اسد بھوپالی، مجروح سلطان پوری وغیرہ کے ساتھ راجہ مہدی علی خان بھی تھے۔

راجہ مہدی علی خان اپنی گھریلو معاشی مجبوریوں کے باعث پابندی سے تعلیم میں آگے نہ بڑھ سکے انٹر میڈیٹ میں ناکام ہونے کے بعد ملازمت کی طرف مائل ہوئے۔

راجہ مہدی علی خان نے سب سے پہلے اپنے ماموں ظفر علی خان کے اخبار ''زمیندار'' میں بحیثیت صحافی خدمات انجام دیں پھر اس کے بعد روزنامہ ''انقلاب'' میں بھی بطور صحافی کام کیا۔ اخبار زمیندار انقلاب کے علاوہ اور بھی اخباروں ورسائل میں راجہ مہدی علی خان کی نگارشات پابندی سے شائع ہوا کرتی تھیں اپنے دور کے مشہور اردو رائٹرس سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر راجہ مہدی علی خان کی شاعری کے بڑے شیدائی تھے اور ان کی بڑی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔

راجہ مہدی علی خان دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۵ء میں وزیر آباد سے دہلی چلے آئے تھے دہلی میں انہیں All India Radio پر بڑی جدوجہد کے بعد منشی کی ملازمت مل گئی۔ راجہ مہدی علی خان کی ملاقات دہلی میں معروف شاعر راجندر سنگھ بیدی سحر سے ہوئی جنہوں نے راجہ مہدی علی خان کو فوج میں ملازمت اختیار کرنے کا مشورہ دیا جو راجہ مہدی علی خان نے قبول کرلیا اور ریڈیو کی ملازمت چھوڑ کر فوج میں شامل ہوگئے۔

سعادت حسن منٹو نے راجہ مہدی علی خان کو فلموں میں مدعو کیا۔ راجہ مہدی علی خان ۱۹۴۶ء میں ممبئی فلموں میں گیت نگاری کے لئے آگئے مگر شروع شروع میں انہیں کافی دشواریاں پیش آئیں وہ صبح سے شام تک فلم سازوں، ہدایت کاروں اور موسیقاروں کے دفاتر، نگارخانوں، رہائش گاہوں کے چکر پہ چکر لگاتے تھے، سعادت حسن منٹو مہدی علی خان کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے رہے کبھی راجہ مہدی علی خان کو مایوس ہوکر بکھرنے نہ دیا بلکہ ان کی دوڑ دھوپ میں ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں راجہ مہدی علی خان کو دو فلموں ''دو بھائی'' اور ''آٹھ دن'' میں پہلی بار گیت لکھنے کا موقع ملا جس کی موسیقی اس دور میں ابھرتے ہوئے موسیقار ایس ڈی برمن نے دی تھی۔ فلم ''آٹھ دن'' سعادت حسن منٹو کی کہانی اور معروف ادیب اوپندر ناتھ اشک کے منظر نامے پر مبنی تھی۔ فلم ''آٹھ دن'' کے گانے شائقین میں بہت پسند کئے گئے تھے۔ مگر اس فلم کی کامیابی کے بعد بھی راجہ مہدی علی خان کو فلمی حلقوں میں شہرت نہ مل سکی۔

۱۹۴۷ء میں جب راجہ مہدی علی خان کی پہلی فلم ''دو بھائی'' ریلیز ہوئی تو اس فلم کے تمام گانے خاص طور پر ایک گانا جس کو گلوکارہ گیتا دت نے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر گایا تھا اور موسیقار ایس

ڈی برمن نے اس کی بڑی دردبھری دھن بنائی تھی لکھا

مرا سندر سپنا بیت گیا
میں پریم میں سب کچھ ہار گئی
بے درد زمانہ جیت گیا

موسیقار مدن موہن جو فلمی دنیا میں نئے نئے داخل ہوئے تھے فلمی شاعر میں سب سے زیادہ راجہ مہدی علی خان کو پسند کرتے تھے جب موسیقار مدن موہن کی پہلی فلم ''آنکھیں'' کے سبھی گانے مدن موہن نے راجہ مہدی صاحب سے لکھوائے جو بہت مشہور ہوئے انہوں نے اپنے گھر والوں کی پسند سے محترمہ زیب النساء زیب سے ۱۹۵۰ء میں شادی کی محترمہ زیب النساء زیب خود ایک عمدہ شاعرہ تھیں شادی کے بعد راجہ مہدی علی خان کی شہرت و دولت کی راہیں کھلنا شروع ہوگئیں۔فلم ''مدہوش'' کے مدن موہن کی زبردست دھنوں کے ساتھ راجہ مہدی علی خان کے تمام گانے مشہور ہوئے خاص طور پر اپنے دور کے نامور گلوکار طلعت محمود کی آواز میں گایا ہوا گانا آج کے فرمائشی گانوں میں ریڈیو پر ہفتے میں ایک بار ضرور سنائی دیتا ہے جسکے بول یوں ہیں۔

میری یاد میں تم نہ آنسو بہانا
نہ دل کو جلانا مجھے بھول جانا

فلم مدہوش کی کامیابی کے بعد راجہ مہدی علی خان کو ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۰ء تک بدنصیبی سے فلمی گانے لکھنے کا موقع نہ ملا۔گھر کی حالت غربت کا شکار ہوگئی اس کی وجہ سے راجہ مہدی علی خان اور ان کی بیوی میں بحث وتکرار کا سلسلہ روز جاری رہنے لگا جو آخر کار طلاق پر منتج ہوا۔راجہ مہدی علی خان کو زیب النساء زیب سے ایک بیٹی بھی ہے۔جس کا نام نیلوفر ہے۔راجہ مہدی علی خان تنہا ہوگئے اور بیوی اور بیٹی کی یاد میں تڑپ تڑپ کر شراب خانے کی راہ چل پڑے۔راجہ مہدی علی خان ساری ساری رات میخانے میں پیا کرتے تھے حتیٰ کہ وہیں سوجایا کرتے تھے بعد میں راجہ مہدی علی خان نے طاہرہ سلطانہ نامی خاتون سے شادی کر لی۔طاہرہ خود بھی اچھی شاعرہ تھیں ان کا تخلص مخفی تھا۔وہ ایک حیدرآبادی خاتون تھیں۔راجہ مہدی علی خان کو دوسری بیوی سے اولاد نہ ہوئی یہ غم الگ تھا مگر شدت غم ان کو دراصل پہلی بیوی سے علیحدگی اور بیٹی سے دوری اور ان کی خوشحالی میں مدد کرنے کا سبب تھا دوسری شادی کے بعد راجہ مہدی علی خان نے شراب پینا چھوڑ دیا مگر پھر حالات زندگی

سے تنگ آ کر دوبارہ شراب کو زہر سمجھ کر پینا شروع کر دیا تھا۔

۱۹۵۵ء میں سعادت حسن منٹو کے انتقال کے بعد راجہ مہدی علی خان اپنے ہمدرد دوست سے محروم ہوگئے۔راجہ مہدی علی خان کے اور بھی جو پرخلوص دوست تھے ان میں کرشن چندر کے علاوہ موسیقار غلام محمد نوشاد اور ان کے معاون موسیقار وقوال عزیز نازاں تھے جو راجہ مہدی علی خان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے نہ صرف دلدادہ تھے بلکہ ان کے بے لوث دوستوں میں تھے جو انہیں اکثر و بیشتر شراب نوشی سے روکا کرتے تھے بلکہ سگریٹ نہ پینے کے لئے کہا کرتے تھے۔

راجہ مہدی علی خان کی شریک حیات طاہرہ سلطانہ اور ان کی بیٹی نیلوفر نے بھی ہر ممکن کوشش کی کہ راجہ مہدی علی خان شراب کی لت سے چھٹکارا پائیں۔آہستہ آہستہ ایسے بھی دن آئے کہ مہدی علی خان خود بخود شراب پینے سے باز آگئے ۱۹۶۰ء کے بعد انہوں نے پھر ایک بار جم کر گیت نگاری پر کام کرنے کا عہد کر لیا۔راجہ مہدی علی خان کے اس جذبے،حوصلے اور ارادے سے موسیقار مدن موہن بے حد خوش ہوئے اور انہوں نے راجہ مہدی علی خان کے گیتوں کو اپنی پرکشش دھنوں سے سجانے کا وعدہ کیا۔

۱۹۶۲ء میں مہدی علی خان نے موسیقار مدن موہن کے ساتھ فلم ''ان پڑھ'' میں ایسے خوبصورت گیت لکھے تھے کہ شائقین ادب کے علاوہ تمام ادبی حلقے بے حد متاثر ہوئے تھے۔مدن موہن نے ایسی شاندار اور دلفریب دھنیں اس فلم کے گیتوں کی بنائی تھیں کہ شائقین موسیقی کے علاوہ بڑے بڑے موسیقار جیسے نوشاد وغیرہ اب تک ان کی دھنوں کے شیدائی ہیں گلوکارہ لتا منگیشکر خود ذاتی طور پر مدن موہن کے گیتوں اور ان کے دھنوں سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئیں بہرحال فلم ان پڑھ کے تمام گانوں کے عوام کو معیاری شاعری وموسیقی کی طرف مائل کر دیا تھا۔اس فلم کا خاص طور پر یہ گیت جو لتا منگیشکر نے گایا تھا بہت مشہور ہوا۔

آپ کی نظروں نے سمجھا پیار کے قابل مجھے
دل کی دھڑکن ٹھہر جا مل گئی منزل مجھے

راجہ مہدی علی خان کو موسیقار ایس ڈی برمن اور مدن موہن کے ساتھ نمایاں کامیابی کے بعد بہت سے فلم ساز اور ہدایت کار راجہ مہدی علی خان کو دوسرے مشہور موسیقاروں کے ساتھ جوڑنا چاہتے تھے بلکہ راجہ مہدی علی خان خود دوسرے پرانے اور نئے موسیقاروں کے ساتھ فلمی گیت لکھنا چاہتے تھے تاکہ

گیت نگاری کے شوق کی تکمیل کے ساتھ ساتھ مالی فائدہ ہوتا رہے اور معاشی حالات جلد از جلد بہتر ہوں نامور موسیقار او پی نیّر کے ساتھ ۱۹۶۶ء میں فلم ''ایک مسافر ایک حسینہ'' میں بڑے خوبصورت گیت لکھے۔ جن کو او پی نیّر نے اپنی خوبصورت دھن میں چار چاند لگا دئے اس فلم کا دوگانا ''میں پیار کا راہی ہوں'' جسے گلوکار محمد رفیع اور آشا بھونسلے نے گایا تھا بہت مشہور ہوا تھا۔

موسیقار لکشمی کانت پیارے لال نے فلم ''انیتا'' میں راجہ مہدی علی خان کے گیتوں کو اپنی دھنوں میں سجا کر پیش کیا اس فلم کے سارے گانے بہت مقبول ہوئے ایک گیت آج تک پسند کیا جاتا ہے جس کے بول یوں ہیں :

تم بن جیون کیسے جینا
پوچھو مرے دل سے

راجہ مہدی علی خان ۱۹۶۵ء سے بیمار رہنے لگے تھے اور آخر کار ۱۸ ستمبر ۱۹۶۶ء کو حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال کر گئے شعری مجموعہ (۱) مضراب) (۲) انداز بیاں (۳) آخری نظمیں۔

☆☆☆

مکالمہ نگار۔ ابرار علوی

دل میں ایک خلش سی باقی ہے

ششر شرما

ویسے تو اجودھیا (فیض آباد) کے رہنے والے میرے والد اس وقت کے یوت مال ضلع میں پولس پروزیکیوٹر تھے اور ڈی آئی جی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ میری پیدائش تو اجودھیا میں ہوئی لیکن والد کی نوکری کے دوران بچپن کا زیادہ تر وقت ہوشنگ آباد، اکولا جیسے شہروں میں گزرا۔ ناگپور میں تعلیم حاصل کی جہاں شوقیا بطور اسکرپٹ رائٹر اور اداکار میں ریڈیو، ڈراموں سے منسلک رہا اور کالج کے لیے بھی کئی ڈرامے لکھے۔ ایم اے، ایل ایل بی کرنے کے بعد ۱۹۵۱ء میں اداکار بننے کے لیے میں ممبئ چلا آیا اور کالج کے اپنے سینئر اور مشہور اسٹیج ماسٹر حبیب تنویر سے متاثر ہو کر ''اپٹا'' سے جڑ گیا۔ اسطرح تقریباً چار مہینے بغیر کسی ٹھکانے کے گزارے، پھر ایک روز اچانک سگے چچازاد بھائی ارشاد حسین سے ملاقات ہوگئی جو مجھے اپنے گھر لے گئے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ بھی ممبئ میں ہیں اور فلموں میں اداکاری کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنا فلمی نام جسونت رکھ لیا تھا اور ان دنوں وہ گرودت کی ہدایت میں فلم 'باز' میں بطور معاون اداکار کام کر رہے تھے۔ مجھے ڈرائیونگ کا بہت شوق تھا اس لیے جسونت کے ساتھ میں بطور ڈرائیور 'بازی' کی شوٹنگ پر جانے لگا تھا۔ اسی دوران اس فلم میں بطور معاون اداکار کام کر رہے راج کھوسلا سے میری اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ ایک دن میری بات سے متاثر ہو کر گرودت نے جسونت سے میرے بارے میں کچھ پوچھ تاچھ کی اور جب انہیں میری سرزمین کا پتہ چلا تو انہوں نے مجھ پر اپنی اگلی فلم 'آر پار' کے مکالمے لکھنے کی ذمہ داری ڈال دی۔ 'آر پار' بہت کامیاب رہی جس کے بعد میں گرودت کے ساتھ پوری طرح جڑ گیا۔

کالج کے دنوں میں میرے ذریعہ لکھا ایک مزاحیہ ڈرامہ 'ماڈرن میرتج' کافی کامیاب رہا تھا۔ گرودت نے جب اس ڈرامہ کا اسکرپٹ پڑھا تو انہیں اتنا پسند آیا کہ انہوں نے اگلی فلم 'مسٹر اینڈ مسز پچپن' بنائی۔ یہ فلم بھی بے حد کامیاب رہی اور اس فلم میں میرا نام صرف بطور مکالمہ نگار دیا گیا۔ اس فلم کے کریڈٹ میں اسکرپٹ رائٹر اور منظر نگار کا نام ہی نہیں تھا۔ حیدرآباد کے ایک زمیندار ریڈی گھرانے کا لڑکا میرا ساتھی تھا اس کے ذریعہ میری ملاقات ایک طوائف سے ہوئی تھی جو گجرات کے کسی مندر کے پجاری کی بیٹی تھی اور اپنے

محبوب کے ساتھ گھر سے بھاگ آئی تھی اور آخر میں دھوکہ کھا کر جسم فروشی کے دلدل میں آ پھنسی تھی۔ اس لڑکی کی اقدار اور بات چیت کے انداز نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ گرودت کی فلم ''پیاسا'' میں گلابو کا کردار میں نے اسی کو ذہن میں رکھ کر تیار کیا تھا۔ میرے سلسلے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ میں جو کچھ بنا، صرف گرودت کی وجہ سے۔ ایک حد تک یہ بات صحیح ہو سکتی ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ تصویر کے دوسرے پہلو پر کسی نے توجہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ فلم 'مسٹر اینڈ مسز پچپن' کی ہی طرح 'پیاسا' کے کریڈٹ میں میرا نام صرف مکالمہ نگار کی حیثیت سے ہی دیا گیا جبکہ اس فلم کی کہانی اور کرداروں کو تیار کرنے میں بھی میں برابر کا شریک تھا۔ ادیب کے علاوہ میں ہمیشہ سیٹ پر موجود رہ کر اداکاروں کی زبان اور تلفظ پر نظر رکھتا تھا۔ فلم 'پیاسا' کی شوٹنگ کے دوران میں کچھ وقت تک سیٹ پر نہیں جا پایا تھا۔ اداکار رادھے شیام اور محمود اس فلم میں ہیرو گرودت کے بڑے بھائیوں کے کردار میں تھے۔ شوٹنگ کے اپنے پہلے ہی دن محمود نے گرودت سے گزارش کی انہیں بنگالی لہجہ میں مکالمے بولنے دیئے جائیں جسے قبول کر لیا گیا۔ اگر میں اس وقت وہاں ہوتا تو ایسا ہرگز نہیں ہونے دیتا کیونکہ 'پیاسا' کا یہ گھرانہ بنارس کا رہنے والا ایک ایسا بنگالی گھرانہ تھا جس میں والدہ سمیت سبھی ممبران بھوجپوری ملی ہندی میں بات چیت کرتے ہیں اور چھوٹا بھائی ہیرو گرودت ہندی و اردو کا شاعر ہے۔ ایسے میں صرف ایک ممبر کا بنگالی لہجے میں مکالمے بولنا بے تکا سا لگتا ہے۔

فلم 'کاغذ کے پھول' میں پہلی مرتبہ میرا نام مکالمہ نگار کے ساتھ ساتھ اسکرپٹ رائٹر کے طور پر بھی دیا گیا لیکن یہ فلم بری طرح فلاپ ہو گئی۔ ایشین فلمز کے مالک اور نور جہاں کے شوہر شوکت حسین رضوی نے مکالموں سمیت ایک اسکرپٹ تیار کر رکھی تھی جسے وہ 'ایک جھلک' نام سے بنانا چاہتے تھے لیکن تقسیم ہند کے بعد انہیں پاکستان جانا پڑا تھا۔ یہ اسکرپٹ گرودت کے پاس رکھی تھی جس پر انہوں نے اگلی فلم بنائی لیکن اس میں میری خدمت صرف نیا نام 'چودھویں کا چاند' کے مشورے تک ہی محدود رہی۔ اس فلم کی کامیابی کے سبب مجھ سے 'صاحب بیوی اور غلام' فلم کی اسکرپٹ، مکالمے سمیت لکھوائی گئی۔ گرودت اس فلم کی ہدایت خود کرنا چاہتے تھے لیکن میں باہر کی کچھ فلموں میں مصروف ہونے کی وجہ سے شوٹنگ پر موجود رہنے میں قاصر تھا۔ نتیجتاً میری آواز میں چار گھنٹے کی اسکرپٹ 'اسپول' پر ریکارڈ کرائی گئی تاکہ ضرورت پڑنے پر گرودت کو کہانی اور کرداروں کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ ادھر گھریلو حالات کی وجہ سے ان دنوں وہ شدید ذہنی کشیدگی سے گزر رہے تھے۔ اس لیے انہوں نے خود ہدایت کاری کا خیال ترک کر کے ستین بوس اور تپن بوس وغیرہ سے

بات کی اور جب کہیں بات نہیں بنی تو یہ ذمہ داری پھر مجھے سونپ دی گئی۔ میری ہچکچاہٹ کو سمجھتے ہوئے انہوں نے کہا ''جیسا کہ میں نے بول کر ریکارڈ کرایا ہے بس ہو بہو پردے پر لے آؤ''۔ یہ فلم بنی، کامیاب ہوئی اور اسے ڈاکٹر رادھا کرشنن کے ہاتھوں صدر جمہوریہ اعزاز سے نوازا گیا۔ پھر نیو تھیٹرس کی فلم 'پریسیڈینٹ' کا ری میک بنانے کی بات چلی۔ میری مصروفیت اور موضوع سے متعلق ناپسندیدگی کی وجہ سے عصمت چغتائی سے اس کی اسکرپٹ لکھوائی گئی اور ان کے کہنے پر ہدایت کاری کی ذمہ داری ان کے شوہر شاہد لطیف کو سونپ دی گئی۔ لیکن تین ریل بننے کے بعد 'بہاریں پھر بھی آئیں گی' بند ہو گئی۔ نتیجتاً گرودت نے ہدایت کاری کی ذمہ داری خود سنبھال لی۔ کولکاتہ سے فلم 'پریسیڈنٹ' کے مصنف بنیو چٹرجی کو بلایا گیا جن کے ساتھ بیٹھ کر میں نے اسکرپٹ میں تبدیلی کروا دی۔ شاہد لطیف نے کے آصف سے دباؤ ڈلوایا تو گرودت نے کہا کہ ہدایت کاری میں خود کروں گا۔ شاہد چاہے سیٹ پر آ کر بیٹھے رہے۔ انہیں معاہدے کے مطابق پیسے ملتے رہیں گے۔ شاہد اس کے لیے تیار ہو گئے لیکن بارہ تیرہ ریل بنانے کے بعد گرودت نے خودکشی کر لی۔ فائنانسر بیایم شاہ اور گرودت کے بھائی آتما رام سمیت کمپنی سے جڑے سبھی لوگوں کی فکر کو دیکھتے ہوئے فلم 'بہاریں پھر بھی آئیں گی' میں نے پوری کی جس کے لیے مجھے فلم 'تیسری قسم' اور فلمساز آرڈی بنسل کی لیکھ ٹنڈن کے ذریعہ ہدایت کی گئی فلم 'جھک گیا آسمان' کے مکالمے لکھنے کا کام چھوڑنا پڑا۔ معاہدے کے مطابق ہدایت کاری میں ڈمی ہدایت کار شاہد لطیف کا ہی نام دیا گیا۔

گرودت کیمپ کے باہر میں نے 'ساتھی، سورج، شکار، پرنس، پروفیسر، چھوٹی سی ملاقات، بے راگ، لیلیٰ مجنوں، دو پھول، سب سے بڑا روپیا، منورنجن اور سنگھرش' جیسی تقریباً چالیس فلمیں لکھیں جن میں سے زیادہ تر کامیاب رہیں۔ آج بھی میرے پاس کئی کہانی اور اسکرپٹ تیار پڑی ہیں۔ ہر فنکار چاہتا ہے کہ اس کے فن کو پوری عزت ملے۔ اس کی شخصیت کو کم کر کے نہ تولا جائے۔ فنکاری کے میدان میں اس کی خدمات کو نظر انداز نہ کیا جائے اور میں بھی اس سے باہر نہیں ہوں۔

☆☆☆

گیت کار۔آنند بخشی

غلام رسول

بالی ووڈ ایک ایسی جگہ ہے جہاں قسمت کا بڑا دخل ہوتا ہے۔اگر قسمت نے ساتھ دیا تو یہاں فن کار کا نام پل بھر میں بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے۔کامیابی و کامرانی ہمیشہ اس کے قدم چومتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اس دار فانی سے کوچ کرنے تک ان کا نام شہرت کی روشنی سے جگمگا تا رہتا ہے۔ایسی ہی ایک فلمی شخصیت کا نام آنند بخشی ہے جو فلموں میں رسیلے، سنہرے اور دل موہ لینے والے گیت لکھا کرتے تھے۔ان کے لکھے ہوئے تقریباً سبھی گیت ہٹ ہوئے۔ان کا نام فلموں کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا ہے۔

فلموں میں چار ہزار سے زیادہ گیت لکھنے والے آنند بخشی کا ۳۰ مارچ ۲۰۰۲ء کو ممبئی کے نانا وتی اسپتال میں طویل علامت کے بعد انتقال ہوگیا۔انہوں نے فلمی دنیا کو جہاں بے شمار شیریں اور شوخ وچنچل گیت دیئے تھے وہیں ان گنت درد اور کسک بھرے گیت بھی پیش کئے۔ ان کی عمر ۷۲ سال تھی اور وہ راولپنڈی میں پیدا ہوئے تھے۔اوائل عمر ہی سے انہیں فلموں سے وابستہ ہونے کا شوق تھا لیکن آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد قسمت نے انہیں فوج میں بھرتی کروادیا۔تین سال تک فوج میں اپنی خدمات انجام دینے کے بعد آخر کار ان کے شوق نے انہیں ممبئی پہنچا دیا۔ بالی ووڈ میں بطور گیت کار قدم جمانے کے لئے یہاں کی ریت اور رواج کے اعتبار سے انہیں کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑی اور سخت جدوجہد کا سامنا کرنا پڑا۔ آنند بخشی کو سب سے پہلے مشہور کامیڈین آنجہانی بھگوان دادا نے فلم ''بھلا آدمی'' میں موقع دیا تھا اور ۱۵۰ روپئے معاوضے کے عوض چار گیت لکھوائے تھے۔اس کے بعد مشہور پروڈیوسر ڈائریکٹر اور ایکٹر راج کپور نے انہیں فلم ''مہندی لگی میرے ہاتھ'' کے گیت لکھنے کا سنہرا موقع عطا فرمایا۔لیکن انہیں خاطر خواہ کامیابی مشہور ومعروف گیت ''کنکر یا مار کے جگایا'' سے ملی۔ اس کے بعد انہیں کئی فلموں میں گیت لکھنے کا موقع ملا۔اسی دوران انکی بے پناہ مقبولیت نے انہیں کیفی اعظمی، حسرت جے پوری، شیلندر، ساحر لدھیانوی اور مجروح سلطانپوری کی صف میں لا کھڑا کر دیا۔ انہوں نے فلمی گیتوں میں بہت دھوم مچائی۔ ان کی فلموں کی فہرست کافی

طویل ہے۔ جسے یہاں دینا مناسب نہیں۔ سب سے بڑی خصوصیت ان کی یہ تھی کہ وہ دیگر گیت کاروں کی طرح کسی ایک موسیقار پر اکتفا کبھی نہیں کرتے تھے بلکہ سبھی موسیقاروں کے ساتھ وہ گیت لکھتے تھے لیکن خاص کر لکشمی کانت پیارے لال اور آر ڈی برمن کے ساتھ انہوں نے زیادہ کام کیا تھا اور مدھر گیتوں کے ذریعہ دھوم مچا دی تھی، ان کی کامیاب فلموں کے چند نام حسب ذیل ہیں۔ملن، محل، ہمالیہ کی گود میں، جب جب پھول کھلے، دو راستے، جیون مرتیو، کھلونا، آن ملو سجنا، آرادھنا، کٹی پتنگ، ہرے راما ہرے کرشنا، میرا گاؤں میرا دیش، بابی، میرے ہم سفر، چرس، سیتا اور گیتا، امر پریم، ایک دوجے کے لئے، شعلے، کھلنا ئیک، بڑے میاں چھوٹے، رام لکھن، دل والے دلہنیا لے جائیں گے۔ دل تو پاگل ہے، تال، یادیں، محبتیں اور کئی دیگر فلمیں قابل ذکر ہیں۔اسی طرح ان کے چند ہٹ گیت اس طرح ہیں، ساون کا مہینہ پون کرے سور....بندیا چمکے گی ....اچھا تو ہم چلتے ہیں....مار دیا جائے کہ چھوڑ دیا جائے....میرے جیون ساتھی پیار کئے جا....چولی کے پیچھے کیا ہے....وغیرہ گیت لکھنے کے علاوہ انہیں گیت گانے کا بھی شوق تھا۔انہوں نے فلم موم کی گڑیا، میں لتا منگیشکر کے ساتھ ایک یادوگانا، باغوں میں بہار آئی....گایا تھا۔اس فلم میں ایک اور گیت ''میں ڈھونڈ رہا تھا سپنوں میں'' گایا تھا۔

آنند بخشی ایک اچھے گیت کار ہونے کے ساتھ ایک شریف النفس اور منکسر المزاج شخص بھی تھے۔وہ اکثر سنجیدہ دکھائی دیتے تھے۔لیکن باتوں باتوں میں مزاح پیدا کرنے کا فن خوب جانتے تھے۔انہوں نے ۱۹۶۰ء سے کچھ پہلے فلموں میں گیت لکھنا شروع کیا۔اس طرح ان کا فلمی کیریر تقریباً ۴۵ سال کے طویل سفر پر محیط تھا۔دوران سفر انہوں نے فلمی دنیا کو بے شمار کامیاب گیت دیئے۔انہوں نے فلمی شائقین کو ان گنت خوشیوں بھرے اور کئی درد بھرے گیت پیش کئے۔گیت کار آنند بخشی کے گیت سدا بہار گیت بن کر ہمیشہ گونجتے رہیں گے اور سامعین انہیں گیتوں کے سہارے ہمیشہ یاد کرتے رہیں گے۔کیونکہ ''جانے والے کبھی نہیں آتے جانے والوں کی یاد آتی ہے''۔

☆☆☆

گیت کار۔ اندیور

وکیل انور چاپدانوی

بنارس کے قریب بروا ساگر نامی ایک گاؤں میں ایک زمیندار خاندان میں ۱۹۲۱ء میں ایک بچے نے جنم لیا۔ خاندان والوں نے اس کا نام شیام لال راؤ رکھا۔ جب یہ بچہ صرف دس برس کا تھا کہ گاؤں میں زبردست ہیضہ پھیلا اور ماں باپ دونوں ہی لقمۂ اجل ہو گئے۔ اسی بچے نے جب جوانی میں قدم رکھا تو ملک پر انگریزی حکومت کا قبضہ تھا وطن کی آزادی کے لئے ملک میں بغاوت کی مشعل روشن ہو چکی تھی۔ انہیں دنوں شیام لال راؤ کی ملاقات گاندھی جی سے ہوئی۔ گاندھی جی نے شیام لال راؤ کو بہت متاثر کیا اور اس میں وطن کے لئے کچھ کرنے کی خواہش بیدار ہوئی اس نے پر اثر نظمیں لکھنا شروع کیں اور اپنی نظموں کے ذریعہ وطن کے عوام میں آزادی کا جذبۂ پیدا کرنے کی کوشش کی اسی دوران انہوں نے ایک نظم انگریزی حکومت کے خلاف لکھی اور اس کی پاداش میں شیام لال راؤ کو ایک سال کی قید ہوگئی۔ جیل سے رہائی کے بعد شیام لال راؤ کی دنیا بدل چکی تھی انہوں نے گاؤں چھوڑ کر شہر جانے کا فیصلہ کیا اور ممبئی چلے آئے۔ یہاں انہوں نے فلموں میں گانے لکھنے کے لئے تگ و دو شروع کی کافی کوشش کے بعد قسمت مہربان ہوئی۔ ۱۹۴۲ء میں انہیں ایک فلم کے گیت لکھنے کا موقع ملا اور اپنا فلمی نام اندیور رکھا فلم کا نام تھا ''ڈبل فیس'' یہ فلم کچھ خاص نہیں چلی اس کے بعد ۱۹۵۰ء میں انہیں ایک اور فلم ملی جس کا نام تھا ''ملہار'' اس کے موسیقار تھے اپنے وقت کے مشہور و معروف سنگیت کار روشن فلم ''ملہار'' بہت زیادہ کامیاب ہوئی اس فلم کے یہ گیت ''بڑے ارمان سے رکھا ہے بلم تیری قسم پیار کی دُنیا میں یہ پہلا قدم....'' مکیش اور لتا کی آواز میں گایا ہوا گانا کافی مقبول ہوا اور آج بھی اس کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ اس طرح شیام لال راؤ یعنی گیت کار اندیور نے بڑے ارمان کے ساتھ فلمی دنیا میں اپنی کامیابی کا پہلا قدم رکھا۔ اس کے بعد اندیور نے ایک اور فلم ''بادبان'' کے لئے گانے لکھے اس کے سنگیت کار تھے تمیسر برن فلم کامیاب نہیں رہی اور شاید اس فلم کی ناکامی نے ان کے دل کو تکلیف پہنچائی اور انہوں نے تقریباً چودہ سال

تک کسی بھی فلم کے لئے گانے نہیں لکھے۔ چودہ سال کے بعد انکی فلم آئی ''دولہا دلہن'' کے نام سے اس فلم کے سنگیت کار تھے کلیان جی آنند جی اس فلم کے سارے کے سارے گانے کافی ہٹ ہوئے۔ اور اس طرح اندیور اور کلیان جی آنند جی کی نئی جوڑی بن گئی۔ اس ہٹ جوڑی نے بے شمار خوبصورت فلمیں دیں ''دولہا دلہن'' کے علاوہ ہولی آئی رے، دھرماتما، ہمالیہ کی گود میں، پورب اور پچّھم، سفر، سچا جھوٹا، پارس، بلیک میل، اپکار، جانی میرا نام اور سرسوتی چندر وغیرہ۔

فلم اپکار میں منّا ڈے کی آواز میں گایا ہوا گانا ''قسمیں وعدے پیار وفا سب.....'' کافی مقبول ہوا اور اس گیت کے لئے منّا ڈے کو اس سال کا گلوکار کا بہترین ایوارڈ ملا اور ''سرسوتی چندر'' کا گیت ''چندن سا بدن چنچل چتون....'' اور سب سے مقبول گیت مکیش اور لتا کی آواز میں گایا ہوا ''پھول تمہیں بھیجا ہے خط میں....'' اس قدر مشہور اور مقبول ہوا کہ سنگیت پریمیوں کی زبان پر صرف اندیور اور کلیان جی آنند جی کا نام تھا۔ فلم ''قربانی'' کا ایک گیت جس نے پاکستانی پاپ سنگر نازیہ حسن کو راتوں رات عالمی شہرت نصیب کی وہ تھا ''آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے تو بات بن جائے.....'' اس گانے کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اُس سال ریکارڈ کی فروخت میں فلم قربانی کے ریکارڈ نے سب سے زیادہ فروخت ہونے کا ریکارڈ بنایا تھا۔ کلیان جی آنند جی کے علاوہ گیت کار اندیور نے روشن کے سپوت راجیش روشن کی موسیقی کے لئے بھی بے شمار ہٹ فلموں کے گانے لکھے ہی جیسے فرض چکانا ہے، خون بھری مانگ، خود غرض، کام چور، کوئل اور آخر میں اپنے وقت کی سپر ہٹ فلم کرن ارجن جس کے تمام گیت بہت مقبول ہوئے۔ ان تمام فلموں سے پہلے ایک فلم آئی تھی ''آخر کیوں'' اس فلم کا یہ گیت ''دشمن نہ کرے دوست نے وہ کام کیا ہے.....'' لتا منگیشکر اور امیت کمار کی آوازوں میں گایا ہوا یہ گیت بہت زیادہ مقبول ہوا تھا اور آج بھی ہے۔

گیت کار اندیور نے اور بھی بہت سے سنگیت کاروں کے لئے لکھے ہیں جن میں شیامل مترا، اوشا کھنہ، بپی لہری، بیجو شاہ وغیرہ شامل ہیں اندیور کی شاعری میں زندگی کی سچائی تھی ان کے بہت سارے گیت فلمی ہونے کے باوجود اچھی شاعری اور اعلیٰ ادب کا نمونہ ہیں جیسے فلم اپکار کا یہ گیت ''قسمیں وعدے پیار وفا سب باتیں ہیں باتوں کا کیا....'' اس گیت میں جھوٹے رشتے ناتوں

کی بات ہے آج کی دُنیا میں وفا، قسم اور وعدے بے معنی الفاظ بن کر رہ گئے ہیں یا پھر ''سرسوتی چندر'' کا یہ گیت ''چھوڑ دے ساری دنیا کسی کے لئے یہ مناسب نہیں آدمی کے لئے ....'' اس گیت میں پیار کے علاوہ اور بہت سی حقیقتیں ہیں جن کا سامنا انسان کو کرنا پڑتا ہے اسی سچائی کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

بہرکیف اندیور نے ۷۶ سال کی عمر میں ۲۸ رفروری ۹۷ کو اس دار فانی سے کوچ کیا آج وہ ہمارے درمیان نہیں مگر ان کے لکھے ہوئے بے شمار گانے ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔

☆☆☆

عظیم گلوکار۔کندن لال سہگل

ایم قمر علیگ

ہندوستانی فلم انڈسٹری کی تاریخ کا جب بھی مطالعہ کیا جائے گا گلوکار اور اداکاری دونوں میں کندن لال سہگل (۱۹۴۷ء۔۱۹۰۴ء) کا تذکرہ ضرور سامنے آئے گا۔اس عظیم فنکار کے ذکر کے بغیر فلمی تاریخ نامکمل ہے۔گزشتہ ۱۸ جنوری کو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں جہاں جہاں آج بھی سہگل کے مداح رہتے ہیں، اس عظیم فنکار کو خراج عقیدت پیش کرنا نہیں بھولے اور بھولتے بھی کیسے کیونکہ ۶۰ سال گزر جانے کے بعد بھی ان کی گلوکاری کا جادو برقرار ہے۔گلوکاری کی دنیا کا یہ تابناک ستارہ اپنی لافانی فن کے لیے ہمیشہ تاریخ کے اوراق میں زندہ جاوید رہے گا۔موسیقار اعظم نوشاد کے مندرجہ ذیل منظوم کلام سے اسی بات کی ترجمانی ہوتی ہے:

سہگل کو فراموش کوئی کر نہیں سکتا
وہ ایسا امر ہے کہ کبھی مر نہیں سکتا
ہر دل میں دھڑکتا ہوا وہ ساز ہے باقی
گو جسم نہیں ہے مگر آواز ہے باقی

۱۹۰۴ء می جالندھر میں پیدا ہونے والے کندن لال سہگل نے اپنا کیرئیر پنجاب ریلوے میں ٹائم کیپر کی حیثیت سے شروع کیا تھا۔کچھ دن انہوں نے سیلز مین کی حیثیت سے بھی کام کیا لیکن ملازمت سے ان کا دل مطمئن نہیں ہوا۔بچپن سے ہی انہیں گانے کا شوق تھا اور ان کی طبیعت تصوف کی جانب مائل تھی۔جب وہ بہت چھوٹے تھے تو ان کی والدہ اس وقت کے معروف صوفی بزرگ سلمان یوسف کے پاس ان کو لے جایا کرتی تھیں جس کی وجہ سے صوفیانہ کلام اور قوالیاں ان پر اثر انداز ہوگئیں اور ان میں گلوکاری کا شوق پیدا ہوگیا۔اس کے لیے انہوں نے نہ صرف سخت محنت کی بلکہ اس زمانے کی مشہور شخصیات استاد فیاض خاں، پنچ ملک اور پہاڑی سانیال سے باقاعدہ موسیقی کی تربیت حاصل کی۔

جس وقت سہگل صاحب نے فلم انڈسٹری میں قدم رکھا ہندوستانی سنیما خاموش فلموں کے دور سے متکلم فلموں کے دور میں داخل ہوگیا تھا کیونکہ ۱۹۳۱ء میں اولین بولتی فلم ''عالم آرا'' منظر عام پر آچکی تھی ،فلموں میں داخل ہونے سے قبل ہی سہگل صاحب ہندوستانی کلاسیکل موسیقی میں گلوکاری کے لیے مقبول ہوچکے تھے۔ بی این سرکار نے ان کی گلوکاری سے متاثر ہوکرانہیں فلموں میں متعارف کرایا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ہیرو اور ہیروئن کو اپنے گانے خود ہی گانے پڑتے تھے۔ نیوتھیٹر لمیٹڈ کلکتہ نے ۱۹۳۲ء میں تین فلمیں بنائی تھیں۔(۱) ''محبت کے آنسو'' جس میں سہگل صاحب نے اختری مرادآبادی کے ہمراہ اداکاری کی تھی۔ اتفاق سے سردست اس فلم کے گانوں کی تفصیل دستیاب نہ ہوسکی۔(۲) ''صبح کے ستارے'' جس میں رتن بائی کے ساتھ کام کیا۔اس فلم میں انہوں نے گیت بھی گائے اور (۳) ''زندہ لاش'' جوکہ انہوں نے مہ جبیں کے ساتھ کی تھی۔اس فلم کے گیتوں کی تفصیل بھی دستیاب نہیں ہوسکی۔۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء تک سہگل صاحب نے تقریباً ۳۹ فلموں میں کام کیا اور تقریباً ۱۴۲ فلمی گیت گائے۔ یہاں ان کی فلم ''تدبیر''، ''عمر خیام'' اور ''پروانہ'' کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ اس زمانے کی معروف اداکارہ اور گلوکارہ ثریا نے نہ صرف ان کے ساتھ کام کیا بلکہ گانے بھی گائے۔ ۱۸ر جنوری ۱۹۵۲ء میں سہگل صاحب کی ۵ ویں برسی کے موقع پر ''اسکرین'' میگزین میں ثریا نے انہیں امر قرار دیتے ہوئے کہا تھا:

''میری زندگی کا سب سے زیادہ عجیب وغریب واقعہ ان کے ساتھ فلم ''تدبیر'' میں ڈوئٹ گانے کا تھا۔ میں ہمیشہ ان کی فین رہی ہوں اور یہ خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے ان کے ساتھ گانے کا موقع ملے گا۔ جب تک ان کے نغمے ہمارے ساتھ ہیں وہ امر ہیں۔''

۱۹۴۶ء میں منظر عام پر آنے والی فلم ''شاہجہاں'' سہگل صاحب کی مقبول ترین فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔موسیقار اعظم نوشاد نے اس فلم کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ فلمی میگزین ''شمع'' میں قسط وار شائع ہونے والی ''نوشاد کی کہانی نوشاد کی زبانی'' میں انہوں نے فلم ''شاہجہاں'' کا تذکرہ کیا تھا۔سہگل صاحب کے ذریعہ گائے ہوئے اس فلم کے نغمے آج بھی مقبول ہیں۔نوشاد صاحب نے گانوں کی ریکارڈنگ سے متعلق ایک واقعہ کا ذکر کیا تھا۔سہگل صاحب مے نوشی کے

عادی تھے اور اکثر شراب نوشی کے بعد ہی ریکارڈنگ کراتے تھے۔ وہ شراب کو ''کالی پاچ'' کہتے تھے۔''شاہجہاں'' کے نغموں کی ریکارڈنگ کے وقت بھی یہی ہوا۔انہوں نے ''کالی پاچ'' کی خواہش ظاہر کی اور ریکارڈنگ کرادی مگر نوشاد صاحب مطمئن نہیں ہوئے۔انہوں نے سہگل صاحب سے کہا کہ میں گانے کی ریکارڈنگ بغیر ''کالی پاچ'' کے بھی کرنا چاہتا ہوں۔ سہگل صاحب مسکرائے اور کہا کہ ریکارڈنگ اچھی نہیں ہوگی مگر وہ نوشاد صاحب کے کہنے سے ریکارڈنگ کے لیے تیار ہوگئے۔ دونوں ریکارڈنگ کے لیے تیار ہوگئے۔ جب دونوں ریکارڈنگ انہیں سنائی گئیں تو معلوم ہوا کہ بغیر ''کالی پاچ'' والی ریکارڈنگ شاندار ہے جسے سہگل صاحب نے بھی پسند کیا۔نوشاد صاحب نے سہگل صاحب سے کہا آپ بغیر ''کالی پاچ'' کے شاندار گا سکتے ہیں۔اس پر سہگل صاحب نے کہا نوشاد صاحب آپ مجھے پہلے کیوں نہیں ملے۔ اگر آپ پہلے ملتے تو میری شراب چھوٹ جاتی مگر اب بہت دیر ہوچکی ہے۔

۶۰ کی دہائی میں ہمارے ملک میں ریڈیو سیلون بہت مقبول تھا۔ اس کے دو پروگرام- ''بنا کا گیت مالا'' اور صبح ساڑھے سات بجے سے آٹھ بجے تک براڈ کاسٹ ہونے والا پرانے گانوں کا پروگرام بہت دلچسپی سے سنا جاتا تھا۔ اس پروگرام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ روزانہ اس کا آخری گیت جو اکثر 7:75 بجے صبح کو بجایا جاتا تھا وہ سہگل صاحب کا ہوتا تھا۔سہگل کا گیت سامعین کے معمولاتِ زندگی میں صبح کے آٹھ بجنے کی علامت بن گیا تھا۔ ریڈیو سیلون کے اس پروگرام کے آخر میں سہگل کا گایا ہوا گیت بجانا ۱۹۵۴ء میں ریڈیو سیلون پر مامور ہندوستان نژاد ایک افسر وجے کشور نے لازمی کیا تھا۔

۱۹۸۹ء میں جب میں نے طلعت محمود کا انٹرویو لیا تھا تو ان سے ایک سوال کیا تھا کہ آپ کس گلوکار اور گلوکارہ سے متاثر ہیں تو انہوں نے ایک جملے میں کہا '' میں سہگل صاحب کو پسند کرتا ہوں ،انہی سے متاثر ہوں۔''

اپنے زمانے کے عظیم موسیقار انل بسواس نے بھی سہگل صاحب کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''سہگل نے گلوکاری کو غیر معمولی بلندیوں تک پہنچایا۔ ان کی آواز، ان کا سُر، ان کی ترجمانی کی قوت یہ سب ان کی ہم عصر گلوکاروں اور آنے والے گلوکاروں کے لیے رہنمائی کا باعث بنیں گے۔ اس دنیا میں سہگل جیسا کوئی دوسرا نہیں ہوگا۔''

سہگل صاحب کے زیادہ تر گیت ہندوستانی کلاسیکل موسیقی یعنی راگوں پر مبنی ہیں جن میں ہندوستان کی عظیم اور قدیم ثقافتی تہذیب کی جھلک ملتی ہے۔ نوشاد کے مطابق ''ہندوستانی موسیقی چاہے وہ کلاسیکی ہو یا عوامی اگر اس میں ''ہندوستانیت'' نہیں ہے تو پھر وہ بے رنگ و بے رس ہے۔''

ہندوستانیت کے یہ سارے رنگ ہمیں سہگل کی گلوکاری میں ملتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ساٹھ سال گزر جانے کے بعد بھی سہگل صاحب کے گانے سننے کے بعد تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ آج بھی نووارد گلوکاروں کے لیے سرچشمۂ تحریک ہیں۔ گلوکاری کا یہ منارہ ہمیشہ روشن رہے گا۔

کندن لال سہگل کے مقبول ترین نغمے

۱۔ رادھا رانی دے ڈارونہ	پورن بھگت	۱۹۳۳ء
۲۔ جھولنا جھلا وُری	راگ دیوگندھر	۱۹۳۳ء
۳۔ بالم آئے بسو مورے من میں	دیوداس	۱۹۳۵ء
۴۔ دکھ کے دن اب بیتت ناہیں	دیوداس	۱۹۳۵ء
۵۔ اک بنگلہ بنے نیارا	پریسیڈنٹ	۱۹۳۷ء
۶۔ دنیا رنگ رنگیلی بابا	دھرتی ماتا	۱۹۳۸ء
۷۔ بابل مورا نیہر چھوٹا جائے	اسٹریٹ سنگر	۱۹۳۸ء
۸۔ کروں کیا آس نراس بھئی	دشمن	۱۹۳۹ء
۹۔ میں کیا جانوں کیا جادو ہے	زندگی	۱۹۴۰ء
۱۰۔ سو جا راج کماری سو جا	زندگی	۱۹۴۰ء
۱۱۔ نس دن برست نین ہمارے	بھگت سورداس	۱۹۴۲ء
۱۲۔ مدھر کرشیام ہمارے	بھگت سورداس	۱۹۴۲ء

۱۳۔ دیا جلاؤ۔ دیا جلاؤ	تان سین	۱۹۴۳ء
۱۴۔ سپت سُر تین تال	تان سین	۱۹۴۳ء
۱۵۔ دو نینا متوارے تہارے	مائی سسٹر	۱۹۴۴ء
۱۶۔ کیا میں نے کیا ہے	مائی سسٹر	۱۹۴۴ء
۱۷۔ جنم جنم کا دکھیا پرانی آیا شرن تہاری	تدبیر	۱۹۴۵ء
۱۸۔ اے دل بے قرار کیوں	شاہجہاں	۱۹۴۶ء
۱۹۔ چاہ برباد کرے گا ہمیں	شاہجہاں	۱۹۴۶ء
۲۰۔ غم دیے مستقل کتنا نازک ہے دل	شاہجہاں	۱۹۴۶ء
۲۱۔ انسان! کیوں روتا ہے انسان	عمر خیام	۱۹۴۶ء
۲۲۔ ٹوٹ گئے سب سپنے میرے یہ دونینا	پروانہ	۱۹۴۷ء

☆☆☆

لافانی آواز۔محمد رفیع

شاہد احمد

آج رفیع صاحب کی ۳۰/ویں برسی ہے۔گوانہیں ہم سے جدا ہوئےتیس برس گذر چکے ہیں لیکن ان کی یاد آج بھی ہر دل میں تازہ ہے۔ان کے گیت آج بھی مقبول ہیں اِن کی مدھراور سریلی آواز آج بھی سننے والوں کوسکون وراحت بخشتی ہے۔ان کی آواز کی نغمگی ہمارے احساسات اور جذبات کواس طرح چھو جاتی ہے جیسے شہ رگ پر بجلی کوندگئی ہو۔

رفیع صاحب کی پیدائش ۲۴/دسمبر ۱۹۲۴ءکوصوبہ پنجاب کے ضلع امرتسر میں کوٹلہ کے مقام پر سلطان سنگھ گاؤں میں ہوئی بچپن سے ہی انہیں گانے کا شوق رہااوراپنے شوق کی تکمیل کے لئے وہ اکثر کوئی نہ کوئی گیت گاتے رہتے تھے۔رفیع صاحب کاتعلق ایک غریب خاندان سے تھا جہاں گیت سنگیت کواچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ان کے بڑے بھائی دین محمد کی ایک دکان تھی۔رفیع صاحب اپنے بھائی کی دکان پر ہی سارادن گذارا کرتے تھے۔دین محمد نے اپنے بھائی کے اندر چھپی صلاحیت کو پہچان لیا اور یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ اپنے بھائی کی اس صلاحیت کو ضائع ہونے نہیں دینگے۔انہوں نے رفیع صاحب کوایک اچھا گلوکار بنانے میں ہرطرح کی مدد کی اوراپنی ذمہ داری بخوبی نبھائی۔

رفیع صاحب نے ۱۹۴۱ء میں اپنا پہلا گیت ایک پنجابی فلم ''گل بلوچ'' کے لئے گایا تھا۔جس کی موسیقی شیام سندر نے ادا کی تھی۔پنجابی گیتوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے بعد رفیع صاحب نے ہندی فلموں میں گانے کا رخ کیا اوراسی مقصد کے تحت وہ ۱۹۴۲ء میں بمبئ پہنچے۔

بمبئ میں ان کی ملاقات مشہورسنگیت کارنوشاد سے ہوئی۔انہوں نے نوشاد صاحب سے ہندی فلموں میں گیت گانے کی خواہش ظاہر کی۔اس وقت کے مقبول اورمشہوراداکار کندن لال سہگل کے لئے انہوں نے اپنی محبت اورعقیدت کا اظہار کیا اوران کے ساتھ گانے کی خواہش ظاہر کی۔نوشاد صاحب نے انہیں مایوس نہیں کیا اورفلم شاہ جہاں میں کندن لال سہگل کے ساتھ انہیں صرف دولائن گانے کودیا ''حسن کے؟؟؟ تھے'' روحی روحی میرے سپنوں کی رانی'' جونوجواں رفیع کے لئے یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔سہگل جیسے بڑے اداکار کے ساتھ گانااوراپنی منزل کو پانے کی جانب یہ پہلی

کامیابی تھی۔اس کے بعد وہ دن بھی آیا جب رفیع صاحب نے فلم جگنو کے لئے'' یہاں بدلا وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے'' گایا۔یہیں سے انہوں نے اپنی پہچان بنائی اوراپنی منفرد آواز کا سحرانگیز اثر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم کیا۔اس کے بعد رفیع صاحب ممبئ فلم انڈسٹری میں پوری طرح چھا گئے۔ان کے گائے ہوئے گیت کچھ اس طرح مقبول ہونے لگے کہ ہر ڈائریکٹر موقع دینے لگا۔پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں بیشترفلموں میں رفیع صاحب کے ہی گیت ہوا کرتے تھے۔رفیع صاحب چونکہ کم پڑھے لکھے تھےاس لئے شروع شروع میں بڑی مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔گیت کوصحیح طرح سے یاد کرنا،تلفظ کوصحیح ڈھنگ سے ادا کرنا،لفظوں کے وزن کو برقرار رکھنا،سنگیت کے تال کے ساتھ اپنی آواز کےتوازن کوملانا وہ ان سب سے نا آشنا تھےلیکن انہوں نے یہ سبھی کچھ سیکھا بلکہ یہ سب کچھ سیکھنے کے لئے انہوں نے مزید بہت کچھ سیکھا۔اپنے گیتوں کوتقویت بخشنے کے لئے انہوں نے کلاسیکی سنگیت کی تعلیم حاصل کی مختلف قسم کے سازوں کو بجانا سیکھا اوراپنی آواز کو پرکشش اور پراثر بنانے کے لئے بے پناہ ریاض کیا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے گائے ہوئے گیتوں میں ایک الگ قسم کی فنی آمیزش کا احساس ہوتا ہے۔

انہوں نے سبھی طرح کے گیت گائے۔رومانی گیت،غزلیں،بھجن،کلاسیکی گیت،قوالی،کامیڈی گیت،جذباتی نغمیں اورجدید قسم کے''فاسٹ سونگ'' یعنی مغربی طرز کے گیت وغیرہ۔اور یہ سب کچھ اتنی آسانی کے ساتھ کہ سننے والوں کوان میں تفریق کرنا مشکل ہوکہ کون سی صنف اچھی ہے یا کون کس سی بالاتر۔ان کے گائے ہوئے سبھی گیتوں اورنغموں میں بے پناہ کشش ہےاور بلا کی بلوغیت کہ سننے والا ان کی آواز میں ہی کھوکر رہ جائے۔ان کی سانسوں میں ایک طوفان بھرا ہوا تھا جوان کی آواز کی بلندی کواس مقام تک لے جاتا تھا جہاں تک پہنچنا کسی کے بس کی بات نہیں۔تلفظ میں وہ چاشنی کہ لفظوں کواس کی خوبصورتی سے زیادہ وقعت بخش دے۔یہی وہ چیزیں تھیں جوانہیں دوسروں سے جدا کرتی ہیں۔یہی وہ خصوصیتیں تھیں جس نے انہیں ایک عظیم گلوکار بنا دیا تھا۔انہوں نے ہندستان کی مختلف زبانوں میں ۲۶ ہزار سے زیادہ گیت گائے اورچالیس سال تک گاتے رہے۔یہ ایک ایسا ریکارڈ ہے جو اب تک برقرار ہےانہوں نے ہندستانی فلم انڈسٹری کے زیادہ تر اداکاروں،موسیقاروں کے لئے گیت گائے اورساٹھ کی دہائیوں میں ایک ایسا وقت بھی آیا جب دلیپ کمار،راجندر کمار،دیوآنند،راج کمار،شمی کپور اوردھرمیندر کی فلموں میں مستقل طور پرانہیں کی آوازیں ہوتی تھیں۔یعنی ان اداکاروں کی فلموں میں

صرف رفیع صاحب کے ہی گیت ہوا کرتے تھے انہوں نے فلمی گلوکار کشور کمار کے لئے بھی راگنی، باغی، شہزادہ اور شرارت جیسی فلموں میں گیت گائے۔ رفیع صاحب نے اپنے زمانے کے بہترین موسیقاروں کی دھن پر گیت گائے جن میں سچن دیو برمن، سی رام چندر، روشن، شنکر جے کشن، مدن موہن، او۔ پی۔ نیر، کلیان جی آنند جی، لکشمی کانت پیارے لال، جے دیو، سلیل چودھری، اقبال قریشی، روی، اوشا کھنہ چترگپت، روندر جین اور راہول دیو برمن شامل ہیں۔ ان موسیقاروں کی دھن میں گانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ کیونکہ یہ تمام حضرات اپنے زمانے اور اپنے فن دونوں پر حاوی تھے ان کے کلاسیکی سنگیت پر بڑی گرفت تھی اور وہ سب سنگیت کے استاد مانے جاتے تھے۔ رفیع صاحب کو ان کے معیار میں خود کو ڈھالنا تھا۔ اس کے لئے انہیں بڑی سخت محنت کرنی پڑی اور ریاض کرنا پڑا۔ انہوں نے اپنے فن کو معیاری بنانے کے لئے استاد عبدالواحد خاں پنڈت جیون لال مٹو، غلام علی خاں اور فیروز نظامی جیسے کلاسیکی سنگیت کے اساتذہ سے سنگیت کا سبق حاصل کیا اور فن کو جاننا اور پہچاننا سیکھا۔ ۱۹۶۵ء میں حکومت ہند نے انہیں پدم شری کے انعام سے نوازا۔ ۱۹۷۷ء میں صدر مملکت نیلم سنجیوا ریڈی نے پانچویں نیشنل فلم فسٹول میں انہیں رجت کمل کے انعام سے سرفراز کیا۔

رفیع صاحب نے ہر طرح کے گیت گائے ان کے گیت میں وسیع النظری اور وسیع القلبی دونوں موجود تھی۔ ان کے گیتوں میں روشن خیالی اور روشن ضمیری بھی پائی جاتی ہے۔ جو ہمیں مایوسیوں سے نکال کر ایک نئی صبح کی آمد کی امید دلاتے ہیں۔ یہی باتیں رفیع صاحب کی عظمت اور آفاقیت کو وسیع تر بنا دیتی ہیں۔ ان کے گیتوں میں حب الوطنی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے پیغام بھی ہیں اور سرمایہ دارانہ، زمین دارانہ نظام کے تئیں نفرت بھی۔ ان کے گیتوں میں کسانوں کے لہلہاتے کھیتوں کے منظر بھی ہیں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے تیور بھی ان کے گیتوں میں سامراج وادی جنگوں اور نوآبادیت کے خلاف بغاوت بھی ہے اور فاشزم کی مزاحمت بھی۔

ان کے گیتوں میں جہاں محبت اور اخوت کے پیغام ہیں وہیں امن، سلامتی اور خوش حالی کے سندیس بھی ہیں۔ ان کے گیت جہاں ہماری روزمرہ کی زندگی کی کشمکش کی داستان سناتے ہیں وہیں ہمیں مایوسیوں کے اندھیرے سے نکال کر ایک نئی صبح کی آمد کا منظر دکھاتے ہیں۔ موجودہ نظام کے فرسودہ رسم ورواج کا جہاں منظر دکھاتے ہیں وہیں

ایک نئے خوش حال معاشرے کی آمد کا یقین بھی دلاتے ہیں۔

آج رفیع صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ہمارے سامنے وہ تمام مسائل موجود ہیں جنہیں انہوں نے اپنے گیتوں کا موضوع بنایا تھا۔ عالمی سطح پر سماج وادی ممالک کے بکھرنے سے سامراج واد مضبوط ہو گیا ہے۔ اور ساری دنیا کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس مقصد کی حصولیابی کے لئے وہ ہر ایک ملک کے مقامی اور علاقائی ادب وثقافت کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہے۔ اسی مقصد کے تحت آج کل پائریٹنگ کا دور شروع ہوا ہے پرانے گیتوں کو نئے انداز میں گانے کے نام پر ان گیتوں کے نہ صرف طرز کو ہی بدلا جارہا ہے بلکہ کہیں کہیں ان کے الفاظ بھی بدلے جا رہے ہیں جس سے ان گیتوں کا اصل مقصد اور اس کی روح ختم ہو رہی ہے۔ رفیع صاحب کے گیتوں کو ہی توڑ مروڑ کر گانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ ایک سامراجی سازش ہے جس کا اصل مقصد ہمارے کلاسکی ادب اور ثقافت اور ہماری پرانی یادگاروں کو چھین لینا ہے اسے مٹا دینا ہے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا ہے اس سازش کے کامیاب ہونے کا مطلب نے نہ صرف ہم سے ہمارے ماضی کی تہذیب وتمدن کو ختم کر دیا ہے بلکہ سامراج وادی تہذیب، ثقافت اور کلچر کو منظّم کرنا، فروغ دینا اور نئی نسل کے ذہن میں داخل کرنا بھی ہے۔ ایسے میں ہماری نئی نسل گمراہی کا شکار ہو رہی ہے۔ اپنے ملک کے کلاسکی ادب وثقافت سے ناآشنائی انہیں تباہی کے راستے پر لے جا رہی ہے تاریخ کے اس موڑ پر ہم رفیع صاحب کے نغموں میں اپنے مسئلوں کو سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

رفیع صاحب کے بعد بہت سے لوگوں نے ان کی آواز میں گانے کی کوشش کی اور ان کی خالی جگہ کو پُر کرنا چاہا لیکن ہر کوشش اب تک ناکام ہی رہی۔ ایسے لوگوں میں شبیر کمار، انور اور محمد عزیز بھی شامل ہیں۔ شبیر کمار اور انور اب گمنامی میں چلے گئے ہیں ایک محمد عزیز ہیں جنہوں نے کوششیں جاری رکھی ہیں اور ابھی تک ہمت نہیں ہاری ہے۔ آج بھی انگنت نوجوان محمد عزیز کی طرح اپنے ہر دل عزیز گلوکار محمد رفیع کے گیتوں کو گاتے ہیں۔ ان کے مداح ان کے گیتوں کو سنتے ہیں اور ان کی یاد کو تازہ کرتے ہیں۔ جب تک اپنے ملک اور ملک کے لوگوں کے لئے ہمارے سینے میں محبت باقی ہے محمد رفیع اور ان کے گیت بھی زندہ رہیں گے۔

☆☆☆

شہنشاہِ غزل ۔ طلعت محمود

رفعت سروش

ایک زمانہ تھا جب اس غیر فلمی گانے کی مقبولیت فلمی گانوں سے زیادہ تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب راقم الحروف نے ریڈیو پر نوکری کی تھی۔ اس گانے کا اپنی میٹھی اور درد انگیز آواز سے جادو جگانے والے تھے، طلعت محمود۔ جو اُس وقت بمبئی نہیں آئے تھے۔ ریڈیو اسٹیشن پر غزلیں اور گیت گانے والوں کے لئے کلام چُننا میرے فرائض میں داخل تھا اور ریڈیو پر گانا ہر گانے والے کو پسند تھا، یہ ان کی پبلسٹی کا ذریعہ تھا اور عوام تک پہنچنے کے علاوہ فلموں تک پہنچنے کی آسان سیڑھی، اس زمانے میں مکیش سب سے زیادہ مقبول تھے ڈاکٹر صفدر آہ کا لکھا ہوا اُن کا گانا

دل جلتا ہے تو جلنے دے آنسو نہ بہا، فریاد نہ کر

فلم 'پہلی نظر' میں آچکا تھا۔ ریڈیو پر گانے کے لئے ان کی فیس ۱۵/روپے تھی۔ ایک فیس میں تین غزلیں گانی پڑتی تھیں۔ محمد رفیع لاہور سے نئے نئے آئے تھے اور ریڈیو پر ان کے گانے کی فیس تھی ۱۰/روپے۔ اس وقت تک ان کا مشہور گانا

یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے

(نور جہاں کے ساتھ) نہیں آیا تھا۔ پھر دونوں گلوکار فلموں میں تیزی سے ترقی کی منزل طے کرنے لگے اور محمد رفیع کی مقبولیت نے مکیش کو پیچھے چھوڑ دیا اس سے پہلے ایس ڈی باتش اور جی ایم درّانی، اپنے اپنے زمانے میں مقبولیت کی بلندیوں تک پہنچ کر نیچے اُتر چکے تھے۔

آزادی کے ایک دو سال بعد لکھنؤ سے دو فنکار عروس البلاد بمبئی آئے۔ ان میں ایک تھے الکٹرک گٹار کے بے مثل فن کار، وان شیلے اور دوسرے طلعت محمود۔

طلعت محمود لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے گایا کرتے تھے اور کلکتہ سے بھی اور ان کے نام سے پہلے ان کا گانا

تصویر تری، دل مرا بہلا نہ سکے گی

بمبئی کے گلی کوچوں میں گونجتا تھا۔ طلعت محمود ایک نہایت دل پذیر شخصیت، خوش مزاج، خوش لباس، متوازن قد وقامت، بیضاوی چہرہ، شرفائے لکھنؤ کی شرافت ان کی صورت پر تبسم میں بڑی جاذبیت تھی۔ گفتگو میں شائستگی اور مٹھاس، میری ان سے دوستی ہوگئی۔ ایک دلچسپ بات یاد آئی، ہمارے ریڈیو

پروگرام کے لئے خط لکھنے والوں میں سے کسی نے لکھا: ہمیں یہ دو نام بہت پسند ہیں، طلعت محمود اور رفعت سروش (معاف کیجئے اس میں خودستائی کا پہلو نکل آیا۔ ر۔س) طلعت نے ریڈیو پر میری کئی غزلیں گائیں اور ریڈیو سیلون کے لئے میرے کئی اوپیراؤں میں انھوں نے میرا کلام گایا تھا (افسوس میں نے اپنے گانوں کے ریکارڈ محفوظ نہیں کئے) اس زمانے میں طلعت محمود ریڈیو اسٹیشن کے قریب ہی دھوبی تالاب کے علاقے میں ایک کمرے میں رہتے تھے۔ میری ایک دوست نما خاتون۔ عمر میں مجھ سے بڑی، مگر نہایت شائستگی سے شعر وموسیقی کی داد دینے والی۔ اور محکمۂ تعلیم میں اعلیٰ عہدے پر فائز۔ (نام نہ پوچھئے) طلعت سے ملنا چاہتی تھی۔ میں نے طلعت محمود سے کہا۔ مگر وہ شرمائے۔ خیر اخلاقاً ملے۔ مگر ایسے ہی جیسے بڑے فنکار اپنے مداحوں سے حرف حرف بمبئی میں ملتے ہیں۔ طلعت محمود سینٹ اسٹیفنس کالج بمبئی کے مشہور پرنسپل این۔ ایل احمد کی بیگم۔ قمر احمد کے قریبی رشتہ دار تھے۔ غرض طلعت محمود کی شرافت ونجابت کی قسم کھائی جاسکتی تھی۔

فلم انڈسٹری نے طلعت محمود کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک نئی آواز، ایک نیا انداز اور اس زمانے میں تقریباً سرگوشیوں میں مکالمے ادا کرنے والے شہنشاہِ جذبات دلیپ کمار کی آواز سے طلعت محمود کی آواز میل کھاتی تھی، چنانچہ جہاں دلیپ کمار، وہاں طلعت محمود اور جہاں جہاں رومانی دھندلکوں میں مہکتی ہوئی آواز کی ضرورت وہاں طلعت محمود کی چاہت۔ دیکھتے دیکھتے اس وقت کا سب سے مشہور پلے سنگر محمد رفیع بھی نمبر ۲ ہوکر رہ گئے۔ اولیت کا سہرا بندھ گیا تھا طلعت محمود کے سَر۔ کسی اسٹوڈیو میں طلعت محمود کے گانے کی ریہرسل پر کشور کمار نے کہا تھا کہ اس آواز کو سن کر تو میں لب کھولنے کی بھی جرأت نہیں کرسکتا۔

دلیپ کمار کے لئے طلعت گاتے ہی تھے۔ راج کپور نے بھی فلم بے وفا، کے لئے ان سے ''دل متوالا، لاکھ سنبھالا'' اور ''تم کو فرصت ہو مری جاں تو ادھر دیکھ تو لو''۔ جیسے گانے گوائے۔ رومانی ہیرو، دیو آنند کا گانا ''جائیں تو جائیں کہاں''۔ ایس ڈی برمن کے سنگیت نردیشن میں فلم ٹیکسی ڈرائیور میں طلعت محمود نے ہی گایا تھا۔ غرض طلعت نے فلم والوں کا دل موہ لیا تھا۔

مثل مشہور ہے کہ بدقسمتی کہہ کر نہیں آتی۔ دراصل انسان کی اپنی ہی لغزش اسے کبھی کبھی ایسے غار میں ڈھکیل دیتی ہے کہ جس سے نکلنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اور کامیابی پر بے جا غرور اچھوں اچھوں کو لے ڈوبتا

ہے۔بمبئ میں ایک مخصوص فلمی سماج ہے جس میں کچھ لوگ اپنا وقار رکھتے ہیں اوران کی عظمت مسلم ہے۔ مثلاً دلیپ کمار نے ہر قیمت پر اپنی ساکھ بنائے رکھی ہے اور ۱۹۴۵ء سے آج تک وہ اپنی الگ جگہ بنائے ہوئے ہیں اسی طرح موسیقاروں میں ہر شخص چوتھے دہے کے موسیقار نوشاد علی کو شہنشاہ موسیقی تصور کرتا ہے۔اورنوشاد صاحب کے یہاں جورکھ رکھاؤ، جوشرافت نفسی، جوحِلم اوراپنے سے چھوٹوں کے لیے جو شفقت ہے اس میں آج تک کوئی کمی نہیں آئی ہے، وہ بے حد کم سخن ہیں، ایک عمدہ موسیقار ہونے کے علاوہ ایک اچھے شاعر ہیں۔میاں کارداراورنوشادصاحب، شکیل بدایوانی اور دلیپ کمار پرتھوی راج کپور یہ لوگ فلمی دنیا کی آن بان شان رہے ہیں اوران میں سے جوحیات ہیں ان کی شرافت کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔

لکھنؤ کی تہذیب کے پروردہ اور بے حد خلیق گلوکار طلعت محمود سے غلطی نہ معلوم کیسے ہوگئی کہ اس نے (بقول راوی) فلم بابل کے گانوں کی ریکارڈنگ کے دوران بزرگ موسیقار نوشاد کے سامنے سگریٹ پینے کی جرأت کی اور دھواں اُن کی طرف اُڑادیا۔طلعت کی اس حرکت سے نوشاد صاحب ناراض ہوگئے۔ اوراگلی فلم ''انداز'' کے لیے انہوں نے طلعت کی جگہ مکیش کو لے لیا۔اوران کی یہ دوری طلعت سے ۱۸/سال تک رہی۔(ہوسکتا ہے اس واقعہ کی تہہ میں کوئی اور بات ہو کیونکہ صرف سگریٹ کا دھواں ہوا میں تحلیل ہوسکتا ہے) بہر حال لوگوں کا کہنا ہے کہ نوشاد صاحب سے قطع تعلق طلعت کے لئے بہت مضر ثابت ہوا۔

مگر میرا خیال ہے کہ طلعت محمود کے زوال کا سبب ان کی فلم ''نادان'' ہے۔ان سے نادانی یہ ہوئی کہ شہرت اورمقبولیت کی کامیابی نے انہیں کے۔ایل سہگل کے نقش قدم پر چلنے کے لئے اُکسایا۔خود ہیرو بنو کسی اور کے لیے نہیں اپنے لئے گاؤ۔طلعت محمود کے اس خیال کی تکمیل میں کاردارصاحب نے اس کی مدد کی اوراپنے بینر سے فلم ''دلِ نادان'' بنائی۔جس میں نوشاد صاحب نے تو موسیقی دینے سے انکار کردیا مگر ان کے ایک شاگرد غلام محمد نے موسیقی دی اور فلم میں طلعت ہیرو آئے۔اوران کے گانے بہت مقبول ہوئے۔

محبت کی دھن بے قراروں سے پوچھ
تیری دنیا سے دل بھر گیا۔اور
جوخوشی سے چوٹ کھائے وہ جگر کہاں سے لاؤں

گانے تو مقبول ہوئے مگر فلم کے ہیرو طلعت محمود کو بطور ہیرو فلم بینوں نے پسند نہیں کیا۔اس موقع پر ایک بات یاد آئی۔

طلعت محمود کی نرم ونازک شخصیت کے حوالے سے ایک باراُس زمانے کی مشہور ہیروئن۔بیگم پارہ نے کہا تھا کہ کاش کسی فلم میں میں ہیروئن ہوں اور طلعت محمود ہیرو۔طلعت محمود کی ناکامی اور زوال کا دورشروع ہوگیا۔ان کی ایک دو فلمیں اورآئیں اور پٹ گئیں۔اورمیوزک ڈائریکٹروں نے تو جیسے طلعت کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑدیا۔طلعت گمنامی کے غار میں چلے گئے۔اپنی سطح سے اُتر کر کسی سے کام مانگنے نہیں گئے۔اوراندر ہی اندر گھٹتے رہے۔

اب موسیقاروں کی وہ کھیپ آگئی جنہیں طلعت کی آواز بے وقت کی آواز معلوم ہونے لگی۔شنکر جے کشن نے تو (بقول راوی) یہاں تک کہہ دیا۔طلعت جیسی روتی بسورتی آواز کے لئے کوئی جگہ نہیں۔

۱۸/سال بعد فلم ''آدمی'' کے لئے نوشاصاحب نے ہی انہیں یاد کیا۔گانا ریکارڈ بھی ہوا۔مگر منوج کمار نے کہا کہ طلعت کی لرزتی ہوئی آواز میری آواز سے میل نہیں کھاتی، اور پھر وہ گانا مہندر کپور سے گوایا گیا اور پھر تو طلعت نے جیسے سنیاس لے لیا اوران کی صحت گرتی چلی گئی۔ہلکا سا فالج کا اثر بھی آخر آخر میں ہوگیا تھا۔بہت دن کی بات ہے دہلی میں علی صدیقی نے عالمی اردو کانفرنس کے کسی پروگرام میں طلعت کو بلایا تھا۔ میری ان سے وہ آخری ملاقات تھی۔وہ مریض، تھکے تھکے، افسردہ افسردہ زبان حال سے کہہ رہے تھے۔

تیری دنیا سے دل بھر گیا

اور کچھ عرصہ بعد وہ اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔اب تو ان کی آواز بھی کبھی کبھار ہی سننے کو ملتی ہے اپنے زمانے کا مشہور گلوکار وقت سے پہلے موت کی گود میں سوگیا تھا۔

جب کہ مکیش، رفیع اور کشور کو گاتے گاتے ہی ملک الموت نے پکڑا تھا۔اوران کی شہرت کا آفتاب آج بھی چمک رہا ہے۔

دراصل طلعت محمود کی خودداری بھی ان کے آڑے آئی۔مگر جب بھی بیسویں صدی کے وسط کے نغموں کی تاریخ لکھی جائے گی تو سرفہرست طلعت محمود کے گانے ہی ہونگے۔

آج ناقدریٔ فن کا ایک عبرتناک نمونہ ہیں طلعت محمود، کل خدا جانے۔

☆☆☆

سدا بہار گلوکار ۔ کشور کمار

یاسمین اختر

ابھاس کمار گنگولی عرف کشور کمار (۴ اگست ۱۹۲۹ تا ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۷) ہندی فلموں کے ایک ایسے گلوکار اور اداکار گزرے ہیں جنہوں نے ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۷ء تک اپنے فلمی کیریر کے دور میں پوری فلم انڈسٹری کو اپنے قبضے میں لے رکھا تھا اور ان کے سدا بہار گیتوں نے تقریباً ۱۸ برسوں تک لوگوں کو مسحور کئے رکھا۔ اگر چہ ان کا فلمی کیریر ۱۹۵۱ء سے شروع ہوا تھا مگر ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک صرف محمد رفیع کی حکمرانی رہی اور ۱۹۷۱ء میں شکتی سامنت کی فلم آرادھنا کی ریلیز کے بعد انہیں نئی زندگی ملی جس کے بعد ۱۹۸۷ء تک اپنی حکمرانی قائم کئے رکھی۔ کشور کمار بحیثیت نغمہ نگار، کمپوزر، پروڈیوسر، ڈائریکٹر، ایکٹر، اسکرین، رائیٹر اور اسکرپٹ رائیٹر کے ساتھ گلوکاری کی دنیا میں تہلکہ مچانے والے پہلے اور آخری ہرفن مولا تھے۔ انھوں نے ہندی، بنگلہ (مادری زبان) مراٹھی، آسامی، گجراتی، کنٹر، بھوجپوری، ملیالم، اڑیہ میں محمد رفیع اور مکیش کے ساتھ مل کر گیت گائے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۰ء تک وہ تین لیڈنگ گلوکاروں میں شامل تھے جنمیں رفیع، مکیش اور کشور کے نام تھے۔ بہترین پلے سنگر کے طور پر انھوں نے سب سے زیادہ مرتبہ فلم فیئر ایوارڈ حاصل کیا تھا۔ ان کی پہلی بیوی سے امیت کمار اور چوتھی بیوی سے سمیت کمار پیدا ہوئے، دوسری بیوی مدھوبالا اور تیسری بیوی یوگیتا بالی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

جس وقت کشور کمار ایک چائلڈ آرٹسٹ کے طور پر فلمی دنیا سے متعارف ہوئے تھے اس وقت ان کے بڑے بھائی اشوک کمار فلمی دنیا کے سب سے بڑے سپر اسٹار تھے کشور کمار کو کندن لال سہگل (کے ایل سہگل) کے گیتوں سے بیحد پیار تھا اور وہ انہیں اپنا گرو تصور کرتے تھے۔ کشور کمار کا نام اشوک کمار ہی نے دیا تھا اور ان کا اصل نام ابھاس کمار گنگولی شاید ہی کوئی جانتا ہو۔ ۱۹۵۱ء میں پہلی مرتبہ بمبئی ٹاکیز کی فلم ''آندولن'' میں کشور نے ہیرو کا رول ادا کیا تھا۔ یہ رول بھی انہیں اشوک کمار نے دلایا تھا اگر چہ وہ چاہتے تھے کہ کشور صرف پلے بیک سنگر کے طور پر اپنے کیریر کو بنائے۔ کشور بھی

گانے سے بہت زیادہ دلچسپی رکھتے تھے اور انہیں اداکاری سے سے زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔

کشور کمار نے کئی مشہور ہدایتکاروں کے ساتھ کام کیا۔ ۱۹۵۴ء میں بمل رائے کی فلم ''نوکری'' میں انھوں نے ایک بیروزگار تعلیم یافتہ شخص کا رول ادا کیا تھا۔ رشی کیش مکھر جی نے بطور ڈائریکٹر اپنی پہلی فلم (''مسافر''۔ ۱۹۵۷) میں دلیپ کمار کے ساتھ لیا تھا۔ سلیل چودھری جو کہ فلم نوکری کے میوزک ڈائریکٹر تھے انھوں نے بطور سنگر کشور کمار کو مسترد کردیا تھا۔ جب انہیں یہ پتہ چلا کہ کشور نے گانے کے سلسلے میں کوئی تربیت حاصل نہیں کی ہے۔ بعد ازاں انھوں نے اُسے موقع دیا اور پہلا گیت ''چھوٹا سا گھر ہوگا'' گانے دیا وہ گیت اس سے پہلے ہیمنت کمار کو دیا جانے والا تھا۔

شروع میں بطور ہیرو جب انہیں ناکامی ہوئی تو ۱۹۵۶ء میں پہلی مرتبہ ایک مزاحیہ فلم ''نئی دہلی'' میں ان کے رول کو بیحد پسند کیا گیا۔ اس کے بعد آشا (۱۹۵۷ء) چلتی کا نام گاڑی (۱۹۵۸ء) جھمرو (۱۹۶۱ء) ہاف ٹکٹ (۱۹۶۲ء) اور پڑوسن (۱۹۶۸ء) میں وہ بطور مزاحیہ اداکار کے بیحد مشہور ہوئے۔ چلتی کا نام گاڑی ان کے ہوم پروڈکشن کی فلم تھی جس میں تینوں گنگولی برادران اشوک کمار، انوپ کمار اور کشور کمار نے کام کیا تھا اس فلم کی ہیروئن مدھوبالا تھی جس کے ساتھ کشور نے بعد میں شادی کرلی تھی۔ یہ فلم ایک شہری لڑکی اور ایک کار میکینک کے درمیان رومانس پر مبنی بیحد دلچسپ فلم تھی۔

اس فلم کے موسیقار ایس ڈی برمن تھے اور انھوں نے اس فلم میں کشور کمار کی آواز کا بہترین انداز میں استعمال کیا کہ لوگ کشور کی آواز کے عاشق ہوگئے خاص طور سے وہ گیت.... ہم تھے وہ تھے اور سماں رنگین سمجھ گئے نا، ایک لڑکی بھولی بھالی سی، دے دے تو میرا پانچ روپیہ بارہ آنا وغیرہ بیحد مقبول ہوئے تھے۔ دراصل ایک دن برمن دا اشوک کمار کے گھر گئے تھے اور گھر کے باتھ روم کے اندر کشور سہگل کی آواز میں نہاتے ہوئے گیت گارہے تھے اور ان کے گانے کے انداز سے ہی برمن دا نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس نوجوان کے اندر زبردست ٹیلینٹ ہے اور ایک دن وہ اپنے گیتوں کی بدولت نام کرے گا۔

برمن دا نے کشور کو دیوآنند کی فلم منیم جی (۱۹۵۴ء) ٹیکسی ڈرائیور (۱۹۵۴ء) ہاؤس

نمبر۴۴ (۱۹۵۵ء) فنٹوش (۱۹۵۶ء) نو دو گیارہ (۱۹۵۷ء) پیئنگ گیسٹ (۱۹۵۷ء) گائیڈ (۱۹۶۵ء) جیول تھیف (۱۹۶۷ء) پریم پجاری (۱۹۷۰ء) اور تیرے میرے سپنے (۱۹۷۱ء) میں لیا۔انھوں نے کشور کی ہوم پروڈکشن فلم چلتی کا نام گاڑی میں بغیر کسی معاوضے کے موسیقی دی تھی۔ایس ڈی برمن کی موسیقی میں کشور کے چند مشہور گیتوں میں (۱) ماناجناب نے پکارا نہیں (پے انگ گیسٹ) (۲) ہم ہی راہی پیار کے ہم سے کچھ نہ بولئے (نو دو گیارہ) (۳) اے میری ٹوپی پلٹ کے آ (فنٹوش) (۴) ایک لڑکی بھیگی بھاگی سی (چلتی کا نام گاڑی) (۵) دل پکارے، آرے آرے آرے (جیول تھیف) (۶) یہ دل نہ ہوتا بے چارہ (جیول تھیف) جب برمن اور لتا منگیشکر کے تعلقات ۶۲۔۱۹۵۷ء بگڑ گئے تھے تب انھوں نے لتا کی چھوٹی بہن آشا بھونسلے کو موقع دینا شروع کیا تھا۔آشا بھونسلے اور کشور کمار کے ڈویٹ گانے جو برمن دا نے تیار کئے وہ بیحد مشہور ہوئے تھے۔(۱) چھوڑ دو آنچل زمانہ کیا کہے گا (پیئنگ گیسٹ) (۲) آنکھوں میں کیا جی کسی کا آنچل (نو دو گیارہ) (۴) حال کیسا ہے جناب اور پانچ روپیہ بارہ آنا (چلتی کا نام گاڑی) (۴) چھیڑو نہ میری زلفیں، سب لوگ کیا کہیں گے (گنگا کی لہریں) (۵) ارے یار میری تم بھی ہو غضب (تین دیویاں) وغیرہ ایسے ڈویٹ گیت تھے جن کی وجہ سے آشا۔کشور کی جوڑی بیحد ہٹ ہوگئی تھی۔

۱۹۶۱ء میں کشور نے فلم جھمرو بنائی جس میں مدھو بالا کو ہیروئن لیا، اس میں ہدایت کاری، فلمسازی اور اداکاری کشور کمار ہی کی تھی۔۱۹۶۴ء میں انھوں نے دور گگن کی چھاؤں میں، ۱۹۷۱ء میں دور کا راہی اور ۱۹۸۰ء میں دور وادیوں میں کہیں، بنا کر کشور فلمسازی اور ہدایتکاری سے بہت دور ہوگئے۔۱۹۶۱ء میں ضرورت ہے ضرورت ہے (منیم جی) گاتا رہے میرا دل (گائیڈ) اور یہ دل نہ ہوتا بے چارہ (جیول تھیف) کے گانوں نے کشور کمار کو زبردست مقبولیت بخشی تھی۔

۱۹۶۰ء کے بعد برمن دا کے بیٹے راہول دیو برمن نے بھی کشور کمار کے ساتھ زبردست جوڑی بنائی۔پہلی زبردست فلم پڑوسن تھی (۱۹۶۸ء) جس میں کشور کمار کا بیحد ہٹ گیت (میرے سامنے والی کھڑکی میں) اور کہنا ہے کہنا آج تم سے یہ دل کی بات۔بیحد مشہور ہوا تھا، اس کے ساتھ ہی منا

ڈے کے ساتھ ''ایک چتور نار بڑی ہوشیار'' تو آج تک بیحد مشہور گیت مانا جاتا ہے۔

۱۹۷۱ء میں شکتی سامنت نے فلم آرادھنا بنائی، لیکن محمد رفیع، کشور کمار، آشا بھونسلے اور لتا منگیشکر کے چند گیت ریکارڈ کرانے کے بعد برمن دا بیمار پڑ گئے جس کے بعد ان کے اسسٹنٹ آر ڈی برمن نے ساری ذمہ داری قبول کر لی اور کشور کا سدا بہار گیت ''میرے سپنوں کی رانی کب آئے گی تو، روپ تیرا مستانہ پیار میرا دیوانہ، کورا کاغذ تھا یہ من میرا۔وغیرہ ریکارڈ کرایا جو بیحد مقبول ہوا۔

۱۹۶۹ء میں ایس ڈی برمن نے فلم پریم پجاری کے لئے کشور کے گیت جیسے پھولوں کے رنگ سے اور شوخیوں میں گھولا جائے۔اور ۱۹۷۱ء میں شرمیلی فلم میں آج ہوش اڑا جائے رے گوریا۔آر ڈی برمن کے ساتھ کشور نے فلم شعلے کے علاوہ کٹی پتنگ، میرے جیون ساتھی، بڈھا مل گیا، پریچے، نمک حرام، انامیکا، آپ کی قسم، اگر تم نہ ہوتے جیسی مشہور فلموں میں کام کیا۔

کن فلموں کے لئے ان کے گیت نامزد ہوئے

۱۹۷۱ء۔زندگی ایک سفر ہے سہانا (انداز)
۱۹۷۱ء۔یہ جو محبت ہے (کٹی پتنگ)
۱۹۷۲ء۔چنگاری کوئی بھڑکے (امر پریم)
۱۹۷۳ء۔میرے دل میں آج کیا ہے (داغ)
۱۹۷۴ء۔گاڑی بلا رہی ہے (دوست)
۱۹۷۴ء۔میرا جیون کورا کاغذ (کورا کاغذ)
۱۹۷۵ء۔میں پیاسا تم ساگر (فرار)
۱۹۷۵ء۔او ماجھی رے (خوشبو)
۱۹۷۷ء۔آپ کے انورودھ پہ (انورودھ)
۱۹۷۸ء۔او ساتھی رے تیرے بنا بھی (مقدر کا سکندر)

۱۹۷۸ء۔ہم بے وفا ہرگز نہ تھے (شالیمار)

۱۹۷۹ء۔ایک راستہ ہے زندگی (کالا پتھر)

۱۹۸۰ء۔اوم شانتی اوم (قرض)

۱۹۸۱ء۔ہمیں تم سے پیار کتنا (قدرت)

۱۹۸۳ء۔شاید میری شادی کا (سوتن)

۱۹۸۳ء۔چھو کر میرے من کو (یاراں)

۱۹۸۴ء۔دے دے پیار دے (شرابی)

۱۹۸۴ء۔انتہا ہو گئی انتظار کی (شرابی)

۱۹۸۴ء۔لوگ کہتے ہیں میں شرابی ہوں (شرابی)

بی ایف جے اے ایوارڈ

۱۹۷۱ء۔ارادھنا

۱۹۷۲ء۔انداز

۱۹۷۳ء۔ہرے راما ہرے کرشنا

۱۹۷۵ء۔کورا کاغذ

☆☆☆

دنیائے موسیقی کا بے مثال گلوکار۔منا ڈے

ایم۔قمر علیگ

پر بودھ چندر ڈے جو صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا مین منا ڈے کے نام سے مشہور ہیں، مغربی بنگال میں پیدا ہوئے تھے۔موسیقی کے شعبہ میں مغربی بنگال کی اپنی ایک شناخت ہے۔حالانکہ منا ڈے کو اپنے بچپن میں کشتی اور باکسنگ کا شوق تھا۔لیکن وہ اپنے سب سے چھوٹے چچا سنگیت آچاریہ، کے۔سی ڈے سے بہت متاثر تھے۔یہی سبب تھا کہ وہ اپنے کالج کے زمانے میں مسلسل تین سال تک گلوکاری کے مقابلوں میں اول مقام حاصل کرتے رہے۔

۱۹۴۲ء میں وہ کرشن چندر ڈے (کے۔سی ڈے) کے ہمراہ ممبئی چلے آئے۔یہاں پر انہوں نے کے۔سی ڈے کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرنا شروع کیا۔اس کے بعد وہ سچن دیو برمن کے تحت کام کرنے لگے۔جب انہوں نے آزادانہ طور پر ہندی فلموں میں موسیقار کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا تو اسی دوران انہوں نے ہندستانی کلاسیکل کے اس زمانے کے معروف استادوں، استاد امن علی خاں اور استاد عبدالرحمٰن سے تربیت حاصل کی۔

منا ڈے نے ۱۹۴۳ء میں فلم ''تمنا'' سے اپنی گلوکاری کے کریئر کا آغاز کیا۔اس فلم میں نہ صرف کے۔سی ڈے نے ہی گیت گائے تھے بلکہ ثریا کے ساتھ منا ڈے نے ایک ڈوئٹ بھی گایا تھا۔اس زمانے میں یہ ڈوئٹ ''کیتکی گلاب جوہی'' بھی گایا جو کہ آج بھی ایک نایاب کلاسیکل گیت تصور کیا جاتا ہے۔محمد رفیع، لتا منگیشکر اور کشور کمار کے ساتھ بھی انہوں نے لافانی گیت گائے ہیں۔

انہوں نے ۱۹۴۴ء میں منظر عام پر آنے والی دلیپ کمار کی اولین فلم ''جوار بھاٹا'' کے لیے گیت گائے۔حالانکہ یہ فلم فلاپ ہو گئی تھی، مگر اس کے گیتوں نے مقبولیت حاصل کی تھی۔اسی دہائی میں انہوں نے راج کپور کی تین فلموں ''آوارہ'' (۱۹۵۱ء) ''بوٹ پالش'' (۱۹۵۴ء) اور ''شری ۴۲۰'' (۱۹۵۵ء) کے لیے گیت گائے اور مقبولیت کے ریکارڈ قائم کیے۔۱۹۶۱ء میں فلم ''کابلی والا'' میں منا ڈے نے ایک گیت ''اے میرے پیارے

وطن'' گایا تھا۔اس گیت میں حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور منا ڈے نے اپنی دلکش آواز میں اس طرح پیش کیا تھا کہ راہ گیر بھی اس کو سننے کے لیے رک جاتے تھے۔

چونکہ منا ڈے کی ابتدائی تربیت کلاسیکل موسیقی میں ہوئی تھی،اس لیے فلمی گیتوں پر بھی اس کا اثر قائم رہا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن کے دنوں میں ۱۹۶۵ء میں بی آر چوپڑہ کی فلم''وقت'' ریلیز ہوئی تھی،اس فلم میں بلراج ساہنی کے لیے منا ڈے نے ایک گیت''اومیری زہرہ جبیں'' گایا تھا۔اس زمانے میں یہ گیت ریڈیو سیلون سے اکثر براڈ کاسٹ کیا جاتا تھا۔اس گیت میں منا ڈے نے آواز کے اتار چڑھاؤ کی عمدہ ترین مثال قائم کی تھی۔منوج کمار کی فلم''اپکار'' جو کہ ۱۹۶۷ء میں ریلیز ہوئی تھی،اس میں پران کے لیے انہوں نے جو گیت''قسم وعدے پیار وفا'' گایا تھا وہ اپنی مثال آپ ہے۔فلم''برسات کی رات'' کی قوالی''نہ تو کارواں کی تلاش ہے'' آج بھی سامعین پر جادو کا سا اثر کرتی ہے۔ بھارت بھوشن اور مدھو بالا کی یہ فلم آج بھی بہترین فلموں کی صف میں شمار کی جاتی ہے۔ یہاں میں راج کمار اور مالا سنہا کی ۱۹۶۸ء میں ریلیز ہونے والی فلم''میرے حضور'' کا ذکر کرنا چاہوں گا۔اس فلم میں منا ڈے نے ''جھنک جھنک تیری باجے رے پایلیا'' گیت گایا تھا جو کہ راج کمار پر فلمایا گیا تھا۔یہ گیت منا ڈے کی گلوکاری میں سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے، کیونکہ اس میں کلاسیکل موسیقی کے ضابطوں کی پابندی کرتے ہوئے فلمی گیت کے مکھڑوں کی ادائیگی کی گئی تھی۔اسے بنا کا گیت مالا میں خصوصی درجہ حاصل ہوا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اسی سال سنیل دت اور سائرہ بانو کی فلم''پڑوسن'' ریلیز ہوئی تھی۔فلم کے پردے پر کشور کمار اور محمود کے درمیان موسیقی کا مقابلہ دکھایا گیا تھا۔''ایک چتر نار کرکے سنگار'' ایسا ڈوئٹ جسے منا ڈے اور کشور کمار نے گایا تھا۔موسیقی کے ماہرین اسے فلموں کا بے مثالی گیت قرار دیتے ہیں۔

جب ایک عظیم فنکار کسی دوسرے فنکار کی تعریف کرتا ہے تو اس سے نہ صرف اس کی فراخدلی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس کے وقار میں مزید بلندی آجاتی ہے۔اس بات کا انکشاف میں یہاں منا ڈے کے تعلق سے کرنا چاہتا ہوں۔ایک جگہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ''محمد رفیع مجھ سے بہتر گلوکار تھے۔وہ مکمل گلوکار تھے۔ایسے کتنے گلوکار ہیں جو ہر طرح کا گیت گا سکتے ہیں۔دیگر گلوکاروں کی محدود رینج تھی لیکن رفیع صاحب نے اور میں نے ہر طرح کے گیت

گائے۔موسیقاروں کو ہم پر مکمل بھروسہ تھا''۔

اگر منا ڈے کے اس بیان پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت پر مبنی ہے کیوں کہ رفیع صاحب اور منا ڈے نے فلمی گیت گانے سے قبل کلاسیکل موسیقی کے معروف ترین استادوں سے تعلیم حاصل کی تھی،ان کی محنت نے فلمی گیتوں کو لافانی بنادیا۔اگر کلاسیکل موسیقی کی روشنی میں منا ڈے کے فلمی گیتوں پر تفصیلی گفتگو کی جائے تو اس کو اس مختصر مضمون میں سمیٹنا مشکل کام ہے۔ کیونکہ انہوں نے تقریباً ۳۵۰۰ گیتوں کو اپنی آواز سے سنوارا ہے۔

فی الحال بنگلور میں مقیم اس ۸۵ سالہ عظیم گلوکار نے حالانکہ اپنا آخری گیت فلم''عمر'' کے لیے ریکارڈ کرایا تاہم وہ ابھی بھی سرگرم گلوکار ہیں۔فلم انڈسٹری کے بدلتے ہوئے رجحان اور سامعین کی بدلتی ہوئی دلچسپی کے پیش نظر انہوں نے فلموں میں گلوکاری جاری رکھنے کا سلسلہ منقطع ضرور کردیا ہے لیکن وہ موسیقی کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں،اور شاید اچھا موقع ملنے پر وہ اپنی سحر آفریں آواز سے سامعین کو مسحور کرنے کے لیے غور کرسکتے ہیں۔ایک جگہ وہ خود لکھتے ہیں:

''نہیں میں نے گلوکاری نہیں چھوڑی ہے۔میرا تعلق قدیم گھرانے سے ہے۔میں اس وقت سے گلوکاری سے وابستہ ہوں جب گلوکاروں کا انتخاب اہم ضابطوں جیسے گیت،سچویشن،کردار اور یہاں تک کہ اداکاروں کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔میں عامر خان کے لیے نہیں گا سکتا۔آپ ہی بتایئے کیا میں گا سکتا ہوں''۔منا ڈے کا یہ بیان حقیقت پر مبنی ہے۔کمپیوٹر کے اس دور میں ہر چیز برق رفتار ہوگئی ہے۔وہ اس بات کا بھی ایک جگہ اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''امید کے برعکس پورا منظر نامہ تبدیل ہوگیا ہے۔مجھے یاد ہے کہ دادا(ایس ڈی برمن)ایک گیت پر سات سات دن صرف کردیتے تھے۔اس میں نکھار لانے کے لیے باریکیوں پر توجہ دیتے تھے۔اس وقت کسی گیت کو وجود میں لانا ٹیم ورک ہوتا تھا اور ہم سب گیت کو بہترین سے بہترین بنانا چاہتے تھے۔آج برق رفتاری ہے،کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔اسی وجہ سے تخلیقی کاموں کا فقدان ہے۔'' لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس عظیم گلوکار کے حوصلے بلند ہیں اور ہمیں اس بات پر نہ صرف ناز ہے بلکہ بجا طور پر فخر ہے کہ سال ۲۰۰۸ء تک منا ڈے کو تقریباً ۱۹ ایوارڈوں سے نوازا

جا چکا ہے۔ ۲۱/اکتوبر ۲۰۰۹ء کو صدر جمہوریہ ہند محترمہ پرتبھا دیوی سنگھ پاٹل نے فلموں میں گلوکاری کے میدان میں اعلیٰ ترین خدمات انجام دینے کے اعزاز میں مناڈے کو ۵۵ ویں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے نوازا ہے۔ اس موقع پر محترمہ پاٹل نے مناڈے کو بے مثال گلوکار ''A singer Par excellence'' قرار دیا ہے۔ مذہبی خیالات کے اس عظیم گلوکار نے دادا صاحب پھالکے ایوارڈ کو قدرت کا تحفہ ''Gift of God'' سے تعبیر کیا ہے۔ موسیقی کے شائقین کے لیے یہ بجا طور پر فخر کرنے کی بات ہے، کیونکہ مناڈے کو دنیائے موسیقی کا ایک تابناک ستارہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔

بطور گلوکار مناڈے کی مشہور فلمیں

شعلے	۱۹۷۵ء	ضمیر	۱۹۷۵ء
پونگا پنڈت	۱۹۷۵ء	دیوار	۱۹۷۵ء
امیر غریب	۱۹۷۴ء	البیلی	۱۹۷۴ء
ریشم کی ڈوری	۱۹۷۴ء	اوشکار	۱۹۷۴ء
بابی	۱۹۷۳ء	انوکھی ادا	۱۹۷۳ء
زنجیر	۱۹۷۳ء	باورچی	۱۹۷۲ء
لال پتھر	۱۹۷۲ء	شور	۱۹۷۲ء
اپہار	۱۹۷۱ء	ادھیکار	۱۹۷۱ء
ریشما اور شیرا	۱۹۷۱ء	پرایا دھن	۱۹۷۱ء
آنند	۱۹۷۱ء	میلا	۱۹۷۱ء
بڈھا مل گیا	۱۹۷۱ء	کھلونا	۱۹۷۰ء
شگون	۱۹۶۴ء	ضدی	۱۹۶۴ء
کلپنا	۱۹۶۰ء	پیغام	۱۹۵۹ء
پرورش	۱۹۵۸ء	مدر انڈیا	۱۹۵۷ء

حقیقت	۱۹۶۴ء	وقت	۱۹۶۵ء،
اپکار	۱۹۶۷ء،	ایک پھول دو مالی	۱۹۶۹ء،
مشعل	۱۹۵۰ء،	آوارہ	۱۹۵۱ء،
جھنک جھنک پایل باجے	۱۹۵۵ء	دیوداس	۱۹۵۵ء،
دیوتا	۱۹۵۶ء	انوراگ	۱۹۵۶ء،
نیا زمانہ	۱۹۵۷ء،	امانت	۱۹۵۵ء،
لال بتی	۱۹۵۷ء،	بھابھی	۱۹۵۷ء،
بمبئی کا بابو	۱۹۶۰ء،	برسات کی رات	۱۹۶۰ء،
کالا بازار	۱۹۶۰ء،	چلتی کا نام گاڑی	۱۹۵۸ء

☆☆☆

☆☆☆

محبوب گلوکار ۔ مکیش

غلام رسول

فلم انڈسٹری کے مقبول، نامور اور محبوب گلوکاروں میں مکیش کا نام بھی بہت ہی احترام اور ادب سے لیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی نرم وشگفتہ گلوکاری کے وہ یادگار گیت پیش کئے ہیں کہ آج بھی لوگوں کے ذہن کو تازگی اور دل ودماغ کو ٹھنڈک عطا کرتے ہیں۔ بہر حال مکیش کو اس دنیا سے رخصت ہوئے تقریباً ۲۹ برس ہو گئے لیکن آج بھی جب ان کے گیت سننے کو ملتے ہیں تو ذہن ودماغ کو شادابی سی محسوس ہوتی ہے۔

مکیش ۲۲ر جولائی ۱۹۳۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد لالہ زورآور چند ماتھر انجینئر تھے۔ مکیش کی بہن سندری پیاری کو موسیقی کی تربیت دینے پر مقرر کئے گئے۔ میوزک ماسٹر نے مکیش کو موسیقی کا دلدادہ پایا وہ دوسرے کمرے میں بیٹھ کر موسیقی کے نشیب وفراز کا جائزہ لیتے تھے۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد اپنے والد کے ساتھ اسسٹنٹ سرویئر (Survivor) کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ ۱۷ سال کی عمر میں انہوں نے ممبئی آکر گلوکار بننے کے لئے اپنی قسمت آزمائی شروع کی۔ جب وہ اپنی بہن کی شادی میں گا رہے تھے تو کیریکٹر ایکٹر موتی لال نے مکیش میں گلوکاری کے فن کو تلاش کیا اور اپنی رہائش گاہ میں قیام کا موقع دینے کے علاوہ میوزک ماسٹر پنڈت جگن ناتھ پرساد کو موسیقی کا درس دینے کے لئے مقرر کیا، وہ کے ایل سہگل کے پرستار تھے۔ متعدد ڈائرکٹروں نے انہیں ان کی خوبصورتی اور اعتدال پسند مزاج کے باعث ہیرو کے رول کی پیشکش کی۔ مکیش نے سب سے پہلے فلم ''نردوش'' میں غزل گائی۔ انہوں نے دکھ سکھ میں ستارہ دیوی کے ساتھ اور ''انوراگ'' میں اوشا کرن کے ساتھ گایا اور ''معشوقہ'' میں ثریا کے ساتھ بھی گیت گائے۔ انہوں نے خود محسوس کر لیا کہ ان کا وجود اداکاری کے لئے نہیں ہے۔ ۱۹۴۵ء میں انہوں نے فلم ''پاروتی'' میں موتی لال کے لئے دو سولو گیت گائے۔ ۱۹۴۶ء میں انہیں اس وقت شہرت ملی جب انہوں نے فلم ''پہلی نظر'' میں ''دل جلتا ہے تو جلنے دے'' گایا۔ موسیقی انیل بسواس نے دی تھی۔ یہ گیت گا کر انہوں نے کے ایل سہگل کا انداز اپنانے کی اپنی خواہش پوری کر لی۔ بعد میں نوشاد اور انل بسواس نے انہیں سہگل کے

انداز کو بدلنے کا مشورہ دیا اور ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے بعد کے کئی گیتوں میں اپنی علیحدہ شناخت بنائی۔ گائے جا گیت ملن کے، ہم آج کہیں دل دے بیٹھے تڑپ تڑپ کے کہہ رہا ہے، سہانا سفر ہے جیسے گیت مکیش نے دلیپ کمار کے لئے گائے۔ دلیپ صاحب نے کہا کہ مکیش درحقیقت ان کی آواز ہیں۔ مکیش نے ہی لتا منگیشکر کو نوشاد سے متعارف کروایا تھا۔ اور ''انداز'' میں ان کی جوڑی کامیاب رہی۔ راج کپور کی پہلی ملاقات ''بانسری'' کے سیٹ پر ہوئی۔ وہ مکیش چند کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ان دونوں کا ساتھ ہمیشہ قائم رہا۔

آر کے بینر کی تقریباً تمام فلموں میں مکیش نے گیت گائے۔ ان کی سریلی آواز راج کپور کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا تعلق اٹوٹ رہا۔ مکیش، راج کپور کی آواز بنے رہے۔ دیگر اداکار جن کے لئے مکیش نے اپنی آواز دی ان میں منوج کمار کے لئے ''تم بن جیون'' اور ''ایک پیار کا نغمہ'' دیو آنند کے لئے ''چل رے سجنی'' راجیش کھنہ کے لئے ''کہیں دور جب دن'' اپتابھ بچن کے لئے ''کبھی کبھی میرے دل میں شامل ہیں۔ مکیش ایک عظیم گلوکار ہونے کے علاوہ ایک اچھے انسان بھی تھے اپنے پیشہ سے پورا انصاف کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی اپنے دوستوں کو نظر انداز نہیں کیا، مکیش، سہگل کے گیت گاتے اور ان کے دوست روشن لال ہارمونیم بجاتے۔ بعد ازاں روشن میوزک ڈائرکٹر بن گئے۔ روشن اور مکیش نے مل کر ''تیسری دنیا میں'' اور ''دے تال ملے'' جیسے گیت پیش کئے۔ انہوں نے کلیان جی لکشمی کانت پیارے لال کے ساتھ بھی کام کیا۔ ان کو تلسی داس رامائن کے لئے بھی آواز دینے کا اعزاز حاصل ہے۔ مکیش نے ایک ہزار سے زائد گیت گائے۔ ۱۹۷۶ء میں کنیڈا میں پروگرام کے دوران مکیش کو سردی کا حملہ ہوا۔ گلے میں خراش کے باعث وہ بیمار ہو گئے۔ ۳۱ر اگست ۱۹۷۶ء کو اپنے ہزاروں پرستاروں کو سوگوار بنا کر وہ چل بسے۔

☆☆☆

خوبصورت آواز کا جادو۔محمد عزیز

محمد شاہد خان سسہرامی

سازاورآواز کی دنیا میں آج بھی گلوکار محمد عزیز کا نام اتنا ہی روشن ہے جتنا کل تھا۔اس گلوکار کے گائے ہوئے بے شمار انگنت گیت اپنی مقبولیت کو چھور ہا ہے۔اس گلوکار نے کم وقت میں اتنے سارے گیت گائے ہیں کی ہم انہیں اپنی انگلیوں پر گن نہیں سکتے۔فلم ''امبر'' میں محمد عزیز نے اپنی آواز میں پہلی بار گیت گائے۔اس کے بعد فلم ''پھانسی کے بعد'' میں اسے گانے کا موقع ملا۔اللہ تعالی نے اس شخص کو اتنی خوبصورت اور سحر انگیز آواز دی ہے کہ جس نے بھی اس کی خوبصورت آواز میں گیت سنا متاثر ہوئے بغیر رہ نہ سکا۔فلم ''مرد'' کے گیتوں نے اسے کامیابیوں کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔شہنشاہ ترنم محمد رفیع صاحب کی وفات کے بعد اس نوجوان گلوکار کو ہندی فلمی دنیا کے موسیقاروں نے اسے رفیع کا نعم البدل بنا کر اپنی فلموں میں گانے کا حسین (گولڈن) موقع دیا۔اس نے بھی اس موقع کو اپنے ہاتھوں سے جانے نہ دیا اور اپنی خوبصورت آواز میں اتنا اچھا گایا کہ موسیقاروں کا دل خوش ہو گیا اور وہ اپنی آنے والی سبھی فلموں میں اس گلوکار سے گوانے لگے۔

محمد عزیز ۱۹۸۱ء سے ۱۹۹۰ء تک کا ہندی فلمی دنیا کا ایک ایسا مقبول اور مصروف ترین گلوکار رہا ہے جس کو ہم آسانی سے بھولا نہیں سکتے۔جس طرح ہم آواز کے شہنشاہ محمد رفیع صاحب کو بھلا نہیں سکتے۔محمد عزیز کی آواز کا جادو آج بھی سر چڑھ کر بول رہا ہے۔اس گلوکار نے اب تک جتنے بھی گیت گائے ہیں دل سے اور ایمانداری سے گائے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس کے گائے ہوئے گیت ایک بار سننے کے بعد بار بار سننے کو دل کرتا ہے۔محمد عزیز کی آواز میں ہندی فلموں کے سبھی بڑے چھوٹے۔اداکاروں نے گیت گائے ہیں۔دلیپ کمار فلم ''کرما'' دل دیا ہے جاں بھی دینگے.....''امیتابھ بچن فلم ''مرد''،''میں مرد تانگے والا۔مرد تانگے والا....''جتندر فلم ''آگ اور شعلہ'' آج صبح جب میں جگا....''دھرمیندر فلم جیو اور جینے دو''،''تم سے بنا میرا جیون....''انل کپور فلم ''پیار کیا ہے پیار کرینگے' آیا میٹھی میٹھی سردی ہے....''متھن چکرورتی۔فلم ''چرنوں کی سوگندھ'' چاند لگن سے پھول چمن سے ہو نہیں سکتا دور....''رشی کپور فلم نگینہ ''آج کل یاد کچھ اور رہتا نہیں....''گووندہ فلم ''خودغرض'' مئے سے مینا سے نہ ساقی سے....''اجے دیوگن فلم ''دل ہے بیتاب''۔تراغم اگر نہ ہوتا تو شراب میں نہ پیتا.....سنجے دت فلم ''نام'' تو کل چلا جائے گا تو میں کیا کروں گا....''راج ببر فلم دلہن ہو تو ایسی'' پھول گلاب کا لاکھوں میں ہزاروں میں ایک چہرہ جناب کا....''سنی دیول فلم ''نگاہیں'' ساون کے جھولوں نے مجھ کو جھلایا۔میں پردیسی گھر واپس آیا....''

پران فلم ''امرت'' دنیا میں کتنا غم ہے پر میرا غم کتنا کم ہے....''ادتیہ پنچولی فلم ''کب تک چپ رہوں گی''،''متوا بھول نہ جانا میں نے جو وعدہ کیا....''شاہ رخ خان فلم ''کرن ارجن''،''پھانگڑا پالے آجا آجا....''ونود کھنہ فلم ''دیا وان'' دل تیرا کس نے توڑا....''نانا پاٹیکر فلم ''ترنگا'' پی لے پی لے او میرے راجہ....''وغیرہ ان اداکاروں نے اپنی صرف ایک ہی فلم میں نہیں بلکہ کئی فلموں میں محمد عزیز کی آواز میں گائے ہیں۔پلے بیک سنگر محمد عزیز ہندی فلمی دنیا کا واحد گلوکار ہے جس نے کم وقت میں بے شمار گیت ہندی کے علاوہ بنگلہ، اوڑیہ، گجراتی، بھوجپوری، مراٹھی اور دوسری زبانوں کے فلموں میں گیت گائے ہیں اور ہندی فلمی دنیا کے سبھی چھوٹے بڑے موسیقاروں کے ساتھ کام کیا، محمد عزیز نے سب سے زیادہ گیت موسیقار لکشمی کانت پیارے لال کی دھنوں میں گائے ہیں اور شہنشاہ موسیقار نوشاد جی کی دھنوں میں فلم ''آواز دے کہاں ہے'' میں سارے کے سارے گیت اکیلے خود گایا تھا۔محمد عزیز نے اپنے وقت میں بے شمار سپر ہٹ گیت گائے جو آج بھی مقبول ہیں یہ اور بات ہے کی آج محمد عزیز کو ہندی فلموں میں گانے کا موقع نہیں دیا جا رہا ہے اس کا یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ محمد عزیز میں پہلے کی طرح صلاحیت (Talent) اور آواز میں جادو، کشش نہیں رہی، ایسی بات بالکل غلط اور لغو ہے اس گلوکار کے اندر پہلے سے بھی زیادہ گانے کی صلاحیت، آواز میں نکھار، خوبصورتی اور کشش ہے، اس گلوکار کے اندر وہ تمام خوبیاں ہیں جو ایک باصلاحیت گلوکار میں ہوا کرتی ہے۔اگر محمد عزیز کو آج بھی ہندی فلموں میں گانے کا موقع دیا جائے تو یہ اپنی خوبصورت اور سحر انگیز آواز کے جادو سے سب کا دل جیت لے گا اور ایک بار پھر اس کی ہندی فلم انڈسٹری میں طوطی بولنے لگے گی۔یہ گلوکار بھی محمد رفیع صاحب کی طرح آج کے سبھی گیتوں کو بخوبی گانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔محمد عزیز گروپ بندی اور تعصب پرستی کا شکار ہو گیا ہے۔ہندی فلم انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے سبھی یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ محمد عزیز ایک باصلاحیت اور ہر طرح کے لکھے ہوئے گیتوں میں اپنی خوبصورت آواز سے جان ڈال دیتا ہے۔پھر بھی اتنے بڑے گلوکار سے کوئی بھی موسیقار رابطہ نہیں کر رہا ہے۔اس میں گلوکار محمد عزیز کی بھول نہیں کہہ سکتے بھول آج کے موسیقار حضرات کر رہے ہیں اور گیت وسنگیت کے معیار کو گراتے جا رہے ہیں۔اگر اپنے وقت کے باصلاحیت اور منجھے ہوئے گلوکاروں کو آج کے موسیقاروں نے اپنی فلموں میں گانے کا موقع نہیں دیا تو آنے والے دن میں ان کا ان کی فلمی دنیا کا ان کے گیت اور سنگیت کا معیار گر کر چکنا چور ہو جائے گا اور کوئی بھی ان کی دھنوں کو سننا پسند نہیں کرے گا۔اس لئے اپنے وقت کے باصلاحیت اور معروف ترین گلوکار محمد عزیز کو ایک بار پھر سے گانے کا موقع دیا جائے۔

☆☆☆

ہندوستانی فلم کے پہلے ہیرو۔ڈی ڈی ڈابکے

ڈاکٹر الف انصاری

ڈی ڈی ڈابکے کا اصل نام دتاتریہ دامودر ڈابکے تھا جنہوں نے ہندوستان کی پہلی خاموش فلم ''راجہ ہریش چندر'' میں بطور ہیرو کام کیا تھا۔انہوں نے اس فلم میں راجہ ہریش چندر کا مرکزی کردار ادا کر کے ہیروشپ کی راہ دکھائی۔فلم کے پروڈیوسر داداصاحب پھالکے تھے۔ ڈابکے کی پیدائش مہاراشٹر کے اسود نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوئی۔

ڈابکے کی خداداد صلاحیت اور فنکارانہ محاسن سے متاثر ہوکر داداصاحب پھالکے نے انہیں اپنی ٹیم میں شامل کرلیا۔آپ داداصاحب پھالکے کے ساتھ پانچ برسوں تک بطور معاون کام کرتے رہے۔اس دوران انہوں نے پھالکے صاحب سے ڈائرکشن اور فوٹوگرافی سیکھی۔۱۹۲۲ء میں ڈابکے کوہ نور فلم کمپنی میں شامل ہوئے۔۱۹۲۸ء میں ''سرجلدیش فلم کمپنی'' میں شمولیت اختیار کی۔

۱۹۲۹ء میں انڈین فلم پروڈیوسنگ کمپنی کلکتہ نے پانچ سوروپے ماہوار کی شاہی تنخواہ پران کی خدمات حاصل کیں۔۱۹۳۳ء میں انہوں نے ''ودیا سنے ٹون کمپنی'' میں کیمرہ مین کے فرائض نبھانے کے ساتھ فلم ''سیتا سوئمبر'' جزوی طور پر ڈائرکٹ کی۔اس کے بعد ''راجندر مودی ٹون دہلی'' میں شامل ہوگئے۔

ڈابکے نے اداکاری سے زیادہ فوٹوگرافی اور ہدایتکاری کے میدان میں شہرت حاصل کی۔ان کی فوٹوگرافی سے برودہ کی شاہی فیملی اس قدر متاثر ہوئی کہ اس نے کوہِ نور فلم کمپنی کے لئے ڈابکے کی بنائی ہوئی چند فلمیں پرائیوٹ نمائش کے لئے خریدلیں۔

آج ہندوستانی فلم انڈسٹری جس بلند مقام پر نظر آرہی ہے وہ ڈابکے کی بے مثال فلمی خدمات کا ثمرہ ہے۔

☆☆☆

فلموں کا اکبرِ اعظم۔پرتھوی راج کپور

رشید انجم (بھوپال)

جس طرح عشق ومحبت کی داستانوں پر مقبول فلمیں بنیں۔جس طرح چند خاص شہروں لکھنؤ اور حیدرآباد اور دہلی کو ایسی داستانوں کی فلموں میں مقام حاصل ہوا،وہیں مغل شہنشاہی بھی ایسی داستانوں کے توسط سے فلموں میں اپنے پورے کروفر کے ساتھ پردے پر جلوہ گر رہی۔

ہندوستان میں بنیں اردو فلموں میں مغلیہ دبدبے اور شہنشاہیت کو سب سے زیادہ موضوع بنایا گیا ہے۔''نورجہاں''''پکار''۔''عدل جہانگیر''۔''انارکلی''۔''ملکۂ عالم نورجہاں''،''بابر''''ہمایوں''''اکبر''، ''جہاں آرا'' اور کئی فلمیں اس بات کی گواہ ہیں۔ان فلموں میں اگر کسی کردار (شہنشاہ) کو سب سے زیادہ پسند کیا گیا(مرعوبیت اور شاہی جلال کے ساتھ) تو وہ مغلیہ سلطنت کے تیسرے شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر۱۶۰۵۔۱۵۵۶ تھا۔گو اس شہنشاہ کی ذاتیات بہت متنازعہ رہیں مگر امور سلطنت،عدل وانصاف اور شاہی رتبہ وروایت پسندی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔مختلف عہد میں مختلف فلموں میں اپنے اپنے وقت کے مایہ نازاداکاروں نے اکبر کو پردۂ فلم پر اپنے اپنے فنکارانہ انداز میں پیش کیا۔فلم ''انارکلی''۱۹۳۵۔۱۹۲۷ میں غلام محمد۔۱۹۵۳ کی ''انارکلی'' میں مبارک ''میرا''۱۹۷۹ امجد خان وغیرہ نے اکبر کے رول کئے۱۹۴۴ میں شروع ہوئی فلم ''مغلِ اعظم'' میں چندرموہن تھے مگر ان کے شدید بیمار ہونے پر پرتھوی راج کپور کو ''مغلِ اعظم'' میں اکبر کے کردار کے لئے لے لیا گیا۔یہ حرف آخر تھا۔نہ تو اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد پرتھوی راج کپور جیسا عظیم اکبر پردۂ فلم پر نمودار ہوا۔اپنے نام مغلِ اعظم کے مرتبے کو قائم رکھتے ہوئے کے آصف اور کمال امروہوی نے کردار کا انتخاب پرتھوی راج کی شکل میں کیا تھا اور پرتھوی راج کپور نے ثابت کردیا کہ ان سے بہتر اوران سے نمایاں اداکار انڈین فلم انڈسٹری نے اپنی ساٹھ سالہ فلم زندگی میں پیدا نہیں کیا تھا۔

پرتھوی راج کپور کو اگر فلم انڈسٹری کا بنائے کار (یعنی راوی یا آغاز) کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ان کی قد آور شخصیت اور فنکارانہ صلاحیت کے ساتھ انکسارانہ مزاج،مہرومحبت کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ ساری فلم انڈسٹری انھیں احترام سے پاپاجی کہتی رہی اور آج بھی ان کو اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔پشاور کی

ہندوستان فلم انڈسٹری پر یہ بہت بڑی کرم فرمائی ہے کہ اس مردم خیز مگر خونخوار غیّور فطرت سرزمین سے بے حد دلنواز اور اپنی سخت مزاج طبیعت کے برخلاف نرم خو، رومان فطرت اور فنی خوبیوں سے مالا مال لاتعداد شخصیتیں اس انڈسٹری میں آئیں اور دنیا کو پیغام دوستی دے دیا کہ سخت زمینوں سے بھی گل پوش چمن آراستہ ہو سکتے ہیں۔ پشاور (اب پاکستان کا ایک صوبہ) میں پرتھوی راج کپور ۳/نومبر ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے متحدہ ہندوستان انگریزوں کی غلامی میں تھا۔ ان کے والد بشیشر ناتھ کپور پولس افسر تھے اور یہ خاندان دلیپ کمار کے والد محمد سرور خان کا پڑوسی اور ہر دکھ سکھ کا ساتھی تھا۔ پرتھوی راج کپور کی تعلیم مقامی ایڈورڈ کالج میں ہوئی اور بی اے کے بعد ایل ایل بی میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔ دورانِ تعلیم وہ کالج میں ٹینس چیمپین بھی رہے۔ اسی کے ساتھ کالج کی ڈرامہ سوسائٹی کے سرگرم فنکار بھی تھے۔ اس سوسائٹی کے تحت انھوں نے سب سے پہلے ''دی بورٹے کمس ہوم'' ڈرامے میں حصہ لیا۔ یہ انگریزی پلے تھا۔ ان کے والد کی خواہش تھی کہ پرتھوی راج پولس فورس جوائن کریں مگر ان کے اندر کا فنکار انھیں اس خشک اور پابند زندگی گذارنے سے روکتا تھا۔ انھوں نے فنکار کے ساتھ رہنا بہتر سمجھا۔ دورانِ تعلیم پشاور کالج میں ان کے پروفیسر جے دیال اور پروفیسر رچرڈ تھے جنھوں نے سب سے پہلے ان کی اداکارانہ صلاحیتوں کو پہچان کر ان کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

۱۹۲۸ء کا زمانہ تھا اور ۲۳ سالہ عمر کا پرشباب دور جب گھر والوں کی مخالفت کے باوجود محض دو سو روپئے جیب میں ڈال کر انھوں نے فلمی دنیا کا رُخ کیا۔ ان کے والد کے دوست اور آج کے مشہور ڈائرکٹر لیکھ ٹنڈن کے والد فقیر چند پچیس روپئے ماہوار پر سرکاری ملازم تھے۔ پانچ روپئے وہ اپنے والد کو بھیجتے تھے اور ۲۰ روپئے میں گھر کا خرچ چلاتے تھے۔ جمع تو کچھ ہوتا نہیں تھا۔ انھیں جب پرتھوی راج کے پشاور سے چلے جانے کا معلوم ہوا تو اپنی بیوی کے زیور لے کر ان کے پاس پہونچے کہ ان سے تیرا کام چل جائے گا۔ پرتھوی راج اپنے دوست کے خلوص اور ایثار سے آبدیدہ ہو گئے۔ زیور تو قبول نہیں کئے مگر ان کا یہ احسان وہ ساری عمر بھلا نہیں پائے۔ جب انھیں عروج حاصل ہوا اور وہ فلموں کے مشہور اداکار بن گئے تو بمبئی سے ہر ماہ اپنے دوست کو سال میں دوبار اصلی گھی کے کنستر (ایک کنستر سولہ سیر) پابندی سے بھیجا کرتے تھے۔ سرسوں کا ساگ بھی بھیجتے اور پندرہ روپئے بھی ہر ماہ بھیجتے یہ بہانا کرتے کہ پروڈیوسر نے کام سے خوش ہوکر ماہانہ تنخواہ میں اضافہ کر دیا ہے۔ یہی نہیں اپنے عروج کے دور میں جب ایک بار وہ لاہور گئے جہاں شیخو پورہ میں فقیر چند سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے۔ اپنی آمد کی اطلاع پہلے سے دیدی تھی۔ شیخو پورہ میں یہ خبر عام ہو گئی۔

پرتھوی راج شیخو پورہ پہونچے۔ وہاں کے ڈپٹی کمشنر اور مالدار رئیسوں نے اپنے یہاں ٹھہرا کر ہر طرح کی آسائش مہیا کرانے کی دعوت دی لیکن پرتھوی راج نے بہت انکسار کے ساتھ معذرت کر لی اور اپنے بھائی جیسے دوست کے خاندان کے یہاں رکنے کو اہمیت دی جہاں ٹیبل فین تھا نہ صوفہ سیٹ اور مچھروں کو دور کرنے کا اہتمام بھی نہ تھا لیکن پرتھوی راج کو ان خارجی آسائشوں کی بہ نسبت ان کی بے ریا اور بے لوث محبت میں رہنا پسند تھا جو جسم سے زیادہ روحانی تسکین دینے کا باعث تھیں۔

پرتھوی راج سب سے پہلے کلکتہ گئے مگر جب انھوں نے نیو تھیٹر کمپنی کا جائزہ لیا تو یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ نیو تھیٹر بنگالی فلمیں بناتا ہے۔ گو فلمیں خاموش تھیں مگر ماحول بنگالی تھا چنانچہ وہ بمبئی آ گئے کوئی شناسا نہیں تھا اور مرعوب کن شخصیت ہونے کے باوجود ہندی فلموں کے فلمساز ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ میٹرو سنیما کے قرب میں ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں رہنے لگے۔ کافی عرصہ گذر گیا۔ دو سو روپئے میں سے جب صرف سترہ روپے باقی رہ گئے تو وہ مستقبل سے مایوس ہونے لگے۔ نہ کسی سے مانگ سکتے تھے اور نہ خودداری گھر سے پیسہ منگانے پر آمادہ تھی۔ اسی مایوس مرحلے پر ایک ایکسٹرا سپلائر سے ان کی ملاقات ہوئی اور اس نے ایک فلم میں انھیں بھیڑ میں کھڑا رہنے کا موقع دلا دیا۔ ایکسٹراؤں کو نقد معاوضے کا چلن نہیں تھا۔ موقع محل کے لحاظ سے چائے کے وقت چائے اور اگر کھانے کا وقت ہو تو کھانا مل جایا کرتا تھا۔ ایکسٹراؤں کو ان پیڈ ایکسٹرا کہا جاتا تھا۔ پرتھوی راج پہلی بار کیمرے کا سامنا کر رہے تھے۔ میک اپ مین انکی شاندار پرسنالٹی سے زیادہ ان کے محبت آمیز سلوک کا گرویدہ ہو چکا تھا۔ ایک عرب کا میک اپ داڑھی کے ساتھ کیا گیا اور جب وہ سب کے ساتھ کھڑے ہوئے تو اپنی قدآوری کی وجہ سے سب سے الگ نظر آ رہے تھے۔ ابھی شاٹ شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ فلم کی ہیروئن ایرملین کی نگاہ ان پر پڑ گئی۔ وہ ان کی مردانہ وجاہت سے اتنی متاثر ہوئی کہ فلم پروڈیوسر سے بضد ہو کر فلم کا ہیرو بنائے جانے پر زور دینے لگی۔ ہیروئن کی ضد نے فلمساز کو مجبور کر دیا اور آناً فاناً پرتھوی راج کا میک اپ اتارے جانے کے احکام جاری ہو گئے مگر پرتھوی راج نے اپنے اسی گیٹ اپ کو برقرار رہنے پر شاٹ دینے کے لئے اصرار کیا۔ بطور ایکسٹرا ان کا شاٹ لیا گیا لیکن دوسری فلم بطور ہیرو سائن ہو گئی ایمپیئریل فلم کمپنی کے مالک اردشیر ایرانی نے سترہ روپئے ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔

۱۹۲۹ء سے ان کا فلمی سفر شروع ہوا۔ ایمپیریل فلم کمپنی کی ایڈونچر رومانی فلم ''سنیما گرل'' میں پہلی بار وہ ایرملین کے مقابل ہیرو بن کے فلم پردے پر جلوہ گر ہوئے ۱۹۲۹ء کی اس خاموش فلم کے ہدایت کار بی پی

مشرا تھے۔ اس کے بعد دو خاموش فلمیں ''وجے کمار'' اور ''شیر عرب'' بھی اسی سال ریلیز ہوئیں۔ ۱۹۳۱ء میں ''نمک حرام کون''، ''بار کے پوبار''، ''گولی بار'' اور ''طوفان'' ان کی خاموش فلمیں تھیں۔

وہ وقت بھی جلد ہی آ گیا جب ہندوستان بولتی فلموں کے انقلابی عمل سے دو چار ہوا۔ پرتھوی راج ایمپیریل کمپنی کے ملازم تھے اور صرف پانچ فلمیں کرنے کے بعد ہی اردشیر ایرانی نے انھیں اپنی اور ہندوستان کی پہلی بولتی فلم ''عالم آرا'' میں اہم ترین کردار دے دیا۔ ۱۹۳۱ء کی اس فلم میں پہلا مکالمہ ادا کرنے والے پرتھوی راج تھے اور اپنی نو جوانی اور بھر پور شباب میں انھوں نے معمر کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کے بعد ''دروپدی'' اسی سال ریلیز ہوئی۔

لیکن فلم ان کی منزل نہیں تھی۔ فلم ان کا شوق تھی۔ فلم سے انھیں شہرت دولت آسائش اور خواہشات کو پورا کرنے کی سہولیات میسر آ چکی تھیں۔ فلم ایک صبر آزما مرحلہ تھی۔ اس سے انھیں روحانی تسکین میسر نہیں تھی۔ ایک فنکار انھیں اندر سے بے چین رکھتا اور وہ انتہائی مصروفیات کے لمحات میں یکا یک تنہا ہو جاتے۔ سارا شور شرابہ اچانک تھم جاتا اور ایک لامتناہی سناٹا ان کے وجود کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتا وہ خود اپنا موازنہ کرتے تو فلم ان کو آئینہ نظر آتی جس میں اپنی تمام تر فنی صلاحیتوں کے عکس دیکھ سکتے تھے لیکن وہ عکس بند شخصیت سے نکل کر زندہ حقیقتوں کے ساتھ خود کو آزمانے کے خواہش مند تھے مگر اس سے قبل کہ ان کی تھیٹر کی زندگی کو تحریر کا ضابطہ دیا جائے پہلے ان کی فلموں پر نظر ڈال لی جائے!

۱۹۳۲ء میں فلم ''دغا باز ڈاکو'' میں کام کرنے کے بعد انھوں نے بمبئی سے کلکتہ کا رخ کیا اور ۱۹۳۳ء میں بی این سرکار کے نیو تھیٹر کو جوائن کر لیا جو اب بنگلہ کے ساتھ ہندی فلمیں بھی بنا رہا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں نیو تھیٹر کی فلم ''راج رانی میرا'' میں درگا کھوٹے کے مقابل ہیرو کا کردار ادا کیا۔ یہی فلم بنگالی میں ''میرا بائی'' کے نام سے بنی تھی جس میں درگا داس بنرجی پہاڑی سانیال اور مولنی دیوی تھے۔ دونوں کے ہدایت کار دیوکی بوس تھے۔ بنگالی ورژن میں کندن لال سہگل نے بھی کام کیا تھا۔

۱۹۳۴ء میں نیو تھیٹر کی فلم ''ستیا'' انھیں ملی۔ اس فلم کو بھی دیوکی بوس ڈائریکٹ کر رہے تھے۔ پرتھوی راج کا اصول تھا کہ وہ ہدایت کار کی عزت بھی کرتے تھے اور اپنے رول کے ساتھ انصاف بھی کرتے تھے۔ پورا منظر نامہ کہانی کے ساتھ پوری توجہ سے سنتے اور جو منظر تشریح طلب ہوتے ان پر بحث کرتے تھے۔ فلم ''سیتا'' میں بن باس اور راون کے قبضے سے سیتا کو رہا کرانے کے بعد حاملہ ہونے کی صورت میں رام سیتا کو

نہ صرف محل سے بلکہ خود سے بھی دور کر دیتے ہیں۔ وصال کے بعد دل گرفت جدائی کو دیوکی بوس پس منظر گانے سے اجاگر کرنا چاہتے تھے جس میں رام کو رونا بھی تھا۔ پرتھوی راج اس منظر سے متفق نہ تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ بن باس کی تکلیفیں جس رام نے صبر سے برداشت کیں۔ سیتا کے اغوا کو سہا اور تمام تر مصائب رام نے پرسکون حالت میں سہے جب وہ نہیں روئے تو اب اس واقعہ پر بھی نہیں روئیں گے۔ ہدایت کار، یونٹ اور دیگر اداکار پرتھوی راج سے غیر متفق تھے۔ کئی دن بحث ہوئی اور شوٹنگ نہیں ہو سکی۔ آخر پرتھوی راج نے رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک نظم دیوکی بوس کو سنائی جسکا ماحصل یہ تھا کہ شاعر کو ایک ضعیف عورت ملی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بجھی سی تھی۔ سفید روکھے بال، چہرہ جھرّیوں سے بھرا ہوا۔ شاعر نے جب اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ زندگی ہے۔ شاعر کو تعجب ہوا کہ زندگی ایسی کیوں کر ہے؟ اتنی غمزدہ؟ اتنی بے رونق؟ اتنی ناتواں؟ اس نے سبب بیان کیا کہ وقت جب گذرتا ہے تو صرف اپنی نشانیاں چھوڑ جاتا ہے۔ یہ نشانیاں تمام رونقیں، شادابیاں، رنگینی، ولولے اور ساری تمازتیں خود میں ضم کر لیتی ہیں اور ابھرتا ہے صرف بدرونق سراپا جس میں کوئی رنگ کوئی شفق کوئی کشش نہیں ہاں۔ اگر کچھ ہے تو ایک مسکراہٹ۔ گو مایوس کن ہے مگر مسکراہٹ تو ہے۔

اس نظم کو سن کر دیوکی بوس، پرتھوی، راج کی منطق کے قائل ہو گئے اور جب یہ منظر فلمایا گیا تو پس منظر گانے کے ساتھ رام کے ہونٹوں پر ایک درد آمیز مسکراہٹ تھی اور دیکھنے والوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ ایک فنکار کی عظمتوں کی فتح تھی۔ فلم ''سیتا'' فنی لحاظ سے بھی اہم فلم ثابت ہوئی جس کو نہ صرف مقامی بلکہ غیر ملکی پریس نے بھی بے حد سراہا تھا۔ پرتھوی راج گونا گوں شخصیت کے حامل تھے۔ دیومالائی سراپا جو دیکھے مبہوت ہو جائے گفتگو کا وہ انداز کہ ملنے والا سحر زدہ رہ جائے۔ ملنسار اتنے کہ ہر ادنیٰ اور اعلیٰ ان کا گرویدہ بن کر رہے۔ فنکار ایسے کہ پردۂ فلم پر ہر آنکھ ہی دیکھنا چاہے۔ انھیں اپنی مردانہ وجاہت اور پر کشش پُر اثر وجود کا بھر پور احساس تھا مگر خود نمائی و خود پرستی کو انھوں نے کبھی خود پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ اور نہ خود اس کے اسیر ہوئے۔ رما دیوی سے ان کی شادی تبھی ہو چکی تھی جب انھوں نے پشاور چھوڑنے کا ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔ رما دیوی خالص پنجابی ماحول کی پروردہ گھریلو خاتون تھیں۔ ٹھیٹھ پنجابی زبان انکا لہجہ تھی۔ شوہر ان کے نزدیک مندر میں رکھے ایک دیوتا کی مانند تھا جس پر عقیدت اور پرستش کے پھول چڑھائے جاتے ہیں۔

یہ بھی تعجب خیز بات ہے کہ انھوں نے اپنی پوری فلمی زندگی میں فلم پردے پر کوئی رومانی گیت نہیں گایا۔ فلمساز و ہدایت کار سچویشن نکالتے بھی تو وہ یہ کہہ کر صاف انکار کر دیتے تھے کہ جب خود انھیں گانا نہیں آتا

تو وہ فلم میں کسی اور گلوکار کی آواز پر کیوں ہونٹ ہلائیں؟ جیمنی مدراس کی ایک فلم ''تین بہورانیاں'' میں انھوں نے باپ اور دادا کا رول کیا تھا۔ فلم طنز ومزاح سے بھر پور تھی۔ پرتھوی راج پر ان کی آواز میں ایک مزاحیہ گیت ''آمدنی اٹھنی خرچہ روپیہ'' فلمایا گیا تھا۔ وہ ایسے کردار سے پرہیز کرتے تھے جس کے لئے گانا ضروری ہو۔

۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۹ء تک وہ نیو تھیٹر کلکتہ میں رہے۔ جب انھوں نے محسوس کیا کہ اب کلکتہ کی فلموں میں ان کی گنجائش کم ہو رہی ہے تو وہ بمبئی واپس آ گئے۔ تقریباً سترہ فلموں میں وہ کلکتہ میں رہ کر کام کر چکے تھے اور ہندوستان کا فلم طبقہ نہ صرف ان کی فنکاری بلکہ ان کی شاندار شخصیت کا بھی گرویدہ ہو چکا تھا۔ فلم انڈسٹری میں وہ اپنا اہم مقام پا چکے تھے اور تین بیٹوں راج کپور، شمی کپور اور ششی کپور کے باپ بھی بن چکے تھے۔ ان کے والد بشیشر ناتھ اور والدہ اب ان کے ہمراہ ہی رہتی تھیں۔ چندولال شاہ نے اپنی فلم کمپنی رنجیت اسٹوڈیو کے لئے ان کو فوراً HIRE کر لیا۔

۱۹۳۹ء میں انھوں نے رنجیت کی فلم ''ادھوری کہانی'' میں درگا کھوٹے کے ساتھ ہیرو کا رول کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فلم کا ہدایت کار فلم کا ناخدا ہوا کرتا تھا۔ فلم پورے ڈسپلن کے ساتھ بنائی جاتی تھی غلطی ہونے پر اداکار کو ہدایت کار کی مار بھی پڑتی تھی۔ یوگ راج نے ایک واقعہ بیان کیا ہے جو اس وقت کے آمرانہ مزاج پر عبرت ظاہر کرتا ہے وہ لکھتے ہیں۔ ''اے آر کاردار کی فلم ''ملاپ'' ۱۹۳۷ء کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ اس فلم میں ایک نئی جوان لڑکی کو ہیروئن (نام نہیں دیا) کے طور پر لیا تھا۔ ایک شارٹ میں دوسری اداکارہ مایا دیوی کو اس نوجوان حسینہ کو کسی بات پر زوردار تھپڑ مارنا تھا۔ اس فلم کے ہدایت کار نے جو خود کو خدا سمجھتے تھے مایا دیوی کو کہا کہ اس لڑکی کے جواب پر تم ایسا زوردار تھپڑ رسید کرو کے اس کا سر گھوم جائے۔ ریہرسل میں مایا نے سوچا کہ ابھی ریہرسل ہے، اصل شارٹ میں زور سے ماروں گی تو صرف ایکشن سے کام چلا لیا جس پر کاردار نے آؤ دیکھا نا تاؤ مایا دیو کو پورے زور سے تھپڑ مار کہا کہ ایسے مارو۔ مایا دیوی تو چکرا کر وہیں بیٹھ گئی۔ پرتھوی راج بھی سٹپٹا گئے۔ یہ کیسا جنگل راج ہے لیکن خود پر قابو رکھا۔ کچھ روز بعد پرتھوی راج کیمرے کے سامنے تھے۔ کاردار کو لگا کہ وہ ان کی ہدایت کے مطابق نہیں کر رہے ہیں تو غصے سے ان کی جانب مارنے کو لپکے تو پرتھوی راج نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا ''سنبھل کے۔ ہاتھ میرا بھی بڑا بھاری ہے'' یہ جواب سن کر سب لوگ حیران رہ گئے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ کاردار بھی سنبھل گئے اور پھر کبھی اپنی اس عادت کو دہرایا نہیں۔ اس ایک کوشش سے فلم انڈسٹری میں خوشگوار تبدیلیاں آئیں اور چھوٹے اداکار، فلمساز اور ہدایت کار کے برے اور ذلت آمیز برتاؤ سے محفوظ ہو گئے۔ یوگ راج نے اس فلم ''ملاپ'' کی اداکارہ کا نام مایا دیوی لکھا ہے اور نئی اداکارہ کا نام نہیں

لکھا۔ یہ اداکارہ مایا دیوی نہیں اندرا دیوی تھی اور نئی اداکارہ کا نام بملا کماری تھا۔

۱۹۴۱ء میں انھوں نے سہراب مودی کی فلم ''سکندر'' میں سکندر کا وہ کردار ادا کیا جس کے فنکارانہ عروج کو آج بھی کوئی اداکار چھو نہیں پایا۔ سکندر کے ہدایت و فلمساز سہراب مودی بہت بااصول اور ضابطے کے پابند انسان تھے۔ پرتھوی راج اتنی زبردست کامیابیوں کے بعد بھی مغرور یا خود پسند نہیں ہوئے تھے۔ یونٹ کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے تھے۔ الگ سے اپنے لئے کوئی اہتمام انھیں پسند نہیں تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ایکسٹرا اور چھوٹے اداکاروں کی ضروریات کا نہ تو خیال رکھا جاتا ہے نہ انھیں بہتر سہولیات دی جاتی ہیں تو انھوں نے احتجاج کیا۔ جب سنوائی نہیں ہوئی تو شوٹنگ پر نہ آنے کی دھمکی دی۔ سہراب مودی سمجھدار انسان تھے۔ انھوں نے ہمدردی سے سنا اور یونٹ کی ضروریات پوری کیں۔ اس طرح پرتھوی راج ہر چھوٹے بڑے کے نزدیک ہوتے چلے گئے۔ وہ یہیں تک محدود نہیں رہے۔ اور فلم کمپنیوں میں بھی انھوں نے ایکسٹراؤں کے ساتھ ظلم زیادتی کے خلاف آواز اٹھائی۔ ان کے جائز حقوق اور معاوضے نیز فلموں میں ان کی اہمیت کے لئے ایکسٹرا یونین کی تشکیل کی۔ اس یونین کے پہلے صدر پرتھوی راج ہی تھے۔ اس یونین سے یہ فائدہ ہوا کہ ایکسٹرا سپلائرس کی دھاندلیاں بند ہو گئیں۔ ایکسٹرا سپلائر ان کے دشمن ہو گئے۔ دھمکیاں بھی ملیں۔ حملے بھی ہو گئے مگر پرتھوی راج نے بہت حلیمی اور شائستگی کے ساتھ ان کو جواب دیا۔ یہ ان کی شخصیت کا ہی اثر تھا کہ وہ غنڈے بعد میں ان کے گرویدہ ہو گئے اور پرتھوی راج نے ان کی مجبوریوں کو سمجھتے ہوئے اپنے پرتھوی تھیٹر میں میں ملازم رکھا۔

رنجیت مووی ٹون کی کچھ فلموں میں کام کیا۔ اس وقت تک وہ ملازم کی حیثیت رکھتے تھے یہ انھیں ناپسند تھا۔ ان کی آزاد شخصیت کو قبول نہیں تھا۔

پرتھوی راج وہ پہلے اداکار تھے جنھوں نے ملازمت سے انحراف کیا اور ایک آزاد فنکار کی طرح پوری فلم کے معاوضے پر فلمیں لینا شروع کر دیں فلم ''سکندر'' کا معاوضہ انھیں چالیس ہزار روپیہ ملا تھا۔

ان کے اس اقدام سے دیگر اداکاروں کو راہ ملی۔ وہ بھی پرتھوی راج کے نقشِ قدم پر چلے یہ اس عہد کی ابتداء تھی جس نے اسٹار سسٹم کو پیدا کیا اور جو آج اپنے انتہائی عروج پر پہونچ چکا ہے۔

پرتھوی راج کا فلمی سفر اب اس راہ پر گامزن تھا جس کی منزل پرتھوی تھیٹر پر ختم ہوتی تھی۔

☆☆☆

فلمی اُفق کا درخشندہ ستارہ۔ دلیپ کمار

خورشید اختر فرازی

ہندوستانی فلم انڈسٹری میں عظیم اداکاروں کی فہرست میں سب سے اول اداکار ہے دلیپ کمار۔ جس کا اصلی نام یوسف خان ہے۔ پیشاور کے محلے خداداد میں ۱۱/دسمبر ۱۹۲۲ء کو ایک مذہبی پٹھان گھرانے میں پیدا ہونے والے کمسن بچے نے اپنے والدین کے ہمراہ ۱۹۳۲ء میں خوابوں کے شہر ممبئ میں قدم رکھا تو کسی نے یہ سوچا بھی نہ ہوگا کہ یہ لڑکا مستقبل میں اپنے والد سرور خان کے لئے پھلوں کی تجارت کو فروغ دینے کے بجائے فلمی اداکاری میں ایک نیا ٹرینڈ پیدا کرے گا۔ اسے شائقین فلم ٹریجڈی کنگ، ابھینئے سمراٹ اور شہنشاہ جذبات جیسے القاب سے مخاطب کریں گے۔ دلیپ کمار نے گذشتہ ۵۸ سالوں سے اپنی بہترین اور لاجواب اداکاری کے ذریعے شائقین فلم میں اپنی سب سے علیحدہ شناخت بنائی ہے۔ ملینیم اسٹار سپر اسٹار امیتابھ بچن، جبلی کمار راجندر کمار، بھارت کمار منوج کمار اور موجودہ سپر اسٹار شاہ رخ خان کے علاوہ ہر نئے پرانے اداکار نے دلیپ کمار کی نقل کی اور اس کا بار بار اعتراف بھی کیا۔ ان ہی میں ایک طویل فہرست نئے نئے اداکار اور ٹیلی ویژن اداکاروں کی بھی ہے۔

جو دلیپ کمار کو اپنا آئیڈیل کہنے میں ذرہ برابر شرم محسوس نہیں کرتے۔ دلیپ کمار کی ابتدائی تعلیم ویسے تو پیشاور کے محلے خداداد میں اردو میڈیم سے ہوئی۔ لیکن ۱۹۳۲ء میں ممبئ آنے پر دیولالی میں سکونت اختیار کی۔ انجمن اسلام ہائی اسکول، ممبئ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، خالصہ کالج سے بی اے کا امتحان نمایاں نمبرات سے پاس کر کے پونہ کے ملٹری کینٹین میں بطور منیجر نوکری کی۔ اس خوبصورت خوبرو نوجوان پر دیویکا رانی کی نظر پڑی، انہوں نے اپنے ادارہ بامبے ٹاکیز کے بینر تلے دلیپ کمار سے تین فلموں کے لئے معاہدہ کیا۔ دیویکا رانی کے ذریعے دیئے گئے تین فلمی ناموں واسودیو، جہانگیر خان اور دلیپ کمار میں سے خود دلیپ کمار نے اپنا فلمی نام جہانگیر خان منتخب کیا مگر دیویکا رانی اور معروف مصنف دانشور بھگوتی چرن ورما کے اصرار پر بالآخر یوسف خان کا فلمی نام دلیپ کمار تجویز کیا گیا۔ ہدایت کار امیہ چکرورتی کی ہدایت میں یکے بعد تین فلمیں جوار بھاٹا، پرتما اور ملن ریلیز ہوئیں، جو

اتفاق سے شائقین فلم پر کوئی اچھا تاثر چھوڑنے میں ناکام رہیں۔ لیکن ایک نئے اداکار کے طور پر اپنی بہترین اداکاری کے ذریعے دلیپ کمار نے اپنی چھاپ چھوڑی۔ بامبے ٹاکیز کے ہدایت کار امیہ چکرورتی، پی جے راج اور نتین بوس جیسے منجھے ہوئے ہدایت کار سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا۔

اپنی اداکاری میں نکھار کے لئے دلیپ کمار نے ہالی ووڈ کی فلمیں دیکھیں اور اداکار جن میں اسٹوارٹ، ہینری فونڈا، لارنس آلیور، اسپنیر ٹریسی کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا۔ اشوک کمار اور موتی لال کی قدرتی اور انتہائی خوبصورت اداکاری سے علیحدہ ایک منفرد اداکاری کا انداز پیدا کیا جس کی آج پانچ دہائیوں کے بعد بھی نئے نئے اداکار نقل کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

شوکت حسین رضوی کی ہدایت میں ملکہ حسن نور جہاں نے فلم جگنو میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ فلم ۱۹۴۷ء میں ریلیز ہوئی اس طرح دلیپ کمار شائقین فلم میں جگنو کی طرح چمکے۔ فلم زبردست کامیابی سے ہمکنار رہوئی۔ اس کے بعد جیسے دلیپ کمار کی فلموں کی ایک لمبی قطار لگی۔ ۱۹۴۸ء میں دلیپ کمار کی پانچ فلمیں ریلیز ہوئیں اس کے بعد ایسا موقع پھر کبھی نہیں آیا۔ اپنے ۵۸ سالہ فلمی کیریئر میں مشکل سے تقریباً ۶۵ فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے، جبکہ ایک معمولی سے معمولی اداکار کی فلموں کی تعداد قلیل مدت میں سیکڑوں تک پہنچ جاتی ہے۔ دلیپ کمار اپنے مداحوں کو دو سال میں ایک بہترین فلم دینا چاہتے تھے۔ اسے کامیابی ملے یا ناکامی ان کا یہ فارمولہ بڑا کامیاب رہا۔ آج عامر خان اور امیتابھ بچن، دلیپ کمار کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انتہائی کم فلمیں کرتے ہیں۔

عظیم ہدایت کار محبوب خان نے پہلی مرتبہ دو عظیم اداکاروں دلیپ کمار اور راج کپور کو فلم انداز میں یکجا کیا، فلم میں دلیپ کمار کے ناکام عاشق کا کردار اتنا متاثر کن تھا کہ یہیں سے انہیں شہنشاہ جذبات المیہ اداکاری کے لئے ٹریجڈی کنگ کے لقب سے نوازا گیا۔ راج کپور کے ساتھ دوسری مرتبہ فلم سنگم میں دوبارہ اداکاری کا آفر ملا، جسے کسی وجہ سے دلیپ کمار نے مسترد کیا۔ سدابہار اداکار دیوآنند کے ہمراہ فلم انسانیت میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔ اس کے بعد یہ عظیم اداکار کبھی دوبارہ یکجا نہ ہو سکے۔ آنجہانی راجکمار اکثر و بیشتر کہا کرتے تھے کہ فلم انڈسٹری میں صرف دو کمار ہیں۔ ’’ایک دلیپ کمار اور دوسرے راجکمار‘‘۔ فلم پیغام میں ان دونوں اداکاروں نے شائقین کے سامنے اپنی اداکاری کے جوہر

دکھائے، اس کے بعد ۳۲ سال کے طویل عرصے کے بعد شومین سبھاش گھئی نے فلم سوداگر میں انہیں یکجا کیا جو بہت بڑا چیلنج تھا۔ دلیپ کمار نے منوج کمار کے ساتھ ''آدمی اور کرانتی'' میں کام کیا۔ منوج کمار ہی کی فلم ''کرانتی'' سے دلیپ کمار نے کریکٹر ایکٹر کے طور پر اپنی دوسری اننگز کا آغاز کیا تھا۔ سپر اسٹار امیتابھ بچن کا جب طوطی بولتا تھا اس وقت مشیر ریاض کے بینر تلے ہدایت کار رمیش سپی نے ان دو عظیم اداکاروں کو فلم شکتی میں متعارف کرایا۔ فلم میں باپ بیٹے کی نوک جھونک اور جگل بندی نے شائقین فلم کو خوب محظوظ کیا۔ خیر دلیپ کمار، دلیپ کمار ہے۔ فلم میں حسب توقع دلیپ کمار، امیتابھ بچن پر چھائے رہے۔ اتفاق سے اسی سال بہترین اداکاری کا فلم فیئر ایوارڈ دلیپ کمار کو دیا گیا۔ گذشتہ سال تنویر احمد نے انہیں فلم ایئر وی امپیکٹ کے لئے سائن کیا تھا۔ امسال شومین سبھاش گھئی کی اگلی فلم میں اپنے اپنے وقت کے تین سپر اسٹاروں دلیپ کمار، امیتابھ بچن اور شاہ رخ خان کے یکجا ہونے کے بہت چرچے ہیں۔ اگر یہ فلم بنتی ہے تو واقعی یہ بڑا اعجوبہ ہوگا۔

ہندوستانی فلموں میں ڈبل رول والی فلموں کی کامیابی کی بنیاد دلیپ کمار کی دین ہے۔ جب فلم ''رام اور شیام'' نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ جس کی نقل آج تک ہماری فلم انڈسٹری میں مختلف اداکار کر رہے ہیں۔ 'رام اور شیام' کے علاوہ داستان میں بھی دلیپ کمار نے ڈبل رول کیا اس کے علاوہ دلیپ کمار کی ہی فلم بیراگ تھی جس میں انہوں نے ٹرپل رول ادا کر کے شائقین فلم کو انگشت بدنداں کر دیا ایک طرف دلیپ کمار نے فلم نیا دور میں ایک دل پھینک عاشق، دیدار، انداز میں ناکام عاشق کا کردار ادا کیا، ساتھ ہی کوہِ نور، گوپی میں قابل تعریف مزاحیہ اداکاری کے جوہر دکھائے۔ کریکٹر ایکٹر کے رول میں بھی اپنی علیحدہ چھاپ کرما، ودھاتا، قانون اپنا اپنا اور قلعہ وغیرہ میں چھوڑ دی۔ اس کے بعد مدر انڈیا فلم بنی۔ اس فلم میں دلیپ کمار نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ اداکارہ نرگس نے کئی فلموں میں دلیپ کمار کے مقابل ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا 'مدر انڈیا' میں انہیں نرگس کو ماں کہہ کر پکارنا پڑے گا اس لئے انہوں نے یہ کردار ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ آج تک ہماری فلم انڈسٹری کے بڑے بڑے اداکاروں نے فن اداکاری کو مذاق بنایا اسے روپئے کمانے کا ذریعہ بنایا۔ ایک ہی اداکارہ نے مختلف فلموں میں کبھی ہیروئن، کبھی بھابھی تو کبھی بہن اور کبھی تو ماں

کا کردار ادا کیا۔ ہدایت کار اداکار گرودت اپنی فلم ''پیاسا'' کے لئے دلیپ کمار کو لینا چاہتے تھے۔ ان کے بقول یہ رول دلیپ کمار کو مدِ نظر رکھ کر تحریر کیا گیا تھا اور دلیپ کمار ہی اسکے ساتھ انصاف کر سکتے تھے لیکن ناموافق حالات کے سبب دلیپ کمار نے یہ آفر قبول نہیں کیا۔ بعد میں مجبوراً گرودت نے یہ رول خود کیا اور حسب توقع فلم ''پیاسا'' زبردست کامیاب رہی۔ ورنہ دلیپ کمار کی کامیاب المیہ فلموں کی فہرست میں ایک اور کامیاب فلم کا اضافہ ہو جاتا۔

دلیپ کمار ہندوستان کے واحد اداکار ہیں جنہیں آٹھ بار فلم فیئر ایوارڈ بہترین اداکاری کے لئے دیئے گئے جن میں فلم 'داغ' ۱۹۵۳ء فلم 'آزاد' ۱۹۵۵ء، دیوداس ۱۹۵۶ء، 'نیا دور' ۱۹۵۷ء، 'کوہِ نور' ۱۹۶۰ء، 'رام اور شیام' ۱۹۶۳ء، 'لیڈر' ۱۹۶۴ء، 'شکتی' ۱۹۸۲ء، جب کہ فلم فیئر لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ اور زی لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ شامل ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جنوب کے اداکار کمل ہاسن کو ۱۴ فلم فیئر ایوارڈ ملے، مگر یہ ایوارڈ انہیں کسی ایک زبان کی فلم کے لئے دیا گیا۔ بلکہ کمل ہاسن کو ملیالم، تیلگو، کنڑ اور تامل فلموں کے لئے مشترکہ انعام دیئے گئے ہیں۔ اس میں دلیپ کمار کے ایوارڈ سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۹۴ء میں دلیپ کمار کو ملک کے سب سے بڑے سرکاری فلم ایوارڈ دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے سابق آنجہانی صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے نوازا۔ جب کہ ۱۹۹۹ء میں پاکستان کے سب سے بڑے اعلیٰ شہری ایوارڈ نشانِ پاکستان ایوارڈ سے سابق صدر پاکستان رفیق تارڑ نے نوازا تھا۔ اس کے علاوہ سینکڑوں چھوٹے موٹے ایوارڈ بھی انہیں مل چکے ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں پدم شری اور ۱۹۷۷ء میں پدم بھوشن دیا گیا۔ ۱۹۸۱ء میں دلیپ کمار کو ممبئی شہر میں شیریف آف بامبے بنایا گیا تھا۔ فی الحال دلیپ کمار راجیہ سبھا میں کانگریس کے ممبر آف پارلیمنٹ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

☆☆☆

فلم انڈسٹری کا سب سے بڑا شو مین۔ راج کپور

رشید انجم (بھوپال)

نام۔ رن بیر راج کپور۔ والد: پرتھوی راج کپور۔ والدہ رما دیوی۔

پیدائش: ۱۴/ دسمبر ۱۹۲۴ء۔ کل فلمیں ۷۵

پہلی اسٹیج پرفارمینس: ۱۹۳۲۔ عمر ۸ سال۔ انڈین نیشنل تھیٹر بمبئی کے ڈرامہ The Toycart (کھلونا گاڑی)۔ دیگر اداکار تھے، پرتھوی راج، ایس ایم یوسف اور اینگلو انڈین لڑکیاں۔ دوسری اسٹیج پرفارمینس: ۱۹۴۳ء پرتھوی تھیٹر کے ڈرامہ ''شکنتلا'' میں راجہ دشینت کا نوعمر رول۔ پہلی فلم بطور چائلڈ: ۱۹۳۳ء فلم ''انقلاب'' نیو تھیٹر کلکتہ۔ ہدایت: دیوکی بوس۔ بطور ہیرو پہلی فلم: نیل کمل۔ ۱۹۴۷ء۔ ہیروئن: مدھوبالا۔ رنجیت اسٹوڈیو۔ ہدایت: کیدار شرما۔ بطور ڈائریکٹر: کل ۱۰ فلمیں۔ بطور ہیرو: ۵۱ فلمیں۔ بطور کیریکٹر: ۱۳ فلمیں۔

راج کپور انڈین فلم انڈسٹری کے غیر معمولی فنکار تھے۔ آزاد ہندوستان نے جب روس جیسے ترقی یافتہ ملک کو اپنا دوست بنایا تو روس میں ہندوستان کو دو ہی شخصیتوں سے پہچانا جاتا تھا۔ پنڈت نہرو اور راج کپور۔ برسوں گزر جانے کے بعد بھی روس میں راج کپور اور ان کی فلموں ''آوارہ'' اور ''شری ۴۲۰''۔ کی مقبولیت میں کچھ زیادہ فرق نہیں آیا۔ ان کے پرستار آج بھی روس میں موجود ہیں۔ راج کپور نے سب سے پہلے ۸ سال کی عمر میں انڈین نیشنل تھیٹر بمبئی کے ڈرامے The Toycart (کھلونا گاڑی) میں ۱۹۳۲ء میں پہلی بار اسٹیج پرفارمینس دی۔ ۱۹۳۵ء میں ۱۱ سال کی عمر میں ''نیو تھیٹر کلکتہ۔ کی فلم ''انقلاب'' میں بطور چائلڈ آرٹسٹ فلموں میں قدم رکھا۔ اس فلم میں پرتھوی راج کپور ہیرو تھے۔ ان کے والد پرتھوی راج اس وقت مصروف ترین اداکار بن چکے تھے۔ لیکن راج کپور نے اپنی راہیں خود طے کیں۔ ان کی کامیابی اور فنکارانہ صلاحیتوں میں والد کا قطعی دخل نہیں تھا۔ ۱۹۴۲ء کے بعد پرتھوی تھیٹر قائم ہوا اور اس کے پہلے ڈرامے ''شکنتلا'' میں راج کپور کو اپنے والد پرتھوی راج یعنی راجہ دشینت کا نوعمر کردار نبھانے کا موقع ملا۔ راج کپور پرتھوی تھیٹر میں ایک ادنیٰ ورکر کی طرح کام کرتے تھے۔ جھاڑو لگانے سے بھی انہیں گریز نہیں تھا۔

ان کا فلمی کیریئر بمبئی ٹاکیز سے شروع ہوا جہاں وہ ایک معمولی کلیپر بوائے تھے۔ ۱۹۴۳ء میں انہیں بمبئی ٹاکیز کی فلم ''ہماری بات'' (جے راج، دیویکا رانی) میں چھوٹا سا رول کرنے کا موقع ملا۔ ۱۹۴۳ء میں انہوں نے رنجیت اسٹوڈیو کی فلم ''گوری'' (پرتھوی راج۔ شمیم) میں اداکاری کی۔ ۱۹۴۴ء میں بمبئی ٹاکیز کی فلم ''جوار بھاٹا'' میں جب دلیپ کمار کو متعارف کرایا گیا تو راج کپور امیہ چکرورتی کے اسسٹنٹ تھے۔ اس فلم میں بھی انہوں نے چھوٹا سا رول کیا تھا۔ ''گوری'' کے ہدایت کار کیدار شرما تھے۔ ۱۹۴۶ء میں وہ رنجیت اسٹوڈیو میں آ گئے اور کیدار شرما کے بلا معاوضہ چوتھے اسسٹنٹ بن گئے۔ فلم سازی اور فلم تکنیک کے گر انہوں نے کیدار شرما سے ہی سیکھے۔ ۱۹۴۶ء میں پربھاکر پکچرس بمبئی کی فلم ''والمیکی'' (ہیرو پرتھوی راج کپور۔ ہیروئن شانتا آپٹے) میں اہم رول کرنے کا موقع ملا۔ اس فلم کے ہدایت کار بھال جی پنڈھارکر تھے۔ تب وہ ۲۲ سال کے بھرپور جوان تھے۔ ۱۹۴۶ء میں کیدار شرما نے رنجیت اسٹوڈیو چھوڑ دیا اور اورینٹل پکچرس بمبئی کی فلم ''نیل کمل'' بنانے کا ارادہ کیا تو اس فلم میں راج کپور کو مدھوبالا کے مقابل ہیرو منتخب کیا۔ اس وقت مدھوبالا کو ممتاز کے اصل نام سے پیش کیا گیا تھا اور ان کی عمر صرف ۱۳ سال تھی۔ کیدار شرما راج کپور کے گاڈ فادر تھے۔ ۱۹۴۷ء سے ان کے ہیروشپ کا دور شروع ہوا۔ مدھوبالا کے ساتھ انہوں نے دو فلموں ''چتوڑ وجے'' اور ''دل کی رانی'' (دونوں ۱۹۴۷ء) میں کام کیا تھا۔ پھر عرصے دراز تک یہ دونوں کسی فلم میں یکجا نہیں ہوئے۔ تقریباً ۱۲ سال بعد ''دو استاد'' میں راج کپور پھر مدھوبالا کے ساتھ نظر آئے۔

راج کپور بے حد سعادت مند شاگرد تھے۔ انہوں نے اپنے استاد کیدار شرما سے اداکاری کے فنّی امور ہی نہیں سیکھے بلکہ فلم کی ہر تکنیک اور ہر شعبے پر انہوں نے عرق ریز نگاہ رکھی۔ وہ صرف ہیروشپ تک محدود رہنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ تو فلم کے خالق بننے کے خواہش مند تھے۔ ہیرو تو فلم کا ایک جز ہوتا ہے اور خالق کے ہاتھ میں فلم کے تمام اجزا ہوتے ہیں۔ آخر ان کی محنت اور انکسارانہ ہنرمندی نے انہیں خالق بننے کا موقع فراہم کر دیا۔

۱۹۴۸ء میں انہوں نے اپنی ذاتی فلم کمپنی آر کے فلمز کی بنیاد آبادی سے دور اور لق و دق ویرانے چمبور کے مشرقی علاقے میں رکھ دی۔ یہ تب ایک چھوٹا سا بینر تھا۔ اس بینر سے راجکپور نے

اندرراج آنند کے اسکرپٹ پر فلم ''آگ'' بنائی۔ اس سنجیدہ اور یک سر آرٹسٹک فلم میں انہوں نے نرگس کو اپنے لئے ہیروئن لیا۔ اپنے سالے پریم ناتھ کو اہم رول دیا اور پرتھوی تھیٹر کے موسیقار رام گانگولی کو موسیقی کی ذمہ داری سونپی۔ تب شنکر (طبلہ نواز) اور جے کشن (ہارمونیم پلییئر) اس فلم میں رام گانگولی کے معاون تھے۔ فلم ریلیز ہوئی۔ پریس نے بے حد سراہا لیکن عوام سے مقبولیت نہیں ملی۔ انہوں نے اس اہم مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیا کہ جو فلم خواص میں کامیاب ہے اور عوام میں ناکام تو اس کے اسباب صرف باکس آفس کی طاقت ہو سکتی ہے۔ اور جب فلم کو کامیاب بنانا ہے تو باکس آفس کی قوت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کمرشیل سنیما کی لازمیت کو دھیان میں رکھتے ہوئے انہوں نے آر کے فلمز کا سیٹ اپ تیار کیا۔ ایک ٹیم ورک اچھے کمرشیل سنیما کی خالق بن سکتی ہے۔ ان کی ٹیم میں جو نام شامل ہوئے انہوں نے نہ صرف اچھی کمرشل فلمیں تخلیق کرنے میں تعاون دیا بلکہ ان فلموں کے معیار سے بھی انکار ممکن نہیں ہوا۔ رادھو کرماکر (کیمرہ مین) بنی روبن (پبلیسٹی انچارج) شنکر جے کشن (موسیقار) شیلیندر حسرت جے پوری (نغمہ نگار) ڈیوڈ (مشیر) نرگس (ہیروئن) علاؤالدین (ساؤنڈ ریکارڈسٹ) اچریکر (آرٹ ڈائریکٹر) پریم ناتھ (معاون اداکار) اس ٹیم میں شامل ہوئے۔ پریم ناتھ جلد ہی الگ ہو گئے۔ لیکن باقی لوگ آخر تک ساتھ رہے اس ٹیم میں اندرراج آنند اور خواجہ احمد عباس بھی شامل تھے۔ خواجہ احمد عباس کے اسکرپٹ پر ہی ''آوارہ'' اور ''شری ۴۲۰'' جیسی اچھوتی فلمیں بنائی گئی تھیں۔ وہ بے حد جفاکش انسان تھے۔ ان کی شخصیت میں عجیب سا رچاؤ تھا۔ اور مشرق و مغرب کا دل کش سنگم بھی۔ سیٹ اپ تیار ہونے کے بعد پرتھوی تھیٹر کے ڈرامہ نویس رامانند ساگر سے فلم اسکرپٹ تیار کرایا اور اس اسکرپٹ پر جو میوزیکل رومانی فلم تخلیق ہوئی جسے لتا منگیشکر کی دل نشیں آواز اور شنکر جے کشن کی ناقابل فراموش موسیقی کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے فلم ''برسات'' سے ہی نمی اداکارہ بنیں۔ شنکر جے کشن، حسرت اور شیلیندر کے علاوہ رامانند ساگر اور کیمرہ مین رادھو کرماکر (اس فلم کے اصل کیمرہ مین جال مستری تھے)۔ کی یہ پہلی فلم تھی۔ ۱۹۴۹ء کی یہ زبردست ہٹ فلم تھی اس فلم نے آر کے فلمز کو مستحکم کر دیا۔ اب راج کپور پر اعتماد ہو چکے تھے۔ اس سال محبوب خان کی فلم ''انداز'' میں راج کپور کو پہلی بار دلیپ کمار کے ساتھ اداکاری کرنے کا موقع ملا۔ نرگس اور نوشاد کی موسیقی نے اس فلم میں چار چاند

لگا دئے۔ اور یہ فلم تاریخ ساز حیثیت اختیار کر گئی۔ آج اس فلم کو میل کا پتھر کہا جاتا ہے۔ راج کپور بیرونی فلموں اور آر کے فلمز کی فلموں میں مقبولیت کی انتہائی کو چھوتے جا رہے تھے۔ فلم انڈسٹری اور انڈین اسکرین پر تب تین ہی ہیروز کا راج تھا۔ دیو آنند، دلیپ کمار اور راج کپور۔ ان تینوں نے ایک عرصۂ دراز تک فلم انڈسٹری پر حاکمانہ قبضہ جمائے رکھا۔ سارا ہندوستان ان کی اداکاری ان کے ہیر اسٹائل اور ان کے لباس کا دیوانہ تھا۔ تینوں کی اداکاری کا مزاج الگ، فن الگ اور اسٹائل الگ رہا۔ یہ تینوں عظیم فنکار مغربی فنکاروں کے مقلد رہے۔ دلیپ کمار ہالی ووڈ کے مایہ ناز اداکار مارلن برانڈو سے متاثر تھے تو دیو آنند گریگری پیک کی تقلید کرتے تھے۔ راج کپور نے چارلی چیپلن کو مشرقی انداز میں پیش کیا۔ ان کی منفرد اداکاری میں مغرب اور مشرق کا بڑا ہی دل کش فن جھلکتا تھا۔

یہ تین فنکار ہندی فلموں کے وہ تاریخ ساز اداکاری تھے جن سے ایک عہد روشن رہا۔ ان کے متوازن ایک چوتھا اداکار بھی تھا۔ اشوک کمار۔ اپنی فطری اداکاری کا ایسا بلند مینار جس کی اونچائی نگاہ سے نہیں ناپی جا سکتی تھی۔ ان تین میں یہ چوتھا کبھی شامل نہیں رہا شاید اس کی وجہ یہ رہی کہ اول تو اشوک کمار ان سے بہت سینیئر تھے اور یہ تینوں ہم عمر دوسرے اشوک کمار کی نوجوان عمر کی سیڑھیوں پر ہمیشہ ایک بزرگ قدر کار بیٹھا رہا جس نے انہیں حسن کے بیباک سبزہ زار پر اترنے ہی نہیں دیا۔ ان کے مقدر میں ہیروشپ سدا سے ہی سنجیدہ کردار بن کر آئی۔ ان تینوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ تینوں مٹی پکڑ پہلوان تھے۔ یہ ہار کر بھی چت نہیں ہوتے تھے۔ یہ تینوں ہم عصر فنکار تھے لیکن کبھی ایک دوسرے کے مدِ مقابل نہیں آئے۔ ان کی دوستی مثالی تھی۔ دلیپ کمار ماضی کو نظر میں رکھتے تو دیو آنند کے لئے حال ہی سب کچھ تھا لیکن راج کپور کی نگاہ سدا مستقبل کی بندِ مٹھی کو کھولنے کا جتن کرتی رہی۔ وہ کنارے پر بیٹھ کر پانی کی گہرائی کا اندازہ نہیں لگاتے تھے۔ پانی میں کود کر ہی پانی کی گہرائی کے ساتھ اس کے سرد اور گرم ہونے کا صحیح اندازہ لگانے کے قائل رہے۔ وہ خواب دیکھنے کے نہیں اس کی تعبیر پر یقین رکھتے تھے۔ اگر وہ صرف اداکار ہوتے تو صرف راج کپور ہوتے لیکن انہوں نے بطور فلمساز ہدایت کار اپنی فلموں میں اپنا موقف پیش کیا اور اونچائیوں کو چھو گئے۔ وہ شہری بابو ہوتے ہوئے بھی شہری رواجوں سے باغی رہے۔ ''پریم روگ'' اور ''رام تیری گنگا میلی'' میں انہوں نے ان حقائق کو بے نقاب کیا جو حویلیوں میں گناہ پلتے ہیں اور سیاست کی سفید پوشی میں جراثیم کی مانند اپنی

گندگی معاشرے کی کوکھ میں انڈیل دیتے ہیں۔فلم ''آوارہ'' میں سب سے پہلا ڈریم سکوینس انڈین فلموں کو دیا تو فلم ''بوبی'' سے ٹین ایج (کم عمری کی محبت) کی شروعات بھی انہوں نے کی تھی۔''پھر صبح ہوگی'، 'جاگتے رہو'، 'اناڑی'، 'آوارہ'، 'شری ۴۲۰'، 'آہ'، 'انداز'، 'جس دیش میں گنگا بہتی ہے'، 'میرا نام جوکر' اور 'عبداللہ' ان کے ہیروشپ سے لے کر کیریکٹر آرٹسٹ میں تبدیل ہونے تک ان کی وہ فلمیں ہیں جن میں وہ بطور اداکار اور ہدایت کار فن کے عروج پر نظر آتے ہیں۔''بوٹ پالش''، ''اب دلی دور نہیں'' نے انہیں بطور فلمساز نہ صرف ملک میں بلکہ بیرونِ ملک بھی اعزاز دلائے۔ بوٹ پالش کو ۱۹۵۴ء میں کانفرنس فلم فیسٹیول میں بے حد سراہا گیا اور بے بی ناز کو Special Mention ایوارڈ سے نوازا گیا۔

''جاگتے رہو'' کو ۱۹۶۵ء میں کارلووری فلم فیسٹیول میں دی گرانڈ پرکھ ایوارڈ سے نوازا گیا اس کے علاوہ اسے نیشنل ایوارڈ بھی ملا تھا اور فلم فیئر ایوارڈ بھی۔''بوٹ پالش'' فلم فیئر ایوارڈ میں بہترین فلم کے ساتھ ڈیوڈ کو معاون اداکار مانا گیا تھا۔اناڑی میں انہیں بہترین اداکار کا اعزاز ملا تھا تو فلم ''سنگم'' ۱۹۶۴ء میں چار ایوارڈ دئے گئے تھے۔''جس دیش میں گنگا بہتی ہے'' کو ۱۹۶۰ء کے چار ایوارڈ ملے تھے۔ان کی ہر فلم کو سراہا گیا۔گو یہ بات الگ ہے کہ کچھ فلمیں ناکام بھی ہوئیں لیکن فلم کے معیار کوالٹی اور سبجیکٹ سے کوئی انکار نہیں کرسکا۔

وہ ایک اچھے اور فرمانبردار بیٹے تھے۔والد کے قدموں میں بیٹھتے تھے تو ماں کو پلکوں پر بٹھاتے تھے۔فلموں میں آنے سے قبل پریم ناتھ کی بہن کرشنا سے ان کی شادی ہوگئی تھی۔کرشنا جتنی خوبصورت تھیں اتنی ہی کشادہ دل اور کشادہ ذہن کی مالک تھیں۔شوہر کی خامیوں اور ان کی عیاشیوں کا اثر انہوں نے کڑوے گھونٹ کی طرح پی لیا۔مگر گرہست زندگی پر داغ نہیں آنے دیا۔نرگس اور راج کپور کا معاشقہ جگ ظاہر رہا۔دونوں تمام حدوں کو پار کر چکے تھے۔لیکن راج کپور کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ جتنا فن کے لئے دیوانگی کی حد تک سنجیدہ تھے۔اتنے ہی بیوی کے حقوق ادا کرنے میں بھی گریز نہیں کرتے تھے۔انہوں نے نرگس کے ساتھ ۱۹ فلموں میں کام کیا۔ان کی آخری فلم اے وی ایم مدراس کی ''چوری چوری'' تھی جو ۱۹۵۶ء میں آئی تھی ''مدر انڈیا'' ۱۹۵۸ کے بعد نرگس نے سنیل دت سے شادی کرلی اور یہ پیار کا قصہ پارینہ بن گیا۔

راج کپور ایک عہد ساز فلم ساز اور اداکار تھے۔وہ اپنے ساتھیوں کے لئے بھی اتنے ہی دریا دل تھے۔اپنے دوست گیت کار شیلیندر کی کلاسک فلم ''تیسری قسم'' میں انہوں نے بلا معاوضہ کام کیا تھا۔اس فلم کو پورا کرنے میں بھی اور پھر اس کی ایڈیٹنگ کرنے میں بھی انہوں نے بھرپور امداد کی تھی لیکن فلم اور بجٹ کے علاوہ بہت زیادہ وقت میں بنی جس کی وجہ سے شیلیندر قرضدار ہوکر ہسپتال پہونچ گئے اور ٹھیک ۱۴ دسمبر کو راج کپور کی سالگرہ والے دن راج کپور کی بانہوں میں فلم کی کامیابی کی حسرت لئے دم توڑ گئے۔راج کپور اور خواجہ احمد عباس کا سنگم تھی فلم ''آوارہ'' ۱۹۵۱ء۔اس فلم کو پنڈت جواہر لال نہرو کے علاوہ خروشچیف، ماؤ اور کرنل جیسے اپنے وقت کے عظیم رہنماؤں نے دیکھا اور سراہا تھا۔راجہ، رعایا، عالم، طالب علم، دانشور اور عام مزدور نے اس فلم کو دیکھا۔عرب ملکوں کے علاوہ چین، روس اور دیگر سماج وادی ملکوں میں پیش کی گئی یہ پہلی ہندوستانی فلم تھی۔شمالی خط مستقیم پر تعینات سائنسدانوں کی فرمائش پر اس فلم کا مخصوص شو وہاں رکھا گیا تھا۔یہ بھی بڑی چونکانے والی بات ہے کہ اس فلم کو روس کی غیر تسلیم شدہ قومی فلم ہونے کا بھی فخر حاصل ہوا۔۱۹۸۵ء میں اسے امریکہ کے مختلف شہروں میں بھی ریلیز کیا گیا تھا۔راج کپور نے اپنی زندگی میں معاشقے بھی کئے۔سیکس کو بھی فلموں میں نمایاں رکھا۔شرابیں بھی پیں لیکن اپنے خاندان کی کسی لڑکی یا عورت کو فلم میں کام کرنے کی اجازت نہیں دی۔وہ چھوٹے پردے کے طلسم سے بھی دور رہے۔منہ مانگی قیمت پر بھی انہوں نے اپنی کوئی فلم ٹیلی ویژن پر دکھانے کی اجازت سے پرہیز کیا۔انہیں ۱۹۸۷ء میں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے نوازا گیا اور سانس کے عارضے میں مبتلا یہ فنکار صرف ۶۴ سال کی عمر میں ۱۹۸۸ء میں دنیا سے رخصت ہوگیا۔راج کپور کے انتقال کے بعد نہ صرف ٹیلی ویژن کے دروازے سے ان کی فلموں پر لگا پہرہ ہٹ گیا بلکہ کپور خاندان کی لڑکیاں بھی سیکس، گلیمر رومانس، دولت اور شہرت کے ریمپ پر اپنی جوانی کی گاگریں چھلکاتی ہوئی اتر آئیں۔ان کے بعد ان کے بیٹوں نے تین فلمیں ''حنا'' (رندھیر کپور)، ''پریم گرنتھ'' (راجیو کپور) اور ''آ اب لوٹ چلیں'' (رشی کپور) بنائی مگر راج کپور جیسی شو مین شپ سے محروم رہ گئیں۔

☆☆☆

دادامنی ۔ اشوک کمار

ڈاکٹر شاہد محمود

دادامنی اشوک کمار ہندی فلم کے ایک ایسے ٹال فیگر رہے ہیں جنہوں نے تقریباً ٦ دہائیوں تک اپنی بے مثال اداکاری کے ذریعہ لوہا منوا یہ ایک ایسے اداکار رہے جن کے زمانے میں دلیپ کمار، راجکپور، دیو آنند، سنیل دت، منوج کمار، راجندر کمار، دھرمیندر، راج کمار سبھی اپنی اپنی جگہ پر عروج پر رہے لیکن اس کے باوجود اشوک کمار کی اپنی ایک الگ اور منفرد حیثیت رہی، اشوک کمار کا موازنہ دلیپ کمار، راج اور دیو آنند سے نہیں کیا جاسکتا کیونکہ دادامنی ان تینوں سے سینئر اداکار تھے اور اس زمانے کے ہیرو تھے جب الہاس، موتی لال، شیکھر، سہگل، چندرموہن، سہراب مودی اور پرتھوی راج جیسے سپر اسٹار تھے۔ اشوک کمار نے لیلاٹپنس، دیویکارانی، شوبھنا سمرتھ جیسی گئے وقت کی ہیروئینوں کے ساتھ کام کیا ان کو مدھوبالا، شیاما، ثریا، مینا کماری، جبین، شکیلہ، ہیلن، وحیدہ رحمٰن، نندہ، جیسی ٹاپ ہیروئینوں کے ساتھ بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ کمال امروہوی کی ناقابل فراموش فلم ''محل'' میں اشوک کمار کو مدھوبالا کے ساتھ پیش کیا گیا تھا جس کا ایک گیت ''آئے گا آئے گا آئے گا آئے آنے والا آئے گا'' اس قدر مشہور ہوا تھا کہ لوگ آج بھی اس گیت کو کہیں سن لیتے ہیں تو ان کے قدم خود بخود رک جاتے ہیں۔

اشوک کمار نے بیک وقت ہیرو، سائڈ ہیرو، ویلین، باپ، دادا اور بڑے بھائی کا رول بڑی خوبصورتی سے نبھایا۔ ١٩٦٠ء کی دہائی میں ریلیز ''چتر لیکھا'' ان کی زندگی کی یادگار اور کلاسیک فلم ثابت ہوئی جس میں ہیروئن مینا کماری اور چندرگپت کے تاریخی رول میں پردیپ کمار تھے۔ اس فلم میں اشوک کمار نے ایک ایسے سادھو سنیاسی کا رول ادا کیا تھا جس کا دل دنیاوی جھمیلوں سے اچاٹ ہوچکا تھا اور وہ دنیاوی جھمیلوں کو چھوڑ کر سنیاس لے چکے تھے۔ اور برسوں پہاڑوں، غاروں اور ویران ساحلی سمندر پر گزار کر ایک مرتبہ پھر سے اس دنیا میں آئے تھے جو عام لوگوں کی دنیا تھی اور وہ اس دنیا میں واپس آ کر ایک راج نرتکی مینا کماری پر ریجھ گئے تھے اور یہاں تک کہ اس کے عشق میں اپنا مذہب اور اپنے سنیاس کو بھی تیاگ دینے کو

تیار تھے۔ اس فلم میں ان کے جنون، مینا کماری کی نفرت اور پردیپ کمار کا حسد اس قدر خوبصورتی سے فلمایا گیا تھا کہ وہ فلم ناقابل فراموش بنی لیکن افسوس وہ فلم بری طرح سے ناکام ہوئی کیونکہ اس میں حد درجہ سخت ہندی کی بھینٹ چڑھ کر ناکام ہوچکی تھی۔

اشوک کمار نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کشور کمار، انوپ کمار کے ساتھ بھی ایک یادگار فلم کی تھی جس کا نام ''چلتی کا نام گاڑی'' تھا اس فلم میں اشوک کمار بیک وقت سنجیدہ، مزاحیہ رول کی وجہ سے یادرہ گئے تھے۔ یہ فلم سپرہٹ ثابت ہوئی تھی، اس فلم کے چند گیت جیسے پانچ روپیّا بارآنہ، ہم تھے وہ تھے اور سماں رنگین سمجھ گئے نا، ایک لڑکی بھولی بھالی سی بیحد مشہور ہوئے تھے۔ اشوک کمار نے دلیپ کمار کے ساتھ دو یادگار فلمیں کیں جنمیں ''دیدار'' اور ''دنیا'' قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ راجندر کمار کے ساتھ میرے محبوب، قانون پردیپ کمار کے ساتھ راکھی، افسانہ، چتر لیکھا، شیخ مختار کے ساتھ بڑا بھائی، استادوں کے استاد، مینا کماری کے ساتھ بہو بیگم، چتر لیکھا، پاکیزہ وغیرہ۔

دیو آنند کے ساتھ اشوک کمار کی سب سے یادگار فلم ''جیول تھیف'' تھی اس فلم میں ہدایتکار وجے آنند نے اشوک کمار کو بہت ہی اہم اور مرکزی رول ''جیول تھیف'' کے طور پر پیش کیا تھا اور ان کی اداکاری کے آگے دیو آنند بالکل آؤٹ کلاس ہوکر رہ گئے تھے۔

اشوک کمار نے کئی فلموں میں ویلین کے کردار بھی نبھائے جن میں ''جواب'' (مینا کماری، جتندر) دادی ماں (بینا رائے) قانون میں راجندر کمار، نندہ کے ساتھ ڈبل رول بر ماروڈ میں شیخ مختار، شکیلہ، استادوں کے استاد میں پردیپ کمار، شکیلہ، شیخ مختار کے ساتھ ویلین کا رول ادا کیا۔

فلم ''مہربان'' جو کہ اے وی ایم کی فلم تھی اس فلم میں اشوک کمار نے نوتن اور سنیل دت کے ساتھ انتہائی جذباتی رول ادا کیا تھا۔ اور اس فلم کی مثال نہیں دی جاسکتی۔ اسی طرح سے بمل رائے کی فلم میں دھرمیندر اور نوتن کے ساتھ بھی ایک یادگار رول نبھایا تھا۔

رشی کیش مکھرجی کی سب سے بہترین فلم اگر آنند تھی تو آشیرواد کو بھی اُسی زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ اس فلم میں اشوک کمار کا ایسا جذباتی رول تھا کہ سنجیو کمار، سمیتا سانیال جیسے اداکار بھی پھیکے پڑ گئے تھے۔ اس فلم میں اشوک کمار نے اپنی آواز میں ایک گیت بھی گایا تھا جسے بیحد پسند کیا گیا

تھا اوراس فلم میں ان کی اداکاری بیحد عروج میں تھی،خود اشوک کمار اقرار کرتے ہیں کہ فلم آشیر واد سے بہتر انہیں کوئی اور فلم نہیں ملی تھی۔ ویسے تو چتر لیکھا،جیول تھیف، پاکیزہ،دیدار،کاجل،مہربان، ان کی بہترین فلموں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے لیکن سریندر کمار کی فلم ’’تیری صورت میری آنکھیں‘‘ جو ۱۹۶۵ء میں ریلیز ہوئی تھی اس فلم کو بھی کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اس فلم کے مرکزی کرداروں میں اگر چہ آشا پاریکھ اور پردیپ کمار تھے لیکن فلم کی پوری کہانی اشوک کمار کے ارد گرد گھومتی ہے۔اس فلم میں انھوں نے ایک انتہائی بدصورت اور سیاہ فام،آدمی کا رول ادا کیا تھا جو اپنی صورت دنیا کو دکھانے کے لائق نہیں سمجھتا،ہمیشہ اپنے آپ کو تاریک اور بند کمروں میں رکھتا ہے۔اس فلم کی اداکاری سے اشوک کمار کی عظمت دوبالا ہوتی ہے۔

ویسے تو اشوک کمار نے بڑے بھائی اور باپ کے رول میں تقریباً ۳۰۰ سے زائد فلموں میں کام کئے،لیکن جو بھی رول ملا اسے انتہائی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا۔۱۹۷۰ء میں فلمساز و ہدایتکار برج کی زبردست سپرہٹ مزاحیہ فلم ’’وکٹوریہ 203‘‘ ریلیز ہوئی تھی جس میں سائرہ بانو اور نوین نشچل لیڈ رول میں تھے اور پران کے ساتھ اشوک کمار کی زبردست کامیڈی نے فلم کو سپرہٹ کر دیا تھا۔اس کے علاوہ پران کے ساتھ دفعہ 203،راجہ اور رانا بھی دلچسپ فلم ثابت ہوئی تھی۔ایچ ایس رویل کی میرے محبوب میں انھوں نے ہیروئن سادھنا کے بڑے بھائی اور نمی کے عاشق کا رول ادا کیا تھا۔بہو بیگم ان کی ایک اور یادگار فلم ہے جس میں مینا کماری اور پردیپ کمار بھی تھے۔۱۹۹۹ء میں انھوں نے آخری فلم ’’دی ریٹرن آف جیول تھیف‘‘ میں کام کیا تھا لیکن یہ فلم ناکام ہوگئی تھی۔

☆☆☆

سدا بہار ہیرو۔دیو آنند

خورشید اختر فرازی

دیو آنند ایک ایسے سدا بہار ادکار کا نام جو گزشتہ ۶ دہائیوں سے فلموں میں نظر آرہے ہیں اور اپنی اننگ کا سلسلہ جاری رکھا ہے اور انہیں ایور گرین دیو آنند کا نام اس لئے دیا گیا کہ وہ جہد مسلسل پر یقین رکھتے ہیں اور کبھی بھی تھکنے کا نام نہیں لیتے،۱۹۵۰ء میں انھوں نے اپنی پروڈکشن نویکیتن کا آغاز کیا تھا۔اوراس کے بینر تلے تقریباً ۶۵ فلمیں کامیاب رہیں اور ۲۰ بس یونہی رہیں اور بقیہ فلاپ ہوگئیں مگر دیو آنند نے کبھی اس کے بارے میں نہیں سوچا بس ایک فلم ریلیز کے لئے پیش ہوئی کہ دوسری فلم کی تیاری شروع کر دی،دیو آنند نے کئی نئی لڑکیوں کو انڈسٹری سے متعارف کرایا۔کچھ بہت چلیں،کچھ چند فلموں تک گوارا رہیں اور کچھ اپنی پہلی فلم کے بعد ہی غائب ہوگئیں۔ویسے ان کے بینر تلے جس ہیروئن نے برسوں دھوم مچایا اور ہمیشہ ٹاپ کی ہیروئن بنی رہی وہ بلاشبہ زینت امان تھی جسے دیو آنند نے پہلی مرتبہ اسے اپنی بہن کے رول میں ’’ہرے راما ہرے کرشنا‘‘ میں پیش کیا۔۱۹۷۰ء کی ریلیز اس فلم نے باکس آفس کے ریکارڈ توڑ دیئے۔فلم کے دلکش نغمے،آنند بخشی کے چٹکلے گیت اور راہل دیو برمن کا خوبصورت سنگیت نیز دیو آنند،ممتاز،زینت امان کی بہترین اداکاری کے سبب سے یہ فلم بیحد کامیاب ہوئی تھی،چونکہ اس زمانے میں ہندوستان میں امریکی وباچرس افیم گانجہ نے اپنا قبضہ جمارکھا تھا اور ہرے راما ہرے کرشنا کا راگ الاپتے ہوئے امریکن ہپّیوں کی بہت بڑی تعداد نے ہندوستان میں بسیرا کر لیا تھا جس کے سبب سے ہندوستانی نوجوانوں کے اندر چرس،افیم اور گانجہ جیسی منشیات کی لعنت نے جڑ پکڑ لیا تھا اور نوجوان نسل ان منشیات کی عادی بن کر پوری قوم کو تباہ کر رہی تھی۔ایسے موقع پر ہندوستانیوں کو جگانے کے لئے یہ فلم پوری قوم کے لئے ایک پیغام بن کر آئی تھی اور اس فلم میں چرس،گانجہ اور افیم کی لعنت کو اپنائے ہوئے نوجوانوں کی تباہی کو بہت ہی خوبصورت انداز میں دکھایا گیا تھا جس کی بنا پر ہر طبقے کے لوگوں نے اس فلم کو پسند کیا اور بار بار دیکھا۔آشا بھونسلے،کشور کمار اور اوشا اوتھپ کے پاپ گیت نے تہلکہ مچا دیا تھا۔دم مارو دم،پھولوں کا تاروں کا سب کا کہنا ہے،کانچھی رے،دیکھو او دیوانوں ایسا کام نہ کرو،ہرے رام ہرے کرشنا جیسے سپرہٹ گیتوں کی وجہ

سے یہ فلم خوب چلی جس کی بنا پر نوکیشن کے اگلے پچھلے تمام حساب بیباق ہو گئے اس فلم کے ذریعہ دیو آنند نے کروڑوں روپے کمائے اور اپنی فلم یونٹ کے ہر شخص کو چھ چھ مہینوں کا بونس دیا تھا۔

اس سے قبل دیو آنند نے دیش بھکتی فلم ''پریم پجاری'' بنائی تھی جس میں پاکستان اور چین کے جاسوسوں کی ملی بھگت کے ذریعہ ہندوستان میں حملہ کرنے کا پروگرام تھا، اس فلم کے چند ڈائیلاگ بہت ہی متنازع تھے خاص طور پر شتروگھن سنہا کا یہ ڈائیلاگ کہ پاکستان دو دن کے اندر اندر ہندوستان پر قبضہ کرے گا اور ہم لوگ جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کریں گے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سارے ڈائیلاگ تھے جس کی بناء پر فلم متنازع ثابت ہوئی ریلیز ہوئی لیکن بہت زیادہ کامیاب نہ ہو سکی تھی۔

دیو آنند نے وحیدہ رحمٰن کے ساتھ سب سے زیادہ فلمیں کیں، روپ کی رانی چوروں کا راجہ، سولہواں سال، گائیڈ، پریم پجاری وغیرہ، ان تمام فلموں میں وجے آنند (دیو آنند کا سب سے چھوٹا بھائی) کی ہدایت میں بنی فلم ''گائیڈ'' بیحد کامیاب اور کلاسیک فلم ثابت ہوئی انڈیا کی کلاسیک فلموں میں جہاں دو آنکھیں بارہ ہاتھ، گرم ہوا، مغل اعظم، پکار، دیوداس، میرا نام جوکر، لگان وغیرہ کو رکھا جائے گا وہیں گائیڈ کو بھی جگہ ملے گی اور اسے امتیازی مقام حاصل ہوگا۔ گائیڈ فلم نے پورے ہندوستان کو سوچنے کا موقع فراہم کیا تھا اس فلم میں دیو آنند، وحیدہ رحمٰن، انور حسین اور کشور ساہو نے بہترین اداکاری کی تھی۔ دیو آنند کی ماں کے رول میں لیلا چٹنس اور ماما کے رول میں الہاس نے ایسی شاندار اداکاری کی تھی جس کی مثال نہیں دی جا سکتی۔ اس فلم میں ایک عورت کے کئی روپ دکھائے گئے تھے وہ ایک بیوی، معشوقہ، بے وفا معشوقہ اور رقاصہ کے روپ میں وحیدہ رحمٰن نے اس فلم میں اپنی اداکاری کے ذریعہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا تھا جس کی بنا پر اُسے فلم فیئر ایوارڈ بھی ملا، جبکہ اس فلم میں دیو آنند کو بھی ایوارڈ ملنا چاہئے تھا اور اگر یہ فلم آج کے دور میں ریلیز ہوئی ہوتی تو اُسے آسکر کے لئے نامزد کیا جاتا، کشور کمار، محمد رفیع اور لتا منگیشکر کے خوبصورت گیت مجروح سلطانپوری کے خوبصورت نغمے اور ایس ڈی برمن کے سنگیت نے اس فلم میں چار چاند لگا دیئے تھے، ایسی خوبصورت اور کلاسیک فلمیں برسوں کے بعد بنتی ہیں اور ایسی فلموں کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس فلم کے ڈائیلاگ اور خاص طور پر کشور ساہو کا یہ ڈائیلاگ ''گھبراؤ مت راجو میری کتاب میں ایک نام تمہارا بھی ہوگا، بیحد لاجواب رہا، اس فلم میں رقص کے لئے جو اسپیشل پچ دیئے گئے تھے اس کے لئے ہدایت

کار وجے آنند کی تعریف کرنا ہوگی جس نے دیو آنند کی اس فلم کو ایک شاہکار فلم میں تبدیل کر دیا تھا۔

فلم گائیڈ کے بعد دیو آنند کی جو زبردست ہٹ فلم آئی وہ وجے آنند کی ہدایت پر مبنی ''جیول تھیف'' تھی اس فلم کے انداز ہی نرالے تھے، اس میں اشوک کمار نے ایک ایسے مکار جیول تھیف کا رول ادا کیا تھا جو ناقابلِ فراموش ثابت ہوا، شروع سے آخر تک لوگ دیو آنند کے کسی ہمشکل کو جیول تھیف سمجھتے رہے اور جیول تھیف (اشوک کمار) سبھوں کے سامنے موجود رہتے ہوئے بھی ایک مظلوم بھائی اور انتہائی شریف النفس انسان بنا رہا، اس فلم میں جس انداز کا سسپنس دکھایا گیا ہے وہ شاید اس سے پہلے کسی بھی ہندی فلم میں دکھایا نہ گیا ہو، فلم میں دیو آنند، وجینتی مالا نے لیڈ رولز کئے، اس کے علاوہ توجہ ایک بہت ہی خوبصورت چنچل ہنس مکھ لڑکی کے رول میں نظر آئی اس کے علاوہ ہیلن، فریال اور انجو مہندرو نے تین حسیناؤں کے رول میں کمال کر دیا تھا اس فلم کی سب سے بڑی خوبی فلم کی ہدایت تھی اور وجے آنند نے اپنی ہدایت کے ذریعہ اس فلم میں چار چاند لگا دیئے تھے اور لوگوں کو پہلی مرتبہ وجے آنند کی اصلی ذہانت کا پتہ چلا تھا۔ اگرچہ وجے آنند اس سے پہلے ناصر حسین کی فلم ''جب پیار کسی سے ہوتا ہے'' میں دیو آنند اور آشا پاریکھ کے ساتھ کامیاب فلم بنا چکے تھے، اس کے علاوہ نوکیشن کی فنٹوش (دیو آنند کلپنا کارتک) (دیو آنند۔ گیتا بالی) تیرے گھر کے سامنے افسر (دیو آنند۔ نوتن) اور ناصر حسین کی آل ٹائم بیسٹ تیسری منزل (شمی کپور۔ آشا پاریکھ) کی کامیاب ڈائریکشن دے چکے تھے۔ فلم گائیڈ جو کہ ہندوستان کی کلاسیک فلموں میں شامل ہے جس میں دیو آنند۔ وحیدہ نے کام کیا تھا اور اس فلم کی ہدایت بھی وجے آنند دے چکے تھے لیکن جیول تھیف گائیڈ کے بعد وجے آنند کی سب سے بہترین ہدایت کاری میں بنی فلم کا نام تیسری منزل ہی ہے۔

جب لوگ دیو آنند سے زیادہ وجے آنند کی تعریف کرنے لگے تو لوگوں کی حد درجہ تعریف سے دیو آنند تنگ آ گئے اور انھوں نے ہرے راما ہرے کرشنا کی ہدایت خود ہی دی، یہ فلم ہپّی ازم کے دور میں ریلیز ہوئی تھی جس میں ممتاز کے ساتھ زینت امان نے یادگار رول ادا کئے تھے، یہ فلم راہل دیو برمن کے سنگیت، آنند بخشی کے گیت اور زینت امان کی ادکاری کی وجہ سے کامیاب ہوئی بلکہ سپر ہٹ ثابت ہوئی جس کے بعد دیو آنند نے یہ تصور کر لیا کہ وہ خود بھی اچھے ہدایت کار ہیں لہٰذا ہدایتکاری کے لئے پیسہ اور شہرت وجے آنند کو کیوں دیں لہٰذا اسکے بعد دیو آنند نے پریم پجاری (وحیدہ رحمٰن) عشق عشق عشق (زینت امان) پریم

شاستر (زینت۔بندو) سوامی دادا (ایکتا) چھپے رستم وغیرہ تقریباً ایک درجن فلمیں بنائیں جو سب کی سب فلاپ ہوگئیں، آخری فلم ''دی ریٹرن آف جیول تھیف'' تو صرف ایک ہفتے مشکل سے چلی۔

لیکن ان ناکامیوں کے باوجود دیو آنند کو سدابہار اداکار کہا گیا ہے۔دیو آنند نے اپنی ہیروئن کلپنا کارتک سے محبت کر کے شادی کی تھی جن سے دو بچے بھی ہوئے مگر آج گزشتہ ۳۴ برسوں سے وہ دونوں ایک ہی بنگلے میں اوپر نیچے رہتے ہیں مگر دونوں میں بات چیت بند ہے۔دونوں میں علاحدگی نہیں ہے اور کلپنا کارتک کا پورا خرچ دیو آنند ہی اٹھاتے ہیں مگر بات چیت بند، دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کے بھی روادار نہیں، دیو آنند نے ٹینا منیم کے ساتھ دیش پردیش، انسانیت میں دلیپ کمار، بینا رائے، کے ساتھ بھی کام کیا تھا۔ان کی فیوریٹ ہیروئنوں میں کلپنا کارتک گیتا بالی (جال) وحیدہ رحمٰن، زینت امان، وجینتی مالا (جیول تھیف، امردیپ) ثریا کے ساتھ ایک فلم کی اور ثریا نے اپنی زندگی میں دیو آنند سے عشق کرنے کا اظہار کیا تھا۔

دیو آنند کو بالی ووڈ اداکار گریگوری پیک کا چربہ کہا جاتا تھا وہ پورے طور پر اسی کی داکاری کرتے تھے جب کہ دلیپ کمار پر رچرڈ برٹن کے انداز میں اداکاری کرنے کا الزام لگا تھا۔دیو آنند نے ابھی حال میں اپنی سوانح عمری لکھی ہے جس کا اجرا وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے کیا۔اس کتاب میں دیو آنند کی عشق کی داستانیں بھری ہوئی ہیں۔وجے آنند کی ہدایت میں بنی ''جانی میرا نام'' بھی سپر ہٹ فلم ثابت ہوئی تھی جس میں ہیما مالنی، کے ساتھ پہلی مرتبہ دیو آنند نے کام کیا تھا۔اس فلم میں پران پریم ناتھ، پدما کھنہ، رندھاوا، افتخار اہم رول میں تھے۔جانی میرا نام کلیان جی آنند جی کی بہترین موسیقی، کشور اور لتا منگیشکر کے خوبصورت نغموں کی وجہ سے سپر ہٹ ثابت ہوئی تھی دیو آنند کی ایک فلم سی آئی ڈی (وحیدہ۔شکیلہ) جعلی نوٹ (مدھوبالا) کالا پانی (مدھوبالا) بھی بیحد کامیاب فلمیں ثابت ہوئی تھیں روپ کی رانی چوروں کا راجہ (وحیدہ) سولہواں سال (وحیدہ) بھی اپنے وقت کی کامیاب ہیروئینوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

☆☆☆

بیش قیمت موتی تھے۔موتی لال

ہریش تیواری

آنجہانی بمل رائے کی فلم 'دیوداس' کا ذکر ہو تو چنّی بابو کے طور پر اداکار موتی لال بروقت یاد آجاتے ہیں۔پھر یاد آتی ہے فلم 'جاگتے رہو' میں 'زندگی خواب ہے..' گیت کے ساتھ گھومتے ہوئے شرابی کی۔ان دونوں فلمی مناظر کے کردار کو یہ کہہ کر ناظرین کبھی نہیں بھول پاتے کہ 'ارے یہ تو موتی لال ہیں...!' اور اس وقت فلم 'چھوٹی چھوٹی باتیں' کے سیٹ پر کہی گئی ان کی یہ بات یاد آجاتی ہے 'میں اداکاری نہیں کرتا، کردار بن جاتا ہوں'

ان دنوں وہ اپنی فلم 'چھوٹی چھوٹی باتیں' کو بنانے میں جتنے مصروف تھے، اتنے ہی پریشان بھی تھے۔سچ کہوں تو وہ ان کے ایسے برے دن تھے کہ ان کے رئیسانہ مزاج سے متعلق جہاں بیشمار کہانیاں پھیلی ہوئی تھیں، وہیں ان کی معاشی بدحالی اور تنگ دستی کی چھری کی دھار کی طرح نوکیلے حصے ان کے بے پناہ مداحوں کا دل چیر رہے تھے۔شیورلینڈ جیسی مہنگی اور شاندار کار سے آنے جانے والے موتی لال ان دنوں ٹیکسی میں سمٹ کر بیٹھتے تھے۔اسکاچ کی بوتل میں کنٹری بھر کر پینے کا ان کا اور اداکار چندر موہن کا قصہ مشہور ہو چکا تھا، مگر ان کی رئیسی کے قصوں کے دھاگے آج بھی ان کے بیشمار مداحوں کے ذہن پر چھائی ہوئی ہے۔ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے وہ وہی موتی لال تھے۔جن سے مہاراجہ آف کشمیر نے گزارش کی تھی کہ وہ 'ڈربی ریس' میں اول آنے والے گھوڑے کو عزت بخشنے کے لیے، اس کی لگام پکڑ کر ڈائس پر لے چلیں تو موتی لال نے مہاراجہ کو یہ کہہ کر ڈانٹ دیا کہ 'یہ تو سائسوں کا کام ہے، رئیسوں کا نہیں...' یقیناً وہ موتی لال کا زمانہ تھا، جب راستہ میں کام رکوا کر اپنے دوست کو پانچ منٹ انتظار کرنے کی تاکید کر کے وہ ورلی کے ایک فلیٹ کے اندر چلے گئے، جب پندرہ منٹ دیر سے واپس لوٹے تو دوست سے معافی مانگتے ہوئے بولے 'اسّی ہزار روپے ہارنے میں دس منٹ کی دیر تو ہو گی ہی...؟'

۱۹۳۰ء کی دہائی میں انڈین نیوی کے عہدہ پر کام کرنے والے موتی لال دہلی سے ممبئی تشریف لائے۔چوپاٹی میں کسی فلم کی شوٹنگ چل رہی تھی، وہ دلچسپی کے ساتھ تماش بینوں کی بھیڑ میں کھڑے ہو گئے تو سب انہیں دیکھنے لگے۔فلم کے ہدایت کار نے ان سے درخواست کی

کہ کیمرہ کی طرف پیٹھ پھیر کر ایک شاٹ دے دیں فوراً راضی ہو گئے۔ جب شاٹ لیا جانے لگا تو سب کے منہ کھلے رہ گئے 'باپ رے، اس کا تو کوٹ بھی اداکاری کرتا ہے...!' یہیں سے نیوی کی بجائے وہ فلموں میں چمکنے لگے، اپنے نام کی طرح..!

یہ وقت سہگل سریندر، پرتھوی راج کپور اور سہراب مودی جیسے اداکاروں کا تھا جن کی طرز اداکاری ڈرامائی اور پارسی تھیٹر سے متاثر تھی۔ موتی لال نے سنجیدہ اور حقیقی اداکاری سے فلموں میں ایسی تازگی بھر دی، جس نے باکس آفس پر مقناطیس جیسا کام کیا۔ اپنی پہلی فلم 'شہر کا جادو' سے ہی وہ اسٹار بن گئے۔ اس وقت کی گلیمرس اداکارہ سویتا دیوی کے ساتھ ان کی ہٹ جوڑی بن گئی، جو 'ڈاکٹر مدھوریکا'، 'کل ودھو' جیسی کئی فلموں میں چمکیں۔ ان کی مقبولیت کا ڈنکا کیسے بج رہا تھا، اس کا اندازہ اس بات سے ہی لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۳۵ء میں جب موتی لال کی شادی ایک لیڈی ڈاکٹر سے ہوئی تو اس میں شریک ہونے کے لئے بلبلِ ہند کہلائی جانے والی سروجنی نائیڈو خصوصی طور پر ممبئی آئیں۔ فلم ساز و ہدایت کار محبوب خان، عبدالرشید کاردار اور رنجیت فلم کمپنی کے چندو لال شاہ نے باکس آفس پر بلندی حاصل کرنے والی جو بھی فلمیں بنائیں، ان کا بغیر موتی لال کے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جن لوگوں نے ستیہ جیت رے کی فلم 'ناٹک' دیکھی ہے، انہیں وہ منظر یاد ہوگا جب فلم کا ہیرو نوٹوں بھری سڑکوں پر چلتا ہے، اس کے آس پاس نوٹوں کے پیڑ اور پہاڑ کھڑے ہیں، آسمان سے بارش بھی نوٹوں کی ہی ہو رہی ہے...! بھلے ہی ستیہ جیت رے کے ہیرو اتّم کمار رہے ہوں، مگر ہمیں وہ موتی لال ہی لگے، جن پر نوٹوں کی بارش تو ہو رہی تھی، مگر ریس اور جوے کی نالیوں سے ساری دولت نکل بھی رہی تھی۔

۱۹۴۰ء کی دہائی گزرتے گزرتے موتی لال کو ان کی عمر نے کرارہ جھٹکا دیا۔ باکس آفس پر وہ بطور ہیرو مسترد کر دیے گئے۔ مگر ان میں جو عجیب و غریب اداکارانہ صلاحیت تھی، وہ معاون اداکار کے طور پر فلم بینوں پر جادو جیسا اثر کرتی تھی۔ 'جاگتے رہو، پیغام، مسٹر سمپت، اناڑی، دیوداس' جیسی فلمیں جس نے دیکھیں، وہ موتی لال کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ ان کی شخصیت میں رئیسوں جیسے انداز تھے، جسے ایک غریب پوسٹ مین کے کردار میں وہ ویسی ہی سنجیدگی سے چھپا لیتے تھے جیسے معروف اداکارہ مینا کماری اپنے داہنے ہاتھ کی چھٹی انگلی کا فلم بینوں کو پتہ ہی نہیں چلنے دیتی تھیں۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں بنی بمل رائے کی کلاسیکل فلم

'پرکھ' کو یاد کیجیے جو موتی لال کی بہترین اداکاری کی وجہ سے ہمیشہ یاد کی جائے گی۔

۱۹۵۰ء کی دہائی آتے آتے ان کی حالت پھر اس ہیرو جیسی ہو گئی۔ جس سے آس پاس کے نوٹوں کے پہاڑ اچانک کھسک گئے۔ اب وہ نوٹوں کے بجائے معاشی تنگی کی اس پتھریلی سڑک پر تھے جو پیروں کو لہولہان کر دیتی ہے۔ عزت، شہرت اور جی حضوری کرنے والوں کا دربار قصۂ پارینہ بن گیا۔ پھر بھی موتی لال ہمت نہیں ہارے۔ انہوں نے مشکلات سے زور آزمائی کرتے ہوئے فلم 'چھوٹی چھوٹی باتیں' مکمل کیں، مگر اب وہ باکس آفس پر بے آبدار موتی ہو گئے تھے۔ حالانکہ ایک ریٹائرڈ شخص کے طور پر انہوں نے فلم میں پھر زوردار جلوہ دکھایا، مگر دیکھنے والے ہی نہ ہوں تو کیا کیا جائے؟

ان کی صحت بھی تیزی سے گرتی جا رہی تھی، انہوں نے اپنے عزیز دوستوں کو تاکید کی تھی کہ وہ ان کی صحت کے بارے میں بات نہ کریں، لیکن پھر بھی بات پھیل گئی، جس کے برے نتائج کے طور پر انہیں معاون اداکار کا بھی کام ملنا بند ہو گیا۔ اس وقت یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی موتی لال ہیں جو کبھی فلم سازوں کو یہ کہہ کر بھگا دیتے تھے کہ 'ایک لاکھ روپے میں تو میرا کوٹ بھی اداکاری نہ کرے'۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ آج سے پچاس سال پہلے ایک لاکھ روپے کا کیا مطلب ہوتا ہوگا۔

ان کے عزیز دوست اور فلم 'چھوٹی چھوٹی باتیں' میں بطور ہیروئن رہیں نادرہ آنکھوں میں پانی بھر لائی تھیں۔ وہ موتی لال کی تعزیتی نشست میں آئے ہوئے صرف تین چار صحافیوں کو بتا رہی تھیں کہ 'ان کی میت اٹھانے کے لیے پیسہ نہ تھا، ایسے وقت میں جو گھی کا ڈبہ ہوتا ہے اس کا بھی انتظام نہیں تھا'

☆☆☆

فطری اداکار۔ بلراج ساھنی

بی۔ایم۔ملہوترہ

ادب اور ایکٹنگ بلراج ساہنی کے انتہائی پرجوش اور جبلّتی شوق تھے۔جو ہندی فلموں کے ایک ممتاز ستارے تھے۔مختلف نوعیّتوں کے کردار ادا کرکے وہ کامیابی کی بلندیوں تک پہنچ گئے۔ان کرداروں میں پختہ ہیرو سے لیکر کریکٹر رول تک شامل ہیں۔اپنے فلمی کریر کے دوران انہوں نے ۱۲۵ فلموں میں کام کیا اور ۱۹۴۰ء کے وسط سے ۱۹۷۰ء کی ابتدا تک تین کامیاب دہائیوں تک فلمی افق پر نمایاں رہے۔انکا چہرہ دمکتا ہوا اور آنکھوں میں چمک تھی۔اور انکی اداکاری سے سماجی آگہی سے پر انکی بہت قابل شخصیت کا انعکاس ہوتا تھا۔

انکا جنم یوم مئی یعنی یکم مئی ۱۹۱۳ء کو راولپنڈی (اب پاکستان میں) میں ہوا۔وہ اپنے والد ہربنس لال ساہنی کے پہلے بیٹے تھے۔ان سے پہلے انکی پانچ بہنیں پیدا ہوچکی تھیں۔ان کے والد ایک کامیاب بیوپاری تھے۔ان کا نام یُدھشٹر رکھا گیا لیکن چونکہ ان کی ایک پھوپی کی زبان پر یہ نام نہیں چڑھتا تھا اور وہ اسے رجسٹر بول دیتی تھیں لہذا ان کا نام بدل کر بلراج رکھا گیا۔

ایک مقامی اسکول سے نمایاں طور پر میٹرک پاس کرنے اور وظیفہ حاصل کرنے کے بعد انہوں نے ۱۹۳۴ء میں لاہور کے مشہور گورنمنٹ کالج سے انگریزی میں ایم۔اے کیا۔اسکول اور کالج کے زمانے میں انہوں نے چھوٹے ڈرامے لکھے اور انہیں ڈائریکٹ اور پیش کیا۔انکی لکھی ہوئی نظمیں کالج کے میگزین راوی میں شائع ہوئیں۔کالج کی تعلیم کے دوران انہوں نے The Man Who Ate the Popomack'' نامی ڈرامے میں ایک زنانہ رول ادا کیا کیونکہ اس زمانے میں طالبات اس قسم کی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیتی تھیں۔کالج کے اپنے آخری سال میں وہ یونیورسٹی اسٹوڈینٹس یونین کے صدر رہے۔

۱۹۳۶ء میں انہوں نے دمینتی سے شادی کی جو انکے انگریزی کے لکچرار اور دوست جسونت رائے کی ہمشیرہ تھیں۔انکے والد کی خواہش تھی کہ وہ راولپنڈی میں رہیں اور خاندانی کاروبار میں شامل ہوجائیں۔لیکن بلراج کی اپنی ہی ترجیحات اور امنگیں تھیں۔اس سے پہلے بھی کالج میں داخلے کے وقت اپنے والد کی خواہش

کے خلاف انہوں نے کامرس اور اکنامکس کے بجائے انگلش لٹریچر پڑھنے کو ترجیح دی تھی۔

اپنے مضبوط رجحان اور سر اٹھاتی ہوئی صلاحیت کے دباؤ میں انہوں نے ۱۹۳۷ء کے آخر میں راولپنڈی کو خیر باد کہہ دیا اور اپنی تعلیم یافتہ اہلیہ کے ساتھ تخلیقی ڈرامے لکھ کر عملی زندگی گذارنے کا فیصلہ کیا۔اس کے بعد آٹھ سال تک دونوں انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن (IPTA) میں شامل رہے۔انکی زندگی پر پیچ اور غیر معمولی واقعات سے گزری۔

لاہور میں بطور آغاز بلراج اور انکے کالج کے دوستوں، پریم بھاٹیہ، جگ پردیش چندر اور بی۔پی۔ایل اور فریڈا بیدی (فلم اداکار کبیر بیدی کے والدین) نے مل کر ''Monday Morning'' نام سے ایک ہفت روزہ اخبار نکالا۔اس اخبار کو شروع کرکے انہوں نے دو بڑے انگریزی اخبارات The Tribune اور سول اینڈ ملٹری گزٹ کی کمی کو پورا کرنا چاہا تھا جو پیر کے روز شائع نہیں ہوا کرتے تھے۔تاہم اس کام میں انہیں ناکامی حاصل ہوئی۔

اس واقعہ کے تھوڑے عرصے کے بعد میاں بیوی شانتی نیکیتن چلے گئے جہاں بلراج نے ہندی ٹیچر کی حیثیت سے کام کیا۔وہاں رہتے ہوئے انہوں نے ہندوستان کے اولین نوبل انعام یافتہ رابندرناتھ ٹیگور کی خوبیوں کا براہ راست مشاہدہ کیا جو کثیر جہت جینیئس تھے۔کم وبیش ایک سال بعد وہ واردھا کے نزدیک واقع سیواگرام چلے گئے اور وہاں گاندھی کی بنیادی تعلیم کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کے کام میں مصروف ہوگئے۔آشرم میں گاندھی جی کی موجودگی کی وجہ سے انہیں بلند اقدار،اصولوں اور ضابطوں کو خود میں ضم کرنے کا موقع ملا جو کہ اس عظیم سنت اور سیاست داں کے اصول اور عمل تھے جنہیں بعد میں بابائے قوم کا اعزاز حاصل ہوا۔

گاندھی جی کی اجازت سے دوسری جنگ عظیم کے دوران بلراج لندن گئے اور وہاں چار سال تک ہندوستانی بی۔بی۔سی میں اناونسر کی حیثیت سے کام کیا۔لندن میں رہتے ہوئے انہوں نے کارل مارکس کی داس کیپیٹل اور دوسرے کمیونسٹ لٹریچر کا مطالعہ کیا اور بائیں بازو کے انٹلیکچول بن گئے۔انہوں نے کہا کہ انکے اصلی گورو ٹیگور، گاندھی، مارکس، لینن اور سٹینس لاوسکی ہیں۔ایک اداکار بننے کے لئے انہوں نے کسی ادارے سے تربیت حاصل نہیں کی بلکہ سٹینس لاوسکی کی کتاب ''An Actor Prepares'' سے استفادہ کیا جسے وہ اپنی بائبل مانتے تھے۔

جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد وہ ہندوستان واپس آ گئے اور بمبئی پہنچنے پر IPTA میں شامل ہو گئے جہاں انہوں نے بہت سے کمیونسٹ اور ترقی پسند رائیٹرس کے ساتھ کام کیا جیسے چیتن آنند اور خواجہ احمد عباس۔ بلراج نے اپٹا میں بہت سے ڈرامے لکھے، انہیں ڈائریکٹ کیا اور ان میں اداکاری کی جن میں ''انسپیکٹر جنرل'' اور ''ڈولس ہاوس'' شامل ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ خواجہ احمد عباس کے ڈرامے زبیدہ کو ڈائریکٹ کرتے ہوئے وہ ایک پوری بارات پارٹی کو اسٹیج پر لے آئے جس کے ساتھ پیتل کا روایتی بینڈ تھا اور دولہا سفید رنگ کے گھوڑے پر سوار تھا۔ اپٹا کے ایک اور ڈرامے ''آخری شمع'' میں انکا ادا کیا ہوا مرزا غالب کا کردار ہر اعتبار سے تکمیل کا حامل تھا جو بلراج کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔

انکی پہلی فلم ''دھرتی کے لال'' تھی جسے اپٹا نے پروڈیوس اور خواجہ احمد عباس نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ اس فلم میں انہوں نے بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ اور یہ ۱۹۴۵ء میں بنی تھی۔ فلم کا موضوع بنگال کا قحط تھا جس میں بلراج نے ایک مفلس اور کنگال کسان کا رول کیا اور فلم میں دمنیتی انکی بیوی بنی تھیں۔ ایک نادار اور بھوکا کسان نظر آنے کے لئے انہوں نے بہت دنوں تک محض ایک وقت ہی کھانا کھایا۔ انکا لباس بے حد مختصر اور چہرہ اور جسم بہت لاغر نظر آتے تھے۔ شوٹنگ سے ایک دن پہلے کپڑے پر مٹی اور کیچڑ لگا لیتے تھے۔ ملک اور ملک سے باہر فلم اور بلراج کی اداکاری کی بے حد تعریف کی گئی۔

انہوں نے اتنے ہی مستند انداز میں بہت سے غیر معمولی کردار ادا کئے۔ بمل رائے کی مشہور کلاسیکی فلم دو بیگھہ زمین میں رکشا والے کا رول ادا کرنے کے لئے وہ سچ مچ چند روز تک رکشا والوں کے ساتھ رہے اور نہ صرف مہارت کے ساتھ رکشا کھینچا بلکہ انکے مخصوص انداز بھی سیکھے۔ فلم کے شائقین آج بھی اُس منظر کی میٹھی یاد کے اسیر ہیں جس میں ایک شکستہ حال رکشا والا ایک بے رحم شہری سواری کے دباؤں ڈالنے پر کلکتہ کی گرم سڑکوں پر ایک گھوڑا تانگے سے آگے نکلنے کے لئے دوڑتا ہے۔ فلم میں بلراج کی غیر معمولی اداکاری پر انہیں ایک کامل اور پختہ کار المیہ کردار نگار تسلیم کر لیا گیا۔ وہ لاکھوں فلم بینوں اور ورکروں کے چہیتے بن گئے اور انہیں ''پاپولر ایکٹر'' کا نام ملا۔

اسی طرح ٹیگور کی کہانی کے میوہ فروش ایک سادہ لوح پٹھان کابلی والا (۱۹۶۱ء) کا رول حقیقی انداز میں پیش کرنے کے لئے انہوں نے کئی دنوں تک مقامی پٹھانوں کے ساتھ رہ کر انکے لب و لہجے اور بولنے کے

طریقوں سے آگاہی حاصل کی۔ یہ کردار انہوں نے فلم اور اسٹیج دونوں پر بڑی کامیابی کے ساتھ ادا کئے۔

۱۹۵۱ء میں انہیں کمیونسٹوں کے خلاف ایک کارروائی میں جیل بھیج دیا گیا جبکہ اُسی دوران کے آصف کی فلم ہلچل میں وہ ایک جیلر کا رول کر رہے تھے جسکے لئے ایک خصوصی اجازت کے تحت شوٹنگ کے لئے پولیس انہیں جیل سے اسٹوڈیو لاتی اور واپس لے جاتی۔ خوش قسمتی سے انہیں جلد ہی رہا کر دیا گیا جس کے بعد انہوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ ضیا سرحدی کی فلم ''ہم لوگ'' میں ایک تلخ مزاج بے روزگار نوجوان کا رول ادا کیا۔ اس سے قبل وہ دمنیتی کی بے وقت موت کی مصیبت سے دوچار ہو چکے تھے جو فلم دھرتی کے لال کی شوٹنگ کے دوران گندہ پانی پینے کی وجہ سے مختصر علالت کے بعد گذر گئی تھیں۔ شادی سے لیکر اپنے آخری وقت تک وہ بلراج کی ہر وقت کی ساتھی رہی تھیں۔ وہ بھی اپٹا کے کچھ ڈراموں اور فلموں میں کام کر چکی تھیں اور پرتھوی تھیٹر کے ڈرامے دیوار میں بھی انہوں نے رول کیا تھا۔ اس صدمے سے نبرد آزما ہونے کے لئے بلراج ساہنی نے خود کو اپٹا کی سرگرمیوں، سماجی مسائل اور ٹریڈ یونینوں کے ورکروں کے حقوق اور امنگوں کے لئے وقف کر دیا۔

اس کے بعد انہوں نے اپنی ایک کزن سنتوش سے شادی کر لی جنہوں نے انکا جذباتی استحکام بحال کیا۔ انہیں اپنے صاحبزادے پریکشت، بیٹی شبنم اور بھائی بھیشم سے بھی جذباتی سہارا ملا۔ پریکشت جنہوں نے اجئے ساہنی اور بعد میں اپنے اصل نام سے فلموں میں کام کیا آج فلم اور ٹی۔ وی کے پختہ اداکار ہیں۔ باپ بیٹوں کی جوڑی نے دو فلموں ''پوتر پاپی'' اور ''اودھم سنگھ'' میں ایک ساتھ کام کیا۔ بھیشم ساہنی جو ایک رائیٹر اور ایکٹر ہیں انہوں نے ٹیلی سیریل ''تمس'' کے ذریعے نام پایا جسے خود انہوں نے لکھا اور اس میں ایک رول بھی ادا کیا جو ایک گہرا کردار تھا۔

بلراج نے ۳۷ سال کی عمر میں باقاعدگی کے ساتھ فلموں میں کام کرنا شروع کیا۔ انڈسٹری کے کچھ لوگ پیٹھ کے پیچھے یہ کہتے ہوئے ان کا مذاق اڑاتے تھے کہ انکی عمر زیادہ ہے، بہت دُبلے پتلے ہیں اور اتنے گنجے ہیں کہ فلموں میں کامیاب نہیں ہو سکتے لیکن انہوں نے اپنے اس مقولے سے انہیں غلط ثابت کر دیا کہ ''Never says die''۔ انہوں نے پختہ عزم کے ساتھ سخت محنت کی اور ''ہم لوگ'' اور ''دو بیگھہ زمین'' فلموں میں شاندار کام کیا جس نے انہیں اسٹار بنا دیا۔

انکا یقین تھا کہ اصل چیز نتیجہ نہیں بلکہ جدو جہد ہے۔ ''سیکھنے کے لئے جیو اور جینا سیکھو''۔

یہ ایک آزمودہ سنہری اصول ہے کہ آرٹ کو چھپاٹا آرٹ ہے اور بلراج ساہنی اس کی ایک مثالی علامت تھے۔انہوں نے فلموں میں طرح طرح کے یادگار رول ادا کئے جیسے''سیما''،''وقت''،''حقیقت''،''انورادھا''،''لاجونتی''،''ان پڑھ''،''پرایادھن''،''کٹھ پتلی''، ''پردیسی''،''ہمراز''،''گرم کوٹ'' اور''گرم ہوا''۔فلم''گرم ہوا'' ان کے انتقال سے کچھ ہی پہلے مکمل ہوئی۔اس فلم میں انہوں نے جوتے کے ایک بیوپاری کا رول ادا کیا جو آگرہ کے ایک مسلم خاندان کا سربراہ تھا۔اس کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ تقسیم کے موقع پر ہونے والے فسادات کی صورت حال میں وہ ہندوستان میں رہے یا پاکستان چلا جائے۔تمامتر نامساعد حالات کے باوجود اس نے پختہ ارادے کے ساتھ پاکستان جانے سے انکار کر دیا۔ یہ ایک بڑا ہی حساس اور انکا آخری رول تھا جسے بجا طور پر انکا شاہکار رول کہا جا سکتا ہے۔

صاحب نظر فلم بین اور نقاد بلراج کو معدودے چند فطری اداکاروں میں سے ایک مانتے ہیں۔جیسا کہ انکی درخشاں اور شاندار اداکاری سے ظاہر ہے۔وہ قدرتی طور پر خود کو حقیقت میں ڈھال کر اداکاری کرتے تھے۔

اپنی زندگی کے آخری سالوں میں انہیں اپنی مادری زبان میں دلچسپی پیدا ہوگئی یعنی پنجابی زبان، پنجابی ادب اور پنجابی کلچر۔انہوں نے گورمکھی لپّی میں پنجاب ٹائیپ رائٹر پر ٹائپ کرنا سیکھا اور بہت سے مضامین، ریویو، مختصر کہانیاں، نظمیں اور ڈرامے لکھے۔روس اور پاکستان کے سفر کے بعد انہوں نے دو سفرنامے بھی لکھے۔روسی سفرنامے پر انہیں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ بھی دیا گیا اور انہوں نے اپنی سوانح حیات بھی لکھی یعنی۔ایک غیر جذباتی ڈائیری۔انہیں پدم شری ایوارڈ سے بھی نوازا گیا اور انہیں نئی دہلی کی جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے موقع پر خطبہ پڑھنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔۱۳/اپریل ۱۹۷۳ء کو انہوں نے آخری سانس لی۔

☆☆☆

فلمی دنیا کا افسانوی کردار۔امیتابھ بچن

رشید انجم

امیتابھ بچن___Legendary Icon (افسانوی بت شکن)۔فلم انڈسٹری کا شہنشاہ۔بین الاقوامی شخصیت۔تمام فن کارانہ جوہر سے آراستہ۔کشمیر سے کینا کماری تک ہر فلم شائق کے دلوں پر جن کا راج۔صبح سے رات گئے تک اس عمر میں بھی ان کے بنگلے کے آگے ان کی ایک جھلک پانے کو ان کے چاہنے والوں کا مجمع۔مادام توسادلندن میوزیم میں جن کا موم کا مجسمہ نصب۔بنگال میں ان کے دیوانوں نے مندر بنا کر ان کی مورتی قائم کی۔اداکار۔تقریبات کے میز بان۔ اناؤنسر۔ڈرامہ آرٹسٹ۔فلمساز۔قماز ساماجک شخصیت۔سوشل اور گھریلو انسان وغیرہ وغیرہ___ اتنا کچھ ان کی ذات سے وابستہ کر دیا گیا کہ اس اشتہاری اشیا کا بابانگِ دہل پروپیگنڈہ ہم ہر ٹی وی چینل پر دیکھتے ہیں جس میں دراصل کوئی اصلیت نہیں ہوتی، محض بھرم ہوتا ہے۔امیتابھ بچن واقعی ایسے ہی فنکار ہیں جیسا کہ ان کی شخصیت کو ایک اشتہاری شئے کی مانند میڈیا کے توسط سے ہمارے روبہ روپیش کیا جاتا رہا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر فلم مبصرین اپنی رائے میں اختلاف رکھتے ہیں۔اُن کی ذات متنازعہ رہی ہے۔امیتابھ بچن میں یہ انا پرستی اس دور میں بیدار ہوئی جب وہ عمر کے پچاس منازل طے کر چکے تھے۔اب جبکہ وہ عمر کی سترھویں سال کی جانب گامزن ہیں تو یہ انا پرستی ان پر پوری طرح حاوی ہو چکی ہے۔اور وہ زیادہ سے زیادہ خود کو میڈیا کے روبہ رو رکھنے کے لئے بیتاب رہتے ہیں۔ ہر وہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے جب انہیں کیمرے کے آگے خود کو دکھانے کی معمولی دعوت بھی ملے۔نہ ملے تو وہ موقع نکالتے ہیں۔وہ معمولی اشتہاری فلمیں بھی کر گزرتے ہیں جو اُن جیسے قد آور فنکار کو نہ صرف مضمکہ خیز بناتی ہیں بلکہ دیکھنے والے کو ان کی سطحیت کا احساس بھی دلاتی ہیں۔ آیئے ان کے فن، اُن کی ذات، ان کی فلموں سے وابستگی اور ان کے شخصی کردار کو ذرا قریب اور گہرائی سے جاننے کی کوشش کریں کہ آخر انہیں صدی کا سب سے عظیم فنکار کیوں مان لیا گیا اور اُن کے فنِ اداکاری میں ایسی کیا انفرادیت ہے کہ وہ فلم صنعتوں کے شہنشاہ کے خطاب سے نوازے گئے اور کیا خوبی ہے کہ دوسرے

ادا کاروں کے مقابل انہیں آج بھی سراہا جاتا ہے۔انہیں سپر اسٹار سے کم درجے پر نہیں رکھا جاتا اور اس عمر میں بھی وہ کون سے لوگ ہیں جوان کے پرستار ہیں؟

ڈاکٹر ہری ونش رائے بچن الہٰ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ ہندی ساہتیہ میں ان کا اہم مقام ہے۔وہ نہ صرف بہترین کوی تھے بلکہ ایک مہذب اور شریف انسان بھی تھے۔''مدھوشالا''۔جیسی نظم لکھ کر وہ شہرت وستائش کے حقدار تسلیم ہوئے۔ان کی اہلیہ تیجی بچن بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ'نئی روشنی اور جدید ماحول کی پروردہ ہونے کے باوجود نرم مزاج،شوہر پرست اور کافی حد تک گھریلو خاتون تھیں۔چونکہ بچن خاندان الہٰ آباد کا ہی رہنے والا تھا،لامحالہ ان کا تعلق آنند بھون سے بھی ہوا اور نہرو خاندان کے قریبی ساتھی میں شمار ہوئے۔پنڈت جواہر لال نہرو سے ڈاکٹر ہری ونش رائے بچن اور تیجی بچن کی قربتیں رہیں۔بعد ازاں ہندوستان کی پہلی خاتون وزیر اعظم اندرا گاندھی سے بھی ان کے رشتوں کی تجدید ہوئی اور پھر پہلے نوجوان وزیر اعظم راجیو گاندھی بچن خاندان کے سب سے بڑے بیٹے امیتابھ بچن کے اتنے نزدیک ہوئے کہ جب راجیو گاندھی،بوفورس توپ کی مبینہ خریداری کے واقعہ میں ملوث ہوئے تو امیتابھ بچن پر بھی الزام عائد ہوئے اور وہ عدالتی الجھنوں کا برسوں شکار رہے۔

نہرو خاندان سے ان کے تعلقات کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ امیتابھ بچن بنگلور میں فلم ''قلی'' کی شوٹنگ کے دوران زخمی ہوکر بمبئی کے بریچ کینڈی اسپتال میں داخل تھے تو وزیر اعظم اندرا گاندھی دہلی سے انہیں دیکھنے بمبئی آئی تھیں مگر بوفورس واقعہ کے بعد ان خاندانوں میں فاصلے پیدا ہوگئے۔

اس بچن خاندان میں ۱۱/اکتوبر ۱۹۴۲ء کو الہٰ آباد میں جو بیٹا پیدا ہوا اسے خاندان کے لئے نیک فال مانا گیا اور اسی مناسبت سے والدین نے اس کا نام انقلاب تجویز کیا مگر سمترا نندن پنت نے اس نام کو نا پسند کیا اور امیتابھ بچن نام رکھ دیا گیا۔ان کی راشی تُلا یعنی میزان ہونے کے سبب یہ نام تجویز ہوا تھا۔ امیت = یعنی کثیر الجہات۔تابھ = غیر محدود۔امیتابھ یعنی غیر محدود درونقوں کا مالک ___ شاید اس نام کی معنویت ہی ہے کہ وہ عمر کا ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد بھی اپنی آب و تاب اسی طرح برقرار رکھنے میں کامیاب رہے جس طرح وہ ''زنجیر'' کے وقت مطلعِ ذوق پر بھرپور سورج کی مانند طلوع ہوگئے تھے۔

ابتدائی تعلیم نینی تال کے شیروڈ اسکول میں ہوئی پھر انہیں سینٹ میری اسکول بمبئی میں داخلہ مل گیا۔کلاس روم میں اگر وہ عرق ریز طالب علم تھے تو کھیل کے میدان میں اتنے ہی Energetic کھلاڑی۔دورانِ تعلیم

اسکول کے ڈراموں میں بھی حصہ لینے لگے تھے۔اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دہلی کے کروڑی مل کالج سے بی ایس سی میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور شاویلیس میں ملازم ہوگئے۔انہوں نے کلکتہ کی جہاز راں فرم برڈ اینڈ کمپنی میں بھی FreedBroker کے طور پر کام کیا اور اس طرح وہ اپنے والدین کا سہارا بن گئے۔

ان کا پہلا شوق تھیٹر تھا۔یہ شوق انہیں اپنے والد سے ملا تھا۔والد کی ''مدھوشالا'' پڑھ پڑھ کر امیتابھ میں ایک فنکار انگڑائی لینے لگا تھا اور وہ اس فنکار کو اپنے اندر کروٹ لیتے محسوس کرتے تھے لیکن کوئی راہ واضح نہیں تھی۔ایسے ایک دن اجیتابھ بچن نے امیتابھ کو ایک میگزین دیا جس میں ایک فارم برائے فلم اداکاری شائع کیا گیا تھا۔درخواست کے ہمراہ خواہش مند کے فوٹوگراف بھی طلب کئے گئے تھے۔اجیتابھ نے ہی ایک معمولی کیمرے کا انتظام کیا اور ان کی تصاویر اتار کر فارم کے ساتھ بمبئی بھیجدیں۔بمبئی فلم صنعت میں خود کو منوانا آسان کب تھا؟ سب سے بڑی مشکل ان کا غیر معمولی چھ فٹ تین انچ کا قد تھا۔چھریرا بدن اور Unconventional Look ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔اگر کچھ تھا ان کا سرمایہ تو وہ ان کی آواز تھی۔یہ آواز Rough بھی تھی اور Tough بھی۔اس کے علاوہ ان کی شخصیت میں اور کوئی پرکشش خوبی نہ تھی۔اپنی آواز کا فائدہ اٹھانے کی غرض سے انہوں نے آل انڈیا ریڈیو کی انتخابی مجلس میں شرکت کی اور آواز کی بدولت وہ منتخب ہوگئے۔کچھ عرصہ بطور ریڈیو اناؤنسر کی خدمات انجام دیں مگر یہ اُن کی منزل نہیں تھی۔والد اُن کے خوابوں سے انجان نہ تھے۔خواجہ احمد عباس چونکہ ادیب ہونے کے علاوہ فلم ساز بھی تھے۔ہری ونش رائے بچن اسی ناطے خواجہ احمد عباس کے شناسا تھے۔خواجہ احمد عباس اپنی فلم کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ ہری ونش رائے بچن نے اپنے بیٹے کی خواہش کا اظہار کر دیا اور خواجہ صاحب ان کی درخواست کو رد نہ کر سکے۔۱۹۶۹ء کی فلم ''سات ہندوستانی''۔میں امیتابھ کو ساتواں ہندوستان کا کردار مل گیا۔اس فلم سے امیتابھ کو کچھ فائدہ نہیں ملا لیکن اتنا ہوا کہ وہ فلم صنعت میں ایک نو شناخت اداکار کی حیثیت سے فلمسازوں کی توجہ مبذول کرنے میں کامیاب ہوگئے۔اس کا ثبوت رشی کیش مکھر جی جیسے قابل ہدایت کار کی نظروں میں آنا تھا۔۱۹۷۰ء کی فلم ''آنند'' میں اس وقت کے سپر اسٹار راجیش کھنہ کے ساتھ معاون اداکار ہونا قبول کیا تھا۔یہ وہ دور تھا جب معاشی اعتبار سے بمبئی شہر میں ان کا کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا اور نہ ایسا آسرا جو انہیں جہدِ مسلسل پر آمدہ رکھ سکے۔اس کسمپرسی میں محمود اور ان کے بھائی انور امیتابھ کا

سہارا بنے۔ ان دونوں بھائیوں نے نہ صرف ان کی مالی کفالت کی بلکہ ہر وہ ضرورت پوری کی جو تقاضۂ انسانیت ہوتی ہے۔ برسوں امیتابھ ان کے گھر میں رہے اور جو فلمیں انہیں ملتی رہیں ان سے معقول آمدنی نہ تھی۔ پھر بھی وہ صحیح وقت کے منتظر رہ کر فلموں میں کام کرتے رہے۔

فلم ''آنند'' میں ان کے کام کو بھی سراہا گیا اور انہیں بحیثیت اداکار ایک تابناک مستقبل کی شہادت بھی ملی مگر ابھی منزل بہت دور تھی۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۳ء تک تین سال میں امیتابھ نے ۱۶ فلمیں بطور ہیرو اور معاون اداکار کیں۔ ۱۹۷۱ء ''پروانہ''، ''پیار کی کہانی''، ''ریشماں اور شیرا''، ''سنجوگ''، ''گڈی''۔ ۱۹۷۲ء ''بامبے ٹو گوا''، ''بنسی اور برجو''، ''ایک نظر''، ''راستے کا پتھر''، ''جہان'' (بنگلہ)۔ ۱۹۷۳ء ''گہری چال''، ''بندھے ہاتھ''، ''نمک حرام''، ''سوداگر'' اور ''ابھیمان''۔

فلم ''پروانہ'' میں ان کا نگیٹو رول تھا۔ ''گڈی''، ''ریشماں اور شیرا'' اور ''نمک حرام''۔ میں وہ مختصر اور معاون اداکار تھے۔ فلم ''گڈی'' کے سیٹ پر پہلی بار ان کا تعارف جیا بھادری سے ہوا تھا اور وہ پہلی ملاقات ان کے دل پر اثر کر گئی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جیا بھادری اپنی پہلی ہی فلم ''گڈی'' سے صفِ اول کی اداکارہ بنیں اور امیتابھ بچن لگاتار فلاپ ہیرو رہے۔ شاید اسی سبب بہ ظاہر اندرونی احساسِ نفس کو موضوع بنا کر رشی کیش مکھر جی نے ''ابھیمان'' تخلیق کی تھی۔ یہ فلم اوسط رہی تھی اور جیا بھادری اور امیتابھ بچن کی جوڑی کو پسند کیا گیا تھا۔

مسلسل ناکامی کو دیکھتے ہوئے محمود نے اُن کے لئے فلم ''بامبے ٹو گوا'' بنائی تھی۔ ارونا ایرانی ان کی ہیروئن تھیں۔ کم بجٹ کی اس مسالہ فلم نے بھی انہیں کوئی بہتر بریک نہیں دیا۔

۱۹۷۳ء میں ۱۷ فلموں کے فلاپ اور اوسط اداکار کو آخر وہ موقع مل ہی گیا جس کی اسے تلاش تھی۔ سلیم جاوید نے بہت مہارت کے ساتھ وہ اداکار تخلیق کیا جس نے فلم صنعت میں اس فنکار کو استحکام دلایا جو آگے چل کر بمبئی سنیما کا بلاشرکت غیرے ''شہنشاہ'' بن کر منظرِ فلم پر ابھرا۔ فلم ''زنجیر'' نے راتوں رات امیتابھ بچن کو سپر اسٹار کے قماز مقام پر پہنچا کر متمکن کر دیا۔ یہیں سے راجیش کھنہ کا زوال شروع ہوا اور امیتابھ بچن Angry youth کے باغیانہ لقب کے ساتھ مطلعِ سنیما پر طلوع ہوئے۔

پورے سماج، اس کے نظام اور System کے خلاف آمادۂ پیکار ہوئے ''زنجیر'' میں جیا بھادری کے مقابل انہوں نے ایک سخت پولس آفسر کا رول نبھایا تھا جس میں رومانی مناظر یا نغمہ و محبت کی گنجائش نہیں

تھی۔ ۳؍جون ۱۹۷۳ء میں ''زنجیر'' کی ہوشربا کامیابی کے بعد امیتابھ نے اپنی محبوبہ اور منگیتر جیا بھادری سے شادی کر لی۔ اب ان کی جدوجہد کا دور گذر چکا تھا اور ان کی رہائش گاہ کے آگے فلمساز قطار بند ہو گئے تھے۔

۱۹۷۴ء میں ۶ فلمیں ''بے نام''، ''کسوٹی''، ''کنوارا باپ''، ''مجبور''، ''روٹی کپڑا اور مکان'' اور ''دوست'' ریلیز ہوئیں۔ یہ وہ فلمیں تھیں جو ''زنجیر'' سے قبل بننا شروع ہوئی تھیں اور ''زنجیر'' کے ایک سال بعد ریلیز ہوئیں۔ ''روٹی کپڑا اور مکان''۔ میں ان کا ویسا ہی کردار تھا جیسا سنیل دت کی فلم ''ریشماں اور شیرا''۔ میں تھا۔ ''مجبور'' روی ٹنڈن کی فلم تھی۔ اس فلم میں امیتابھ نے اپنے کردار سے پورا پورا انصاف کیا تھا۔ یہ کردار ان کی فنی صلاحیتوں میں اضافے کا سبب بنا۔

۱۹۷۳ء میں انہیں ''سوداگر'' میں نوتن کے مقابل مسلم کردار ادا کرنے کا موقع ملا تھا۔ سدھیند ورائے کی یہ فلم نریندر ناتھ مترا کے بنگالی ناول پر مبنی تھی۔ ایک جانب امیتابھ بچن Melancholic anti Hero کے کردار ادا کر رہے تھے جو شرت چندر چٹر جی جیسے بنگلہ ادیبوں کی کہانیوں سے اخذ تھا تو دوسری جانب اسی کردار کو وہ Commercial Cinema میں بھی وضاحت کے ساتھ پیش کر رہے تھے۔ بمبئی سنیما دو شعبوں میں منقسم تھا۔ Commercial اور Semi-Commer cial۔ کمرشیل سنیما میں لیش چوپڑہ ''دیوار''، ''ترشول''، ''کالا پتھر''، ''سلسلہ''۔ میں پیش کر رہے تھے تو پرکاش مہرہ ''ہیرا پھیری''، ''خون پسینہ''، ''مقدر کا سکندر''، ''نمک حلال''، ''شرابی'' وغیرہ فلموں میں پیش کر رہے تھے اسی سلسلہ کا تیسرا اہم نام منموہن ڈیسائی کا بھی تھا جنھوں نے ناصر حسین، سبودھ مکھر جی اور فلمستان سنیما کو اپنی فلموں کے توسط سے آگے بڑھایا۔ امیتابھ منموہن ڈیسائی کے مقدر کا ستارا بن کر ان کے سنیما میں پیش ہوئے۔ ''امر اکبر انتھونی''، ''سہاگ''، ''نصیب''، ''قلی''، ''مرد''، ''دیش پریمی'' فلموں کے خالق منموہن ڈیسائی نے امیتابھ کو پوری طرح Cash کیا اور وہ ان قدرے عامیانہ فلموں کو اپنے فن کی معراج سمجھتے رہے۔ ان تین لیش چوپڑہ، پرکاش مہرہ، اور منموہن ڈیسائی جیسے فلمی مہارتھیوں کی تمام فلموں کا مبصرانہ جائزہ لیا جائے تو صرف لیش چوپڑہ ہی امیتابھ بچن کی فنکارانہ صلاحیتوں کو بہتر اور کافی حد تک معیار دینے میں کامیاب رہے ہیں۔ ان کی فلموں ''دیوار''، ''کالا پتھر'' اور ''ترشول'' کا کریڈیٹ پوری طرح سلیم جاوید کو دیا جا سکتا ہے جنہوں نے نہ صرف ان فلموں کے منظر نامے میں اپنی ہنرمند تخلیق نگاری کا مظاہرہ کیا۔ بلکہ

امیتابھ بچن کو مدِ نظر رکھ کر ایسے کردار تخلیق کئے جوان کے Angry young man کے فن کو مزید وسعت دینے میں کامیاب رہے۔ یہ فلمیں بے شک معیاری کہی جاسکتی ہیں۔اسی طرح ساگر سرحدی نے لیش چوپڑہ کی فلم ''کبھی کبھی''۔میں وہ امیتابھ بچن کو پیش کیا جورومان کی ہلکی اور کہیں گہری آنچ سے تپ کر پردۂ فلم پر اُبھرا۔

اسی طرح رمیش پپی سنیما میں بھی سلیم جاوید کا کمال نظر آتا ہے۔ رمیش پپی کی فلم ''شعلے''، ''شان''۔اوران کی ہدایت میں بنی مشیر ریاض کی فلم ''شکتی'' یہ تینوں فلمیں ایک ہی موضوع پر مختلف انداز میں بنائی گئی تھیں اور وہ موضوع تھا تشدد کا عفریتی قہر آمیز رنگ۔''شعلے'' اور ''شان'' کے کرداروں میں ان کے حصے میں تعریف کم آئی۔''شعلے'' کا سارا کریڈیٹ امجد خان ان کے بعد سنجیو کمار، ہیما مالنی اور پھر دھرمیندر کو دیا گیا۔''شکتی'' میں دلیپ کماران کے مدِ مقابل تھے۔ یہ طے شدہ بات تھی کہ دلیپ کمار کا قد بہر حال ان سے بلند رہا ہے، اس لئے اس فلم کا بھی تمام کریڈیٹ دلیپ کمار کو ہی دیا گیا۔ یوں بھی اگر دیکھا جائے تو وہ کردار جو امیتابھ نے اس فلم میں ادا کیا کوئی بھی ضمنی اداکار بخوبی ادا کرسکتا تھا۔

دوسری جانب رشی کیش مکھر جی، باسو چٹر جی، اسیت سین، بمل رائے اور رتن بوس کا سنیما تھا جو بنگلہ کے حقیقت پسندانہ سماج سے متاثر بمبئی سنیما تھا۔ رشی کیش مکھر جی اور اسی نوع کے دیگر ہدایت کاروں نے بمبئیا سنیما سے قدرے مختلف فلموں میں امیتابھ کو پیش کیا۔''ملی''، ''چپکے چپکے''، ''آراپ''، ''جرمانہ''، ''کھٹا میٹھا''، ''چرنداس''، ''گول مال''، ''برسات کی ایک رات''، ''انوسندھان''، ''بے مثال'' جیسی فلمیں تھیں۔ جو متوازن بھی تھیں اور تفریحی بھی۔ان فلموں میں امیتابھ ایک دوسرے ہی رنگ اور روپ میں نظر آئے لیکن ''زنجیر''، ''دیوار''، ''ترشول'' وغیرہ سے ان کی جو امیج بنادی گئی تھی ان فلموں کے کرداران کے شائقین کو نہ تو متاثر کر پائے اور نہ وہ کردار دیر پا ثابت ہوئے۔

چندر باروٹ نے جب انہیں اپنی پہلی اور آخری فلم ''ڈان''۔ ۱۹۷۸ء میں پیش کیا تو ڈبل رول والے کردار نے باکس آفس پر ہی قبضہ نہیں کیا بلکہ ان کی اداکارانہ کردار نگاری نے دیکھنے والوں کے دل و دماغ کو بھی مسخر کرلیا تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ فلم بین انہیں ایسے ہی کرداروں میں دیکھنا پسند کرتے ہیں اس سے ہٹ کر نہیں۔ یہ فلم بھی سلیم جاوید کے ہنر مند قلم سے نکل کر پردۂ فلم تک آئی تھی۔''امر اکبر انتھونی''، ''خون پسینہ''، ''مقدر کا سکندر''، ''کالا پتھر''، ''خوددار''، ''قلی''، ''آخری راستہ''، ''ترشول''، ''دیوار''، ''مسٹر نٹور لال''، ''اکیلا''، ''خدا گواہ'' اس سلسلے کی فلمیں

ہیں جو عام شائق کے سیدھے دل پر اثر انداز ہوئیں اور ''ڈان'' نے ان پر اپنی مہر ثبت کر دی۔

''امر اکبر انتھونی''، ''ہیرا پھیری''، ''مقدر کا سکندر'' اور ''خون پسینہ'' میں ونود کھنہ ان کے ساتھی اداکار تھے۔ان فلموں میں ونود کھنہ نے اپنی اداکاری کے بھر پور نقوش چھوڑے تھے اور کہیں بھی امیتابھ سے انیس نظر نہیں آئے تھے۔ یہ کہا جانے لگا تھا کہ ونود کھنہ امیتابھ سے آگے نکل جائیں گے اور وہ مقام پالیں گے جس پر امیتابھ قابض ہیں۔

فلم ''دوانجانے'' ۱۹۷۶ء سے ان کا ساتھ ریکھا سے ہوا اور بعد کی کئی فلموں میں وہ امیتابھ کی محبوبہ بن کر آئیں۔اس محبوبہ کے افسانوی کردار کو ریکھا نے حقیقت کا روپ دے دیا اور وہ امیتابھ کے نزدیک تر آتی گئیں۔ ریکھا سے نزدیکیاں جب انت رنگ اختیار کرتی گئیں تو جیا بھادری کو اپنا سہاگ خطرے میں نظر آنے لگا۔لیش چوپڑہ نے اس ''پریم پرسنگ'' کو فلم کا موضوع بنایا اور فلم ''سلسلہ'' ۱۹۸۱ء میں بیک وقت جیا بھادری (بیوی) اور ریکھا (محبوبہ) کو ایک ساتھ امیتابھ کے ساتھ پیش کر دیا۔ یہ فلم گویا ایک جانب تو جیا بھادری کی راحت کا سبب بنی تو دوسری جانب ریکھا کے بڑھتے قدموں کو روکنے میں بھی کامیاب رہی مگر ریکھا جیسی بنداس اداکارہ امیتابھ کو اپنے دل سے نہیں نکال سکی۔

فلم ''قلی''۔کی شوٹنگ کے دوران اداکار اور فائٹ کمپوزر پنت اسّر سے فلمی فائٹ میں امیتابھ کو سخت ترین چوٹ آئی تھی اور وہ عرصہ تک اسپتال میں موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہے تھے۔میڈیا پل پل کی خبریں نشر کر رہا تھا اور اس وقت ہندوستان میں ان کے شائقین کا وہ جنون دیکھنے کو ملا جس نے بلا تفریق مذہب و ملت ان کی صحت یابی کی دعائیں کیں، منتیں مانیں اور ہر طرح اپنے اداکار کو پھر سے پردے پر دیکھنے کے لئے اپنے اپنے طریقۂ عبادت کے مطابق پرارتھنائیں کیں۔ یہ انہیں دعاؤں کا ثمرہ تھا کہ امیتابھ موت کے آہنی پنجے سے خود کو چھڑا کر زندگی کی جانب لوٹ آئے اور پھر سے فلموں میں کام کرنے لگے۔

۱۹۸۴ء میں اندرا گاندھی کے قتل کے بعد جب راجیو گاندھی کو اقتدار حاصل ہوا تو امیتابھ بچن کو کانگریس کے ٹکٹ پر ان کے وطن الہٰ آباد سے الیکشن میں کھڑا کیا گیا اور وہ انتخاب جیت کر ممبر آف پارلیامنٹ بن گئے۔لیکن بعد میں ان کے ہم وطنوں نے ہی ان کے خلاف آوازیں بلند کیں کہ امیتابھ نے انتخاب سے پہلے جو وعدے کئے تھے وہ پورے نہیں کئے۔ وہ تو دورانِ اقتدار ایک بار بھی لوٹ کر الہٰ آباد

نہیں گئے۔ بعد ازاں جب سیاست میں اسکینڈل ابھرے تو امیتابھ نے ممبر آف پارلیامنٹ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ سیاست چائے کا کپ نہیں کہ اسے پی کر خود میں انرجی پیدا کی جائے۔

مسلسل کامیابی اور دن بدن بڑھتی مقبولیت نے انہیں ہندوستانی سنیما کا ناقابلِ فراموش اداکار تسلیم کرالیا۔ تقریباً ۸۶ فلموں میں کام کرنے کے بعد انہیں محسوس ہوا کہ اب انہیں بھی اپنا فلمساز ادارہ قائم کرلینا چاہئیے۔ ۱۹۹۵ء میں انہوں نے اے بی سی ایل کے نام سے یہ ادارہ قائم کرلیا۔ اس ادارے کی پہلی فلم ''تیرے میرے سپنے'' تخلیق ہوئی جس میں تمام نئے اداکار تھے۔ فلم کی پہلی ہی تجارت نے اس ادارے کو مالی مشکلات میں ڈال دیا۔ اس ادارے کی دوسری فلم ''سات رنگ کے سپنے'' اور ''مرتیوداتا'' جب بری طرح فلاپ ہوئیں تو یہ ادارہ پوری طرح مالی بحران میں آ گیا اور وہ امیتابھ جنہیں بگ بی کا خطاب دے کر یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ وہ غیر متزلزل ہیں، اچانک ان کے پیروں تلے دلدلی زمین آ گئی ___ اسی پر بس نہیں ہوا، ان کے فلمی ناخداؤں منموہن ڈیسائی اور پرکاش مہرہ کی فلمیں ''طوفان''، ''جادوگر'' اور ''گنگا جمنا سرسوتی'' مہنگے بجٹ کی فلمیں باکس آفس پر اوندھے منہ گریں تو آسمان سے ٹوٹے ستارے کی مانند امیتابھ دھرتی پر آ گئے۔ یہیں پر بس نہیں ہوا ان کی ''اگنی پتھ'' اور ''ہم'' کا حشر بھی اچھا نہیں ہوا۔ وہ کروڑوں کے قرض دار ہو گئے۔ ان کے نام کے مختلف اے بی سی ایل فلم ادارہ بند ہو گیا۔ انہیں مجبوراً کم معاوضے پر ''سوریہ ونشم'' اور ''آج کا ارجن''۔ جیسی معمولی فلموں میں کام کرنا پڑا مگر یہ فلمیں بھی ناکامی کا داغ ان کی پیشانی پر چھوڑ گئیں۔ فلمی اقتدار پر جب تاریک کے گھنے بادل چھانے لگے تو اب صرف اشتہاری فلمیں ہی ان کو مالی آسرا دے سکتی تھیں۔ بی پی ایل اور مرنڈا کے علاوہ انہوں نے کئی اشتہاری فلمیں کیں کوئی اثر ان کے ڈوبتے مقدر پر نہیں پڑا۔ ایسے ہی موقع پر اسٹار پلس کے راستے بند اور عقل مفقود ہو تو ہر مشورہ اور ہر تجویز پر آدمی عمل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ امیتابھ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اپنے ادارے کے ساتھ اپنی ساکھ کی خاطر انہوں نے تجارتی بروکروں کے مشورے پر ۱۹۹۶ء میں بنگلور شہر میں بیوٹی کونٹیسٹ منعقد کیا جسمیں مس ورلڈ کا انتخاب ہونا تھا۔ اس کانٹیسٹ کی میزبانی پوری طرح امیتابھ نے کی تھی لیکن سیاست کے ماہر کھلاڑیوں نے ان پر نہ صرف دولت کی بیجا بربادی کا الزام عائد کیا، بلکہ اس مقابلہ حسن کے پیچھے کھیلے جا رہے غیر شائستہ اور غیر مہذبانہ طور پر لڑکیوں کے استعمال کا بھی پردہ فاش کیا۔ نتیجہ یہ کہ امیتابھ بچن مزید قرضوں کا

بوجھ اٹھائے گھر تک محدود ہو گئے۔ کوئی راہ ایسی نہ تھی جو انہیں اس دشوار سفرِ حیات سے نجات دلا کر کامیاب منزل تک لے جاتی۔ شاید قدرت کی بارگاہ میں ان کی کوئی دعا قبول ہو گئی۔ اسٹار پلس نے جب ۲۰۰۰ء میں اپنا شو ''کون بنے گا کروڑ پتی''۔ لانچ کیا تو اس کی میزبانی کے فرائض امیتابھ کو دئے گئے۔ یہی وہ شو تھا جس نے امیتابھ کو نہ صرف مالی بحران سے نکالا بلکہ ان کے فلمی اقتدار کو پھر سے ان سے منسوب کرنے میں کامیاب ہوا۔ امیتابھ کی نپی تلی پرفارمینس، سحر خیز آواز، بہترین کاسٹیوم ڈیزائن، پراثر شخصیت اور انتہائی دلکش ودلگداز مکالماتی زبان اور تخاطب نے اس شو کو وہ بلندیاں عطا کیں جس کی مثال انڈین ٹیلی ویژن دینے سے قاصر ہے۔ یہ امیتابھ کا ہی کمال تھا کہ انہوں نے اپنے فنی اعتماد اور پر بہار شخصی توازن سے ''کون بنے گا کروڑ پتی''۔ کو مقبول تر بنا دیا اور ایک بار پھر سارا ملک ہی نہیں۔ دور دراز ملکوں میں آباد ہندوستانی ان کے دیوانے ہو گئے۔ یہ شو اپنا آخری شو دکھا کر بند ہو گیا اور جب ۲۰۰۵ء میں اس رقم کو دوگنا یعنی دو کروڑ کر کے پھر سے شروع کیا گیا تو امیتابھ کا وہ جادو برقرار نہ رہ سکا جو انہوں نے پہلے شو میں قائم کیا تھا۔ اسی شو کے درمیان ان کی وہ بیماری پھر اُبھر آئی جو کہیں دبی ہوئی تھی۔ شو درمیان میں ہی بند ہو گیا۔ امیتابھ اسپتال پہونچ گئے جہاں ان کی سرجری کی گئی لیکن اس بار نہ تو ملک گیر سطح پر کسی نے ان کی صحت یابی کے لئے دعا کی نہ منت مانی گئی اور نہ کسی قسم کا کوئی ردِّ عمل ظاہر ہوا۔ وہ صحت یاب ہو کر گھر آ گئے۔

پہلے شو کون بنے گا کروڑ پتی کے بعد لیش چوپڑہ نے ہی انہیں پھر بریک دیا اور اپنے بیٹے آدتیہ چوپڑہ کی فلم ''محبتیں''، میں انہیں کیریکٹر آرٹسٹ کا بھاری بھرکم رول دے دیا جو ان کی قد آور شخصیت کے عین مطابق تھا۔ ''محبتیں'' کی کامیابی کے بعد امیتابھ بچن پھر سے فلم انڈسٹری میں آ گئے مگر اس بار ان کی واپسی ہیرو کے طور پر نہیں، کیریکٹر آرٹسٹ کے طور پر ہوئی تھی۔ ''محبتیں''۔ کے بعد لاتعداد فلمیں ان کی فنکارانہ شخصیت کو ابھارنے میں کامیاب رہیں۔ ان فلموں میں وہ مشفق باپ ہیں۔ محبت کرنے والے شوہر ہیں۔ اچھے دوست ہیں۔ بہترین ویلین ہیں اور کئی اور روپ کئی اور Shades ابھر کر سامنے آئے ہیں۔

فلم ''شعلے'' میں وہ امجد خان والا رول کرنا چاہتے تھے مگر رمیش سپی اور سلیم جاوید نے امجد خان کو منتخب کیا تھا۔ یہ تمنا ان کی قائم رہی۔ جب رام گوپال ورما نے شعلے کی ریمیک بنانے کا منصوبہ بنایا تو امیتابھ کی دبی ہوئی خواہش نے اچانک مورت روپ لے لیا۔ شعلے کئی مسائل میں الجھی۔ رام گوپال ورما نے اس کا نام بدل

کر''رام گوپال ورما کی آگ'' رکھ دیا۔امید تھی کہ گبر سنگھ کے کردار میں امیتابھ نے یقیناً بہترین پرفارمینس دی ہوگی مگر جب فلم ریلیز ہوئی تو پہلے ہی شو میں بجھ گئی۔امیتابھ بچن، امجد خان کے قدآور فن کو چھو بھی نہ سکے۔

''چینی کم''، ''نشبد'' اور اسی نوع کی کئی فلمیں آ آ کر ان کی موجودگی کا تو احساس دلاتی رہیں مگر وہ بلند اور قمازحیثیت سے محروم ہی رہے۔

امیتابھ بچن نے فلموں میں عامیانہ اور فحش نگار گانوں اور پرفارمینش سے بھی گریز نہیں کیا۔وہ تو ہر وہ کام کرنے کے لئے خود کو تیار رکھتے تھے جو کسی بھی طرح انہیں نام ونمود اور شہرت دلا سکتا تھا۔

ان کی اداکاری کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ اول اول انہوں نے دلیپ کمار کے فنِ اداکاری کی سیڑھی چنی جس پر چڑھ کر انہوں نے خود کو سنورنے کی کوشش کی۔یہی نہیں انہوں نے دلیپ کمار کی کئی فلموں میں ادکاری کا چربہ بھی پیش کرنے سے گریز نہیں کیا۔''ملی'' اور ''شرابی'' میں انہوں نے دلیپ کمار کے ''دیوداس'' روپ کی نقل نقص کی تو فلم ''لاوارث'' کے ایک منظر میں امیتابھ نے فلم ''کوہِ نور'' میں ادا کیا گیا دلیپ کمار کا وہ پورا سین دے دیا۔جس میں شیشہ اتار کر دلیپ کمار خود کھڑے ہو جاتے ہیں اور شرابی جیون یہ سمجھتا ہے کہ شیشے میں اس کا ہی عکس نظر آ رہا ہے۔فلم ''مہان'' میں انہوں نے تین کردار نبھائے جو دلیپ کمار ''بیراگ'' میں ادا کر چکے تھے۔یاد کیجئے ''مہان'' اور ''عدالت'' کے وہ مناظر جب عمر دراز امیتابھ بچن مرتے ہوئے اپنے بیٹوں کو ''منا'' کہہ کر پکارتا ہے۔''منا'' کی پکار دلیپ کمار اپنی یادگار فلم ''گنگا جمنا'' میں ناصر خان کے لئے ادا کر چکے تھے۔

راجیش کھنہ کی مرکزی رول والی فلموں ''آنند'' ۱۹۷۲ء اور ''نمک حرام'' ۱۹۷۴ء میں امیتابھ بچن کو بہترین معاون اداکار تسلیم کیا گیا اور فلم فیئر اعزاز ملے تھے۔ ان کے بعد ''امر اکبر انتھونی'' ۱۹۷۸ء ''ڈان'' ۱۹۷۹ء اور ''ہم'' ۱۹۹۲ء کی فلموں میں بہترین مرکزی اداکاری کے لئے فلم فیئر نے ٹرافیاں دے کر نوازا تھا۔فلم ''اگنی پتھ'' ۱۹۹۱ء میں انہیں نیشنل ایوارڈ بھی ملا تھا اور اسی سال حکومتِ ہند نے انہیں پدم شری کا اعزاز دیا تھا۔بی بی سی کے ایک پول کے ذریعہ انہیں صدی کا بہترین فلمی ستارا منتخب کیا گیا تھا۔

ان کی اداکاری کا سفر ابھی جاری ہے۔ان کی آواز کا استعمال نغمہ کی گلوکاری میں بھی کیا گیا۔سب سے قبل فلم ''نٹورلال'' ۱۹۷۹ء میں راجیش روشن کی موسیقی میں امیتابھ نے ''میرے پاس آؤ میرے دوستوں'' گایا تھا۔

اس کے بعد ۱۹۸۱ء کی فلم ''لاوارث'' میں ''میرے انگنے میں تمہارا کیا کام ہے'' اور فلم ''سلسلہ'' میں ''رنگ برسے بھیگی چنر والی رنگ برسے''۔فلم ''پکار'' میں آرڈی برمن کی طرز پر مزاحیہ گیت ''تو میکے مت جیُو۔اور فلم ''باغبان'' کا ہولی گیت ''ہوری کھیلیں رگھویرا اودھ میں'' ان کی آواز میں ریکارڈ ہو کر انہیں پر فلمائے بھی گئے۔

غرض یہ کہ امیتابھ نے ہر طرح ہندوستانی فلموں میں خود کو منوانے کی بے پناہ کوششیں کیں اور وہ کامیاب رہے۔فلمساز اور ہدایت کاروں کے علاوہ عوام نے انہیں ایک ایسی مسند پر بٹھا دیا جو ہوشربا بھی ہے اور ہوش گنوانے والی بھی۔ان کو صرف سپر اسٹار ہی نہیں صدی ستارہ بھی بنا دیا گیا۔اس پر طرّہ یہ کہ سیاسی اکھاڑے بے لنگوٹ پہلوان اور سیاسی بساط کے پیادہ میں ان کے ہمراہی بن گئے۔ان تمام عوامل نے ان کے ہوش اور حواس پر قبضہ کر لیا۔اور وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ فلم صنعت ان کے بغیر اپاہج ہے۔ان میں تکبر آ گیا۔حرص، طمع اور حسد نے ان پر ملمع سازی کر دی ان کے کشیدہ تعلقات کا ایک زمانہ گواہ ہے۔میڈیا ان کی کھلی تجوریوں کا اس حد تک مرید ہوا کہ اگر امیتابھ نے رات تین بجے گھر سے مندر جا کر پوجا کرنے کا ڈھونگ رچا تو ان کے ساتھ ساتھ میڈیا کے کیمرے بھی ان کے ہر قدم اور ہر تاثر کو قلمبند کرتے رہے۔اپنے بیٹے ابھی شیک کی شادی میں انہوں نے جس طرح اپنے پیش رو فنکاروں کو نظر انداز کیا اس سے تمام ہندوستان واقف ہے۔انہوں نے کبھی کسی کا احسان نہیں مانا۔ان کے اصل گاڈ فادر محمود تھے لیکن جب محمود کا انتقال ہوا تو امیتابھ نہ تو ان کے جنازے میں شریک تھے اور نہ کسی قسم کا انہوں نے اظہارِ افسوس کیا۔آج وہ انڈسٹری کے کروڑ پتی اداکار ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے فنکار ہیں فلم ''بلیک'' اور حالیہ فلم ''پا'' میں انہوں نے ثابت بھی کیا ہے۔فلم ''پا'' کا تمام کریڈیٹ ان کے غیر ملکی میک اپ مین کو جاتا ہے۔اپنے اس فلمی سفر کی دوسری پاری میں انہوں نے صرف پایا ہی پایا ہے۔کھویا کچھ نہیں۔ہاں انہوں نے اپنے وجود پر خودی (انا پرستی) کو اس درجہ حاوی کر لیا کہ وہ شفاف وجود جو آغاز میں موجود رہا، کہیں روپوش ہو گیا۔

☆☆☆

فلم انڈسٹری کے محبوب فنکار۔سنیل دت

غلام رسول

فلم انڈسٹری کے محبوب فنکار، حب الوطنی سچا سپاہی اور انسان دوست دلاور سنیل دت ۲۵ رمئی ۲۰۰۵ء کو اچانک دل کا دورہ پڑنے سے اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔اس مشہور ومعروف فلمی اداکار اور سماجی وسیاسی خدمت گار کا اس دنیا سے اٹھ جانے سے ہندستان کے سبھی لوگوں کو گہرا صدمہ ہوا۔سنیل دت کی موت سے نہ صرف فلم انڈسٹری کو نقصان ہوا بلکہ سماج وسیاست اور انسانیت کو گہرا دھکّا پہنچا ایسی ہی شخصیت کے اٹھ جانے سے یہ کہا جاتا ہے کہ ''موت اس کی ہے جس کا زمانہ کرے افسوس۔''

سنیل دت کا اصل نام بلراج دت تھا۔ان کے والد کا نام دیوان رگھوناتھ دت تھا اور والدہ کا نام کول ونتی دیوی تھا۔ان کی پیدائش ۶ جون ۱۹۲۹ء کو مغربی پنجاب کے جہلم ضلع کے خورد گاؤں میں ہوئی تھی۔ان کا گھرانہ زمیندار خاندان کا تھا۔دولت وجائیداد کی بہتات تھی۔جب وہ پانچ سال کے تھے تو ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ان کے والد کے انتقال کے بعد بھی کسی قسم کی معاشی پریشانی نہیں ہوئی کیوں کہ کسی چیز کی کمی نہیں تھی لیکن ان کی زندگی کے لالے اس وقت پڑ گئے جب ملک کا بٹوارہ ہوا۔تقسیم ہند کے وقت وہ اپنی ماں اور بھائی بہنوں کے ساتھ ہندوستان آ گئے اور یہاں پنجاب کے جگادھری قصبہ میں سکونت اختیار کی جواب ہریانہ میں ہے۔وہ پڑھائی حاصل کرنے کے لئے ممبئی کے دادرا علاقوں میں آ گئے جہاں ان کا ایک کزن رہتا تھا۔یہاں پر ایک کالج میں داخلہ لیا اور پڑھائی جاری رکھی۔کالج کے اساتذہ اور پرنسپل ان کی ذہانت اور بہتر پڑھائی کے دلدادہ تھے۔وہ کالج کے بعد دوپہر ڈھائی بجے سے رات ساڑھے گیارہ بجے تک ایک بس ڈپو میں کام کیا کرتے تھے جہاں سے انہیں ایک سو روپے ماہانہ مل جاتے تھے۔اس وقت ان کی حالت نہایت ہی خستہ تھی۔وہ کالج کے زمانے ہی سے ڈرامے اور کلچر پروگراموں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ایک بار ایک کالج کے پروگرام میں اناؤنسر کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ ان کی اس

کارکردگی کو دیکھتے ہوئے وہاں پر موجود ریڈیو سیلون کے ایک افسر نے انہیں ریڈیو میں کام کرنے کے لئے آفر دیا۔وہ ریڈیو پر فلمی فن کاروں کا انٹرویو لیا کرتے تھے۔نمّی، ثریا، دیوآنند، دلیپ کمار جیسے کئی بڑے فن کاروں کے انہوں نے انٹرویو لئے۔

ایک مرتبہ فلم ''شہید'' کے سیٹ پر سنیل دت، دلیپ کمار کا انٹرویو لے رہے تھے تو اسی وقت ہدایت کار رمیش سہگل نے انہیں اپنی ایک فلم میں کام کرنے کا آفر دیا۔اسکرین ٹیسٹ میں وہ پاس کر گئے لیکن وہ کام کرنے سے انکار کرنے کے لئے انہوں نے کہا کہ میں نے اپنی ماں سے گریجویشن پورا کرنے کا وعدہ کیا ہے، اور اس کے بعد ہی میں فلم میں کام کرسکتا ہوں، یہ بات سن کر سہگل صاحب بہت خوش ہوئے اور انہوں نے کہا کہ تمہارے امتحان میں یوں تو دو مہینے باقی ہیں، اگر دو سال بھی ہوتا تو میں تمہارا انتظار کرتا۔انہوں نے پہلی بار فلم ''ریلوے پلیٹ فارم'' میں نلنی جیونت کے ساتھ کام کیا۔۱۹۵۷ء میں انہیں ممتاز ڈائریکٹر محبوب کی فلم ''مدر انڈیا'' ملی جس کے بعد انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔اسی فلم کے سیٹ پر پہلی بار سنیل دت نے نرگس کو دیکھا۔کہا جاتا ہے کہ ''مدر انڈیا'' کے سیٹ پر آگ سے نرگس کو بچایا اس لئے وہ سنیل دت کے قریب آ گئیں لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ سنیل دت کی بہن ایک بار سخت بیمار پڑ گئی تھی اور اس وقت نرگس نے بہت زیادہ مدد کی اور وہیں سے ان دونوں کے درمیان قربت بڑھ گئی۔ایک بار دونوں ایک کار میں ایک ساتھ جا رہے تھے کہ سنیل دت نے نرگس سے شادی کرنے کی تجویز پیش کی اور چند دنوں کے بعد نرگس نے اس تجویز کو قبول کر لیا اور ۱۹۵۸ء میں ان دونوں کی شادی ہوگئی۔

سنیل دت ایک ایسے اداکار تھے کہ انہوں نے اپنی کئی فلموں میں بہترین اداکاری کے نقش چھوڑے ہیں۔گمراہ، وقت، ہم راز، خاندان، ملن، ریشما اور شیرا، یہ راستے ہیں پیار کے، یادیں، سادھنا، انسان جاگ اٹھا، سجاتا، ہم ہندستانی، چھایا، آج اور کل، مجھے جینے دو، درد کا رشتہ، اور یہ آگ کب بجھے گی میں انہوں نے بے مثال اداکاری پیش کی۔انہوں نے اپنے زمانے کی مشہور فلمی شخصیتوں امیتابھ بچن، راج کمار، فیروز خاں، ششی کپور، کشور کمار، محمود، شتروگھن سنہا، جانی واکر، نرگس، وجینتی مالا، مینا کماری، وحیدہ رحمٰن، سادھنا وغیرہ کے ساتھ کام کیا۔ان کی پہلی

فلم ''ریلوے پلیٹ فارم'' تھی اور آخری اپنے بیٹے سنجے دت کے ساتھ ''منّا بھائی ایم بی بی ایس'' میں کام کیا تھا۔ ۱۹۸۱ء میں نرگس کا انتقال ہوجانے سے وہ بالکل ٹوٹ سے گئے تھے۔ نرگس کی موت کینسر سے ہوئی تھی اس وجہ سے انہوں نے اس بیماری کے خلاف اعلان جنگ کا آغاز کیا اور اس طرح انہوں نے نرگس فاؤنڈیشن قائم کیا۔ اس کے بعد سے ہی وہ سماجی خدمات کے کام میں مصروف ہوگئے۔ وہ راجیو گاندھی کی دعوت پر سیاست میں داخل ہوئے اور پانچ بار لوک سبھا کے الیکشن میں کامیاب ہوئے۔ سنیل دت کا سیاست سے متعلق کہنا ہے کہ ''میرا ماننا ہے کہ سیاست کا اہم کام لوگوں کو جوڑنا ہوتا ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ آج یہ لوگوں کو ایک دوسرے سے دور کررہی ہے۔'' گزشتہ سال لوک سبھا الیکشن میں کامیاب ہونے کے بعد پہلی بار وہ مرکزی وزیر بنائے گئے اور کھیل ونوجوانوں کے امور کی وزارت کو سنبھالا اور اس کے تحت انہوں نے بہت سے کام کئے لیکن موت نے انہیں مہلت نہیں دی۔ بہرکیف سنیل دت نہ صرف ایک مشہور وممتاز اداکار تھے بلکہ سچے اور مخلص انسان کے ساتھ دردمند دل والے سماجی خدمت گار اور سیاست داں تھے۔ اس اچھے انسان کے چلے جانے سے آج پورا ہندوستان سوگ کے عالم میں ہے۔

☆☆☆

ہندی فلم کے جانی ۔ راج کمار

خورشید اختر فرازی

ہندی فلم کے ''جانی'' یعنی راج کمار جن کا اصل نام کل بھوشن پنڈت تھا ان کی پیدائش ۸/اکتوبر کو بلوچستان (برٹش انڈیا) میں ہوئی تھی اور تعلیم سے فراغت پانے کے بعد وہ ممبئ میں پولس سب انسپکٹر کے پیشے میں تھے ۱۹۵۱ء میں انہوں نے اداکاری کا پیشہ اپنا لیا، راج کمار کی بیوی کا نام یگاتری ہے جسے لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا اور ان کا لڑکا پورو راج کمار ہے جس نے چند فلموں میں اداکاری کی اور فلمسازوں نے اُسے ہیرو کے بجائے ویلین کے طور پر پیش کیا، راج کمار نے ۱۹۴۰ء میں پولیس میں نوکری شروع کی تھی جب ان کی تنخواہ ماہانہ ۶۲ روپئے تھی اور ۱۹۵۱ء میں جب انہوں نے پولیس کی نوکری چھوڑی اس وقت ان کی ماہانہ تنخواہ ۳۱۱ روپئے تھی۔

راج کمار کی پہلی فلم جو ۱۹۵۲ء میں ریلیز ہوئی اس کا نام ''رنگیلی'' تھا جو خاموشی سے ریلیز ہوئی اور اسی خاموشی سے چلی گئی اور اس فلم کا کسی نے نوٹس بھی نہیں لیا۔ ۱۹۵۷ء میں انہیں اس وقت زبردست شہرت ملی جب آسکر نامزد فلم محبوب خان کی ''مدر انڈیا'' ریلیز ہوئی۔ اور پھر وہ ایک اسٹار بن گئے اور تقریباً ۷۰ فلموں میں انہوں نے ہیرو کا رول نبھایا۔ نرگس، مینا کماری، وحیدہ رحمان، مالا سنہا، نندہ، کامنی کوشل، پدمنی جیسی مشہور اداکاراؤں کے ساتھ ہیرو کا رول نبھایا بعد ازاں شرمیلا ٹیگور، لینا چندرورکر، سادھنا کے ساتھ بھی کام کئے۔ لوگ انہیں پیار سے جانی کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ لفظ جانی ان کا تکیہ کلام تھا۔ انہوں نے تقریباً ہر فلم میں اس لفظ کا استعمال کیا اور خاص طور پر کسی کو مخاطب کرتے ہوئے وہ یہی لفظ استعمال کرتے تھے۔ راج کمار کی خاصیت ان کے ڈائیلاگ بولنے کا انداز تھا، لہجہ حد درجہ سخت اور سامنے والے کے لئے گھبراہٹ میں مبتلا کردینے والا۔ راج کمار نے دلیپ کمار کے ساتھ دو فلمیں پیغام ۱۹۵۹ء اور فلم سوداگر ۱۹۹۱ء میں کیں اور یہ دونوں ہی فلمیں ہندی فلموں کی دنیا میں کلاسیک فلمیں سمجھی جاتی ہیں۔ پیغام میں راج کمار نے دلیپ کمار کے بڑے بھائی کا رول ادا کیا تھا جب کہ سوداگر میں شروع جانی دوست اور درمیان میں جانی دشمن کا۔

راج کمار نے راجندر کمار کے ساتھ جیمنی کی فلم ''زندگی'' میں معاون اداکار کا رول کیا تھا اوراس فلم میں ان کی اداکاری انتہائی عروج پر تھی۔اس فلم میں پرتھوی راج کپوراوروجنتی مالا بھی تھی۔راج کمار نے بی آر چوپڑہ کی یادگار اورنا قابل فراموش فلم''وقت'' میں زبردست رول نبھایا تھااوراسی فلم میں مدنپوری کے ساتھ ایک سین کے ڈائیلاگ میں ان کا یہ ڈائیلاگ ''جانی اسے چاقو کہتے ہیں اگرلگ جائے تو خون نکل آتا ہے''اور رحمٰن کے ساتھ ایک ڈائیلاگ ''جولوگ شیشے کے گھروں میں رہتے ہیں وہ دوسروں پر پتھرنہیں پھینکا کرتے'' بیحدمشہور ہوا تھا۔

راج کمار جن کا اصل نام کل بھوشن پنڈت تھا وہ پاکستان کے بلوچستان میں پیدا ہوئے دراصل وہ کشمیری پنڈت خاندان سے تھے اور ذات کے سرسوتی برہمن۔ ۱۹۴۰ء میں وہ غیر منقسم ہندوستان کے شہرممبئی چلے آئے اورسب انسپکٹر کی نوکری کر لی۔ ۱۹۶۰ء میں گیا تری سے شادی کی جن میں پوروج کمار، پانینی راج کمار اور ایک لڑکی واستاویکتا راج کمار ہے۔واستاویکتا نے ۲۰۰۸ میں پہلی مرتبہ ایک فلم''ایٹھ شانی'' میں اداکاری کی تھی،راج کمارممبئی کے متمول علاقے ورلی کے ایک شاندار بنگلے میں رہتے تھے جہاں سے ان کا لڑکا پوروبچپن میں اغوا کرلیا گیا تھا۔مگر بعد میں پولیس نے اُسے برآمد کرلیا تھا۔

پورو راج کمار جوکہ جوانی سے ہی حد درجہ شراب نوشی میں مبتلا رہنے لگا تھا۔ایک مرتبہ نشے کے عالم میں گاڑی چلاتے ہوئے اس نے میرین ڈرائیو میں چارآدمیوں کوکچل دیا تھا جس کی وجہ سے ایک کی موت ہوگئی اورتین شدیدطور پر زخمی ہوئے تھے،پوروکوگرفتار کرلیا گیا تھا لیکن بعد میں حیرت انگیز طور پرعدالت نے اُسے کیس میں بری الذمہ قراردیا تھا۔

راج کمار کی اہم فلموں میں شرارت ۱۹۵۹ء،کشور کمار کے ساتھ پیغام ۱۹۵۹ء دلیپ کمار کے ساتھ،دل اپنا پریت پرائی ۱۹۶۰ء گھرانہ ۱۹۶۱ء ،دل ایک مندر ۱۹۶۳ء، وقت ۱۹۶۵ء، ہمراز ۱۹۶۷ء،نیل کمل ۱۹۶۸ء، پاکیزہ ۱۹۷۲ء، لال پتھر ۱۹۷۱ء، ہیررانجھا ۱۹۷۱ء، ہندستان کی قسم ۱۹۷۳ء ایک سے بڑھ کر ایک ۱۹۷۶ء اور کرم یوگی ۱۹۷۸ء میں ۱۹۶۰ء کی دہائی میں انہیں اداکار کےطور پرفلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں راج کمار نے بطور تجربہ کئی قسم کے رول کئے جس میں باپ،انکل، بھائی،ڈاکو،ڈاکٹر،گینگسٹر،قاتل اورانتہائی شریف پروفیسر جس میں چمبل کی قسم ۱۹۸۰ء،قدرت ۱۹۸۱ء،ایک نئی پہیلی ۱۹۸۴ء،مرتے دم تک ۱۹۸۷ء، جنگ باز ۱۹۸۹ء، پولیس پبلک ۱۹۹۰ء کے نام قابل ذکر ہیں۔

یوں تو لوگ راج کمار کی اہم فلموں میں پولیس پبلک کا شمار نہیں کرتے ،لیکن اس فلم میں ایک انتہائی شاطر،رشوت خوراور بدعنوان پولیس افسر کے رول میں نصیرالدین شاہ تھے اورظاہر سی بات ہے کہ نصیرالدین شاہ جیسے ادکارکواگرکھل کرکام کرنے کا موقع ملے تو پھران کی اداکاری آسمان پرنظرآئے گی،لیکن اس فلم میں راج کمار نے اپنے سنجیدہ ڈائیلاگ کی ادائیگی،آنکھوں کی گردش اورحرکات وسکنات کی بدولت نصیرالدین شاہ جیسے اداکار پربھی حاوی ہو گئے تھے۔

اسی طرح سے نانا پاٹیکر ایک ایسے اداکار ہیں جن کے آگے اچھے اچھے اداکار پانی بھرتے نظرآتے ہیں۔لیکن فلم ترنگا میں راج کماراورنانا پاٹیکرکومتوازی رول دیئے گئے تھےاورراج کمار بہرصورت نانا پاٹیکر کے مقابلے میں برترنظرآئے،ایسی بات نہیں ہے کہ نانا پاٹیکر کی اداکاری خراب تھی بلکہ ان کی اداکاری کوبھی لوگوں نے بیحد پسند کیا تھا لیکن راج کمار کی بات ہی کچھ اورتھی۔راج کمار اپنےلطیفوں کی وجہ سے بیحدمشہور تھے،ان کے چندلطیفے ذیل میں دیئے جارہے ہیں۔

راج کمار نے جس دن رات کا شو یش چوپڑہ کی ہدایت میں بنی فلم''شکتی'' دیکھی جس میں دلیپ کمار،امیتابھ بچن،سمیتا پاٹیل،راکھی اورامریش پوری نے کام کیا تھا اس رات کوراج نے خوب شراب پی اوررات کے ۲ بجے دلیپ صاحب کوفون لگایا تو ان کے خادم نے کہا کہ صاحب آرام کررہے ہیں۔جس پرراج نے کہاانہیں جگادیجئے اورکہیئے کہ راج کمار نے فون کیا ہے۔بہرکیف دلیپ صاحب نے فون پکڑااورپوچھا کون ہو بھائی صاحب،جس پرراج نے کہا کہ یوسف میں نے آج تمہاری فلم شکتی دیکھی اورمجھے احساس ہوا کہ میرے بعدتم ہی اچھے اداکار ہو،بائی دی وے تمہارے ساتھ وہ ایکسٹرا کون تھا؟(امیتابھ بچن کوانہوں نے ایکسٹرا کہا تھا)ایک مرتبہ پرکاش مہرہ(زنجیر،ہاتھ کی صفائی،شراب،نمک حلال کے ہدایت کار) نے راج سے کہا کہ وہ انہیں اپنی فلم

میں لینا چاہتے ہیں ساتھ میں ان کے کتّے کا بھی اہم رول ہوگا، جس پر راج نے کہا تو پھر کتّے کا بھی سائن کرلو۔ پرکاش مہرہ ہکا بکا رہ گئے پھر ڈرتے ڈرتے پوچھا....اسے کیا دینا ہوگا؟

جس پر راج نے گال کھجاتے ہوئے کہا....آج کل راجیش (راجیش کھنّہ) کیا لے رہا ہے؟

ایک مرتبہ موہن کمار (امن، آپ آئے بہاری آئی، آئی ملن کی بیلا) کے ہدایتکار نے راج سے اپنی فلم میں ہیرو کے رول کے لئے کہا تو راج نے کہا، موہن پیارے میں تمہارے فلم میں کام ضرور کرتا لیکن تم بال میں تیل بہت لگاتے ہو، میں تمہاری فلم میں کام نہیں کرسکتا۔

ایک فلمی پارٹی میں راج نے دھرمیندر کو اشارہ کیا اور کہا.....اے جتندرا دھر آؤ دھرمیندر ان کے قریب آئے وہ اکڑ کر کہا....میرا نام دھرمیندر ہے، جتندر نہیں۔ جس پر راج نے لاپرواہی سے کہا جتندر، دھرمیندر اور بندر سبھی ہم قافیہ ہیں۔

ایک پارٹی میں انہوں نے زینت امان سے کہا تمہاری پرسنالیٹی اچھی ہے، خوبصورت ہو تم فلم میں کام کیوں نہیں کرتی، اس وقت تک زینت ہرے رام ہرے کرشنا، قربانی اور ہیرا پنا میں کام کر کے ٹاپ کی اداکارہ بن چکی تھی، فلم بلندی میں آشا پاریکھ کے شوہر اور حاضر دماغ پروفیسر کا رول کیا تھا اور ان کا یہ ڈائیلاگ ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں زمانہ ہم سے ہے زمانے سے ہم نہیں۔ بیحد مشہور ہوا تھا۔

☆☆☆

فلم ''شعلے'' کا ٹھاکر۔ سنجیو کمار

یاسمین اختر (مغربی بنگال)

ہری بھری زری والا عرف سنجیو کمار ہندی فلموں کے ایک ایسے نا قابل فراموش فنکار گزرے ہیں جنہوں نے اپنی فلمی زندگی کا آغاز ایک ایکسٹرا اداکار کے طور پر کیا تھا۔ اور ان کا عروج وہاں تک پہنچا کہ انہیں دلیپ کمار جیسے اداکار سے موازنہ کیا جانے لگا اور لوگ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہے کہ دلیپ کمار اور سنجیو کے درمیان بڑا اداکار کون ہے۔ دلیپ کمار کو جہاں ایک سنجیدہ۔ مزاحیہ اور رومانٹک ہیرو کے رول میں لوگوں نے قبول کیا وہیں سنجیو کمار نے بھی اپنے آپ کو پیچھے نہیں رکھا بلکہ سنجیو نے چند فلمیں ایسی بھی کیں کہ خود ان کی اداکاری کے آگے دلیپ کمار نے اپنے آپ کو کم بتایا۔ جیسے فلم ''کھلونا'' میں پاگل کا رول، نیا دن نئی رات میں بیک وقت ۹ مختلف رول جس میں کوڑھی کا نا قابل فراموش رول، فلم جانی دشمن میں خطرناک قاتل کا رول، فلم کوشش میں گونگے بہرے، فلم شعلے میں اپاہج ٹھاکر صاحب کا رول، وغیرہ یہ چند ایسی فلمیں ہیں جن میں سنجیو کمار کی اداکاری انتہائی عروج پر نظر آئی۔

فلم ساز ایچ ایس رویل نے فلم سنگھرش میں اور سبھاش گھئی نے فلم ودھاتا میں دلیپ کمار اور سنجیو کمار کو یکجا کیا تھا اور ان دونوں فلموں میں سنجیو کمار نے دلیپ کمار کے سامنے بہت ہی خوبصورت اداکاری کی جس کا کوئی جواب نہیں تھا، فلم ''ہم ہندوستانی'' جو ۱۹۵۹ء میں ریلیز ہوئی تھی اس فلم میں سنجیو کمار نے پولس انسپکٹر کا ایک چھوٹا سا رول ادا کیا تھا، اس کا کام فلم کے آخر میں عدالت کے سین میں تھا جب اُسے بالکل خاموش رہنا تھا۔ اس فلم میں اُسے ایک بھی ڈائیلاگ بولنے کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ ۱۹۶۵ء میں سنجیو کمار کو ایک جادوئی فلم ''نشان'' میں ناظمہ کے ساتھ ہیرو کا رول میں لیا گیا فلم کسی حد تک کامیاب ہوئی اور لوگوں نے سنجیو کمار کو پہچانا پھر علی بابا میں سعیدہ خان کے ساتھ، اسمگلر میں کم کم، شیخ مختار کے سات، دو چہرے میں انیتا گوہا کے ساتھ اُسے چھوٹی چھوٹی فلموں میں ہیرو کے رول ملتے رہے۔ ۱۹۶۷ء میں پہلی مرتبہ گرودت کے بھائی آتما رام نے انہیں اپنی سپرہٹ فلم ''شکار'' میں ایک انسپکٹر کے اہم رول میں پیش کیا، اس فلم کے ہیرو دھرمیندر اور ہیروئن آشا پاریکھ تھی،

اس فلم میں سنجیو کمار نے زبردست اداکاری کی اور اُسے پہلی مرتبہ فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔

سنجیو کمار کی زندگی میں فلم ''شکار'' کی بڑی اہمیت ہے۔اس فلم کی زبردست کامیابی نے سنجیو کمار کو بھی راتوں رات سپر اسٹار بنا دیا۔اسی سال پاچھی کی فلم ''سچائی'' ریلیز ہوئی جس میں شمی کپور، سادھنا کے ساتھ سنجیو کمار کو متوازی رول دیا گیا۔اس فلم میں بھی سنجیو کمار کی اداکاری کے سامنے شمی کپور جیسے منجھے ہوئے اداکار پھیکے پڑ گئے۔اس فلم میں بھی سنجیو کمار کو مختلف اداکاروں کی طرف سے کئی ایوارڈ ملے۔فلم ستیہ کام میں رشی کیش نے دھرمیندر کے ساتھ پیش کیا اس فلم میں بھی اس کی اداکاری کو سراہا گیا۔بعد ازاں ایل وی پرساد نے جب ۱۹۷۰ء میں کھلونا بنائی اور انہیں ممتاز کے مقابل ہیرو بنایا تو گلشن نندہ کی کہانی پر مبنی یہ فلم نہ صرف سپر ہٹ ثابت ہوئی بلکہ اس فلم میں سنجیو کمار کو فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔بعد ازاں نیا دن نئی رات میں جیا بہادری، گلزار کی فلم کوشش میں جیا بہادری کے لئے بھی انہیں فلم فیئر ایوارڈ ملے۔

سنجیو کمار نے دلیپ کمار، راج کپور، بلراج ساہنی، دھرمیندر، جتندر، منوج کمار، شمی کپور، سنجے خان، فروز خان، نوین نشچل، ایتابھ بچن، سچترا سین، وجنتی مالا، وحیدہ رحمان، نوتن، سادھنا، نندہ، سری دیوی، جیا پردھا، سمیت سبھی اداکار وادا کاراؤں کے ساتھ کام کیا اور جس فلم میں بھی اداکاری کی اس فلم میں انھوں نے اپنی اداکاری کی ایک گہری چھاپ چھوڑی۔

کبھی کبھی وقت کی رفتار اتنی تیز ہوتی ہے کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دیتی اور جب کچھ لمحوں کے لئے ذرا سی مہلت ملتی ہے اور ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے ارے....یہ تو ایک دور گزر گیا۔ایسی ہی ایک شخصیت دیکھتے ہی دیکھتے ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی، کل تک ان کا ڈائیلاگ کانوں میں گونجتا رہتا تھا۔''گبّر سے کہنا رام گڑھ والوں نے کتّوں کے آگے روٹی ڈالنا چھوڑ کر دیا ہے'' اور اس کے ساتھ ''آندھی'' فلم کی وہ نرم اور محبت کے جذبے سے سرشار آواز....اس بار اماوس کچھ زیادہ ہی لمبی ہوگئی ہے۔سنجیو کمار اپنی بے پناہ اداکارانہ صلاحیتوں کے ساتھ ہندستانی پردۂ فلم پر نمودار ہوا تھا اور پورن ماسی کے چاند کی طرح سے پورے فلمی آکاش پر چھا گیا تھا۔مگر اماوس کی ایک ہی کالی رات نے اس چاند کو ہم سے چھین لیا۔۶ رنومبر ۱۹۸۵ء کی اماوس کتنی ظالم ثابت ہوئی تھی۔

ایک مرتبہ جب کمال امروہی سے کسی نے پوچھا کہ آپ کی نظر میں سب سے اچھا اداکار کون ہے تو انہوں نے کہا کہ صرف اشوک کمار اور سنجیو کمار، چونکہ کمال امروہی کو دلیپ کمار سے ازلی بیر ہمیشہ سے ہی رہا اس لئے انھوں نے دلیپ کمار کا نام نہیں لیا، بہر کیف انھوں نے سنجیو کمار کو بڑا اداکار قرار دیا۔فلم ترشول میں ایتابھ بچن کا رول نبھا کر سنجیو کمار نے اپنی اداکاری کی گہری چھاپ چھوڑی تھی۔اس کے علاوہ وشواش گھات، محبت اور خدا بھی ان کی یادگار فلموں میں شامل ہیں۔

سنجیو کمار جب صرف ۱۵ سال کے تھے تو ایک لڑکی کے ساتھ ان کی والدہ نے منگنی کر دی تھی مگر بعد میں منگنی ٹوٹ گئی۔فلمی دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اس نے ہیما مالنی سے سچا پیار کیا تھا مگر دھرمیندر آڑے آ گئے۔بعد کی خبریں ملتی رہیں مگر شادی کسی سے بھی نہ ہوسکی پتہ چلا ہے کہ سنجیو کمار کی موت کے بعد سلکھشنا پنڈت پاگل ہوگئی ہے اور اب بھی دن رات ہری بھائی کے نام کی مالا جپتی رہتی ہے۔

سنجیو کمار نے سلکھشنا پنڈت کے ساتھ بھی کئی فلموں میں کام کئے جس میں ایک اہم فلم کا نام ''الجھن'' ہے اس فلم میں ایک مرڈر سسپنس کو بہت ہی خوبصورت انداز میں فلمایا گیا ہے جس میں سنجیو کمار کو اپنی بیوی سلکھشنا پر قتل کرنے کا شبہہ ہوتا ہے لیکن آخر میں یہ بھید کھلتا ہے کہ سنجیو کی بہن بینائی نے وہ قتل کیا تھا اور اپنی نند کو بچانے کے لئے اس نے قتل کا الزام اپنے سر لے لیا تھا اس کے علاوہ سنجیو کمار، شتروگھن سنہا، مالا سنہا، اور ریناراے پر مشتمل فلم ''بے رحم'' بھی ایک بہت ہی شاندار فلم تھی جس میں سنجیو کمار پولس کمشنر ہونے کے باوجود اپنی معشوقہ مالا سنہا کے اوباش شوہر منموہن کا قتل کرتا ہے اور جب آخر میں شتروگھن کو ساری حقیقت کا پتہ چلتا ہے تو اس وقت تک کافی دیر ہوچکی ہوتی ہے اور موت کے بے رحم ہاتھ سنجیو کمار کو موت کی نیند سلا دیتے ہیں۔اس فلم میں اگر چہ مالا سنہا کا رول بہت ہی مختصر ہے مگر اس کے باوجود اس نے اپنی اداکاری سے بیحد متاثر کیا ہے ویسے اس فلم کے یادگار رول میں سنجیو کمار کی اداکاری کو کوئی بھی بھول نہیں پائے گا اس کے علاوہ مختصر رول میں کیشٹو مکھر جی نے اپنی اداکاری کے ذریعہ بیحد متاثر کیا تھا اور ایسی شاندار کامیڈی کی تھی جس کی مثال نہیں دی جاسکتی۔

سنجیو کمار کی ایک اور یادگار اور ناقابل فراموش فلم این این سپی کی ''دیوتا'' ہے فلم دیوتا میں سنجیو کمار نے گاؤں کے ایک بھولے بھالے اور ایک ہاتھ کے اپاہج کا رول نبھایا ہے لیکن قتل کے ایک

کیس میں پھنس جانے کے بعد وہ گاؤں چھوڑ کر شہر چلا آتا ہے اور ایک مافیا ڈان کے رول میں دوبارہ گاؤں واپس ہوتا ہے۔ اس فلم میں شبانہ اعظمی اور ڈینی کے بھی بہت اہم رول ہیں اور اس فلم میں بھی سنجیو کمار نے ایسی اداکاری کی جس کا موازنہ کسی اور فلم سے نہیں کیا جا سکتا اس نے اپنی بیٹی کے عاشق بنجامن گیلانی کا قتل کیا تھا جو اُسے بن بیاہی ماں بنانے کے بعد گاؤں چھوڑ کر شہر بھاگ جانا چاہتا تھا۔

فلم پرتیچے میں اپنے مختصر رول کے باوجود سنجیو کمار نے بیحد متاثر کیا، اسی طرح سے فلم جینے کی راہ میں بھی اس نے مختصر رول کے باوجود فلم میں جان ڈال دی تھی۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں ایک بہترین فلم ''دھرتی کہے پکار کے'' ریلیز ہوئی تھی جس میں تین بھائیوں کی کہانی تھی۔ کنہیا لال، سنجیو کمار اور جتندر تین بھائی تھے۔ درگا کھوٹے، نندہ اور نیویدیتا اور ترون بوس نے اس فلم میں مرکزی کردار نبھائے تھے۔ اگرچہ اس فلم میں سنجیو اور جتندر نے بھی بہت ہی خوبصورت رول نبھائے تھے لیکن کنہیا لال پوری فلم میں چھایا ہوا رہا اور اس کی اداکاری کے سامنے سنجیو کمار اور ترون بوس جیسے منجھے ہوئے اداکار بھی پھیکے پڑ گئے تھے۔

۱۹۷۰ء میں فلم پارس بھی ریلیز ہوئی تھی جس میں سنجیو کمار، راکھی، شتروگھن اور فریدہ جلال نے اہم رول کئے تھے اس فلم میں بھی سنجیو اپنی اداکاری میں پارس ثابت ہوا تھا۔ ۱۹۹۳ء میں سنجیو کمار اور وحیدہ رحمان کی ''من کی آنکھیں'' ریلیز ہوئی تھی جس میں سنجیو اور سنیل دت نے بہترین اداکاری کی تھی۔ ۱۹۸۰ء میں سنجیو کمار کی مزاحیہ فلم ''پتی پتنی اور وہ'' ریلیز ہوئی تھی اور اس فلم میں سنجیو نے رنجیتا کے ساتھ جس انداز میں فلرٹ کیا تھا اس شاندار کامیڈی کی وجہ سے فلم سپرہٹ ثابت ہوئی تھی۔ رشی کیش مکھرجی کی آشیرواد کو بھی مجموعی اعتبار سے اچھی فلم کہا جا سکتا ہے سنجیو کمار اپنی اداکاری کی دنیا میں ایک آسمان تھے اور ان کی اداکاری کے آگے کوئی بھی اداکار پھیکا پڑ سکتا تھا۔

☆☆☆

سلور جوبلی اسٹار۔ راجندر کمار

عطاء اللہ خان

ہندی فلم انڈسٹری ایک بہت ہی وسیع انڈسٹری ہے۔ یوں تو یہاں پر ۱۹۳۰ء کی دہائی میں ہی فلمیں بننا شروع ہوگئی تھیں اور اب بھی بن رہی ہیں۔ اس وقت بھی فلمیں پسند کی جاتی تھیں اور کثیر تعداد میں لوگ فلمیں دیکھنے جاتے تھے۔ اب بھی سنیما گھر بھرے رہتے ہیں۔ ان سب کے باوجود ۱۹۶۰ء کی دہائی کو ہندی سنیما کا سنہرا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور کی فلمیں اب بھی پسند کی جاتی ہیں اور اس دور کے گیت تو لافانی تصور کئے جاتے ہیں۔ آج بھی ایک بڑا طبقہ ان گیتوں کو ہی سننا زیادہ پسند کرتا ہے۔ ان کے مطابق ان گیتوں میں سر، تال، نغمگی، شاعری اور آواز کا ایک بے حد خوبصورت امتزاج پایا جاتا تھا۔ اس وقت کے اداکاروں میں بھی فطری اداکاری پائی جاتی تھی۔ وہ جو بھی کام کرتے تھے پوری محنت اور لگن سے کرتے تھے اور اس میں پوری طرح ڈوب جاتے تھے۔ اس لئے ان کی اداکاری بے حد پر اثر ہوتی تھی۔ اس دور کے بہترین اداکاروں میں ایک نام راجندر کمار کا بھی آتا ہے۔ راجندر کمار کو جبلی کمار بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ایک دور ایسا بھی تھا کہ جب کسی بھی فلم میں انکی شمولیت کو کامیابی کی ضمانت تصور کیا جاتا تھا۔

راجندر کمار غیر منقسم ہندوستان کے صوبہ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد وہ دہلی چلے آئے اور سبزی منڈی نامی ایک مقام پر سکونت حاصل کی۔ ان کے پاس نہ تو پیسہ تھا اور نہ ہی کوئی کام۔ دو چند سال تک کسی مناسب کام کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ ایک دن انہیں اچانک خیال آیا کہ کیوں نہ فلم انڈسٹری میں اپنی قسمت آزمائی جائے۔ انہیں اپنی شکل وصورت اور ذہانت کے قابل قبول ہونے کا پورا احساس تھا۔ فلموں میں قسمت آزمائی کے مقصد سے انہوں نے اپنے والد کی دی ہوئی گھڑی کو ۶۳ روپے میں فروخت کر دیا اور اس میں سے ۱۳/روپے لیکر دہلی سے ممبئی تک کا سفر کیا۔ بقیہ ۵۰/روپے اپنی جیت میں رکھے اور ممبئی آ گئے۔ یہاں ان کی ملاقات انڈسٹری میں اثر ورسوخ کے مالک سیٹھی سے ہوگئی۔ وہ نیو ایمپائر سنیما میں ٹکٹ فروخت کیا کرتا

تھا۔انہوں نے ان کی ملاقات اپنے ایک نوجوان دوست بلراج دت سے کرائی، وہ بھی اپنے خوابوں کو تلاش کرنے یہاں آیا تھا۔بلراج دت بعد میں سنیل دت کے نام سے بے حد مشہور ہوئے اور آج بھی اسے فلم اور سیاست کا پروقار شخصیت تصور کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں سیٹھی کے مکان میں رہنے لگے اور فلموں میں کام کی تلاش جاری رکھی۔ بعد میں راجندر کمار باندرہ میں واقع گیسٹ ہاؤس میں رہنے لگے، وہاں ان کی ملاقات مشہور نغمہ نگار راجندر کرشن سے ہوئی۔ان کی مدد سے راجندر کمار کو ڈائریکٹر پروڈیوسر ایچ ایس رویل کے معاون کی حیثیت سے ۱۵۰ روپئے ماہوار تنخواہ پر نوکری مل گئی۔ایک دن ان کی ملاقات پروڈیوسر ڈائریکٹر دیویندر گوئل سے ہوگئی۔انہوں نے ان سے کہا کہ ''تم فلموں میں ہیرو کیوں نہیں بن جاتے''۔اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ''ہر کوئی مجھ سے یہی سوال کرتا ہے لیکن فلموں میں کام کوئی نہیں دیتا ہے''۔اس پر گوئل نے انہیں اپنے دفتر میں بلوایا اور اپنی آئندہ فلم ''وچن'' کے لئے انہیں بطور ہیرو سائن کرلیا اور ایک سوایک روپئے بطور سائننگ اماؤنٹ دیئے۔اس فلم کی شوٹنگ ایک سال بعد ہوئی، تب تک وہ رویل کے ساتھ ہی کام کرتے رہے۔

راجندر کمار ایچ ایس رویل کو فلم ''وچن'' کے پریمیر کے لئے اپنی کار میں لے گئے۔ وہاں پر انکی بہت پذیرائی ہوئی اور عوام نے ان کی اداکاری سے خوش ہوکر انہیں گھیر لیا۔ایک دن ایسا بھی آیا کہ جب رویل کے حالات ناسازگار ہوگئے تو انہوں نے رویل کو اپنی کار میں بیٹھا کر اداکارہ سادھنا کے پاس لے گئے اور ان سے رویل کی فلم ''میرے محبوب'' میں کام کرنے کے لئے کہا۔ساتھ ہی اپنی جیب سے سائننگ اماؤنٹ بھی دیا۔انہوں نے ہی نوشاد صاحب کو موسیقی ترتیب دینے کے لئے رضامند کیا۔ یہ فلم اس قدر کامیاب ہوئی کہ اس کے بعد رویل کے اچھے دن پھر سے پلٹ آئے۔فلم ''میرے محبوب'' سے قبل وی شانتا رام کی فلم ''طوفان اور دیا'' منظر عام پر آئی۔اس میں راجندر نے ۳۵۰ روپئے ماہوار پر کام کیا۔اس کے بعد انہیں کئی فلمیں ملیں ان کی ایک تمنّا تھی کہ وہ کسی بڑے بینر کے لئے کام کریں۔ان کی یہ خواہش محبوب پروڈکشن کی فلم ''مدر انڈیا'' میں کام کر کے پوری ہوئی جس میں انہوں نے ایک ہزار روپئے ماہوار پر کام کیا تھا۔اس فلم میں انہوں نے نرگس کے بڑے

بیٹے ''راموٗ'' کا کردار کیا۔اتفاق سے ان کے پرانے دوست سنیل دت نے بھی اس میں ان کے چھوٹے بھائی برجو کا کردار ادا کیا۔اس فلم کے بعد سے راجندر کمار اور سنیل دت کی دوستی اور بھی گہری ہوگئی۔آگے چل کر یہ دوستی رشتہ داری میں تبدیل ہوگئی۔ بہر حال راجندر کمار ایک ایسے کامیاب ہیرو تھے کہ ان کی زیادہ تر فلمیں سلور جبلی، گولڈن جبلی ہوئی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انہیں جبلی اداکار بھی کہا جاتا ہے۔ان کی مشہور فلموں میں مدر انڈیا، گھر سنسار، دھول کا پھول، گونج اٹھی شہنائی، ماں باپ، گھرانا، سسرال، آس کا پنچھی، دل ایک مندر، میرے محبوب، آئی ملن کی بیلا، سنگم، سورج، جھک گیا آسمان، گنوار، آپ آئے بہار آئی، آرزو، گورا اور کالا، ساجن بنا سہاگن، ساجن کی سہیلی، انصاف کا قانون ہیں۔فلم انڈسٹری کے بے حد کامیاب اداکار راجندر کمار کو اس دنیا سے کوچ کئے پانچ سال گذر گئے لیکن اپنی فلموں کے حوالے سے آج بھی وہ ہمارے درمیان محسوس ہوتے ہیں۔

☆☆☆

ناقابلِ شکست فنکار۔اجیت

رشید انجم

اصلی نام: حامد علی خاں، پیدائش: ۲۷/جنوری ۱۹۲۲ء شاہجہاں پور پہلی فلم ''پریم سنگیت'' ۱۹۴۳ء بطور سائڈ رول۔ وفات۔ ۲۱/اکتوبر ۱۹۹۸ء حیدرآباد۔

بہت کم ایسے اداکار ہوئے ہیں کہ جب وہ ہیروشپ سے ریٹائرڈ ہوئے تو بطور کیریکٹر آرٹسٹ اور ویلن اس سے کہیں زیادہ مقبول ہوئے۔ ان میں سرِفہرست اجیت کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اجیت ہیرو بھی آئے، کیریکٹر آرٹسٹ بھی رہے اور ویلن میں بھی انھوں نے وہ مقبولیت حاصل کی کہ جس کی یاد آج بھی فلم دیکھنے والوں کے دلوں میں زندہ ہے۔

اجیت کی رگوں میں وہ خون دوڑ رہا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس خون کے چند قطرے بھی زمین پر گر جائیں تو بیر بہوٹیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ پہاڑوں میں بسے قبائل کی خونخواریت اور دلیری کی حد تک جہالت ان کے سراپے سے دور ہی رہی مگر قد وقامت کو کیا کیجئے کہ وہ سرکش حسن جو صرف قبائلی جسامت سے منسوب رہا، وہ بیباک مردانہ وجاہت جو کوہساروں کی جنوں خیز حرمت مانی گئی اور وہ پرکشش شورشِ جذب وکیف جو صنفِ مخالف کو ایک جھلک میں آمادۂ رفاقت کردے، اجیت صاحب کو اداکاری خداداد حاصل ہوا تھا۔

ان کے والد بشیر علی خاں نظام حیدرآبادی کی ذاتی کار چلاتے تھے۔ اس لئے اس گھرانے کا رکھ رکھاؤ بھی شاہی خاندان کے طور طریقوں کی پیروی کرتا تھا۔ اجیت یعنی حامد علی خاں کی تعلیم وتربیت بھی محلات کے پابند اصول وقواعد کے زیر اثر ہوئی۔ حامد علی خاں کے اجداد بھی نظام دکن کی افواج اور دیگر محکموں میں ملازم رہے۔ لہذا اس خاندان کو تہذیب، لیاقت اور اعلیٰ ظرفی ورثے میں ملی تھی۔

حامد علی خاں کی اٹھان جوانی کی اس چٹان کی مانند ہوئی جو اوپر سے تو سخت ہوتی ہے مگر اپنے اندر پناہ لینے والوں کے وجود پر سایہ فگن بھی رہتی ہے۔ ابھی وہ صرف ۲۱ سال کے تھے کہ فلموں کا شوق ان کی کچی

عمر پر تیکھے ذائقے کی طرح مچل اٹھا۔ کوئی خاص دشواری یا رکاوٹ تو تھی نہیں، لہذا وہ مقدر آزمانے بمبئی آگئے۔ بمبئی فلم کی منڈی بن چکی تھی مگر حامد علی خان پہلے پونہ گئے۔ پونہ میں شالیمار نام سے ایک فلم اسٹوڈیو قائم تھا جس کے مالک ڈبلیو زیڈ احمد تھے۔ زیڈ احمد فلم ''من کی جیت'' کی تیاریاں کررہے تھے۔ اور انھیں کچھ نئے چہروں کی تلاش تھی۔ اردو شعروادب کی دو معروف ہستیاں ساغر نظامی اور جوش ملیح آبادی، زیڈ احمد کی اسٹوری ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ کالج کے مشاعروں میں یہ دونوں حضرات حیدرآباد جایا کرتے تھے جس کالج میں حامد علی خاں زیرِ تعلیم تھے۔ حامد علی خاں اسی حوالے سے ساغر نظامی سے ملے اور فلموں میں کام کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ساغر نظامی کی سفارش پر انھیں اسکرین ٹیسٹ میں شامل کرلیا گیا اور مکالمے دے دیئے گئے۔ حامد علی خاں نے بہت اعتماد سے یہ مکالمے ادا کئے۔

''کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے
شرابیں کہ ایک بار تو اس میں آسی دادا مونچھ ڈبولیں''

ٹیسٹ کامیاب رہا۔ باہر نکلے تو اس دور کے معروف اداکار شیام نے انھیں گلے لگا کر مبارکباد دی۔ حامد علی نے بتایا کہ ان کا تعلق حیدرآباد سے ہے۔ شیام نے انھیں کامیاب ہونے کی زیادہ امید نہیں دلائی۔ ''من کی جیت'' میں تو انھیں نہیں لیا گیا البتہ شالیمار کی دوسری فلم ''پریم سنگیت'' میں انھیں ایک رول دے دیا گیا۔ ۱۹۴۳ء کی اس فلم میں نینا اور جیراج مرکزی کردار تھے اور حامد علی خاں کو فلمی نام اجیت سے متعارف کرایا گیا تھا ''من کی جیت'' ۱۹۴۴ء میں ریلیز ہوئی اور کچھ عرصہ بعد شالیمار اسٹوڈیو بند ہوگیا۔ بمبئی میں شیام ان کے اچھے دوست بن گئے تھے۔

اجیت نے اپنے ایک انٹرویو (مطبوعہ شمع فروری ۱۹۷۶ء) میں اپنی پہلی فلم کا ذکر نہیں کیا لیکن میری تحقیق کے مطابق ان کی پہلی فلم ''پریم سنگیت'' ہی تھی۔ شیام انھیں ''لمبو'' کہا کرتے تھے۔ اور ہمیشہ ان کے روشن مستقبل کی امید دلایا کرتے تھے۔ اس وقت اجیت کولابا بمبئی میں واقع لینن کورٹ کے ایک کمرے میں کرائے پر رہتے تھے۔ اسی عمارت میں شیام بھی قیام پذیر تھے۔

اجیت کو یونیٹی پروڈکشن کلکتہ کی فلم ''کروکیشتر'' میں ایک اہم رول مل گیا۔ ۱۹۴۵ء کی اس فلم

کے ہیرو کندن لال سہگل تھے۔ اسی سال انھیں ایچ ایس رویل نے بھارت لکشمی پکچرس کلکتہ کی فلم ’’ضد‘‘ میں رمولا اور منورما کے مقابل ہیرو لے لیا۔ فلم کامیاب ہوئی تو شیام کے دلاسے اور امید کام آئی اور ان کے مستقبل کو روشن کرنے کی راہیں ہموار کر دیں۔

۱۹۴۹ء میں کے امرناتھ نے اجیت کو اپنی فلم ’’بے قصور‘‘ میں مدھو بالا کا ہیرو بنا دیا۔ مدھوکر پکچرس بمبئی کی اس فلم میں یہ جوڑی بہت پسند کی گئی۔ یہ فلم ۱۹۵۰ء میں ریلیز ہوئی تھی لیکن اس سے قبل ۱۹۴۹ء میں ایم ڈی بیگ کی زیرِ ہدایت فلم ’’جیون ساتھی‘‘ دھوم مچا چکی تھی اس فلم کی ہیروئن سلوچنا چٹر جی تھیں۔ ۱۹۵۰ء میں اجیت فلم ’’مہربانی‘‘ میں بیگم پارا کے ہیرو بن کر پردۂ فلم پر نمودار ہوئے۔ ان فلموں کی کامیابی کے بعد اجیت کا ستارا عروج پر آ گیا۔

۲۶/جون ۱۹۴۳ء کو حیدرآباد سے بمبئی فلم نگری میں آ کر کامیاب ہونے کے پیچھے اجیت کی دلکش شخصیت مہذب رکھ رکھاؤ کے ساتھ ان کے مقدر کی بھی یاوری تھی۔ یہ وہ دور تھا جب موتی لال جیراج، شیام اور اشوک کمار بامِ عروج پر متمکن تھے اور ناصر خان، دلیپ کمار، راج کپور وغیرہ اپنے فن کی آزمائش میں مصروف تھے۔ ان کے درمیان اپنا مقام بنا لینا آسان کام نہ تھا۔ یہ وہ دور بھی تھا جب اداکاری کے فن کی تربیت دے کر نوآموز فنکار کی فنی صلاحیتوں کو نمایاں کرنے والا کوئی تربیتی ادارہ قائم نہیں تھا۔ جتنی بھی تربیت دی جاتی، اداکاری کی فنی اور تکنیکی باریکیوں سے فنکار کو سنوارا جاتا وہ ہدایت کار کی زیرِ نگرانی اور زیرِ تربیت کا ہی نتیجہ ہوتا تھا۔ اجیت کو خداداد صلاحیتیں حاصل رہیں اور وہ ایک کے بعد ایک فلم کے ہیرو بنتے گئے۔

۱۹۵۰ء میں اجیت کے امرناتھ کی فلم ’’سرکار‘‘ میں کام کر رہے تھے۔ یہ فلم موہن پکچرس بمبئی کی تھی جس کی ہیروئن وینا تھیں۔ دوسری جانب فلمستان کی فلم ’’شبستان‘‘ میں شیام، نسیم بانو کے مقابل شوٹنگ میں مصروف تھے کہ ہارس رائڈنگ کے منظر میں گھوڑے سے گر کر ان کی موت واقع ہو گئی۔ اجیت کو ’’سرکار‘‘ کے سیٹ پر اس حادثۂ جانکاہ کی اطلاع ملی تو وہ سکتے میں آ گئے مگر جب یہ معلوم ہوا کہ شیام کو اسپتال لے جایا گیا ہے تو وہ بیساختہ اپنی کار میں بیٹھ کر اسپتال روانہ ہو گئے۔ تیز رفتاری کی وجہ سے اندھیری کے ایک موڑ پر ان کی کار لاری سے اس طرح ٹکرائی کہ کار بالکل تباہ ہو گئی مگر اجیت بال بال بچ گئے۔ ان کے عقب میں بیگم پارہ اپنی کار میں آ رہی تھیں۔ اجیت کے ایکسیڈنٹ کا سن کر وہ زار و قطار رونے لگیں مگر اجیت کو سلامت دیکھ کر بیگم پارہ نے اللہ کا شکر

ادا کیا۔ دونوں اسپتال پہونچے مگر شیام تو دنیا چھوڑ چکے تھے۔ ان کی فلم ’’شبستان‘‘ ۱۹۵۱ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

۵۰ کی دہائی میں کے آصف نے اپنی تاریخی فلم ’’مغلِ اعظم‘‘ شروع کی تھی۔ مغلِ اعظم میں چندر موہن، اکبر، سپرو، شہزادہ سلیم اور نرگس، انارکلی کے کرداروں کے لیے منتخب ہو چکے تھے البتہ درجن سنگھ کے کردار کے لئے کسی کا انتخاب کیا جانا تھا۔ اجیت اور اداکار سریش اسکرین ٹیسٹ میں ناکام ہوئے۔ درجن کا رول ہمالیہ والا کو مل گیا۔ چندر موہن کے انتقال کے بعد یہ فلم بند ہو گئی۔ جب نئے سیٹ اپ اور نئی کاسٹ دلیپ کمار، مدھو بالا اور پرتھوی راج کے ساتھ کے آصف نے پھر سے ’’مغلِ اعظم‘‘ شروع کی تو درجن سنگھ کا رول اجیت کے حصے میں آیا اور لوگ اس کردار کو آج بھی نہیں بھولے ہیں۔

اجیت نے دلیپ کمار کے ساتھ صرف دو فلموں میں کام کیا تھا۔ فلم ’’نیا دور‘‘ ۱۹۵۷ء اور ’’مغلِ اعظم‘‘ ۱۹۶۰ء ان دونوں فلموں میں اجیت نے دلیپ کمار کے جاں نثار اور جگری دوست کے یادگار کردار نبھائے تھے۔ مینا کماری کے ساتھ فلم ’’ہلاکو‘‘ ۱۹۵۶ء میں ہیرو کا رول ادا کیا تھا۔ ۱۹۵۹ء کی فلم ’’جاگیر‘‘ میں انھیں مینا کماری کے بالمقابل ہیرو لیا گیا تو بقول اجیت صاحب کہ ’’فلم انڈسٹری کے ایک بڑے اداکار نے ان سے (اجیت سے) کہا تھا کہ میناجی کے ساتھ فلم میں بہت سنبھل کر کام کرنا پڑتا ہے‘‘ اجیت کو جب ’’جاگیر‘‘ فلم ملی تو یہ جملے ان کے ذہن میں گونجنے لگے اور وہ فلم کو ادھوری چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بعد میں یہ رول پریم ناتھ نے ادا کیا تھا۔ برسوں بعد (مینا کماری کی وفات کے بعد) اجیت اپنی بیوی کے ساتھ کشمیر گئے۔ خود انھوں نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ چیتن آنند نے ’’روشنی اور آواز‘‘ پروگرام ترتیب دیا تھا جو صوت وصدا کے توسط سے سری نگر میں واقع شالامار باغ میں ہر شام دکھایا جاتا تھا۔ اس پروگرام میں جہانگیر کا کردار اجیت نے اور نور جہاں کا کردار مینا کماری نے ادا کیا تھا۔

سری نگر میں اجیت نے یہ پروگرام اپنی اہلیہ کے ساتھ دیکھا اور پرچھائیوں میں جب مینا کماری کی آواز ابھری تو اجیت بری طرح رو دئے۔ بیوی حیران کہ ماجرا کیا ہے؟ پوچھنے پر بتایا کہ یہ اس عظیم فنکارہ کی آواز ہے جس نے دنیا سے رخصت ہو کر ہمیں سوگوار کر دیا۔ آج ان وادیوں میں صرف ان کی آواز گونج رہی ہے‘‘

اجیت چونکہ پٹھان تھے، اس لئے ان کے وجود میں کہیں خونخواریت کا عنصر بھی موجود تھا اور اس

خونخواریت کی تسکین وہ شیر کا شکار کر کے حاصل کرتے تھے۔ امجد خان کے والد جینت بھی قبائلی پٹھان تھے دونوں کے مزاج اور شوق ایک ہی جیسے تھے۔ رہتے بھی قریب قریب تھے۔ جینت کے ساتھ اجیت نے صرف دو فلموں ''بڑا بھائی'' ۱۹۵۷ء اور ''کابلی خان'' ۱۹۶۳ء میں کام کیا تھا۔ یہ فلمیں نزدیکی کا سبب بن گئیں۔ عمر میں بڑا ہونے کے باوجود دونوں میں گہری دوستی تھی۔ اس دور میں بھوپال کے جنگلات درندوں اور شکار سے بھرے ہوئے تھے۔ بینڈ ماسٹر تراہے پر واقع مرزا حمید خان کا مکان فلم والوں کی آماجگاہ رہتا تھا۔ میرے والد بھی اچھے شکاری تھے۔ مجھے یاد ہے، ۱۹۶۰ء کے اوائل میں جینت اور اجیت بغرض شکار بھوپال آئے تھے اور حمید بھیا کے یہاں قیام کیا تھا۔ دوسرے دن والد کے ہمراہ حمید بھیا ان سب کو لے کر شکار پر گئے اور شیر کے علاوہ چیتل سانبھر بھی مار کر لائے تھے۔ اس وقت تک شکار پر پابندی عائد نہیں ہوئی تھی۔

اجیت کی فلموں کی تعداد تو بہت زیادہ نہیں ہے لیکن بطور ہیرو انھوں نے اپنے وقت کی تقریباً بڑی ہیروئنوں کے مقابل کام کیا۔ مدھو بالا، مینا کماری، نلنی جیونت، گیتا بالی، شیلا رمانی بینا رائے، اوشا کرن، چترا، ثریا، منور سلطانہ، آشا ماتھر، پورنیما نگار سلطانہ، کوشلیا، مینا شوری ان کی ہیروئن رہیں۔ پھر عمر کے تقاضے شروع ہوئے تو اجیت نے کیریکٹر رول لینا شروع کر دیئے ''بڑا بھائی'' اور ''کابلی خان'' میں ان کے کرداروں کو سراہا گیا تھا ''نیا دور'' اور ''مغلِ اعظم'' کے رول تو ان کی اداکاری کے گویا سنگِ میل ثابت ہوئے۔ تقریباً ۱۱۵ فلموں میں اجیت نے ہیرو، سائیڈ ہیرو، کیریکٹر آرٹسٹ اور ویلن کے کردار کئے۔ ۱۹۸۱ء میں وہ دل کے جان لیوا عارضہ میں مبتلا ہوئے اور امریکہ میں ان کی اوپن ہارٹ سرجری ہوگئی۔ اس کے بعد وہ فلموں سے کنارہ کش ہوگئے اور مستقل طور پر حیدرآباد میں بود و باش اختیار کر لی اسی دوران ان کا ایک بیٹا فلم ''پولس پبلک ۱۹۹۰ء میں ارباز خان کے نام سے ہیرو بن کر آیا۔ دوسرا بیٹا شہزاد بھی فلموں میں اور ٹی وی سیریل میں اجیت کی کاپی کر کے اپنی اداکاری کا بھرم قائم رکھے ہوئے ہے۔ ۱۹۷۱ء میں فلم ''پرایا دھن'' اور ۱۹۷۳ء میں ناصر حسین کی فلم ''یادوں کی بارات'' کے علاوہ ۱۹۷۳ء میں ہی امیتابھ بچن کی یادگار فلم ''زنجیر'' میں وہ ویلن کی حیثیت سے اپنی درندہ صفت اداکاری کا لوہا منوا چکے تھے۔ دیگر فلموں میں بھی انھوں نے کبھی فلم فلیش اور کبھی مختصر ویلن کے کردار ادا کئے۔ ۱۹۸۱ء میں سرجری کے بعد وہ عرصہ تک فلموں کی چکا چوند سے دور تقریباً گمنام رہے مگر ان کے

چاہنے والے انھیں فراموش نہیں کر سکے۔ کامل گیارہ سال بعد یعنی ۱۹۹۲ء میں فلم ساز سلیم اختر اجیت کو پھر سے فلموں میں لے آئے۔ ۱۹۹۲ء میں سلیم اختر کی دو فلموں ''پولس آفیسر'' اور ''جگر'' میں اجیت نے اسی کروفر کے ساتھ ویلن کے کردار ادا کئے جو انکی شخصیت کے ساتھ مخصوص رہے تھے۔ ''آدمی'' ۱۹۹۳ء اور ''آ گلے لگ جا''' وغیرہ میں ان کا سکّہ پورے جوش سے قائم رہا۔ دیو آنند کی فلم ''گینگسٹر'' ان کی آخری فلم تھی جو ۱۹۹۵ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم کے بعد انھوں نے پھر کوئی فلم قبول نہیں کی اور حیدرآباد لوٹ گئے جہاں ان کے اپنے ان کی راہ مین نگاہیں فرشِ راہ کئے ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ آرام کیا اس آرام میں اگر کسی نے مخل ہونے کی جرأت کی تو وہ موت کی دستک تھی۔ اکتوبر ۱۹۹۸ء میں انھیں مقامی نرسنگ ہوم میں داخل کیا گیا مگر اب قدرت ان کی طلب گار تھی۔ ۲۱/اکتوبر ۱۹۹۸ء کو انھوں نے آخری بار کھلی آنکھ سے سب کو دیکھا اور محض ۷۶ سال کی عمر میں وہ آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔

پران، امریش پوری، کے این سنگھ، کنہیا لال، جینت، تواری، مدن پوری جیسے برے آدمیوں کو انھوں نے کبھی خود پر حاوی نہیں ہونے دیا نہ ان کی تقلید کی۔ اپنی خاندانی مردانہ وجاہت کو ہی انھوں نے اپنے فن کی اساس بنایا اور ایک الگ سب سے جدا برے آدمی کی روش پر گامزن رہے۔ سفید لباس خاص قسم کا سفید فیلٹ ہیٹ، سفید جوتے، ہونٹوں پر نیم سفید مونچھوں کی قطار، لبوں میں دبا ہوا سگار یا کبھی پائپ، مکالموں کی ادائیگی میں شائستگی۔ مقابل کو گالی بھی دی تو اس میں بھی ان کا مہذب لہجہ موجود رہا۔ یہ تمام ان کی شخصیت کو بالکل نئے، انوکھے انداز کا فلم ویلن بنا کر پیش کرتے رہے کہ دیکھنے والا ان کے شگفتہ لہجہ میں بھی خونخواریت اور درندگی محسوس کئے بنا نہیں رہی۔ ''مونا ڈارلنگ'' ان کا مخصوص تکیہ کلام مکالمہ تھا۔ اجیت بے شک ناقابلِ شکست ویلن تھے۔

☆☆☆

میوزیکل فلموں کا سدا بہار ہیرو۔ بھارت بھوشن

ڈاکٹر الف انصاری (مغربی بنگال)

شہنشاہِ جذبات دلیپ کمار کے بعد اگر کسی اداکار نے اپنی المیہ اداکاری کا گہرا نقوش فلمی
شائقین کے دلوں پر چھوڑا ہے تو وہ بلا شبہ بھارت بھوشن ہے جو گذشتہ پچاس برسوں سے ہندستانی فلم
اسکرین پر کروڑوں پرستاروں کا محبوب ہیرو بنا رہا۔ اور جس نے بہت ساری کلاسیکل اور میوزیکل
فلموں میں کام کیا ہے ان میں بیشتر میوزیکل ہٹ فلمیں ثابت ہوئیں جیسے بیجو باورا، بسنت بہار،
شباب، مرزا غالب، برسات کی رات، سوہنی مہیوال، رانی روپ متی، پھاگن، جہاں آرا اور گھونگھٹ
وغیرہ۔ یہ تمام فلمیں بھارت بھوشن کی المیہ اداکاری کی بے مثال فلمیں تسلیم کی جاتی ہیں۔ بھارت
بھوشن کے چہرے کی معصومیت، کشش، اور سنجیدگی اس کی المیہ اداکاری کے خاص جوہر ہیں۔

فلموں میں شاعر 'گویا' اور ایک سچے عاشق کے کردار کو حقیقت کا روپ دینے کے لئے
بھارت بھوشن کا انتخاب اس لئے ہوا کرتا تھا کہ اس میں ان کرداروں کو ادا کرنے کی
صلاحیتیں پوری طرح موجود تھیں جب وہ پردے پر ایک شاعر 'گویا' یا عاشق کا کردار
ادا کرتا تھا تو اس کے چہرے کے حرکات وسکنات چہرے کا تاثر، اور مکالموں کی ادائیگی
سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھارت بھوشن نہیں بلکہ ایک حقیقی شاعر' ایک گویّا یا ایک سچا عاشق ہے
بھارت بھوشن کی ان ہی صفات نے اسے اداکاری کے بامِ عروج پر پہنچا دیا۔

ایک زمانہ وہ تھا جب بھارتی فلموں میں بھارت بھوشن کی حکومت تھی۔ پہلی فلم ''بھگت کبیر''
میں اُس نے ایک صوفی شاعر کبیر داس کا مرکزی رول میں پہلی بار المیہ اداکاری کا نمونہ پیش کیا۔ یہ فلم
کلکتہ میں بنی تھی جب فلم ریلیز ہوئی تو فلم بینوں نے بھارت بھوشن کی اداکاری کو کافی سراہا اس فلم کی
شہرت اور کامیابی کے بعد ایک پروڈیوسر نے اسے ایک فلم ''بھائی چارہ'' میں موقع دیا لیکن کلکتہ اس
وقت شدید اقتصادی مسائل سے دوچار تھا جس کے سبب پروڈکشن کمپنی نے اپنا دفتر پونا کے شالیمار
اسٹوڈیو میں منتقل کر دیا لیکن بدنصیبی یہ ہوئی کہ ''یونیٹی پروڈکشن پارٹنروں کی غلط فہمیوں اور آپسی
اختلافات کے سبب ٹوٹ گیا اس طرح بھارت بھوشن کی یہ فلم ادھوری رہ گئی۔

قسمت ایک بار پھر بھارت بھوشن پر مہربان ہوئی جب شالیمار اسٹوڈیو کے چیف

ڈبلو۔ زیڈ۔ احمد نے اس کو فلم ''کرشن بھگوان'' میں کرشن کے رول کے لئے پیش کیا۔ اس فلم نے فلم
بینوں کے ذہن پر اچھا تاثر دیا۔ اب تک بھارت بھوشن کو اس کی منزل نہیں ملی تھی جس کا وہ منتظر تھا
لیکن بھارت بھوشن اپنی منزل کی تلاش میں مسلسل جدوجہد کر رہا تھا۔ حسنِ اتفاق کہ ایک دن اس کی
ملاقات عظیم موسیقار نوشاد سے ہوئی۔ ان دنوں وکرم بھٹ کو ایک میوزیکل فلم ''بیجو راؤ'' کے لئے
ہیرو اور ہیروئن کی تلاش تھی۔ ان کی نظر میں دلیپ کمار اور نرگس تھی مگر جب نوشاد صاحب کو معلوم
ہوا تو انہوں نے دلیپ اور نرگس جیسے منجھے ہوئے اداکار کو لینے سے انکار کیا۔ اور اپنی تجویز میں
بھارت بھوشن اور مینا کماری کا نام پیش کیا ان دونوں کی شمولیت سے ایک ایسی تاریخی' یادگار
اور میوزیکل ہٹ فلم بنی جسے ہم ''بیجو راؤ'' کے نام سے جانتے ہیں اس فلم نے ممبئی اور دیگر شہروں میں
سلور جوبلی منائی اور اگر دیکھا جائے تو اسی فلم کے ذریعہ بھارت بھوشن ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔ اس
فلم کی کامیابی کے بعد وکرم بھٹ نے بھارت بھوشن اور مدھوبالا کو اپنی ہٹ فلم ''پھاگن'' میں دوبارہ
پیش کیا۔ یہ فلم بھی او پی نیر کے خوبصورت گیتوں کے سبب آج بھی مقبول ہے۔

بھارت بھوشن کی زندگی کی ایک اور یادگار فلم سہراب مودی کی 'مرزا غالب' ہے جس میں
بھارت بھوشن نے شاعر اعظم مرزا غالب کا کردار بحسن وخوبی نبھایا اور کہیں کہیں غالب کی حقیقی
چھبی بھی ان میں نظر آئی۔ مقابل میں مشہور اداکارہ اور گلوکارہ ثریا تھیں۔ ثریا کی دلکش آواز
نے جادو جگا دیا اور مرزا غالب کی غزلوں کو زبان زد خاص و عام کر دیا۔

ابتدائی دنوں میں بھارت بھوشن فلم انڈسٹری میں اچھی طرح اپنا قدم جما بھی نہیں پایا
تھا کہ تقسیم ہند کے بعد ہی کرشن چندر، جوش ملیح آبادی، اختر الایمان، راما نند ساگر، بھرت
ویاس، اور شیام پاکستان سے ہندستان چلے آئے اور فلم انڈسٹری کے مرکز بمبئی میں قیام
کیا۔ پھر مشہور فلم ساز ڈبلو۔ زیڈ۔ احمد ہندستان سے پاکستان کے لئے روانہ ہوئے۔ ان
کے ترکِ وطن سے بھارت بھوشن کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا اسی دوران بھارت
بھوشن کی ملاقات چندر شیکھر سے ہوئی جو خود بھی ممبئی کی فلم انڈسٹری میں داخل ہونے کے
لئے جدوجہد کر رہے تھے ان دونوں کی یہ ملاقات دوستی میں بدل گئی۔

جب بھارت بھوشن اور چندر شیکھر ممبئی آئے تو کیدار شرما نے بھارت بھوشن کو اپنی فلم ''سہاگ
رات'' میں مرکزی رول کے لئے سائن کیا اس کے مقابل گیتا بالی کا انتخاب ہوا یہ فلم ۱۹۴۸ء میں

ریلیز ہوئی تھی اس فلم کی کامیابی کے بعد بھارت بھوشن نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا بلکہ اس کے سنہرے فلمی دور کا آغاز ہوا۔ یکے بعد دیگرے کئی فلمیں ملنے لگیں جیسے آنند مٹھ، ہیروئن رنجنا، انگولی مالا۔لڑکی۔ ہیروئن انجلی دیوی، رانی روپ متی ہیروئن نروپارائے، چکوری۔ بے بس، چیتنا، مہاویر پربھو، سوہنی مہیوال، ہیروئن نمّی۔ بسنت بہار (نمّی) شباب (نوتن) جہاں آرا (مالاسنہا) مرزا غالب (ثریا) پھاگن (مدھوبالا) برسات کی رات (مدھوبالا) بیجو باورا (مینا کماری) جیسی میوزیکل فلمیں بھارت بھوشن کی یادگار فلمیں ثابت ہوئیں۔

موسیقار نوشاد اور فلم ساز وکرم بھٹ کی ہٹ میوزیکل فلم سے بھارت بھوشن کو دائمی شہرت ملی اس فلم میں نوشاد کی شاہکار موسیقی، محمد رفیع اور لتا منگیشکر کے لاثانی گیت اور بھارت بھوشن کی ناقابلِ فراموش المیہ اداکاری نے اس فلم کو لازوال شہرت بخشی جس طرح محبوب خان' فلم مدر انڈیا' کے آصف مغلِ اعظم' دلیپ کمار دیوداس' مغلِ اعظم' امجد خان' شعلے' کے ذریعہ ہمیشہ یاد کئے جائیں گے اسی طرح بھارت بھوشن بھی فلم' بیجو باوَرا' جیسی ہٹ میوزیکل فلم کے ذریعہ برسہا برس عوام کے دلوں و دماغ میں محفوظ رہیں گے۔

بھارت بھوشن کی چند یادگار فلمیں

فلم کا نام	ہیروئن	سن	فلم کا نام	ہیروئن	سن
انگولی مالا			کوی کالی داس		
چترلیکھا	مہتاب	1941	سہاگ رات		1948
آنکھیں	نلنی جیونت	1950	شری چیتنیہ		
بیجو باورا	مینہ کماری	1952	بسنت بہار	نمی	1956
پھاگن	مدھوبالا	1956	مرزا غالب	ثریا	1957
رانی روپ متی	نروپارائے	1959	برسات کی رات	مدھوبالا	1960
سنگیت سمراٹ تان سین	انیتا گوہا	1962	جہاں آرا	مالاسنہا	1964
گیارہ ہزار لڑکیاں	مالاسنہا	1950	گونگھٹ	بینارائے	1960
دوج کا چاند	بی سروجا دیوی	1962	تقدیر		1967
سونی مہیوال	نمی	1967	پیار کا موسم	آشا پاریکھ	1968

☆☆☆

شہنشاہوں کے شہنشاہ اداکار۔شیخ مختار

خواجہ احمد حسین (مغربی بنگال)

پرانے اداکاروں میں ایک شہنشاہ اداکار شیخ مختار بھی تھے۔انہیں شہنشاہ اداکار کا درجہ اس لئے دیا گیا کہ وہ صحیح معنوں میں شہنشاہ تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہیں دلیپ کمار، راج کپور، اور دیوانند کے مقابلے میں رکھا نہیں جاسکتا کیونکہ متذکرہ تینوں اداکار شہنشاہ جذبات، شہنشاہ جوکر اور شہنشاہ گلیمر تھے لیکن ان سے الگ ہٹ کر دیکھا جائے تو دوسرے درجہ کے ستاروں میں جہاں پرتھوی راج، سہراب مودی، موتی لال، بلراج ساہنی کا نام لیا جاسکتا ہے۔تو اسی درمیان شیخ مختار کا نام بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔اس ضمن میں اشوک کمار کا نام اس لئے نہیں لیا جاسکتا ہے کہ اشوک کمار کا کوئی مقابلہ نہیں وہ شروع تا آخر اداکاروں کے اداکار شہنشاہ بالی ووڈ تھے۔البتہ شیخ مختار کو متذکرہ تمام اداکاروں سے الگ ہٹا کر دیکھنا ضروری ہوگا کیونکہ انہوں نے صرف چند اے گریڈ کی فلموں کے علاوہ زیادہ تر سی گریڈ کی فلمیں کیں لیکن اتنا ضرور تھا کہ فلموں کے شائقین صرف ان کا نام دیکھ کر ہی فلمیں دیکھنے جایا کرتے تھے۔

شیخ مختار ۱۹۴۰ء میں پشاور سے ممبئی چلے آئے تھے۔ اور ممبئی میں ان کی ملاقات اس زمانے کے مشہور پروڈیوسر اور ڈائرکٹر آسپی سے ہوئی تھی اور ڈائرکٹر آسپی کے ایک کمرے والی فلیٹ باندرہ میں وہ رہنے لگے تھے۔ آسپی ان دنوں خود فلم پروڈکشن انچارج کے ماتحت کام کرتے تھے اور انہوں نے کئی اہم پروڈیوسروں بشمول محبوب خان، ایس یوسنی، کیدار شرما اور وجے بھٹ سے شیخ مختار کے لئے سفارش کی تھی لیکن شیخ مختار کو پہلی کامیابی سہراب مودی نے دلائی جب انہوں نے آسپی سے برماروڈ بنانے کے لئے کیا اور نہ صرف ان کی فلم کے لئے کئی اہم ڈسٹر بیوٹری کمپنی سے متعارف کرایا بلکہ فلم کے ابتدائی چند ریل تیار کرنے کے لئے اپنی جیب سے سرمایہ بھی دیا۔فلم برماروڈ میں شیخ مختار اور اشوک کمار، نلنی جیونت اور مدھو بالا نے کام کیا تھا۔فلم اوسط درجہ کی رہی اور آسپی کو نقصان نہیں ہوا اور دوسری طرف شیخ مختار کو زبردست مقبولیت ملی جب انہوں نے اپنے وقت کے سپر اسٹار دادامنی اشوک کمار کے ساتھ کام کیا۔اس فلم کے بعد وجے بھٹ کی پروڈکشن میں آسپی نے دوسری تاریخی فلم ''چنگیز خان'' شروع کردی اور ٹائیٹل رول شیخ مختار کو دیا جس میں پریم ناتھ اور بینا رائے نے کام کیا تھا۔ٹائیٹل رول میں چنگیز خان کے طور پر شیخ مختار نے اپنی اداکاری کا لوہا منوالیا۔ یہ فلم سپرہٹ ثابت ہوئی تھی۔اس کے بعد آسپی نے قیدی نمبر ۹۱۱ اور بڑا بھائی بھی بنائی۔قیدی نمبر ۹۱۱ میں محمود نے ہیرو کا رول ادا کیا تھا اور اس فلم میں

سب سے اہم رول خطرناک قیدی ہیرا لال کا تھا جو جیل سے بھاگ کر ایک گھر میں پناہ لیتا ہے اور ایک کمسن بچے کو اغوا کر لیتا ہے۔اس فلم میں شیخ مختار کی اداکاری قابل تعریف تھی۔اسی طرح سے بڑا بھائی میں اس نے سبی راج کے بڑے بھای کا رول ادا کیا تھا۔اس فلم میں شیخ مختار تالا توڑنے کے ماہر تھے لیکن ایک مرتبہ جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ ایک اچھا انسان بننے کی کوشش کرتے ہیں۔اس فلم میں ان کے جذباتی اداکاری اور اپنے چھوٹے بھائی کو پڑھا لکھا کر ایک کامیاب انسان بنانے کی کوشش ان کی اداکاری میں چار چاند لگا تا نظر آتا ہے۔

۱۹۷۰ء میں آپسی کی سپرہٹ فلم ’’شبنم‘‘ آئی تھی جس کے ہیرو محمود اور ہیروئین جنوب کی وجے لکشمی تھی۔فلم بغداد کے پس منظر میں فلمائی گئی تھی۔یہاں پر ایک بات قابل ذکر ہے کہ شیخ مختار کی زیادہ تر فلموں میں مزاحیہ اداکار مقری ہوا کرتے تھے۔شبنم،گنہگار،برما روڈ،لمبوان ہانگ کانگ،ہم سب استاد ہیں،یہ سبھی فلمیں بے حد اچھی اور کامیاب فلمیں تھی۔۱۹۷۰ء میں آپسی کی ایک اور بڑے بجٹ کی فلم ’’استادوں کے استاد‘‘ ریلیز ہوئی تھی جس میں اشوک کمار،شکیلہ،پردیپ کمار اور شیخ مختار نے اہم رول ادا کیا تھا۔اس فلم میں شروع سے آخر تک شیخ مختار کو ایک خطرناک مجرم دکھایا گیا جو قتل،بینک ڈکیتی،رہزنی،اور نقب زنی میں ماخوذ تھا اور دوسری طرف اشوک کمار کو شروع تا آخر خفیہ پولس کا افسر،لیکن فلم کے اختتام تک پتہ چلتا ہے کہ خفیہ پولس افسر شیخ مختار تھے اور اصل مجرم اشوک کمار،اس فلم کے ایک سین میں شیخ مختار جب اشوک کمار سے ملتے ہیں تو اشوک کمار پوچھتے ہیں تم کون ہو جس پر شیخ مختار بڑے زعم سے کہتے ہیں استادوں کے استاد اور جب وہ اشوک کمار سے پوچھتے ہیں کہ وہ کون ہے تو دادا منی اپنے مخصوص انداز میں سگریٹ کا کش لیکر مسکراتے ہوئے کہتے ہیں۔استادوں کے استاد کے استاد،یہ کہہ کر وہ جس انداز میں اپنی ایک آنکھ دباتے ہیں ہیں اس کی وجہ سے شیخ مختار پانی پانی ہو جاتے ہیں۔اشوک کمار کے ساتھ شیخ مختار نے آپسی کی فلم ’’دو بھائی‘‘ میں بھی کام کیا۔اس فلم کے ہیرو جتندر اور ہیروئن مالا سنہا تھی۔اس فلم میں ایک لڑکی جو حاملہ تھی وہ خودکشی کر لیتی ہے اور اس کا بھائی شیخ مختار جب دبئی سے ممبئی آتا ہے اور تفتیش کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ اس کی بہن اشوک کمار سے محبت کرتی تھی لہٰذا اس نے یہی سوچا کہ اشوک کمار نے اس کی عزت سے کھیل کر اسے خودکشی کرنے پر مجبور کیا اور پھر وہ اس کے تعاقب میں لگ جاتا ہے تا کہ موقع پاتے ہی اس کا کام تمام کر دے۔لیکن فلم کے آخر میں انکشاف ہوتا ہے کہ اشوک کمار بے گناہ ہے۔اور اس لڑکی کی عزت ایک بدمعاش منموہن نے لوٹ لی تھی اور اشوک کمار غصے میں پاگل ہو کر ٹرین کے ڈبے میں گھس کر اس کا قتل کر دیتے ہیں اور اس قتل کی چشم دید گواہ مالا سنہا ہوتی ہے۔اس میں شیخ مختار کا رول مختصر ہونے کے باوجود بیحد متاثر کن تھا۔

فلم ’’نور جہاں‘‘ جو مغلیہ دور کے پس منظر میں فلمائی گئی ایک بہترین اور ناقابل فراموش فلم تھی۔وہ فلم شیخ مختار کی زندگی کی آخری فلم تھی جو ۱۹۸۰ء میں ریلیز ہوئی تھی اس فلم میں مینا کماری اور پردیپ کمار کے ساتھ شیخ مختار نے بہت ہی اہم رول نبھایا تھا اور فلم کی ہدایت اہم صادق اور موسیقی روی نے ترتیب دی تھی فلم تجارتی نکتہ نگاہ سے نہیں بنی تھی اس لئے یہ فلم فلاپ ہو گئی اور فلم کے پروڈیوسر شیخ مختار کو دل کا دورہ پڑ گیا لیکن پھر وہ صحت یاب ہونے کے بعد اس فلم کے تمام ریل جو ہندوستان میں تقسیم کئے گئے تھے سب کو اپنے قبضے میں واپس لے لیا اور ایک رات خاموشی سے لاہور (پاکستان) چلے گئے۔اور وہاں انہوں نے اس فلم کی نمائش کی تو یہ فلم پورے پاکستان میں سپرہٹ ہو گئی اور صرف ایک ہفتے میں اس فلم نے کروڑوں کا بزنس کیا جس پر شیخ مختار کو دوسری مرتبہ دل کا دورہ پڑا اور اس وقت جب فلم سلور جبلی منا رہی تھی اور کروڑوں روپئے کی آمدنی ہو رہی تھی وہیں شیخ مختار اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔اس فلم کا ایک بھی ریل ہندوستان میں نہیں ہے اور پوری ریل پر پاکستان کا قبضہ ہے جبکہ اس فلم کو ہندوستان کی ملکیت ہونا چاہئے کیونکہ شیخ مختار نے یہ فلم ہندوستان میں تیار کروائی تھی۔

شیخ مختار نے سکنڈ اور تھرڈ گریڈ کی ہیروئینوں بشمول کم کم،چترا،سعیدہ خان،وغیرہ کو بہت آگے بڑھایا اور خاص طور پر کم کم کو کافی فائدہ پہنچا شیخ مختار کی فلم نور جہاں کی ریلیز پر دلیپ کمار بھی پریمیئر میں موجود تھے اور انہوں نے فلم دیکھنے کے بعد کہا تھا کہ ہندوستان کی تاریخی فلموں میں سکندر،پکار،جھانسی کی رانی،مغلِ اعظم،انارکلی،جہاں آرا،کے بعد نور جہاں ایک حسین اضافہ ہے اور اس فلم کی خوبصورت ہدایت کاری کے لئے ایم صادق مبارکباد کے قابل ہیں۔دلیپ کمار کا بیان ۱۹۸۰ء کے مارچ کے شمع میگزین نے شائع کیا تھا اور اسی شمارے میں دلیپ کمار اور شیخ مختار کی ایک یادگار تصویر بھی تھی جس میں دلیپ صاحب شیخ جی کو گلے لگائے ہوئے تھے۔

شیخ مختار کو فلمساز و ہدایتکار کمال امروہوی فلم رضیہ سلطان میں سہراب مودی کا رول دینا چاہتے ہیں لیکن شیخ مختار نے وہ رول کرنے سے اس لئے انکار کر دیا تھا کہ سہراب مودی اپنی بیماری کی وجہ سے ایک ماہ کے لئے شوٹنگ کرنے سے قاصر تھے۔اس سے پہلے وہ کے آصف کی فلم لو اینڈ گاڈ (محبت اور خدا) میں نمی کے والد کا جنت والا رول ادا کرنے سے بھی انکار کر چکے تھے۔

☆☆☆

فلم کا پہلا باغی اداکار۔شمی کپور

رشید انجم (بھوپال)

نام: شمشیر راج کپور۔ فلمی نام: شمی کپور۔ پیدائش ۲۱/اکتوبر ۱۹۳۱ء۔بمبئی۔

پہلی اسٹیج پر مارمینس: ۱۹۴۳ء۔ پرتھوی تھیٹر۔ ڈرامہ۔ شکنتلا۔ عمر: ۱۲ سال۔ کردار: شکنتلا اور اس کے بیٹے کا۔

پہلی فلم: ۱۹۵۳ء فلم ''گل صنوبر'' بطور ہیرو۔ ہیروئن: شیاما۔ ہدایت: اُپسی۔ فلمساز: جے بی واڈیا۔کل فلمیں بطور ہیرو: ۱۱۷۔ بطور کیریکٹر: ۵۷، بطور ہدایت کار: ۲۔منورنجن ۱۹۷۴۔ بنڈل باز۔ ۱۹۷۶ء

راجکپور سے ۷ سال چھوٹے پرتھوی راج کپور کے دوسرے بیٹے۔ ماٹونگا کا بمبئی کے چھوٹے سے مکان میں بچپن گزرا۔تعلیم حاصل کی اور بچپن میں ہی پرتھوی تھیٹر سے جڑ گئے۔ ایک عام ملازم کی طرح تھیٹر میں کام کیا اور تھیٹر کے ڈراموں میں اداکاری بھی کی۔ اپنے اداکار بھائی سے ایک دم جدا رہ کر اپنی فنکارانہ پہچان قائم کی۔ ۱۹۵۳ء میں جے بی واڈیا نے فینٹیا سی فلم ''گل بکاؤلی'' میں شیاما کے مقابل ہیرو بنا دیا۔ اس سال ''جیون جیوتی''۔''لیلےٰ مجنوں''۔''ریل کا ڈبہ''۔اور ''ٹھوکر'' فلمیں آئیں۔ اورفلاپ ہوگئیں۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۶ء تک قائم رہا۔تقریباً ۲۰ فلمیں ان کی ناکام رہیں۔ ان فلموں میں وہ رومانی ہیرو بھی تھے۔ مجنوں بھی، پروانہ بھی، مرزا بھی، ڈاکو بھی اور تانگے والا بھی۔ اپنے بھائی راج کپور کی طرح مونچھیں رکھتے تھے۔فلمستان کے مالک ششدھر مکرجی کو شمی کپور میں اپنا ہیرو نظر آیا تو شمی کپور کو منتخب کرلیا۔ ایس مکرجی فارمولا فلمیں بنانے میں ماہر تھے۔ انہوں نے شمی کا صرف ہیراسٹائل تبدیل کیا، نہ ان کی مونچھیں بھی صاف کرا دیں اور نئے گیٹ اپ، نئے لک کے ساتھ ناصر حسین کی ہدایت میں فلم ''تم سا نہیں دیکھا'' میں امیتا کے مقابل پیش کر دیا۔ ناصر حسین کی بھی یہ پہلی فلم تھی اور اسکرپٹ بھی انہیں کا تھا۔''تم سا نہیں دیکھا'' او پی نیر کے ہٹ میوزک سے سجی رومانی فلم ثابت ہوئی اور شمی بطور باغی اداکار Established ہوگئے۔ باغی ان معنوں میں

کہ ہیرو محبت میں ہارتا نہیں ہے۔ ناکام محبت کو بھی سماج، روایت اور رسموں سے بغاوت کر کے کامیاب محبت میں بدلنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ دلیپ کمار، راجکپور اور دیو آنند جیسے بلند فنکاروں کے درمیان خود کو منوالینا بڑا ہی دشوار اور ناممکن سا مرحلہ تھا۔شمی کپور کے لئے ضروری تھا کہ وہ ان سب سے جدا اپنے فن کی راہ نکالیں اور ''تم سا نہیں دیکھا'' کی ہیروشپ امیج نے ان کی مشکلیں آسان کر دیں۔ اور شمی کپور اس باغی امیج میں نہ صرف کامیاب رہے بلکہ یہ خطاب ان کے نام کے ساتھ ہمیشہ کے لئے جڑ گیا۔ اپنے اس باغیانہ کردار کے ساتھ شمی کپور نے پانچویں اور چھٹی دہائی کے بعد تک ہندی فلموں پر راج کیا۔انہیں Playing a male starlet بھی کہا گیا۔ ۱۹۶۱ء میں سبودھ مکرجی کی فلم ''جنگلی'' میں شمی کپور کا جو روپ پردے پر نظر آیا اس نے پوری نوجوان نسل کو انکا دیوانہ بنا دیا۔ ان کی امیج کو ابھارنے میں موسیقی کا بھی بہت بڑا ہاتھ رہا۔شنکر جے کشن نے دھنیں ترتیب دیں اور ان دھنوں پر حسرت اور شیلیندر نے جو گیت لکھے وہ نوجوانوں کے دل کی آواز بن گئے۔ اور پھر محمد رفیع کی وہ انتہائی جذبات کو چھوتی آواز جس نے شمی کپور کو فن اداکاری کے بلند مرتبے پر بٹھا دیا۔ خاص طور سے فلم ''جنگلی'' میں رومان پرور نعرہ یا ہو سب کو پاگل کر گیا۔ ان کی اس پاگل بنا دینے والی امیج بالی ووڈ کے مشہور اداکاروں جیمس ڈین اور ایلوس پریسے کو دھیان میں رکھ کر گھڑی گئی تھی۔ پھر اس پر ان کے رقص کرنے کا انوکھا انداز جس کے اسٹیپ بیک وقت ویسٹرن اور ایسٹرن رقصوں کا حسین امتزاج ثابت ہو گئے اور ان تمام فنکارانہ خوبیوں سے لیس جو شمی کپور فلم پردے پر پیش ہوا اس نے نہ صرف فلم اور سنیما کو ایک نیا موڑ دیا، نہ صرف برسوں فلموں پر حکومت کی بلکہ بعد میں آنے والے نوجوان اداکاروں جیتندر سے لے کر آج کے موجودہ اداکار شاہد کپور تک میں ان کے رقص کا انداز اپنایا گیا۔''جنگلی'' کی زبردست کامیابی کے بعد وہ سپر اسٹار بن گئے تھے۔ بھگت سنگھ۔ مجنوں۔ مرزا اور دیگر رومانی کردار شمی کپور ان کی امیج سے ایسے غائب ہوئے کہ کبھی ان کا ذکر بھی نہیں کیا گیا۔ اس نے دل کھول کر معاشقے کئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ لڑکیوں کے پیچھے سپرہٹ بھاگتے تھے۔ ممتاز سے بھی ان کا عشق اس انتہا کو پہنچا کہ جب ممتاز کو اپنی ماں کی علالت کی اطلاع ملی تو کسی جہاز میں حیدرآباد جانے کے لئے سیٹ نہیں مل پائی تو شمی کپور نے پورا جہاز

چارٹرڈ کر کے اپنی محبوبہ کو حیدرآباد بھیج دیا تھا۔انہوں نے عشق تو خوب کئے لیکن محبت صرف گیتا بالی سے کی اور انہیں سے ۱۹۵۵ء میں شادی بھی کر لی۔ گیتا بالی ان کے بچوں کی ماں بھی بنیں لیکن راجندر سنگھ بیدی کی فلم ''رانو'' (ایک چادر میلی سی) کی شوٹنگ کے دوران وہ چیچک جیسی بیماری کا شکار ہو کر ۱۹۶۵ء میں انتقال کر گئیں۔ یہ صدمہ شمی کپور برداشت نہیں کر سکے اور خود کو شراب میں ڈبو دیا۔بچوں کی پرورش ان کی تعلیم اور تربیت کے علاوہ خود شمی کپور کی زندگی بھی بکھرنے لگی تو بھابی کرشنا نے ایک ماں کا فرض ادا کیا۔اور اس گرداب سے نکالنے کے لئے ان کی دوسری شادی بھاؤنگر(گجرات) کے راجہ کی بیٹی نیلا دیوی سے کرادی۔ نیلا دیوی بہار کا خوشگوار جھونکا بن کر اس طرح شمی کپور کی زندگی میں آئیں کہ شمی کپور کو حیات نو مل گئی۔ بچوں کو انہوں نے سگی ماں جیسا پیار دیا۔

شمی کپور کو شکار کا بھی بے حد شوق تھا۔ وہ بھوپال صرف شکار کھیلنے آیا کرتے تھے۔اپنی پہلی بیوی گیتا بالی کو لے کر بھی شکار کی غرض سے بھوپال آ کر بینڈ ماسٹر چوراہے پر واقع حمید بھیا کے مکان میں ٹھہرتے تھے۔ان کے اندر ایک جنگلی پن تھا۔ایک ضد تھی اور کسی کو خاطر میں نہ لانے والا مزاج تھا جس کا بھرپور فائدہ ان کی اسٹار امیج کو ملا۔ وہ جنگل میں بے تحاشہ جانوروں کا پیچھا کیا کرتے تھے۔اور کہا جاتا ہے اتنے ہی جنگلی پن سے شہروں میں لڑکیوں کے پیچھے دوڑتے تھے۔انہیں تمام بگڑی عادتوں کو دھیان میں رکھ کر سبودھ مکرجی۔ ایس مکرجی۔شکتی سامنت اور منموہن ڈیسائی، نے بھرپور باکس آفس کے فائدے حاصل کئے۔اور ''جنگلی''۔ جانور۔ ''بدتمیز'' ۔بلف ماسٹر۔ اجالا۔ کشمیر کی کلی۔ راج کمار۔ پرنس۔ پیار کیا تو ڈرنا کیا۔تم سے اچھا کون ہے۔تیسری منزل۔ پگلا کہیں کا۔این ایوننگ ان پیرس۔ پروفیسر۔ چائنا ٹاؤن۔ سنگاپور۔اور جوان محبت جیسی ہلکی پھلکی رومان پرور میوزیکل فلمیں بنا کر شمی کپور کی داخلی کیفیت کو بڑی مہارت کے ساتھ جگ ظاہر کر دیا۔ان کے اس دو طرفہ فنی رخ نے ہندوستانی ویلن کو کمال آہستگی سے مات دے دی۔ان کے گانوں اور رقصوں میں بڑی دل کشی ہوا کرتی تھی۔

نیلا دیوی نے انہیں اپنی چاہتوں کا وہ سہارا دیا کہ ان کا جگمگاتا وجود ٹھہر گیا۔ یہاں تک کہ وہ شراب۔تعیش اور سگریٹ نوشی سے یکدم تائب ہو گئے۔ یہاں تک ہوا کہ انہوں نے خود کو بدل

ڈالا قشقہ کھینچا۔طرح طرح کی مالائیں گلے میں ڈالیں۔ گیروا لباس پہنے، بس دیر میں بیٹھنا باقی رہ گیا تھا۔ داڑھی بھی رکھ لی اور خود کو بدل کر مطمئن ہو گئے۔

شمی کپور نے ۱۱۵ فلموں میں ہیرو اور کیریکٹر آرٹسٹ کے بطور اپنی اداکاری کا لوہا منوایا۔

۱۹۶۸ء میں جی پی سپی کی فلم ''برہم چاری'' میں شمی کپور کا ایک اور ہی رخ نظر آیا۔ یہ شمی کپور نہ تو کھلنڈرا تھا نہ بدتمیز اور جنگلی جانور تھا۔اس کے بہ نسبت ایک دل گداز اور خود کو اوروں کی خاطر مٹا ڈالنے والا انسان اس فلم میں اجاگر ہوا۔اس فلم نے انہیں نہ صرف اعزاز دلایا بلکہ اس کی ہوش ربا کامیابی نے ایک انوکھے شمی کپور کو ہمارے روبرو لا کھڑا کر دیا۔۱۹۶۱ء میں پھر جی پی سپی نے اس کی امیج بدل ڈالی۔سلیم جاوید کے اسکرپٹ پر رمیش سپی نے فلم ''انداز'' میں راجیش کھنہ اور ہیما مالنی کے مقابل اس شمی کپور کو سنجیدہ کردار میں پیش کیا۔ یہ شمی کپور اب چھریرا نہیں رہا تھا۔فربہی (موٹاپے) کی طرف بہت تیزی سے بڑھ رہا تھا۔اس فلم کی کامیابی نے شمی کپور کو کریکٹر آرٹسٹ کی صف میں لا کھڑا کیا اور پھر ان کی اداکاری کا وہ سفر شروع ہوا جس نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ واقعی اپنے والد پرتھوی راج کے صحیح جانشین ہیں۔بی آر چوپڑا کی ''ضمیر''۔ بھرت شاہ کی ''شالیمار''۔منموہن ڈیسائی کی ''دیش پریمی''۔راج کپور کی ''پریم روگ''۔سبھاش گھئی کی ''ودھاتا'' اور ہیرو۔ایگل فلمز کی گورے لوگ'' جے دتہ کی ''بٹوارہ''۔ششی کپور کی ''عجوبہ'' انل شرما کی ''تہلکہ''چیتن آنند کی ''ہیر رانجھا''۔ یہ چند فلمیں شمی کپور کی وہ فلمیں ہیں جن میں شمی کپور نے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کی چھاپ قائم کی ہے۔انہوں نے اپنے کرداروں میں جو ڈرامیٹک تبدیلی کی وہ یقیناً حیرت زدہ کر دیتی ہے۔انہوں نے دو فلموں کو بھی ڈائریکٹ کیا تھا۔انگریزی فلم Irma la Douce (۱۹۶۳ء) کو فلم ''منورنجن'' کے نام سے ہندی میں سنجیو کمار اور زینت امان کے ساتھ بنایا۔ دل کش مزاحیہ فلم تھی۔۱۹۷۴ء میں اس فلم نے خاصا بزنس کیا تھا۔۱۹۷۶ء میں راجیش کھنہ کو لے کر فلم ''بنڈل باز'' بنائی اور اس کی ناکامی نے انھیں توبہ کرادی۔کمپیوٹر کی ایجاد نے انہیں اچانک الیکٹرونک پرفارمینس کی جانب توجہ کر لیا۔شمی کپور وہ پہلے اداکار ہیں جنہوں نے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کلب بمبئی میں قائم کیا تھا۔ وہ اس کلب کے چیرمین رہے اور کامیاب بھی ہوئے۔

شمی کپور کی زندگی کے کئی پڑاؤ ہیں۔ پرتھوی راج کا بیٹا ہو کر پرتھوی تھیٹر میں عام سے ایک مزدور کی طرح کام کرنا۔فلموں میں آ کر لگاتار فلاپ فلمیں دینا۔ٹھہرنا۔رکنا اور پھر چل پڑنا۔انتہائی شہرت پانا۔شادی پھر غمی۔پھر شادی۔روحانیت کی تلاش میں بھٹکنا۔شراب پینا پھر تائب ہونا۔ ہیروشپ سے کیریکٹر آرٹسٹ بن جانا۔اور پھر عمر کے اس آخری پڑاؤ پر خیمہ زن ہو جانا جہاں گزری عمر کی تمام آسائش ،تمام راحتیں،تمام شہرتیں،تمام ناز برداریاں،تمام جوانی کی جولانیاں،تمام جنوں سامانیاں، بےخطر اڑان، کی تمام حسرتیں ہاتھ چھڑا کر گرد و پوش ہو چکی ہیں اور تنہائی کی کربناک ٹیسیں ذہن پر سناٹے کے فریب بن کر گھر کر لیتی ہیں۔شمی کپور ۷۵ سال کے اسی پڑاؤ پر خیمہ زن ہیں۔صرف ہمراہ ہیں تو نیلا دیوی کی رفاقت اور اولادوں کا سکھ سے بھرپور مستقبل۔یہ وہ سرمایہ ہے جس کے آگے سب کچھ ہیچ ہے اور شمی کپور ان روحانی آسائشوں سے پوری طرح مطمئن ہیں۔

☆☆☆

اداکار و ہدایت کار۔گرودت

یاسمین اختر (مغربی بنگال)

۱۹۵۰ء کی دہائی کو اگر ہندی فلموں کے سنہرے دور سے تعبیر کیا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا،اس دور میں ہندی فلموں کے ہدایتکار اور اداکار ایسے تھے جنھوں نے اپنے کام کے ذریعہ اپنی پہچان کروائی تھی اور ایسی ہی شخصیتوں میں سے ایک گرودت شیوشنکر پڈکون تھے جنہیں لوگ صرف گرودت کے نام سے جانتے تھے ان کی فلمیں کلاسیک ہوتی تھیں اور ۱۹۷۰ء سے پہلے تک انھوں نے جو مقبولیت حاصل کی اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا،ان کی فلمیں بھلے ہی فل ہاؤس میں نہ دیکھی جاتی ہوں لیکن جو لوگ بھی ان کی فلمیں دیکھنے جاتے تھے وہ دانشور طبقہ کے لوگ تھے کیونکہ گرودت خود بھی ایک دانشور تھے اور وہ اپنی فلمیں بھی خاص طور پر دانشور طبقہ کے لئے بناتے تھے۔گرودت ۹ جولائی ۱۹۲۵ء کو بنگلور میں پیدا ہوئے ،وہ ایک متوسط گھرانے کے برہمن سرسوتی خاندان منگلور سے تعلق رکھتے تھے ان کے والد شیوشنکر پڈوکون ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور ان کی والدہ وسنتی ایک اسکول ٹیچر تھیں۔وہ بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھیں اور افسانے لکھتی تھیں اور بنگلہ ناولوں کو کنٹر زبان میں ترجمہ کیا کرتی تھیں۔گرودت کی ابتدائی زندگی بہت ہی کرب واذیت میں گزری اور ان کے والدین کے درمیان جب تفرقہ پیدا ہوا تو ان کی زندگی اور بھی پریشانیوں میں گھر گئی۔اسی زمانے میں گرودت کا چھوٹا بھائی جو صرف سات مہینے کا تھا،معبود حقیقی سے جا ملا۔اور انہیں اپنی زندگی میں جو کچھ بھی تجربہ ہوا اس کا نچوڑ انھوں نے اپنی فلموں میں پیش کیا۔گرودت کے درمیان اور دو بہنیں تھیں۔اس کے چھوٹے بھائی آتما رام بعد میں پرڈیوسر ڈائریکٹر بھی بنے اور ان کی بہن للیتا لجمی ایک مشہور پینٹر بنی۔گرودت بعد میں کلکتہ چلے آئے اور ان کی تعلیم کلکتہ میں مکمل ہوئی۔مالی پریشانیوں کے باعث وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دینے پر مجبور ہوئے انھوں نے ۱۹۴۱ء میں میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا تھا۔

گرودت نے رقص کی تربیت باقاعدہ طور پر حاصل کی تھی اور پربھات فلمز کے بینر تلے انہیں

ڈانس ڈائریکٹر کے طور پر تین سال کا معاہدہ ملا۔۱۹۴۴ء میں انھوں نے فلم ''چاند'' میں سرکرشنا کا مختصر رول بھی ادا کیا تھا۔فلم ''ہم ایک ہیں'' میں وہ باقاعدہ طور پر ڈانس ڈائریکٹر بنے۔ بعدازاں امید چکرورتی کے وہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر بنے۔۱۹۵۰ء میں دیوآنند نے انہیں اپنی فلم ''بازی'' کی ہدایتکاری سونپی۔فلم بازی سپرہٹ ثابت ہوئی اوراسی فلم کے ذریعہ انگنت فلموں میں اسی انداز کے جرائم کو پیش کیا گیا۔اس فلم کا ایک گیت جو ساحر کا لکھا ہوا تھا''تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنالے۔اپنے پہ بھروسہ ہے تو یہ داؤ لگا لے۔''بیحد کامیاب اور مقبول ثابت ہوا تھا۔

گرودت نے ۱۹۵۲ء میں فلم ''جال'' کی ہدایت دی اور یہ فلم بھی سپرہٹ ثابت ہوئی ۔۱۹۵۶ء میں ''سیلاب'' ۱۹۵۳ء میں ''باز'' اور ۱۹۵۴ء میں آر پار، ۱۹۵۵ء میں مسٹر اینڈ مسز ۵۵ نے زبردست ریکارڈ بنائے۔۱۹۵۷ء میں جب فلم پیاسا بنائی تو ساری دنیا کے لوگوں نے انہیں ایک عظیم اداکار، ہدایتکار اور فلمساز کے روپ میں پہچانا۔۱۹۵۹ء میں کاغذ کے پھول کی ناکامی سے دت صاحب کا دل ٹوٹ چکا تھا اور قرض چکانے کے لئے انہیں اپنا اسٹوڈیو تک فروخت کرنا پڑا۔اگرچہ اس فلم میں گرودت نے اپنی ساری محنت جھونک دی تھی اس کے باوجود یہ فلم فلاپ ہوگئی۔

۱۹۶۰ء میں جب فلم ''چودھویں کا چاند'' ایم صادق کی ہدایت میں بنائی تو پھر انھوں نے فلم کے سپرہٹ ہونے پر لاکھوں کمالئے۔ وحیدہ رحمٰن کو اس فلم میں لکھنؤ کی دوشیزہ کے رول میں بیحد پسند کیا گیا تھا۔ دھرمیندرا اور تنوجہ کو ساتھ لے کر جب وہ فلم ''بہاریں پھر بھی آئیں گی'' بنا رہے تھے تو اچانک انہیں موت کی نیند سوجانا پڑا۔ جب انھوں نے نیند کی کئی گولیاں بیک وقت کھا کر خودکشی کر لی تو لوگوں کا کہنا ہے کہ وحیدہ رحمٰن نے گرودت کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا اس وجہ سے گرودت نے خودکشی کر لی لیکن وحیدہ رحمٰن کا کہنا ہے کہ وہ میری اچھی سہیلی گیتا دت کے شوہر تھے پھر میں کیسے اپنی سہیلی کا گھر اجاڑنے کا گناہ کرسکتی تھی گرودت نے باہر کی جن فلموں میں کام کیا ان میں سہاگن، سانجھ اور سویرا، بھروسہ، بہورانی، سوتیلا بھائی، ٹو ویلو کلاک وغیرہ ہیں۔۱۹۶۴ء میں وہ اپنی بیوی گیتا دت سے تنازع کے بعد علاحدہ ہوگئے پھر انھوں نے خود کو شراب میں ڈبولیا اور ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو ان کی موت خودکشی

کر لینے کی وجہ سے ہوئی اور ہندی فلموں کو نا قابل عظیم نقصان پہنچا۔

گرودت کو اگر ایک بہترین اداکار کے بجائے بہترین ہدایت کار اور فلمساز کہا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔گرودت نے ایک ایسے دور میں اپنے آپ کو منوایا ایک منفرد اور باعزت مقام تک خود کو پہنچایا جس دور میں دلیپ کمار، راج کپور، دیوآنند، راجندر کمار، منوج کمار، شمی کپور، ششی کپور اور دھرمیندر فن کی انتہائی بلندیوں پر تھے اور کسی بھی فلم میں ان کی موجودگی فلم کی کامیابی کی ضامن سمجھی جاتی تھی۔ لیکن ان کے درمیان رہتے ہوئے گرودت کی فلمیں جیسے آر پار، پیاسا، چودھویں کا چاند، مسٹر اینڈ مسز ۵۵، سی آئی ڈی اور کاغذ کے پھول وغیرہ لاجواب فلمیں تھیں جنہیں ہندوستان کی کلاسیک فلموں میں شمار کیا گیا تھا۔اس کے علاوہ صاحب بی بی اور غلام نے ساری دنیا کے سنجیدہ فلم میکروں کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ ہندوستان میں کوئی ایسا فلم میکر بھی ہے جس کی سوچ ان سب سے زیادہ گہری اور اونچی ہے۔گرودت جن فلموں میں دوسرے ہدایتکار کی موجودگی ضروری سمجھتے تھے اس فلم کی ہدایتکاری دوسروں کو سونپ دیتے تھے مثال کے طور پر چودھویں کا چاند کی ہدایتکاری انھوں نے ایم صادق کو سونپ دی تھی۔اسی طرح سے فلم سی آئی ڈی کے لئے جب انھوں نے دیکھا کہ جاسوس ہیرو کے رول میں وہ کامیاب نہیں ہوں گے تو انھوں نے دیوآنند کو ہیرو کا رول دیا اور ڈائریکٹر کے روپ میں پہلی مرتبہ نوجوان راج کھوسلہ کو موقع دیا اور اس فلم نے اتنا زبردست بزنس کیا تھا کہ چودھویں کا چاند جیسی سپرہٹ فلم کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

گرودت نے اداکار رحمٰن کو اپنی اہم ترین فلموں میں ہیرو سے بڑا رول دیا چودھویں کا چاند میں رحمٰن، گرودت کے عزیز دوست بنے تھے۔ صاحب بی بی اور غلام میں مینا کماری کے اوباش شوہر اور پیاسا میں گرودت کی سابق محبوبہ مالا سنہا کے شوہر کا رول دیا تھا اور ان تینوں ہی فلموں میں رحمٰن کی اداکاری انتہائی عروج پر تھی۔ رحمٰن ایک بڑے اداکار تھے اور وہ کسی بھی اداکار سے دبتے نہیں تھے، ان کا مقابلہ اشوک کمار، بلراج ساہنی اور ترون بوس جیسے سنجیدہ اور اوریجنل اداکار سے کیا جاسکتا ہے۔

جب گرودت نے فلم پیاسا بنانے کا اعلان کیا اور اس فلم کی کہانی جب عام ہوئی تھی

تو خود دلیپ کمار نے ان سے درخواست کی تھی کہ اس فلم میں ہیرو کا رول انہیں دیا جائے۔ وہ گرودت کی ہدایت میں کام کرنے کو تیار ہیں، لیکن گرودت راضی نہیں ہوئے، انھوں نے ساحر لدھیانوی سے درخواست کی تھی کہ چونکہ یہ فلم ان کی اپنی زندگی پر بنی ہے لہذا وہ اس فلم کے لئے ایسے نغمے اور گیت تیار کریں جو کبھی بھی بھلائے نہ جاسکیں اور ساحر نے ان کا مطالبہ پورا کیا اور وہ فلم تو امر ہوگئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ساحر بھی نغمہ نگاروں کے درمیان آسمان پر پہنچ گئے، اگرچہ اس زمانے میں شکیل بدایونی، شیلندر، حسرت جے پوری کا طوطی بولتا تھا لیکن ان کے درمیان رہتے ہوئے سبھی نے بچے سے لے کر بوڑھے تک کمسن طالب علم سے لے کر یونیورسٹی کے پروفیسر تک ساحر کو سب سے عظیم اور منفرد شاعر کی حیثیت سے تسلیم کرلیا۔

فلم پیاسا میں گرودت نے سچ مچ اپنی زندگی کے واقعات کو پیش کیا تھا، ویسے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس فلم میں دراصل ساحر لدھیانوی کی اپنی زندگی کی کہانی تھی، اس وجہ سے ساحر نے ایسے نغمے لکھے جس کا آج تک کوئی جواب نہیں لکھ سکا ہے۔ لوگ جاوید اختر کو بڑا نغمہ نگار مانتے ہیں لیکن جاوید اختر تو ساحر لدھیانوی کے نقشِ پا کو چھو نہیں سکتے، بلکہ جاوید تو قمر جلال آبادی، ایس ایچ بہاری، نیرج اور شیلندر تک کی گرد کو پا نہیں سکتے۔

گرودت کی دوسری کلاسیک اور ناقابل فراموش فلم ''کاغذ کے پھول'' تھی، اگرچہ یہ فلم بری طرح سے ناکام ہوگئی تھی اور اس ناکامی سے گرودت دیوالیہ ہوگئے تھے اور انہیں اپنا اسٹوڈیو تک فروخت کرنا پڑا تھا، لیکن اس فلم میں انھوں نے جس انداز میں ایک فلم ڈائریکٹر کی زندگی کو پیش کیا تھا وہ اپنی جگہ پر ناقابل فراموش ہے۔

☆☆☆

خوبرو اداکار۔ ناصر خان

سیّد ناظر حسین

دلیپ کمار کے چھوٹے بھائی ناصر خاں کا انتقال ۲ رمئی ۱۹۷۴ء کو بمبئی میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر پچاس سال تھی۔ انتقال کے وقت ان کی بیوی بیگم پارہ (مشہور اداکارہ) اور بیٹا ایوب خان موجود تھے۔ ناصر خان نے اپنے بڑے بھائی دلیپ کمار کے ساتھ مل سٹیزن فلمز کمپنی قائم کی تھی اور فلم ''گنگا جمنا'' پروڈیوس کی جو ۱۹۶۱ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ ناصر خان نے ۱۹۷۰ء میں فلم ساز وہدایت کار کی حیثیت سے فلم ''ضد'' شروع کی تھی جس میں سائرہ بانو اور سنجے خان ہیرو تھے مگر وہ اس فلم کو مکمل نہ کرسکے جو آج بھی ادھوری ہے۔

یکم اکتوبر ۱۹۲۴ء کو ناصر خان پشاور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سرور خان اور والدہ کا نام عائشہ خانم تھا۔ جن کے چھ بیٹے اور چھ بیٹیاں ہوئیں۔ ناصر خان کے دادا حاجی محمد خان تھے۔ ناصر خاں کے والد سرور خان پھلوں کے کاروبار کیا کرتے تھے۔ وہ پشاور سے پھل کراچی، کابل، کلکتہ اور بمبئی میں سپلائی کیا کرتے تھے۔ بعد میں یہ خاندان پشاور سے بمبئی منتقل ہوگیا۔ ناصر خان کے گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ ۱۹۴۰ء میں اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے ایرفورس میں داخلے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ملی۔ ۱۹۴۴ء کی بات ہے جب دلیپ کمار فلم ''جواڑ بھاٹا'' میں کام کررہے تھے جس کی شوٹنگ بمبئی ٹاکیز میں ہورہی تھی ایک دن ناصر خان اپنے بڑے بھائی دلیپ کمار سے ملنے کے لئے اسٹوڈیو گئے وہاں پر ڈائریکٹر نتن بوس سے ملاقات ہوئی نتن بوس ناصر خان کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوئے۔ نتن بوس نے فلم ''مزدور'' میں اُنہیں بطور ہیرو منتخب کرلیا۔ اس طرح ناصر خان فلم ''مزدور'' کے ہیرو بن گئے۔ یہ فلم تیار ہوکر ۱۹۴۵ء میں ریلیز ہوئی۔ فلم کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی مگر ناصر خان کی اداکاری کی پختگی دیکھنے کے بعد لوگوں نے اُنہیں موتی لال ثانی کہا۔ اس فلم سے ہی ان کا فلمی سفر شروع ہوگیا۔ اس کے بعد انہوں نے فلم شہنائی میں کام کیا جو ۱۹۴۷ء میں ریلیز ہوا اس کے ڈائریکٹر پیارے لال سنتوشی تھے۔ اس فلم میں اندومتی، ریحانہ اور ممتاز علی نے بھی کام کیا

تھا۔اس کے بعدوہ پاکستان چلے گئے جہاں اُنہوں نے دوفلموں ''شاہد'' اور ''تیرا پیار'' میں کام کیا۔

مارچ ۱۹۵۰ء میں ناصرخان پاکستان سے ہندوستان واپس آ گئے اور پھر سے ہندستانی فلموں میں کام کرنے لگے۔ان کی چھ فلمیں ۱۹۵۱ء میں ریلیز ہوئیں اور چھ فلمیں ۱۹۵۲ء میں ریلیز ہوئیں۔۱۹۵۶ء میں فلم ''چار مینار'' ریلیز ہوئی اوراس کی شوٹنگ حیدرآباد میں چار میناراوراس کے آس پاس علاقوں میں ہوئی تھی۔فلم انڈسٹری میں ناصرخان اورنوتن کی جوڑی بے حد مشہور ہوئی تھی ان دونوں نے چار فلموں میں ایک ساتھ کام کیا تھا جن میں نگینہ(۱۹۵۱ء)، ہنگامہ (۱۹۵۲ء)،شیشم (۱۹۵۲ء)اورآغوش (۱۹۵۳ء) تھیں۔اپنے وقت کی مشہورادا کارہ بیگم پارہ کے ساتھ تین فلمیں کی جن میں لٹیرا(۱۹۵۱ء)،کربھلا(۱۹۵۶ء)اورآدمی (۱۹۵۷ء) تھیں۔بعد میں ناصر خان نے بیگم پارہ کے ساتھ شادی کرلی۔ان کا بیٹا ایوب خان ہے جوفلموں میں کام کررہا ہے۔ناصر خان کی بطور ہیروآخری فلم ''سایہ'' تھی جو ۱۹۶۱ء میں ریلیز ہوئی۔فلم ''مزدور'' (۱۹۴۵ء) سے ''سایہ'' (۱۹۶۱ء) بطور ہیرو ۲۹ فلموں میں کام کیا۔ناصرخان نے دلیپ کمار کے ساتھ دوفلموں میں کام کیا تھا جن کے نام ''گنگا جمنا'' اور ''بیراگ'' ہیں۔انہوں نے فلم ''یادوں کی بارات'' (۱۹۷۳ء) میں عامرخان کے باپ کا رول کیا تھا۔اس کے علاوہ انہوں نے ''انگار'' میں بھی کام کیا تھا۔اس طرح ناصر خان کا سرمایہ حیات صرف ۳۴ فلمیں ہیں۔مینا کماری کے ساتھ ''دائرہ'' نرگس کے ساتھ ''انگارے'' نمی کے ساتھ ''سوسائٹی'' منورسلطانہ اور ویناکے ساتھ ''جلاد'' میں کام کئے تھے۔

بہرحال ناصرخان ایک کامیاب اداکار ثابت ہوئے ہیں اورانہوں نے اپنی اداکاری کے مختلف جوہر پیش کئے ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ فلم انڈسٹری میں انہوں نے وہ مقام حاصل کیا جواُن کے بڑے بھائی دلیپ کمار کا تھا لیکن اپنی شخصیت اوراداکاری سے ایک منفرد شناخت ضرور قائم کی۔ان کی بہترین اداکاری کودیکھتے ہوئے انہیں انڈسٹری میں موتی لال ثانی کے طور پر یاد کیا جاتا رہا۔

☆☆☆

مہا نائک۔اتم کمار

خورشیداختر فرازی

بنگلہ فلموں کے مہا نائیک اتم کمار صحیح معنوں میں بنگالیوں کے نزدیک مہا نائیک تھے جنھوں نے تقریباً تین دہائیوں تک اپنی اداکاری کے ذریعہ لوگوں کومسحور کئے رکھا تھا۔شمالی کلکتہ کے اہیرتلہ میں ۱۹۲۶ء کواورون کمار چٹرجی (اتم کمار) کی پیدائش ہوئی تھی اس کی دادی چونکہ اُسے اتم کہہ کر پکارا کرتی تھیں اس وجہ سے ان کا فلمی نام ہی اتم کمار پڑ گیا تھا۔ان کے لمبے چوڑے خاندان کا اپنا ٹھیٹر گروپ شوریہ سماج تھا جس نے بنگلہ سماج کے لئے بہت ساری امیچر شو پیش کئے۔اسی دوران جبکہ اتم کمار بیحد کمسن تھے انہیں فلموں میں اداکاری کے آفر ملے،اس زمانے میں اتم اسپورٹس اورفزیکل فٹنس پرسب سے زیادہ دھیان دیتے تھے۔وہ کشتی،تیراکی،لاٹھی کھیل،گھوڑ سواری اورٹینس میں بیحد دلچسپی رکھتے تھے۔وہ بھوانی پورسوئمنگ ایسوسی ایشن میں لگاتار تین سال چمپئن بھی ہوئے تھے۔

اسی دوران انھوں نے اپنا میٹریکولیشن مکمل کرلیا۔اسی زمانے میں انھوں نے فلموں میں اداکاری کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔اسی زمانے میں انھوں نے اس وقت کے مشہورسنگر نیدان بنرجی سے گانا سیکھنا شروع کیا۔وہ بہت جلد کلکتہ کے ٹھیٹروں سے اکتا گئے تھے اورفلموں میں نیچرل اداکاری کرنے پر زیادہ زوردینے لگے تھے۔گریجویشن مکمل کرنے کے بعد گھریلو ذمہ داریاں بڑھیں اورانھوں نے کلکتہ کے پورٹ کمشنر کے دفتر میں کلرکی کی نوکری کرلی۔اپنی تنخواہ سے ہی وہ میوزیکل اسکول میں گانا سیکھنے کا فیس ادا کرتے تھے۔۱۹۴۷ء میں انہیں ایک ہندی فلم ماپاڈور میں ایک چھوٹے سے رول کی پیشکش ہوئی لیکن وہ فلم مکمل نہ ہوسکی اور ۱۹۴۸ء میں ان کی پہلی بنگلہ فلم درشی دیوانی ریلیز ہوئی جس کے ہدایت کار نیتن بوس تھے۔نیتن بوس نے گنگا جمنا کی ہدایت بھی دی تھی جس میں دلیپ کماراوروجینتی مالا نے کام کیا تھا۔۱۹۵۲ء میں ان کی ایک ہٹ فلم باسو پریوار ریلیز ہوئی لیکن ان کی اداکاری کسی کو بھی پسند نہیں آئی تھی۔اسی دوران ۱۹۴۸ء میں انھوں نے گوری گنگولی سے شادی کرلی۔جس سے ۱۹۵۰ء میں ان کا لڑکا گوتم پیدا ہوا۔فلموں میں زبردست ناکامی کے بعد وہ مایوس

ہو گئے اور فل ٹائم نوکری کی تلاش میں لگ گئے ۔ باسو پریوار کی ہیروئن ساوتری چڑ جی کو اس فلم سے زبردست مقبولیت ملی تھی اور اتفاق کی بات ہے کہ اس فلم میں سپر یہ دیوی نے اتم کمار کی بہن کا رول ادا کیا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں باسو پریوار پھر سے اکٹھا ہوا اور ''شارے چھوتر'' نامی فلم بیحد مقبول ہوئی۔ اس فلم میں اتم کمار نے پہلی مرتبہ سچترا سین کے مقابلے میں ہیرو کا رول ادا کیا تھا۔ اگلے سال ۱۹۵۴ء میں اتم اور سچترا کی فلم اگنی پریکشا زبردست ہٹ فلم ثابت ہوئی اور اتم سچترا کی جوڑی کو بنگلہ فلم میں سپر اسٹار جوڑی کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے بعد دونوں نے کئی فلموں میں کام کئے اور بیحد رومانٹک جوڑی آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے لگی۔

اتم اور سچترا کی مقبول فلموں میں شاپ موچن (۱۹۵۵) ساگریکا (۱۹۵۶) ہرانا سو (۱۹۵۷) سپتا پدی (۱۹۶۱) بپاشا (۱۹۶۲) اور گریہا دا (۱۹۶۷) بیحد مقبول اور ہٹ فلمیں ثابت ہوئیں اور اتم ۔ سچترا کی جوڑی کا طوطی بولنے لگا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں ریلیز شونار ہرین میں اتم کے مقابلے سپر یہ دیوی نے ہیروئن کا رول ادا کیا۔ سپر یہ نے اس سے پہلے رچویک گھٹک کی ناقابل فراموش فلم ''میگھا دھا کہ تارا'' میں زبردست رول ادا کر کے بیحد مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ اس کے بعد اتم اور سپر یہ کی جوڑی جمتی چلی گئی اسی دوران اتم نے اپنی بیوی اور بچے سے علاحدگی حاصل کر لی اور سپر یہ کے ساتھ بغیر شادی کئے رہنے لگے اور پورے ۱۷ سال رہے اور اسی کے گھر میں اتم کی موت ہوئی۔ اتم اور سپر یہ کی فلمیں بیحد ہٹ ثابت ہوئیں اور لوگوں کا گروپ بٹ گیا ایک گروپ اتم اور سچترا کی فلموں میں پسند کرتا تھا جبکہ دوسرا گروپ اتم اور سپر یہ کی فلمیں زیادہ پسند کرتا تھا۔ اتم اور سچترا کی فلمیں لوگ اصل رومانس کو دیکھنے جاتے تھے جبکہ اتم اور سپر یہ کی فلمیں دیکھنے جانے سے پہلے لوگ ان دونوں کے آپسی تعلقات کو جان کر دیکھنے جاتے تھے۔ جس سے ان کے دلوں میں ان کے رومانس کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تھا۔

۱۹۶۶ء میں ستیہ جیت رے کی فلم ''نائیک'' ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں ستیہ جیت نے ارندم مکھرجی کو ہیرو کے رول میں لیا۔ لیکن اس کا کردار اتم کمار کی زندگی پر مشتمل تھی۔ اور اس حقیقت سے ہر کوئی واقف تھا۔ بہر کیف ۱۹۶۷ء میں اتم کمار نے ستیہ جیت رے کی فلم ''چڑیا خانہ'' میں

ہیرو کا رول نبھایا تھا۔ ۱۹۶۳ء میں اتم کمار نے جن فلموں کی فلمسازی کی تھی ان میں ''ہرانا سور'' ''سپتا پدی'' ''اتر فالگونی'' ''جاتو گریہہ (۱۹۶۴) گرہید ہا اور یہ تمام فلمیں سپر ہٹ ثابت ہوئی تھیں۔ اتم کمار جنہوں نے سپر ہٹ ہندی فلم ''چھوٹی سی ملاقات'' (۱۹۶۷) کو پروڈیوس کیا تھا اس کے بعد امانش، بندی، دیش پریمی، کتاب، دوریاں، آنند آشرم وغیرہ میں بھی کام کیا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں ریلیز آنند آشرم جو بیک وقت ہندی اور بنگلہ زبان میں پیش کی گئی تھی سپر ہٹ فلم ثابت ہوئی تھی۔ ۲۴ر جولائی ۱۹۸۰ء کو دل کا زبردست دورہ پڑنے پر اتم کمار کو کلکتہ کے بیل دیو نرسنگ ہوم میں داخل کیا گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے ۱۶ گھنٹوں تک سخت جدوجہد کر کے انہیں بچانے کی کوشش کی تھی لیکن افسوس وہ اسی رات گزر گئے۔ ان کی موت کی خبر سن کر بھوانی پور سے کیوڑہ شمشان گھاٹ تک لاکھوں افراد ان کی ارتھی میں شریک ہوئے تھے۔

اتم کمار کی چند مشہور بنگلہ فلمیں حسب ذیل ہیں۔

باسو پریوار (۱۹۵۲) شارے چھوتر (۱۹۵۳) اگنی پریکشا (۱۹۵۶) چاپا ڈانگہ بہو (۱۹۵۴) شاپ موچن (۱۹۵۵) ساگریکار (۱۹۵۶) ہرانا سور (۱۹۵۷) تاشرگھر (۱۹۵۷) شونار ہرین (۱۹۵۹) سپتا پدی (۱۹۶۱) بپاشا (۱۹۶۲) جھرنتی بلاش (۱۹۶۳) جاتو گریہہ (۱۹۶۴) نائیک (۱۹۶۶) انھونی فرنگی (۱۹۶۷) چڑیا خانہ (۱۹۶۷) گرہیریا (۱۹۶۷) اپاری چتا (۱۹۶۹) بون پالاشر پادابلی (۱۹۷۳) امانش (۱۹۷۶) اور جادو بنشا (۱۹۷۶)۔

☆☆☆

اداکار اور ویلن ۔ پریم ناتھ

ڈاکٹر شاہد محمود (مغربی بنگال)

ہندی فلم کے ویلنوں میں ایک نام پریم ناتھ کا بھی ہے جنہوں نے برسوں ہیرو کا رول نبھایا پھر کیریر کی دوسری اننگ میں ویلین بن گئے اور ایک ایسے کامیاب ویلین بنے کہ انھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے سبھوں کی چھٹی کر دی، پریم ناتھ نے بطور ہیرو رستم سہراب میں پرتھوی راجکپور، ثریا اور ممتاز کے ساتھ کام کیا، فلم بادل میں مدھو بالا، چنگیز خان میں بینا رائے، شیخ مختار، بارہ گھنٹے میں پورنیما وغیرہ کے ساتھ ہیرو کا رول ادا کیا۔ لیکن ۱۹۵۲ء میں محبوب خان نے اپنی سپرہٹ فلم ''آن'' میں دلیپ کمار کے مقابل انہیں ویلین کے رول میں پیش کیا اور ہیرو سے اچانک ویلین کا رول نبھانے والے پریم ناتھ نے اس فلم میں اپنی زبردست اداکاری کے ذریعہ اپنی ایک چھاپ چھوڑی اور ساری دنیا میں اپنی اداکاری کا سکّہ جما دیا۔

پریم ناتھ کی پیدائش پشاور (پاکستان) میں ہوئی تھی اور تقسیم ہند کے بعد وہ مدھیہ پردیش کے جبل پور میں آ کر بس گئے جہاں سے بعد میں وہ ممبئ شفٹ کر گئے۔ انھوں نے فلم تاج محل کی حسین اداکارہ بینا رائے سے شادی کی جن سے دولڑکے پریم کشن اور کیلاش ناتھ (مونٹی) ہوئے۔ بینا رائے کی والدہ اکاکشا ملہوترہ بھی ایک مشہور اداکارہ رہ چکی ہیں۔ پریم ناتھ کے دو چھوٹے بھائی راجندر ناتھ اور نریندر ناتھ بھی تھے اور یہ دونوں بھی اداکار تھے۔ راجندر ناتھ نے انگنت فلموں میں مزاحیہ اداکاری کی اور خاص طور پر ناصر حسین کی فلمیں جب پیار کسی سے ہوتا ہے، پھر وہی دل لایا ہوں، وغیرہ میں اس کی مزاحیہ اداکاری عروج پر تھی۔

پریم ناتھ نے اپنے فلمی کیریر کی دو لمبی اننگ کھیلی ہے، پہلی مرتبہ بطور ہیرو کے اور دوسری مرتبہ بطور ویلین کے۔ ویسے تو اپنے ہیرو کے دور میں وہ فلم آن میں ویلین کا بھرپور کردار نبھا چکے تھے اور اپنی پہچان بنوالی تھی لیکن بطور ہیرو ریٹائر ہونے کے ایک عرصہ بعد انھوں نے ناصر حسین کی سدابہار اور سپرہٹ فلم ''تیسری منزل'' میں ایک خطرناک قاتل کا رول نبھایا جس کے دو مختلف روپ تھے۔ ایک روپ میں وہ شہر کی

باعزت حیثیت سے رائے صاحب کے طور پر مشہور تھے اور ان کا شمار تمول لوگوں میں ہوتا تھا جبکہ ان کا ایک دوسرا رول بھی تھا وہ اپنی بیوی، اپنی معشوقہ کا قتل کر چکے تھے اور پریم ناتھ ان دونوں کرداروں میں اپنے آپ کو اُبھار کر پیش کر چکے تھے۔ اداکارہ آشا پاریکھ جو کہ ان کی بیوی بینا رائے کی خالہ زاد بہن تھی اس کے ساتھ تیسری منزل میں پریم ناتھ نے بہت ہی خوبصورت رول ادا کیا تھا۔ فلم تیسری منزل نے کامیابی کے ریکارڈ توڑ دیئے تھے۔ اس فلم کی کامیابی میں جہاں شمی کپور، آشا پاریکھ، ہیلن اور پریم ناتھ کی خوبصورت اداکاری کو دخل تھا وہیں مجروح سلطانپوری کے خوبصورت نغمے، رفیع اور آشا بھونسلے کی دلکش آوازیں، راہل دیو برمن کی خوبصورت اور ناقابل فراموش سنگیت اور سب سے بڑھ کر وجے آنند کی ہدایت کاری، جس نے اس فلم کی کامیابی میں چار چاند لگا دیئے تھے۔

پریم ناتھ خود اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ وجے آنند جیسے ذہین ڈائریکٹر نے انہیں دیکھا۔ وجے آنند نے نوکیتن کی زبردست ہٹ فلم ''جانی میرا نام'' میں بھی ہدایت دی تھی جس کے ستارے پران، دیو آنند، ہیما مالنی، پریم ناتھ تھے، اس فلم میں پریم ناتھ نے ایک سکھ کا رول بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ نبھایا تھا۔ فلم تیرے میرے سپنے، دیش پریمی، جانِ من، امیر غریب، چھپا رستم، جانی دشمن وغیرہ پریم ناتھ کی یادگار فلمیں ہیں۔ انھوں نے امریکن ٹیلی ویژن سیریز مایا (۱۹۶۷) اور امریکن فلم (کینز) ۱۹۶۹ میں مشہور ہالی ووڈ اکٹر جم براؤن کے ساتھ کام کیا تھا۔ ۱۹۹۲ء میں انہیں دل کا شدید دورہ پڑا اور وہ ۶۵ سال کی عمر میں چل بسے۔ ۱۹۹۷ء میں ان کے سب سے چھوٹے بھائی نریندر ناتھ بھی حد سے زیادہ شراب نوشی کی وجہ سے چل بسے۔ راجندر ناتھ اس وقت زندہ ہیں لیکن فلموں سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ پریم ناتھ کی بیوہ بینا رائے بھی زندہ ہے لیکن پتہ چلا ہے کہ اکثر و بیشتر ان پر پاگل پن کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔

☆☆☆

گلوکار۔ ماسٹر نثار احمد

رام اورنگ آبادی

ماسٹر نثار اپنے زمانے کے بیحد مشہور آرٹسٹوں میں سے تھے۔لوگ ان کی گلوکاری کی اسیج پر فدا تھے۔ ماسٹر نثار نے بہت کم عرصے میں اتنی دولت حاصل کی جتنی کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اپنے زمانے کی سب سے مہنگی اور خوبصورت موٹر گاڑیاں ان کے پاس تھیں۔کئی کئی نوکر چاکر غرض کہ عیش وآرام کی ہر ایک چیز موجود تھی ان کے پاس۔مگر وہ اس دولت کو سنبھال کر نہ رکھ پائے اور ایک دن کنگال ہو بیٹھے۔حالات نے انھیں دردر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کردیا۔

ماسٹر نثار دلّی کے رہنے والے تھے۔ایسا نہیں تھا کہ گانا بجانا انھیں کہیں جاکر سیکھنا پڑا ہو بلکہ ان دونوں سے ان کا خاندانی رشتہ تھا۔مطلب وہ میراثی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ویسے ماسٹر نثار موسیقی کے ماہر بھی رہے تھے۔وہ اچھے خوبصورت نوجوان تھے۔روزگار کی خاطر دلّی سے کلکتہ پہنچے۔یہ وہ زمانہ تھا جب کلکتہ میں تھیٹروں کا زمانہ تھا۔وہاں راجستھان کے کئی شوقین مزاج لوگ ہوا کرتے تھے جنھیں ناچ گانے کا بڑا شوق تھا۔ان کے پاس تھیٹر اور فلم کمپنیاں بھی تھیں۔مدن تھیٹر انھیں میں سے ایک تھا۔اس تھیٹر میں ان کے آرٹسٹ کام کیا کرتے تھے۔جن میں عورت اور مرد دونوں ہی ہوا کرتے تھے۔آپ کو جان کر تعجب ہوگا کہ مرحوم اداکارہ مینا کماری کی ماں اقبال بیگم بھی اسی تھیٹر میں کام کرتی تھیں۔اور وہ یہاں پر ڈانسر ہوا کرتی تھیں۔مگر اس زمانے میں کلکتہ کی سب سے بڑی اسٹار تھی کجن۔یہ بے حد خوبصورت تھی۔کجن طوائف بھی تھی۔اس وقت تو تھیٹروں میں طوائفیں ہی کام کیا کرتی تھیں۔

ماسٹر نثار نے بھی تھیٹروں سے ہی فلموں میں قدم رکھا۔اس زمانے میں کلکتہ میں تھیٹر کے دو مصنف بہت مشہور تھے۔پنڈت بیتاب اور آغا حشر کاشمیری۔انھیں کے ڈراموں کو کلکتہ کے تھیٹروں میں کھیلا جاتا تھا۔ماسٹر نثار آغا حشر کشمیری سے ٹکرائے اور انھوں نے نثار کی قابلیت کو پہچان کر اپنے ڈراموں میں انھیں کام دینا شروع کردیا۔کجن بھی تھیٹروں میں ہی تھی۔اور اسی سلسلے میں ماسٹر نثار کجن کے قریب آئے۔ماسٹر نثار نے اس کے ساتھ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد جیسے کئی ڈراموں میں کام کر کے خوب شہرت حاصل کی۔

یوں ماسٹر نثار دلّی سے شادی شدہ ہی آئے تھے اور اپنی بیوی کو کلکتہ میں ساتھ رکھتے تھے لیکن بعد میں ان کا رومانس کجن کے ساتھ رہا۔

انھوں نے کھل کر کجن پر پیسہ لٹادیا۔اس کے باوجود ان کے قبضے سے باہر نکل گئی۔

فری پریس جرنل اخبار کے مالک تھے کرنانی۔کلکتہ میں ان کا بھی اندر پرستھ نام کا اپنا اسٹوڈیو تھا۔ کرنانی شوقین مزاج آدمی تھے۔ماسٹر نثار نے پہلے 'لیلیٰ مجنوں' اور 'شیریں فرہاد' جیسے ڈراموں کے ذریعہ شہرت حاصل کرہی لی تھی۔بعد میں انھیں فلموں میں لیا جانے لگا۔مدن تھیٹر نے 'لیلیٰ مجنوں' اور 'شیریں فرہاد' نام کی فلمیں بنائیں تو اس میں بھی ماسٹر نثار کو ہی لیا گیا۔اس تھیٹر کے مالکوں میں سے ایک کرنانی بھی تھے۔

کلکتہ میں ماسٹر نثار کی مقبولیت دیکھ کر بمبئی کے نانو بھائی ڈیسائی انھیں بمبئی لانے کے لیے کلکتہ جا پہنچے۔ نانو بھائی کی بمبئی میں سروج مووی ٹون نام کی کمپنی تھی۔کلکتہ سے ماسٹر نثار کو بمبئی لاکر اپنے بینر میں انھوں نے پہلی فلم بنائی ''عید کا دریا'' اس میں ماسٹر نثار کے ساتھ ہیروئن کے طور پر انھوں نے لیا سردار اختر کو دوسری فلم کے دوران ماسٹر نثار سے ان کی ان بن ہوگئی تو انھوں نے ماسٹر نثار کی چھٹی کردی۔

اس کے بعد ماسٹر نثار بھوانی مووی ٹون میں آگئے۔اس کے مالک تھے ایم۔بھوانی۔ماسٹر نثار کو لے کر انھوں نے اپنی فلم شروع کی ''شہر پرستان'' اس فلم میں ماسٹر نثار کے ساتھ ہیروئن تھیں ببّو اور ولن تھے جے راج۔ببّو دلّی کی رہنے والی طوائف تھی اور بڑی تیز طرّ ار لڑکی تھی۔وہ بول چال میں بڑے بڑوں کے کان کاٹ دیتی تھیں۔

ماسٹر نثار بھی دلّی کے رہنے والے تھے اور ببّو بھی۔ایک تو ایک ہی شہر کے رہنے والے دوسرے جوانی کی عمر۔ماسٹر نثار اور ببّو اس فلم کے دوران ایک دوسرے سے کافی نزدیک آتے گئے۔اور یہ نزدیکیاں عشق میں بدل گئیں۔اور ماسٹر نثار ایک بار پھر عشق کے چکر میں پھنس کر ببّو پر پانی کی طرح پیسہ بہانے لگے۔ببّو اور ماسٹر نثار کا عشق کافی دن تک چلتا رہا۔مگر شاید ماسٹر نثار کی قسمت میں عشق کا صحیح لطف اٹھانا نہیں تھا۔پہلے کجن نے انھیں ٹھکرادیا تھا اور پھر ببّو نے بھی ماسٹر نثار کو ٹھکرادیا۔

اسی دوران ماسٹر نثار نے دوسری شادی کرلی۔یہ شادی نرگس کے بھائی اختر کی سالی سعیدہ سے ہوئی اور اسی سے بچے بھی ہوئے۔لیکن اس سے بھی ماسٹر نثار کی نہیں بنی

اور آہستہ آہستہ آپس میں اختلافات شروع ہو گئے۔

ماسٹر نثار نے بہت سی فلموں میں کام کیا اور پیسہ بھی خوب کمایا۔ کسی زمانے میں ماسٹر نثار کی مقبولیت کی انتہا یہ تھی جو کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ لوگ انھیں دیکھنے کے لیے اسٹوڈیو کے گیٹ پر کھڑے رہا کرتے تھے اس وقت وہ بالکیشور روڈ پر ایک عالیشان محل میں رہا کرتے تھے۔ اسی بلڈنگ میں اس وقت کے سبھی ٹاپ کے آرٹسٹ رہا کرتے تھے۔ نسیم، جدّن بائی، سروپ رانی وغیرہ اسی میں رہتے تھے۔ اور خوشحالی کے دنوں میں ماسٹر نثار کے پاس سب سے مہنگی گاڑی ہوا کرتی تھی۔ ''روڈ ماسٹر بیوک'' اسکے علاوہ اور بھی کئی گاڑیاں ان کے پاس تھیں۔ ''روڈ ماسٹر بیوک'' کی اس وقت غالباً بارہ تیرہ ہزار روپے قیمت ہوگی مگر بارہ تیرہ ہزار روپے اس وقت بہت کم لوگوں کے پاس ہوتے تھے۔

ان کی عیاشی اور جیب خرچ اس حد تک تھی کہ سارا پیسہ انھوں نے پانی کی طرح بہا دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں بالکیشور کا اپنا مکان چھوڑ کر کسی چھوٹی جگہ چلے جانا پڑا۔ انھوں نے وہ مکان چھوڑا تو بمبئی سینٹرل پر بنسی لال مینشن میں دو کمروں کے مکان لینے پر مجبور ہو گئے۔ بے تکے خرچ کی اس عادت نے انھیں کنگال سے بھکاری کے مقام پر لا کھڑا کیا اور جب ان کے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہا تو تمام دوست واحباب جو ہمیشہ انھیں گھیرے رہتے تھے ایک ایک کر کے ان کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے پھر تو انھیں یہ مکان بھی چھوڑ دینا پڑا۔ اور کمائی پورہ جیسی بدنام بستی کی ایک کھولی میں اپنی زندگی کے باقی دن گزارنا پڑے۔

سب لوگوں نے اُن کا ساتھ ضرور چھوڑ دیا۔ لیکن اس حالت میں بھی جو ان کے کام آئی تھی وہ ان کی دلّی والی پہلی بیوی ہی تھی۔ اس نے زندگی کے آخری دنوں تک ان کا ساتھ دیا۔

اب جس ماسٹر نثار کے ہاں دس پانچ لوگ یوں ہی کھاتے پیتے اور عیش کرتے تھے اب اسی فنکار کو خود دانے دانے کے لیے محتاج ہو جانا پڑا۔ میں نے ایک بار ماسٹر نثار کو جانی واکر کے گھر پر عجیب وغریب حالت میں دیکھا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ عید کا دن تھا۔ پتہ چلا ہر بار کی طرح وہ جانی واکر کے یہاں اپنا لفافہ لینے آئے ہوئے ہیں۔ جانی واکر نے سو روپے کا نوٹ اُن کے ہاتھوں پر رکھا تو انھوں نے اس طرح جھک کر اسے لیا کہ مانو یہ سو روپے ان کے لیے ایک لاکھ روپے ہوں۔ جو آدمی ہزار پانچ سو روپے راہ چلتے اُڑا دیتا تھا اب اس کا یہ حشر ہے۔

جب وہ چلے گئے تو جانی واکر نے بتایا ہر سال عید کے موقع پر وہ آتے ہیں اور بنا کچھ کہے وہ انھیں سو کا نوٹ تھما دیتے ہیں۔

جدّن بائی بھی ماسٹر نثار کی کافی مدد کیا کرتی تھی۔ کئی مرتبہ تو اس نے انھیں ایکسٹرا کے رول بھی اپنی فلموں میں دیئے تھے۔

اتنا ہی نہیں آخری دنوں میں ماسٹر نثار کو جہاں سے بھی جو ملا وہ لے کر انھوں نے اپنا پیٹ بھرا۔ فلم آرٹسٹ ایسوسی ایشن کے فنڈ سے چندر شیکھر جی کی طرف سے انھیں ماہوار کچھ پیسے ملا کرتے تھے۔ اس ماسٹر نثار نے جس نے کبھی عیش و آرام میں اپنی پچھلی زندگی گزاری تھی اس ماسٹر نثار نے تِل تِل کر جیتے ہوئے ایک دن اپنی اندھیری کھولی میں دم توڑ دیا۔ ان کے جنازے میں بھی جانے والا کوئی نہیں تھا۔ میں، چندر شیکھر، اختر اور پاکستان میں رہنے والے ماسٹر نثار کے سالے ہی جنازے میں شریک ہوئے تھے۔

☆☆☆

فلم صنعت کا خوبصورت ہیرو۔ دھرمیندر

کمل دیوبندی

دھرمیندر کی کامیابی شہرت اور فنی صلاحیت کبھی بھی کسی سوپر اسٹار سے کم نہیں رہی۔ ۱۹۶۰ء سے ۲۰۰۷ء کے درمیان دھرمیندر کی ۲۴۹ فلمیں منظر عام پر آئیں۔ ۲۴۹ فلموں میں مرکزی کردار ادا کرنا کوئی کھیل تماشہ نہیں ان ۲۴۹ فلموں میں سے زیادہ تر نے باکس آفس پر کامیابی حاصل کی۔ اسی وجہ سے ۹۹ فیصد فلموں میں دھرمیندر بطور ہیرو نظر آئے۔ فلم انڈسٹری کے دو سوپر اسٹار راجیش کھنہ اور امیتابھ بچن بھی ایک زمانہ میں دھرمیندر کے ساتھ معاون ہیرو کا کردار ادا کرنے پر مجبور ہوئے۔ پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں نسرولی سے ممبئی کا رخ کرنے والے دھرمیندر کا اداکاری سے صرف فلمیں دیکھنے تک کا ناطہ تھا۔ فلم دیکھنے کے بعد گھر میں سجے آئینہ سے مکالمے بولنا یا پھر گھر میں ستون کو محبوبہ سمجھ کر بانہوں میں لینا اور رومانی مکالمے ادا کرنا ان کا خاص مشغلہ تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے ہر طرح کی فلموں میں اپنے فن کے جلوے بکھیرے اور اپنی حاضری کا بھرپور احساس دلایا۔ ۱۹۶۰ء میں ''دل بھی تیرا ہم بھی تیرے'' کے ذریعہ فلمی سفر کا آغاز کرنے والے دھرمیندر نے ۱۹۶۶ء میں او پی رہلن کی ہدایت میں بنی پھول اور پتھر میں ایک نامور غنڈے شاکا کے کردار کو زندگی بخشی اس دہائی کا ہیرو بے حد شرمیلا اور سماجی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا ایسے وقت میں دھرمیندر نے فلم کے پردے پر شرٹ اتار کر بہت سی سرحدوں کو بالائے طاق کر دیا تھا اور طویل مدت کے لئے کامیابی کے دروازے کی چابی کو اپنی مٹھی میں ید کر لیا تھا۔

اسی سال رشی کیش مکھرجی کی ''انوپما'' نے ایک نئے دھرمیندر کو متعارف کردایا جو اپنے کلام سے عوام مسائل پر طنز کرتا تھا۔ ۱۹۶۹ء میں ''ستیہ کام'' ۱۹۷۰ء ''جیون مرتیو'' اور ''شرافت'' ۱۹۷۱ء میں ''میرا گاؤں میرا دیش'' اور ''نیا زمانہ'' ۱۹۷۲ء میں ''سمادھی'' ۱۹۷۳ء میں ''یادوں کی بارات'' ۱۹۷۴ء میں ''دوست'' ۱۹۷۵ء میں ''شعلے''، ''چپکے چپکے'' اور ''پرتگیا'' ۱۹۷۷ء میں ''دھرم ویر'' ۱۹۸۳ء میں ''رضیہ سلطان'' ۱۹۸۵ء میں ''غلامی'' ۱۹۸۷ء میں ''حکومت'' اور ۲۰۰۷ء میں ''اپنے'' میں دھرمیندر نے اداکاری کے ہر پہلو پر اپنے آپ کو کھرا ثابت کیا اور یہ احساس بھی دلایا کہ فن اور فنکار کسی مخصوص امیج کے غلام نہیں

ہوتے ان فلموں کے علاوہ شکار۔ آنکھیں ۔ سیتا اور گیتا۔ راجہ جانی۔ جگنو۔ لوفر۔ پتھر اور پایل۔ چرس۔ نوکر۔ بیوی کا۔ آگ ہی آگ۔ اعلان جنگ۔ میٹرو جیسی درجنوں فلموں کی کامیابی نے دھرمیندر کو کامیابی اور شہرت کی بلندی بخشی۔ اپنے پچاس سالہ فلمی سفر میں دھرمیندر نے ۷۵ کے قریب مختلف ہدایت کاروں اور پچاس ہیروئنوں کے ساتھ فلم کے پردے پر اپنے کام کو انجام دیا۔ ارجن ہنگو رانی، راما نند ساگر، پرمود چکروتی، رشی کیش مکھرجی، انل شرما، راج کمار کوہلی، موہن کمار اور دلال گویا نے ایک نہیں کئی بار دھرمیندر کی فنی صلاحیتوں کا امتحان لیا اسی طرح مینا کماری، آشا پاریکھ، ہیما مالنی اور انیتا راج کے ساتھ دھرمیندر کی رومانٹک جوڑی مقبول عام ہوئی دھرمیندر کے دو بیٹے سنی دیول، بوبی دیول اور بیٹی ایشا دیول بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فلموں سے وابستہ ہوئے۔

بحیثیت فلم ساز وجیتا فلمس کے بینر تلے دھرمیندر نے جہاں راج کمار سنتوشی، امرتا سنگھ، ٹیونکل کھنہ، سنی دیول، بوبی دیول، ابھے دیول، آئشہ ٹاکیہ اور امتیاز علی کو متعارف کرایا وہیں ایک زمانہ میں پھر سے فلم انڈسٹری میں کامیابی اور نئی امیج کو تلاش رہے جاوید اختر اور راہل رویل کو بھی بہترین مواقع فراہم کئے۔

بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہوں گے کہ دھرمیندر اردو زبان اور اردو ادب کے زبردست شیدائی ہیں ان کو ہزاروں اشعار ازبر یاد ہیں اپنے مکمل فلمی سفر میں انہوں نے ہمیشہ فلم کی اسکرپٹ اور مکالمے اردو میں تحریر کئے ہوئے لئے ہیں ان کی ذاتی ڈائری میں ان کے کہے ہوئے ہزاروں کی تعداد میں اشعار درج ہیں وہ نثر میں بھی اپنے قلم کی زور آزمائش کرتے رہتے ہیں ان کا ایک شعر قارئین کے لئے یہاں پر حاضر خدمت ہے

دل کا بوجھ نہ بن جائے ان پہ بوجھ ہلکا کرنے سے ڈرتا ہوں
آہ نہ سن لے کوئی شدّت درد کی' فقط ضبط سے بیاں کرتا ہوں

دھرمیندر کے متعلق مشہور اردو ماہنامہ ''شمع'' نے ایک بار تحریر کیا تھا کہ ایشیاء میں جہاں اردو بولی جاتی ہے وہاں دھرمیندر مقبول ہیں۔ انگریزی ماہنامہ ''فلم فیئر'' نے دھرمیندر کو ون مین آرمی (The One Man Army) کے لقب سے نوازا تھا۔ ہندی ہفتہ روزہ ''مایا پوری'' نے ایک مضمون میں دھرمیندر کے حوالے سے تحریر کیا تھا کہ دھرمیندر کے فن کے بارے میں کچھ تحریر کرنا سورج کو چراغ دکھانے جیسا ہے مشہور فلمی ہفتہ روزہ انگریزی اخبار ''اسکرین'' نے دھرمیندر کے تعلق سے تحریر

کیا تھا کہ دھرمیندر زمین پر کامیابی کی کہانی ہیں۔اسی طرح ایک اور ماہنامہ ''فلم رپورٹر'' نے دھرمیندر کے تعلق سے لکھا تھا کہ دھرمیندر دادی، ماں اور بیٹی تینوں نسلوں کی پہلی پسند ہیں۔ان کے علاوہ راج کپور، دلیپ کمار، امیتابھ بچن، ونود کھنہ، سنی دیول، ہیما مالنی، شری دیوی، ڈمپل کپاڈیہ، راج کمار، کوہلی، پرمود چکرورتی، ارجن ہنگو رانی، گووند اور کے سی بوکاڑیہ جیسے نامور فلم ساز، ہدایت کار اور اداکار بھی دھرمیندر کی فنی صلاحیتوں کو قبول کر چکے ہیں۔

دھرمیندر کا فلم بینوں میں بھی اپنا ایک الگ کریز ہے۔ ہریانہ کے ارجن سنگھ منڈا ۱۹۷۲ء سے دھرمیندر کی مسلسل پوجا کر رہے ہیں، بیکانیر راجستھان کے پریتم کمار نے

ایک طویل مدّت سے اپنے گھر میں دھرمیندر کے نام سے ایک مندر بنا رکھا ہے، احمد آباد کی ایک لڑکی سنیتا شری دھردھون ''اوم نمہ شوائے'' کی جگہ اپنی تحریر میں ''شری دھرمیندر'' تحریر کرتی ہے اسی طرح کلکتہ کے قابل وکیل ایس۔کے۔گوہارائے اپنے لیٹر پیڈ پر اپنے آپ کو انگریزی میں ''دھرمیندر کا بھگت'' تحریر کرتے ہیں اس کے علاوہ بنگلور میں دو فینس کلب دھرمیندر کے نام سے قائم ہیں۔

دھرمیندر کی فنی صلاحیتوں کے اعتراف میں سابق صدر جمہوریہ ہند گیانی زیل سنگھ کے ذریعہ ''شرومنی پرسکار'' سابق صدر جمہوریہ ہند وینکٹ رمن کے ذریعہ فلم گھایل کی تکمیل کے لئے ''نیشنل ایوارڈ'' پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ بینت سنگھ کے ذریعہ ''یادگار پرسکار'' لائنس کلب دہلی کے ذریعہ ''موسٹ پوپلر ایکٹر'' کا ایوارڈ فلم فیئر کے ذریعہ ''لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ'' پنجابی کلا سنگم کے ذریعہ ''کلا بھوشن ایوارڈ'' حیدر آباد جرنلسٹ کے ذریعہ ''بہترین ہیرو کا خصوصی اعزاز'' سوئی وی ورس چوائس کے ذریعہ ''لائف ٹائم اچیومینٹ ایوارڈ'' زی سنے کے ذریعہ ''لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ'' پنے میں پانچویں قومی فلم تقریب میں ''جیون گورو پرسکار'' آئیفا ایوارڈ کے ذریعہ ''لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ'' ممبئ اکیڈمی آف موویز کے ذریعہ ''خصوصی اعزاز'' ناسک میں دوسرے ناسک انٹرنیشنل فلم فیسٹول میں ''لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ'' اور امریکہ کی مشہور انگریزی زبان کی میگزین ''ٹائم'' کے ذریعہ دنیا کے ساتھ خوبصورت مردوں میں انتخاب کیا جاچکا ہے۔

طویل کامیابی، شہرت، بلندی، اور فلمی سفر کے باوجود حکومت ہند کا رویہ دھرمیندر کے لئے انتہائی مایوس کن ہے۔آج بھی دھرمیندر کے لاکھوں مداح اس انتظار میں آنکھیں بچھائے بیٹھے ہیں کہ کب حکومت ہند کی نیند ٹوٹے اور دھرمیندر کی فنی صلاحیتوں کا اعتراف سرکاری سطح پر ہو۔ ☆☆☆

منفرد اداکار۔نصیر الدین شاہ

یاسمین اختر (مغربی بنگال)

اگر یہ کہا جائے کہ ہندی فلموں میں دلیپ کمار کے بعد اگر کوئی دوسرا بڑا اداکار ہے تو وہ نصیر الدین شاہ ہے تو ممکن ہے کہ مختلف اطراف سے تنقیدوں کا سلسلہ شروع ہو جائے، کوئی دوسرا نمبر امیتابھ بچن کو، کوئی راج کمار کو، کوئی دھرمیندر تو کوئی راجیش کھنّہ، سنیل دت، منوج کمار کا نام لے سکتا ہے۔اس فہرست میں ہم سنجیو کمار کو شامل نہیں کر سکتے کیونکہ سنجیو کمار کی نیچرل اداکاری انمول تھی اور اسکی نیچرل اداکاری کے آگے ہندوستان کا ہالی ووڈ بھی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ سنجیو بیک وقت رئیس، غریب، مشفق اور ظالم کا کردار اس خوبی سے نبھا سکتے تھے اور ان کی نیچرل اداکاری پر کوئی بھی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا، بہر کیف یہاں بات نصیر الدین شاہ کی ہو رہی ہے اور نصیر الدین شاہ موجودہ دور کے ایک ایسے اداکار ہیں جو سوائے کامیڈی کے ہر رول کو خوبصورتی سے نبھا سکتے ہیں۔نصیر الدین شاہ کا تعلق اسٹیج سے رہا ہے۔اور وہ برسوں اسٹیج پر کام کرتے رہے۔فلموں کے لئے اداکاری آسان ہے نسبتاً اسٹیج میں اداکاری کے۔اگر نصیر الدین شاہ کو ''البرٹ پنٹو کو غصّہ کیوں آتا ہے'' سے لیکر کرش اور دس کہانیاں، تین دیواریں تک کا محاسبہ کیا جائے تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس اداکار نے گزشتہ تین برسوں کے دوران ٹی وی اور فلموں میں اپنی اداکاری کے ایسے جوہر دکھائے کہ ماہر تنقید کو بھی سوچنا پڑے گا۔مندرجہ ذیل میں ہم نصیر کی تمام فلموں کے بجائے ان چنندہ فلموں کی بات کریں گے جس میں ان کی اداکاری انتہائی عروج پر نظر آئی۔

آکروش:- فلم آکروش شیام بینیگل کی ایک ماسٹر پیس فلم تھی جس میں سمیتا پاٹل، نانا پاٹیکر، اوم پوری اور نصیر الدین شاہ نے مرکزی کردار ادا کئے تھے، یہ ایک بیحد خوبصورت اور جذباتی المیہ سے بھرپور فلم تھی اور پوری فلم مکارانہ سیاست پر مبنی تھی۔اس فلم میں نصیر الدین شاہ نے ایک وکیل کا رول ادا کیا تھا اور وہ اس فلم میں ایک ایسے آدیواسی قاتل کو بچانے کی کوشش کرتا ہے جس پر اس کی بیوی (سمیتا پاٹل) کے قتل کا الزام ہے اور یہ قاتل اوم پوری ہے۔وہ وکیل کے جرح کے دوران کچھ بھی نہیں کہتا حتیٰ کہ اس کا باپ نانا پاٹیکر بھی اپنی زبان سے کچھ کہنا نہیں چاہتا۔لیکن نصیر اپنی تحقیقات کے ذریعہ اس کا پتہ لگا لیتے ہیں کہ جس پروموٹر اور ٹھیکہ دار نے مل کر اس کی بیوی کی اجتماعی عصمت دری اور قتل کیا تھا اُسے اس قتل کے الزام میں پھنسا دیتا ہے اور اس کے باپ کو دھمکی دی جاتی ہے کہ اگر اس نے اپنی زبان کھولی تو اس کی بیٹی کا بھی اغوا اور ریپ کر دیا جائے گا، فلم کا کلائمکس بیحد لاجواب ہے۔

اس فلم میں نصیرالدین شاہ سمیتا پاٹل اوراوم پوری کی اداکاری تو انتہائی عروج پر تھی لیکن ایک آدیواسی مجبور، بوڑھے اور لاغر باپ کے رول میں نانا پاٹسیکر کی اداکاری کا کوئی جواب نہیں تھا خاص طور پر نصیر جب اس سے کچھ جرح کے لئے جاتا ہے تو وہ اشارے سے اُسے اس انداز میں واپس جانے کے لئے کہتا ہے جیسے کوئی بیزار شخص بیٹھے بیٹھے مکھیاں بھگا تا ہو۔شیام بینگل نے اس فلم کی ہدایتکاری میں سبھوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا خودستیہ جیت رے نے اس فلم کے بارے میں تبصرہ کیا تھا کہ یہ فلم ہندوستان کی چند بہترین کلاسیک فلموں میں سے ایک ہے۔

نصیرالدین شاہ کو بہترین اداکاری مرچ مسالہ (سمیتا پاٹل) پولیس پبلک (راج کمار) چمتکار (شاہ رخ خان) کرش (ریتک روشن) دس کہانیاں (شبانہ اعظمی) پار (شبانہ اعظمی) کرما (دلیپ کمار)، البرٹ پنٹو کو غصّہ کیوں آتا ہے (شبانہ اعظمی) تین دیواریں (جیکی شروف، جوہی چاوٗلہ) مہرا (اکشے کمار) امراوٗ جان (ریکھا) وغیرہ میں کھل کر نظر آئیں۔فلم ڈویژن اور ٹیلی ویژن نے جب مرزا غالب پر ایک ٹیلی سیریل بنانے کا ارادہ کیا تو مرزا غالب کے رول میں نصیرالدین شاہ کو لیا اور نصیرالدین شاہ نے مرزا غالب سیریل کو اپنی حقیقی اداکاری کے ذریعہ نیا رنگ بھر دیا۔یوں تو نصیرالدین تری دیو جیسی فلمیں بھی کیں اور کامیڈی کا انداز بالکل چمتکار جیسا پیش کیا لیکن درحقیقت نصیر ایک بیحد سنجیدہ قسم کے اداکار ہیں۔انہوں نے اسٹیج کی دنیا سے ہی اپنی انفرادیت کا مظاہرہ کر دیا تھا اور خودستیہ جیت رے جیسے ہدایتکار نصیر کی اداکاری سے بیحد متاثر تھے فلم پولیس اور پبلک اور مرچ مسالہ میں انہوں نے جس خطرناک قسم کے پولیس افسر کا رول کیا وہ دونوں فلمیں نصیر کی وجہ سے یادگار بن گئیں۔

نصیر حقیقی طور پر ان فلموں کو ہمیشہ ترجیح دیتے رہے جس میں کوئی نئی کہانی ہو اور جس میں انہیں اداکاری کے فن کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملے نصیر بیک وقت سنجیدہ اور کمرشیل فلموں میں کام کرتے رہے ہیں لیکن ان کی اداکاری ہر فلم میں بالکل عروج پر نظر آئی۔اس وقت جبکہ سلمان، عامر، شاہ رخ، ریتک، اکشے، سیف وغیرہ کا زمانہ ہے ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے بھی نصیر نے اپنی اداکاری کے بل بوتے پر ایک سپراسٹار کی حیثیت حاصل کر رکھی ہے فلم اقبال جیسی تجرباتی فلم میں جس میں وہ ایک کمسن لڑکے کو بیٹنگ اور بالنگ سکھاتے نظر آتے ہیں وہ اس رول میں بھی بیحد پسند کئے گئے۔

☆☆☆

فلمی شہزادہ۔ پردیپ کمار

خواجہ احمد حسین

۲۰ ویں صدی کے درمیانی دور میں جن اداکاروں نے بہت زیادہ نام وشہرت حاصل کئے ان میں اشوک کمار، دلیپ کمار، دیو آنند، راجکپور، شمی کپور، ششی کپور، راجندر کمار، سنیل دت، دھرمیندر، منوج کمار کے نام قابلِ ذکر ہیں جس کے بعد راجیش کھنہ، امیتابھ بچن، شتروگھن سنہا، ونو دکھنہ کا دور آیا، لیکن پہلے دور میں جو اشوک کمار اور دلیپ کمار کا دور رہا، اس میں متذکرہ اداکاروں کو صف اول کا سپر اسٹار تسلیم کیا گیا تھا اور ان کے درمیان بھارت بھوشن، پردیپ کمار، دوسرے درجے کے ہیرو تھے جبکہ تیسرے درجے میں مہی پال، ترلوک کپور، رنجن، آزاد، اجیت وغیرہ کو تیسرے نمبر کا ہیرو قرار دیا گیا تھا۔لیکن اس کے باوجود جہاں بھارت بھوشن نے مرزا غالب، پھاگن، بیجو باوٗرا، جہاں آرا، انگو مال، گیارہ ہزار لڑکیاں، برسات کی رات۔گھونگھٹ، جیسی کلاسیک فلموں میں کام کر کے اپنا منفرد مقام بنایا وہیں پردیپ کمار کو ان سب سے الگ مختلف اداکار کے طور پر تسلیم کیا گیا، جس کے چہرے پر شہزادوں اور یوراج جیسا وقار، کنور جیسا خوبصورت چہرہ تھا۔انارکلی، تاج محل، ناگن، آرتی، بہو بیگم، نورجہاں جیسی تاریخی فلموں میں کام کر کے پردیپ کمار کو صحیح معنوں میں ہندی فلموں کا شہزادہ تسلیم کیا گیا۔

پردیپ کمار جن کا تعلق کولکاتہ کے ٹالی گنج سے تھا۔انہوں نے اپنے کیریر کا آغاز بنگلہ فلموں سے کیا اور سچترا سین، سمترا دیوی وغیرہ کے ساتھ کئی بنگلہ فلمیں کیں چونکہ پردیپ کمار نے لکھنوٗ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہاں انھوں نے اردو ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا، اور ان کے لب ولہجہ سے پتہ ہی نہیں چل سکتا تھا کہ وہ بنگال کے ہیں جبکہ تاج محل، نورجہاں اور بہو بیگم جیسی فلموں میں اردو کے ڈائیلاگ ایسے ادا کئے کہ ہر کوئی حیران رہ گیا کہ یہ شخص بنگال کا ہے یا اتر پردیش کا چونکہ نورجہاں اور بہو بیگم کے ڈائیلاگ خود ایم صادق نے تحریر کئے تھے اور مشکل سے مشکل الفاظ کا استعمال کیا تھا لیکن پردیپ کمار کا لہجہ بالکل کسی لکھنوی نواب جیسا ہی رہا۔

پردیپ کمار نے فلم چترلیکھا میں ایک راج کمار ''بیج گپت'' کا مشکل رول ادا کیا تھا اور اسی طرح سے ہیمنت کمار کی فلم ''ناگن'' میں بھی انھوں نے ایک کنور کا رول نبھایا اور ان دونوں فلموں میں اس کے ڈائیلاگ بالکل دھارمک قسم کے تھے لیکن مجال ہے جو ان سے تلفظ کی غلطی ہوئی ہو اور خاص طور پر چترلیکھا میں مینا کماری اور اشوک کمار کے ساتھ جو اس کے طویل ڈائیلاگ وید، پران، اپ بھرنش، سنسکرت اور خالص ہندی کے تھے انھوں نے بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ ادا کیا ویسے تو فلم چترلیکھا صرف مینا کماری کی وجہ سے یاد رکھی جاسکتی ہے لیکن اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ پردیپ کمار نے اپنا رول بیحد عمدگی سے نبھایا۔

فلم آرتی میں اشوک کمار اور وحیدہ رحمٰن کے ساتھ پردیپ کمار کا رول اگرچہ بہت معمولی تھا اور پوری فلم اشوک اور وحیدہ کے اردگرد گھومتی تھی لیکن اس کے باوجود پردیپ نے اشوک کے دوست گنیش کے رول میں بہت زیادہ محنت کی۔

فلم بہو بیگم، بھیگی رات، چترلیکھا کی کاسٹنگ ایک ہی تھی اور تینوں فلموں میں اشوک، مینا اور پردیپ کے متوازی رول تھے، ان تینوں میں پردیپ کمار کی اداکاری کو بیحد سراہا گیا۔فلم استادوں کے استاد (اشوک کمار، شکیلہ، پردیپ کمار، شیخ مختار) میں بھی پردیپ کمار نے ایک بھولے بھالے عاشق کا رول ادا کیا تھا جبکہ اس فلم میں اصل رول شیخ مختار اور اشوک کمار ہی کا تھا۔شیخ مختار ایک خطرناک غنڈہ اور اشوک کمار ایک خطرناک جاسوس، لیکن آخر میں استادوں کے استاد اشوک کمار ہی ثابت ہوئے جب پتہ چلا کہ اصل مجرم وہی ہیں اور شروع سے آخر تک غنڈے کا رول نبھانے والا خفیہ پولیس کا افسر، اس فلم میں اشوک کمار اور شیخ مختار نے پردیپ کمار کو بالکل کھلونے کی طرح سے کھیلا تھا اور پوری فلم میں وہ ایک مظلوم عاشق ہی نظر آئے۔البتہ ہیروئن کے رول میں شکیلہ کا کردار کسی حد تک ٹھیک رہا اور اسے اداکاری کے کئی مواقع دیئے گئے جبکہ پردیپ کمار کو تماشائی بنا کر رکھا گیا۔

۱۹۷۰ء کی دہائی میں پردیپ کمکار نے بطور فلمساز فلم ''افسانہ'' بنائی جس کے ہدایت کار برج اور معاون ہدایتکار منموہن ڈیسائی تھے۔اس فلم میں اشوک کمار، پدمنی بھی تھے۔اشوک کمار ایک عادی

مجرم اور مفرور قیدی تھے جو ایک ویرانہ میں پردیپ کمار کے سیب کے باغات میں پناہ لینے پہنچے، لیکن آخر میں پردیپ کمار کو اس کے دشمنوں سے بچاتے ہوئے خود جان دیدی اس طرح سے اصل ہیرو وہی بن گئے اور دیکھا جائے تو استادوں کے استاد، بھیگی رات بہو بیگم، افسانہ، آرتی، چترلیکھا وغیرہ میں اشوک کمار نے جو پردیپ کمار کے ساتھ متوازی رول ادا کیا، وہ ہر فلم میں چھائے رہے۔

پردیپ کمار کی ابتدائی بنگلہ فلم ''آنند مٹھ'' تھی جس میں انہوں نے ایک مجاہد آزادی کا رول نبھایا تھا، اس فلم کے واقعات اس قدر زیادہ تھے کہ اصل ہیرو خود اس کے پس پردہ چلے گئے تھے۔اس زمانے میں بیجو باؤرا، پھاگن، مرزا غالب وغیرہ بھارت بھوشن کی ایسی فلمیں تھیں جو بہترین موسیقی اور محمد رفیع کی دلکش گیتوں کی وجہ سے بیحد کامیاب ہوئی تھی لیکن سی رامچندر کی موسیقی فلم انارکلی، ہیمنت کمار کی موسیقی فلم ناگن، روشن کی موسیقی فلم تاج محل اور چترلیکھا نے بھی اپنی موسیقی کے نئے رنگ بکھیرے، اس زمانے میں موسیقی کا اصل مقابلہ نوشاد، روشن اور مدن موہن کے درمیان ہوتا تھا۔ہیمنت کمار نے فلم ناگن کے لئے جس بہترین انداز میں وائکن اور سنکھ بجائے اور بین کی آواز کے ساتھ لتا اور ہیمنت کے گیتوں نے تہلکہ مچایا اس کی مثال نہیں دی جاسکتی ناگن کی موسیقی سپرہٹ ثابت ہوئی اسی طرح سے انارکلی میں لتا منگیشکر کی آواز کا جادو سرچڑھ کر بولا، پردیپ کمار نے چترلیکھا، ناگن، بہو بیگم، نورجہاں، راج ہٹ، پٹ رانی درگا نندنی میں تاریخی رول ادا کئے جس میں ہیمنت کمار اور روشن جیسے اعلیٰ موسیقاروں نے پردیپ کمار کی شہرت میں بے پناہ اضافہ کردیا تھا۔

پردیپ کمار نے اپنے کیرئیر میں ہیرو کے بعد معاون اداکار کے طور پر بھی انگنت فلموں میں کام کیا جس میں شومکھرجی کی یادگار فلم ''سمبندھ'' کا نام قابلِ ذکر ہے، اس فلم میں وہ دیب مکھرجی کے باپ کا رول ادا کرتے ہیں جو اُسے بچپن میں اپنی بیوی کے پاس چھوڑ کر شہر میں پیسے کمانے کے لئے چلا جاتا ہے لیکن کئی برسوں تک اُسے مارا مارا پھرنا پڑتا ہے اور پھر وہ مایوس ہوکر گاؤں لوٹتا ہے تو اُسے پتہ چلتا ہے کہ بھیانک سیلاب نے پورے گاؤں کو اجاڑ دیا تھا اور اس کی بیوی اور بچے کے بارے میں کسی کو بھی کچھ علم نہیں۔کچھ لوگوں نے بتایا کہ وہ دونوں مرکھپ گئے ہیں جس کے بعد وہ پھر

شہر چلا آتا ہے جہاں ایک امیرزادی اس پر عاشق ہو جاتی ہے اور وہ اس سے شادی کر لیتا ہے لیکن شادی کے چند ماہ بعد ہی اس کی بیوی بچے کو جنم دینے سے پہلے مرجاتی ہے اور اس کی ساری دولت اس کے نام کر جاتی ہے، پھر عجیب وغریب حالات میں اس کی ملاقات اس کے بیٹے سے ہوتی ہے وہ بیٹے کو پہچان نہیں پاتا لیکن بیٹا اپنے باپ کو پہچان لیتا ہے، فلم کا اختتام المیہ ہے جس میں پردیپ کمار کو پتہ چلتا ہے کہ اس کی بیوی انتہائی مفلسی میں تپ دق کا شکار ہو کر مرگئی، وہ اپنے بیٹے کو اپنا لیتا ہے لیکن موت بھی اس کے تعاقب میں ہوتی ہے اس فلم کی کہانی میں پردیپ کمار ارنجنا ممتاز اور دیب مکھر جی کی اداکاری لاجواب ہے۔ پردیپ کمار کی بیوی کے رول میں سلوچنا کی اداکاری بھی عروج پر ہے فلم باغی میں پردیپ کمار نے لیلا نائیڈو، ممتاز اور جیون کے ساتھ کام کیا تھا پردیپ کمار کو دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا کیا اور منوج کمار کی فلم ''کرانتی'' میں دونوں اداکاروں کو دو تین سین میں یکجا کیا گیا۔ پردیپ کمار نے این اے انصاری کی فلمیں ''وہاں کے لوگ'' میں فریال کے ساتھ کام کیا۔ یہ بیحد سنسنی خیز جاسوسی فلم تھی۔ پردیپ کمار جس نے فلموں میں شاہزادوں، کنور، راجکمار اور بادشاہ کے رول ادا کئے، ان کی زندگی کے آخری چند سال بہت ہی عُسرت میں گزرے، کلکتہ کے ٹالی گنج کے ایک فلیٹ میں وہ تنہا رہتے تھے، بیوی کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا، ایک بیٹا، باپ سے علاحدگی حاصل کر کے امریکہ میں جابسا تھا اور بیٹی شادی کر کے کناڈا چلی گئی تھی اور باپ کی موت کی خبر سن کر بھی وہ دونوں نہیں آئے۔ چند لوگ جن میں بنگلہ فلموں کے ایکسٹرا اداکار تھے انھوں نے پردیپ کمار کی نعش کو ۲۰۰۷ء میں کیوڑا اتلہ شمشان گھاٹ پہنچایا اور اس کی موت کے بعد سے آج تک کسی نے بھی اس مشہور اداکار کے بارے میں سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کی۔

☆☆☆

اپنے عہد کا سپر اسٹار ہیرو۔ جتندر

ڈاکٹر شاہد محمود

فلمی اداکاروں کی بات ہو اور ذکر جتندر کا نہ ہو تو اس جیسے سپر اسٹار کے ساتھ زبردست ناانصافی ہوگی کیونکہ اس اداکار نے ۲۰۰ سے زائد فلمیں دیں، لیکن جتندر بسواجیت پردیپ کمار چند ایسے سپر اسٹار ہیں جن میں جوائے مکھر جی بھی شامل ہیں انہیں کبھی ایوارڈ کا مستحق نہیں سمجھا گیا، جہاں تک بسواجیت اور جوئے مکھر جی کی بات ہے تو ان کی بات دوسری ہے لیکن جتندر نے کم از کم چھ سات ایسی فلمیں ضرور دی ہیں جس میں وہ ایوراڈ کے مستحق ہو سکتے تھے جیسے پریچے، بوند جو بن گئی موتی، گیت گایا پتھروں نے، خودغرض وغیرہ، اس کے علاوہ میرے حضور بھی ایک ایسی فلم ہے جس میں اس نے اچھی اداکاری کی، لیکن سارا کریڈٹ راج کمار لے گئے۔ بہرکیف جتندر نے دلیپ کمار، راج کمار، راجیش کھنہ، فیروز خان، امیتابھ بچن، دھرمیندر، اشوک کمار، جیسے اداکاروں کے ساتھ کام کیا اور اپنی ایک منفرد پہچان رکھی۔

جتندر نے اپنے ابتدائی دور میں راجشری کے ساتھ گیت گایا پتھروں نے، سہاگ رات، میں کام کیا اور یہ دونوں فلمیں کلاسیک رہیں، لیکن ۱۹۶۷ء میں فلمساز وہدایت کار ڈھونڈی کی فلم ''فرض'' میں جیمز بانڈ کا رول نبھایا، اس فلم کی ہیروئن ببیتا تھی اور فلم کے پہلے ہی سین میں ارونا ایرانی کے ساتھ جتندر کا یہ گیت ''مست بہاروں کا میں عاشق'' نے فلم بینوں کو اپنی جگہ سے اچھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ فلم پورے ملک میں گولڈن جبلی ہوئی۔ ڈھونڈی نے فلم جواب (اشوک کمار، مینا کماری، جتندر، لینا چندورکر) اور دیگر کئی فلمیں بنائیں جو سپر ہٹ ثابت ہوئیں، فلم لاوارث میں جتندر، ہیما مالنی اور محمود نے غضب کی اداکاری کی تھی اور یہ فلم سپر ہٹ ثابت ہوئی تھی جس کے بعد جتندر نے ایک کے بعد ایک کئی سپر ہٹ فلمیں دیں اور وہ بھی اپنے زمانے میں راجندر کمار کی طرح سے جبلی اداکار کہلانے لگے۔ جتندر نے ہیما مالنی، لینا چندرورکر، راکھی، ریکھا، سری دیوی کے ساتھ بہت زیادہ فلمیں کیں اور ایک زمانے میں جتندر اور سری دیوی کی جوڑی سب سے ہٹ جوڑی کہلانے لگی تھی، جتندر کو لوگ اس کے اچھل کود، رقص اور خوبصورت انداز میں گیت گانے کی وجہ سے بیحد پسند کرنے لگے تھے۔

۱۹۸۰ء میں ناصر حسین کی سپر ہٹ فلم ''کارواں'' میں جتندر، آشا پاریکھ اور ارونا ایرانی نے مرکزی کردار نبھایا تھا، یہ فلم محمد رفیع اور آشا بھونسلے کے خوبصورت گیت اور آر ڈی برمن کے سنگیت کی وجہ سے سپر ہٹ ہو گئی تھی اس

فلم کے شروع میں ہیلن کے رقص کے ساتھ ایک گیت ’’پیا تو اب تو آجا‘‘ بیحد مشہور گیت ثابت ہوا تھا۔

رائٹر، ہدایت کار، فلمساز و نغمہ نگار گلزار نے فلم پریچے میں جتندر کو ایک سنجیدہ ٹیچر کا رول دیا، یہ فلم ’’دی ساؤنڈ آف میوزک‘‘ سے متاثر ہو کر بنائی گئی تھی جس میں پران نے کرسٹوفر پامر اور جیا بھادوری نے آدری ہیپرن کا رول کیا تھا۔ اس فلم میں جتندر کی سنجیدہ اداکاری نے لوگوں کو سوچنے سمجھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

جتندر نے مسلم شوشل فلم ’’میرے حضور‘‘ میں راج کمار اور مالا سنہا کے ساتھ کام کیا تھا جس میں راجکمار نے ایک اوباش نواب کے رول میں جان ڈال دی تھی، اس فلم کے آخر میں راجکمار، جتندر کی جان بچاتے ہوئے خود موت کے منھ میں چلا جاتا ہے اور اس طرح سے اس فلم میں جتندر بہترین اداکاری کرنے کے باوجود راجکمار کے مقابلے میں ہار مان جاتا ہے۔

جتندر نے راجیش کھنّہ کے ساتھ بھی کئی سپر ہٹ فلمیں کیں جس میں مقصد اور سلطان احمد کی فلم شامل ہے۔ اس کے علاوہ دلیپ کمار، دھرمیندر اور امیتابھ بچن کے ساتھ بھی کام کیا۔ اس وقت جتندر فلموں سے الگ ہو گئے ہیں کیوں کہ ان کی بیٹی ’’ایکتا کپور‘‘ چھوٹے پردے کی رانی ہے اور اس کی سیریلیں ملک میں دھوم مچا چکی ہیں جس میں ساس بھی کبھی بہو تھی، کہیں کسی روز اور دیگر سبھی سیریل جو بالا جی پروڈکشن کے نام سے ہیں وہ سبھی ایکتا کپور کی ہیں جس نے ٹی وی سیریلوں کے ذریعہ اربوں روپئے کمائے جو جتندر اپنی ۳۰ سالہ فلمی کیریر میں نہیں کما سکے جتندر کا لڑکا تو شار کپور بھی ہیرو ہے لیکن ناکام ہے اور چھوٹے موٹے رول کرتا ہے۔ البتہ اس نے پہلی فلم میں ہیرو کا رول کرینہ کپور کے مقابلہ میں کیا ہے۔

۱۹۷۰ء کی دہائی میں ڈھونڈی کی فلم ’’ہمجولی‘‘ جو کہ گولڈن جبلی فلم تھی جس میں جتندر اور لینا چندرو کرنے اداکاری کی تھی، اس فلم میں محمود کے ٹرپیل رول نے فلم کو زبردست کامیابی بخشی تھی، محمود نے اس فلم میں بوڑھے کے رول میں پرتھوی راج، اڈھیڑ کے رول میں راج کپور اور نوجوان کے رول میں اپنی اوریجنل اداکاری کی تھی اور تینوں کی بیک وقت مختلف انداز کی اداکاری نے فلم کی کامیابی میں چار چاند لگا دیئے تھے اور فلم میں ہیرو کے طور پر جتندر گم ہو کر رہ گئے تھے جس طرح سے فلم میں سندر ہوں میں محمود کی اداکاری کے آگے ہیرو بسوا جیت پانی بھرتے نظر آئے بہر کیف جتندر کو صحیح معنوں میں ۱۹۷۰ء کی دہائی کا بہترین اور سپر اسٹار کہا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

بھارت کمار۔ منوج کمار

ڈاکٹر عقیل احمد عقیل

منوج کمار عرف بھارت ہندی فلموں کے ایک ایسے اداکار رہے ہیں جو دوسرے اداکاروں سے ہمیشہ مختلف نظر آئے، لیکن یہ الگ پن اسی وقت سے شروع ہوا جب سے انہوں نے بحیثیت ہدایتکار اپنے آپ کو سامنے لایا اور ۱۹۶۵ء میں حب الوطنی کے موضوع پر فلم ’’اُپکار‘‘ بنائی اس فلم میں انھوں نے اپنا نام بھارت رکھا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں چیتن آنند کی حقیقت کے بعد اپکار حب الوطنی کے موضوع پر بنی دوسری فلم تھی اور بیحد کامیاب ہوئی تھی اور سب سے بڑھ کر لوگوں کو اس کا نام ’’بھارت‘‘ کچھ عجیب سا مگر بہت پیارا لگا تھا لہذا منوج کمار نے اس کے بعد جتنی بھی فلمیں اپنے وشال انٹرنیشنل کے بینر تلے بنائیں ان سبھوں میں انہوں نے اپنا نام بھارت ہی رکھا جیسے پورب اور پچھّم، روٹی کپڑا اور مکان، شور، کرانتی وغیرہ فلم اپکار کے بعد سے اس خوبصورت اور وجیہہ چہرے والے ہیرو کے اندر ایسی تبدیلیاں آئیں کہ انھوں نے اپنے آپ کو وقت سے پہلے بوڑھا بنالیا۔ ڈائیلاگ بولنے کا انداز تو پہلے ہی سے دلیپ کمار جیسا اپنا رکھا تھا اور بعد میں تو انھوں نے اپنے ہر انداز میں اس طرح بناوٹی پن اختیار کر لیا اور ڈائیلاگ اس طرح سے رک رک کر چہرے اور پیشانی پر ہر لمحہ بل لاتے ہوئے ڈائیلاگ بولنے کی کوشش نے انہیں ایک پیچیدہ اداکار بنا کر رکھ دیا تھا۔ اپکار، پورب اور پچھّم تک تو لوگوں نے برداشت کیا مگر روٹی کپڑا اور مکان اور پھر اکرانتی میں بھی وہی نام بھارت کا لوگوں کو کھل گیا، اس کے علاوہ بات بات پر ملک سے وفاداری کے ڈائیلاگ، ملک پر جان قربان کر دینے کا دعویٰ، ہر چیز کی زیادتی بذات خود ایک بیماری ہوتی ہے اور اگر کوئی ہر وقت اپنے آپ کو سچا، ایماندار، اور پُر خلوص ظاہر کرنے کی کوشش کرے تو اسی سے اندازہ کر لینا چاہئے کہ اس کے اندر کس حد تک ایمانداری اور خلوص ہے۔ لہذا اپکار، پورب پچھّم روٹی کپڑا اور مکان تو ہٹ ہو گئیں اور اس دوران سماجی موضوع پر بنی فلم شور بھی کامیاب ہوئی مگر کرانتی بیحد بور اور سر درد والی فلم ثابت ہوئی۔ خاص طور پر اس فلم کے لمبے لمبے ڈائیلاگ جس پر منوج کمار کا بار بار سر کو دائیں بائیں آگے پیچھے ہلانا اور بار بار ہاتھ کا پنجہ سامنے رکھ کر اور کبھی ہتھیلی سے منھ چھپا کر ڈائیلاگ بولنے کے انداز نے لوگوں کو حد درجہ بور کر دیا۔ منوج اس فلم میں بیک وقت بالی ووڈ کے ٹین کمانڈس مینٹ، بن ہور، ایڈوریڈو، اور فار فرام دی میڈنگ کراؤڈ کی نقّالی میں مارے گئے، اس فلم میں اگرچہ دلیپ کمار، ہیمالنی، ششی کپور اور

شترو گھن سنہا جیسے دوسرے اداکار تھے لیکن منوج نے اس فلم میں ان سبھوں کو کریکٹر ایکٹر بلکہ جہاں تک فلم اپکار کا سبجیکٹ تھا، وہ اپنی جگہ پر ٹھیک تھا، ایک طرف کسان اور دوسرا جوان، ان دونوں کو دو مختلف انداز میں محاذ جنگ میں برسرِ پیکار دکھایا گیا تھا، اس کے ساتھ ساتھ شہر کی حالت جہاں اوپاشی، عریانی اور مئے کشی عام تھی، ایک طرف جہاں فوجی جوان ملک کی خاطر اپنی جان قربان کر رہے تھے وہیں شہر کے رہنے والے اپنی رنگ رلیوں میں مشغول تھے اور اس کے ساتھ ساتھ بھائی بھائی کا ٹکراؤ، زمین جائداد کی حرص اور غلط ہاتھوں میں پڑ کر غلط کام کرنا اور پھر اس کا سدھار اور یہ سب کچھ مل کر اس فلم کی کامیابی کی ضامن بنی تھیں۔

پورب اور پچھّم کا سبجیکٹ بھی اچھا تھا۔ جہاں مشرق اور مغرب کا ٹکراؤ دکھایا گیا تھا اور ہندستان کا بھارت انگلستان کی پرکتی کو اپنے سدبھاؤنا میں لانے اور ہندستانی رنگ میں رنگنے کی کوشش میں کامیاب ہوا تھا۔ اور یہ فلم اگرچہ بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوئی تھی تو فلاپ بھی نہیں البتہ اس فلم کے ذریعہ منوج کمار کی مقبولیت میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔

اسی طرح سے روٹی، کپڑا اور مکان کا سبجیکٹ بھی اچھا تھا جہاں ایک سیدھا سادا انسان مایوسی کے عالم میں غلط کام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے مگر اپنے فرض کو نہیں بھولتا۔ اس فلم میں موسمی چٹر جی اور زینت امان کے ساتھ پریم ناتھ نے بھی بیحد اچھا رول کیا تھا۔

منوج کمار کے بارے میں مشہور تھا کہ جن فلموں میں اس نے پران یا پریم ناتھ کو کاسٹ کیا وہ فلم بیحد کامیاب ہوئی جیسے پورب پچھّم، اپکار شور اور روٹی کپڑا اور مکان۔ مگر کرانتی میں نہ تو پریم ناتھ تھے اور نہ ہی پران، لہذا اس فلم میں دلیپ کمار کے ہونے کے باوجود فلم ناکام ہو گئی۔

ویسے اس سے قبل منوج کمار نے کئی اچھی فلمیں کیں جن میں پتھر کے صنم، سنیاسی ساون کی گھٹا، نیل کمل، نقلی نواب، گرہستی، ہریالی اور راستہ، دس نمبری، ہمالیہ کی گود میں، منوج کمار کی اداکاری عام اداکار جیسی تھی اور ان فلموں میں وہ اپنی اداکاری کرتا تھا کسی دوسرے خصوصاً دلیپ کمار کی نقالی نہیں کرتا تھا، صرف اپکار کے بعد اس کی جو فلمیں آئیں ان میں وہ مکمل طور پر دلیپ کمار کا چربہ نظر آیا۔

منوج کمار ایک Typical قسم کے اداکار تھے اور اسی ٹائپ کے لوگوں کی نظر میں وہ پسندیدہ اداکار سمجھے جاتے تھے۔ کلکتہ کے راکسی سنیما کے اسسٹنٹ منیجر محمد ارشد بھام کسی زمانے میں منوج کمار کی فلمیں کئی کئی بار دیکھتے تھے اور جب ان سے پوچھا جاتا کہ آخر اس فلم میں ایسی کیا بات ہے کہ تین تین چار چار مرتبہ

دیکھ لیا تو وہ کہتے کہ اصل میں دلیپ کمار کی فلمیں چار سال میں ایک ریلیز ہوتی ہے لہذا دلیپ کمار کے چربہ اداکار جیسے منوج کمار اور راجندر کمار کو دیکھ کر تسکین ہو جاتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوا کہ وہ دراصل منوج کمار کے فین نہیں تھے بلکہ دلیپ کمار کی وجہ سے وہ منوج اور راجندر کی فلمیں دیکھا کرتے تھے۔

منوج کمار کی ابتدائی بلیک اینڈ وائٹ فلمیں جیسے نقلی نواب (شکیلہ) شادی (سائرہ بانو) ہریالی اور راستہ، ہمالیہ کی گود میں (مالا سنہا) گرہستی (آشا پاریکھ) گھر بسا کے دیکھو (آشا پاریکھ) وغیرہ کے ساتھ اچھی فلمیں کی تھیں اور اس زمانے میں وہ بالکل چاکلیٹ ہیرو جوائے مکھرجی بسواجیت جیسے تھے لیکن شکتی سامنت نے جب پہلی مرتبہ ایک زبردست رومانٹک فلم ''ساون کی گھٹا'' میں شرمیلا، ممتاز کے ساتھ لیا پھر اے کے نڈیاوالا نے پتھر کے صنم میں انہیں وحیدہ رحمٰن اور ممتاز کے ساتھ پیش کیا تھا تو انہوں نے اپنے امیج کو بدلنے کی کوشش کی تھی مگر بعد میں رام مہشوری نے انہیں نیل کمل (راجکمار۔ وحیدہ) کے ساتھ ایک بہت ہی سنجیدہ اور بوجھل قسم کا رول دے دیا تھا تو انہوں نے ایک مرتبہ پھر سے اپنے امیج کو بدل کر سنجیدہ اداکار بننے کی کوشش کی، اسی زمانے میں فلم ''شہید'' میں انہیں شہید بھگت سنگھ کا رول ملا تو ان کے اوپر جیسے بھارت ماتا کی آتما سوار ہو گئی اور انھوں نے یکے بعد دیگرے کئی فلمیں وطن پرستی پر بنا ڈالیں اور ہر فلم میں اپنا نام بھارت رکھا جو انتہائی مضحکہ خیز لگا خاص طور پر اس وقت جب بھارت کو کسی لڑکی سے عشق فرماتے دیکھا گیا۔ ویسے نڈیاوالا کی بہترین فلم ''دو بدن'' میں منوج کمار اور آشا پاریکھ کی جوڑی پر بیحد کامیاب اور خوبصورت فلم بنی تھی جس کے گیت کار شکیل بدایوانی مرحوم تھے اور اس فلم کی کامیابی صرف شکیل کے گیتوں کی وجہ سے ہوئی ورنہ اس فلم کا اختتام جس قدر بور اور مضحکہ خیز تھا کہ اگر آج کے دور میں وہ فلم ریلیز ہوئی ہوتی تو شاید تین ہفتوں میں اتر جاتی جبکہ ۱۹۶۶ء کی ریلیز اس فلم نے پورے ہندستان کے ہر شہر میں سلور جبلی منائی تھی۔ منوج کمار نے سادھنا کے ساتھ ''انیتا'' ''وہ کون تھی'' گمنام اور نینا ساہو کے ساتھ ''پونم کی رات'' جیسی ڈراؤنی فلموں میں بھی کام کیا اور نندہ کی وجہ سے کامیاب ہوئی تھی۔ خاص طور پر محمود کی کامیڈی کی وجہ سے کامیاب ہوئی۔ منوج نے سادھنا کے ساتھ فلم ''امانت'' میں کام کیا۔ یہ فلم پورے دس سال کی تاخیر سے ریلیز ہوئی تھی مگر کامیاب رہی۔

☆☆☆

سپر اسٹار۔ راجیش کھنّہ

یاسمین اختر

کا کا بابو(راجیش کھنہ) ہندی فلموں کے نا قابل فراموش اداکار ہیں اور جب جب ان کی یادگار فلموں کی یاد آتی ہے تو احساس ہوتا ہے کہ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء کی دہائی تک وہ جو سپر اسٹار بنے رہے تو وہ یقیناً اس کے حقدار تھے کیونکہ انھوں نے صرف اپنی فلموں کے ذریعہ شہرت کے آسمان کو چھولیا تھا جبکہ اس زمانے میں ٹی وی کا کوئی خاص رواج نہیں تھا اور صرف دوردرشن کے ذریعہ لوگ کبھی کبھی لطف اندوز ہولیا کرتے تھے۔ الیکٹرونک میڈیا یا اور ملٹی چینل کے سامنے آنے سے امیتابھ بچن کو جس قدر شہرت ملی اور جس طرح سے انھوں نے تمام ٹی وی چینلوں کو خریدے رکھا اس کی وجہ سے ہر دن مختلف چینلوں میں ان کی مختلف فلمیں دکھائی جاتی رہیں اور ان کی تمام فلمیں کم از کم ۱۵۰ مرتبہ دکھائی جا چکی ہیں جنہیں دیکھ دیکھ کر لوگ اکتا چکے ہیں، اگر اس دور میں راجیش کھنہ ہوتے تو شاید امیتابھ بچن کی وہ شہرت نہ ہوتی جو آج ہے کیونکہ اداکاروں کے اعتبار سے راجیش کھنہ کے اندر جو صلاحیتیں اور خوبیاں تھیں نیز چہرے کے اتار چڑھاؤ، جذبات کی عکاسی، رونے کا انداز، خوشی ظاہر کرنے کا انداز، گانا گانے کا اسٹائل، مکالمہ بولنے کا انداز، یہ سب کچھ مل کر راجیش کھنّہ کو فن کی انتہائی بلندیوں تک لے گیا تھا۔ ساری دنیا کو اپنی اداکاری سے مسحور کر دینے والا انتہائی زندہ اداکار آج درویش صورت گمنامی کے غار میں چھپا ہوا ہے۔ اور جب سے اس کی بیوی ڈمپل کپاڈیہ الگ ہوئی ہے تو اس وقت سے لے کر آج تک اس نے تنہا زندگی گزاری ہے، اگر وہ چاہتا تو دوسری شادی بھی کر سکتا تھا، دھرمیندر نے تو بیوی کے رہتے ہوئے ہیما مالنی کے ساتھ زبردستی دوسری شادی کی اور جب اس سے دل بھر گیا اور ہیما دو بچیوں کی ماں بن گئی تو وہ اپنوں میں واپس ہو گیا اور فلم اپنے بناڈالی جس میں اپنی پہلی بیوی کے دونوں لڑکوں کو پیش کیا جبکہ ہونا تو یہی چاہئے تھا کہ اس میں ہیما مالنی بھی ہوتی اور اس کی دونوں لڑکیاں۔ سنی اور بابی کے بہنوں کا رول کرتی تب کہیں جا کر فلم اپنے کی کاسٹ کو مکمل اور تشفی بخش تصور کیا جا سکتا تھا لیکن اپنے میں دھرمیندر نے خود کام کیا اور اپنے دونوں لڑکوں کو پیش کر کے اپنے تئیں یہ تصور کر لیا کہ اس کے اپنوں کی شناخت ہوگئی لیکن لوگوں نے اس فلم کو پسند بھی نہیں کیا

کیونکہ فلم میں جذبات ہے نہ رومانس اور نہ ہی کوئی اپنا پن صرف زبردستی کی اپنائیت کسی بھی طور پر لوگوں کو پسند نہیں آ سکتی، اس کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے جو دھرمیندر نہیں کر پائے۔

بہر کیف یہاں تذکرہ تھا کا کا بابو کا۔ کا کا بابو نے صحیح معنوں میں سخت جدوجہد کی زندگی گزاری، پہلی فلم ''راز'' کے ہٹ ہو جانے کے بعد کئی بلیک اینڈ وائٹ فلمیں جیسے عورت، خاموشی وغیرہ آئیں جن میں ان کے رول کو تو پسند کیا گیا لیکن فلم نہیں چلی۔ اسی زمانے میں راجیش کھنہ کو چند بڑے بینروں کی فلمیں مل گئیں جن میں دل دولت دنیا (سادھنا) دی ٹرین (نندہ) اتفاق (نندہ) داغ (شرمیلا۔ راکھی) اجنبی (زینت امان۔ یوگیتا بالی) کٹی پتنگ (آشا پاریکھ) دشمن (ممتاز) اپنا دیش (ممتاز) بندھن (ممتاز) سچا جھوٹا (ممتاز) سفر (شرمیلا) ارادھنا (شرمیلا) گرہ پرویش (شرمیلا) دوراستے (ممتاز) عاشق ہوں بہاروں کا (زینت امان) بنڈل باز (سلکھشنا پنڈت) امر پریم (شرمیلا) انداز (ہیما مالنی) آنند نمک حرام (امیتابھ بچن) وغیرہ یہ تمام فلمیں ایسی فلمیں ثابت ہوئیں جس کی وجہ سے راجیش کھنہ کا صف اول کے اداکاروں میں شمار ہونے لگا تھا۔ ریکھا کے ساتھ پیار کا بندھن اور نمک حرام میں بہترین اداکاری کی تھی فلم ہمشکل میں موسمی چٹرجی اور سچا جھوٹا میں ممتاز کے ساتھ ڈبل رول بھی کیا اور ان دونوں فلموں میں اس کی اداکاری لوگوں کو بیحد پسند آئی کبھی کبھی یہ بحث چھڑی کہ راجیش کھنہ کے ساتھ کس ہیروئن کو سب سے زیادہ پسند کیا گیا۔ کچھ کا کہنا ہے کہ ممتاز اور کچھ لوگ شرمیلا کو اور یہ سوال صحیح معنوں میں سخت ہے اور اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ دونوں میں سے کون ہیروئن سب سے زیادہ فیورٹ رہی۔ اگر باکس آفس کے نظریئے سے دیکھا جائے تو راجیش کھنہ نے ممتاز کے ساتھ اپنا دیش، بندھن، سچا جھوٹا، دوراستے، دشمن وغیرہ میں کام کیا اور سبھی فلمیں سپر ہٹ ثابت ہوئیں، جبکہ شرمیلا ٹیگور کے ساتھ امر پریم، داغ، سفر، ارادھنا، گرہ پرویش وغیرہ میں کام کیا جن میں سفر اور گرہ پرویش تو فلاپ ہوگئیں لیکن داغ، امر پریم، ارادھنا وغیرہ نے ریکارڈ توڑ بزنس کیا اور آرادھنا تو آل ٹائم فیوریٹ فلم ثابت ہوئی لیکن سب سے ناکام سفر اور گرہ پرویش یہ دو ایسی فلمیں تھیں جنھیں کلاسیک فلموں میں شمار کیا جا سکتا ہے اس لحاظ سے راجیش اور شرمیلا کی جوڑی بھی راجیش ممتاز جوڑی کے مقابلے میں کچھ کم نہیں تھی ویسے توجہ کے ساتھ میرے جیون ساتھی، آشا پاریکھ کے ساتھ کٹی پتنگ، مالا سنہا کے ساتھ سادھنا مریادہ کے ساتھ دل

دولت، راکھی کے ساتھ شہزادہ نندہ کے ساتھ جورو کا غلام، نندہ کے ساتھ اتفاق، ڈی ٹرین بھی بیحد کامیاب فلم ثابت ہوئی تھی۔ راجیش نے کبھی بھی اپنے بڑے اداکاروں کے ساتھ کام نہیں کیا صرف راج کمار کے ساتھ فلم مریادا میں امیتابھ بچن کے ساتھ نمک حرام اور آنند میں کام کیا۔ آنند میں اس کی اداکاری ایسی تھی جنھیں ہندی اپنی زندگی میں شاید ہی بھلا سکیں۔ یوگیتا بالی کے ساتھ راجیش نے جنتا حوالدار نام کی ایک فلم میں بھی کام کیا تھا۔ لینا چندرورکر کے ساتھ محبوب کی مہندی راجیش کھنہ نے آشا پاریکھ کے ساتھ بھی ہٹ فلمیں دیں۔ آن ملو سجنا اور کٹی پتنگ یہ دو ایسی فلمیں ہیں جو باکس آفس میں بیحد کامیاب ہوئیں۔ فلم کٹی پتنگ شکتی سامنت کی فلم تھی جس کی کہانی گلشن نندہ نے تحریر کی تھی۔ اس فلم کی موسیقی آر ڈی برمن نے دی تھی اور فلم کے سبھی گیت بیحد ہٹ ہوئے تھے۔ فلم آن ملو سجنا بھی ہلکی پھلکی رومانی کہانی پر مشتمل تھی لیکن فلم کے ہٹ گانوں نے فلم کو زبردست کامیابی بخشی تھی کہا جاتا ہے کہ کشور کمار کو گمنامی سے نکالنے والے راجیش کھنہ ہی تھے جنہوں نے فلم ارادھنا سے کشور کمار کو ایک نئی زندگی دی اور اس فلم کے ہٹ گانوں نے کشور کمار کو دیکھتے ہی دیکھتے فن کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ چیتن آنند کی فلم قدرت میں راجیش نے ہیما مالنی اور پریہ راج ونش کے علاوہ راج کمار کے ساتھ کام کیا تھا۔ یہ فلم اگر بہت زیادہ کامیاب نہ ہوئی تھی تاہم یہ فلم پریہ راج ونش کی وجہ سے دیکھی جا سکتی ہے۔ راج کمار، راجیش کھنہ، ہیما مالنی اور ونود کھنہ سبھی اس فلم میں بھرتی کے اداکار تھے۔

راجیش کھنہ اور آشا پاریکھ کی ایک اور یادگار فلم ''بہاروں کے سپنے'' تھی یہ ناصر حسین کی فلم بلیک اینڈ وائٹ تھی، کامیاب نہ ہو سکی، مگر فلم کی کہانی، اداکاری، ڈائیلاگ اور خاص طور پر پریم ناتھ کی اداکاری نے اس فلم کو چار چاند لگا دیئے تھے راہل رویل کی فلم محبوب کی مہندی بھی ایک اہم فلم ہے۔ یہ ایک شوشل فلم تھی جس میں راجیش کھنہ کسی بھی اعتبار سے مسلم نہیں لگے جس طرح سے میرے حضور میں جتندر نہیں لگے تھے۔ البتہ میرے محبوب، پالکی وغیرہ میں راجندر کمار صحیح معنوں میں مسلم طبقے کی ترجمانی کرتے نظر آئے، راہل رویل نے محض اس وجہ سے محبوب کی مہندی میں راجیش کو لے لیا تھا کہ اس زمانے میں راجیش ہی سپر اسٹار تھے جس طرح سے میرے محبوب کے زمانے میں راجندر کمار کی اسٹارازم تھی۔

راجیش کھنہ چند خاص انداز کی وجہ سے نوجوانوں کے اندر بیحد مقبول ہوئے جس میں آنکھ مٹکانے کا انداز، زلف کو ایک خاص اینگل سے نکالنے کا انداز فل پینٹ میں پنجابی اسٹائل کا کرتا راجیش کھنہ پر فلمائے گئے چند بیحد خوبصورت گیت حسب ذیل ہیں۔

(۱) روپ تیرا مستانہ پیار میرا دیوانہ (ارادھنا) (۲) میرے سپنوں کی رانی کب آئے گی تو (ارادھنا) (۳) باغوں میں بہار ہے کلیوں میں نکھار ہے (ارادھنا) یہ ریشمی زلفیں یہ شربتی آنکھیں (دو راستے) (۵) خزاں کے پھول پہ آتی کبھی بہار نہیں (دو راستے) (٦) میرے نینا ساون بھادو (۷) یہ تیرے اتھروں (شہزادہ) (۸) دنیا میں لوگوں کو دھوکا کبھی ہو جاتا ہے (اپنا دیش) (۹) یہ شام متوالی مدہوش کیئے جا (کٹی پتنگ) (۱۰) یہ جو محبت ہے یہ ان کا ہے کام (کٹی پتنگ) (۱۱) سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے (دشمن) (۱۲) دشمن جو دوستوں سے پیارا ہے (دشمن) (۱۳) دور کہیں جب دن ڈھل جائے (آنند) (۱۴) میں نے تیرے لئے ہی سات رنگ کے سپنے چنے (آنند) (۱۵) چنگاری کوئی بھڑکے (امر پریم) (۱٦) زندگی ایک سفر ہے سہانا (انداز) (۱۷) میں عاشق ہوں بہاروں کا (عاشق ہوں بہاروں کا) (۱۸) اچھا تو ہم چلتے ہیں (آن ملو سجنا) (۱۹) کورا کاغذ ہے یہ من میرا (ارادھنا) (۲۰) نفرت کی دنیا کو چھوڑ کر (ہاتھی میرے ساتھی) (۲۱) چل چل میرے ساتھی او میرے ہاتھی (ہاتھی میرے ساتھی) (۲۲) آیئے آپ کو میں اپنے گھر کی سیر کراؤں (جورو کا غلام) (۲۳) دنیا میں کتنا غم ہے میرا غم کتنا کم ہے (امرت) (۲۴) دشمن نہ کرے دوست نے وہ کام کیا ہے (آخر کیوں) (۲۵) اتنا تو یاد ہے مجھے کہ ان سے ملاقات ہوئی (محبوب کی مہندی) (۲٦) اکیلے ہیں چلے آؤ جہاں ہو (راز) (۲۷) گوروں کا نہ کالوں کا یہ دنیا ہے دل والوں کا (ڈسکو ڈانسر)۔

☆☆☆

فلمی صنعت کا انتہائی مقبول اداکار۔عامر خان

رشید انجم

نام : عامر خان
والدین: طاہر حسین خان/ زینت حسین خان
پیدائش: ۱۴/ مارچ ۱۹۶۵ء۔ ہولی فیملی اسپتال، باندرہ۔بمبئی۔
بھائی : فیصل خان۔بہنیں: نکہت اور فرحت۔
پہلی فلم بطور چائلڈ: یادوں کی بارات ۱۹۷۳ء
بطور ہیرو: ''قیامت سے قیامت تک'' ۱۹۸۸ء

ناصر حسین کو کون نہیں جانتا؟ محبوب خان اگر فلموں کے لاثانی خالق مانے گئے ،راج کپور اگر فلموں کے بہت بڑے شومین تسلیم کئے گئے تو ناصر حسین محبت، ناکامی اور کامیابی کی تثلیث (Tringle) پر میوزیکل فلموں کی تخلیق سے اپنا شاندار مقام حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ان کی فلموں میں محبت اور موسیقی کا وہ جادو رہا جو ہمیشہ نوجوان نسل کی رگوں میں لاوابن کر دوڑا۔ان کی فلموں کی ایک خوبی یہ بھی رہی کہ انہوں نے فلمی سمجھوتے نہیں کئے۔بے حیائی، عریانی اور جنسی اختلاط پردے پر اجاگر نہیں ہوا۔اس کے باوجود ان کی چابکدست ہدایت اور جادو صفت موسیقی ،نغمہ وگلوکاری کی بدولت فلموں نے باکس آفس کو ہمیشہ اپنی گرفت میں رکھا۔

عامر خان پیدا ہوئے تو اپنے والد طاہر حسین کے یہاں مگر ناصر حسین کے توسط سے انہیں وہ شناخت ملی جس کی مثال پوری فلمی صنعت دینے سے قاصر ہے۔

عامر اس گھرانے میں پیدا ہوئے جس گھرانے میں سینما رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا تھا۔ چچا ناصر حسین فلم صنعت کے قابل اور معروف فلمساز تھے تو والد طاہر حسین بھی فلم ساز بن رہے تھے۔ عامر کو اسکول میں داخل کیا گیا مگر ان کا دل اسکول کے کورس کو رٹنے اور پڑھ کر یاد رکھنے میں نہیں لگتا تھا۔ اسکول جانا صرف اس لئے اچھا لگتا تھا کہ وہاں ان کے ہم عمر ساتھی ہوا کرتے تھے۔ انہیں ٹینس کھیلنا بہت پسند تھا۔ بلڈنگ کے کمپاؤنڈ میں ان کے ٹینس ساتھی ان کے بھائی فیصل اور بہن نکہت اور فرحت ہوا کرتی تھیں۔ وہ مہاراشٹر کے صوبائی ٹینس چیمپئن بننا چاہتے تھے لیکن مقدر ان کی خواہش اور سوچ سے زیادہ طاقتور تھا۔ وہ

کیسے جان سکتے تھے کہ اس کم سنی کے عہد میں جب وہ چاکلیٹ چہرے اور بے حد معصوم سی پُر کشش پرسنالٹی کے مالک تھے۔اس عہد سے گزریں گے تو ہندوستانی فلم صنعت کے انتہائی مقبول اداکار بن جائیں گے۔

ابھی عامر خان نے صرف ۸ بہاریں ہی دیکھیں تھیں کہ ناصر حسین نے اپنی فلم ''یادوں کی بارات'' میں وجے اروڑہ کے بچپن کے رول کے لئے کاسٹ کرلیا۔کیمرہ، لائٹ ایکشن یہ تین جملے عامر کے ذہن نشین کیا ہوئے کہ ٹینس کھلاڑی بننے کا خواب بنا تعبیر ذہن سے محو ہوگیا۔عامر خان نے اداکاری کے گُر سیکھنے کے لئے پونہ فلم انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لینا چاہا لیکن والد نے مشورہ دیا کہ ناصر حسین تو بذاتِ خود کسی انسٹی ٹیوٹ سے کم نہیں ہیں، کیوں نہ ان کی سرپرستی قبول کرلو۔والد طاہر حسین کا مشورہ صائب لگا اور عامر خان اپنے چچا ناصر حسین کے معاون بن گئے جہاں انہوں نے سنیما اور فلم کے سارے فن اور تجارت کے تمام اصول سیکھے۔ یہاں ان کے ہمراہ ناصر حسین کے نوعمر بیٹے منصور خان، عامر کے بہترین دوست تھے اور دونوں ایک دوسرے کے نہ صرف ہم مزاج تھے بلکہ ہمراز بھی تھے۔

دس سال عامر خان نے ناصر حسین کی سرپرستی میں بسر کئے اور ماہر ہوتے چلے گئے۔فلم ''منزل منزل'' (۱۹۸۴ء) فلم ''زبردست'' (۱۹۸۵ء) میں انہوں نے سنی دیول اور سنجیو کمار کو اداکاری کرتے دیکھا۔ان دونوں فلموں میں عامر خان، ناصر حسین کے معاونِ خاص تھے۔۱۹۸۳ء کی فلم ''ہولی'' میں عامر خان نے کیتن مہتا جیسے ہدایت کار کو اسسٹ کیا تھا۔ یہ ان کی سوجھ بوجھ کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ خود کو ناصر حسین تک محدود رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ناصر حسین سے مختلف ہدایت کاروں کی Film Making کے طریقۂ کار کو سمجھنا ان کے لئے ضروری تھا کہ آئندہ ان کا واسطہ کئی فلمسازوں اور ہدایت کاروں سے پڑنے والا تھا۔فلم ''ہولی'' میں انہوں نے ایک مختصر رول بھی ادا کیا تھا۔

عامر خان ابھی محض ۲۱ سال کے تھے کہ نغمۂ حیات کی پہلے سر جیسی ایک لڑکی بارش کا سنگیت بن کر ان کے حواس پر برس پڑی۔ پہلی نظر کا عشق یوں بھی بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔ عامر خان بھی دنیا جہاں بھلا بیٹھے اور اُسے Propose کردیا۔بمبئی میں ایرانڈیا کے ریجنل مینجر کی بیٹی رینا دتا بھی عامر خان کی نوعمر خوشبو کو اپنے دل میں بسا بیٹھی۔ عامر خان مسلم اور رینا دتا ہندو مگر عشق تو ہر سرحد، ہر بندش کو توڑنے پر آمادۂ پیکار رہا ہے۔مخالفتوں کے باوجود دونوں نے کورٹ میرج کرلی۔ زندگی میں ٹھہراؤ آ گیا۔ ایک بیٹا جنید

اور بیٹی عائرہ کے باپ بھی بن گئے۔

ناصر حسین کی فلموں کو وہ Response نہیں مل رہا تھا جسکے وہ عادی ہو چکے تھے۔فلموں نے جب انہیں اقتصادی کشمکش سے دوچار کیا اور فلمیں غیر منافع بخش ثابت ہونے لگیں تو انہوں نے بہت سوچ بوجھ سے منصوبہ بندی کی۔ یہ منصوبہ بندی ٹھیک اسی طرح تھی، جس طرح ''میرا نام جوکر'' کی ناکامیابی کے بعد راج کپور نے کی تھی اور ہندی اسکرین کو پہلی بار فلم ''بوبی'' کے ذریعہ کم عمر (Teen Ager) محبت سے روشناس کرایا تھا۔اسی منصوبے پر انہوں نے عمل کرتے ہوئے اسکرپٹ تیار کیا اور ہدایت کاری کے فرائض اپنے نوجوان بیٹے منصور خان کو سونپ دیئے۔فلم کا نام ''قیامت سے قیامت تک'' تجویز ہوا۔ عامر خان ۲۲ سال کے ہو چکے تھے اور ایک بیٹے کے باپ بھی بن چکے تھے لیکن فلم کے دستور کے مطابق ان کی شادی کو پوشیدہ رکھا گیا اور نئی لڑکی جوہی چاؤلہ کے مقابل عامر خان اس فلم کے ہیرو بنا دیئے گئے۔فلم نے باکس آفس پر ہوشربا کامیابی حاصل کی اور عامر خان اسٹار بن گئے۔لوگوں کا خیال تھا کہ یہ چاکلیٹی نوجوان آئندہ کامیابی حاصل نہیں کر پائے گا مگر عامر خان نے اپنی عمر سے کہیں آگے نکل کر اپنے مستقبل کی پلاننگ کی تھی۔ ''قیامت سے قیامت تک'' ۱۹۸۸ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ یہ المیاتی محبت کی داستان تھی جس کا اختتام بڑا ہی جانگداز تھا۔عامر نے بہت اعتماد سے اپنا کردار ادا کیا تھا اور یہی وہ اعتماد تھا جو آگے چل کر ان کے مستقبل کا رہنما ثابت ہوا۔ابتدائی فلموں ''لولولو''، ''اوّل نمبر''، ''دیوانہ مجھ سا نہیں'' وغیرہ کچھ خاص متاثر نہیں کر پائیں مگر مہیش بھٹ کی فلم ''دل ہے کہ مانتا نہیں'' ۱۹۹۱ء اور منصور خان کی دوسری فلم ''جو جیتا وہی سکندر'' ۱۹۹۲ء جیسی فلمیں عامر خان کو Stablish ed کرنے میں کامیاب رہیں۔ ۱۹۹۳ء میں ''ہم ہیں راہی پیار کے'' ۱۹۹۴ء میں راجکمار سنتوشی کی کامیڈی فلم ''انداز اپنا اپنا'' نے ثابت کیا کہ یہ اداکار اب چاکلیٹی نہیں رہا۔اپنے چاکلیٹی لیبل کو تو عامر خان نے تب ہی تیاگ دیا تھا جب فلم ''راکھ'' جیسی فلم میں انہوں نے اپنی زندگی کا سب سے منفرد کردار ادا کیا تھا۔ ۱۹۹۵ء میں منصور خان نے پھر اپنے حوصلے کو آزمایا اور اپنی فلم ''اکیلے ہم اکیلے تم'' میں عامر خان کو منیشا کوئرالا کے ساتھ بے حد جذباتی متاثر کن رول میں پیش کیا۔ یہ فلم انگریزی فلم Kramen Vs Kramen کا ہندی روپ تھا۔چونکہ عامر خان ذاتی زندگی میں ایک باپ کا فرض ادا کرتے آرہے تھے، اس لئے اس فلم میں بھی انہوں نے اس فرض کو بیحد خوبی سے ادا کیا اور فلم بیٹے کے رول میں ان کے حقیقی بیٹے جنید

نے پہلی بار کیمرے کے سامنے آکر ثابت کیا کہ وہ اپنے باپ کا صحیح جانشین بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

۱۹۹۵ء میں سلیم اختر کی فلم ''بازی'' میں عامر خان نے آشوتوش گوواریکر کی ہدایت میں پہلی بار لڑکی کا گیٹ اپ اختیار کیا تھا چونکہ یہ فلم ایک جاسوس کے کردار پر مبنی تھی لہذا اس گیٹ اپ کو قبول کر لیا گیا۔اسی سال رام گوپال ورما کی فلم ''رنگیلا'' نے باکس آفس پر قبضہ جما لیا۔اس فلم میں ارمیلا ماتونڈکر کے مقابل بمبئی کے ٹپوری کا رول کیا تھا۔ ۱۹۹۶ء میں ''راجہ ہندوستانی'' ۱۹۹۷ء میں ''عشق'' ۱۹۹۸ء میں فلم ''غلام''۔ یہ چاروں فلمیں سپرہٹ رہیں۔ ''راجہ ہندوستانی'' میں عامر خان کو کرشمہ کو Kiss کرنے کا موقع ملا تو فلم ''غلام'' میں انہوں نے رانی مکرجی کو ''پٹانے'' کے لئے آپنی آواز میں ''آتی کیا کھنڈالا'' گیت گایا تھا۔

موجودہ فلم انڈسٹری میں اپنے ہم عصر اداکاروں سلمان خان، شاہ رخ خان، اجے دیوگن، سیف علی خان وغیرہ کے مقابل عامر خان سب سے زیادہ مقبول اور اپنے فن کے تئیں بے حد سمجھدار اداکار ہیں۔ دلیپ کمار کی تقلید انہوں نے اس طرح کی ہے کہ ایک وقت میں صرف ایک فلم ہی قبول کی۔ وہ فلم جس کے اسکرپٹ نے ان کی ذہانت کو متوجہ کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں انہوں نے فلم ''رنگیلا'' میں ٹپوری، ''راجہ ہندوستانی'' میں ٹیکسی ڈرائیور، دل ہے کہ مانتا نہیں'' میں رومیوار ''سرفروش'' میں ایماندار پولس آفیسر کے کردار انتہائی خود اعتمادی سے ادا کئے تو ''غلام'' میں ان کی پرفارمینس کو سراہا گیا۔ ''عشق'' میں کامیڈی رول میں خود کو اس طرح منوایا کہ ان کے ساتھ اداکار ان کے آگے پھیکے پڑ گئے۔

۱۹۹۵ء میں آشوتوش گوواریکر کی ہدایت سے وہ متاثر ہوئے تھے۔یہی وجہ تھی کہ جب آشوتوش گوواریکر فلم ''لگان'' کا اسکرپٹ لے کر ان کے پاس آئے تو عامر خان نے اس فلم کو خود تخلیق کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۲۰۰۱ء کی اس فلم نے پوری فلم صنعت کو چونکا دیا۔زمانے میں اس کے چرچے ہوئے اور ہر نگاہ نے عامر خان کے اس حوصلے اور جرأت مندانہ اقدام کا خیر مقدم کیا۔لاتعداد اعزازات حاصل ہوئے اور آسکر کے لئے بھی نامزد کی گئی۔

۲۰۰۵ء میں جب کیتن مہتا نے ''منگل پانڈے'' کے تاریخی کردار پر فلم بنانے کا منصوبہ بنایا تو پوری فلم انڈسٹری میں عامر خان سے بہتر فنکار انہیں نہیں ملا اور وقت نے ان کے اس اعتماد کو ثابت بھی کر دیا۔ ۲۰۰۶ء کی فلم ''رنگ دے بسنتی'' نے سونے پہ سہاگے کا کام کیا۔ان فلموں نے عامر خان کے فنِ اداکاری کی غیر محدود پرواز کے آسمان طے کر دیئے اور یہ ثابت ہو گیا کہ عامر خان ہندوستانی فلم صنعت کے ناقابلِ فراموش اداکار

ہیں۔فرحان اختر کی فلم ''دل چاہتا ہے'' میں انہوں نے جب اپنا گیٹ اپ تبدیل کیا تو نوجوان نسل ان کی دیوانی ہوگئی۔عامر خان اپنے رول کو پوری طرح اپنی شخصیت پر اس طرح حاوی کر لیتے ہیں کہ ان کی ذات پھر کہیں نظر نہیں آتی۔اسکرین پر صرف وہ کردار ہوتا ہے جسے وہ ادا کرتے ہیں۔انہوں نے Method Acting کے اسٹائل کو اپنے کردار میں استعمال کیا ہے۔کامیڈی۔ایکشن۔ڈرامہ اور رومانس فلم کے ان بنیادی تقاضوں کو انہوں نے اپنے ہر کردار میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔وہ فلم سے بھی باہر نہ آئے ہیں۔میگھنا پاٹھک کی نربدا بچاؤ تحریک سے متاثر ہو کر عامر خانے نے ۱۴/اپریل ۲۰۰۶ء میں عملی حصہ لے کر نئی دہلی کے جنتر منتر پر دھرنا دیا تھا۔اپنی اداکاری کی امیج کو برقرار رکھتے ہوئے جب انہوں نے ۲۰۰۸ء میں ہدایت کاری کا فیصلہ کیا تو ''تارے زمین پر'' جیسی کلاسک فلم کی تخلیق کر کے ثابت کیا کہ وہ ایک اچھے اور منجھے ہوئے ہدایت کار بھی ہیں۔۲۰۰۸ء میں ہی ان کی فلم ''گجنی'' نے وہ وہ کمال دکھایا کہ بڑے بڑے ستارے اور فلمساز حیرت زدہ رہ گئے۔اسی سال انہوں نے اپنے بھانجے عمران خان کو لے کر عباس ٹائر والا کے اسکرپٹ پر اسی کی ہدایت میں فلم ''جانے تو یا جانے نہ'' فلم بنا کر عمران خان کو فلم صنعت میں قدم جمانے کا موقع فراہم کر دیا۔
وہ بے شک ایک قابل ہدایت کار، بہترین فلمساز اور لاجواب اداکار ہیں مگر اسی کے ساتھ ان کا ایک تاریک پہلو بھی ہے۔''لگان'' کی تکمیل کے دوران خاتون صحافی کرن راؤ سے ان کا تعارف ہوا۔یہ تعارف نزدیکی میں بدلا پھر اس طرح قربت میں تبدیل ہوا کہ اپنے پہلے پیار اور دو بچوں کی ماں کو ۲۰۰۲ء میں طلاق دے کر جنوری ۲۰۰۶ء میں کرن راؤ کو اسی سیج پر جگہ دے دی جہاں والہانہ محبت اور لاکھ مخالفتوں کے باوجود رینا دتا کو بیاہ کر لائے تھے۔بہر حال ان ذاتی معاملات سے چشم پوشی اختیار کر لینا ہی بہتر ہے۔۴۴ سال کی پختہ عمر کا یہ اداکار آج بھی اپنے اصولوں پر قائم ہے۔کبھی کسی تقریب، کسی ایوارڈ فنکشن میں نہیں جاتے۔نہ کسی ریلٹی شو میں حصہ لے کر خود کو سنورنے کے طریقے اختیار کرتے ہیں۔

☆☆☆

ہدایت کار وادا کار۔پی جے راج

پریم پال اشک (دہلی)

پی جے راج ۲۸/دسمبر ۱۹۰۸ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ان کا پورا نام جے راج پیڈا ہے۔
وہ تحریک آزادی کی مجاہدہ بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو کے بھانجے ہیں۔اگر چہ وہ فلموں میں بطور اداکار اور ٹیکنیشین آئے تھے مگر جلد ہی ہیرو بن گئے اور پھر کیریکٹر رول کرنے لگے۔وہ ۱۹۳۰ء میں فلموں میں آئے تھے۔انہوں نے کئی فلموں کی ڈائریکشن بھی دی۔انہوں نے ہیرو کی حیثیت سے اپنے وقت کی نامور اور ممتاز شخصیتوں اور ایکٹرسوں میں سیتا دیوی، درگا کھوٹے، خورشید، مس روز، رینو کا دیوی، شوبھنا سامرتھ، سنیہہ پربھا پردھان، للیتا پوار، لیلا چٹنس، زیب النساء، مادھوری، ستارہ دیوی، شانتا ہبلیکر، مہتاب، پرمیلا، لیلا ڈیسائی اور نرگس کے ساتھ کام کیا۔انہوں نے ینگ انڈیا پکچرز، شاردا فلمز، ایسٹرن فلم کمپنی، اجنتا مووی ٹون، پرکاش پکچرز اور بامبے ٹاکیز کی فلموں میں کام کیا۔کھلونے، بھابھی، رائفل گرل، پریم سنگیت، شاہ جہاں، راجپوتانی، سوامی، نئی دنیا، نئی کہانی اور ہماری بات اور بھگت سنگھ ان کی اہم فلمیں ہیں۔
۱۹۸۱ء میں انہیں ۱۹۸۰ء کے دادا صاحب پھالکے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔

☆☆☆

اداکار وہدایت کار۔فیروز خان

مظہر جمیل

''ہمیں سرخ رنگ سے نفرت ہے مگر کیا کریں یہ ہماری رگوں میں دوڑتا ہے۔'' صبا کریم شاہ مہاجر افغان کے اس تیور میں ۶ سال قبل ریلیز''جانشین''میں ناظرین کے ایک کثیر طبقہ نے تالیوں اور داد وتحسین سے فیروز خان کو نوازا۔اس منفی رول کے مقابلے میں ان کے بیٹے فردین خان اور نئی اداکارہ سیلینا جیٹلی کا کردار بھی مدھم پڑ گیا۔فیروز خان نے یہ فلم اپنے بیٹے کے کیریئر کو سہارا دینے اور سیلینا کے گلیمر سے ناظرین کو متعارف کرانے کے لئے بنائی تھی اور ان کا اپنا رول اس کہانی میں رنگ بھرنے کے لئے تھا جب کہ حتمی نتیجہ یہ نکلا کہ شیروں کو دوست بنانے والا صبا کریم شاہ اپنے منفی کردار کے باوجود ہیرو سے بڑھ کر ثابت ہوا۔ لگاتار تین فلاپ فلم (یلغار، پریم اگن، جانشین) کو بنانے کے بعد حالات ساز گار نہیں رہے اور وہ فلمسازی کے میدان سے دور ہو گئے۔پھر بھی اپنے بیٹے کے ساتھ 'ایک کھلاڑی، ایک حسینہ' اور انیس بزمی کی 'ویلکم' میں نانا پاٹیکر اور انل کپور کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا تو وہ انکار نہیں کر سکے۔گزشتہ سال نمائش کے لئے پیش کی جانے والی یہ فلم خاصی مقبول ہوئی اور فیروز خان کا تکیہ کلام 'ابھی ہم زندہ ہیں' خاص وعام کی زبان پر چڑھ گیا۔ایک سال تک کینسر جیسے موذی مرض سے جنگ لڑنے کے بعد ۲۶/اپریل ۲۰۰۹ءکو وہ زندگی کی جنگ ہار گئے لیکن اپنے فن کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

۲۵/ستمبر ۱۹۳۹ءکو بنگلور میں صادق علی خان اور ناظمہ کے گھر تولد ہونے والے فیروز خان چار بھائی اور دو بہنوں میں سب سے بڑے تھے۔صادق علی خان کا تعلق افغانستان سے تھا جب کہ فاطمہ ایک ایرانی خاتون تھیں۔فیروز بچپن سے اصول وضوابط کے سخت خلاف تھے۔جب بھی وہ اپنے والدین کی حکم عدولی کرتے انہیں سخت سست اور نافرمان قرار دے دیا جاتا۔ضدی فطرت کے جراثیم فیروز کے مزاج میں جانے کب داخل ہو گئے کسی کو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی۔والدین کی دلی خواہش تھی کہ وہ بیرسٹر بنیں،لیکن انہوں نے مغربی انداز کے ملبوسات،کاؤبوائے قسم کے جوتے اور ٹوپ خریدنے کے علاوہ ایک ایسا درزی بھی تلاش کرلیا جوان کے فیشن ایبل لباس تیار کر سکے تاکہ وہ اس لباس کے مطابق مختلف کرداروں کی نقل اتار سکیں۔اگرچہ فیروز ایک ذہین طالب علم تھے لیکن اپنی شرارتوں اور عجیب وغریب حرکتوں کے باعث وہ

تین اسکولوں سے نکالے گئے۔گیارہ سال کی عمر میں شور مچاتی ہوئی بائیک لے کر وہ کلاس روم میں اچانک داخل ہو گئے جب کہ ترانہ کا سلسلہ جاری تھا۔اس دخل اندازی پر ان کے خلاف سخت نوٹس لیا گیا اور انھیں اسکول بدر کرنے کا نوٹس گھر بھیج دیا گیا۔صادق علی خان کو محسوس ہوا کہ فیروز پر سے ان کی ڈانٹ پھٹکار کا اثر ختم ہوتا جا رہا ہے،سو ایک بار پھر انہوں نے نصیحتوں کی کڑوی کسیلی گولی ان کی سماعتوں میں انڈیل دی۔

ایک بار صادق علی خان نے فیروز سے سگریٹ پینے کے لئے کہا تاکہ وہ یہ دیکھ سکیں کہ وہ اس قبیح عادت کا شکار ہیں یا نہیں۔فیروز اگرچہ اس سے دور تھے،لیکن والد کی بات مان کر سگریٹ کے کش لینے لگے۔ان کے والد محترم کے دل پر یہ دیکھ کر سخت ٹھیس پہنچی۔فیروز کو بھی اس کا احساس ہو گیا لیکن کیا کرتے تیر کمان سے نکل چکا تھا۔جب ان کے والد کی موت ہوئی تو وہ لمحہ ان کے سامنے ایک بار پھر زندہ جاوید ہوا تھا۔اس رات ایک لمحے کے لیے بھی سو نہیں سکے۔فیروز خان کے بقول وہ اسی رات میچور ہو گئے تھے۔

سینئر کیمبرج کا امتحان دینے کے بعد انہوں نے کالج کا رخ کرنے کے بجائے عروس البلاد ممبئی کی جانب کوچ کیا جہاں انہیں بطور معاون واڈیا اینڈ برادرس فلم پروڈکشن ہاؤس میں تین سو روپے ماہانہ پر کام ملا۔یہ رقم بھی ان کی ضروریات کی خاطر خواہ تکمیل سے قاصر تھی کیونکہ رہائش کا کرایہ بھی اچھا خاصا تھا۔فیروز نے آمدنی میں اضافہ کے لئے ایک کلب میں ملازمت کرلی جہاں ان کا کام جواریوں کو تاش کی گڈی لا کر دینا تھا۔واڈیا اینڈ بردرس میں ہی انھیں فلم سازی کی ابتدائی معلومات حاصل ہوئیں۔کلب میں ہی ایک فلمساز کی نظر فیروز پر پڑی،اس نے اس نوجوان میں مستقبل کا اداکار دیکھ کر ایک ہزار روپے ماہانہ کے طور پر''راجو ماسٹر'' نامی فلم میں بریک دیا۔اس فلم کی نمائش 'رپورٹر راجو' کے نام سے ۱۹۶۲ءمیں ہوئی۔چترا کے بالمقابل فیروز خان کو پیش کرنے والے اس فلم کے ہدایت کار دواریکا کھوسلہ تھے۔اس سے قبل ۱۹۵۷ تا ۱۹۶۰ زمانہ،دیدی،رات اور دن،گھر کی لاج اور 'میں شادی کرنے چلا' میں بھی ان کے مختصر کردار تھے۔

سعیدہ خان (میں شادی کرنے چلا، چار درویش) امیتا (سیمسن) کم کم (ایک سپیرا،ایک لٹیرا، میں وہی ہوں،سو سال بعد) کلپنا (تیسرا کون،تصویر) ممتاز (آگ،سی آئی ڈی ۹۰۹،وہ کوئی اور ہوگا،آدمی اور انسان،اُپاسنا،اپرادھ، ناگن) پدمنی (عورت) للتا چٹرجی (رات اندھیری تھی) شاہدہ (انجام) شرمیلا ٹیگور (پیاسی شام،سفر) تنوجہ (ایک پہیلی،آجا صنم) ریکھا (کشمکش، قبیلہ، خون پانی) سادھنا (گیتا

میرا نام) ہیما مالنی (دھرماتما، شرافت چھوڑ دی میں نے) پروین بابی (کالا سونا، درندہ) سلکشنا پنڈت (شنکر شمبھو) رینا رائے (جادو ٹونا، کچے ہیرے، دو وقت کی روٹی) نیتو سنگھ (شرافت چھوڑ دی میں نے، چنوتی) زینت امان (قربانی) سلمیٰ آغا (میت میرے من کے) شری دیوی (جانباز) کے ساتھ کامیاب جوڑی بنانے والے فیروز خان کا مخصوص انداز مغربی انداز کے سوٹ بوٹ اور چبا کر مکالموں کی ادائیگی ہر فلم میں نمایاں رہی۔ لاکھ چاہنے کے باجود وہ اپنی امیج سے باہر نہیں نکل سکے۔

۶۰ فلموں میں اپنی اداکاری کا جلوہ بکھیرنے والے فیروز خان نے اپرادھ، دھرماتما، قربانی، جانباز، دیاوان، یلغار، پریم اگن اور جانشین جیسی فلمیں بھی بنائیں۔ ان میں پریم اگن کے علاوہ اپنی سبھی فلموں میں وہ کسی نہ کسی کردار میں ضرور نظر آئے اور ناظرین پر اپنا نقش چھوڑ گئے۔ ۱۹۷۰ء میں آدمی اور انسان کے لئے معاون اداکار کا فلم فیئر ایوارڈ، ۲۰۰۱ء میں فلم فیئر کی ہی جانب سے لائف ٹائم اچیومینٹ، ۲۰۰۸ء میں زی سنے ایوارڈ کا لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ اور ۲۰۰۸ء میں میکس اسٹار ڈسٹ ایوارڈ میں پرائیڈ آف دی انڈسٹری ایوارڈ پانے والے فیروز خان نے نہ صرف فلموں میں ہیروئنوں سے رومانس کیا بلکہ حقیقی زندگی میں بھی وہ ایک رومانی نوجوان بنے رہے۔ ان کے حلقہ احباب میں مردوں کے مقابلے میں خواتین کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی۔ خود وہ بھی اس سلسلے میں دوٹوک انداز میں کہتے تھے کہ ''میں پارٹی اور خواتین کے بغیر رہنے کا تصور ہی نہیں کرسکتا۔'' یوں تو ان کا نام مختلف اداکاراؤں سے جوڑا گیا، لیکن ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک سندری کی قربت نے شادی تک اس مرحلے کو پہنچایا اور وہ دونوں ۱۹۶۵ء میں ازدواجی رشتے میں بندھ گئے۔ فیروز خان ۱۹۷۰ء میں لیلا اور ۱۹۷۴ء میں فردین کے باپ کے بن گئے لیکن فیروز کو ٹھہراؤ راس نہیں آیا۔ طغیانی کی تلاش میں وہ پھر ایک نئے سفر پر نکل پڑے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی فلیٹ کے اندر رہتے ہوئے میاں بیٹے بیٹی کبھی بھی یکجا نہیں ہو پائے۔ جواں عمر اور زندہ دل فیروز خان ایک عرصہ تک ایملی نامی خاتون کی زلفوں کے اسیر رہے۔ اگرچہ ایملی کی رہائش انگلینڈ میں تھی لیکن فیروز نے اسے ہمیشہ اپنے دل کے قریب محسوس کیا۔

گھوڑوں کا شوق بچپن سے ہی انھیں رہا۔ فیروز خان کے ننیہال والے اگرچہ گھوڑے رکھتے تھے، لیکن صادق علی خان کے پاس اتنی استطاعت نہیں تھی کہ وہ گھوڑوں کا صرفہ برداشت کرسکیں پھر بھی جب کسی گھوڑے پر فیروز خان کی نظر پڑی تو وہ اس پر سوار ہونے سے خود کو روک نہیں سکے۔ آخر دم تک فیروز خان کے پاس کئی گھوڑے رہے۔ فرصت کے اوقات میں وہ ان کی نازبرداری کے علاوہ اس پر سواری کا لطف بھی لیتے رہے۔

اپرادھ، دھرماتما، قربانی، جانباز اور دیاوان کے کامیاب فلمساز وہدایت کار فیروز خان اگرچہ یلغار، پریم اگن اور جانشین میں اس کامیابی کو دوہرانے میں ناکام رہے پھر بھی انہوں نے ممتاز، ریکھا، زینت امان، شری دیوی، مادھوری دیکشت، نغمہ، میگھنا کوٹھاری، سیلینا جیٹلی، پنکی ہروانی، ارچنا پورن سنگھ اور کشمیرا شاہ کو ٹو پیس بکنی اور کم سے کم کپڑوں میں پیش کر کے ناظرین کو رجھانے کی کوشش ضرور کی، یہ الگ بات کہ کمزور کہانیوں اور روایتی انداز کے باعث آخر الذکر فلموں نے باکس آفس پر دم توڑ دیا۔ پریم اگن کے بعد جانشین انہوں نے اپنے بیٹے فردین خان کے کیریئر کے گراف کو بلند کرنے کے لئے بنائی لیکن ان کے منفی کردار صبا کریم شاہ کے مقابلے میں لکی کپور کا کردار بے اثر ثابت ہوا۔ یہ فلم بعض علاقوں میں تھوڑی بہت چل گئی اور اپنی کمائی وصول کرگئی، لیکن فیروز خان کو جس قدر دھماکہ دار ہنگامے کی امید تھی یہ اس میزان پر کھری نہیں اتر سکی۔ اس ناکامی کے باوجود انھوں نے 'تجھ پہ دل قربان' اجے دیوگن، ایشوریہ رائے اور فردین خان کو لے کر بنانے کا اعلان کیا، لیکن ایشوریہ کے انکار کے بعد یہ پروجیکٹ انہیں بند کرنا پڑا۔ 'جانشین' کی شوٹنگ کے دوران ہی فردین خان کی سالگرہ پر انہوں نے سیلینا جیٹلی کے ساتھ فردین خان کو لے کر شادی ڈاٹ کام بنانے کا اعلان کیا، لیکن یہ منصوبہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ 'اپرادھ' میں ممتاز کو چند منٹوں کے لئے بکنی کا گلیمر دینے والے فیروز خان نے چند سالوں قبل اپنے بیٹے فردین خان کی شادی نتاشا سے کر کے انھیں سمدھن بنا لیا اور چند قدم مزید قریب کرلیا۔

'قربانی' ان کی زندگی کی یادگار فلم تھی جسے وہ دوبارہ اپنے بیٹے کو لے کر بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ افسوس موت کے بے رحم ہاتھ انھیں دور لے گئے کہ اب یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ جب بھی اسٹائلش فنکاروں کا تذکرہ ہوگا فیروز خان کا نام ضرور لیا جائے گا اور قربانی کے ساتھ 'جانشین' کا صبا کریم شاہ اور 'ویلکم' کا آرڈی ایکس پردہ ذہن پہ روشن ہو جائے گا۔

☆☆☆

جنوبی ہند کا سپر اسٹار۔کمل ہاسن

سرور یوسف

ہمارے یہاں ہندی فلموں کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں میں بھی فلمیں بنتی ہیں اور فلمی بازار میں ہندی فلموں کے مقابلے اگر ان کی حیثیت بہت زیادہ نہیں تو بہت کم بھی نہیں ہے۔خاص کر جنوبِ ہند میں تمل تیلگو اور ملیالم زبانوں میں فلموں کی مارکیٹ اچھی ہے۔اب تو یہ علاقائی فلمیں پورے ہندوستان میں صبح کے شوز میں چلتی ہیں اور کامیابی سے دکھائی جاتی ہیں۔

ساؤتھ کی فلم صنعت پچھتر سال پرانی ہے اس انڈسٹری نے شیواجی گینشن' این ٹی راماراؤ جیسے فنکاروں اور منی رتھنم' بالومہیندرو' بھارتی راجا اور بالا چندرن جیسے مایہ ناز فلمکاروں کو جنم دیا ہے۔جنھوں نے علاقائی فلموں میں کام کرتے ہوئے بھی بین الاقوامی سطح پر مقبولیت حاصل کی ہے اور آسکر ایوارڈز سے بھی سرفراز کیے گئے ہیں۔ان میں ایک ستارہ کمل ہاسن بھی ہے۔آج وہ ساؤتھ میں پوری آب وتاب کے ساتھ چمکنے والے تین درخشاں ستاروں میں سے ایک ہے۔اس کے مقابل رجنی کانت اور وجے کانت کا نام لیا جاتا ہے۔

کمل ہاسن نے اپنے فلمی سفر میں اَن گنت کامیاب فلمیں دی ہیں اور اعزازات وانعامات حاصل کیے ہیں۔ان کی فلمیں ان کی فنکاری سے مزّین ہیں چاہے وتمل میں بنی فلم 'مارمگن' ہو جس کے لیے انھوں نے بہترین اداکار کا نیشنل ایوارڈ حاصل کیا۔چاہے وہ ہندی میں بنی 'ساگر' اور 'صدمہ' رہی ہو جس میں بہترین فن پیش کرنے کے لیے فلم فیئر ایوارڈ ملا چاہے وہ مارو چرترا (تیلگو) رہی ہو جو مسلسل دوسال تک مدراس میں چلتی رہی اور دھوم مچاتی رہی یا ''کوکیلا'' (کنٹر) ہو جس کے لیے وہ بہترین اداکار کے انعام کے حقدار پائے گئے۔ ان سب میں ان کا فن بلندیوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔

مقبول کمل ہاسن: اُس وقت ان کی عمر تین سال تھی جب وہ کیمرے کے سائے میں کھڑے ہوئے چونکہ ہر فلم ڈیزی ایرانی نہیں کرسکتی تھی اس لیے خوبصورت بچّے تلاش کیے جاتے۔کمل ہاسن کے بھائی چندر ہاسن انھیں ایک فلمساز اور ہدایتکار کے پاس لے گئے اور تبھی سے وہ کام کرنے لگے' انھیں مکالمے رٹائے جاتے۔دھوپ میں کھڑے رہنے سے منع کیا جاتا کہ کالے ہوجاؤ گے' آئس کریم اس لیے نہیں ملتی تھی کہ ڈبنگ کے وقت آواز پر اثر پڑے گا اور شیواجی گنیشن کے ساتھ کھڑا کردیا جاتا کہ دیکھو کتنے اچھّے ہیں وغیرہ وغیرہ اور

پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا کمل ہاسن اور کیمرے کی قربت بڑھتی گئی۔اداکاری کا رجحان زیادہ ہوگیا۔پڑھنے سے طبیعت اکتانے لگی اور دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اداکار بن کے نام کمانا ہے اس لیے نویں کلاس تک آتے آتے پڑھائی کی طرف سے دلچسپی بالکل ختم ہوگئی اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا نیز وہ پوری طرح فلموں سے وابستہ ہوگئے لیکن جیسا عموماً ہوتا ہے کہ چائلڈ آرٹسٹ کو بچپن کی عمر پار کرنے کے بعد ہیرو کا رول دینے کا خطرہ بہت کم لیا جاتا ہے کیونکہ اس میں نقصان کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

کمل ہاسن کو رول ملنے بند ہوگئے تو انھوں نے اچھے فلمکاروں برگ مین' کارلو پوتی' ڈیسا کا کی فلمیں دیکھنی شروع کیں مشہور رقّاص این۔ایس نٹراجن سے بھرّت ناٹیم کی تربیت حاصل کی اور ایک کوریوگرافر کے اسسٹنٹ ہوگئے لیکن گاڑی چلتی نہیں دکھائی دی تو ایک دوسرے ہدایتکار کے ساتھ کام کرنے لگے اور ان کے چوتھے معاون بن کر کلیپر بوائے کا کام انجام دینے لگے۔ایک بار ایک فلم میں نگیٹیو رول ملا تو ویلن بن گئے اور ویلن کی حیثیت سے ایک سال میں دس فلمیں کیں۔ساؤتھ فلم انڈسٹری میں مشہور ہوگیا کہ اگر فلم ڈانس سِکونس ہے اور ریپ کا سین رکھنا ہے تو کمل ہاسن کو لے لو۔

کمل ہاسن فلموں میں ریپ اور رقص سین کرتے کرتے بور ہوگئے تھے کبھی کبھار دوسری طرح کا چھوٹا موٹا رول مل جاتا ایک بار ایک فلم میں مزاحیہ رول ملا جو فلمساز بالا چندرن نے دیکھا وہ متاثر ہوئے اور پھر ان کا فن نکھرتا ہی چلا گیا۔ہیرو کے رول ملنے لگے اور فلمیں چلنے لگیں۔اور وہ ساؤتھ کے کامیاب اداکار تسلیم کر لئے گئے ان کے لیے رول لکھے جانے لگے' کامیابی کے ساتھ ساتھ فلمساز ان کے معاوضے میں اضافہ کرتے گئے۔کمل نے جب 'مَن ماڈ الیلائی' سائن کی تھی تو انھیں صرف سات ہزار روپے ملے تھے۔۱۶ ویا نتھی نائل کے لیے اُنھیں پچیس ہزار کا معاوضہ ملا 'ستیّم این کائل' کے لیے انھوں نے پچاس ہزار لیے اور اب تو کامیاب فلموں کے حساب سے ان کی قیمت اور بڑھا دی گئی ہے۔

کمل ہاسن جب تمل' تیلگو' ملیالم اور کنٹر فلموں میں ہٹ ہوگئے تو انھیں ہندی فلم بینوں سے 'ایک دوجے کے لیے' کے ذریعے متعارف کرایا گیا۔جس میں ایک جگہ مایوسی کے عالم میں اداکارہ مادھوی کے سامنے ان کے رقص نے فلم بینوں کو خاموشی سے ٹکٹکی باندھے پردے کی طرف دیکھنے پر مجبور کردیا تھا۔اس فلم کے بعد 'صدمہ' کا نام آتا ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔خصوصاً وہ منظر جب سری دیوی بالکل ٹھیک ہوکر ٹرین میں بیٹھی جارہی ہوتی ہے اور کمل ہاسن اسے اپنی طرف متوجّہ کرنے کے لیے پاگلوں کی طرح اُچھل کود کرتا ہے جبکہ آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر غم کے بادل چھائے ہوئے ہیں نیز اس فنکاری کے لیے انھیں نیشنل اور فلم

فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اسی طرح فلم 'ساگر' میں اس کا کردار جتنا مشکل تھا اتنا ہی اس کو کامیابی سے ادا کیا اور دل کو چھو لینے والی جذبات سے پُر اداکاری کی۔ 'پُشپک' بھی ایک ایسی ہی فلم ہے جس میں بغیر مکالموں کے چہرے کے تاثرات اور انداز سے فن پیش کرنا تھا اور کمل ہاسن یہاں بھی بازی مار لے گئے۔ لیکن اس سچائی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کمل ہاسن ہندی فلموں میں نہیں چل سکے۔ یہ ہندی فلم بینوں کا ٹیسٹ کہیے یا کمل کی بدقسمتی کہ پہلی فلم 'ایک دوجے کے لیے' کے بعد جتنی بھی فلمیں آئیں ناکام ہو گئیں جیسے ایک دوجے کے بعد 'صنم تیری قسم' فلاپ ہوئی جو ریناراۓ کے ساتھ تھی۔ پھر پونم ڈھلون کے ساتھ 'یہ تو کمال ہو گیا' ریلیز ہوئی اور ناکام ہو گئی۔ انیتا راج کے ساتھ 'ذرا سی زندگی' کا بھی بُرا حال ہوا' سری دیوی کے ساتھ ریلیز 'آخری سنگرام' لوگوں نے پسند نہیں کی۔ ریناراۓ اور کمل ہاسن نے 'کرشمہ' میں ایک ساتھ کام کیا جو ناکام ہو گئی۔ 'راج تلک' اور 'گرفتار' بڑی کاسٹ کی فلمیں تھیں لیکن یہ بھی فلم بینوں کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکیں۔ لیکن ایک عجیب بات یہ ہو گئی کہ سال ۱۹۹۰ء میں جب کمل ہاسن کی تمل ہٹ فلم 'اپور سہودرگل' ہندی میں 'اپّو راجہ' کے نام سے ڈب کر کے ریلیز کی گئی تو پبلک نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور کامیاب قرار دی گئی۔

ادھر تین سال کا عرصہ گزر گیا لیکن کمل ہاسن نے پھر اپنی کوئی فلم ہندی میں ڈب نہیں کہ نہ کسی ہندی فلمساز کی پیش کش قبول کی جبکہ انھیں رمیش سپی نے امیتابھ کے مقابل نگیٹو رول آفر کیا تھا۔ کمل ہاسن ساؤتھ میں خوش ہیں اور وہیں کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔ اداکاری کے ساتھ ساتھ ان کے لکھنے پڑھنے کا بھی شوق ہے لیکن ہندی فلموں میں ان کی دلچسپی زیادہ نہیں دکھائی دیتی کیونکہ وہ ''جو مل جائے وہ کرو'' جیسے تیسے پر یقین نہیں رکھتے بلکہ اپنی پسند کی فلمیں کرنے کے ساتھ ساتھ ہندی فلم بینوں کے دلوں میں اتنی ہی جگہ چاہتے ہیں جتنی انھیں جنوب میں حاصل ہے اور ہندی فلم بینوں کی اتنی ہی تالیوں کے خواہشمند ہیں جتنی ساؤتھ کی پبلک ان کے پردے پر آتے ہی بجانے لگتی ہے۔

اُن کی فنی صلاحیت و مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انھیں چودہ مرتبہ فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یہ اپنے آپ میں ایک ریکارڈ ہے جسے آج تک نہ کوئی توڑ پایا ہے اور نہ شاید ہی کوئی توڑ پائے گا۔

☆☆☆

ضابطۂ فن کا رومانی اداکار۔ ششی کپور

رشید انجم

نام: ششی راج کپور۔ پیدائش: ۱۸؍ مارچ ۱۹۳۸ء کلکتہ۔ پہلی اسٹیج پرفارمینس: ۱۹۴۳ء۔ پرتھوی تھیٹر۔ ڈرامہ: شکنتلا اور دشنیت کے بیٹے کا کردار: عمر ۵ سال۔ دوسری بڑی اسٹیج پرفارمینس: ۱۹۵۲ء ڈرامہ کسان میں عیاش جاگیردار۔ عمر ۱۴ سال۔

بطور پروڈیوسر: ۱۰ بطور ڈائریکٹر: ایک فلم عجوبہ۔ بطور کیریکٹر آرٹسٹ: ۳۲، کل فلمیں ۱۲۶۔ بطور چائلڈ ۱۳۔

راجکپور اور شمی کپور کے چھوٹے بھائی اور پرتھوی راج کے سب سے چھوٹے بیٹے۔ ابھی وہ کم عمر ہی تھے کہ پرتھوی تھیٹر میں اپنے والد اور دونوں بھائی کے ساتھ کام کرنے لگے۔ ۱۹۴۳ء میں پرتھوی تھیٹر کے پہلے ڈرامے شکنتلا میں شمی کپور اور راج کپور نے شکنتلا اور دشینت کے بیٹے کے کردار ادا کئے۔ پھر یہ کردار ششی کپور نے نبھائے۔ یہ ان کی پہلی اسٹیج پرفارمینس تھی مگر جب انہیں لگا کہ تھیٹر کے ڈراموں میں ان کی ابھی گنجائش نہیں ہے تو تھیٹر کے مردوں کے ساتھ سیٹ لگانے نکالنے اور پھر دوسرے شہروں میں تھیٹر کے لئے انتظامات کرنے لگے۔ یہ ان کا بچپن تھا۔ پرتھوی تھیٹر کے ڈرامہ ''کسان'' میں انہیں اپنی عمر سے بڑا کیریکٹر ملا۔ یہ ایک عیاش جاگیردار کا رول تھا جو انہوں نے بخوبی ادا کیا۔ اسی کے ساتھ ان کی تعلیم بھی ہوتی رہی۔ یہ وہ وقت تھا جب راج کپور بطور اداکار فلموں میں اپنا سکہ قائم کر چکے تھے اور خود اپنی فلم بنانے جا رہے تھے۔ راج نے ۱۹۴۸ء میں اپنی فلم ''آگ'' میں ششی کپور کو اپنے بچپن کے رول میں پیش کیا تب ششی کپور کی عمر محض دس سال تھی۔

۱۹۵۰ء کی ان کی دو فلمیں اشوک کمار اور نلنی جیونت کے ساتھ آئیں۔ ''سمادھی''۔ (فلمستان) اور ''سنگرام'' (بمبئی ٹاکیز) ان دونوں فلموں میں ۱۲ سالہ ششی کپور تھے۔ آر کے بینر کامیابی کی جانب محوِ سفر تھا۔ راج کپور اپنی ناقابلِ فراموش فلم ''آوارہ'' بنانے جا رہے تھے۔ ۱۹۵۱ء کی اس فلم میں ایک جانب پرتھوی راج نے راج کپور کے والد کا رول ادا کیا تو دوسری جانب ششی کپور نے اپنے بھائی کے بچپن کا کردار نبھایا۔

۵۶-۱۹۵۳ء کے درمیان لندن سے ایک ڈرامہ کمپنی شیکسپیرین ہندوستان آئی اور ہندوستان کے نمایاں شہروں میں اپنے انگریزی ڈرامے اسٹیج کرنے لگی۔ یہ ٹورنگ تھیٹریکل گروپ تھا اور اس کے

کرتا دھرتا جیوفری کینڈل تھے۔شیکسپیرین تھیٹریکل گروپ جب بنگلور میں اپنے ڈرامے کھیل رہا تھا تب پرتھوی تھیٹر بھی بنگلور میں تھا۔ششی کپور کی ملاقات جیوفری کینڈل سے ہوئی اور ششی کپور اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اس گروپ میں شمولیت اختیار کرلی۔وہ بھی اس کمپنی کے ڈراموں میں شامل ہو کر مختلف شہروں کے دورے کرنے لگے۔جیوفری کینڈل کی نوعمر بیٹی جینفر کینڈل Jannifer Kendel بھی اس گروپ میں تھیں۔ششی کپور اور جنیفر کا پیار یہیں پروان چڑھا اور اپنے گھر والوں کی مرضی پانے کے بعد ۱۹۶۰ء میں ششی کپور نے جینفر سے شادی کرلی۔شادی کے بعد انہیں فلمیں ملنے لگیں۔ان کی پہلی فلم ''چار دیواری'' تھی جو ۱۹۶۱ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

ان کے سامنے سب سے بڑی آزمائش اداکاری کی قواعد طے کرنا تھی۔پرتھوی راج نہ صرف اسٹیج فلموں کے بھی الگ انداز کے اداکار تھے۔ان کے بڑے بھائی راج کپور نے اپنی سب سے جدا اداکاری میں اپنا مقام حاصل کرلیا اور شمی کپور بھی اپنی راہ متعین کر چکے تھے۔ان سب سے الگ اور تینوں سے منفرد راہ نکالنا تھی جو بے حد دشوار طلب اور صبر آزما کام تھا۔پرتھوی راج کا اثر کسی نے قبول نہیں کیا تھا۔راج کپور کا مکتب الگ تھا تو شمی کپور نے بھی اپنے آپ کو ایک نئے پیکر میں ڈھال کر فلموں میں پیش کیا۔یہ امیج کامیاب ہوئی اور دونوں بھائی فنِ اداکاری کے دو مختلف، سب سے جدا بے حد متاثر کن اسکول قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔اب ششی کپور کو اپنا راستہ منتخب کرنا تھا اگر وہ ان دونوں بھائیوں سے متاثر ہوتے اور ان کا سایہ بن کر فلموں میں کبھی قبول نہیں کرتے۔یہ نکتہ ان کے ذہن میں بھی تھا۔اس لئے جب وہ پہلی بار ہیرو بن کر پردے پر نمودار ہوئے تو ان کی اداکاری میں نہ تو پرتھوی راج نظر آئے اور نہ راج کپور اور شمی کی ہلکی سی جھلک بھی محسوس کی گئی۔وہ ششی کپور تھے صرف ششی کپور۔ان کی ڈائلاگ ڈیلیوری۔چہرے کے تاثرات، باڈی لنگویج، چلنے اور رقص کرنے کا انداز ایک تازگی بھرا احساس لئے ہوئے رہا۔یہ انداز یہ طریقۂ اداکاری دور دور تک کسی اور اداکار میں نظر نہیں آیا۔اس لئے شمی کپور اور راج کپور کی طرح ششی کپور کو بھی فلم طبقے نے بہت جلد قبول کرلیا۔لوگ ان کی اداکاری کے دیوانے ہوتے چلے گئے۔

۱۹۶۱ء میں ہی بی آر چوپڑہ نے اپنی فلم ''دھرم پتر'' میں ششی کپور کو ایک الگ کردار میں پیش کیا۔یہ قابلِ دید فلم فرقہ وارانہ فساد پر ایک زبردست طنز تھی۔مالا سنہا اور رحمٰن کے مقابل ششی کپور نے مذہبی جنون سے شرابور

نوجوان کا کردار عمدگی سے ادا کیا تھا۔اب ان کا سفر آسان ہوگیا تھا۔ایک جانب پرتھوی راج فلموں میں انتہائی بلند مقام (فلم مغلِ اعظم) حاصل کر چکے تھے تو دوسری جانب راج کپور ملک کو ''جس دیش میں گنگا بہتی ہے'' (۱۹۶۰ء) دے کر عالمی شہرت اختیار کر کے مطمئن ہو رہے تھے تو شمی کپور بھی ''دل دے کے دیکھو'' (۱۹۵۹ء) اور فلم ''جنگلی'' (۱۹۶۱ء) سے ساری فلم انڈسٹری پر چھا چکے تھے۔یہ بے حد دلچسپ حقیقت ہے کہ پرتھوی راج مغلِ اعظم سے، راج کپور ''جس دیش میں گنگا بہتی ہے'' سے اور شمی کپور فلم ''جنگلی'' سے صرف ایک اور دو سال یعنی ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۱ء کے درمیان وہ ناقابلِ فراموش فلمیں دے کر فنِ اداکاری کا وہ مرتبہ پا چکے تھے جسے صدیوں تک یاد رکھا جانا تھا اور ان کا کوئی بدل کوئی بھی پیش کرنے سے قاصر تھا۔البتہ ششی کپور ابھی اس بلند منصب سے دور تھے۔اپنی شریکِ حیات کے اشتراک سے انہوں نے اپنی ذاتی فلم کمپنی فلم والا کی بنیاد رکھی اور فلم ''ہاؤس ہولڈ'' بنا کر فلم ساز بن گئے۔۱۹۶۳ء کی یہ فلم تھی۔یہی وہ سال تھا جب وہ شرام بیڈیکر نے فلم ''رستم سہراب'' میں پرتھوی راج کپور کے ساتھ ثریا کو آخری بار اسکرین پر پیش کیا تھا۔

منزل ابھی دور تھی۔فلمیں بن رہی تھیں۔ریلیز ہو رہی تھیں۔باکس آفس کبھی قبول کرتا تھا اور کبھی نہیں۔۱۹۶۵ء آگیا۔راجکپور اپنی سب سے بڑی اور پہلی کلر فلم ''سنگم'' ۱۹۶۴ء کی کامیابی کا جشن منا رہے تھے۔خواجہ احمد عباس اپنی فلم ''آسمان محل'' (۱۹۶۵ء)۔میں پرتھوی راج کپور کو یادگار رول میں پیش کر رہے تھے اور شمی کپور نئی نویلی ہیروئن شرمیلا ٹیگور کے ساتھ فلم ''کشمیر کی کلی'' کا طوفان خیز مقابلہ کرنے کے بعد ایک اور ان چھوئی خیرہ کن حسن کی مالک راج شری کے ساتھ ''جانور'' (۱۹۶۵ء) جیسا سلوک کر چکے تھے کہ ششی کپور پر بھی قسمت مہربان ہوگئی اور نندہ کے ساتھ ان کی کبھی نہ بھولنے والی رومانس اور موسیقی سے بھرپور جذبات، محبت، وصل اور جدائی پر مبنی فلم ''جب جب پھول کھلے'' (۱۹۶۵ء) منظرِ عام پر کیا آئی کہ نوجوان نسل کے ساتھ عمرِ گذشتہ بھی ان کی پرستار ہوگئی۔اس فلم نے کامیابیوں کی انتہا کو چھولیا۔کہا جاتا ہے کہ اس فلم سے بہتر کشمیر کبھی کسی اور فلم میں نظر بند نہیں کیا گیا۔

اس فلم نے ششی کپور کو بھی ان کا جائز مقام پر لا کھڑا کیا۔ایک جانب ان کی مختلف فلمیں مختلف ہیروئنوں اور ہدایت کاروں کے ساتھ آ رہی تھیں۔تو دوسری طرف وہ فلمستان سے بھی غافل نہیں تھے۔فلم والا کے علاوہ آوَری مرچنٹ پروڈکشن کے اشتراک سے فلمیں بنانا جاری رکھا۔انہوں نے

مغرب کی فلمسازی میں بھی اس وقت ایک اہم مقام حاصل کرلیا جب Conrad Rook کی انگریزی فلم ''سدھارتھ'' (۱۹۷۸ء) میں سمی گریوال کے مقابل ٹائیٹل رول ادا کیا۔

اس پروڈکشن کی فلموں سے انہیں عالمی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ''ہاؤس ہولڈ'' ۱۹۶۳ء۔ ''شکسپئر والا'' ۱۹۶۵ء۔ ''بامبے ٹاکیز'' ۱۹۷۰ء۔ ''سدھارتھ'' ۱۹۷۸ء ''ہیٹ اینڈ ڈسٹ'' ۱۹۸۳ء۔ ''سیمی اینڈ روزی لینڈ'' ۱۹۸۷ء۔ ''دی ڈیسیوورز'' ۱۹۸۸ء وغیرہ اسی پروڈکشن کی انگریزی فلمیں ہیں۔ اسماعیل مرچنٹ نے انہیں ڈائریکٹ کیا تھا۔ اس کے علاوہ اپنی ذاتی فلم کمپنی والا کے تحت انہوں نے بہترین تخلیق کی۔ ''جنون'' ۱۹۷۸ء۔ ''وجیتا'' ۱۹۸۰ء۔ ''وجیتا'' ۱۹۸۲ء۔ ''اُتسو'' ۱۹۸۴ء۔ یہ چاروں فلمیں نہ صرف اپنی کہانیوں کی بنا پر بلکہ اچھوتی ہدایت کاری اور لاجواب فلم میکنگ کی وجہ سے یادگار فلمیں ہیں۔ کل یگ اور اُتسو کو شیام بینگل نے ڈائریکٹ کیا تھا اور ''اُتسو'' سنسکرت ناٹک وسنت سینا پر مبنی گریش کرناڈ کی ہدایت میں بنی بہترین فلم ثابت ہوئی۔ ''وجیتا'' میں ششی کپور نے اپنے بڑے بیٹے کنال کپور کو پیش کیا تھا اور ''اُتسو'' میں ریکھا کے ساتھ شیکھر سمن کو متعارف کرایا تھا۔ ہیروشپ سے یہ ریٹائرڈ ہونے کا وقت تھا۔ اب وہ عمر کے تقاضوں سے مجبور ہو کر فربہی (موٹاپے) کی جانب تیزی سے بڑھ چکے تھے۔ موٹاپہ ان کا خاندانی وصف تھا۔ وہ ساری احتیاطیں جو ہیروشپ کے لئے ضروری اور جوانی کو برقرار رکھنے کے لئے واجب ہوتی ہیں تیاگ چکے تھے۔ ۱۹۹۱ء میں انہوں نے انڈو سویت پروڈکشن اشتراک سے عربین نائٹس کی کہانی چن کر فلم ''عجوبہ'' ڈائریکٹ کی۔ بڑا بجٹ، عالیشان سیٹس اور بھرپور تفریح تھی جس میں امیتابھ بچن نے لیڈنگ رول کیا تھا۔

ششی کپور جتنے ہیرو کامیاب تھے اتنے ہی معاون (سپورٹنگ) ہیرو بھی پسند کئے جاتے تھے۔ امیتابھ بچن کے ساتھ انھوں نے دس فلموں میں سپورٹنگ ہیرو کے رول کئے۔ ''دیوار'' ۱۹۷۵ء، ''کبھی کبھی'' ۱۹۷۷ء، ''ایمان دھرم'' ۱۹۷۷ء، ''ترشول'' ۱۹۷۸ء، ''کالا پتھر'' ۱۹۷۹ء، ''سہاگ'' ۱۹۷۹ء، ''شان'' ۱۹۸۶ء، ''ایک اور ایک گیارہ'' ۱۹۸۱ء، ''سلسلہ'' ۱۹۸۲ء اور ''نمک حلال'' ۱۹۸۲ء۔ ''وقت'' ۱۹۶۵ء میں شرمیلا ٹیگور کے ساتھ راج کمار اور سنیل دت کے سب سے چھوٹے بھائی تھے تو گوتم گووندا ۱۹۷۹ء شتروگھن سنہا کے ہمراہ متوازن کردار میں تھے۔ ''روٹی کپڑا اور مکان'' ۱۹۷۴ء، ''کرانتی'' ۱۹۸۱ء اور ''کلرک'' ۱۹۸۹ء میں انہوں نے منوج کمار کے ساتھ معاون اداکار بننا قبول کیا۔ فلم ''گھنگرو'' ۱۹۸۳ء میں وہ وحیدہ رحمٰن کے بیٹے،

سمیتا پاٹل کے شوہر اور منوج کمار کے بیٹے کنال گوسوامی کے باپ کے رول میں آئے تھے۔

ششی کپور کی ہیروشپ کا دور سنہرا دور تھا۔ وہ بے حد مقبول بھی تھے اور بے حد پسند بھی کئے جاتے تھے۔ ''جب جب پھول کھلے''۔ ''جنون''۔ ''ستیم شیوم سندرم''، ''نیند ہماری خواب تمہارے''، ''حسینہ مان جائے گی''، ''کنیا دان''، ''نیو دہلی ٹائمس''، ''پیار کئے جا''، ''آ گلے لگ جا''، ''پیار کا موسم''، ''شرمیلی''، ''چوری میرا کام''، ''چور مچائے شور''، ''فقیرا''، ''دوسرا آدمی''، ''مکتی''، ''ترشنا''، ''سدھارتھ''، ''کل یگ''، ''اُتسو'' وغیرہ ان کی چند بہترین اور قابلِ دید فلمیں ہیں۔

اسماعیل مرچنٹ کی آخری فلم ''محافظ'' (The Custody) میں ششی کپور نے آخری بار کام کیا تھا۔ ۱۹۹۳ء میں بنی اس فلم میں انہوں نے شاعر نور کا کردار نبھایا تھا۔ وہ اتنے موٹے ہو چکے تھے کہ نہ تو ان سے ٹھیک طرح چلا جاتا تھا اور نہ کام کر سکتے تھے۔ اسماعیل مرچنٹ نے پرانے تعلقات کو فرض کی طرح ادا کیا تھا۔ اس فلم کی زیادہ تر شوٹنگ بھوپال کے گوہر محل اور اطراف میں ہوئی تھی۔ انتہائی لغو اور بکواس فلم تھی جو نہ صرف ششی کپور بلکہ اسماعیل مرچنٹ مرحوم کے نام پر بھی داغ لگا گئی۔

ان کے دو بیٹے کنال اور کرن اور ایک بیٹی سنجنا ہے۔ کرن کپور کو سلیم اختر نے سب سے پہلے فلم ''لوہا'' میں پیش کیا تھا۔ اس کے بعد دو فلمیں اور آئیں مگر دونوں ہی بیٹے فلم کی ڈیمانڈ پر کھرے نہیں اترے۔ بیٹی سنجنا بھی فلموں اور ٹی وی سیریل میں آئی مگر جلدی واپس ہوگئی۔ ششی کپور نے ٹی وی سیریل ''سیاست'' ۱۹۹۲ء میں چیف منسٹر کا رول بھی کیا تھا۔

اب وہ اور ان کی بیٹی پرتھوی تھیٹر کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ پرتھوی تھیٹر میں مختلف ڈرامہ گروپ اپنے ڈرامہ کھیلتے ہیں اس طرح پرتھوی تھیٹر کا وجود قائم ہے۔

☆☆☆

گولڈن جبلی فلموں کے ہیرو ''جوائے مکھر جی''

احمر امان

۱۹۶۰ء کی دہائی میں ایک فلم ریلیز ہوئی تھی جس کا نام ''ہم ہندستانی'' تھا اس فلم کے مرکزی کردار سنیل دت اور آشا پاریکھ نے ادا کئے تھے جبکہ سائیڈ ہیرو کا رول ایک نئے بنگالی نوجوان جوائے مکھر جی کو دیا گیا تھا، اس کے ساتھ معاون ہیروئن کا رول ہیلن نے ادا کئے تھے، اس فلم میں سنیل دت نے ایک جوشیلے نوجوان کا رول ادا کیا تھا جس نے زندگی میں کبھی بھی ہار ماننا نہیں سیکھا جبکہ اس کے چھوٹے بھائی کے رول میں جوائے مکھر جی ایک گریجویٹ مگر بیروزگار نوجوان کے رول میں تھا اور نوکری نہ ملنے کے باعث اس کے مزاج میں غصیلا پن پیدا ہو گیا تھا اور وہ بات بات پر اپنے بھائی سے جھگڑ بیٹھتا تھا۔ ہدایتکار شومو مکھر جی جو جوائے مکھر جی کے چچا تھے انہوں نے غصیلے نوجوان کے روپ میں جوائے مکھر جی کو پیش کیا تھا لیکن انہوں نے زندگی میں یہ نہیں سوچا تھا کہ یہی غصیلا نوجوان آگے چل کر سب سے بہترین رومانٹک ہیرو بنے گا اور سلور جبلی اور گولڈن جبلی فلموں کی لائین لگا دے گا۔

فلم ''ہم ہندستانی'' ایک دیش بھگت فلم تھی اور اس فلم کو بہترین کہانی، بہترین اداکاری کے سبب سے زبردست کامیابی ملی اور یہ ساری کامیابیاں سنیل دت کے حصّے میں گئیں جوائے مکھر جی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور وہ تین برسوں تک یونہی بیکار رہا اور مختلف اسٹوڈیوز کے چکر کاٹتا رہا پھر ۱۹۶۰ء میں ایس ایچ بہاری کی فلم ''ایک مسافر ایک حسینہ'' میں اس وقت کی ابھرتی ہوئی اداکارہ سادھنا کے ساتھ اُسے مرکزی رول میں پیش کیا گیا۔ اس فلم کی موسیقی او پی نیّر کی تھی اور فلم میں پورے ۱۲ گانے تھے، ایس ایچ بہاری اور مجروح کے دلکش گیتوں اور او پی نیّر کے سنگیت نے فلم میں چار چاند لگا دیئے، فلم بلیک اینڈ وائٹ تھی اور یہ فلم پورے ہندستان میں سلور جبلی اور گولڈن جبلی کے ساتھ باکس آفس میں ہٹ ثابت ہوئی، حسین سادھنا کی اداکاری بھی عروج پر تھی اور جوائے مکھر جی نے یادداشت کھوئے ہوئے ایک نوجوان کا رول ادا کیا تھا۔ اس فلم کے چند مشہور گیتوں میں یہ گیت ملاحظہ ہوں۔

۱۔ آپ یونہی اگر مجھ سے ملتے رہے
دیکھئے ایک دن پیار ہو جائے گا

۲۔ زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

جوائے مکھر جی کی کامیاب فلموں میں ناصر حسین کی گولڈین جبلی فلم ''پھر وہی دل لایا ہوں'' ہے اس فلم میں ہیروئن کا رول آشا پاریکھ نے اور ویلین کا رول پران صاحب نے ادا کیا تھا۔ اس فلم کی کہانی ناصر حسین کی پچھلی فلموں کی کہانیوں ''جبپ پیار کسی سے ہوتا ہے'' تم سا نہیں دیکھا، جیسی تھیں، لیکن اس فلم کے گیت مجروح نے تحریر کئے تھے موسیقی او پی نیّر کی تھی اور اس فلم کے چند مشہور گیت ملاحظہ ہوں

۱۔ اجی قبلہ، محترمہ، کبھی شعلہ کبھی نغمہ
آپ کا انداز کا ہائے کیا کہنا

۲۔ بندہ پرور تھام لو جگر بن کے پیار میں آیا ہوں
قسمت سے آپ کے حضور پھر وہی دل لایا ہوں

پھر وہی دل لایا ہوں کے علاوہ جوائے مکھر جی کی بہترین اور کامیابی فلموں میں پرمود چکرورتی کی ضدی (آشا پاریکھ) اور لوان ٹوکیو (آشا ریکھ) ہے۔ لوان ٹوکیو میں پوری فلم جاپان کے مختلف شہروں میں فلمائی گئی اور اس فلم کو خوبصورت مناظر اور بہترین فوٹوگرافی کی وجہ سے بیحد پسند کیا گیا۔ اس فلم کی کہانی اگرچہ بیحد معمولی تھی، لیکن جاپانی لڑکی کے رول میں آشا پاریکھ نے غضب کی اداکاری کی، حسرت جے پوری اور شیلندر کے خوبصورت گیتوں کو شنکر جے کشن نے اپنی خوبصورت دھنوں سے سجایا تھا اس فلم نے اپنی کامیابی کے نئے ریکارڈ بنائے تھے اور ہدایتکار پرمود چکرورتی نے ضدّی کے بعد دوسری زبردست ہٹ فلم' بنا کر اپنے آپ کو سپر اسٹار فلمسازوں میں شامل کر لیا تھا۔ پرمود چکرورتی کی دیگر فلموں میں بارود (رشی کپور) نیا زمانہ (دھرمیندر۔ ہیما مالنی) جگنو (دھرمیندر۔ ہیما مالنی) سبھی گولڈن جبلی فلمیں ثابت ہوئیں۔

۱۹۶۰ء کی دہائی میں جوائے مکھر جی کی بلیک اینڈ وائٹ فلم ''لوان شملہ'' ایک مسافر ایک حسینہ (دونوں کی ہیروئن سادھنا) ریلیز ہوئی تھی اور دونوں فلموں میں او پی نیّر نے بہترین سنگیت کے ذریعہ فلم کو بیحد خوبصورت بنا دیا تھا۔ فلم ایک مسافر ایک حسینہ کے چند گیت جیسے

۱۔آپ یونہی اگر مجھ سے ملتے رہے

دیکھئے ایک دن پیار ہو جائے گا

۲۔میں پیار کا راہی ہوں

زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

اور لوان شملہ کے گیت

۱۔عشق کا مطلب ہے پیار، پیار دلوں کا قرار

جوائے مکھر جی کو دراصل لوگ ان کی فلموں کے خوبصورت گیتوں کی وجہ سے یاد رکھتے ہیں۔اس اداکار کو اگرچہ کبھی کوئی ایوارڈ نہیں ملا اور نہ ہی اُسے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ کے لئے منتخب کیا گیا مگر ضدّی، لوان شملہ، لوان ٹوکیو، ایک مسافر ایک حسینہ، ہم ہندستانی، پھر وہی دل لایا ہوں اور اپنی ہدایتکاری میں حب الوطنی کے موضوع پر ''ہم سایہ'' (شرمیلا ٹیگور۔مالا سنہا) جیسی سلور اور گولڈن جبلی فلموں کے سپر اسٹار ہیرو جوائے مکھر جی صحیح معنوں میں ایک گریٹ ہیرو رہے ہیں۔مزاحیہ فلم ''شاگرد'' میں سائرہ بانو اور آئی ایس جوہر کے ساتھ بھرپور کامیڈی کے ساتھ اس گولڈن جبلی فلم کو کوئی بھی فراموش نہیں کر پائے گا جس کے چند گیت

۱۔دل ول پیار ویار میں کیا جانوں رے

۲۔بڑے میاں دیوانے ہم سے سنو

حسینہ کیا چاہے ہم سے سنو

بیحد پسند کئے گئے تھے اور تقریباً سال بھر گیت لوگوں کی زبان پر رہے تھے۔

☆☆☆

اداکار و ہدایت کار۔اتپل دت

ڈاکٹر عقیل احمد عقیل

تھیٹر اور اداکاری کی دنیا میں جہاں پرتھوی راج کپور اور سہراب مودی دو بڑے نام ہیں جنھوں نے ہندی تھیٹر اور ہندی سنیما کو بہت کچھ دیا اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں شخصیتوں نے مل کر ہندی تھیٹر اور ہندی سنیما کو مالا مال کر دیا وہیں بنگال کی سرزمین پر اتپل دت ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس نے بنگلہ تھیٹر اور بنگلہ سنیما کو اپنی اداکاری، اپنی ہدایتکاری، مکالمے اور کہانیوں کے ذریعہ اتنا کچھ دے دیا ہے کہ آنے والی کئی نسلیں ان تجربات سے فیضیاب ہوتی رہیں گی۔اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو اتپل دت تھیٹر کی دنیا کے آدمی تھے بعد میں انھوں نے بنگلہ اور ہندی سنیما کا رخ کیا۔ان کی پیدائش ۲۹/مارچ کو ۱۹۲۹ء میں شیلانگ میں ہوئی اور ۱۹/اگست ۱۹۹۳ء کو دل کا دورہ پڑنے سے ان کا انتقال ہوا۔ان کے والد کا نام گرجا رنجن دتہ تھا۔اتپل دت نے ابتدائی تعلیم شیلانگ کے ایڈمنٹ اسکول میں حاصل کی اور ۱۹۴۵ء سنٹ زیویر اسکول سے میٹریکولیشن کیا۔سنٹ زیویر اسکول سے ۱۹۴۹ء میں انھوں نے انگلش آنرز کے ساتھ گریجویشن مکمل کی۔۱۹۵۰ء میں ایک بنگلہ فلم ''مائیکل مدن سون'' میں انھوں نے مائیکل مدن سون کا رول ادا کیا، ان کا تعلق شیکسپرئن انٹرنیشنل تھیٹر کمپنی سے تھا۔بعد میں گنا نائید سنگھا کے مستقل ممبر بن گئے۔انھوں نے اپنا ایک چھوٹا تھیٹریکل گروپ قائم کیا اور بہت سارے ڈرامے اسٹیج کئے ان کے تھیٹر گروپ کا نام منروا تھیٹر تھا۔بعد میں انہوں نے پیلپز تھیٹر گروپ بھی قائم کیا جس کا نام ''آر جوا و پیرا اور رو یو یکا یاترا سماج'' رکھا۔وہ یاترا پال (بنگلہ لوک ڈرامہ) کو تیار کرنے اور ہدایت دینے میں ماہر تھے۔ویسے دوسرے لفظوں میں اتپل دت کو انڈین شیکسپیئر کا نام دیا گیا تھا۔صرف انگریزی ہی نہیں انھوں نے ہندی۔اسپینی، جرمن، فرنچ اور لاطینی زبان پر بھی عبور حاصل کی اور ان زبانوں کے ڈراموں سے بہت کچھ حاصل کیا۔وہ برسہا برس تک ساؤتھ پوائنٹ اسکول میں انگریزی کے ٹیچر کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔

بنگلہ فلموں کے علاوہ انھوں نے بہت ساری ہندی فلموں میں بھی اداکاری کی، انھوں نے پریشٹ

سوسائٹی society Brecht تشکیل بھی کی تھی جس کے صدر ستیہ جیت رے تھے اتپل دتہ نے بہت سارے ڈرامے بھی تحریر کئے، جاترا کے اسکرپٹ اور آرٹیکلس بھی تحریر کئے۔ انہیں زندگی میں بہت سارے ایوارڈ بھی ملے جس میں سب سے بڑا ایوارڈ ''بھارت پرسکار'' تھا جو ۱۹۶۹ء میں انہیں ہندی فلم ''بھون شوم'' میں اداکاری کے لئے ملا ۱۹۶۰ء میں انھوں نے شوبھا سین سے شادی کر لی تھی۔

چونکہ راقم الحروف نے اس عظیم فنکار کی بنگلہ فلمیں نہیں دیکھیں اور اس وجہ سے ان کی بنگلہ فلموں کے متعلق کچھ لکھنا مشکل ہے لیکن انھوں نے چند یادگار ہندی فلموں میں کام کیا اور اس کی وجہ سے وہ بیک وقت ہندی اور بنگلہ فلموں کے سپر اسٹار رہے اور ۱۹۸۰ء کی دہائی میں وہ ہندی فلموں کے سپر اسٹار کیریکٹر ایکٹر کی شکل میں ابھر کر سامنے آئے۔ اتپل دت کی جن ہندی فلموں کو قابل ذکر اور کلاسیک تصوّر کیا گیا ہے ان میں نرم گرم، گول مال، نمکین، آ مانش، شوقین، دوانجانے، دیش پریمی، آنند آشرم، سات ہندستانی سب سے بڑا سکھ، چپکے چپکے، گڈی اور دیگر بہت ساری فلمیں ہیں۔ جن میں اتپل دت نے اپنی اداکاری کا جادو جگایا، وہ بیک وقت انتہائی ملنسار پرخلوص اور انتہائی مکّار انسان کا رول ادا کر سکتے تھے، اگر غریب آدمی کا رول دیا جائے تو وہ اپنے چہرے پہناوے اور جسم کی ہر حرکت سے یہ ثابت کر سکتے تھے کہ وہ ایک انتہائی غریب اور پسماندہ کمیونیٹی سے تعلق رکھتے ہیں اور اگر کسی امیر جاگیردار یا رئیس ساہوکار کا رول ملے تو وہ اس زمرے میں بھی اپنی پہچان ثابت کر سکتے تھے۔ امیتابھ بچن کے ساتھ انھوں نے خواجہ احمد عباس کی ناقابل فراموش اور کلاسیک فلم ''سات ہندستانی'' میں کام کیا تھا جو امیتابھ بچن کے فلمی کیریئر کی پہلی فلم تھی، اس میں لیڈ رول اتپل دت کو ہی ملا تھا اور امیتابھ بچن ضمنی رول میں تھے۔ لیکن بعد میں جب امیتابھ شہرت کی بلندیوں پر پہنچے تو انھوں نے اپنی اہم فلموں میں اتپل دت کو اہم رول کے لئے سفارش کی، اتپل دت جیسے عظیم اداکار کو کسی کی سفارش کی ضرورت نہیں تھی لیکن امیتابھ نے وہ سفارش خود اپنے لئے کی تھی کہ اگر وہ ان کی فلم میں وہ اہم رول نہ کرتے تو شاید امیتابھ کی ان فلموں کو وہ شہرت بھی نہ ملتی۔ مثال کے طور پر فلم ''دوانجانے'' جس میں امیتابھ اور ریکھا کے ساتھ پریم چوپڑہ بھی تھے اور اس فلم کے ایک مختصر سے رول میں اتپل دت نے بھی کام کیا تھا لیکن وہ اپنے اس مختصر سے رول میں بھی چھا گئے تھے۔

مغربی بنگال کے ممتاز ڈرامہ نویس اور باغیانہ روش رکھنے والے جناب ظہیر انور کا کہنا ہے کہ اتپل دت کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ ایک اچھے اور منجھے ہوئے اداکار زیادہ تھے یا ایک عظیم ہدایتکار۔ جن ڈراموں کو انہوں نے تحریر کیا اور ساتھ ہی اسٹیج کیا، وہ اپنی مثال آپ ہیں، اگر شیکسپیرین کو صحیح معنوں میں زندہ کیا تو وہ اتپل دت تھے، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ڈرامے میں زندگی تو ہے لیکن پیسے نہیں جبکہ اس کے مقابلے میں فلم میں پیسے تو ہیں مگر زندگی نہیں لیکن پھر بھی نرم گرم، گول مال، شوقین جیسی کم بجٹ والی فلموں کو انھوں نے جس طرح سے سپر ہٹ بنایا وہ انہی کا کمال تھا۔

فلم گول مال میں ان کی کامیڈی زندگی سے بھرپور تھی اور اس فلم کو دیکھنے کے بعد اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ وہی اداکار ہیں جنہوں نے بھون شوم اور سات ہندستانی جیسی فلموں میں انتہائی خشک اداکاری کی تھی۔ گول مال میں ان کی لاجواب کامیڈی بالکل مختلف تھی اور لفظ شش شش شش کو اس انداز میں ادا کرنا صرف ان ہی کا کام تھا اور یہ دونوں فلمیں ایک زبردست کلاسیک فلموں میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں۔ مجموعی اعتبار سے اتپل دت کو ایک عظیم اداکار، ایک عظیم ہدایت کار اور ایک ناقابل فراموش اسکرپٹ رائیٹر کہا جاسکتا ہے جو آج ہمارے درمیان موجود تو نہیں لیکن ان کی یادیں ہمارے دلوں میں زندگی کی طرح سے قائم ہیں۔

☆☆☆

فلم صنعت کا انوکھا اداکار۔کنہیا لال

رشید انجم

خباثت جس کی شدت ہو،حرص وہوس جس کی خصلت ہو،نفسانی خواہش کی تکمیل جس کے مزاج پر حاوی رہتی ہو،شراب، جوا اور ہر وہ کام جو عام اور نیک آدمی نہ کرسکتا ہو،ایسے شخص کو سماج میں برا، واہیات آدمی اور بدمعاش کہا جاتا ہے۔فلم میں اسے ولین کا نام دیا گیا ہے ان تمام بری خصلتوں کو فلم کے پردے پر پیش کرنا آسان نہیں ہوتا۔ایک ایسا فنکار جو اپنی نجی اور گھریلو زندگی میں بہترین شوہر، خاندان کا منتظم سربراہ، شفیق باپ اور جان نثار دوست اور بھائی ہو اور جس کے کسی بھی عضو سے برائی کی کوئی رمق ظاہر نہ ہوتی ہو جب ولین کا کردار ادا کرے تو پردۂ فلم پر اس کا سارا وجود خونخواریت اور درندگی کا مظہر بن جائے اور دیکھنے والے بیساختہ اس سے نفرت کا اظہار کرنے لگیں تو اس کی فنکارانہ صلاحیتوں کی یہ جیت ہوتی ہے۔

ایسے ہی ایک فنکار کنہیا لال بھی تھے۔جسم انتہائی منحنی کہ ذرا سا دھکا دو تو دس فٹ دور جا گرے، دونوں ہونٹ مونچھوں میں پوشیدہ، سر پر لمبی چوٹی، بدن پر جنیو، جسم پر بنڈی اور دھوتی، آنکھوں پر باریک کمانی کا چشمہ اور بغل میں چھتری یا پوتھی دبی ہوئی ہو۔ یہ ہندوستانی فلموں کا وہ روایتی کردار ہے جو گاؤں دیہات میں ہی پیدا ہوتا رہا، جس نے شہری زندگی کی ہلکی سی جھلک دیکھنا گوارا نہیں کیا۔انتہائی کنجوس کہ گھی میں مکھی گر جائے تو چوس کر پھینک دے اور جس کی آنکھوں میں بہو بیٹیوں کو دیکھ کر نفسانی ہوس جاگ اٹھے۔ایسے کردار منشی پریم چند کے یہاں بھی ملتے ہیں اور ہر اس کہانی کار کے یہاں جس نے دیہات کو اپنی کہانی کے لئے منتخب کیا ہو۔ ہماری فلموں میں بھی ایسے کردار ان فلموں میں ملتے رہے ہیں جو گاؤں دیہات کے پس منظر پر تخلیق کی گئیں۔ایسے کردار ادا کرنے والے فلموں میں کم نہیں رہے۔جیون، تواری، جینت، سی ایس دوبے وغیرہ نے دیہاتی سود خور ساہوکار اور موقع پرست اور دل پھینک لالہ کے کردار ضرور کیے لیکن کنہیا لال نے ان کرداروں میں جو فن پیش کیا وہ دیگر برے (ولین)

اداکار نہیں پیش کر پائے۔کنہیا لال اس کردار میں اتنے منجھ چکے تھے کہ کوئی فلم ساز یا ہدایت کار ان کو سامنے رکھ کر ہی فلم اسکرپٹ میں اس کردار کو تخلیق کرتا تھا۔

فلموں کا وہ ابتدائی دور تھا اور ۴۰ کی دہائی تھی۔کنہیا لال نے اسی دور میں فلم ''گراموفون سنگر'' سے ۱۹۳۸ء میں اپنی اداکاری کا آغاز کیا تھا۔ساگر فلم کمپنی بمبئی کی اس فلم کے ہدایت کار وی سی ڈیسائی اور آر ڈیسائی اور آر تھا کر تھے۔سریندر اور ببو نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔اس فلم کے بعد ان کی تین فلمیں ''بھولے بھالے''، ''ایک ہی راستہ'' اور ''سروس لمیٹڈ'' آئیں۔یہ تینوں فلمیں ۱۹۳۹ء کی تھیں اور ان فلموں میں کنہیا لال کے نسبتاً منفی کردار ہی تھے لیکن جب محبوب خان نے نیشنل اسٹوڈیوز کے لیے اپنی فلم ''عورت'' کا پروجیکٹ تیار کیا تو اس فلم میں کنہیا لال کو بھی سردار اختر، سریندر اور یعقوب کے ساتھ کاسٹ کیا۔۱۹۴۰ء کی یہ فلم کلاسک ثابت ہوئی اور اسی فلم سے دیہات کے روایتی کردار لالہ کا جنم ہوا۔کنہیا لال نے اس فلم میں لالہ کے کردار کو گویا فلم پردے پر زندہ کردیا۔لوگ عش عش کرا ٹھے۔برسوں بعد جب محبوب خاں اپنا فلم پروڈکشن قائم کر چکے تھے اور اس پروڈکشن کے تحت لاجواب فلمیں فلم صنعت کو دے چکے تھے تو اپنی پرانی فلم ''عورت'' کو رنگین بنانے کا فیصلہ کیا۔۱۹۵۷ء کی فلم ''مدر انڈیا'' میں نرگس، راج کمار، سنیل دت، ذلو بائی اور راجندر کمار کے علاوہ ''مدر انڈیا'' کی کہانی کو Turning point دینے کا جو باعث بنا وہ دیہات کا وہی لالہ تھا اور اس بار بھی کنہیا لال نے اپنے فن کا وہ کمال دکھایا کہ جب دلیپ کمار نے ۱۹۶۲ء میں ''گنگا جمنا'' تخلیق کی تو وہ بھی کنہیا لال کو لالہ کے کردار میں منتخب کرنے پر مجبور ہوگئے۔آج بھی کنہیا لال کو ان دو فلموں سے ہی یاد رکھا گیا ہے۔

۴۰ اور ۵۰ کی دہائی میں پانچ لال بطور اداکار فلم صنعت سے وابستہ ہوئے تھے۔ایشور لال، ہیرالال، رام لال، موتی لال اور کنہیا لال۔ان پانچوں اداکاروں میں ایک سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ سب فنِ اداکاری کو عبادت کی طرح ادا کرتے تھے اور کردار میں خود کو اس درجہ غرق کر لیتے تھے کہ شناخت مشکل ہوجاتی تھی کہ کون اصلی ہے اور کون محض اداکار۔کنہیا لال کا فن چونکہ سب سے الگ اور جدا تھا، اس لئے ان کے کردار میں معمولی جھول بھی انگشت نما نہیں ہوسکا۔

ان کا پورا نام کنہیا لال چتر ویدی تھا۔ ۱۹۱۰ء میں بنارس میں آباد ایک معزز مذہبی گھرانے میں ان کا جنم ہوا تھا۔ ان کے والد پنڈت بھیرو دت چتر ویدی ''شری سناتن دھرم ناٹک منڈلی'' چلاتے تھے۔ یہ رام لیلا منڈلی تھی۔ رام لیلا کے علاوہ بھیرو دت ساماجک ناٹک بھی کرتے تھے۔ اس فنی ریاضت کے درمیان کنہیا لال کی پرورش ہوئی۔ کنہیا لال کی ایک بڑی بہن بھی تھی جس کی شادی ہو چکی تھی۔ ناٹکوں سے جو کچھ آمدنی ہوتی تھی اس سے اس مختصر خاندان کی گذر اوقات ہوتی تھی۔ تعلیم ان کی واجبی ہوئی۔ ان کا رجحان ناٹکوں میں اداکاری کی جانب ہی تھا۔ صرف چوتھے کلاس تک ہی پڑھائی ہوئی اور ان کے والد نے اپنی پشتینی کرایہ کی دوکان پر ان کو بٹھا دیا۔ وہاں دل نہیں لگا تو گھر کا خرچ چلانے کے لیے آٹا چکی پر بھی کام کیا مگر ان کاموں میں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ فنونِ لطیفہ ان کی رگ رگ میں سما چکا تھا۔ وہ مختلف قسم کے گلدستے، سنگار کے خوبصورت سامان، کاغذ کے پھول اور لکڑی کے نقاشی دار سنگھار کا آرائشی سامان بنانے میں مہارت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ انھیں شاعری کا بھی شوق تھا ہارمونیم اور طبلہ بھی بہت اچھا بجاتے تھے۔ بھانگ کی گولی اور پان کھانا ان کی عادت میں شامل تھا۔ کنہیا لال اس خاندان کے پروردہ تھے جہاں لڑکے کی اٹھان دیکھتے ہی اسے شادی کے بندھن میں باندھ دیا جاتا تھا۔ کنہیا لال کی شادی بھی کم عمری میں کر دی گئی مگر بیوی زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکی اور فوت ہو گئی۔

باپ کی ناٹک منڈلی نے ہی انھیں اداکاری کی طرف مائل کیا اور وہ آغا حشر کے ناٹکوں میں شامل ہو گئے۔ ''آنکھ کا نشہ'' ناٹک میں انھیں طبلچی کا کردار ملا تھا۔ اس کے بعد انھیں اردو اور ہندی ناٹکوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملتا گیا۔ انھوں نے الہٰ آباد کی نرسنگھ رام لیلا منڈلی میں بھی کئی سدھار کئے۔ یہ ان کا ہی کارنامہ تھا کہ اس رام لیلا منڈلی نے پہلی بار چرخی پر گھومتی ہوئی مچھلی کو پیش کیا۔ اس رام لیلا منڈلی کے ناٹکوں میں جو سیٹ لگائے جاتے تھے ان پر نقش و نگار بھی کنہیا لال ہی بناتے تھے۔ ان جدید تبدیلیوں کی وجہ سے اس ناٹک منڈلی کے ناٹکوں کو دیکھنے کے لئے دور دور سے لوگ آتے تھے۔ اُس رنگ منچ کو نمایاں کرنے اور عہد کی جدید تکنیک سے جوڑنے میں اپنے کئی سال لگا دیئے۔ اسی رنگ منچ (الہ آباد) پر انھوں نے اپنا تحریر کردہ ڈرامہ ''۱۵ر اگست کے بعد'' پیش

کیا تھا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ بمبئی کے سیٹھ چمن لال جو فلمساز بھی تھے، الہٰ آباد میں موجود تھے۔ انھوں نے اس ڈرامے کو دیکھا اور ان کی پارکھی نظروں نے کنہیا لال کے فن کو پہچان لیا اور اپنی فلم ''گرام فون سنگر'' میں ایک اہم کردار دے دیا۔ ۱۹۳۸ء کی اس فلم میں فلم صنعت کو وہ فنکار ملا جو بیک وقت ویلن اور متوازن کردار سے اپنے فن کی تاریخ لکھ گیا۔

کنہیا لال کے مزاج میں ضد کا عنصر ضرور تھا مگر حسد یا لالچ بالکل نہیں تھی۔ اپنی غیر معمولی فنکارانہ صلاحیتوں سے وہ اپنے کردار میں جان ڈال دیتے تھے۔ فلم ''عورت'' ۱۹۴۰ء اور ''مدر انڈیا'' ۱۹۵۷ء کا خون چوسنے والا ساہوکار ''لال حویلی'' ۱۹۴۴ء کا عیاش پنڈت۔ ''بھروسہ'' ۱۹۴۰ء کا پاجی لنگڑا نوکر۔ ''نوکری'' ۱۹۵۴ء کا ہریا۔ ''بہت دن ہوئے'' ۱۹۵۴ء کا جھاورمل گھی والا۔ ''میری صورت تیری آنکھیں'' ۱۹۶۳ء کا کمزور مگر جان نثار باپ۔ ''ہم لوگ'' ۱۹۵۱ء کا غریب کسان۔ ''ہمالیہ کی گود میں'' کا لالچی اوجھا۔ ''اپکار'' ۱۹۶۷ء کا حاسد لالہ۔ ''دھرتی کہے پکار کے'' کا بھولا بھالا بڑا بھائی۔ ''اپنا دیش'' ۱۹۷۲ء کا ڈرپوک برا آدمی۔ ''جنتا حولدار'' ۱۹۷۹ء کا کائیاں ماما۔ ''ستیم شیوم سندرم'' ۱۹۷۸ء کے ویاس جی اور ''ہم پانچ'' ۱۹۸۰ء کا من سکھ لال شریواستو جیسے بے شمار کرداروں میں کنہیا لا نے اپنی مخصوص مکالمہ کی ادائیگی اور اپنے بے مثال فن سے جان ڈال دی تھی مگر ان تمام کرداروں کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ انھوں نے اپنا گیٹ اپ کبھی تبدیل نہیں کیا۔ البتہ ''میری صورت تیری آنکھیں'' میں چونکہ مسلم کردار تھا اس لئے پگڑی کی جگہ ٹوپی، دھوتی و بنڈی کی جگہ قمیض پاجامہ اور چہرے پر داڑھی کے اضافے کے ساتھ پیش ہوئے تھے۔

ان کی ۴۴ سالا فلمی زندگی میں متعدد فلمیں ایسی ہیں جن میں کنہیا لال نے غیر معمولی فنکاری کا مظاہرہ کیا تھا لیکن ساہوکار، مہاجن، چھوٹا زمیندار، منیم، لالہ وغیرہ جیسے کرداروں کی ادائیگی میں آج بھی صرف ایک نام سرفہرست مانا جاتا ہے۔ کنہیا لال کا نام۔

اسّی کی دہائی ان کے فن کی آخری دہائی ثابت ہوئی۔ وہ بھانگ کے بجائے شراب کے رسیا ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ان کے بڑے بیٹے کی اچانک موت نے

انھیں ساری دلچسپیوں سے دور کر دیا تھا اور وہ ٹوٹ کر بکھر کر رہ گئے تھے۔ انھوں نے فلم سے سنیاس لے لیا اور گھر کی چار دیواری تک خود کو محدود کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی میں ہی ان کی دوسری بیوی کی موت نے بھی ان کے دل کو ہی نہیں دماغ کو بھی متاثر کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنا دماغی توازن بھی کھو بیٹھے۔

فلم صنعت تو یوں بھی بازار میں بکتے حال کی بولی لگاتی ہے۔ سنیما کے بدلتے تیور اور فلموں میں جدید رجحانات اور ارتقائی تکنیک میں بھلا لالہ۔ مہاجن اور ساہوکار جیسے کرداروں کی کہاں گنجائش رہی تھی۔ یوں بھی سنیما سے گاؤں دیہات وداع لے چکے تھے۔ ان تمام حالات نے کنہیالال کو بالکل ہی دل برداشتہ کر دیا۔ آخر کار اجل نے دستک دی اور ۲۷ سال کی عمر میں ۱۴ اگست ۱۹۸۲ء کو اس غیر معمولی فنکار نے موت کو لبیک کہہ دیا۔

☆☆☆

سنجیدگی اور ظرافت کا بے مثال فنکار۔ اوم پرکاش

رشید انجم (بھوپال)

سب کا پسندیدہ۔ فلمساز اور ہدایتکار سے لے کر فلم شائقین تک، ہر شخص جس کا طلب گار اور منتظر رہا ہو وہ فلم انڈسٹری کا کامیڈین تھا اوم پرکاش۔ کامیڈی کا سلجھا ہوا انداز۔ مکالموں کی ادائیگی کے ساتھ چہرے کے تاثرات اور ہاتھ کی انگلیوں کو ایک سدھا ہوا ماہرانہ زاویہ دینا اوم پرکاش کو دیگر مزاحیہ اداکاروں سے الگ کرتا تھا۔ وہ پیدائشی کامیڈین تھے بے حد ملنسار، ہنس مکھ اور خوش اخلاق۔ فلمیں جن کے دم پر چلتی تھیں۔ وہ نجی زندگی میں جتنے خوش مزاج تھے اس سے کہیں زیادہ اسکرین پر نظر آتے تھے۔ انھوں نے ہر قسم کے رول کئے۔ کامیڈی کی تو چہرے تر و تازہ ہو گئے۔ جذباتی اداکاری کی تو آنکھوں کے گوشے نم کر دیئے۔ متوازن کردار کئے تو ایک زمانہ گرویدہ ہو گیا۔ جو دوسروں کو ہنسانے کا ہنر جانتا ہو وہ بھیڑ سے الگ آدمی ہوتا ہے اوم پرکاش ایسے ہی اداکار تھے۔

۱۹۲۰ء میں وہ لاہور کے جس گھرانے میں پیدا ہوئے وہ بے حد دولت مند گھرانہ تھا۔ بہت وسیع جائیداد لاہور اور جموں میں تھی۔ ان کی پڑھائی لاہور اور جموں میں ہوئی۔ چھ ماہ لاہور اور چھ ماہ جموں میں یہ گھرانہ رہتا تھا۔ فلموں کا خاموش دور تھا۔ فلموں کا شوق انھیں بھی تھا۔ جب سن شعور کو پہونچے تو فلمیں دیکھ کر وہ خود میں بے چینی محسوس کرتے۔ شاید ان کے اندر کوئی فنکار تھا جو کروٹیں لینے لگتا تھا۔ آخر انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اداکار بنیں گے۔ انھوں نے تعلیم ادھوری چھوڑی گھر سے اجازت لی اور ۱۳ سال کی عمر میں ۱۹۳۳ء میں وہ بمبئی آ گئے۔ بمبئی کی سروج فلم کمپنی میں تیس روپیے ماہانہ پر ملازم ہو گئے اور اپنا وقت اور پیسہ اداکار کا چانس حاصل کرنے پر صرف کرتے رہے۔ آخر انھیں چانس ملا جس دن شوٹنگ ہونا تھی اس دن ایسی موسلا دھار بارش ہوئی کہ رکنے کا نام نہیں لیا۔ اوم پرکاش قدرت کے اشارے کو سمجھ گئے۔ کچھ عرصے تک اپنے اس شوق کو ملتوی کیا اور لاہور آ گئے۔ لاہور کچھ عرصہ رہ کر ۱۹۳۶ء میں وہ جموں آئے اور بیکاری کے زمانے کو کسی کام کی نذر کرنا مناسب سمجھا۔ گھر سے کوئی روک ٹوک یا پیسے کی کمی نہ تھی مگر خود سے کچھ کرنے کے ارادے کے ساتھ انہوں نے لانڈری خرید لی اس سے انھیں سولہ ہزار کا منافع ہوا تو

خود اعتماد ہوئے مگر خواہشات نے انھیں قرار سے نہیں رہنے دیا آخر اس شدت میں جب زیادتی ہوئی تو ایک نوجوان کو مالکانہ حقوق کے ساتھ محض سات ہزار میں لانڈری فروخت کردی۔ ایک سال غور و فکر میں گذار دیا۔ اپنے مستقبل کے لئے کوشاں تو تھے مگر دولت مند نوجوان کو سمت نہیں مل پا رہی تھی۔ جب کچھ نہ ہوسکا تو آل انڈیا ریڈیو لاہور میں بطور ڈرامہ اداکار ملازمت کرلی۔ پھر انھیں دیہی پروگرام مل گیا۔ انھوں نے ایک کردار وضع کیا۔ فتح دین کاشتکاری میں کن مصائب کا سامنا کسان کو ہوتا ہے اور اس کا سد باب کیا ہو، یہ اوم پرکاش اپنے کردار فتح دین کے توسط سے بتاتے۔ سلجھا ہوا انداز اور آسان یہ پروگرام دس منٹ کا ہوتا تھا۔ جلد ہی فتح دین مقبول ہوگیا۔ پسند کرنے والوں کی تعداد بڑھی تو انھیں تین سے چار سو خطوط ملنے لگے۔ یہ پروگرام سات سال نہایت کامیابی سے چلتا رہا۔ مگر اوم اب اس سے بددل ہوگئے۔ ایک جیسا پروگرام کوئی نیا پن نہیں کوئی دل کشی جب نظر نہیں آئی تو ان کی دلچسپی بھی کم ہوگئی اور پروگرام بے تاثیر ہوگیا۔ آخر ۲۵ر روپیے فی گرام کی اس ملازمت سے انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔

۱۹۴۰ء میں ان کی شادی کردی گئی۔ وہ سرینگر آگئے۔ ابھی وہ شادی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اچانک مشہور فلمساز دل سکھ ایم پنچولی کا ٹیلی گرام ملا۔ لاہور میں انھیں ایک فلم میں رول آفر کیا گیا تھا۔ انھیں یہ محض مذاق لگا۔ اس دوران مشہور موسیقار غلام حیدر چھٹیاں گذارنے سرینگر آئے ہوئے تھے۔ اوم پرکاش نے ان کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا تو غلام حیدر نے انھیں فوراً لاہور جانے کا مشورہ دیا۔ لاہور پہنچ کر اوم دل سکھ پنچولی سے ملے اور انھیں فلم ''داسی'' میں ایک رول دے دیا گیا۔ رول ویلنٹس تھا۔ ۱۹۴۴ء کی اس فلم میں الحسن اور راگنی مرکزی کردار تھے اور ہیروئن بوس ہدایتکار اوم پرکاش ۸۰ روپیے ماہانہ پر اس کمپنی میں ملازم ہوگئے۔

۱۹۴۵ء میں پنچولی نے پھر اپنی فلم ''دھمکی'' میں انھیں پیش کیا۔ راگنی اور الناصر ہیرو ہیروئن تھے۔ اس میں بھی وہ ویلن تھے۔ پنچولی ان کے کام سے بہت متاثر تھے۔ جب انھیں پتہ چلا کہ ان کی تنخواہ اسی روپیے سے ڈھائی سو روپیے کردی گئی ہے تو انھیں یقین نہیں ہوا۔ دو مہینے بعد ہی ان کی تنخواہ پانچ سو روپیے ہوگئی۔ پنچولی ان کے کام سے ہی نہیں، وقت کی پابندی اور شائستہ مزاجی کے بھی قائل تھے پھر انھیں ساڑھے سات سو روپئے ملنے لگے اور پھر ایک ہزار! ایک سال میں ہی انھوں نے غیر معمولی ترقی اور مقبولیت حاصل کرلی۔ وہ ملازم تو پنچولی کے تھے مگر ان پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ۱۹۴۶ء میں برکت مہرہ نے اپنی فلم ''شہر سے دور'' میں پیش کیا۔

۱۹۴۶ء میں آخر انھیں وہ چانس مل گیا جس کا انتظار تھا۔ ہدایت کار شنکر مہتا نے انھیں ہیروئن دلشاد کے مقابل فلم ''آئی بہار'' میں بطور رومانی ہیرو پیش کردیا۔ یہ فلم فلاپ ہوگئی اور اوم پرکاش سمجھ نہیں پائے اس کی ناکامی کو۔ فلمی سفر رُکا نہیں ۱۹۴۷ء میں ان کی ایک اور اہم فلم ''پگڈنڈی'' آئی یہ تمام فلمیں لاہور کی تھیں۔ اسی سال تقسیم ملک نے فسادات کا روپ دھار لیا انھیں لاہور چھوڑنا پڑا اور انکی فیملی بر ندرا بن آگئی۔ جب امن قائم ہوا تو کام کی تلاش میں بمبئی آئے۔ وہ دور بڑا ہی جبر آزما تھا۔ ایک اسٹوڈیو سے دوسرا اسٹوڈیو کام کی تلاش میں جاتے اپنے فن کی آپ وکالت کرتے اور خالی ہاتھ لوٹ آتے کون تھا جوان کی مدد کرتا۔ نہ آسرا نہ کوئی شریک غم۔ ایک سال ایسے ہی گذر گیا۔ صبر کا دامن نہ انھوں نے چھوڑا اور نہ ہمت پست ہوئی۔ ۱۹۴۸ء میں ایک پارٹی میں فلم ساز جینت ڈیسائی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ قسمت یاور تھی جینت نے انھیں فلم ''لکھ پتی'' میں رول کا آفر دیا تو انھوں نے بلا جھجک قبول کرلیا۔ جب قیمت پر بات آئی تو پوری فلم کے پانچ ہزار انھیں بتائے گئے۔ وہ حیران رہ گئے۔ اس پرائز پر فلم قبول کرلی اور پوری رقم کا چیک انھیں پیشگی دے دیا گیا۔ وہ رقم شراب کے جام سے زیادہ نشہ آور تھی۔ انھیں اس وقت یقین نہیں ہوا جب تک چیک کیش نہیں ہوگیا۔ رقم لے کر پہلی بار ٹیکسی سے گھر لوٹے۔ اپنے عزیز دوست خوشی رام کو ساتھ لیا اور بازار سے ہر برانڈ کے تین سو سگریٹ کے پیکٹ خریدے یہ ان کے تین ماہ کا اسٹاک تھا۔ پھر شاندار ہوٹل میں جا کر ڈنر کیا۔ فلم بنی اور ان کو فلمیں ملنے لگیں۔ ان کی اگلی فلم جیمنی دیوان کی ''چمپن'' تھی۔ پنجابی زبان کی اس فلم نے پشاور سے دہلی تک دھوم مچادی۔ اس کا معاوضہ ساڑھے تین ہزار ملا تھا۔

۱۹۴۹ء میں انھیں صحیح مفہوم میں پہلی بڑی ہندی فلم ''چار دن'' ملی۔ ایم صادق کی ہدایت میں شیام اور ثریا کی رومانٹک جوڑی کے ساتھ ان کا رول بے حد جاندار تھا۔ فلم کی زبردست پبلیسٹی کی گئی تھی۔ فلم خوب چلی۔ ۱۹۵۰ء میں ان کی دوسری بڑی فلم ''سرگم'' آئی۔ پی ایل سنتوشی کی اس فلم میں انھوں نے پہلی بار راج کپور کے ساتھ کام کیا تھا۔ ہیروئن تھیں ریحانہ اب وہ بے حد مصروف اداکار بن گئے تھے۔

۱۹۵۱ء میں جب اے وی ایم مدراس نے کرن دیوان کے ساتھ بالکل نئی ہیروئن وجینتی مالا کو اپنی فلم ''بہار'' میں پیش کیا تو اوم پرکاش کی کامیڈی نے اس فلم کو پر بہار بنا دیا۔ راجیندر کرشن کی بطور رائٹر اور گیت کار یہ پہلی فلم تھی۔ ایس ڈی برمن کی موسیقی اور شمشاد بیگم کے دل کش نغموں کی وجہ سے یہ فلم

زبردست کامیاب ہوئی اور پھر اوم پرکاش نے پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اس فلم نے انھیں ہندی فلموں کا کامیاب مزاحیہ اداکار بنا دیا۔ وہ ایک وقت میں پانچ پانچ فلموں کے معاہدے کرنے لگے۔ یہ دوراُن کا بے حد مصروف اور کامیابی کا دور تھا۔ فلم شائقین ایک بے حد شائستہ اور منجھے ہوئے کامیڈین سے واقف بھی ہوئے اور اس کی ادکاری سے لطف اندوز بھی ہوئے۔ ان کی کامیاب فلموں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔

۱۹۵۳ء میں انھیں فلم ''راشن کارڈ'' کی ہدایت دینے کا موقع ملا۔ پھر ۱۹۵۵ء میں انھوں نے سی۔ رامچندر کی موسیقی اور فلم سازی میں کرن دیوان۔ انیتا گوہا، کلدیپ، نادرہ، جانی واکر کو لے کر مزاحیہ فلم ''دنیا گول ہے'' ڈائریکٹ کی۔ انیتا گوہا کی پہلی فلم تھی۔ فلم ''چاچا زندہ باد'' ان کی ایک اور یادگار کامیڈی فلم تھی ۱۹۵۷ء میں انھوں نے بطور فلمساز ہدایت کار مدھو بالا بھارت بھوشن پردیپ کمار جانی واکر بھگوان کے ساتھ بے حد دلچسپ میوزیکل فلم ''گیٹ وے آف انڈیا'' بنائی۔ مدن موہن کی موسیقی سے سجی اس فلم میں اوم پرکاش نے لتا منگیشکر کی آواز کے عاشق کا رول ادا کیا تھا۔

پاچھی ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ وہ بھی اداکاری اور فلم سازی کے میدان میں اترے۔ کئی فلمیں بنائیں ان کی سب سے مشہور فلم ''اراؤنڈ دی ورلڈ'' تھی۔ راج کپور اور جے شری کی فلم میں پاچھی نے خود بھی کام کیا تھا۔

اوم پرکاش بہت اچھی اردو جانتے تھے۔ وہ خود بھی بہت اچھے رائٹر تھے۔ اردو میگزین میں ان کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے وہ نغمہ نگار بھی تھے اور اپنے نغموں کو کمپوز کر کے خود ہی گاتے تھے۔ کھانا پکانا اور فیملی کے علاوہ یار دوستوں کو کھلانا ان کا شوق تھا۔ اداکاری اور ہدایتکاری سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ اکثر ان سے ملنے لاہور اور کراچی سے ان کے دوست اور ان کو پسند کرنے والے آیا کرتے تھے تو ان کی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔ فلموں سے ہٹ کر لوگوں کو ہنسانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ انھیں بہترین کہانیاں ازبر تھیں جن میں ظرافت ہوتی وہ کہانیاں موقع نکال کر محفلوں میں پوری اداکاری اور تاثر کے ساتھ سنایا کرتے تھے۔ بلاشبہ یہ عادات انھیں ایک لازوال اداکار بنانے میں معاون ثابت ہوئیں کلاسیکل موسیقی پسند کرتے تھے۔ ہارمونیم اور طبلہ بجاتے تھے اور خود بھی بہت اچھا گاتے تھے۔ اسپورٹس سے انھیں دلچسپی تھی۔ فرصت کے

اوقات میں کرکٹ۔ ہاکی اور فٹ بال میچ بہت شوق سے دیکھتے تھے۔ فلمیں بھی اسی شوق سے دیکھتے تھے۔

وہ صرف ایک عظیم کامیڈین ہی نہیں تھے بلکہ سنجیدہ کردار بھی اتنی ہی جذباتیت سے ادا کرتے۔ ''ان داتا''، ''بڈھا مل گیا''، ''شرابی''، ''نمک حلال'' اور ان جیسی بہتری فلمیں ان کی لاجواب اداکاری کی گواہ بنیں۔

انھوں نے ہر دور شان سے گذارا وہ اپنی دنیا کے نرالے انسان تھے۔ اپنی فلمی اور غیر فلمی زندگی میں انھوں نے ہمیشہ ایک توازن قائم رکھا۔ سگریٹ ان کا شوق تھا۔ مگر شراب کو انھوں نے خود پر حاوی نہیں ہونے دیا۔

چیمبور میں انھوں نے اپنا ایک خوبصورت کاٹیج تعمیر کرایا تھا جسے خود اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا اس کاٹیج میں ان کی ہم مزاج بیوی اور بے حد خوبصورت بیٹی رہتی تھیں۔ وہ اس کاٹیج میں سارے تفکرات کو باہر ہی چھوڑ کر بہت سکون محسوس کرتے تھے۔ یہ کاٹیج ان کی جبلت کا آئینہ تھا جو ان کی شان وشوکت کے ساتھ ان کی گھریلو زندگی اور نفاست پسند طبیعت کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔

آخری عمر میں انھیں بلڈ کینسر ہو گیا تھا۔ ان جان لیوا بیماری نے اس وقت ان پر دھاوا بولا جب اعضاء مضمحل ہو چکے تھے۔ وہ زیادہ عرصہ اس موذی مرض کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اور ۲۱ رفروری ۱۹۹۸ء کو ۷۸ سال کی عمر میں ساری زندگی ہنسی بانٹنے والا اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب چھپائے چپ چاپ دنیا سے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

بالی ووڈ کا منفرد ایکشن کنگ۔ سنجے دت

تحسین اختر (مغربی بنگال)

ہندی فلموں کے چہیتے اداکار، آنجہانی سنیل دت کے اداکار بیٹے سنجے دت صحیح معنوں میں ہندی فلموں کے بہترین ایکشن کنگ کہے جا سکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں ایک بے حد سنجیدہ اداکار کا بھی درجہ دیا جا سکتا ہے کیونکہ انہوں نے اب تک اپنے اچھے فلمی کیریئر میں چند نہیں بلکہ کئی ایک اچھی فلمیں دی ہیں جس کی بنا پر سنجے دت کو ایک بہترین اور مکمل اداکار کہا جا سکتا ہے۔

سنجے دت کی یوں تو کھلنائک، مشن کشمیر، دیوار، ساجن، کرودھ، خطروں کے کھلاڑی، سمیت بہت سی اچھی فلمیں ہیں جو باکس آفس پر کامیاب ہیں لیکن سنجے دت کی ایک یادگار فلم سبھاش گھئی کی ہدایت میں بنی ''ودھاتا'' ہے جس میں اس نے دلیپ کمار، شمی کپور اور سنجیو کمار کے ساتھ کام کیا جب کہ اس فلم میں دلیپ، شمی اور سنجیو تینوں کی اداکاری انتہائی عروج پر تھیں اور ان تینوں کے درمیان اداکاری کرتے ہوئے سنجے دت نے اپنی ایک الگ اور پہچان رکھی۔

سنجے دت اپنی بہترین ہیروئن آج بھی مادھوری ڈکشت کو سمجھتے ہیں جس کے ساتھ انہوں نے ساجن اور کھلنائک جیسی دو سپر ہٹ فلموں میں کام کیا۔ ایک طرف کھلنائک میں جہاں وہ ایک خطرناک دہشت گرد اور قاتل کا رول ادا کر کے اپنی اداکاری کے آگے جیکی شروف کو گم کر دیتے ہیں وہیں فلم ساجن میں انہوں نے ایک اپاہج کے رول میں بیحد عمدہ اور جذباتی اداکاری کی۔ فلم دیوار میں سنجے دت نے اکشے کھنہ اور امیتابھ بچن کے ساتھ کام کیا اور اس فلم میں بھی ان کی اداکاری کے آگے امیتابھ بچن جیسے سپر ہٹ اسٹار کمزور نظر نہیں آئے۔

۲۰۰۰ء میں سنجے دت کی ایک انوکھی فلم واستو آئی تھی اس فلم میں سنجے دت ایک معصوم نوجوان تھے اور ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے ان کے ہاتھ سے ایک قتل ہو جاتا ہے جس کے بعد پولیس سے چھپتے چھپتے ایک دن وہ ڈان بن جاتے ہیں اور بڑے بڑے پولیس افسران کے سامنے ہاتھ باندھے نظر آتے ہیں اس فلم میں بھی ان کی جذباتی اداکاری کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

۱۹۸۰ء میں سنیل دت نے اپنے بینر اجنتا آرٹس کے بینر تلے ایک فلم بنائی جس کا نام ''راکی'' تھا اس فلم میں انہوں نے سنجے کو پہلی مرتبہ ہیرو کے رول میں پیش کیا۔ فلم ایک نئی نسل کے نوجوان پر مشتمل تھی جو مختلف پریشانیوں اور انڈر ورلڈ کے لوگوں کی دشمنی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس فلم میں سنجے دت نے اپنی فلائٹینگ صلاحیتوں کی بل بوتے پر اپنی صلاحیت کا لوہا منوا لیا تھا۔ فلم کی کامیابی نے سنجے کو سپر اسٹار بنا دیا۔ سنجے دت کی بہن نمرتا کی شادی راجندر کمار کے اداکار بیٹے کمار گورو کے ساتھ ہوئی اور راجندر کے بھائی نریش (گورا کالا) نے سنجے دت اور کمار گورو کو لے کر ایک فلم ''نام'' بنائی جس میں نوتن نے دونوں کے ماں کا رول ادا کیا تھا۔ یہ فلم گولڈن جبلی ثابت ہوئی اور فلم کے آخری سین میں جب سنجے پولیس کی گولی لگنے کے بعد ہلاک ہو جاتا ہے اور کمار گورو غیر ملک سے اس کی راکھ لے کر اپنی ماں کے پاس پہنچتا ہے تو وہ سین بہت جذباتی تھا۔

فلم کرودھ میں اس نے سنی دیول کے ساتھ کام کیا اور سنی دیول جو مار پیٹ اور خطرناک سین کا کنگ ہے اس فلم میں وہ سنجے دت کے غصّے اور قتل کرنے کے جوش کے آگے بالکل پھیکا پڑ جاتا ہے۔

فلم مشن کشمیر سنجے دت کی زندگی کی ایک یادگار فلم ہے جس میں اس کا اکلوتا بیٹا کشمیر کے جہادیوں کے ساتھ مل کی تخریبی کاروائیوں میں ملوث ہو جاتا ہے اس فلم میں سنجے دت ایک فرض شناس پولیس افسر کے رول میں بے حد متاثر کرتے ہیں جب انہیں خود اپنے بیٹے (ریتک روشن) کو گولی مار دینی پڑتی ہے۔ اس فلم میں سنجے کی جذباتی اداکاری لاجواب رہی تھی۔

اس وقت سنجے دت ایک مرتبہ پھر سے ''لمحہ'' فلم میں مرکزی کردار ادا کر رہے ہیں اور موضوع تقریباً مشن کشمیر جیسا ہے اس فلم میں بھی سنجے دت سے امید کی جا رہی ہے کہ وہ اپنی سنجیدہ اداکاری کے ذریعہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیں گے۔ سنجے دت نے کئی مرتبہ مزاحیہ فلموں میں بھی سلمان خان، گووندہ کے ساتھ کام کیا ہے اور اس کی مزاحیہ فلمیں بھی بے حد کامیاب رہی ہیں جس میں چل بھائی چل اور ایک گیارہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

سنجے دت کی زندگی میں ایک نیا موڑ اس وقت آیا جب ۱۹۹۳ء میں انہیں بی جے پی حکومت نے گھر میں اے کے 47 رائفل رکھنے کے جرم میں گرفتار کرا دیا تھا۔ اس موضوع پر

مزید بحث کی ضرورت اس لئے نہیں کہ وہ کیس اب بھی عدالت میں زیرِ سماعت ہے ویسے اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس کی گرفتاری سے پہلے اس کی فلم کھلنا ئیک ریلیز ہوئی تھی جس میں اس نے ایک دہشت گرد کا رول کیا تھا اور اسی بنا پر ان کی شخصیت کو دہشت گرد کے طور پر دیکھا جانے لگا جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سنجے بابا ایک نہایت ،معصوم ،غریب پرور اور حساس انسان ہیں اور انہوں نے اپنی زندگی میں شاید ایک چیونٹی کو بھی نہ مارا ہو۔

۲۰۰۵ء میں سنجے دت تمام سپر اسٹاروں کے رہتے ہوئے بھی اس وقت سپر اسٹار بن گئے جب ارشد وارثی کے ساتھ ان کی فلم ''منّا بھائی ایم بی بی ایس'' ریلیز ہوئی ، یہ ایک بھرپور کامیڈی فلم تھی جس میں سنجے دت اور ارشد وارثی نے ناظرین کو ہنساتے ہنساتے پاگل کر دیا تھا۔منّا بھائی سیکوئیل بھی بنی اور کامیاب ہوئی اور لوگوں نے سنجے عرف سنجو بابا کو ایک بے حد کامیاب اداکار کے طور پر تسلیم کرلیا۔ سنجے دت نے فلم ''پنا'' میں بے حد جذباتی اداکاری کی تھی اور بدقسمتی سے یہ فلم فلاپ ہوگئی مگر اس کی اداکاری کا لوہا سبھی نے تسلیم کرلیا۔

☆☆☆

باصلاحیت اداکار۔راج ببّر

خواجہ احمد حسین (مغربی بنگال)

راج ببّر ۱۹۸۰ء کے دہائی میں پہلی مرتبہ پونم ڈھلون کے ساتھ ایک اوسط درجے کی فلم میں نظر آئے لیکن راج ببّر کی خوبصورتی اور بہترین جسامت مگر سپاٹ چہرے کے باوجود لوگوں نے راج ببّر کو پسند کیا۔اسی زمانے میں بی آر چوپڑہ راج ببّر کو اپنی یادگار فلم ''نکاح'' میں پاکستانی اداکارہ وگلوکارہ سلمیٰ آغا کے ساتھ پیش کیا اور اس فلم کے سپر ہٹ ہونے کے بعد راج ببّر کو فلمیں ملنے لگیں ۱۹۸۱ء میں راج ببّر نے فلم ''اعتبار'' میں ویلین کا رول نبھایا، فلم تو زیادہ کامیاب نہیں ہوئی مگر بحیثیت ایک ویلین کے راج ببّر کی اداکاری بے حد پسند کی گئی اور اس زمانے میں جب کہ پران ،جیون وغیرہ کا دور ختم ہو چکا تھا اور فلم سازوں کو ایک بہتر قد آور اور خوبصورت چہرے وجسم کے مالک ویلین کی اشد ضرورت تھی جو کام کبھی روپیش کمار کیا کرتے تھے مگر ویلین سے زیادہ تیسری قسم کے مخلوق نظر آتے تھے،لہٰذا راج ببّر کو ویلین کے طور پر پسند کیا گیا اور بی آر چوپڑہ نے اپنی ناقابل فراموش فلم ''انصاف کا ترازو'' میں راج ببّر کو زینت امان اور کمسن پدمنی کولہا پوری کے ساتھ لیا، اس فلم میں راج ببّر دونوں بہنوں زینت اور پدمنی کی آبروریزی کرتا ہے اور فلم کے آخر میں زینت اُسے ریوالور سے ہلاک کر دیتی ہے اس فلم میں راج ببّر نے ایک ایسے جنونی جنسیت کا مارا SADIST کا رول نبھایا کہ اس کے رول کی تعریف پران اور جیون جیسے ویلینوں نے بھی کی۔

راج ببّر نے گوونده اور چنکی پانڈے کے ساتھ فلم ''آنکھیں'' میں بھی ایک خطرناک ویلین کا رول نبھایا، فلم ہم پانچ میں متھن چکرورتی ،سنجیو کمار دیپتی نول اور امریش پوری کے ساتھ کام کیا۔ اور اپنی مرحومہ دوسری وائف اداکارہ سمیتا پاٹل کے ساتھ ایکشن فلم ''وانٹیڈ'' میں بھی ہیرو کا رول نبھایا راج ببّر کی بیٹی بھی ایک فلم میں ہیروئن بن کر آئی مگر فلم کی زبردست ناکامی نے اسے واپس ہونے پر مجبور کر دیا۔ حالیہ سپر ہٹ فلم ''فیشن'' میں راج ببّر نے پرینکا چوپڑہ کے باپ کے رول میں مختصر کردار نبھایا۔راج ببّر کی ایک یادگار فلم سنی دیول ،موسمی چٹرجی اور امریش پوری کے ساتھ ''گھائل'' بے حد مشہور فلم ثابت ہوئی تھی جس میں سنی دیول اپنے بڑے بھائی راج ببّر کے قتل کا امریش پوری سے بڑا بھیانک انتقام لیتا ہے۔

فلم گھائل کو اس اعتبار سے بین الاقوامی حیثیت کا حامل فلم قرار دیا گیا کہ اس فلم میں راج ببّر نے ایک انتہائی شریف انسان کا رول کیا اور جس وقت وہ امریش پوری کے خونی جال میں پھنس جاتا ہے اور جس مجبوری کے عالم میں اپنے بھائی کو فون کرتا ہے اس وقت اس کی بے بسی اور مظلومیت پر ناظرین کی آنکھیں ڈب ڈبا جاتی ہیں۔ گھائل میں بھلے ہی راج ببّر کا رول مختصر ہو لیکن وہ اپنے اس مختصر سے رول کے باوجود ناظرین کو بے حد متاثر کرتے ہیں۔

چند سال قبل بابی دیول، کاجول کی ایک فلم ''گپت'' ریلیز ہوئی تھی اور اس سسپنس سے بھرے فلم میں راج ببّر نے بابی دیول کے باپ کا رول ادا کیا تھا اس فلم میں بابی دیول پر اپنے باپ کے قتل کا الزام عائد ہو جاتا ہے، اس فلم میں بھی راج ببّر نے مختصر سے رول کے باوجود متاثر کیا تھا۔

۱۹۹۰ء میں متھن چکرورتی، عائشہ جلکا کے ساتھ ایک فلم ''دلال'' ریلیز ہوئی تھی اس فلم میں دلالوں کے سردار کے رول میں راج ببّر نے اپنی اداکاری سے بے حد متاثر کیا تھا۔ اس کے علاوہ فلم آنکھیں جس میں گووندہ، چنکی پانڈے نیلم تھے اس فلم میں راج ببّر کا ڈبل رول تھا اور وہ اپنے دونوں رول میں بے حد کامیاب رہے، خاص طور پر بد معاش کے رول میں انہوں نے اپنی اداکاری کے ذریعہ جان ڈال دی تھی۔ اسی دور کی ریلیز فلم ''ضدّی'' جس میں سنی دیول تھے اس فلم میں راج ببّر نے ایک خطرناک مافیا ڈان کے رول میں بے حد متاثر کیا تھا۔ اس فلم میں سنّی دیول بے حد ڈیشنگ رول میں تھے لیکن راج ببّر بھی اپنے مختصر رول میں پوری فلم میں چھا گئے تھے۔

☆☆☆

قادر خان۔ ہندی سنیما کا ایک کامیاب مکالمہ نگار

محمد جاوید مولا

ہندستانی فلمیں مکالموں کے بغیر ادھوری ہیں حالانکہ ''عالم آرا'' سے قبل کئی فلمیں آئیں جو خاموش کہلائیں اور چلی بھی مگر آج کے زمانے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بولتی فلموں میں جان ڈالنے کا کام جہاں نغمہ نگاروں نے کیا وہیں اسے بولنے کا ہنر وسلیقہ مکالمہ نگاروں نے کیا اور اس میں کوئی دورائے نہیں کہ فلموں کو کامیاب کرنے میں اردو جیسی شیریں اور میٹھی زبان کو ذریعہ بنانا مکالمہ نگاروں نے اپنا فرض سمجھا۔

مکالمہ نگاروں میں ابتدا میں خواجہ احمد عباس، ابرار علوی، کمال امروہوی، اختر الایمان، وجاہت مرزا اور ستر کی دہائی میں سلیم جاوید کی جوڑی نے تہلکہ مچا دیا تھا جب صرف انہی کے نام پر فلمیں کامیاب ہوا کرتی تھیں۔ اسی دوران ایک اور نام آہستہ آہستہ اپنے معنی خیز اور جاندار مکالموں کے ذریعہ ہر خاص و عام کو اپنی جانب متوجہ کئے ہوئے تھا کوئی اور نہیں وہ فلم اداکار قادر خان تھے۔ اپنی پہلی فلم ''جوانی دیوانی'' سے حالیہ ریلیز فلم ''کھلم کھلا پیار کریں گے'' تک جاری و ساری ہے۔ قادر خان نے بحیثیت اداکار ہندستانی فلم صنعت میں اپنی شناخت قائم کر لی مگر چونکہ فلموں میں آنے سے قبل طالب علمی کے دور میں صابو صدیقی کالج میں ڈرامے کھیلتے تھے۔ اور اپنے ڈرامے خود لکھا کرتے تھے، اس لئے فلموں میں مکالمے لکھنا انہیں مشکل نہیں تھا۔ سب سے پہلے قادر خان نے مکالموں سے متاثر ہو کر افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی اور ان کے فرزند نریندر بیدی جو ایک فلم ''جوانی دیوانی'' بنا رہے تھے۔ قادر خان کو مکالمہ لکھنے کے لئے رضامند کیا۔ یہ فلم تو نہیں چلی مگر بحیثیت قادر خان مکالمہ نگار چل پڑے۔ فلم ''روٹی'' کے لئے قادر خان نے نہ صرف خوبصورت و جاندار مکالمے لکھے بلکہ شاید پہلی بار کسی مکالمہ نگار نے اپنے مخصوص انداز میں مکالمہ ریکارڈ کر کے دیا۔ یہ فلم زبردست کامیاب ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ہر ہدایت کار کی اولین پسند قادر خان قرار پائے۔ امیتابھ بچن کی فلم ''امر اکبر انتھونی'' کا مکالمہ لکھا۔ اس فلم کے تمام مکالمے کیسٹ میں ریکارڈ کر کے قادر خان نے دیئے۔ اور وہ فلم سال کی بڑی ہٹ فلم ثابت ہوئی۔ پرورش، نصیب، دیش پریمی، قلم، مرد وغیرہ کے مکالمے قادر خان نے لکھے۔ ان سے متاثر ہو

کرفلمساز ہدایت کار پرکاش مہرہ سلیم جاوید کو چھوڑ کر قادر خان کو اپنی فلمیں اور اداکار امیتابھ بچن کے لئے لکھنے کو کہا۔ قادر خان نے پرکاش مہرہ کی فلم ہیرا پھیری، خون پسینہ، نمک حلال، شرابی اور مقدر کا سکندر جیسی کامیاب فلمیں دیں اور اتفاق سے یہ فلمیں امیتابھ کی پسندیدہ فلمیں قرار پائیں۔

امیتابھ بچن سے لے کر تمام ہی اداکاروں کو مکالمے قادر خان نے ریکارڈ کر کے دیئے تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ امیتابھ بچن کو سلیم جاوید کے بعد آپ نے مکالموں کے ذریعہ کامیابی دلائی۔ اس بارے میں ان کا کہنا ہے ''میرے مکالمے سونا تھے جسے امیتابھ بچن نے اپنی آواز کے ذریعہ زیور بنایا، مجھے امیتابھ جی کے ساتھ کام کر کے لطف آیا، میں نے ان کے مکالموں کی ادائیگی میں بہت مدد کی۔'' جب یہ پوچھا گیا کہ دلیپ کمار نے آپ کے مکالمے ادا کئے تو آپ کو کیسا لگا؟ انھوں نے کہا ''جب میں مکالمے لکھتا ہوں تو یہ نہیں دیکھتا کہ کس اداکار کے لئے لکھ رہا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دلیپ کمار صاحب نے جب میرے مکالمے ادا کئے تو یقیناً خوشی ہوئی۔ وہ جنوب کی فلموں میں ذومعنی مکالمے لکھنے لگے جس سے ان پر تنقید کی جانے لگی اور ان کے گھر والوں کے منع کرنے پر انھوں نے ایسے مکالمے لکھنے بند کر دیئے اور بعد میں جیسی کرنی ویسی بھرنی، دریا دل، پیار کا مندر جیسی صاف ستھری۔ کامیڈی میں طنز کو ترجیح دینے لگے۔ قادر خان کو اپنی فلمی اداکاری اور مکالموں کی مناسبت سے فلم آج کا دور، انگار، جیسی کرنی ویسی بھرنی، دریا دل بہت پسند ہے۔ آج کل کم لکھنے سے متعلق وہ کہتے ہیں ''جب تک ہم جیسے لوگ لکھنا بند نہیں کریں گے، نئے لکھنے والے کیسے آئیں گے، اس کے علاوہ آج کے فلمساز وہدایت کار اردو اور ہندی سمجھ نہیں پاتے۔ انہیں زبان سے نہیں منافع سے سروکار ہے۔ ان پر تو بالی ووڈ کا بھوت سوار ہے۔'' امسال دو فلمیں ایک کرن راز داں اور ایک فلم کا مکالمے فلم ''تو سی گریٹ ہو پاپا جی کے لئے پاکستانی ڈرامہ اداکار عمر شریف اور ہندوستانی سابق کرکٹر نوجوت سنگھ سدھو کے لئے لکھ رہے ہیں۔ اس میں پہلی بار قادر خان، عمر شریف کے ساتھ کامیڈی کی جگل بندی کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔

☆☆☆

فلموں کا جینٹل مین اداکار۔ شاہ رخ خان

رشید انجم

پیدائش: ۲/نومبر ۱۹۶۵ء نئی دہلی۔ تعلیم: کمیونیکیشن میں ماسٹر ڈگری۔

والد: تاج محمد۔ انتقال ۱۹۸۱ء والدہ: فاطمہ بیگم۔ آکسفورڈ یونیورسٹی لندن سے اعلیٰ تعلیم یافتہ، پیشے سے مجسٹریٹ۔ انتقال: ۱۹۸۱ء، بہن: شہناز۔ بیوی: گوری چھبّر۔ شادی: ۲۵/اکتوبر ۱۹۹۱ء۔ بیٹا: آرین۔ ۱۳/نومبر ۱۹۹۳ء

بیٹی۔ سُہانا۔ ۲۲/مئی ۲۰۰۰۔ شوق۔ کمپیوٹر پر گیم کھیلنا۔

شاہ رخ خان کا بچپن اور جوانی کا ابتدائی دور نئی دہلی میں بسر ہوا۔ اکونومکس کے طالب علم تھے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ماس کمیونیکشن سے انھوں نے ماسٹر ڈگری حاصل کی تھی کچھ عرصہ انھوں نے دریا گنج دہلی میں ایک ریسٹورینٹ بھی چلایا اور مٹی کا تیل بھی بیچا۔

شاہ رخ خان کا تعلق بھی دلیپ کمار اور راج کپور کی طرح پیشاور سے رہا۔ ان کے والد تاج محمد جنگِ آزادی کے مجاہد تھے۔ ان کا نام کم عمر فریڈم فائٹر میں سرِ فہرست رہا۔ آزادی ملتے ہی ۱۹۴۷ء میں وہ ہندستان آگئے اور دہلی میں رہائش پذیر ہو گئے۔ تاج محمد ۱۹۴۲ء میں جب لاہور کے ایک اسکول میں ۱۲ ویں کلاس کے طالب علم تھے تو بھارت چھوڑ وتحریک میں حصہ لیا اور انگریزوں کے خلاف نعرے اور تقریر کرنے کے جرم میں گرفتار کر لئے گئے۔ شاہ رخ کے چچا غلام محمد کا خاندان ابھی بھی پشاور کے قصبہ خوانی بازار کے اسی مکان میں رہتا ہے۔ شولی تل علاقے کا وہ پشتنی مکان ماضی کی یادگار رہے اور شاہ رخ کو اس پر فخر ہے۔ شاہ رخ کے بہنوئی نے اپنے بڑے بیٹے کا نام شاہ رخ خان ہی رکھا ہے۔ والد تاج محمد گاندھی وادی ضرور تھے لیکن انقلابیوں کا بہت احترام کرتے تھے۔ کھودی رام بوس، سبھاش چندر بوس، بھگت سنگھ کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد ان کے نزدیک قابلِ تعظیم شخصیات تھیں۔

شاہ رخ کا رجحان طالب علمی سے ہی لطافت کی جانب تھا۔ اسکول اور کالج کے اسٹیج پر پرفارم کرتے تھے اور اپنی بیوی گوری چھبّر سے عشق بھی۔ یہ عشق اس جوانی کی اپھان کا جنون خیز

عشق تھا جب وہ ۱۹ سال کے اور گوری محض سولہ سال کی تھی ۲۰۰۵ء میں برٹین کے صحافی خاتون نسرین منی کبیر نے SHAHRUKH KHAN'S INNER/OUT WORLD سے ایک دستاویز فلم تیار کی تھی۔اس فلم کے مطابق ۱۹ سال کی عمر میں پہلی بار ۱۴ سالہ گوری چھبّر سے ملے تو عشق کے دیوتا کیوپڈ نے دونوں کو احساس دلایا کہ وہ ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں۔تب شاہ رخ اکونومکس کے طالب علم تھے اور گوری تاریخ کی طالبہ۔شاہ رخ کا مضمون نہ ہوتے ہوئے بھی وہ تاریخ کے نوٹس تیار کر کے گوری کو دیتے کہ کچھ تو بحرِ ملاقات چاہیئے۔شاہ رخ کچھ اور Possitive ہوئے تو گوری نے فاصلے بڑھا دئے کہ حسن کا یہ بھی ایک انداز ہے دیوانہ بنا دینے کا۔یہ سلسلہ دو سال تک قائم رہا۔والد اور والدہ انتقال کر چکے تھے۔مذہب کی کوئی آڑ اور رسم ورواج کی پابندیاں دیوانگی کے آگے ہمیشہ ریت کی دیواریں ثابت ہوتی رہی ہیں۔گوری جب ۲۱ سال کی ہوگئی تو دونوں نے گوری کے والدین کی رضا مندی سے ہندو رسم ورواج کے مطابق ۲۵ر اکتوبر ۱۹۹۱ء میں شادی کر لی۔پھر بعد میں سول میرج بھی ہوگئی۔شاہ رخ پہلے گھوڑی پر اور پھر ہاتھی پر چڑھ کر سسرال گئے تھے۔اس دستاویزی فلم کے مطابق شاہ رخ اتنے خوش تھے کہ ایک کلومیٹر تک خود بھی ناچتے ہوئے گئے تھے۔

اپنی شادی سے قبل انھوں نے ٹی وی سیریلس سے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا آغاز کیا تھا۔نیشنل چینل تب سب سے پہلے اور فعال چینل ہوا کرتا تھا۔انھیں سب سے پہلے بریک ٹی وی سیریل ''دل دریا'' (ہدایت: لیکھ ٹنڈن) میں ملا لیکن سکھ نوجوان کا رول ہونے کی وجہ سے کوئی انھیں پہچان نہیں سکا اس سے بھی قبل انھیں شنکر ناگ کے مشہور سیریل ''واگلے کی دنیا'' میں دیکھا گیا تھا۔اس میں وہ صرف چند سکنڈ کے لئے آتے تھے جس کا معاوضہ انھیں پانچ سو روپیے فی ایپی سوڈ ملتا تھا۔

اس کے بعد ''فوجی'' عزیز مرزا کا سیریل ''سرکس'' اور لیکھ ٹنڈن کے سیریل ''دوسرا کیول'' میں شاہ رخ خان کی پہچان قائم ہوئی۔شادی کے بعد بالیووڈ نے انھیں اپنی جانب راغب کرلیا پہلی بار منی کول کی فلم ''ایڈیٹ'' (۱۹۹۱ء) میں انھیں مرکزی کردار ملا مگر فلم ناکام رہی۔اسی سال ہیما مالنی نے اپنی فلم ''دل آشنا ہے'' میں انھیں موقع دیا لیکن بات نہیں بنی۔شاہ رخ کے سامنے فنِ اداکاری کا ایک سمندر موجزن تھا۔انھوں

نے اس سمندر سے ایک نایاب موتی منتخب کیا اس موتی کو اپنی صلاحیت کے گلے میں تعویز کی مانند پہنا اور ۱۹۹۲ء میں جب ان کی فلم ''دیوانہ'' ریلیز ہوئی تو ایک نوعمر دلیپ کمار، شاہ رخ کے وجود میں پردۂ فلم پر منعکس ہوا تھا۔فلم کامیاب ہوئی تو شاہ رخ میں اعتماد آگیا مگر انھیں کسی کی کاربن کاپی بننا منظور نہیں ہوا۔بہت غور کے بعد انھوں نے اپنی ایک کمزوری کو اپنی خوبی میں بدلنے کا فیصلہ کرلیا۔آغاز میں وہ بہت نروس ایکٹر تھے۔کیمرے کا سامنا کرتے ہی ہکلانے لگتے تھے۔یہی لکنت ان کی آئندہ فلموں کی کامیابی کی ضامن بنی۔لوگ ان کی اس کمزوری سی خوبی کے دیوانے ہوگئے اور وہ خود کو بہت آسانی مگر ذہانت کے ساتھ کاربن کاپی بنانے سے بچ نکلے اور پھر کسی نے ان پر دلیپ کمار کی پرچھائیں ہونے کا الزام نہیں لگایا۔۱۹۹۲ء میں ہی ''چمتکار'' ''راجو بن گیا جنٹل مین'' ''مایا میم صاحب'' ریلیز ہوئیں۔عزیز مرزا نے ''راجو بن گیا جنٹل مین'' میں اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا۔۱۹۹۳ء میں ''کنگ انکل'' کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ پائی۔اسی سال لیش چوپڑہ کی فلم ''ڈر'' اور عباس مستان کی فلم ''بازی گر'' نے شاہ رخ کو اپنے ایک ایک پرستار کے نزدیک کردیا۔نگیٹو ہوتے ہوئے بھی شاہ رخ کو ہیرو شپ کا وہ منصب ملا جس پر وہ آج بھی بڑی آن اور شان سے بیٹھے ہوئے ہیں۔اسی سال ان کی فلم ''کبھی ہاں کبھی نا'' نرم گئی۔۱۹۹۴ء میں پھر ''بازیگر'' کے کردار کو فلم ''انجام'' میں انھوں نے دہرایا مگر ۱۹۹۵ء میں راکیش روشن کی فلم ''کرن ارجن'' میں سلمان خان کے مقابل انھوں نے اپنے بھرپور اداکارانہ کمالات کا مظاہرہ کیا اور یہیں سے ان کا جوڑی کا جول کے ساتھ ہٹ مان لی گئی۔۱۹۹۵ء میں ہی ان کی ۶ فلمیں ریلیز ہوئیں ''زمانہ دیوانہ'' اور ''ڈارلنگ یہ ہے انڈیا''۔''گڈو، دل، دل والے دلہنیا لے جائیں گے''۔''رام جانے'' اور ''تریمورتی'' ۵ فلمیں ناکام رہیں لیکن ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' کی زبردست کامیابی نے ۵ فلموں کی ناکامی کا داغ دھو دیا اور شاہ رخ ہر نوجوان لڑکے اور ہر نوعمر لڑکی کا آدرش بن گئے۔

لیش چوپڑہ کی ''محبتیں'' سے ان کا ساتھ امیتابھ بچن سے ہوا جو ''کبھی خوشی کبھی غم'' سے فلم ''کبھی الودع نہ کہنا'' تک قائم چلا آرہا ہے۔وہ امیتابھ بچن کی بے حد عزت کرتے ہیں کہ وہ ان کے نہ صرف سینئر بلکہ بہترین اداکار ہیں یہاں تک کہ انھوں نے امیتابھ کی گذری لاجواب فلم ''ڈان''۔(ہدایت: چندر بارٹ ۱۹۷۸ء) کی ری میک فلم ''ڈان'' (ہدایت: فرمان اختر ۲۰۰۶ء) میں امیتابھ کا Challenging رول بہت بھروسے سے ادا کیا اس طرح وہ دلیپ کمار کے بھی بڑے پرستار ہیں۔یہاں تک کہ وہ ان کی قدمبوسی کو اپنی

سعادت مانتے ہیں۔فلم ''دیوداس'' (۱۹۵۶ء۔ ہدایت بمل رائے) کو جب سنجے لیلا بھنسالی نے دوبارہ بنایا تو شاہ رخ نے عقیدتاً ''دیوداس'' بننا قبول کیا۔اب یہ دوسری بات ہے کہ دونوں فلموں میں وہ فن کی کسوٹی پر کھرے نہیں اترے۔انھوں نے اپنا فلمی ادارہ بھی قائم کیا جس کے تحت ''ون ٹو کا فور'' ''پھر بھی دل ہے ہندستانی'' اور ''پہیلی'' جیسی فلمیں بنائیں مگر فلم سازی انھیں نہ تو راس آئی اور نہ فلمی معیار قائم کر پائی۔

شاہ رخ بہت منسکر المزاج اداکار ہیں۔غرور کا دور تک نام ونشان نہیں ملتا کبھی کسی اسکینڈل میں ان کا نام نہیں لیا گیا۔ان کی بیوی ان کی محبوبہ بھی ہے اور بچے ان کی کامیاب زندگی کا لازم حصہ ہیں۔

وہ عجیب اداکار ہیں جو ۵۰ کروڑ کے بنگلے میں رہ کر ہندوستان کی فلم صنعت کے سب سے بڑے اداکار اور کنگ خان کا مرعوب کن لقب پا کر بھی کہتے ہیں کہ وہ بچوں سے اداکاری سیکھتے ہیں اور ان کے پالتو کتے ان کے سب سے بھروسے مند مدرس ہیں۔

اور دسمبر ۱۹۹۷ء کو کولمبو میں گرینیڈ حملے میں بال بال بچے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ ان کے بچوں کا مقدر انہیں زندہ رکھنے کا باعث بنا۔اسی سال انھیں انڈر ولڈ سے جب جان سے مارنے کی دھمکی ملی تو وہ چند دنوں گھر تک محدود رہے لیکن پھر خوف کو پس پشت ڈال دیا۔اور مہیش بھٹ کی فلم ''بلیک کیٹ'' کی شوٹنگ میں مصروف ہوگئے جو کھلی سڑکوں پر ہوتی تھی۔ان کا کہنا تھا کہ خطرے بے حد رومانٹک بھی ہوتے ہیں اور ایڈونچر بھی۔

درمیانہ قد۔اوسط شکل وصورت معمولی آواز کے مالک میں کوئی ایسی ان چھوئی خوبی نہیں تھی جو اسے دنیا کی دوسری سب سے بڑی اور مضبوط فلم انڈسٹری کا بے تاج بادشاہ بنا دیتی مگر مقدر کی راہوں پر شاہ رخ نے اپنی فنکارانہ جہد سے کامیاب سفر طے کیا اور آج وہ اس مقام پر آ ٹھہرے ہیں جہاں دور دور تک کوئی ان کا مقابل نہیں ہے۔یہ وہی دور ہے جو ۵۰ اور ۶۰ کی دہائی میں دلیپ کمار، راج کپور اور دیو آنند کا دور تھا۔وہ تینوں بھی کبھی ایک دوسرے کے مقابل نہیں رہے اور اس دور میں شاہ رخ خان۔سلمان خان اور عامر خان ایک دوسرے کے مقابل ہوتے ہوئے بھی اپنی اپنی راہوں کے کامیاب ہم سفر ہیں اور ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں۔ان میں ایک چوتھا خان بھی شامل ہے سیف علی خان جو بہت توازن سے اپنا چوتھا مقام پائے بنا کامیابی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔۵۰ اور ۶۰ کی دہائی میں بھی چوتھے کمار، اشوک کمار کو کبھی چوتھا مقام نہیں ملا تھا۔شاید اس لئے وہ سینئر تھے۔فرق اتنا ہے کہ اس دور میں سیف علی خان جونیئر ہیں۔

امریکی میگزین فوربس کے مطابق شاہ رخ آج دنیا کے سب سے مقبول ستاروں میں شمار ہوتے ہیں ان کی گنتی ہالی ووڈ کے سپر اسٹار نام کروز کے ساتھ کی جاتی ہے۔اسی طرح لندن کے میگزین دی گارجین کے سروے کے مطابق انھیں ورلڈ سنیما کا ممتاز ترین اداکار مانا گیا ہے۔

ایک اندازے کے مطابق ان کی آمدنی بیس ہزار روپیے فی گھنٹہ ہے یعنی وہ ہر ایک منٹ میں تقریباً تین سو روپیے کما لیتے ہیں۔ایک فلم کا پانچ کروڑ لیتے ہیں۔ایڈس اور اسٹیج پرفارمینس کی بے تحاشہ آمدنیات ان کے علاوہ ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ ایڈ سے وہ ہر لمحہ اپنے پرستاروں کی نگاہوں میں رہتے ہیں آج وہ ۴۱ سال کے ہو چکے ہیں۔یہ عمر جذبوں، امنگوں اور جوش میں ٹھہراؤ کی عمر ہوتی ہے اسی عمر میں بردباری اور سنجیدگی بھی مزاج پر حاوی ہوتی ہے اور یہیں سے نشیب کا سفر شروع ہوتا ہے۔

کنگ خان یعنی بادشاہ خان بلاشبہ ایک منفرد اداکار ہیں۔انھیں یہ اعزاز ملنا ہندوستانی سنیما کا اعزاز ہے۔فنِ اداکاری کا اعزاز ہے اور شاہ رخ خان کو اب مڑ کر دیکھنے اور ٹھہر کر سوچنے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔وہ اس مقام سے بہت آگے نکل چکے ہیں جہاں روشنی سورج کی نہیں سورج روشنی کا طلبگار ہوتا ہے۔ کے بی سی تین میں وہ امیتابھ کی جگہ لینے جا رہے ہیں جس کا معاوضہ ۳۰ لاکھ فی اپی سوڈ طے پایا ہے یعنی کل سال بھر کا معاوضہ ۳۲ کروڑ ملے گا۔شاہ رخ پھر سے بڑے پردے سے اسی چھوٹے پردے پر آ رہے ہیں جہاں سے انھوں نے ۵۰۰۰ روپیے سے سفر شروع کیا تھا اور اب جو ۳۰ لاکھ تک پہنچ گیا ہے۔

☆☆☆

ہندی اور بنگلہ فلموں کا محبوب اداکار۔متھن چکرورتی

ڈاکٹر شاہد محمود

متھن چکرورتی بھی ۱۹۷۰ء کی پہچان ہے۔کولکاتا میں نکسلی تحریک سے وابستہ متھن چکرورتی پولیس کے خوف سے ممبئی بھاگ گئے تھے اور روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے جب بنگال کے فلمساز وہدایتکار اتپل دت نے جو کہ بہترین اداکار بھی تھے انہیں ڈھونڈ نکالا اور انہیں اپنی فلمسازی ۱۹۷۱ء میں فلم ''مرگیہ'' میں پیش کیا،فلم بہت ہی کلاسیک تھی اور متھن چکرورتی کی اداکاری سبھوں کو پسند آئی، پھر وہ مدراس کی اسسٹنٹ فلموں میں کام کرنے لگے جس میں گن ماسٹر جی نائن بیحد مقبول فلم ثابت ہوئی۔اس کے بعد متھن بہترین ڈانسر اور بہترین فائیٹ کنگ کراٹے اور جوڈو اسٹائل کے فائٹ کی وجہ سے بیحد مشہور ہوئے اور اسی دوران انہیں فلم ''ہم پانچ'' میں کام کرنے کا موقع ملا جس میں راج ببّر،سمیتا پاٹل، امریش پوری وغیرہ تھے اور بہت ہی خصوصی رول میں سنجیو کمار تھے اور اس فلم میں سبھوں کی اداکاری اپنی جگہ پر مناسب تھی لیکن متھن چکرورتی کی اداکار نے سبھوں کو متاثر کیا،جس کے بعد متھن رومانی ہیرو کے طور پر ابھرے اور راجشری فلمز میں بھی رنجیتا کے ساتھ ہیرو بنے اور فلم گولڈن جبلی ثابت ہوئی،جس کے بعد متھن نے پیچھے مڑکر نہیں دیکھا اور بے تحاشہ فلموں میں کام کرنے لگے،فلم ہٹ ہو یا فیل اس سے انہیں کوئی غرض نہیں تھا،انہوں نے ہر طرح کی فلمیں کرنا شروع کیں۔

لیکن ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ان کی فلم ''ڈسکو ڈانسر''قسم پیدا کرنے والے کی ''ڈانس ڈانس'' نے انھیں سپر اسٹار بنادیا جب بہترین رقص سے مزین فلموں میں متھن نے راک ڈانسر کے طور پر اپنا لوہا منوالیا۔

متھن چکرورتی نے امیتابھ بچن کے ساتھ غیر معمولی فلم ''اگنی پتھ'' میں بھی کام کیا اور اس فلم میں مدراسی کے رول میں متھن نے اپنے رول میں جان ڈال دی تھی جب کہ اس فلم میں امیتابھ ایک ڈان کے رول میں تھے اور ان کے مقابلے میں متھن کی اگرچہ کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن پھر بھی لوگ متھن کو فلم اگنی پتھ میں فراموش نہیں کر سکتے۔متھن،امیتابھ اور ریکھا کی فلم ''دوانجانے'' میں بھی ایک سین میں تھے امیتابھ بچن کے لڑکے ابھیشیک بچن کے ساتھ بھی انہوں نے فلم ''گرو'' میں

ایک بہت ہی اہم رول ادا کیا تھا۔

متھن کی ایک فلم ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ''غلامی'' بھی ریلیز ہوئی تھی جس میں انہوں نے دھرمیندر، نصیر الدین شاہ،انیتا راج کے ساتھ کام کیا تھا اور ایک فوجی کے رول میں متھن نے اپنی اداکاری کا لوہا منوالیا تھا۔متھن کی فلم کمانڈر بھی بیحد مقبول ہوئی تھی۔متھن نے حالیہ ایک فلم ''اعلان'' میں مافیا ڈان کا رول بھی کیا جس میں جان ابراہم،اکشے کھنہ،لارا دتہ اور بپاشا باسو وغیرہ تھے۔اس وقت متھن زیادہ تر بنگلہ فلموں میں کام کر رہے ہیں اور بنگلہ فلمیں رحمت خان،سوکھونلکا،ٹارگٹ وغیرہ بیحد ہٹ فلمیں ثابت ہوئی ہیں۔متھن نے کشور کمار کی مطلقہ یوگیتا بالی سے شادی کی۔کولکاتا میں وہ ایک یتیم خانہ بھی چلاتے ہیں اور دو بچوں کو انہوں نے گود بھی لیا ہے کیوں کہ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہے۔اور متھن دا صحیح معنوں میں ایک اچھے اور اعلیٰ انسان ہیں۔

☆☆☆

ونود کھنّہ

فلم 'امرا کبرانتھونی' میں جب ونود کھنہ، امیتابھ بچن کو اپنے علاقے میں جا کر لڑائی کرنے کے لیے للکارتے تھے اور پھر جم کر ان کی دھنائی کر دیتے تھے تو سنیما ہال میں سیٹیاں بجنے لگتی تھیں۔ اس دور میں جب سپر اسٹار امیتابھ کا کریز سر چڑھ کر بول رہا تھا تب ونود کھنہ کو ان کے واحد حریف کے طور پر دیکھا جانے لگا تھا۔ دھرمیندر کے بعد اگر کسی ہیرو نے لڑکیوں پر 'اپنی میکو امیج' کا جادو چلایا تو وہ ونود کھنہ تھے۔ نہ جانے کیوں اس ستارے کو زندگی سے شکایت ہوئی اور اس نے گلیمر ورلڈ سے اچانک کنارہ کر لیا ورنہ ہو سکتا تھا کہ امیتابھ کی جگہ ونود کھنہ لوگوں کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہوتے۔

ایک ویلن کے طور پر اپنا کریئر شروع کرنے والے ونود کی زندگی میں ایسے کئی نشیب و فراز آئے اور وہ ان سب کے درمیان سے گزر کر اپنا راستہ تلاش کرتے رہے۔ انہوں نے فلمی دنیا میں کئی اننگ کھیلیں اور ہر بار خود کو ثابت کیا۔ ان کے مداحوں نے بھی ان کا دل سے استقبال کیا۔ ایک ویلن اور پھر ہیرو سے لے کر سیاست داں تک، ریل لائف سے ریئل لائف میں ونود نے ہر طرح کے کردار کا ذائقہ کر لیا ہے۔ گلیمر ورلڈ سے ان کا دل کھٹا بھی ہوا اور اسی دنیا نے انہیں لوٹ کر آنے پر دوبارہ بلندیوں پر بھی پہنچایا۔

'ہیرا پھیری'، 'پرورش' اور 'امرا کبرانتھونی' جیسی فلموں میں امیتابھ بچن کے ساتھ اداکاری کرنے سے لے کر پرسنالٹی تک میں ونود کہیں بھی ۱۹ ثابت نہیں ہوئے۔ انہوں نے ویلن اور ہیرو سے لے کر کیریکٹر آرٹسٹ والے رول بھی بخوبی انجام دیے۔ یہ ایک اہم بات ہے کہ فلمی دنیا میں اتنے مختلف کردار کرتے ہوئے بھی انہوں نے نہ تو کسی بھی کردار کے ساتھ ناانصافی کی اور نہ ہی ان پر ایک جیسے کرداروں میں بندھے رہنے کی مہر ہی لگی۔ سنیل دت نے جب اپنے بھائی سوم دت کو لانچ کرنے کے لیے فلم 'من کا میت' (۱۹۶۸ء) بنائی تو اس میں ونود کھنہ کو ویلن کا رول دے دیا۔ یہی فلمی دنیا میں ونود کھنہ کا پہلا قدم تھا۔ سوم دت تو خیر اس فلم کے بعد بھی گمنام ہی رہے لیکن ونود کھنہ راتوں رات نہ صرف فلمسازوں کے بلکہ فلم بینوں کے بھی دل پر چھا گئے۔ اس کے بعد انہوں نے کئی فلمیں ویلن کے طور پر ہی سائن کیں۔ اس میں 'میرا گاؤں میرا دیش'، 'رام پور کا لکشمن' اور 'آن ملو سجنا' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ گلزار نے انہیں اپنی فلم 'میرے اپنے' (۱۹۷۱ء) میں مینا کماری جیسی سینئر ہیروئن کے معاون کام کرنے کا موقع دیا اور اس رول نے ونود کھنہ کے فلمی کریئر کو نئی بلندیوں کو سر کرنے کا موقع دیا۔

ایک بیروزگار اور حالات کے مارے لیکن دل کے اچھے نوجوان کے طور پر ونود کھنہ ہر طبقے میں مقبول ہو گئے اور پھر تو ان کے پاس فلموں کے آفرس کا ڈھیر لگ گیا۔ 'میرے اپنے' والے سال میں ہی انہوں نے فلم 'ریشمہ اور شیرا' کی۔ اس سے پہلے وہ 'پورب اور پچھّم' اور 'سچا جھوٹا' میں بھی چھوٹا موٹا رول کر چکے تھے۔ انہوں نے ۱۹۷۳ء میں گلزار کی ہی ایک فلم 'اچانک' میں اپنی اداکاری سے فلم ناقدین کا دل بھی جیت لیا۔ یہ ایک بغیر گیتوں کی حقیقی کہانی پر مبنی تھریلر فلم تھی، جس میں ونود کھنہ نے ایک نیوی آفیسر کا رول بخوبی ادا کیا تھا۔ ۷۰ سے ۸۰ کی دہائی میں ونود نے 'قربانی'، 'ہاتھ کی صفائی'، 'دی برننگ ٹرین'، 'خون پسینہ' اور 'پرورش' جیسی کئی کامیاب فلمیں بنائیں۔ ۱۹۸۰ء کے دوران ہی ونود کا دل فلمی دنیا سے اچاٹ ہو گیا اور وہ اپنی بیوی گیتانجلی اور دو بیٹوں (اکشے اور راہل) کو چھوڑ کر وہ اوریگن (امریکہ) میں منتقل ہو گئے۔

۴ سال بعد وہ واپس فلمی دنیا میں لوٹے اور انہیں پہلے کی ہی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ انہیں فلمیں ملنی شروع ہو گئیں لیکن بقول ونود کھنہ شاید اس درمیان ان کی خود اعتمادی کچھ کمزور ہو گئی تھی، وہ گھنٹوں اپنے میک اپ روم میں بند ہو کر روتے تھے۔ کچھ لوگوں نے یہ افواہ بھی پھیلا دی کہ ونود کھنہ ذہنی طور پر بیمار ہو گئے ہیں، مگر تبھی اپنی فلموں کو کامیاب ہوتے ہوئے دیکھ کر ان کی خود اعتمادی پھر لوٹ آئی اور وہ ایک بار پھر فلم صنعت میں اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد اپنی بیوی سے طلاق لے کر انہوں نے کویتا دفتری سے دوسری شادی کر لی، جن سے ان کی دو اولاد ہیں۔ دوسری اننگ میں بھی ونود نے 'چاندنی'، 'لیلا'، 'دیاوان'، 'فرشتے'، 'شتریا'، 'دیوانہ پن'، 'رسک' اور جیسی کئی فلموں میں کامیاب اداکاری کی چھاپ چھوڑی اور ان کا سفر اب بھی جاری ہے۔

اس درمیان انہوں نے بطور فلم ساز اپنے بیٹے اکشے کو لانچ کرنے کے لیے 'ہمالیہ پتر' بھی بنائی۔ کبھی انہی ونود کھنہ نے اپنے انٹرویو میں کہا تھا کہ 'مجھے نیتا گیری کرنے کا شوق نہیں''۔ لیکن شاید وقت نے ان کی اس سوچ کو بدل دیا اور وہ سیاست کے میدان میں بھی اتر گئے۔ بی جے پی کے ساتھ جڑ کر وہ مسلسل تین بار ممبر پارلیمنٹ بنے اور مرکزی وزیر بھی رہے۔

(بشکریہ۔ امنگ۔ نوئیڈ)

☆☆☆

موجودہ ہندستانی سینما کے مقبول اداکار۔سلمان خان

رشید انجم

نام : سلمان خان
والدین: سلیم خان/سلیم
بھائی : ارباز خان اور سہیل خان
بہن : الویرا
پیدائش: ۲۷ر دسمبر ۱۹۶۵ء۔بمبئی
پہلی فلم بطور چائلڈ: ''بیوی ہو تو ایسی'' ۔۱۹۸۸ء ہیرو: فاروق شیخ۔ہیروئن ریکھا۔
پہلی فلم بطور ہیرو: ''میں نے پیار کیا'' ۱۹۸۹ء

سلمان خان موجودہ ہندوستانی سینما (ممبئی) کے مقبول ترین فلم اداکار ہیں۔انہیں Hotte st Selling Star کا خطاب دیا جاتا ہے۔اور یہ سچ بھی ہے،سلمان خان کی فلمیں منہ مانگے داموں میں فروخت ہوتی ہیں۔ان کی چاہت غیر محدود ہے۔اندرونِ ملک ہی نہیں بیرونِ ملک بھی ان کے لاکھوں پسند کرنے والے موجود ہیں۔نہ صرف لڑکیوں وہ لڑکوں میں بھی اتنے ہی مقبول ہیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ فلم صنعت کے انتہائی مقبول ترین ستارے شاہ رخ خان،سلمان خان اور عامر خان ایک ہی سال یعنی ۱۹۶۵ء کی پیدائش ہے۔صرف تاریخوں کا فرق ہے اور اگر تاریخوں کو شمار کیا جائے تو عامر خان اپنے دونوں ہم عصر فنکاروں سے عمر میں بڑے ثابت ہوتے ہیں۔۱۹۶۵ء کا سال جہاں زمین وآسمانی جنگ اور انتشار کا سال تھا تو ثقافت کا عروج کا سال بھی تھا۔اس اہم سال میں کئی فلمی ستارے مقبولیت کی انتہائی بلندی پر متمکن تھے اور ان کی فلموں میں رومانس،موسیقی اور کہانی کا دلکش سنگم شائقین کی وابستگی کا سامان بن رہا تھا۔کہا جاتا ہے کہ ساٹھ اور ستر کی دہائی میں جو موسیقی فلموں میں پیش ہوئی اور جو رومانس کہانی کی تثلیث کا عنوان بنا وہ بعد کی دہائیوں میں مفقود ہوگیا۔

اس سال پیدا ہونے والے ستارے جوانی کی کمان سنبھالتے تک تابش وتابنا کی کے منتظر رہے اور

جب پردۂ فلم نے ان کی کچی عمر کو فن کی گھاٹی پر کھا تو سینما نے ایک نئے دور کے آغاز کا ارتعاش محسوس کیا۔

سلمان خان کی تعلیم کا آغاز باندرہ میں واقع کرسچین اسکول سے ہوا۔ذہین تھے اس لئے تعلیم کے ساتھ اپنے ساتھیوں میں ہردل عزیز بھی ہوگئے۔اسپورٹس کے علاوہ انہوں نے تیراکی میں بھی مہارت حاصل کی مگر تعلیم مکمل نہیں کر سکے۔والد سلیم خان کا شمار فلم اسکرپٹ رائٹرز میں ہوتا تھا اور ان کی ہر فلم کامیابی کی منازل طے کر رہی تھی۔سلمان خان نے وقت گزاری کے لئے اپنے مکان واقع باندرہ کے نزدیک سی راک ہوٹل میں ملازمت اختیار کر لی مگر چونکہ خمیر سینما اور فلم سے تیار ہوا تھا اس لئے جلد ہی اُن کا رُخ سینما کی جانب ہوگیا اور ۱۹۸۸ء میں فلم ''فلک'' کے ہدایت کار ششی لال نائر کی شاگردی اختیار کر لی۔ابھی انھوں نے ہدایت کاری اور فلم میکنگ کے گُر سیکھے ہی تھے کہ فلم ''بیوی ہو تو ایسی'' (۱۹۸۸ء) میں لئے گئے۔اس فلم کے مرکزی کردار فاروق شیخ اور ریکھا تھے۔سلمان خان نے اس فلم میں فاروق شیخ کے نوعمر بھائی کا کردار ادا کیا تھا۔چونکہ یہ فلم ہوشربا جوانی اور ناقابلِ فراموش فن کی فہیمن ریکھا پر انحصار کرتی تھی،ظاہر ہے سلمان خان پر کسی کی نظریں ٹھہرتیں۔

۱۹۸۹ء میں ان کی زندگی کا وہ بہترین سال ثابت ہوا جس نے سلمان خان کو بطور ہیرو ہی نہیں،ایک بھرپور فنکار کی حیثیت سے Stablished کر دیا۔سورج بڑجاتیہ کی فلم ''میں نے پیار کیا''۔نے سلمان خان کو فلم انڈسٹری میں وہ مقام دلایا جسے پانے کے لئے امیتابھ بچن نے کئی فلاپ فلمیں دیں اور اب ابھیشک بچن اس مقام کو حاصل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے مگر نہیں حاصل کر پاتا۔سورج بڑجاتیہ نے اپنی تمام تجارتی ہوشمندی سے پورے ملک میں باکس آفس پر اپنا قبضہ اس طرح جمایا کہ فلم کا ایک ویڈیو کیسٹ بھی بازار میں نہیں آیا۔بھاگیہ شری کے ساتھ سلمان خان کی قسمت کا ستارہ بامِ عروج پر پہونچ گیا اور اس پہلی فلم سے ہی انہیں Hottest Selling Star کا خطاب دے دیا گیا۔''میں نے پیار کیا'' یوں تو ایک معمولی لواسٹوری تھی مگر ہدایت کار کی مضبوط گرفت،بہترین اسکرپٹ،فنکاروں کی دل پذیر اداکاری اور موسیقی کے ساتھ نغمہ نگاری نے اس فلم کو غیر معمولی بنا دیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ زندگی کے سنگلاخ سفر اور تلاشِ مستقبل کی جستجو میں اگر مسافر نے پلٹ کر دیکھا تو وہ پتھر کا ہوگیا لیکن سلمان خان کا سفر تو کامرانی،کامیابی اور روشن مستقبل کا سفر تھا جو شروع ہوا تو انہیں پلٹ کر دیکھنے

کی فرصت ہی نہ ملی اور اگر پلٹ کر دیکھ بھی لیا تو ساری شاہراہ پھولوں سے گلزار ہو اُٹھی۔

فلم صنعت کا یہ بہت پرانا چلن رہا ہے کہ ہر کامیاب اور بامراد اداکار کے حصول کے لئے فلمساز قطار بند ہو جاتے ہیں۔سلمان کے بنگلے پر بھی یہ قطاریں لگنا شروع ہو گئیں۔منہ مانگی قیمت پر سلمان فروخت ہونا شروع ہو گئے۔

راج شری پروڈکشن کے وہ پہلے چہیتے ہیرو تو بن ہی چکے تھے، سنجے لیلا بھنسالی اور ڈیوڈ دھون کی فلموں میں بھی انہوں نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے کہ ان فلمسازوں نے انہیں ہر قیمت دے کر اپنی فلموں کو باکس آفس پر کامیابی کی ضمانت مان لیا۔سلمان نے راج شری پروڈکشن کی فلم ''ہم آپ کے ہیں کون؟'' (۱۹۹۴ء) اور ''ہم ساتھ ساتھ ہیں'' (۱۹۹۹ء) میں بھی کام کیا اور ان فلموں نے سورج بڑجاتیہ کو ایک کامیاب ہدایت کار تو تسلیم کرایا ہی سلمان خان کو بھی مقبولیت اور شہرت کا اعلیٰ منصب حاصل ہو گیا۔

''میں نے پیار کیا'' اور ''ہم ساتھ ساتھ ہیں'' فلموں کے درمیان سلمان نے کئی فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔''باغی'' ۱۹۹۰ء۔''پتھر کے پھول''، ''صنم بے وفا''، ''قربان''، ''ساجن''، ''لو'' ۱۹۹۱ ''سوریہ ونش''، ''ایک تھا لڑکا ایک تھی لڑکی''، ''جاگرتی''، ''نشچے'' ۱۹۹۲ء ''چندر مکھی''، ''دل تیرا عاشق'' ۱۹۹۳ء ''چاند کا ٹکڑا''، ''انداز اپنا اپنا''، ''سنگدل صنم'' ۱۹۹۴ ''کرن ارجن''، ''ویرگتی'' ۱۹۹۵ء ''منجدھار''، ''خاموشی''، ''جیت''، ''دشمن دنیا کا'' ۱۹۹۶ء ''جڑواں''، ''اوزار''، ''دیوانہ مستانہ'' ۱۹۹۷ء ''پیار کیا تو ڈرنا کیا''، ''جب پیار کسی سے ہوتا ہے''، ''سر اُٹھا کے جیئو''، ''بندھن'' ۱۹۹۸ء ''جانم سمجھا کرو''، ''ہم دل دے چکے صنم''، ''صرف تم''، ''ہیلو برادر'' ۱۹۹۹ء، وانٹیڈ ۲۰۰۹ء، دبنگ ۲۰۱۰ء۔

ان فلموں میں چند فلمیں ہی ایسی ہیں جن میں سلمان خان نے اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ایسی فلمیں بھی ہیں جن میں انہوں نے شرٹ اتار کر اپنے سطحی پن کا ثبوت دیا۔''ساجن''، ''صنم بے وفا''، ''کرن ارجن''، ''خاموشی''، ''بندھن''۔سلمان کی اچھی فلمیں مانی گئیں۔سنجے لیلا بھنسالی نے اپنے اولین فلم ''خاموشی'' میں سلمان کو منیشا کوئرالا کے ساتھ پیش کیا اور دوسری فلم ''ہم دل دے چکے صنم'' میں ایشوریہ رائے ان کی ہیروئن رہی۔''خاموشی'' میں منیشا کی نزدیکی ان کے دل کو نہ چھو سکی مگر ایشوریہ رائے کی نزدیکی نے نہ صرف دل پر دستک دی بلکہ ان کی خوابگاہ تک رسائی حاصل کر لی اور وہ بے نکاحی بیوی بن گئی۔

سلمان خان کے رومانس کے قصے بھی بہت مشہور ہوئے۔اتنے کہ ان کی رسوائی کا باعث بھی بن گئے

لیکن دیکھا جائے تو ایسی رسوائیاں فلم انڈسٹری میں ستاروں کی شہرت اور فلمی وقار میں اضافہ ہی کرتی ہیں۔

سلمان جہاں پلے بوائے ہیں وہیں شراب کے بے حد رسیا بھی۔شباب کی آغوش میں شراب ہی کمال دکھاتی ہے اور جب شباب کی آغوش سے نکل کر شراب کا رسیا باہر آتا ہے تو شراب کی مدہوشی حادثے کا سبب بن جاتی ہے۔اسی شراب کے مدہوش کن سرور نے ان کے ہاتھوں کئی جانیں تلف کرا دیں اور وہ اپنے چاہنے والوں کی نظروں میں ایک وحشی مجرم بن گئے۔فلم ''ہم ساتھ ساتھ ہیں'' کی شوٹنگ کے دوران جودھپور راجستھان میں کالے ہرنوں کے شکار کرنے کے جرم میں گرفتار ہوئے۔۱۹۹۸ء میں ان پر فرد جرم عائد ہو کر کورٹ میں مقدمہ قائم ہوا۔۱۰/اپریل ۲۰۰۶ء میں انہیں جیل بھیجا گیا جہاں ۳۰/اپریل کو ان کی ضمانت ہوئی۔اس کے بعد بھی وہ رش ڈرائیونگ کی وجہ سے عام لوگوں کی زندگی سے کھیلنے کا باعث بنے۔

سلمان کی ان تمام بدعنوان حرکتوں اور عامیانہ کارستانیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے دوسرے رُخ کو دیکھا جائے تو یہ رُخ بے حد تابندہ اور دلکش نظر آتا ہے۔

گھر میں سب سے بڑے بھائی ہونے کا فرض انہوں نے بخوبی ادا کیا ہے۔اپنے دونوں بھائیوں ارباز اور سہیل کے لئے انہوں نے فلم انڈسٹری میں داخل ہونے کے راستے ہموار کئے۔سہیل کے لئے فلم پروڈکشن قائم کرنے میں بھرپور مدد کی اور ان کی ہدایت میں تین فلموں میں بلا معاوضہ کام بھی کیا۔

گھر کے ہر فرد کے لئے زندگی کی ہر آسائش بہم پہونچائی۔سلیم جاوید کی جوڑی جب ٹوٹی تو اپنے والد سلیم خان کی فلم ''پتھر کے پھول'' اور ''منجدھار'' میں کسی شرط کے بغیر اداکاری کی۔گھر کے ہر فرد کے لئے شوروم سے نئی نئی کاریں مہیا کرائیں۔اپنی دوسری ہیروئنوں اور فلمسازوں کو کبھی پریشان نہیں کیا۔کمزور فلمسازوں کو فائنانس بھی کیا اور کم معاوضہ پر ان کی فلموں میں کام بھی کیا۔ان کے والد سلیم خان نے جب اپنے وقت کی ڈانسر ہیلن کو نکاح میں لے کر اپنی زندگی میں پناہ دی تو سلمان نے ہیلن کو وہی درجہ وہی احترام دیا جو وہ اپنی حقیقی ماں کو دیتے آئے تھے۔

فلم، سنیما اور گھر سے باہر ان کی ایک شناخت بھی ہے۔وہ ایسے اداروں میں جاتے ہیں جہاں زمانے کے ستائے اور بے سہارا لوگ پناہ گزیں ہیں۔وہ ان تکلیفوں میں شریک ہوتے ہیں۔ان کی نہ صرف زبانی بلکہ مالی امداد بھی کرتے ہیں۔انہوں نے ایسے ہی ادارے کو ۲۴ کیریٹ گولڈ کی ایک بے حد قیمتی ٹرافی تحفتاً

دی تھی۔ وہ کینسر جیسے موذی مرض کے شکار موت وزندگی سے جوجھ رہے مریضوں سے بھی ملتے ہیں۔انہیں ایسے کلمات سے نوازتے ہیں کہ پل بھر کو موت سے نزدیک مریض زندگی پانے کا خواہش مند ہو جاتا ہے۔

ان کی فلموں کی فہرست اگر دیکھا جائے تو بہت طویل نہیں ہے مگر ان کی نجی زندگی کے پوشیدہ کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔سلمان نے کرن جوہر کی فلم ''کچھ کچھ ہوتا ہے'' ۱۹۹۰ء روی چوپڑہ کی ''باغبان'' ۲۰۰۵ء اور سنجے لیلا بھنسالی کی ''سانوریا'' ۲۰۰۸ء میں مہمان اداکار کے بطور کام کیا یہ مختصر رول ہی ان فلموں کے سارے کرداروں پر بھاری رہے۔

سلمان جہاں ایک ناکام عاشق کا کردار ادا کرنے میں کامیاب مانے جاتے ہیں وہیں وہ تشدد سے بھرپور کرداروں میں بھی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے میں باکس آفس پر گرفت مضبوط رکھتے ہیں۔

سلمان خان، شاہ رخ اور عامر خان کے ہم جلیس اور ہم فنکار اداکار ہیں۔یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ ان دونوں پر سبقت لے جاتے ہیں یا نہیں۔ بہت گہرائی سے فلموں کے انتخاب کا موازنہ کیا جائے تو سلمان اکثر چوک گئے ہیں۔شاہ رخ بھی چوکے ہیں جبکہ عامر ان دونوں کے مقابل زیادہ باہوش اور سنجیدہ رہے ہیں۔ مجموعی طور پر سلمان خان اس دور کے اہم اداکار ہیں۔کامیاب بھی۔کامران بھی اور بے حد سنجیدہ بھی۔

☆☆☆

غریب آدمی سے عظیم اداکار۔اوم پوری

ھما میر حسن

اوم پوری کا بچپن دوروٹی کی فکر میں گزرا لہذا کبھی نامور اداکار بننے کے خواب بھی پاس نہیں بھٹکے۔تاہم آج مبصرین انہیں ہندی سنیما کی روح گردانتے ہیں۔وہ اپنے فن اور انتھک محنت کی بدولت ہندی سنیما کی کہکشاں میں دمک رہے ہیں۔

انہوں نے ۱۸/اکتوبر ۱۹۵۰ء میں ہریانہ کے غریب گھرانے میں آنکھ کھولی ان کے والد پیشے سے پرائیوٹ جاب کرتے تھے کبھی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہی۔مشکل سے چار سال تک والدین نے اوم کی پرورش کی اور بعد ازاں انہیں ماموں جی کے گھر بھیج دیا گیا۔ابتداء سے ہی حالات سازگار نہ تھے تاہم اوم کچھ کرنے کی جستجو میں مصروف عمل رہے اور مختلف پیشے اختیار کرتے رہے۔جن میں کبھی لیب اسسٹنٹ کبھی ہوم ٹیوشن اور کبھی ہوٹلز میں معمولی نوعیت کی جاب سمیت دیگر جان شامل ہیں دوسری جانب ماموں نے اسکول تک تعلیمی اخراجات میں اوم کا ساتھ دیا جس کے بعد انہوں نے پڑھائی اپنے بل بوتے پر کی۔انتھک محنت اور قابل اسٹوڈنٹ ہونے پر اوم پوری اساتذہ اور دوستوں کے چہیتے رہے مگر ایک دور ایسا بھی آیا جب تعلیم جاری رکھنے کے لئے وہ اسکالرشپ کے لئے طویل عرصہ انتظار نہیں کرسکتے تھے۔اس وقت اوم کے دوست کام آئے جنہوں نے ان کی مالی سپورٹ کرتے ہوئے انہیں نیشنل اسکول آف ڈرامہ میں داخل کروایا جہاں ہندی سنیما کے مایہ ناز اداکار نصیرالدین شاہ ان کے کلاس فیلو تھا اوم کہتے ہیں کہ ''میں غربت اور مفلسی کے سائے میں جوان ہوا جو درحقیقت میرے ارادوں کی مضبوطی کا سبب بنا۔

۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران اوم کی شدید خواہش تھی کہ وہ آرمی افسر بنیں اور مقبولیت حاصل کریں۔اگر کہا جائے کہ شہرت کی چاہت کی دراصل انہیں ایکٹنگ ورلڈ تک لے گئی تو بیجا نہ ہوگا۔۱۹۷۳ء میں نیشنل اسکول آف ڈرامہ کے بعد اوم اداکاری کے فن سے مائل ہو رہے تھے۔تھیٹر میں فنکاروں کو مختلف روپ میں کردار نگاری کرتا دیکھ انہیں اداکاری سے گہرا لگاؤ ہو گیا لیکن ان کی شخصیت میں ایسا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا جو ایک اداکار کی شان ہوتا ہے۔وہ دیکھنے میں پرکشش تھے نہ ہی غیر معمولی نین نقش کے حامل تھے لیکن چٹان کی

طرح مضبوط ارادے انہیں بالی ووڈ کے افق تک لے گئے۔اوم پوری نے اس حوالے سے بتایا کہ ”شروع میں فلمسازوں کے لئے یہ طے کرنا مشکل تھا کہ مجھے ہیرو یا پھر ولن کس روپ میں کاسٹ کیا جائے۔

اوم پوری نے ۱۹۷۶ء میں فلم ”گھاسی رام کوتوال“ سے فلمی کیریئر کا آغاز کیا بعدازاں بچوں کی فلم ”چور چور چھپ جائے“ سائن کی جس میں ان کا ساتھی بندر تھا۔فلم میں وہ ”آوارہ“ کا کردار بخوبی ادا کرنے پر اوم کو پہلا معاوضہ ”مونگ پھلی“ کی صورت میں ملا جب کہ بعدازاں انہیں تین ہزار روپے دیئے گئے جو انہوں نے اپنے کورسز مکمل کرنے پر خرچ کئے۔

ابتدا میں اوم پوری کمرشیل فلموں سے دور رہے انہوں نے ستر کی دہائی میں شبانہ اعظمی، امریش پوری، نصیرالدین شاہ اور سمیتا پاٹل کے ساتھ لاجواب آرٹ فلموں میں کام کیا اور اپنی الگ پہچان بنائی۔۱۹۸۳ء میں شیام بینگل کی سپرہٹ ”منڈی“ میں فوٹوگرافر کے روپ میں اوم پوری نے کمال کردارنگاری کی، متعدد آرٹ فلموں کے بعد اوم، پنجابی فلموں میں مشہور ہوئے، بہت کم کردار ودیگر انڈسٹریوں میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں مگر اوم پوری کی راہ میں زبان کبھی رکاوٹ نہیں بنی۔ہندی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے علاوہ انہوں نے متعدد ہالی ووڈ فلموں میں قابل قدر کام کیا۔جن میں ”گاندھی“ ”سٹی آف جوائے“ ”دی پیرول آفیسر“ ”پیپی ناؤ“ ”دی زوکیپر“ گھوسٹ ایڈ ڈارکنس“ جیسی فلمیں شامل ہیں۔ہالی ووڈ فلم کو اکیڈمی ایوارڈز میں سراہا بھی گیا۔علاوہ ازیں انہوں نے ”ایسٹ از ایسٹ“ وائٹ ٹیتھ“ اور کنٹری ٹیل“ جیسے انگریزی ٹی وی سیریلز میں بھی نمایاں کردار نبھائے۔بطور اداکار برطانیہ سے ان کا تعلق ۱۹۸۰ء میں فلم ”جویل ان دی کراؤن“ سے شروع ہوا۔”برادران ٹریل“ ”مائی سن اے فیٹا نک“ اور ٹیکسپئر کے ڈرامہ ’کنگ لیئر کی نئی شکل میں عمدہ کام کی بدولت انہیں ۲۰۰۴ء میں برطانوی ”آرڈر آف برٹش امپائر کے اہم اعزاز سے نوازا گیا“ ۲۰۰۷ء میں ہالی ووڈ فلم ” Charlie wilson'swar میں اوم پوری خوبرو اداکارا انجیلیا جولی اور ٹام ہنکٹس کے ساتھ سابق پاکستانی جنرل ضیاء الحق کے روپ میں نظر آئے۔گزشتہ دہائی میں اوم کی مشہور ہندی فلموں میں آکروش، آروہن، آرودستیا، گپت، ماچس، پیار تو ہونا ہی تھا، ہیرا پھیری، میرے باپ پہلے آپ، ڈان، سنگھ از کنگ، لنڈن ڈریمز، دبنگ، سمیت دیگر شامل ہیں۔

اپنے کرداروں میں ڈھل جانے والے اداکار اوم پوری فلموں میں دل ہلا دینے والے لازوال رول کرچکے ہیں تاہم بدقسمتی سے ان کی ذاتی زندگی بھی کسی سانحہ سے کم نہیں۔نجی لائف میں اوم پوری متنازعہ شخصیت کی حامل رہے جب کہ ان کی صحافی بیوی نند پوری نے اپنے شوہر کی زندگی کے تاریک گوشوں کو بائیو گرافی کا روپ دے کر جلتی پر تیل کا کام کیا۔اوم کہتے ہیں کہ ”میں نے دوسرے شوہروں کی طرح اپنی بیوی سے ہر راز شیئر کیا جو میری غلطی ٹھہری جبکہ نندیتا کا کہنا تھا کہ میں نے اپنے پیشے کے ساتھ انصاف کیا شوہر کے بارے میں سچ بتا کر میری عزت نفس بھی مجروح ہوئی“ بائیوگرافی کے بعد دونوں کے رشتے میں کشیدگی آگئی تاہم اوم نجی لائف میڈیا سے شیئر ہونے پر بہت افسردہ ہوئے۔۳۵ سال پر محیط طویل کیریئر میں اوم کئی اعزازات اپنے نام کرچکے ہیں جن میں انڈیا کے اہم ترین اعزاز پدما شری سمیت دیگر شامل ہیں لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ وہ اپنے کیریئر سے مطمئن نہیں ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ مجھے بڑے بینر کی فلمیں کم نصیب ہوئیں جب کہ مجھے آفر ہونے والے کرداروں میں یکسانیت کا عنصر بہت رہا“ ۶۰ سالہ اوم اپنے سنیئر اداکار ۶۸ سالہ اداکار بگ بی سے حسد کرتے بھی دکھائے دیتے ہیں۔کیوں کہ وہ امیتابھ بچن کے نبھائے گئے کردار کرنے کی شدید خواہش رکھتے ہیں۔اوم پوری بالی ووڈ میں تقریباً ہر ڈائریکٹر اور پروڈیوسرز کے ساتھ کام کرچکے ہیں تاہم انہیں فلم ساز اپنے مقصد کے لئے بعض اوقات کامیڈی فلموں کے لئے مختصر رولز کے لئے سائن کرلیتے ہیں جسے اوم پوری نبھانا اپنی شان میں کمی نہیں سمجھتے۔اوم پوری کا کہنا ہے کہ ”میں اپنی عمر کے آخری حصے میں ہوں جہاں میں منفی یا پھر رونے دھونے والے رول نہیں کرنا چاہتا“ اوم پوری دنیا بھر میں بالی ووڈ کی شناخت قائم کررہے ہیں انہیں ہالی ووڈ سے متعدد آفرز ہیں مگر وہ اب زیادہ کام نہیں کرنا چاہتے۔

”دھوپ“ جیسی فلم میں حقیقت سے قریب تر اداکاری کرنے والے اوم کو ابتدائی دس سالہ کیریئر میں آرٹ فلموں کی وجہ سے بہت عزت وشہرت ملی، کمرشیل فلمیں کبھی ان کی گڈ بک میں شامل نہیں ہوئیں مگر بدلتے وقت نے اوم پوری کو نظریات بدلنے پر مجبور کیا اور آج اپنے کیریئر میں توازن رکھنے کے لئے آرٹ کے ساتھ کمرشیل فلمیں کررہے ہیں۔بالی ووڈ کے چند عظیم اداکاروں میں شامل اوم پوری کے نئے پراجیکٹس میں فلمساز کرن جوہر کی فلم ”اگنی پتھ“ اور ”ڈان ٹو“ شامل ہیں۔

☆☆☆

کئی چہروں والا اداکار۔نانا پاٹیکر

نثار انجم (مغربی بنگال)

ہندی فلموں کی دھوپ چھاؤں کبھی باکس آفس کی کسوٹی کے احترام میں تو کبھی تجارتی مصلحت کے تحت اپنا چولا بدلتی رہتی ہے یا دوسرے لفظوں میں ہندی فلم انڈسٹری ایک ایسی نک چڑھی حسینہ ہے جو گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ جیسی فطرت کی ترجمانی کرتی ہے۔سُپر اسٹار ''راجیش کھنّہ'' کی رومانی چال کی رفتار جب جذبات المیہ نگاری، حسن وعشق کی لگاتار توتو میں میں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوئی تھی تو راجیش' امیتابھ کی آمد سے مات کھا گیا۔سنیما ہال میں راجیش کے حصّے کی تالیاں امیتابھ بٹورنے لگا۔اس وقت ہندی فلموں کے مزاج نے ایک اور کروٹ لی اور اس کروٹ میں رجحان ساز کروٹ پنہاں تھیں۔۷۰ کی دہائی ہندی فلموں کے لئے ایک رجحان ساز دور تھا جسے امیتابھ بچن نے Angry Young Man امیج کے ذریعہ کیش کیا تھا۔ ''زنجیر'' سے ہندی فلم بینوں کے ذہن کو ایک نئی ہمہ رنگی ملی تھی۔امیتابھ سے پہلے فلم کا ہیرو یا تو اپنے غموں سے نڈھال ہو کر دور بھاگتا یا ہیروئن کی چھیڑ خانی کرنے والے وِلن کی پٹائی کرتا یعنی ہیرو کا دائرہ صرف ناچنا کودنا، پیار کرنا، پیار کی راہ میں روڑے اٹکانے والے سے انتقام لینا یا پھر جائداد، دولت کے اردگرد ہی کہانی کا مرکزی کردار گھومتا رہتا تھا لیکن امیتابھ بچن پچھلے ہیرو سے مختلف تھا۔سماج کا دانا بن کر ظلموں کا ستیاناس کرنے والا سماجی وسطی اختیار سے ہی مین کی صورت میں آیا اور فلم بینوں کو متاثر کرتا چلا گیا۔امیتابھ کی دیوار، کالا پتھر، مقدر کا سکندر، ترشول اور کالیہ جیسی فلمیں سماج کے عام آدمی کے رجحان میں حیرت انگیز تباہ تبدیلی کا باعث بنیں۔امیتابھ کے رجحان ساز ہونے کا اعتراف سبھی کو ہے امیتابھ کو فلموں کی توسط سے سماج میں عام آدمی کے رویّے میں مثبت رجحان آیا یا پھر منفی۔ بحث یہاں مقصود نہیں ہے۔امیتابھ کی فلموں نے عام فلم بینوں کو اپنے کردار سے یہ درس دیا کہ ایک عام آدمی سبھی سماجی ناانصافی، اخلاقی ناانصافی، ظلم کا تنہا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتا ہے۔امیتابھ کی فلموں نے جہاں عام آدمی کو غریبوں کا ہمدرد بن کر ظلم سے لڑنے کے لئے INSPIRE کیا وہیں ہر کس و ناکس کو کسی نہ کسی اعتبار سماجی وسیاسی تکریم وصولنے کا موقع بھی ہاتھ آ گیا۔''ہم'' میں امیتابھ کے کردار نے کافی ترغیب دی تھی۔امیتابھ کے کردار می مثبت رجحان تھا۔لیکن تکرار غریبوں پر آزمانے کا رجحان

عام آدمی کے رول منضی منفی ___ زنجیر سے آخری راستہ تک امیتابھ نے اینگری ینگ مین Angry Young Man ___ کچھ سکھایا۔پھر پنت اسیر (قلی کے سیٹ کا ویلن) کا ایک گھونسہ جب موت کے منہ تک امیتابھ کو گھسیٹ لے جاتا ہے تو فلم بینوں کو لگا کہ ''غریبوں کا ہمدرد'' پردے پر درجنوں غنڈوں کی پٹائی کرنے والا ''ہی مین He Man'' بھی عام آدمی کی طرح ہے جو ایک گھونسے سے موت کے دہانے پر آ کھڑا ہوا تب فلم بینوں کے ذہن سے 'ہی مین' کا تاثر جاتا رہا۔اور جب امیتابھ نے سنبھالا لیا تو ہندی فلموں کا کبوتر پیار کی چھٹّی ___ بانٹ رہا تھا اور ہندی فلموں کا طوطا پیار کی بولی کے ساتھ ون،ٹو گنگنا رہا تھا۔

یہاں ہندی فلموں کے دوا دوار کو رجحان ساز کہنا بیجا نہ ہوگا۔ایک راجیش کے گرنے کے بعد امیتابھ ___ دوسرا امیتابھ کے مدھم ہو جانے کے بعد نانا پاٹیکر کا دور ___ انکش جب مقامی سنیما گھروں میں ریلیز ہوئی تھی تو پہلے سات دن ٹکٹ کھڑکیاں ذہنوں سے خالی تھیں۔موٹا سا ڈنڈا لئے دربان آنے والے فلم بین کا استقبال مسکرا کر کرتا لیکن دوسرے ہی ہفتہ مرکزی کردار میں نانا پاٹیکر ___ بے روزگار نوجوان کی لاابالی اور جھلاہٹ کے فطری رجحان کا اچھا خاصہ تاثر جاگا۔اور فلم بینوں کو یہ نام یاد رہ گیا۔بالکل اسی طرز کی فلم ارجن میں ''پاٹیکر'' ''سنی دیول'' سے مختلف قسم کی اداکاری کا چرچہ فلمی دنیا میں ہونے لگا اور اس نوجوان میں نئی امید جاگی اسی دور میں قیامت سے قیامت تک جہاں روحانی سیلاب لے آیا تھا۔وہیں نئے اور شاداب چہروں کا تانتا بھی بندھ گیا تھا۔پہلے رسیلے گیت۔ہوشربا ہیجان خیز☆☆☆ موسیقی میں امیتابھ کے خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی گئی۔''پرتی گھات'' نے نئی دہائی کو نئے مسائل (Booth Capturing) ریگنگ کے پے در پے واقعات کو باندھا اور نانا پاٹیکر۔پرتی گھات کے اس مخصوص کردار کی عکاسی میں ہر زاویے سے سماج کا جھلاّیا ہوا جوان ہی نظر آیا جس کے چہرے پر عیاں سوچ کی لکیریں تھک گئی تھیں۔

نانا پاٹیکر ہندی فلموں کے توسط سے سماج کا جھلایا اور چڑچڑا جوان بن کر جب ''پرہار'' میں آیا تو اس فلم میں پاٹیکر کے چہرے پر ملک کے جوانوں کے مستقبل کی لکیریں صاف نظر آرہی تھیں۔نانا پاٹیکر کے چہرے پر غصّے اور مایوسی کی موٹی لکیر، سماجی انصافی کے شکار' فلم بینوں کی اپنی ہی تصویر پردے پر رقص کر رہی تھی۔پردے پر نانا پاٹیکر قانون' انصاف کی زنجیروں سے بندھا جھنجھلاتا تو اس کی کسک اور جھنجھلاٹ ہال میں بیٹھے صف اوّل سے ہوتی ہوئی بالکونی میں بیٹھے فلم بینوں کے ذہن تک آ گئی اور یوں پاٹیکر مقبول ہوتا

گیا۔نانا پاٹیکر کے پردے پر آتے ہی ہال تالیوں سے گونج اٹھتا ہے تو وہیں فلم بین اپنا دکھ اور اپنے مسائل کو مرکزی کردار یعنی پاٹیکر کے ساتھ بانٹ بھی آتے ہیں۔انگار۔پرہار۔ترنگا۔پرندہ۔راجو بن گیا جینٹل مین' سے جہاں پاٹیکر فطری اداکاری کے عروج پر پہنچ گیا ہے وہیں اپنے منفرد انداز میں مکالموں کی ادائیگی کے سبب امیتابھ کے حصّے کی تالیاں بھی سمیٹنے لگا ہے۔آج امیتابھ کے بعد پاٹیکر کی آمد نے کچھ مخصوص حلقوں کی تشنگی کو سیراب کیا ہے۔جہاں تک امیتابھ اور پاٹیکر کا سوال ہے۔امیتابھ غریبوں کا ہمدرد،سماج کا داتا بن کر ظلم کی ہر زنجیر کو توڑنے کا ہنر جانتا تھا۔لیکن پاٹیکر غصہ ور ہے مگر سماجی وقانونی ناانصافی سے جھلّایا ہوا ہے اس کے یہاں سبھی ظلم کی زنجیر کو توڑنے کا ہنر ہے مگر فرض' قانون' انصاف کی ہتھکڑیوں میں بندھا___ اس دیش کے نوجوانوں کی طرح ظلم سے لوہا لینے کے لئے ہمت جٹا رہا ہے۔تاکہ سیاست کی گندی ہانڈی کو چورا ہے پر پھوڑ سکے۔ مایوسی چڑ چڑاپن۔لاابالی۔استحصال تو نئی نسل کو ورثے میں ملا ہے۔ جھنجھلانے کی کیفیت' انداز' آنکھوں' اشاروں' ہاتھوں سے اپنے مجروح وجھلّائے ہوئے جذبات کی عکاسی میں نانا پاٹیکر ہر زاوئے سے نوجوان کا ماضی حال اور مستقبل نظر آتا ہے۔نانا پاٹیکر سماجی وسیاسی خدوخال سے بیزار ایسے جوان کی تقریر کا خاکہ پیش کرنے کے فن میں طاق ہے اس کی مقبولیت کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ دیش کا پڑھا لکھا۔بے روزگار۔برسرروزگار یا پھر عام آدمی جس طرح بڑی طاقت سے پریشان ہے اوران کی جو حقیقی حالت ہے نانا پاٹیکر خود کو ان کرداروں میں بخوبی ڈھال رہا ہے۔آج عام فلم بین ہو یا ہدایت کار،فلم ساز ہو یا پھر فلمی ناقدین۔پاٹیکر کی فنکارانہ صلاحیتوں کا ہر کوئی برملا اعتراف کررہا ہے۔نانا پاٹیکر کی' سماجی' سیاسی قانونی ناانصافیوں سے ہار کر جھلّانا فطری ہے اوراس المیے کی عکاسی میں پاٹیکر کا چہرہ ہر فلم بین کو اپنا چہرہ لگتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ سماج کے ہر طبقہ میں اس کی پذیرائی ہو رہی ہے۔

☆☆☆

ایکشن اور کامیڈی کنگ۔اکشے کمار

تحسین اختر (مغربی بنگال)

آج کے موجودہ دور کے سپر اسٹار۔بہترین ایکشن کے ماہر اور بہترین کامیڈی کے بادشاہ اگر کسی کو کہا جا سکتا ہے تو وہ صحیح معنوں میں اکشے کمار ہیں جن کے اندر سنجیدہ اداکاری بھی ہے،بھرپور کامیڈی بھی اور ساتھ ہی ساتھ سپر ایکشن بھی،جو بھی خطرناک سین ہو اس کے لئے اکشے کمار اسٹنٹ مین کا مدد نہیں لیتے،چاہے پہاڑ سے کودنا ہو،چھت سے نیچے چلانگ لگانی ہو یا سپاٹ دیوار پر کمند ڈال کر چڑھنے کا سین یا خطرناک ڈرائیونگ،رائیڈنگ یا کراٹے جوڈو لڑنے کا سین،وہ ان سب میں خود ہی ایکٹ کرتے ہیں اور کسی اسٹنٹ مین کی مدد نہیں لیتے،دوسری طرف اگران،سے سپر کامیڈی کرانا ہو یا پھر جذباتی سین،ان سب میں اکشے کمار صحیح معنوں میں ہر فن مولا ہیں،اکشے کمار کی ان صلاحیتوں کے معترف سبھی ہیں۔

1985ء میں پہلی مرتبہ انہیں فلم "سوگندھ" میں پیش کیا گیا تھا اوراس فلم کے چند فائیٹ سین میں اکشے کمار نے بہترین انداز میں فائیٹنگ کی تھی اور پہلی مرتبہ لوگوں کو بالکل ہالی ووڈ کے بلیک بیلٹ جیسا ہیرو ملا تھا۔فلم سوگندھ اگرچہ راکھی اور وویک اوبرائے کی بہترین اداکاری کی وجہ سے ہٹ ہو گئی تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس فلم کی کامیابی نے اکشے کو بھی راتوں رات سپر اسٹار بنا دیا تھا۔

فلم میں آنے سے پہلے اکشے کمار ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے باورچی تھے اور بہترین کھانا پکانا جانتے تھے جس میں چائنیز،مٹن،بریانی،اورنان کباب ان کی پسندیدہ ڈشیں تھیں۔اور چونکہ وہ اپنی ملازمت سے فراغت پاکر ایک جم میں مشق کرتے تھے نیز کراٹے جوڈو کی تعلیم حاصل کرنے پر بنکاک کے ایک مقابلے میں انہیں بلیک بیلٹ بھی حاصل ہوا تھا اور اپنی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے انہیں فلم میں بریک ملا پہلی فلم سوگندھ کے ذریعہ زبردست کامیابی مل گئی تھی۔1986ء میں انہیں ایک اور فلم "وقت ہمارا ہے" میں ہیرو کا رول ملا جس میں ان کے ساتھ سنیل سیٹھی بھی تھے جو اپنی پہلی فلم بلوان کی کامیابی کے بعد ابھر گئے تھے۔چونکہ اکشے اور سنیل دونوں ہی بلیک بیلٹ ہیں۔اوراس فلم میں خطرناک فائیٹ سین میں دونوں کی فائیٹنگ قابل دید تھی۔

اس کے بعد اکشے کمار نے ودیا بھارتی،منیشا کوئرالا،روینہ ٹنڈن،کرشمہ کپور،شلپا سیٹھی کے ساتھ

انگنت فلمیں کیں اگر چہ وہ کامیاب نہیں تھیں تو انہیں ناکام بھی نہیں کہا جا سکتا۔

اکشے کمار کی زندگی کے کامیڈی رول کی شروعات 2000ء سے ہوئی۔ جب سنیل سیٹھی پریش راول کے ساتھ ان کی بہترین کامیڈی سے پر فلم ''ہیرا پھیری'' ہٹ ثابت ہوئی اس فلم میں ان تینوں کی ایسی بھرپور کامیڈی تھی جس نے اکشے کمار کو سپر کامیڈین بنا دیا اور پریش راول کو کامیڈین کا شہنشاہ۔

اکشے کمار نے سنیل سیٹھی کے ساتھ کئی فلمیں کیں اور چند ایسی فلمیں بھی کیں جس میں پوری فلم میں ایک بھی فائیٹ سین نہیں تھا۔ ایسی ہی ایک رومانی فلم ''دھڑکن'' بھی تھی جس میں اکشے کمار سنیل اور شلپا سیٹھی تھے، پوری فلم جذباتی تھی اور محبت کے تکون پر بنی تھی جس میں اگر چہ سنیل سیٹھی ناکام عاشق کے رول میں چھا کر رہ گئے تھے تاہم ایک اعلیٰ اور سچا انسان کے رول میں اکشے کمار نے بھی اپنی اداکاری سے بیحد محظوظ کیا اس فلم کا ایک گیت ''دل نے کیا کہا ہے دل سے، محبت ہوگئی ہے تم سے'' بیحد مشہور ہوا تھا نیز قادر خان کی ایک قوالی ''دلہن کا چہرہ سہانا لگتا ہے'' بے حد مشہور ہوا تھا اور بغیر ایکشن والی یہ فلم سپر ہٹ ثابت ہوئی تھی۔

اکشے کمار کی کھلاڑی سیریل فلمیں بھی بے حد کامیاب ہوئیں جس میں کھلاڑی نمبری 1 وغیرہ شامل ہے۔ اکشے نے اس فلم میں ریکھا جیسی اداکارہ کے ساتھ کئی سیکس سین بھی کئے اور اپنی اداکاری میں کہیں بھی جھول پیدا ہونے نہیں دیا۔ اکشے کمار کی حد سے زیادہ مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ڈمپل کپاڈیہ نے اپنی بیٹی اداکارہ ٹوئینکل کھنہ سے اس کی شادی کی بات کی، چونکہ ٹوئینکل بھی میلہ، جورو کا غلام اور بادشاہ جیسی مشہور سپر ہٹ فلموں کی ہیروئن بن چکی تھی۔ اگر چہ اکشے اور ٹوئینکل کی ازدواجی زندگی خوش گوار گذر رہی ہے۔ ایک بچی بھی ہے لیکن جب سے کٹرینہ کیف کے ساتھ اکشے نے سنگھ از کنگ میں کام کیا ہے اور چند بے حد جذباتی سین کئے ہیں، اس کے بعد ان دونوں کے درمیان خواہ مخواہ غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہیں۔

اکشے کمار نے حال میں کئی سپر فلاپ اور ساتھ ہی سپر ہٹ فلمیں دی ہیں جس میں چائنا ٹاؤن جو ڈیپکا پڈوکون کے ساتھ سپر فلاپ ہوئی لیکن سنگھ از کنگ اور ویل کم سپر ہٹ ہوگئیں۔ اکشے کمار کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اس فلم میں اس نے فیروز خان جیسے سپر اسٹار کے ساتھ کام کیا، اس فلم کے بعد ہی فیروز خان کا کینسر کے مرض میں انتقال ہو گیا۔

اکشے کمار ان دنوں کئی بڑے پروجکٹ والی فلموں میں کام کر رہے ہیں جن میں دیپکا

پڈکون، کرینہ کپور، کٹرینہ کیف، لارا دتہ۔ بپاشا باسو اور سونم کپور ان کی ہیروئن ہیں چونکہ اکشے کی ایک ڈراؤنی فلم بھول بھلیاں بھی بے حد کامیاب ہوئی تھی لہذا وہ ایسی ہی دو تین فلموں میں بھی کام کر رہے ہیں۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ اکشے کمار اور روینہ ٹنڈن ایک فلم مہرہ کی شوٹنگ اوٹی میں کر رہے تھے جہاں ایک ویران مقام پر تقریباً 16 افراد نے روبینہ کو گھیر لیا تھا اکشے کمار بالکل فلمی ہیرو انداز میں گاڑی سے نکل کر ان سبھی نوجوانوں کی اچھی طرح پٹائی کی تھی لیکن بعد میں انہیں معاف کر دیا تھا اور پولیس کیس نہیں کیا تھا کیونکہ پولیس کیس ہونے سے ان نوجوانوں کا مستقبل برباد ہو جاتا۔

اس وقت اگر چہ سپر اسٹاروں میں شاہ رخ خان، عامر خان، سلمان خان کے ساتھ سیف علی خان کا نام بھی جڑ گیا ہے اس کے علاوہ ریتک روشن ہیں، گوندہ ہے لیکن اس کے باوجود اکشے کمار نے اپنا منفرد مقام بنالیا ہے، کیونکہ وہ بیک وقت سنجیدہ، جذباتی، ایکشن سے بھرپور اور ساتھ ہی کامیڈی بھی کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا ہے۔ سنیل سیٹھی، پریش راول اور اب نانا پاٹیکر بھی کئی فلموں میں اکشے کمار کے ساتھ کامیڈی رول میں نظر آئیں گے کیونکہ حد سے زیادہ ایکشن فلمیں بور لگنے لگی ہیں اور کامیڈی فلمیں بہت زیادہ کامیاب ہو رہی ہیں جیسے نوانٹری، ویل کم، گول مال، ریٹرن آف گول مال، ہیرا پھیری، پھر ہیرا پھیری وغیرہ جیسی فلموں کا دور ہے۔

☆☆☆

نوجوان دلوں کی دھڑکن۔ گووندا

رشید انجم (بھوپال)

نام : گووندا آہوجہ

والد : ارون کمار آہوجہ

والدہ : نرملا دیوی

پیدائش: ۱۹۶۳ء۔ بمبئی

گھر کا نام: چی چی

پہلی فلم : ۱۹۸۶ء۔ ''لو ۸۶''۔ ہیرئن: نیلم۔ عمر: ۲۳ سال۔

کامیاب ترین فلمیں: ۱۹۹۲ء ''شعلہ اور شبنم''۔ ۱۹۹۳ء ''آنکھیں''۔ ۱۹۹۴ء ''راجہ بابو''۔

قابلِ ذکر فلمیں: ۱۹۸۹ء ''مرتے دم تک''۔ ''دریا دل''۔ ۱۹۸۸ء ''شوشکتی''۔ ''ہتیا''۔ ''گھر گھر کی کہانی''۔ ''پاپ کو جلا کر راکھ کردوں گا''۔ ''فرض کی جنگ''۔ ''مہا سنگرام''۔ ۱۹۸۹ء ''دوست غریبوں کا''۔ ۱۹۸۹ء ''جنگ باز''۔ ''سچائی کی طاقت''۔ ۱۹۹۰ء ''آوارگی''۔ ''عزت دار''۔ ''سورگ''۔ ''رئیس زادہ''۔ ۱۹۹۱ء ''ہم''۔ ''بھابی''۔ ''کون کرے قربانی''۔ ۱۹۹۲ء ''ظلم کی حکومت''۔ ۱۹۹۳ء ''تیری پایل میرے گیت''۔ ۱۹۹۴ء ''دلارا''۔ ''خوددار''۔ ''بیٹا ہو تو ایسا''۔ ۱۹۹۵ء۔ ''آندولن''۔ ''قلی نمبر ا''۔

ارون کمار آہوجہ ۴۰ کی دہائی کے مصروف اداکار اور گلوکار تھے۔ ارون کمار بمبئی ٹاکیز کی فلموں میں کام بھی کرتے تھے اور گلوکاری بھی۔ میں یہاں ان کی تین فلموں کا ذکر کروں گا۔ یہ تینوں فلمیں بمبئی ٹاکیز کی تخلیق کردہ تھیں۔ ان تینوں فلموں میں ارون کمار نے گلوکاری کی تھی اور ان کے گائے گیت مشہور بھی ہوئے تھے۔

۱۹۳۸ء کی فلم ''نرملا''۔ میں جما سوروپ کیشپ کا لکھا اور سرسوتی دیوی کی طرزِ موسیقی میں ڈھلا یہ گیت ''دکھ سکھ کا نت ناطہ۔ ایک جاتا ایک آتا''۔ دو حصوں میں ریکارڈ ہوا تھا۔ دوسرے حصے کے گلوکار ارون کمار تھے ۱۹۳۹ء کی فلم ''کنگن''۔ میں نروتم ویاس کا لکھا اور رام چندر پال کی طرز پر گایا یہ گیت ''رادھے ونشی رہی پکار۔ متھرا جاتے نند کمار''۔ ارون کمار اور ساتھیوں کی آواز میں تھا۔ ۱۹۴۰ء کی فلم ''بندھن'' میں سرسوتی دیوی کی

موسیقی میں پردیپ کا لکھا یہ گیت تو بہت ہی مشہور ہوا تھا۔ ''چنا جور گرم بابو میں لایا خریدار چنا جور گرم''۔ ارون کمار نے محبوب کی فلم ''عورت''۔ ۱۹۴۰ء میں وہی کردار ادا کیا تھا جو ''مدر انڈیا'' میں راجندر کمار نے کیا تھا۔

ارون کمار نے بھجن گلوکارہ نرملا دیوی سے شادی کی تھی۔ ان کے دو بیٹے گووندا آہوجہ اور کیسرتی آہوجہ ہیں۔ گووندا جب پیدا ہوئے تو یہ خاندان بمبئی کے سب سے پوش علاقے جوہو کے عالیشان بنگلے میں شاہانہ زندگی بسر کر رہا تھا لیکن دولت کا نشہ جب سر چڑھتا ہے تو عقل خرد بیگانہ ہو جاتے ہیں اور آدمی اس طریقۂ زندگی کے زیرِ اثر آجاتا ہے جسے انگریزی میں Lavish Life Style کہا گیا ہے ۔یعنی فضول خرچ طریقۂ زندگی۔ زوال آیا تو جوہو سے اتر کر یہ خاندان بمبئی کے دیہی علاقے ورار کی کم تر بستی میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ اسی علاقے میں گووندا کا بچپن گزرا۔

غریب ہندی میڈیم کے اس نوجوان میں بچپن سے ہی کچھ کر گذرنے کی خواہش تھی۔ خوبرو بھی تھا اور خوش مزاج بھی۔ اس نے ڈانس میں مہارت حاصل کی اور جب عمر بیس کی نوجوان بہاریں عبور کر چکی تو اس نے فلم انڈسٹری میں خود کو آزمانے کی کوشش کی۔ وہ دور جتیندر، دھرمیندر اور راجیش کھنہ کا تھا۔ گووندہ کے ہمراہ دو ہی خوبیاں تھیں۔ اس کی خوبروئی اور ڈانس Skill۔ تیسرا اس کا اعتماد۔ کوئی قماز اداکارہ گووندہ کی ہیروئن بننا نہیں چاہتی تھی۔ اسی دور میں گلوکار مہندر کپور کا بیٹا روہن کپور بھی قسمت آزما رہا تھا۔ فلمساز کو بھی دو نئے چہروں کی ضرورت تھی۔ لہٰذا فلم ''لو ۸۶'' میں ان دونوں کو بطور ہیرو لے لیا گیا۔ فلم میوزیکل لو اسٹوری تھی۔ گووندہ نے اداکاری کے ساتھ ڈانس کا ہنر بھی آزمایا۔ فلم نوجوان طبقے میں پسند کی گئی اور گووندہ کی قسمت نے یاوری کی۔ متھن چکرورتی بھی جتیندر اسٹائل کے ڈانسر اداکار تھے۔ گووندہ نے متھن کی ہی روایت کو آزمایا اور کم بجٹ کی فلموں میں آہستہ آہستہ مقبول ہوتے گئے۔ ان کا بھائی کیسرتی کمار بھی فلموں میں آگیا۔ اس نے بیک وقت اداکار اور فلمساز کا میدان چنا۔ گووندہ اب Stablish ہو گئے تھے۔ کیسرتی نے بھائی کو لے کر فلم ''ہتیا'' بنائی۔ یہ قتل کی گتھی سلجھانے پر ایک سسپینس فلم تھی۔ پسند کی گئی مگر کیسرتی کی دوسری فلم ''رادھا کا سنگم'' فلاپ ہوگئی۔ کیسرتی نے اس فلم میں نگیٹو رول کیا تھا۔

۱۹۹۱ء میں رمیش شرما کی فلم ''ہم'' میں گووندہ کو امیتابھ بچن کے ساتھ پیش کیا گیا۔

۱۹۹۲ء میں گووندہ ڈیوڈ دھون کیمپ کے ہیرو بن گئے۔ ڈیوڈ دھون نے انہیں اس وقت کی معروف

ہیروئن دویا بھارتی کے مقابل ہیرو پیش کر دیا۔فلم ''شعلہ وشبنم'' جاندار منظر نامہ اور چابک دست ہدایت کاری کی وجہ سے ہٹ ہوئی۔ اب گوونده' ڈیوڈ دھون کی مقبولیت اور شہرت اور کامیابی کے ضامن بن گئے۔ وہ ان کی ہر فلم میں لئے جانے لگے۔فلم ''آنکھیں''۔ ''راجہ بابو''۔ ہیرونمبرا''۔ ''بیٹا نمبرا''۔ ''قلی نمبرا'' وغیرہ باکس آفس کی کامیاب فلمیں ہیں۔ امیتابھ بچن کے انتہائی برے دن میں ڈیوڈ دھون نے امیتابھ بچپن اور گوندہ کو لے کر فلم ''چھوٹے میاں بڑے میاں'' بنائی تھی۔ یہ فلم نہ تو امیتابھ کو ان کی مقبولیت واپس دلاسکی اور نہ گوونداکی شہرت میں مزید اضافہ کرسکی۔ ہاں بمبئی سینما کی فلموں میں انتہائی پھوہڑ' عامیانہ اور سستی فلم کے اضافے کا باعث ضرور بن گئی۔

گوونداکے والد ارون کمار تو بہت پہلے ہی چل بسے تھے۔ماں نرملا دیوی نے ہی اپنی اولادوں کی پرورش کی تھی۔ گووندانے بچپن سے ہی طے کرلیا تھا کہ وہ اپنے خاندان کو پھر اسی علاقے میں رہائش پذیر کروائیں گے جو ان کی Lavish کی وجہ سے تاراج ہوگیا تھا۔ گوونداجب مقبول ہوئے اور دولت کا دیوتا براجمان ہوگیا تو گووندانے اپنے خاندان کو جوہو کے ایک بنگلے میں پھر سے لابسایا۔

ماں کی پسند سے شادی کی اور بیوی کو فلمی چکاچوند سے دور رکھا۔ گووندا کے پاس سب کچھ آ گیا۔ دولت' شہرت' عزت' مقبولیت۔ ایک وسیع آبادی ان کے اسٹائل اور ڈانس کی دیوانی ہوگئی۔ گووندا نے اپنے اسی ہنر کی بدولت ورلڈ سینما پر راج کیا۔نوجوان کے دل کی دھڑکن میں بسے اور راجہ بابو کہلائے جانے لگے۔ پھر اس عروج پر گہن لگا تو انہوں نے سیاست کا دامن تھاما۔ اپنے اسی علاقے ورار سے ایم ایل اے منتخب ہوئے جہاں ان کا بچپن اور جوانی گذری تھی اور جسے انہوں نے کبھی فراموش نہیں کیا تھا۔ سیاستداں بن تو گئے اور فلمی ہنر' سیاست میں کبھی گُر نہیں بنتے۔ ایک عرصہ دور رہنے کے بعد وہ واپس لوٹے تو بہت دیر ہوچکی تھی۔ ڈیوڈ دھون بھی ہاتھ پیر مار رہے تھے۔ پریہ درشن کی فلمیں کامیاب ہورہی تھیں۔ پریہ درشن وغیرہ کی فلموں میں آسرا لیا لیکن ان فلموں میں پہلے سے مقبول فلم اسٹار کامیڈی کر رہے تھے۔ گووندا دوسرے اور تیسرے نمبر پر رہے۔سونے پہ سہاگہ یہ ہوا کہ نان اسٹار کاسٹ کی ہوم پروڈکشن فلم ''سکھ'' بنالی اور اس کی ریلیز کے لئے جب کوئی تیار نہ ہوا تو قرض لے کر فلم ریلیز کی اور ناکامی کا منہ دیکھا۔ یہی نہیں جب انہوں نے حضرت معین الدین چشتی سے منت مانی تو اپنے ۱۰ سالہ بیٹے یش وردھن

۱۷ سالہ بیٹی نرمدا اور بیوی سنیتا کو اجمیر بذریعہ کار روانہ کیا اور چونکہ انہیں جشنِ آزادی کی تقریبات میں حصہ لینا تھا، اسلئے بعد تقریبات ہوائی جہاز سے گووندا اجمیر پہونچ کر اپنے خاندان سے مل جاتے لیکن راستے میں کار حادثے کا شکار ہوگئی جس میں ان کا سکریٹری رشبھ جاں بحق ہوگیا تھا۔ یہ واقعہ ۱۹۹۶ء میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ گووندا فوراً ہسپتال پہونچ گیا۔ رشبھ کے خاندان کی کفالت کا ذمہ لیا اور اسے نبھایا بھی۔

مالی مشکلات تو سب پر آتی ہیں۔ گووندا بھی اس سے دوچار ہوئے لیکن فضول خرچی سے بچے رہے۔ شراب ان کی ضرورت نہیں بنی۔ فلمی پارٹیوں میں کبھی نہیں جاتے۔ ہر چکاچوند سے خود کو دور رکھتے ہیں۔ بہت سنبھل کر چلنا انہیں آتا ہے، اسی لئے اندھیرے میں بھی ٹھوکر نہیں کھاتے۔ اب وہ فلموں میں سکینڈ کیریکٹر ہیں۔ فلمیں چلتی بھی ہیں' نہیں بھی چلتیں۔ ہاں معاوضہ ضرور مل جاتا ہے جس سے گھر کی کفالت بھی ہوتی ہے اور زندگی کا بھرم بھی قائم رہتا ہے۔

☆☆☆

خوبرو اور خوش مزاج اداکار۔فارق شیخ

چاند خاں رحمانی

پردۂ سیمیں پر جب بھی کسی معصوم کردار میں روح پھونکنے کی بات آتی ہے تو سب سے پہلے جو نام زبان پر آتا ہے وہ ہے اداکار فاروق شیخ کا، بھولی بھالی صورت اور غضب کی فنّی صلاحیت کے مالک وہی فاروق شیخ جو متعدد فلموں میں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں۔

فلموں میں فاروق شیخ کی آمد اس وقت ہوئی جب پُرتشدّد فلموں کا بازار پوری طرح گرم تھا۔ ایسے وقت میں فلمساز ایش چوپڑہ نے اپنی فلم ''نوری'' میں رومانی جوڑی کی حیثیت سے پونم ڈھلّون اور فاروق شیخ کو پیش کیا۔ مار دھاڑ، تشدّد زنا بالجبر اور قتل و غارت گری کے مناظر دیکھ کر عاجز آ چکے تماشائیوں نے ''نوری'' دیکھ کر فرحت محسوس کی۔ اگرچہ اس سے قبل ۱۹۷۳ء میں فلم ''گرم ہوا'' میں بھی فاروق شیخ کو پیش کیا گیا تھا۔ لیکن تب فلم بینوں میں ان کی کوئی شناخت نہیں بن سکی تھی کیونکہ اس وقت ان کی توجہ اسٹیج کی طرف زیادہ تھی اس لئے فلم کو وہ سنجیدگی سے نہیں لے پائے تھے۔ لیکن نوری کی زبردست کامیابی نے فاروق شیخ کو فلمساز کی توجہ کا مرکز بنا دیا اور پھر تو یکے بعد دیگرے کئی متعدد فلموں میں فاروق شیخ کو اپنی فنّی صلاحیتیں دکھانے کا موقع ملا فلم ''مکن'' شطرنج کے کھلاڑی، بازار، چشم بددور اور ساتھ ساتھ، وغیرہ میں ان کے کردار بالکل زندہ حقیقت محسوس ہوئے۔ لیکن نہ جانے کیوں ان سب کے باوجود ان کی فلموں کو وہ مقبولیت نہ مل پائی جس کے سہارے وہ شہرت کے بامِ عروج تک پہنچ پاتے۔ ان کے کیریئر پر آرٹ فلموں کی مہر کچھ اس طرح ثبت ہوگئی کہ کمرشل فلموں کے تخلیق کار انھیں لے کر کچھ کر دکھانے کی جسارت نہ کر پائے۔ فارق کا سبک رفتار فلمی سفر محض آرٹ فلموں کے ذریعے ہی جاری تھا۔ لیکن اچانک ہی ان کے کیریئر نے ایک نیا موڑ لیا۔ اور آرٹ فلموں کا یہ اداکار چھوٹے پردہ کے ذریعہ سے اپنے پرستاروں تک آ پہنچا۔ جب فاروق شیخ کے سیریلوں کا تذکرہ ہوتا ہے تو بھگوتی چرن ورما کے ناول پر منحصر سیریل ''آخری داؤ'' کا نام سب سے پہلے زبان پر آتا ہے۔ اس سیریل کی تمام قسطوں میں اُن کا اہم رول تھا۔ فاروق کے ساتھ اس سیریل میں دیپتی نول کو پیش کیا گیا تھا مگر اس میں کوئی شک نہیں کوئی فاروق کا کردار لافانی تھا۔

ابھی حال ہی میں اُردو کے مایۂ ناز شاعر علی سردار جعفری کے ذریعے پیش کئے گئے سیریل ''کہکشاں'' میں فاروق شیخ نے مولانا حسرت موہانی کے کردار میں جس طرح روح پھونکی ہے وہ صرف انھیں کا حصّہ ہے۔ وہ اس کسوٹی پر بھی کھرے اُترے ہیں کہ کردار مزاحیہ ملا ہو یا سنجیدہ وہ اس میں با آسانی حقیقت کا رنگ بھر دیتے ہیں۔

۱۹۶۸ء میں فاروق شیخ نے اپٹا سے وابستگی اختیار کی اور اداکاری کی ان باریکیوں کو دیکھا جس کے سبب وہ آج بھی ترقی کے منازل طے کر رہے ہیں۔ اداکاری سے قبل انھوں نے قانون پڑھا لیکن اداکاری میں شوق کی وجہ سے وہ قانون کے پیشے کی طرف توجہ نہ دے سکے اور اداکاری کو ہی اپنا مقصدِ حیات بنا لیا۔

فاروق شیخ خود بھی سیریل بنانا چاہتے ہیں۔ بشرطیکہ دوردرشن انھیں اجازت دے دے۔

فاروق شیخ سمی پن یا دکھاوے میں یقین نہیں رکھتے وہ واضح طور پر اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ مجھے اسٹیج سے زیادہ فلمیں پسند ہیں۔ اُنھیں اس بات سے بھی انکار نہیں کہ آج کل کام کم مل رہا ہے اس لئے فلم یا سیریل کسی میں بھی وہ کام کرنے کے لئے تیار ہیں۔

☆☆☆

ہمعصروں میں منفرد اداکار۔ اَنل کپور

رشید انجم

نام : انل کپور۔ پیدائش: ۲۴ر دسمبر ۱۹۵۹ء۔ بمبئی

تعلیم : سینٹ زیویرس کالج بمبئی سے گریجویشن

والد : سریندر کپور۔ مشہور فلم ساز

بھائی : بونی کپور، فلمساز اور اداکارہ شری دیوی کے شوہر۔ سنجے کپور۔ فلم اداکار۔

بہن : رینا کپور۔ غیر فلمی ہستی۔

بیوی : سنیتا بھم بانی۔ غیر فلمی۔ بیٹیاں: سونم اور چھوٹی بیٹی___ بٹیا: ایک

پہلی فلم : ۱۹۷۹ء ''ہمارے تمہارے''۔ ہدایت: اُمیش مہرہ۔ ہیرو ہیروئن: سنجیو کمار اور راکھی۔

دوسری فلم: ۱۹۸۰ء ''ایک بار کہو''۔ ہدایت: لیکھ ٹنڈن۔ ہیرو ہیروئن: نوین نشچل اور شبانہ اعظمی۔

پہلی فلم بطور ہیرو: ۱۹۸۳ء ''وہ سات دن''۔ ہدایت بونی کپور۔ ہیروئن: پدمنی کولہاپوری۔

فلم انڈسٹری علمِ نجوم سے اخذ کی گئی سعد اور نجس ساعتوں اور نک چھروں کی اچھی بری چالوں سے (فلم کی پلاننگ سے لے کر فلم کی ریلیز تک) نتائج نکالتی ہے۔ یہاں مقدر بھی سمتیں طے کرتا ہے۔ Star Sons جن کے بچپن سے لے کر جوانی تک کا ہر لمحہ فلم کے آنگن میں گذرتا ہے، اگر ان کا مقدر یاور نہیں ہے تو اچھی فلم بھی اسکے مستقبل کو روشن کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ کئی مثالیں فلم انڈسٹری میں موجود ہیں۔ وہ مثالیں بھی ہیں کہ اچھی پرسنالٹی نہ ہوتے ہوئے بھی مقدر کی یاوری نے اس فنکار کو قماز کی حیثیت دلا دی۔ یہاں دو ہی چیزیں کام آتی ہیں۔ Talent یعنی قابلیت، صلاحیت جسے ہم Nature Gift بھی کہہ سکتے ہیں دوسری قسمت، مقدر یا نصیب۔

انل کپور ان اداکاروں میں ہیں جن کا خاندانی پس منظر بھی ان کے فلمی کیریر میں معاون رہا اور ان کی اپنی قابلیت وصلاحیت کے ساتھ مقدر نے بھی ان کی اداکاری کے مستقبل کو تابناک بنایا۔

سریندر کپور اپنے وقت کے کامیاب فلمساز و ہدایت کار تھے۔ ان کے تین بیٹے بونی کپور، انل

کپور اور سنجے کپور ہیں۔ بونی کپور نے فلمسازی کا میدان چنا تو انل کپور اور سنجے کپور نے اداکاری کو منتخب کیا انل کپور نے اپنی اداکاری کا آغاز امیش مہرہ کی فلم ''ہمارے تمہارے'' سے کیا تھا۔ اس فلم کے بعد ان کی دوسری فلم ''ایک بار کہو'' بھی ایسی ہی فلم تھی جس میں ان کا کردار نسبتاً معاون اداکار کا تھا۔ ان فلموں سے جب ان کی پہچان نہیں بن پائی تو ان کے والد سریندر کپور نے اپنے ہوم پروڈکشن کی فلم میں پیش کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ فلم کا اسکرپٹ جنوبی ہند کی کامیاب فلم سے ہندی میں منتقل کیا گیا۔ ۱۹۸۳ء کی فلم ''وہ سات دن'' میں انل کپور کا سامنا منجھے ہوئے اداکار نصیر الدین شاہ سے ہوا۔ اس فلم میں انل کپور نے بہت ہی معصوم، سیدھے سادے پریم پرتاپ پٹیالے والے کا کردار ادا کیا تھا اور یہ کردار ان کی فطری اداکاری کے عین مطابق تھا۔ فلم کہانی اور ہدایت کے ساتھ انل کپور کی وجہ سے بھی کامیاب ہوئی اور انل کپور کا نام فلمی حلقوں کے علاوہ فلم تماش بین کی زبان پر بھی آ گیا۔ اس فلم کا کلیدی کردار راج کپور کی کردار نگاری سے متاثر تھا۔ اس فلم کے بعد یش چوپڑہ نے ۱۹۸۴ء میں فلم ''مشعل'' میں انہیں دلیپ کمار اور وحیدہ رحمٰن کے مقابل کردار نگاری کا موقع دیا۔ انل کپور نے غنڈے کا کردار بھی اسی خوبصورتی اور معیاری فنکاری سے نبھایا تھا کہ دلیپ کمار بھی انہیں شاباشی دینے پر مجبور ہوگئے۔ اس فلم کا زبردست کامیابی کی وجہ سے ان کا شمار Multi Facted Star میں کیا جانے لگا۔ فلم ''مشعل'' میں بہترین معاون اداکاری کے اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ ساون کمار ٹاک کی فلم ''لیلیٰ'' میں سنیل دت ان کے مقابل تھے۔ ''صاحب''۔ ''اتہاس''۔ ''لومیرج''۔ ''یدھ''۔ ''محبت'' اور ''پیار کیا ہے پیار کریں گے''۔ ان کے اگلے چار سال کی چھ فلمیں تھیں جن میں ان کے مختلف کردار تھے اور ان فلموں میں وہ رومانٹک ہیرو بھی تھے اور Balance Hero بھی فلم ''انصاف کی آواز'' میں وہ Angry Young Man کے کردار میں پیش ہوئے۔

سبھاش گھئی ان کی فنکاری کے اتنے پرستار ہوئے کہ انہوں نے انل کپور کو اپنی فلموں ''کرما'' ۱۹۸۶ء۔ ''رام لکھن'' ۱۹۸۹ء۔ اور ''مال'' میں ایسے کردار دئے کہ انل کپور کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ ان کے بھائی بونی کپور نے انہیں مشہور زمانہ فلم ''مسٹر انڈیا'' ۱۹۸۷ء میں وہ کردار دیا جسے آج بھی ہر عمر کا فلم شائقین بہت

شوق اور ذوق سے پسند کرتا ہے۔ ''ایشور'' ۱۹۹۸ء۔ ''رکھوالے'' ۱۹۸۹ء کے بعد یش چوپڑہ نے فلم ''لمحے'' میں سری دیوی کے مقابل یادگار کردار دیا۔ جاوید اختر کی بیوی ہنی ایرانی کا لکھا اسکرپٹ ایک چیلینج تھا۔ فلم تو کامیاب نہیں ہوئی مگر انل اور مادھوری کے کام کو سراہا گیا۔ فلم ''ایشور'' ان کی وہ تنہا فلم ہے جس میں وہ Brilliantly Portayed Role میں آئے تھے۔ یہ کردار دماغی طور پر کمزور نوجوان کا کردار تھا اور Negative رول میں ڈھلنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

امیش چندرا کی فلم ''تیزاب'' ۱۹۸۸ء نے تو باکس آفس پر گویا قبضہ جما لیا تھا۔ اس فلم نے انل کپور کو وہ اونچائیاں دلا دیں جس کی آرزو ہر فلم اداکار کرتا ہے۔ ''تیزاب'' کے بعد اندر کمار کی فلم ''بیٹا'' ۱۹۹۲ء میں ان کی لاجواب پرفارمینس کو بے حد سراہا گیا۔ مشیر ریاض کی فلم ''وراثت'' ۱۹۹۷ء میں انہیں Critics Award سے سرفراز کیا گیا۔ انل کپور نے اپنی فلم سے اپنے فن کی داستان بیان کی۔ ''من''۔ ''بیوی نمبر ا'' ''جدائی''۔ ''ہیر رانجھا''۔ ''روپ کی رانی چوروں کا راجہ''۔ ان کی وہ فلمیں ہیں جن میں انہوں نے ایک جانب تو رانجھا جیسے عاشق کا رول کیا تو دوسری جانب دل کی دھڑکنوں میں بسیرا ڈھونڈھتا اور روپ کو چرا لینے کا حوصلہ رکھتا نوجوان محبوب کا کردار ادا کیا۔ ۲۰۰۰ء کی فلم ''پکار'' میں انہیں بہترین کردار نگاری کے لئے نیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اندر کمار کی فلم ''لجّا'' ۲۰۰۱ء میں ان کا کردار بہت مشکل تھا جسے انہوں نے اپنی فطری اداکاری سے بخوبی ادا کیا۔

ونود چوپڑہ نے جب ''۱۹۴۲ء اے لو اسٹوری'' کی منصوبہ بندی کی تو انہیں مجاہدانہ وطن پرست نوجوان کی ساری خوبیاں انل کپور میں نظر آئیں اور انل کپور نے اس فلم میں وطن پرست نوجوان کا رول نبھا کر ونود چوپڑہ کے اعتماد پر آنچ نہیں آنے دی۔

عمر نے جب اپنی گرفت مضبوط کی اور بیٹی سونم ہیروئن کی صف میں آ گئی تو انل کپور کو بھی ہیروشپ سے ریٹائرمنٹ لینا پڑا لیکن ''مسافر'' ۲۰۰۴ء ''بے وفا''۔ ''مائی وائف مرڈر''۔ ''چاکلیٹ'' ۲۰۰۵ء۔ ''ہم کو دیوانہ کر گیا۔ ۲۰۰۶ء فلموں میں جب انل نے کام کیا تو ان کے چہرے پر عمر کی پختگی ضرور نظر آئی مگر ان کے فن کے انداز وہی رہے فلم ''نو انٹری'' اور ''ویل کم'' جیسی ہلکی پھلکی تفریحی فلموں نے انل کپور کو پھر سے ان کا مقام دلانے کی کوشش کی۔ یہ کردار Parrallel رہے لیکن انل کپور کا فن کمزور نہیں پڑا۔

''ایشور'' ۔ ''مسٹر انڈیا''۔ ''بیٹا''۔ ''تیزاب''۔ ''صاحب''۔ ''محبت''۔ ''تال''۔ ''وراثت''۔ ''وہ سات دن''۔ ''مشعل''۔ ''پکار''۔ ''رام لکھن'' وغیرہ ان کی وہ فلمیں ہیں جو تجارتی اعتبار سے تو کامیاب تھی ہی لیکن انل کپور کے فن اور بہترین کردار نگاری کی کسوٹی پر بھی اتنی ہی کامیاب اور یادگار فلمیں ہیں جتنی کہ باکس آفس پر۔

ان کی اداکاری میں راج کپور اپنی وجودی صداقت کے فن میں نمایاں طور پر ظاہر ہوتے رہے ہیں تو انہوں نے اپنی دیگر فلموں میں راج کپور کی وجودی صداقت کے فن کو بھی نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔ یہ بہت عجیب ہے کہ ایک اداکار بیک وقت اپنے پیش رو کے فن کو بھی نمایاں کرے اور اپنے فن کو بھی پیش کرنے میں مہارت رکھتا ہو ___ یہ خوبی انل کپور میں موجود ہے۔ اسی لئے ان کے ہم عصر فنکاروں میں وہ انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔

☆☆☆

ہرفن مولا اداکار۔عرفان خان

بالی ووڈ میں جو اداکار بغیر کسی گاڈ فادر کے بلندیوں تک پہنچے ہیں، ان میں عرفان خان کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ جے پور سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے عرفان خان کو پہلے سے ہی اداکاری کا شوق تھا، لہٰذا تعلیم مکمل کر کے انہوں نے این ایس ڈی سے اداکاری کا ڈپلومہ کیا اور پھر ممبئی آ گئے۔ معمولی شکل وصورت کے اس اداکار نے یہاں آنے کے بعد 'چندر کانتا'، 'چانکیا' اور 'بیسٹ سیلر' جیسے سیریلوں سے اپنی اداکاری کا سفر شروع کیا اور اپنی بہترین اداکاری سے کچھ ہدایت کاروں کی توجہ اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہوئے۔ پہلے انہوں نے کچھ اور آرٹ فلمیں کیں۔ جیسے 'کملا کی موت'، 'پردھا'، 'ایک ڈاکٹر کی موت' وغیرہ۔ اسی دوران انہیں ایک غیر ملکی سیریل 'دی واریئر' میں مرکزی کردار ادا کرنے کا موقع ملا تو بالی ووڈ میں بھی وہ اپنے اچھے کام کی بدولت مشہور ہو گئے، تب کہیں جا کر بالی ووڈ کے کچھ فلم کاروں کو ان کی اداکارانہ صلاحیت کا احساس ہوا۔

عرفان پہلی بار فلم 'حاصل' سے لائم لائٹ میں آئے، جس میں ان کا منفی کردار تھا۔ اس کے بعد تو انہوں نے ہر طرح کا کردار کر کے سنیما میں پرفارمنس کا ڈھیر لگا دیا، لیکن عرفان اپنے آپ پر کسی امیج کا ٹھپہ لگانا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ان دنوں ہر طرح کی فلمیں کیں جیسے جہاں وہ 'مقبول' اور 'باربر' جیسی فلموں میں ہیرو تھے تو وہیں 'دی نیم سیک' سے 'کریزی 4'، 'آجا نچلے'، 'بڑا دن'، 'گھات'، 'قصور' 'کالی شلوار'، 'گناہ'، 'دھند'، 'سپاری'، 'فٹ پاتھ'، 'چرس'، 'آن'، 'روگ'، 'چہرہ'، 'ساڑھے سات پھیرے'، 'چاکلیٹ'، 'یوں ہوتا تو کیا ہوتا'، 'صرف 24 گھنٹے'، 'اپنا آسمان'، 'ممبئی میری جان'، 'نیویارک'، 'ایسڈ فیکٹری' اور 'اے مائٹی ہارڈ' وغیرہ فلموں میں انہوں نے ہر طرح کے کردار ادا کیے۔ یہی نہیں 'سنڈے' اور 'دل کبڈی' میں وہ کامیڈی کرتے ہوئے پائے گئے۔ یعنی عرفان خان ایک ہرفن مولا اداکار کے طور پر ہر کردار کو ادا کرنے میں باصلاحیت ثابت ہوئے۔

'دی واریئر' کے بعد ہالی ووڈ میں بھی عرفان ایک جانا پہچانا چہرہ بن گئے۔ لہٰذا انہیں ہالی ووڈ

کی فلم 'انڈین سمر' میں پنڈت جواہر لال نہرو کا کردار ادا کرنے کا آفر ملا، اس کے علاوہ آسکر یافتہ فلم 'سلم ڈاگ ملینئر' میں بھی ایک پولس آفیسر کا کردار ادا کر چکے ہیں۔ عرفان کسی بھی فلم میں اپنے کردار کے لیے کتنے چاق وچوبند رہتے ہیں، اس کا اندازہ فلم 'رائٹ یا رونگ' سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس فلم کی کہانی سننے کے بعد انہیں اپنا کردار کافی اچھا لگا، کیونکہ فلم میں یہ کردار ہیرو سنی دیول کے رول کو زبردست ٹکر دینے والا تھا۔ لیکن کچھ دنوں بعد انہوں نے جیسے ہی سنا کہ ان کا کردار سنی کے کردار کے مقابلے تھوڑا کمزور کر دیا گیا ہے تو انہوں نے وہ فلم چھوڑنے کا فوراً اعلان کر دیا۔ بعد میں جب اس فلم کے رائٹر وہدایت کار نیرج پاٹھک نے انھیں یقین دلایا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا ہے، ان کے رول کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی، تب جا کر وہ اس فلم کو کرنے کو تیار ہوئے۔ دراصل عرفان خان پوری طرح سے اداکاری کے تئیں وقف ہونے والے اداکار ہیں۔ لہٰذا انہیں اس میں بے ایمانی برداشت نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ''میں نے کبھی اسٹار کہلوانے کی ضد نہیں کی، میں تو اپنے آپ کو اداکار کہلوانا پسند کرتا ہوں''۔

(بشکریہ ''امنگ'' راشٹریہ سہارا۔نوئیڈا)

☆☆☆

خوبرو اداکار۔شاہد کپور

رشید انجم

پیدائش	:	۲۵ رفروری ۱۹۸۱ء (بمبئی)
والد	:	پنکج کپور
والدہ	:	نیلما عظیم
تعلیم	:	گریجویش
پہلی فلم	:	۲۰۰۳ ''عشق وشق'' ۔ ہدایت: کین گھوش ۔ ہیروئن: امرتاراؤ (عمر ۲۲ رسال)
کامیاب فلم	:	۲۰۰۷ر ''واوہ'' ۔ ہدایت: راج کمار برجاتیہ ۔ ہیروئن: امرتاراؤ
		۲۰۰۹ر ''کمینے'' ہدایت: وشال بھاردواج

دوردرشن پر ٹیلی کاسٹ سوشل سیریل ''تلاش'' آپ کو یقیناً یاد ہوگا۔ یہ سیریل ۹۰ رکی دہائی کا کامیاب ترین سیریل تھا۔اس سیریل کا سب سے دلچسپ، دل کش اور بیباک شہناز کا کردار تھا۔اس کردار کو ادا کیا تھا نیلما عظیم نے ۔انور عظیم اردو ادب کے ایک ممتاز ادیب، محقق اور افسانہ نگار تھے۔جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں اہم عہدے پر فائز رہے۔معیاد ملازمت ختم ہونے کے بعد کچھ عرصہ مکتبہ جامعہ دہلی میں بھی ملازم رہے اور ابھی کچھ سال قبل انتقال کر گئے۔انہیں نیک نفس اور شریف انسان انور عظیم کی بیباک اور نئی روشنی کی پروردہ بیٹی نیلما عظیم ہے۔نیلما عظیم کی تعلیم دہلی میں ہوئی۔سنیما اور فلم سے رغبت ہوئی تو دوردرشن کے سیریل ''تلاش'' میں لے لی گئیں۔اس سیریل کا کردار اور نیلما عظیم کی شخصیت نے دل و دماغ کی مسحور کر لیا تھا۔ہم اس کردار کی وجہ سے بھی اس سیریل کو شوق سے دیکھتے تھے۔

آپ کو مہیش بھٹ کی مشہور فلم ''سڑک'' بھی یاد ہوگی۔ سنجے دت اور پوجا بھٹ کے دوست کی حیثیت سے دیپک تجوری نے اہم کردار ادا کیا تھا۔دیپک تجوری کی محبوبہ کے کردار میں نیلما عظیم تھی۔

اپنی اسی بیباک فطرت، آزاد خیال اور رسم ورواج کو خاطر میں نہ لانے والی نیلما عظیم نے پنکج کپور سے شادی کی تھی۔پنکج کپور اور نیلما عظیم کا ہی بیٹا شاہد کپور ہے۔شاہد کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد نیلما اور

پنکج نے علیحدگی اختیار کر لی۔پنکج کپور نے مقبول اداکارہ دینا پاٹھک کی بیٹی نصیرالدین شاہ کی سالی اور فلم ''بازار'' کی دوسری ہیروئن سپریہ پاٹھک سے شادی کر لی جواب تک قائم ہے۔

تقریباً تین یا چار سال قبل نیلما عظیم بھوپال آئی تھی۔بھارت بھون کی آرٹسٹ سروج شرما کے ہمراہ بازار ابراہیم پورہ میں واقع میرے دوست نفیس صدیقی کے شوروم سے لکھنوئی لباس یہ کہہ کر خریدے تھے کہ وہ اپنے بیٹے شاہد کپور کے لئے خرید رہی ہے۔بل کی رقم میں تقریباً آٹھ سو روپے کم ہوئے جو نیلما ادھار کر گئی۔اسی دوران میرا بمبئی جانا ہوا تو شوروم کے مالک نفیس صدیقی نے مجھے نیلما عظیم کا پتہ لگانے کو کہا۔میں بمبئی پہونچا تو بمبئی کے انگریزی اخبار میں یہ خبر پڑھ کر حیران رہ گیا کہ نیلما عظیم، بڑے غلام علی خان کے پوتے کلاسیکل گائک کو لے فرار ہو گئی اور اس کی بیوی نے ایف آئی آر درج کروائی ہے۔پولس تلاش میں ہے۔اس خبر کے ساتھ دونوں کا جوائنٹ فوٹو بھی شائع ہوا تھا۔مقصد یہ کہ نیلما عظیم نے بمبئی شہر کی اس کہاوت کو سچ کر دکھایا کہ بمبئی، فلم، سیکس اور پیار کی نگری ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی کھلم کھلّا اداکارہ کا بیٹا بھی اتنا ہی کھلا ہوا ہونا چاہئے۔شاہد کپور نے ماں کو شرمندہ نہیں ہونے دیا کہ اس نے بھی فلم کا اور سیکس کا بے حد کھلا ہوا اظہار کیا۔

شاہد نے اپنے کیریر کی ابتداء ماڈلنگ سے کی تھی۔شاہ رخ خان کے ابتدائی دور میں جب شاہ رخ خان کو کوکا کولا کا برانڈ ایمبسیڈر بنایا گیا تو شاہد کپور نے شاہ رخ خان کے ساتھ اس برانڈ میں ماڈلنگ کی تھی۔اس وقت شاہد کی عمر غالباً دس سال رہی ہوگی۔ماڈلنگ سے ہی شاہد کی اداکاری میں نکھار پیداء ہوا اور پھر ان کے پشت پناہ داکارانہ فنکاری سے مالا مال ان کے والد پنکج کپور رہے جنہوں نے شاہد کو بہترین Tips دئے اور جب شاہد اس عمر پر آ گئے کہ وہ اداکاری کے میدان میں اتر کر اپنے جوہر سے تماش بینوں کو مبہوت کر دیں تو کین گھوش جیسے ہدایت کار نے انہیں اداکارہ امرتاراؤ کے مقابل رومانی فلم ''عشق وشق''۔ کے مرکزی کردار میں پیش کر دیا۔شاہد کپور نے سوجھ بوجھ سے کام لے کر ملٹی اسٹار فلم سے خود کو دور رکھا اور یقیناً پنکج کپور کا تجربہ اس معاملے میں ان کا ضامن رہا ہوگا۔۲۰۰۳ کی اس فلم نے تجارتی اعتبار سے کامیابی حاصل کی۔کین گھوش نے انہیں اپنی دوسری فلم ''خدا''۔میں بھی کلیدی رول میں پیش کیا۔۲۰۰۴ کی اس فلم کے دوسرے ہیرو فردین خان تھے۔اس فلم کی ہیروئن کرینہ کپور تھی۔بس یہی وہ لمحہ تھا جب کرینہ کپور نے شاہد کپور

کی ماں نیلما عظیم کی بیباک فطرت کا اس طرح مظاہرہ کیا کہ شاہد کپور اپنے شباب کے آغاز میں ہی پورے مرد بن گئے اور Live in relaionship ان کی نجی زندگی میں عود کر گیا۔اس طرح کہ کوئی پردہ داری نہیں رہی۔ بھارتی سنسکرتی جس پر بھارت کو ناز رہا ہے، گیلے کپڑے کی طرح سایہ کے تار پر ٹانگ دی گئی۔

یہ پیار بالی ووڈ کے لئے کوئی انوکھا پیار نہیں تھا۔ بالی ووڈ میں اس کی مثالیں بے گنتی مل جائیں گی۔ فلمی کیریئر اور اپنی فلموں کی پبلسٹی کے لئے ایسے ہتھکنڈے بہت زور شور سے استعمال کئے جاتے ہیں اور میڈیا انہیں نمکین بنا کر پیش کرتا رہا ہے۔

کرینہ اور شاہد کی جوڑی کو بالی ووڈ کے بے حد گرم جوڑی Hot Couple تسلیم کر لیا گیا اور ایک بعد ایک ان کی فلمیں کامیاب ہوتی گئیں۔

ستیش کوشک کی ''ملیں گے ملیں گے''۔ پرتیش نندی کی ''چلو دلبر چلو''۔امتیاز علی کی ''جب وی میٹ'' وغیرہ اس کی مثال ہیں۔''جب وی میٹ'' سے یہ جوڑی ٹوٹنے لگی تھی۔شاہد سے کرینہ کا دل بھر گیا تھا اور ۴۰ سالہ پختہ مرد اور تجربہ کار مگر خوبرو اداکار سیف علی کسی چور دروازے سے کرینہ کی زندگی میں داخل ہو گئے اور اچانک کرینہ نے شاہد کو الوادع کہہ دیا۔

شاہد کپور کا نام بعد میں ٹینس اسٹار ثانیہ مرزا سے بھی جوڑا گیا اور پرینکا ٹوڈی سے بھی مگر یہ حربہ زیادہ اثر دار ثابت نہیں ہو سکا۔کرینہ جیسی چارمنگ اور تیز تر اداکارہ کے ساتھ عباس مستان ''۳۶ چائنا ٹاؤن'' فلم ایٹل لائف کے دوکلوز کی تازہ ون تھری کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ ایک کلائمکس پر آ کے تھم سا گیا۔شاہد کرینہ کا Die Heart دوست تھا اور یہ تمغہ بعد میں سیف علی کے کھلے سینے پر اسکے ہونٹوں نے آویزاں کر دیا۔

۲۰۰۵ء میں شاہد کی لگاتار ۵ فلمیں ریلیز ہوئیں۔''دل مانگے مور''،''ملیں گے ملیں گے''، ''سپنے''،''دیوانے ہوئے پاگل''،''لائف ہو تو ایسی'' وغیرہ اور ۲۰۰۸ء میں ''قسمت کنیکشن'' فلم۔

پریہ درشن کے ساتھ شاہد نے کامیڈی فلم ''چپ چپ کے''۔کرینہ کپور کے ساتھ کی تھی جو ۲۰۰۶ میں ریلیز ہوئی تھی۔''چانس پہ ڈانس'' کے بعد یش چوپڑہ کی فلم ''بدمعاش کمپنی'' ۲۰۱۰ء میں ریلیز ہوئی۔

''وواہ'' کی کامیابی کے بعد وشال بھاردواج نے اپنی فلم ''کمینے'' میں شاہد کو مختلف انداز میں پیش کیا تو یش چوپڑہ کے فلم ادارے نے ''چانس پہ ڈانس'' فلم میں ان کی Dancing Performance کو

Cash کیا۔ بمبئی سنیما میں شاہد کپور نٹ کھٹ شہزادہ ہیں۔ اور انہیں انگریزی میں Wonderkid اور Kute Hunk بھی کہا گیا ہے۔ کم عمر ہونے کے باوجود شاہد میں غضب کا Talent ہے۔ وہ بہت زیادہ Energetic بھی ہیں۔ غریب فلمسازوں اور کم بجٹ کی فلموں کا شاہد کپور، شاہ رخ خان ہے۔

موجودہ دور میں جب شاہ رخ خان، سلمان خان، عامر خان اور سیف علی خان ۴۰ر عمر پار کر چکے ہیں اور تیزی سے پختہ عمر کو چھو رہے ہیں تو شاہد کپور کا مستقبل اس لحاظ سے روشن ہے کہ ان کے مقابلے میں رتیش دیش مکھ، عمران خان، جان ابراہیم اور ابھی شیک بچن ہیں۔ ان کے مقابلے میں شاہد کپور میں Dancing Ability کے علاوہ ڈائلاگ ڈیلیوری کا ایک مخصوص رومانی انداز پایا جاتا ہے۔ یہ ان کی ایکسٹرا کوالٹی ہے اور یہ کوالٹی اسٹار بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

☆☆☆

جادوئی فلموں کے دوتلوار باز اداکار۔رنجن،مہی پال

تحسین اختر

پرانے اداکاروں میں سکنڈ گریڈ اداکار بھی اپنی جگہ پر کافی اہمیت رکھتے ہیں۔اگر دلیپ کمار، راج کپور، دیوآنند،سنیل دت، منوج کمار، دھرمیندر، سنجیو کمار اور امیتابھ بچن، راجیش کھنّہ کو سُپر اسٹاروں کی صف میں رکھا جائے تو دوسری طرف کرن دیوان، شیکھر، رحمٰن، جگدیپ، رنجن، مہی پال، دارا سنگھ، جے راج وغیرہ اس زمانے میں سکنڈ گریڈ اداکاروں میں شمار کئے جاتے تھے جس طرح سے آج امیتابھ بچن، سلمان خان، عامر خان، سیف علی خان اور شاہ رُخ خان، اکشے کمار کے بعد دیگر اداکار جیسے اکشے کھنّہ، انیل کپور، فردین خان، سنی دیول، بابی دیول وغیرہ سکنڈ گریڈ ہیں، ویسے ان سکنڈ گریڈ اداکار کی فلمیں جب ریلیز ہوتی ہیں تو ان فلموں کی کامیابی کے بعد وہ وقتی طور پر فرسٹ گریڈ میں آجاتے ہیں مندرجہ ذیل حصّے میں آج ہم پرانے وقتوں کے دو سکنڈ گریڈ اداکار مہی پال اور رنجن کے بارے میں گفتگو کرینگے۔

رنجن: رنجن دراصل ایک عیسائی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور چونکہ ۱۹۶۰ء اور اس سے پہلے کے دور میں ہمیشہ ایسی فلمیں ریلیز ہوتی تھیں جس میں تلوار بازی کے کرامات ہوتے تھے اور زیادہ فلمیں بادشاہ اور غلام کی کہانیوں یا حکومت سے بغاوت کرنے پر منحصر ہوا کرتی تھی۔رنجن کو فلمساز و ہدایت کار سہراب مودی نے اپنی کلاسیک فلم ''پکار'' میں فائٹ ماسٹر کے طور پر شامل کیا تھا، کیونکہ رنجن کے اندر ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ تلوار بازی کے فن میں یکتا تھے اور اس شاندار انداز میں تلوار چلاتے تھے کہ سامنے والے کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتیں اور حریف منٹوں میں زیر، رنجن نے فلم پکار (۱۹۴۹ء) میں بطور شمشیر زنی ماسٹر کے طور پر فلم میں اداکاروں کو تلوار بازی سکھائی تھی،جس کے بعد ۱۹۵۰ء میں سہراب مودی کی کافی تاخیر سے ریلیز فلم ''سکندر'' ریلیز ہوئی جس میں رنجن نے پرتھوی راج کپور کو شمشیر زنی کے فن سکھائے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فلم ''کوہِ نور'' میں رنجن نے دلیپ کمار کو بھی شمشیر زنی سکھائی تھی لیکن چونکہ اس زمانے میں رنجن خود بھی ایک اسٹار بن چکے تھے اس لئے انہوں نے اپنی اس فلم کی کاسٹ میں سے اپنا نام ہٹا دیا تھا۔کیونکہ فلم کوہ نور سے پہلے وجئے بھٹ کی فلم ''باغی سپاہی'' ریلیز ہوئی تھی جس میں

رنجن نے بینا رائے کے مقابلے میں ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔باغی سپاہی ہٹ فلم ثابت ہوئی،جس کے بعد رنجن نے جادوئی چراغ میں شکیلہ کے ساتھ کام کیا پھر حاتم طائی کی بیٹی گیتا بالی، بزدل سورما میں شیاما اور ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۸ء کے دوران رنجن نے تقریباً ۴۰ فلموں میں ہیرو کا رول ادا کیا۔

۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۶ء کے بعد رنجن عمر دراز ہونے کی وجہ سے فلموں سے الگ ہو گئے لیکن ۱۹۷۴ء کی ریلیز فلم جال (بسواجیت۔انوپما) میں رنجن کو ایک مختصر رول میں دیکھا گیا پھر اس کے بعد وہ مزید کسی فلم میں نظر نہیں آئے اور ۱۹۷۹ء میں گوا کے شہر مرگاؤں میں ان کا انتقال ہوگیا۔ رنجن کے اندر سنجیدہ اداکاری بھی تھی اور خاص طور پر باغی سپاہی میں ان کے رول کو بیحد پسند کیا گیا تھا رنجن نے چترا نامی اداکارہ کے ساتھ کئی کلاسیک جادوئی فلموں میں ہیرو کا رول ادا کیا اس زمانے میں چترا، کمّو اور شیاما بی گریڈ فلموں کی اسٹار اداکارہ تھیں،لیکن بعد میں سعیدہ خان جیسی حسین اداکارہ کے آجانے کے بعد ان اداکاراؤں کی مارکٹ ختم ہوگئی سعیدہ خان نے علی بابا میں اجیت کے ساتھ کام کیا تھا۔

مہی پال: مہی پال نے اگرچہ دھارمک فلموں میں بہت زیادہ کام کیا اور انہیں دھارمک فلموں میں کرشن کے رول میں بہت زیادہ پیش کیا گیا اگرچہ مہی پال بنارس ہندو یونیورسٹی کے سائنس گریجویٹ تھے مگر بیحد خوبصورت اور وجیہہ چہرے ہونے کی وجہ سے انہیں بعد میں صرف دھارمک فلموں کا ہیرو بنا دیا گیا ویسے مہی پال نے سب سے پہلے اے ایچ واڈیا کی فلم ''زبک'' میں ایک باغی شہزادے کا رول ادا کیا تھا، اس فلم کی ہیروئن شیاما تھی،فلم میں اوشا کھنّہ کی موسیقی تھی اور گیت حسرت جے پوری کے تحریر کردہ تھے جس کے چند گیت جیسے:-

محلوں نے چھین لیا بچپن کا پیار میرا
مجھ کو الزام نہ دو کر لو اعتبار میرا

اس گیت کو محمد رفیع اور آشا بھونسلے نے گایا تھا اور یہ گیت ۱۹۶۷ء کی ریلیز زبک کا بہترین گیت مانا گیا۔زبک میں مہی پال اور ویلین وی ایم ویاس اور جیون کے ساتھ تلوار بازی کے کئی بہترین سین تھے، اس فلم میں کامیڈین کا رول سندرا اور بھگوان داس نے ادا کیا تھا اور مجموعی اعتبار سے یہ فلم بیحد کامیاب ہوئی تھی اور کئی شہروں میں سلور جبلی بھی ہوئی تھی۔مہی پال نے بھی علی بابا چالیس چور میں شکیلہ کے ساتھ ہیرو کا

رول ادا کیا جس کی موسیقی لالہ اشد ستار نے دی تھی، بعد ازاں کن کن میں بھگوان، مہاستی انسویئا، بھیم سنگھ بھگوان اوراس جیسی درجنوں دھارمک فلموں میں مہی پال نے کبھی کرشن کبھی راجکمار تو کبھی ناردمنی کا رول کیا اور وہ اپنی تمام فلموں میں کامیاب رہے اور بطور ایک اداکار انہیں بڑی تیزی سے ترقی ملی۔

۱۹۷۱ء میں پہلی مرتبہ اپنے وقت کے عظیم اداکار و ہدایتکار وی شانتا رام نے اپنی فلم ''لڑکی سیسا دری کی'' میں مہی پال کو سندھیا کے مقابلے میں ہیرو کا رول دیا اور یہ فلم کلاسیک نکتہ نظر سے، لتا منگیشکر کے گیت اور رام لعل کی سنگیت کی وجہ سے بیحد کامیاب ہوئی، اس کے بعد انہوں نے اُسے ''جل بن مچھلی نرتیہ بن بجلی'' میں سندھیا وی شانتا رام کی بیوی تھی جبکہ سندھیا وی شانتا رام کی رکھیل سمجھی گئی کیونکہ شانتا رام نے اس سے زندگی بھر شادی نہیں کی تھی۔ جے شری کی بیٹی راجشری مشہور ہیروئن بنی اور جانور، اراونڈ دی ورلڈ، سہاگ رات جیسی ہٹ فلموں کی ہیروئن بنی۔ جل بن مچھلی نرتیہ بن بجلی میں مہی پال کو ایک درباری گلوکار کے رول میں پیش کیا گیا تھا جو دربار شاہی کا گلوکار تھا اور اسی محل کی ناچنے والی سندھیا کے ساتھ محبت کرتا تھا جب راجہ کو ان دونوں کے تعلقات کا علم ہوا تو مہی پال کو سات سمندر پار بھجوا دیا، مگر اُس کے دل سے نکلی ہوئی آواز سے آخر میں دونوں کا ملن ہوگیا۔

☆☆☆

ہر کردار میں فٹ ویلن ۔ پران

خاور حسن

ایک اچھا اداکار وہی ہے جو کمہار کی گیلی مٹی کی طرح ہر روپ میں ڈھل جائے اور چوں کہ پران بھی ایک ایسے ہی اداکار ہیں اس لیے انھوں نے ایک شبیہ بنائی اور خود ہی اسے توڑ دی۔ ایک وقت وہ تھا جب پران، راون کی طرح سمجھے جاتے تھے اور کم از کم فلموں سے ذرا بھی رغبت رکھنے والے اپنے بچے کا نام پران رکھنا پسند نہیں کرتے تھے لیکن 'اپکار' کے بعد وہی پران ملنگ چاچا بن کر اس قدر مقبول ہوئے کہ ایک بچے نے اپنے خط میں انھیں یہاں تک لکھ دیا کہ جس طرح چاچا نہرو ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے اسی طرح وہ بھی 'ملنگ چاچا' کے روپ میں ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

ایسا نہیں ہے کہ پران شروع سے ہی فلموں میں آنا چاہتے تھے، ان کے انٹرویوز اور ان پر لکھے گئے مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دراصل ایک فوٹوگرافر بننا چاہتے تھے مگر یہ ولی محمد دلی کی پارکھی نگاہ تھی جس نے ان میں اداکاری کی خوبیاں دیکھی اور انھیں زبردستی فلم انڈسٹر میں لے آئی۔ اس تعلق سے واقعہ یہ ہے کہ پران ۱۹۳۹ء میں جب فوٹوگرافی کے کام کے سلسلے میں لاہور سے دہلی آئے ہوئے تھے تو وہ ایک پان کی دکان پر اپنے دوستوں کے ساتھ اکثر جایا کرتے تھے۔ ایک دن گئے تو انھوں نے ایک شخص کو اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس شخص نے خود ہی اپنا تعارف دیا کہ وہ ولی محمد ولی ہیں۔ ولی نے پران کو یہ بھی بتایا کہ دل سکھ پنچولی جو اسٹوڈیو کے مالک اور فلم ساز ہیں وہ ان کے رائٹر ہیں اور ان کی پنجابی فلم 'یملا جٹ' کے ولین کے کردار کے لیے وہ چوں کہ فٹ معلوم ہوتے ہیں اس لیے چاہتے ہیں کہ یہ کردار وہ کریں۔ ولی نے انھیں اپنا کارڈ دیا لیکن پران مقررہ وقت پران سے نہیں ملے۔ اگلے سنیچر کو جب وہ فلم دیکھنے گئے تو 'پلازا' سنیما میں پھر ولی کی ملاقات پران سے ہوگئی۔ اس بار انھوں نے پران سے ان کا پتہ بھی معلوم کیا اور پھر انھیں لے جا کر اپنے فلم ساز سے ملایا اور وہ منتخب کر لیے گئے۔

'یملا جٹ' گرچہ ایک بے حد ہٹ فلم ثابت ہوئی لیکن پہلی بات تو یہ تھی کہ یہ ایک پنجابی فلم

تھی اور دوسری بات یہ تھی کہ اس میں پران کا کردار ولن کا تھا اس لیے اس نے انہیں وہ کامیابی نہیں ملی جس کی انہیں امید تھی ۔لیکن تیسری ہی فلم 'خاندان' جو ان کی ہندی میں پہلی فلم تھی انھوں نے نور جہاں کے ساتھ کی ۔ یہ فلم نور جہاں کی بھی پہلی فلم تھی اور اس وقت ان کی عمر مشکل سے ۱۲۔۱۳ سال کی تھی ۔ پران نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ نور جہاں اس وقت اتنی چھوٹی تھیں کہ ان کے ساتھ کلوز اپ لینے کے لیے انھیں اینٹوں پر کھڑا کیا جاتا تھا۔

پران کی فلم انڈسٹری میں آنے کے ۵ سال بعد دلیپ (۱۹۴۶ء)، دیو آنند (۱۹۴۵ء) اور راج کپور (۱۹۴۶ء) ہیرو کی حیثیت سے فلم انڈسٹری میں داخل ہوئے ۔ وہ کتنے باصلاحیت ہیں اور کتنے اچھے اداکار ہیں اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ جس دلیپ کمار کے منہ سے اپنی تعریف سننے کے لیے اداکار ترستے ہیں وہی دلیپ کمار 'دل دیا درد لیا' میں تقریباً ہر شاٹ کے بعد ان سے پوچھ کر اطمینان کرتے ۔ ایسا شاید اس لیے ہوا کہ اس فلم میں دلیپ کمار کا جو کردار تھا وہ بے حد جذباتی کردار تھا اور یہ ان کرداروں سے مختلف تھا جو انھوں نے اس وقت تک ادا کیا تھا۔

امجد خان کے 'گبر سنگھ' اور امریش پوری کے 'موگیمبو' کے رول کو جو مقبولیت ملی ویسی مقبولیت ان کے کسی کردار کو نہیں ملی تو اسے صرف اتفاق کہا جا سکتا ہے مگر انھوں نے جو کردار ادا کیے وہ کم متاثر کن نہ تھے ۔ انھوں نے ان کرداروں کو کتنے بہترین طریقے سے ادا کیا اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ آج بھی جب لوگ ۴۰ سال پہلے بنی ان کی فلمیں دیکھتے ہیں تو ان کے ولین کے کردار سے نفرت کیے بغیر نہیں رہ پاتے لیکن یہ پران کی لاجواب اداکاری کا ہی کمال ہے کہ یہی لوگ جب ان کی فلم 'اپکار' اور 'زنجیر' دیکھتے ہیں تو اپنے دل میں ان کے لیے ایک شدید محبت محسوس کرتے ہیں ۔ایسا کئی لوگوں نے ان کی فلمیں دیکھ کر مجھے بتایا۔

اچھا آرٹسٹ اکثر اپنی پرفارمینس سے اپنے شائقین کو چونکا دیتا ہے۔فلم بیں چونکے تھے جب انھوں نے 'اپکار' دیکھا لیکن اہم بات یہ تھی کہ اس پرفارمینس سے انھوں نے فلم والوں کو بھی چونکا دیا۔ پران نے خود اپنے ایک انٹرویو میں بتایا کہ موسیقار کلیان جی کو جب معلوم ہوا کہ ان کی موسیقی سے لبریز نغمہ 'قسمیں وعدے پیار وفا، وعدے ہیں وعدوں کا کیا' کی فلم بندی منوج کمار، پران پر کرنا

چاہتے ہیں تو انھوں نے منوج کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ وہ نغمہ کا 'ستیاناس' نہ کریں لیکن منوج بضد رہے ۔ آخر کار جب فلم ریلیز ہوئی تو انھیں کلیان جی نے پران سے معافی مانگتے ہوئے ان کی تعریف کی اور کہا'' آپ پہلے آرٹسٹ ہیں جنھوں نے منہ سے نہیں، گلے سے ہمارا گانا گایا ہے'' ۔

پران فلموں میں نہیں آنا چاہتے تھے لیکن ان کی قسمت انھیں فلموں میں لے آئی اسی طرح ان کی زندگی بچنی تھی اس لیے وہ بروقت اندور چلے آئے ورنہ وہ بھی شاید فسادات کی نذر ہو گئے ہوتے ۔ پران کے مطابق ۱۹۴۷ء میں فسادات کے شروع ہونے کے بعد انھوں نے اپنی بیوی، ایک سال کے اپنے بیٹے اور اپنی سالی کو اندور بھیج دیا۔ بیٹے کی یوم پیدائش ۱۰؍اگست تھی ۔سن ۴۶ میں پیدا ہوا تھا۔ بیوی شکلا بضد ہوگئیں کہ وہ اگر ۱۰؍اگست کو اندور نہ پہنچے تو وہ بچے کی سالگرہ نہیں منائیں گی ۔

بیوی کی ضد کے سامنے انھیں جھکنا پڑا اور لاہور سے روانگی کے اگلے ہی دن انھوں نے جب آل انڈیا ریڈیو سے فسادات کی خبر سنی تو وہ کانپ گئے ۔ ۱۴؍اگست کو ممبئی کے ہوٹل 'تاج محل' میں انھوں نے قیام کیا لیکن جلد ہی انھیں اندازہ ہو گیا کہ ان کی راہ آسان نہیں ۔ پھر حالات نے انھیں نہ صرف اپنی شریک حیات کے زیورات فروخت کرنے پر مجبور کر دیا بلکہ چھوٹے ہوٹلوں میں قیام پر بھی مجبور کر دیا ۔

پہلی فلم بمبئی میں انھیں 'ضدی' ملی ۔ یہ عصمت چغتائی کے ناول پر تھی جو ۱۹۴۸ء میں بنی اور ایک ہٹ فلم ثابت ہوئی ۔ اس کے بعد ان کی گاڑی چل پڑی اور انھوں نے پھر کبھی مڑ کر نہیں دیکھا ۔ ۱۲؍فروری ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے پران اب ۸۸ ویں برس میں لگ چکے ہیں، بوڑھے ہو چکے ہیں مگر ان کے کردار آج بھی جوان ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ کبھی بوڑھے نہیں ہوں گے ۔

☆☆☆

منفرد لہجے کا ویلن ۔ جیون

تحسین اختر

فلمی ویلینوں میں جہاں بہت سارے اہم نام ہیں وہیں ایک نام جیون کا بھی ہے اور جیون نے ایک ایسے دور میں اپنی پہچان اور شناخت قائم رکھی جس زمانے میں جینت، پران، تیواری، الہاس، مدن پوری، ہیرالال این اے انصاری کے این سنگھ، منموہن، پریم چوپڑہ جیسے کہنا مشق اور مشہور ویلین فلمی افق پر چھائے ہوئے تھے۔ جیون نے دلیپ کمار، راج کپور، دیو آنند، راجندر کمار، دھرمیندر، منوج کمار، راجیش کھنہ، امیتابھ، راج کمار، پردیپ کمار سمیت اپنے وقت کے تمام بڑے ہیروز کے ساتھ اور تقریباً سبھی بڑی ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا اور اپنے کام کے ساتھ اپنی پہچان بھی رکھی۔ جیون کے اندر ڈائیلاگ بولنے کا ایک مخصوص انداز نمایاں تھا اور وہ جس انداز سے اپنے ڈائیلاگ بولتے تھے، اس کی بنیاد پر انہیں منفرد اداکار کے روپ میں شناخت کیا گیا۔ فلم میلہ میں دلیپ کمار اور نرگس کے ساتھ ان کا بے حد دلچسپ رول تھا اور وہ سیدھے سادے گاؤں والوں پر اپنی انگریزی دانی کا مظاہرہ کرکے رعب جھاڑتے تھے اس فلم میں اس موقع کا بہترین ڈائیلاگ وہ تھا جب وہ گاؤں کے سیدھے سادے نوجوان دلیپ کمار کو گاؤں سے نکالنے کی سازش کرتے ہیں اور گاؤں والوں کو پٹی پڑھاتے ہیں کہ دیکھو اس میں صاف صاف لکھا ہے ''اے بی سی ڈی'' یعنی اس کا مطلب یہ نوجوان دھوکے باز ہے اور اسے گاؤں میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے اور یہ دیکھو لکھا ہوا ہے ''ای یف جی ایچ'' اس کا مطلب ہے اس نے گاؤں کی نوجوان لڑکی کے ساتھ عشق کا جھوٹا ناٹک کیا ہے۔ لہذا اس کا منھ کالا کرکے گاؤں سے نکال دینا چاہئے اور یہ دیکھو اس میں صاف صاف لکھا ہے ''آئی کے جے کے ایل ایم'' اس کا مطلب ہے اس نے گاؤں والوں سے غداری کرکے سبھوں کا جینا حرام کیا ہے لہذا اسے پکڑ کر مارنا چاہئے اور سیدھے سادے ان پڑھ گاؤں والے اس کی انگریزی دانی سے بے حد مرعوب ہوتے ہیں اور گاؤں کا مکھیا پنچائت بٹھا کر دلیپ کمار کو گاؤں چھوڑ کر چلے جانے کا حکم دیتا ہے اس موقع پر جیون کی مکارانہ ادا ایسی ہوتی ہے کہ فلم بین ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جیون ایک خطرناک ویلین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مزاحیہ اداکار بھی تھے، فلم کوہ

نور میں دلیپ کمار اور مینا کماری کے ساتھ کئی ایسے خوبصورت مزاحیہ سین ہیں جو کہ دیکھنے کے لائق تھے، خاص طور پر محل کا وہ سین جس میں دلیپ کمار آئینہ کو ہٹا کر خود آئینہ کے ساتھ داڑھی مونچھ لگا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور نشے میں دھت جیون اسے آئینے میں اپنا ہی عکس سمجھتا ہے اور پھر دس منٹوں تک جو مزاحیہ سین ہیں وہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں اور اس سین کو کرکے دلیپ کمار نے بھی اپنے آپ کو بڑے مزاحیہ اداکار ثابت کر دیا تھا۔ اسی سین کو ۳۰ برسوں کے بعد امیتابھ بچن نے بھی فلم ''قلی'' میں دہرایا اور بہت ہی بھونڈے پن سے دہرایا جب کہ سین کو فلم ''میڈیم ایکس'' میں شکتی کپور اور جگدیپ کے درمیان دہرایا گیا لیکن جو بات فلم کوہ نور میں تھی وہ کسی اور میں نظر نہیں آسکی۔

دلیپ کمار اور جیون کی اصل ٹکر ''بی آر چوپڑہ کی فلم ''نیا دور'' میں دیکھی گئی۔ اس فلم میں جیون کو شہر کا رنگیلا تعلیم یافتہ شخص دکھایا گیا ہے جو گاؤں میں یکّہ چلانے والوں اور کارخانے میں کام کرنے والوں کی زندگی برباد کرنے آتا ہے۔ وہ گاؤں میں یکّہ کی جگہ پر بس لے آتا ہے اور مشین پر کام کرنے والوں کی جگہ ایک ایسی مشین لے آتا ہے جو ڈیڑھ سو مزدوروں کا کام بیک وقت کرسکتا ہے اور وہ بھی ۱۰ گھنٹوں کا کام ایک گھنٹہ میں۔ لہذا پہلے تو کارخانے میں کام کرنے والے تمام مزدور کی چھنٹائی ہو جاتی ہے جس کی بنا پر ۱۰۰ کے قریب مزدور اچانک بے کار ہو جاتے ہیں دوسری طرف گاؤں کے دس پندرہ یکے والے بھی بس کے آجانے سے بیکار ہو جاتے ہیں کیونکہ بس انہیں جلد ان کی منزل تک پہنچا دیتی ہے اور کرایے میں بھی کافی بچت ہو جاتی ہے لہذا شہری بابو جیون دیکھتے ہی دیکھتے پورے گاؤں کے مزدور، محنت کشوں اور یومیہ اجرت پر کام کرنے والوں کو بے کار کر دیتے ہیں اور ایسے میں تین چار سین میں دلیپ اور جیون کے درمیان ڈائیلاگ رکھے گئے ہیں وہ اگرچہ وقت کے آواز کے مطابق ہیں لیکن ان کی ادائیگی کا انداز بالکل وہی ہے جو منظر آج ہمیں نندی گرام اور سینگور میں نظر آتا ہے۔

جیون کی ایک اور یادگار فلم ''جانی میرا نام'' ہے اس فلم میں جیون پریم ناتھ کے لئے ایک خطرناک اسمگلر کا رول ادا کرتے ہیں اور پوری فلم میں ان کے ڈائیلاگ کی ادائیگی فلم کی جان ہے اور خاص طور پر فلم کا آخری سین جس میں دیو آنند کی ماں سلوچنا کو پریم ناتھ کوڑے برسانے کا حکم دیتا ہے اور ماں کوڑے کھانے کے باوجود اس کا اعتراف نہیں کرتی ہے دیو آنند اور پران اسی کے بیٹے ہیں اور ایسے وقت میں جیون، پریم ناتھ کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ ماں پر کوڑے برسانے کے بجائے ماں کے سامنے بیٹوں پر کوڑے برسائے، جس کے بعد ماں کا دل پھٹ جائے گا اور وہ اقرار کرلے گی کہ یہ دونوں اسی کے بیٹے ہیں۔ اس

سین میں جیون بھی جس انداز میں غدار ہوتا ہے اور جس طرح کی مکاری کا اظہار کرتا ہے اس کی بنیاد پر وہ اس سین میں پریم ناتھ، دیوآنند، پران، افتخار جیسے اداکاروں کو اپنی اداکاری کے ذریعہ پھیکا کر دیتا ہے۔

جیون کے اندر ایک بری بات یہ تھی کہ وہ کسی بھی اداکار کے آگے جھکتے نہیں تھے، بلکہ اپنی اداکاری کی پختگی انہیں دوسروں کے مقابلے میں اونچا کر دیتی تھی، راجیش کھنہ اور ممتاز کے ساتھ انہوں نے روٹی اور بندھن فلم میں کام کئے اور ان دونوں فلموں میں ان کی اداکاری بے حد منفرد رہی۔ خاص طور پر بندھن میں جب وہ انتقام کی ہوس میں اپنے دشمن کی بیٹی کی عزت لوٹنا چاہتا ہے اور اس حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے کہ وہ لڑکی اس کے بیٹے کی محبوبہ ہے اور اس کی بہو بننے والی ہے اور اس سین میں راجیش کھنہ کے ہاتھوں اس کے باپ جیون کا قتل ہو جاتا ہے لیکن مرنے سے پہلے ضمیر جاگ اٹھتا ہے وہ اپنے بیٹے سے گذارش کرتا ہے کہ دنیا والوں کے سامنے اس کا یہ کیرکٹر سامنے نہ آنے پائے، لیکن عدالت جبکہ راجیش کھنہ کو اپنے باپ کے قتل کے جرم میں سزائے موت کا اعلان کرنے والی تھی اس موقع پر ممتاز آ کر سارا واقعہ جج کے سامنے بیان کر دیتی ہے کہ اس کی موت خود اپنی کلہاڑی سے ہوئی ہے۔

جیون نے تقریباً ۵۰ برسوں تک فلموں میں اداکاری کی اور چھوٹے بڑے رولز کے ساتھ اس نے تقریباً ۳۰۰ سے زائد فلموں میں کام کئے۔ جیون کا اپنا کہنا تھا کہ اس کی نظر میں ہندی فلموں کے سب سے بہترین ویلین کوئی تھے تو وہ پران اور انہوں نے اپنی اداکاری کی جو چھاپ چھوڑی ہے وہ انمٹ ہیں۔ انہوں نے دلیپ کمار کے بارے میں کہا تھا کہ اس سے بہتر مزاحیہ اداکار اور کوئی نہیں ہے۔ جیون کا لڑکا کرن کمار بھی ایک نامور اداکار ہیں پہلے انہوں نے چھوٹی چھوٹی فلموں میں ہیرو کے رول کئے اور راجیش کھنہ کی اداکاری کی۔ جنگل میں منگل بطور ہیرو ان کی بہترین اور ہٹ فلم ثابت ہوئی بعد ازاں انہوں نے بھی ویلین کے کردار شروع کئے۔ خدا گواہ ان کی بہترین فلم ثابت ہوئی۔ پچھلے چند سالوں کے دوران انہوں نے ٹی وی سیریلوں میں بھی کام کئے اور مجموعی طور پر ان کی شناخت تو ہے مگر وہ کوئی خاص تاثر قائم نہیں کر سکے۔

☆☆☆

ناقابلِ فراموش ویلن۔ کے این سنگھ

ثانیہ قیصر (مغربی بنگال)

کیدار ناتھ سنگھ عرف کے این سنگھ ہندی فلموں کے ایک ایسے ناقابلِ فراموش ویلین اور بہترین اداکار گزرے ہیں جنہوں نے اشوک کمار، راج کپور، دلیپ کمار، دیوآنند، منوج کمار، دھرمیندر، امیتابھ بچن کے ساتھ مشترکہ طور پر کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ شمی کپور، ششی کپور کے ساتھ اپنی اداکاری کے جلوے دکھا کر یہ ثابت کیا کہ وہ ایک ایسے منفرد اور ناقابل فراموش اداکار گزرے جو کسی کے سامنے بھی نہیں دبے حتیٰ کہ پرتھوی راج کپور کے ساتھ بھی ڈائیلاگ بولنے میں ان کا انداز منفرد رہا۔ کے این سنگھ جن کا انتقال ۱۹۹۶ء میں باندرہ بمبئی میں ہوا وہ اپنی زندگی کے آخر ۵ برس اندھے پن کا شکار ہو گئے تھے اور پھر ایک دن اپنے اپارٹمنٹ میں خاموشی سے چل بسے۔ ان کی بیوی کا ۱۹۷۲ء میں انتقال ہو چکا تھا اور ایک لڑکا جو کہ امریکہ میں شادی کر کے بس گیا تھا اور لڑکی کی شادی کناڈا میں ہوئی تھی اور ان دونوں نے پلٹ کر اپنے باپ کی خبر بھی نہیں لی تھی۔ ممکن ہے ان کے آپسی تعلقات شروع ہی میں بگڑ گئے ہوں، تاہم اتنا ضرور ہے کہ کے این سنگھ نے دونوں بچوں کو تعلیم دلائی اور ان کی شادیاں بھی کیں، لیکن شادی کے چند سال بعد ہی انھوں نے اپنی پچھلی زندگی کی طرف مڑنا پسند نہیں کیا تھا۔

راج کپور نے سب سے پہلے کے این سنگھ کو اپنی فلم ''آوارہ'' میں ویلین کا رول دیا، اس فلم میں کے این سنگھ نے ایک ایسے خطرناک غنڈے کا رول کیا تھا جسے دیکھنے کے بعد صحیح معنوں میں ڈر محسوس ہو۔ آوارہ فلم میں راج کپور کے ساتھ آمنے سامنے اس کے کئی شاٹ تھے۔ اور اس میں کے این سنگھ کی ہیبت ایسی تھی کہ راج کپور کے پسینے چھوٹ رہے تھے اور دوسری طرف ان کی شکل دیکھ کر ناظرین بھی شدید نفرت کرتے تھے اور کے این سنگھ کو اسی نفرت کے اظہار نے کامیابی دلائی تھی۔ اگرچہ اس دور میں پران اپنی اداکاری کے ذریعہ لوہا منوا چکے تھے لیکن اس کے باوجود آوارہ میں کے این سنگھ کو سڑک چھاپ غنڈے کا رول اس لئے دیا گیا کہ وہ دیکھنے والوں کو ڈرا سکیں۔ اس فلم میں ان کی اداکاری کو گوپ اور ڈیوڈ جیسے کہنہ مشق اداکاروں نے سراہا تھا۔

کے این سنگھ ہندی، انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو اور پشتو زبان بھی اچھی طرح سے بولتے تھے۔ فلم عدل

جہانگیر میں خالص اُردو ڈائیلاگ دیئے گئے تھے اور ضیاء سرحدی کے اردو ڈائیلاگ نے اس فلم کو بیحد کامیاب بنایا تھا۔ کے این سنگھ خود یہ کہتے تھے کہ انہیں سب سے زیادہ اشوک کمار کے ساتھ کام کرنے میں مزہ آیا، کیونکہ وہ ایک ایسے منجھے ہوئے اداکار تھے جنہیں ڈائریکٹر کو کچھ بھی ہدایت دینے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

کے این سنگھ نے اپنے ۵۰ سالہ فلمی کیریر میں تقریباً ۱۵۰ فلموں میں کام کیا، لیکن عہد نوجوانی میں انھوں نے ایک خطرناک قسم کے ویلین کا رول جس انداز میں نبھایا اُسے بیحد پسند کیا گیا خاص طور پر جب وہ غصّے کا اظہار کیا کرتے تھے تو ان کی آنکھیں بیحد خطرناک نظر آنے لگتی تھیں اور اس وقت ایک جنونی قاتل نظر آنے لگتے تھے۔ ہوڑہ برج میں مدھو بالا، اشوک اور سنگھ کے درمیان خطرناک لڑائی ہوڑہ پل کے اوپر ہوئی تھی، اگرچہ اس کے لئے ایک ڈمی ہوڑہ پل فلمستان اسٹوڈیو میں پورے دو ماہ کی صنعت سے تیار کی گئی تھی اور ڈی پل کی سیڑھیوں پر وہ بھاری بھرکم جسم کو لے کر جس تیزی کے ساتھ دوڑتے نظر آتے ہیں وہ منظر بیحد خوبصورتی کے ساتھ فلمایا گیا تھا۔ کے این سنگھ نے فلم آوارہ میں ایک خطرناک سڑک چھاپ غنڈے کا رول بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ نبھایا تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر راج کپور اور نرگس کی گھگّی بندھ جایا کرتی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ راج کپور نے کے این سنگھ کو جو بریک آوارہ میں دیا اس کی وجہ سے کے این سنگھ اپنی فلمی کیریر کو کم از کم ۴۵ برسوں تک کھینچنے میں کامیاب ہو گئے۔

کے این سنگھ نے منوج کمار، اشوک اور شکیلہ کے ساتھ فلم ''نقلی نواب'' میں ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ اس فلم میں مشاعرے کے سین بیحد دلچسپ تھے اور کے این سنگھ، اشوک کمار اور منوج کمار تینوں ہی نے شاعر کا رول نبھایا تھا۔

کے این سنگھ نے شمی کپور، راج کپور، ششی کپور، منوج کمار، سنیل دت، دیوآنند، اشوک کمار، پردیپ کمار، شیخ مختار وغیرہ کے ساتھ کام کیا۔ اور ان کی فیوریٹ ہیروئن ثریا اور شکیلہ تھیں، وہ ان دنوں ہیروئنوں کو بیحد ٹیلینٹ سمجھتے تھے فلم راز (اشوک کمار، راج کپور، ثریا) میں شکیلہ نے ثریا کے بچپن کا رول اس خوبصورتی کے ساتھ نبھایا تھا کہ پورا بمبئی فلم انڈسٹری شکیلہ کا گرویدہ ہو گیا تھا۔

فلم کالا پانی میں کے این سنگھ کا بیحد اہم رول ہے اور اس فلم میں انھوں نے ایک ایسے خطرناک سازشی قاتل کا رول ادا کیا جو صحیح معنوں میں دیکھنے کے لائق تھا۔ چونکہ سنگھ اپنی اداکاری کا اظہار اپنی آنکھوں اور پیشانی پر پڑنے والے سلوٹوں سے بھی کر لیتے تھے اس

لئے انہیں ایک بیحد کامیاب اداکار تصور کیا گیا تھا۔

شکتی سامنت کی ہٹ فلم ''این ایوننگ ان پیرس'' جس میں شمی کپور، شرمیلا ٹیگور (ڈبل رول) اور پران نے رول ادا کیا تھا، اس فلم میں کے این سنگھ کا ایک مختصر مگر بیحد متاثر کن مافیا ڈان کا رول تھا اور فلم کے اس سین میں جب پران قتل کے ارادے سے کے این سنگھ کے زیرزمین تہہ خانے میں داخل ہوتے ہیں تو ایسے انداز میں ان کا قتل کرتے ہیں جس انداز میں جیمز ہیڈلی چیز کے ناول ''اے پلاٹ ٹوکل'' A Plot to kill میں ہیرو گرلینڈ ایک مافیا ڈان کا قتل کرتا ہے۔ کے این سنگھ اپنے زمانے میں ان ویلینوں میں شمار کئے جاتے تھے جن میں الہاس، جیون، جینت، سپرو وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ پران دوسری نسل اور پریم چوپڑہ، منموہن، اجیت تیسری نسل کے ویلین ہیں جبکہ موجودہ نسل میں ایک بھی ایسا ویلین نہیں خاص طور پر امریش پوری کے انتقال کے بعد کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔

ناصر حسین کی سدابہار فلم ''تیسری منزل'' میں بھی کے این سنگھ کا ایک مختصر سا لیکن بیحد خطرناک رول ہے جبکہ اس فلم میں وہ ایک بھی ڈائیلاگ نہیں بولتے بلکہ رائے صاحب (پریم ناتھ) کی ایک حویلی کے باہر سرونٹس کوارٹر کے اندر کمرہ بند کر کے صرف شراب پیتے نظر آتے ہیں لیکن اسی مختصر رول کے باوجود کے این سنگھ سبھوں کے دلوں کو بھا گئے۔ کے این سنگھ نے اپنی زندگی کے آخری دور میں فلم ''کالیا'' میں امیتابھ بچن، پروین بابی، ہیرالال وغیرہ کے ساتھ کام کیا تھا اور یہ امیتابھ بچن کی خوش قسمتی ہے کہ اس نے پرانے دور کے سب سے بہترین ویلین کے ساتھ ایک سین کر لیا۔

☆☆☆

جاسوسی فلموں کا مقبول ویلن۔این اے انصاری

ہما انور (مغربی بنگال)

نثار احمد انصاری عرف این اے انصاری ہندی فلموں کے ایک ایسے ایکٹر، ڈائریکٹر، پروڈیوسر، اسکرپٹ اور ڈائیلاگ رائیٹر گزرے ہیں جن کی ۱۶/دسمبر کو ۲۷ویں برسی ہے وہ ۱۶ دسمبر ۱۹۸۰ء کو اپنے وطن بنڈیل کھنڈ میں انتقال کر گئے تھے۔این اے انصاری کو پرانے وقتوں کے لوگوں نے جانا اور پہچانا، ۱۹۵۷ء میں دریا دل فلم سے انھوں نے اپنے فلمی کیریر کا آغاز کیا اور نلنی جیونت کے ساتھ معاون ہیرو کا رول نبھایا،اس کے بعد ۱۹۶۰ء۱۹۶۵ء کے دوران نرتکی، پہلا سوال،الفت، جاگیر سنہرے پل وغیرہ میں ویلین کا رول ادا کیا، ۱۹۶۶ء میں انھوں نے پہلی مرتبہ بنڈیل کھنڈ فلمز کے نام پر اپنی پروڈکشن شروع کی اور پہلی فلم ''بلیک کیٹ'' بنائی۔اس فلم میں بلراج ساہنی اور مینو ممتاز نے لیڈ رولز کئے تھے اور ایک قاتل ڈاکٹر کے رول میں این اے انصاری جن کا سائڈ بزنس اسمگلنگ،ڈکیتی اور چور بازاری تھی، اس رول میں انھوں نے جان ڈال دی تھی اور اس فلم کی کامیابی نے ان کے لئے راہیں کھول دیں۔اگر چہ اس فلم کا تھیم ایشیا کے مشہور جاسوسی ناول نگار اسرار احمد خاں عرف ابن صفی کے اولین ناول ''دلیر مجرم'' سے اخذ کیا گیا تھا لیکن فلم میں کچھ دوسرے واقعات اور کہانی کے تانے بانے کو الگ کر کے اسے دلچسپی کے ساتھ فلمایا گیا تھا۔اس کے بعد این اے انصاری نے فلم ''ملزم'' بنائی جس میں پردیپ کمار شکیلہ کو لیڈ رول دیا،اس فلم کی کہانی بھی ابن صفی کی شاہکار رسلسلہ وار کہانی بوغا سیریز سے اخذ کی گئی تھی اور اس فلم میں بھی چند دوسرے واقعات کو پیش کر کے فلم کو مزیدار پراسرار بنایا گیا تھا۔اس کے بعد انھوں نے اجیت اور شکیلہ کو لے کر ''ٹاور ہاؤس'' بنائی یہ فلم ایک پرانے قلعہ پر موجود خطرناک قاتل کی کہانی تھی،ابن صفی کی کہانی پہاڑوں کی ملکہ۔ہیروں کا فریب اور سناٹے کی چیخ کو یکجا کر کے بنائی گئی تھی۔ٹاور ہاؤس ایک بیحد پراسرار اور ڈراؤنی فلم تھی اور شیطانی قلعہ کے اندر خطرناک قاتلوں اور اسمگلروں کا جمگھٹا تھا اور اس کے باس کے رول میں این اے انصاری کی اداکاری قابلِ تعریف رہی جس نے بیک وقت ایک انسان دوست ڈاکٹر اور ساتھ ہی ساتھ بھیانک اسمگلروں اور قاتلوں کے باس کا رول نبھایا تھا۔

فلم ٹاور ہاؤس باکس آفس میں ہٹ فلم ثابت ہوئی اور این اے انصاری کو ایک قابل اور کامیاب ہدایت کار، اداکار تسلیم کر لیا گیا۔بلیک کیٹ،ملزم،ٹاور ہاؤس ایک کے بعد ایک ہٹ ثابت ہوئی جس کے بعد این اے انصاری نے بنڈیل کھنڈ فلمز کے پرچم تلے ''وہاں کے لوگ'' نامی فلم بنائی،اس فلم میں دوسرے سیارے سے آنے والے لوگ اور جہاز سب کچھ دکھایا اور اس فلم کا تھیم بھی این اے انصاری نے ابن صفی کی شاہکار جاسوسی ناول ''فضائی ہنگامہ'' سے اخذ کر کے حاصل کی تھی۔''وہاں کے لوگ'' میں پردیپ کمار کے ساتھ ایک نئی اداکارہ فریال کو ہیروئن کے طور پر پیش کیا تھا۔

فلم ''وہاں کے لوگ'' ۱۹۷۰ء میں ریلیز ہوئی تھی اور اس فلم کی تکنیک کی فلمی اخبار اسکرین، سنے ایڈوانس وغیرہ نے بیحد تعریف کی تھی۔انصاری صاحب اس فلم کی نمائش کے موقع پر کلکتہ تشریف بھی لائے تھے اور کلکتہ کے ایک ہوٹل میں جب ان سے کہا گیا کہ ان کی فلموں کے تھیم زیادہ تر ابن صفی کے جاسوسی ناولوں پر مبنی ہوتے ہیں،اس سوال کے جواب میں انھوں نے کہا تھا کہ اگر لوگ ایسا کہتے ہیں تو مجھے اپنے آپ پر فخر ہونا چاہئے کہ میں ایشیا کے سب سے بہترین جاسوسی ناول نگار کی کہانیوں کو فلموں میں اپنے طور پر پیش کر رہا ہوں، انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ایان فلیمنگ کی تحریر کردہ بانڈ سیریز کی فلموں میں محض دھماکہ چوکڑی ہوتی ہے اور جاسوسی کے اسرار و رموز نہیں ہوتے ہیں،لیکن اگر کوئی سچ مچ ابن صفی کی چند ناولوں جیسے جنگل کی آگ، بوغا سیریز، پہاڑوں کی ملکہ،فضائی ہنگامہ اور چند خطرناک کردار جیسے سنگ ہی، منچ، بوغا اور اس کے ساتھ کرنل فریدی، کیپٹین حمید،علی عمران اور قاسم کے رول کو پیش کر سکے تو شاید ان کی فلمیں ایان فلیمنگ کی بانڈ سیریز کی فلموں سے زیادہ مشہور ہو،لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ بالی ووڈ کے ٹکنیشین ساتھ دیں، کیونکہ اپنے ملک میں نہ تو ایسے آلات دستیاب ہیں اور نہ ہی انہیں امپورٹ کرنے کی استطاعت ہے، لہذا میں چھوٹے بینر پر بڑے خیالات کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور جس قدر میری پذیرائی ہوئی ہے اس سے میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنی محنت کا ثمر مل گیا۔

این اے انصاری نے اس موقع پر ہدایتکار وجے آنند،راج کھوسلہ اور این این سپّی کی تعریف کی جو اپنی فلموں میں خوبصورت رنگ بھرنے کے ساتھ ساتھ اس میں ایسا تجسّس بھی بھر دیتے ہیں جو شائقین کے لئے بیحد دلچسپی کا باعث ہیں۔این اے انصاری کے بارے میں کبھی رشی کیش مکھرجی جیسے اعلیٰ ہدایتکار نے تبصرہ کیا تھا کہ اس

ذہین اوراعلیٰ دماغ ہدایتکار کو اگر مواقع اور بڑے اسپانسر پروڈیوسر کی حمایت حاصل ہوتی تو وہ ہندی سینما کو بہت دور تک لے جاتے اور ایسی ایسی فلمیں تیار کرتے کہ ہالی ووڈ بھی شرما جاتا۔ اگر چہ ان کی فلمیں بڑے بجٹ کی نہیں ہوتی تھیں لیکن اسے عوام میں یکساں طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اور سنجیدہ طبقے کے لوگ خاص طور پر ان کی فلمیں دیکھتے تھے۔ انصاری اپنی ہر فلم میں اپنے مخصوص پائپ یا پرنس ہنری کا سگار پیتے نظر آتے تھے، زبان خالص اردو لکھنوی انداز اور حرکتیں انتہائی خطرناک مجرموں جیسی ہوتی تھیں۔ ہر فلم میں جب کلائمکس میں انہیں مرتا ہوا دیکھا جاتا تو لوگ یقین کر بیٹھتے کہ اب فلم ختم ہوگئی لیکن وہ کلائمکس پر کلائمکس رکھتے ہوئے دوبارہ حرکت کرتے تھے اور تماش بین اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اچھل پڑتے تھے اور اسی تحیئر کو پیش کرنے میں انصاری اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

۱۹۷۵ء میں ساجد نڈیاڈ والا کی ایک فلم ''ہم تم اور وہ'' آئی تھی اور اس فلم کے ہیرو نو دکھنہ، ہیروئن یوگیتا بالی، اشوک کمار اور ایک بہت ہی خاص رول میں این اے انصاری تھے، اس فلم میں انصاری ایک بہت ہی شریف قسم کے ڈاکٹر کے رول میں نظر آئے تھے مگر اشوک کمار کے ہاتھوں ان کا قتل ہو جاتا ہے۔ بالکل آخر میں پتہ چلتا ہے کہ انصاری ملک کے غدار تھے اور ملک کو بچانے کی خاطر اشوک کمار نے ان کا قتل کر دیا تھا۔ انصاری صرف ۵۰ کی دہائی میں ریلیز فلموں میں عاشقانہ رولز میں نظر آئے تھے لیکن اس کے بعد انھوں نے صرف ویلین کا کردار نبھایا۔ پران، پریم چوپڑہ، جیونت جیسے مشہور ویلین انصاری کا بیحد احترام کرتے تھے کیونکہ انھیں احساس تھا کہ ممبئی کی فلم نگری میں وہ واحد اعلیٰ دماغ ہیں۔ اداکارہ شکیلہ ان کی فیوریٹ ہیروئنوں میں سے ایک تھی، ٹاور ہاؤس، ملزم وغیرہ میں انھوں نے شکیلہ کو اہم رولز دیا تھا۔

☆☆☆

فلم شعلے کا گبّر سنگھ۔ امجد خان

ڈاکٹر شاہد محمود

لوگ امجد خان کو کم اور گبّر سنگھ کو بہت ہی اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں جی پی سپی کی فلم ''شعلے'' نے ایسی دھوم مچائی کہ اس فلم کو ریلیز ہوئے ۳۲ سال گزر گئے لیکن آج بھی وہ فلم جب سنیما گھروں یا ٹی وی پر دکھائی جاتی ہے تو لوگ اُسے بڑے شوق سے دیکھتے ہیں اور صرف یہی نہیں شعلے فلم کے ڈائیلاگ ہی کہیں سے نشر کئے جائیں تو وہ جگہ لوگوں سے بھر جاتی ہے اور لوگ اس فلم کے ڈائیلاگ آج بھی شوق اور دلچسپی کے ساتھ سنتے ہیں اور خاص طور پر گبّر کے ڈائیلاگ ''کتنے آدمی تھے''، ''یہ ہاتھ مجھے دیدے ٹھاکر''، ''ارے دیکھ نچنیا تو جبتک ناچے گی یہ بندوق خاموش رہے گی اور جہاں تیرے قدم رکے یہ بندوق چل پڑے گی'' یہ تمام ڈائیلاگ لوگوں کو حفظ ہو چکے ہیں لیکن اس کے باوجود گبّر کی زبان سے ادا ہوئے یہ تمام ڈائیلاگ ناقابل فراموش ہو چکے ہیں اور جب تک لوگ زندہ رہیں گے وہ گبّر کے ڈائیلاگ کو فراموش نہیں کر پائیں گے۔

یہ بات بہت ہی کم لوگوں کو معلوم ہے کہ گبّر (امجد خان) سلیم خان کی دریافت ہیں، جن دنوں امجد ہدایتکار کے آصف کو فلم ''لو اینڈ گاڈ (محبت اور خدا) کے لئے اسسٹنٹ کر رہے تھے وہیں انھوں نے امجد خان کو تاک لیا تھا اور جب شعلے کے لئے سپّی نے سلیم خان (سلمان خان کے والد) کو ایک ڈاکو ویلین کو تلاش کرنے کے لئے کہا تو سلیم نے فوراً امجد خان کا نام بتایا اور کہا کہ گبّر کے رول کے لئے امجد سے بہتر کوئی نہ ہوگا، اگر چہ جاوید اختر (معاون اسکرپٹ رائیٹر) نے کافی مخالفت کی تھی کہ اس فلم میں گبّر کے رول میں اگر امجد خان کو لیا گیا تو فلم فلاپ ہو جائے گی اس رول کے لئے جاوید نے ڈینی ڈین زپن گوپّا کا نام تجویز کیا تو سپی نے کہا کہ اُسے بلاؤ، ایک مرتبہ اس کا ٹسٹ لے لیا جائے، لیکن جب ڈینی سے رابطہ کیا گیا تو اس نے کہا کہ جو تاریخیں سپّی صاحب شوٹنگ کے لئے مانگ رہے ہیں وہ میں انہیں نہیں دے سکوں گا کیونکہ میں نے یہ تاریخیں فیروز خان کو دے رکھی ہیں اور وہ فلم ''دھرماتما'' کی شوٹنگ کے لئے افغانستان جا رہے ہیں۔

جاوید اختر کی ناکامی کے بعد سپّی نے سلیم سے امجد خان کو بلانے کے لئے کہا اور امجد خان نے اپنے پہلے ہی شاٹ میں سبھوں کو متاثر کیا۔ سلیم نے گبّر کے رول کو بہت ہی اچھی طرح سے لکھا اور اس کے لئے خاص ڈائیلاگ لکھے، فلم شعلے کے اسکرپٹ رائیٹر اگر چہ سلیم۔جاوید ہیں، لیکن سلیم نے اس فلم میں گبّر سنگھ (امجد خان) اور ٹھاکر صاحب (سنجیو کمار) کے سبھی ڈائیلاگ خود ہی لکھے اور کوئی بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ فلم شعلے میں امجد خان اور سنجیو کمار کے ڈائیلاگ کیسے تھے۔ جاوید نے دھرمیندر، ہیما اور امیتابھ کے لئے ڈائیلاگ لکھے تھے۔

امجد خان کی پیدائش ۱۲؍نومبر ۱۹۴۰ء کو ہوئی اور ۲۷؍جولائی ۱۹۹۲ء کو وہ دارفانی سے کوچ کر گئے، وہ بدترین قسم کے ذیابطیس کے مریض تھے جس کی وجہ سے وہ بدنما حد تک فربہ ہوگئے تھے اور ان کا وزن ۱۸۰ کیلوگرام ہوگیا تھا، ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ہر شاٹ کے بعد ایک کپ چائے پیتے تھے اور دن بھر میں چالیس بیالیس کپ صرف چائے پی جاتے تھے اور اسی لت کی وجہ سے وہ ذیابطیس کے مرض میں مبتلا ہوگئے تھے۔

امجد خان جن کی پیدائش ۱۹۴۰ء میں حیدرآباد میں ہوئی، ان کے والد مشہور ویلین اور کریکٹر ایکٹر جینت تھے جنھوں نے لیڈر، انسانیت، محبت اور خدا، زندگی جیسی یادگار فلموں میں کام کیا تھا، امجد خان کے دو چھوٹے بھائی امتیاز خان اور عنایت خان بھی ہیں امتیاز نے چند فلموں بشمول دھرماتما، دو گز زمین کے نیچے، یادوں کی بارات وغیرہ میں کام کیا تھا۔ امجد خان نے چائلڈ آرٹسٹ کے طور پر ۱۹۵۷ء کی ریلیز ''اب دلّی دور نہیں'' میں پہلی مرتبہ کام کیا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں ان کی شادی شیلا خان سے ہوئی ۱۹۷۳ء میں ان کا لڑکا شاداب خان پیدا ہوا جس نے فلم مہدی میں رانی مکھرجی کے ساتھ ہیرو کا رول نبھایا تھا۔ امجد خان کی دو بیٹیاں بھی ہیں جن کے نام اہلم خان اور سیماب خان ہیں۔

امجد خان فلموں میں آنے سے پہلے تھیٹر میں کام کرتے تھے اور ۱۷ سال کی عمر میں انھوں نے اب دلّی دور نہیں میں کام کیا تھا۔ ۱۹۶۰ء سے شروع ہوئی محبت اور خدا کے آصف، گرودت، سنجیو کمار، غلام محمد، شکیل بدایونی وغیرہ کے انتقال کے بعد ۱۹۹۰ء میں ادھوری ریلیز ہوئی جو فلاپ ہوگئی

تھی، اس فلم میں امجد نے کے آصف کو ہدایت میں اسسٹنٹ بھی کیا تھا اور ایک چھوٹا سا رول بھی ادا کیا تھا، کے آصف کا انتقال ۱۹۷۱ء میں ہوا۔ ۱۹۷۳ء میں چیتن آنند کی ہدایت میں بنی فلم ''ہندستان کی قسم'' میں امجد نے پہلی مرتبہ راج کمار، پریہ کے ساتھ کام کیا تھا، اگر چہ اس فلم میں بھی اس کا رول بھی بہت معمولی تھا۔ پھر بھی لوگوں نے ان کے رول کو یاد رکھا تھا۔

۱۹۷۵ء میں جب سلیم خان نے جاوید کے ساتھ مل کر فلم شعلے کا اسکرپٹ تیار کیا تو اس رول کے لئے ان کی نظر امجد خان ہی پر پڑی تھی تو انھوں نے چمبل کے مشہور ڈاکو کا رول امجد کو دیا اور اس کے لئے اُسے جیا بہادری کے والد ترون کمار بہادری کا لکھا ہوا ایک ناول ابھیشیش چمبل پڑھنے کے لئے دی اور کہا کہ اس ناول میں گبّر کا جو کردار ہے اس کردار کو اچھی طرح سے پڑھ لو اور اپنے آپ کو اس رول کے لئے تیار کرلو۔ فلم شعلے میں گبّر نام کے ڈاکو کا ایسا اسکرپٹ لکھا گیا تھا جو اس سے پہلے کسی بھی ہندی فلم میں لکھا نہ گیا ہو۔

اس فلم میں گبّر کے رول میں امجد خان کو حد سے زیادہ کامیابی ملی اور پہلی مرتبہ برٹانیہ بسکٹ نے اپنے اشتہار میں ایک ڈاکو کو ماڈل بنایا تھا اور یہ پہلا موقع تھا جب ایک بڑی کمپنی نے ایک خراب آدمی کو اپنا رول ماڈل کے طور پر پیش کیا۔ شعلے کی کامیابی کے بعد سے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۰ء تک امجد خان نے انگنت فلموں میں ویلین کے کردار ادا کئے۔ جن میں چرس، پرورش، دادا، یارانہ، لوک پرلوک، دیس پردیش، لاوارث، کام ستر، قربانی، انگلش فلم پرفیکٹ مرڈر، چمیلی کی شادی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

امجد خان کی اداکاری سے متاثر ہندستان کے سب سے بڑے ہدایتکار ستیہ جیت رے نے اپنی پہلی اور آخری ہندی فلم ''شطرنج کے کھلاڑی'' میں امجد خان کو واجد علی شاہ کا رول دیا۔ جن کی حکومت اودھ کو برطانوی سامراجیوں نے اپنا نشانہ بنا رکھا تھا۔ اس فلم میں امجد خان نے واجد علی شاہ کا رول بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ نبھایا تھا۔ ۱۹۸۰ء میں امجد خان نے فلم چور پولس کی ہدایت کاری بھی دی اس کے علاوہ امیر آدمی غریب آدمی میں بھی ہدایتکاری کی مگر یہ دونوں فلمیں کامیاب نہ ہوسکیں۔

۱۹۷۶ء میں انہیں ممبئی گوا روڈ میں زبردست حادثہ پیش آیا تھا جب انھوں نے اپنی کار کو ایک

باؤلڈر سے بچانے کے لئے درخت سے ٹکرا دی تھی۔اور اس دوران کے علاج کے سلسلے میں جو دوائیاں استعمال کی گئیں اس سے ان کو ذیابیطس کا مرض لاحق ہوگیا اور ان کا وزن حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔۱۹۹۲ء میں بالآخر دل کا شدید دورہ پڑنے سے وہ ۵۱ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ان کی بہت ساری فلمیں ان کی موت کے بعد بھی ۱۹۹۶ء تک ریلیز ہوتی رہیں۔

امجد خان کی بیحد تمنا تھی کہ کسی فلم میں دلیپ کمار کے ساتھ کام کرسکیں، ان کے والد جینت اور دلیپ کمار فلم انسانیت لیڈر اور امر میں ایک ساتھ کام کر چکے تھے مگر امجد کی یہ حسرت پوری نہ ہوسکی، فلم قربانی میں ان کے زبردست کامیڈی رول کو کوئی بھی بھلا نہیں سکتا۔اسی طرح سے فلم دادا میں ایک پیشہ ور قاتل کے رول میں اور اسی طرح سے انھوں نے کئی فلموں میں بہت ہی خطرناک ویلین کا کردار نبھایا لیکن اپنے آپ کو ہمیشہ اجیت سے نیچے سمجھا۔ان کا کہنا تھا کہ فلم زنجیر یادوں کی بارات، کالی چرن وغیرہ میں اجیت نے جس انداز میں ویلین کا کردار نبھایا تھا وہ رولز ان کے لئے ہمیشہ ہی رول ماڈل رہا۔

☆☆☆

ویلینوں کے شہنشاہ۔امریش پوری

فاریہ قیصر

کیا کوئی ویلین ہیرو سے زیادہ مشہور اور سپر اسٹار ہوسکتا ہے، یہ کوئی مشکل سوال نہیں ہے کیونکہ ویلین اکثر و بیشتر ہیرو سے زیادہ مشہور رہے ہیں، مثال کے طور پر پران، وہ جب تک ویلین رہے تو ویلینوں کے شہنشاہ بنے رہے اور جب کیریکٹر ایکٹر کا رول شروع کیا تو اس میں بھی اپنی منفرد چھاپ چھوڑی۔ ویلین کے طور پر دل دیا درد لیا، مدھومتی، جب پیار کسی سے ہوتا ہے، این ایوننگ ان پیرس، راجکمار اور اس جیسی ۳۰۰ فلمیں اور کیریکٹر ایکٹر کے طور پر اپکار، ڈان، وکٹوریہ ۲۰۳، شہید، اسی طرح سے پریم ناتھ بطور ویلین آن، جانی میرا نام، امیر غریب، نفرت اور بطور کیریکٹر بابی، روٹی کپڑا اور مکان، شور، شتروگھن سنہا بھی بطور ویلین کھلونا، بلیک میل، پارس اور بطور کیریکٹر ایکٹر کرانتی، دوستانہ، جوالا مکھی، سمجھوتہ وغیرہ میں بیحد کامیاب رہے۔اسی ضمن میں ایک نام ہے امریش پوری کا۔

امریش پوری، مدن پوری اور اوم پوری برادران میں شامل ہیں جبکہ تینوں سگے بھائی نہیں بلکہ ایک دوسرے کے کزن ہیں۔ امریش پوری نے ابتدائی دنوں میں چند چھوٹے رولز کئے جیسے قربانی (فیروز، ونود، زینت) ودھاتا (دلیپ کمار، سنجے دت، پدمنی کولہا پوری) ان دونوں فلموں میں لوگوں نے بہت ہی معمولی طور پر انہیں پہچانا، لیکن رفتہ رفتہ امریش پوری کو فلمیں ملنے لگیں اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب انھیں سپر اسٹار ویلین کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔

بونی کپور کی فلم ''مسٹر انڈیا'' میں امریش پوری ایک خطرناک مافیا ڈان موگامبو کے رول میں بیحد پسند کئے گئے تھے اور خاص طور پر ان کا وہ ڈائیلاگ ''موگامبو خوش ہوا'' لوگوں کو بیحد پسند آیا تھا۔دلیپ کمار کے ساتھ مشعل، ودھاتا، سوداگر اور شکتی میں کام کیا اور ان چاروں فلموں میں ان کا رول بیحد اہم تھا اور خاص طور پر جب دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے تو ہر اداکار کو اپنے آپ کو پہلے سے سنبھال لینا پڑتا ہے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔فلم سوداگر میں، شکتی میں اور خاص طور پر مشعل میں امریش پوری کو ایک خطرناک اور سازشی ویلین کے رول میں پیش کیا گیا اور کہنے کی ضرورت نہیں کہ انھوں نے اپنی ایکٹنگ میں ایسی جان ڈال دی تھی کہ پرانے وقتوں کے ویلین پران، پریم ناتھ، پریم چوپڑہ، جیون، منموہن بھی شرما گئے امریش پوری نے فلم لوہا

میں بھی دھرمیندر، شترو اور کنال کے ساتھ ایک بہت ہی خطرناک قسم کے ویلین کا رول نبھایا تھا۔

ایسی بات نہیں ہے کہ امریش پوری نے صرف ویلین کے کردار نبھائے، انھوں نے فلم دل والے دلہنیا لے جائیں گے، گھاتک، چائنا گیٹ، اور بہت ساری فلموں میں کریکٹرا یکٹر کا بھی رول نبھایا جس کی بناء پر انہیں ایک بہت ہی اچھا اور سلجھا ہوا اداکار سمجھا جانے لگا۔ امریش پوری نے سنیل دت، ششی کپور، گووندہ، نصیرالدین شاہ سے لے کر دلیپ کمار، راج کمار، دیوآنند تک کے ساتھ کام کیا اور تقریباً سبھی بڑی ہیروئنوں کے ساتھ بھی کام کیا۔ سنی دیول کے ساتھ جہاں فلم گھاتک میں ایک مجبور باپ کا رول نبھایا وہیں گھائل میں ایک خطرناک قاتل کا رول نبھایا۔ دامنی فلم میں انھوں نے ایک انتہائی مکار وکیل کا رول ادا کیا تھا اسی طرح سے میری جنگ میں بھی انھوں نے ایک خطرناک قاتل اور وکیل کا رول نبھایا تھا۔ فلمساز وہدایتکار سبھاش گھئی نے انہیں کئی فلموں میں لیا جن میں میری جنگ، سوداگر، ودھاتا وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

فلم لوہا میں ایک خطرناک قاتل کے رول میں نظر آئے تھے اس کے علاوہ فلم تری دیو میں بھی انھوں نے ایک خطرناک گینگسٹر کا رول ادا کیا تھا۔ اور یہ بہت ہی حیرت کی بات ہے کہ بالکل پران کی طرح سے جب جب بھی وہ ویلین بنے تب تب لوگوں نے ان سے بیحد نفرت کی اور جب بھی انھوں نے ایک اچھے اور شریف باپ کا رول ادا کیا وہیں انھوں نے لوگوں کی ہمدردیاں بٹوریں، پران نے بھی اپکار، ڈان میں بہت ہی اچھا رول ادا کیا تھا اور لوگوں نے اس رول میں انہیں بیحد پسند کیا تھا اسی طرح سے مدھومتی، رام اور شیام میں لوگوں نے ان سے بیحد نفرت کی تھی۔

امریش پوری کا انداز سب سے الگ اور منفرد رہا اور پچھلے پندرہ سالوں کے دوران صرف وہی ایک ویلین کے طور پر نمایاں رہے اور ان کے مقابلے میں دیگر ویلینوں نے گھبرا کر مزاحیہ رول ادا کرنے شروع کر دیئے جیسے شکتی کپور، پریش راول وغیرہ مزاحیہ اداکار بن گئے، انوپم کھیر بھی اسی انداز کو اپنانے پر مجبور ہو گئے تھے، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو امریش پوری موجودہ دور کے سب سے بہترین ویلین ثابت ہوئے، ان کے اندر جذبات نگاری کا فن تھا اور جس انداز میں وہ پردے پر نمودار ہوتے تھے فلم بینوں پر چھا جاتے تھے۔

☆☆☆

فلمی صنعت کا منفرد اداکار۔ پریم چوپڑہ

ثانیہ قیصر

پریم نام ہے میرا.... پریم چوپڑا۔ یہ مشہور ڈائیلاگ فلم ''بابی'' کے مختصر رول میں ویلین کا کردار نبھانے والے مشہور ویلین پریم چوپڑا کا ہے۔ پریم چوپڑا ایک ایسے اداکار مانے گئے ہیں جنہوں نے بیک وقت ویلین، کریکٹرا یکٹر اور کامیڈین کا رول نبھایا۔ جب ویلین بنے تو انتہائی خطرناک ویلین بنے اور مزاحیہ اداکاری کی تو ناظرین کو ہنساتے ہنساتے بے دم کر دیا۔ ۱۹۶۵ء میں وہ پہلی بار ایک بھوجپوری فلم ''کنوارا'' میں ہیرو کے رول میں آئے جس میں اس وقت کی مشہور ہیروئن کانن کوشل تھی جس نے جے سنتوشی ماں میں مرکزی کردار ادا کیا تھا جو فلم ۷ سال مسلسل چلی تھی۔ بطور ہیرو پریم چوپڑہ نے کئی چھوٹی چھوٹی فلموں میں کام کیا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے اور جب سورج کمار نے انہیں اپنی فلم ''اپکار'' میں اپنے سوتیلے بھائی کے رول میں پیش کیا تو انہیں اینٹی ہیرو کا رول دیا اور وہ ایک ویلین کی حیثیت سے بہت ہی کامیاب ویلین ثابت ہوئے۔ خود منوج کمار اس سے بیحد متاثر ہوئے اور اپنی سبھی فلموں میں پریم چوپڑہ کو لیا جس میں سنیاسی، دس نمبری، پورب پچھم، کرانتی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ منوج نے دوسرے فلمسازوں کی فلم میں کام کیا تو ان فلموں میں بھی سفارش کر کے پریم چوپڑہ کو رول دلوایا اور پھر پریم چوپڑہ ایک سپر اسٹار ویلین کے طور پر تسلیم کر لئے گئے۔ جس زمانے میں پریم چوپڑہ نے ویلین کے طور پر کام شروع کیا، اس دور میں پران نے ویلین کا کردار چھوڑ کر کریکٹر رولز کرنا شروع کر دیئے تھے اور اس کی وجہ سے بھی پریم چوپڑہ کو ترقی کرنے کا موقع ملا کیونکہ اس زمانے میں اجیت بھی فلموں سے الگ تھے امریش پوری کا زمانہ ۸۰ کی دہائی سے شروع ہوتا ہے جبکہ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں پریم چوپڑہ کا جادو ہی چلتا رہا۔

پریم چوپڑہ نے منوج کمار کے علاوہ دیوآنند، دلیپ کمار، راج کپور، دھرمیندر، راجندر کمار، راجیش کھنہ، ونود کھنہ، شتروگھن سنہا، سنیل دت، ششی کپور، شمی کپور، رشی کپور، انیل کپور، نصیرالدین شاہ، جیکی شروف، گووندہ، سلمان خان، عامر خان، شاہ رخ خان سمیت تقریباً ہر ہیروز کی فلموں میں

مختلف قسم کے خصوصاً ویلین کے رولز نبھائے اور ان کی فلمیں بطور ویلین کے بیحد یادگار ثابت ہوئیں اور انہیں کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ پریم چوپڑہ نے صحیح معنوں میں اپنے مختلف کرداروں کی ایک ایسی چھاپ چھوڑی ہے جسے لوگ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

فلم ''داستان'' جوکہ آئی ایس جوہر کی تحریر کردہ بی آر چوپڑہ کی فلم تھی۔ اس فلم میں دلیپ کمار (ڈبل رول) شرمیلا ٹیگور، بندو اور آئی ایس جوہر کے ساتھ پریم چوپڑہ نے بھی پہلی مرتبہ دلیپ کمار کے ساتھ کام کیا تھا۔ اس فلم میں دلیپ کمار ایک جج کے رول میں تھے اور وہ اپنی بیوی بندو سے بیحد پیار کرتے ہیں لیکن بندو ایک اوباش اور فلرٹ قسم کی عورت ہے وہ جج صاحب کی عدم موجودگی میں پریم چوپڑہ کی شامیں رنگین کرتی ہے اور اوباش فلرٹ شخص کے رول میں پریم چوپڑہ اپنی اداکاری سے متاثر کر گئے، کیونکہ دلیپ کمار کے سامنے ڈائیلاگ بولنا اسقدر آسان نہیں تھا۔

پریم چوپڑہ نے فلمساز ڈھونڈی کی فلم ''قیمت'' میں ایک خطرناک باس کا رول کیا تھا جو افیم، چرس اور گانجہ کا اسمگلر تھا اس کے علاوہ ایک خطرناک قاتل تھا اس فلم میں دھرمیندر اور ریکھا کی جوڑی تھی اور فلم بیحد کامیاب ہوئی تھی۔ پریم چوپڑہ نے فلم دوستانہ میں امیتابھ بچن اور شتروگھن سنہا کے ساتھ ایک مکار ویلین کا رول نبھایا تھا۔ اور ایک سین میں جبکہ وہ امیتابھ اور شترو دونوں کو رسّی سے باندھ دیتا ہے اور امیتابھ کے منہ پر تھپڑ مارتا ہے تو اس موقع پر اس کا یہ ڈائیلاگ ''ارے ارے ارے اتنا خون نکل گیا اور وہ بھی ایک تھپڑ میں، لیکن ابھی تو ہمیں بہت مار کھانی ہے۔ یہ ڈائیلاگ اس نے جس انداز میں ادا کیا اس سے امیتابھ اور شترو دونوں خجل نظر آنے لگے تھے۔

فلم ''دو انجانے'' امیتابھ، ریکھا اور پریم چوپڑہ کی بہت ہی مشہور فلم تھی، اس فلم میں پریم چوپڑہ ایک فلم پروڈیوسر کا رول کرتا ہے اور اس کی نظر امیتابھ کی بیوی ریکھا پر ہے اور وہ سازش رچ کر امیتابھ کو ٹرین سے نیچے پھینک دیتا ہے اور ریکھا کا قرب حاصل کرلیتا ہے، اس فلم میں اس کی مکّاری اور چالبازی کے ساتھ اس کی ماہرانہ اداکاری بھی انتہائی عروج پر نظر آتی ہے۔

پریم چوپڑہ اپنی نوجوانی کے دور میں ایک بہت ہی خوبصورت اور ہینڈسم قسم کے اداکار تھے اور بہت ساری اداکارائیں ان پر جان چھڑکتی تھیں پریم چوپڑہ کو نہ بہت شراب پینے کی لت ہے اور نہ

عورتوں سے تعلقات رکھنے کی، البتہ اسے گھوڑوں کے ریس سے بیحد دلچسپی ہے اور وہ ہر سنیچر اور اتوار کے روز ممبئی کے ریس کورس گراؤنڈ میں نظر آتے ہیں۔

پریم چوپڑہ کے اندر ایک خاص بات یہ ہے کہ ڈائیلاگ کی ادائیگی بہت ہی خوبصورتی سے کرتے ہیں اور خاص طور پر اردو کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، فرصت کے لمحات میں غالب، میر اور ذوق کا کلام پڑھتے ہیں کیونکہ اردو زبان سے ان کی واقفیت کافی اچھی ہے۔ ان کے فیوریٹ اداکاروں میں دلیپ کمار، راجکپور اور سنیل دت ہیں۔ ہیروئینوں میں وہ ثریا، نمّی، مینا کماری اور وحیدہ رحمٰن کے لئے چودھویں کا چاند ۱۴ مرتبہ دیکھی اور کہا کہ جب بھی ٹی وی پر وہ فلم دکھائی جاتی ہے وہ اسے شوق سے دیکھتے ہیں۔

دلیپ کمار کے بارے میں انھوں نے کہا کہ اس اداکار کے ساتھ اداکاری کی جاسکتی ہے اگر مقابل اداکار براہ راست ان کی آنکھوں کی طرف نہ دیکھے لیکن ان کی آنکھوں کی طرف دیکھنے کے بعد وہ سحر میں مبتلا ہوکر خود اپنی اداکاری بھول سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ دور کا سب سے بڑا اداکار امیتابھ بچن جب ان سے فلم شکتی میں آنکھیں ملاکر ڈائیلاگ بولنے کی ہمت نہیں کرسکا، دیو آنند انسانیت میں، راج کمار پیغام اور سوداگر میں اور منوج کمار آدمی اور کرانتی میں ان کے سامنے آنکھیں ملاکر باتیں نہیں کرسکا تو پھر دوسرے اداکاروں کی اوقات ہی کیا ہے۔

☆☆☆

منجھاہوا باصلاحیت ویلن۔ڈینی ڈین زنگپا

تحسین اختر

سکّم جیسے پہاڑی علاقوں کا رہنے والا اداکار ڈینی ڈین زنگپا جس کا چہرہ چینی نیپالیوں جیسا ہے، جسے پورے ہندستان کے لوگ پسند کریں یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے لیکن اس میں کوئی دورائے نہیں کہ ڈینی ایک بیحد منجھا ہوا اور باصلاحیت اداکار ہے اور اس نے کئی ایسی فلموں میں کام کیا جس میں اس کا رول بیحد نمایاں تھا اور وہ فلمیں بھی محض اسی کی وجہ سے چلیں ڈینی نے مشترکہ طور پر ہندی، نیپالی، بنگلہ اور انگریزی فلموں میں کام کئے، چونکہ اس کے ڈائیلاگ بولنے کا انداز بیحد شاندار تھا اور تلفظ میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا اس وجہ سے سبھی زبانوں کی فلموں میں اپنی شاندار اداکاری کی دھاک بٹھادی۔ڈینی کو سب سے پہلے ہدایتکار وفلمساز گلزار نے اپنی فلم ''میرے اپنے'' میں پیش کیا تھا، یہ فلم بنگلہ سے ہندی میں ڈب کی گئی تھی چونکہ بنگلہ میں بنی ''اپان جی'' بیحد کامیاب ہوئی تھی جس میں چھایا دیوی، سمیت بھانجہ اور سروپ ڈے نے بیحد خوبصورت اداکاری کی تھی، یہ فلم ۱۹۷۰ء میں حالات حاضرہ کے پس منظر میں بنائی گئی تھی جب کلکتہ کے مختلف علاقوں میں غنڈہ راج تھا اور طلباء اپنے اپنے گروپ کو لے کر پارٹ ٹائم غندہ گردی کرتے تھے۔فلم کے کامیاب تھیم کو دیکھتے ہوئے گلزار نے اس فلم کو ہندی میں بنانے کا فیصلہ کیا اور چھایا دیوی کا رول مینا کماری کو سروپ ڈے کا رول ونود کھنہ اور سمیت بھانجہ کا رول شترگھن سنہا کو دیا تھا اور اسی فلم میں ونود کھنہ کے گروپ سے ڈینی کا تعلق تھا جو بیحد خطرناک غنڈہ تھا لیکن اس کے ہاتھ میں ہر وقت بچپن کا کھلونا جوکر رہتا تھا جو اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا، اس فلم میں اگر چہ ڈینی کا رول بیحد مختصر تھا مگر اس کے باوجود اس نے اپنی اداکاری کے ذریعہ اپنی صلاحیت کا لوہا منوالیا تھا۔

۱۹۷۱ء میں بی اشارہ نے اپنی پہلی ہندی فلم ''ضرورت'' بنائی جس میں وجے اروڑہ، رینا رائے پہلی مرتبہ جلوہ گر ہوئے تھے، اس فلم میں ڈینی کو ایک بہت ہی اہم اور جذباتی رول میں پیش کیا گیا تھا۔چونکہ اس زمانے میں یہ فلم سیکس کے موضوع پر بنی تھی اس لئے فلم زبردست ہٹ ہوئی تھی

اور اس فلم کے ہٹ ہونے پر ڈینی کو بھی زبردست کامیابی ملی تھی، جس کے بعد اسے بطور اینٹی ہیرو بنگلہ فلم ''لال بنگلہ'' میں لیا گیا اور جب بنگلہ فلم بیحد کامیاب ہوئی تو اُسے ہندی میں بھی ڈب کیا گیا۔لیکن ہندی میں ڈب ہونے کے بعد وہ فلم زیادہ کامیاب نہیں ہوئی جس طرح سے تپن سنہا کی بنگلہ فلم ''سگینہ مہتو'' گولڈن جبلی ہوئی تھی مگر ہندی میں ڈب ہونے کے بعد وہ دس ہفتے بھی نہیں چلی جبکہ اس فلم میں دلیپ کمار، سائرہ بانو، سروپ ڈے، اوم پرکاش جیسے اداکار تھے۔

بہرکیف ڈینی کی کامیابی کا عمل جاری رہا اور اس نے بڑے بینر کی فلم بی آر چوپڑہ کی ''دھند'' میں ایک خطرناک اپاہج ویلین اور زینت امان کے شوہر کا رول نبھایا جسے بیحد پسند کیا گیا اس فلم میں حالانکہ سنجے خان نوین نشچل، نویدیتا جیسے مشہور اسٹار تھے لیکن ڈینی کا رول یادگار ثابت ہوا اور شروع تا آخر یہ پتہ نہیں چل پاتا ہے کہ ڈینی کا قتل کس نے کیا، سنجے خان نے، زینت امان نے، یا نوین نشچل نے۔یہ فلم سپر ہٹ ثابت ہوئی تھی۔دھند کی کامیابی سے ڈینی کو بھی کامیابی ملی، اسی زمانے میں اس نے فلم ۳۶ گھنٹے میں سنیل دت، رنجیت کے ساتھ کام کیا اور اس فلم میں بھی اس کی اداکاری عروج پر تھی۔اگرچہ ڈینی نے دھرماتما جیسی فلم میں کام کرنے کے لئے جی پی سپی کی فلم شعلے میں امجد خان والا رول ٹھکرادیا تھا جبکہ سپّی اُسے ہی گبّر سنگھ کا رول دینا چاہتے تھے۔اس سے قبل ڈینی این این سپّی کی فلم ''دیوتا'' میں سنجیو کمار اور شبانہ اعظمی کے ساتھ کام کر چکے تھے اور ایک پولس افسر کے رول میں انہیں بیحد پسند کیا گیا اور اس کے بعد ''خدا گواہ'' میں بھی امیتابھ بچن اور سری دیوی کے ساتھ اس کے رول کی بیحد تعریف ہوئی۔

ڈینی جو کہ ایک پہاڑی علاقے سکّم کا رہنے والا ہے شکلاً وہ چینی ضرور لگتا ہے لیکن اس کی ناک چپٹی نہیں ہے اور وہ محض اپنے چینی پن کو چھپانے کے لئے اکثر اپنا میک اپ گھنی داڑھی یا بڑی بڑی مونچھوں سے چہرے کی بناوٹ کو چھپانے کے لئے کرتا تھا اور اپنے میک اپ کی وجہ سے اپنے آپ کو چھپانے میں ہمیشہ کامیاب رہا۔ڈینی صرف ایک ویلین نہیں بلکہ ایک جذباتی اداکار بھی ہے۔فلم ''جواب'' میں وہ ایک خطرناک گینگسٹر کے رول میں نظر آتا ہے اور اس کی دھمکیوں کے آگے بڑے بڑے پولیس افسران تک کانپنے لگتے ہیں لیکن جب فلم کا ہیرو راج ببّر

اس کی بیٹی کا اغوا کر لیتا ہے جسے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے اور اس کی جدائی میں اس کی ساری ہیکڑی ختم ہو جاتی ہے اور وہ بیحد جذباتی ہو کر اپنی بیٹی کی جدائی میں نیم پاگل سا ہو جاتا ہے اور اس وقت اس کی اداکاری بیحد شاندار نظر آتی ہے۔

اسی طرح سے فلم ''ہم'' میں وہ گودی کے مزدوروں کو اپنا تابع بنائے رکھتا ہے اور اس کی داداگیری پورٹ ممبئی علاقے میں نظر آتی ہے لیکن جب ایک حادثے میں اس کی بیوی اور بیٹی کا قتل ہو جاتا ہے تو پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے اور اس کے قاتل ایتابھ بچن کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے اس موقع پر اس کی اداکاری بیحد شاندار نظر آتی ہے اور آخری لمحوں میں جب ایتابھ اس کا انکشاف کرتا ہے کہ اس کی بیوی اور بیٹی کا قتل اس نے نہیں کیا تو اس کی اداکاری اور بھی شاندار نظر آتی ہے۔

فلم دیوتا میں سنجیو کمار کے ساتھ اس کے ڈائیلاگ بولنے کا انداز، دھرماتما میں ہیما مالنی سے عشق میں ناکامی اس کا غمزدہ ہونا، فلم ۳۶ گھنٹے میں سنیل دت کے ساتھ خطرناک گروہ کی شکل میں نمودار ہونا اور راج کمار جیسے اداکار کے سامنے نڈر ہو کر ڈائیلاگ بولنا وغیرہ ڈینی کی انفرادیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ فلم شعلے میں گبّر سنگھ کے رول کو ٹھکرانے کا ڈینی کو غم نہیں اور اس کا کہنا ہے کہ اچھا ہی ہوا جو اس نے شعلے میں گبّر سنگھ کا رول ٹھکرا دیا ورنہ دنیا امجد خان جیسے بہترین اداکار کو دیکھنے سے محروم رہتی۔

☆☆☆

ہرفن مولا کا میڈین۔محمود

ڈاکٹر شاہد محمود

پورے ملک کے کسی بھی وی سی ڈی سیلس مین سے اگر طلب کیا جائے کہ وہ اُسے ایک ایسا وی سی ڈی دیں جسے دیکھنے کے بعد وہ اپنے تمام تفکّرات کو بھول جائیں اور ان کے دل کے اندر چھائے ہوئے تفکّرات کے بادل چھٹ جائیں تو پھر وہ یہی مشورہ دے گا کہ آپ کسی ایسی فلم کا وی سی ڈی لے جائیں جس میں محمود نے رول کیا ہو۔ بیشک مزاحیہ اداکار محمود ایک ایسے فنکار تھے جنھوں نے اپنی ساری زندگی لوگوں کو ہنسانے اور ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دینے میں گزار دی، لیکن یہ بہت ہی کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ساری دنیا کو ہنسانے والا یہ مزاحیہ اداکار خود اپنی نجی زندگی میں بیحد غمزدہ اور دل گرفتہ انسان تھا۔ اس کا ایک اپاہج لڑکا جس نے کنوارا باپ کا مرکزی رول ادا کیا تھا اس کے اپاہج پن کی وجہ سے محمود اندر ہی اندر ٹوٹ کر رہ گئے تھے اور پھر عین نوجوانی میں اس کی موت نے انہیں نیم پاگل کر دیا تھا۔

محمود اپنی جوانی میں جبکہ وہ سپرہٹ ایکٹر مانے جاتے تھے نوجوانی کے ان دنوں میں انہوں نے خراب عادتوں کو گلے لگایا تھا وہ حد سے زیادہ اسمیک پینے لگے تھے اور ریس کے گھوڑوں کے پیچھے اپنی ساری دولت لٹانے لگے تھے، آخری عمر میں اسمیک کی زیادتی نے اثر دکھایا اور زندگی کے آخر چند سال انہوں نے صرف اسپتال اور اپنے بند کمرے میں وینٹی لیشن میں گزارے۔

محمود اپنے وقت کے عظیم فنکار اسٹیج اور فلم آرٹسٹ ڈانسر ممتاز علی کے بیٹے تھے، انہوں نے اپنا بچپن پولٹری کی مرغیوں کو فروخت کرنے میں اور مینا کماری کو ٹیبل ٹینس سکھانے میں گزارا اسی دوران مینا کماری کی بہن مدھو اس سے محبت کرنے لگی اور ایک دن دونوں نے شادی کر لی۔ جس سے ان کا ایک لڑکا ۱۹۵۰ء میں پیدا ہوا جس کا نام مسعود علی تھا بعد ازاں روپے کمانے کے لئے محمود نے فلموں میں چھوٹے چھوٹے رول ادا کرنا شروع کیا اور دو بیگھہ زمین اور پیاسا میں مختصر رول ادا کئے۔

محمود کو سب سے پہلے ایک بڑا بریک راج کپور کے چھوٹے بھائی کے رول میں پرورش میں ملا، اس فلم میں اس کا رول بیحد جذباتی تھا۔ یہ فلم ۱۹۵۸ء میں ریلیز ہوئی تھی محمود اگرچہ شروع میں بیحد

جذباتی مختصر رول میں نظر آئے تھے مگر کسی نے بھی انہیں ایک کامیڈین کے رول میں موقع دینے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی شاید ان کا اندازہ تھا کہ محمود کسی بھی طور پر ایک کامیڈین کے روپ میں نظر نہیں آئے تھے اور نہ ہی کسی نے انہیں ایک کامیڈین کنگ کی شکل میں دیکھا تھا چونکہ شروع شروع میں محمود حد سے زیادہ سنجیدہ اور کسی قدر غصیلے مزاج کے تھے۔

محمود کو شروع شروع میں بیحد ہنڈسم ہونے کی وجہ سے چند فلموں میں ہیرو کا رول بھی دیا گیا تھا اور انہوں نے چترا، ناز، امیتا، وجے لکشمی، ناظمہ، رادھا سلوجہ، وغیرہ کے ساتھ ہیرو کے رول بھی نبھائے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں بالاجی پروڈکشن کے پرچم تلے محمود نے اپنی فلم پروڈکشن قائم کر لی اور پہلی فلم ''چھوٹے نواب'' جس میں محمود نے اپنے بچپن کے دوست آر ڈی برمن کو پہلی مرتبہ بریک دیا۔ لیکن اس فلم میں آر ڈی برمن کامیاب نہ ہوئے تو ۱۹۶۴ء میں بھوت بنگلہ بنائی جس میں تنوجہ کو ہیروئن کے طور پر لیا اور آر ڈی برمن کو موسیقی کے ساتھ فلم میں ایک اہم رول دیا تھا۔ فلم بھوت بنگلہ کی کامیابی کے بعد محمود نے آر ڈی برمن کو آسمان پر پہنچا دیا، وہ خود ایک ٹیلنٹ موسیقار تھے اس کے بعد محمود نے انہیں بمبئی ٹو گوا، پڑوسن، جیسی سپر ہٹ فلموں میں موقع دیا اور آر ڈی برمن شہرت کے آسمان پر پہنچ گئے اور ہر بڑی فلم میں آر ڈی برمن کی موسیقی ہونے لگی۔ آر ڈی برمن جس نے چھوٹے نواب میں موسیقی دینے کے لئے محمود سے ۲۰ ہزار روپے لئے تھے، فلم پڑوسن کے لئے خود محمود نے انہیں ۵/ لاکھ روپے میں سائن کیا تھا۔

جب آر ڈی برمن شہرت اور دولت کے آسمان پر پہنچ گئے اور ہر بڑے بینر کی فلمیں کرنے لگے تو اسی زمانے میں جی پی سی پی۔ رمیش سپی نے انہیں ملٹی اسٹار کاسٹ فلم ''شعلے'' کے لئے سائن کیا اور ۵۰ لاکھ روپے میں معاہدہ کیا، اسی زمانے میں محمود اپنی فلم ''کنوارا باپ'' بنانے کا پروجیکٹ تیار کر چکے تھے اور محمود ۱۰ لاکھ روپے لے کر آر ڈی برمن کے گھر گئے کہ انہیں سائننگ امائنٹ دے دیں، لیکن اس وقت آر ڈی برمن، رمیش سپی کے ساتھ بات کرنے میں محو تھے، انہوں نے نوکر سے کہلوا دیا کہ محمود ایک گھنٹے ڈرائینگ روم میں انتظار کریں، نوکر نے آکر وہی سب کچھ انہیں کہہ دیا تو محمود آپے سے باہر ہو گئے اور نوکر سے کہہ دیا کہ کہہ دینا کہ محمود نے آج

تک کسی کا انتظار نہیں کیا اور جس طرح سے وہ آر ڈی برمن پیدا کر سکتے ہیں اسی طرح سے وہ دوسرا آر ڈی برمن بھی پیدا ہوسکتا ہے۔ محمود یہ کہہ کر غصّے سے باہر نکلے اور ادا کار راکیش روشن کے گھر پہنچے اور ان سے کہا کہ تمہارا چھوٹا بھائی فنکشن وغیرہ میں موسیقی دیتا ہے اُسے یہ دس لاکھ روپے دیدو اور کہنا کہ اُسے محمود کی فلم ''کنوارا باپ'' کے لئے سائن کر لیا گیا ہے۔ راکیش روشن ہکا بکا رہ گئے کہ اس کے چھوٹے بھائی راجیش روشن کو جو کوئی پہچانتا بھی نہیں ہے اُسے محمود اپنی فلم میں بریک دے رہے ہیں اور وہ بھی ۱۰ لاکھ روپے کا سائننگ اماؤنٹ دے کر۔ بہرکیف راجیش روشن نے بڑی محنت سے کنوارا باپ کے لئے موسیقی ترتیب دی اور وہ فلم سپر ہٹ ثابت ہوئی، اس فلم کے چند گیت بیحد مشہور ہوئے جیسے (۱) سج گئی دیکھو میری امّاں سنہرے برقع میں (۲) میں ہوں گھوڑا تو ہے گاڑی (۳) آری آ نندیا تیری گلی۔

اس فلم کے بعد راجیش روشن بھی ٹاپ کے موسیقاروں میں شمار ہونے لگے تھے۔ محمود جنوبی ہند کی فلموں میں بیحد کامیاب رہے تھے۔ جیمنی، ایس ایس واسن اور اے وی ایم کی فلمیں جیسے سسرال، ہمراہی اور زندگی میں محمود کو فلم کی کامیابی کا ذریعہ سمجھا گیا تھا، ان تینوں ہی فلموں میں راجندر کمار نے ہیرو کا رول نبھایا تھا۔ سسرال ۱۹۶۱ء میں ریلیز ہوئی تھی جس نے ریکارڈ توڑ بزنس کی اور ۶۰ کی دہائی میں محمود کو اس فلم کے بعد کامیڈی کنگ کا نام دے دیا گیا تھا۔ ان دنوں ہر فلم میں محمود اور شوبھا کھوٹے کی جوڑی بیحد کامیاب ہوئی تھی جس میں گھر گرہستی، بھروسہ، ضدی، لوان ٹوکیو کے نام قابل ذکر ہیں۔ محمود نے ۶۰ کی دہائی میں زیادہ تر مناڈے کی آواز کا استعمال کیا تھا۔ ۱۹۶۵ء میں محمود نے جوہر (آئی ایس جوہر) کے ساتھ جوہر محمود ان گوا میں کام کیا اور یہ فلم کامیڈی سے بھرپور سپر ہٹ فلم ثابت ہوئی تھی۔

بعد ازاں ان دونوں نے جوہر محمود ان ہانگ کانگ میں بھی کام کیا تھا۔ محمود کو خاص طور پر دو فلموں کی زبردست اور ناقابل فراموش کامیابی پیار کئے جا (۱۹۶۶ء) اور پڑوسن (۱۹۶۸ء) سادھو اور شیطان (۱۹۷۰ء) کے لئے ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ دلیپ کمار اور محمود نے ایک ساتھ کسی بھی فلم میں کام نہیں کیا لیکن سادھو اور شیطان میں محمود نے ایک مختصر رول کے لئے دلیپ کمار صاحب کو راضی

کرلیا اوراس مختصر رول میں محمود کو پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ اگر وہ کامیڈی کنگ ہیں تو دلیپ کمار شہنشاہ کامیڈی۔

محمود نے فلم پیار کئے جا کی زبردست کامیابی کے بعد مینا نام کی ایک خوبصورت لڑکی (ممتاز) کے ساتھ جوڑی بنائی اوراس کے ساتھ محمود نے کئی آواز جیسے ''واؤ واؤ، کوڈوکوڈو، کچ کچ کچ کو بیحد مشہور لفظوں میں شامل کردیا۔ پڑوسن فلم میں اس نے اپنے طور پر کئی لفظ ایک گیت میں شامل کئے اور اپنی آواز میں کشور کمار سے مقابلہ کیا۔ جیسے ایک چتورنار بڑی ہوشیار کے بعد مناڈے کی آواز میں ڈب کرا کر مشہور کردیا تھا۔ محمود کی زبردست کامیڈی پتھر کے صنم، کاجل، دوکلیاں، میں سندر ہوں ،گمنام ،بھروسہ، پیار کئے جا، نیل کمل ،آنکھیں ،اولاد میں دیکھنے کوملیں ،محمود کو ہیرو کے دوست کے طور پر دھرمیندر، جتندر، امیتابھ ،منوج کمار، بسواجیت، راجندر کمار نے شامل کرنا اپنا فرض سمجھ لیا تھا، بعد ازاں محمود کی اپنی بینر کی فلمیں لاکھوں میں ایک (رادھیکا سلوجہ) مستانہ (پدمنی) دوپھول (ارونا ایرانی) وارث (ارونا ایرانی) بمبئی ٹوگوا، کنوارا باپ، جنی اور جانی، گرم مسالہ، نیا زمانہ، چرس وغیرہ میں زبردست کامیڈی کے ساتھ دیکھا گیا۔

محمود کی فلموں کے چند مشہور گیت جوان پر فلمائے گئے ہیں ملاحظہ کریں۔

(۱) اک چتور نار بڑی ہوشیار (پڑوسن) کشور، محمود، مناڈے (۲) ماما او ماما (پرورش)،مکیش اورلتا (۳) اپنی الفت پہ زمانہ کا پہرہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا (سسرال) رفیع ،لتا۔ (۴) وہ دن یاد کرو (ہمراہی) رفیع ،لتا () پیار کی آگ میں تن بدن جل گیا (ضدی) مناڈے (٦) آؤ ٹوئسٹ کریں (بھوت بنگلہ) مناڈے (۷) یہ دو دیوانے دل کے (جوہر محمود ان گوا) مناڈے۔ رفیع (۸) ہم کالے ہیں تو کیا ہوا دل والے ہیں (گمنام) محمود۔ رفیع (۹) او میری مینا تو مان لے میرا کہنا (پیار کئے جا) مناڈے، اوشا منگیشکر (۱۰) تجھ کو رکھے رام تجھ کو اللہ رکھے (آنکھیں) آشا بھونسلے، مناڈے (۱۱) جوڑی ہماری جمے گا کیسے (اولاد) مناڈے۔آشا (۱۲) یہ کیسا آیا زمانہ (ہمجولی)۔محمود، مکیش۔کشور) (۱۳) مٹورا مٹورا مٹوسیکا (دوپھول) محمود۔آشا) (۱۴) سج رہی گلی میری اماں (کنوارا باپ) محمد رفیع۔

محمود کی فیوریٹ ہیروئن۔

(۱) سسرال (۱۹٦۱ء) شوبھا کھوٹے

(۲) گمنام (۱۹٦۵ء) ہیلن

(۳) پیار کئے جا (۱۹٦٦ء) ممتاز

(۴) لوان ٹوکیو (۱۹٦٦ء) شوبھا کھوٹے

(۵) پتھر کے صنم (۱۹٦۷ء) ارونا ایرانی

(٦) پڑوسن (۱۹٦۸ء) سائرہ بانو

(۷) آنکھیں (۱۹٦۸ء) مالا سنہا

(۸) ہمجولی (۱۹۷۰ء) ارونا ایرانی

(۹) میں سندر ہوں (۱۹۷۱ء) لینا چندراورکر

(۱۰) جوہر محمود ان گوا (۱۹٦٦ء) سونیا ساہنی

☆☆☆

برصغیر کے نامور کامیڈین۔نور محمد چارلی

انیس امروہوی

برصغیر کے نامور کامیڈین نور محمد چارلی ۱۹۸۳ء میں کراچی میں انتقال فرما گئے۔نور محمد چارلی کا بھی ایک دور تھا جو اُن کے مرنے کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔آج کل جس قسم کی کمرشیل فلمیں بن رہی ہیں، ان میں کامیڈین کی کوئی خاص گنجائش باقی نہیں رہی۔اب تو ایک فلم کا کروڑوں روپے معاوضے لینے والے ہیرو امیتابھ بچن، دھرمیندر اور گووندہ ہی وہ کامیڈی رول ادا کر لیتے ہیں، جن کے لئے کبھی چارلی کا طوطی بولتا تھا۔

جیسے اب سے پہلے برصغیر میں کامیڈین محمود، جانی واکر اور علاؤالدین وغیرہ مشہور تھے، اسی طرح چوتھی اور پانچویں دہائی میں چارلی، غوری، کیسری، دیکشت، مرزا مشرف، بدھوا ڈوانی، بھگوان داس ،آغا سندر، وی۔ایچ۔ڈیسائی، گوپ وغیرہ کامیڈین مشہور تھے، ان ہی کے ہم عصر یعقوب اور کنہیالال بھی تھے جو کامیڈی رول کے ساتھ ساتھ ولین کا رول بھی ادا کر لیتے تھے۔

ان سب کے باوجود چارلی کا منفرد مقام تھا۔چارلی زیادہ تر چندولال شاہ کے ساتھ رنجیت مووی ٹون سے منسلک رہے۔اُن دنوں چارلی کے ساتھ غوری اور کیسری بھی رنجیت اسٹوڈیو میں ہوا کرتے تھے۔جس طرح سیٹھ چندولال شاہ کی اکثر فلموں کے ہیرو موتی لال یا ایشورلال ہوا کرتے تھے، اسی طرح ان کی فلموں میں کامیڈی رول چارلی اور غوری ادا کیا کرتے تھے۔

نور محمد چارلی کو مزاح سے شروع ہی سے شغف تھا۔اداکاری کی ابتداء اسٹیج سے کی اور کئی کامیاب ڈرامے کئے۔اس کے بعد بمبئی میں اے۔آر۔کاردار کے ساتھ کئی کامیاب فلمیں کیں۔جن میں ''ٹھوکر'' اور ''پاگل'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔''پاگل'' میں چارلی نے مختصر سا رول ادا کیا تھا، لیکن یہ ان کی زندگی کا ایک یادگار رول تھا۔فلم میں ہیرو کا رول پرتھوی راج کپور نے ادا کیا تھا۔اس فلم کی کہانی کچھ اس طرح سے تھی کہ پرتھوی راج کپور ایک ڈاکٹر ہیں اور پاگل خانے کے اسپتال میں کام کرتے ہیں۔وہ اپنی محبوبہ (مادھوری) کو اس کی مرضی کے خلاف اس کا علاج کرنے کے بہانے لے آتے ہیں، اور اُسے وہاں ایک طرح سے قیدی

بنا کر رکھتے ہیں۔پاگل خانے کے دیگر مریضوں میں ایک مریض چارلی بھی ہوتے ہیں۔وہ دیگر پاگل ساتھیوں کے ساتھ گاتے ہیں۔''پری لاؤ'' اور فوراً اُن کے سامنے مادھوری کو لا کر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔

چارلی فن موسیقی کے بھی غیر معمولی ماہر تھے اور انہیں گانے کا بہت شوق تھا اور گانوں کی نقل اتارنے میں تو انہیں کمال حاصل تھا۔اچھے خاصے کلاسیکل گانوں کو اس رنگ سے گایا کرتے تھے کہ سننے والوں کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔گانا ''پری لاؤ'' بذات خود کلاسیکی رنگ لئے ہوئے تھا، جسے چارلی نے مزاحیہ انداز میں گایا تھا۔اس طرح فلم ''ڈھنڈورا'' میں چارلی کا گایا ہوا ایک نغمہ اُن دنوں بہت مقبول ہوا، جن فلم بینوں کو چارلی کا اُس وقت کا دَور یاد ہے، اُنہیں چارلی کا گایا ہوا فلم ''ڈھنڈورا'' کا یہ گانا بھی ضرور یاد ہوگا.....

ہر چیز سے ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا
تھے ہم بھی جوانی میں بڑے عشق کے پورے
وہ کون سے گل رو تھے جو ہم نے نہیں گھورے
پر ہائے بڑھاپے میں ہوئے ایسے ادھورے
پر جھڑ گئے، دم اُڑ گئی پھرتے ہیں لنڈورے
ہر چیز سے ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

چارلی نے سیٹھ چندولال شاہ کی فلم کمپنی رنجیت مووی ٹون کے جھنڈے تلے ''ڈھنڈورا'' خود ہی پروڈیوس کی تھی اور اس فلم کے ڈائریکٹر بھی خود ہی تھے۔اس فلم میں چارلی نے ڈبل رول ادا کیا تھا۔یہ ایک دلچسپ کامیڈی فلم تھی۔اُن دنوں اس فلم نے کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کئے تھے۔اسی طرح رنجیت مووی ٹون کی ایک اور فلم ''مسافر'' میں بھی چارلی نے کلیدی رول ادا کر کے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا سکّہ جمایا تھا۔

۵۶-۱۹۵۵ء میں چارلی کراچی لوٹ گئے۔اس وقت بھارتی فلموں پر پاکستان میں پابندی نہیں لگی تھی اس لئے چارلی اپنی شہرت اور مشہور فلموں کے ساتھ کراچی گئے تھے۔ان دنوں چارلی خاصے مشہور تھے اور

جہاں کہیں بھی جاتے ،انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔

ایک ملاقات میں چارلی نے بتایا کہ اے۔آر۔کاردار ان کے ساتھ اکثر انگریزی فلمیں دیکھنے جایا کرتے تھے۔کاردار کو انگریزی نہیں آتی تھی۔وہ انگریزی فلمیں صرف اس خیال سے دیکھتے تھے کہ شاید کچھ سیکھنے کو مل جائے۔لیکن ایک روز کاردار صاحب چارلی کو اپنے ساتھ ایک اوپیرا میں لے گئے۔وہاں جا کر انہیں بڑی مایوسی ہوئی کہ کوئی خاص چیز ملی ہی نہیں۔لیکن جب اگلے روز چارلی نے اوپیرا کی مردانہ اور زنانہ آوازوں کی نقل اُتار کر پیروڈی پیش کی تو کاردار صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔

حاجی نور محمد چارلی جنہیں تقسیم ہند سے قبل انڈین چارلی کہا جاتا تھا، اور تقسیم ہند کے بعد وہ بھارت پاک کے نامور کامیڈین کہلاتے تھے، اپنی موت سے ایک ماہ قبل ہی اپنی بیوی کے جسدِ خاکی کے ساتھ کراچی آئے تھے۔ان کی بیوی جو کہ ایک عرصہ سے بیمار تھیں، سان فرانسسکو میں انتقال فرما گئی تھیں۔

نور محمد چارلی عارضۂ قلب میں مبتلا تھے۔کچھ دن قبل ہی اُنہیں دل کا دورہ پڑا تھا۔انہیں اسپتال میں داخل کرایا گیا، لیکن جانبر نہ ہوسکے......سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چارلی کا انتقال کب ہوا....یکم جولائی ۱۹۸۳ء کو یا اگست ۱۹۴۷ء کو، جس روز ترک وطن کر کے پاکستان آنے پر ایک آرٹسٹ کی حقیقی موت ہوگئی تھی۔چارلی زندگی بھر جی بھر کے جئے۔خود بھی ہنسے اور دوسروں کو بھی ہنسایا اور دوبار مرے.....وہ خود نمائش و نمود کے قائل نہیں تھے۔پروپیگنڈے اور شہرت کے بھوکے نہیں تھے۔وہ ایک شاندار آدمی تھے۔

☆☆☆

فطری صلاحیت والا کامیڈین۔جانی واکر

خاور حسن

جانی واکر چارلی چیپلن تو نہیں تھے مگر چارلی جیسے ہی ایک کامیڈین تھے، وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ کامیڈی صرف الفاظ کی ادائیگی سے نہیں کی جاتی۔ہنسانے میں حلیہ، چہرے کے تاثرات اور جسم کے اعضا کی حرکات وسکنات بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں، چنانچہ ہنسانے کے لیے انہیں کبھی مزاحیہ الفاظ کی ضرورت نہیں پڑی۔پردے پر ان کی موجودگی ہی اس بات کے لیے کافی تھی کہ شائقین اپنی کرسیوں پر سنجیدہ اور اداس نہیں بیٹھیں گے۔ان کی آواز کا اتار چڑھاؤ، گردن کو ہلانے ڈلانے اور لبوں کو سکوڑنے کا انداز، چلنے کا اسٹائل اور مخصوص قسم کی مونچھیں...یہ سبھی ادائیں آج کامیڈی کرنے والوں کے لیے توجہ کا موضوع بنی ہوئی ہیں۔

جانی واکر کا اصلی نام بدرالدین قاضی ہے۔بھوپال میں ان کے والد ایک مل میں نوکری کرتے تھے لیکن جب وہ بند کردی گئی تو انہیں اپنی فیملی کے ساتھ ممبئی کا رخ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔۱۵افراد پر مشتمل خاندان کی ضرورتوں سے بدرالدین بہت اچھی طرح واقف تھے لیکن وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ کامیاب زندگی، زندہ دلی سے ہی جی جاسکتی ہے اور زندہ دلی سے جینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ دکھوں کو خوشی پر حاوی نہ ہونے دیا جائے اس لیے وہ صرف خود ہی نہیں مسکراتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی ہنسنے پر مجبور کردیتے تھے۔جب وہ ایک سبزی فروش تھے تب بھی ایک کامیڈین کی طرح لوگوں کو ہنساتے تھے۔اور جب حالات ذرا بہتر ہوئے اور بامبے الیکٹرک سپلائی اینڈ ٹرانسپورٹ (بیسٹ) سے وابستہ ہوئے تو بھی انہوں نے لوگوں کو ہنسانا نہیں چھوڑا۔شاید ان کی یہی ادا اوپر والے کو بھا گئی اور اس نے ان کی زندگی کا رخ ایسا موڑا کہ انہیں کبھی غمگین نہ ہونا پڑا۔

بدرالدین بیسٹ کی بسوں کے لیے کنڈکٹر کی حیثیت سے منتخب ہوئے تھے اور انہیں دادر کے بس ڈپو کے لیے بحال کیا گیا تھا لیکن بس کے ساتھ انہیں بمبئی (ممبئی) کے دیگر حصوں میں بھی جانے کا موقعہ ملتا تھا۔یہ بات ۱۹۵۰ء کی ہے۔ان دنوں مشہور اداکار بلراج ساہنی 'بازی' لکھ رہے تھے۔ایک دن بس میں ان کی ملاقات کنڈکٹر بدرالدین قاضی سے ہوئی تو وہ ان سے بے حد متاثر ہوئے۔انہیں ایسا

محسوس ہوا جیسے ان کی کہانی کا کامیڈین، بدرالدین کی شکل میں ان کے سامنے کھڑا ہو۔ بلراج ساہنی کے کہنے پر جب ہدایت کار گرودت نے ان کا آڈیشن لیا تو وہ بھی کنڈکٹر بدرالدین کی اداکارانہ صلاحیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چونکہ آڈیشن میں انہوں نے ایک شرابی کی اداکاری کی تھی اس لیے اس وقت کی اسکاچ وھسکی کے برانڈ 'جانی واکر' کے نام پر گرودت نے ان کا فلمی نام جانی واکر رکھ دیا۔ پھر جب فلم 'بازی' ریلیز ہوئی تو ہیرو دیو آنند کی فلم میں جس طرح جانی واکر نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا اس نے شائقین کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اس جانی واکر کا بھی اپنا ہی نشہ ہے اور یہ نشہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ 'بازی' ہٹ ہوئی اور ساتھ ہی جانی واکر بھی سپر ہٹ ہو گئے۔

جانی واکر نے ہنسانے کے لیے کبھی ذومعنی اور بھدّے الفاظ کا استعمال نہیں کیا اس کے باوجود وہ پہلے ایسے کامیڈین تھے جنہیں ذہن میں رکھ کر کردار تخلیق کیے گئے۔ ان کا کریز ایسا تھا کہ اس وقت کا کوئی بڑا ہدایت کار یہ تصور ہی نہیں کر سکتا تھا کہ ہنسی، خوشی کی کہانی پر مبنی کوئی کامیاب فلم، جانی واکر کے بغیر بھی مکمل کی جا سکتی ہے۔ گرچہ ان کی آمد سے قبل بھی بالی ووڈ میں کئی ایسے کامیڈین تھے جن کی بڑی شہرت تھی لیکن ان میں سے زیادہ تر صرف ہیرو کی 'شبیہہ' کو ابھارنے کے لیے ہی فلموں میں استعمال کیے جاتے تھے۔ ان کے اپنے کردار کی چھاپ کم ہوتی تھی۔ گرودت، جانی واکر کے لیے صرف ایک ایسے فلمساز و ہدایت کار ہی نہیں تھے جنہوں نے انہیں فلموں میں پہلا بریک دیا تھا بلکہ وہ ان کے بہت اچھے دوست بھی تھے، چنانچہ ۱۹۶۴ء میں گرودت کی موت کے بعد جانی بالکل ٹوٹ سے گئے۔ پہلی بار لوگوں کو ایسا محسوس ہوا کہ موت کا سایہ گرودت کے دوست پر اثر انداز ہو گیا ہے لیکن جلد ہی انہوں نے یہ بات ثابت کر دی کہ کامیڈین جانی واکر کے سامنے موت کی اداسی طویل مدت تک ٹھہر نہیں سکتی۔ گرودت کے علاوہ دلیپ کمار سے بھی جانی واکر کا بڑا دوستانہ تھا۔

جن نغموں کی فلم بندی جانی واکر پر کی گئی تھی، ان میں انہیں دو نغمے بے حد پسند تھے۔ ایک نغمہ فلم 'سی آئی ڈی' کا 'یہ ہے بامبے میری جان' اور ایک نغمہ فلم 'پیاسا' کا 'سر جو تیرا چکرائے' تھا۔ 'سر جو تیرا چکرائے' کے تعلق سے ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ایک بار جب وہ گرودت کے ساتھ کلکتہ (کولکاتا) گئے تو ایک شخص کو بڑے اچھے انداز میں تیل کی مالش کرتے ہوئے دیکھا۔ گرودت نے ان سے کہا کہ وہ اس شخص کو غور سے دیکھیں، کیوں کہ اس طرح کا کردار انہیں ان کی فلم میں

ادا کرنا ہے۔ بعد میں اسی کردار پر مبنی نغمے کی فلم بندی 'پیاسا' کے مذکورہ نغمے کی گئی۔

۱۹۵۵ء میں جب جانی واکر گرودت کی فلم 'مسٹر اینڈ مسز ۵۵' کی شوٹنگ کر رہے تھے تو ان کی ملاقات اس وقت کی مشہور اداکارہ شکیلہ کی بہن نور سے ہوئی۔ وہ ان کی آنکھوں میں واقعی نور بن کر بس گئیں اور ان کے بغیر جانی واکر کو اپنی زندگی سونی نظر آنے لگی۔ آخرکار نکاح کر کے نور کو انہوں نے اپنا بنا لیا اور خود بھی ہمیشہ کے لیے ان کے بن گئے۔ ایسا نور، بچوں کی محبت اور گھر سے وابستگی کی وجہ سے بھی ہوا کہ کامیابی کے نقطۂ عروج پر پہنچنے کے بعد بھی جانی واکر نے ایک عام آدمی کی طرح زندگی بسر کی۔ قدروں سے کبھی ناطہ نہیں توڑا، فلم انڈسٹری کی بھول بھلیاں میں وہ گم نہیں ہوئے۔ چنانچہ جب انہیں یہ شدت سے محسوس ہونے لگا کہ Cheapness کو کامیڈی کا نام دیا جانے لگا ہے تو انہوں نے خاموشی سے فلموں سے علیحدگی اختیار کرنے میں ہی بہتری سمجھی اس لیے یہ کہنا غلط ہوگا محمود کا عروج ان کے زوال کا سبب بنا اور وہ ان کی (محمود کی) وجہ سے بالی ووڈ چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔

جانی واکر کی آخر فلم 'چاچی ۔۴۲۰' ۱۹۹۸ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ یہ فلم انہوں نے ہدایت کار اور نغمہ نگار گلزار کی گزارش پر کی لیکن ان کا آخری بہترین کردار 'آنند' کے کردار کو سمجھا جاتا ہے۔ 'آنند' کے کردار میں اپنی اداکارانہ صلاحیت کی چھاپ چھوڑ کر یہ بات انہوں نے بہت حد تک واضح کر دی کہ دکھانے والے چھوٹے سے رول میں بھی اپنی صلاحیت دکھا دیتے ہیں۔ ۲۹/جولائی ۲۰۰۳ کو جب انہوں نے یہ دنیا چھوڑی تو اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ زندگی بھر ہنسانے والا بھی ایک دن رُلا جاتا ہے۔

☆☆☆

رومانٹک اداکار اور کامیڈین۔بھگوان داس

ہما انور

بھگوان اباجی پانڈو عرف ''بھگوان'' عرف ''بھگوان دادا'' گزشتہ برسوں میں ایک ایسے مزاحیہ اور نا قابل فراموش کامیڈین گزرے ہیں جنہیں لوگ فراموش کرنا بھی چاہیں تو فراموش نہیں کرسکتے۔ بھگوان کی کامیڈی سے بھرپور میوزیکل فلم ''البیلا'' ۱۹۵۱ء میں ریلیز ہوئی تھی اور بھگوان نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے آپ کو سپر اسٹار کاسٹ کی دوڑ میں شامل پایا تھا۔آج بھی جبکہ زمانہ جیٹ اتج میں پہنچ چکا ہے اور الکٹرانک تفریحات نے لوگوں کی زندگی تبدیل کردی ہے۔اس کے باوجود آج بھی پرانے لوگوں کی زبان پر یہ نغمہ ''شعلہ جو بھڑکے''....دل میرا دھڑکے یا پھر ''بھولی صورت دل کے کھوٹے...نام بڑے اور درشن چھوٹے'' فلم البیلا کے ان گیتوں کو لوگ کبھی بھی فراموش نہیں کرسکتے ہیں، چاہے کوئی تقریب فلم ایوارڈز کی ہو، ڈسکو کی ڈانڈیا کی یا پھر کوئی شادی کی محفل، وہاں البیلا کے یہ گیت سونے پر سہاگہ کا کام کرتے ہیں صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ہر سپر اسٹار چاہے وہ امیتابھ بچن ہو، گووندہ ہو، متھن چکرورتی یا رشی کپور، سبھوں نے بھگوان کی نقّالی کی اور اس کا اعتراف بھی کیا کہ بھگوان کی نقّالی کرکے انہوں نے کامیابی حاصل کی ،لیکن اعلیٰ ظرف بھگوان نے کبھی بھی کسی کے سامنے اس کا اظہار نہیں کیا کہ فلاں فلاں سپر اسٹار نے ان کے رقص کرنے کے انداز کی نقّالی کی ہے۔بھگوان کے سلوموشن میں رقص کرنے کے انداز کو کوئی بھی فراموش نہیں کرسکتا ہے۔

بھگوان کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کسی فلم میں رومانٹک ہیرو کا رول بھی ادا کرسکتے ہیں، کیونکہ ان کا جسم فربہ، قد چھوٹا اور بہت ہی سلوموشن میں چلنے کا انداز تھا لیکن فلم البیلا میں جب بھگوان کو گیتا بالی جیسی ٹاپ ہیروئن کے ساتھ ہیرو بننے کا موقع ملا تو انھوں نے یہ ثابت کردکھایا کہ وہ نہ صرف ایک سنجیدہ اور باصلاحیت اداکار ہیں بلکہ اپنے کام کی بدولت وہ اچھے اچھے کا دل بھی جیت سکتے ہیں۔فلم البیلا باکس آفس میں ہٹ فلم ثابت ہوئی تھی بھگوان جو کہ راسخ العقیدہ ہندو

فیملی سے تعلق رکھتے تھے ان کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ فلموں میں کام کریں گے ،جس وقت انھوں نے فلم انڈسٹری کا رخ کیا تھا تو ان کے خاندان والے دیگر دوست احباب ان پر ہنستے تھے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے کہ پہلے اپنی شکل دیکھیں پھر ہیرو بننے کی کوشش کریں۔

اسی جدوجہد کے دور میں ان کی ملاقات گلوکارہ اداکارہ ثریا اور نورجہاں سے ہوئی اور دونوں نے بھگوان کے ٹیلنٹ کو سمجھا اور اعتراف کیا اور پھر ان دونوں کی بدولت بڑے بڑے فلمسازوں اور ہدایت کاروں کے ساتھ ان کی ملاقات کرائی گئی۔جس کے بعد انہیں فلم میں چھوٹے چھوٹے رول ملنے لگے۔اور لوگ انہیں کامیڈین ادکار ''بھگوان'' کے نام سے جاننے اور پہچاننے لگے۔

گیتا بالی مرحومہ خود بھگوان کی ہمت افزائی میں شامل رہیں اور فلم البیلا میں جب نلنی جیونت کا منی کدم اور دوسری اداکاراؤں نے بھگوان کے ساتھ لیڈرول میں کام کرنے سے انکار کیا تو اس وقت نوتن ، وجنتی مالا نے خود اس کی پیشکش کی کہ وہ بھگوان کے ساتھ البیلا میں کام کرنے کو تیار ہیں لیکن پروڈیوسر نے چونکہ گیتا بالی سے معاہدہ کرلیا تھا کہ گیتا بالی نے بغیر معاوضے کے کام کرنا منظور کیا کہ فلم اگر کامیاب ہوئی تب فلمساز اُسے پیسے دے سکتے ہیں اور فلم بیحد کامیاب ہوئی اور فلمساز نے حسب وعدہ گیتا بالی کو ۶۰ ہزار روپئے کا چیک بھیج دیا اس زمانے میں ٹاپ کی ہیروئن ایک لاکھ سے ڈیڑھ لاکھ روپئے لیتی تھیں جبکہ آج کے زمانے میں ملکہ شراوت جیسی رقاصہ صرف ایک ڈانس کے لئے چار کروڑ روپے کا مطالبہ کرتی ہے۔بعد ازاں فلم البیلا کی تیاری شروع ہوئی لیکن اسی دوران فلمساز چل بسے اور ہدایتکار نے خود کو الگ کرلیا تو بھگوان نے پہلی مرتبہ ہدایتکار، فلمساز کے ساتھ فلم میں خود ہیرو کا رول نبھایا اور فلم نے اس زمانے میں باکس آفس میں نیا ریکارڈ بنایا تھا۔اس فلم میں بھگوان کا کردار ایک سیدھے سادے معمولی انسان کا تھا جو صرف میوزک اور گانے میں دلچسپی رکھتا تھا۔

موسیقار سی راچندر کی موسیقی نے اس فلم کی کامیابی میں بہت ہی اہم رول ادا کیا تھا۔اس فلم کی تیاری کے دوران بھگوان اور سی راچندر کے درمیان گہری دوستی بھی ہوگئی تھی۔البیلا کے سپرہٹ ہوتے ہی بھگوان کو زبردست مقبولیت ملی اور دولت کی ریل پیل بھی۔

لیکن اس زبردست مقبولیت اور دولت کی حصول کے بعد بھی بھگوان نے اپنی زندگی میں

کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ ان کے والد ایک ٹکسٹائل ملز میں ورکر تھے ان کی ابتدائی زندگی ممبئی کے پاریل اور دادرا ایریا میں گزری، ماسٹر وٹھل جو خاموش فلموں کے سپر ہٹ اداکار تھے وہ بھگوان کے پسندیدہ اداکار تھے۔ بھگوان اپنی فلموں میں حیرت انگیز سین اور فائٹ سین میں بیحد دلچسپی رکھتے تھے۔ بھگوان کو چار کلاس پاس کرنے کے بعد ہی تعلیم چھوڑ دینی پڑی تھی اورانہوں نے زندگی گزارنے کے لئے چھوٹے موٹے کام کرنا شروع کر دیئے۔ انھوں نے اپنے آپ کو مضبوط بنانے کے لئے ایک مقامی جمنا سٹک کلب میں بھی داخلہ لے لیا تھا۔ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب وہ بالکل ریمبو جیسی جسامت کے مالک ہو گئے تھے۔

وہ دن بھرا سٹوڈیوز کے چکر لگایا کرتے کہ کہیں انہیں کام مل جائے ۱۹۳۰ء میں انہیں بریک ملا۔ فلمساز سراج علی حکیم نے انہیں اپنی خاموش فلم ''بے وفا عشق'' میں انہیں ایک کامیڈین کا رول دیا، وہ فلم زبردست ہٹ ثابت ہوئی، اس فلم میں بھگوان نے ایک کبڑے کا رول ادا کیا تھا جسے بیحد پسند کیا گیا لیکن اس کے بعد مہینوں تک اسے کوئی بھی کام نہیں ملا کیونکہ سبھی اسی قسم کے رول میں دیکھنا چاہتے تھے اوراس قسم کا کوئی دوسرا رول نہیں تھا۔

بھگوان نے اسی دوران چندراورکر پوار سے ملاقات کی جنھوں نے اسے اپنی تین خاموش فلموں میں رول دیا۔ ۱۹۳۶ء میں بھگوان نے اپنی فلم بنائی جس کا نام ''ہمت مرداں'' تھا اس کے بعد انھوں نے دوسری کمپنی میں خود کو شامل کرلیا اور ایک دوسری فلم ''بہادر کسان'' بنائی اس فلم میں بھگوان نے ہنسا راڈ کر کو ہیروئن بنایا۔ یہ فلم زبردست ہٹ ہوئی۔ اس فلم کی شوٹنگ کے دوران بھگوان نے اپنے اسسٹنٹ کے طور پر چیتلکر رامچندر کو شامل کیا۔ اورسی رامچندر کے بعد دیگرے تین فلموں میں میوزک ڈائریکٹر بنے اور بھگوان نے انہیں ایک مشہور میوزک ڈائریکٹر بنا دیا۔ اسی بناء پر جب رامچندر اور بھگوان پر فلم بیحد کامیاب ہوئی اس فلم میں ایک بہت ہی مشہور لوری بھی تھی'' دھیرے سے آجاری.... انکھیوں میں.... کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایکشن فلمیں بیحد کامیاب ہوا کرتی تھیں اس زمانے میں بھگوان اور ناڈیا (ہنٹر والی) کے عروج کا زمانہ تھا۔ بھگوان نے دیگر کئی فلموں میں ہیرو کے رول نبھائے جنہیں'' بڑے

صاحب، داماد، غضب، رام بھروسے اور بھولے بھٹکے شامل ہیں۔

ان کی فلم ''بھیدی بنگلہ'' ایک پراسرار، خوفناک فلم ثابت ہوئی تھی۔ اس سے پہلے ایسی خوفناک فلم بنانے کا کسی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن بھگوان نے صرف تین ماہ کے اندر اس فلم کو مکمل کیا۔ جب فلم ریلیز ہوئی تو ممبئی کے سبھی کیمرہ مین اور ڈائریکٹر قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے کہ اس فلم میں جو اسپیشل ایفکٹس پیش کئے گئے وہ کیسا تھا اور سبھی تعجب میں پڑ گئے کہ یہ ایسا شاندار بھی ہوسکتا ہے۔ وی شانتا رام جیسے اعلیٰ پائے کے ڈائریکٹر بھی بھگوان سے بیحد متاثر ہوئے تھے۔ بھگوان نے اپنی اس فلم کی ڈبنگ، ریکارڈنگ اور ٹرائل جنہیں اسٹوڈیو میں مکمل کرائے تھے جہاں راج کپور تقریباً ہر دن آیا کرتے تھے۔ راج کپور نے بھی بھیدی بنگلہ دیکھی اور اس فلم کو انھوں نے بیحد پسند کیا تھا، خاص طور پر رقص کے مناظر انہیں بیحد پسند آئے تھے اس موقع پر راجکپور نے انہیں مشورہ دیا کہ فلم میں چند دھشیم دھشیم مناظر رکھے جائیں جو لوگوں میں بیحد پسند کئے جائیں گے۔

البیلا کی بیحد کامیابی کے بعد بھگوان نے لا بیلا بنائی پھر اس کے بعد جھمیلا بنائی لیکن یہ دونوں فلمیں فلاپ ہو گئیں۔ ایک اور فلم ''سہمے ہوئے سپنے'' بھی زبردست فلاپ ہوئی تھی۔ جس سے بھگوان کو کنگال ہو جانا پڑا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے کشور کمار کے ساتھ مل کر ایک فلم ''ہنستے رہنا'' بنائی جس میں بھگوان نے اپنی بیوی کے سارے زیورات، اپنی گاڑی اور بنگلہ تک بیچ ڈالا۔ لیکن فلم کے دوران کشور کمار نے آنا کافی شروع کر دی اور فلم درمیان ہی میں رک گئی۔

اس سے بھگوان کو ایک تلخ تجربہ ہوا، ان کے دوستوں کی طویل فہرست جو پہلے ان کے ساتھ ہوٹلوں میں کھاتے پیتے تھے ایک ایک کر کے سبھی الگ ہو گئے اور بھگوان اکیلا رہ گیا بھگوان اس کے بعد اپنی بیوی کو لے کرایہ کے دو کمرے والے فلیٹ میں منتقل ہو گئے۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں ان کی غیر شادی شدہ سڑک ان کی دیکھ بھال کرتی رہی اور ایک لڑکا جو ساؤنڈ ریکارڈسٹ تھا وہ بھی ان کی مدد کرنے لگا۔ جوہو میں ان کا بنگلہ جو ۲۵ کمروں پر مشتمل تھا اور ۷ بہترین کار بھی ایک ایک کر کے فروخت ہو گئیں۔ بھگوان نے تقریباً ۵۰ برسوں تک فلموں میں کام کیا اور ۶۰۰ فلموں میں انہیں دیکھا گیا۔ بھگوان نے بطور کامیڈین سندباد جہازی، گونج، چوری

چوری، ترانہ، ایک سے بڑھ کر ایک، شرابی وغیرہ میں بھی کام کئے۔ لیکن وہ موجودہ طرز طریق کار کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اسی بناء پر وہ بالکل علاحدہ ہو گئے تھے۔ سائن آرٹسٹ ایسوسی ایشن اور انڈین موشن پکچرز ایسوسی ایشن کی طرف سے انہیں ۳ ہزار اور ۵ ہزار روپے ماہانہ ملتے تھے۔

بھگوان کے آخری دنوں میں ان کے گھر پر سنیل دت، دلیپ کمار، جانی لیور، اور ستین کپور جایا کرتے تھے۔ وہ دلیپ کمار کے بیحد ممنوع تھے کیونکہ دلیپ کمار جب بھی ان کی رہائش گاہ کے قریب سے اپنی گاڑی سے گزرتے تھے تو وہ گاڑی روک کر مخصوص انداز میں ہارن بجایا کرتے تھے جس پر بھگوان کھڑکی میں آکر انہیں ہاتھ ہلایا کرتے تھے۔ جب بھگوان کسی فلمی تقریب میں شریک ہوتے تھے تو بڑے بڑے اداکار جھک کر ان سے ملتے اور مصافحہ کرتے تھے۔

☆☆☆

اعلیٰ تعلیم یافتہ اداکار۔ آئی ایس جوہر

فاریہ قیصر

اندرسین جوہر (آئی ایس جوہر) جن کی پیدائش ۱۹۲۰ء میں ملتان (پاکستان) میں ہوئی تھی ان کا انتقال ۲۵ مئی ۱۹۸۰ء کو ہوا، آئی ایس جوہر ایک ایسے اداکار، فلمساز اور ہدایتکار تھے جن کا ثانی اگر کوئی ہوسکتا ہے تو وہ صرف کشور کمار ہی ہوسکتے ہیں، جوہر صرف گلوکار نہیں تھے جبکہ کشور کمار ملک کے ایک بہترین اور ناقابل فراموش گلوکار تھے لیکن جوہر کی آواز چونکہ پھٹے ہوئے بانس کی طرح سے تھی اس لئے انھوں نے کبھی بھی گانے کی کوشش نہیں کی۔ جوہر کی یادگار فلموں میں شاگرد، جانی میرا نام، جوہر محمود ان گوا، جوہر ان کشمیر جوئے بنگلہ دیش وغیرہ ہیں اور انھوں نے جس فلم میں بھی اپنی اداکاری کا مظاہرہ کیا، ان کے مقابلے میں کوئی ٹھہر نہ سکا، حتیٰ کہ شہنشاہ جذبات دلیپ کمار بھی فلم داستان کے ایک سین میں بالکل زچ ہو کر رہ گئے تھے۔ جوہر کی سب سے زیادہ مشہور اور یادگار فلم کا نام جانی میرا نام ہے۔ اس فلم میں انھوں نے ٹرپل رول ادا کیا تھا اور تینوں ہی رول میں وہ بیحد جچے تھے، اس فلم میں ان کی اداکاری کے آگے دیو آنند، ہیما مالنی اور پریم ناتھ، پران جیسے منجھے ہوئے اداکار بھی پھیکے پڑ گئے تھے۔

جوہر انگریزی کے ماہر تھے، اگرچہ انھوں نے آکسفورڈ میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر اکثر و بیشتر وہ مہمان پروفیسر کی حیثیت سے آکسفورڈ یونیورسٹی میں لیکچر دینے کے لئے مدعو کئے جاتے تھے، انھوں نے تقریباً ۲۴ برسوں تک فلم فیئر میگزین میں سوال و جواب کا کالم سنبھالے رکھا اور ان کے جوابات اس قدر چُست اور برجستہ ہوتے تھے کہ پڑھنے والے دلچسپی کے ساتھ فلم فیئر خریدا کرتے تھے۔

فلم ''داستان'' (دلیپ کمار، شرمیلا) کی کہانی آئی ایس جوہر ہی نے لکھی تھی اور اس فلم کو پہلی مرتبہ ۱۹۵۴ء میں فلمایا گیا جس میں شیکھر اور شیلا رمانی نے کام کیا تھا بعد ازاں بی آر چوپڑہ نے اسی فلم کو دوبارہ بنایا، اگرچہ دوسری مرتبہ بھی یہ فلم کامیاب نہ ہوئی۔ لیکن اس فلم میں دلیپ کمار، پریم چوپڑہ اور بندو کی اداکاری انتہائی عروج پر تھی۔ اس فلم کے ذریعہ جوہر نے اپنی کہانی، ڈائیلاگ اور اسکرین پلے کی بدولت کافی نام کمایا تھا۔

جوہر ایک سنجیدہ اداکار تھے لیکن ضرورت کی وجہ سے انہیں کامیڈین بننا پڑا، انھوں نے اپنی فلموں کے

ذریعہ مغربیت لانے کی ہر ممکنہ کوشش کی تھی کیونکہ وہ بالی ووڈ کی فلموں سے بیحد متاثر تھے، انھوں نے اپنی فلم ''جو ہر محمود ان گوا'' میں پہلی مرتبہ سونیا ساہنی کو ہیروئن کے روپ میں پیش کیا تھا اور اس فلم میں پہلی مرتبہ بوسے کا منظر فلمایا گیا تھا جس پر سنسر بورڈ پر کافی لعن طعن ہوئی تھی لیکن جو ہر سنسر بورڈ کو ایک مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ سنسر بورڈ چند احمقوں کی انجمن ہے۔ انھوں نے فلم کی ضرورت کے مطابق عریاں مناظر رکھے اور جب سنسر بورڈ نے اعتراض کیا تو فلم فیئر کے مختلف آرٹیکل میں ان کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں جس پر وہ خاموش ہو گئے جس کے بعد تو انہیں اور بھی آزادی مل گئی، جوئے بنگلہ دیش اور فائیو رائفلز میں جو ہر نے اپنی بیٹی کو ہیروئن بنایا اور اُسے بھی فلم میں عریاں دکھایا اور باقاعدہ بوسے کے سین بھی رکھے۔

اگر چہ کہا جائے کہ جو ہر اپنی فلموں میں پھوہڑ پن کا مظاہرہ کرتے تھے اور گھٹیا ٹسٹ رکھنے والوں کے لئے تفریح مہیّا کرتے تھے تو یہ بالکل غلط ہوگا کیونکہ انھوں نے چند ایسی فلمیں بھی کیں اور خاص طور پر جانی میرا نام، جو ہر محمود ان گوا، داستان شاگرد وغیرہ جس نے بھی دیکھی، اس نے اعتراف کیا کہ جو ہر ایک مکمل اور منجھے ہوئے کامیڈین ہیں، اگر چہ اس زمانے میں جانی واکر، محمود، مقری، اوم پرکاش، سندر، بھگوان، کیشٹو مکھر جی، بیربل، موہن چوٹی، کشور کمار، دھومل، وغیرہ بھی اپنی پہچان رکھتے تھے اور خاص طور پر محمود، جانی واکر اور اوم پرکاش تو بیحد کامیاب کامیڈین تھے لیکن ان کے درمیان رہتے ہوئے آئی ایس جو ہر کو ناقابل فراموش کامیڈین تسلیم کیا گیا ہے۔ آئی ایس جو ہر نے دلیپ کمار، راجندر کمار، دیو آنند، سنیل دت، جوئے مکھر جی، منوج کمار، راج کپور، دھرمیندر جیسے بڑے اداکاروں کے ساتھ کام کیا۔ ان کی نظر میں نوتن سب سے اچھی اداکارہ تھی، اور بمل رائے کی فلم بندنی میں نوتن کا رول دیکھ کر انھوں نے کہا تھا کہ یہ رول مینا کماری، نرگس جیسی اداکارہ بھی نہیں کر سکتی تھی، جو ہر کی موت کے بعد ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا جو دنیا کے ہر اہم مسئلے پر فلم بنانے کی خواہش رکھتے تھے بنگلہ دیش کی جنگ آزادی پر انھوں نے فلمیں بنائیں، آخر میں وہ بھٹو کی پھانسی پر بھی ایک فلم بنانا چاہتے تھے مگر انہیں اس کی اجازت نہیں ملی۔

☆☆☆

ہندی فلموں کے ناقابلِ فراموش مزاحیہ اداکار

ڈاکٹر شاہد اختر

یوں تو ہندی فلموں میں کئی ایسے مزاحیہ اداکار سامنے آئے اور لوگوں کو ہنسا ہنسا کو لوٹ پوٹ کر گئے اور گزرتے زمانے کے ساتھ ان کے نقوس بھی مٹتے چلے گئے لیکن ۱۹۵۰ء سے ۲۰۰۰ء تک چند ایسے مزاحیہ اداکار بھی سامنے آئے جنھوں نے بہت زیادہ شہرت و مقبولیت کے ساتھ دولت کی ریل پیل بھی دیکھی جن میں بلاشبہہ اوم پرکاش، محمود، جانی واکر، اتپل دت، جانی لیور، اسرانی، بھگوان دادا، آغا کیشٹو مکھر جی، سندر، مقری، کشور کمار قابل ذکر ہیں لیکن ان میں چند مزاحیہ اداکار ایسے بھی گزرے ہیں جن کی اداکاری انتہائی عروج پر رہی لیکن بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ نہ صرف لوگوں نے فراموش کر دیا بلکہ اس ترقی یافتہ دور کی سب سے اہم ایجاد کمپیوٹر کے ڈسک میں بھی ان کی تصویر موجود نہیں اور جب ان کے نام لکھ کر بورڈ میں کلک کیا جائے تو اس میں یہی لکھا نظر آئے گا This photo is not found، حیرت کی بات یہ ہے کمپیوٹر نے دنیا جہاں کی تصویریں اپنے اندر سمو رکھی ہیں، لیکن اپنے وطن عزیز کے ان شاہکار اداکاروں کی تصویریں موجود نہیں جنھوں نے برسوں اپنی مزاحیہ اداکاری کے ذریعہ لوگوں کا دل بہلایا اور ان کے غموں کا مداوا بنے لیکن اس کے باوجود نئی نسل ان سے بے بہرہ ہے اور ان کے بارے میں جاننے کی بھی کوشش نہیں کرتی۔ آسنسول کے میرے ایک کرم فرما شکیل انور صاحب کا کہنا کے کہ اس کالم کے ذریعہ پرانی یادوں کو کرید کر نئی نسل کو پرانی یادوں کے قریب کیا جا رہا ہے کہ اگر وہ فلموں کے شوقین ہیں تو ماضی کے ان شہنشاہوں، ان بادشاہوں کو فراموش نہ کریں جنھوں نے برسوں سلور اسکرین پر اپنی حکمرانی جاری رکھی اور اپنی خوبصورت اداکاری کے ذریعہ لوگوں کے دل کو بہلایا کولکاتا کے گارڈن ریچ مٹیا برج کی منفرد شخصیت اور انگنت کتابوں کے خالق جناب الف انصاری کا کہنا ہے کہ انہوں نے یادوں کے جھروکوں والے کالم کو شروع تا آخر محفوظ کیا ہے کیونکہ ان کی نظر میں یہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک اثاثہ ہے جو کبھی نہ کبھی کسی ادبی پاگل کے ذریعہ کتابی شکل میں نظر آئے گا اور لوگ ماضی کے درخشندہ ستاروں سے بھی واقف ہوں گے جنہیں موجودہ نسل فراموش کر چکی ہے۔ انہوں نے سہراب مودی، پرتھوی راج کپور، راج

کپور، راجندر کمار، دلیپ کمار، دیو آنند، راجکمار، دھرمیندر، منوج کمار، سنیل دت، امیتابھ بچن، نرگس، مینا کمار، نندہ، آشا پاریکھ، وحیدہ رحمٰن، این اے انصاری، للیتا پوار، اشوک کمار، بینا رائے، محمود، کیشٹو مکھر جی، مقری، جینت، وجنتی مالا، کامنی کوشل، ہیما مالنی، سری دیوی، دیویا بھارتی، سمیت تقریباً ۱۰۰ سے زائد اداکار، اداکارہ، ویلین معاون اداکار، معاون اداکارہ اور مزاحیہ اداکاروں کے مضامین کو سمیٹ رکھا ہے جو صحیح معنوں میں ان کی جرأت کی اعلیٰ مثال ہے۔

بہر کیف زیر نظر مضمون چند ایسے مزاحیہ اداکاروں پر مشتمل ہے جنہیں بلا شبہہ UNSUNG HEROES کہا جاسکتا ہے کیونکہ ان کی تصویریں نایاب ہیں اور ان مزاحیہ اداکاروں میں بلاشبہہ جو چند نام سامنے آئے ہیں وہ رادھا کشن، گوپ، یعقوب، جگدیپ، آغا، مقری، کیسٹو مکھر جی، راجندر ناتھ، دھومل اسرانی ہیں مندرجہ ذیل میں ان چاروں مزاحیہ اداکاروں کا خاکہ پیش کیا جارہا ہے امید ہے کہ اس مضمون کو وہ لوگ ضرور پسند کریں گے جو پرانی یادوں کو اب بھی ایک اثاثہ سمجھتے ہیں۔

رادھا کشن:۔ رادھا کشن صحیح معنوں میں اسم با مسمیٰ تھے بلکہ ایسے نام کوئی شاذ و نادر ہی رکھے گا جن کے نام سے احساس ہو کہ وہ کسی لڑکی کا نام ہے رادھا کشن یا رادھا کا کشن۔ رادھا کشن نے ۱۹۴۵ء سے ۱۹۶۵ء تک انگنت فلموں میں اہم رولز ادا کئے جس میں سب سے اہم رول ۱۹۵۷ء کی ریلیز بی آر چوپڑہ کی فلم ''نیا دور'' تھی جس میں دلیپ کمار، وجنتی مالا، جانی واکر، چاند عثمانی اور اجیت وجیون نے اہم رول ادا کئے تھے۔ رادھا کشن اس فلم میں ایک سازشی اور مکار قسم کے انسان تھے اور فلم کے ویلین جیون کے دست راست۔ فلم میں بس اور یکے کی دوڑ کے پروقار مقابلے کے لئے سڑک تیار کرنے کی مہم کے دوران رادھا کشن نے ایسے ایسے ہتھکنڈے اپنائے اور چہرے پر ہر وقت مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ دانت کھسوڑ کھسوڑ کر باتیں کرنے کا ان کا مخصوص انداز لوگوں کو آج بھی یاد رہا ہے۔ رادھا کشن یوں تو اپنی ذاتی زندگی میں بیحد خشک مزاج اور سنجیدہ آدمی تھے لیکن اپنی فلموں میں وہ اپنے مخصوص مکارانہ مسکراہٹ اور دانت کھسوڑ کر بات کرنے کا انداز انہیں دوسروں سے منفرد کرتا تھا۔

بی آر چوپڑہ نے اپنی یادگار فلم ''سادھنا'' (سنیل دت۔ وجنتی مالا) میں بھی انہیں ایک مکاّر قسم

کے عورتوں کے دلال کا رول دیا تھا اور انہوں نے اپنے اس رول کو بھی بخوبی ادا کیا تھا۔ اس فلم میں منموہن کرشن بھی ایک خطرناک غنڈے کے رول میں عورتوں کی دلاّلی کرتے تھے، پوری فلم میں منموہن کرشن اور رادھا کشن کی جوڑی نے ہیبت طاری کر رکھا تھا۔ فلم سونے کی چڑیا (طلعت محمود۔ نوتن) پنجڑے کے پنچھی (مینا کماری، بلراج ساہنی) کنارے کنارے (دیو آنند۔ مینا کماری) شرابی (دیو آنند۔ مدھو بالا) ہم پنچھی ایک ڈال کے، برماروڈ اور اس جیسی کئی فلموں میں رادھا کشن کے رول نے انھیں ایک مشہور کامیڈین کے ساتھ ساتھ مکاّر قسم کے آدمی کے رول نے انہیں بیحد مشہور کرایا تھا۔ دلیپ کمار، دیو آنند، راجندر کمار، بلراج ساہنی کے ساتھ انہیں بالمقابل ڈائیلاگ بولنے کے موقع پر دستیاب ہوئے اور انہوں نے اپنی اداکاری کے ذریعہ سبھوں کا دل لبھایا۔

گوپ:۔ بلیک اینڈ وائٹ فلموں کے شہنشاہ کامیڈین گوپ کے بارے میں آج کی نئی نسل شاید بہت کم جانتی ہے یا شاید اُسے اس بارے میں کوئی معلومات نہیں ہے لیکن ایک وہ زمانہ تھا جب گوپ صحیح معنوں میں ہندی فلموں کی اہم ضرورت سمجھے جاتے تھے۔ بھاری بدن ہاتھ پاؤں کے گوپ کافی قوی الجثہ تھے اور اگر وہ آج کے دور میں ہوتے تو شاید ان سے بہتر ویلین کوئی نہیں ہوتا۔ گوپ نے سب سے پہلے ۱۹۴۸ء میں سہراب مودی کی فلم کندن میں ایک چھوٹا سا رول کیا تھا لیکن ان کے ڈائیلاگ بولنے کے انداز نے سبھوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ پھر اسی دوران سلطان احمد جو اس زمانے میں کے آصف کے اسسٹنٹ تھے اور بعد میں محبوب خان کے اسسٹنٹ کرنے لگے انہوں نے محبوب خان سے فلم روٹی کے لئے گوپ کی سفارش کی اور لوگوں کو یاد ہوگا کہ ریسٹوران کے باہر جو فقیر نظر آتا تھا وہ گوپ ہی تھے۔ محبوب خان نے گوپ کو فلم انداز میں بھی ایک مختصر رول دیا تھا اسی زمانے میں ۱۹۴۹ء کی ریلیز فلم چوری چوری میں گوپ نے نرگس کے باپ کا رول کیا جسے بیحد سراہا گیا۔ فلم انداز اور آوارہ میں بھی گوپ کو مختصر رول ملا۔ گوپ نے ماسٹر نثار کے ساتھ ساتھ پرتھوی راج کپور اور سہراب مودی، دلیپ کمار اور راج کپور کے ساتھ کئی فلموں میں کام کیا۔ گوپ یوں تو دیکھنے میں بیحد سنجیدہ لگتے تھے لیکن مزاحیہ اداکاری کرتے وقت ان کے چہرے کا زاویہ پل پل بدلتا رہتا تھا۔

گوپ نے ۱۹۵۳ء میں بی آر چوپڑہ کی فلم سادھنا میں کام کیا تھا لیکن کسی بات پر نا اتفاقی ہونے پر

انہوں نے وہ رول چھوڑ دی جو بعد میں وہ رول رادھا کشن نے نبھایا اس زمانے میں گوپ کو ہر دن کے کام کا معاوضہ ۳۰ روپئے ملا کرتا تھا جو آج کے زمانے کے اعتبار سے ۱۰ ہزار روپئے کے برابر ہے۔ گوپ فلموں میں کام کرنے سے قبل چوپاٹی پر چھولے بٹورے فروخت کرتے تھے اور کے ایل سہگل کے گیت بہت ہی خوبصورت انداز میں گاتے تھے۔ فلم انورادھا، چھیل چھبیلی، ہاف ٹکٹ اور کلرک بابو جیسی اچھی فلموں میں کام کئے۔ محبوب خان اور کے آصف کے ساتھ بہتر تعلقات ہونے کی وجہ سے کیدار شرما، چیتن آنند اور وجے بھٹ نے انہیں کئی فلموں میں پیش کیا۔ چنگیز خان میں شیخ مختار، پریم ناتھ اور بینا رائے کے ساتھ اہم کامیڈین کے طور پر کام کیا۔ گوپ کئی فلموں میں جن کے رول میں بھی نظر آئے۔ الہٰ دین۔ حاتم طائی جیسی فلموں میں انہیں چراغ کے جن کے رول میں بیحد پسند کیا گیا تھا۔

یعقوب:- مزاحیہ اداکار یعقوب صحیح معنوں میں ایک بہت ہی اعلیٰ پائے کے اداکار تھے اگر چہ انہیں بہت زیادہ فلموں میں کام کرنے کا موقع نہیں ملا پھر بھی انہوں نے چند یادگار فلمیں کیں۔ فلم طلاق میں انہوں نے راجندر کمار اور کامنی کوشل کے ساتھ کام کیا، اس فلم میں وہ راجندر کمار کے کالج کے دوست کے رول میں نظر آئے تھے۔ فلم انسپکٹر میں شیکھر اور شیاما کے ساتھ انہوں نے بہترین کامیڈی رول کئے۔ یعقوب کو فلمی دنیا سے متعارف کرانے میں ہدایتکار و فلمساز ایسی یونس کا بڑا ہاتھ ہے۔ جس زمانے میں ایس یوسنّی دلیپ کمار اور نمّی کو لے کر اڑن کھٹولہ بنا رہے تھے اسی زمانے میں یعقوب کیمرہ مین صاحب سنگھ کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتے تھے لیکن سنّی صاحب نے محسوس کیا کہ اگر یعقوب کو کوئی رول دیا جائے تو وہ بخوبی ادا کر سکیں گے۔ انہوں نے اس سلسلے میں دلیپ کمار سے بات کی، لیکن دلیپ کمار نے سنّی کی اگلی فلم دیدار کے لئے مقری کو لینے کی سفارش کی جس پر یعقوب نے ان سے کہا کہ استاد اس غریب کا بھی خیال کرو اور دلیپ کمار نے فوراً اس غریب کو فلم دیدار میں کامیڈی رول کے لئے ہاں کر دی اور لوگوں کو یاد ہوگا کہ فلم دیدار کے ایک سین میں جب وہ بھوک سے بیتاب ہو کر اپنے پڑوسی کا مرغ چراتے ہیں اور اُسے اپنی کوٹ کے اندر چھپا کر لے جانا چاہتے تھے مگر کوٹ کے اندر سے مرغ کے بانگ دینے کی وجہ سے پکڑے جاتے ہیں اس وقت ان کے چہرے کی بیچارگی اور مسکینی قابلِ دید نظر آتی ہے۔ اس فلم میں اگر چہ یعقوب کا رول بڑا نہیں تھا پھر بھی اس کی اداکاری بیشتر موقوں پر دلیپ کمار پر بھی

حاوی نظر آئی۔ یعقوب نے اس کے علاوہ غریب کی بیٹی، لاکھن، مزدور زندہ باد، چار دل چار راہیں، گیارہ ہزار لڑکیاں جیسی یادگار فلمیں کیں۔ ان کی اداکاری خاص طور پر ان کی آنکھوں سے ہوتی تھی اور ان سے آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی تاب اچھے اچھے اداکاروں کے اندر نہیں تھی۔

جگدیپ:- جگدیپ کو موجودہ نسل کے لوگ خاص طور پر فلم شعلے، چائنا گیٹ وغیرہ سے جانتے ہیں لیکن جگدیپ نے سب سے پہلے وجے بھٹ کی ہدایت میں بنی فلم راجہ میں مسخرہ شہزادے کا رول کیا تھا فلم کی ہیروئن وجے چودھری تھی جگدیپ نے کھلونا، لاوارث، قربانی، وارث جینے کی راہ، فرض سمیت ۳۰۰ فلموں میں اداکاری کی جگدیپ فلم میں آنے سے پہلے چوپاٹی میں لوگوں کی تیل مالش کر کے زندگی گزارتے تھے انہیں مزاحیہ اداکار محمود نے وجے بھٹ سے متعارف کرایا اور انہیں فلم میں کام کرنے میں مدد دی تھی۔ جگدیپ اپنے محسن محمود کو کبھی نہیں بھولے اور انہوں نے کئی جگہ اس کا اعتراف بھی کیا کہ کامیڈی کنگ محمود کی فلمیں دیکھ دیکھ کر بنا ہوں نے مزاحیہ اداکاری سیکھی۔ فلم من مندر، انوکھا بندھن، سانجھ اور سویرا، پتی پتنی، دیکھ بکھیرا رویا، اور نشوش میں بھی جگدیپ کو اہم رول ملے فلم جینے کی راہ میں اس کی اداکاری عروج پر تھی۔ فلم ہمجولی میں پہلی مرتبہ جگدیپ کو محمود کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ جنہوں نے اس فلم میں ٹرپیل رول ادا کئے تھے۔ فلم شعلے میں سورما پالی کے رول میں جگدیپ نے چار چاند لگا دیئے تھے۔

یادوں کے جھروکوں کے اس سلسلے میں اس مرتبہ ہندی فلموں کے چند ایسے کامیڈین کو شامل کیا گیا ہے جنہوں نے برسہا برس تک اپنی مزاحیہ اداکاروں کے ذریعہ لوگوں کو ہنسا ہنسا کو لوٹ پوٹ کر دیا، ان کی حیثیت اس جوکر کی تھی جو اندر سے روتے لیکن چہرے پر مسکراہٹ لئے زندگی بھر دوسروں کو ہنساتے رہے، اپنی زندگی میں انگنت المیہ سہے لیکن اف تک نہ کی اور چہرے پر مصنوعی غازہ لگا کر دل کی گہرائیوں کے ساتھ دنیا کو ہنسایا اور انہیں پردہ سیمیں پر دیکھ دیکھ کر لوگ اس قدر ہنسے کہ ہنسنے میں ان کی آنکھوں میں پانی آ گیا، بقول شاعر ''ہنستے ہنستے میرے رونے پہ تعجب نہ کرو= ہے وہی چیز مگر دوسرے انداز میں ہے۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ پہلے کی فلموں میں کامیڈین کا ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا اور اگر کسی فلم میں ہیرو، ہیروئن اور ویلین کے ساتھ کوئی کامیڈین نہ ہو تو پھر اس فلم میں تشنگی کا احساس ہوتا تھا، مگر بعد کی فلموں میں ہیرو نے خود کامیڈین بنا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ تمام اوریجنل کامیڈین آہستہ آہستہ بیکار ہوتے چلے گئے بلکہ

یوں کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ان ہیروز نے اوریجنل کامیڈینوں کے پیٹ میں لات ماری اور پھر وہ یکے بعد دیگرے بیکار ہوتے چلے گئے جن میں محمود جانی واکر، مقری، آغا، جگدیپ اور بعد میں جانی لیور کے نام قابلِ ذکر ہیں اور جن ہیروز نے ان کامیڈینوں کے پیٹ میں لات ماری، ان میں سب سے اہم اوّل نام دلیپ کمار کا ہے جو بعد میں امیتابھ بچن، گووندہ، ششی کپور اور حتیٰ کہ دھرمیندر تک اس زمرے میں شامل نظر آئے۔ دلیپ کمار کی فلم آزاد، گوپی، کوہِ نور، لیڈر اور رام شیام کو دیکھا جائے تو احساس ہوگا کہ دلیپ کمار سے بہتر کامیڈین فلم انڈسٹری میں کوئی دوسرا نہیں، اسی طرح سے امیتابھ بچن کو ایک اور ایک گیارہ، نمک حلال، امر اکبر انتھونی اور چپکے چپکے میں بہترین کامیڈین کے رول میں دیکھا جاسکتا ہے۔ دھرمیندر کو چپکے چپکے، شعلے اور گووندہ کو پارٹنر، بیوی نمبر ون، چھیلا بابو، شعلہ شبنم وغیرہ میں بہترین کامیڈی کرتے دیکھا گیا۔ اگرچہ ان کامیڈین ہیروز کی وجہ سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا تو وہ بھگوان دادا اور کیشٹو مکھرجی رہے، جنکی لاجواب اور منفرد کامیڈی ہمیشہ ہی دوسروں پر حاوی رہی۔ بعد میں اتپل دت نے بھی گول مال اور نرم گرم جیسی فلموں میں اپنی بہترین کامیڈی کے ذریعہ لوگوں کو ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ کردیا تھا۔ سنجیو کمار نے بھی ہم تم اور وہ، سیتا اور گیتا میں زبردست کامیڈی کرکے لوگوں کا دل جیت لیا تھا۔ اس تمہید کے بعد ان کامیڈینوں کا ذکر ہوجائے جن کے ذکر سے اس مضمون کو لکھنے کا قصد کیا گیا ہے تو آیئے سب سے پہلے اس کامیڈین کا ذکر ہوجائے جس نے اپنی زندگی اور فلمی کیریئر میں زیادہ تر بلیک اینڈ وائٹ فلموں میں کام کیا۔

<u>آغا</u>:- کامیڈین آغا نے ۱۹۵۰ء سے ہندی فلموں میں کام کرنا شروع کیا، انہیں فلمی دنیا سے متعارف کرانے میں اداکار رکمار اور ماسٹر نثار کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ماسٹر نثار کی سفارش پر ہی آغا کو جیمنی کی فلم ''انسانیت'' میں ایک بہت ہی اہم کامیڈین کا رول ملا۔ اس فلم میں دلیپ کمار، دیو آنند بینا رائے، جینت اور جے راج تھے، اس فلم میں آغا ایک مداری کی حیثیت سے نمودار ہوئے اور ان کے ساتھ ان کا شپانجی بندر نے بھی بہت ہی اہم رول ادا کیا اور بندر کی اداکاری دیکھ کر بالکل ایسا لگا جیسے کسی چھوٹے قد کے انسان کو بندر کی کھال پہنا کر اداکاری کرنے کو کہا گیا ہے۔ فلم انسانیت میں آغا کو کئی جگہوں پر دلیپ اور دیو آنند کے ساتھ مکالمہ ادا کرنے کا موقع ملا اور آغا نے بہت ہی بہادری اور پختگی کے ساتھ ان دونوں بڑے اداکاروں کے ساتھ اپنے مکالمے ادا کئے اور کہیں بھی نہیں جھجھکے۔ آغا کو ۱۹۵۸ء کی ریلیز فلم ''گھونگھٹ'' میں بہترین کامیڈی کے لئے فلم فیئر ایوارڈ سے

بھی نوازا گیا جس میں پردیپ کمار، بھارت بھوشن، بینا رائے اور آشا پاریکھ تھے، آغا نے فرض، بلیدان، آمنے سامنے، باغی، بھابھی، سپاہی، چور پولیس، بے گناہ، وارث اور کئی اہم فلموں میں اداکاری کی۔ دلیپ کمار، دیو آنند کے علاوہ راج کمار، دھرمیندر، پرتھوی، راج کپور، راجندر کمار، منوج کمار کے ساتھ کام کیا اور اپنی ہر فلم میں بہترین اداکاری کی بہترین چھاپ چھوڑی، فلم گھرانہ میں راجندر کمار، آشا پاریکھ اور راج کمار کے ساتھ بہترین اداکاری کی اور ایک سین میں راج کمار جب اپنے چھوٹے بھائی راجندر کمار پر خواہ مخواہ ہاتھ اٹھاتا ہے تو اس کا بہنوئی آغا یہ منظر دیکھ کر غصّے سے راج کمار کو زوردار تھپڑ رسید کرتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ اپنی طاقت اور دولت پر گھمنڈ کرنے والے کو میں اسی طرح سے مارتا ہوں اس سین میں آغا کے ڈائیلاگ بولنے کا انداز اس قدر خوبصورت ہوتا ہے کہ شیدائی اپنی سیٹ سے اٹھ کر تالیاں بجانے لگتے ہیں۔ آغا نے اپنی فلمی کیریر میں بہت زیادہ فلمیں نہیں کیں لیکن ان کی اداکاری کا لوہا سبھی مانتے تھے۔

<u>مقری</u>:- چار فٹ قد والے مقری جن کے چہرے پر کوئی بھی کشش نہیں تھی، انہوں نے نہ صرف بلیک اینڈ وائٹ فلموں میں بہترین اداکاری کی بلکہ نئے اسٹاروں کے ساتھ بھی بہترین اداکاری کی حالیہ فلمیں امر اکبر انتھونی، شرابی قابل ذکر ہیں جس میں انہوں نے امیتابھ بچن کے ساتھ کام کیا، شرابی میں اپنی مخصوص بڑی مونچھیں اور امر اکبر انتھونی میں طیب علی پیار کا دشمن کے رول میں انہیں بیحد پسند کیا گیا۔ دلیپ کمار کے ساتھ فلم آن، کوہ نور، رام اور شیام سنگھرش، یہودی جیسی فلمیں کیں، فلم آن کے ایک سین میں جب وہ دلیپ کمار کو ایک گھونسہ مار کر کنویں کے اندر پھینک دیتا ہے تو وہ سین بیحد دلچسپ ہوتا ہے۔ کوہ نور میں بھی اُس نے کم کم، مینا کماری اور دلیپ کمار کے ساتھ کئی بہترین سین کئے اور خاص طور پر فلم کے ویلین جیون کے ساتھ اس کے کئی سین یادگار ثابت ہوئے۔ دلیپ کمار اپنی فلموں میں کامیڈین کے طور پر یا تو جانی واکر کو لیتے تھے یا پھر مقری کو۔ لیکن جانی واکر کی طرح مقری بھی بالکل مساوی رول میں نظر آتے تھے۔ مقری نے شیخ مختار کے ساتھ گنہگار، نور جہاں، بڑا بھائی، ہم سب استاد ہیں، استادوں کے استاد، برمارو، دو بھائی، بڑا بھائی سمیت ۱۵ فلموں میں شیخ مختار کے ساتھ کام کیا اور ہر فلم میں مقری کی اپنی ایک الگ حیثیت ہوا کرتی تھی، مقری، دلیپ کمار کی طرح پٹھان تھے، فلم مدر انڈیا میں انہوں نے نرگس، سنیل دت، اور راجندر کمار کے ساتھ بھی بہترین مزاحیہ اداکاری کی تھی۔ محبوب خان نے اُسے سن آف انڈیا اور روٹی میں بھی اہم رول دیئے تھے۔ مقری کو خاص طور پر مینا کماری، وحیدہ

رحمٰن، کم کم، شیاما اور نرگس بیحد پسند کرتی تھیں، کیونکہ فلمی دنیا کی چمک دمک میں رہنے کے باوجود یہ شخص انتہائی سادہ دل اور مخیّر انسان تھا۔

<u>کیشٹو مکھر جی</u>:- کیشٹو مکھر جی کا نام یاد آتے ہی ذہن پر ایک ایسے بلانوش شرابی کا سراپا نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے جو اٹک اٹک کر جملے کو توڑ توڑ کر اور بدن کے مخصوص حصّوں کو لچکا لچکا کر باتیں کرتا ہے کیشٹو مکھر جی کی اداکاری اس قدر نیچرل شرابی کی ہوتی تھی کہ آج تک کوئی بھی اداکار اس کے سامنے ٹک نہیں سکا۔ چاہے وہ فلم گول مال ہو یا بمبئی ٹو گوا، سنگدل، بے رحم، پڑوسن کیشٹو مکھر جی نے اپنی بے مثال اداکاری کے ذریعہ برسوں لوگوں کا دل بہلایا اور منفرد انداز میں کامیڈی کی۔ اُسے فلمساز ہر فلم میں بلانوش شرابی کا رول دیا کرتے تھے کیونکہ اس کی فلم میں مختصر موجودگی بھی فلموں میں جان ڈال دیتی تھی، ہدایتکار رشی کیش مکھر جی اُسے اپنی ہر فلم میں ضرور لیتے تھے۔ فلم پڑوسن، بمبئی ٹو گوا، اور گول مال کی اداکاری کو لوگ برسوں بھول نہیں پائیں گے۔ گول مال کے آخری سین میں صدی کا بہترین کامیڈین اتپل دت بھی پولیس اسٹیشن کے سین میں کیشٹو مکھر جی کی اداکاری کے آگے جز بز نظر آتے تھے۔ صحیح معنوں میں لوگ کسی بھی کامیڈین کو بھول سکتے ہیں مگر کیشٹو مکھر جی کو بھلانا ناممکن ہے۔

<u>سندر</u>:- ہندی فلموں میں ایک مشہور و معروف کامیڈین سندر بھی گزرے ہیں جنہوں نے کم و بیش ۳۰۰ سے زائد فلموں میں کامیڈی رول کئے اور اپنی منفرد اداکاری اور ڈائیلاگ بولنے کے انداز کے ذریعہ اپنی اہمیت منوالی تھی۔ سندر نے دلیپ کمار، راج کمار، راج کپور، دیو آنند، سنیل دت، دھرمندر، منوج کمار، جیسے بڑے اداکاروں کے ساتھ کام کیا اور ان کی اداکاری میں کسی قسم کا جھول نہیں تھا۔ اگر چہ سندر کے دور میں اوم پرکاش محمود، جانی واکر، موہن چوٹی، بیربل، کیشٹو مکھر جی، بھگوان، دھومل اور کشور کمار ٹاپ کے کامیڈین تھے لیکن اس کے باوجود سندر کی اپنی ایک منفرد حیثیت رہی اور انہیں فلم بین ایک مستند کامیڈین تسلیم کرتے تھے فلم ممبئی ٹو گوا میں پوری فلم ایک بس کے اندر کے سین میں رہی۔ اس فلم میں سندر اپنی بیوی کمو اور ایک موٹے تازے بے تحاشہ پکوڑا کھانے والے بچے کے باپ کے رول میں نظر آئے اور اس قدر کامیاب کامیڈی شاید ہی کسی فلم میں نظر آئی ہو۔ سندر اور محمود بے شمار فلموں میں بشمول ،ضدی، پیار کئے جا، آنکھیں، پڑوسن، سسرال ،ہمراہی میں نظر آئے۔ اس کے علاوہ دلیپ کمار کے ساتھ فلم ''سنگھرش'' میں انہوں نے کام کیا۔ اس فلم میں وہ دلیپ کمار کے ماما بنے تھے۔ فلم گوپی، بیراگ، دل دیا درد لیا اور یہودی میں بھی انہوں نے دلیپ کمار کے ساتھ کام کیا۔

فلم پھول اور پتھر میں وہ گاؤں کے وید بنے تھے اور ٹن ٹن ان کی بیوی تھی۔ وہ اس گاؤں میں وید بن کر پہنچے جس گاؤں میں پلیگ پھیل گیا تھا اور ہر کوئی گاؤں چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔ ایک ظالم خسر جیون، دیور منموہن اور للیتا پوار اپنی بیمار پلیگ سے متاثرہ بہو مینا کماری کو مرنے کے لئے گاؤں میں چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں اور جانے سے پہلے تمام زیورات گڈھا کھود کر زمین پر دفن کر دیتے ہیں اور وہ تمام زیورات وید سندر اٹھا کر لے جاتا ہے اور فلم کے آخری سین میں عدالت میں وہ تمام زیور پیش کر کے بے قصور دھرمیندر ''شاکا'' کو بچالیتا ہے۔ اس فلم میں سندر اور ٹن ٹن کے کامیڈی سین ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیتے ہیں سندر نے تقریباً سبھی بڑے اداکاروں خصوصاً دیو آنند کے ساتھ کئی فلمیں کیں۔ فلم ''بات ایک رات کی'' میں دیو آنند جب ٹرین کے ڈبے میں گھر سے بھاگی ہوئی وحیدہ رحمٰن کو ایک اوباش نوجوان جگدیو بھامبری کے چنگل سے بچانا چاہتے ہیں تو ایک گیت ''یہ اپنا دل تو ہے آوارہ نہ جانے کس پہ آئے گا''۔ گاتے ہیں اور اس سین میں سندر جس انداز میں لہرا لہرا کر ماؤتھ آرگن بجاتے ہیں۔ وہ سین یقیناً قابل دید تھا۔

فلمساز و ہدایتکار (راجندر کمار کے چھوٹے بھائی) کی فلم گنوار میں وہ گاؤں کے پنساری کے رول میں نظر آتے ہیں اور دکان کا ملازم گلشن باورا جو فلم کے نغمہ نگار بھی تھے اس کے ساتھ کئی مزاحیہ سین میں سندر خوب ہنساتے ہیں۔ گلشن باورا جو کہ فلم زنجیر، ایک کنوارا، ایک کنواری، وکٹوریہ ۲۰۳ ہاتھ کی صفائی جیسی مشہور فلموں کے نغمہ نگار تھے ان کا انتقال ۲۰۰۹ء میں ہو گیا۔ سندر نے راجندر کمار کے ساتھ فلم آس کا پنچھی، دل ایک مندر، گہرا داغ اور طلاق میں کام کیا۔ طلاق میں وہ فلم کی ہیروئن کامنی کدم کے ماما کے رول میں تھے۔

<u>مرزا مشرف</u>:- مرزا اشرف نے انگنت فلموں میں اداکاری کی اور خاص طور پر مسلم سوشل فلموں میں مرزا مشرف کی موجودگی ضروری ہوتی تھی جن کا لہجہ خالص لکھنوی انداز کا ہوتا تھا۔ اور ڈائیلاگ میں وہ ''ارے منّا'' کہہ کر ضرور پکارتے تھے۔ فلم نقلی نواب (منوج کمار، شکیلہ، کے این سنگھ) یہ زندگی کتنی حسین ہے (جوئے مکھر جی، سائرہ بانو، موتی لعل) یہ راستے ہیں پیار کے (سنیل دت، لیلا نائیڈو، رحمٰن) پالکی (راجندر، وحیدہ) جواں محبت (دیو آنند، آشا پاریکھ) اور اس جیسی انگنت فلموں میں مرزا مشرف نے کام کئے ۱۹۶۸ء میں وہ کلکتہ بھی آئے تھے جب ان کی اہلیہ جن کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا وہ گھر سے لاپتہ ہو گئی تھی اور انہیں پتہ چلا کہ وہ کولکاتا میں ہے۔ کولکاتا آکر وہ اردو اخبارات کے مدیروں سے ملے اور اپنی اہلیہ کی تصویر تلاش گمشدہ کے طور پر چھپوائی تھی۔ وہ تین دنوں تک کولکاتا کے ۳ نواب سرج الاسلام

لین، کولکاتا۔ ١٦ میں ٹھہرے تھے۔ لیکن ان کی بیوی نہیں ملی آخر میں وہ مایوس ہوکر واپس ممبئی چلے گئے اور ١٩٧٩ء میں ان کا انتقال بھی ہوگیا۔ مرزا مشرف نے اگرچہ مزاحیہ طور پر اداکاری میں اپنا ایک خاص مقام رکھا تھا اور مکالمہ نگار ان کے لئے خاص طور پر خالص اردو ڈائیلاگ لکھتے تھے۔ کیونکہ اردو ڈائیلاگ کی ادائیگی میں ان کا مقابلہ کسی سے بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

فلموں میں کامیڈین ایک اہم رول ادا کیا کرتے تھے اور کامیڈینوں کو اس وقت تک اہم رول ملتا رہا جب تک امیتابھ بچن نے ان کے پیٹ میں لات نہیں ماری، امیتابھ نے لاوارث، شرابی، ایک اور ایک گیارہ، نمک حلال، شعلے، شان، رام بلرام، چپکے چپکے اور انگنت فلموں میں بیک وقت ہیرو اور کامیڈین کا رول نبھایا جس کی وجہ سے آہستہ آہستہ جانی واکر، محمود جیسے بڑے کامیڈین سائیڈ لائن ہوتے چلے گئے پھر دھومل، راجندر ناتھ، مقری، موہن چوٹی، جگدیپ، غائب ہوتے گئے، امیتابھ صرف آئی ایس جوہر، کیشٹو مکھرجی اور بھگوان کے مقابلے میں ٹھہر نہ سکے بلکہ کئی فلموں میں امیتابھ نے خود محمود کی اداکاری کی کاپی کی اور رقص کرنے کا مکمل انداز بھگوان سے لیا اور جہاں تک کیشٹو مکھرجی کی بات ہے تو ان کے سامنے کسی کے ٹھہرنے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ بہرکیف پرانی فلموں میں کامیڈین ایک اہم حیثیت کے حامل ہوتے تھے اور لوگ کسی فلم کو دیکھنے سے پہلے فلم میں کامیڈین اور ویلین کے بارے میں معلوم کرتے تھے اور جس فلم میں کامیڈین اور ویلین نہ ہو وہ فلم معیاری تو ہوتی تھی مگر باکس آفس میں نرم پڑ گئیں۔ آیئے مندرجہ ذیل میں چند سدابہار کامیڈینوں کی باتیں کریں۔

راجندر ناتھ: راجندر ناتھ تجربہ کار اور کہنہ مشق اداکار پریم ناتھ کے بھائی اور نریندر ناتھ کے چچا زاد بھائی تھے، پریم ناتھ اور نریندر ناتھ نے زیادہ تر فلموں میں ویلین کے کردار ادا کئے لیکن راجندر ناتھ نے اپنی پہلی فلم ہمراہی (راجندر کمار، جمنا، محمود) میں ایک خطرناک قاتل عاشق کا رول ادا کیا تھا جو اپنی بے وفا محبوبہ ششی کلا کا مرڈر کردیتا ہے اور اس قتل کا الزام راجندر کمار کے سر جاتا ہے کوئی بھی راجندر ناتھ پر شک نہیں کرتا کیونکہ وہ ایک انتہائی بھولا بھالا اور شرمیلے قسم کا نوجوان کالج بوائے تھا، لیکن جب اس کی قلعی کھلتی ہے اور وہ پکڑا جاتا ہے تو وہ جس انداز میں اپنی بے وفا محبوبہ کو قتل کرنے کی داستان سناتا ہے اس موقع پر ایسا نہیں لگتا کہ اس نے زندگی میں کبھی بھی مزاحیہ اداکاری کی ہوگی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ راجندر ناتھ ایک کلاسیک کامیڈین تھے اور انہوں نے ناصر حسین کی چند فلموں میں

ایسی کامیڈی کی کہ لوگ آج تک ان مناظر کو یاد کرکے بے ساختہ ہنس پڑتے ہیں۔

ناصر حسین کی یادگار فلم ''جب پیار کسی سے ہوتا ہے'' میں راجندر ناتھ نے دیوآنند آشا پاریکھ اور پران کے ساتھ اہم رول ادا کیا تھا۔ عام طور پر ناصر حسین اپنی فلموں میں راجندر ناتھ کا نام پوپٹ لال رکھتے تھے اور اس زمانے میں لوگ راجندر ناتھ کے نام سے کم بلکہ اسی پوپٹ لال کے نام سے پہچانتے تھے جب پیار کسی سے ہوتا ہے کہ علاوہ ناصر حسین کی گولڈن جبلی ہٹ فلم ''پھر وہی دل لایا ہوں'' میں بھی اس نے جوئے مکھرجی، آشا پاریکھ اور پران کے ساتھ کام کیا تھا اور اس فلم کی پوری کہانی وہی تھی جو جب پیار کسی سے ہوتا ہے کی تھی۔ اور دونوں فلموں میں راجندر ناتھ کا رول تقریباً ایک جیسا تھا۔ راجندر ناتھ نے راجیش کھنہ اور نندہ، ہیلن کے ساتھ فلم ''دی ٹرین'' میں بھی زبردست کامیڈی کی تھی کیونکہ ٹرین میں قتل کی چشم دید گواہ وہی تھا اور اپنے مخصوص کامیڈی انداز میں وہ جس طرح سے قاتل کا سراغ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے وہ سب ہی خوب تھا۔ فلم راجکمار میں شمی کپور اور سادھنا کے ساتھ بھی اس نے زبردست کامیڈی رول کئے تھے اور اتفاق سے اس فلم کے ویلین بھی پران ہی تھے اس فلم میں جب وہ بھیس بدل کر اوم پرکاش کی زبان سے اصل قاتل کا نام پوچھنے جاتا ہے وہ سین یادگار تھا۔ فلم جانور (شمی کپور۔ راجشری) آمنے سامنے (ششی کپور۔ شرمیلا ٹیگور) راز (راجیش کھنّہ، ببیتا) نیلا آکاش (دھرمیندر، مالا سنہا) سہاگ رات (جتندر۔ راجشری) وہ رات پھر نہ آئے گی (بسواجیت۔ شرمیلا ٹیگور) اور ١٩٧٠ء سے ١٩٨٠ء کی دہائی میں راجندر ناتھ نے کم و بیش ١٠٠ سے زیادہ فلموں میں اداکاری کی اور یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ اس کی زیادہ تر فلمیں بیحد کامیاب رہیں اور سب سے بڑھ کر اس کے انوکھے انداز کی کامیڈی نے راجندر ناتھ کو سپر اسٹار کامیڈین کی حیثیت دے دی تھی۔ راجندر ناتھ نے دھرمیندر اور راکھی کے ساتھ فلم جیون مرتیوں میں بھی ایک اہم کردار نبھایا تھا اور وہ ایک پنجابی نوجوان کے رول میں بیحد پسند کئے گئے تھے۔

دھومل: کامیڈین اداکار دھومل کو ١٩٦٠ء سے ہندی فلموں میں دیکھا گیا اور ١٩٦٠ء سے ١٩٨٠ء کے دوران دھومل نے کم و بیش ١٠٠ فلموں میں کامیڈی رول کئے، آسرا جیون دیپ، شکست، من کی پیاس، ہم پنچھی ایک ڈال کے، حاتم طائی، باغی سپاہی، من پیاسا ہے، جادوئی چراغ، سندباد جہازی اور اس طرح کی انگنت فلموں میں دھومل نے چھوٹے چھوٹے کامیڈی رولز کئے، لیکن ١٩٧٠ء کی دہائی میں جب کامیڈین محمود کو عروج حاصل ہوا تو بیشتر فلموں میں محمود کی محبوبہ کا رول شوبھا کھوٹے نے ادا کیا۔

شوبھا کھوٹے کے باپ کے رول میں دھومل نظر آئے۔ دھومل نے پرمود چکرورتی کی فلم ''ضدّی (جوئے مکھرجی، آشا پاریکھ) لوان ٹوکیو (جوئے مکھرجی، آشا پاریکھ) سہاگ رات (راجندر۔راجشری) میں شوبھا کھوٹے کے باپ کا رول ادا کیا۔ رامانند ساگر کی فلم آنکھیں میں محمود، مالا سنہا کے ساتھ دھومل نے بیروت کی سڑکوں پر لاپتہ دھرمیندر کو ڈھونڈ نکالنے کے لئے ایک مزیدار گیت ''تجھ کو رکھے رام تجھ کو اللہ رکھے۔ دے داتا کے نام تجھ کو اللہ رکھے'' گایا تھا اور یہ گیت پوری فلم کی جان ثابت ہوا تھا۔

راجندر ناتھ نے این سی سپّی کی فلم ''گمنام'' میں منوج کمار، نندہ، ہیلن، پران، منموہن کے ساتھ کام کیا تھا، اس فلم میں ترون بوس ایک ویران جزیرے میں سات افراد کو بھیانک انداز میں قتل کرتے ہیں جس میں ایک قتل دھومل کا بھی ہوتا ہے اور جس بھیانک انداز میں اس کی لاش دستیاب ہوتی ہے، وہ سین دیکھنے کے قابل تھا۔ دھومل نے زیادہ تر فلموں میں محمود کے ساتھ کام کیا اور محمود کے ساتھ ان کی کامیڈی جوڑی بیحد کامیاب سمجھی جاتی تھی، دھومل نے ڈھونڈی کی فلم فرض میں بھی جتندر اور ببیتا کے ساتھ اہم رول ادا کیا تھا۔ فلم دیوار میں دھرمیندر، دیون ورما اور شرمیلا ٹیگور کے ساتھ کام کیا جو بنگلہ فلم ''نا'' کی ہندی میں ڈب فلم تھی۔ دھومل نے فلم جال میں بسواجیت، مالا سنہا، بکھرے موتی (جتندر۔ببیتا) دس لاکھ (سنجے، ببیتا) ایک پھول دو مالی (سنجے، سادھنا، بلراج ساہنی) اور اس کے علاوہ انگنت مشہور اور کامیاب فلموں میں اداکاری کی۔

<u>اسرانی</u>: اسرانی ۱۹۷۰ء کی پیداوار ایک محنتی اور کامیڈین اداکار ہیں جو اپنے عروج پر پہنچنے کے بعد ہیرو بننا چاہتے تھے لیکن ان کو کسی فلمساز نے ہیرو کے طور پر قبول نہیں کیا لہٰذا انہوں نے خود اپنی فلمسازی اور ہدایتکاری میں فلم ''چلا مراری ہیرو بننے'' بنائی جو پہلے ہی ہفتے میں دم توڑ گئی اور ساتھ ہی اسرانی نے بھی ہیرو بننے کا خواب دیکھنا چھوڑ دیا۔ دراصل ہیرو بننے کی بیماری انہیں ان کے اولین فلم ''گڈی'' میں لگی تھی جس میں سمیت بھانجہ، اتپل دت اور جیا بہادری تھی اس فلم میں اسرانی گاؤں چھوڑ کر ممبئی چلے آتے ہیں تاکہ ہیرو بن سکیں لیکن ہیرو بننے کے بجائے کلیپ بوائے بن گئے اس فلم میں اسرانی نے بیحد سنجیدہ اداکاری کی تھی۔ لیکن رشی کیش مکھرجی نے انہیں پھر ابھیمان میں امیتابھ۔ جیا کے ساتھ موقع دیا، فلم کی کامیابی سے اسرانی کو بھی شہرت ملی، پھر شکتی سامنت کی انورودھ (راجیش، سمپل) اور پھر جی پی سپّی کی تاریخ ساز فلم ''شعلے'' میں اسرانی کو انگریزوں کے دور کا جیلر کے رول میں پیش کیا جس میں اسرانی کی اداکاری انتہائی عروج پر تھی۔ جیل کے

وارڈن کے رول میں اسرانی نے اپنی اداکاری کے فن کو عروج پر پہنچا دیا تھا۔ لیکن امیتابھ نے جب سے کامیڈی رول خود کرنا شروع کئے تو اس سے اسرانی کو زبردست نقصان پہنچا اور آہستہ آہستہ وہ فلموں سے آؤٹ ہوتے چلے گئے اور برسوں کے بعد چھوٹے چھوٹے رول میں نظر آئے جس طرح چائنا گیٹ میں انہیں گاؤں کے ایک پنڈت کے رول میں دیکھا گیا۔

اسرانی نے دھرمیندر، امیتابھ بچن، ونود کھنہ، راجیش کھنہ کے ساتھ زیادہ تر فلموں میں اداکاری کی، لیکن ان کے دور میں جبکہ جانی واکر اور محمود محاذ چھوڑ رہے تھے اس وقت اگر وہ مکمل طور پر کامیڈی رول کا انتخاب کرتے تو مزید کئی برسوں تک چل سکتے تھے۔ جانی واکر اور محمود نے بھی اگرچہ بیشتر فلموں میں ہیرو کا رول نبھایا لیکن اداکاری کے اعتبار سے ان دونوں کا کوئی جواب نہیں تھا مگر اسرانی جو اپنے آپ کو کامیڈین سے زیادہ ہیرو تصور کرنے لگے تھے اور ان کی یہی غلطی انہیں لے ڈوبی جب ان کے رول انوپم کھیر، جانی لیور وغیرہ نے بانٹ لئے اور انیل کپور نے اپنے عروج کے زمانے میں زیادہ تر انوپم کھیر کو کامیڈین کے رول میں لیا جو بیک وقت ہیرو ہیروئن کے باپ، ویلین اور مزاحیہ اداکاری کرنے کے فن میں یکتا تھے اور اگر سنجیدہ اداکاری پر اتر آئیں جیسے سازش، سمندر میں نے گاندھی کو نہیں مارا وغیرہ وغیرہ تو پھر ان کے مقابلے میں دوسرا اداکار ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ انوپم کھیر اور جانی لیور کو بھی اپنے دور کا بہترین کامیڈین تصور کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

نا قابلِ فراموش کیریکٹر ایکٹر

ثانیہ قیصر

نذیر حسین : ہندی فلموں کے معاون اداکاروں میں ایک اہم اور سب سے منفرد نام نذیر حسین کا بھی ہے نذیر حسین مرحوم نے تقریباً ۳۰۰ فلموں میں اداکاری کی اور اپنی اداکاری کا لوہا منوالیا، انہوں نے زیادہ تر فلموں میں ہیرو یا ہیروئن کے باپ کا رول ادا کیا، جب ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۵ء تک کی فلموں میں ہیرو یا ہیروئن کا باپ ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا اور باپ کا ایک اہم رول ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۵۰ء کی ریلیز بمل رائے کی فلم انورادھا میں نذیر حسین نے لیلا نائیڈو اور بلراج ساہنی کے ساتھ کام کیا۔ اس کے علاوہ رام اور شیام، آیا ساون جھوم کے، کٹی پتنگ، آئی ملن کی بیلا آنکھیں، للکار، آرزو، امر اکبر انتھونی اور اس جیسی انگنت فلمیں ہیں جن میں نذیر حسین نے ایک معاون اداکار کے رول میں جان ڈال دی تھی۔ بی ناگی ریڈی کی فلم رام اور شیام میں وہ وحیدہ رحمٰن کے باپ بنے تھے اور ایک پارٹی کے سین میں جہاں دلیپ کمار یہ گیت گاتے ہیں ''آج کی رات میرے دل کی سلامی لے لے، کل تیری بزم سے تیرا دیوانہ چلا جائیے گا، اس گانے کے بعد دلیپ کمار کو تھپڑ مارنے کا سین بیحد یادگار بن گیا تھا، اس کے علاوہ اس سین میں جب نذیر حسین پہلی مرتبہ دلیپ کمار کو گھر پر لے کر آتے ہیں اور وہ مرغ مسلم سے پورا انصاف کرتا نظر آتا ہے ایسے میں پران کی آمد پر وہ جس مضحکہ خیز انداز میں منھ بنا کر مرغ کی ٹانگ توڑتے ہیں اور نذیر حسین ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوتے ہیں وہ سین بھی بیحد یادگار نظر آتا ہے۔

راما نند ساگر کی فلم ''آرزو'' میں وہ سادھنا کے باپ کا رول کرتے ہیں اور ایک پارٹی کے سین میں جب راجندر کمار ایک بوڑھے لیکن جواں دل شاعر کا روپ دھار کر آتے ہیں اور یہ گیت ''چھلکے تیری آنکھوں سے شراب اور زیادہ، گاتے ہیں اس سین میں نذیر حسین کا ان کو داد دینا اور ہر شعر پر پھڑک کر واہ واہ کہنا بیحد اچھا لگا تھا، پھر اسی سین میں جب انہیں اچانک راجندر کمار کے نقلی ہونے کا پتہ چلتا ہے تو ان کی آنکھوں میں جو درد اور کرب کے ساتھ آنسو نظر آتے ہیں، اپنے اس سین کی وجہ سے وہ اس فلم کے زندہ جاوید کردار بن جاتے ہیں۔

فلم ''آیا ساون جھوم کے'' میں وہ دھرمیندر کے باپ بنتے ہیں اور دھرمیندر کی گاڑی سے آشا پاریکھ کے

والد شیو پرشاد کا ایکسیڈنٹ میں موت ہو جاتی ہے تو نذیر حسین اپنے بیٹے کو بچانے کے لئے آشا پاریکھ کے گھر پر روپئے لے کر آتے ہیں کہ وہ روپئے لے کر عدالت میں اپنا مقدمہ واپس لے لے۔

اس سین میں ایک رئیس باپ کے طور پر ان کی آنکھوں میں جو غرور تکبّر اور غریبوں سے نفرت کرنے کا جذبہ نظر آتا ہے اُسے دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ نذیر حسین اپنے آپ کو ہر سین میں ڈھال لینے کے فن میں یکتا تھے اور وہ کوئی بھی سین قبول کرنے سے پہلے اس رول کو اچھی طرح سے سمجھ لیتے تھے اور بے تکا قسم کا کوئی رول وہ پسند نہیں کرتے تھے۔

راما نند ساگر کی نا قابلِ فراموش فلم ''آنکھیں'' میں وہ ایک خفیہ سیکرٹ سروس کے سربراہ اور اپنے جاسوس بیٹے دھرمیندر کے باپ کے رول میں تھے اور ایک سین میں ان کے ساتھی کنہیا لال اپنے بیٹے کے غدار ہونے کا پتہ لگنے پر جب اپنے ہی پستول سے اس کا خاتمہ کر دیتے ہیں اس سین میں نذیر حسین کی جذباتی اداکاری کا کوئی جواب نہیں تھا۔

آئی ملن کی بیلا میں وہ سائرہ بانو کے باپ تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی ایک غریب کسان راجندر کمار سے شادی کرے وہ چاہتے تھے کہ شہر کا انجینئر دھرمیندر ان کا داماد بنے اور اس سین میں جبکہ وہ راجندر کو ٹھکانے لگانے کے لئے جنگل کی طرف جاتے ہیں تو ایک شیر کا نوالہ بن جاتے ہیں اس فلم میں بھی ان کی جذباتی اداکاری لاجواب رہی تھی۔

نذیر حسین نے کئی بھوجپوری فلموں میں بھی کام کیا اور ہدایتکاری بھی دی اور انہیں بھوجپوری فلموں میں بھی زبردست شہرت ملی تھی۔ گنگا میّا تو ہے پیڑھی چڑھیبو، لاگی ناہی چھوٹے رام جیسی یادگار فلمیں انہوں نے کیں۔

انوپم کھیر :- انوپم کھیر کو موجودہ دور کا بہترین کیریکٹر ایکٹر کہا جاتا ہے، انہوں نے اپنی پہلی فلم ''سازش'' میں یادگار اداکاری کی تھی، اس فلم میں وہ اپنے بیٹے کی لاش کی راکھ حاصل کرنے کے لئے پولیس اسٹیشن کا جس قدر چکر لگاتے ہیں اور کس کس طرح سے انہیں پولیس والے پریشان کرتے ہیں، اس فلم میں اس انداز سے دکھایا گیا تھا کہ پتھر سے پتھر دل والا بھی اپنے آنسوؤں کو نہیں روک سکتا۔ انوپم کھیر کی یادگار فلموں میں سمندر، لمحے، آخری راستہ، ہم پانچ، کرما، سوداگر وغیرہ لاجواب ہیں۔ انوپم کھیر نے اسٹیج اداکارہ کرن کھیر سے شادی کی تھی لیکن ۲۰۰۹ء میں ان کے ساتھ علاحدگی حاصل کر لی۔ انوپم کھیر بیک وقت مزاحیہ اداکاری، ویلین اور مشفق باپ کا رول ادا کرنے میں یکتا ہیں۔

انوپم کھیر نے فلم آخری راستہ میں امیتابھ بچن، لمحے میں انیل کپور، دل ہے کہ مانتا نہیں میں عامر خان،

سوداگر اور کرما میں دلیپ کمار، سمندر میں سنّی دیول، کے ساتھ کام کیا، ویسے تو وہ اپنی زندگی میں ایک انتہائی سنجیدہ انسان ہیں اور حالات حاضرہ پر ان کی گہری نظر ہے لیکن مختلف فلموں میں وہ مختلف رول میں نظر آتے ہیں اور جب ویلین کا کردار نبھاتے ہیں تو ان کے چہرے پر درندگی، وحشت بیک وقت نظر آتی ہے۔ چند سال قبل وہ فلم سینسر بورڈ کے اعلیٰ رکن بھی تھے لیکن سینسر بورڈ کی دوغلی پالیسی کی وجہ سے انہوں نے بہت جلد اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ انہوں نے امریش پوری، اوم پوری، اوم شیو پوری کے انداز میں بیک وقت مزاحیہ، ویلین اور دیگر کردار نبھائے، لیکن ان کی اداکاری میں ایک انفرادیت ہمیشہ ہی نظر آئی۔ دلیپ کمار کے ساتھ وہ سبھاش گھئی کی فلم کرما میں خاص ویلین کے روپ میں نظر آئے خاص طور پر جب دلیپ کمار انھیں جیل میں بند کرتے ہیں تو وہ ڈاکٹر ڈین کے رول میں دلیپ کمار کو تنبیہہ کرتے ہیں کہ ان کی زندگی کے دن اب بہت کم رہ گئے ہیں اور یہ ڈائیلاگ وہ جس انداز میں ادا کرتے ہیں وہ قابلِ تعریف ہے۔

پریش راول:۔ پریش راول کو اگر اس وقت موجودہ دور کا سپر اسٹار کامیڈین برقرار دیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کیونکہ پریش راول کی وجہ سے جانی لیور، جیسے زبردست کامیڈین کی دکان پھیکی پڑ گئی ہے اور اب انھیں بہت ہی کم فلموں میں چانس ملتا ہے جبکہ پریش راول مشترکہ طور پر کامیڈی اور سنجیدہ فلموں میں چھائے نظر آتے ہیں۔ فلم ہیرا پھیری سیریز، گول مال، ان کی حالیہ اور سپر ہٹ فلمیں ہیں اور انہوں نے ان فلموں میں اپنی اداکاری کے ذریعہ سپر اسٹار اکشے کمار اور سنیل سیٹھی کی بھی سٹّی گم کر کے رکھ دی تھی ان کی کامیڈی سے متاثر ہو کر اوم پوری بھی مکمل طور پر کامیڈی رول کرنے پر اتر آئے تھے۔

پریش راول نے حالیہ سپر ہٹ کلاسک فلم ''باغبان'' میں امیتابھ بچن اور ہیما مالنی کے ساتھ بیحد اہم رول ادا کیا تھا اور ان کی بے داغ کامیڈی بھی اس قدر شاندار رہی جو قابلِ یادگار بن گئی۔ خاص طور پر جب وہ اپنی بیوی کا سر اونچا کرنے آئے جان بوجھ کر غلط محاورے بولتے ہیں اور ان کی بیوی ان کے محاروں کی تصحیح کر کے خوش ہوتی ہے اپنی بیوی کا دل خوش کرنے کے لئے غلط محاورے بولتے تھے۔

فلم ''کرودھ'' میں سنی دیول اور سنجے دت کے ساتھ انہوں نے ایک خطرناک قسم کے غنڈے کا رول ادا کیا تھا اور اپنے رول میں وہ بیحد کامیاب ہوئے تھے۔ اداکار عامر خان کے ساتھ بھی انہوں نے ایک فلم میں بیحد خطرناک قسم کے سوامی کا رول ادا کیا تھا وہ فلم ہالی ووڈ کے گاڈ فادر سے متاثر ہو کر بنائی گئی تھی، اس فلم

میں دھرمیندر اور موسمی چٹرجی نے بھی اہم رول ادا کیا تھا۔ ویسے تو گزشتہ ۱۰ رسالوں کے اندر جو فلمیں ریلیز ہوئی ہیں ان میں وہ ہر تیسری یا چوتھی فلم میں نظر آئے ہیں اور اس کی وجہ ہے کہ وہ بیک وقت خطرناک ویلین اور کامیڈین کا رول بخوبی نبھا سکتے ہیں۔

پریش راول نے ایک تاریخی فلم سردار پٹیل میں بھی پٹیل کا کردار نبھایا تھا مگر وہ فلم کامیاب نہ ہو سکی تھی ۔انہوں نے دھرمیندر، سنجے دت، گوونده، سلمان خان، عامر خان، شاہ رخ خان سیف علی خان، اکشے کمار، سنیل سیٹھی، اکشے کھنہ کے ساتھ کام کیا اور ہر فلم میں اپنی اداکاری کی چھاپ چھوڑی اور ان میں سے بیشتر فلمیں ایسی ہیں جو محض پریش راول کی وجہ سے کامیاب ہوئیں۔

پرانی فلموں کی یادیں اگر چہ لوگوں کے بہت ہی کم دائرے میں پسند کی جاتی ہیں اور موجودہ نسل صرف شاہ رخ، سلمان خان، عامر، ایشوریہ، ریتک، بپاشا، کرینہ اور کٹرینہ کے بارے میں جاننا کرنا پسند کرتی ہے لیکن کچھ اداکار ایسے بھی ہیں جن کی تاریخ ان کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی گر چہ ان کے بارے میں لکھنا اور پرانی یادوں کو تازہ کرنا بیحد مشکل کام ہے اور اس میں نہ تو کمپیوٹر کچھ مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی ویب سائٹ، کیونکہ یہ ویب تیار کرنے والے بھی نوجوان نسل سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں صرف حال معلوم ہے، وہ نہ ماضی کے بارے میں کچھ جانتے ہیں اور نہ ہی انہیں مستقبل کی کوئی فکر ہے اور وہ سب اپنے ''حال'' میں مست ہیں۔ مثال کے طور پر پرانے کہنہ مشق اداکاروں میں سپرو، الھاس، کرن دیوان، موتی لال، جینت، درگا کھوٹے، سلوچنا، لیلا چٹنس تیواری، رنجن، کامران، ہیرا لال، کے این سنگھ وغیرہ کا نام لکھ کر کلک کیا جائے تو اس نام سے ملتے جلتے دوسرے موجودہ کسی شخصیت کی تصویر پر آ جائے گی اور تلاش کرنے والا نئی شکل وصورت والے میں الجھ کر خود بھی بھول جائے گا کہ اسے کس کی تلاش تھی کیونکہ نئی اور موجودہ شکل صاف وشفاف بلکہ کپڑوں سے بے نیاز نظر آئے گی اور ایسی ایسی خوبصورت شکلوں کو اور وہ بھی کپڑوں سے بے نیاز کون دیکھنا پسند نہ کرے گا۔

بہر کیف راقم کو اپنی یادداشت اور پرانی یادوں کو کریدنے سے دلچسپی ہے جسے اگر ایک فیصد لوگ بھی پسند کریں تو محنت وصول، ابھی پچھلے دنوں بیل گھّیا کے علاقے سے ایک محترمہ کا فون آیا تھا جس میں انہوں نے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ شاہ رخ خان کی فلم دیوداس کو بکواس اور دلیپ کمار کی دیوداس نا قابل فراموش لکھا گیا تھا اس محترمہ کا یہ خیال ہے کہ شاہ رخ کی دیوداس دلیپ کی دیوداس سے بدر جہا بہتر ہے بلکہ

یہ بھی لکھ دیا کہ دلیپ کمار ہی شاہ رخ کی نقالی کرتے ہیں۔اسی طرح سے ایک دوسری محترمہ کا یہ کہنا ہے کہ بلراج ساہنی بکواس اداکار تھے۔ان کے مقابلے میں انوپم کھیر زیادہ بہتر ہیں۔علاوہ ازیں جانی واکر ہر فلم میں ایک ہی قسم کی کامیڈی کرتے تھے اوران سے بدرجہا بہتر جانی لیور ہیں۔بہرکیف یہ اسی قسم کے کئی احمقانہ اعتراضات ہیں یا پھر اسے یوں سمجھا جائے کہ یہ اپنے اپنے دور کی بات ہے لیکن پھر بھی اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ پرانے اداکاروں کی ہمسری کرنے والا آج کے دور میں کوئی بھی نہیں۔چاہے وہ شاہ رخ ہو، سلمان ہو، ریتک ہو یا عامر خان، جہاں تک دلیپ کمار کی بات ہے تو اس کے بارے میں دھرمیندر اور جیا بچن کا تبصرہ ہی کافی ہے کہ ان کے بعد نہ کوئی دوسرا اسپر اسٹار ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

مندرجہ ذیل میں ہم دو تین نا قابل فراموش معاون اداکار کا ذکر کر رہے ہیں۔جن کے بغیر فلمی تاریخ کبھی مکمل ہو نہیں سکتی جس میں بلا شبہ نانا پالسیکر اور کشور ساہو، ہیں آیئے آج انہی دونوں کے بارے میں ذکر خیر ہو جائے۔

نانا پالسیکر:۔ نانا پالسیکر پکے مراٹھی ہیں اور ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۰ء کے دہے میں وہ سہراب مودی اور پرتھوی راج کپور کے تھیٹریکل کمپنیوں میں اسٹیج اداکاری کیا کرتے تھے۔۱۹۵۰ء میں بی آر چوپڑہ نے اپنی زبردست سسپنس فلم ''قانون'' میں انہیں ایک بیحد اہم کردار دیا۔اس فلم میں وہ ایک چور کا رول کرتے ہیں اور ایک رات کو ایک گھر کی کھلی ہوئی کھڑکی کو دیکھ کر پائپ کے ذریعہ گھر میں داخل ہو جاتے ہیں۔جہاں وہ اشوک کمار کو ایک شخص کا قتل کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور پھر قتل کے الزام میں نانا پالسیکر کو گرفتار کر لیا جاتا ہے کیونکہ خون جو فرش پر پھیلا ہوا تھا اس میں ان کے پاؤں کی چھاپ پڑ جاتی ہے۔اس فلم کے زیادہ تر سین عدالت کے ہیں جس میں جج کے رول میں اشوک کمار اور وکیل کے رول میں راجندر کمار جو جج کی بیٹی نندہ سے شادی کرنے والا ہے اور فلم کے آخری سین میں پتہ چلتا ہے کہ جو اشوک کمار قاتل ہے وہ دراصل جج کا ہم شکل ہے اور نانا پالسیکر کو رہا کر دیا جاتا ہے۔اس فلم کے ذریعہ بی آر چوپڑہ نے پھانسی کی سزا کے خلاف زبردست اپیل کی تھی۔نانا پالسیکر نے کم وبیش ۲۰۰ سے زائد فلموں میں کام کئے۔

وی شانتارام کی مشہور فلم ''بوند جو بن گئی موتی''، جس میں جتندر اور راجشری نے کام کیا تھا اس فلم میں نانا پالسیکر نے ایک سخت دل اور بے رحم ٹیچر کا رول ادا کیا تھا جس میں وہ ہر جگہ نئے ٹیچر جیتندر کے خلاف سازش کرتے رہتے تھے۔اس کے علاوہ ستین بوس کی فلم ''دوستی'' جو صدارتی مڈل ایوارڈ یافتہ فلم تھی اس فلم میں بھی نانا پالسیکر کو ایک سخت دل اور جذبات سے عاری ٹیچر کا رول ملا تھا۔

نانا پالسیکر کی ایک یادگار فلم ۱۹۸۰ء میں شیام بینگل کی ''آکروش'' تھی جس میں ایک غریب مزدور جو رات کو شراب پی کر اپنی دنیا میں گم رہتا ہے، اس جذباتی رول میں انہوں نے بیحد متاثر کیا تھا جب ایک زمیندار کے ہاتھوں اس کی بہو کی عزت لٹ جاتی ہے اور اس کے خودکشی کر لینے کے بعد اس کے قتل کے الزام میں اس کے بیٹے اوم پوری کو پولس گرفتار کر لیتی ہے۔اس فلم میں نصیرالدین شاہ نے ایک نوجوان اور انقلابی ذہن رکھنے والے وکیل کے رول میں اپنی اداکاری کی ایسی چھاپ چھوڑی تھی جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔دھرماتما جو کہ فیروز خان کی فلم تھی اس میں وہ انڈرورلڈ پریم ناتھ کا ملازم تھا جو مرتے وقت اپنے بیٹے امتیاز خان کو ذمہ داری چھوڑ جاتا ہے۔

کشور ساہو: کشور ساہو ۱۹۴۲ء سے ہندی فلموں میں کام کر رہے ہیں اور جس زمانے میں اشوک کمار اور لیلا چٹنس کی جوڑی اور موتی لال نرگس وغیرہ کی جوڑی بلیک اینڈ وائٹ میں اپنا اثر قائم کئے ہوئے تھی اسی زمانے میں کشور ساہو اور اچلا سچدیو، سلوچنا، نرگس وغیرہ کے ساتھ اپنی جوڑی بنا کر تھے، کشور ساہو اب بھی زندہ ہیں اور اس وقت ان کی عمر ۹۲ سال ہے۔فلمی دنیا سے خود کو الگ کر رکھا ہے' دیوآنند اور وحیدہ رحمٰن کی فلم ''گائیڈ'' میں انہوں نے ایک نا قابل فراموش مورخ کا رول ادا کیا تھا جو اجنتا اور ایلورا کے غاروں میں کسی نئی گھپا کی تلاش اور اس کی نئی تاریخ مرتب کرنے میں سرگرداں تھے۔اپنی نوجوان بیوی وحیدہ رحمٰن کو گھر میں چھوڑ کر ان گھپاؤں میں وہ بازاری عورتوں کے ساتھ داد عیش دیا کرتے تھے۔اس فلم میں بحیثیت ایک مورخ بیحد کامیاب رہے تھے اور خاص طور پر ان کا یہ ڈائیلاگ ''گھبراؤ مت راجو گائیڈ میری کتاب میں تمہارا بھی ذکر ہوگا''لوگوں کو بیحد پسند آیا تھا۔

کشور ساہو نے کئی فلمیں بھی ڈائرکٹ کیں جس میں اس کی بیٹی ہیروئن بھی بنی، اپنی بیٹی نینا ساہو کو انہوں نے بسواجیت کے ساتھ ہرے کانچ کی چوڑیاں میں پیش کیا، لیکن اس فلم میں اپنی بیٹی کو ڈائرکٹ کرتے ہوئے انہوں نے بسواجیت کے ذریعہ اس کی عصمت دری کا جو سین فلمایا اس کی وجہ سے وہ مغربی طرز کے باپوں میں شمار ہونے لگے جو ئے مکھرجی کو لے کر ایک کلی مسکائی بنائی، اس کے علاوہ پونم کی رات میں منوج کمار کے ساتھ ایک سسپنس فلم بنائی حال میں انہوں نے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں دیوآنند کی فلم ہرے راما ہرے کرشنا میں دیوآنند اور زینت امان کے باپ کا رول نبھایا، بیوی کا رول اچلا سچدیو نے کیا تھا۔دیوآنند کی فلم تیرے میرے سپنے میں بھی چھوٹا سا رول اس کے علاوہ شکتی سامنت کی فلم ''یہ رات پھر نہ آئے گی۔میں شرمیلا ٹیگور کے باپ کا رول ادا کیا، مجموعی اعتبار سے ان کی ہدایت میں بنی سبھی فلمیں باکس آفس میں نرم پڑ گئیں۔

فلمی دنیا کے تین منفرد ویلن۔ جینت، ہیرالال اور تیواری

پروین اختر

پرانے اداکاروں میں ویلین کا کردار نبھانے والے چند ناقابلِ فراموش کرداروں میں جہاں پران، جیون، پریم ناتھ کے نام قابل ذکر ہیں وہیں جینت، تیوراِی، این اے انصاری اور ہیرالال بھی ایسے ویلین گزرے ہیں جنھوں نے برسہابرس تک فلموں میں کام کر کے اپنی انفرادیت کا مظاہرہ کر دکھایا، جن میں بلاشبہہ جینت کا نام سرفہرست آتا ہے جو مرحوم ویلین امجد خان اور امتیاز خان (حیات) کے والد تھے، جینت نے اپنی بھاری بھرکم شخصیت کے ساتھ تقریباً سبھی بڑے اداکاروں کے ساتھ کام کیا اور خاص طور پر دلیپ کمار کے ساتھ ان کی چند فلمیں یادگار ہیں، مندرجہ ذیل میں متذکرہ چاروں مرحوم ویلینوں کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

جینت:- جینت کا اصل نام عباس خان تھا اور وہ لاہور کے رہنے والے تھے ۱۹۵۰ء میں لاہور سے ہجرت کر کے وہ ممبئی چلے آئے اور کے آصف، ایس یونس، موسیقار نوشاد اور نغمہ نگار شکیل بدایونی کے ساتھ اپنے مراسم بڑھائے۔ جینت کو فلموں میں ویلین کا کردار نبھانے کے لئے موقع دلانے میں موسیقار اعظم نوشاد علی (مرحوم) کا بڑا ہاتھ تھا۔ دلیپ کمار کے ساتھ فلم امر (دلیپ کمار۔ مدھو بالا، نمّی) لیڈر (دلیپ وجنتی مالا) سنگھرش (دلیپ کمار۔ وجنتی مالا) اور بمل رائے کی فلم ''مدھومتی'' (دلیپ کمار وجنتی) میں جینت کو خاص طور پر اپنی اداکاری کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملا، فلم امر میں وہ گاؤں کے غنڈے کے رول میں نظر آتے ہیں نمّی کو دل وجان سے چاہتے ہیں مگر نمّی، دلیپ کمار کے ہاتھوں اپنی عصمت گنوانے کے بعد اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتی ہے۔ اسی طرح سے فلم مدھومتی میں جینت، وجینتی مالا کے باپ بنتے ہیں جو پران کے چنگل سے بچنے کے لئے خودکشی کر لیتی ہے، ان دونوں فلموں میں جینت کی جذباتی اداکاری خوب تھی۔ فلم شنگھرش میں بنارس کے ٹھگوں کے سردار بھوانی شنکر کے رول میں وہ بیحد جچے، اس فلم میں وہ دلیپ کمار کے دادا کے رول میں نظر آتے ہیں اور وہ لوگوں کو ٹھگنے کے بعد راتوں رات اس کا کام تمام کر دیتے ہیں اور دولت کی ہوس میں اپنے اکلوتے بیٹے افتخار کا بھی قتل کروا دیتے ہیں۔ اس فلم میں جینت کو صحیح معنوں میں بھیانک رول میں پیش کیا گیا تھا۔ فلم لیڈر میں وہ ایک مکار قسم کے مافیا ڈان بنتے ہیں جن کا کام سیاسی لیڈروں کا قتل کرانا ہوتا ہے اور عوامی لیڈر موتی لال

کو جب ہیرالال کے ہاتھوں قتل کرا دیتے ہیں اس قتل کا الزام دلیپ کمار کے سر لگ جاتا ہے۔ جینت نے راج کپور کی فلم میم دیدی میں بھی للیتا پوار ڈیوڈ کے ساتھ بیحد اہم رول ادا کیا تھا۔ اس کے علاوہ موہن کمار کی فلم اپریل فول میں سائرہ بانو کے والد کا رول ادا کیا۔ چیتن آنند کی ناقابلِ فراموش فلم ''حقیقت'' میں وہ فوجی کرنل اور دھرمیندر کے والد کے رول میں نظر آتے ہیں۔ اور دوسرے زخمی وتھکے ہوئے جوانوں کی زندگی بچانے کے لئے ہزاروں حملہ آوروں کو روکنے کے لئے اپنے بیٹے کی جان کی قربانی تک دینے سے دریغ نہیں کرتے فلم انسانیت میں وہ دلیپ کمار اور دیو آنند کے مقابلے میں بے رحم بادشاہ کے رول میں نظر آتے ہیں اور فلم کے آخری سین میں دلیپ کمار کے ساتھ تلوار کی جنگ میں ان کا پھرتیلا پن لاجواب نظر آتا ہے۔ جینت نے ہاتھ کٹے کرنل کے رول میں دھرمیندر اور ونود کھنہ کے ساتھ ''میرا گاؤں میرا دیش'' میں بھی بہت ہی اہم رول ادا کیا تھا۔ شیخ مختار کے ساتھ برماروڈ جیمنی کی فلم زندگی میں پرتھوی راج، راجندر اور وجنتی مالا کے ساتھ اہم رول نبھایا۔ غرضیکہ جینت نے جن فلموں میں بھی کام کیا، اس فلم میں اپنی اہمیت منوالی تھی۔

ہیرالال:- ہیرالال کا پورا نام کشورمن جوہری ہیرالال تھا۔ طویل ہیکل اور مضبوط بدن ہاتھ والے ہیرالال کی آنکھیں بیحد خطرناک تھیں، سر سمنڈے ہوئے تھے ناک اور آنکھ کی بناوٹ بالکل ایسی تھی کہ بادی النظر میں ان کی شکل الّو سے مشابہ تھی اور اپنی اس خطرناک شکل اور گرانڈیل جسم کی بدولت انہیں انگنت فلموں الف لیلیٰ، حاتم طائی، جادو کا محل جیسی فلموں میں دیو کا رول دیا گیا لیکن انہیں پہلا بریک جی پی سپی کے والد این ایس سپی نے اپنی فلم ''قیدی نمبر ۹۱۱'' میں دیا جس میں وہ ایک خطرناک قاتل قیدی نمبر ۹۱۱ کے رول میں جلوہ گر ہوئے تھے اور جیل سے فرار ہو کر وہ ایک گھر میں گھس جاتے ہیں اور گھر کے معصوم بچے کو اغوا کر لے جاتے ہیں، اس فلم میں شیخ مختار، محمود اور شکیلہ نے اہم کردار ادا کئے تھے۔ فلم قیدی نمبر ۹۱۱ کی کامیابی کے بعد ہیرالال کو انگنت فلموں میں ویلین کے کردار حاصل ہوئے۔ فلم گنہگار، برماروڈ، لیڈر، جال، اور اس کے علاوہ بھی بہت ساری فلمیں انہیں ملیں۔ شکل سے وہ ایک انتہائی خطرناک رول میں نظر آئے لیکن ان کی زبان بڑی ہی شیریں تھی ایک مرتبہ وودھ بھارتی کے پروگرام میں ان کا انٹرویو سننے کا اتفاق ہوا تھا جس میں وہ بات بات پر غالب، میر، سودا کے اشعار پیش کر رہے تھے، ان کا کہنا تھا کہ وہ صبح کے وقت جب تک اردو کا اخبار نہیں پڑھ لیتے انہیں چین نہیں آتا تھا اس کے علاوہ انہوں نے حیدرآباد، گلبرگہ، کلکتہ اور اترپردیش کے ایجنٹوں سے رابطہ کر رکھا تھا جو انھیں اردو

کے اخبارات اور معیاری پرچے بھجوایا کرتے تھے، انہیں اردو زبان سے بیحد پیار تھا۔

تیواری: - ار بند کمار تیواری نے برسہا برس تک فلموں میں ویلین کا رول نبھایا تیواری نے خاص طور پر دارا سنگھ، مہی پال، آزاد کامران، رندھاوا کی فلموں میں ویلین کے کردار ادا کئے فلم میں سہا گن ہوں (گرو دت ، مالا سنہا) کاجل (دھرمیندر، راج کمار، مینا کماری) مدھومتی (دلیپ کمار، وجینتی، پران) میں اہم رول ادا کئے تیواری کے بیٹے بھوشن تیواری نے بھی کئی فلموں میں اداکاری کی۔ تیواری پہلے دور کی فلموں میں عام طور پر خطرناک اور بے رحم بادشاہ کے رول میں زیادہ نظر آئے پھر بعد میں انہوں نے ظالم ساہوکار کا رول نبھایا، پرانے زمانے میں ہر اداکار چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، لوگ نہ صرف ان کا نام جانتے تھے بلکہ شکل سے بھی واقف تھے لیکن آج جو فلمیں بن رہی ہیں جن کے بے تکے نام بھی نظر آتے ہیں ان کے ہیرو اور ہیروئن کا نام بھی شاید کوئی نہیں جانتا ہوگا۔ لیکن پہلے کی فلموں کے چھوٹے اداکار جیسے تیواری، راج مہرہ، سدھیر، واسطی، الیاس ہری شودسانی، منورما، مرزا مشرف سبھی اپنی ایک الگ اور منفرد پہچان رکھتے تھے۔

☆☆☆

افتخار، الیاس، انور حسین، رحمٰن

ہما انور (مغربی بنگال)

پرانے کیریکٹر ایکٹر کی بات آئے اور اس میں ذکر افتخار کا نہ آئے تو شاید اس جیسے عظیم اداکار کے ساتھ بڑی بے انصافی ہوگی۔ افتخار جہاں تیسری قسم (راج کپور۔ وحیدہ) میں ظالم اور اوباش ساہوکار نظر آتے ہیں وہیں تیری صورت میری آنکھیں (اشوک، پردیپ، آشا پاریکھ) میں اندرا بلّی کے ساتھ ایک مکار قاتل کے روپ میں نظر آتے ہیں، جانی میرا نام (دیو آنند۔ ہیما) میں جہاں ایک سنجیدہ حاضر دماغ پولیس افسر کے رول میں ہیں تو اسی انداز میں تیسری منزل (شمی کپور۔ آشا پاریکھ) میں ایک خفیہ جاسوس کے رول میں نظر آتے ہیں۔ دولت کے حرص میں پاگل خودغرض بھائی دیوداس (دلیپ۔ وجنتی، سچترا) کے رول میں نظر آتے ہیں وہیں سنگھرش (دلیپ، وجنتی، بلراج) کے درمیان دلیپ کمار کے باپ کے رول میں نظر آتے ہیں۔ دلہن وہی جو پیا من بھائے میں مدنپوری کے گہرے ڈاکٹر دوست کی شکل میں فلم اتفاق میں (راجیش، نندہ) پولیس کے رول میں وہ ایک کامیاب پولیس افسر نظر آئے ہیں۔

افتخار تقریباً ۲۰۰ سے زائد فلموں میں الگ الگ رول میں نظر آتے ہیں اور ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ رہی کہ انھوں نے اپنے ہر کردار کے ساتھ بھرپور انصاف کیا۔ فیروز خان کی ڈائنا مک فلم جو ماریو پوزو کی گاڈ فادر سے متاثر ہوکر دھرماتما کے نام پر بنائی گئی تھی، وہ گینگیسٹر پریم ناتھ کے دست راست اور مینجر کے رول میں نظر آتے ہیں اور اپنے مالک سے وفاداری کرتے ہوئے اپنی جان قربان کر دیتے ہیں جب گاڑی کے اندر رنجیت اور سدھیر بہت ہی بری طرح سے ان کا گلا گھونٹ کر قتل کرتے ہیں، فلم دھرماتما میں جہاں پریم ناتھ، اور ہیما مالنی کے رول کی تعریف کی گئی وہیں افتخار کے رول کو بھی بیحد سراہا گیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ افتخار کو سب سے زیادہ پولیس افسر کے رول میں پسند کیا گیا کیونکہ ان کے ڈائیلاگ بولنے کا انداز دوسرے سے بالکل منفرد تھا اور جو اداکار دلیپ کمار، راجکپور اور دیو آنند کے ساتھ بہترین اداکاری کرنے میں کامیاب ہو جائے وہ اداکار کسی کے بھی آگے جھک نہیں سکتا ہے۔ افتخار نے کئی فلموں میں ویلین کے رول بھی نبھائے لیکن انہیں خاص طور پر پولیس افسر اور مجبور باپ کے رول میں بیحد پسند

کیا گیا کیونکہ وہ اپنی شکل سے ہی بیحد مشفق اور عقلمند نظر آنے والے انسان لگتے تھے۔

الھاس: ۶ فٹ کے بھاری بھرکم جسامت رکھنے والے معاون اداکار الہاس کی اداکاری ایچ ایس رویل کی فلم ''سنگھرش'' میں بیحد پسند کی گئی تھی جو دلیپ کمار کے باپ جینت کے پشتینی وفادار ملازم تھے اور جینت (بھوانی پرشاد) کی موت کے بعد شنکر (دلیپ کمار) کے محافظ کے طور پر زندگی بھر ساتھ رہے اور دلیپ کمار کے جانی دشمن بلراج ساہنی کو قتل کرنے جاتے ہوئے خود دلیپ کے پھینکے ہوئے کلہاڑی سے جاں بحق ہوجاتے ہیں، اپنی موت کے وقت آخری ڈائیلاگ ''بچوا میں جارہا ہوں اپنی حفاظت خود کرنا'' کہہ کر وہ جس انداز میں دم توڑ دیتے ہیں اس سین میں دلیپ کمار اور بلراج ساہنی جیسے اعلیٰ اداکار بھی پھیکے نظر آتے ہیں۔

الہاس نے فلم ''گائیڈ'' میں لیلا چٹنس کے بھائی اور دیوآنند کے ماما کا رول ادا کیا تھا جو یہ برداشت نہیں کر پائے تھے کہ ان کا بھانجا ایک ناچنے گانے والی کے چکّر میں پڑ کر اپنی زندگی برباد کرلے اور جب وہ اس بائی وحیدہ رحمٰن کو گھر سے گھسیٹ کر نکال دینا چاہتے ہیں تب دیوآنند اپنے ماما سے سخت حجت تکرار اور تلخ کلامی کر کے اس ناچنے والی بائی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر والوں کے ساتھ رشتہ توڑ دیتا ہے۔ اس فلم میں الہاس کی جذباتی اداکاری اور اپنے غصّے کا اظہار جس انداز میں کرتے ہیں اس سے انہیں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔

فلم ''آدمی'' (دلیپ، وحیدہ، منوج، سمی) میں الہاس ایک ایسے شخص کا رول ادا کرتے ہیں جسے دلیپ کمار سے زبردست نقصان پہنچتا ہے اور وہ رات کے وقت دلیپ کمار کا قتل کرنے جاتے ہیں مگر پکڑے جاتے ہیں لیکن دلیپ انہیں معاف کردیتے ہیں اور فلم کے آخری سین میں دلیپ کی زندگی بچاتے ہیں اور ان کی بھرپور عیادت کر کے انہیں پھر سے روبصحت کردیتے ہیں۔ اے بھیم سنگھ کی ہدایتکاری میں بنی اس فلم میں اگرچہ الہاس کا رول بیحد مختصر ہے مگر اپنے اندر بیحد جاذبیت رکھتا ہے۔ الہاس نے دلیپ کے ساتھ اڑن کھٹولہ (نمی) شکست (نلنی جیونت) اور راجندر کمار کے ساتھ طلاق (کامنی کدم) دیکھ کبیرا رویا، سمیت تقریباً ۶۰ سے زیادہ فلموں میں اداکاری کی اور فلم سنگھرش کے ذریعہ اس نے اپنی ایک ایسی لازوال شبیہ پیش کی جسے لوگ کبھی بھی فراموش نہیں کرپائیں گے۔

انور حسین: انور حسین نے تقریباً ۲۰۰ سے زائد فلموں میں کام کئے اور ان کی سب سے مشہور نتن بوس

کی ہدایت میں فلم ''گنگا جمنا'' تھی جس میں دلیپ کمار، ناصر خاں اور وجنتی مالا نے اداکاری کی تھی۔ فلم گنگا جمنا میں انور حسین ایک لالچی، ظالم اور پُرہوس ساہوکار کے رول میں جس نے جو گنگا اور جمنا کی ماں لیلا چٹنس کی زندگی میں بے حد دکھ دیئے تھے اور لیلا چٹنس کی افسوسناک موت کے بعد گنگا (دلیپ) جہاں گنگا ڈاکو بن جاتا ہے وہیں جمنا ایکوفادار پولیس افسر بن جاتا ہے اور فلم کے آخری سین میں جب دھنّو (وجنتی مالا) پولیس کی گولی لگنے سے ہلاک ہوجاتی ہے تب گنگا ساہوکار انور حسین کی پوری حویلی کو جلا کر اُسے گولی مار کر ہلاک کردیتا ہے لیکن اپنے پولیس افسر بھائی کی گولی لگنے سے خود بھی جاں بحق ہوجاتا ہے۔ اس فلم میں انور حسین ایک کامیاب ویلین کے طور پر نظر آئے۔ گائیڈ میں وہ دیوآنند کے دوست بنے تھے اور فلم اصلی نقلی میں سندھیا رائے کے بھائی تھے جس میں ایک مل ورکر اور ان پر فلمایا گیا یہ گیت ''چنزی سنبھال گوری اڑی چلی جائے رے'' بیحد مشہور ہوا تھا جسے منّا ڈے کی آواز میں او پی نیّر نے مجروح سلطان پوری کی تحریر کردہ گیت کو فلمایا تھا۔

انور حسین نے اجیت اور پران کے ساتھ بی ناگ ریڈی کی فلم غدار میں مدن پوری، ونود کھنہ اور پران کے ساتھ کام کیا لیکن ۱۹۸۰ء کی ریلیز وکٹوریہ ۲۰۳ میں پران، اشوک کمار، نوین نشچل اور سائرہ بانو کے ساتھ بہترین ویلین کا کردار نبھایا، اس کے بعد دفعہ ۳۰۲، راجہ اور رانا، امیر غریب، چوری میرا کام بھابھی چندا اور بجلی سمیت دو درجن فلموں میں ویلین کا رول نبھایا۔ انور حسین مشہور اسٹیج رقاصہ جدّن بائی کے بیٹے اداکارہ نرگس کے بھائی اور اداکارہ زاہدہ کے ماما تھے انور حسین کو خاص طور پر لوگ گنگا جمنا، وکٹوریہ ۲۰۳ جیسی سپرہٹ اور یادگار فلموں کے لئے یاد رکھ سکتے ہیں۔ انور حسین کو سلطان احمد، کے آصف، محبوب خان، ایس یوسّی وجے آنند کی خصوصی حمایت حاصل رہی اور انہوں نے ان فلموں میں کام کر کے اپنی اہمیت منوالی تھی۔

رحمٰن: معاون اداکاروں میں رحمٰن کو ہمیشہ اصل ہیرو کے طور پر یاد رکھا جائے گا رحمٰن جو کہ اترپردیش کے ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے تھے ان کا اُردو تلفّظ بہت ہی شاندار تھا۔ رحمٰن نے دلیپ کمار کے ساتھ فلم دل دیا درد لیا، گرودت کے ساتھ پیاسا، صاحب بی بی اور غلام، چودھویں کا چاند، راجندر کمار کے ساتھ پالکی، دھرمیندر کے ساتھ دوست، میرے ہمدم میرے دوست، بہاروں کا موسم، دلہن ایک رات کی، جیسی یادگار فلموں میں کام کیا۔ لیکن چودھویں کا چاند، دل دیا درد لیا، پالکی اور صاحب بی بی اور غلام میں ان کے رول اور ڈائیلاگ کو کوئی بھی فراموش نہیں کرسکتا۔ فلم پیاسا میں ایک بے رحم قسم کے پبلشر کے رول میں نظر

آتے ہیں۔فلم دشمن میں راجیش کھنہ کے ساتھ ایک جج کے رول میں ان کی اداکاری بیحد پسند کی گئی۔آر کے نیّر کی فلم انتقام میں سنجے خان،سادھنا اور اشوک کمار کے ساتھ ان کے رول کو بیحد پسند کیا گیا جب وہ اور اشوک کمار نوجوانی میں اسمگلر تھے لیکن ہیرے اسمگل کرنے کے بعد اشوک کمار خود کو پولیس کے حوالے کردیتے ہیں اور اس امید پر کہ رحمٰن اس کے گھر والوں کو دیکھے گا مگر وہ بے وفا دوست نکلتا ہے اور اشوک کمار اس سے انتقام لینے کے لئے زبردست منصوبہ تیار کرتے ہیں۔

رحمٰن نے بی آر چوپڑہ کی ناقابلِ فراموش فلم ''وقت'' میں راج کمار،ششی کپور،سادھنا اور سنیل دت کے ساتھ بیحد اچھا رول کیا تھا جس میں وہ ایک خطرناک اسمگلر ہی نہیں ایک قاتل بھی تھے،اس فلم میں بحیثیت ایک ویلین کے رحمٰن بیحد عروج پر نظر آتے ہیں۔میرے ہمدم میرے دوست میں بھی اور منوج،سادھنا کی فلم امانت میں بھی وہ ایک خطرناک قاتل کے رول میں یادگار اداکاری کے نمونے پیش کئے۔رحمٰن بیک وقت سنجیدہ اور خطرناک رول میں کامیاب تھے،ان کے جیسا بہترین اور اداکار آج کے دور میں عنقا ہے۔

☆☆☆

فلمی دنیا کی خاتونِ اوّل۔دیویکارانی

اندرناتھ چودھری

۱۹۳۵ سے ۱۹۴۵ء تک کی دہائی میں ہندوستان کے چار فلم ساز ادارے بڑے محترم سمجھے گئے ہیں۔(۱) کلکتے کا نیو تھیٹرز،جس کی فلمیں صرف تعلیم یافتہ طبقہ پسند کرتا تھا۔(۲) پونے کی پربھات فلم کمپنی،جس کی سماجی فلموں کو ہندوستانی مزاج کے فلم بین سراہتے تھے۔(۳) بمبئی کے بامبے ٹاکیز جس کی فلمیں صاف ستھرے اور بھرپور انٹرٹین منٹ کی بنا پر خوش مزاج اور سنجیدہ طبیعت کے فلم بین زیادہ پسند کرتے تھے اور (۴) بمبئی کی منروا مودی ٹون کی سماجی اور تاریخی فلمیں اپنے اسٹیجی اردو مکالمات کی بنا پر مسلم فلم بین طبقے کو بہت اچھی لگتی تھیں۔

مگر یہاں ذکر ہے بامبے ٹاکیز کا۔لیکن پہلے ہمانسو رائے!

ہمانسو رائے بنگال کے ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے تھے جس کا شوقیہ طور پر اپنی ناٹک کمپنی تھی۔ہمانسو رائے نے کلکتے سے بی اے،ایل۔ایل۔بی،پاس کیا اور پھر وہ بیرسٹری کی تعلیم کے لئے لندن چلے گئے۔لندن کے قیام میں انہوں نے قانون سے زیادہ ڈرامے اور فلم سے دل چسپی لی۔لندن میں ہمانسو رائے کی ملاقات بنگال کے مشہور انقلابی بپن چندر کے بیٹے نرنجن پال سے ہوئی۔انہیں دنوں نرنجن پال نے لندن میں ہندوستانی طالب علموں کے لئے انہی کے سرمائے سے ''دی گاڈس'' نام کا ایک ڈراما اسٹیج کیا۔جس میں ہمانسو رائے نے مرکزی رول ادا کیا اور پھر جلد ہی ہمانسو رائے نے فلم سازی میں دل چسپی لینی شروع کردی۔براہ راست معلومات اور تجربہ حاصل کرنے کی خاطر وہ کچھ عرصے جرمنی میں بھی رہے۔ہمانسو رائے نے اپنے دوست نرنجن پال کی ایک کہانی ''لائٹ آف ایشیا'' جرمنی کے ایک فلم ساز ادارے ایم الیکا کنزرن کو فروخت کرادی۔ہمانسو رائے جرمنی سے ہندوستان آئے اور لاہور کو اپنی فلم سازی کا مرکز بنایا۔وہ اس طرح کہ لاہور ہائی کورٹ کے ایک جج جسٹس موتی ساگر اور ان کے بھائی دہلی کے ایک مشہور تاجر پریم ساگر کے سرمائے سے لاہور میں گریٹ ایسٹرن کارپورشن کے نام سے ایک فلم ساز ادارہ قائم کیا۔مگر ہمانسو رائے نے فلم پروڈکشن کا شعبہ لندن میں ہی رکھا۔اور پھر ایم الیکا کنزرن ہی کے اشتراک سے ہمانسو رائے نے

انٹر انٹرنیشنل ٹاکیز لمیٹیڈ کے نام سے ایک ضمنی ادارہ بھی قائم کیا۔جس کے تحت سب سے پہلے لندن جرمنی ماہرین کی مدد سے نرنجن پال کی (وہی کہانی جو ایم الیکا کنزرن نے خریدی تھی) لائٹ آف ایشیا کے نام سے فلمائی۔ یہ کہانی بودھ فلسفے سے متعلق تھی۔اس میں گوتم بدھ کا مرکزی رول خود ہمانسورائے نے ادا کیا اور یشودھرا کا رول ایک اینگلو انڈین خاتون رینی سمتھ نے سیتا دیوی کے نام سے انجام دیا۔ابتداء میں تو یہ فلم مقبول نہیں ہوئی۔مگر جلد ہی ہمانسورائے کو لندن کے شاہی بیکنگم پیلس میں ''لائٹ آف ایشیا'' کا ایک شو دکھانے کا موقع مل گیا اس کے نتیجے میں اس فلم کو خاصی پبلسٹی مل گئی۔لکھنؤ ٹائمز نے لائٹ آف ایشیا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''یہ ۱۹۳۵ء کی دس بہترین فلموں میں سے ایک ہے۔'' ہمانسورائے کے اسی ادارے نے 'شیراز' (جو تاج محل کے معمار سے متعلق تھی) اور ۱۹۲۸ء میں 'تھرو آف ڈسک' بنائی۔تھرو آف ڈسک، میں دیویکارانی نے بھی کام کیا تھا۔ہمانسورائے نے ۱۹۲۹ء میں دیویکارانی سے شادی کر لی۔

لندن میں ہمانسورائے کی ملاقات بمبئی پریذیڈنسی کے سابق گورنر کے بیٹے رچرڈ ٹیمپل سے ہوئی اور دونوں کے اشتراک سے پہلی اینگلو انڈین فلم ''کرما'' بنی۔ یہ ہمانسورائے کی پہلی بولتی فلم ''کرما'' کی ہیروین دیویکارانی تھیں!

سوال یہ ہے کہ ہمانسورائے اور دیویکارانی کا سنجوگ کیسے ہوا؟

دیویکارانی والیٹر میں کرنل چودھری کے گھر پیدا ہوئیں۔ چودھری برٹش سے میڈیکل کور میں کرنل تھے اور بعد میں مدراس میں پہلے سرجن جنرل بنائے گئے ریٹائر ہونے کے بعد کرنل چودھری نے انگلستان میں سکونت اختیار کر لی دیویکارانی کی دادی سوکماری دیوی گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور کی بہن تھی۔ چنانچہ دیویکارانی کی بچپن کی تعلیم شانتی نکیتن میں ہوئی۔۹ ربرس کی عمر میں دیویکارانی اپنے والد کے ساتھ انگلستان چلی گئیں۔

جہاں ان کی ابتدائی تعلیم لندن کے ہمپ اسٹیڈ اسکول میں ہوئی۔سنئیر کیمرج کرنے کے بعد جب دیویکارانی کی ملاقات مشہور روسی رقاص اناپاوَلوف سے ہوئی پاوَلوف کے توسط سے دیویکارانی کو رائل اکاڈیمی آف ڈرامیٹک آرٹ اور رائل اکاڈیمی آف میوزک جیسے اہم اداروں سے وظیفوں کے ساتھ ان میں داخلہ بھی مل گیا۔دیویکارانی کو آرائش کے فن سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور انہوں نے اپلائیڈ آرٹ میں بھی داخلہ لیا۔ٹیکسٹائل ڈیزائن اور ڈیکور میں ڈپلوما لینے کے بعد دیویکارانی نے ایک ٹیکسٹائلز ڈیزائنر کی حیثیت

سے اپنی روزی آپ پیدا کرنی شروع کر دی!

لندن میں کرنل چودھری نرنجن پال کے پڑوسی تھے اور نرنجن پال ہمانسورائے کے دوست بھی تھے اور شریکِ کار بھی ___ ۱۹۲۸ء میں نرنجن پال کے مکان پر ہمانسورائے کی دیویکارانی سے ملاقات ہوئی اور بردس وولف کمپنی (ہمانسورائے جس کے شریکِ کار تھے) کے لئے کاسٹیوم ڈیزائنر کی حیثیت سے دیویکارانی سے ایک معاہدہ ہو گیا۔

۱۹۲۹ء میں جب دیویکارانی اور ہمانسورائے ہندوستان آئے تو ہم ذوق اور شریکِ کار ہونے کے ساتھ جرمنی چلی گئیں۔ جہاں جرمنی کے مشہور ادارے یو۔ایف۔اے میں دیویکارانی نے میک اَپ، اسٹیج کی آرائش اور خصوصی طور پر فنِ اداکاری کی تربیت حاصل کی۔یہی نہیں بلکہ انہوں نے جرمنی کے سب سے بڑے فلم ڈائریکٹر پابسٹ سے اداکاری کے رموز ونکات کو اور زیادہ سمجھا اور فیٹز لانگ جیسے باکمال استاد نے بھی دیویکارانی کو فلم سازی کے جملہ رازوں سے واقف کرایا اور اس کے بعد لندن میں دیویکارانی نے ہمانسورائے کی تیسری فلم ''تھرو آف ڈسک میں پہلی بار اداکارہ کی حیثیت سے کام کیا۔

''کرما'' ہمانسورائے اور دیویکارانی کی پہلی بولنے والی فلم تھی جو بیک وقت ہندی اور انگریزی میں بنی تھی۔ہندوستان میں ہندی فلم، کرما، کے پریمئیر کا افتتاح وائس رائے لارڈ ارون نے کیا تھا۔''کرما'' کی مقبولیت نے دیویکارانی کو ایک ہی رات میں اسٹار بنا دیا۔اسی مقبولیت کے نتیجے میں بی بی سی نے جب شارٹ ویو پر ہندوستان کے لئے پہلی بار اپنا پروگرام نشر کیا تو اس کے افتتاح کے لئے دیویکارانی کو مدعو کیا!

اب تھوڑا ذکر بامبے ٹاکیز کا!

بامبے ٹاکیز: ہمانسورائے اور دیویکارانی ۱۹۳۴ء میں جب قطعی طور پر ہندوستان واپس آئے تو ان کے ہمراہ ان کے فیملی دوست مسٹر ٹیمپل بھی تھے۔بمبئی کے کاروباری حلقوں میں ٹیمپل کے کافی رسوخ تھے۔چنانچہ ان کے کہنے پر کئی سرمایہ کار ہمانسورائے کی طرف متوجہ ہوئے۔مسز سروجنی نائیڈو دیویکارانی کو بہت چاہتی تھیں۔اور دیویکارانی کو ہمیشہ ڈارلنگ کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔مسز نائیڈو کی ترغیب پر سر اکبر حیدری نے بھی دلچسپی لی۔سر اکبر حیدر آباد کے صدر اعظم بھی تھے۔اور وزیرِ مالیات بھی۔غرض کہ سر جنی لال مہتہ اور ایف۔ای۔دین جیسے سرمایہ کار بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل ہوئے۔ہمانسورائے فاؤنڈر ڈائریکٹر

بنائے گئے۔اور ۲۵ لاکھ روپئے کے سرمائے سے بامبئے ٹاکیز کے نام سے ہندوستان کا پہلا لمیٹیڈ فلم ساز ادارہ وجود میں آیا۔اسی اثنا میں ہمانسورائے کے پرانے دوست نرنجن پال اپنے وطن کلکتے واپس آکر فلمیں بنانے میں لگے ہوئے تھے۔مگر وہ نصف درجن فلمیں بنانے کے بعد بھی کاروباری طور پر کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ہمانسورائے نے انہیں بمبئی بلا کر بامبے ٹاکیز کے اسٹوری ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ مقرر کردیا۔ہمانسورائے نے ایک ضابطہ یہ بھی بتایا کہ اداکار یا ٹیکنیشین جو کمپنی میں ملازم رکھے جائیں وہ تعلیم کے اعتبار سے کم از کم گریجویٹ ضرور ہوں۔اور انہیں منتخب کرتے وقت ان کے فیملی بیک گراؤنڈ کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ابتداء میں کمپنی میں جو ملازم رکھے گئے،ان میں ایس مکر جی (ایڈیٹنگ) ساؤک واچا (ساؤنڈ) کمد لال گنگولی (ایڈیٹنگ اور فوٹو گرافی) گیان مکر جی،امیہ چکروتی،نجم نقوی (ڈائریکشن) شامل تھے اور بعد میں کشور ساہو،راما شکل،پنڈت جے راج،رینوکا دیوی،کرونا دیوی،میرا دیوی،لیلا چٹنس،اور مایا دیوی کو اداکارہ کے طور پر ملازم رکھا گیا۔انگریزی روز نامے ''بامبے کرانی کل'' کے مشہور ایڈیٹر ہارنی مین کی سفارش پر حیدر آباد سے آئے ہوئے ناٹک کے ایک ممتاز ڈانسر ممتاز علی (کامیڈین محمود کے والد) کو کمپنی میں ڈانس ڈائریکٹر بنایا گیا۔ڈائریکٹر فریز آسٹن کو ان کے یونٹ (جوزف ورژنگ) لین بارٹلے،کارن وان سپریٹی وغیرہ) کے ساتھ جرمنی سے بلایا گیا۔ہمانسورائے نے جرمنی سے آئے ہوئے ان ماہرین سے اپنے عملے کو تربیت بھی دلوائی۔جے۔این۔کیشپت (جو دہرہ دون کے ایک کالج میں استاد تھے)۔ایس۔آئی۔حسن، پنڈت اندر،پردیپ اور شاہد لطیف وغیرہ کو مکالمہ اور گیت کار کی حیثیت سے منتخب کیا گیا۔

میوزک ڈائریکٹر کی جگہ کیلئے ایک پارسی خاتون خورشید ہونجی (جن کا سرسوتی دیوی نام رکھا گیا) کو منتخب کیا اور سنگر کے طور پر ارون کمار کو! ہمانسورائے نے اپنے سیکریٹری پرپرا کے ساتھ دہلی کا دورہ کیا اور کہتے ہیں کہ کئی ہزار نوجوانوں میں سے نجم الحسن کو ہیرو کے ......رول کے لئے منتخب کیا گیا۔نجم انتہائی خوب رو تھے۔پنجاب کے رہنے والے تھے اور گریجویٹ تھے۔یہاں یہ بات ضروری ہے کہ کمپنی کے لئے ضابطے مقرر کرنے اور عملے کے انتخاب میں دیویکارانی کا ذہن ہمانسورائے کا برابر شریک تھا۔

بامبے ٹاکیز نے ۱۹۳۴ء تا ۱۹۵۲ء یعنی ۱۸/ برس کے عرصے میں کل ۳۸ بولتی فلمیں بنائیں جن میں ۱۴/ فلموں میں دیویکارانی نے ہیروئین کی حیثیت سے کام کیا۔(کرما،بامبے ٹاکیز کی فلم نہیں تھی۔بامبے ٹاکیز

قائم ہونے سے پہلے ہمانسورائے نے،کرما،لندن میں بنائی تھی)چونکہ اس مضمون کی مجموعی شخصیت دیویکارانی ہے اس لئے ان کی فلموں کی تفصیل ذیل میں دی جارہی ہے:

۱۹۳۳ء	کرما	دیویکارانی،ہمانسورائے
۱۹۳۵ء	جوانی کی ہوا	دیویکارانی،انجم الحسن
۱۹۳۶ء	ممتا	دیویکارانی،ایچ۔مسیح
۱۹۳۶ء	جیون نیّا	دیویکارانی،جے۔ایس۔کیشب
۱۹۳۶ء	اچھوت کنیّا	دیویکارانی،اشوک کمار
۱۹۳۶ء	جنم بھومی	دیویکارانی،اشوک کمار
۱۹۳۷ء	عزت	دیویکارانی،اشوک کمار
۱۹۳۷ء	ساوتری	دیویکارانی،اشوک کمار
۱۹۳۷ء	جیون بھارت	دیویکارانی،کشور ساہو
۱۹۳۸ء	نرملا	دیویکارانی،اشوک کمار
۱۹۳۸ء	وچن	دیویکارانی،اشوک کمار
۱۹۳۹ء	درگا	دیویکارانی،راماشکل
۱۹۴۱ء	انجان	دیویکارانی،اشوک کمار
۱۹۴۳ء	ہماری بات	دیویکارانی،جے راج

کرما: یہ فلم مئی ۱۹۳۳ء میں لندن میں ریلیز ہوئی تھی اور اس کی تکمیل میں دو برس صرف ہوئے تھے۔کرما،اگرچہ کاروباری طور پر کامیاب نہیں ہوئی،مگر انگریزی پریس نے اسے کافی سراہا۔اس فلم میں بوسہ لینے کے بھی مناظر تھے،جن کو سنسر نے حذف نہیں کیا تھا۔پریس نے دیویکارانی کے انگریزی تلفظ کی بہت تعریف کی تھی۔لندن کے ایک اخبار نے تو یہاں تک لکھا کہ ایسا نرم لہجہ ایسی دل نشین آواز اور ایسی موہنی صورت،نہ پہلے کبھی سنی گئی اور نہ دیکھائی گئی'ایرا' نام کے جریدے نے اپنے

تبصرے میں کہا کہ دیویکا رانی کی مخملی آنکھیں جذبات کا اظہار کرنے میں بڑی کامیاب ہیں۔ البتہ لندن کے ہی ایک مصنف پال اوتھا نے اپنی کتاب میں، کرما، کو ایک غیر دل چسپ فلم قرار دیا تھا مگر دہلی کے ایک اردو جریدے نے تو کرما، پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھا کہ ''پلاٹ نہ کہانی اور ہنڈ پھر کے دیویکا رانی''۔ کرما کا ہندی روپ ۲ / جنوری ۱۹۳۴ء کو ریلیز ہوا۔ اس موقع پر 'کرما' سے متعلق ایک خصوصی بک لیٹ شائع ہوئی، جس کا پیش لفظ سروجنی نائیڈو نے لکھا تھا۔ مسز نائیڈو نے اپنے پیش لفظ میں دیویکا رانی کو 'محبت کا طلسمی پھول' قرار دیا تھا۔ 'کرما' میں دیویکا رانی نے چار گانے بھی گائے تھے۔ تین ہندی میں ایک انگریزی میں ''لو چلے چل پار چلے چل''، ''مرے ہاتھوں میں ترے ہاتھ ہیں''، اور ''سب کچھ بھولے جھولا جھولے''۔ ''کرما'' میں دیویکا رانی سیتا پور کی رانی بنی تھیں اور ہمانسو رائے جیا نگیر کے راج کمار۔

جوانی کی ہوا : نام تھا 'مدنائٹ کراسنگ' اور موضوع کے اعتبار سے نرنجن پال کی یہ کہانی ایک بولڈ کہانی تھی۔ یعنی ہیروئن اپنی ناپسندیدہ شادی کو ٹھکراتی ہے اور سماج کے چیلنج کو قبول کرتی ہے اور پھر پسندیدہ مرد کے ساتھ فرار ہو جاتی ہے۔ کہانی کا بڑا حصہ ریل کے سفر سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے لئے کمپنی کی طرف سے جی۔ آئی۔ پی ریلوے کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ اگر چہ نئے اداکاروں کی وجہ سے یہ فلم دیکھنے والوں کو زیادہ متوجہ نہیں کر سکی۔ مگر دو پارسی بہنوں کے بنا پر جو اس فلم سے وابستہ تھیں۔ خورشید ہو نچی اس فلم کی میوزک ڈائریکٹر تھیں اور ان کی بہن مانک نے چندر پربھا کے نام سے ایک رول ادا کیا تھا۔ بمبئی کی پارسی پنچایت کے اراکین نے سنیما ہال کے باہر پیکٹنگ کیا تھا۔ پارسی پنچایت فلم میں پارسی خواتین کی شمولیت کے خلاف تھی، حد یہ کہ مخالفت کرنے والوں میں فلم ساز واڈیا برادران فلم ساز آرڈیشر ایرانی پیش پیش تھے۔ پارسی برادری کی یہ مخالفت ''جوانی کی ہوا'' کے لئے موافق ثابت ہوئی اور فلم چل نکلی۔ چنانچہ بامبے ٹاکیز کی جانب سے (بمبئی) فورٹ کے علاقے میں ایک ایرونی ریسٹورنٹ (جارج ریسٹورنٹ) میں فلم کی کامیابی کا جشن منایا گیا____ دیویکا رانی نے شمپئین بوتل کا کارک اڑایا پھر ڈنر کا دور چلا!

''ممتا'' اور ''میاں بیوی'': 'جوانی کی ہوا' کے بعد کی یہ دو فلمیں ایک ہی شو میں ایک ساتھ دکھائی جاتی تھیں۔ یہ دونوں کہانیاں بھی نرنجن پال ہی نے لکھی تھیں 'ممتا' ایک ٹریجڈی فلم تھی اور 'میاں بیوی' ایک کامیڈی یہ دونوں فلمیں بُری طرح ناکام ہوئیں!

جیون نیّا: اشوک کمار کو پہلی بار اس فلم میں دیویکا رانی کے مقابل کھڑا کر دیا گیا تھا۔ وہ بالکل کبوتر جیسے معصوم دکھائی دیتے تھے۔ البتہ ممتاز علی کے ناچ گانے کی بنا پر یہ فلم خاصی تفریحی ثابت ہوئی تھی۔ اور کاروباری طور پر بھی بری نہیں رہی تھی۔

اچھوت کنیا: بامبے ٹاکیز اور دیویکا رانی کی یہ سب سے مبقول فلم ہے۔ رنجن پال کی اس کہانی کا پہلا نام ''لیول کراسنگ'' تھا۔ ''لیول کراسنگ'' کو ''اچھوت کنیا'' جیسا موزوں ترین نام ہمانسو رائے نے دیا تھا۔ چھوت چھات، ذات پات اور ہندو سماج کے بیجا بندھنوں سے متعلق یہ بڑی موثر کہانی تھی۔ کستوری نام کی ایک ہریجن لڑکی، جس سے ایک براہمن لڑکا محبت کرتا ہے۔ کستوری کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ایک ریلوے پورٹر سے ہو جاتی ہے اور پھر کستوری کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس فلم میں دیویکا رانی نے ایک بھولی بھالی ہریجن لڑکی کے روپ میں بلا کی نیچرل اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ ساٹھ برس گزر جانے کے بعد، اس فلم کے دو گانے آج بھی مقبول ہیں: ''میں بن کی چڑیا بن میں بن بن بولوں رے'' دیویکا رانی اور اشوک کمار نے گایا تھا اور 'کت گئے، کھیون ہار، فلم کی میوزک ڈائریکٹر سرسوتی دیوی نے خود گایا تھا۔ اگر چہ ''اچھوت کنیا'' صرف آٹھ ہفتے میں بن کر تیار ہو گئی تھی۔ اور ۲۷/ ہزار ایک سو تیرہ روپئے چودہ آنے کی اس پر لاگت آئی تھی۔ اور کلکتے کے ایک ہی سنیما گھر میں ۲۷ ہفتے چلی تھی، اور یہ بامبے ٹاکیز کی پہلی جوبلی فلم تھی۔ ''اچھوت کنیا'' آج ایک کلاسک فلم کے طور پر یاد کی جاتی ہے!

''اچھوت کنیا'' کے بعد دیویکا رانی اور اشوک کمار ''جنم بھومی'' میں آئے۔ یہ فلم گرام سدھار سے متعلق تھی۔ ''عزت'' میں بھی انہی دونوں نے کام کیا تھا۔ جو بھیل اور مراٹھوں کی دوستی اور دشمنی سے متعلق ایک کاسٹیوم فلم تھی۔ ''ساوتری'' دیویکا رانی اور اشوک کمار کی پہلی دھارمک فلم تھی جو خاصے بڑے بجٹ کی فلم تھی۔ مگر یہ تینوں فلمیں کاروباری طور پر ناکام رہیں۔ ان غیر اہم فلموں کے بعد فلم ''جیون پربھات'' میں دیویکا رانی کے مقابل کشور ساہو کو پیش کیا گیا۔ یہ فلم چھوت چھات کے موضوع پر مبنی تھی اور پسند کی گئی تھی۔

درمیان میں بامبے ٹاکیز کی فلم ''بھائی'' (جس میں علی گڑھ کی خورشید عبداللہ، رینو کا دیوی کے نام سے پہلی بار ہیروئن بن کر آئیں، ہیرو جے راج تھے) کی خاصی کامیابی کے بعد دیویکا رانی کی تین اور ناکام فلمیں آئیں۔ ''نرملا'' ایک ایسی عورت کی کہانی تھی، جو اولاد سے محروم تھی، ''وچن'' میں راجپوتوں کی بہادری دکھائی

گئی تھی۔ان دونوں فلموں میں دیویکارانی کے مقابل اشوک کمار ہیرو تھے۔''درگا'' میں دیویکارانی ایک یتیم لڑکی بنی تھی۔جس سے گاؤں کا ڈاکٹر (راماشکل) محبت کرتا تھا۔''دُرگا'' میں ممتاز علی کا بھی ایک اہم رول تھا!

ذرا پیچھے مڑ کے، ہمانسورائے پر ایک نظر اور ____

ہمانسورائے کے اپنے دوستوں کے کہنے کے بموجب ہمانسورائے کبھی بلا کے من چلے نوجوان تھے، مگر دیویکارانی سے شادی کرنے کے بعد اور خصوصی طور پر بامبے ٹاکیز کا سربراہ بننے کے بعد وہ کسی خاتون سے ہنس کر بات کرنا تو کُجا، خواتین سے بات کرتے وقت بھی اپنی نظریں نیچی رکھتے تھے۔ہمانسورائے اور دیویکارانی میاں بیوی تھے، مگر سمن اور سوگندھ کی طرح ہمانسورائے اپنی بیوی کو دیویکا نہیں بلکہ پیار سے ''مونی'' کہتے تھے۔اپنی مونی سے مشورہ کئے بغیر وہ ایک قدم بھی نہ اٹھاتے تھے ____

مگر جوانی مرد کی ہو یا عورت کی' جوانی کا دوسرا نام لغزش ہے!

''جیون نیّا'' کا پہلا سیٹ تیار تھا۔لائٹنگ جاری تھی۔پہلے شاٹ کے بعد ہیروئن (نجم الحسن اور دیویکارانی) کو سیٹ پر پہنچنا تھا کہ اچانک ہمانسورائے کو خبر ملی کو دونوں اسٹوڈیو میں نہیں ہیں۔یہ سنتے ہی ہمانسورائے کے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی ____ ایک اور خبر ملنے پر ہمانسورائے دوڑے دوڑے کلکتہ پہنچے اور گرانڈ ہوٹل میں دونوں کو پالیا۔اس سے پہلے نجم الحسن اور دیویکارانی نیوتھیٹر کمپنی کی پیش کش قبول کرتے ،رائے اپنی اس مونی کو بمبئی واپس لے آئے جس پر اُن کا حق تھا۔نجم الحسن سے انہوں نے کوئی باز پرس نہیں کی۔نجم الحسن بحیثیت اداکار نیوتھیٹرز میں ملازم ہوگئے۔دیویکارانی کی اس لغزش کو بامبے ٹاکیز کے عملے نے کمپنی کی بدنامی سمجھا اور دیویکارانی کی واپسی پر تمام اسٹاف مشتعل ہوکر ہڑتال پر جانے کے لئے تیار ہوگیا۔مگر ہمانسورائے نے اپنی سوجھ بوجھ سے بات کو اور زیادہ بگڑنے نہیں دیا، سمجھا بجھا کر اسٹاف کے غصّے کو ٹھنڈا کردیا۔لیکن دیویکارانی نے اسٹاف کے احتجاج کے پیچھے نرنجن پال کے دماغ کو ذمّہ دار ٹھہرایا!

نجم الحسن کے اچانک چلے جانے کی بنا پر زیرِ تکمیل فلم ''جیون نیّا'' کے لئے ہیرو کی ضرورت پیش آئی۔تلاش کے لئے وقت نہیں تھا۔چنانچہ اسٹوڈیوز کے لیبورٹیری سے کمد لال گنگولی کو باہر لاکر اشوک کمار بنادیا گیا اور ''جیون نیا'' کے سیٹ پر لے جاکر دیویکارانی کے مقابل کھڑا کردیا گیا۔گرچہ دیویکارانی کی لگاتار تین فلموں (نرملا، وچن اور درگا) کی ناکامی سے ہمانسورائے فکرمند رہنے لگے تھے اور آخر

ذہنی تناؤ کے مرض میں مبتلا ہوگئے۔کہانی ''نارائنی'' زیرِغور تھی کہ ان کا ذہن اور زیادہ الجھ گیا اور ایک دن کسی معمولی سی بات پر مشتعل ہوکر ہمانسورائے نے ساؤک واچر کو ایسا تھپڑ مارا کہ وہ بے چارا ہمیشہ کے لئے ایک کان سے بہرہ ہوگیا اور ہمانسورائے اعصابی اختلال کا شکار ہوکر اسپتال چلے گئے اور پھر اچانک ۱۹ر مئی ۱۹۴۰ء کو اس دنیا ہی سے چلے گئے!

علیحدگی: ہمانسورائے کے گزر جانے کے بعد جنرل منیجر رائے بہادر چنّی لال (میوزک ڈائریکٹر مدن موسن کے والد) کی خواہش تھی کہ انہیں کمپنی کا کنٹرولر مقرر کیا جائے، مگر بامبے ٹاکیز کے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے اس عہدے کے لئے دیویکارانی کو ترجیح دی اور چنی لال کو جنرل منیجر بنادیا۔چنی لال کو یہ بات ناگوار گزری۔انہوں نے دیویکارانی کو اکھاڑنے کی کوشش کردی۔دیویکارانی بھی چنی لال کی روز بروز بڑھتی ہوئی خودمختاری کو پسند نہیں کرتی تھیں۔چنی لال نے چاہا کہ باہر کے لوگوں کو کمپنی میں بھرتی کیا جائے۔وہ ڈائریکٹر کے طور پر جے۔کے۔نندا کو کمپنی میں لانا چاہتے تھے۔مگر دیویکارانی کا فیصلہ تھا کہ کمپنی کے جو نوجوان ملازمین اسٹوڈیوز میں تربیت پارہے ہیں، انہیں کو آگے بڑھایا جائے، چنانچہ دیویکارانی اور چنی لال کے درمیان دوری بڑھتی گئی۔آخر بامبے ٹاکیز کے ''بڑے'' دو گروپ میں بٹ گئے۔چنی لال اور ایس۔مکرجی وغیرہ کا ایک گروپ بنا اور دوسرا دیویکارانی اور امیہ چکرورتی وغیرہ کا۔پروڈیوسر کی حیثیت سے ایس۔مکرجی نے ''کنگن، بندھن، جھولا، اور نیا سنسار'' جیسی کامیاب فلمیں پیش کیں۔دیویکارانی نے پروڈیوسر بن کر امیہ چکرورتی سے ''انجان'' (دیویکارانی، اشوک کمار) اور ''بسنت'' (ممتاز شانتی، الہاس) اور دھرمی سے ''ہماری بات'' (دیویکارانی، جے راج) جیسی فلمیں ڈائریکٹ کروائیں۔ان میں کاروباری طور پر صرف فلم ''بسنت'' کامیاب رہی۔۱۹۴۳ء میں ایس۔مکرجی نے فلم ''قسمت'' (اشوک کمار، ممتاز شانتی، ڈائریکٹر: گیان مکرجی، موسیقار: انل بسواس) بنائی۔مکرجی کی قسمت نے پھر یاوری کی۔کلکتے کے ایک ہی سنیما گھر میں ''قسمت'' نے تین سال لگاتار چل کر ایک ریکارڈ قائم کیا۔اپنی اس کامیابی کے نتیجے میں ایس مکرجی نے اپنی ماہانہ تنخواہ ایک ہزار روپے میں اضافہ کی مانگ کی۔جو کمپنی کی کنٹرولر دیویکارانی نے منظور نہیں کی!

چنانچہ دیویکارانی کے طریق کار کو پسند نہ کرتے ہوئے رائے بہادر چنی لال اور ایس۔مکرجی نے ۱۹۴۳ء میں بامبے ٹاکیز کو خیر باد کہا۔ساتھ میں اشوک کمار، گیان

مکر جی، ساوک واچا، دتہ رام پائی، پردیپ، شاہد لطیف، مارشل برگنزا نے بھی بامبے ٹاکیز کو چھوڑ دیا اور سب نے مل کر فلمستان کے نام سے فلمسازی شروع کر دی۔

مردوں کی دنیا میں دیویکارانی اگر چہ تنہا رہ گئیں۔مگر ان کے حوصلوں نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ بامبے ٹاکیز کی کنٹرولر اور پروڈیوسر کی حیثیت سے انہوں نے ۱۹۴۴ء میں ''چار آنکھیں'' (جے راج، لیلا چٹنس۔ڈائریکٹر: سوشیل مجمدار) اور ''جوار بھاٹا'' (آغا، دلیپ کمار، مردولا۔ڈائریکٹر: امیہ چکرورتی) اور ۱۹۴۵ء میں ''پریتما'' (دلیپ کمار، سورن لتا۔ڈائریکٹر: جے راج) جیسی فلمیں بنائیں۔مگر یہ تینوں فلمیں کاروباری طور پر ناکام رہیں۔

دوسری بڑی جنگ کے ختم ہونے پر بازار کے بھاؤ گرنے لگے۔ بامبے ٹاکیز کے شیئر ہولڈرز کی دلچسپی بھی ختم ہونے لگی۔ چنانچہ کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹر نے تنہائی میں امیہ چکرورتی سے فلموں کی ناکامی کے سلسلے میں جواب طلب کیا امیہ نے کہا کہ ''مجھے کل اختیارات اور ذمہ داری سونپ دی جائے میڈم (دیویکارانی) کی سرپرستی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بہتر ہے کہ میڈم سے چھٹکارا پا لیا جائے۔مگر جب یہی سوال اگلے دن دیویکارانی سے کیا گیا تو ان کا جواب تھا اگر چہ فلمیں ہلکی گئی ہیں، لیکن اس کی یہ معنی نہیں ہیں کہ امیہ کی صلاحیت سے مایوس ہو جائیں۔

امیہ میں اچھی اور کامیاب فلمیں بنانے کی کافی صلاحیت موجود ہے مگر جب بورڈ آف ڈائریکٹرز نے امیہ چکرورتی کا ریکارڈ کیا ہوا بیان دیویکارانی کے گوش گزار کیا تو درجنوں مردوں کا تنہا مقابلہ کرنے والی دیویکارانی اپنے صرف ایک مرد ساتھی کی دغا پر ڈھیر ہو کر رہ گئیں:

اُنہی دنوں کی بات ہے کہ روسی مصور ڈاکٹر سوٹیوسلوف رورک کا اپنی چند شارٹ فلموں کی ڈبنگ کے سلسلے میں بامبے ٹاکیز کے اسٹوڈیو آنا ہوا، دیویکارانی سے ان کی ملاقات ہوئی، (قطعی طور پر فلمی ملاقات کی طرح) پہلی ہی ملاقات میں دونوں نے ایک دوسرے کو ہم ذوق سمجھا اور بقیہ زندگی ساتھ گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔۱۹۴۵ء کے آخری مہینوں میں دیویکارانی نے بامبے ٹاکیز سے متعلق اپنے تمام حصے شیراز علی حکیم (فلم: ''مغل اعظم'' کے پہلے پروڈیوسر اور ممبئی کی فیمس سنے بلڈنگ کے سابق مالک) کو فروخت کر دئے اور مسٹر روک سے شادی کر کے دیویکارانی اپنے شوہر کی اسٹیٹ میں کلّو (منالی) میں جا بسیں جہاں ان کے شوہر

اور سر کی پکچر آرٹ گیلری واقع تھی اور سیب کے باغات بھی۔

کامیابی کا راز: بامبے ٹاکیز کی اکثر فلمیں کاروباری طور پر کامیاب ثابت نہیں ہوئیں مگر بامبے ٹاکیز کی کسی ایک فلم کو بھی غیر معیاری کبھی نہیں کہا گیا۔دراصل ہندوستانی فلموں کے ابتدائی دور میں مکالمہ نویس پنڈت ہوتے تھے یا منشی۔ پنڈت رائٹر کے لکھے ہوئے مکالموں کی زبان سنسکرت آمیز ہندی ہوتی تھی اور منشی قسم کے فلم کار کے لکھے ہوئے مکالمے فارسی آمیز اردو میں ہوتے تھے اور ان کا انداز اسٹیجی ہوتا تھا۔ چنانچہ منروا موی ٹون کی اکثر فلموں میں ایک مخصوص قسم کی بنگالی مزاج کی ہندی پائی جاتی تھی پونے کی پربھات فلم کمپنی کی فلموں کی ہندی کا مراہٹی والا لب ولہجہ تھا۔ بامبے ٹاکیز کی فلموں کا عام فہم ہونا ہمانسورائے اور دیویکارانی کی اس پالیسی کا نتیجہ تھا کہ فلم کی زبان ہر اعتبار سے ہندوستانی ہو۔ چنانچہ روزمرہ کی سادہ زبان صرف بامبے ٹاکیز کی فلموں کی ہوتی تھی۔اس سے فلم کا عوام سے براہ راست رشتہ قائم ہو جاتا تھا! اچھی موسیقی بھی ایک بڑی وجہ تھی کہ جس نے بامبے ٹاکیز کی فلموں کو ایک امتیاز بخش دیا تھا۔سرسوتی دیوی رام چندر پال، انل بسواس، پنّا لال گھوش اور ارون کمار کی ڈھولک وغیرہ۔

ممتاز علی اور میڈیم آزوری کے ناچ نے اور پردیپ۔ایس۔کشیپ ممبئی اور بھگوتی چرن ورما کے ہلکے پھلکے گیتوں نے بڑا کمال دکھایا تھا۔اگر چہ ٹاکیز میں پلے بیک سسٹم کی سہولت موجود تھی مگر بامبے ٹاکیز کی فلموں کے زیادہ تر گانے ان فلموں میں کام کرنے والے اداکاروں ہی نے گائے ہیں۔دیویکارانی، اشوک کمار، لیلا چٹنس رینوکا دیوی، ارون کمار، سنبہ پربھا، پردھان ارسریش وغیرہ نے اپنے گانے خود ہی گائے تھے۔سرسوتی دیوی کا آرکسٹرا بھی آج کا پرشور آرکسٹرا نہیں تھا بلکہ صرف طبلے، سارنگی، ستار اور جل ترنگ پر مشتمل تھا۔بمبئی ٹاکیز کی ہر فلمی کہانی دل چسپ ہونے کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی اعتبار سے اصلاحی ضرور ہوتی تھی۔مزاح ہمیشہ صاف ستھرا اور پاکیزہ ہوتا تھا۔

مثالی ڈسپلن: جہاں تک ڈسپلن کا تعلق ہے ہمانسورائے اور دیویکارانی نے بامبے ٹاکیز کو اپنے وقت میں ملک کا ایک منفرد فلم ساز ادارہ بنا دیا تھا۔اسٹوڈیو کے ہر فرد کو باقاعدہ مکمل لباس پہننے کا حکم دیا تھا۔ڈاکٹر سوریہ کانت بھٹ (ایم۔بی۔بی۔ایس) اسٹوڈیو کے تین سو ملازمین کے میڈیکل چیک اپ کے لئے ہر تیسرے دن اسٹوڈیو میں آتے تھے ان سے دیویکارانی نے ابتداء ہی میں کہہ دیا تھا کہ:

’’آپ ایک ذمہ دار عہدے کے مالک ہیں۔آپ کو ہمیشہ ایک مکمل لباس میں اسٹوڈیو میں آنا ہوگا۔آپ نوجوان ہیں اور آپ کے پیشے کی ابتداء ہے۔اس لئے آپ کا کردار بے داغ ہونا چاہئے۔خصوصی طور پر اسٹوڈیو کے خواتین کے ساتھ۔‘‘

صاف ستھرے اور مکمل لباس پہننے،مہذب اور شائستہ عادات کے بنا پر دیویکارانی،دلیپ کمار کو بہت پسند تھیں۔مگر ایک دن جب دلیپ کمار اسٹوڈیو کے اوقات میں سہ پہر کے شو میں (بمبئی) میٹرو سنیما میں دیکھے گئے تو سزا کے طور پر دلیپ کمار کی ایک دن کی تنخواہ کاٹ لی گئی۔اس شو میں خود دیویکارانی اپنے غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ موجود تھیں۔دلیپ کمار کو بلا کر خوشی سے اپنے مہمانوں سے تعارف کرایا اور پھر سختی سے حکم دیا۔’’ابھی اسٹوڈیو واپس جاؤ!‘‘ راج کپور جوان دنوں امیہ چکرورتی کے تیسرے اسسٹنٹ تھے اور بامبے ٹاکیز کی اکثر فلموں جوار بھاٹا،ہماری بات) میں چھوٹے چھوٹے رول بھی ادا کرتے تھے،اسٹوڈیو پابندی سے نہیں آتے تھے۔چنانچہ اطلاع پانے پر دیویکارانی نے راج کپور کی خوب سرزنش کی،

بامبے ٹاکیز کی اسٹاف کو ہر قسم کی سہولت دی گئی تھی،بچوں کے لئے اسکول تھا ڈسپنسری تھی،کینٹین تھا اور جنرل اسٹور بھی تھا۔جہاں اسٹاف کے کسی بھی فرد کو واؤچر کے ذریعے کھانے پینے کا سامان مل سکتا تھا۔اور واؤچر کی رقم پہلی تاریخ کو تنخواہ میں سے کاٹ لی جاتی تھی۔جب فلم مکمل ہوجاتی اور پریمئر ہوتا تو یونٹ کے تمام لوگ پکنک منانے جاتے تھے۔بامبے ٹاکیز اپنے ملازمین کیلئے گھر جیسی جگہ تھی اور دیویکارانی ایک بزرگ ماں کی طرح سب کی فکر کرنے والی۔دیویکارانی کے سکریٹری گوسوامی نے ایک بار کام کی زیادتی اور اپنی صحت کے متاثر ہونے کی شکایت جب دیویکارانی سے کی تو انہوں نے اسٹوڈیو کے کینٹین سے گوسوامی کے لئے صبح میں ایک گلاس دودھ اور دوپہر میں آملیٹ پڈنگ (فری) سپلائی کرنے کا آرڈر دے دیا۔دوسری بڑی جنگ کے دوران جب مہنگائی بڑھنے لگی تو دیویکارانی کے حکم سے (اسٹاف کے مطالبے کے بغیر) اسٹاف کی تنخواہوں میں اضافہ کردیا گیا۔پچھلے دن کی سوٹنگ کے رشیز اگلے دن اس فلم کا پروڈیوسر،ڈائریکٹر ایڈیٹر ہی دیکھ سکتا تھا۔کسی دوسرے فرد کو حتیٰ کہ دیویکارانی یا دیویکارانی جیسی ہیروئن کو بھی اپنے فلم کے رشیز دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔جہاں تک ڈسپلن کا تعلق ہے،دیویکارانی بڑی سخت گیر خاتون تھیں۔

مخصوص عادتیں : ہندوستانی سماج کے اونچے طبقے سے نکل کر فلمی دنیا میں قدم رکھنے والی

دیویکارانی پہلی خاتون تھیں،وہ پہلی تربیت یافتہ اداکارہ بھی تھیں اور کسی غیر ملکی فلم میں اور غیر ملکی زبان میں فلم میں کام کرنے والی بھی وہ پہلی ہندوستانی ایکٹریس تھیں۔اسی بنا پر دیویکارانی کو فلمی دنیا کی خاتون اوّل کہا گیا اور یہی وجہ تھی کہ پبلسٹی میں ان کے نام سے پہلے ’’بین الاقوامی شہرت یافتہ‘‘ لکھا جاتا تھا___

دیویکارانی ہی سے تحریک پاکر اناکشی راماراؤ (ایم۔اے) دُرگا رکھوٹے (بی۔اے) رینوکا دیوی (علی گڑھ کی خورشید عبداللہ) جیسی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باعزت گھرانوں کی خواتین اپنے سماج کے بندھنوں کو توڑ کر فلمی دنیا میں آئیں____

دیویکارانی کو اپنی شاپنگ خود کرنے کا شوق تھا۔وہ اکثر نرنجن پال کی بیوی (جن کو وہ بھابھی کہتی تھی) کے ساتھ کیڈل روڈ (ماہم،بمبئی) کے بازار جاتی تھیں،خصوصی طور پر مچھلی وہ خود خریدتی تھیں۔اگرچہ ’’اچھوت کنیا‘‘ کی مقبولیت کے بعد وہ بازار میں پہچانی جانے لگی تھیں،مگر شاپنگ کے لئے گھر سے باہر جانے کا سلسلہ ختم نہیں کیا تھا۔ایسے موقعوں پر مسٹر ٹیمپل کار ڈرائیو کرتے تھے۔مسٹر ٹیمپل کو دیویکارانی پیار سے ’’ڈکی ڈیڈی‘‘ کہتی تھیں!

دیویکارانی اپنے سراپا اور اپنی ہئیت کی دل کشی کو بنائے رکھنے کا بڑا خیال رکھتی تھیں۔وہ اپنے بیڈروم سے مکمل میک اپ کئے بغیر باہر نہیں آتی تھیں۔انہوں نے اپنی عمر کے آخری دنوں تک پندرہ دن میں ایک بار کمرشیل اسٹریٹ (بنگلور) کے اپنے ایک پسندیدہ بیوٹی پارلر جانے کا سلسلہ برقرار رکھا۔وہ امریکن سگریٹ پینے کی شوقین تھیں۔مگر سگریٹ ہمیشہ ہولڈر میں لگا کر پیتی تھیں۔اور یہ بھی اعتراف کرتی تھیں کہ سگریٹ نوشی ایک غیر نسوانی شوق ہے۔دیویکارانی کی عادتیں قطعی طور پر ان کی اپنی تھیں اور ان کے اصول بھی منفرد تھے،جن پر وہ سختی سے کاربند رہتی تھیں۔اگرچہ وہ مغرب میں پروان چڑھی تھیں،مگر انہوں نے اپنی پوری زندگی میں مغربی لباس کبھی نہیں پہنا،حد یہ کہ کسی فلم میں بھی نہیں۔ہمانسو رائے صبح ساڑھے سات بجے اسٹوڈیو پہنچ جاتے تھے مگر دیویکارانی ساڑھے آٹھ بجے اسٹوڈیو پہنچنے کا سلسلہ شروع کیا۔ایک سے تین تک وہ لنچ کے لئے وقفہ کرتی تھیں!

دیویکارانی جب دہلی آتیں تو جن پتھ کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ایک مخصوص اور پسندیدہ کمرے میں قیام کرتیں،جسے وہ ’’دہلی ہوم‘‘ سمجھتی تھیں۔انہیں پھولوں اور پھلوں کا بہت شوق تھا۔ان کے کمرے کے

گلدان پھولوں سے اور بڑے پھلوں سے بھرے رہتے تھے۔انہیں سیاست سے کوئی دل چسپی نہیں تھی، وہ نہ اخبار پڑھتی تھیں اور نہ ریڈیو سنتی تھیں۔کسی سے گاندھی جی کی شہادت کی خبر سن کر انہوں نے چند دن ریڈیو سے خبریں ضرور سنی تھیں۔ان کا کہنا تھا کہ ''میں یقین نہیں کر سکتی کہ کوئی ہندو، مہاتما گاندھی کو قتل کر سکتا ہے!''

ہمانسورائے اور دیویکارانی میں، ہمانسورائے کو زیادہ محبت تھی، دوسرے شوہر مسٹر رورک سے دیویکارانی کو زیادہ محبت تھی۔فون آنے پر وہ ہمیشہ یہی جواب دیتیں کہ ''جی ہاں! میں مسز ردرک بول رہی ہوں!'' وہ اپنے شوہر مسٹر ردرک کو ''صاحب'' کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔مسٹر ردرک انہیں ''میڈم'' کہہ کر پکارتے تھے اور ملازمین کا عملہ انہیں ''رانی صاحبہ'' کہتا تھا۔

دیویکارانی خاصی مردم شناس بھی تھیں۔انہوں نے بمبئی والوں کے لئے لاہور سے ممتاز شانتی کو دریافت کیا۔بے بی ممتاز (جو بعد میں مدھوبالا بنیں) کو بھی انہوں نے ہی موقع دیا۔ان دونوں کو انہوں نے اپنی فلم ''بسنت'' میں پیش کیا۔دیویکارانی کی سب سے بڑی دریافت دلیپ کمار ہے۔دیویکارانی کے فیملی ڈاکٹر یوسف خان کو دیویکارانی سے متعارف کرایا۔دیویکارانی نے یوسف خان کے چھپے ہوئے فن کو پہچان کر فوراً منتخب کر لیا اور بھگوتی چرن ورمانے نے یوسف کو دلیپ کمار جیسا نام دیا!''

قدرِ جوہر: ۱۹۵۸ء میں دیویکارانی کو فلمی فن سے متعلق ان کی خدمات کے صلے میں حکومتِ ہند پدم شری کے اعزاز سے نوازا۔۱۹۷۰ء میں ان کو دادا بھائی پھالکے ایوارڈ دیا گیا اور ۱۹۸۹ء میں انہیں سویٹ لینڈ ایوارڈ بخشا گیا۔قومی رہنما میں سروجنی نائیڈو دیویکارانی کی سب سے بڑی مداحِ تھیں۔دیویکارانی کی فلم ''اچھوت کنیا'' دیکھ کر تو مسز نائیڈو اس حد تک لہلوٹ ہوئیں کہ وہ اصرار کر کے پنڈت نہرو کو بمبئی کے راکسی سنیما میں ''اچھوت کنیا'' دکھانے لے گئیں اور پنڈت جی کو بھی فلم اور فلم کی ہیروئن دیویکارانی اس حد تک پسند آئی کہ انہوں نے ایک ذاتی خط لکھ کر دیویکارانی کو مبارکباد دی۔۱۹۳۶ء کے کانگریس اجلاس میں بھی ''اچھوت کنیا'' کو گاندھی جی کے آدرشوں پر بنی ہوئی فلم قرار دیتے ہوئے کانگریس کے ہائی کمان کو دکھایا گیا۔''اچھوت کنیا'' کے بعد دیویکارانی کی فلم ''ساوتری'' جب الہ آباد میں ریلیز ہوئی تو پوری نہرو فیملی نے ایک ساتھ یہ فلم دیکھی اور بامبے ٹاکیز کے یونٹ نے اس موقع کو فلم بند بھی کیا۔یہی نہیں بلکہ بعد میں نہرو فیملی اور ردرکِ فیملی ایک دوسرے کی دوست بن گئیں۔پنڈت نہرو اور اندرا گاندھی

جب کُلّو جاتے تھے وہ ردرک فیملی ہی کے مہمان بنتے تھے!

جن دنوں لارڈ برابروَن بامبے پریذیڈنسی کے گورنر تھے، وہ نوجوان تھے اور کنوارے بھی۔مسٹر ٹیمپل کے توسط سے وہ دیویکارانی سے متعارف ہوئے۔وہ دیویکارانی کے مداح اور بے تکلف دوست بن گئے۔اکثر رات میں مالابار پر واقع گورنر ہاؤس سے تنہا اپنی کار باہر نکالتے اور سیدھے ملارڈ پہنچتے اور بامبے ٹاکیز اسٹوڈیو میں شوٹنگ دیکھتے اور دیویکارانی کے ساتھ ڈنر کھاتے۔

ایس۔ایم۔ساگر کی فلم ''ان پڑھ'' کی شوٹنگ کے دوران ایک بار اشوک کمار ملے تو دوسری گزری ہوئی باتوں کے ساتھ بامبے ٹاکیز کا ذکر نکل آیا اور ظاہر ہے کہ پھر دیویکارانی کا ذکر ناگریز تھا۔میں نے اشوک سے دریافت کیا کہ ''دادامنی! آپ نے کئی فلموں میں دیویکارانی کے مقابل مرکزی کردار ادا کیا ہے آپ بہتر طور پر بتا سکتے ہیں کہ دیویکارانی کی اداکاری کس معیار کی تھی؟ اشوک کمار نے بڑی ناگواری سے جواب دیا:

''وہ کبھی بھی ایک اچھی آرٹسٹ نہیں رہیں۔ان سے اچھی آرٹسٹ تو لیلا چٹنس تھیں۔''

مجھے اشوک کمار کے اس جواب سے بڑی حیرت ہوئی۔اس لئے کہ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۵ء کے زمانے میں متفقہ طور پر پرتھوی راج کپور کو بہترین اداکار اور دیویکارانی کو بہترین اداکارہ مانا جاتا تھا۔میں نے دیویکارانی ہی سے متعلق اشوک کمار سے ایک سوال کیا کہ ''اچھا یہ بتائے دادامنی! کہ وہ اپنے ادارے بامبے ٹاکیز کی منظّم کیسی تھیں؟'' اشوک کمار نے اپنے اسی ناگوار لہجے میں جواب دیا:

''دیویکارانی بمبئی ٹاکیز کی منتظم نہیں، باس (آقا) تھیں۔وہ اپنا باسزم جتاتی تھیں۔خصوصی طور پر مجھ پر۔انہوں نے مجھے کبھی عزت سے مخاطب نہیں کیا۔وہ ''آپ سے نہیں، تو سے مجھے مخاطب کرتی تھیں!''

یہ جواب پا کر مجھے اور زیادہ حیرت ہوئی۔کچھ دن بعد مجھے کسی نے بتایا کہ اگرچہ اشوک کمار نے دیویکارانی کے ساتھ آٹھ فلموں میں کام کیا۔مگر ان دونوں میں بنی کبھی نہیں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۱ء تک تو دونوں میں بول چال ہی بند رہی۔فلم ''انجان کی تکمیل کے دنوں میں امیہ چکرورتی کی کوشش سے دونوں میں وقتی طور پر اور غالباً مصلحتاً صلح ہو گئی تھی۔

آٹھ نو برس پہلے کی بات ہے کہ انگریزی ہفت روزہ، اسکرین، میں دیویکارانی سے متعلق دلیپ کمار کی جانب سے ایک مضمون شائع ہوا تھا اس میں دلیپ کمار نے کہا تھا کہ:

''وہ اپنے عہد کی مشہور ترین شخصیت تھیں اور بامبے ٹاکیز کی مرکزی شخصیت انہی کی بدولت میں فلمی دنیا میں آیا۔انہوں نے مجھے انگریزی فکشن اور ڈرامے کی ٹیکنک پر کتابیں پڑھنے کی ہدایت کی۔وہ مجھے سمجھایا کرتی تھیں کہ ڈائریکٹر کی مدد سے ایک اداکار اپنے فن کو کیسے بروئے کار لائے اور ایک ڈائریکٹر کے لئے ان کا مشورہ ہوتا تھا کہ وہ ایک آرٹسٹ کی چھپی ہوئی صلاحیت کو نمایاں کیسے کرے۔انہوں نے چند کارآمد کتابیں بھی مجھے تحفے کے طور پر دی تھیں جو آج میرا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔وہ ایک انتہائی مثالی قسم کی ذہین خاتون ہیں۔انہیں اپنے کام پر عبور حاصل ہے۔وہ ایک متوازن باوقار شائستہ،مہذب،خوب صورت،پاکیزہ اور خوش اسلوب لیڈی ہیں میں نے ان سے بے شمار مفید باتیں سیکھی ہیں۔جب شوٹنگ نہیں ہوتی تھی تو ان کی ہدایت تھی کہ میں اپنا تمام وقت اسٹوڈیو کی لائبریری میں مطالعہ میں صرف کروں۔میرا بامبے ٹاکیز میں داخل ہونا ایسا ہی تھا جیسے اسکول کی تعلیم پوری کرنے کے بعد کالج میں داخل ہوتا۔دیویکارانی کا ماں کا روپ بھی تھا۔اسٹاف کے کسی رکن کی بیٹی کی شادی ہوتی تو اس کی ایک تقریب اسٹوڈیو میں ضرور منعقد ہوتی اور مسز رائے ضرور موجود ہوتیں۔رات میں فلم کی ایڈیٹنگ جب دیر تک ہوتی وہ فلاسک بھر کر چائے یا کافی ایڈیٹنگ روم میں کام کرنے والوں کو ضرور بھجواتیں۔اگرچہ میں ان کا چہیتا تھا مگر کسی ڈسپلن شکنی کا مرتکب ہونے پر وہ مجھے بھی سزا دے دیتیں۔میں نے مسز رائے کے بعد فلمی دنیا میں ان جیسی دل کش شخصیت کی مالک،ذہین اور باوقار خاتون نہیں دیکھی۔''

روسی ہنٹر سوئٹوسلوف ردرکِ سے شادی کرنے کے بعد دیویکارانی اپنے شوہر کے ہمراہ ہماچل پردیش کے ضلع کلّو کے قصبے نگر چلی گئیں۔جہاں ان کے خسر نکولائی ردرک رہتے تھے۔لیپی نگر میں مسٹر نکولائی کی ایک پکچر آرٹ گیلری واقع ہے حکومت روس کی درخواست پر اس کو حکومت ہند نے ایک ٹرسٹ کی صورت دے دی ہے خسر کے گزر جانے کے بعد دیویکارانی اپنے شوہر کے ساتھ بنگلور آ گئیں۔بنگلور کے مقامات میں شہر سے دس کیلومیٹر دور دونوں نے ۱/۱۴۵۷ ایکٹر زمین خریدی،جس کو اس وقت کی وزیراعظم اندرا گاندھی کی خصوصی اجازت پر سیلنگ سے مشتثنیٰ قرار دیا گیا۔اس ٹاٹاگنی اسٹیٹ میں سویٹوسلوف ردرک نے اپنی اور اپنے والد کو لائی ردرک کی پینٹنگس کے لئے آرٹ گیلری قائم کی،ایگری کلچر فارم بنایا اور صندل کے درخت بھی لگائے!

ایک مختصر انٹرویو:

۱۹۸۳ء میں جب مجھے بنگلور جانے کا اتفاق ہوا تو جی میں آیا کہ اس ہستی سے ملا جائے جسے سروجنی نائیڈو جیسی عظیم شاعرہ نے ''محبت کا طلسمی پھول'' کہا تھا اور جس کا میں بچپن سے فین رہا ہوں اور جس کی اکثر فلموں کو میں نے کئی کئی بار دیکھا ہے میں نے فون سے دیویکارانی کی نرس ٹریسا گرمزا اور سیکریٹری میری جوائے سی سے رابطہ قائم کیا اور ملاقات کے لئے وقت لیا۔

میں اگلے دن صبح دس بجے ٹاٹاگنی اسٹیٹ پہنچا۔دیویکارانی کی خادمہ نے مجھے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھایا اور بولی: رانی صاحبہ آتی ہیں!''تھوڑی ہی دیر بعد دیویکارانی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔آہ!''اچھوت کنیا'' کی کستوری نے ٹاٹاگنی اسٹیٹ تک اتنا طویل فاصلہ طے کیا تھا کہ پہچانی نہیں جا رہی تھی۔سروجنی نائیڈو کے پھول کا طلسم بھی ٹوٹ چکا تھا۔اسّی برس کے بوڑھے چہرے کی جھریاں گہرے میک اپ سے بھی نہیں چھپ پا رہا تھا۔کستوری کی پیشانی کشادہ تھی مگر سامنے بیٹھی ہوئی رانی صاحبہ کی پیشانی اور بھی کھلی ہوئی تھی۔وہ کلف دار کریم کلر ساڑی میں بالکل مصر کی ممی جیسی معلوم ہو رہی تھیں۔ان کے داہنے ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ ہولڈر دبا ہوا تھا جس کو وہ اپنے لپ اسٹک لگے سُرخ ہونٹوں میں دبا کر تھوڑے تھوڑے وقفے سے کش لے رہی تھیں۔میں چند ہی لمحوں میں سارا ماضی پھلانگ گیا کہ انہوں نے ملاقات کا مقصد؟ کہہ کر مجھے چونکا دیا۔میں نے اپنا تعارف کرایا اور زور دے کر بتایا کہ میں نے ''کرما'' سے ''ہماری بات'' تک آپ کی ہر فلم دیکھی ہے۔''انجان''،پانچ بار اور ''اچھوت کنیا'' سات بار!'' یہ سن کر وہ تشکر آمیز انداز میں مسکرائیں اور روزی کو آواز دے کر کافی کے لئے کہا۔اس ملاقات کے بہت سے سوال و جواب میں سے چند سوال کے جواب ذیل میں درج ہیں۔

سوال:عوام وخواص کے لئے فلم کیسی ہونی چاہئے؟

جواب: دیویکارانی تھکا ہوا انسان سنیما جاتا ہے۔اگر وہ تروتازہ ہو کر سنیما ہال سے باہر آتا ہے تو ہم نے ایک فلم ساز کی حیثیت سے اپنا فرض صحیح طور پر اور دیانت داری سے ادا کیا ہے۔قتل،خوں ریزی اور شراب نوشی کے مناظر فلم دیکھنے والوں پر برا اثر چھوڑتے ہیں۔دہشت گردی اور اٹھا پٹخ ہم کو فلموں میں نہیں دکھانا چاہیے۔ہم

کو یہ فیصلہ پہلے کر لینا چاہیے کہ ہم اپنے ملک انڈیا کو کیسے پیش کریں نہ صرف دنیا کے سامنے بلکہ اپنے ملک میں رہنے والے اپنوں کے سامنے۔

(اب وہ سوال جو میرے ذہن میں پچھلے کئی برس سے کلبلا رہا تھا)

سوال: آپ کے ساتھ دادامنی نے آٹھ فلموں میں کام کیا ہے۔ وہ آپ کے ساتھ آخری کی چند فلموں میں تو بولڈ دکھائی دیتے ہیں۔ مگر جیون نیا، ساوتری اور حد یہ ہے کہ اچھوت کنیا میں بھی آپ کے سامنے دبے دبے رہے ہیں۔ دادامنی کے ابتدائی دور کی اداکاری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: دیویکارانی: نہیں نہیں! پہلے ہی سین کی شوٹنگ کے وقت مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اشوک میں اداکاری کی صلاحیت ہے۔ ایک ہوشیار لڑکے کے طور پر اس نے مجھے متاثر کیا تھا۔ ڈائریکٹر نے کبھی بھی اسے ایک بات دوبارہ نہیں سکھائی۔

سوال: دلیپ کمار کے ساتھ آپ نے کام نہیں کیا۔ مگر دلیپ کو متعارف آپ نے کرایا ہے۔ بہت حد تک تربیت بھی دی ہے اور ان کی پہلی دو فلمیں بھی آپ ہی نے بنائی ہیں۔ اشوک اور دلیپ میں آپ نے کیا فرق پایا؟

جواب: دیویکارانی: جہاں تک موازنے کا تعلق ہے دونوں آرٹسٹ اداکاری کی اپروچ میں بنیادی طور پر ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ اشوک کو ہینڈل کرنا آسان تھا۔ دلیپ کی گہری شخصیت کو سمجھنا پڑتا تھا۔ دلیپ کی شخصیت قطعی طور پر اپنی تھی۔ اس کا فارم بھی اپنا تھا۔ مگر دلیپ کمار ہماری انڈسٹری کا Well Read آرٹسٹ ہے۔ بہت حساس بھی۔ بہرنوع! اپنے اپنے میدان میں دونوں متاثر کرتے ہیں۔

سوال: کیا آپ وقت سے بہت پہلے فلموں سے ریٹائر نہیں ہوئیں؟

جواب: دیویکارانی: نہیں! میں ٹھیک وقت پر ریٹائر ہوئی ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے ذرا سا بھی پچھتاوا نہیں ہے۔ میرے آج کے معمولات میں، گزرے ہوئے کل کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ میری زندگی کا فلسفہ آگے کی طرف دیکھنے کا ہے۔ مڑ کر پیچھے کی طرف بالکل نہیں!

سوال: آپ کا ہم جیسے کافہم اور ناتجربہ کاروں کے لئے کوئی نیک پیغام یا مفید مشورہ؟

جواب: دیویکارانی: پڑھے لکھے انسان کو زیادہ حساس نہیں ہونا چاہیے۔ اس دنیا میں

زود رنج ہونا خسارے کا سودا ہے۔

تقریباً ۱۹۹۲ء میں دیویکارانی اور ان کے شوہر مسٹر ردرک اپنی گرتی ہوئی صحت کی بنا پر اپنی اسٹیٹ ٹاٹا گنی سے بنگلور کے اشوکا ہوٹل میں منتقل ہو گئے تھے، جہاں مسٹر رورِک تیس جنوری ۱۹۹۳ء کو نوے برس کی عمر میں گزر گئے۔ تیرہ ماہ بعد ۹/مارچ ۱۹۹۴ء کو دیویکارانی نے بھی ۸۷/برس کی عمر میں رنگ و بو کی اس دنیا کو خیر باد کہا۔ وہ اپنے دوسرے شوہر مسٹر رورک سے عمر میں چھ برس چھوٹی تھیں!

پراسرار دیویکارانی:

دیویکارانی کی وصیت تھی کہ ان کے آخری رسوم بنگالی براہمن دھرم کے مطابق انجام دی جائیں۔ ان کی چتا کی راکھ کا تھوڑا کلّو وادی میں ان کے سسر کے قریب دفن کر دی جائے۔ وہاں ایک چھوٹی سی سمادھی بھی بنائی جائے اور اس کے پتھر پر لکھا جائے۔ ''اچھوت کنیا'' اس فلم کا نام ہے جس میں دیویکارانی نے کام کیا تھا۔ اور جو ان کے پہلے شوہر نے بنائی تھی۔''

کہا جاتا ہے کہ مسٹر ردرک اور دیویکا رانی نے جو جائداد اور دولت چھوڑی وہ ۴۵۷/ایکڑ آراضی (جو ٹاٹا گنی اسٹیٹ کہلاتی ہے) کلّو میں سیب کے کئی باغ، بنگلور میں صندل کے بہت سے درخت، دو پکچر آرٹ گیلریاں، متعدد سونے کے ہار، سونے کے سکّوں کا ایک ہار، قیمتی پتھروں والی سولہ انگوٹھیاں، سونے کے متعدد بسکٹ، ۵۰ غیر ملکی سکّے، سونے اور جواہرات کی چوڑیاں، کئی کروڑ روپے کے جواہرات، قیمتی ملبوسات، سمور کے کئی کوٹ، پانچ ٹن صندل کی لکڑی، گوتم بدھ کی تبّتی اور نیپالی مورتیاں اور سوئزر لینڈ کے ایک بینک میں ۳۴ ملین ڈالر کے ایک اکاؤنٹ پر مشتمل ہے۔ دیویکارانی کی زندگی ہی میں دیویکارانی کے لاولد ہونے کی بنا پر کرناٹک سرکار نے ۵/کروڑ معاوضے کی صورت میں دے کر اس تمام املاک کو لینا چاہا تھا مگر دیویکارانی یہ کہہ کر آڑے آ گئی تھیں کہ یہ میرا اپنا گھر ہے اس پر کسی دوسرے کا حق نہیں ہے'' مگر اب دیویکارانی کے گزر جانے کے بعد کرناٹک کی حکومت نے مسٹر اینڈ مسز ردرک کی تمام املاک کو (جو ۵۰۰/کروڑ روپئے کی بتائی جاتی ہے سر بمہر کر دیا ہے۔

ننانوے کے پھیرے سے نکلئے اور ذرا غور کیجئے کہ

دیویکارانی انتہائی موڈرن اور ترقی پسند نظریات کی حامل تھیں۔ سماج کی پابندیوں کی انہوں نے کبھی

پرواہ نہیں کی۔ کتنی ہی دوسری خواتین نے ان سے تحریک لی۔ ان کی اپنی سماج سدھار فلم ''اچھوت کنیا'' کے نام سے کتبہ لگوانے کی وصیت کر کے انہوں نے مرنے کے بعد بھی اچھوت کنیا سے تعلق برقرار رکھنا چاہا، لیکن دلی طور پر وہ اپنی آخری سانس تک کٹّر پنتھی خاتون ہی بنی رہی ہیں______! وہ لاولد ہونے کے باوجود تمام زندگی قارون کے اتنے بڑے خزانے کی حفاظت کیوں کرتی رہیں؟ اس بے شمار دولت میں سے انہوں نے اچھوتوں کے سدھار کے لئے تھوڑا سا بھی خرچ کیوں نہیں کیا؟ اور نہ کوئی فلاحی ادارہ ہی قائم کیا؟

غالبًا انسان کے مزاج کا یہ خاصہ ہے کہ جوانی میں سماج کی جن قدروں سے وہ بغاوت کرتا ہے، بڑھاپے میں عموماً انہی قدروں کو وہ اپنا لیتا ہے۔

قطع نظر اس بحث طلب بات کے یہ ضرور کہا جائے گا کہ دیویکا رانی مردوں کی اس دنیا میں رضیہ سلطان جیسی بہادر خاتون تھیں، بامبے ٹاکیز ہو یا ٹاٹا گنی اسٹیٹ، نظم وضبط قائم رکھنے میں وہ بیگم حضرت محل جیسی حوصلہ مند شخصیت کی اداکارہ تھیں۔ ہندوستان کی فلمی دنیا پر ان کا بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے دلیپ کمار جیسا اداکار دیا جو ایک اچھا انسان بھی ہے۔

☆☆☆

سُروں کی ملکہ۔ لتا منگیشکر

مشتاق جاوید

متکلم فلموں کی شروعات کے بعد ہندوستانی فلموں میں موسیقی کو بے پناہ اہمیت حاصل ہوئی۔ اگر ہم پرانی فلموں کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ اس وقت کی بیشتر فلموں میں گیتوں کی تعداد پندرہ بیس سے کم نہیں ہوا کرتی تھی اور گیت اپنی خوبیوں کے باعث شائقین فلم کے دلوں کو متاثر کرتے تھے۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۵۰ء تک جن خاتون گلوکاروں نے اپنے خوبصورت گیتوں سے موسیقی کے پرستاروں کے دلوں کو گرمایا تھا ان میں جدّن بائی۔ خورشید، نرملا دیوی، کانن بالا، نسیم اختر، امیر بائی کرناٹکی، زہرہ بائی امبالہ والی، کانن دیوی، راجکماری، پارول گھوش، شمشاد بیگم، ثریا اور نور جہاں کے نام قابل ذکر ہیں۔ خصوصاً نور جہاں کی آواز کی تازگی، نغمگی، لوچ اور کھنک نے دنیائے موسیقی میں ہلچل مچا دی تھی ہر چہار طرف اس کے رسیلے گیتوں اور نشیلی آواز کا شہرہ تھا استاد جھنڈے خان، غلام حیدر، کھیم چند پرکاش، میر صاحب، خورشید انور، سجاد حسین، وسنت ڈیسائی، سی رام چندر، انیل بسواس اور موسیقارِ اعظم نوشاد سبھی نور جہاں کی بے پناہ فنکارانہ صلاحیتوں اور حسین آوازوں کو اپنی دھنوں کی زینت بنانا چاہتے تھے۔ اس لیے موسیقی کے مداح انھیں ملکۂ ترنم کے نام سے پکارتے تھے۔ لیکن جب ہمیں انگریزوں کی غلامی سے نجات ملی اور ہندوستان دو حصّوں میں تقسیم ہوگیا تو ملک کی تقسیم کی ساتھ ہمارے دانشور اور فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والی کئی معروف اور ممتاز ہستیاں بھی ہم سے جُدا ہوگئیں ایسی ہستیوں میں ایک نام نور جہاں کا بھی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد ہر طرف یہ سوال گونجنے لگا کہ نور جہاں کے بعد موسیقی کے پرستاروں کو اپنے دلکش نغموں سے کونسی گلوکارہ متاثر کرے گی؟ اب نور جہاں کی جگہ کون پُر کرے گا؟ مگر کچھ دنوں بعد ہی ایک کمسن اور شرمیلی مراٹھی لڑکی لتا منگیشکر اس مقام تک پہنچنے کی جدّ و جہد میں لگ گئی۔

مشہور کلاسیکل سنگر ماسٹر دینا ناتھ منگیشکر کی بڑی بیٹی لتا منگیشکر نے اپنی فلمی زندگی کا آغاز مراٹھی فلم ''سہیلی اور منگلا گور'' میں چائلڈ آرٹسٹ کی حیثیت سے کیا تھا۔ لتا نے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم اپنے والد سے حاصل کی تھی بطور گلوکارہ اس نے پہلی بار فلم ''آپ کی سیوا'' میں گیت گائے تھے یہ بھی مراٹھی فلم

تھی.... دینا ناتھ کی موت کے بعد پورے گھر کی ذمّہ داری لتا کے نحیف کاندھوں پر آن پڑی معاشی حالت کافی خراب تھی اسی دوران مشہور و معروف موسیقار ماسٹر غلام حیدر نے لتا کو اپنی ہندی فلم ''مجبور'' میں گانے کا موقع دیا.... جس میں انھوں نے مکیش کے ساتھ ایک دوگانا گایا۔ گیت مقبول ہوا۔ اس کے بعد لتا نے کھیم چندر' پرکاش' شیام سندر' انیل بسواس اور حُسن لال بھگت رام جیسے کہنہ مشق اور بزرگ موسیقاروں کی دھن پر کئی گیت گائے لیکن نہ تو اس کی معاشی حالت سدھری نہ ہی وہ مقبولیت ملی جس کی اسے شدّت سے تلاش تھی ___ اسی دوران لتا کی ملاقات موسیقار نوشاد سے ہوئی ۔ نوشاد اس وقت جوان تھے اور فلم انڈسٹری میں ان کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ نوشاد کی موسیقی فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ ہر بڑے فلم ساز اور گلوکار کو نوشاد کی تخلیقی صلاحیت' عظمت اور اہمیت کا شدّت سے احساس تھا۔ لتا بھی نوشاد کی سحر انگیز موسیقی سے بے حد متاثر تھیں اور ان کی دھنوں پر گانا باعثِ فخر سمجھتی تھیں۔ انھوں نے نوشاد کی موسیقی میں پہلی بار فلم ''چاندنی رات'' کے گیت گائے۔ ریہرسل اور ریکارڈنگ کے لیے انھوں نے لتا کو جب اسٹوڈیو بلایا تو وہ بارش کی پرواہ کیے بغیر نوشاد سے ملنے پہنچ گئیں۔ اتفاق سے راستے میں چپل ٹوٹ گئی اس نے اپنے پاؤں ساڑی میں چھپا لیے شاید انھیں اپنی غربت کا شدّت سے احساس تھا۔ یہ منظر دیکھ کر نوشاد کا دل دہل گیا اور آنکھیں بھیگ گئیں۔ انھیں بھی اپنا ماضی یاد آ گیا جب وہ خستہ لباس میں ملبوس روزی کی تلاش میں بمبئی کی خاک چھان رہے تھے انھوں نے لتا کے کپڑے بدلوائے۔ گرم چائے کے ساتھ ایک ٹکیہ کھلائی تا کہ آواز پر ٹھنڈا کا اثر نہ ہو۔ پھر ریہرسل کے بعد گانے کی ریکارڈنگ ہوئی وہیں سے نوشاد اور لتا لازم و ملزوم ہو گئے۔ نوشاد اور لتا کی جوڑی اس قدر کامیاب ہوئی کہ ان دو باکمال فنکاروں کے تمام گیت یادگار اور تاریخ ساز ثابت ہوئے۔ یہ جوڑی آج بھی قائم ہے۔

لتا نے ماضی اور حال کے تقریباً تمام موسیقاروں کی دھنوں پر گیت گائے ہیں۔ انھوں نے اب تک ہزاروں گیت گا کر عالمی ریکارڈ قائم کیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ لتا نے کبھی خود کو سطحی اور عامیانہ بنانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ بے شمار اعزازت سے سرفراز ہونے والی ''آواز کی ملکہ'' لتا منگیشکر کو پدم بھوشن اور دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

ہندوستانی موسیقاروں کو ہم چار دور میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے دور میں استاد جھنڈے خان، غلام

حیدر' کھیم چند پرکاش۔ آرسی بورال۔ پنکج ملک۔ میر صاحب' مدھو ماسٹر۔ ڈاکٹر پال۔ کے دتّہ۔ شیام سندر۔ انیل بسواس سی رامچندر اور خورشید انور کے نام آتے ہیں۔ دوسرا دور نوشاد۔ غلام محمد۔ چترگپت۔ اے۔ آر۔ قریشی' ایس این ترپاٹھی اور سردار ملک پر مشتمل ہے۔ تیسرے دور میں مدن موہن۔ روشن۔ شنکر جے کشن۔ خیام۔ او' پی' نیّر ۔ جے دیو۔ جمال سین۔ سلیل چودھری اور ہیمنت کمار نظر آتے ہیں۔ روی۔ این۔ دتّہ۔ آر' ڈی' برمن۔ راجیش روشن۔ انو ملک۔ آنند ملند۔ بپّی لہری۔ شو ہری۔ ستیش بھاٹیہ۔ رام لکشمن۔ دلیپ سین سمسیر سین، اتم سنگھ' ندیم شرون' راجو نوشاد کو چوتھے دور کے موسیقاروں کی صف میں رکھا جاتا ہے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۰ء تک کا زمانہ ہندوستانی موسیقی کا سنہرا زمانہ کہلاتا ہے اس زمانے میں ہمارے بیشتر موسیقاروں نے وہ دھنیں ترتیب دیں جن پر موسیقی کے پرستاروں کو ناز ہے اور جو ہماری قومی موسیقی کا سرمایہ سمجھی جاتی ہیں۔

ہماری گلوکارائیں بھی چار پیڑھیوں میں منقسم ہیں۔ پہلی پیڑھی میں جدن بائی۔ خورشید۔ نسیم اختر۔ امیر بائی۔ زہرہ بائی۔ کانن دیوی راجکماری۔ کانن بالا اور پارول گھوش کے نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ دوسری پیڑھی نور جہاں۔ شمشاد بیگم۔ ثریّا۔ اوما دیوی (ٹن ٹن) مبارک بیگم۔ گیتا دت اور لتا منگیشکر پر مشتمل ہے۔ تیسری پیڑھی میں آشا بھونسلے۔ سدھا ملہوترہ۔ جگجیت کور۔ اوشا منگیشکر۔ سمُن کلیان پور۔ شاردا۔ شانتی ماتھر۔ کمل باروت۔ کرشنا کلّے ۔ مدھو بالا۔ زویری۔ سلکشنا پنڈت اور وانی جے رام آتی ہیں۔ چوتھی پیڑھی میں انورادھا پوڈھوال۔ کویتا کرشنا مورتی۔ سادھنا سرگم۔ سونالی واجپئی انوپما دیش پانڈے' اور سپنا مکھرجی کے نام لیے جاتے ہیں۔ اگر ہم ہندوستانی فلمی موسیقی کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں تیسری اور چوتھی دہائی میں ایک خاتون موسیقار خورشید ہوم جی کی شکل میں نظر آئیں گی۔ افسوس کہ ہمارے فلم سازوں اور ہدایتکاروں نے ان کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی نہیں کی ورنہ ان کا شمار بھی نامور موسیقاروں میں ہوتا۔

نوشاد ہندوستانی فلمی صنعت کے باوقار اور قابلِ قدر موسیقار ہیں۔ انھوں نے فلموں کے ذریعہ ہندوستانی موسیقی کو بڑھاوا دینے اور بلند مقام تک پہنچانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اگر ہم لتا کے گیتوں اور نوشاد کی دھنوں کے سفر کا جائزہ لیں تو ہمیں ان کی فنّی عظمت اور کارناموں کا اعتراف ہر حال

میں کرنا پڑے گا۔ لتا اورنوشاد کی جوڑی تشکیل پاتے ہی کسی دوسری گلوکار کو وہ کامیابی نہیں ملی جو لتا کے حصّے میں آئی۔ آشا بھونسلے اور سمن کلیان پور بلاشُبّہ صاحبِ لیاقت اور اچھی گلوکارائیں ہیں۔ نوشاد نے انھیں بھی کئی بار اپنی موسیقی میں گوایا ہے۔ لیکن لتا کا دور شروع ہوتے ہی تمام پرانی گلوکاراؤں کی چمک ماند پڑ گئی۔ عوام کے دل و دماغ پر لتا کی حکمرانی باقی رہ گئی اورنوشاد کی بیشتر فلموں کی دھنوں میں صرف لتا کی آواز سنائی دینے لگی' جادو' انداز' بابل' آن' دیدار' بیجو باوَرا' مدر انڈیا اور مغلِ اعظم میں شمشاد بیگم ایک دو گیتوں کے ساتھ ہی نوشاد کے ساتھ نظر آتی ہیں جبکہ ان فلموں کے بیشتر گیت لتا نے گائے ہیں مثلاً: لو پیار کی ہوگئی جیت۔ گِن گِن تارے (جادو) تیر کھاتے جائیں گے (دیوانہ) اے دل تجھے قسم ہے (دلاری) کوئی میرے دل میں۔ اُٹھائے جا ان کے ستم (انداز) لگن وغیرہ۔

محمد عبدالسلام لکھتے ہیں کہ۔

لتا منگیشکر کی آواز میں ایسا جادوئی کرشمہ تھا کہ وہ سرحدوں کی دوریوں کو مٹاتی چلی گئی انہیں اس بات کا اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے ملک کے تقریباً سبھی قابل فخر اعزازات حاصل کئے جن میں پدم شری، پدم بھوشن، پدم وی بھوشن، دادا صاحب پھالکے کے علاوہ انہوں نے بھارت رتن بھی حاصل کیا۔ وہ راجیہ سبھا کی رکن بھی ہیں۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے انہیں انمول ہیرے سے تعبیر کیا تھا جب انہوں نے ہندستان چین کے جنگ کے دوران شہید ہوئے فوجی نوجوانوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ''اے میرے وطن کے لوگوں'' گیت گایا تھا اس گیت کو سننے کے بعد جواہر لال نہرو کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

☆☆☆

مغلِ اعظم کی جودھا بائی۔ درگا کھوٹے

خورشید اختر فرازی

فلموں کے کچھ کردار ایسے ہوتے ہیں جو دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں اور کچھ اداکار ایسے ہوتے ہیں جو ذہن و دل پر ایک ایسا انمٹ تاثر چھوڑ جاتے ہیں جو کبھی مِٹ نہیں پاتے بلکہ جب جب بھی ان کی یاد آتی ہے یا ٹھیٹر اور ٹیلی ویژن پر ان کی فلمیں دکھائی جاتی ہیں تو ایک ایسا جذباتی تاثر اور لگاؤ پیدا ہوتا ہے کہ دل مسوس کر رہ جاتا ہے کہ وہ اب ہمارے درمیان نہیں۔ اشوک کمار، موتی لال، پرتھوی راج، بلراج ساہنی، مدھو بالا۔ کشور کمار، محمد رفیع، مکیش، شنکر جے کشن، روشن، جانی واکر، جینت، مقری، بھگوان دادا۔ پریہ راج ونش، وجے اروڑا، مجروح، حسرت، شیلندر، آرڈی برمن اور ایس ڈی برمن، نوشاد علی، راج کپور، چیتن اور وجے آنند، کیشٹو مکھرجی، اتپل دت، اتم کمار، ثریا، نور جہاں۔ للیتا پوار، نوتن، پروین بابی، کمال امروہی، مینا کماری، گیتا دت، گرودت، رحمٰن، جیون، منموہن، جینت، امجد خان، بی آر چوپڑہ۔ شنکر جے کشن، سلیل چودھری، راجندر کمار، سہراب مودی، محمود یہ سارے چہرے گزشتہ تیس پینتیس برسوں کے دوران نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ انہوں نے برسوں اپنی فنکاری کے ذریعہ لوگوں کے دل کو بہلایا اپنی من موہنی صورت، خوبصورت اداکاری، مردانہ وجاہت کے ذریعہ لوگوں کو متاثر کیا اور برسہا برس تک انھوں نے اپنی فنکاری کے جوہر دکھائے اور روپوش ہو گئے لیکن ان کی یادیں لوگوں کے دلوں میں ابتک قائم ودائم ہیں اور انہیں کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ایسے ہی ادکاروں میں ایک اداکارہ درگا کھوٹے بھی تھی جس کی اداکاری میں ایک شان ایک آن بان ہوا کرتی تھی جب وہ مظلوم ماں یا دادی کا رول ادا کرتی تھی سنیما ہال کے اندر لوگوں کی آنکھیں بھیگی رہتیں اور ہر کسی کو اس کا احساس ہوتا کہ وہ اس کے اپنے گھر کی بزرگ ہیں جن کے ساتھ ایسی ناانصافی اور بے قدری ہو رہی ہے، اس کی سب سے بڑی وجہ تھی کہ درگا کھوٹے کی اداکاری بالکل نیچرل اور سادگی سے بھرپور ہوا کرتی تھی اور دیکھنے والے اپنے دل میں یہ جذبہ ضرور رکھتے تھے کہ سلور اسکرین پر آنسو بہا رہی یہ ضعیفہ کوئی اور نہیں بلکہ اس کے اپنے گھر کی کوئی فرد ہے۔ کے آصف کی فلم ''مغلِ اعظم'' میں جودھا بائی کا کردار اس نے جس خوبصورتی

کے ساتھ ادا کیا تھا اس کی وجہ سے درگا کھوٹے زندہ جاوید ہوگئی۔ کے آصف کی بلیغ نظروں کی داد دینی پڑے گی جو انھوں نے اس اہم ترین رول کے لئے درگا کھوٹے کا انتخاب کیا، ورنہ اس بارعب، خوددار عورت کے رول کے لئے اس وقت کی مشہور اداکارہ وینا کے چہرے پر رعب اور دبدبہ ضرور تھا لیکن آنکھوں میں مشفقانہ آنسو اور ہونٹوں پر مادرانہ محبت والی مسکراہٹ نہیں تھی اور وینا نے جن فلموں میں بھی کام کیا ان میں شاید ہی وہ کسی منظر پر مسکراتی نظر آئی ہو۔ فلم مغلِ اعظم میں درگا کھوٹے کو خاص طور پر پانچ سینئر اداکاروں کا مقابلہ کرنا تھا جس میں ان کے شوہر کے رول میں پرتھوی راج کپور (شہنشاہ اکبر) بیٹے کے رول میں دلیپ کمار (شہزادہ سلیم) اور اس کی محبوبہ کی شکل میں مدھوبالا (انارکلی) اور یہ سبھی اپنے وقت کے پہاڑ جیسے اداکار تھے لیکن ان کے درمیان بھی درگا کھوٹے نے جس بہترین اداکاری کا مظاہرہ کیا اس کی مثال دی نہیں جا سکتی ہے۔

درگا کھوٹے اپنے دور کی عظیم ترین اداکارہ تسلیم کی گئی تھی انھوں نے تقریباً ۵۰ سے زائد سال فلموں میں کام کئے اور تقریباً ۲۲۰ فلمیں کیں۔ ۲۰۰۰ میں جب اس کے بارے میں پتہ چلایا گیا کہ ہندوستانی خواتین میں وہ کون ہے جو ۱۵۰ اعلیٰ اور منفرد فلمی خاتون میں شامل ہے تو اس میں ایک نام درگا کھوٹے کا بھی آیا تھا۔ دیگر میں نرگس، مینا کماری، مدھو بالا، مالا سنہا، نوتن، ثریا، نور جہاں، نمی اور کامنی کوشل ہیں۔

ہندی فلموں میں ماں کا رول ادا کرنے والی ۱۰ ماؤں میں یہ مقابلہ کرایا گیا تھا کہ للیتا پوار، سلوچنا، نیروپا رائے، مردولا، روہنی ہتنگڑی، اچلا سچدیو، لیلا چٹنس، لیلا مشرا، درگا کھوٹے اور بینا رائے کے درمیان سب سے بہتر ماں کے رول میں کون فٹ ہے تو پہلا نمبر لیلا چٹنس اور درگا کھوٹے کو ملا اور تیسرا نمبر للیتا پوار کو دیا گیا۔ درگا کھوٹے نے ۱۹۴۱ء میں چرنوں کی داسی، مرزا غالب، ۱۹۵۴ء، بابی ۱۹۷۳ء، بدائی ۱۹۷۴ء، دادی ماں ۱۹۶۷ء، اور ۱۹۷۵ء میں قرض میں یادگار رول ادا کیا تھا درگا کھوٹے کو ہندی فلم کے لئے سب سے پُر وقار ایوارڈ دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا اور ۱۹۸۳ء میں انہیں تاحیات کارنامے کی وجہ سے ایوارڈ دیا گیا۔ ۱۹۹۱ء میں ۸۶ سال کی عمر میں یہ عظیم اداکارہ چل بسی لیکن مغلِ اعظم، قرض، مرزا غالب بدائی اور دادی ماں جیسی فلموں میں بے مثال اداکاری کرنے والی درگا کھوٹے آج بھی ہمارے درمیان ہمارے دلوں میں موجود ہے اور انہیں کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے وہ گوڑ خاندان میں جو کہ ایک برہمن خاندان تھا اسی میں پیدا ہوئی اور ۲۶ سال کی عمر میں اس کا شوہر اسے دو بچوں کی ماں بنا کر چل

بسا تھا۔ اس نے اپنے دونوں بچّوں کی پرورش کی خاطر فلموں میں کام کرنا شروع کیا تھا۔

کریر کے ابتدائی سال

درگا کھوٹے نے ۱۹۳۱ء میں چھوٹے چھوٹے کرداروں کے ساتھ اپنے فلمی کیریر کا آغاز کیا اور پربھات فلم کمپنی کی خاموش فلم ''فریبی جال'' سے شروعات کی پھر ۱۹۳۲ء میں مایا مچھندر نامی خاموش فلم میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ لیکن جلد ہی انہیں ترقی ملی اور ۱۹۳۲ء ہی میں بیک وقت دو زبانوں (ہندی اور مراٹھی) میں بنی فلم ''ایودھیا شی راجہ'' میں انہیں ہیروئن کا رول ملا۔ یہ بھی پربھات فلم کی پیشکش تھی اور یہ فلم سپرہٹ ثابت ہوئی تھی۔ اس فلم میں درگا کھوٹے نے رانی تارامتی کا رول نبھایا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک درجن سے زیادہ فلموں میں بیوہ کا رول ادا کیا۔ انھوں نے پربھات فلمز کے ساتھ معاہدہ بند ہونے کے باوجود اسٹوڈیو سسٹم سے اپنے آپ کو دور رکھا۔ انھوں نے اپنا مطالبہ پیش کر دیا کہ انہیں ماہانہ تنخواہ دی جائے اور یہ اگر انہیں منظور ہے تو ٹھیک ورنہ وہ کوئی دوسری اداکارہ کھوج لیں۔ ۱۹۳۷ء میں درگا کھوٹے نے فلم ''ساتھی'' کی ہدایت وفلمسازی بھی کی اور ہندوستانی سینما میں وہ پہلی خاتون ہدایتکار بنیں جس کا شور پورے ملک میں ہوا۔ ۴۰ کی دہائی نے درگا کھوٹے کی کامیابیوں کی راہیں کھول دیں جب ۱۹۴۱ء میں انھوں نے سپرہٹ فلم ''چرنوں کی داسی'' اور وجے بھٹ کی کلاسیکل فلم ''بھرت ملاپ'' میں ہیروئن کا کردار ادا کیا۔ ان دونوں فلموں میں انہیں بنگال فلمز جرنلسٹ ایسوسی ایشن (بی ایف جے اے) کا ایوارڈ دو برسوں کے دوران دیا گیا۔

درگا کھوٹے نے کئی برسوں تک اپنے آپ کو تھیٹر کی دنیا سے بھی وابستہ رکھا اور ممبئی کے مراٹھی تھیٹر سے ان کی خاص وابستگی رہی۔ اس کے علاوہ انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن سے بھی خود کو وابستہ رکھا اور انگنت ڈراموں میں کام کیا اور ممبئی مراٹھی ساہتیہ سنگھ کے ساتھ اٹوٹ رشتہ بنائے رکھا۔ شیکسپیئر کا ڈرامہ میکبیتھ پر مبنی لیڈی میکبیتھ (راج مکٹ) میں انھوں نے مرکزی کردار ادا کیا۔ نانا صاحب پھاٹک کے ساتھ ''دی رائل کراؤن'' میں بھی اہم رول ادا کیا۔

کیریر کا درمیانی سال

درگا کھوٹے نے ہندی فلموں اور ہندی مراٹھی ڈراموں میں برسہا برس تک کام کیا اور کبھی بھی ان کے نام کے ساتھ کوئی اسکینڈل نہیں جڑا۔ ان کی وجہ سے کئی نسلوں کی ہیروئنوں کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا موقع ملا۔ خاص طور پر سوبھنا سمراٹ (والدہ نوتن۔تنوجہ) نے کھلے عالم اعتراف کیا کہ فلموں اور تھیٹر میں ان کی کامیابی کا اصل راز درگا کھوٹے ہے، ویسے شوبھنا سمراٹ کے ساتھ کئی اسکینڈل شامل رہے اور موتی لال، سہراب مودی جیسے فنکاروں کے ساتھ ان کا نام ہمیشہ جڑا رہا۔

۱۹۵۰ء کی دہائی میں درگا کھوٹے نے معاون اداکارہ کے رول کرنا شروع کر دیئے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں ریلیز کے آصف کی ناقابلِ فراموش کلاسیکل فلم ''مغلِ اعظم'' میں اس نے جودھا بائی کا کردار ادا کیا تھا۔ ۱۹۷۳ء میں راج کپور کی فلم ''بابی'' میں اس نے ڈمپل کپاڈیہ کی نانی کا رول ادا کیا تھا اور ۱۹۷۴ء میں ایل وی پرساد کی فلم ''بدائی'' میں جتندر کی ماں کا رول کیا اور ۱۹۷۵ء میں سبھاش گھئی کی فلم ''قرض'' میں راج کرن اور ابھا دھولیہ کی ماں کا کردار ادا کیا تھا۔ راج کرن کے قتل کے بعد اس کا دوسرا جنم رشی کپور کی شکل میں ہوتا ہے۔ ۱۹۷۵ء ہی میں رشی کیش مکھر جی کی فلم ''ابھیمان'' میں امیتا بھ بچن کی آنٹی کے رول میں بھی انھوں نے بیحد متاثر کیا تھا۔ فلم ''بدائی'' میں انتہائی جذباتی اور متاثر کن رول ادا کرنے پر انہیں بہترین معاون اداکارہ کے طور پر فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

۱۹۶۳ء میں ڈرگا کھوٹے نے مرچنٹ ایوری کی انگریزی فلم ''ہاؤس ہولڈر'' میں کام کیا بالکل یہی رول اپرنا سین کی فلم ۳۶ چورنگی لین میں ششی کپور کی مرحوم اہلیہ جینفیر کپور نے بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ ادا کیا تھا۔ درگا کھوٹے نے دوردرشن کے لئے ٹی وی سیریل بھی تیار کئے جس میں ''واگلے کی دنیا'' بہت ہی مشہور ہوئی تھی۔ بعدازاں انھوں نے مراٹھی زبان میں اپنی سوانح عمری بھی لکھی جسے انگریزی میں ترجمہ کیا گیا جس کا عنوان ''آئی درگا کھوٹے'' رکھا گیا۔ زندگی کے آخری سالوں میں وہ علی باغ بیچ میں رہنے لگی تھیں جو ممبئی سے قریب ہے اور وہیں ۲۲ ستمبر ۱۹۹۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔

ان کی شادی ایک راسخ العقیدہ برہمن خاندان میں ہوئی تھی اور اس شادی سے ان کے دولڑکے باکول اور ہارین پیدا ہوئے۔ درگا کھوٹے نے تھیٹریکل دنیا کے شہنشاہ وجے مہتہ سے شادی کی تھی لیکن شادی کے ۶

سال بعد ہی وجے مہتہ کا انتقال ہوگیا جس کے بعد انھوں نے محمد رشید نام کے ایک شخص سے دوسری شادی کی مگر یہ شادی کامیاب نہ ہوسکی۔ آج ان کے پوتے اور بھانجے خود بھی مشہور فلمساز اور ٹی وی ڈائریکٹر ہیں اور جودھا اکبر اور لائف ان اے میٹرو جیسی فلم پیش کر چکے ہیں درگا کھوٹے کے بھائی نندو کھوٹے خاموش فلموں میں کام کرتے تھے جن کی بیٹی شوبھا کھوٹے مشہور اداکارہ بنی اور بھائی وجو کھوٹے جس نے فلم شعلے میں کالیا کا کردار ادا کیا تھا۔ شوبھا کھوٹے نے اومید چکرورتی کی فلم سیما (۱۹۵۵ء) میں پہلی مرتبہ بلراج ساہنی اور نوتن کے ساتھ کام کیا تھا۔ شوبھا کھوٹے کی بیٹی، بھاڑنا بالسا ور بھی ایوارڈ یافتہ ٹی وی آرٹسٹ ہے۔

ایوارڈ: درگا کھوٹے کو ۱۹۴۲ء میں بہترین اداکارہ کا ایوارڈ۔ ''چرنوں کی داسی'' میں ملا۔ ۱۹۴۲ء بھرت ملاپ میں دوسری مرتبہ ایوارڈ ملا۔ ۱۹۵۸ء سنگیت نائک اکاڈمی ایوارڈ۔ ۱۹۶۸ء پدما شاری۔ ۱۹۷۴ء (فلم بدائی) ۱۹۸۳ء۔ داداصاحب پھالکے ایوارڈ۔

☆☆☆

بیگم اختر: کلاسیکی غزل کی آبرومند آواز

رشیدانجم (بھوپال)

سرتاپا لکھنوی تہذیب کی زندہ مثال تھیں بیگم اختر۔ پانچ فٹ سے کچھ کم درمیانہ قد اور دل کش شخصیت کی مالک بیگم اختر۔ ان کے چہرے کی کشش کو دوبالا کرتی ناک میں دمکتی ہیرے کی لونگ۔ ہارمونیم پر ہونٹوں سے آداب کے لفظ ادا ہوتے تو سامعین ان کی غزل گائیکی سے زیادہ ان کے شائستہ انداز کے گرویدہ ہو چکے ہوتے تھے۔ داہنے ہاتھی کی انگلی میں پہنی انگوٹھی کا عقیق۔ کالی آنکھوں میں تیرتی آسمانی بدلیاں۔ جسم ساڑی اور اس پر شال سے ڈھکا ہوا بے حد نفیس نسائی انداز سے ساڑی کے پلو یا شال کو جسم کے گرد لپیٹتے ہوئے ان کی خوش سلیقگی کا متین سا اظہار ہوا کرتا تھا۔

بیگم اختر ریاست اودھ کی اولین راجدھانی فیض آباد میں ۷/ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئی تھیں۔ بیڑنیوں اور نٹوں کا یہ خاندان گلے میں پیٹی ڈالے، ڈھولک لٹکائے شہر شہر قصبہ قصبہ اور گاؤں گاؤں بھٹکتا تھا۔ اپنی سریلی گائیکی سے روزی روٹی کا اہتمام ہر روز کا معمول تھا۔ جہاں رات ہوتی ڈیرا ڈال دیا۔ رات کھانا پکانے، کھانے اور زمین پر آڑھا ترچھا پسر کر آرام کرنے اور سونے میں گذر جاتی۔ صبح سویرے ہی جاگ جاتی۔ ضروریاتِ زندگی سے فارغ ہوتے ہی یہ خاندان پھر روزی کی تلاش کے لیے پیروں میں سفر باندھ لیتا۔ گانا بجانا ہی ان کا معمول اور یہی گذر بسر کا ذریعہ تھا۔

اودھ تہذیب کا نمائندہ صوبہ تھا۔ ہر شے سے سلیقگی اور خوش نمائی کا اظہار ملتا تھا۔ طوائفوں میں بھی ضابطہ اخلاق اور سلیقہ مندی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شہر کی باوقار طوائفیں، نٹ بیڑنیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ اور انھیں اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتی تھیں لیکن قدرت جسے وقار دینا چاہے، انسان کا کیا بس!

اختری کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ بچپن ہارمونیم اور ڈھولک سے آشنا رہا جو ہندوستانی موسیقی کے اہم ترین ساز ہیں جن سے آواز کو اتار چڑھاؤ سے سدھایا جاتا ہے۔ قدرت نے گلے میں سروں کی دیوی سرسوتی کو پہلے ہی براجمان کر دیا تھا۔ رات دن گائیکی سے وابستہ اور پھر سر بھی سدھے ہوئے۔ سلیقہ تو آنا ہی تھا۔ کچھ عمر بڑی ہوئی تو سر میں سر ملانے لگیں۔ شباب نے بدن پہ شکنجہ کسا تو چہرے پر ملاحت لودے اٹھی۔ قامت نے

قیامت کے پر تولے تو دورونزدیک آواز کے ساتھ حسن کے چرچے بھی عام ہونے لگے۔ آواز مہوئے کی مہک کی طرح جوان دھڑکنوں تک پہونچی تو دیہاتوں اور قصبوں کے چھوٹے اور کم وقار زمینداروں کے سائبان اختری کی محفلوں سے آباد ہونے لگے۔ اور وہ اختری بائی فیض آبادی کے نام سے جانی جانے لگیں جو اس دور میں کسی اور ڈیرہ والی طوائفوں کے عموماً پکارے جانے اور پہچانے جانے والے نام ہوا کرتے تھے۔

اختری کی ماں مشتری بائی، ہاؤ بھاؤ اور مردوں کو رجھانے میں تو ماہر تھی مگر گانے میں سر ساز کا ساتھ نہ دے پاتی تھی۔ مشتری کا ایک بھائی بھی تھا، عبدل جس کو گانے کا شعور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عبدل نے، اختری کی گائیکی کو پہچانا اور اس سے خاطر خواہ فائدے حاصل ہونے لگے۔ تلاش معاش کے بعد اور چھوٹی موٹی محفلیں نپٹا کر یہ لوگ فیض آباد میں اپنی رہائش گاہ گلاب باڑی میں لوٹ آیا کرتے تھے۔ اختری بہت حساس طبیعت کی تھی۔ اس کی وجہ اس کی جڑواں بہن ببو کا بچپن میں ہی گذر جانا تھا۔ اپنی بہن کی موت اختری پر ہمیشہ سوگ بن کر طاری رہی۔ شاید یہی وہ وجہ بھی ہو کہ اختری کے گلے میں اس کربنا کی نے سوز بٹھا دیا۔

پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آئے تو اختری کو باقاعدہ شاستری گائیکی کی تعلیم کی ضرورت محسوس کی گئی فیض آباد میں تو کوئی استاد ایسا نہیں تھا جو راگ راگنیوں سے واقف کراتا اور غزل گائیکی کی بندشوں کی تعلیم سے آراستہ کراتا۔ استاد کی تلاش شروع ہوئی۔ اس معمولی گھرانے کی پہنچ استادان فن تک بھلا کیوں کر ممکن ہوتی؟ بہر حال جن محفلوں کی وہ جان بن چکی تھی، وہیں سے قدرت نے ذریعہ مہیا کر دیا اور اختری کو پٹیالہ گھرانے کے استاد عطا محمد خان کی حضوری میں پیش کر دیا گیا۔ استاد نے اپنی شاگردہ کے گن پہچان لیے۔ ریاض نے جوہر کھولے اور اختری بائی فیض آبادی غزل گایکی میں اپنی سمت طے کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن ایک آنچ کی کسر ابھی باقی تھی۔ اس کسر کو پورا کیا استاد عبدالحید خان نے ان دونوں استادوں نے اختری بائی کو اپنے کمال کا وہ ہنر دیا کہ اختری بائی کو دیہات اور قصبات کی سائبانی محفلوں کی حاجت نہ رہی۔ جوانی منہ سے بولنے لگی تو حسن نے بھی شرارتی انداز اختیار کیے اور سروں نے جوانی اور حسن کو وہ زبان دی کہ شہروں کے رخ قصبوں کی جانب ہونے لگے۔

ساون کا مہینہ تھا درختوں پر جھولے پڑے تھے۔ فیض آباد کی کچی مٹی سوندھی خوشبو اگل رہی تھی بارش کی پھواروں سے ساونی گھٹاؤں سے امنگوں سے اٹھان تھی۔ اختری کے گھر کے سامنے پیپل کے پیڑ کی موٹی سی

شاخ پر جھولا ڈالا گیا تھا اختری امنگ بھری ساعتوں کا لطف لیتے ہوئے جھولے کی پینگ لے رہی تھی اور اس کے ہونٹوں پر الھڑ سا اودھی گیت مچل رہا تھا۔ ''سانوریا کی مورتیا'' جیسا ہی کوئی نغمہ تھا اختری کو گانے اور جھولے کے جھونٹوں کے سوا کوئی ہوش نہیں تھا۔ نہ جانے کب ایک سجیلا بانکا سپاہی راہ چلتے ٹھہر گیا۔ گھوڑے کی لگام اس کے ہاتھوں میں ڈھیلی پڑ گئی اور اس البیلی گائیکی سے اپنی سدھ بدھ بسرا چکا تھا۔ ہوش تو تب آیا جب مطلع صاف ہوگیا۔ جھونٹے تو نہیں رکے، نغمگی پر جیسے ابر کی پرت جم گئی۔ سپاہی جوان کچھ بولے بغیر قریب آیا، غور سے اختری کو دیکھا، مسکرایا اور اپنے لباس سے چاندی کا سکہ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھا اور گھوڑے پر بیٹھ کر نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ وہ ایک سکہ تاعمر اختری کے لیے بہت بیش قیمت اور عزیز رہا۔ جائیکہ بیگم اختر بن کر انھوں نے لاکھوں روپیے کمائے مگر وہ سکہ کبھی ان کی نگاہوں میں اپنی وقعت کم نہ کر سکا۔

کوئٹہ (پاکستان) میں زلزلہ سے لاکھوں لوگ بے گھر ہوگئے۔ کئی جانیں تلف ہوگئیں۔ ان تباہ حال خاندانوں کی امداد کے لیے کلکتہ میں مختلف تقریبات کی گئیں۔ ایسے ہی ایک اسٹیج پروگرام میں ۱۹ سال کی عمر میں (غالباً) ۱۹۳۳ء میں اختری نے پہلی بار اسٹیج پر پرفارم کیا۔ آواز اگر دلوں کو تڑپا کر انھیں قابو کرنے کا ہنر جانتی ہے تو اس دن اختری کی آواز سے ثابت ہوگیا۔ کلکتہ فلموں کی اہم نگری بن چکا تھا۔ فلم والوں کی نگاہوں نے بھی رس بھری آواز کا اثر قبول کرلیا۔

فلم کا زمانہ رفتار پکڑ رہا تھا۔ بازارِ حسن کی جانی مانی طوائفیں فلموں میں کام بھی کر رہی تھیں اور فلمیں بھی بنا رہی تھیں۔ وحیدن آگرے والی (اداکارہ نمی کی ماں) اور جدّن بائی (نرگس کی ماں) کا فلموں میں طوطی بول رہا تھا۔ چونکہ اختری کا خاندانی پیشہ بھی رقص و نغمہ تھا اور فلموں کی کشش غضب کی تھی۔ اختری کا بھی فلموں کی جانب مائل ہونا لازمی تھا۔ زمانے کا مزاج بدل رہا تھا۔ بیٹر نیاں حقارت کی نظر سے اب نہیں دیکھی جاتی تھیں۔ جدن بائی اور وحیدن جیسی طوائفیں روشن خیال تھیں تب جدن بائی کلکتے والی کے نام سے مشہور تھیں۔ اختری ابھی صبر آزما لمحات سے گذر رہی تھی۔ اس کی آواز کی مانگ بڑھی تو فیض آباد سے نکلنا لازمی ہوگیا۔ کلکتہ میں ڈیرا جمایا اور جدن بائی کے رابطے میں آگئی۔ جدن بائی کو اختری کی گایکی نے متاثر کرلیا۔ جدن بائی چونکہ ماہر گائکہ تھیں۔ اس لیے اختری کی آواز کی کھرج کو پہچان لیا۔ اختری کی آواز میں انوکھی خاصیت تھی۔ شاستری گایک کا ایک وصف ہے جسے اس گائکی میں پتّی پڑنا کہتے ہیں۔ یہی خاصیت اختری کو اوروں سے جدا کرنے

کا باعث بن گئی۔ یہ اصطلاح صرف اختری میں جدن بائی نے محسوس کیا یوں سمجھئے مرکی لیتے وقت آواز ہلکے سے پھٹتی تھی جسے پارکھی اور کلاسک گایکی کے استاد پتّی پڑنا کہتے ہیں۔ یہ پتّی کب اور کس شعر یا بول پر لگے گی، کہا نہیں جاسکتا۔ اس کے پہلے سے پروگرامنگ بھی نہیں ہوتی تھی۔ بس کسی اچانک لمحے میں وہ پتّی لگ جاتی اور سننے والے کے دل میں ایک کسک چھوڑ جاتی تھی۔

جدن بائی نے کلکتے میں اپنی نجی اور باوقار محفل میں اختری کو بھی مدعو کرلیا۔ پارکھیوں کے درمیان یہ اختری کی گایکی کا پہلا تعارف بھی تھا اور امتحان بھی۔ اختری کو یہ موقع بس غنیمت لگا پورے ہاؤ بھاؤ لٹکے جھٹکے کے ساتھ وہ اس محفل میں شریک ہوئی۔ جدن بائی بذاتِ خود بڑے پائے کی مغنیہ تھیں اور ایک وسیع حلقہ ان کا معترف تھا۔ اختری کو اپنی گایکی اور حسن پر بھروسہ تھا کلکتہ کا گویا کریم اس محفل میں موجود تھا۔ جدن بائی نے بہت اعتماد کے ساتھ اختری کو ان کے درمیان پیش کیا۔ اختری نے پہلی غزل پیش کی۔ ''نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے'' غالب کی اس غزل کے پہلے شعر کی ادائیگی نے ہی حاضرین محفل کو سنبھلنے پر مجبور کردیا اور غزل جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی، محفل سانس لینا بھول گئی۔ آواز کا سحر تھا کہ ہر سوسناٹا طاری ہوگیا۔ سننے والا آواز کی بندش میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اس غزل میں کئی بار پتّی پڑتی تھی کہ لوگ عش عش کر اٹھتے تھے۔ جدن بائی کے قدردان نیو تھیٹر فلم کمپنی کلکتہ کے معروف موسیقار آر سی بورال بھی شریک محفل تھے۔ فلمساز بھی تھے اور زمانہ شناس بھی وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ اختری کو بے حد قیمتی بنگالی ساڑی نذر کردی۔

جدن بائی اس پائے کی مغنیہ تھیں کہ انھوں نے ہی کندن لال سہگل کو غالب کی غزل نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے گانے کا انداز سکھایا تھا اور یہ بھی ان کے ذہن نشین کیا تھا کہ غزل گایکی میں تلفظ اور الفاظ کی صحیح اور بروقت ادائیگی ضروری ہوتی ہے۔ جو لفظ گاٹک ادا کر رہا ہو اس کے معنی سے بھی اس کا واقف ہونا لازمی ہے، تبھی آواز میں حسنِ لطافت پیدا ہوتا ہے۔ جدن بائی نے ہی اختری کو بھی یہی باریکیاں سکھائی تھیں۔ مشہور دادرا ''توڑ لائین راجہ جمنا کی ڈار'' اختری کو جدن بائی نے ہی سکھایا تھا جس نے اختری کو شہرت دلائی۔

اختری چونکہ نٹ بیڑنی کے نچلے اور کم تر درجے کے گھرانے سے نسبت رکھتی تھی، اس وجہ سے احساس کمتری آنا لازمی تھا۔ وہ اونچا اٹھنا چاہتی تھی اور اس کا ایک ہی طریقہ اس کی سمجھ میں آتا تھا کہ وہ کلکتے کے بازارِ حسن میں بیٹھ جائے۔ تب طوائفوں کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ بہت ٹھسے اور کلے کی طوائفیں ہوا کرتی تھیں۔

اختری کی ان طوائفوں نے کھل کر حقارت کی حد تک مخالفت کی اور سونا گاچھی میں بیٹھنے اور مجرا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ وہ طوائفیں اختری کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا اور اس کے رقص ونغمہ میں شریک ہونا اپنی ہتک گردانتی تھیں۔ اختری کے لیے وہ دور بہت پریشان کن تھا۔ آخر جدن بائی نے صورتِ حال کو سنبھالا۔ اس مسئلہ کے تدارک کے لیے جدن بائی نے تمام طوائفوں بالخصوص اس دور کی ممتاز طوائفوں ممتاز بیگم۔ شریفن ،گلنار بائی، وحیدن آگرہ والی، دھنو بائی، جہاں آرا کجن (جو بعد میں فلم ایکٹریس بنی) کو اپنے یہاں دعوت پر بلایا۔ بے تکلف کھانے کے بعد اختری کو ایک ملزم کی طرح پیش کیا گیا۔ بدتر کے آگے اپنے کم تر ہونے کا اعتراف اختری نے اس طرح کیا کہ تمام طوائفوں کے قدموں پر سر رکھا اور معافی کی خواستگار ہوئی۔ عام معافی مل گئی۔ سب نے اسے اس طرح قبول کیا کہ اس کے گلے میں دوپٹہ ڈالا گیا جو کہ سونا گاچھی کی رسم تھی۔ بتاشے تقسیم ہوئے اور اختری فیض آبادی کلکتے کے سونا گاچھی کی طوائفوں میں شامل ہوگئی۔ بیٹھکیں کرنے، مجلسیں جمانے اور نغمہ ورقص کرنے سے اب ساری رکاوٹیں دور ہوگئی تھیں۔ کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ آزادی سے سونا گاچھی میں بیٹھ کر اعلیٰ طبقوں تک رسائی کی خود مختار ہوگئی تھی۔ اس کی ماں مشتری اور بھائی عبدل نے گلے سے ڈھولک اور ہارمونیم اتار دیا تھا اور قصبوں دیہاتوں میں تلاشِ معاش کے لیے بھٹکنا موقوف ہوکر کوٹھے کی شان وشوکت کی سیڑھی سے نیچے ہی چھوٹ چکا تھا۔ اختری بائی فیض آبادی ڈیرادار کی نہیں، سونا گاچھی کی باوقار طوائف بن چکی تھی جس کی آواز کے جادو میں ہر ذی ہوش گرفتار کشاں کشاں کوٹھے پر کھینچا چلا آتا تھا اور اختری صرف آواز کا سودا کرتی تھی، کسی کی ہمت وجرأت نہ تھی کہ وہ اپنا قدم اس کی خواب گاہ کی جانب بڑھا سکے!

اختری فیض آبادی صرف کوٹھے تک محدود رہنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا کوٹھا آباد تھا اور اس کوٹھے کی سیڑھیاں صرف شرفاء ہی چڑھ سکتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر میگھا فون کمپنی کے مالک گھوش بابو نے جب اختری کو سنا تو بے اختیار ہو اٹھے اور اپنی کمپنی کے لیے اختری سے معاہدہ کرلیا۔ بہزاد لکھنوی کی غزل ''دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنادے'' کا ایل پی جب بازار میں آیا تو منچلے تو دیوانہ بنے ہی ایک خاص طبقہ بھی اس آواز کا گرویدہ ہوگیا۔

جدن بائی اس کی محسنہ بھی تھیں اور خیر خواہ بھی۔ انھوں نے اختری کو نیو تھیٹر میں داخلہ دلا دیا۔ نیو تھیٹر کے مالک بی این سرکار فن کے قدردان تھے۔ کے سی ڈے پنکج ملک۔ رائے چند بورال، بمل رائے اور پی سی

بروا جیسے گوہر نایاب نیو تھیٹر میں تھے۔ کندن لال سہگل کا آغاز تھا تب وہ سہگل کشمیری کے نام سے جانے جاتے تھے۔ جدن بائی کے سب گرویدہ تھے اور ان کی عزت بھی کرتے تھے۔ نیو تھیٹر میں تو نہیں ایسٹ انڈیا فلم کمپنی نے اختری کو اختری فیض آبادی کے اصل نام سے اپنی فلم ''کنگ فار اے ڈے'' میں اطہر اور مظہر خان کے ہمراہ بطور ہیروئن پیش کردیا۔ اسے تاریخی فلم کہا گیا۔ ایک دن کا بادشاہ۔ شاید یہ فلم بچہ سقہ پر مبنی تھی جس نے ہمایوں کی جان بچانے کے عوض میں ایک دن کی بادشاہت حاصل کی تھی۔ ۱۹۳۳ء کی یہ فلم کامیاب ہوئی۔ فلم والوں کو ایک قیامت ہاتھ لگی۔ اختری کا حسن دوآتشہ بن کر خرمنِ ہوش وحواس پر برسا۔ غزل گائکی سے جو دل کی دھڑکنوں کا شمار بھول جاتے تھے، اب فلم کے پردے پر اختری کی اداکارانہ جلوہ گری سے اسقدر بدحواس ہوئے کہ پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔ کلکتہ میں لگاتار چھ فلموں میں کام کرنے سے اختری کی گونج بمبئی فلم نگری تک پہنچی تھی۔ اختری بائی کو بمبئی آنے کی دعوت مل گئی۔ جدن بائی اور وحیدن بھی اپنی اپنی کم سن بیٹیوں (نمی اور نرگس) کو لے کر بمبئی پہونچ چکی تھیں اختری بھی بمبئی آگئی۔

۱۹۴۱ء میں محبوب خان، موسیقار، انل بسواس کے اسٹوری آئیڈیا پر فلم ''روٹی'' بنانے جارہے تھے۔ وجاہت مرزا نے اسے ڈیولپڈ کیا تھا۔ محبوب خان ایک خاص نگیٹو رول کے لیے اپنی بیوی سردار اختر کو کاسٹ کرنا چاہتے تھے مگر انل بسواس کا کہنا تھا کہ سردار اختر اچھی گلوکارہ نہیں ہیں جبکہ اختری فیض آبادی کے چرچے عام تھے۔ فلم میں چندر موہن (سرمایہ دار) کی ڈارلنگ کے رول میں اختری بہت مناسب تھی۔ چنانچہ انل بسواس کے اصرار پر اختری کو کاسٹ کرلیا گیا۔ انل بسواس کی سوانحی کتاب رتو آئے رتو جائے (مصنف شرددت) میں تفصیلی ذکر ہے؟ اس وقت اختری کو اس رول کے لیے سب سے زیادہ معاوضے کی رقم بائیس ہزار روپے دی گئی تھی جو ۴۰۔۱۹۴۱ء میں تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ روٹی ۱۹۴۲ء میں ریلیز ہوگئی تھی۔ اختری نے نگیٹو رول کے ساتھ چھ گانے (۱) پھر فصل بہار آئی دلِ دیوانہ (۲) چار دنوں کی جوانی، متوالے پی لے پی لے (۳) الجھ گئے نینوا چھیئے نہ چھٹائے (۴) اے پریم تیری بلی ہاری ہوں، ہم نیا قرینہ سیکھ گئے (۵) وہ ہنس رہے ہیں آہ کیے کیسے جارہا ہوں میں (۶) رہنے لگا ہے دل میں اندھیرا تیرے بغیر۔ ان گانوں کو صفدر آہ۔ آرزو لکھنوی اور بہزاد لکھنوی نے لکھا تھا۔ چونکہ اختری کا معاہدہ ایچ ایم وی کے ساتھ تھا۔ محبوب خان نے یہ فلم نیشنل اسٹڈیو کے لیے بنائی تھی جس کا معاہدہ ایچ ایم وی کے ساتھ نہیں تھا۔ اس لیے ان گانوں کا ریکارڈ جاری نہیں

ہوسکا۔ بہت بعد میں میگھافون نے اس کا ریکارڈ ریلیز کیا تھا۔(حوالہ۔رتو آئے رتو جائے)۔

اختری نے بہت زیادہ فلموں میں کام نہیں کیا مگر جس قدر بھی فلمیں کیں، مطمعِ نظر دولت کا حصول رہا۔ چونکہ اس کا رکھ رکھاؤ اور زندگی گزارنے کا انداز بڑا ہی شاہانہ تھا۔ اسی زندگی کی وہ دلدادہ تھی۔ اس طرح کھانوں میں بھی نفاست اور ذائقوں کو اہمیت دی جاتی تھی۔ میگھافون اور ایچ ایم وی کمپنیاں اس کے ریکارڈ جاری کرتی تھیں جو بازار میں آتے ہی ختم ہوجاتے تھے۔ معاوضہ بھی بھرپور لیتی تھی۔ رائلٹی اس کے علاوہ تھی۔ نجی محفلوں میں بھی دل کھول کر معاوضہ وصول کرتی تھی۔ فیض آباد کی نٹ بیڑنی، دیہات دیہات گانے والی اختری فیض آبادی، کلکتے کے بدنام بازار سونا گاچھی میں بیٹھی۔ فلموں میں موقع ملا۔ اداکاری کے ساتھ گانے بھی گائے۔ گھاٹ گھاٹ کے پانی نے موقع شناس بنادیا تھا۔ جدن بائی کلکتے والی، وحیدن آگرے والی، جہاں آرا کجن اور دلی کی چھمیا شمشاد (سائرہ بانو کی نانی) جیسی ٹھسے دار طوائفوں کے دن بھر پھرے دولت آئی تو عزت دار بن گئیں۔ دولت نے ہی وقار، شرافت اور اعلیٰ طبقے کی برابری کا سلیقہ بھی سکھادیا۔ مہذب اور خاندانی گھرانے متوجہ ہوئے۔ یوں بھی یہ عورتیں جہاں دیدہ۔ آدابِ زندگی اور القاب بندگی سے آگاہ تھیں انھیں ہتھیاروں نے ان عورتوں کو کوٹھے کو بھلا کر حویلیوں کی نجابت دلادی۔

اختری فیض آبادی کو بھی اب ایسے ہی سکون کی تلاش تھی۔ عورت کا تحفظ شوہر کی آغوش ہوتی ہے جہاں سے اسے وقار ملتا۔ معاشرہ اور دنیادار لوگ اسے شوہر کی آبرو اور خاندان کا وقار مان لیتے ہیں اور ماضی کو بھلا کر عزت کے منصب پر لا بٹھاتے ہیں۔

اختری فیض آباد کے دن بھی پلٹے۔ ایک باعزت شخص نے اس کے لیے اپنی خواب گاہ کے ساتھ گھر کے دروازے بھی کھول دیے۔ نکاح ہوگیا۔ اختری بائی فیض آبادی اپنے بدنام زمانہ "میکے" کو گلیوں میں ہی چھوڑ کر کوٹھے سے کوٹھی میں جا بسی اور پھر زمانے نے اختری بائی فیض آبادی کو صرف بیگم اختر کے نام سے ہی جانا۔ ایک باوقار، باسلیقہ، مہذب، اور شائستہ انداز، زندگی بیگم اختری کا کردار بن گیا۔ ان پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ فلموں سے تو کنارہ کش ہوچکی تھیں۔ صرف غزل گایکی تک خود کو محدود کرلیا تھا۔ عام محفلیں تو ان کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھیں۔ بیگم اختری کی غزل گائکی میں ایک تڑپ اور تپش کے ساتھ شائستگی بھی ملتی ہے۔ ان سے قبل اور بعد میں بھی بہت غزل گانے والیاں ہوئیں بدنام بازاروں کی طوائفوں میں ایک سے بڑھ کر ایک

غزل اور کلاسک گائکی میں لاثانی آوازیں سنی گئیں لیکن بیگم اختر نے غزل کو ایک شناخت دی تھی۔ ان کا ماننا تھا کہ دھرپد اور دھمال پورے جوش سے پیش کیا جاتا ہے تو غزل میں بھی اس سے کہیں زیادہ خیال رکھنا ہوتا ہے۔ بندش، مفہوم الفاظ کی تراکیب اور شعر کا مطلب و معنی کہیں مجروح نہ۔ غزل کی نازک خیالی پر کہیں آنچ نہ آئے۔ ادائیگی صحیح ہو، تلفظ میں کہیں کجی نہ آئے ہر حرف اور حروف کے ارتباط میں لہجہ نہ ٹوٹے۔ بیگم اختر کی غزل گایکی میں یہ تمام پابندیاں خاص اظہار کے ساتھ ملتی ہیں۔ اسکا ادراک انھیں پہلے سے ہی تھا۔ اس لیے وہ پوری طرح غزل کے لیے Devoted ہوگئی تھیں۔ انھوں نے دیگر راگ بھی گائے۔ دادرا۔ ٹھمری، کجری، پٹہ، کہربا اور دھرپد کے علاوہ بھوجپوری اور اودھی زبانوں کے ساتھ لوک شیلی میں بھی اپنی دل کش آواز کو استعمال کیا لیکن بیگم اختر کی پہچان غزل اور صرف غزل سے قائم ہے۔

ہر شے میں خوبصورتی اور حسن تلاش کرنے والی بیگم اختری نجی زندگی میں بے حد نفاست پسند تھیں ان کی ایک قریبی سہیلی (نام یاد نہیں آرہا) بیان کرتی ہیں کہ وہ صرف ساڑی ہی پہنتی تھیں۔ ساڑی سے میچ کرتا پرس، شال اور چپل ہوا کرتے تھے۔ میچنگ کا وہ اس حد تک خیال رکھتی کہ اگر بال برابر بھی کمی محسوس کریں تو کبھی استعمال نہیں کرتی تھیں۔ یہی سہیلی آگے کہتی ہیں کہ ان کے ہونٹوں پر ہمیشہ تخاطب کے لیے متواضع مسکراہٹ ہوا کرتی تھی۔ مخاطب سے بڑے ہی سلیقے سے آداب کرتی تھیں۔ جس میں لکھنؤ کا خاص انداز جھلکتا تھا۔ اپنے بہی خواہ اور اپنے پسند کرنے والوں کا وہ بہت احترام کرتی تھیں۔ بیگم اختر کی آواز میں درد کی آمیزش ان کی ماضی کی حسرتوں نے سمودی تھی جس نے ان کی گائکی کو سمجھ لیا، اس نے گویا بیگم اختر کو جان لیا۔ انھیں حکومت نے پدم شری کے اعزاز سے نوازا تھا۔ اس کے علاوہ مقامی اور بین الاقوامی اتنے اعزازات ملے تھے کہ ان کی تفصیل بیان کرنا محال ہے۔ ۳۰/ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو صرف ۶۰ سال کی عمر میں یہ عظیم گلوکارہ وفات پا گئی اور اسی کے ساتھ غزل گائکی کا ایک درخشاں دور منجمد ہوگیا۔

بیگم اختر کی فلمیں:- ۱۹۳۳ء 'کنگ فار اے ڈے' (پہلی فلم) ہدایت: راج ہنس۔ ہیرو: اطہر۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کلکتہ، ۱۹۳۳ء 'نل دمینتی' ہیرو: مظہر خاں، ایسٹ انڈیا کمپنی کلکتہ، ۱۹۳۴ء 'آمینہ' ہیرو: اختر نواز۔ کالی فلمز کلکتہ، ۱۹۳۴ء 'ممتاز بیگم' ہیرو: مظہر خان، ہدایت: اختر نواز، ایسٹ انڈیا کمپنی کلکتہ، ۱۹۳۴ء 'روپ کماری' ہیرو۔ ماسٹر موہن لال۔ ہدایت۔ جے کے مدان۔ مدان تھیٹرس کلکتہ، ۱۹۳۵ء 'جوانی کا نشہ' ہیرو۔ ماسٹر خلیل

احمد۔ ہدایت۔ پیسی کرانی۔منوہر فلمز کلکتہ۔ ۱۹۴۲ء 'روٹی' ہیرو۔شیخ مختار۔ہدایت۔محبوب خان۔نیشنل اسٹوڈیوز بمبئ۔۱۹۴۵ء 'پنا دائی' مرکزی رول۔درگا کھوٹے ،چندر موہن۔ہدایت۔رام دریانی۔موسیقی۔گیان دت۔نغمات۔ڈی این مدھوک (اس فلم میں صرف دو گانوں 'میں راجہ کو اپنے رجھا کے رہوں گی' اور 'فصلِ گل آئی ہمیں یاد تیری ستانے لگی' کا پلے بیک لیا گیا تھا)

۱۹۵۴ء 'احسان' مرکزی رول۔پرتھوی راج رمنور سلطانہ۔ہدایت۔راجندر شرما۔موسیقی۔مدن موہن گمیت۔مدھوک کیف عرفانی (اس فلم میں بھی صرف ایک گیت 'ہمیں دل میں بسا بھی لو۔یہ کہتی ہیں جواں نظریں' کا پلے بیک لیا گیا تھا۔

☆☆☆

فلمی اداکاروں کی ماں۔نروپا رائے

ششر شرما

اداکاری کے میدان میں غیر متوقع اترنے والی نیروپا رائے اپنے ۶۰ سالہ کیرئیر کے دوران بطور ہیروئن،معاون اداکارہ اور کیریکٹر آرٹسٹ ہندی اور گجراتی زبانوں کی تقریباً ۵۰۰ فلموں میں اداکاری کر چکی ہیں۔حال ہی میں انھیں 'فلم فیئر لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ' سے نوازا گیا۔آیئے ان کی ہی زبانی ان کی زندگی کے چند یادگار لمحات کو ٹٹولنے کی کوشش کریں۔

بلساڑ گجرات کے ایک روایتی گجراتی گھرانے میں میری پیدائش ہوئی تھی۔والد ریلوے میں ملازمت کرتے تھے اور فیملی میں والدین اور ہم دو بہنیں تھیں۔میں نے ابتدائی تعلیم ہی حاصل کی تھی کہ ۱۹۴۵ء میں ۱۴ برس کی عمر میں میری شادی ہوگئی اور میں 'کوکا' چوہان سے مسز کوکا بلساڑا بن کر ممبئ آ گئی۔میرے شوہر یوں تو راشننگ انسپکٹر کے عہدہ پر فائز تھے لیکن فلموں میں اداکاری کرنے کا انہیں بہت شوق تھا جو پورا نہیں ہو پا رہا تھا۔ہماری شادی ہوئے تین چار مہینے ہی گزرے ہوں گے کہ میرے شوہر کی نظر گجراتی فلم 'رنک دیوی' کے لیے نئے اداکار کی تلاش سے متعلق سن رائز پکچرس کے ایک اشتہار پر پڑی جس کے انٹرویو کے لیے بلاوا آیا تو میں بھی ان کے ساتھ گئی۔شوہر تو فیل ہوگئے لیکن بغیر انٹرویو لئے میرے سامنے فلم کے اہم کردار کے لیے آفر رکھ دی گئی جسے شوہر کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے مجھے قبول کرنا پڑی۔حالانکہ میں جس ماحول میں پلی بڑھی تھی وہاں فلموں اور فلمی دنیا کو بہت خراب مانا جاتا تھا اور اس وقت تک میں نے کوئی فلم دیکھی بھی نہیں تھی۔شوٹنگ شروع ہوئی تو مجھے ہیروئن کی جگہ پر ایک دیگر نسبتاً چھوٹا کردار دے دیا گیا۔ادھر جب میرے میکہ میں پتہ چلا تو گھر اور سماج میں اس بات کی سخت مخالفت ہوئی۔سماج کی مخالفت تو 'رنک دیوی' کے ہٹ ہوتے ہی ٹھنڈی پڑ گئی لیکن میکہ سے میرے تعلقات خراب ہوگئے۔سن رائز پکچرس کے مالک وی ایم ویاس نے ہی اس فلم کے دوران مجھے یہ فلمی نام نیروپا رائے دیا تھا۔

میری اگلی فلم ہندی اور گجراتی میں بنی 'گن سندری' جس میں میں نے ہیروئن کا کردار ادا کیا۔تین موسیقاروں بلوسی رانی،ہنس راج اور اے ویاس کی موسیقی سے سجی اور رتی بھائی کے ذریعہ ہدایت دی گئی اجیت

پکچرس کی اس فلم میں میرے ہیرو منہر دیسائی تھے اور یہ فلم ۱۹۴۸ء میں ریلیز ہوئی تھی لیکن چندولال شاہ کے رنجیت اسٹوڈیو کی فلم 'لاکھوں میں ایک' جو میں نے بعد میں سائن کی تھی 'گن سندری' سے پہلے ریلیز ہوگئی اور اس میں میرے ہیرو پاکستان کے اداکار کمل تھے۔

اس زمانے میں حالانکہ مذہبی، تاریخی، سماجی فلموں کے اپنے اپنے اداکار ہوتے تھے لیکن میں سبھی قسم کی فلموں میں یکساں طور سے مصروف ہوگئی۔ 'ہر ہر مہادیو، ناگ پنچمی، ستی رونی، شیو کنیا اور چنڈی پوجا' جیسی تقریباً ۵۰ مذہبی فلموں میں میں نے خاص طور پر مہیپال ساہو مودک اور ترلوک کپور جیسے اداکاروں کے ساتھ سیتا، ساوتری، دم ینتی وغیرہ تقریباً سبھی میں دیویوں کے کردار کیے تو 'امر سنگھ راٹھور، سمراٹ چندرگپت، کوی کالی داس، رانی بھوک متی، ویر درگا داس اور رضیہ سلطان' جیسی تاریخی فلموں میں جے راج اور بھارت بھوشن کی ہیروئن رہی۔ ساتھ ہی 'ہماری منزل، بھاگیہ وان، دھرم پتنی، دو بیگہ زمین، کنگن، ہیرا موتی، بے درد زمانہ کیا جانے، گھر کی لاج اور من کا میت' وغیرہ کئی سماجی فلمیں بھی بطور ہیروئن کیں۔ ان میں سے زیادہ تر فلمیں پانچویں دہائی میں بنی تھیں۔

میں نے ۱۹۵۶ء میں بنی فلم 'بھائی بھائی' میں پہلی مرتبہ اشوک کمار کی بیوی کے طور پر کیریکٹر رول کیا تھا، جس میں اشوک کمار اور کشور کمار نے بھی پہلی بار ایک ساتھ کام کیا تھا۔ اس سے پہلے ۱۹۵۵ء میں بنی فلم 'منیم جی' میں ہیروئن کی جوانی سے لے کر بڑھاپے تک کے کردار کے آفر کو میں نے ایک چیلنج مان کر قبول کیا تھا۔ لیکن بعد میں مجھے بغیر بتائے میرے سبھی جوانی کے مناظر کاٹ دیے گئے اور میری جگہ پر نلنی جیونت کو لے لیا گیا۔ اس سے میں اتنی بری طرح افسردہ ہوئی کہ اس کردار کے لیے مجھے ملنے والا سب سے بہترین کو اسٹار کا فلم فیئر ایوارڈ بھی میرے غم کو کم نہ کر سکا۔ میں نے 'بازی گر' اور 'سند باد دی سیلر' جیسی اسٹنٹ فلموں میں مذہبی فلموں کی اپنی امیج کو بدلنے کی کوشش کی تو 'دیوی' کا اسٹنٹ کرنا لوگوں کو پسند نہیں آیا اور مخالفت کے طور پر فلم بینوں کے اتنے خطوط ملے کہ مستقبل میں اسٹنٹ فلموں سے مجھے توبہ کر لینی پڑی۔

۶۰ کی دہائی شروع ہوتے ہوتے میں پوری طرح کیریکٹر آرٹسٹ بن چکی تھی۔ ۱۹۶۱ء میں فلم 'چھایا' اور ۱۹۶۴ء میں 'شہنائی' کے لیے مجھے بہترین کو اسٹار کا فلم فیئر ایوارڈ ملا۔ میں نے 'چاند اور سورج، آیا ساون جھوم کے، آن ملو سجنا، چھوٹی بہو، جیسی کئی فلموں میں ماں کا کردار کیا لیکن ۱۹۷۵ء میں بنی فلم 'دیوار' میں امیتابھ

اور ششی کپور کی ماں کا کردار اتنا کامیاب رہا کہ میں فلمی ماں ہی بن گئی۔ میں 'سہاگ، امر اکبر انتھونی، مقدر کا سکندر، گنگا جمنا سرسوتی، گوتم گووندا، کرتویہ، ماں گنگا تیرے دیس میں' جیسی کئی فلموں میں امیتابھ اور دھرمیندر جیسے اس دور کے تقریباً سبھی بڑے اداکاراؤں کی ماں کا کردار ادا کر چکی ہوں۔ ۸۰ کی دہائی کے وسط تک میں اداکاری میں بہت مشغول رہی اور پھر دھیرے دھیرے کام کم ہونے لگا۔ میں نے ۱۹۹۹ء میں بنی فلم 'جہاں تم لے چلو' میں جمی شیر گل کی دادی کا کردار ادا کیا اور یہی میرے اب تک کی آخری ریلیز ہونے والی فلم ہے۔ ایک اور دیگر فلم 'لو یو ہمیشہ' کافی وقت سے ریلیز ہونے کے لیے تیار ہے۔ حال ہی میں 'مجھے فلم فیئر لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ جس کی مجھے بہت خوشی ہے۔ میں نے اپنے ابھی تک کے کیریئر میں ہندی اور گجرات میں بنی تقریباً ۵۰۰ فلموں میں اداکاری کی ہے۔ اب گزشتہ ۵ برسوں سے اداکاری سے دور رہ کر اپنا وقت شوہر، دو بیٹوں، ایک پوتے اور ایک پوتی سے بھرے گھر کے ساتھ گزار رہی ہوں۔

☆☆☆

ماضی کی باصلاحیت اداکارہ۔لیلا چٹنس

خورشید اختر فرازی

پرانے دور کی ہیروئینوں میں ایک نام لیلا چٹنس کا بھی ہے جس نے اشوک کمار کے ساتھ کئی فلموں میں ہیروئن کا کردار نبھایا، کنگن، بندھن، اچھوت کنیا، وغیرہ اشوک کمار کی ایسی یادگار فلمیں ہیں جنہیں ہندوستان کی کلاسیک فلموں میں شمار کیا گیا ہے اس زمانے میں لیلا چٹنس، دیویکارانی، بیگم پارہ، اچلا سچدیو، مبارک بیگم، نسیم بانو وغیرہ ایسی ہیروئنیں تھیں جنھوں نے عرصے تک فلموں میں راج کیا، یہ وہ زمانہ تھا جب عورتوں کا فلموں اور تھیٹروں میں کام کرنا ممنوع اور باعثِ توہین تصور کیا جاتا تھا۔اس زمانے میں مرد ہی عورتوں کا لباس اور میک اپ وغیرہ کرکے ہیروئن کا کردار ادا کیا کرتے تھے، پرتھوی راج کپور اور سہراب مودی نے جب اپنے اپنے پرتھوی تھیٹرز اور منروا تھیٹرز کو شروع کیا تو انھوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ ان کی فلموں میں ہیروئن کا رول عورت ہی ادا کرے گی اور ہیروئن کے رول کسی مرد کو پیش کرکے کہانی کا مذاق نہیں بنایا جائے گا۔ان دنوں فلم پکار میں نسیم بانو نے کام کرکے فلم کو سپر ہٹ بنا دیا تھا اس فلم کے ہدایت کار سہراب مودی تھے اور ہیرو کے رول چندر موہن نے نبھایا تھا۔دوسری طرف سہراب مودی کی دوسری فلم سکندر میں بھی پرتھوی راج نے سکندر کے رول ادا کرکے فلم میں جان ڈال دی تھی۔حالانکہ اس فلم میں ہیروئن کے رول میں وہ لیلا چٹنس کو لینا چاہتے تھے مگر لیلا چٹنس ان دنوں (۱۹۴۸ء) اشوک کمار، موتی لال کے ساتھ کئی فلموں میں کام کر رہی تھیں اور ڈیٹ نہ ملنے کے سبب سے وہ لیلا چٹنس کو طویل شوٹنگ شیڈول کے لئے تیار نہیں کر پائے تھے۔لیکن روٹی اور دوسری فلم میں سہراب مودی نے لیلا چٹنس کو لیا لیکن رول مختصر ہونے کی وجہ سے لیلا چٹنس اور سہراب مودی کے درمیان تنازع پیدا ہو گیا تھا۔

اسی دوران لیلا چٹنس کی شادی ہوگئی اور وہ طویل برسوں تک فلم سے الگ ہوگئی لیکن ۱۹۶۰ء میں جب ان کے شوہر کا لندن میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا تو انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو لندن کے ہاسٹل نما اسکول میں داخل کرا کر ہندوستان واپس آ گئی اور ایک مرتبہ پھر سے فلموں میں کام کرنا شروع کیا لیکن اس وقت ان کے لئے ہیروئن کا رول محال تھا کیونکہ وجنتی مالا، مالا سنہا،

شیاما، وحیدہ رحمٰن، نرگس، مینا کماری اور شکیلہ کا عروج تھا اور خود اشوک کمار متذکرہ تمام بڑی ہیروئنوں کے ساتھ بطور ہیرو کام کر رہے تھے بعد ازاں بڑے بھائی اور باپ کا رول کرنے لگے تھے اور کیرکٹر ایکٹر کے طور پر بھی اشوک کمار سپر ہٹ ثابت ہوئے اگرچہ اس زمانے میں بھی انھوں نے برما روڈ، شیرو، ہم سب استاد ہیں، چلتی کا نام گاڑی، استادوں کے استاد جیسی فلموں میں معاون اداکارہ کا رول کرنا جاری رکھا تھا۔اس زمانے میں وینا ان کی فیورٹ ہیروئن تھی۔

لیلا چٹنس نے تھک ہار کر ماں کا رول ادا کرنا منظور کر لیا دلیپ کمار نے انھیں اپنی پروڈکشن والی فلم گنگا جمنا، میں ماں کا رول دیا، اس فلم میں دلیپ کمار کے چھوٹے بھائی ناصر خاں نے چھوٹے بھائی جمنا کا رول ادا کیا تھا فلم کی ہیروئن وجنتی مالا اور دیگر اداکاراوں میں انور حسین، کنہیا لال وغیرہ تھے۔یہ فلم سپر ہٹ ثابت ہوئی تھی اور اس فلم میں لیلا چٹنس کے مرنے کا سین اس قدر جذباتی تھا کہ دیکھنے والوں کے آنسو نکل پڑے تھے۔

لیلا چٹنس نے او پی رلہن کی فلم ''پھول اور پتھر'' میں ایک بوڑھی فقیرنی کا رول ادا کیا تھا اس فلم میں دھرمیندر، مینا کماری، مدنپوری، ششی کلا شیام کمار، اندرا بلی اور او پی رلہن کے ساتھ رام موہن کے رول یادگار تھے، اس فلم میں دھرمیندر کے آگ میں جل کر بری طرح سے جھلس جانے کے بعد بوڑھی فقیرنی کے رول میں لیلا چٹنس کو رات بھر درخت کے نیچے دعائیں مانگتے دیکھا گیا اور صبح کو جب دھرمیندر کو ہوش آیا تو پتہ چلا بوڑھی فقیرنی مر چکی ہے اور اس معمولی رول میں لیلا چٹنس نے لاجواب اور بے مثال اداکاری کے ذریعہ اپنی انفرادیت کا لوہا منوا لیا تھا۔

فلم ''گہرا داغ'' او پی رلہن کی فلم تھی جس میں راجندر کمار، مالا سنہا کے رول تھے اور اس فلم میں راجندر کمار کو قتل کے جرم میں جب ۱۴ سال کے لئے کالا پانی بھیج دیا جاتا ہے تو اس موقع پر ایک بوڑھی ماں کی بے بسی اور کمسن بیٹی کی فکر میں ڈوبی اداکاری لاجواب تھی، اس فلم میں کمسن بیٹی کا رول ممتاز نے کیا تھا اور ممتاز کی وہ پہلی فلم تھی، اس کے بعد ایسا ہوا کہ ہر کوئی لیلا چٹنس کے پاس ماں کا رول لے کر آتا لیکن وہ بیک وقت صرف ایک فلم کو ہاتھ میں لیتی تھیں اور ان کا کہنا تھا کہ بیک وقت کئی فلموں میں کام کرنے سے وہ اپنی اداکاری سے انصاف نہیں کر سکتیں۔۱۹۹۰ء میں سبھاش گھئی نے فلم ''میری جنگ'' میں نوتن کا رول لیلا چٹنس کو دینا چاہا تھا جو پھر سے انگلستان اپنے بیٹوں کے پاس واپس چلی گئی

تھیں لیکن وہ مزید فلم کرنے پر راضی نہ ہوئیں اور ۲۰۰۱ء میں انگلستان ہی میں ان کی موت ہوگئی ان کے مرنے کے ایک ماہ بعد ہندوستان والوں کو ان کے بارے میں پتہ چلا۔

لیلا چٹنس نے جب ماں کے رول ادا کرنے شروع کئے تو دلیپ کمار، راج کپور، دیو آنند، منوج کمار سبھوں نے انہیں اپنی ماں کے رول میں لینا شروع کیا۔ نوکیتن کی فلم ''ہم دونوں'' (دیو آنند۔ سادھنا۔ نندہ) میں لیلا چٹنس نے دیو آنند کی ماں کا رول نبھایا تھا اور جب وہ فوج میں چلا جاتا ہے تو وہاں سے اس کے مرنے کی خبر آتی ہے اور اس غم میں اس کا گھٹ گھٹ کر رونا اور پھر انتہائی بیماری کے عالم میں مرجانا متاثر کرجاتا ہے۔ اسی طرح سے ''آس کا پنچھی'' میں اس نے راجندر کمار کی ماں کا رول ادا کیا جب فوج میں شامل ہوتا ہے اور وہاں سے اس کے مرنے کی خبر آتی ہے تو لیلا چٹنس کو بالکل اسی انداز میں غمزدہ اور شکست خوردہ دکھایا گیا ہے۔ فلم وقت (سنیل د، سادھنا، شرمیلا، ششی اور راجکمار) میں لیلا چٹنس نے ایک امیر زادی کا رول ادا کیا۔ اس فلم میں وہ شرمیلا ٹیگور کی ماں بنتی ہے۔ لیکن چونکہ اصل رول اچلا سچدیو (بلراج ساہنی کی بیوی اور سنیل، ششی اور راجکمار کی ماں) کا ہوتا ہے۔ اس لئے اس فلم میں لیلا چٹنس متاثر نہ کرسکی۔ لیکن آوارہ (نرگس، راج کپور) میں اس نے پرتھوی راج کی بیوی اور راج کپور کی ماں کے رول میں بیحد متاثر کیا۔ جن دنوں لیلا چٹنس پھول اور پتھر میں او پی رلہن کی ڈائریکشن میں ایک غریب فقیرنی کا رول کررہی تھی ان دنوں ان کی طبیعت خراب تھی اور پاؤں میں شدید درد کے سبب وہ چل بھی نہیں پاتی تھیں لیکن ان کے اسٹوڈیو میں داخل ہوتے ہی فلم کے ہیرو دھرمیندر زمین پر بیٹھ کر ان کا پاؤں اپنی جانگھ پر رکھ کر تقریباً ایک گھنٹے تک تیل کی مالش کرتے تھے، اگرچہ وہ انہیں لاکھ روکتی تھیں کہ وہ اتنے بڑے اداکار ہیں اور ان کے لئے یہ سب زیب نہیں دیتا لیکن وہ ان کی خدمت ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح سے کرتے تھے اسی لئے لیلا چٹنس دلیپ کمار کے بعد دھرمیندر کو بیحد پسند کرتی تھیں۔

☆☆☆

مشہور اداکارہ وگلوکارہ۔ خورشید

سیّد ناظر حسین عزیز

۱۸/اپریل ۲۰۰۱ء کو مشہور اداکارہ وگلوکارہ خورشید کا کراچی میں ۸۷ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ۱۴/اپریل ۱۹۱۴ء کو خورشید پنجاب کے ضلع لاہور کے قریب ایک گاؤں چوٹیاں میں نہایت ہی تعلیم یافتہ اور باعزت گھرانے میں پیدا ہوئی تھیں۔ اُنکے والد پنجاب کے ہائی کورٹ لاہور کی عدالت عالیہ کے ناظر تھے۔ خورشید کو بچپن میں دینیات، اخلاقیات، اُردو، فارسی، عربی، پنجابی، انگریزی کی تعلیم دلوائی گئی اور وہ اُن میں ماہر ہوگئیں۔ خورشید کو اس بات پر فخر ہے کہ اُسے علامہ اقبالؔ کی گود میں کچھ عرصہ کھیلنے کا شرف حاصل رہا۔ دراصل اُن کا رہائشی مکان علامہ اقبال کے مکان کے عین بالمقابل تھا اسی لئے اُن کا خاصا وقت علامہ اقبالؔ کے گھر میں گزرتا تھا۔ علامہ اقبالؔ کی اُن پر شفقت کا یہ عالم تھا کہ اُنہوں نے طفلانہ شرارتوں کا نہ تو کبھی نوٹس لیا اور نہ ہی کبھی اس سے ناراض ہوئے۔

تیسری اور چوتھی دہائی میں خورشید کا شمار صفِ اوّل کی ہیروئنوں میں ہوتا تھا۔ دراصل وہ ایک ماہر فن ممثلہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین مغنیہ بھی تھیں۔ آج بھی جب کبھی اُس کا گایا ہوا کوئی گیت کسی ریڈیو اسٹیشن یا ٹی وی چینل سے نشر ہوتا ہے تو بڑے ذوق وشوق کے ساتھ سنا جاتا ہے اور اُس دور کی یاد تازہ ہوجاتی ہے، جب اُن کے گائے ہوئے گیت برصغیر ہندوپاک کے ہر شہر، گلی کوچوں اور بازاروں میں بچے بچے کی زبان پر ہوتے تھے۔ بچپن میں فلمیں دیکھ دیکھ کر خورشید نے خود بھی اداکارہ بننے کا فیصلہ کرلیا تھا اور جب اپنے اس ارادہ کا اظہار کیا تو اس کے خاندان میں ہلچل مچ گئی تھی۔ اسے ارادہ سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی لیکن انہوں نے بغاوت کرکے لاہور کی ایک فلم کمپنی ''ہند ماتا سنے ٹون'' میں ملازمت اختیار کرلیں۔ اُنہیں پہلی بار ایک پنجابی فلم ''مرزا صاحبان'' میں بحیثیت ہیروئن پردۂ سیمیں پر آنے کا موقع مل گیا۔ عروج احمد عروج جالنہ کا کہنا ہے کہ خورشید کا اصل نام ارشاد بیگم تھا، وہ اپنے ایک رشتے کے بھائی کے ساتھ ۱۹۳۱ء میں گھر چھوڑ کر کلکتہ چلی گئیں اور مدن ٹاکیز کلکتہ میں نوکری حاصل کرلیں اور مس شیلا کے فلمی نام سے فلموں میں کام کرنے لگیں۔ لیکن اُن کی یہ بات سچ معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اس وقت کے فلمی رسالے اور اخبارات میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا بلکہ اُن کی پہلی فلم پنجابی ''مرزا صاحبان'' کو ہی بتایا جاتا ہے۔

خورشید اچھی اداکارہ ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی گلوکارہ بھی تھیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ فلمی زندگی اختیار کرنے سے پہلے وہ موسیقی کے فن سے نابلد تھیں۔ لیکن بہت تھوڑے عرصہ میں انہوں نے اس فن میں پوری

مہارت حاصل کرلی تھی۔بچپن سے ہی اُن کی آواز میں رس تھا،لوچ تھی،ایک سرور ایک مٹھاس اُن کی آواز میں پائی جاتی تھی جو سننے والے پر اثر کرتی اور مسحور کر دیتی تھی۔بعد میں رقص میں بھی کمال حاصل کرلیا۔عذرا میر،اے آر کاردار،وجاحت مرزا،چنگیزی،ضیاء سرحدی کے ساتھ کام کر کے وہ اُن کے ہدایت کاروں کی قابلیت سے متاثر بھی ہوئیں اور اُن سے بہت کچھ سیکھا بھی۔اُس زمانے میں ہیرو اور ہیروئن کو اپنے گانے خود گانے پڑتے تھے۔خورشید نے بھی اپنے گانے خود ہی گائے۔گانوں اور اداکاری میں کمال حاصل کیا اور فلمی دنیا میں اپنا نام روشن کیا۔خورشید کی پہلی ہندی فلم ''خبردار'' تھی۔اسے مہالکشمی سنےٹون ممبئی نے بنائی تھی۔یہ فلم ۱۹۳۵ء میں ریلیز ہوئی۔اُن کی آخری ہندی فلم ''ہندوستان میں پپیہارے'' تھی جسے کلد یپ پکچرز ممبئی نے بنائی تھی یہ فلم ۱۹۴۸ء میں ریلیز ہوئی۔خورشید نے ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۸ء تک ۱۴ سال میں ۴۶ ہندی فلموں میں اور دو پنجابی فلموں (جملہ ۴۸) میں کام کیا۔اُنہوں نے ''ماڈرن پکچرز'' کے نام سے اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کی اور اس کمپنی کے بینر تلے ایک پنجابی فلم ''پٹولا'' تیار کی۔یہ فلم ۱۹۴۲ء میں ریلیز ہوئی۔۱۹۴۶ء میں خورشید نے اپنے ساتھی اداکار لالہ یعقوب سے شادی کرلی۔اُنہیں اپنے شوہر سے بے حد محبت تھی اور وہ ایک شریف بیوی کی حیثیت سے انتہائی خوش وخرم زندگی بسر کررہی تھیں۔وہ برقع بھی پہننے لگی تھیں۔امریکہ کی سیاحت کے دوران اُن کی صبح نماز فجر سے شروع ہوتی تھی اور رات عشاء کی نماز سے۔قیام پاکستان کے بعد خورشید اپنے شوہر کے ساتھ ۱۹۴۸ء میں ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلی گئیں اور کراچی میں اپنی بقیہ زندگی گذاریں۔وہاں بھی اُنہوں نے چند فلموں میں اداکاری کی اور گانے بھی گائے۔کچھ اختلاف کے بنا پر دونوں شوہر اور بیوی میں علیحدگی ہوگئی اور ۱۹۵۹ء میں طلاق ہوگئی۔بعد میں خورشید نے ایک بزنس مین یوسف بھائی سے شادی کرلی اور آخر ۱۸/اپریل ۲۰۰۱ء کو اُن کا انتقال ہوگیا۔اُن کی چند فلمیں خبردار، چراغ حسن،غیبی ستارہ،سورگ کی سیڑھی،اعلان جنگ ،شوخ دلربا، سپہ سالار،ایمان فروش،ساقی،پریم سادھی،مدھرملن،کون کسی کا،میری آنکھیں،ڈائر آف انڈیا،آپ کی مرضی،آندھی ،مسافر، بیٹی پردیسی ،شادی،بھگت سورداس،چاندنی،تان سین،زمین،ممتاز محل،مورتی،نیلم،پربھو کا گھر،کون پردیسی،منجدھار،مٹی،آپ بیتی،پپیہارے تھیں۔

☆☆☆

اپنے عہد کی ایک مشہور اداکارہ۔سلوچنا

ششر شرما

کولہاپور سے ۳۰ میل کی دوری پر کھڈ کلاٹ گاؤں واقع ہے۔اسی گاؤں میں ۳۰/جولائی ۱۹۲۹ء کو میری پیدائش ہوئی تھی۔میرے والد کولہاپور ریاست کے داروغہ تھے۔گھر میں والدین کے علاوہ مجھ سے دس سال بڑا ایک بھائی تھا اور گاؤں کے نام سے ہم لوگ لاٹکر کہلاتے تھے۔گاؤں کے ہی پرائمری اسکول میں میری تعلیم ہوئی۔حالانکہ پڑھائی میں میری دلچسپی نہیں تھی،گاؤں کی درگاہ میں عرس کے دوران ہونے والے 'تماشا، ناٹک اور فلمیں' میں بہت شوق سے دیکھتی تھی اور اکثر چلتی پھرتی تصویروں کا راز جاننے کے لیے پردہ کے پیچھے بھی جھانکتی تھی۔میں ۱۲ برس کی تھی جب ماں باپ دونوں گزر گئے اور ہمارے ہی ساتھ رہنے والی بچپن میں ہی بیوہ ہوئیں موسی ہم دونوں بھائی بہن کو پالنے لگیں۔انہیں دنوں پلیگ پھیلا اور ہمیں اپنا گھر بار چھوڑ کر پاس ہی کے 'چگوڑی' گاؤں میں جانا پڑا۔ جہاں میرے والد کے وکیل دوست بیناڈیکر رہتے تھے۔ان کے شاگرد اور ننداکے والد ماسٹر ونایک ایک روز ان سے ملنے آئے تھے موسی کے کہنے پر ماسٹر ونایک نے مجھے کولہاپور بلالیا۔اس طرح ۱۹۴۳ء میں مجھے ان کی فلم کمپنی 'پرفل پکچرس' میں نوکری پر رکھ لیا گیا۔جہاں اسمرتی گپتے اور مناکشی شرودکر جیسی تعلیم یافتہ اداکارائیں پہلے ہی سے کام کرتی تھیں۔میں چونکہ صرف پرائمری پاس تھی اور ہندی کے نام پر صفر تھی اس لیے گھبرائی ہوئی رہتی تھی۔ایسے وقت میں اسی کمپنی میں کام کرنے والی لتا منگیشکر نے مجھے بہت سہارا دیا جن سے اس دوران ہوئی میری جگری دوستی آج تک چلی آرہی ہے۔'پرفل پکچرس' تو تین مہینے بعد ہی ممبئی منتقل ہوگئی لیکن شہر کے نام سے گھبرا کر میں نے کولہاپور میں ہی رہنا بہتر سمجھا جہاں مذہبی اور تاریخی فلمیں بنانے کے لیے مشہور بھال جی پنیڈھارکر کے جے پربھا اسٹوڈیو میں ۳۰ روپے ماہانہ کی تنخواہ پر مجھے نوکری مل گئی۔پرفل پکچرس کی وسنت راؤ جوگ لے کر کی ہدایت کاری میں مراٹھی فلم 'چمیکلا سنسار' میں حالانکہ ایک بے حد چھوٹے سے کردار میں کیمرے کا سامنا کر چکی تھی لیکن صحیح معنوں میں میں نے کام جے پربھا اسٹوڈیو میں سیکھا جہاں بھال جی ہمیں لاٹھی،تلوار چلانا،گھوڑسواری وغیرہ کرنا سکھاتے تھے۔ان کی ہندی فلمیں 'مہارتھی کرن' اور 'بالمیکی' میں میں نے اداکاری کی اور پھر مراٹھی فلم 'ساسرواس' میں پہلی مرتبہ میں ہیروئن بنی۔جس میں میرے ہیرو ماسٹر وٹھل تھے۔بھال جی نے ہی مجھے 'نگابائی' اور 'رنگو' کی جگہ یہ فلمی نام سلوچنا دیا تھا۔اسی دوران ۱۵ برس کی عمر میں کولہاپور کے ایک زمیندار گھرانہ کے آباصاحب چوہان سے میری شادی ہوگئی۔

۱۹۴۸ء میں سیاسی اتھل پتھل کی وجہ سے جب جے پر بھا اسٹوڈیو جلا دیا گیا تو میں پونے چلی آئی اور کولہاپور کے ہی کچھ لوگوں کی کمپنی 'منگل پکچرس' کی فلم 'جیوا چا سکھا' میں اداکاری کرنے کے بعد پوری طرح مراٹھی فلموں میں مصروف ہوگئی۔ رنجیت اسٹوڈیو کے مالک چندولال شاہ میری ایک ہٹ مراٹھی فلم 'استری جنم تجھی کہانی' کا ہندی ریمیک بنانا چاہتے تھے۔ اس لیے ۱۹۵۳ء میں مجھے ممبئی آنا پڑا۔ ۱۹۵۴ء میں ریلیز ہوئی اس فلم 'عورت تیری یہی کہانی' میں میرے ہیرو بھارت بھوشن تھے۔ پھر انوپ کمار کے ساتھ 'سجنی'، سریندر کے ساتھ 'بھرت کبیر'، موتی لال کے ساتھ 'مکتی' اور سپرو کے ساتھ 'سنت نام دیو' فلمیں کیں۔ ان میں سے تو کوئی نہیں چل پائی لیکن ''ستی انوسویا'' کی زبردست کامیابی نے مجھے مذہبی فلموں کی اسٹار بنا دیا۔ تب ہی ایک دن بمل رائے نے فلم 'سجاتا' میں ماں کے کردار کے لیے مجھے بلایا۔ درگا کھوٹے اور للیتا پوار کے مشورے پر تذبذب کی حالت سے باہر آ کر میں نے کیریکٹر کردار کے لیے خود کو تیار کیا اور اس فلم کی کامیابی کے بعد میں سماجی فلموں کی بے حد مقبول ترین اداکارہ بن گئی۔ 'دل دے کے دیکھو، سنگھرش، ریشما اور شیرا، آئی ملن کی بیلا، دنیا، آئے دن بہار کے، جانی میرا نام، ساجن، مجبور، کسوٹی، سنیاسی، کرانتی، پریم نگر، کٹی پتنگ، کورا کاغذ، اندھا قانون، مقدر کا سکندر، گنگا کی سوگندھ اور رام پور کا لکشمن، جیسی چھٹی اور ساتویں دہائی کی کئی فلموں میں اداکاری کی۔ ساتھ ہی لمبے عرصے تک مراٹھی فلموں میں ہیروئن کی اپنی پوزیشن بھی برقرار رکھی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ کام پڑتا چلا گیا۔ اور بڑھتی عمر کی وجہ سے گزشتہ کچھ وقت سے تو میں اداکاری سے تقریباً آزاد ہو چکی ہوں۔ 'شانتا ایوارڈ، آندھرا پردیش جرنلسٹ ایسوسی ایشن ایوارڈ، ماسٹر دینا ناتھ منگیشکر ایوارڈ، کلا شری، امپا ایوارڈ، اور بھارت سرکار کے پدم شری سمیت مجھے ملے تقریباً چالیس سے بھی زیادہ اعزازات کی فہرست میں اس سال فلم فیئر لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ کا نام جڑ چکا ہے۔

معروف مراٹھی اسٹیج آرٹسٹ اور فلم اداکار مرحوم ڈاکٹر کاشی ناتھ تھانیکر میرے داماد تھے۔ ان کے نام سے جاری ٹرسٹ کے ذریعہ ہر سال مشہور ترین اسٹیج آرٹسٹوں کو ایوارڈ دیے جاتے ہیں۔ فی الحال میں اس آرٹسٹ کے علاوہ مہاراشٹر سرکار کے راج کپور اور شانتا ایوارڈوں کی کمیٹی سمیت مختلف سرکاری و سماجی ٹرسٹوں اور رفاحی تنظیموں سے جڑی ہوئی ہوں۔ جن کا کام کاج دیکھنے میں ہی میرا سارا وقت گزر جاتا ہے۔

☆☆☆

فلم ''شعلے'' کی موسی۔ لیلا مصرا

انیس امروہوی

یو۔ پی کا شہر بنارس یوں تو اپنے مندروں اور ٹھگوں کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے، مگر کبھی کبھی ایسے شہروں میں کچھ پاکیزہ روحیں بھی جنم لیتی ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں ایسی ہی ایک روح نے وہاں جنم لیا..... لیلا مصرا نام کی جس لڑکی کا جنم بنارس میں ہوا، صرف بارہ برس کی عمر میں اس کی شادی آر۔ مصرا صاحب سے ہوگئی، جو اُس وقت طالب علم تھے، مگر ڈراموں اور فلموں کے بڑے شوقین تھے اور اُن کا کافی وقت ڈرامہ کمپنی میں گزرتا تھا۔ اس زمانے میں آغا حشر کاشمیری ڈراموں کی دنیا کے بے تاج بادشاہ تھے اور ان کے ڈراموں میں عورت کا کردار ایک خطرناک ہستی کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ نمک حرام، زہریلی ناگن اور بے وفا عورت سے ہوشیار رہنے کی تلقین ہوتی تھی۔ حالانکہ بعد میں آغا حشر کاشمیری خود ایک اداکارہ کے جال میں ایسے پھنسے کہ خود کو تباہ کر لیا۔

آغا حشر کاشمیری کی ڈرامہ کمپنی میں لیلا مصرا کے شوہر آر۔ کے۔ مصرا کا آنا جانا تھا۔ وہیں ان کو کسی نے رائے دی کہ ڈراموں کو چھوڑ کر فلموں کا رُخ کریں۔ یہ وہ دور تھا جب فلموں نے بولنا شروع ہی کیا تھا اور دھیرے دھیرے فلموں کے اثرات سماج میں پھیلنے لگے تھے، لہٰذا مصرا جی نے بہت سی باتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بنارس سے بمبئی کا رُخ کیا اور بمبئی کی ایک فلم کمپنی میں ملازمت کر لی۔

مصرا جی بمبئی میں اکیلے رہتے تھے اور ان کے کھانے پینے کا انتظام اُن کے پڑوس میں رہنے والی ایک اداکارہ مہر سلطانہ کیا کرتی تھی۔ مہر سلطانہ کے مشورے پر ہی مصرا جی نے اپنی بیوی کو بمبئی بلا لیا۔ اس طرح آج ہم فلمی پردے پر جس موسی کو دیکھتے ہیں، وہ اپنے شوہر کا کھانا بنانے کے لئے بنارس سے بمبئی آئی تھیں۔

فلمی دنیا میں کئی اداکارائیں اپنے کسی بہترین فلمی کردار کے لئے مشہور ہوئیں، جیسے للیتا پوار کو دیکھتے ہی ساس کا تصور ذہن میں آجاتا ہے یا نروپا رائے کو دیکھتے ہی ممتا بھری ماں یاد آجاتی ہے۔ اسی طرح پردے پر لیلا مصرا کو دیکھتے ہی صرف اور صرف موسی کا خیال ہی ذہن میں اُبھرتا ہے۔ یہ اپنے کردار کے ساتھ پورے خلوص اور لگن کے ساتھ کمال حاصل کرنے کا بہترین ثبوت ہے۔ لیلا مصرا نے فلمی موسی کے کردار کو جس

خوبصورتی اور فنکارانہ مہارت کے سات پیش کیا ہے، اس کی مثال فلمی دنیا میں نہیں ملتی۔

لیلا مصرا کا کوئی ارادہ فلموں میں آنے کا نہیں تھا۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق کی بات ہے۔ فلموں میں اُن کے شوہر کو کوئی کامیابی نہیں مل رہی تھی۔ تبھی ناسک کی ایک فلم کمپنی سے ان کے لئے فلم میں ایک چھوٹا سا کردار کرنے کا آفر آیا جسے سن کر وہ حیران رہ گئیں۔ کیوں کہ وہ بنارس میں اپنے شوہر کے ساتھ فلمیں دیکھتی ضرور تھیں، مگر وہ زیادہ تر دھارمک یا جادوئی فلمیں ہوا کرتی تھیں۔ ان کے نزدیک سنیما کوئی جادوئی تماشہ ہی تھا۔ شوہر کے سمجھانے پر وہ اس فلم کمپنی میں کام کرنے کو تیار ہو گئیں اور پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ طے ہوئی۔

موسی کو اس وقت بہت غصہ آیا جب اس کمپنی کی فلم کے لئے ایک مرد میک اپ مین نے ان کا میک اپ کرنا شروع کیا۔ کسی غیر مرد کا اپنے جسم کو ہاتھ لگوانا ان کے لئے بڑی غیرت کی بات تھی اور یہ سب کچھ اُن کے شوہر کی موجودگی میں ہی ہو رہا تھا۔ اس لئے ان کا غصہ اپنے شوہر پر ہی تھا۔ اسی طرح کسی غیر مرد کے ساتھ محبت کے جذباتی سین کرنا بھی ان کے لئے مشکل ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں وہ اس فلم میں کوئی بھی کردار ادا نہیں کر پائیں۔

ناسک کے جس مکان میں یہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے، اس کے عین سامنے ایک ہوٹل تھا۔ ہوٹل کی بالکنی سے ایک شخص روز موسی کو گھورتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ لہٰذا موسی نے اپنے شوہر سے شکایت کی اور مردانہ غیرت کی وجہ سے مصرا صاحب نے ہوٹل کے مینیجر سے اس شخص کی شکایت کی، مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ کولہا پور سے ٹون کمپنی کا فنانسر اور ڈائریکٹر ہے اور اپنی کمپنی کی طرف سے موسی کو فلموں میں سائن کرنا چاہتا ہے۔ موسی کے ہاں کرنے پر کولہا پور سنے ٹون کے مینیجر دادا صاحب کو اطلاع دی گئی۔ انہوں نے موسی کو کولہا پور کے سفر خرچ کے لئے چار سو روپے بھجوا دیئے۔ یہ رقم موسی کی زندگی کی بہت بڑی رقم تھی۔

لیلا مصرا اپنے شوہر کے ساتھ کولہا پور پہنچ گئی اور پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ فلم تھی ''بھکارن''۔ ماسٹر ونائک ہیرو اور رتن بائی ہیروئن تھیں۔ موسی کا کردار تھا ہیرو کو اپنی محبت کے جال میں پھنسانے والی عورت کا۔ ہدایتکار تھے گجانن جاگیردار۔ ہدایتکار کی لاکھ کوشش کے باوجود موسی اس طرح کے جذباتی سین نہیں کر سکی۔ یہاں تک کہ ماسٹر ونائک کو ''ناتھ'' کہہ کر پکارنا تک موسی کے لئے ناممکن سا تھا۔ لہٰذا یہ چانس بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ بعد میں یہ کردار پرمیلا نے ادا کیا، مگر موسی کی ملازمت برقرار رہی۔ کمپنی کی

طرف سے دو سال کا معاہدہ تھا اور تنخواہ برابر مل رہی تھی۔ لہٰذا کمپنی نے موسی کو اپنی فلم ''ہونہار'' میں ساہو مودک کی ماں کا کردار دے دیا۔ اس وقت موسی کی عمر ۱۷ار برس تھی۔ اور ساہو مودک ان سے عمر میں بڑے تھے۔ مگر موسی کو ماں بننا ہی پڑا کیوں کہ ہیروئن بن کر کسی غیر مرد کے ساتھ فلمی پیار کرنا موسی کے بس کی بات نہ تھی۔

بعد میں کولہا پور سنے ٹون کی ہی اگلی فلم ''گنگا وترن'' میں موسی نے ہیروئن کا رول ادا کیا۔ یہ فلم ایک ہیروئن کے طور پر ان کی پہلی اور آخری فلم ثابت ہوئی۔ اس فلم میں موسی کو پاروتی بننا تھا اور شیو جی کی پوجا کرنی تھی۔ لہٰذا اس کردار کو انہوں نے با آسانی کرلیا۔ موسی کے لئے رومانی ہیروئن کا کردار ادا کرنا لوہے کے چنے چبانے کے برابر تھا۔

کریکٹر ایکٹر جیون ان دنوں نئے نئے آئے تھے اور فلمی دنیا کی دو اداکارائیں ایک ساتھ ان پر فدا ہو گئی تھیں۔ ان دنوں موسی کی موجودگی میں شوٹنگ کے دوران جیون کے معاملے کو لے کر اُن دونوں اداکاراؤں میں اتنی لڑائی ہوئی کہ نوبت ہاتھا پائی اور گالی گلوج تک پہنچ گئی۔ موسی یہ واقعہ حیرت واستعجاب سے دیکھ رہی تھیں۔ بعد میں ان میں سے ایک اداکارہ سے موسی نے پوچھا کہ آخر جیون کوئی خوبصورت نوجوان تو ہے نہیں، جو اس کی وجہ سے دو اداکارائیں جان کی بازی لگائی ہوئی ہیں۔ اس پر اس اداکارہ نے برجستہ جواب دیا کہ ''جیون کی صورت پر مت جاؤ موسی.....'' اس جملہ کا باقی حصہ موسی بھی سنانے سے قاصر تھیں۔ مگر یہ واقعہ ان کو آخر تک یاد رہا۔ آج جیون بھی اس دنیا میں نہیں ہیں۔

''گنگا وترن'' کی شوٹنگ کے دوران ہی فلم ''ولاسی ایشور'' کے لئے شوبھنا سمرتھ بھی کولہا پور سنے ٹون کمپنی میں داخل ہوئی تھیں اور ''گنگا وترن'' کی تکمیل کے ساتھ ہی موسی کا کمپنی سے معاہدے کا وقت بھی پورا ہو گیا تھا اور وہ حاملہ بھی تھیں۔ لہٰذا اس فلم کی شوٹنگ مکمل کراتے ہی وہ اپنے شوہر کے ساتھ بنارس چلی آئیں جہاں انہوں نے ایک لڑکی کو جنم دیا جو فلم اداکارہ نوتن کی عمر کی تھی اور بیوہ ہونے کے بعد موسی کے ساتھ ہی بمبئی میں رہتی تھی۔ موسی کی دوسری بیٹی ازدواجی زندگی میں خوش ہے۔ موسی نے فلموں سے کمائی دولت سے بنارس میں جائیداد بنائی جس کی دیکھ بھال ان کا لڑکا گوپل کرتا ہے۔

آج ہم جس فلمی موسی کو جانتے ہیں، وہی لیلا مصرا اپنی جوانی کے دنوں میں ہی ماں اور موسی کے کردار ادا کرنے لگی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کہیں موسی کا ذکر آتا ہے تو فوراً لیلا مصرا کا چہرہ اور ان کا بار بار ایک ہاتھ سے

دوپٹہ کوسر پر درست کرنا آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ لیلا مصرا نے اپنے فلمی سفر میں بہت سے لوگوں کو بنتے بگڑتے دیکھا ہے۔ بہت سے لوگوں کا عروج اور زوال دیکھا ہے.... مینا کماری کو دیکھا ہے، ان کی بڑی بہن خورشید کو دیکھا ہے۔ جس زمانے میں خورشید ہیروئن ہوا کرتی تھی، مینا کماری بہت چھوٹی تھی اور پھر لیلا مصرا کے دیکھتے ہی دیکھتے مینا کماری نے شہرت اور مقبولیت کے آسمان پر اپنا نام سنہرے حروف میں لکھا۔ لیلا مصرا کے سامنے ہی مینا کماری اپنے بہی خواہوں کے ذریعہ لٹتی رہی اور پھر ایک دن لمبی بیماری کے بعد اس دنیا سے کوچ کر گئی۔ لیلا مصرا نے مدھو بالا کے کمال اور زوال کا زمانہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ نروپا رائے اور شیاما کو دیکھا، دلیپ کمار، دھرمیندر کو دیکھا، محبوب خان، کاردار، شانتارام اور چندولعل شاہ کا زمانہ بھی دیکھا۔

لیلا مصرا نے محبوب خان کی فلم ''انمول گھڑی'' اور ''اعلان'' میں کام کیا تھا۔ اس زمانے میں محبوب خان کو بے خوابی کی بیماری تھی۔ رات کو دیر سے سوتے تھے اور صبح کو دیر سے جاگتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کی فلموں کی شوٹنگ شفٹ دوپہر کو دیر سے شروع ہوتی تھی۔ اور رات کو دیر تک چلتی تھی۔ فلم کے ہر فنکار کو میک اپ کر کے سیٹ پر تیار ہو کر بیٹھے رہنا پڑتا تھا۔ چاہے اُس کے شاٹ کسی وقت بھی ہوں۔ ''اعلان'' کی شوٹنگ کے دوران لیلا مصرا نو دن تک اسی طرح میک اپ کئے بغیر شوٹنگ کئے بیٹھی رہیں۔ ''انمول گھڑی'' اور ''اعلان'' کے بعد محبوب خان کی کسی فلم میں لیلا مصرا کو کام کرنے کا موقع نہ ملا۔ مگر ان کے اسٹوڈیو میں دوسری فلموں کی شوٹنگ کے دوران محبوب خان سے ملاقات اکثر ہو جاتی تھی۔ انہوں نے اپنا اسٹوڈیو بنا لیا تھا۔ ان ہی ملاقاتوں کے دوران محبوب خان نے ایک دن لیلا مصرا کو بتایا کہ جب وہ جیوتی اسٹوڈیو میں ایکسٹرا کے طور پر کام کیا کرتے تھے، تب ان کو ایک روپیہ روز ملا کرتا تھا۔ لیلا مصرا نے تب محبوب خان سے کہا تھا کہ اُس ایک روپیہ کی بنیاد پر ہی آج وہ لاکھوں کا محبوب اسٹوڈیو تعمیر کر پائے ہیں۔

لیلا مصرا نے نور جہاں کے ساتھ ''انمول گھڑی'' میں کام کیا تھا۔ ثریا کا زمانہ بھی انہوں نے دیکھا تھا اور بعد کی ثریا کو بھی دیکھا۔ شمی کپور کے ابتدائی دور کے دن بھی انہیں یاد تھے جب وہ مہیش کول کی فلم ''جیون جیوتی'' میں آئے تھے اور مہیش کول ان کو ''بھوندو'' کہا کرتے تھے۔ تب شمی کپور فلمساز ہدایتکار کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ پھر فلمساز و ہدایتکار کو شمی کپور کے اشاروں پر بھی ناچتے دیکھا۔ ''جیون جیوتی'' سے شمی کپور کے ساتھ ہی چاند عثمانی نے بھی فلموں میں داخلہ لیا۔ اس طرح چاند عثمانی کے پہلے ہدایتکار مہیش کول ہی تھے، تب

انہوں نے چاند عثمانی کو اداکاری کی تعلیم دیتے ہوئے کہا تھا....''اگر تمہیں اداکاری سیکھنی ہے تو موسی کی اداکاری کو غور اور باریکی سے دیکھو، کیونکہ موسی اپنے آپ میں اداکاری کا ایک اسکول ہیں۔''

مہیش کول کے ساتھ ہی موسی کو ہدایتکار کیدار شرما بھی بہت پسند تھے۔ راج کپور کی ہدایت میں بھی موسی نے کام کیا تھا۔ راج کپور کسی زمانے میں کیدار شرما کے اسسٹنٹ ہوا کرتے تھے۔ راج کپور کی ہدایت میں بنی پہلی فلم ''آوارہ'' میں موسی نے بھی ایک کردار ادا کیا تھا۔ اس رول کو کرنے کی بات کرنے کے لئے راج کپور خود ہی موسی کے گھر گئے تھے، جس کرسی پر راج کپور بیٹھے تھے، وہ ٹوٹی ہوئی تھی یعنی اس کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔ راج کپور نے کرسی پر بیٹھتے ہی جوکروں والی حرکتیں شروع کر دیں جس کے نتیجہ میں وہ بڑے زور سے کرسی کے نیچے گر پڑے اور اپنی حرکتوں پر بہت شرمندہ ہوئے۔ ''آوارہ'' میں موسی کا جو چار دن کا کام تھا، وہ تین دن میں ہی ختم ہو گیا۔ پروڈکشن منیجر نے موسی کو تین دن کے پندرہ سو روپے کا چیک کاٹ کر دے دیا۔ موسی کو چونکہ احساس تھا، لہٰذا انہوں نے بھی تین دن کے پیسے خاموشی سے لے لئے۔ اس بات کو کافی دن بیت گئے تھے۔ ایک دن موسی شری ساؤنڈ اسٹوڈیو میں شوٹنگ کر رہی تھیں، وہیں پر دوسرے فلور پر ''آوارہ'' کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ لنچ بریک میں موسی یوں ہی گھومتی ہوئی ''آوارہ'' کے سیٹ پر پہنچ گئیں۔ موسی کو دیکھتے ہوئے راج کپور منہ چھپائے اداکاری کرتے ہوئے بولے۔ ''موسی، میں آپ کا گنہگار ہوں''۔

''کیسا گنہگار؟'' موسی نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی آپ کے ایک دن کے پانچ سو روپے مجھ پر قرض ہیں جو آپ کو ادا کرنے سے رہ گئے تھے۔'' راج کپور نے وضاحت کی۔

''مگر کام تو تین دن میں ہی ختم ہو گیا تھا۔'' موسی نے بات واضح کرتے ہوئے کہا۔

''ہو گیا ہو گا مگر کانٹریکٹ میں تو چار ہی دن کا تھا۔'' راج کپور بولے۔ ''چوتھے دن کے پیسے اصولی طور پر مجھے دینے ہی چاہئیں۔'' یہ بات کہتے ہوئے راج کپور نے اپنی چیک بک منگوائی اور چیک کاٹ کر موسی کے ہاتھ میں دے دیا۔ موسی نے چیک پر نظر ڈالی تو حیرت کا اظہار کرتی ہوئی بولیں۔

''ایک دن کے تو صرف پانچ سو روپے ہی بنتے ہیں۔ آپ نے غلطی سے چیک پر ایک ہزار لکھ دیا ہے''۔

''غلطی سے نہیں، یہ تو جرمانہ ہے۔'' راج کپور بولے۔

''جرمانہ؟'' موسی حیرت سے راجکپور کی طرف دیکھتی ہوئی بولیں۔

''اورنہیں تو کیا۔آپ کی جگہ کوئی بڑا اسٹار ہوتا تو میں اس کے پیسے فوراً ادا کر چکا ہوتا۔اتنا ہی نہیں بلکہ خود اس کے گھر بھجوادیتا۔لیکن اتنے دن تک آپ کے پانچ سو روپے میری طرف جرمانہ کے ہیں۔''اس طرح راج کپور کا قرض معہ سود ادا ہوا۔

اسی طرح منوج کمار کی ایک فلم ''پورب اور پچھم'' میں موسی نے ایک چھوٹا سا کردار ادا کیا تھا۔اس کی چار دن کی شوٹنگ کے لئے منوج کماران کو پونا لے گئے تھے۔راج کپور کے راج باغ میں شوٹنگ چل رہی تھی لیکن تین دن تک موسی ہوٹل میں اسی انتظار میں بیٹھی رہیں کہ کب شوٹنگ کا بلاوا آتا ہے،مگر بلاوا تھا کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔حالانکہ طے شدہ رقم یومیہ موسی کو مل رہی تھی۔چوتھے دن شوٹنگ ہوئی۔موسی کو صرف ایک مکالمہ بولنا تھا..... ''گونا آوت ہے۔''....بس مشکل سے۔آدھے گھنٹے کی شوٹنگ تھی،جو کہ فلم میں صرف چار سکنڈ کا سین ہوتا۔اتنے سے کام کے منوج کمار نے انہیں چار دن کے پیسے دیے۔چار دن پونا کے ہوٹل میں ٹھہرایا۔موسی کو بڑی حیرت تھی تب منوج کمار نے موسی کو سمجھایا۔''موسی،آپ کو چار دن کے پیسے دینے کا مجھے کوئی افسوس نہیں،بلکہ خوشی ہے۔کیونکہ ''گونا آوت ہے'' کہتے ہوئے آپ نے گردن کو جس خوبصورتی سے جھٹکا دیا ہے،وہ بے مثال ہے،اوراسی سے میرے سارے پیسے وصول ہو گئے۔

دلیپ کمار کے ساتھ بھی تو موسی نے کئی فلموں میں کام کیا۔رمیش سہگل کی فلم ''شکست'' میں بھی دلیپ کمار کے ساتھ موسی تھیں اور ''رام اور شیام'' کی موسی کو بھلانا تو بہت ہی مشکل ہے۔دھرمیندر کے ساتھ بھی موسی نے کئی فلموں میں کام کیا ہے۔

فلمی دنیا کی تاریخ میں تو موسی کا نام نمایاں حروف میں لکھا ہی جائے گا۔اس کے ساتھ ہی ٹی۔وی پر موسی نے کئی سیریلس میں بڑی مقبولیت حاصل کی تھی اورٹی۔وی کے ذریعے موسی گھر گھر پہنچ گئی تھیں،جس کے نتیجے میں ہندوستان کا بچہ بچہ اب لیلا مصرا کو صرف موسی کے ہی نام سے جانتا ہے۔موسی نے چھ سو سے زائد فلموں میں اداکاری کی۔اُن کی آخری فلم ''مر مٹیں گے'' تھی۔ان میں سب سے مشہور فلم شعلے تھی۔

☆☆☆

پری چہرہ ''نسیم بانو''

پروفیسر یاسمین اختر

ہندی فلم کی ہیروئنوں میں ''پری چہرہ نسیم بانو'' اپنے دور کی ٹاپ کی ہیروئن تسلیم کی جاتی تھی اور لوگ انہیں ''بیوٹی کوئین'' یا پری چہرہ نسیم کہہ کر پکارتے تھے نسیم کے چہرے پر ایسی معصومیت جھلکتی تھی اور چہرہ اس قدر پرکشش اور بھولا بھالا کہ جو بھی اسے دیکھتا تھا چند محویت کے عالم میں دیکھتا رہ جاتا تھا،اس کی آنکھیں غزالی تھیں اور جو کوئی بھی ان کی آنکھوں کی طرف نظر ڈالتا،چند لمحوں کے لئے ڈوب کر رہ جاتا اور پھر بقول ڈرامہ نویس ظہیر انور،دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا۔بنگال کے سب سے بڑے ڈرامہ نویس اور اسٹیج ڈائریکٹر ظہیر انور کے بارے میں صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ ۱۹۷۰ء میں سہراب مودی کی معرکتہ الآرا فلم ''پکار'' طویل برسوں کے بعد دوبارہ براڈائیز سنیما میں ریلیز ہوئی تھی اور ظہیر انور جو اس فلم کے دوبارہ ریلیز ہونے کا شدت سے انتظار کر رہے تھے اور جس دن یہ فلم کلکتہ کے براڈائز سنیما میں ریلیز ہوئی انھوں نے بیک وقت جمعہ،سنیچر اور اتوار کے لئے چار چار ٹکٹیں بک کرالیں اور اپنے کلاس کے ساتھیوں راجہ،سلیم،ایوب،رشید،ملا اختر کے ساتھ فلم پکار کو تین دن لگاتار دیکھا اور اس کے بعد بھی تشفی نہیں ہوئی،بہرکیف پکار میں نسیم بانو،رتن موہن اور سہراب مودی کی اداکاری پر مزین فلم صحیح معنوں میں ایک ایسی دستاویزی فلم تھی جسے ہدایتکار سہراب مودی نے بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا تھا۔اگر چہ اس سے پہلے سہراب مودی اپنے منروا تھیٹرس کے بینر تلے ''سکندر'' بنا چکے تھے جس میں انھوں نے سکندر کا رول پرتھوی راج کپور کو اور پورس کا رول خود ہی ادا کیا تھا اور یہ فلم باکس آفس میں زبردست ہٹ ہوئی تھی جب انھوں نے پکار بنانے کا فیصلہ کیا تھا اور مغل شہنشاہ جہانگیر کے رول کے لئے پرتھوی راج ہی کو لینے کا فیصلہ کیا تھا لیکن نسیم بانو نے ان کی توجہ رتن موہن کی طرف دلائی جنہوں نے فلم شہید (دلیپ کمار کامنی کوشل) کے ساتھ کام کیا تھا اور عدالت کے سین میں ایک وکیل کی حیثیت سے جو اداکاری رتن موہن نے کی تھی اس اداکاری کے سامنے دلیپ کمار جیسے بڑے آرٹسٹ بھی بھونچکے رہ گئے تھے چونکہ اس زمانے میں فلم فیئر ایوارڈ کا کوئی رواج نہیں تھا ورنہ صرف عدالت کے سین کے لئے رتن موہن کو فلم فیئر ایوارڈ ضرور ملتا۔

بہرکیف نسیم بانو کے مشورے پر سہراب مودی نے رتن موہن کو ہی پکار میں شہنشاہ جہانگیر کا رول دیا اور یہ فلم ایسی کہ فرق کرنا مشکل ہوگا کہ فلم پکار عظیم تھی کہ کے آصف کی ''مغلِ اعظم'' انڈیا کے چند کلاسیک فلموں میں سکندر، پکار، روٹی، مدر انڈیا، گنگا جمنا، مغل اعظم، کے ساتھ گلزار کی کوشش اور جی پی سپی کی شعلے کو بھی کلاسیک فلموں میں جگہ دی گئی ہے جس میں وی شانتا رام کی ''دو آنکھیں بارہ ہاتھ'' بھی شامل ہیں اور جدید دور میں امراؤ جان، اور گرم ہوا (ایس ایم سیتھو) مظفر علی کے نام بھی شامل ہیں اور ساتھ ہی وجے آنند کی گائیڈ بھی۔

ہندی فلموں میں بیشتر ہیروئین تنگدست اور مفلس خاندان سے تعلق رکھتی رہی ہیں لیکن نسیم بانو کا خاندان تمول خاندان تھا جہاں پیسے کی ریل پیل تھی، دیگر ہیروئنوں کی حالت یہ تھی کہ انھوں نے پرائمری اسکولوں کا بھی منہ نہیں دیکھا تھا، جبکہ نسیم جو بیجدا میر والدین کی بیٹی تھی اس کا فلموں میں داخلہ بھی اتفاقیہ تھا۔ اس کا کانوینٹ اسکول گرمیوں کی چھٹی کی وجہ سے بند تھا اور وہ اپنی والدہ کے ساتھ بمبئی میں ایک رشتہ دار کے یہاں گھومنے گئی تھی۔ ہردن وہ اپنی میزبان سے ضد کرتی کہ اُسے فلم اسٹوڈیو دکھائے۔ پھر وہ ہرروز اسٹوڈیو جانے لگی، وہاں اس نے پرتھوی راج، ماسٹر نثار، کمار، سہراب مودی وغیرہ کو اداکاری کرتے دیکھا اور اُسے ان کی اداکاری بیحد پسند آنے لگی۔ اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر ہرکوئی متاثر تھا اور اسٹوڈیو میں اسے عزت کے ساتھ بٹھایا جاتا۔ ایک مرتبہ سہراب مودی نے اپنی فلم ''ہیملٹ'' میں ایک رول کی پیشکش کی۔ لیکن اس کی والدہ جو یہ چاہتی تھیں کہ وہ ڈاکٹر کی پڑھائی مکمل کرے اور انھوں نے نسیم کو روک دیا جس پر نسیم نے بھوک ہڑتال شروع کردی۔ اور ہر وقت روتی رہتی جس کے بعد اس کی ماں آخر مان گئی اور اسے فلم میں کام کرنے کی اجازت دے دی۔ فلم ہیملٹ نے اسے راتوں رات اسٹار کی صف میں شامل کردیا۔ لیکن فلموں میں کام کرنے کی وجہ سے اسے کالج میں داخلہ نہیں ملا۔ اس زمانے میں عورتوں کے لئے فلم میں کام کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا دوسرے وہ مسلمان تھی اور اس وجہ سے مسلمانوں کا ایک گروپ بھی اس کی زبردست مخالفت میں اتر آیا تھا، لیکن رفتہ رفتہ معاملہ دب گیا اور ہرکوئی نسیم بانو پری چہرہ کی خوبصورتی میں ڈوب کر رہ گیا۔

اس صورت حال کے بعد نسیم بانو بحیثیت اداکارہ اپنے کیریر کو بنانا شروع کردیا اور یکے بعد دیگرے کئی فلمیں لیں جن میں خون کا خون، ڈایورس (طلاق) خان بہادر، میٹھا زہر اور وسنتی شامل ہیں، تاریخ

ساز منروا موو ٹیون فلم ''پکار'' جس میں اس نے ایک مغل شہنشاہ کی بیوی نور جہاں کا رول ادا کیا تھا اور اس فلم میں اس کی اداکاری نے اسے شہرت اور مقبولیت کے آسمان پر لا بٹھایا۔ منروا موی ٹیون کی دوسری فلمیں جو سہراب مودی کی ہدایت میں بنیں جس میں نسیم بانو کی ہیروئن کا رول ملا، وہ فلمیں کامیاب رہیں،۔ خاص طور پر شیش محل جس میں اس نے ایک تباہ حال زمیندار کی بیٹی کا رول ادا کیا جس میں کپڑے بالکل معمولی اور سادہ تھے لیکن اس کی خوبصورتی کو دیکھنے کے بعد کسی کو یاد ہی نہیں رہا کہ اس نے کیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس فلم میں اس نے بغیر میک اپ کے کام کیا تھا۔

منروا موی ٹیون کی کئی ہٹ فلموں میں کام کرنے کے بعد نسیم نے فلمستان اسٹوڈیو کا رخ کیا اور اس اسٹوڈیو میں بنی پہلی فلم کا نام ''چل چل رے نوجوان'' تھا یہ فلم ۱۹۵۰ء میں ریلیز ہوئی جس میں اشوک کمار ہیرو تھے۔ نسیم کے شوہر احسان بھی بعد میں فلمساز بنے اور انھوں نے بھی نصف درجن فلمیں بنائیں ان کے پروڈکشن کا نام تاج محل پکچرز تھا۔ لیکن اس زمانے میں نسیم نے چند چھوٹی بجٹ کی معمولی فلموں میں کام کرکے اپنے کیریئر کو داغدار کردیا۔ وہ فلمیں تھیں باغی، سند بادسیلر جس میں نسیم نے سمندری ڈاکو کا رول ادا کیا تھا اور لوگوں نے اس رول میں انہیں بالکل پسند نہیں کیا۔

> اس زمانے میں ان کی ہم عمر اداکارائیں تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کرگئی تھیں جس میں نور جہاں کا نام قابل ذکر ہے مگر نسیم نے اپنا فلمی سفر بمبئی میں جاری رکھا۔ ۱۹۵۰ء کے اختتام پر نسیم بانو نے فلم سے ریٹائرمنٹ لے لیا۔ بعدازاں وہ فلم ''نوشیروانِ عادل'' میں ایک مختصر رول میں جلوہ گر ہوئی تھیں۔ بہت سارے فلمساز اسے دوبارہ فلم میں واپس لانے کے خواہاں تھے اور بہت ہی اچھے اچھے رول کی انہیں پیشکش کی تھی۔

☆☆☆

فلموں کی ظالم ساس۔للیتا پوار

خورشید اختر فرازی

ہندی فلموں میں کئی ایسے کیرکٹر ایکٹر گزرے ہیں جن کے نام فلم کی کاسٹنگ میں کہیں کونے میں نظر آتے ہیں اور ان کے ناموں پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی جیسے جاگیردار، الھاس، سپرو، نذیر حسین، کمل کپور، واسطی، کنہیالال، سلوچنا، ممتاز بیگم، مبارک بیگم، اچلا سچدیو وغیرہ وغیرہ۔لیکن یہ معاون اداکار اداکارائیں بھی کچھ ایسے یادگار رول ادا کر جاتی ہیں جنھیں زمانہ گزر جانے کے بعد بھی ذہن سے نکالا نہیں جاتا۔ایسے ہی اداکاراؤں میں ایک معاون اداکارہ للیتا پوار بھی تھی جنھیں ۱۹۷۰ء کی دہائی کے بعد زیادہ تر ظالم ساس کے رول میں دیکھا گیا،لیکن کبھی وہ بھی ایک حسین اداکارہ تھی اور متعدد فلموں میں اس نے ہیروئن کا رول بھی نبھایا، خاص طور پر خاموش فلموں کے دور میں للیتا پوار نے انگنت فلموں خصوصاً دھارمک فلموں میں اس نے ہیروئن کا رول ادا کیا، ایسی ہی ایک فلم میں جبکہ وہ بھگوان دادا کے ساتھ کام کر رہی تھی اور فلم کے اس سین میں بھگوان دادا کو ایک زوردار تھپڑ للیتا پوار کو لگانا تھا مگر بھگوان دادا کا ہاتھ کچھ زیادہ ہی زور سے چل گیا جس کے نتیجے میں للیتا کی ایک آنکھ زخمی ہوگئی، جس کے لئے اس نے کافی علاج کرایا مگر ایک آنکھ قدرے ڈھک گئی۔اگرچہ بھگوان دادا نے انگنت مرتبہ ان سے معافی مانگی مگر للیتا نے کبھی کوئی شکایت نہیں کی بلکہ اسے بھی اپنی تقدیر کا ایک حصّہ مان لیا اور یہ بھی اتفاق ہے کہ ایک آنکھ نصف ڈھکی ہونے کی وجہ سے للیتا پوار کو تقریباً ۲۰۰۰ فلموں میں ظالم ساس، ظالم ماں اور ظالم بہن کا رول ملا اور اس نے اس واقعے کو ہی اپنی زندگی کی کامیابی ٹھہرایا۔

للیتا پوار بیک وقت ایک دردمند ماں اور ظالم ساس کا رول بخوبی نبھاتی تھیں فلم اناڑی، شری ۴۲۰، جس دیش میں گنگا بہتی ہے میں راجکپور کے ساتھ اہم رول کیا، اس کے علاوہ میم دیدی، بوٹ پالش میں بھی اس کا رول بیحد اہم رہا۔ بوٹ پالش میں جینت اور ڈیوڈ کے ساتھ اس کے کامیاب رول کو کوئی بھی فراموش نہیں کرسکتا ہے۔فلم داغ میں دلیپ کمار کی ماں کے رول میں بھی للیتا پوار کو کوئی بھول نہیں سکتا ہے۔للیتا نے راج کپور کے ساتھ بہت ساری فلموں میں کام کیا اور ان کی اداکاری کا لوہا سبھوں نے مان لیا تھا۔

شمی کپور کے ساتھ فلم پروفیسر اور جنگلی میں للیتا پوار کا رول ہیروئن سے زیادہ اہم تھا۔ایف سی مہرہ کی فلم ''پروفیسر'' جس میں شمی کپور، کلپنا اور پروین چودھری نے کام کیا تھا اس فلم میں للیتا پوار اپنی

دو جوان لڑکیوں کے لئے ایک عمر دراز بوڑھے ٹیوٹر کا اشتہار دیتی ہے اور بیروزگار افلاس کا مارا شمی کپور ایک بوڑھے کے روپ میں ٹیوٹر بن کر جاتا ہے اور پھر للیتا پوار جو زندگی بھر مردوں سے نفرت کرتی ہے اس بوڑھے ٹیوٹر پر عاشق ہوجاتی ہے۔اس فلم میں شمی کپور نے ایک بوڑھے ٹیوٹر کا رول جس خوبصورتی سے نبھایا وہ ناقابلِ فراموش ہے،فلم کے آخری سین میں جب شمی کپور کی حقیقت کھلتی ہے اس سین میں للیتا پوار کی اداکاری انتہائی عروج پر نظر آتی ہے۔

سبود مکھرجی کی فلم جنگلی میں بھی للیتا پوار نے ایک ظالم ماں کا رول ادا کیا تھا اور اس کی ظالمانہ عادت واطوار کی وجہ سے اس کا نوجوان لڑکا شمی کپور بھی نیم پاگل غصّہ ور اور جنونی جاتا ہے لیکن سائرہ بانو کی محبت اور جذبات اسے انسان بنادیتے ہیں، اس فلم میں سب سے اہم اور کلیدی رول للیتا پوار کا ہے۔

راما نند ساگر کی فلم ''آنکھیں'' میں للیتا پوار نے چین کی جاسوسہ کا رول ادا کیا اور مشہور شاعر وادیب انجم عظیم آبادی کی صرف فلم آنکھیں کی وجہ سے للیتا پوار یاد رہی۔اس فلم میں اس کا رول بیحد مختصر مگر بہت ہی اہم تھا۔للیتا پوار نے نیل کمل، من کی آنکھیں جیسی مشہور فلموں میں کام کیا۔ان کی پہلی فلم راجہ ہریش چندر تھی جو ۱۹۲۸ء کو ریلیز ہوئی۔ان کی آخری فلم ''بھائی'' ہے جو ۱۹۹۷ء میں ریلیز ہوئی جس میں سنیل شیٹھی ہیرو تھے، للیتا پوار نے ہندی اور مراٹھی کے تقریباً ۶۰۰ فلموں میں کام کیا۔ان کی پیدائش ۱۶/اپریل ۱۹۱۶ء کو ہوئی اور ۲۴/فروری ۱۹۹۸ء کو ان کا انتقال ہوا۔

ان کی موت کا قصّہ بڑا عجیب ہے چونکہ اس نے شادی نہیں کی تھی اور ممبئی کے بوروولی کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں تنہا رہتی تھی، لیکن ۲۴/فروری کو جب ان کا انتقال ہوا تو کسی کو پتہ نہیں چلا اور تقریباً ایک ہفتے بعد جب ان کے فلیٹ کے اندر سے بدبو آنے لگی تو پولیس نے تالا توڑ کر دیکھا کہ وہ مری پڑی ہے۔اتنی عظیم اور ناقابلِ فراموش اداکارہ کا انجام اس طرح سے بھی ہوسکتا ہے یہ کسی نے بھی سوچا نہیں تھا۔فلم اناڑی، جس دیش میں گنگا بہتی ہے اور شری ۴۲۰ میں راجکپور کے ساتھ ان کی فلمیں جن میں وہ ایک دردمند عورت کا رول ادا کرتی ہے ان فلموں کو کوئی بھی فراموش نہیں کرسکتا ہے۔

☆☆☆

ملکہ ترنم۔نور جہاں

جنوبی ایشیا کی عظیم گلوکاراؤں میں شمار کی جانے والی 'ملکہ ترنم' کو مقبول ترین موسیقی میں انقلاب لانے اور پنجابی لوک گیتوں کو نیا ایام دینے کا موجد تصور کیا جاتا ہے۔ان کی گلوکاری میں وہ جادو تھا کہ ہر باصلاحیت گلوکار کی آئیڈیل لتا منگیشکر نے جب اپنے کیریئر کا آغاز کیا تو ان پر نور جہاں کی گلوکاری کا اثر تھا۔

نور جہاں کا اصلی نام 'اللہ وصی' تھا۔ان کی پیدائش ۳۱ر ستمبر ۱۹۲۶ء کو ہندوستان کے کسور نامی مقام پر ہوئی تھی۔نور جہاں کی پیدائش پیشہ ور موسیقار مدد علی اور فتح بی بی کے گھر میں ہوئی تھی۔وہ اپنے والدین کی گیارہویں اولادوں میں سے ایک تھیں۔موسیقاروں کے گھرانے میں پیدا ہوئی نور جہاں کا بچپن سے ہی موسیقی کے تئیں گہرا لگاؤ تھا۔نور جہاں نے ۵۔۶ سال کی عمر سے ہی گلوکاری شروع کردی تھی۔وہ کسی بھی لوک گیت کو سننے کے بعد اسے اچھی طرح یاد کرلیا کرتی تھیں۔ان کے شوق کو دیکھتے ہوئے ان کی ماں نے انہیں موسیقی کی تربیت دلانے کا انتظام کیا۔اس دوران ان کی بہن عیدن بائی پہلے سے ہی رقص اور گلوکاری کی تربیت حاصل کررہی تھیں۔

ان دنوں کلکتہ تھیٹر کا گڑھ بنا ہوا تھا،وہاں پر فارمنگ آرٹسٹ،اسکرپٹ رائٹر وغیرہ کی کافی مانگ تھی۔ اسی کے پیش نظر نور جہاں کی فیملی ۱۹۳۰ء کی دہائی میں کلکتہ چلی آئی۔جلد ہی نور جہاں اور ان کی بہن کو وہاں رقص اور گلوکاری کے مواقع حاصل ہوگئے۔نور جہاں کی گلوکاری سے متاثر ہوکر موسیقار غلام حیدر نے کے ڈی نہرا کی پہلی پنجابی فلم 'شیلا عرف پنڈ دی کوڑی' میں انہیں چائلڈ آرٹسٹ کا کردار دلایا۔۱۹۳۵ء میں ریلیز ہوئی یہ فلم پورے پنجاب میں ہٹ رہی۔اس فلم نے پنجابی فلم صنعت کے قائم ہونے کا راستہ ہموار کردیا۔اس فلم کے گیت بھی کافی ہٹ ہوئے۔۱۹۳۰ء کی دہائی کے اختتام تک لاہور میں کئی اسٹوڈیو وجود میں آئے۔گلوکاروں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو دیکھتے ہوئے نور جہاں کی فیملی ۱۹۳۷ء میں لاہور آگئی۔ڈل سکھ اینڈ پنچولی نے بے بی نور جہاں کو سنا اور 'گل بکاؤلی' فلم میں انہیں ایک کردار دے دیا۔یہ فلم بھی کافی ہٹ رہی اور اس کے گیت بھی کافی مقبول ہوئے۔اس کے بعد ان کی اگلی فلمیں 'یملا جٹ' (۱۹۴۰ء)،'چودھری' ریلیز ہوئیں۔ان فلموں کے گیت 'کچیاں بے کلیاں نا توڑ.....' اور 'بس بس بے ڈولنا کی تیرے نام بولنا.....'' کافی مقبول ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں نور جہاں نے اپنے نام سے بے بی لفظ ہٹادیا،اسی سال ان کی فلم 'خاندان' آئی جس میں پہلی بار وہ

لوگوں کی منظور نظر ہوگئیں اسی فلم کے ہدایت کار شوکت حسین رضوی کے ساتھ انہوں نے شادی کرلی۔۱۹۴۳ء میں نور جہاں بمبئی چلی آئیں۔محض ۴ سال کے مختصر وقفہ کے بعد وہ اپنے مدمقابل سبھی اداکاراؤں سے کافی آگے نکل گئیں۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ کی پرانی نسل کے لوگ ان کی کلاسیکل فلموں 'لال حویلی،زینت،بڑی ماں،گاؤں کی گوری' اور 'مرزا صاحبان' کے آج بھی دیوانے ہیں۔فلم 'انمول گھڑی' کی موسیقی نوشاد نے دی تھی،اس کے 'آواز دے کہاں ہے.....'' جواں ہے محبت .....' اور میرے بچپن کے ساتھی.....'' جیسے گیت آج بھی لوگوں کی زبان پر ہیں۔نور جہاں تقسیم وطن کے بعد اپنے والد کے ساتھ بمبئی چھوڑ کر لاہور چلی گئیں۔وہاں رضوی صاحب نے ایک اسٹوڈیو قائم کیا اور اس کا نام شاہ نور اسٹوڈیو رکھا۔شاہ نور پروڈکشن نے فلم 'چنوے' (۱۹۵۰ء) بنائی،جس کی فلم ساز و ہدایت کار نور جہاں تھیں۔یہ فلم بے حد کامیاب ہوئی۔اس کے 'تیرے مکھڑے پر کالا تلوے......'' جیسے گیت کافی مقبول ہوئے۔

ان کی پہلی اردو فلم 'دوپٹہ تھی' اس کے گیت 'چاندنی راتیں.....چاندنی راتیں......'' آج بھی لوگوں کی زبان پر ہے۔فلم 'جگنو' اور 'چنوے' کی ہی طرح اس کی موسیقی بھی فیروز نظامی نے تیار کی تھی۔'دوپٹہ' پہلی فلم 'چنوے' سے بھی بڑی ہٹ ثابت ہوئی۔بطور اداکارہ نور جہاں کی آخری فلم 'بازی' تھی،جو ۱۹۶۳ء میں ریلیز ہوئی۔انہوں نے پاکستان میں ۱۴ فلمیں بنائیں،اس میں ۱۰ اردو فلمیں تھیں۔انہوں نے اپنے سے ۹ سال چھوٹے اعجاز درانی سے دوسری شادی کرلی۔پھر گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے انہیں اداکاری کو خیرآباد کہنا پڑا، حالانکہ انہوں نے گلوکاری جاری رکھی۔

پاکستان میں پیشہ ور گلوکار کے طور پر ان کی پہلی فلم 'جان بہار' (۱۹۵۸ء) تھی۔اس فلم کا گیت 'کیسا نصیب لائی.....'' کافی مقبول ہوا۔انہوں نے اپنی آدھی صدی سے زیادہ فلمی کیریئر میں اردو،پنجابی اور سندھی زبانوں میں کئی گیت گائے۔انہیں منورنجن کے شعبہ میں پاکستان کے سب سے اعلیٰ اعزاز 'تمغہ امتیاز' سے بھی نوازا گیا۔۲۳ر دسمبر ۲۰۰۰ کو دل کا دورہ پڑنے سے ان کا انتقال ہوگیا۔

(بشکریہ۔امنگ۔راشٹریہ سہارا۔نوئیڈا)

☆☆☆

کامنی کوشل۔ جواں ہے جنوں

فرحت رضوی

فلم انڈسٹری میں عام طور پر ہیروئنوں کی عمر بہت کم ہوتی ہے، خاص طور سے شادی کے بعد تو ان کا گلیمر اور کریز ایک دم کافور ہو جاتا ہے۔ وجینتی مالا، بینا رائے، سادھنا، سائرہ بانو، راج شری، ممتاز اور ان کی اگلی پیڑھی پدمی کولہا پوری، زینت امان وغیرہ وغیرہ گھر سنسار بسا کر گلیمر کی دنیا سے کنارہ کش ہو گئیں۔

ڈمل کپاڈیہ جنہوں نے ناکام شادی کے بعد فلمی سفر جاری رکھا کسی حد تک مخصوص رول میں مقبول ہو سکیں۔ جب کہ مادھوری دیکشت اور پھر کاجول جیسی سپر اداکارائیں بھی شادی کے بعد اپنا 'کریز' ناظرین کے درمیان قائم رکھنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکیں، لیکن حیرت کی بات ہے کہ ہندوستان کی فلمی تاریخ میں ۴۰۔۵۰ کی دہائی کا ایک معصوم چہرہ، دلنواز شخصیت ایسی بھی ہے جس کا فلمی سفر گزشتہ ۶۰ سالوں سے جاری ہے اور ان کی اداکارانہ صلاحیتیں ہیروئن سے لے کر کامیاب فلمی ماں، پھر دادی ماں کے مختلف روپوں میں جلوہ گر ہوتی رہیں وہ بھی بڑے پردے سے لے کر چھوٹے پردہ تک ان کا فن محیط ہے، بلکہ ان کی دیگر تخلیقی صلاحیتیں بطور اسٹوری رائٹر بھی سامنے آئیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ حیرت میں ڈال دینے والی بات یہ ہے کہ ''کامنی کوشل'' نام کی اس اداکارہ نے اپنا فلمی سفر شادی شدہ زندگی کے ساتھ شروع کیا۔ محض ان کی پہلی فلم نیچا نگر، جو ایک آرٹ فلم تھی ریلیز ہونے کے بعد ہی شادی ہو گئی، وہ بھی اپنی بہن کے انتقال کے بعد دو بچوں کے باپ (بہنوئی) سے۔ تاہم انہوں نے گھریلو ذمہ داریوں نیز ذاتی زندگی میں ماں کے فرائض ادا کرنے کے باوجود فلموں میں بطور ہیروئن کام کرنا جاری رکھا۔ کامنی نے اپنے زمانے کے تمام بڑے اداکاروں اشوک کمار، راج کپور اور دلیپ کمار کے ساتھ بطور ہیروئن کام کیا۔ چیتن آنند کی ہدایت میں بنی ان کی پہلی فلم ''نیچا نگر'' (غور طلب ہے کہ مونٹریال میں منعقد فلم فیسٹول میں اس فلم کو بیسٹ فلم ایوارڈ ملا تھا) ۱۹۴۶ء میں ریلیز ہوئی تھی اور آخری فلم 'لاگا چنری میں داغ' پچھلے سال ۲۰۰۷ء میں ریلیز ہوئی۔ اس طرح ۶ دہائیوں کے دوران انہوں نے بے شمار فلموں میں بطور ہیروئن و کیریکٹر آرٹسٹ کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹے پردہ پر دوردرشن کے پروگرام 'چاند ستارے' سے لے کر حال میں اسٹار پلس پر جاری 'شنو کی شادی'

سیریل کے ذریعے ناظرین سے روبرو ہیں۔

کامنی کوشل جن کا اصلی نام 'اوما' ہے کی پیدائش ۶ جنوری ۱۹۲۷ء میں لاہور کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد لاہور یونیورسٹی میں سائنس کے پروفیسر تھے۔ اوما کشیپ نے لاہور سے انگریزی ادب میں گریجویشن کیا۔ پہلی ریلیز ہونے والی فلم سے پہلے وہ ریڈیو پر بطور چائلڈ آرٹسٹ اور دلی تھیٹر میں کام کر چکی تھیں۔ ریڈیو اسٹیشن پر ہی چیتن آنند کی ملاقات اوما کشیپ سے ہوئی اور ''نیچا نگر'' کا آفر مل گیا۔ چیتن آنند نے انہیں 'کامنی کوشل' فلمی نام دیا اور اسی نام سے وہ آج تک پہچانی جاتی ہیں۔ 'نیچا نگر' ریلیز ہونے کے بعد اگرچہ فلم ناقدین اور ناظرین کے ذہنوں پر کامنی نے گہرا اثر ڈالا، لیکن اسی دوران ان کی زندگی میں ایک عجیب حادثہ پیش آیا۔ بڑی بہن کی اچانک موت سے ٹوٹے خاندان نے دو چھوٹی بچیوں کے مستقبل کی خاطر کامنی کوشل کی شادی ان کے بہنوئی سبھاش سود سے کر دی اور وہ اس طرح اوما سود بن گئیں۔

کامنی کوشل کی فلمیں 'ندیا کے پار' اور 'شہید' ۱۹۴۸ء میں، شبنم ۴۹۔۵۰ میں 'آرزو'' منظر عام پر آئیں۔ ان میں ان کے ہیرو دلیپ کمار تھے۔ دلیپ، کامنی کی رومانٹک جوڑی نے ادھر پردے پر دھوم مچائی اور ادھر اصل زندگی میں بھی ہنگامہ سا پیدا کر دیا۔ اس زمانے کی مشہور فلمی رقاصہ و اداکارہ ستارہ دیوی نے ایک بار کہا تھا کہ 'اوما دلیپ کا پہلا اور حقیقی پیار تھا۔ اس کی جدائی سے وہ بری طرح ٹوٹ گیا تھا، خود دلیپ کمار نے اپنی آٹو بایوگرافی میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ۲۰ سالہ کامنی کے معصوم حسن کا جادو ان پر کس طرح سوار تھا۔ اپنے زمانے کے مشہور ڈائریکٹر، پروڈیوسر پی این اروڑا نے ایک صحافی کو بتایا تھا کہ ان کی ہدایت میں بن رہی کامنی دلیپ کی فلم ''شہید'' کی شوٹنگ کے دوران کافی ہنگامہ ہو گیا تھا۔ کامنی کے بھائی جو فوج میں تھے 'شہید' کے سیٹ پر ریوالور لے کے آدھمکے اور انہوں نے دھمکی دی کہ اگر ان دونوں کی نزدیکیاں ختم نہیں ہوئیں تو وہ کامنی کو ختم کر دیں گے۔ اس زمانے میں کامنی کے شوہر جو پورٹ ٹرسٹ میں افسر تھے اور انہیں وہاں ایک بنگلہ ملا ہوا تھا، دلیپ کمار کا اکثر وہاں جانا ہوتا حالانکہ کامنی کوشل شادی شدہ تھیں، لیکن دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لیے جو جذبۂ خاص تھا وہ زیادہ دنوں تک پوشیدہ نہیں رہ سکا۔ بہر حال یہ رومانی جوڑی زیادہ دنوں تک پردہ پر قائم نہیں رہ سکی لیکن زندگی کے ان اتار چڑھاؤ کے باوجود کامنی کی اداکاری جاری رہی۔ بنگالی ناول نگار شرت چندر کی ناول پر مبنی فلم 'براج بہو' کے لیے انہیں ۱۹۵۵ء میں بہترین اداکاری کا فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا

گیا۔جیلر گریٹ شو آف انڈیا، بینک مینجر، گئودان، جنم۔جنم کے ساتھی، بھیگی رات، اپکار، آنچل کے پھول، وارث، وشواس، ایک شریمان۔ایک شریمتی، دوراستے، بیٹی، یقین، یادگار، پورب اور پچّھم، عشق پرزورنہیں، دھرتی، اپہار وغیرہ وغیرہ فلموں میں کامنی نے شروع میں بطور ہیروئن پھر کیریکٹر رول نبھائے۔

۱۹۴۰ء۔۱۹۵۰ء کی دہائی میں وہ ہیروئن تھیں پھر ۶۰۔۷۰ میں ماں کے رول میں آگئیں۔

۱۹۶۵ء میں بنی فلم 'شہید' سے انہوں نے کیریکٹر رول کی شروعات کی اس میں وہ بھگت سنگھ، (منوج کمار کی ماں بنی تھیں)۔اس کے بعد تو پورب اور پچّھم، شور، روٹی کپڑا اور مکان، سنیاسی اور دس نمبری میں مسلسل منوج کمار کی ماں کا کردار نبھاتی رہیں۔دونوں کے درمیان رشتوں کی یہ جذباتی کیمسٹری فلم بینوں کو خاصی بھا گئی تھی۔پردۂ سیمیں پر مسلسل معصوم اور ممتا کی مورت ہندوستانی ماں کا کردار نبھانے والی کامنی کوشل نے فلم 'انہونی' میں مسز رائے بہادر سنگھ' کے روپ میں ایک ویمپ کا رول ادا کر کے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کو منفرد نہج پر بھی آزمایا اور اس میں کامیاب بھی رہیں۔۱۹۸۰ء میں انہوں نے انگریزی فلم 'جویل ان دی کراؤن' میں کام کیا۔اس کے بعد کافی دنوں تک گھر گرہستی کی ذمہ داریوں میں الجھی رہیں، لیکن اس دوران بچیوں کے لیے کہانیاں لکھیں جو 'پراگ' میں شائع ہوئیں۔دوردرشن پر 'چاند ستارے' چنداماما اور Puppet-show کے ذریعہ چھوٹے پردہ پر دستک دی۔ہمہ جہت صفات کی ملکہ ۸۰ سالہ کامنی کوشل کی صلاحیتوں پر بڑھتی عمر کا اثر بھی بے اثر ثابت ہو رہا ہے۔

گزشتہ سال ۲۰۰۷ء میں 'لیش راج' کی فلم 'لاگا چنری میں داغ' ریلیز ہوئی تھی اس کے علاوہ اسٹار پلس پر جاری 'شنو کی شادی' میں بھی یہ تجربہ کار اداکارہ اپنی فعال موجودگی درج کرا رہی ہیں اور خدا کرے آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے۔سیریل میں ان کی معاون اداکارہ دویا دتہ ان کی فی الحال بہترین دوست ہیں۔وحیدہ رحمٰن سے بھی ان کی دوستی برقرار ہے۔کامنی کوشل کا ہر کارنامہ حیرت زدہ کرنے والا ہوتا ہے۔لوگوں کو شاید یقین نہ آئے مگر وہ ۸۰ سال کی عمر میں بھی 'تیراکی' کرتی ہیں۔کامنی کے مطابق فٹ رہنے کے لیے ورزش ضروری ہے پھر خواہ یوگا کرو یا سویمنگ ایک ہی بات ہے۔

☆☆☆

شہرۂ آفاق اداکارہ۔مدھو بالا

نثار احمد صدیقی

خان عطاء اللہ خان کے گھر ۱۴۔جنوری ۱۹۳۲ء کو دہلی میں ایک بچی نے اس دنیا میں آنکھ کھولی اس بچی کا نام ممتاز جہاں بیگم رکھا گیا۔عطاؤ اللہ خان کی اولاد میں آٹھ بیٹیاں اور تین بیٹے تھے ان میں چھ بچے شروع میں انتقال کر گئے تھے۔پانچ بچوں میں اب ممتاز بیگم دوسرے نمبر پر تھی۔عطاء اللہ خان کا خاندان دہلی میں ایک پسماندہ علاقہ میں رہائش پذیر تھا۔غربت کے سبب بچیوں کی تعلیم پر بھی خصوصی توجہ نہیں دی جاسکی۔ممتاز جہاں بیگم کی تعلیم بھی مسجد سے مدرسے تک محدود رہی۔ان ہی دنوں ممتاز جہاں بیگم کو ریڈیو سے نشر ہونے والے بچیوں کے پروگراموں میں شریک ہونے کا شوق ہوا۔باپ نے رہنمائی کرتے ہوئے اس شوق کو پورا کیا دراصل باپ بہت دور کی سوچ رہا تھا۔یہ وہ زمانہ تھا جب فلموں میں چائلڈ اسٹاروں کی بہت اہمیت تھی۔ہیرو، ہیروئن کے بچپن کے کردار بیشتر فلموں کا لازمی جز سمجھے جاتے تھے۔عطاء اللہ خان کچھ ہی عرصے کے بعد اپنے تمام گھرانے کے ساتھ دہلی سے ممبئی منتقل ہو گئے اور یہاں فلمی صنعت میں انہوں نے حصول کامیابی کے لئے اپنی کوششوں کا آغاز کیا۔

یہ غالباً ۱۹۴۲ء کی بات ہے جب ہندوستانی فلمی صنعت کے مشہور فلم ساز ادارے بمبئی ٹاکیز کو فلم 'بسنت' میں ہدایت کار و فلم ساز، امیہ چکرورتی نے ممتاز جہاں بیگم کو چائلڈ اسٹار کی حیثیت سے روشناس کرایا اس فلم نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ممتاز شانتی اور الہاس کے ساتھ کمسن ممتاز جہاں بیگم کی کام کی تعریف بھی کی گئی چنانچہ اس بچی کو کیدار شرما نے اپنی فلم ''ممتاز محل'' میں لے لیا۔''بیماری''، ''پھلواری''، ''راجپوتانی'' ممتاز جہاں بیگم کی چائلڈ اسٹار کی حیثیت سے چند دوسری فلمیں تھی۔

بچوں کے کردار ادا کرتے ہوئے ممتاز جہاں بیگم اپنے بچپن کو پیچھے چھوڑ آئی کیدار شرما کی دُوربین نگاہوں نے ممتاز جہاں بیگم میں مستقبل کی حسین اور عظیم اداکارہ کو دیکھ لیا تھا۔یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے جب انہوں نے ''نیل کمل'' میں ممتاز جہاں بیگم کو ہیروئن کا روپ دے کر اسے مدھو بنا دیا۔اس فلم میں مدھو بالا کے مقابل کیدار شرما نے اپنے یونٹ میں ہدایت کاری کی تربیت حاصل کرنے والے ٹیکنشیز راج کپور کو ہیرو بنا دیا۔یہ فلم بڑی کامیابیوں تک رسائی حاصل نہ کر سکی تاہم مدھو بالا اور راج کپور کو فلمی صنعت میں متعارف

کرانے کا ذریعہ بن گئی۔ ''میرے بھگوان'' اور ''چٹوتر وجے'' کے بعد مدھو بالا ایک مرتبہ پھر ''امرجیوتی'' میں راج کپور کے ساتھ جلوہ گر ہوئی لیکن نمایاں کامیابی سے وہ اب بھی دور تھی۔ ''پرائی آگ'' کے بعد اسے پھر راج کپور کے ساتھ ''امر پریتم'' میں کام کرنے کا موقع ملا۔ ''امتحان''، ''اپرادھی''، ''دولت'' اسے ''محل'' تک لے آئیں۔ بمبئی ٹاکیز کے لئے کمال امروہوی کی ''محل'' میں ان کی کامیابی نے ایک تہلکہ مچا دیا۔

مدھو بالا کی ملکوتی حسن اور اداکاری میں پراسراریت کا کمال اشوک کمار کی کردار نگاری اور دل آویز موسیقی آج بھی ''محل'' کے حسن کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ ''پارس''، ''دلاری''، ''نیکی بدی''، ''سنگھا''، ''سپہیا'' اور ''بے قصور'' اسے اور بھی کامیابیوں کی طرف لے آئیں۔ ''ہنستے آنسو''، ''نرالا''، ''پردیس''، ''آرام''، ''بادل''، ''خزانہ''، ''نادان''، ''ساقی'' اور ''نازنین''، فلمیں مدھو بالا کے عروج کی ہم سفر بن گئیں۔ اب ہر سمت مدھو بالا کے چرچے تھے سب ہی فلمی ستارے ان کی موجودگی میں گہن زدہ نظر آتے وہ ہر دل کی دھڑکن بنی ہوئی تھی ان ہی دنوں رام دربانی نے فلم ''ترانہ'' شروع کی اس فلم میں مدھو بالا کے ساتھ پہلی بار دلیپ کمار کا سٹ ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب دلیپ کمار ہر نوجوان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا اسے رومانس کا شہزادہ اور کنگ آف ٹریجڈی کہا جا رہا تھا دنیائے فلم کے دو دلوں میں بسے رہنے والے اداکار ''ترانہ'' میں یکجا ہوئے تو کہانی کی رومانیت اپنی اثر انگیزی کے ساتھ مدھو بالا اور دلیپ کمار کے لئے پیغام محبت کا وسیلہ بن گئی۔ ان کے درمیان ادا کئے جانے والے مکالمے حقیقت کا روپ دھارنے لگے۔ یہ فلم جب منظر عام پر آئی تو وہ دل آویزی محبت کا ایک خوبصورت شاہکار بن کر فلم بینوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ کے آصف جیسے ہدایت کار نے اس جذبہ محبت سے فائدہ اٹھانے کے لئے ''مغلِ اعظم'' بنانے کا اعلان کر دیا۔ مدھو بالا انارکلی بن گئی۔ محبت کی ایک لازوال داستان۔ کثیر سرمایہ سے بنائی جانے والی یہ فلم دھیرے دھیرے بن رہی تھی لیکن ان دونوں کی محبتیں اس دھیرے پن سے بہت آگے نکل آئی تھیں۔ ان ہی دنوں آر۔سی۔ تلوار نے ان دونوں کو ''سنگدل'' میں یکجا کر دیا۔ اس فلم کی فلم بندی تیز رفتاری سے کی جانے لگی تب عطاء اللہ خان بھی حالات سے واقف ہو چکے تھے ان کی دخل اندازی کے سبب کئی بار فلم کی فلم بندی التوا کا شکار ہوئی عطا اللہ خان نہیں چاہتے تھے کہ اب مدھو بالا کسی فلم میں دلیپ کمار کے ساتھ کام کرے۔ لیکن وہ محبوب خان جیسے عظیم ہدایت کار کو انکار نہ کرنے پر مجبور ہو گئے یوں یہ رومانی جوڑی ''امر'' تک آ پہنچی۔ محبوب خان نے عطاء اللہ خان کو یقین دلایا تھا کہ اس فلم کی کہانی میں دلیپ کمار کی محبت کا مرکز نمی کو بنایا جائے گا۔ چنانچہ اس فلم میں دلیپ کمار اور مدھو بالا ''ترانہ'' اور ''سنگدل'' کے رومانی حسن کو اس خوبی سے اجاگر نہیں کر سکے۔ جب بی۔آر۔ چوپڑا نے نیا دور شروع کی اس فلم کے مرکزی کرداروں کے لئے مدھو بالا اور دلیپ کمار کو لیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ان کا رومانس عروج پر تھا۔ جبکہ عطاء

اللہ خان نہیں چاہتے تھے کہ سونے کی چڑیا ان کے ہاتھ سے اڑ جائے ان کی جانب سے آئے دن نئی پابندیاں عائد کی جانے لگیں جس کا اثر ''نیا دور'' کی فلم بندی پر بھی پڑنے لگا اب دلیپ کمار اور مدھو بالا میں اختلافات رونما ہونے لگے ایک دن انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب انہیں مزید انتظار کئے بغیر شادی کر لینی چاہئے۔ کہتے ہیں کہ دلیپ کمار نے مدھو بالا کو انگوٹھی بھی پہنا دی تھی اس نے مدھو بالا کے گھر اپنی بہنوں کو رشتہ لینے کے لئے بھیجا تو وہاں صورتِ حال مختلف ہو گئی۔ عطاء اللہ خان نے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ دلیپ کمار کی بہنوں کی توہین بھی کی دلیپ کمار یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکا۔ اور اس نے مدھو بالا سے قطع تعلق کر لیا اور حالات کی تلخیاں اس حد تک بڑھیں کہ بی۔آر چوپڑاہ نے ''نیا دور'' سے مدھو بالا کو علیحدہ کر کے اس کی جگہ وجنتی مالا کو لے لیا۔ عطاء اللہ خان نے دلیپ کمار کو موردالزام ٹھہرایا اور اسے اپنی بے عزتی جانا جس کے سبب مدھو بالا کی ساکھ پر اثر پڑ رہا تھا انہوں نے بی۔آر۔ چوپڑہ کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا اس مقدمے کی کاروائی کے دوران دلیپ کمار نے بھری عدالت میں مدھو بالا کو طمانچہ مار دیا یہاں سے ان کے رومانس کی بازگشت دنیا بھر میں پھیل گئی۔

اب دلیپ کمار نے مدھو بالا سے ہر تعلق توڑ لیا تھا کہتے ہیں مدھو بالا نے تجدید وفا کے لئے پریم ناتھ شمی کپور سے محبت کے ناٹک کھیلے لیکن وہ دلیپ کمار کو اپنی طرف مائل کرنے میں پھر بھی ناکام رہی۔ ان ہی دنوں عطاء اللہ خان نے اپنا فلم ساز ادارہ مدھو بالا پرائیوٹ لمیٹیڈ کے نام سے بنایا۔ وہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر لینے کی جستجو میں گرفتار تھے۔ لیکن اب باپ بیٹی کے درمیان ذرا ذرا کی بات پر ٹھننے لگتی تھی۔ کشور کمار جیسا تیسرے درجہ کا اداکار مدھو بالا کے قریب آ چکا تھا وہ مدھو بالا کے پرستاروں میں تھا مدھو بالا کی خدمت کر کے اسے ایک سکون حاصل ہوتا تھا۔ ان ہی دنوں ''مغلِ اعظم'' کی فلم بندی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ لیکن تب دلیپ کمار اور مدھو بالا ایک دوسرے سے چپ چپ اور دور دور رہتے ان کے درمیان صرف کام کے سلسلے میں بات چیت ہوتی۔

مدھو بالا کی بیماری بڑھتی گئی جوں جوں دوا کی اس نے انتقاماً کشور کمار سے شادی کر لی باپ کو مجبور ہونا پڑا کشور کمار اسلام قبول کر لینے کے بعد عبداللہ بن گیا اور دن رات مدھو بالا کی خدمت اور دلجوئی میں لگ گیا۔ سولہ برس تک زیر تکمیل رہنے والی فلم ''مغلِ اعظم'' ۱۹۶۰ء میں نمائش کے لئے پیش ہوئی اس تاریخ ساز فلم نے اپنی خوبیوں کی بدولت تہلکہ مچا دیا۔ اس فلم میں مدھو بالا انارکلی بن کر شہزادہ سلیم کی محبت میں دیوار سے چنوا دی گئی کچھ مدھو بالا کے ساتھ حقیقی زندگی میں بھی ہوا۔ اس کی محبت چھین لی گئی اب حالات کچھ اور تھے۔ مدھو بالا ''مغلِ اعظم'' دیکھنے کے لئے سینما ہال گئی اور واپس گھر آ کر زار و قطار روئی اس کے بعد بیماری دل اس

کاروگ بن گئی اس کے بعد اس نے اپنی چند فلمیں بہ مشکل مکمل کرائیں ان فلموں کے کئی مناظر میں اس نے بستر پر لیٹے ہوئے یہ مکالمے ادا کئے مدھو بالا قریب نو سال تک بیماری دل سے نبرد آزما رہی اس دوران وہ علاج کے لئے لندن بھی گئی لیکن وہاں سے بھی وہ مایوس لوٹی۔

مدھو بالا کو بیماری کے دوران بھی فلمیں دیکھنے کا شوق رہا اپنے انتقال سے ہفتہ بھر قبل وہ فلم ''پڑوسن'' دیکھنے کے لئے گئی یہ فلم اس نے نیچے کلاس میں بیٹھ کر دیکھی کیونکہ وہ اوپر نہیں چڑھ سکتی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس نے برسوں سے سنیما گھر میں اوپر کی کلاس کی شکل نہیں دیکھی تھی چلنے پھرنے اور اوپر چڑھنے سے معذور ہوگئی تھی۔ فلم دیکھ کر جب وہ گھر واپس آئی تو اس کے پیٹ میں شدید درد پیدا ہوا پھر وہ بخار میں بھی مبتلا ہوگئی ڈاکٹروں نے یرقان بتایا۔ جو برسوں سے تسبیح کے دانوں میں اللہ اللہ کیا کرتی تھی بے ہوشی میں چلی گئی آخری دنوں میں اسے آکسیجن دی جانے لگی۔ آکسیجن جار میں وہ اکھڑی اکھڑی سانس لے رہی تھی۔ ایک لمحہ ایسا بھی آیا جب اس نے کہا۔ ''اے اللہ مجھے بچا لیجئے میں ابھی مرنا نہیں چاہتی''۔ وہ آخری لمحوں میں بہت پرسکون نظر آرہی تھی۔ اس نے موت کی آغوش میں جانے سے قبل کہا۔ ''اب بازی میرے ہاتھ سے نکل چکی ہے سب لوگ میرا قصور معاف کردیں''۔ اس کے لب بار بار کلمہ کا ورد کر رہے تھے۔

۲۳ر فروری ۱۹۶۹ء کو دنیائے فلم کی سحر انگیز ذہین اور عظیم اداکارہ منوں مٹی تلے میٹھی اور گہری نیند جا سوئی جہاں خوابوں کا کوئی گزر نہیں ہے۔ اس کے سفر آخرت میں اشوک کمار، سنیل دت، نرگس، ششی کپور، پریم ناتھ، کے۔ آصف، کمال امروہوی اور اس کے ہزاروں پرستار اس کی یادوں میں گم تھے ان میں دلیپ کمار شامل نہ تھا وہ مدراس گیا ہوا تھا اسے جب مدھو بالا کی وفات کی اطلاع ملی تو اسی شب واپس آیا وہ رات گئے اپنے آنسوؤں کا نذرانہ لئے مدھو بالا کی قبر پر پہنچا وہ گھنٹوں اشک بار آنکھوں سے مرجھائے ہوئے پھولوں کو اپنی یادوں کے نہاں خانوں میں سمیٹتا رہا۔

مدھو بالا نے اپنے فلمی سفر میں تقریباً ساٹھ فلموں میں اداکاری کی ان میں پچاس فلموں کی وہ ہیروئن تھی۔ مدھو بالا کی بیشتر فلموں نے نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ مدھو بالا کی آخری فلم ''جوالہ'' اس کی موت کے دو سال بعد نمائش کے لئے پیش کی گئی۔

☆☆☆

محبت کی دیوی۔ نرگس

سید مجیب الرحمٰن

اپنے وقت کی کامیاب اداکارہ گلوکارہ اور ہدایت کار جدن بائی کے یہاں یکم جون ۱۹۲۹ء کو پیدا ہونے والی لڑکی کا نام فاطمہ رشید رکھا گیا۔ فاطمہ رشید نام کی اس معصوم لڑکی نے چار سال کی چھوٹی سی عمر میں ہی فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھانے شروع کردیئے تھے۔ اس کی پہلی فلم ''تقدیر' میں اپنے وقت کے مشہور اداکار موتی لال ہیرو تھے۔ یہ فلم اتنی زبردست کامیاب ہوئی کہ نرگس (فاطمہ رشید) کی تقدیر ہی بدل گئی۔ اس فلم کی ہدایت محبوب خان نے دی تھی۔ 'تقدیر' میں نرگس نے اپنی اداکاری کی زبردست چھاپ چھوڑی تھی۔

(ویسے نرگس کی پہلی فلم بطور چائلڈ آرٹسٹ 'تلاش حق' تھی جو ان کی ماں جدّن بائی کی ہدایت میں بنی تھی)۔

۱۹۴۸ء تک نرگس فلم انڈسٹری کی کامیاب ترین اداکاراؤں میں شمار کی جانے لگی تھیں۔ کسی بھی فلم میں ان کی شمولیت فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ ان کی صلاحیت اور مقبولیت سے حد درجہ متاثر ہوکر راج کپور نے انہیں اپنی فلم ''آگ'' میں کام کرنے کی پیش کش کی۔ ''آگ'' بھی اپنے دور کی کامیاب ترین فلم ثابت ہوئی اور اسی فلم سے نرگس، راج کپور کی جوڑی مشہور ہوئی جس نے ایک نئی تاریخ رقم کی۔ نرگس کا فلمی کریئر بہت لمبا نہیں رہا، لیکن انہوں نے جتنی بھی فلموں میں کام کیا ان میں زیادہ تر فلمیں ہٹ ثابت ہوئیں۔ ہٹ فلموں میں مدر انڈیا' برسات' آگ' آوارہ' دیدار' عدالت' شری ۴۲۰' اور لاجونتی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان فلموں میں نرگس نے فلم بینوں کے دل و دماغ پر جو تاثر چھوڑے، وہ آج تک برقرار ہیں۔

نرگس کی باکمال، پُروقار اور سنجیدہ شخصیت کی وجہ سے نرگس کے فن کے پرستاروں میں ہندوستان کے سابق وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور ترکی کے شہرۂ آفاق شاعر ناظم حکومت جیسی عظیم ہستیاں بھی شامل ہیں۔ ترکی کے ناظم حکمت نے نرگس کے بارے میں کہا تھا کہ ''اتنی حسین عورت پردۂ سیمیں پر کبھی نہیں آئی!''۔

نرگس کی اہم دیگر فلموں میں بیسوی صدی' مہندی' میلہ' انجمن' نرگس' جوگن' ساگر' نیا دن نئی رات' چوری چوری وغیرہ بھی کافی مشہور ہوئی تھیں۔ نرگس نے اپنے وقت کے تمام مشہور اداکاروں کے ساتھ کام

کیا تھا۔ لیکن نرگس کی سب سے کامیاب جوڑی راجکپور کے ساتھ رہی۔راج کپور بھی نرگس کی عظمت اوراہمیت کوتسلیم کرتے تھے جس کا واضح ثبوت ان کے پروڈکسن ہاؤس آر کے فلمز کا نشان LOGO ہے۔نرگس نے اپنے پورے فلمی سفر میں تقریباً ۵۶ فلموں میں اہم رول ادا کیا ہے لیکن ان کی فلمی زندگی کو بلندی عطا کرنے والی فلم محبوب خان کی 'مدرانڈیا' تھی۔

۱۹۶۷ء میں ریلیز ہونے والی فلم 'رات اور دن' نرگس کی آخری فلم تھی۔جس کے بعد یہ معصوم صورت اداکارہ پردۂ سیمیں سے زیادہ سماجی کاموں میں نظر آنے لگی، ذہنی اور جسمانی طور پر معذور بچوں کی زندگی کو خوشگوار بنانے کا خیال شاذونادر ہی کسی کو ہوتا ہے۔نرگس ان عظیم افراد میں سے ایک تھیں جنہوں نے معذور بچوں کی فلاح و بہبود سے منہ نہیں موڑا بلکہ ان کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی خدمت میں جی جان سے جٹ گئی تھیں۔کہاں فلمی دنیا کا گلیمر.....اور کہاں یہ بے رونق زندگی....؟ نرگس گلیمر کی دنیا میں رہتے ہوئے بھی ہمارے سماج کے کڑوے پہلوؤں کو سدھارنے،سنوارنے کی متواتر کوششیں کرتی رہیں۔وہ ایک مخلص، دردمند اور حساس خاتون تھیں اس لیے ایک دردمند انسان کی طرح سماج کے ہر طبقے کے لوگوں تک پہنچنے اور ان کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش میں مسلسل لگی رہتی تھیں۔اپنے ملک کی حفاظت کرنے والے جانباز ہندوستانی افواج کی تفریح طبع کے لیے وہ اجنتا آرٹس گروپ کی کلاکار منڈلی کے ساتھ برف سے گھری اونچی اونچی چوٹیوں تک بھی گئیں۔

نرگس نے عروج اور مقبولیت کے ساتھ شہرت کی بلندیوں کو چھولیا تھا....غیر ملکی دورے/سرکاری وسماجی اعزازات....مداحوں کی نہ ختم ہونے والی تعداد....الغرض انہیں ہر وہ چیز میسر تھی جس کی خواہش کی جاسکتی ہے۔

نرگس ہندوستان کی پہلی عظیم اداکارہ تھیں جنہیں پہلی بار ۱۹۵۸ء میں مدرانڈیا میں بہترین اداکاری کے لیے عالمی ایوارڈ ملا تھا اور اسی فلم نے انہیں سنیل دت کے روپ میں ''محبت کا دیوتا'' بھی عطا کیا تھا۔ہندوستانی حکومت نے اس عظیم شخصیت کو راجیہ سبھا میں نامزد کرکے نرگس کی بے لوث اور بے پناہ خدمات کا اعتراف بھی کیا۔یہی نہیں بلکہ نرگس کی شہرت اور مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ان کے اعزاز میں ہر سال قومی انعامات میں،قومی اتحاد اور یک جہتی پر مبنی ایک فلم کو 'نرگس دت ایوارڈ' سے بھی نوازا جاتا ہے۔نرگس کی مختصر سی زندگی نے عظمتوں کی بلندیوں کو چھوا ہے،جی بھر کر پیار اور خلوص بانٹا اور جی بھر کر عوامی مقبولیت ومحبت حاصل کی۔

نرگس نے اپنی زندگی کے آخری ایام ایک موذی،مہلک اور لاعلاج مرض سے لڑتے لڑتے گزارے، یہ لڑائی شروع سے ہی یکطرفہ تھی کیونکہ بعض سنگین حقائق کے سامنے انسان خود کو بالکل بے بس لاچار اور مجبور محسوس کرتا ہے۔ایسے وقت میں جب نرگس،موت وزیست کی کشمکش میں گرفتار تھیں۔سنیل دت نے ایک ذمے دار،مخلص،وفادار اور بے پناہ محبت کرنے والے شوہر کے فرائض نبھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی.... انجام سے ہر کوئی واقف تھا لیکن سنیل دت نے جس دل جمعی سے نرگس کی عیادت،دیکھ بھال میں اپنی ذات کو بھلا رکھا تھا،اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید وہ اس انجام کو شکست دینے پر تلے ہوئے ہیں۔لیکن سب بے سود ....بے کار.....ہر کوشش ناکام.....سنیل دت کی تمام کوششیں گو کہ نرگس کو نہیں بچا سکیں لیکن دوسروں کی نظروں میں ان کی بے مثال کردار کو وقار اور بلندی عطا کر گئیں۔وہ بھی نرگس کی ہی طرح ایک دردمند،مثالی انسان تھے،جو سماج خدمات وفلاح و بہبود کی ایک ایسی مثال چھوڑ گئے ہیں جو صدیوں تک لوگوں کو ملک وملت اور سماج کے ہر طبقے کو عوام کی خدمت کرنے پر اکساتی رہے گی۔

☆☆☆

جذبات نگاری سے بھرپور اداکارہ۔ سچترا سین

خورشید اختر فرازی

روما داس گپتا فلمی نام سچترا سین بنگلہ فلموں اور چند منتخب ہندی فلموں کی ایک ایسی ہیروئن ہے جس نے رومان پرور، سنجیدہ اور جذبات نگاری سے بھرپور ایسی فلمیں دیں جنہیں لوگ کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے ہیں، سچترا نے اگر چہ انگنت بنگلہ فلموں میں اداکاری کی اور وہ حسن و اداکاری کی ایسی مہان نائیکہ ثابت ہوئی کہ اس کی شہرت بنگال کی سرزمین سے نکل کر ملک کے کونے کونے میں اور بیرون ملک بھی ہوئی۔ اس کی چند بنگلہ فلموں نے انٹرنیشنل فلمی میلے میں بڑا نام کمایا اور ایوارڈز بھی ملے۔ ایک زمانے میں سچترا اور اتم کمار کی جوڑی کو کامیاب ترین جوڑی قرار دیا گیا تھا جس طرح سے ہندی فلموں میں راج کپور۔ نرگس، دلیپ کمار۔ وجینتی مالا، راجیش، ممتاز یا راجیش شرمیلا اور دھرمیندر۔ ہیما مالنی کی جوڑی کو سدابہار جوڑی کے طور پر تسلیم کیا گیا تھا۔ ویسے تو آج کل کی موجودہ ٹرینڈ کی فلموں میں جوڑی بنانے والی کوئی بات نہیں ہے اور نہ ہی آج کی فلموں میں کہانیوں، جذبات نگاری اور سنجیدہ اداکاری کے لئے کوئی جگہ ہے اگر بھول چوک سے کوئی فلم سنجیدہ بن بھی جاتی ہے تو ایک تو پردۂ سیمیں تک پہنچ نہیں پاتیں اور اگر پہنچ بھی جائیں تو شائقین انہیں مسترد کر دیتے ہیں اور فلم ایک ہفتے بھی صحیح ڈھنگ سے چل نہیں پاتیں، حالیہ مثال پرزانیہ، سلیم جیسی فلموں کی ہے اور لوگ اچھی فلموں کو اب برداشت ہی نہیں کر پاتے، ۱۹۷۰ء کی دہائی میں کوشش پر یچے، آندھی، گول مال جیسی فلموں نے زبردست بزنس کیا تھا لیکن وہ ایک دور تھا اور ایک ایسا دور جس میں لوگ واہیات فلموں سے اکتا کر سنجیدہ اور جذبات سے بھرپور فلموں کی طرف راغب ہوئے تھے اور اس موقع پر سب سے زیادہ فائدہ دور اندیش فلمساز و ہدایت کار رشی کیش مکھر جی اور گلزار نے اٹھایا۔

سچترا سین جس نے چند ہندی فلمیں کیں جن میں دیوداس، بمبئی کا بابو، ممتا کے نام قابل ذکر ہیں، ممتا بطور ہیروئن ان کی آخری ہندی فلم تھی جس میں انھوں نے اشوک کمار اور دھرمیندر کے ساتھ کام کیا تھا۔ اور ممتا کی ریلیز کے ۱۵ سال بعد گلزار نے فلم ''آندھی'' میں ایک سیاستداں کے روپ میں پیش کیا اور ان کا گیٹ

اپ، میک اپ اور اسٹائل وغیرہ ایسا رکھا جس میں ان کی جھلک بہت حد تک اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی سے مشابہ تھی اور ان کی ایسی شاندار گیٹ اپ، بہترین اداکاری، چست ڈائیلاگ، معنی خیز گیت اور سنگیت میں ایسا جادو ابھر کر سامنے آیا کہ لوگ اس فلم کی خوبصورتی میں کھو کر رہ گئے۔ اس فلم میں سچترا سین اور سنجیو کمار نے لازوال اداکاری کی تھی اور اس کی وجہ سے فلم کی کامیابی میں چار چاند لگ گئے تھے۔

سچترا سین کی پہلی ہندی فلم بمل رائے کی دیوداس تھی، اس فلم میں سچترا نے بنگال کی حسین ساحرہ کا رول بڑی خوبصورتی سے نبھایا تھا اور لوگ اسے پارو کے نام سے ہی پکارتے تھے۔ شرت چندر چٹر جی کی کہانی پر فلمائی گئی ''دیوداس'' میں اگر چہ دلیپ کمار نے ایک زبردست شرابی دیب کے رول میں جان ڈال دی تھی اس کے علاوہ چندر مکھی کے رول میں وجینتی مالا اور چنی لال کے رول میں موتی لال کی اداکاری آسمان کی بلندیوں پر نظر آتی ہے، فلم دیوداس سے سچترا سین نے پارو کے رول میں زندگی سے بھرپور اداکاری کی تھی، دیب کے ساتھ اس کی محبت انسیت روحانی تھی مگر دیب اس کی محبت اور چاہت کو کوئی رنگ نہیں دے سکتی تھی کیونکہ دونوں بچپن سے ایک ساتھ پلے بڑھے اور پروان چڑھے تھے مگر پارو جو اس کی محبت میں بچپن ہی سے گرفتار تھی جب ایک دن جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد اس نے اپنی لافانی محبت کا اظہار کیا تو دیبو اس کی محبت کو ٹھکرا کر شہر چلا آتا ہے اور کافی دنوں کے بعد جب گاؤں واپس پہنچتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کی پارو کی شادی ایک بڑے ساہوکار کے ساتھ ہو جاتی ہے جو عمر میں اس کے دادا کے برابر ہوتا ہے جس کے جوان بیٹے، بیٹیاں ہیں کئی پوتے نواسی بھی ہیں۔ پارو کی شادی ہو جانے کی خبر سن کر دیبو کے دل کو زبردست جھٹکا پہنچتا ہے اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کا دل ٹوٹ کر پارہ پارہ ہو چکا ہے اسے پہلی مرتبہ احساس ہوتا ہے کہ وہ پارو سے کس قدر سچی محبت کرتا تھا۔

دیبو اور پارو کی کہانی شروع میں ہو کر کہانی کے پہلے حصّے میں ہی ختم ہو جاتی ہے اور فلم کے آخری حصّے میں جب دیبو زیادہ شراب نوشی کی وجہ سے سخت بیمار پڑ جاتا ہے تو وہ اپنی پارو سے ملنے اس کے گاؤں جانے کا قصد کرتا ہے اور ٹھیک اس کے گھر کے سامنے پہنچ کر دم توڑ دیتا ہے اور پارو کی آنکھوں کے سامنے اس کے دیبو کی لاوارث لاش کو بھنگی اٹھا کر جلانے کے لئے لے جاتے ہیں۔ اس فلم میں بمل رائے نے ہر سین میں جو جذباتی ٹچ دیا ہے ایس ڈی برمن کے خوبصورت سنگیت کے ساتھ ساحر لدھیانوی کے دلکش

اور چبھتے ہوئے طنز سے بھرپور گیتوں نے اس فلم کی دلکشی میں چار چاند لگا دیئے۔ دلیپ وجینتی اور سچترا کی یہ فلم آل ٹائم بیسٹ فلم قرار دی گئی ہے، اس فلم کے بعد نہ تو دلیپ کمار نے اور نہ سچترا نے ایک دوسرے کے ساتھ دوبارہ کام کرنے کی کوشش کی اور اگر وہ کرتے تو شاید آج دیوداس کی وہ دلکشی اور اثر جو برسوں سے دل میں قائم ہے نہیں ہوتی۔ جب بھی ہندوستانی فلموں کی تاریخ مرتب جائے گی تب تب بمل رائے کی ''دیوداس'' کو شامل کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔

سچترا اسین نے بمبئی کا بابو میں دیو آنند کے ساتھ کام کیا تھا اور اس فلم میں سب کچھ اچھا تھا سوائے کہانی کے۔ کہانی کار نے شاید بھنگ پی کر کہانی لکھی تھی۔ اس فلم میں دیو آنند ایک لڑکی کا بھائی بن کر شہر سے گاؤں جاتا ہے جس کا قتل اسی کے ہاتھ ہو جاتا ہے۔ وہ لڑکی اس کو بمبئی سے آیا ہوا اپنا بھائی تصور کرتی ہے اور دوسری طرف دیو آنند تصور میں اسے اپنی محبوبہ تصور کرتا ہے اور فلم دیکھنے والوں کو ابکائیاں آنے لگتی ہیں۔ بہرکیف سچترا اسین کی یہ بیحد واہیات فلم تھی۔

اسیت سین کی ہدایت میں بنی فلم ممتا میں سچترا نے ڈبل رول کیا تھا، زمانے کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرتے ہوئے ایک دن وہ اپنے عاشق کو سب کچھ سونت دیتی ہے اور اس کا عاشق غیر ملک پڑھائی کے لئے چلا جاتا ہے ادھر وہ حاملہ ہو جاتی ہے سماج کے ڈر سے اسنے ایک کوٹھے پر پناہ لینی پڑتی ہے۔ جہاں اس کی بیٹی پیدا ہوتی ہے اور اسی کوٹھے میں وہ اس شخص کا خون کر دیتی ہے جو اس کی زندگی کو اجیرن بنائے ہوئے تھا۔ عدالت میں مقدمہ چلتا ہے اور اس کا عاشق جو بے وفا نہیں تھا اس کے لئے کیس لڑتا ہے اس کی بیٹی کو اپنا لیتا ہے اور پڑھا لکھا کر وکیل بناتا ہے عدالت میں ساری سچائی سامنے آنے کے بعد اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا ہے اور اس کی موت ہو جاتی ہے لیکن اپنی موت سے پہلے وہ سبھوں کو یکجا کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

یہ اچھی اور سبق آموز فلم تھی اور اس فلم نے اچھا بزنس بھی کیا۔ سچترا اسین جس نے سب سے زیادہ اتم کمار کے ساتھ کام کیا وہ ۱۹۳۱ء میں پہنسا ضلع (بنگلہ دیش) میں پیدا ہوئی تھی۔ اس نے ۱۹۴۷ء میں ایک بہت ہی دولت مند بنگالی صنعت کار دیبا ناتھ سین سے شادی کر لی تھی جس سے

ایک لڑکی من من سین پیدا ہوئی۔ سچترا کے والد کرونا موئے داس گپتا بنگلہ دیش کے ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور اس کی ماں کا نام اندرا داس گپتا تھا۔

سچترا اسین کی مشہور بنگلہ فلموں میں ''سات پا کے بادھا، ہرانا سور، دیپ جلے جاکے ہے۔ ۱۹۶۳ء میں سات پا کے بادھا میں ماسکو فلم فیسٹویل میں اسے بہترین اداکارہ کا ایوارڈ حاصل ہوا تھا۔ سچترا اسین فی الحال کلکتہ کے بیڈن اسٹریٹ میں ایک فلیٹ میں گزشتہ ۳۰ برسوں سے عالم فراموشی کی زندگی گزار رہی ہے۔ اور وہ کسی سے بھی نہیں ملتی، ابھی حال میں ایشوریہ رائے، دھرمیندر ملنے گئے تھے۔ دھرمیندر سے تو انھوں نے ملاقات کی مگر ایشوریہ کو ٹال دیا تھا۔

☆☆☆

فلمی افق کا 'تنہا چاند'۔ مینا کماری

ایم قمر علیگ

جس طرح سے ہندوستانی فلموں میں دلیپ کمار کو شہنشاہ جذبات یا ٹریجیڈی کنگ کہا جاتا ہے، اسی طرح مینا کماری کو ملکۂ جذبات یا ٹریجڈی کوئین کہا جاتا ہے۔

مینا کماری کو ہم سے جدا ہوئے ۳۵ سال کا طویل عرصہ گزر گیا مگر ان کا المیہ لہجہ اور لافانی اداکاری آج تک ہمارے دل و دماغ پر نقش ہے۔ مینا کمار جن کا اصلی نام جبیں تھا، پارسی تھیٹر کے اس زمانے کے معروف اداکار اور میوزک ٹیچر علی بخش اور رقاصہ اقبال بیگم کی صاحبزادی تھیں۔ انہوں نے چھ سال کی عمر میں فلموں میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ مینا کماری کے والدین نے روپ تارا اسٹوڈیو کے نزدیک بہت ہی تنگ دستی میں وقت گزارا تھا۔ اسی لیے ان کے والد علی بخش یہ چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی کو فلموں میں کام کرنے کا جلد موقع مل جائے۔ ۱۹۳۹ء میں وجے بھٹ نے سب سے پہلے انہیں بے بی مینا کے نئے نام کے ساتھ فلم ''لیدر فیس'' میں متعارف کرایا۔

۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۹۵۱ء تک مینا کماری نے تقریباً ۲۴ فلموں میں کام کیا۔ اسی دوران انہوں نے کچھ دیومالائی اور مذہبی فلموں جیسے ''ویر گھٹوٹکچ''، شری گنیش مہیما، الہٰ دین اور جادوئی چراغ، ہنومان پاتال وجے، وغیرہ فلموں میں کام کیا، لیکن ۱۹۵۲ء میں فلم ''بیجو باورا'' کی نمائش کے بعد مینا کمار کا ستارہ چمک گیا۔ اس فلم میں ان کے ہیرو بھارت بھوشن تھے۔ وجے بھٹ کی اس فلم کے موسیقار نوشاد تھے۔

۲۱ مارچ ۱۹۵۲ء کو اولین فلم فیئر ایوارڈوں کی تقسیم کے لیے ایک شاندار پروگرام کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس سال کل پانچ ایوارڈ تقسیم کیے گئے جس میں بہترین فلم ''دو بیگھا زمین'' اسی فلم کے بہترین ہدایت کار کے لیے بمل رائے، فلم ''داغ'' کے بہترین اداکار دلیپ کمار اور فلم ''بیجو باورا'' میں بہترین اداکاری کے لیے مینا کماری اور اسی فلم میں بہترین موسیقی ترتیب دینے کے لیے نوشاد کے نام کا اعلان کیا گیا تھا۔

اس لحاظ سے مینا کماری فلم انڈسٹری میں بہترین اداکارہ فلم فیئر ایوارڈ حاصل کرنے والی اولین اداکارہ بن کر تاریخ کا ایک حصہ بن گئیں۔ فلم فیئر ایوارڈ کی اس اولین تاریخی تقریب میں باکمال امروہی نے بھی ان

کے ساتھ شرکت کی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۵۳ء میں کمال امروہی نے اپنی فلم ''دائرہ'' کی ہیروئن کے لیے مینا کماری کا انتخاب کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی فلم سے مینا کماری کی المیہ اداکاری کا دور شروع ہوا۔ اس کے علاوہ بھی مینا کماری نے کمال امروہی کی کئی فلموں میں ہیروئن کا رول ادا کیا، جن میں ''ایک ہی راستہ'' (۱۹۵۶ء)، ''شاردا'' (۱۹۵۷ء) اور ''دل اپنا اور پریت پرائی'' قابل ذکر ہیں۔ آہستہ آہستہ ان کی قربت شادی میں تبدیل ہوگئی۔ اسی درمیان ۱۹۵۸ء میں کمال امروہی اور مینا کماری نے فلم ''پاکیزہ'' کا خاکہ تیار کیا تھا جو کمال امروہی اور مینا کماری کی مشترکہ آرزو تھی۔

۱۹۶۲ء میں منظر عام پر آنے والی گرودت کی فلم ''صاحب، بی بی اور غلام'' کا یہاں تذکرہ کرنا ناگزیر ہے، جس میں مینا کماری نے چھوٹی بہو کا رول ادا کیا تھا جو اپنے گمراہ شوہر کو اپنی تباہی کی حد تک جا کر راہ راست پر لانا چاہتی تھی۔ اس فلم میں مینا کمار نے ایک تاریخ رقم کی کیونکہ بہترین اداکارہ کے فلم فیئر ایوارڈ کے لیے ان کی تین فلموں ''آرتی''، ''میں چپ رہوں گی'' اور ''صاحب بی بی اور غلام'' کو نامزد کیا گیا تھا۔ فلم ''صاحب بی بی اور غلام'' میں بہترین اداکاری کے لیے انہیں ایوارڈ سے نوازا گیا۔

دلیپ کمار کے ساتھ مینا کماری نے فلم ''فٹ پاتھ'' (۱۹۵۳ء)، ''آزاد'' (۱۹۵۵ء)، اور ''کوہ نور'' ''یہودی'' (۱۹۶۰ء)، وغیرہ میں ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ ان میں فلم ''آزاد'' اور ''کوہ نور'' ایسی فلمیں ہیں جن میں شہنشاہ جذبات اور ملکۂ جذبات دونوں نے اپنے المیہ چوغے کو ایک طرف رکھ کر تفریحی رول ادا کیے تھے اور ناظرین کو ان دونوں کا یہ منفرد اسلوب بہت پسند آیا تھا۔

۱۹۶۴ء میں کمال امروہی سے علیحدگی کے بعد مینا کماری کی زندگی میں تلخیاں گھل گئی تھیں جس کی وجہ سے ان کو مے نوشی کا سہارا لینا پڑا۔ کثیر مقدار میں مے نوشی کے سبب ان کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے ''پاکیزہ'' میں کام کرنا جاری رکھا کیونکہ ان کی یہ تمنا تھی کہ یہ فلم جلد از جلد مکمل ہو جائے۔

آخر کار ۱۴ سال کے طویل انتظار کے بعد ۴ر فروری ۱۹۷۲ء کو ''پاکیزہ'' پوری شان و شوکت کے ساتھ منظر عام پر آئی۔ اس فلم کے پریمیئر پر مینا کماری بذات خود موجود تھیں۔ جب فلم ختم ہوگئی اور ہال میں روشنی ہوئی تو انہوں نے ایک جانی پہچانی آواز کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ''شاہکار بن گیا''۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو وہ کوئی اور نہیں بلکہ فلم انڈسٹری کے معروف موسیقار خیام تھے۔ یہ جملہ سنتے ہی مینا کماری کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلک آئے۔ خیام کا یہ جملہ تاریخ بن گیا کیونکہ آج بھی

ہندوستان کی بہترین کلاسک فلموں میں ''پاکیزہ'' کا شمار کیا جاتا ہے۔

حالانکہ ریلیز ہونے کے بعد شروعاتی دنوں میں ناظرین نے ''پاکیزہ'' کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں دی، مگر ۳۱/مارچ ۱۹۷۲ء کو مینا کمار کے انتقال کے بعد گویا ''پاکیزہ'' دیکھنے کے لیے لوگوں کا سیلاب اُمڈ پڑا اور اس کو ایسی کامیابی ملی کہ فلم انڈسٹری کی تاریخ میں سنگ میل بن گئی۔

فلم ''لیدر فیس'' (۱۹۳۹ء) سے لے کر آخری فلم ''گومتی کے کنارے'' (۱۹۷۲ء) تک مینا کماری نے تقریباً ۹۴ فلموں میں اپنے دور کے تقریباً تمام معروف اداکاروں کے ساتھ کام کیا۔

مینا کماری، نازتخلص سے شاعری بھی کرتی تھیں۔ ''تنہا چاند'' کے عنوان سے مینا کماری کی شاعری کا مجموعہ معروف مصنف اور نغمہ نگار گلزار نے ان کے انتقال کے بعد شائع کیا جو فلمی خدمات کے علاوہ مینا کماری کا اردو ادب کے لیے ایک نایاب عطیہ شمار کیا جاتا ہے۔

مینا کماری شاید فلم انڈسٹری کی وہ واحد اداکارہ ہیں، جن کے انتقال کے بعد ان کی سوانح پر مبنی فلم بنائی گئی۔ ۱۹۷۹ء میں شیلی فلم ممبئ کے بینر تلے سہراب مودی کی ڈائریکشن میں بنی فلم ''مینا کماری کی امر کہانی'' منظر عام پر آئی۔ اس فلم میں بھارت بھوشن کے علاوہ ڈولی نے مینا کماری کا کردار اور سونا نے مدھو بالا کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم میں مینا کماری کی کچھ فلموں جیسے ''آزاد''، ''شاردا''، ''غزل''، ''چندن کا پلنا'' اور ''پاکیزہ'' وغیرہ کے ڈائیلاگ اور مینا کماری پر فلمائے گئے کچھ گیت بھی شامل کئے گئے تھے۔ اس طرح کی تخلیق مینا کماری کی عظیم شخصیت کی ترجمانی کرتی ہے۔ زندگی کے المیہ فلموں میں بہترین عکاسی کے لیے مینا کماری کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

☆☆☆

اداکارہ،گلوکارہ۔ثریا

نثار احمد صدیقی

ثریا اپنے دور کی ایک بے مثال اداکارہ اور موسیقی میں ایک مدھر آواز تھی۔ قدرت نے اسے جس دل کشی سے بھی نوازا تھا اپنے دور میں وہ لاکھوں فلم بینوں کے دلوں کی دھڑکن تھی اس دور کی حسین وجمیل اور عظیم اداکاراؤں کے مدمقابل وہ اپنی انفرادی خوبیوں میں یکتا رہی۔ ایک زمانہ اس کا گرویدہ رہا۔

برصغیر میں فلمی صنعت کے قیام کے بعد سے آج تک ثریا اور نور جہاں ہی کو یہ مقام میسر آیا ہے کہ وہ فن اداکاری کے ساتھ اپنی آواز کا جادو بھی جگایا کرتی تھیں۔ انھوں نے جن فلموں میں اداکاری کی اپنے گیت خود گائے۔ اور دونوں حیثیتوں میں مقبول عام رہیں۔

ثریا کی شہرت میں اس کی دولت، محبت اور اس کی زندگی میں اس کی نانی کا کردار بھی زبان زد عام پر آئے۔ ثریا کے عشق میں گرفتار ہونے والے بھی اس دور میں آئے دن منظر عام پر آئے۔ ثریا کی رعنائیوں میں اس کا وقار بھی منفرد تھا۔

شہرۂ آفاق اداکار دلیپ کمار کے ساتھ اس دور میں ہر اداکارہ کام کرنے کی آرزو دل میں بسائے رہتی تھی لیکن ثریا وہ واحد اداکارہ ہے جس نے دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کے۔ آصف ''جانور'' بنا رہے تھے اس فلم میں ثریا اور دلیپ کمار کا شٹ کئے جا چکے تھے اس فلم کے ایک منظر کی فلم بندی کے تقاضوں کے مطابق دلیپ کمار نے ثریا کی پنڈلی پر اپنے دانت رکھ دیئے، ثریا کو دلیپ کمار کی اداکاری پسند نہ آئی وہ شوٹنگ چھوڑ کر چلی گئیں۔ ''جانور'' ادھوری رہ گئی۔ کے۔ آصف جیسا فلم ساز بھی زندگی بھر اس فلم کو مکمل نہ کر سکا۔ ثریا نے دیو آنند سے ٹوٹ کر پیار کیا۔ لیکن جب اس نے ثریا کو بہار کا فریب دے کر کلپنا کارتک سے شادی کر لی تو ثریا کے ارمانوں نے دم توڑ دیا۔ اپنے پیار کے لٹ جانے کے بعد ثریا کی زندگی میں کوئی نہیں آیا۔ اس نے زندگی بھر شادی نہیں کیا۔ ثریا کے لئے کہا گیا کہ اس کے گھر کی دیواریں بھی سونے کی ہیں اس زمانے میں اس کا شمار امیر ترین ادکاراؤں میں کیا گیا تھا۔

ثریا اپنے دور میں ایک پر تجسس داستان بنی رہی اور آج بھی کل کے لوگ اس کے بارے میں جانتے

رہنا چاہتے تھے۔ برصغیر میں ثریا کا نعم البدل آج تک نہیں ملا۔ ثریا کی مدھر آواز میں مدھر کن گیت آج بھی دلوں کو موہ لیتے ہیں۔ ''پاپی پپیہارے پی پی نہ بول میری''۔ (فلم پروانہ) ''جب تم ہی نہیں اپنی دنیا ہی بیگانی ہے''۔ (پروانہ) ''تیرے نینوں نے چوری کیا میرا چھوٹا سا جیا'' (پیار کی جیت) ''وہ پاس رہیں یا دور رہیں نظروں میں سمائے رہتے ہیں'' (بڑی بہن) ''چلے دل کی دنیا جو برباد کرکے بہت روئیں گے ہم تمہیں یاد کرکے'' (درد) ''میں دل میں درد بسالائی'' (انمول گھڑی) ''من مراہوا متوالا کس نے جادو ڈالا'' (افسر) ''یہ موسم اور یہ تنہائی ذرادم بھر کو آ جاؤ'' (داستان) ''یہ کیسی عجیب داستاں ہوگئی ہے'' (رستم وسہراب) ثریا کے گائے ہوئے چند امر گیت ہیں ایسے بے شمار گیت ثریا کی مسحور کن آواز کے خزانے کو سمیٹے ہوئے ہیں۔

ثریا اپنے دور کی واحد اداکارہ تھیں جس کے فلیٹ کے باہر اس کے پرستاروں کا ایک ہجوم ہر وقت موجود رہا کرتا تھا چنانچہ اس دور میں ممبئ کے چیف منسٹر مرار جی ڈیسائی تک یہ اطلاع پہونچی تھی۔ ''ثریا کے شیدائیوں کے سبب ٹریفک میں خلل پیدا ہوتا ہے اس لئے ثریا سے درخواست کی جائے کہ وہ کسی دوسری جگہ منتقل ہو جائے۔''

ثریا ۱۵/ جون ۱۹۲۹ء کو لاہور کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئی۔ اس کی تربیت ناز و نعم سے ہوئی وہ گھر بھر کی آنکھوں کا تارہ بنی رہی لیکن ابھی وہ بڑی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کے والد انتقال کر گئے۔ اب ثریا کے تمام تر نگہداشت اس کی نانی کے حصے میں آ گئی ثریا اپنی ماں ممتاز شیخ سے زیادہ اپنی نانی سے محبت کرنے لگی۔ نانی اس کی ہر خواہش کا احترام کرتیں۔ اسے اپنی نگاہوں سے دور نہ کرتیں ان ہی دنوں ثریا کو گانے کا شوق ہو گیا۔ اس نے نانی سے کہا کہ وہ اپنی آواز ریڈیو کے ذریعے لوگوں تک پہونچانا چاہتی ہے۔ ثریا جس کی تعلیم قدامت پسند گھرانوں کے انداز کے مطابق گھر ہی پر کی جا رہی تھی اب اس میں سے کچھ وقت گانے میں بھی دیا جانے لگا۔ اس زمانے میں ثریا کی نانی کا بمبئ جانا ہوا یہاں ثریا کے ایک ماموں ظہور فلمی صنعت سے وابستہ انہیں اپنی فلم ''تاج محل'' کی فلم بلندی کے سلسلے میں آگرہ جانا پڑا تو وہ ثریا اور اس کی نانی کو بھی تفریحاً آگرہ لے گئے اس فلم کے ہدایت کار بابو بھائی وکیل کی نگاہ جب ثریا پر پڑی تو انھوں نے اسے اپنی فلم میں چائلڈ اسٹار کی حیثیت سے منتخب کر لیا ثریا کی نانی نہیں چاہتی تھیں کہ اس کمسنی میں ثریا فلم میں کام کرے لیکن انھیں مجبور ہونا پڑا۔ اس نے فلم میں نسیمہ بانو کے بچپن کا کردار ادا کیا اب ثریا کی فیملی مستقل طور پر ممبئ میں منتقل ہو گئی۔ ثریا نے ممبئ کے ایک اسکول میں داخلہ بھی لے لیا۔ ''تاج محل'' ۱۹۴۱ء میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں ثریا

کی اداکاری کو بے حد سراہا گیا چنانچہ اسے ''اسٹیشن ماسٹر''، ''تمنا'' اور ''ہماری بات'' میں چائلڈ اسٹار کے کردار ادا کرنے کے اور مواقع ملے۔ یہ فلمیں ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء میں ریلیز ہوئیں۔ اس دوران ثریا ریڈیو پر بچوں کے پروگراموں میں شرکت کر کے گانے کا آغاز بھی کر چکی تھی۔ جب اس کی آواز کو فلمی حلقوں میں سنا گیا تو موسیقار بھی توجہ دینے لگے فلم ساز و ہدایت کار اے آر۔ کاردار نے سب سے پہلے ثریا کو اپنی فلم ''شاردا'' کے لئے گیت گانے کا موقع فراہم کیا یہ گیت اس دور کی مقبول اداکارہ مہتاب پر فلم بند ہوا گیت مقبول عام ہوا گیت کے بول تھے ''پنچھی جا پیچھے رہا ہے بچپن میرا'' ہدایت کار جے۔ کے نندا نے جب ''اشارہ'' شروع کی تو اس فلم میں ثریا کو انھوں نے پرتھوی راج جیسے بڑے اداکار کے مقابل کاسٹ کر کے فلمی صنعت کو حیرت میں ڈال دیا۔ ''اشارہ'' ۱۹۴۳ء میں ریلیز ہوئی تو اس پر فلمی صنعت میں کامیابی کے دروازے کھل گئے۔ ''میں کیا کروں'' میں شاہ نواز اور کے۔ آصف کی فلم ''پھول'' میں پرتھوی راج اس کا ہیرو تھا۔ ۱۹۴۶ء میں عظیم ہدایت کار محبوب خان نے ''انمول گھڑی'' میں ثریا اور نور جہاں کو یکجا کر دیا۔ اس فلم میں دونوں کی آواز بھی ایک ساتھ گونجی۔ ''انمول گھڑی'' کی کامیابی نے ثریا کو صف اول کی اداکاراؤں میں لا کھڑا کیا۔

''سمراٹ چندر گپت'' میں ایشور لال اور ''تدبیر'' میں کے۔ ایل سہگل جیسے مقبول ترین گلوکار و اداکار کے ساتھ کام کرنے کا موقع میسر آیا۔ ''یتیم'' میں یعقوب ۱۹۵۷ء میں سریش ''حسرت'' میں 'دلاور'، ''جگ بیتی'' میں ''پرنس آف منروا'' صادق علی ثریا کا ہیرو بنا۔ موہن سنہا کی ''عمر خیام'' میں ثریا اور سہگل پھر ساتھ تھے۔ ''روشنی'' میں بابو بھائی جانی۔ ''آکاش دیپ'' میں نندو بکر، ڈاک بنگلہ'' میں دینا ناتھ، ''درد'' میں نصرت کاردار۔'' دو دل میں موتی لال اور ''ناٹک'' میں امر ناتھ کے ساتھ اس نے اداکاری اور گیتوں سے ایک سماں پیدا کر دیا۔ یہ تمام فلمیں ۱۹۴۷ء تک منظر عام پر آئیں۔ اس سال ثریا کی ایک یادگار فلم ''پروانہ'' نے دھوم مچا دی اس فلم میں کے۔ ایل۔ سہگل کا ثریا کے ساتھ مرکزی کردار تھا ثریا اور سہگل کے گیت خورشید انور کی موسیقی میں رچ بس کر سننے والوں کے کانوں میں رس گھول رہے تھے۔

''آج کی رات'' اور ''گجرے'' میں موتی لال کے ساتھ وہ ایک نئے انداز میں جلوہ گر ہوئی۔ ''کاجل'' میں واسطی۔ ''رنگ محل'' میں سریش۔ ''پیار کی جیت'' میں رحمان ''شکتی'' میں کرن دیوان ساتھ تھے۔ اس زمانے میں فلم ''ودیا'' میں ایک ابھرتا ہوا نوجوان ہیرو دیوانند نے اس فلم میں کام کیا اور ثریا کی

دھڑکنوں میں سما گیا۔ اور مکیش کا گایا ہوا خوبصورت گیت ''لائی خوشی دنیا ہنستی ہوئی جوانی'' سب پران کی محبت کا راز کھول گیا۔ اس دوران ثریا نے ''امر کہانی'' میں جے راج کے ساتھ ''بڑی بہن'' میں رحمٰن کے ساتھ ''بالم'' میں واسطی کے ساتھ ''چار دن'' اور ''دل لگی'' میں شیام کے ساتھ اور ''دنیا'' میں کرن دیوان کی ہیروئن بنی۔ ''بڑی بہن''، ''چار دن''، ''دل لگی'' کے گیتوں نے تہلکہ مچا کے رکھا ان دنوں ہر طرف ثریا ہی کے چرچے تھے اور یہ دور تھا ۱۹۴۹ء کا اس سال ہدایت کار موہن سنہا نے ثریا اور دیو آنند کو فلم ''جیت'' میں پھر یکجا کر دیا۔ اس سال ہدایت کار چاولہ نے ''شاعر'' میں انھیں ایک دوسرے کے قریب کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ جب کہ ''لیکھ'' میں موتی لال ''ناچ'' میں شیام کے ساتھ اس کی یادگار فلمیں ریلیز ہوئیں۔ یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے جب دیو آنند کے بھائی چیتن آنند نے وقت سے فائدہ اٹھانے کے لئے اپنی فلم سازی اور ہدایت کاری میں فلم ''افسر'' بنائی اس فلم میں انھوں نے دیو آنند کو ثریا سے قریب کر دیا۔ ان دنوں دیو آنند کو اپنی کامیابی کی راہ ہموار کرنے کے لئے کسی بڑے سہارے کی تلاش تھی ثریا آسمان فلم پر چھائی ہوئی تھی۔ دیو آنند نے ثریا کے رومانس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے فریب محبت میں جکڑ لیا اور اپنے لئے کامیابیوں کے دروازے کھول لئے۔ اس سال اے آر۔ کاردار کی داستان میں ثریا راج کپور کے ساتھ جلوہ گر ہوئی ''کمل کے پھول'' میں امرناتھ ''کھلاڑی'' میں اشوک کمار اس کے ہیرو تھے اس سال وہ ''نیلی'' اور ''دوستارے'' میں ایک بار پھر دیو آنند کے ساتھ فلم بینوں کی دھڑکنوں میں داخل ہوئی۔ جب کہ ''شان'' میں رحمٰن ''راجپوت'' میں جے راج اور ''شوخیاں'' میں پریم ناتھ اس کے ہیرو تھے۔

۱۹۵۱ء میں آنند لال خوشونت لال کی فلم ''صنم'' ثریا اور دیو آنند کی مقبول جوڑی کی آخری فلم ثابت ہوئی اس فلم کے بعد دیو آنند ثریا سے دور ہوتا گیا ثریا دیوانہ وار اس کی تلاش میں پھرتی رہی لیکن وہ اب ایک بڑا اور مقبول ہیرو بن چکا تھا۔ اب اسے ثریا کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ کہا جاتا ہے ثریا اس کے لئے برسوں تڑپتی رہی ہے بعد میں فلمی حلقوں میں یہ بھی کہا گیا کہ اس محبت کی ناکامی میں دونوں کا مذہب حائل ہو گیا۔ دیو آنند مسلمان نہ ہو سکا اور ثریا کسی قیمت پر اپنا مذہب چھوڑنے پر تیار نہیں ہوئی۔ ۱۹۵۲ء میں ثریا نے فلم ''خوبصورت'' میں ناصر خان ''گونج'' اور ''دیوانہ'' میں سریش ''موتی محل'' میں اجیت اور ''لال کنور'' میں ناصر خان کے ساتھ کردار کئے۔ ۱۹۵۳ء میں ثریا اور مکیش کی دل کش آواز میں

فلم ''معشوقہ'' کا مرکزی کردار بنی۔ ۱۹۵۴ء میں گلوکار سی ایچ آتما کو ''بلوا منگل'' میں ثریا کا مرکزی کردار بنایا گیا۔ اس فلم کے ذریعے ثریا اور سی۔ ایچ آتما نے جادو جگایا۔ ہدایت کار رتن بوس نے فلم ''وارث'' میں ثریا اور طلعت محمود کو یکجا کرایا دو مدھر آوازیں اس فلم کے گیتوں کا سنگار بن گئیں۔ اس دوران سہراب مودی کی ''مرزا غالب'' نے دھوم مچا دی ثریا کی اداکاری اور اس کے گائے ہوئے نغمات کانوں میں رس گھولنے لگے۔ اس سال ۱۹۵۴ء میں اس نے شمی کپور کے ساتھ فلم ''شمع پروانہ'' میں اپنے گہرے نقش چھوڑے۔ ۱۹۵۵ء میں وہ ناصر خان کے مقابل فلم ''انعام'' میں جے راج کے ساتھ فلم ''کنچن'' میں جلوہ گر ہوئی۔ جب کہ ۱۹۵۶ء میں شیخ ممتاز کے ساتھ فلم ''مسٹر لمبو'' میں کام کیا یہ ایک مختلف نوعیت کی فلم تھی۔

۱۹۵۸ء میں ایس۔ ایم۔ یوسف نے ثریا اور طلعت محمود کو فلم ''مالک'' میں پھر ایک ساتھ کر دیا۔ ''ٹرولی ڈرائیور'' میں رحمٰن ۱۹۵۸ء میں ہی کرن دیوان اور ۱۹۶۱ء میں ''شمع'' میں وہ وجے دت کے مقابل جلوہ گر ہوئی۔ ثریا کی آخری فلم ''رستم سہراب'' بنی اس فلم میں پرتھوی راج کپور اور پریم ناتھ اس کے مقابل تھے یہ فلم ۱۹۶۳ء میں ریلیز ہوئی یہ امر تعجب ہے کہ ثریا کے پہلے ہیرو پرتھوی راج تھے اور آخری فلم میں بھی وہ اس کے مقابل تھے اس درمیان میں بیس برسوں کی طویل مدت شامل تھی۔

ثریا نے اپنی جوانی کے زمانے ہی میں فلموں سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ فلمی صنعت نے لاکھ چاہا کہ وہ فلموں میں پلے بیک گائے لیکن اس نے پلے بیک گانا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔ فلموں سے علیحدگی کے بعد سے وہ شان و شوکت سے زندگی بسر کر رہی تھی۔ برسوں پہلے اس کی نانی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ثریا کی والدہ بھی ۱۹۸۷ء میں انتقال کر چکی تھیں وہ اس وقت سے تنہا زندگی گزار رہی تھیں کہ ۳۱ر جنوری ۲۰۰۴ء کو ثریا بھی اس دار فانی سے کوچ کر گئی۔ ثریا کی موت کی خبر فلم انڈسٹری میں آگ کی طرح پھیل گئی لوگ جوق در جوق عزیز واقارب بھی آئے لیکن فلم انڈسٹری کے چند ہی اشخاص آخری رسومات میں شریک ہو سکے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عمر گزرتے ہی فلم انڈسٹری کے لوگ اپنوں کو پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں یا بھول جاتے ہیں۔

☆☆☆

خوش مزاج، شوخ حسینہ۔ وجینتی مالا

ہریش تیواری

سن ۱۹۵۰ء کی دہائی فلمی موسیقی کا بیحد سُریلا دور تھا تو حسین اداکاراؤں کا ایک ایسا سنہری دور بھی تھا جو فلموں کی تاریخ میں ہمیشہ جگمگاتی رہیں گی۔ نرگس، مدھوبالا، نمّی، بینا رائے، مینا کماری کی موجودگی میں جب جنوب کی وجینتی مالا ممبئی کی فلمی دنیا میں داخل ہوئیں تو ان کے حسن وشباب کی چکا چوند چاروں جانب پھیل گئی۔ ان کے جسم کا ہر حصہ اجنتا الورا کے بتوں کی طرح تراشا ہوا اور بھرت منی کے ناٹیہ شاستر کی شوخیوں سے بھرا ہوا تھا۔ 'بہار' فلم کے ساتھ ہی وہ بہار بن کر ملک کے لاکھوں فلم شائقین کے دلوں پر چھا گئیں۔ شمشاد بیگم کی آواز والے 'سیّاں دل میں آنا رے....'' نغمہ کے ساتھ انہوں ایسی 'چھم چھما چھم' چھوڑی کہ جسے آج ۵۵ سال گزر جانے کے بعد بھی فلم شائقین بھولے نہیں ہیں۔ یہ وجینتی مالا کا ہی کرشمہ تھا کہ اس کے بعد سے اداکاراؤں کے لیے اچھی رقاصہ ہونا لازمی ہوگیا۔ آشا پاریکھ اور ہیما مالنی جیسی اداکاراؤں کی آئیڈیل وجینتی مالا ہی رہی اور بہت بعد کی مشہور اداکارہ اور رقاصہ مادھوری دیکشت کو وجینتی مالا کی ہی روایت میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ وجینتی مالا اس درجے کی اداکارہ تھی جو فلموں میں نہ رہنے کے باوجود ایک روایت بن گئی ہیں جن کی ہمیشہ تقلید کی جاتی ہے۔

'بہار' فلم کے تمل اور تیلگو ریمیک میں بھی وجینتی مالا نے دھوم مچادی۔ حسن وشباب کی وہ بہار ممبئی فلم انڈسٹری میں ایسی چھائی کہ اپنی پہلی ہی فلم سے اسٹار بن گئیں۔ اس وقت جب آج کی طرح کے اشتہار کے سامان دستیاب نہیں تھے، سنیما کے بعد تفریح کا صرف ایک ذریعہ ریڈیو ہی ہوتا تھا یا بھونپو والا فونوگراف۔ اس وقت ریڈیو پر سنیما کے نغموں سے پرہیز ہوا کرتا تھا، ایسے میں جب وجینتی مالا کی فلم 'ناگن' آئی تو بغیر اشتہار کے ہی ٹکٹ کھڑکی کے آگے لوگوں کے ہجوم کی اژدہے جیسی طویل قطاریں لگنے لگیں۔ 'ناگن' نے ہر سنیما ہال میں کامیابی کے ریکارڈ توڑ دیے۔ موسیقار ہمنت کمار کی دُھنوں پر وجینتی مالا کے دلکش رقص نے لوگوں کو مجبور کردیا کہ وہ بار بار فلم دیکھیں۔ 'ناگن' کی طرح وجینتی مالا کے جھومنے کے انداز نے اس وقت کے ہر نوجوان کو ناچنے پر مجبور کردیا۔ اس سب کے ساتھ ہی لتا منگیشکر کی سُریلی آواز ایسی کوکی کہ 'ناگن' کے سبھی نغمے وموسیقی کے اس سنہری دور کی انمول وراثت بن گئے۔ 'تن ڈولے میرا من ڈولے، میرے دل کا گیا قرار....' نغمے کو چاہے لتا

جی قبول کریں یا نہ کریں ان کا سب سے زیادہ مقبول نغمہ ماننے والوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ اس نغمے کا سُروں کی معلومات رکھنے والوں کی محفل میں گایا جانا، اس وقت کے دور میں ضروری ہوگیا۔ سماجی یا مذہبی تقریبات میں مرد وخواتین دھڑلے سے اسے گاتے۔ اسے بھلے ہی کوئی مبالغہ آرائی کہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ ان دنوں جو ہوا چلتی تھی، وہ بھی یہی نغمہ گاتی تھی۔ اس کے علاوہ 'جادوگر سیّاں، چھوڑو میری بیّاں، ہوگئی آدھی رات، اب گھر جانے دو' جیسی موسیقی اور نغمے کے پس منظر کے ساتھ 'وزیول' یعنی منظر میں وجینتی مالا کے جسم کے حصوں کی شوخی شائقین پر جادو سا کردیتی تھی۔ وجینتی مالا میں 'ناگن' جیسی ہی کشش تھی اس فلم کی کامیابی نے یہ ثابت کردیا تھا۔

ہندی سنیما کی اس پہلی اسٹار رقاصہ نے بعد کی اپنی فلموں سے اسے صرف رقاصہ ماننے والوں کے منہ پر تالا لگادیا۔ اداکاری کی کیا تمیز، جیسے الزامات کے باوجود بمل رائے جیسے ہدایت کار نے اسے فلم 'دیوداس' کے لیے منتخب کیا تو لوگ یہاں تک کہنے لگے، تب تو 'دیوداس' کا ہیرو کشور کمار ہونا چاہیے....'ناگن' فلم کی نمائش کے ایک سال بعد جب وجینتی مالا کی اگلی فلم 'دیوداس' نمائش کے لیے پیش کی گئی تو طوائف چندرمکھی کے کردار میں اس نے رقص کی ہی طرح اپنی اداکاری کی بھی چھاپ چھوڑی۔ 'جسے تو قبول کرلے وہ ادا کہاں سے لاؤں' میں مسکراتے ہوئے چندرمکھی نے اپنے دل کی کیفیت اس طرح پیش کی کہ فلم شائقین جذباتی ہوگئے۔ عظیم ہدایت کار بمل رائے کو بھی محسوس ہوا کہ ان کی ہدایت کاری کے لیے ایسا اداکار ہونا چاہیے جو اپنے کردار میں پوری طرح غرق ہوجائے۔ وجینتی مالا نے ان کی امیدوں کو صد فیصد پورا ہی نہیں کیا بلکہ لوگوں کی نظروں میں اس قدر چڑھیں کہ اس سال کی بہترین اداکارہ کا انعام بھی انہیں ملا۔ ۱۹۵۸ء وجینتی مالا کے لیے ایک عجیب وغریب سال تھا، اس سال نمائش کے لیے پیش ہوئی دونوں فلمیں 'سادھنا' اور 'مدھومتی' سپرہٹ ثابت ہوئیں۔ 'مدھومتی' جہاں جنم جنم کے چکروں والی کہانی تھی، وہیں 'سادھنا' ہندوستانی لڑکی کی طوائف بننے جیسی مجبوری کا خلاصہ کرتی تھی۔ 'مدھومتی' میں جہاں محبت سے لبریز دوشیزہ کی شکل میں سلیل چودھری کی دُھن پر 'آجارے پردیسی....' اور 'ایسوری پاپی بچھوا....' پر رقص کرکے اس نے شائقین کو محوِ حیرت کردیا، وہیں 'سادھنا' میں 'عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اسے بازار دیا....' جیسی درد میں بھیگی آواز نے لوگوں کی آنکھیں ہی نہیں، دل بھی بھگو دیے۔ وجینتی مالا کیریئر کی اس اونچائی پر پہنچ گئی تھی، جہاں سے ساری فلم انڈسٹری ان کے قدموں پر تھی۔ آنجہانی بمل رائے نے 'مدھومتی' میں پہلی بار تجارتی فائدے کی شکل میں ایک خطیر منافع کا منھ دیکھا تھا۔

کامیابی کی بلند سے بلند منزل ابھی چھونا باقی رہ گئی تھی۔ ۱۹۶۱ء میں ریلیز 'گنگا جمنا' فلم نے آل ٹائم

ریکارڈ توڑ دیے۔ ایک گنوار بھوجپوری بولنے والی لڑکی کی شکل میں وجینتی مالا نے سنیما کے کروڑوں شائقین کو حیرت زدہ کردیا۔ اس کی گفتگو کے طریقے اور دیہاتی لب و لہجے سے کہیں بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا ہے کہ وہ تمل، تیلگو یا کنٹر زبان کی لڑکی ہے۔ خاص بات یہ تھی کہ اس کی اداکاری میں گاؤں کی الہڑ لڑکی کا فطری پھوہڑ پن اداکارہ کا انعام وجینتی مالا کے ہی نام تھا۔ 'گنگا جمنا' کے تین سال بعد راج کپور کی فلم 'سنگم' (۱۹۶۴ء) نے باکس آفس پر سونے کی اشرفیاں برسا دیں۔ دو محبوبوں کے درمیان جھول رہی ایک دوشیزہ کی تذبذب کا جس بخوبی سے وجینتی مالا نے اظہار کیا، وہ مینا کماری اور نرگس جیسی عظیم اداکاراؤں کے معیار کا تھا۔ ساتھ ہی ہدایت کار راج کپور نے وجینتی مالا کے حسن و جذبات کو اس بہترین طریقے سے پردۂ سیمیں پر پیش کیا کہ سارے ملک میں 'میں کا کروں رام مجھے بڈھا مل گیا' نغمے کی دھوم مچ گئی۔ اچھا ہوا یا برا نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ ریڈیو نے ہمیشہ کے لیے اس نغمے پر پابندی لگادی، وہیں لتا منگیشکر نے اپنے اسٹیج پروگراموں میں اسے گانے سے انکار کردیا اور اسے اپنا گایا ہوا سب سے بیکار گیت بتایا۔

سنگم کے بعد راج کپور اور وجینتی مالا میں جو چپقلش ہوئی اس نے وجینتی مالا کو چڑ چڑا بنا ڈالا۔ دلیپ کمار سے بھی ان کے تعلقات اچھے نہیں رہے۔ 'سنگھرش' فلم کی شوٹنگ پر دونوں میں بول چال بند تھے، دوسروں کے ذریعے سے دونوں ایک دوسرے کو کھری کھوٹی سناتے تھے۔ راجندر کمار سے وہ 'سورج' کے سیٹ پر اس لیے دور دور رہتی تھیں کیوں کہ وہ راج کپور کے دوست تھے۔ لیکن موقع کا تقاضہ سمجھ کر راج کے پرسنل ڈاکٹر بالی اپنا کام دھام چھوڑ کر ان دنوں ان کے میک اپ روم میں ہر وقت موجود رہتے۔ وجینتی مالا کے کیریئر کی تنزلی کے دن تھے جب 'آمر پالی' جیسی بڑی بجٹ کی فلم ناکام ہوگئی۔ جن دنوں 'پیار ہی پیار' کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ ڈاکٹر بالی سے ان کی شادی کی خبر پھیل رہی تھی۔ فلم پوری ہوتے ہی وجینتی مالا نے ہمیشہ کے لیے فلم انڈسٹری کو والوداع کہا اور کئی بچوں کے باپ، معمر بالی سے شادی کر کے گھر بسا لیا۔ نہایت مذہبی اور سبزی خور وجینتی مالا ایسے ایک بکھرے ہوئے خاندان کی لڑکی تھیں جسے ان کے والد کی گرفت سے بچا کر ان کی والدہ یورپ لے بھاگی تھیں، جہاں چار سال کی عمر میں انہوں نے پوپ کے سامنے رقص پیش کر کے پہلی واہ واہی لوٹی۔ آج وہ فلموں میں تو نہیں لیکن لوگوں کے دلوں میں ضرور ہیں 'جُلمی سنگ نین لڑے، او سکھی کا سے کہوں....' جیسی کئی یادیں جگاتی ہیں۔

☆☆☆

بیتے زمانے کی مشہور اداکارہ۔ ریکھا

سید ناظر حسین عزیز

۱۰/ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو ریکھا مدراس میں پیدا ہوئی۔ اس کا اصل نام کمار بھانو ریکھا گنیشن ہے۔ ریکھا کی ماں پشپا تلگو فلموں کی ہیروئن ہے اور باپ جیمنی گنیش تلگو فلموں کے ہیرو ہیں۔ پشپا ولی کے چھ بچے ہیں۔ ان میں دوسرے نمبر پر ہے۔ جیمنی گنیشن رنگین مزاج ہیرو تھے۔ انہوں، تلگو فلموں کی اداکارہ ساوتری سے شادی کرلی اور پشپا ولی کو اپنے چھ بچوں کا انتظام خود کرنا پڑا۔ ریکھا کی ابتدائی تعلیم چرچ ہاؤز میں اور اس کے بعد ایک اقامتی اسکول میں ہوئی۔ ماں کا ہاتھ بٹانے کے لئے ریکھا نے کم سنی ہی میں فلموں میں کام کرنا شروع کردیا۔ انجلی دیوی کی مدد سے ہی ریکھا کو تلگو فلم ''اماں کوسم'' میں رول مل گیا اس کے بعد ایک تامل فلم میں ہیروئن کا رول ملا۔

ریکھا شروع سے ہی شہرت و ترقی کی خواہش مند رہی ہے۔ جس کا نتیجہ ہے کہ وہ جلد سے جلد مشہور و معروف ہیروئن بننا چاہتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ اس نے تیسرے درجہ کی فلموں میں بھی کام کیا۔ اتفاق سے ایک دن جیمنی فلم اسٹوڈیو میں بسواجیت کی نظر ریکھا پر پڑی۔ بسواجیت نے ریکھا کو فلمساز شرو جیت پال سے ملوایا اور ان کو ریکھا پسند آ گئی۔ انہوں نے یہ شرط رکھی کہ وہ ان کی آٹھ فلموں میں کام کرے لیکن ان فلموں کی ریلیز سے پہلے کسی دوسری فلم میں کام نہیں کرنا ہوگا۔ ریکھا نے ان کی شرط کو مان لیا۔ اس طرح اس کی نئی فلم کا نام ''انجانا سفر'' تھی۔ اس فلم میں ریکھا نے بسواجیت کو کئی بوسے دیئے۔ اب بوسوں کی سین کی تصاویر مشہور بین الاقوامی رسالے ''لائف'' نے شائع کئے۔ فلمی دنیا میں تہلکہ مچ گیا اور فلم کی بے حد پبلسٹی ہوئی مگر یہ فلم پوری نہ بن سکی اور ادھوری رہ گئی۔ اس دوران ریکھا کی ملاقات فلمساز و ہدایت کار موہن سہگل سے ہوئی اور انہوں نے ریکھا کو لے کر اپنی نئی فلم ''ساون بھادو'' بنائی اور اس کے ہیرو نوین نشچل تھے۔ ریکھا کو ہندی سکھانے اور تلفظ صحیح ادا کرنے کی ٹریننگ دینے کے لئے ایک ٹیوٹر کا انتظام کیا گیا۔ پہلی فلم 'ساون بھادو' کافی کامیاب رہی۔

فلم 'ساون بھادو' دیکھ کر فلم بین یہ سمجھ رہے تھے کہ کالی کلوٹی، موٹی بھدی ہیروئن نہیں چلے گی ریکھا بچپن میں بہت موٹی کالی اور بھدی تھی۔ تیرہ سال کی عمر میں ریکھا کی کمر ناپ چالس انچ تھا۔ اس کا قد پانچ فٹ چار انچ ہے۔

اس کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ خوبصورت آنکھیں لگتی ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں کو ناگن کی آنکھوں سے تشبیہہ دیتی ہے۔ ریکھا کو اس منزل تک پہنچنے کے لئے کافی درد اور ذلت جھیلنی پڑی۔ اسے اس کے ساتھی کلاکاروں نے بھونڈے ناموں اور خطابوں سے پکارا۔ ایک ہیرو کا تھپڑ تک برداشت کرنا پڑا۔ ریکھا ۱۹۷۶ء تک نیم سیکس اپیل سے ہی کام لیتی رہی۔ پہلی دفعہ ''دوانجانے'' نے ۱۹۷۶ء میں اس کی اداکاری کے لئے نقادوں کو تعریف کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان دنوں وہ ٹائفائڈ سے متاثر کر بیمار پڑ گئی وزن پندرہ کیلو کم ہو گیا تندرست ہونے کے بعد وہ لندن گئی وہاں جا کر اپنے جسم کو سڈول اور خوبصورت بنائے رکھنے کے طور طریقے سیکھ لئے اور وہ لندن سے ایک فلمی ستارہ بن کر لوٹی۔

ریکھا کی فلم ''گھر'' ۱۹۷۸ء کی بہترین فلم رہی جو صرف تین ماہ میں بن کر تیار ہو گئی۔ اس نے رشی کیش مکھرجی کی ڈائریکشن میں فلم نمک حرام (۱۹۷۳ء)، آلاپ (۱۹۷۷ء) خوبصورت (۱۹۸۰ء) میں اپنی بہترین اداکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ممبئ میں بین الاقوامی فلم فیسٹیول کے موقع پر ریکھا کو ہندی فلموں میں اس کی نمایاں خدمات پر ایوارڈ دیا گیا۔ فلم ''امراؤ جان'' (۱۹۸۱ء) میں بہترین اداکاری پر نیشنل ایوارڈ دیا گیا۔ ریکھا اور امیتابھ بچن کے ساتھ ایک ساتھ کئی فلموں میں کام کرنے پر ان دونوں کے متعلق کافی باتیں ہوئیں۔ ریکھا نے اب تک ۱۶۰ فلموں میں کام کیا۔ ۱۵۹ ویں فلم ''بھوت'' اور ۱۶۰ ویں فلم ''کوئی مل گیا'' ۲۰۰۳ء میں ریلیز ہوئیں اس کی آنے والی فلموں میں نمایاں طور پر سنجے لیلا بھنسالی کی فلم ''باجی راؤ مستانی'' ہے۔ اس میں ریکھا، سلمان خان کی ماں کا کردار ادا کر رہی ہے۔ ۱۹۹۰ء میں ریکھا نے مکیش اگروال سے شادی کی مگر نہ جانے کیا بات ہوئی کہ مکیش نے پھانسی لگا کر خود کشی کر لی۔ ریکھا کو انگریزی، ہندی، تیلگو، تامل، مراٹھی، اور بنگلہ زبانیں اچھی طرح آتی ہیں۔ ریکھا ایک ایسی ہیروئن ہے جو ۵۱ سال ہونے کے بعد بھی اس کی اداکارانہ صلاحیتیں اور جسمانی ساخت آج بھی سب کے لئے پر کشش ہے اور نئی ہیروئنوں کے لئے چیلینج بنی ہوئی ہے۔

☆☆☆

ناقابل فراموش اداکارہ۔ اچلا سچدیو

خورشید اختر فرازی

پرانی اداکاراؤں میں ایک اداکارہ اچلا سچدیو بھی ہے جس نے ۱۹۳۸ء سے بولتی فلموں کے آغاز کے بعد کام کرنا شروع کیا اور اس وقت یہ ۹۰ سالہ اداکارہ اب بھی کبھی کبھی چھوٹے پردے پر نظر آجاتی ہیں۔ اچلا سچدیو کی پیدائش ۱۹۲۰ء میں ۳/مئی کو پشاور (برٹش انڈیا) میں ہوئی تھی اور ۱۸ سال کی عمر میں اسے پہلی مرتبہ ۱۹۳۸ء میں فیشن ایبل وائف میں ہیروئن کا رول ملا تھا۔ ۱۹۶۵ء کی بنی بی آر چوپڑہ کی ناقابل فراموش فلم ''وقت'' میں وہ بلراج ساہنی کی بیوی راج کمار سنیل دت اور ششی کپور کی ماں بنی تھی۔ اس فلم میں اچلا سچدیو کے کام کو بے حد سراہا گیا تھا خاص طور پر امیر لالہ (بلراج) جب زبردست زلزلہ کے بعد اپنے گھر بار اور تمام پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور ساتھ ہی اپنی بیوی اور بچوں سے بھی بچھڑ جاتے ہیں اس وقت اچلا سچدیو کے ہاتھ میں صرف گود کا بچہ (ششی کپور) رہ گیا تھا اور اس بچے کو وہ بڑی محنت ومشقت سے پال کر جوان کرتی ہے۔ اس فلم کے ایک ایک سین میں اچلا سچدیو کی جذباتی اداکاری لاجواب تھی۔

اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اچلا سچدیو اپنی جوانی سے ہی بوڑھی نظر آنے لگی ۱۹۵۰ء کی فلم فٹ پاتھ جب کہ اس وقت اچلا سچدیو صرف ۳۰ سال کی تھی اس وقت اس نے مینا کماری کی ماں کا رول ادا کیا تھا اور ۶۰ سال پہلے وہ بے حد بوڑھی لگتی تھی جب کہ وہ میک اپ کا کمال تھا ورنہ ۱۹۷۸ء کی ریلیز امانت (منوج، بلراج، اور سادھنا) میرے صنم (بسواجیت، آشا پاریکھ ۱۹۷۰ء) آسرا (بسواجیت مالاسنہا، بلراج ۱۹۷۰ء) اور ۱۹۶۵ء کی ریلیز ''وقت'' کے پہلے حصے میں وہ کافی حسین لگتی تھی۔ ۱۹۶۶ء کی ریلیز جب پیار کسی سے ہوتا ہے (دیوآنند، آشا پاریکھ) ۱۹۶۷ء کی ریلیز پھر وہی دل لایا ہوں (جوائے مکھرجی، آشا پاریکھ) وغیرہ میں بھی اچلا سچدیو نے باوقار ماں کا رول ادا کیا تھا لیکن اپنی شکل وشباہت کی بنا پر وہ کافی حسین دکھائی دی تھی۔ فلم روٹھا نہ کرو، مہندی لگی میرے ہاتھ، پیار کا موسم، نیند ہماری خواب تمہارے، اس نے کہا تھا وغیرہ میں بھی اچلا سچدیو حسین لگی تھی فلمی تواریخ کے ماہر جناب الف انصاری کی یادداشت کے لئے یہ بات گوش وگذار کر دی جائے (اچلا سچدیو کسی زمانے میں جن دادی لیکھک سنگھ اور ترقی پسند مصنفین میں بے حد مقبول تھیں اور ان کی میٹنگوں

میں اکثر و بیشتر شرکت کے لئے کولکاتا آیا کرتی تھیں ۱۹۷۰ء میں وہ بلراج کے ساتھ کولکاتا آئیں اور کلکتہ کی سب سے قد آور اور عظیم ادبی شخصیت حضرت سالک لکھنوی کی رہائش گاہ پر ٹھہری تھیں اس زمانے میں کیفی اعظمی مرحوم اور پاکستان کی ایک شاعرہ بھی وہاں ٹھہری ہوئی تھیں اور ان کی موجودگی میں ایک ادبی شام منائی گئی تھی جس میں راقم الحراف کو بھی موجود رہنے کا فخر حاصل ہوا تھا اور یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی تھی کہ فلموں میں سیدھی سادی ماں کا کردار ادا کرنے والی اچلا سچد یو بالکل انگلش اسٹائل کے کپڑے اور فریم لیس چشمے میں تھی اور فراٹے سے اردو، انگریزی میں باتیں کر رہی تھی۔

اچلا سچد یو نے آخری زبردست ہٹ فلم ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' میں کاجول کی نانی کا رول ادا کیا تھا۔ یہ فلم ۱۹۹۵ء میں ریلیز ہوئی تھی اور اب تک ممبئی کے ایک سنیما ہال لبرٹی میں گزشتہ ۱۵ برسوں سے مسلسل نون شو میں چل رہی ہے۔ اچلا سچد یو نے یش راج کی بیشتر فلموں میں اداکاری اور اپنی پہلی فلم فیشن ایبل وائف ۱۹۳۸ء کے بعد اس نے کل ملا کر ۱۳۰ فلموں میں اداکاری کی ۱۹۶۳ء کی ریلیز ''نائن آورس ٹو راما'' میں بھی اداکاری کی جس کا سب ٹائیٹل انگریزی میں تھا۔ یہ فلم مارک روبسن نے بنائی تھی اس کے علاوہ ۱۹۶۳ء کی ریلیز مرچنٹ ایوری کی فلم ''دی ہاؤس ہولڈر'' میں بھی اداکاری کی اور اس فلم کا سب ٹائیٹل بھی انگریزی میں تھا۔ چونکہ اچلا سچد یو نے دہلی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا تھا اس لئے ان کی انگریزی زبان دانی بہت ہی شستہ تھی اور بے دھڑک پندرہ بیس منٹ تک مسلسل بغیر رکے انگریزی زبان بول سکتی ہیں۔

اچلا سچد یو نے ۱۹۶۰ء میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی وغیرہ کے ساتھ ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں سرگرم حصہ لیا تھا، اچلا سچد یو نے ہمیشہ ہندی اور انگریزی کے مقابلے میں اردو کو ترجیح دی اور وہ اپنے مکالمہ نگاروں سے بھی کہہ دیتی تھیں کہ وہ ان کے ڈائیلاگ اردو میں لکھ کر دیں تاکہ ڈائیلاگ کی ادائیگی صحیح ڈھنگ سے ہو۔ ۱۹۷۰ء کی ریلیز فلم ''کنیا دان'' میں اس نے آشا پاریکھ کی ماں کا رول ادا کیا تھا اور فلم کے آخری سین میں اس کا ایک طویل ڈائیلاگ جو تقریباً ۱۰ منٹ کا تھا اس نے اس ڈائیلاگ کی ادائیگی بہترین انداز میں کی تھی۔

فلم امانت، وقت وغیرہ میں بھی اس کے ڈائیلاگ کی ادائیگی کی بے حد تعریف ہوئی تھی۔ اچلا سچد یو

نے جن اہم فلموں میں کام کئے ان کے نام حسب ذیل ہیں۔ لیکن اس سے پہلے فلم بندھن کا ذکر بے حد ضروری ہے جس میں وہ جیون کی بیوی اور راجیش کھنہ کی ماں کے رول میں تھی۔ اس فلم میں جیون فلم کی ہیروئن ممتاز کے باپ سے انتقام لینے کے جنون میں ممتاز کی عزت لوٹ لینا چاہتا ہے اور اس حقیقت سے باخر اس کا بیٹا خود ممتاز سے محبت کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ بہرکیف باپ بیٹے میں لڑائی ہوتی ہے اور اتفاق سے جیون اپنی ہی کلہاڑی پر غلطی سے گر کر ہلاک ہو جاتا ہے اور راجیش جب ان کی پیٹھ سے کلہاڑا نکالنے کی کوشش کرتا ہے تو وہاں اس کی ماں پہنچ جاتی ہے اور اسے یہ گمان ہوتا ہے کہ اس کے شوہر کا قتل خود اس کے بیٹے نے کیا ہے اور وہ عدالت میں بھی یہی بیان دیتی ہے لیکن اس سے پہلے کہ جج ان کے لئے پھانسی یا عمر قید کی سزا تجویز کرے ممتاز عدالت میں آ کر سارا واقعہ بیان کر دیتی ہے۔ اس فلم میں اچلا سچد یو کی جذباتی اداکاری بے حد لاجواب تھی اچلا سچد یو کی چند یادگار فلمیں ہیں۔

فیشن ایبل وائف، دلربا، کشمیر، شوخیاں، شیشہ، ریشم، ماں، انہونی، راہی، ہمراز، سپنوں کا سوداگر، میرے ہمدم میرے دوست، کنیا دان، جواری، آدمی اور انسان بندھن، پریم پجاری، پوتر پاپی، میرا نام جوکر، ہیرا رانجھا، ہرے راما ہرے کرشنا، چاہت، انداز، البیلا، پرایا دھن، کل آج اور کل، ہنستے زخم، داغ، انا میکا، پرانئے، کورا کاغذ، گیتا میرا نام، ترتمورتی، جولی، لیلیٰ مجنوں، کرم، چاندی سونا، چھیلا بابو، امانت، تمہاری قسم، منگل دادا، لو اینڈ گاڈ چاندنی، دل والے دلہنیا لے جائیں گے۔ دل کیا کرے، فٹ پاتھ، منا، سب سے بڑا روپیہ، ہم پنچھی ایک ڈال کے، پردیسی، مس میری، چار دل چار راہیں، کلپنا، منزل، زمین کے تارے، شرون کمار، چھوٹے نواب، سلام میم صاحب، جھولا، مہندی لگی میرے ہاتھ، منموجی، میری صورت تیری آنکھیں، دل ایک مندر، شگون، سنگم، راج کمار، حقیقت، چتر لیکھا، آرزو، وقت، میرے صنم، جانور، ہمالیہ کی گود میں، بہو بیٹی، آکاش دیپ، آگ، دل نے پکارا، شاگرد، دہک، کبھی خوشی کبھی غم، نا تم جانو نہ ہم، کل ہو نہ ہو، وغیرہ وغیرہ۔

فلم پوتر پاپی میں اچلا سچد یو، بلراج ساہنی کی بیوی اور تنوجہ اور بے بی نیتو سنگھ (۱۰ سال) کی ماں بنی تھی۔ اس فلم کے ہیرو اجئے ساہنی (پریکشیت ساہنی) تھے۔ بلراج ساہنی ایک گھڑی کے تاجر آئی ایس جوہر کی دکان میں کام کرتے تھے کام بہتر طور پر نہیں ہوسکتا تھا پھر ایک دن ان کی دکان میں

ایک بے کار نوجوان اجے ساہنی کام مانگنے آتے ہیں اور گھڑی سازی کے کام میں وہ بے حد ماہر ہوتے ہیں جس کے بعد لالہ بلراج کو کام سے ہٹا دیتے ہیں جس سے وہ بڑی مصیبت میں پڑ جاتے ہیں کہ ان کی جوان بیٹی کی شادی کا جہیز کہاں سے لائیں چھوٹی بیٹی بھی جوان ہو رہی تھی پھر گھر کا خرچ اور یہ سب کچھ سوچ کر وہ گھبرا کر گھر جانے کے بجائے دوسرے شہر چلے جاتے ہیں، اجے کو جب یہ سب پتہ چلتا ہے تو وہ پورے گھر کی ذمہ داری سنبھال لیتا ہے اور گھر والوں سے جھوٹ کہتا ہے کہ کیدار ناتھ (بلراج) کو لالہ جی نے کسی کام سے دوسرے شہر بھیجا ہے۔ اور مجھے پورے گھر کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپی ہے۔ پھر اس پوتر پاپی کیدار ناتھ کی بیٹی تنوجہ سے محبت کرنے لگتا ہے لیکن اپنی محبت کی قربانی دے کر اس جگہ اس کی شادی کرا دیتا ہے جس رشتہ کو کیدار ناتھ نے جوڑا تھا اور پھر کیدار ناتھ کو جب یہ معلوم ہوتا ہے تو وہ اپنے گھر لوٹ آتے ہیں اور یہ پوتر پاپی کسی دوسرے شہر میں اپنی قسمت آزمانے چلا جاتا ہے۔ ایسی کلاسیک فلم برسوں میں کوئی ایک بنتی ہے۔ اس فلم کے ڈائیلاگ، گیت اور سنگیت پریم دھون کے تھے اور فلم بے انتہا متاثر کن تھی اس فلم کا ایک گیت کشور کمار کی آواز میں اجئے ساہنی پر فلمایا گیا بے حد مشہور ہوا تھا وہ گیت یہ ہے۔

''تیری دنیا سے ہو کے مجبور چلا.....میں بہت دور بہت دور بہت دور چلا''۔

پوری فلم میں اجئے ساہنی اور اچلا سچدیو مرکزی کردار کی طرح سے تھے اور ہر کردار اپنے اپنے طور پر انتہائی جذباتی انداز لے کر تھا۔ بلراج ساہنی اجئے ساہنی اور تنوجہ کی اداکاری کے ساتھ اچلا سچدیو کی اداکاری تو خیر عروج پر تھی لیکن ایک مکار مگر نرم دل لالہ کے رول میں آئی ایس جوہر کی اداکاری نا قابل فراموش تھی۔ اس فلم کو صدارتی تمغے سے نوازا گیا تھا۔ مگر افسوس فلم فیئر والوں نے کسی بھی ایکٹر گیت کار ہدایتکار و کہانی کار کو ایوارڈ نہیں دیا کیوں کہ وہ ایوارڈ کو خریدنے کے اہل نہ تھے۔

☆☆☆

سنجیدہ اداکارہ۔وحیدہ رحمٰن

ڈاکٹر شاہد محمود

وحیدہ رحمٰن.... یہ ایک ایسا نام ہے جس کے اندر خوبصورتی، متانت، سادگی، چہرے کا تیکھا پن اور سب سے بڑھ کر اس کی نشیلی آنکھیں، رقص کرنے کا مخصوص انداز، ڈائیلاگ کی ادائیگی میں تسلسل، غرض یہ کہ اس اداکارہ کے اندر وہ سب کچھ ہے جو آج کی موجودہ اداکاراؤں کے اندر ڈھونڈ کر بھی نہیں ملتا ۱۴رمئی ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئی وحیدہ رحمٰن نے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۰ء تک تقریباً تین دہائیوں تک فلم بینوں کو مسحور کئے رکھا اگرچہ بعد میں وحیدہ رحمٰن نے اپنی تاریخ پیدائش میں تبدیلی کی اور کہا کہ اس کا جنم اصل میں ۳رفروری ۱۹۳۶ء کو ہوا تھا ۱۴رمئی کو نہیں۔ اس کی پیدائش آندھرا پردیش کے شہر حیدر آباد میں ایک مسلم گھرانے میں ہوئی تھی جہاں نماز روزہ اور پرہیز گاری کو خاص درجہ حاصل تھا، ان کے والد ضلع مجسٹریٹ تھے اور انہیں پورے جنوب کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، وحیدہ نے زندگی میں ڈاکٹر بننے کا خواب دیکھا تھا لیکن وہ بچپن ہی سے عارضہ قلب میں مبتلا تھی اور اس وجہ سے وہ اپنی پڑھائی مکمل نہیں کرسکی تھی۔ اس نے بھارتیہ ناٹیم کا سبق حاصل کیا تھا اور اس رقص میں اس کو عبور حاصل تھا۔ بعد ازاں اسے تیلگو فلم میں کام کرنے کی پیشکش ہوئی تو اس کے والدین نے شروع میں مخالفت کی لیکن بعد میں مجبور ہو کر اجازت دیدی اور ۱۹۵۵ء میں پہلی مرتبہ اس نے فلم جے شیما میں کام کیا جو ایک تیلگو فلم تھی۔ اسی سال اس نے دوسری تیلگو فلم روجولو مارائی میں بھی ہیروئن کا رول ادا کیا۔ اس وقت اس کی عمر ۱۲ سال تھی اور اسی دوران ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔

اسی دوران فلمساز و ہدایتکار گرودت نے وحیدہ رحمٰن کو کھوج نکالا اور ۱۹۵۶ء میں اسے اپنے ساتھ بمبئی لے آئے اور اپنی فلم سی آئی ڈی میں پہلی مرتبہ اسے ایک ویمپ کے رول میں پیش کیا۔ فلم سی آئی ڈی کے ہدایت کار راج کھوسلہ تھے۔ ۱۹۶۰ء میں وحیدہ رحمٰن کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ سی آئی ڈی فلم کی زبردست کامیابی کے بعد ۱۹۵۷ء میں گرودت نے انہیں فلم ''پیاسا'' میں ہیروئن کے لیڈنگ رول میں پیش کیا۔ اس زمانے میں کہا جانے لگا کہ گرودت جو کہ گلوکارہ گیتا دت کے شوہر تھے وہ وحیدہ رحمٰن کی زلفوں کا اسیر ہو گئے۔ اس کے بعد ۱۹۵۹ء میں گرودت نے انہیں فلم کاغذ کے پھول میں ہیروئن کے رول میں پیش کیا۔ اس فلم میں

ایک فلم ڈائریکٹر کی کہانی تھی جس نے زندگی میں بڑی کامیابی حاصل کی لیکن ایک لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو کر وہ اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے۔اس فلم میں گرودت نے اپنی نجی زندگی کو پیش کیا تھا لیکن یہ فلم بری طرح فلاپ ہوئی جب کہ اس فلم کو ہندوستانی فلموں میں کلاسیک فلم کا درجہ دیا گیا تھا۔۱۹۶۰ء میں گرودت نے انہیں ''چودھویں کا چاند'' میں پیش کیا یہ مسلم سوشل فلم بیحد کامیاب رہی اور اس فلم میں وحیدہ رحمٰن صحیح معنوں میں چودھویں کا چاند ہی لگی۔

۱۹۶۲ء میں گرودت کی زندگی کی سب سے کامیاب فلم ''صاحب بی بی اور غلام'' تھی جس میں اصل ہیروئن کا رول مینا کماری کا تھا لیکن وحیدہ رحمٰن کو بھی سائیڈ ہیروئن کے طور پر بڑا رول دیا گیا تھا ۱۹۶۳ء میں برلن فیسٹویل کے دوران دونوں کے درمیان ناچاقی پیدا ہوگئی اور وحیدہ رحمٰن نے گرودت سے منہ موڑ لیا ،کہا جاتا ہے کہ وحیدہ کی بے رخی سے گرودت اس قدر دل شکستہ ہوئے کہ رات کو بہت ساری نیند کی گولیاں کھالیں جس سے ان کی موت ہوگئی تھی۔۱۹۶۴ء میں گرودت کی خودکشی پوری فلم انڈسٹری کے لئے ایک المیہ ثابت ہوئی۔ ۱۹۶۰ء،۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء وحیدہ رحمٰن کے عروج کا زمانہ رہا۔ ۱۹۶۵ء میں وجے آنند کی ہدایت میں بنی فلم ''گائیڈ'' میں انہیں دیوانند کے مقابل ہیروئن بنایا گیا۔اس فلم نے پورے ملک میں ریکارڈ توڑ بزنس کیا اور وحیدہ رحمٰن کو بہترین اداکارہ کے طور پر فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ۱۹۶۸ء میں فلم نیل کمل (منوج۔راجکمار) میں بھی وحیدہ کو فلم فیئر ایوارڈ ملا۔اس کے بعد اگرچہ بیشتر فلموں میں اس کی اداکاری کو بیحد سراہا گیا لیکن وہ فلمیں باکس آفس میں فلاپ ہوگئیں۔۱۹۶۴ء میں وحیدہ نے فلم ''شگون'' میں کام کیا جس کے ہیرو کمل جیت سنگھ تھے،اسی فلم کی شوٹنگ کے دوران کمل جیت نے شادی کی تجویز رکھی جسے انھوں نے قبول کرلیا۔اور ۲۷/اپریل ۱۹۷۴ء کو انھوں نے شادی کر لی۔شادی کے بعد وہ بنگلور کے ایک فارم میں منتقل ہوگئی۔اور خود کو کھیتی باڑی میں مصروف کرلیا۔وحیدہ اور کمل جیت کے دو بچے پیدا ہوئے جن کے نام سہیل اور کشوی ہیں۔۲۱/نومبر ۲۰۰۰ء کو اس کے شوہر کمل جیت کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔اپنے شوہر کے انتقال کے بعد اس نے باندرہ میں ایک بنگلہ خرید لیا اور وہیں منتقل ہوگئی۔اب بھی وہ باندرہ میں رہتی ہیں ابھی حال ہی میں اس نے چند فلمیں قبول کیں جن میں واٹر اور رنگ دے بسنتی شامل ہیں۔اکتوبر ۲۰۰۴ء میں وحیدہ رحمٰن کی فلموں کا ایک میلہ شیٹل آرٹ میوزیم یونیورسٹی آف واشنگٹن میں منعقد ہوا تھا۔اس میلے میں وحیدہ نے شرکت کی جہاں ان کی مشہور فلموں پیاسا،تیسری قسم اور گائیڈ پر مختلف سوالات اٹھائے گئے اور اس نے ان کا جواب بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ دیا۔وحیدہ کو ۱۹۶۵ء میں گائیڈ کے لئے اور ۱۹۶۸ء میں نیل کمل کے لئے فلم

فیئر ایوارڈ دیا گیا۔اس کے علاوہ ۱۹۹۴ء میں انہیں فلم فیئر لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ دیا گیا۔

فلم فیئر ایوارڈ کے لئے اگرچہ متعدد مرتبہ ان کا نام فہرست میں شامل ہوا خاص طور پر تیسری قسم رام اور شیام،آدمی،دل دیا درد لیا،خاموشی،کبھی کبھی،نمکین اور لمحے وغیرہ شامل ہیں لیکن مصیبت کے ماروں نے انہیں نظر انداز کر کے دوسروں کو اس ایوارڈ سے نوازا جبکہ وہ کسی بھی اعتبار سے اس کی لائق نہیں تھیں۔

وحیدہ رحمٰن کی دیگر فلموں میں مندرجہ ذیل فلمیں شامل ہیں۔

رنگ دے بسنتی،۱۵/پارک ایونیو،میں نے گاندھی کو نہیں مارا،واٹر،کبھی خوشی کبھی غم،عدالت،ترشول، اوم جے جگدیش،چاندنی مشعل،قلمی،ہمت والا،نمک حلال،سوال،کبھی کبھی،ریشما اور شیرا،پریم پجاری، خاموشی،آدمی،پتھر کے صنم،کہرا،مجھے جینے دو،درپن،بات ایک رات کی،شطرنج،بیس سال بعد،ایک پھول چار کانٹے،کالا بازار،سولہواں سال،روپ کی رانی چوروں کا راجہ،۱۲ او کلاک۔

وحیدہ رحمٰن نے سنیل دت اور دیوآنند کے ساتھ بہت زیادہ فلمیں کیں،درپن میں سنیل دت ہیرو تھے جس میں وحیدہ نے ایک ایسی لڑکی کا رول ادا کیا تھا۔جسے سماج نے رسوا کر کے دردر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ریشما اور شیرا میں اس نے ایک قبائلی لڑکی کا رول بڑی خوبی سے نبھایا تھا۔دیوآنند کے ساتھ فلم سولہواں سال بڑی دلچسپ فلم تھی جس میں اس نے ایک لڑکی کا رول ادا کیا تھا جو اپنے عاشق کے بہکاوے میں آکر گھر سے زیور لے کر بھاگ جاتی ہے اور ٹرین میں اس کی ملاقات دیوآنند سے ہوجاتی ہے اور پھر کہانی جس ڈرامائی انداز میں نیا موڑ لیتی ہے وہ دیکھنے کے لائق ہے۔دلیپ کمار کے ساتھ دل دیا درد لیا، رام اور شیام اور آدمی میں تھیں اس کے بیس سال بعد دونوں کی جوڑی پھر مشعل میں دیکھی گئی،اس فلم میں بھی وحیدہ رحمٰن کے مرنے کا سین بہت ہی جذباتی ہے جب دلیپ کمار رات کے اندھیرے میں چیخ چیخ کر لوگوں سے مدد مانگتے ہیں کہ کوئی اس کی بیوی کو بچائے۔اس فلم کے اس سین کو لوگ کبھی نہ بھول پائیں گے۔

(نوٹ:-اس اسکرپٹ کی تیاری میں محترمہ سیمی رخسار کا میں تہہ دل سے ممنون ہوں)۔

☆☆☆

ماضی کی مشہور اداکارہ۔بیگم پارہ

شکیلہ یعقوب

ماضی کی مشہور اداکارہ اور سیکس سائرن بیگم پارہ جن کا انتقال جنوری ۲۰۰۹ء میں ہوا اور اس کی خبر ہر اخبار نے معمولی انداز میں کسی کونے میں شائع کی کہ حیرت ہونے لگی کہ یہ وہی سپر اسٹار ۱۹۵۰ء تھی جس کی خوبصورتی کا ہر کوئی دیوانہ تھا۔ٹی وی سیریل میکرا یکتا کپور جو جتندر کی بیٹی ہے اور ٹی وی کی دنیا کی ملکہ کہلاتی ہے جس نے ساس بھی کبھی بہو تھی، کہیں کسی روز، کم کم اور اس جیسے درجنوں سیریل بنائے جواب بھی گزشتہ ۱۰ برسوں سے لگاتار دکھائے جارہے ہیں جس میں ایک اہم نام گھر گھر کی کہانی کا بھی ہے، اس ٹی وی پروڈیوسر ایکتا کپور نے بہو کے رول سے سمرتی ایوانی کی جگہ پر بیگم پارہ کو آفر دیا تھا کہ وہ ان کی ٹی وی سیریل میں کام کرے مگر بیگم پارہ نے حقارت کے ساتھ اس آفر کو ٹھکرا دیا۔ سنجے لیلا بھنسالی نے بھی اپنی فلم ''سانوریا'' کے لئے بیگم پارہ سے رجوع کیا تھا کہ وہ فلم میں سونم کپور (انیل کپور کی بیٹی) کی دادی کا رول ادا کرے اور اس کے لئے انھوں نے بیگم پارہ کو ایک اچھی پیشکش بھی کی تھی مگر بیگم نے اس آفر کو بھی ٹھکرا دیا کہ اس نے ۱۹۶۰ء میں بھگوان دادا کے ساتھ آخری فلم ''کربلا'' میں کام کیا تھا جس کے بعد اور کبھی بھی کیمرے کا سامنا نہ کرنے کی قسم کھالی تھی اور اپنی قسم کو وہ توڑی نہیں سکی۔

جس وقت ہندی فلموں میں بیگم پارہ کا کیریر عروج پر تھا اسی زمانے میں اس نے دلیپ کمار کے چھوٹے بھائی ناصر خان کے ساتھ ۱۹۵۸ء میں شادی کر لی تھی اور شادی کے بعد انھوں نے فلمی دنیا کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ناصر خان کا انتقال ۱۹۷۴ء میں ہوگیا تھا جس کے بعد اُسے اپنے تین بچوں کی پرورش میں سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔چونکہ دلیپ کمار کے ساتھ اس کے تعلقات کبھی بھی اچھے نہیں رہے اس لئے اس نے کبھی بھی دلیپ کمار سے رجوع نہیں کیا، خود دلیپ کمار نے بھی اپنے بھائی کی موت کے بعد بیگم پارہ کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔اس وقت بیگم پارہ کا لڑکا ایوب خان بھی اسٹار ہے لیکن بہت زیادہ کامیاب نہیں ہے۔بیگم پارہ اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ ممبئی کے درسودا میں رہتی تھیں۔

بیگم پارہ کو اس کا افسوس کبھی نہیں ہوا کہ ناصر خان کے ساتھ شادی کرنے کے بعد اس کا فلمی کیریئر ختم

ہوگیا اس نے کبھی اس کی کوشش بھی نہیں کی کہ دوبارہ فلموں میں واپس آئے کیونکہ انہیں اچھی طرح سے یہ معلوم تھا کہ موجودہ نسل کے نوجوان ایکٹرا پنے سینئروں کی کوئی عزت نہیں کرتے۔اور وہ سیٹ پر اپنی بے عزتی نہیں چاہتی تھی۔بیگم پارہ کا کہنا تھا کہ اسے فلم کے سیٹ پر جونیئروں کے ہاتھوں سینئروں کی بے عزتی کی کئی کہانی سننے کو ملیں، لیکن سنجے لیلا بھنسالی جنہیں وہ بچپن سے جانتی تھیں اس نے انہیں یقین دلایا تھا کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے انھوں نے جو کچھ بھی سنا ہے وہ غلط ہے۔

اس وقت جب کہ بیگم پارہ کی واپسی کی بات ہورہی تھی کہ وہ دوبارہ فلموں میں واپس آسکتی ہے تو دھڑا دھڑ کئی ٹی وی چینلوں نے ان کی پرانی فلموں کے سین دکھانے شروع کردیئے اور ہر سین میں انھیں ماضی کا سیکس سمبل بنا کر پیش کیا جانے لگا۔یہ سب چیز بیگم پارہ کے لئے اور بھی تکلیف دہ تھی اور انھوں نے حتمی طور پر فیصلہ کرلیا کہ اب وہ کبھی بھی کیمرے کا سامنا نہیں کریں گی۔۱۹۵۳ء میں بیگم پارہ کی ایک فلم ''استاد پیڈرو'' آئی تھی اس فلم کے ہر سین میں وہ ایک ہاف پینٹ پہن کر تھی، پوری فلم جنگل کے سین میں فلمائی گئی تھی، اس فلم کے ہیرو شیخ مختار تھے، یہ فلم بیگم پارہ کی خوبصورتی کی وجہ سے بیحد کامیاب ہوئی تھی۔

بیگم پارہ جب صرف ۱۹/سال کی تھی تب اُسے فلم میں ہیروئن کا رول ملا تھا۔جالندھر کی رہنے والی بیگم نے زندگی کے ابتدائی تعلیمی سال بیکانیر میں گزارے، اس وقت اس کا نام صرف پارہ تھا بعد میں اس نے اپنے نام کے ساتھ بیگم کو جوڑ لیا تھا۔اس کا تعلق ایک آزاد مسلم گھرانے سے تھا، اور گھر پر پردہ کا چلن نہیں تھا۔اس کے والدین اکثر و بیشتر فلمیں دیکھنے جایا کرتے تھے اور اُسے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔بیگم پارہ کا فیوریٹ ہیرو اس زمانے میں موتی لال تھے جو بعد میں اس کے اچھے دوست بن گئے تھے بمبئی میں چھٹیوں کے دوران پارہ کے بھائی کی سالی پر تیما داس گپتا جو کہ فلموں میں کام کرتی تھی اسی نے اسے مجبور کیا کہ وہ بھی فلموں میں کام کرنا شروع کردے۔اس کے والدین کچھ ردوقدح کے بعد راضی ہوگئے تھے۔۱۷سال کی عمر میں اسے فلم ''چاند'' میں ہیروئن کا رول ملا۔جس میں اس کے رومانی ہیرو تھے پریم ادیب، ۱۹۴۵ء میں پارہ مستقل طور پر ممبئی میں سکونت پذیر ہوگئی اور پھر درجنوں فلموں میں ہیروئن کا رول ادا کیا جس میں ''سوہنی مہیوال، مہندی، شمع، استاد پیڈرو، دادا اور دارا، آخری تین فلموں میں اس کے ہیرو شیخ مختار تھے۔اس زمانے میں کوئی عورت ویمپ کا رول ادا کرنے سے کتراتی

تھی اور اسی وجہ سے بیگم پارہ کو کئی اے گریڈ کی فلموں سے ہاتھ دھونا پڑا جس میں اسے ویمپ کا رول دیا گیا تھا۔اس زمانے میں ہر ہیروئن اپنے آپ کو جیسے ''ستی ساوتری'' بنا کر پیش کرنا چاہتی تھی۔

پارہ ہمیشہ سے جدید طرز فیشن ایبل لباس پہننا پسند کرتی تھی اور اس لباس میں فوٹو گرافر اس سے بہت خوش رہا کرتے تھے۔بیگم کو اپنے کیریئر کی کبھی کوئی پرواہ نہیں رہی اور اسے ہیروئن کے طور پر جو بھی فلم ملی اس نے پورا کیا۔فلم ''لٹیرا'' کے سیٹ پر اس کی ملاقات ناصر خان سے ہوئی جو اس فلم کے ہیرو تھے۔اگر چہ دونوں میں پہلی نظر میں محبت ہو جانے والی کوئی بات نہ تھی لیکن دونوں نے شادی کر لی۔دلیپ کمار نے ہر ممکنہ طور پر اس شادی کی مخالفت کی تھی مگر یہ دونوں فیصلہ کر چکے تھے لہٰذا دلیپ نے خود اپنے آپ کو اس معاملے میں الگ کر لیا تھا۔ناصر خان سے شادی کے بعد ہی بیگم پارہ کا فلمی کیریئر اختتام کو پہنچا۔ناصر کی موت کے بعد بیگم پارہ چند برسوں تک اپنی بہن کے پاس پاکستان جا کر رہنے لگی لیکن ہندوستان اس کا وطن تھا۔واپس آ کر بھی اس نے دلیپ کمار کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں رکھا جبکہ پہلے کی تمام تلخیاں ختم ہو چکی تھیں۔

ہندی فلموں میں کام کرتے ہوئے اس کی کئی سہیلیاں ہو گئیں اور سب سے زیادہ دوستی شیاما، نادرہ، نرگس، موتی لال اور ستارہ دیوی کے ساتھ رہی ،بیگم پارہ زندگی کے آخری چند برسوں میں اپنے خاندان کے بچوں کے ہمراہ رہی اور اپنا زیادہ تر وقت ٹی وی پر فلمیں دیکھتے گزاریں۔حال کے اسٹاروں میں انہیں امیتابھ بچن، نصیر الدین شاہ اور کاجول بیحد پسند تھے۔اس کے علاوہ وہ ریکھا، راکھی، اور وحیدہ رحمٰن کو بھی بیحد پسند کرتی تھیں۔لیکن اس نے ٹی وی پر عامر خان، شاہ رخ خان، سلمان خان، سیف علی خان کی ایک بھی فلم نہیں دیکھی بلکہ وہ اس چینل کو ہی بدل دیتی تھیں۔جس میں خان اداکاروں کی فلمیں دکھائی جاتی تھیں، انہیں خان اداکاروں سے نفرت تھی یا کوئی اور وجہ تھی ، یہ اس نے کبھی بھی نہیں بتایا۔

☆☆☆

گلوکارہ۔مبارک بیگم

ششر شرما

'کبھی تنہائیوں میں ہماری یاد آئے گی' جیسے یادگار گیت کی گلوکارہ مبارک بیگم فلموں سے دور تمام پریشانیوں سے مقابلہ کرتی ہوئی گمنامی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ان کا پتہ معلوم کرنے کے لیے کئی کوششوں کے بعد ہمیں یہ جان کر تعجب ہوا کہ فلم صنعت سے وابستہ افراد کے مفاد کے لیے لڑنے کا دعویٰ کرنے والی مختلف ٹریڈ یونینوں میں سے کسی کو بھی ان کا پتہ ٹھکانہ معلوم نہیں۔یہاں تک کہ گلوکار اور گلوکاراؤں کی تنظیم سنگرس ایسوسی ایشن کو بھی نہیں معلوم۔اسے وقت کی ستم ظریفی کہیں یا فلم صنعت کا کردار مان کر تسلیم کریں۔

لیمنگ ٹن روڈ ممبئی کے سب سے پرانے اور گنجان آبادی والے مشہور تجارتی علاقوں میں سے ایک ہے، جہاں دن کا اجالا ہو یا رات کا اندھیرا، بھاری ہجوم کے درمیان خرید وفروخت کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔صرف بکنے والے مال کی شکل بدل جاتی ہے۔اسی لیمنگ ٹن روڈ پر ہے عمر کی کم سے کم ایک صدی پوری کر چکی اور اب بوسیدہ ہو چکی عمارتوں کے بیچ سے گزرتی کانگریس ہاؤس والی گلی جس میں کہیں رہتی ہیں مبارک بیگم۔معلوم کرنے پر ایک پان والا کھنڈر نما ایک عمارت کی جانب اشارہ کرتا ہے جس کا عقب ہماری طرف ہے۔گندگی سے پٹی پڑی بیحد تنگ ایک دوسری گلی کے ذریعہ اس عمارت 'نور محمد بیگ محمد بلڈنگ'' کے دروازے تک اور پھر سیلن بھری اندھیری سیڑھیوں کو ٹٹولتے ہوئے ہم دوسری منزل تک پہنچتے ہیں، جس میں بمشکل تمام 8×10 فٹ کے کوٹھری نما کمرے میں آخر کار مبارک بیگم ہمیں مل ہی جاتی ہیں۔میڈیا سے افراد کے تئیں ان کے دل میں غیر اطمینانی ہے۔'میرے حالات کو سمجھنے کی کوشش کسی نے نہیں کی۔میں کیسی جگہ رہتی ہوں اس بات کو سب نے اچھالا اور میرا مذاق اڑایا'۔ان کی آواز میں ناراضگی صاف جھلکتی ہے لیکن بات چیت کے دوران جلد ہی مطمئن ہو کر وہ پوری طرح کھل جاتی ہیں۔

''میں لکھ پڑھ نہیں پائی کیونکہ ہمارے زمانے میں ماں باپ ڈرتے تھے کہ پڑھی لکھی لڑکی خط وکتابت کر کے کہیں گھر سے نہ بھاگ جائے۔ بھتن جھنو میں اپنے ننیہال میں پیدا ہوئی تھی۔تاریخ تو مجھے پتا نہیں لیکن ۶۵۔۷۰ برس تو ہو ہی گئے ہوں گے۔رہنے والے ہم لوگ نول گڑھ کے ہیں۔لیکن میرے دادا کی احمد آباد میں

چائے کی چھوٹی سی دکان تھی۔ میرے ابا بھی کنبے کو ساتھ لے کر احمد آباد آ گئے اور پھلوں کی ٹھیلی لگانے لگے تھے۔ میں نے ہوش وہیں سے سنبھالا۔ ابا کے طبلہ بجانے کا شوق اور لگن کو دیکھ کر استاد تھرکواں خاں صاحب نے اپنا شاگرد قبول کر لیا۔ پھر ہم سب کو ساتھ لے کر میرے ابا ممبئی چلے آئے اور فلموں میں طبلہ بجانے لگے۔ اس وقت انگریزوں کے خلاف لڑائی زوروں پر تھی جس کے چار پانچ برس بعد ملک تقسیم ہو گیا'۔

مبارک بیگم کی باتوں سے اندازہ لگا کہ ۱۹۴۲ء کے 'بھارت چھوڑو تحریک' کے دوران وہ لوگ احمد آباد سے آئے ہوں گے۔ نور جہاں اور ثریا کے گانے سننے کا مجھے بہت شوق تھا۔ جسے دیکھتے ہوئے ابا نے مجھے کیرانہ گھرانے کے استاد ریاض الدین خاں اور استاد صمد خاں صاحب کی شاگردی میں گلوکاری کی تعلیم دلانی شروع کر دی۔ ساتھ ہی آڈیشن میں کامیاب ہو کر میں آل انڈیا ریڈیوز پر بھی گانے لگی تھی۔ ایک روز اس زمانے کے مشہور موسیقار رفیق غزنوی نے مجھے ریڈیو پر گاتے سنا تو اپنی کسی فلم میں گانے کے لیے بلایا۔ نغمہ نگار تھے آغا جانی کاشمیری۔ لیکن اسٹوڈیو میں لوگوں کا بھاری ہجوم دیکھ کر میں گھبرا گئی اور گا نہیں پائی۔ کچھ وقت بعد ایسا ہی واقعہ رام دریانی کی فلم بھائی بہن کے دوران پیش آیا جس کے موسیقار شیام سندر تھے۔ ادھر سید خاندان کے میرے ننہیال والوں نے جو ابا کے اس قدم کے شروع سے ہی خلاف تھے ہم لوگوں سے ہمیشہ کے لیے رشتہ توڑ لیے۔

بقول مبارک بیگم نہ گا پانے کا دکھ انہیں ایک سال تک رہا۔ اسی دوران ان کے والد کے ایک طبلہ نواز دوست ایک روز انہیں جدن بائی سے ملانے ان کے گھر پر لے گئے۔ ان کا گانا سن کر جدن بائی نے کہا 'لڑکی اچھا گاتی ہے، سفارش تو میں کر دوں گی لیکن محض اسی سے کام نہیں چلے گا، محنت کرنی پڑے گی۔ ان کی حوصلہ افزائی نے مبارک بیگم کو ترغیب اور ہمت دی۔ وہ جوش و خروش کے ساتھ جدوجہد کرنے لگیں۔ آہستہ آہستہ محنت رنگ لائی اور یعقوب کی فلم ''آیئے'' کے لیے شوکت حیدری دہلوی جو آگے چل کر نوشاد کے نام سے مشہور ہوئے، کی ہدایت میں انہیں اپنا پہلا نغمہ 'موہے آنے لگی انگڑائی' گانے کا موقع ملا۔ یعقوب اور سلوچنا چٹرجی کی یہ فلم ۱۹۴۹ء میں ریلیز ہوئی۔ اس کے بعد پانچویں دہائی کی 'پھولوں کے ہار' (سبھی گیت/موسیقی ہنس راج بہل)، 'کندن' (میرا بھولا بلم/غلام محمد)، 'دائرہ' (دیوتا تم ہو میرا سہارا/جمال سین)، 'شباب' (محلوں کے رہنے والے/نوشاد)، 'ماں کے آنسو' (چلا چل مسافر/سردار ملک)، 'اولاد' (آج گھر والے گھر نہیں/سردار ملک)، 'شیشہ' (جل جل کے مروں/غلام محمد)، 'مدھومتی' (حال دل سنائیں گے/سلیل

چودھری)، 'دیوداس' (وہ نہ آئیں گے پلٹ کر/ایس ڈی برمن) اور 'رشتہ' (کیا خبر تھی یوں تمنا/ر کے دتہ) جیسی کئی فلموں میں انہوں نے سنگل اور دوگانے گائے۔ ایک روز ریکارڈنگ روم میں ایک گیت کی ریہرسل کے دوران فلمساز اور نغمہ نگار کیدار شرما نے خوش ہو کر انہیں چار آنے دیے تو انہیں تعجب میں مبتلا دیکھ کر موسیقار اسنیہل بھاٹکر نے کہا ''شرما جی کا دیا پیسہ خوش قسمتی کی علامت ہوتا ہے اس لیے منع مت کرنا اور ہوا بھی یہی'۔ ۱۹۶۱ء میں ریلیز ہوئی فلم 'ہماری یاد آئے گی' کے اس ٹائٹل گیت نے مجھے راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر کھڑا کر دیا، یہ کہنا ہے مبارک بیگم کا۔ 'چھٹی دہائی میں میں نے 'مجھ کو اپنے گلے لگا لے' (فلم ہمراہی/شنکر جے کشن)، 'نیند اڑ جائے تیری' (جواری/کلیان جی، آنند جی)، 'شمع گل کرنہ جا' (عرب کا ستارہ/سادات)، 'نگاہوں سے دل میں چلے آیئے گا' (ہمیر ہٹ/سمّکھ بابو)، 'ہمیں دم دیمی کے' (یہ دل تجھ کو دوں/اقبال قریشی)، 'بے مروت بے وفا' (سشیلا/سی ارجن)، 'میرے آنسوؤں پر نہ مسکرا' (مورے من متوا/دتہ رام)، 'آنکھوں آنکھوں میں ہر ایک (مارول مین/ابن بنرجی)، 'اتنے قریب آ کے بھی کیا' (شگون/خیام)، 'اے دل بتا ہم کہاں آ گئے' (خونی خزانہ/ایس کشن) اور 'وعدہ ہم سے کیا' (سرسوتی چندر/کلیان جی، آنند جی) جیسے اپنے وقت کے کئی مشہور گیت گائے لیکن جیسے جیسے میرا نام ہوتا گیا کئی دیگر گلوکاراؤں کی طرح میرے خلاف سازشوں کے تانے بانے بنے جانے لگے۔ نتیجتاً 'پردیسیوں سے نہ انکھیاں ملانا' (جب جب پھول کھلے) اور 'اگر مجھے نہ ملی تم' (کاجل) ریکارڈ کیے گئے اور کئی گیت جب بازار میں آئے تو ان میں سے میری آواز ندارد تھی۔ ایک روز ریڈیو پر میرا انٹرویو آ رہا تھا اسی دوران فون کی گھنٹی بجی، دوسری جانب مشہور گلوکارہ تھیں جو مجھ سے بولیں 'ہمیں پہچانا؟' ہم تمہیں پیار نہ کرتے تو کبھی کا انڈسٹری سے آؤٹ کروا دیتے۔ شاید وہ بھی میرا انٹرویو سن رہی تھیں لیکن میں آج تک سمجھ نہیں پائی کہ یہ ان کا پیار تھا یا دھمکی۔ بہر کیف ساتویں دہائی شروع ہوتے ہوتے انڈسٹری سے باہر کر دی گئی۔ میرے گیتوں کی تعداد ہزار سے تجاوز نہیں کر پائی۔

۱۹۸۰ء میں بنی فلم 'راموتو دیوانہ ہے' کے لیے چندو کی موسیقی میں 'سنوریا تیری یاد میں' مبارک بیگم کا گایا آخری گیت ہے اور اب گزشتہ ۲۳ برسوں سے وہ بنا کسی کام کے بیٹھیں بدحالی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ 'لوگ مذاق تو اڑاتے ہیں کہ میں ایسے علاقے میں رہتی ہوں لیکن اس کی وجہ جاننے کی کوشش آج تک کسی نے نہیں کی۔ ساٹھ سال پہلے جب یہاں رہنے آئے تھے تب یہاں کافی سکون تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ علاقہ

کچھ خاص وجوہات کی بنا پر مشہور ہوتا چلا گیا۔ مجھے نام تو خوب ملا لیکن اتنا پیسہ میرے پاس کبھی نہیں رہا کہ چاہتے ہوئے بھی کہیں اور رہ سکوں۔ برسوں پہلے سنیل دت صاحب کی کوششوں سے سرکاری کوٹھی سے میرے نام ایک فلیٹ الاٹ ہوا تھا۔ لیکن اس کی قیمت چکا پانا بھی میرے بس میں نہیں تھا۔ ایسے میں ایک نیک طبیعت شخص نے میری مدد کی لیکن آج بھی قرض کا پہاڑ میرے سر پر ہے۔ سرکار سے سات سو روپے کی ماہانہ کی مدد ملتی ہے۔ ادھر پچھلے کئی برسوں سے میرے اپنے ہی اس مکان سے بھی مجھے بے دخل کرنے کی کوششوں میں لگے ہیں۔ خاندان میں بیٹا بہو ایک بیٹی اور چار پوتیاں ہیں۔ بیٹا چھوٹا موٹا کام کر کے گھر چلاتا ہے۔ چاہتی ہوں کہ جلد از جلد سرکار کے دیے فلیٹ میں رہنے چلی جاؤں لیکن فی الحال معاشی حالت اس کی بھی اجازت نہیں دیتی، کہتے کہتے وہ آنکھوں میں امنڈ آئے آنسوؤں کو چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگتی ہیں۔

برسوں قبل شمع رسشما میں شائع ہوا کسی قاری کا وہ خط یاد آتا ہے جس میں لکھا تھا 'مبارک اڑنے بھی نہ پائی تھیں کہ ان کے پر کاٹ دیے گئے'۔ اپنے کچھ گیت انہوں نے گا کر سنائے تو محسوس ہوا کہ ان کی آواز آج بھی اتنی ہی شیریں، اتنی ہی تازہ، اتنی کھنک دار اور اتنی ہی سریلی ہے جتنی کہ آج سے چالیس برس پہلے تھی اور شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کی آواز کا پورا استعمال کبھی ہوا ہی نہیں۔ ان کی درد بھری آواز ہمیشہ کانوں میں گونجتی رہی۔ کبھی تنہائیوں میں.......

☆☆☆

فنکارانہ صلاحیت والی اداکارہ۔نوتن

انجنا شرما

بمل رائے اور رشی کیش مکھرجی جیسے بلند پایہ ہدایتکاروں کی پسندیدہ اداکارہ نوتن کی اچانک موت سے فلم انڈسٹری میں جو خلا پیدا ہوگیا اس کا بھرنا بہت مشکل ہے۔ گزشتہ چار دہائیوں سے نوتن نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کے بل بوتے پر اچھی اچھی اداکاراؤں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ نوتن سب سے پہلے اپنی ماں شوبھنا سمرتھ کی فلم ''ہماری بیٹی'' میں جلوہ افروز ہوئی تھیں۔ ''سیما'' اور ''بندنی'' جیسی بہترین فلموں کی اداکارہ اپنے بیٹے موہنیش بہل کو آخری بار دیکھنے کی چاہ میں چل بسی موہنیش اس وقت اوٹی میں کسی فلم کی شوٹنگ کر رہا تھا جیسے ہی اس کو اپنی ماں کی نازک حالت کے بارے میں معلوم ہوا وہ شوٹنگ چھوڑ کر بمبئی کے لیے پہلی فلائٹ سے روانہ ہوگیا۔ لیکن جب وہ بمبئی پہنچا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ یہ موہنیش کی بدقسمتی ہی کہی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی ماں کے آخری دیدار سے محروم رہ گیا۔

نوتن کو فلم انڈسٹری میں وہ مقام مل چکا تھا جو کبھی نرگس جیسی اداکارہ کو ہی نصیب تھا۔ نوتن نے جہاں اشوک کمار، دیو آنند، راجکپور، بلراج ساہنی، سنیل دت، دھرمیندر، کشور کمار کے ساتھ بطور ہیروئن کام کیا۔ وہیں امیتابھ بچن کے ساتھ ہیروئن بن کر فلم ''سوداگر'' میں آئیں۔ عمر کی زیادتی ان کے چہرے یا اداکاری سے عیاں نہیں ہوتی تھی۔ وہ آخری وقت معصوم چہرے والی کمسن سی نازک لڑکی لگتی تھیں۔ ان کی خوبصورتی اسی طرح قائم تھی جیسی کہ چالیس سال پہلے۔

نوتن کی موت کو فلم انڈسٹری کا نقصانِ عظیم کہنا اس لئے مناسب ہے کیونکہ انھوں نے اپنے دور کی دیگر اداکاروں کی طرح فلم انڈسٹری کو خیر باد نہیں کہا اور نہ ہی عمر کی وجہ سے ان کی فنکارانہ صلاحیتوں میں کسی قسم کا کوئی فرق آیا۔

نوتن نے اپنی پہلی فلم ''ہماری بیٹی'' سے بھی پہلے فلم ''ونیتی'' میں بطور چائلڈ آرٹسٹ ایک مختصر کردار ادا کیا تھا تو اس وقت ان کی عمر آٹھ برس تھی اس کے بعد ۱۹۵۱ء میں وہ فلم ''ہماری بیٹی'' کی ہیروئن بن کر پردہ سیمیں پر نظر آئیں۔ ان کی ۱۲۳ فلمیں سامنے رکھ کر ان کی فنکارانہ خوبیوں کا بخوبی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

نوتن نے اپنی ۵۵ سالہ زندگی میں ۴۰ سال فلم انڈسٹری کی خدمت میں صرف کر دیا مگر ان کا فلمی سفر

۴۷ رسال تک رہا کیونکہ بطور چائلڈ آرٹسٹ بھی انھوں نے کام کیا تھا۔

نوتن کا تقریباً پورا خاندان ہی فلم انڈسٹری سے وابستہ تھا اس کے باوجود وہ بے حد شرمیلی تھیں۔ انھیں رقص و موسیقی کی بھی تعلیم دی گئی تھی لیکن وہ لوگوں کے سامنے آنے میں بھی شرم محسوس کرتی تھیں۔ اسی وجہ سے انھیں اعلیٰ تعلیم کے لئے سوئزر لینڈ بھیج دیا مگر قسمت میں تو پردۂ سیمیں پر اپنے جوہر دکھانا لکھا تھا اس لیے وہی بنیں جو اُنھیں بننا تھا۔

مشہور و معروف ہدایتکار کے۔آصف نے انھیں پہلی بار دیکھا تو ان کے اندر چھپے فنکار کو فوراً پہچان لیا۔ اور چاہتے تھے کہ اپنی کسی فلم میں پیش کریں کہ ان کی ماں نے فلم ''ہماری بیٹی' میں انھیں پیش کر دیا۔

۱۹۵۰ء میں جب نوتن فلمی دنیا میں آئیں تو اس وقت مدھو بالا، نرگس، بیگم پارہ، نلنی جیونت، گیتا بالی، مینا کماری، وحیدہ رحمان جیسی اداکارائیں موجود تھیں جن کے ہوتے ہوئے اپنے لیے الگ مقام بنا پانا بہت مشکل تھا مگر نوتن احساس کمتری کا شکار ہوئے بغیر محنت و لگن کے ساتھ کام کرتی رہیں اور ناصر خان جیسے نئے اور بلراج ساہنی جیسے نامور اور عمر دراز اداکار کی ہیروئن بنیں۔

نوتن نے فلم ''بندنی'' میں سنجیدہ اور ''تیرے گھر کے سامنے'' میں خالصِ مزاحیہ رول ادا کر کے ناظرین کو حیرت میں ڈال دیا کیونکہ یہ دونوں ہی ایک دوسرے سے مختلف تھے دونوں فلمیں دیکھنے کے بعد یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان دونوں میں زیادہ اچھی کون سی تھی۔ جذبات سے بھر پور کرداروں کو وہ بڑی آسانی سے کر لیتی تھیں نوتن کے چہرے پر معصوم فکر کا سایہ تھا ان کے دور میں مینا کماری ہی ایک ایسی اداکارہ تھی جو ٹریجڈی کوئین کہلائیں۔ مگر وہ تو کافی عرصہ قبل اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں اور اب نوتن کی موت کے بعد سنجیدہ فلموں کی روایت کا ہی شاید خاتمہ ہو گیا۔ نوتن نے اپنے متعلق ہر اندازہ کو غلط ثابت کر دکھایا کیونکہ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ زیادہ دن تک انڈسٹری میں نہیں رہ سکے گی مگر انھوں نے اپنی زندگی کے چالیس سال فن کی خدمت کی ___ راج کھوسلہ کی فلم ''میں تلسی تیرے آنگن کی'' کی نوتن اپنے تمام سابقہ کی نوتن سے بہت آگے بڑھ گئیں۔ نوجوان و عمر دراز کا رول انھیں ایک بہترین اداکارہ ہونے کا خطاب دیتا ہے۔ شاید نوتن کو بھی اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کے بارے میں پوری طرح معلوم نہیں ہوگا ایک بڑا فنکار جس طرح دوسروں کے لیے راز ہوتا ہے اسی طرح اپنے لیے بھی راز سے کچھ کم نہیں ہوتا۔ نوتن ایسی ہی اداکارہ تھیں۔ ان کی آنکھیں نلنی جیونت جیسی نہیں تھیں مگر نوتن کی آنکھوں کو جتنی زبان حاصل تھی اتنی شاید صرف نرگس کو ہی رہی ہوگی نوتن کی

اداکاری کا کافی دارومدار ان کی آنکھوں کی خوبصورتی اور انداز پر تھا۔

اپنے آپ کو کردار کے مطابق ڈھال لینا یہ ان کی خاصیتوں میں شامل تھا۔ شباب، اناڑی، پیئنگ گیسٹ' آشا' سُجاتا' بندنی' دلہن ایک رات کی' سوداگر' ساجن بنا سہاگن' ماں اور ممتا' رشتہ کاغذ کا' میری جنگ' منزل' وارث' وغیرہ فلمیں ایسی ہیں جن میں نوتن نے اپنے فن سے ناظرین کو محظوظ کیا اور ساتھ میں اداکاری کے معیار کو نیا رُخ دیا۔ انھوں نے تقریباً ہر بڑے ستارے کے ساتھ کام کیا۔ انھوں نے دیو آنند کے ساتھ منزل' پیئنگ گیسٹ' تیرے گھر کے سامنے' بارش وغیرہ فلموں میں اپنی رومانی جوڑی بنائی اور سنیل دت کے ساتھ سجاتا' خاندان' مہربان' ملن' میوری اور بھائی بہن' فلموں میں اداکاری کی۔ ''سیما'' میں بلراج ساہنی کے ساتھ دلہن ایک رات کی' دھرمیندر کے ساتھ ''سرسوتی چندر'' میں منوج کمار کے ساتھ اور ''سوداگر'' میں امیتابھ بچن کے ساتھ بطور ہیروئن کام کیا ہے۔

فلم ''بندنی'' میں ان کے بالمقابل سدابہار ہیرو اشوکمار نے کام کیا تھا۔ اس فلم کا شمار ان کی بہترین فلموں میں کیا جاتا ہے اس کے علاوہ اناڑی' چھلیا' دل ہی تو ہے' کنہیا' میں راجکپور' سونے کی چڑیا' میں طلعت محمود' شباب' میں بھارت بھوشن اور کشور کمار کے ساتھ' دلّی کا ٹھگ' میں کام کیا اور آخر میں دلیپ کمار کے ساتھ فلم ''کرما'' میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔

نوتن کے شوہر رجنیش بہل ایک نیوی آفیسر تھے انھوں نے کبھی بھی اپنی ازدواجی زندگی میں تلخی نہ آنے دی۔ نوتن نے فلموں کے علاوہ دوردرشن پر بھی اپنی قابلیت کا لوہا منوالیا۔ اپنی فلمی زندگی سے نوتن کو کبھی شکایت نہیں رہی وہ اپنے بیٹے موہنیش بہل کو بہت پیار کرتی تھیں ہر وقت فکر مند رہتی تھیں۔ مگر یہ موہنیش کی بدقسمتی ہی کہی جائے گی کہ وہ آج تک فلموں میں کامیاب نہ ہو سکا۔

کسی فنکار کی موت سے وہاں کتنا خلاً پیدا ہو گیا یہ تو وقت سے بہتر اور کوئی نہیں جانتا پر جب بہترین اداکاراؤں کا نام آئے گا تو نوتن کو ضرور یاد کیا جائے گا۔

☆☆☆

روشنی کی طرح پھیلنے والی آواز ۔شمشاد بیگم

’’کجرا محبت والا، انکھیوں میں ایسا ڈالا......،

میری نیندوں میں تم، میرے خوابوں میں تم....، تیری محفل میں قسمت آزما کر ہم بھی دیکھیں گے....اور لے کے پہلا پہلا پیار.....‘‘ جیسے صدا بہار گیتوں کی فلمیں اور موسیقار بھلے ہی الگ ہیں، لیکن اس میں ایک بات یکساں ہے کہ ان سبھی گیتوں کو شمشاد بیگم نے اپنی کھنک دار آواز سے نوازا ہے۔ اپنی پرکشش آواز سے ہندی فلم موسیقی کو مسحور کردینے والی شمشاد بیگم کے گیتوں میں الہڑ جھرنے کی لاپرواروانی، زندگی کی سچائی جیسا کھردار پن اور بہت دن پہلے چبھے ہوئے کسی کانٹے کی رہ رہ کر اٹھنے والی ٹیس کا سا احساس ہوتا ہے۔ ان کی آواز کی یہ ادائیں سننے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور ان کے گیتوں کے مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ آج بھی ان پر ریمکس گیت بن رہے ہیں۔

تقریباً ۴ دہائیوں تک ہندی فلموں میں ایک سے بڑھ کر ایک مقبول ترین گیتوں کو آواز دینے والی شمشاد بیگم بے پناہ صلاحیت والی گلوکارہ رہی ہیں۔ صاف لہجہ، سُروں پر پکڑ اور سورج کی روشنی کی طرح چاروں طرف بکھر جانے والی آواز سننے والے کو جیسے باندھ ہی لیتی تھی۔ انہوں نے فلمی گیتوں کے علاوہ بھکتی گیت اور غزلیں بھی گائیں۔ گلوکاروں اور موسیقاروں پر ہمیشہ یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ موسیقی کے چکر میں الفاظ کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں یا لہجے کے معاملے میں سمجھوتہ کرلیتے ہیں۔ لیکن شمشاد بیگم کے گیتوں پر یہ تہمت کبھی نہیں لگائی جاسکتی۔ اس دور کے بے حد مشہور موسیقار او پی نیّر نے تو ایک بار یہاں تک کہا تھا کہ ’’شمشاد بیگم کی آواز مندر کے گھنٹے کی طرح واضح اور سہانی ہے‘‘۔

فلم ’سی آئی ڈی‘ میں لوک دھنوں پر مبنی گیت ’بوجھ میرا کیا نام رے....‘ گانے والی شمشاد نے موسیقار سی رام چندر کے لیے ’آنا میری جان سنڈے کے سنڈے.....‘ جیسا مغربی سروں پر مبنی گیت بھی گایا، جو ان کی آواز کی انفرادیت کی گواہی دیتا ہے اس گیت کو ہندی فلموں میں مغربی سروں پر بنے شروعاتی گیتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ تجزیہ کاروں کے مطابق شمشاد بیگم کی آواز میں ایک الگ وزن تھا، جو کئی معنی میں مرد گلوکاروں پر بھی بھاری پڑتا تھا۔ مثال کے طور پر ریشمی آواز کے مالک طلعت محمود کے ساتھ گائے گئے ڈویٹ گیتوں پر واضح طور پر شمشاد بیگم کی آواز زیادہ وزن دار ثابت ہوتی ہے۔

امرتسر میں ۱۴/اپریل ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئیں شمشاد بیگم اس دور کے سپر اسٹار گلوکار کندن لال سہگل کی

زبردست فین تھیں۔ ایک انٹرویو میں شمشاد بیگم نے بتایا کہ انہوں نے کے ایل سہگل کی زیر اداکاری فلم ’دیوداس‘ ۱۴ بار دیکھی تھی۔ انہوں نے سارنگی کے استاد حسین بخش والے صاحب سے موسیقی کی تعلیم لی۔ شمشاد بیگم نے اپنی گلوکاری کی شروعات ریڈیو سے کی۔ ۱۹۳۷ء میں انہوں نے لاہور ریڈیو پر پہلا گیت پیش کیا۔ اس دور میں انہوں نے پیشاور، لاہور اور دہلی ریڈیو اسٹیشن پر گیت گائے۔ شروعاتی دور میں لاہور میں بنی فلموں ’خزانچی‘ اور ’خاندان‘ میں گیت گائے اور آخرکار ۱۹۴۴ء میں ممبئی آ گئیں۔

ممبئی میں شمشاد نے نوشاد علی، رام گانگولی، ایس ڈی برمن، سی رام چندرن، کھیم چند پرکاش اور او پی نیّر جیسے تمام موسیقاروں کے لئے گیت گائے ان میں بھی نوشاد اور او پی نیر کے ساتھ ان کا تال میل کچھ خاص رہا۔ کیونکہ ان دونوں موسیقاروں نے شمشاد بیگم کی آواز میں جتنی بھی خصوصیات چھپی تھیں، ان کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے ایک سے ایک مقبول گیت دیے۔

نوشاد کی موسیقی پر شمشاد بیگم کے جو گیت مقبول ہوئے ان میں ’اولاگی لاگی‘ (آن)، ’دھڑ کے کر میرا دل‘ (بابل) ’تیری محفل میں قسمت آزما کر ہم بھی دیکھیں گے‘ (مغلِ اعظم) اور ’ہولی آئی رے کنہائی‘ (مدر انڈیا) شامل ہیں۔

لوک دھنوں اور مغربی موسیقی کا عجیب و غریب تال میل کرنے والے موسیقار او پی نیّر کی زیر ہدایت کاری میں تو شمشاد بیگم نے جیسے اپنے ساتوں سروں سے قوس قزح کا جادو بکھیر دیا۔ ان گیتوں میں ’لے کے پہلا پہلا پیار‘ (سی آئی ڈی) ’کبھی آر کبھی پار‘ (آر پار) ’کہیں پہ نگاہیں کہیں پہ نشانہ‘ (سی آئی ڈی) ’کجرا محبت والا‘ (قسمت) ’میری نیندوں میں تم میرے خوابوں میں تم (نیا انداز) ایسے گیت ہیں جو سننے والے کو گنگنانے پر مجبور کردیتے ہیں۔

تقریباً تین دہائی تک ہندی فلموں میں اپنی آواز کا جادو بکھیرنے کے بعد شمشاد بیگم نے دھیرے دھیرے پیشہ ور گلوکاری کے میدان سے اپنے آپ کو دور کرلیا۔ وقت کا پہیا گھومتے گھومتے اب ریمکس کا زمانہ آ گیا ہے۔ آج کے دور میں بھی شمشاد کے گیتوں کا جادو کم نہیں ہوا۔ کیونکہ ان کے کئی گیتوں کو جدید گلوکاروں اور موسیقاروں نے ریمکس کرکے پیش کیا اور نئی بوتل میں پرانی شراب کے سرور میں نئی نسل تھرکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

(بشکریہ۔ امنگ۔ بزم سہارا۔ نوئیڈا)

☆☆☆

سمیتا پاٹل۔آنکھوں میں ادائیں

شاہد حسن

ہندوستانی فلموں کے شائقین جب ایک ہی قسم کی فلمیں دیکھ کر گھٹن محسوس کرنے لگے تھے تب ہندی فلموں کے افق پر لیک سے ہٹ کر ایک نئے دور کے آغاز نے چپکے سے دستک دی۔ ۱۹۷۰ء میں ایک نئی شروعات ہوئی جس میں عورت مظلوم نہیں بلکہ پرعزم اور حالات سے جدوجہد کرتی نظر آئی۔ اسی دور میں ۱۹۷۴ء میں شیام بینیگل کی فلم 'نشانت' سے سمیتا پاٹل نے اپنی آمد کا احساس کرادیا۔ اس سے قبل وہ ٹیلی ویژن اور ڈرامہ کے دائرے میں مقید تھی۔ ''نشانت'' اور ''منتھن'' میں اس کی اداکاری اپنے عروج پر نظر آئی۔

اسی کڑی میں سمیتا پاٹل کی فلم ''بھومیکا'' ریلیز ہوئی اس فلم نے سمیتا کو ایک پختہ زمین بخشی جس میں ایک ہیروئن کے زوال سے عروج تک کے رول میں انہوں نے جان ڈال دی۔ اس کی بے کسی، بے بسی اور مایوسی کو جس انداز میں پردہ پر پیش کیا گیا وہ صرف سمیتا پاٹل کا ہی کمال تھا۔ ان کو ۱۹۷۷ء میں ''بھومیکا'' کے لیے بہترین اداکارہ کے ''اروشی'' ایوارڈ سے نوازا گیا۔ سمیتا پاٹل نے عام طور پر ہندوستانی فلموں میں ہیروئن چاہے جھونپڑ پٹی میں رہنے والی ہو یا کسی گاؤں کی الھڑ چنچل، شوخ لڑکی ہو لیکن وہ گلیمر کی چکا چوند میں ڈوبی نظر آتی ہے۔ لیکن سمیتا پاٹل نے اس نظریہ کے برعکس فلم ''چکر'' میں مکمل طور پر غلط ثابت کر دیا۔ اس فلم میں سمیتا پاٹل نے ایک جھونپڑ پٹی میں رہنے والی عورت کا رول اس طرح ادا کیا کہ اس کی حقیقی اور مصنوعی اداکاری کے درمیان کی دوری ختم ہوگئی۔ 'منتھن'، 'چکر'، 'اردھ ستیہ'، 'بازار'، 'منڈی'، 'سوگتی'، 'مرچ مسالہ' سے لے کر 'سدمبرم'، 'دیوشیشو' وغیرہ میں اس کی بہترین اداکاری کا ناقابل فراموش احساس دیکھنے کو ملتا ہے۔

سمیتا پاٹل نے اپنی اداکاری سے آرٹ فلموں اور کلاسیکل، کمرشیل فلموں کی تفریق کو ختم کر دیا۔ ایک بہترین اداکارہ کی شکل میں صرف کلاسیکل ہی نہیں بلکہ کمرشیل فلموں میں اپنی منفرد پہچان بنانے میں وہ کامیاب رہیں۔ فلم شکتی سے لے کر انگارے تک بے شمار کمرشیل فلموں میں مختلف رول ادا کئے۔ ڈائریکٹر مہیش بھٹ کی فلم ''ارتھ'' میں شبانہ اعظمی کے مقابل دوسری عورت کا جو رول سمیتا نے ادا کیا وہ شاید کسی دوسری ہیروئن کے بس کی بات ہی نہیں تھی۔

اس فلم کے لیے سمیتا کو بہترین معاون اداکارہ کا فلم فیئر ایوارڈ بھی دیا گیا۔ اس کی کامیابی کے پیچھے اس کی سخت محنت، رول کے لیے ہمیشہ کچھ نیا کرنے کی ضد، یہی اس کی کامیابی کی کل جمع پونجی تھی۔ وہ نصف شب جاگ کر فلم کی 'اسکرپٹ' پر مشق کیا کرتی تھی۔ اپنے رول کے بارے میں منظر نامے کے ہر باریک پہلو پر بڑے غور وخوض سے نظر رکھتی تھی۔ اس نے کبھی رول کے چھوٹے یا بڑے ہونے کی شکایت نہیں کی۔ بلکہ اپنے رول کو زندگی بخشنے اور اس کو زندہ جاوید بنانے کی بھرپور کوشش کرتی تھی۔ فلم آکروش، میں امریش پوری، اوم پوری اور نصیرالدین شاہ جیسے اداکاروں کے ساتھ چھوٹے سے رول میں اس نے رومانی سین کو جس کلاسیکل انداز سے پیش کیا وہ فلم شائقین کو مسحور کر دینے میں کامیاب ہوا۔

مختلف ایوارڈ حاصل کرنے سمیت جنوری ۱۹۸۵ء میں اداکاری کے مدارج میں سمیتا پاٹل کو ''پدم شری'' کے اعزاز سے نوازا گیا۔ اسی سال فرانس میں انٹرنیشنل شہرت یافتہ پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کا تران گوسرا نے سمیتا کی فلموں کی نمائش کر کے ان کو عالمی افق پر چمکا دیا۔ اب تک یہ اعزاز صرف ہندوستانی ڈائریکٹر ستیہ جیت رے کو ہی حاصل ہوا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۸۶ء میں حیدرآباد میں منعقد فلم میلہ میں ہدایت کار اروند کی فلم 'چدمبرم' اعلیٰ ترین فلموں کے درمیان بحث کا موضوع رہی۔ اس فلم میں سمیتا نے ایک اہم رول ادا کیا تھا۔

سمیتا پاٹل ایک دہائی سے بھی زیادہ وقت تک ہندی مراٹھی پردۂ سیمیں پر نمودار رہیں۔ اس درمیان بہت سی ہیروئین کامیابی کی بلندی تک پہنچیں۔ اور فراموش ہوگئیں، مگر سمیتا کا ہمیشہ دبدبہ قائم رہا۔ ایک اداکار ہمیشہ اداکارا ہی ہوتا ہے۔ 'جواب'، 'میرا گھر میرے بچے'، 'انگارے' میں راج ببر کے ساتھ کام کیا۔ اس کے علاوہ ڈسکو ڈانسر، نمک حلال، بدلے کی آگ وغیرہ جیسی کمرشیل فلموں میں اپنی بے لوث اداکاری کے جوہر دکھائے۔ 'وارث' فلم میں وہ امریش پوری جیسے ویلن پر بھاری نظر آئیں۔

☆☆☆

مدھر آواز والی گلوکارہ۔ گیتا دت

رات کی تنہائی اور اندھیرے میں گیتا دت کی مدھر آوازیں جہاں پوری ذہنی فضا کو روشن کرتی ہیں وہیں رفاقتوں کا حق بھی ادا کرتی ہیں۔ان کی آوازوں کے ساتھ جدائی کی وہ لمبی راتیں بھی کٹ جاتی ہیں جنہیں کاٹنا عموماً جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ان کی آوازیں انسانوں کو وہ جادوئی لمحے عطا کرتی ہیں جن میں آدمی کھوکر اپنے سارے دکھ درد بھول جاتا ہے۔ آخر ان آوازوں میں وہ کون سی جادوئی کشش ہے کہ آدمی اس کا اسیر ہوکر رہ جاتا ہے۔

'بابوجی دھیرے چلنا'، 'کیسا جادو بلم تم نے ڈالا'، 'میری زندگی کے ہمسفر'، 'ذرا سامنے آ'، 'ٹھنڈی ہوا کالی گھٹا'، 'آج سجن موہے انگ لگالو'، 'تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنالے'، 'میرا سندر سپنا بیت گیا' اور 'وقت نے کیا کیا حسیں ستم'، 'لو میں ہاری پیا' اس طرح کے گیت آج بھی سماعتوں میں رس گھولتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ گیتا دت کی آواز میں ایک عجیب سی مقناطیسیت تھی کہ آج بھی یہ گانے سننے کو نہ صرف جی چاہتا ہے بلکہ ان گانوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا من کرتا ہے۔گانے کا ایک الگ انداز تھا گیتا دت کا اور مشہور سنگیت کار راجو کا کہنا ہے کہ گیتا دت دراصل ٹھنڈی ہوا اور کالی گھٹا کی امتزاج تھیں۔ان کے پورے گیت پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات صحیح نظر آتی ہے کہ ان کی آواز میں شبنمی کیفیت بھی تھی اور ایسی گرج بھی جو انسان کو خواب سے بیدار کردیتی ہے۔ وہ مغربی انداز کے گانے بھی گا لیتی تھیں یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی ڈانس بار یا کلب کے لیے گیت کی بات سامنے آتی تھی تو گیتا دت کا نام پہلا ہوتا تھا کہ ان کی آواز میں جنسی کشش تھی اور شہوت خیزی بھی۔ بہرحال گیتا دت کی آواز کا موازنہ کسی کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا۔انہوں نے گیت کو ایک نئی آواز اور نئے لہجے سے آشنا کیا اس میں کوئی ان کا شریک نہیں ہے۔

گیتا دت کی زندگی کا آغاز بھگت پرہلاد (۱۹۴۶ء) سے ہوا تھا جس میں انہوں نے صرف دولائنیں گائی تھیں اور بعد میں فلم دو بھائی کے ذریعے ان کی گلوکاری کا سفر شروع ہوا اور پھر ایس ڈی برمن اور او پی نیر جیسے سنگیت کاروں کے ساتھ انہیں شہرت کی بلندیاں نصیب ہوتی گئیں۔ایس ڈی برمن نے ان کی آواز میں جس

جادو کو محسوس کیا تھا انہوں نے اس جادو کو اپنی فلموں میں بھرپور طریقے سے استعمال کیا۔ چنانچہ ایس ڈی برمن کے سنگیت کی سنگت میں گیتا دت نے جو گیت گائے وہ بہت مقبول ہوئے۔'میرا سندر سپنا بیت گیا' (دو بھائی۔۱۹۴۷ء) وہ سپنے والی رات (پیار۔۱۹۵۰ء)، تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنالے (بازی۔۱۹۵۱ء)، آن ملو آن ملو (دیوداس ۱۹۵۵ء)، آج سجن موہے انگ لگا لو (پیاسا۔۱۹۵۷ء)، ہوا دھیرے آنا (سجاتا۔۱۹۵۹ء)، وقت نے کیا کیا حسین ستم (کاغذ کے پھول۔۱۹۵۹ء) برمن دادا کے لیے گیتا دت نے تقریباً ۷۲ گیت گائے اور آخری گیت جوان کی فلم کے لیے انہوں نے ریکارڈ کرایا وہ ۱۹۶۲ء کی فلم 'ضدی' کا یہ گانا تھا 'میں تیرے پیار میں کیا کیا نہ بنا دلبر' اس کے بعد او پی نیّر کے ساتھ بھی گیت دت کی اچھی جوڑی رہی۔ انہوں نے او پی نیر کی سنگیت کاری میں کچھ ایسے گیت گائے جو بہت مقبول ہوئے۔ گیتا دت کی گلوکاری کی گراف روز بروز بلندی کی طرف بڑھتا گیا اور گیتا دت کو اچھے اچھے گانے ملتے گئے۔انہوں نے ہوڑہ برج میں 'میرا نام چن چن چو' جیسا گانا بھی گایا۔اس کے بارے میں او پی نیر کو یقین نہیں تھا لیکن جب گیتا دت نے یہ گانا گایا تو او پی نیّر بھی مان گئے کہ گیتا دت میں بڑی صلاحیت ہے۔

گیتا دت کی گلوکاری کی زندگی میں تو کامیاب رہی لیکن ازدواجی زندگی ناکامیوں کی نذر ہوگئی۔ان کی شادی گرودت سے ہوئی تھی اور دونوں کی ملاقات ایک فلم کے درمیان ہوئی تھی۔گرودت نے ان کی آواز کا استعمال کیا اور گرودت کی خواہش تھی کہ گیتا دت صرف انہیں کی فلموں میں گیت گائیں مگر گیتا دت اس کے لیے رضامند نہیں تھیں۔ دھیرے دھیرے تعلقات میں دراڑ پڑنے لگی اور پھر وحیدہ رحمان کے ساتھ گرودت کے رومانس کی خبریں آنے لگیں تو گیتا دت اسے برداشت نہیں کرسکیں۔گرودت اور گیتا دت میں جدائی ہوگئی، گرودت نے گیتا دت کے فراق میں غم غلط کرنے کے لیے شراب کا سہارا لینا شروع کردیا اور بالآخر شراب نے گرودت کی جان لے لی۔ان کے انتقال کے بعد گیتا دت بھی بہت گہرے ذہنی صدمے سے دوچار ہوئیں اور انہوں نے بھی شراب کی آغوش میں پناہ لے لی۔ نشے میں مکمل طور پر ڈوب گئیں اب ان کی زندگی کے راستے میں اندھیرے ہی اندھیرے تھے۔ بچے تھے جن کی زندگی کے لیے انہیں کچھ کرنا تھا، انہوں نے دوبارہ گیت گانے کی کوشش کی مگر زیادہ کامیاب نہیں ہوسکیں اور بالآخر ۲۰ جولائی ۱۹۷۲ء کو وفات پاگئیں۔شاید شراب نے ان کے جگر کو بھی چھلنی کردیا تھا اس طرح دو عظیم فن کار شراب میں غرق ہوگئے مگر دونوں ہی اپنے

اپنے میدان میں اپنی انفرادیت کا نقش قائم کر گئے۔

گیتا دت کا تعلق فرید پور سے تھا جو اب بنگلہ دیش میں ہے، ان کا پورا نام گیتا رائے ہے اور جنم ۱۹۳۰ء میں ہوا۔ جب یہ ۱۲ سال کی تھیں جبھی ان کے والدین ممبئی منتقل ہو گئے تھے۔ وہیں دادر میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ گیتا دت اور گرودت کے تین بچے بھی ہیں۔ ترن، ارن اور نینا۔ گیتا دت نے بھگت پرہلاد سے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا اور بنگالی فلموں پر ان کی زندگی کا اختتام ہوا۔ انہوں نے بنگلہ میں بھی بہت سے گیت گائے ہیں جو بہت مقبول ہوئے اور بنگالی فلم میں مرکزی کردار بھی ادا کیے ہیں۔

گیتا دت کے گیت 'تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنالے' سن کر بہتوں نے اپنی زندگی تبدیل کر لی مگر گیتا دت اپنی بگڑی ہوئی تقدیر کو تدبیر سے سنوارنے میں ناکام رہیں، وہ ٹوٹے ہوئے اور شکستہ دلی کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گزارتے رہیں وقت نے ان پر ایسے ایسے ستم کیے کہ وہ اپنی آواز سے بھی بیزار ہو گئیں۔ گیتا دت ایک قیمتی اثاثہ تھیں مگر جدائی نے اس قیمتی اثاثے اور آواز کی کھنک چھین لی تھی۔ بہر حال آج جب کہ نئی گلوکاراؤں کا عروج ہے۔ لتا منگیشکر اور آشا بھونسلے کی حکمرانی بدستور قائم ہے مگر جب بھی گیتا دت کی بات آتی ہے تو ان سب سے الگ آواز کی کشش لوگوں کو گیتا دت کی طرف کھینچ لے جاتی ہے اور لوگ گیتا دت کی آوازوں کے زیر و بم میں اپنے ذہنی وجود کو کھو بیٹھتے ہیں۔ یہی آواز کا جادو ہے جو گیتا دت کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

(بشکریہ۔امنگ۔راشٹریہ سہارا)

☆☆☆

مسحور آنکھوں والی اداکارہ: نمی

نثار احمد صدیقی (گیا)

ماضی میں عظیم فلمی ستاروں کا ایک سنہرا دور گزرا ہے، وہ دور جس نے یادگار فلمیں ہی نہیں لازوال اداکار پیدا کئے جنہیں فلم کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ اس دور میں اداکارائیں بھی فن اداکاری میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔ ہر بڑی اداکارہ اپنی منفرد فنی خوبیوں اور خصوصیات سے ممتاز نظر آتی تھیں اور ایک ہی دور میں کئی کئی بڑی اداکارائیں اپنے فنی قد و قامت سے ایک دوسرے کی مدمقابل تھیں۔ اسی دور میں نمی اپنی انفرادی فنی خوبیوں اور اعلیٰ کارکردگی سے نرگس، مدھوبالا، مینا کماری، نوتن، وجینتی مالا، ثریا، گیتا بالی اور کامنی کوشل جیسی اداکاراؤں کی صف میں شامل کی گئی۔ نمی میں حسن و دلکشی کی فراوانی نہیں تھی لیکن اس کا انگ انگ اداکاری کرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ان کی آواز میں بھی ایک کھنک تھی، انہیں اپنی حساس آنکھوں کے استعمال پر عبور حاصل تھا۔ فلمساز ان کی قہقہہ دار ہنسی کو اپنی فلم کے لئے کامیابی کی کنجی تصور کرتے تھے۔

نمی مکمل طور پر ایک بھرپور اداکارہ تھیں۔ تھیٹر آرٹسٹ وگلوکار وحیدہ نے نواب بانو عرف نمی کو ۱۹۳۳ء میں آگرہ میں جنم دیا۔ ابھی نواب بانو کی عمر صرف نو سال کی ہی تھی کہ وہ اپنے والدین کے سائے سے محروم ہو گئی۔ ان حالات میں ان کی دادی نے ان کی پرورش کا فریضہ انجام دیا۔ بچپن سے شہزادی بننے کے خواب دیکھنے والی اس دوشیزہ نے والدین کے سائے سے محروم ہونے کے بعد غریبی اور کسمپرسی کے دن دیکھے۔ مفلسی کے باوجود ان کے خوابوں نے ہار نہ مانی۔ عمر کے ساتھ اس کے خواب بھی جوان ہوئے، شہزادی بننے کے سپنے ہیروئن بن جانے کی خواہش میں ڈھل گئے۔ ہیروئن بھی اس کی نگاہ میں کسی شہزادی سے کم نظر نہیں آئی۔ اور اداکاری تو اسے ورثے میں ملی تھی۔ وہ اپنے خواب کی تکمیل کے لئے اپنی بوڑھی دادی کے ساتھ آگرہ سے قسمت آزمائی کے لئے ممبئی آ گئی۔ ممبئی میں فلمساز ہدایت کار محبوب خان سے ملیں۔ محبوب خاں ان دنوں ''انداز'' بنانے میں مصروف تھے۔ انہوں نے نواب بانو سے کہا کہ وہ اسے اپنی آئندہ فلم ''آن'' میں ضرور کوئی کردار کرنے کا موقع دے دیں گے۔ محبوب خان سے نواب بانو کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے اپنے اسٹوڈیو میں اپنے فوٹو گرافر سے اس کی کئی خوبصورت تصاویر بنوائیں

اوراسے مشورہ دیا کہ وہ ممبئی کے دوسرے فلم سازوں کو یہ تصاویر دکھائے۔ ممکن ہے اس کی جلد کام حاصل کرنے کی خواہش اس طرح پوری ہو جائے۔ نواب بانو ان تصاویر کو لئے اپنی دادای کے ساتھ ممبئی کے فلمسازوں سے ملاقات کرنے کے لئے جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتی پھرتی رہی۔ فلمساز اسے دلاسوں پر ٹالتے رہے۔ ایک وقت وہ آیا جب وہ اداکارہ بننے سے مایوس ہوگئی۔ اس کے خواب ٹوٹ گئے۔ اس نے ممبئی سے واپس آگرہ جانے کا ارادہ کرلیا۔ وہ محبوب اسٹوڈیو کے دفتر میں محبوب خان سے الوداعی ملاقات کے لئے پہنچی۔ اس وقت دفتر میں محبوب خان موجود نہ تھے۔ راج کپور بھی ان کے منتظر تھے۔ راج کپور نے نواب بانو کی تصاویر دیکھیں تو وہ انہیں دیکھتے رہ گئے۔ محبوب خاں کے آجانے پر راج کپور نے ان سے کہا ''آپ نے ان کی آنکھوں پر غور کیا''۔ پوری فلم انڈسٹری میں ایسی غضب کی آنکھیں کسی اداکارہ کے پاس نہیں ہیں۔ راج کپور نے فوراً ''برسات'' میں کام کرنے کی پیش کش کردی۔

وہ لڑکی بچپن سے سپنے دیکھ رہی تھی، حیرت کی بات ہے وہ خود راج کپور کا خواب تھی۔ نمی راج کپور کے بچپن کے دنوں کی ایک محبوب دوست تھی، اس کی پہلی محبت۔ راج کپور کو نواب بانو میں اپنی نمی کی جھلک نظر آگئی اور یوں وہ ''برسات'' میں نواب بانو سے راج کپور کے دیئے ہوئے نام نمی کی شکل اختیار کرچکی تھی۔ ''برسات'' میں وہ نرگس، راج کپور اور پریم ناتھ کے مدمقابل تھی اور یہ اہم بات تھی۔ فلم صنعت میں اب نمی کے چرچے سنائی دینے لگے تھے۔ راج کپور جب اسے بنا سنوار کر اپنے تخیل میں ڈھال کر کیمرے کے سامنے لے آئے تو پریم ناتھ سے محبت کے مکالمے ادا کرتے ہوئے ان کے پسینے چھوٹ گئے تھے تب راج کپور اور پریم ناتھ نے سمجھایا کہ یہ محض ناٹک ہے، تم خود پر قابو رکھو۔ ''برسات'' ریلیز ہوئی تو اس فلم کی پانچ صلاحیتیں شہرت کی طرف گامزن ہوگئیں۔ موسیقار شنکر جے کشن، نغمہ نگار شیلندر حسرت جے پوری اور نمی جسے اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی۔

محبوب خان نمی کو پہلی ہندوستانی رنگین فلم ''آن'' میں دلیپ کمار جیسے اداکار کے مقابل پہلے ہی کاسٹ کرچکے تھے۔ نمی کے لئے یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ ''آن'' سے قبل وہ متعدد فلموں میں کاسٹ کی جا چکی تھیں۔ ''راج کاٹ'' میں جے راج کے ساتھ، ''باورا'' میں راج کپور کے ساتھ، ''سبق'' اور ''وفا'' میں کرن دیوان کے ساتھ، ''جلتے دیپ'' میں پریم ادیب کے ساتھ، ''بڑی بہو'' اور ''سبز باغ'' میں شیکھر کے ساتھ اور

''بزدل'' میں پریم ناتھ کے ساتھ، ''آن'' اور ''دیدار'' کی ریلیز کے بعد بھی بڑی اداکاراؤں کی صف میں آ کھڑی ہوئی۔ ان فلموں میں وہ دلیپ کمار کی ہیروئن تھی۔ ''داغ'' میں دلیپ کمار کے ساتھ اعلیٰ صلاحیتوں کو منوایا۔ محبوب خان کی ''امر'' میں وہ دلیپ کمار کے ساتھ فن کی اور بھی بلندیوں پر نظر آئی۔ ''اڑن کھٹولہ'' میں دلیپ کمار اور نمی کے سنگم نے پھر جادو جگایا۔ ''ہمدرد'' میں شیکھر، ''سزا'' اور ''آندھیاں'' میں دیوآنند، ''سوسائٹی'' میں ناصر خان، ''بھائی بھائی'' میں کشور کمار، ''جے شری'' میں پردیپ کمار اور ''بسنت بہار'' میں بھارت بھوشن اس کے ہیرو تھے۔ ان ہی دنوں نمی نے اپنی ذاتی فلم ''ڈنکا'' بنائی۔ امرناتھ اس فلم کے ہیرو تھے۔ نمی کی کامیابیوں کا سفر جاری تھا اور وہ دلیپ کمار، راج کپور اور دیوآنند جیسے فلم صنعت کے تین بڑوں کی ہیروئن تھیں۔ اس دور میں نمی نے کہا تھا ''مجھے فلم انڈسٹری کے سب سے بڑے اداکار دلیپ کمار کے ساتھ چار مرتبہ ہیروئن بننے کا موقع ملا ہے۔ میرے لئے یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے''۔ اس نے یہ بھی کہا ''اگر محبوب خاں اور راج کپور میری حوصلہ افزائی نہ کرتے تو میں کبھی بھی اپنے خوابوں کو پورا نہ کرسکتی تھی۔

وجے کمار کے ساتھ نمی نے ''الف لیلیٰ'' میں ایک مختلف کردار ادا کیا۔ شیکھر کے ساتھ ''چھوٹے بابو'' میں اور بھارت بھوشن کے ساتھ وہ ''سوہنی مہیوال'' میں سوہنی کے کردار میں ناقابل فراموش رہی ہے۔ اس دور میں اس نے سنیل دت کے ساتھ ''کندن'' میں، رحمٰن کے ساتھ فلم ''پیاسے نین'' میں اپنی اداکاری کے نقش گہرے کئے۔

اپنے فلمی کیریئر کے آخری دور میں ''درد دل، کچے دھاگے، انگولی مالا، انجلی اور شمع'' کے کردار بھلائے نہیں جاسکتے۔ ''شمع'' میں نمی اور ثریا کو یکجا کیا گیا۔ دونوں اس فلم میں آخری بار جلوہ گر تھیں جبکہ ''میرے محبوب'' کو نمی کی آخری فلم کہا جاتا ہے۔ اس فلم میں نمی کے مقابل اشوک کمار اور راجندر کمار کا بھی ٹکراؤ تھا۔

کے آصف نے ''مغلِ اعظم'' کے بعد جب فلم ''محبت اور خدا'' بنانے کا اعلان کیا تھا تو انہوں نے اس فلم میں نمی کو ہیروئن منتخب کیا۔ کے۔ آصف نے نمی کے انتخاب سے یہ ثابت کیا کہ اس دور میں نمی سے بڑی اداکارہ کوئی نہیں۔ اس فلم کی فلم بندی زور وشور سے جاری تھی۔ ہندوستان کی سب سے مہنگی فلم بنائی جارہی تھی۔ فلم کی ۱۴ ریلیں تیار ہوچکی تھیں لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کے آصف کا انتقال ہوگیا۔ ''محبت اور خدا'' کا نامکمل رہ جانا نمی کے لئے ایک بہت بڑا المیہ ثابت ہوا۔ یہ فلم اگر کے آصف مکمل کرلیتے تو نمی کے حصے

میں وہی مقام ہوتا جو نرگس کو ''مدر انڈیا'' میں مدھو بالا کو ''مغلِ اعظم'' میں اور مینا کماری کو ''پاکیزہ'' میں حاصل ہوا۔ ''محبت اور خدا'' نے نمی کے تمام کیریئر کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس فلم کو وہ اپنے فن کا نچوڑ ثابت کرنا چاہتی تھی۔ اس فلم میں اداکاری کرنے کے دوران اس نے بے شمار فلموں کے معاہدے رد کر دیئے تھے۔ کے آصف کے انتقال کے بعد جب اس فلم کو مختلف ہاتھوں نے دوبارہ شروع کیا تو اس فلم کا ہیرو گرو دت چل بسا۔ یہ فلم پھر آگے نہ بڑھ سکی۔ کے آصف کی عظیم فلم چوبیس برس تک دلیپ کمار کی بہن اختر جہاں جو آصف کی بیوی تھیں انہوں نے اس فلم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا بیڑہ اٹھایا چنانچہ ۲۵/سال کے تعطل کے بعد چند سال قبل یہ فلم عجوبہ بن کر ریلیز ہوئی اور نئی نسل نے نمی کے دیدار کیۓ لیکن فلم عظیم تخلیق نہ بن سکی....!!!

☆☆☆

ہندوستان کی آئیڈیل خاتون۔ مالا سنہا

ہریش تیواری

۱۹۵۰ء کی دہائی مدھو بالا، وجینتی مالا، نمی، نرگس، مینا کماری، نوتن جیسی خوبصورت ہیروئنوں کی تھی۔ اس کے علاوہ زمانہ گھریلو فلموں کا بھی تھا جس میں ایسی خواتین کے کرداروں کو لے کر فلم کی کہانی تیار کی جاتی تھی جو گھر کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے ہر ظلم کے سامنے سر جھکاتی تھی۔ وہ ہیروئن جسم کو ڈھکے ہوئے، زیورات سے لدی ہوئی ہوتی تھی اور شوہر کو اپنا سب کچھ ماننے والی پاک صاف خاتون کے کردار کو پردے پر اتارنے میں ماہر ہوتی تھی۔ اس کی اداکاری میں بے حد جذباتیت کا امتزاج ہوتا تھا کیونکہ بغیر بولے انہیں اپنے تاثرات کو ظاہر کرنا ہوتا تھا۔ ساتھ ہی فلموں کی زمرہ بندی بھی تھی جیسے سماجی، مذہبی، اسٹنٹ، تاریخی اور ڈیزائنر فلمیں وغیرہ۔ خاص بات تو یہ تھی کہ ہر طبقے کی فلموں کے اداکار بھی الگ ہوتے تھے اور اپنی فلموں کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ ایسے وقت میں جب اس نیپالی عیسائی لڑکی کی پہلی فلم 'بادشاہ' گڈھے میں گری تو انہیں اسٹنٹ یا گھریلو فلموں میں گھر جانے کا خوف کھانے لگا۔

اس بات سے بھی وہ بخوبی واقف تھیں کہ خوبصورتی کے معاملے میں وہ اس وقت کی ہیروئنوں کے مقابلے میں کچھ کم تھیں۔ مگر دل میں یہ اعتماد زور پکڑے ہوئے تھا کہ صلاحیت کا جہاں تک تعلق ہے، وہ کسی سے بھی ٹکر لے سکتی ہے۔ اسی تذبذب کی حالت میں بقول مالا سنہا 'میں نے وہی کیا، جو آج تک کرتی آئی ہوں، میں باندرہ کے ہولی چرچ میں مدر میری کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور بولی ''ہولی مدر مجھے راستہ دکھاؤ'' میری دعا فوراً سن لی گئی گھر لوٹنے پر مجھے معلوم ہوا کہ اس وقت کی مشہور اداکارہ گیتا بالی نے مجھے بلایا ہے...! وہ مالا سنہا کی فلم 'بادشاہ' میں کیے گئے کردار سے بہت متاثر تھیں۔ ان کی تجربہ کار آنکھوں نے مالا کے اندر چھپی ہوئی صلاحیت کو ایک نظر میں ہی بھانپ لی تھی، لہذا ان کے اصرار پر پنڈت کیدار شرما نے اپنی فلم 'رنگین راتیں' میں مالا سنہا کو ہیرو شمی کپور کے ساتھ اتارا۔ 'رنگین راتیں' اپنا رنگ باکس آفس پر تو نہیں اتار پائی مگر مالا سنہا فلم صنعت میں چمکنے لگیں۔ گرو دت کو فلم 'پیاسا' میں کالج کی جس تتلی کی تلاش تھی، وہ جیسے خود ان کے درمیان آ گئی۔ 'پیاسا' میں جہاں مالا کا کالج میں پڑھنے اور شاعری کرنے والے لڑکے سے عشق

فرمانے والی لڑکی کا رول تھا، وہیں محبت میں دغا دے کر امیر شخص سے شادی کر لینے والی ولن خاتون جیسا کردار بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ مگر یہ مالا کی بہترین اداکاری کا کمال تھا کہ انہوں نے فلم بینوں کی نفرت مول نہیں لی بلکہ ایک مجبور خاتون کے طور پر ہمدردی حاصل کی۔ 'جانے وہ کیسے لوگ تھے جن کے پیار کو پیار ملا...' جیسے گیت میں انہوں نے شوہر اور سابق عاشق کی موجودگی میں دل کے پچھتاوے کی کشمکش کی جو عکاسی کی، اس نے ثابت کر دیا کہ فلم صنعت کے لیے اب انہیں ذرا بھی روک پانا مشکل ہے۔ مشہور فلم ساز و ہدایت کار مہیش بھٹ کا کہنا ہے میں نے 'بچپن میں اس تھیٹر میں 'پیاسا' فلم دیکھی جہاں ساڑھے پانچ آنے کا ٹکٹ ملتا تھا۔ کوئی دوبارہ ٹکٹ نہ لے سکے اس کے لیے اس کے ہاتھ پر سیاہی کی مہر ماردی جاتی تھی۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ مالا سنہا نے جس طرح سے جوان لڑکی کی امنگوں اور ترنگوں کا اظہار کیا وہ غضب کی تھیں۔ اپنے چھٹے حال عاشق کو بغیر پانی کے نل کے پاس جب وہ دیکھتی ہے، اس 'لک' کو میں کبھی بھول نہیں پایا۔ بھلے ہی میرے ہاتھ میں لگی ہوئی سیاہی کی مہر دو تین دن میں دھل گئی ہو، لیکن مالا جی کی اداکاری کی چھاپ آج پچاس سال بعد بھی دل میں برقرار ہے...'۔

فلم 'پیاسا' کو باکس آفس پر بے پناہ کامیابی ملی۔ مالا سنہا اسٹار حیثیت کی ہیروئن ہو گئیں۔ بی آر چوپڑہ نے راجیند رکمار کے ساتھ انہیں 'دھول کا پھول' کے لیے سائن کیا تو فلم صنعت کے لیے بڑے سے بڑے بینر انہیں سائن کرنے کے لیے پھڑ پھڑانے لگے۔ اس وقت کا بڑے سے بڑا ہیرو، ان کے ساتھ کام کرنے کے لیے راضی ہونے لگا۔ پھر تو ان کے سامنے فلموں کی قطار لگ گئی۔ 'دھول کا پھول' ایسی لڑکی کی کہانی تھی جو بغیر شادی کے ماں بن جاتی ہے۔ عاشق اسے ٹھکرا دیتا ہے اور در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد دوسرے ہیرو اشوک کمار کے ذریعہ اپنا لی جاتی ہے۔ اس ٹھنڈی امیج کو مالا سنہا نے اپنی جذباتی اداکاری سے ایسا تپایا کہ وہ عوام کی پوری ہمدردی اپنی حمایت میں لے گئیں۔ حالانکہ راجیند رکمار اور اشوک کمار فلم میں تھے مگر فلم بینوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں مالا جی کامیاب ہوئیں۔ 'دھول کا پھول' باکس آفس پر سونے کی کان ثابت ہوئی۔ فلم 'ہریالی اور راستہ' اور 'ان پڑھ' ان کی اور دو ہٹ فلمیں ثابت ہوئیں۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں 'گمراہ' فلم میں انہوں نے ایسی لڑکی کا کردار ادا کیا جو شادی ہو جانے کے باوجود اپنے پرانے عاشق کو بھول نہیں پاتی اور وقتاً فوقتاً اس سے ملتی رہتی ہے مگر جس مجبوری کے تحت یہ سب ہوتا ہے اسے مالا نے ایسی اداکاری کے ذریعہ

پیش کیا کہ یہ کردار فلم بینوں کو ان کے خلاف بھڑ کا نہیں پایا اور آخر میں جب وہ عاشق کو ٹھکرا کر شوہر کے گھر چلی جاتی ہے تو ہندوستانی آئیڈیل خاتون کی 'امیج' پردے پر ثابت ہو اٹھتی ہے۔

اسی سال مالا سنہا کی ہندوستانی آئیڈیل خاتون کی امیج کو پیش کرتی ہوئی ایک اور فلم 'بہورانی' آئی۔ ایک تعلیم یافتہ لڑکی کی دھوکے سے ایک ایسے شخص سے شادی کر دی جاتی ہے جو بے وقوت اور نکما ہے۔ آئیڈیل ہندوستانی خاتون اپنے شوہر کو طلاق نہیں دیتی اس لیے وہ شوہر کو سدھارتی ہے، مہذب بناتی ہے اور سمجھ دار بنا دیتی ہے۔ مالا سنہا نے جو بھی کردار ادا کیا وہ اتنے زندہ لگتے تھے جیسے اس میں دل کے ساتھ روح بھی ڈال دی ہو۔ 'گمراہ' اور 'بہورانی' جیسی پیچیدگی بھرے کردار ادا کرنے کے بعد رومانی اداکارہ کے طور پر 'ہمالیہ کی گود میں' میں جہاں لوگوں کو 'بلما تو بڑا وہ ہے...' جیسی ادا ضرورت سے زیادہ بھائی وہیں 'آسرا' اور 'دو کلیاں' میں 'میرے رونے پہ تو مسکرایا...' جیسی بات پھر پیدا ہو گئی۔ یہ فلمیں ایسی چلیں کہ مالا سنہا کے وکیل باپ البرٹ کو بھی مالا کو روتے اور ہنستے ہوئے دیکھنے کی جیسے عادت پڑ گئی۔

٦٠ کی دہائی کے بعد فلم بینوں اور فلموں کا مزاج بدل رہا تھا۔ جب فلمی ہیروئنیں ڈھکی چھپی نہ رہ کر ادھڑ رہی تھیں تو مالا سنہا نے اس چیلینج کو 'آنکھیں' میں قبول کر کے اور فلم بینوں کو فلموں کی نئی لڑی پیش کی۔ ان کی اصل زندگی کی کہانی یہ ہے کہ نیپالی فلم 'مہتی گھر' کی شوٹنگ کے دوران نیپالی ہیرو سی پی لوہری کی محبت میں بندھ کر شادی کی۔ بعد میں بیٹی پرتیبھا پیدا ہوئی جب شوہر سے نہیں بنی اور فلموں میں بھی ویسی چمک نہیں رہی تو مالا سنہا مدر میری کی آغوش میں جا کر بے حد مذہبی ہو گئیں۔ آج بھی وہ باندرہ میں اپنے کئی منزلہ اونچے بنگلے کے پاس ٹہلتی ہوئی نظر آ جاتی ہیں۔ فلمی کامیابی حاصل کرنے کے بعد اب انہیں کوئی ملال نہیں کیونکہ وہ اپنی شرطوں پر قائم رہیں اور یہی وجہ ہے کہ دلیپ کمار کے ساتھ انہوں نے فلم 'رام اور شیام' تک ٹھکرا دی۔

☆☆☆

ناقابلِ فراموش اداکارہ۔شکیلہ

خورشیداختر فرازی

ہندی فلموں کی ایک من موہنی، بیحد خوبصورت، پُروقار اور ریشم سے بھی نازک جیسی ایک ہیروئن تھی ''شکّو'' جس کا نام شکیلہ تھا، اس کا چہرہ کسی بھی طور پر پری چہرہ سے کم نہیں تھا اور ڈائیلاگ کی ادائیگی، رکھ رکھاؤ بالکل شہزادیوں جیسا، پردہ سیمیں پر جب اس کا چہرہ نظر آتا تو بے ساختہ محمد رفیع مرحوم کا گیت'' لے کے پہلا پہلا پیار بھر کے آنکھوں میں خمار، جادو نگری سے آیا ہے کوئی جادوگر' بے ساختہ زبان پر آجاتا تھا۔ اسی شکیلہ کے لئے کبھی رفیع نے یہ گیت بھی گایا تھا۔''ہم تم سے جدا ہوکے، مرجائیں گے رو روکے''۔۱۹۵۰ء میں ریلیز ''فلم داستان'' میں شکیلہ نے وینا کے بچپن کا رول بیحد عمدگی سے نبھایا تھا۔اس وقت شکیلہ صرف ۹ سال کی تھی لیکن اپنے اس رول میں وہ بیحد گھمنڈی اور غصّہ ور لڑکی کے رول میں تھی اور فلم کے دوسرے حصّے میں جب وہ بڑی ہوجاتی ہے تو وہ رول وینا کرتی ہے اور بچپن کے سارے عادات واطوار اس میں موجود رہتے تھے اور اُسے دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ شکیلہ نے کس قدر باریکی سے اپنے اس رول کو پڑھا ہوگا اور خود کو اس رول میں ڈھالنے کی کوشش کی ہوگی۔

جب گرودت کی سسپنس فلم ''سی آئی ڈی'' کی ہدایتکاری راج کھوسلہ کو سونپی گئی تو گرودت دیوانند کے مقابل گیتا بالی کو پیش کرنا چاہتے تھے کیونکہ اس فلم میں ایک خصوصی رول ایک نئی اداکارہ وحیدہ رحمٰن کو دیا گیا تھا اور فلم کا خاص گیت ''کہیں پہ نگاہیں کہیں پہ نشانہ''۔رک جا او پنچھی شکاری ہے دیوانہ' وحیدہ رحمٰن پر فلمانے کا فیصلہ کرلیا گیا تھا۔راج کھوسلہ نے گرودت کو مشورہ دیا کہ اگر گیتا بالی کے بجائے شکیلہ کو موقع دیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ اس سے قبل گرودت کی فلم جال میں گیتا بالی کو لیا گیا تھا اور اس پر فلمایا ہوا گیت ''تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنالے، اپنے پہ بھروسہ ہے تو یہ داؤ لگالے'' بیحد مشہور ہوا تھا مگر چونکہ اس فلم میں گیتا بالی ایک تجربہ کار رقاصہ اور ویلین کے ہمراہ کا رول کرچکی تھی اور سی آئی ڈی میں ایک نوجوان اور بیحد من موہنی جیسی لڑکی کی ضرورت تھی اس لئے گیتا بالی اس رول کے لئے فٹ نہیں ہوسکتی تھی لہٰذا شکیلہ کو پہلی مرتبہ اس وقت کے سپر اسٹار دیوآنند کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا اور شکیلہ کی اداکاری نے فلم کی کامیابی میں چار چاند

لگادیئے، اگرچہ اس فلم میں وحیدہ رحمٰن معاون اداکارہ ہوتے ہوئے بھی سب پر سبقت لے گئی تھی لیکن فلم کے ابتدائی مناظر میں شکیلہ اور دیوآنند کی چھیڑ چھاڑ اور دلفریب گیتوں نے فلم میں بیحد دلچسپی پیدا کردی تھی۔اس فلم میں شکیلہ کے کلوزاپ کو دیکھ کر اس زمانے کی حسین اداکارائیں نندہ، سادھنا، وجنتی مالا اور مالا سنہا بھی دنگ رہ گئی تھیں اور سبھوں نے راج کھوسلہ کو داد دی تھی کہ ان کی پسند نے سبھوں کے دل کو موہ لیا تھا۔

شکیلہ کی یہ بدقسمتی رہی کہ اس کے زمانے میں رنگین فلمیں نہیں بنتی تھیں اور صرف بلیک اینڈ وائٹ فلموں کا رواج تھا۔اگر شکیلہ کسی ٹیکنی کلر یا ایسٹ مین کلر فلم میں نظر آتی تو آج کی ایشوریہ، رانی، کاجول، پریتی اور لارا وغیرہ اس کے سامنے پاؤں کی دھول نظر آتی۔

شکیلہ حیدرآباد کے ایک راسخ العقیدہ مسلم خاندان سے تعلق رکھتی تھی، لیکن اس کی پرورش اور ابتدائی تعلیم لندن میں ہوئی تھی لیکن جب لندن میں اس کے نانا مشرف خان کا انتقال ہوگیا تو اُسے اپنے والدین کے پاس حیدرآباد آنا پڑا، اس زمانے میں ان کے والد بیحد بیمار رہنے لگے تھے اور گھر کی مالی حالت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی، اسی بناء پر اس نے راجکپور کے مشورے پر فلموں میں چھوٹے چھوٹے رول کرنا شروع کئے اور بہت جلد اُسے شہرت حاصل ہوگئی۔

ہدایت کار وفلمساز آسپنی نے ۱۹۶۰ء میں ایک سسپنس فلم ''استادوں کے استاذ'' بنائی تھی جس میں شیخ مختار، اشوک کمار اور پردیپ کمار کے ساتھ شکیلہ کو ہیروئن بنایا گیا تھا۔اس فلم میں شکیلہ اور پردیپ کمار کی رومانی اداکاری اور بیحد جذباتی گیتوں نے فلم کو بیحد کامیاب بنایا تھا۔

این اے انصاری کی فلم ''ملزم'' اور ٹاور ہاؤس میں شکیلہ کو اجیت اور پردیپ کمار کے مقابل ہیروئن کا رول دیا گیا تھا۔اور یہ بھی اتفاق ہے کہ یہ دونوں فلمیں بھی سسپنس تھیں۔شکیلہ نے بہت زیادہ فلمیں نہیں کیں۔کیونکہ وہ فلموں میں فحش سین اور فحش کپڑے پہننے کے لئے تیار نہ تھی اور جب سادھنا، اور شرمیلا ٹیگور جیسی ہیروئنیں آنے لگیں تو شکیلہ رفتہ رفتہ فلم سے کنارہ کش ہوگئی اور لندن کے ایک مسلم کاروباری شخص سے شادی کرلی۔شکیلہ جیسی اعلیٰ اور پُروقار ہیروئن شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے اور پرانی فلموں کے شوقین شکیلہ کو کبھی بھی فراموش نہیں کرسکتے کیونکہ وہ چند ہیروئنوں میں سے ایک تھی جو دل ودماغ پر چھاجانے والی حیثیت رکھتی تھی۔شکیلہ نے منوج کمار کے ساتھ فلم ''نقلی نواب'' میں بھی ہیروئن

کا رول ادا کیا تھا جس میں اشوک کمار اور کے این سنگھ بھی تھے اور یہ ایک بیحد رومانی فلم تھی۔ منوج کمار اپنی بہترین ہیروئنوں میں جہاں آشا پاریکھ، سائرہ بانو اور مالا سنہا اور ہیما مالنی کا نام لیتے ہیں وہیں وہ شکیلہ کا نام لینا نہیں بھولتے جبکہ شکیلہ کے ساتھ انہوں نے صرف ایک ہی فلم کی تھی۔

۱۹۶۶ء میں جب کولکاتا۔ کے پراڈائز سنیما میں آپسی کی فلم ''استادوں کے استاد ریلیز ہوئی تھی تو فرسٹ دن فرسٹ میٹنی شو میں فلم کے بیشتر ستارے شیخ مختار، اشوک کمار، پردیپ کمار کے ساتھ شکیلہ بھی آئی تھی اور اس زمانے میں میٹنی شو کے ٹکٹ ۵۰ روپئے میں فروخت ہو رہے تھے اور پراڈائیز کے باہر لوگوں کا ایک جم غفیر موجود تھا جو اپنے محبوب ستارے کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بیتاب تھے اور جب وہ ستارے اسٹیج میں نمودار ہوئے تو پورے ہال میں ایسا شور ہو رہا تھا کہ آوازیں باہر تک آرہی تھیں، ویسے دور سے سہی راقم الحروف نے شکیلہ کی ایک جھلک دیکھ لی تھی جب وہ ہال سے باہر نکل کر ایک چھوٹی سی آسٹن کار میں بیٹھ رہی تھی اور اس کی جھلک نے لوگوں کو پاگل کر دیا تھا، وہ سچ مچ دودھ کی دھلی کسی پرستان کی حور لگ رہی تھی اور سفید لباس اس پر بیحد کھل رہا تھا شکیلہ نے ہال سے باہر آکر جم غفیر کو دیکھ کر مسکرا کر ہاتھ ہلایا تھا اور اس کی وہی ایک جھلک کلکتہ والوں پر بجلی گرانے کے لئے کافی تھی۔ صحیح معنوں میں اس زمانے میں بلیک اینڈ وائٹ فلموں میں کام کرنے والی شکیلہ آج رنگین فلموں کی تقریباً سبھی ہیروئنوں سے زیادہ حسین تھی اور خاص طور پر اس کی غزالی آنکھیں کوئی بھول نہیں سکتا، فلم سی آئی ڈی میں یہ گیت ''لے کے پہلا پہلا۔ بھر کے آنکھوں میں خمار'' میں وہ جس طرح سے غصے سے اپنی آنکھیں مچکاتی ہے اس سے اچھے اچھے کا دل لٹ سکتا ہے۔

آج شکیلہ ہندوستان سے ہزاروں میل دور غیر ملک میں ہے، کبھی کبھی وہ اپنی پرانی سہیلیوں نمی، وحیدہ رحمٰن، جبین، شیاما وغیرہ سے ملنے کے لئے ممبئی آجاتی ہے۔ ممبئی میں آج بھی اس کے خاندان کے کئی لوگ ہیں لیکن کوئی بھی فلم انڈسٹری سے منسلک نہیں ہے۔ چند سال قبل کامیڈی کنگ جانی واکر (بدرالدین) کا انتقال ہوا تھا تو وہ خبر ٹی وی میں سن کر فوراً ممبئی چلی آئی تھی کیونکہ جانی واکر اُسے بیحد عزیز رکھتے تھے، جانی واکر کی اہلیہ نور شکیلہ کی بہن تھی، وہ اس کے گلے سے لپٹ کر روئی تھی۔ اس وقت شکیلہ خود بھی کافی ضعیف اور لاغر ہو چکی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ مرنے سے پہلے ایک بار واپس ممبئی جائے جہاں اس نے زندگی کے ۳۰ بہترین سال گزارے، لیکن بچے کے درمیان گھر کر وہ واپس آنے سے بھی مجبور ہے۔

کیسے کیسے حسین چہرے دیکھنے کو ملے، مدھو بالا، گیتا بالی، مینا کماری، نوتن، نرگس، اپنی جھلک دکھلا کر معدوم ہو چکی ہیں، کبھی وہ خبر بھی سننے کو ملے گی کہ شکیلہ بھی اب......لیکن پرانی یادیں اور پرانی باتیں کبھی بھی ذہن سے محو نہیں ہو سکتیں۔ وہی یادیں ایک خزانے کا روپ رکھتی ہیں اور اگر یہ یادیں بھی چھن جائے تو بس....!

نوٹ:- یہ مضمون خاص طور پر شکیلہ کی ایک زبردست فین کی درخواست پر لکھا گیا ہے اور اتفاق کی بات ہے کہ اس کا نام بھی شکیلہ ہے۔

☆☆☆

سادھنا کٹ بال والی اداکارہ۔سادھنا

نجمہ شریف

اداکاری کا مشہور اسکول فلمالیہ اسٹوڈیو،اور ہندوستانی فلم انڈسٹری کی دوسری شخصیت جو کسی اسکول سے کم اہمیت نہیں رکھتی تھی وہ تھے بمل رائے،فلمالیہ کے بیز تلے ایسی فلمیں بنائی جاتی ہیں جن کو ہم کمرشیل کہتے ہیں جب کہ بمل رائے نے ہمیشہ ایسی فلمیں بنائی ہیں جو متوسط و متوازن ہوں نہ ان کو آرٹ فلموں کا نام دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کمرشیل،ان دونوں ہی اسکولوں سے ایک ساتھ وابستگی ایک کارِنمایاں کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۹۶۰ء کی دہائی میں دو خوبصورت اداکاراؤں نے ایک ساتھ فلمی دنیا میں قدم رکھا اور بہت جلد اپنی بہترین اداکاری کا مظاہرہ کر کے بلند تر مقام پر پہنچ گئیں یہ ہیں۔سادھنا اور آشا پاریکھ،حالانکہ جس دور میں ان دونوں نے فلمی دنیا میں قدم رکھا اس وقت مینا کماری،نرگس،مدھو بالا،بینا رائے،نوتن وغیرہ پردۂ سیمیں پر چھائی ہوئی تھیں۔

سادھنا کی فلمی زندگی کا آغاز ایک چھوٹی سی فلم لو اِن شملہ سے ہوا،نئے چہروں سے بھری یہ فلم صرف ایک تجربہ تھی۔سادھنا کے ساتھ ساتھ ہیرو جوائے مکھر جی،ہدایتکار آر۔کے۔نیرّا(جو بعد میں ان کے شوہر ہوئے)اور موسیقار اقبال قریشی بھی نئے تھے۔یہی سبب تھا جو اس فلم کے کچھ حصّے بے جان سے لگے۔

سادھنا کی دوسری فلم بمل رائے کی ''پرکھ'' تھی یہ بھی اسی سال بنی اور منظر عام پر آئی اس فلم میں گاؤں کے پس منظر کو پیش کیا گیا تھا اس میں سادھنا کو گاؤں کی بھولی بھالی لڑکی کا کردار کرنا تھا حالانکہ یہ کردار کوئی زیادہ مشکل نہ تھا کیوں کہ وہ اداکاروں سے خوب محنت کراتے اور اچھے سے اچھا کام لیتے۔یہ سادھنا کی دوسری فلم تھی بمل رائے سے سادھنا نے اداکاری کی باریکیوں کو سمجھا اور بہت کچھ سیکھا حالانکہ بمل رائے خود ان سے بے حد متاثر تھے۔اس لئے انہوں نے نوتن کے بعد کا درجہ سادھنا کو دے دیا ابھی ''پرکھ'' مکمل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ بمل رائے نے انہیں اپنی اگلی فلم ''پریم پتر'' کے لئے سائن کرلیا۔

سادھنا نے جب فلموں میں قدم رکھا تو ان کی اپنے بارے میں متوازن سوچ تھی۔ان کے خیالات بہت بلند نہیں تھے۔وہ خود کو ایک عام سندھی لڑکی سمجھتی تھیں۔جو خوبصورتی سے خاصی دور ہو مگر

ایسا نہیں تھا کیوں کہ وہ خوبصورت تھیں۔اس کے علاوہ بہت خوش مزاج تھیں کیونکہ ان کی فلمیں دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین اداکارہ بھی ہیں۔اب چونکہ انہوں نے فلمی زندگی کو خیر باد کہہ دیا ہے اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انہیں یہ گوارا نہیں کہ ان کی جو امیج ناظرین کے ذہنوں میں محفوظ ہے اب وہ ماں بہن کی صورت اختیار نہ کر جائے۔

دیو آنند اور راجیش کھنّہ کے علاوہ ایک سادھنا ہی ہے،جس نے کتاب فیشن میں ایک نئے باب کا اضافہ کا یہ اضافہ یا ضرورت نہیں بلکہ مجبوری تھی۔سادھنا کٹ بالوں کا اس قدر شور بلند ہوا کہ عام لڑکی بھی سادھنا کٹ بال رکھنے کی کوشش کرتی جب کہ اس کے پیچھے ایک مجبوری یہ تھی کہ سادھنا کا ماتھا کافی چوڑا تھا اس لئے انہوں نے آڈرے ہیپرن کا ہیر اسٹائل اپنایا،چوڑے ماتھے پر بالوں کو ایک نئے انداز میں بنایا ان کا یہی انداز اس قدر مقبول ہوا کہ نوجوان لڑکیاں اسی انداز کو اپنانے لگیں اس کی شروعات ''لو اِن شملہ'' سے ہوئی اور ''ایک مسافر ایک حسینہ'' تک آتے آتے یہ اسٹائل اچھا خاصا مقبول عام ہو گیا۔

''وقت''میں انہوں نے ایک اور نیا فیشن پیش کیا۔چوڑی دار پاجامہ اور قمیض ''میرے محبوب''میں بھی یہی اسٹائل تھا لیکن اس فلم میں یہ مسلم تہذیب کا ایک حصہ تھا انہوں نے پنجابی پہناوے کو ایک نیا انداز دے دیا۔سادھنا کٹ بال لباس،چوڑی دار پائجامہ قمیض اور کٹ جوتی یعنی موجری جوتی،آگے سے بند نوکدار،جیسے راجیش کھنّہ نے کرتے کو شہرت دلائی ویسے ہی سادھنا نے ایک روایتی جوتی کو فیشن بنادیا۔جب کہ اس جوتی کو مقبولیت بخشنا مقصد نہیں تھا۔بلکہ سادھنا کے ایک پاؤں میں چھ انگلیاں ہیں۔اس لئے کھلی چپل پہننا مناسب نہیں تھا۔بند جوتیوں نے یہ مسئلہ حل کردیا۔اس طرح کی جوتیوں کا استعمال کرنا تھا وہ فیشن کا ایک حصہ بن گئیں۔

سادھنا کی تمام فلموں کے گانوں کے مناظر میں ایک بات بالکل یکساں ہے''لو اِن شملہ'' سے لے کر ''وندنا'' تک رقص وموسیقی کے ماہر سادھنا اتنے آسان طریقے سے ایک یا دو ٹیک میں ہی شاٹ او کے کروادیتی ہیں۔ویسے فلم کے ہر منظر میں ہدایتکار کو ان کے ساتھ کام کرنے میں محنت نہیں کرنی پڑتی اس کی ایک مثال فلم ''راجکمار'' ہے اس فلم کے ہیرو شمّی کپور تھے جو ماہر رقاص سمجھے جاتے ہیں انہیں کے انداز میں انہیں پیچھے چھوڑ دیا۔کیونکہ گانا شمّی کپور پر فلمایا گیا تھا مگر اپنے جذبات کا چہرے پر تاثرات لاکر اظہار کرنا تھا وہ انہوں نے اتنے

بہترین انداز میں پیش کیا کہ ناظرین بجائے گانے کے اس وقت ان کے انداز کو اہمیت دینے لگے۔

دیو آنند نے جب سادھنا کو فلم ''ہم دونوں'' کے لئے سائن کیا تو اس وقت ان کی صرف دو فلمیں ہی منظر عام پر آئی تھیں مگر ان دونوں ہی فلموں میں کہیں ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ یہ لڑکی اداکاری میں نئی ہے۔ فلم ''ہم دونوں'' میں سادھنا نے اتنی بہترین اداکاری کا مظاہرہ کیا کہ دیو آنند بھی حیران تھے۔ اس فلم کے بعد ان دونوں نے ایک اور فلم ''اصلی نقلی'' میں ایک ساتھ کام کیا فلم ''ہم دونوں'' اور ''اصلی نقلی'' میں سادھنا نے دیو آنند کے ساتھ کام کر کے بہت کچھ سیکھا جو اداکاری کا اسکول جانے جاتے ہیں۔ سادھنا کی خصوصیت میں ایک خاصیت یہ تھی کہ اگر وہ کسی منظر میں موجود ہیں اور انہیں کچھ بولنا نہیں ہے پھر بھی وہ اپنے تاثرات سے موجودگی کا احساس دلا دیتی ہیں، اس لئے ان کی تمام فلموں میں ایک بلند پایہ دار اداکارہ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان کی شروع کی فلموں کی سادگی کی وجہ سے انہیں خاموش حسن کی ملکہ اور ہوشمند ڈولر با کا خطاب دیا گیا۔

ایسی ہی تمام خوبیاں نوتن میں بھی کوٹ کوٹ کر بھری تھیں اسی لئے رشی کیش مکھرجی، بمل رائے دیگر ہدایتکاروں نے سادھنا کو نوتن کا جانشین کہا مگر مینا کماری خود ان کو اپنا جانشین بتاتی تھیں۔ یہ سادھنا کا فن تھا جس نے ان کو ہندی فلم انڈسٹری کی دو مایہ ناز اداکاراؤں کا جانشین کہلوایا۔ حالانکہ مینا کماری مشرقی خاتون کی وہ امیج بنا چکی تھیں جو مظلوم ہو مگر سادھنا نے اپنا تشخص برقرار رکھا۔ ایک ایسی عورت جو اپنے حقوق کے لئے لڑسکتی ہے اسے حاصل کر سکتی ہے۔

سادھنا کو اداکاری کا بچپن سے شوق رہا انہوں نے کالج میں بھی کئی ڈرامے کئے۔ ایک بار سادھنا سندھی کالج میں ڈرامہ کر رہی تھیں کہ فلمساز ٹی۔ این۔ بہاری نے انہیں فلم کیلئے آفر کیا یہ ایک سندھی فلم تھی اس فلم میں سادھنا کو فلم کی ہیروئن شیلا رمانی کی چھوٹی بہن کا کردار ادا کرنا تھا۔ ان ہی دنوں ایس مکھرجی نے اپنا فلمالیہ اسکول شروع کیا انہیں نئے چہروں کی تلاش تھی۔ اتفاق سے کسی اخبار میں سادھنا کی تصویر دیکھی اور فلم ''لوان شملہ'' کے لئے سائن کرلیا اور ابھی یہ فلم بن ہی رہی تھی کہ سادھنا نے دوسری فلم ''پرکھ'' سائن کر لی دونوں ہی فلموں میں انکے کردار ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔

سادھنا نے جس دور میں فلم انڈسٹری میں قدم رکھا ان دنوں ایک الگ ہی ڈھنگ کی فلمیں بنتی

تھی سادھنا نے کبھی زیادہ فلمیں کرنے کی کوشش نہیں کہ بلکہ جتنی بھی فلمیں کیں ان کو مثالی بنادیا۔ سادھنا نے زیادہ تر راج کھوسلہ کی ہدایت میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ کئی فلمیں ایک ساتھ کرنے کی وجہ سے ایک دوسرے کے اچھے دوست ثابت ہوئے۔ اگر سادھنا ۱۹۷۱ء کے بعد فلموں کو الوداع نہ کہتی تو راج کھوسلہ آشا پاریکھ اور سادھنا کو لے کر کچھ اور فلم بناتے۔ اس سے پہلے کہ وہ ایسی کسی فلم کا اعلان کرتے انہوں نے ہندی فلموں کو خیر باکہہ دیا اس لئے راج کھوسلہ نے نوتن اور آشا پاریکھ کو لے کر فلم ''میں تلسی تیرے آنگن کی'' بنائی جو کہ ہٹ ثابت ہوئی۔

''میں تلسی تیری آنگن کی'' میں اگر سادھنا اور آشا پاریکھ آمنے سامنے ہوتیں تو یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا تھا کہ ان دونوں نے اپنی فلمی زندگی میں کیا کچھ سیکھا۔

سادھنا نے اپنے زمانے کے تقریباً سبھی مشہور اداکاروں کے ساتھ کام کیا ہے جیسے جوائے مکھرجی، دیو آنند، کشور کمار، راجندر کمار، منوج کمار، شمی کپور، سنیل دت، دھرمیندر، سنجے خان اور راجیش کھنّہ وغیرہ۔ ان سبھی کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات رہے ایک تو اس لئے وہ خوش مزاج ہیں دوسرے یہ کہ وہ خوب سے خوب تر کام کرنا چاہتی تھیں۔ مگر ایک فلم ''دولہا دلہن'' میں انہوں نے راجکپور کے ساتھ بھی کام کیا اس فلم میں وہ کچھ دبی دبی سی رہیں اس کی وجہ یہ تھی کہ ان پر راجکپور کا رعب طاری تھا کیونکہ وہ صرف ایک اداکار ہی نہیں بلکہ ہدایتکار، فلمساز اور شومین بھی تھے۔ راجکپور سے تھوڑا اُوب جانا فطری امر تھا۔

آج بھی ہم جب کبھی سادھنا کی فلم دیکھتے ہیں تو ذہن میں ایک بہار کی دیوی کا تصور ابھرتا ہے لیکن ہمیں یہ افسوس رہے گا کہ اب ہم ان کے فن کو ان کی گزشتہ فلموں کے علاوہ کہیں اور نہیں دیکھ سکیں گے مگر ایک حد تک ان کا فلموں کو الوداع کہنا مناسب تھا کیونکہ ان کی امیج کے جو نقش ناظرین کے ذہن میں موجود ہیں وہ مٹ جائیں گے۔

☆☆☆

خوبصورت، چنچل اور من موہنی اداکارہ۔ ممتاز

ثانیہ قیصر

اداکارہ ممتاز جسے پیار سے لوگ ممّوں کہتے تھے وہ اپنے دور کی ایک ایسی خوبصورت، چنچل، ہنس مکھ اور من موہنی اداکارہ تھی جس نے بالکل گراس روٹ سے ترقی کی۔ یعنی دارا سنگھ کی ہیروئن بننے کے ساتھ شروعات کی اور اپنے دور کے عظیم اداکار دلیپ کمار، راج کمار، امیتابھ بچن، راجیش کھنّہ، دیو آنند، منوج کمار، دھرمیندر، راجندر کمار کی ہیروئن بنی اور سبھوں کے ساتھ اس طرح سے جوڑی بنائی جیسے وہ اس کے علاوہ کسی اور کے ساتھ کبھی بھی کام نہیں کرے گی۔ جس زمانے میں ممتاز بی گریڈ کی فلموں میں دارا سنگھ، بسواجیت، سیلیش کمار اور رندھاوا جیسے اداکاروں کی ہیروئن کا رول کرتی تھی اس زمانے میں نندہ، شرمیلا ٹیگور، وحیدہ رحمٰن، سادھنا، ہیما مالنی، ریکھا، راکھی وغیرہ کے عروج کا زمانہ تھا اور ان کے درمیان رہتے ہوئے ممتاز نے اپنے آپ کو سپرہٹ اداکارہ بنایا اور اپنی اداکاری کا لوہا منوالیا۔

۱۹۶۰ء میں وہ پہلی مرتبہ دارا سنگھ کے ساتھ فلم دارا سنگھ میں ہیروئن بنی تھی، اس کے بعد بادشاہ، لٹیرا، فولاد، سیمین، کنگ کانگ وغیرہ میں وہ مسلسل دارا سنگھ کی ہیروئن بنی۔ اس کے بعد مزاحیہ اداکار محمود نے پہلی مرتبہ اسے اپنی ہیروئن کے طور پر لیا اور فلم ''پیار کئے جا'' میں اس نے محمود کے ساتھ زبردست مزاحیہ اداکاری کی۔ جس کے بعد وہ محمود کے ساتھ متعدد فلموں میں جلوہ گر ہوئیں۔

اس کی اداکاری سے متاثر ہو کر راجیش کھنہ جو اس دور کے سپرہٹ ایکٹر تھے انہوں نے ۱۹۶۸ء میں فلم بندھن، اپنا دیش، دشمن، دوراستے، سچا جھوٹا میں اسے ہیروئن کے طور پر لیا اور یہ پانچوں فلمیں ایک کے بعد ایک کر کے پورے ملک میں گولڈن جبلی ثابت ہوئیں۔ اس نے رام مہشوری کی فلم کاجل میں راج کمار، مینا کماری، دھرمیندر، پدمنی کے ساتھ کام کیا۔ اس کے ہیرو محمود تھے۔ ممتاز نے مینا کماری کے ساتھ گومتی کے کنارے (ہیرو سمیر) کاجل میں کام کیا، وحیدہ رحمٰن کے ساتھ بحیثیت سائیڈ ہیروئن پتھر کے صنم میں کام کیا۔

ممتاز کی زندگی میں پہلی مرتبہ سب سے اہم رول بی ناگی ریڈی کی فلم ''رام اور شیام'' میں ملا جب

اس کی زندگی کی تمنا پوری ہوئی اور دلیپ کمار کی ہیروئن بننے کا موقع ملا، اس فلم میں ممتاز کو وحیدہ رحمٰن سے زیادہ پسند کیا گیا۔ رام اور شیام میں کام کرنے کے بعد اس نے امیتابھ بچن کے ساتھ ''بندھے ہاتھ، دھرمیندر کے ساتھ لوفر، منوج کمار کے ساتھ ساون کی گھٹا، پتھر کے صنم، بسواجیت کے ساتھ پردیسی، میں اہم رولز ادا کئے۔ اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو ممتاز اور راجیش کھنہ کی جوڑی سب سے ہٹ جوڑی تھی، کیونکہ ان دونوں کی پانچ چھ فلمیں جیسے دشمن، بندھن، اپنا دیش، سچا جھوٹا، دوراستے، آج کی قسم، روٹی وغیرہ ایسی فلمیں تھیں جس نے ہندوستان بھر میں گولڈن جبلی منائی، اگرچہ ممتاز نے دھرمیندر کے ساتھ بھی کئی ہٹ فلمیں دیں جس میں لوفر کا نام اہم ہے اس کے علاوہ سنجیو کمار کے ساتھ اس کی اہم جوڑی رہی لیکن راجیش کھنہ اس کے لئے کامیاب ہیرو ثابت ہوئے۔

پرشاد پروڈکشن کی سب سے اہم فلم ''کھلونا'' سنجیو کمار اور ممتاز کی زندگی کی سب سے بہترین فلم ثابت ہوئی، اس فلم میں سنجیو کمار نے ایک پاگل اور ممتاز نے ایک طوائف کا یادگار رول نبھایا تھا اور اس فلم میں دونوں کو فلم فیئر ایوارڈز سے نوازا گیا تھا۔ اس فلم میں فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ سنجیو کمار کا رول بہتر ہے یا ممتاز کا، کیونکہ دونوں ہی نے ایسی جذباتی اداکاری کی تھی جس کی مثال نہیں دی جاسکتی۔ یہ فلم اگر آج کے دور میں ریلیز ہوئی ہوتی تو شاید آسکر کے لئے نامزد کی جاتی۔ گلشن نندہ کی کہانی پر مشتمل یہ فلم ہر دور میں ایک کلاسیک اور ناقابل فراموش فلم کہلائے گی۔

ممتاز نے دیوانند کے ساتھ ہرے راما ہرے کرشنا میں کام کیا۔ اس کے علاوہ تیرے میرے سپنے میں، ہرے راما ہرے کرشنا پوری فلم میں زینت امان ہی چھائی رہی لیکن تیرے میرے سپنے میں ممتاز نے اپنی جذباتی اداکاری کے ذریعہ دیوانند جیسے سدابہار اور گلیمر ایکٹر کا رنگ بھی پھیکا کر دیا تھا۔

ممتاز کی ہٹ جوڑی سنجے خان اور فیروز خان کے ساتھ بھی بنی تھی۔ آگ میں فیروز خان ایک ڈاکو اور ممتاز نے گاؤں کی بھولی بھالی لڑکی کا رول نبھایا تھا۔ فلم میلہ میں سنجے خان اور فیروز خان دونوں ہی تھے اور اس فلم میں بھی فیروز خان نے ایک ڈاکو کا رول بہت ہی عمدگی سے نبھایا تھا۔ ممتاز نے فلم شرط میں بھی سنجے خان کے ساتھ کام کیا تھا۔

بسواجیت کے ساتھ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں ایک دلچسپ فلم پردیسی آئی تھی جس میں ممتاز نے ایک بنجارن لڑکی کا رول نبھایا تھا۔ اسی رول کو بعد میں شرمیلا ٹیگور نے فلم تلاش میں اپنایا تھا۔ راجندر کمار کے ساتھ فلم گہرا داغ میں ممتاز نے بہن کا رول نبھایا تھا۔ غرض یہ کہ ممتاز نے دلیپ کمار جیسے اعلیٰ ترین اداکار اور دارا سنگھ، بسواجیت جیسے چھوٹے اداکاروں کے ساتھ بھی کام کیا۔ اس کے علاوہ شتروگھن سنہا، جتندر، منوج کمار، سیلیش کمار کے ساتھ بھی ہیروئن کا رول نبھایا۔

☆☆☆

ہندی فلموں کی مایہ ناز اداکارہ۔ آشا پاریکھ

دنیش راہیجا

سہارا انڈیا پریوار کے چینل ''سہارا ون'' کے ذریعہ ۱۱ر جنوری ۲۰۰۷ء کو ممبئی میں ''کم بخت پائریسی'' کے عنوان سے ایک پروگرام منعقد کیا گیا جس میں ہندی فلموں کی مایۂ ناز اداکارہ آشا پاریکھ کو فلموں میں ان کی بہترین کارکردگی پر سہارا انڈیا پریوار کی طرف سے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

سہارا انڈیا کے اس پروگرام میں آشا پاریکھ، رمیش سپّی، سبھاش گھئی، اسمیتا ٹھاکرے (چیئرمین)، لیش چوپڑہ اور سورج آر برتیہ جیسی فلم انڈسٹری کی نامور ہستیوں نے حصہ لیا اور پائریسی (فلموں کی نقلی سی ڈی بنانا) کے برے اثرات پر اپنے خیالات پیش کیے۔ ان سب نے یہ بات تسلیم کی کہ ہندی فلموں کی نقلی سی ڈی بننے سے فلم انڈسٹری کو کافی خسارہ کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

آشا پاریکھ نے ہندی فلموں میں اپنے کیریئر کی شروعات ایک گلیمر لیکن اچھی لڑکی کے طور پر کی۔ اپنی بہترین اداکاری اور فیشن کی وجہ سے ۱۹۶۰ء کی دہائی میں بننے والی رنگین فلموں میں سادھنا اور سائرہ بانو کے ساتھ انہوں نے بھی اپنا نام صف اول کی اداکاراؤں میں درج کرا لیا۔ ان کی فلمیں بنیادی طور پر خوش کن اور درمیانی درجہ کی تفریح مہیا کرانے والی تھیں۔ آج ان کی فلموں کو بھلے ہی کلاسیکی کا درجہ نہ حاصل ہو پایا ہو لیکن یہ فلمیں اب بھی سنجیدگی اور شائستگی پسند عوام ایک خاص طبقے کو سامان تفریح پہنچاتی ہیں، علاوہ ازیں چاہے ان کا ہل اسٹیشن رومانس ہو (جیسے ناصر حسین کی ''پھر وہی دل لایا ہوں''، مکتا دت کی ''آن ملو سجنا'') یا پھر ان کے ڈرامائی رول (جیسے شکتی سامنت کی 'کٹی پتنگ''، راج کھوسلہ کی ''میں تلسی تیرے آنگن کی'')، ان تمام فلموں میں آشا پاریکھ نے گانوں کے ذریعہ سب کو مسحور کر دیا۔ زبان زد خاص وعام چند ایسے مشہور گانے ہیں جن میں آشا پاریکھ کے ساتھ جس کسی نے بھی اداکاری کی اس کی شخصیت میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا۔ او پی نیّر کے ''جایئے آپ کہاں جائیں گے'' سے لے کر مدن موہن کے گانے ''تیری آنکھوں کے سوا'' تک تقریباً تمام موسیقاروں نے اپنی چند عمدہ تخلیق کو آشا پاریکھ کے اوپر فلمایا۔

آشا پاریکھ نے اکثر 'نام بوائے' اسٹائل میں اداکاری کی۔ حقیقی زندگی میں بھی آشا پاریکھ اپنے

والدین کی دنیا کا مرکز تھیں۔ان کی پیدائش ممبئی کے سانتا کروز میں ایک مڈل کلاس فیملی میں ہوئی۔تعلیم کے لیے انہیں مشہور ومعروف جے بی پیٹٹ اسکول بھیجا گیا۔آشا کو ڈانس (رقص) سے بڑا لگاؤ تھا لہٰذا انہوں نے ہمیشہ ڈانس کی کلاس اٹینڈ کی چاہے وہ اپنے گھر میں ہوں یا پھر گھر سے باہر۔آشا کو اپنی زندگی میں آگے بڑھنے کا حوصلہ ہمیشہ ماں سے ملتا رہا۔

ایک مرتبہ جب آشا پاریکھ اسٹیج پر ڈانس کر رہی تھیں تو مشہور ڈائریکٹر بمل رائے نے انہیں اپنی فلم ''باپ بیٹی'' ۱۹۵۴ء میں بچی کا کردار ادا کرنے کا موقع دیا۔چائلڈ آرٹسٹ کے طور پر انہوں نے کچھ فلموں میں اداکاری کی جیسے 'دھوبی ڈاکٹر' اور 'ایودھیاپتی' (۱۹۵۷ء) میں۔''آشا'' نام کی فلم کے ایک گانے میں آشا پاریکھ نے نوعمری کے زمانے میں اپنی آئیڈیل وجینتی مالا کے ساتھ ڈانس بھی کیا۔

مشہور فلم ساز وجے بھٹ نے جب اپنی فلم 'گونج اٹھی شہنائی' میں آشا کو بطور ہیروئن پیش کیا تو ایسا لگا کہ آشا نے اپنے سنہرے فلمی کیریئر کا آغاز کر لیا ہے لیکن بہت جلدی ہی انہیں فلموں سے نکال دیا گیا کیونکہ وہ ایک 'اسٹار مٹیریل' نہیں تھیں۔مضمحل آشا پاریکھ اپنے ڈانس ٹروپ کے ساتھ بیرون ممالک کے سفر پر جانے ہی والی تھیں کہ ایک مہینے کے اندر ہی شادو مکھرجی نے انہیں اپنی فلم 'دل دے کے دیکھو' (۱۹۵۹ء) میں کام کرنے کا موقع دیا۔ناصر حسین کی موسیقی پر مشتمل نوجوانوں کے لیے بنائی گئی یہ فلم اتنی مشہور ہوئی کہ ۱۷ برس کی آشا پاریکھ راتوں رات ایک اسٹار بن گئیں۔ہیرو شمی کپور نے فلم انڈسٹری میں آنے والی اس نئی لڑکی کی اچھی ٹریننگ کی۔بعد میں اس جوڑی کو قبول عام حاصل ہوا۔شمی کپور ہمیشہ نئی لڑکیوں کے ساتھ کام کرنا پسند کرتے تھے جس کی وجہ سے ان دونوں نے اسکرین پر اس کے بعد تقریباً سات برسوں تک ساتھ میں مل کر کام نہیں کیا لیکن یہ خوبرو نوعمر لڑکی جس نے اپنے ٹرینڈی ٹراؤزر والے لباس سے فلموں میں ہندوستانی نوجوانوں کی عکاسی کی اور جس نے 'دل دے کے دیکھو' میں نہایت ہی خوبصورت گانے اور رقص کا مظاہرہ کیا تھا اس کے لیے کسی ساتھی اداکار کی کمی نہیں تھی۔اس نے بہت جلد 'جب پیار کسی سے ہوتا ہے' میں دیو آنند کے ساتھ، 'گھرانا' میں راجندر کمار کے ساتھ اور 'پھر وہی دل لایا ہوں' میں جوائے مکھرجی کے ساتھ کام کیا۔جب ایسا محسوس ہونے لگا کہ آشا کی قسمت میں تو صرف موسیقی پر مبنی فلموں میں ہلکی پھلکی اداکاری کرنا ہی لکھا ہے تو انہوں نے فلم 'ضدی' (۱۹۶۴ء) میں بہترین اداکاری کر کے لوگوں کی ان باتوں کو غلط ثابت کر دیا۔انہوں

نے 'نو۔نانسین نام بوائے' کا کردار ادا کیا جو کہ ہاتھی کے ایک خوبصورت بچے کی دوستی حاصل کرنے کے لیے اس کے ارد گرد گھومتا رہتا ہے۔انہوں نے اپنے جذباتی سین کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو متحیر کر دیا اور اس طرح انہوں نے بڑی مشکلوں کے ساتھ اپنی جوانی کے دور میں قدم رکھا۔

آشا پاریکھ کی جی توڑ محنت ۱۹۶۶ء میں اس وقت رنگ لائی اور ان کی صلاحیت پوری طرح ابھر کر سامنے آئی جب انہوں نے چار کامیاب فلمیں دیں۔وجے آنند کی پر تجسس میوزیکل فلم 'تیسری منزل' نے انہیں دوبارہ شمی کپور کے ساتھ لا کھڑا کیا، 'لو ان ٹوکیو' نے انہیں ڈانس کرنے اور جاپان میں فلم سازی کرنے کا موقع دیا، 'آئے دن بہار کے' نے ان کی دھرمیندر کے ساتھ کامیاب جوڑی کا آغاز کیا (جنہوں نے لگاتار پانچ کامیاب فلمیں دیں، کوئی بھی فلم فلاپ نہیں ہوئی) اور راج کھوسلہ کی فلم 'دو بدن' نے انہیں ٹریجڈی کا کردار ادا کرنے کا موقع فراہم کیا۔

شہرت کے آسمان پر اب آشا پاریکھ کو نئی راہوں کی تلاش تھی لیکن ناظرین انہیں فیشن سے بھرپور رول میں ہی پسند کرتے تھے جیسے 'اپکار' (۱۹۶۷ء)، 'شکار' (۱۹۶۸ء) اور 'آیا ساون جھوم کے' (۱۹۶۹ء)، 'بہاروں کے سپنے' (۱۹۶۷ء) یا 'چراغ' (۱۹۶۹ء) جیسی فلموں میں ان کے ڈی گلیمرائز ڈ رول کو ناظرین نے پسند نہیں کیا۔

آشا پاریکھ کو آخر کار ۱۹۷۰ء میں بننے والی فلم 'کٹی پتنگ' کے لیے بہترین اداکارہ کا انعام سونپا گیا۔ایک بیوہ کی شکل میں جس کی پانی کی طرح صاف وشفاف مسکراہٹ اپنے اندر دردناک راز کو چھپائے رکھتی تھی آشا پاریکھ نے کبھی بھی اقتصادی چکا چوند کا اثر قبول نہیں کیا اور بہادری کے ساتھ اپنی سفید ساڑی میں ملبوس کردار کو برقرار رکھا۔آشا کی اندرونی شخصیت کو پہچاننے والوں نے اس کا خوب فائدہ اٹھایا اور ان کے جذبات سے دغا کرنے والوں نے انہیں فلموں میں اس طرح پیش کیا کہ ناظرین کو بہ آسانی ان سے ہمدردی ہونے لگی

'کٹی پتنگ' کی کامیابی کے بعد ان کی ہٹ فلموں کا سلسلہ جاری رہا جیسے ۱۹۷۰ء کے اوائل میں 'آن ملو سجنا'، 'ناصر حسین کی 'کارواں' اور راج کھوسلہ کی فلم 'میرا گاؤں میرا دیش' لیکن اداکاراؤں کی نوجوان اور بولڈ نسل جیسے ممتاز اور شرمیلا ٹیگور نے بالی ووڈ پر اپنا قبضہ جما لیا۔آشا نے کام پر جانا چھوڑ دیا

اور بیرون ممالک ہونے والے اپنے ڈانس شو میں جانا دوبارہ شروع کر دیا۔ جب وہ ۱۹۷۳ء میں ملک واپس لوٹیں تو ان کے کیریئر کے شروع میں جو عروج انہیں ملا تھا وہ اب زوال پذیر ہو چکا تھا لہٰذا اب آشا پاریکھ نے اپنے مختلف کاموں پر توجہ دینی شروع کر دی، مثال کے طور پر ڈسٹری بیوشن کا کام، سانتا کروز اسپتال میں چیریٹی کا کام اور سمندر کے کنارے واقع اپنے بنگلہ کی دیکھ ریکھ جس کی جدید کاری نے کافی مقبولیت حاصل کی۔ آشا کا رقص سے جنون کی حد تک لگاؤ اب بھی قائم رہا اور 'چولا دیوی' نام کے ڈانس شو میں ان کے رقص نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔

۱۹۷۰ء کی دہائی میں شادی کے بہت سے پیغام آشا کے لیے آئے لیکن ان میں سے کوئی بھی کامیاب نہیں رہا۔ انہوں نے اپنی آزادی کو ہی ہمیشہ برقرار رکھا۔ انہوں نے راج کھوسلہ کی 'میں تلسی تیرے آنگن' (۱۹۷۸ء) یا جے پی دتہ کی 'ہتھیار' (۱۹۸۹ء) جیسی شاہکار فلموں میں بھی کام کیا جس نے ان کی تخلیقیت میں اضافہ کر دیا لیکن جب انہیں 'ماں بھابھی' جیسی فلموں میں کام ملنے لگے تو انہوں نے ۱۹۹۰ء کے شروع میں فلموں سے باقاعدہ کنارہ کشی اختیار کر لی۔

آشا پاریکھ نے سینسر بورڈ کی صدارت بھی سنبھالی۔ اپنی عمر کے پچاسویں سال کے آخری دنوں میں آشا نے بطور ڈائریکٹر قسمت آزمائی شروع کر دی۔ اپنے ٹی وی سیریل 'کورا کاغذ' کی کامیابی کے بعد انہوں نے دوسرے سیریل کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔

آشا پاریکھ کی یادگار فلمیں

سال	فلم	اداکارہ
۱۹۵۹ء	دل دے کے دیکھو	شمی کپور
۱۹۶۱ء	جب پیار کسی سے ہوتا ہے	دیو آنند
۱۹۶۴ء	ضدی	جوائے مکھر جی
۱۹۶۶ء	دو بدن	منوج کمار
۱۹۶۶ء	لو ان ٹوکیو	جوائے مکھر جی
۱۹۶۶ء	تیسری منزل	شمی کپور

۱۹۶۷ء	اُپکار	منوج کمار
۱۹۷۰ء	کٹی پتنگ	راجیش کھنہ
۱۹۷۱ء	کارواں	جیتندر
۱۹۷۸ء	میں تلسی تیرے آنگن کی	وجے آنند

آشا پاریکھ پر فلمائے گئے مشہور گانے

گانے	فلم	گلوکارہ/گلوکار
بڑے ہیں دل کے کالے	دل دے کے دیکھو	آشا بھونسلے
سو سال پہلے	جب پیار کسی سے ہوتا ہے	لتا منگیشکر/محمد رفیع
آنکھوں سے جو اتری ہے دل میں	پھر وہی دل لایا ہوں	آشا بھونسلے
جائیے آپ کہاں جائیں گے	میرے صنم	آشا بھونسلے
سایونارا سایونارا	لو ان ٹوکیو	لتا منگیشکر
آجا آجا	تیسری منزل	آشا بھونسلے/محمد رفیع
پردے میں رہنے دو	شکار	آشا بھونسلے
اچھا تو ہم چلتے ہیں	آن ملو سجنا	لتا منگیشکر/کشور کمار
نا کوئی امنگ ہے	کٹی پتنگ	لتا منگیشکر
میں تلسی تیرے آنگن کی	میں تلسی تیرے آنگن کی	لتا منگیشکر

بشکریہ۔ بزم سہارا۔ نوئیڈا

☆☆☆

معصوم چہرہ والی اداکارہ۔نلنی جیونت

شکیلہ یعقوب

معصوم چہرہ،غلافی آنکھیں،صراحی دار گردن،متناسب جسم والی اداکارہ نلنی جیونت ۱۹۵۰ء کی دہائی میں ایک زبردست اور ٹاپ اسٹار تسلیم کی جاتی تھی،نلنی جیونت نے تقریباً ۱۰ فلمیں اشوک کمار کے ساتھ کیں،اس زمانے میں اشوک کمار ٹاپ کے ہیرو تھے اور سبھی اداکارائیں بشمول نرگس،مینا کماری ،مدھو بالا،نلنی جیونت،صرف اشوک کمار کے مقابل لیڈ رول کرنا پسند کرتی تھیں،دلیپ کمار بھی نلنی جیونت کی معصومیت کے سامنے شکست کھا گئے اور ۱۹۵۳ء میں انہوں نے نلنی جیونت کے ساتھ فلم ''شکست'' میں کام کیا۔اس فلم میں کئی ایسے سین تھے جس میں دلیپ کمار جیسے شہنشاہ جذبات کو نلنی جیونت کے سامنے خاموش تماشائی کے طور پر دیکھا گیا۔خاص طور پر اس سین میں جب دلیپ کمار اُسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ اس سے اپنی محبت کا اقرار کرلے مگر نلنی جیونت جو اس فلم میں ایک بیوہ کا رول کر رہی تھی وہ کسی طرح بھی اپنی محبت کا اظہار نہ کرسکی اگرچہ وہ اسے دل ہی دل میں بیحد چاہتی تھی مگر زمانہ کسی نوجوان بیوہ کو دوسری شادی کی اجازت کیسے دے سکتا تھا اور اس کا احساس نلنی کو خوب تھا اور اسی لئے وہ کھل کر اپنی محبت کا اظہار نہیں کرسکتی تھی اور طیش کے عالم میں دلیپ اپنے ہاتھ کی فونٹین پین اسے کھینچ مارتے ہیں جو سیدھے جا کر اس کی پیشانی پر چھپ جاتی ہے اور خون کے قطرے اس کی مانگ میں سیندور بھرنے کا کام کرتے ہیں،اس فلم کی ہدایتکاری امیہ چکرورتی کی تھی جنہوں نے سیما (بلراج ساہن۔نوتن) دائرہ (ناصر خاں،منور سلطانہ) اپرادھی کون (ابھی بھٹاچاریہ۔مالاسنہا) جیسی شہرہ آفاق فلمیں بنائی تھیں۔

نلنی جیونت شوبھنا سمراٹ کی بہن تھی،شوبھنا سمراٹ کی دو بیٹیاں نوتن اور تنوجہ تھیں نوتن کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔نلنی جیونت اس وقت ۸۰ سال کی ہے اور اپنے کامیاب بزنس مین شوہر اور دو لڑکوں کے ساتھ سان فرانسسکو میں رہتی ہے ایک لڑکا کمپیوٹر انجینئر ہے اور دوسرا ڈاکٹر ہے،نلنی کے شوہر کا انتقال ابھی دو سال قبل ہوا ہے اور وہ اپنے لڑکوں سے کہہ رہی ہے کہ اسے ممبئی واپس جانے دے کیونکہ وہ اپنی زندگی کے آخری دن وہیں گزارنا

چاہتی ہے جہاں اس نے کئی سال گزارے،مگر دونوں لڑکے اسے ہندوستان واپس جانے دینا نہیں چاہتے۔نلنی جیونت کے خاندان کے کئی لوگ ابھی بھی ورلی ممبئی اور کھنڈالہ میں ہیں اور وہ انہی کے درمیان رہنا چاہتی ہے۔

نلنی جیونت کی اصل کامیابی ۱۹۴۰ء کی دہائی میں شروع ہوئی تھی اس نے ہدایتکار ویریندر ڈیسائی سے شادی کرلی اور شادی کے بعد صرف ۹ فلموں میں کام کیا جن فلموں کے ایڈوانس اس نے لئے تھے ان فلموں کی تکمیل کے بعد اس نے مزید فلمیں نہیں کیں۔

۱۹۴۰ء کی دہائی میں کمسن نلنی کو وہ شہرت حاصل نہیں ہوئی جو اسے ملنی چاہئے تھی۔ویریندر ڈیسائی جو کہ نلنی جیونت کے شوہر تھے انہوں نے اس زمانے میں دلیپ کمار اور نرگس کو لے کر فلم ''انوکھا پیار'' بنائی تھی جس کی ٹریجڈی نے سبھوں کو متاثر کیا تھا اگرچہ وہ فلم بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوئی تھی لیکن اس فلم کا ایک گیت ''یاد رکھنا چاند تاروں اس سہانی رات کو'' بیحد مقبول ہوا تھا۔۱۹۴۸ء کی ریلیز یہ فلم اپنے اس گیت کی وجہ سے بیحد مقبول عام ہوا تھا۔۱۹۴۱ء میں نلنی نے فلم رادھیکا میں کام کیا اور اسی سال محبوب خان کی فلم ''بہن'' میں اس نے شیخ مختار کی بہن کا رول ادا کیا تھا۔

۱۹۵۰ء میں ریلیز ''سمادھی'' جس میں نلنی نے اشوک کمار کے ساتھ کام کیا تھا،وہ بیحد کامیاب اور سپر ہٹ فلم ثابت ہوئی تھی۔اس فلم میں نلنی نے ایک مغرب زدہ ہیروئن کا کردار ادا کر کے سبھوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا کہ یہ کمسن من موہن صورت والی اس انداز میں کسی فیشن ایبل حسینہ کا رول بھی ادا کرسکتی ہے اس فلم میں نلنی پر فلمایا گیا ایک گیت ''او گورے گورے او بانکے چھورے'' سبھوں نے بیحد پسند کیا تھا،اگرچہ اس زمانے میں ماتاہری کا بیحد نام ہوا تھا جب اس نے ایک فلم میگزین میں مکمل نیوڈ پوز دے کر پورے ایوان حکومت کو متزلزل کر دیا تھا اور صرف اسی ایک پوز کی وجہ سے ماتاہری کی یادیں آج بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔فلم سمادھی میں نلنی نے اشوک کمار کے ساتھ چند گرم گرم سین بھی دیئے اور ہر سین میں بالکل ایسا ہی لگا کہ نلنی کوئی اداکاری نہیں کر رہی ہے بلکہ وہ صحیح معنوں میں اشوک کمار کی محبت میں مبتلا ہے۔فلم سمادھی ریلیز ہوئی اور سلور جبلی کی طرف گامزن ہوئی اسی دوران نلنی اور اشوک کی دوسری فلم ''سنگرام'' ریلیز ہوئی اور اس فلم نے بھی یکے بعد دیگرے سلور جبلی منائی۔اس فلم میں نلنی نے سوئمنگ ڈریس پہن کر اچھے اچھوں کے ہوش اڑا

دیئے تھے۔ آج کے بس اگر ہیروئن کی جسم پر کپڑے نظر آتے ہیں حیرت ہوتی ہے کہ کپڑے کیوں نظر آ رہے ہیں لیکن اس زمانے میں کسی ہیروئن کے لئے نیم عریان لباس پہننا خصوصاً سوئمنگ کاسٹیوم تو اس زمانے کے لئے بیحد معیوب بات سمجھی جاتی تھی۔ ۱۹۵۰ء کے دوران نلنی نے بیک وقت اشوک کمار، دلیپ کمار، راج کپور اور دیو آنند کے ساتھ کام کیا۔ اس زمانے میں یہی چار ہیرو سب سے بڑے مانے جاتے تھے جس کے بعد راج کمار، راجندر کمار، منوج کمار وغیرہ کا نام تھا۔ نلنی نے دلیپ کمار کے ساتھ صرف فلم شکست میں کام کیا اور کسی بھی دوسری فلم میں اس نے کام نہیں کیا۔

نلنی نے دیویندر گوئل کی فلم آنکھیں میں اشوک کمار کے ساتھ کام کر کے زبردست ہٹ فلم دی تھی۔ ۱۹۷۰ء میں رامانند ساگر نے بھی دھرمیندر اور مالا سنہا کو لے کر فلم آنکھیں بنائی تھیں۔ ۱۹۵۳ء میں نلنی جیونت نے یکے بعد دیگرے دو زبردست ہٹ فلمیں دیں۔ ایک فلم دیو آنند کے ساتھ ''راہی'' اور دوسری دلیپ کمار کے ساتھ ''شکست'' تھی۔ راہی خواجہ احمد عباس کی فلم تھی اس فلم میں نلنی چائے کے باغات میں کام کرنے والی مزدور لڑکی بنی تھی جو چائے باغات کے مالکان کے ہوس کا نشانہ بننے سے صاف انکار کر دیتی ہے۔ ۱۹۵۴ء میں نلنی نے فلم ''ناستک'' میں کام کیا یہ فلم سپر ہٹ ثابت ہوئی تھی۔ اس فلم میں پردیپ کا یہ گیت ''دیکھ میرے سنسار کی حالت کیا ہوگئی بھگوان کتنا بدل گیا انسان'' زبردست ہٹ ثابت ہوا تھا۔ اس فلم میں اجیت نے ہیرو کا رول نبھایا تھا۔ اس کے بعد نلنی نے ایک مزاحیہ فلم ''منیم جی'' (دیو آنند) ریلوے پلیٹ فارم (سنیل دت) ہم سب چور ہیں (شمی کپور) بمل رائے کی فلم باپ بیٹی، محبوب خان کی بہن اور ''آواز'' (۱۹۵۶ء) میں ظل ویلانی اور راجندر کمار کے ساتھ کام کیا۔

مندرجہ ذیل میں نلنی جیونت پر فلمائے گئے چند دلچسپ گیت ملاحظہ ہوں:

(۱) اوگورے گورے او بانکے چھورے (سمادھی۔لتا منگیشکر) (۲) ٹھنڈی ہوائیں لہرا کے گائیں (نوجوان۔لتا منگیشکر) (۳) اری میں تو پریم دیوانی (نوبہار۔لتا منگیشکر) (۴) جب جب پھول کھلے (شکست۔لتا منگیشکر۔طلعت محمود) (۵) کانہا بجائے بانسوری (ناستک۔لتا منگیشکر) (۶) چاند مدھم آسماں چپ ہے (ریلوے پلیٹ فارم۔لتا منگیشکر) (۷) جیون کے سفر میں راہی (منیم جی۔لتا منگیشکر) (۸) بے ایمان بالما مان بھی جا (ہم سب چور ہیں۔لتا منگیشکر) (۹) دن ہو یا رات (مس بمبئی۔لتا

منگیشکر۔مکیش) (۱۰) نجر لاگی راجہ تورے بنگلے پر (کالا پانی۔آشا بھونسلے)

نلنی جیونت نے تقریباً ۲۰ برسوں تک ہیروئن کا کردار نبھایا پھر چند فلموں میں اچھے رول کئے پھر ریٹائرمنٹ لے لیا۔ لیکن ریٹائرمنٹ کے ۲۰ سال بعد اس نے فلم ''ناستک'' میں امیتابھ بچن کی اندھی ماں کا رول کرنا منظور کیا۔ وہ فلم ناکام رہی اور ہدایتکار نلنی سے بہتر کام بھی نہ لے سکے جس کے بعد نلنی نے دوسری مرتبہ فلمی دنیا کو تیاگ دیا۔

فلم کالا پانی میں نلنی نے ایک بائی جی کا رول ادا کیا اور نجر لاگی راجہ اور ہم بیخودی میں تم کو پکارے چلے گئے گیت لوگوں کو بیحد پسند آئے تھے۔ نلنی کا رول اس فلم میں اس قدر اہم تھا کہ فلم کی اصل ہیروئن مدھوبالا اس فلم میں ایکسٹرا اداکار معلوم ہونے لگی تھی۔ فلم کی کہانی یہ ہے کہ ایک شخص ایک قتل کے جھوٹے الزام میں پکڑا جاتا ہے اور اسے کالے پانی میں عمر قید کی سزا ہو جاتی ہے۔ صرف ایک بائی جی کو معلوم تھا کہ وہ شخص بیگناہ ہے اور اصل قاتل (کشور ساہو) کے قتل کا اعتراف نامہ نلنی جیونت کے پاس ہے جس کے ذریعہ وہ اس سیٹھ کو بلیک میل کرتی رہتی ہے۔ ۱۵ سال بعد ایک نوجوان اس بائی جی کی زندگی میں آتا ہے جو اس سے محبت کی پیشکش بڑھا کر اس سے وہ خط حاصل کرنا چاہتا ہے اور آخر میں انکشاف ہوتا ہے کہ یہ نوجوان اسی بدنصیب شخص کا بیٹا ہے جو جھوٹے قتل کے الزام میں پھنس جاتا ہے اس فلم میں نلنی جیونت کا کردار، اس کی اداکاری لاجواب ہے۔ دیو آنند جیسے منجھے ہوئے اداکار بھی اس کے سامنے ناکام نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

دورِ حاضر کی منفرد اداکارہ۔ ہیما مالنی

ابرار احمد

ہیما مالنی کا تعلق جنوبی ہند سے ہے اور اس کی کھوج سب سے پہلے راج کپور نے کی اپنی فلم ''سپنوں کا سوداگر'' میں اُسے ہیروئن کے طور پر لیا یہ فلم ۱۹۶۹ء میں کلکتہ کے پراڈائز سنیما میں ریلیز ہوئی تھی۔ لوگوں کو بڑا تعجب ہوا تھا کہ ۴۸ سالہ راجکپور نے کیا سوچ کر ۱۷ سالہ ہیما مالنی کو اپنی ہیروئن بنایا۔ لوگوں کے درمیان اس بے ہنگم جوڑی کی فروگذاشت ہر جگہ سنی گئی، کافی ہاؤس ہو یا یونیورسٹی، دفتر ہو یا ٹرک ڈرائیور ہر ایک کی زبان پر اس بے ہنگم جوڑی کا ذکر تھا اور لوگ اس فلم کو خاص طور پر دیکھنے کے لئے گئے کہ فلم کے کس سین میں راج کپور، ہیما مالنی کو ننگا کرتے ہیں۔ کیونکہ راج کپور اپنی تمام ہیروئن چاہے وہ وجنتی مالا ہو، پدمنی ہو، سمی اگروال ہو، ڈمپل کپاڈیہ ہو، منداکنی ہو، نرگس ہو، راجشری ہو یا کوئی اور اُسے اپنی فلم کے کسی نہ کسی سین میں سوئمنگ ڈریس کے ذریعہ سے یا بکنی پہنا کر اس کے جسم کی نمائش ضرور کرتے ہیں، مگر قابل تعریف ہے ہیما مالنی جس نے ثریا، وحیدہ رحمٰن، مدھو بالا، مینا کماری کے انداز کو اپنایا اور کسی بھی فلم میں اپنے جسم کی نمائش نہیں کی۔ فلم وارث میں جتندر کے ساتھ اس نے ایک سین میں سوئمنگ ڈریس ضرور پہنا تھا مگر پورے گانے کے سین میں وہ زیادہ پانی کے اندر ہی رہی اور لوگ اس کے ننگے جسم کا معائنہ کرنے سے قاصر رہے۔ بہرکیف اس فلم نے زبردست بزنس کیا اور ہیما مالنی اس فلم کے ریلیز کے ساتھ ساتھ سپر اسٹار بن گئی، اس میں کوئی شک نہیں کہ راج کپور نے کئی سین میں اس کے ساتھ لپٹنے جھپٹنے کی بہت ساری کوشش کر ڈالی مگر جنوبی ہند کی یہ اداکارہ انتہائی چالاک تھی اور اس نے راج کپور کو بہت زیادہ آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا اور نہ ہی کسی سین کے لئے ہدایتکار کی ضد مانا۔ فلم سپنوں کا سوداگر کے بعد ہیما مالنی نے پھر پلٹ کر پیچھے نہی دیکھا۔ اس نے منوج کمار، دلیپ کمار، دھرمیندر، دیو آنند، سلمان خان، جتندر، سنجیو کمار، سنیل دت، فیروز خان، انیل کپور، رشی کپور، شمی کپور، ششی کپور، امیتابھ بچن، راجیش کھنہ اور جیکی شروف سمیت سبھی ٹاپ کے اداکاروں کے ساتھ کام کیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ہیما مالنی نے اپنے قدم ہندی فلموں میں مضبوطی سے جما نہ لئے ہوتے تو شاید وجنتی مالا جو کہ خود بھی ساؤتھ کی تھی مزید چند برسوں تک اور چلتی مگر ہیما مالنی کے آنے کے بعد وحیدہ رحمٰن، نندہ،

سادھنا، ببیتا، آشا پاریکھ جیسی ہیروئنوں کو آہستہ آہستہ ریٹائرمنٹ کی طرف رخ کر لینا پڑا۔

ہیما مالنی کے دیوانوں میں جتندر اور سنجیو کمار کے خاص نام آتے ہیں مگر پہلے سے شادی شدہ دھرمیندر جس نے ہیما مالنی کے ساتھ تقریباً ۱۵ فلموں میں ہیرو کا رول ادا کیا اور سبھی فلمیں سپر ہٹ ثابت ہوئیں، وہ ہیما کو اپنی جاگیر سمجھنے لگا تھا اور ایک ہندو شادی شدہ ہونے کے باوجود نوجوان بیٹوں کے سامنے اس نے ہیما مالنی سے دوسری شادی رچالی جس سے اس کی دو بیٹیاں پیدا ہوئیں جس میں ایشا دیول فلم ہیروئن بھی بنی۔

ہیما مالنی نے منوج کمار کے ساتھ دس نمبری اور کرانتی میں کام کیا اور یہ دونوں فلمیں سپر ہٹ ثابت ہوئیں۔ دیو آنند کے ساتھ جانی میرا نام پورے ملک میں گولڈن جبلی ہوئی۔ اس کے بعد جان من، چھپے رستم، جوشیلا وغیرہ میں کام کیا اور یہ فلمیں بھی اوسط درجہ کی رہیں، فلاپ نہیں ہوئیں۔ دھرمیندر کے ساتھ شرافت، آزاد، جگنو، ڈریم گرل، دل کا ہیرا، شعلے، رام بلرام، رضیہ سلطان، دل لگی، بغاوت، علی بابا چالیس چور، اور یہ سبھی فلم باکس آفس کا ریکارڈ توڑتی رہیں۔ شعلے فلم میں بسنتی کے رول میں لوگوں نے ہیما مالنی کو بیحد پسند کیا۔

امیتابھ بچن کے ساتھ کسوٹی، ستے پہ ستہ، شعلے، نصیب اور باغبان میں کام کیا۔ باغبان کو اگر موجودہ دہے کی سب سے بہترین سماجی فلم کہا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ اس فلم میں ہیما مالنی اور امیتابھ نے اس قدر خوبصورت اداکاری کی کہ اس فلم کو بار بار دیکھنے کے باوجود مزید ایک بار دیکھنے کا دل کرتا ہے۔ ایسی خوبصورت فلم برسوں کے بعد بنتی ہے۔ گزشتہ چند دہائیوں کے دوران پاکیزہ، ودھاتا، شکتی، گرم ہوا، آکروش، آنکور کے بعد اگر کسی فلم نے بہت زیادہ متاثر کیا تو وہ صحیح معنوں میں باغبان ہی ہے۔

ہیما مالنی کے سنہرے کیریئر کی ایک سنہری فلم ''دھرماتما'' بھی کہی جاسکتی ہے جس میں اس نے ایک افغانی لڑکی کا رول کیا تھا اور افغانی حسینہ ریشما کے رول میں ہیما مالنی کی بے پناہ خوبصورتی کو کیمرہ مین فالی مستری نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لایا تھا۔ فلم کے ہیرو، ہدایتکار و فلمساز، فیروز خان نے اپنی اس فلم کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی ساری طاقت جھونک دی تھی، ہالی ووڈ کی مشہور فلم ''گاڈ فادر'' جسے ماریاپوزو نے بنایا تھا اور کہانی، اسکرین پلے و ڈائیلاگ بھی اسی کے تحریر کردہ تھے، فلم میں گاڈ فادر کا رول مشہور بزنس ایکٹر مارلن برانڈو نے ادا کیا تھا اور دھرماتما میں وہی رول پریم ناتھ نے ادا کیا تھا اور اس میں کوئی دورائے نہیں کہ اس رول کو صرف اور صرف پریم ناتھ ہی جیسے منجھے ہوئے اداکار ہی نبھا سکتے تھے، اس فلم میں جب سدھیر اور امتیاز خان، فیروز خان کو قتل کرنے کے لئے اس کی جیپ میں ڈائنامائیٹ ٹائم بم فٹ کرتے ہیں لیکن موت

کا شکار ہیما مالنی بنتی ہے اور فلم کا انٹرویل بھی اسی سین کے ساتھ ہوتا ہے تو بیشتر فلم بین اسی سین کے بعد سنیما ہال سے نکل جاتے ہیں کیونکہ ہیما مالنی کی موت کے بعد فلم کا دوسرا حصّہ بالکل پھیکا پھیکا سا لگتا ہے۔ اگر چہ انٹرویل کے بعد آخر تک سکنڈ ہیروئن کے طور پر ریکھا جیسی نامور حسین اور پر شباب لڑکی تھی لیکن اس فلم میں وہ ہیما مالنی کے مقابلے میں بالکل نہیں جچی بلکہ اس کی شکل دیکھ کر لوگوں کو ابکائیاں سی آنے لگیں۔ فلم کے پہلے حصّے میں ہیما مالنی کے حسن نے لوگوں کو مسحور کر کے رکھ دیا تھا اسی بناء پر فلم کے دوسرے حصّے میں لوگوں نے ریکھا کو دیکھنا تک گوارا نہیں کیا جبکہ اداکاری کے اعتبار سے ریکھا، ہیما مالنی کے مقابلے میں بدرجہا بہتر رہی امراؤ جان، قسمت، کہانی قسمت کی اور مقدر کا سکندر اس بات کے ثبوت ہیں۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ آج کی نئی نسل جو فلموں کی شوقین ہے ان کے انگنت خطوط موصول ہوئے جس میں وہ صرف کرینہ کپور، نہا دھوپیہ، لارا دتّہ، بپاشا باسو، کٹرینہ کیف اور سیف علی خان، اکشے کمار، اکشے کھنہ، گووندہ، سلمان خان، عامر خان اور شاہ رخ خان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے، ان کے موبائیل فون نمبر، گھر کا پتہ، ان کا ای میل ایڈریس اور ان کے معاشقے وغیرہ کے بارے میں جاننے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں، تصویریں نیم عریاں ہو تو سونے پر سہاگہ، اس نئی نسل کو پرانی یادوں کو کریدنے میں کوئی دلچسپی نہیں، وہ دلیپ کمار، سچترا، وجنتی کے دیوداس کے مقابلے میں شاہ رخ خان اور مادھوری کے دیوداس میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ ان کا یہ کہنا کہ شاہ رخ خان نے دلیپ کمار سے بدرجہا بہتر اداکاری کی۔ موتی لال کے مقابلے میں جیکی شروف کی اداکاری کی زیادہ تعریف کرتے ہیں، اب یہ ان کی سوچ اور نئے زمانے کی چمک دمک کا نتیجہ ہے کہ انھیں ان شہ پاروں میں کوئی بھی ندرت نظر نہیں آتی۔ اب بھلا پرتھوی راج، سہراب مودی، کامنی کوشل، ثریا، دلیپ کمار، مینا کماری، نرگس اور وحیدہ رحمان کے مقابلے میں ان نئے ہیروئن کی کیا اہمیت ہے جو سال دو سال کے اندر ہی غروب ہو جاتی ہیں۔ البتہ نئے اداکاروں میں نصیرالدین شاہ، شاہ رخ خان، اوم پوری، کے ساتھ ساتھ سدا بہار امیتابھ بچن ہی ایسے ہیں جنہیں اہمیت دی جاسکتی ہے اب اگر کوئی ہیما مالنی کو بڑی اداکارہ بھلے ہی تسلیم نہ کرے لیکن اس کی خوبصورتی، سادگی اور ۹۰ فیصد کامیاب فلمیں دینے والی ہیما مالنی کو ہر دور میں یاد رکھا جائے گا۔

فلمی دنیا کی ڈریم گرل اداکارہ اپنی عمر کے ۵۸ سال میں بھی مصروف ہے وہ فی الحال آدھا درجن فلمیں کر رہی ہیں جوان کی نوجوان اداکارہ بیٹی ایشا دیول کی مصروفیات سے کہیں زیادہ ہے جنوبی ہند سے تعلق رکھنے

والی اداکارہ ہیما مالنی کا تعلق مدراس سے ہے اور ۱۹۶۴ء میں ہیما مالنی نے پہلی بار ڈائرکٹر سریدھر کی تمل فلم سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا لیکن بدقسمتی سے سریدھر ہیما مالنی کی صلاحیتوں کو ابھارنے میں ناکام رہے۔ اور ۱۹۶۸ء میں ڈائرکٹر مہیش کول کی نظر ان پر پڑی جوان دنوں راج کپور کے ساتھ سپنوں کا سوداگر بنا رہے تھے جنہیں وجنتی مالا کی متبادل اداکارہ کی ضرورت تھی یہ بریک ہیما مالنی کو مل گیا یہ فلم گولڈن جوبلی ثابت ہوئی اس کے بعد ہیما مالنی کی لیکھ ٹنڈن کی ششی کپور کے ساتھ ۶۹ء میں جہاں پیار ملے، ڈائرکٹر منا کی جیتندر کے ساتھ ۶۹ ہی میں وارث، آئیں لیکن ۱۹۷۰ء ان کے لئے لکی ثابت ہوا کیونکہ اس سال ان کی ریلیز ہوئی پانچ فلموں ڈائرکٹر پی مادھوان کی اجئے ساہنی کے ساتھ ''آنسو اور مسکان'' سبودھ مکرجی کی ششی کپور کے ساتھ ''ابھینتری'' وجئے آنند کی دیو آنند کے ساتھ ''جانی میرا نام'' اسیت سین کی دھرمیندر کے ساتھ شرافت اور بی سونی کی دھرمیندر ہی کے ساتھ تم حسین میں جواں نے خوب دھوم مچائی۔ اس کے بعد تو ہیما مالنی کے دور کا ہی آغا ہو گیا تھا سن ۷۱ میں ''انداز، لال پتھر، نیا زمانہ، پرایا دھن، تیرے میرے سپنے'' ۱۹۷۲ء میں بابل کی گلیاں، بھائی ہو تو ایسا، گورا اور کالا، راجہ جانی، سیتا اور گیتا، ۱۹۷۳ء میں چھپا رستم، گہری چال، جوشیلا، جگنو، شریف بدمعاش، ۱۹۷۴ء میں امیر غریب، دوست، دلہن، ہاتھ کی صفائی، کسوٹی، کنوارا باپ، پتھر اور پائل، پریم نگر، ۱۹۷۵ء میں دھرماتما، دو ٹھگ، کہتے ہیں مجھ کو راجہ، خوشبو، پرتگیا، سنیاسی، شعلے، سنہرا سنسا، ۱۹۷۶ء میں آپ بیتی، چرس دس نمبری، جان من، محبوبہ، ناچ اٹھا سنسار، شرافت چھوڑ دی میں نے، جنی اور جانی، ماں ۱۹۷۷ء میں کنارہ، ڈریم گرل، دھوپ چھاؤں، چاچا بھتیجہ، چلا مراری ہیرو بننے، پلکوں کی چھاؤں میں، شری ڈی کے سائی بابا، سوامی، ٹنکو، ۱۹۷۸ء میں دل لگی، اپنا خون، آزاد، تک ہیما مالنی کا خوب عروج رہا اس کے بعد ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۰ء تک کے دور میں ہیما مالنی کی فلموں کے علاوہ ان کے اور دھرمیندر کے رومانس کی خبریں چھپنے لگیں۔ ۱۹۸۰ء میں ہی دھرمیندر اور ہیما مالنی نے شادی بھی کر لی۔ دھرم ہیما کا یہ رومانس کافی پرانا تھا ان دونوں نے ایک ساتھ ''تم حسین میں جواں، شرافت، نیا زمانہ، راجہ جانی، سیتا اور گیتا، جگنو، پتھر اور پائل، دوست، پرتگیا، شعلے، کہتے ہیں مجھ کو راجہ، چرماس، ماں، چاچا بھتیجہ، ڈریم گرل، آزاد، دل لگی، سنیما سنیما، دل کا ہیرا، دی برننگ ٹرین، علی بابا چالیس چور، آس پاس، کرودھی، راجپوت، مہربانی، بغاوت، دو وشائیں، سمراٹ، رضیہ سلطان، راج تلک، جان ہتھیلی پہ، آتنگ کے علاوہ، کنوارا باپ، بارود، کنارا، سوامی، کھیل کھلاڑی کا،'' جیسی فلموں میں بطور مہمان اداکارہ بھی ایک ساتھ کام کیا تھا۔ بہرحال ہیما اور

دھرم کی اس فلمی جوڑی کواس بات کا اعزاز بھی حاصل رہا کہ ان دوفنکاروں نے ایک ساتھ ۳۸ فلموں میں ساتھ ساتھ کام کیا تھا بہرحال شادی کے بعد ہیما مالنی نے پھر ایک بار ۱۹۸۵ء سے سنجیدگی سے فلموں میں کام کرنا شروع کیا اور ۸۵ میں فلم بابو سے پھر ایک بار پردے پر آئیں اس کے بعد اسی سال آندھی طوفان ،درگا،ہم دونوں، پھانسی کے بعد،رام کلی، یدھ انجام،ایک چادر میلی سی، رام تیرا دیش، ۱۹۸۷ء اپنے اپنے، حراست، جان ہتھیلی پے، قدرت کا قانون، سیتا پور کی گیتا،۱۹۸۸ء میں محبت کے دشمن ،ملزم تحفہ محبت کا، وجئے'' ۱۹۸۹ء میں دیش کے دشمن، پاپ کا انت،سنتوش، سچے کا بول بالا، ۱۹۹۰ء میں رہائی، جمائی راجہ،۱۹۹۱ء میں دیش واسی،لیکن ہائے میری جان،۱۹۹۲ء میں اندرا،۱۹۹۳ء گلیوں کا بادشاہ،۱۹۹۴ء ٹکراؤ، ۱۹۹۵ء سوامی وویکانند،۱۹۹۶ء میں آتنک ماہر،۱۹۹۷ء میں ہمالیہ پتر،۲۰۰۰ء میں ہے رام،۲۰۰۱ء سینئر،۲۰۰۳ء باغبان،۲۰۰۴ء میں ویرزارا،۲۰۰۵ء بھاگمتی اور ۲۰۰۶ء میں ''بابل'' کے بعد ہیما مالنی کی مقبولیت میں آج بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے وہ آج بھی مسلسل مصروف ہیں اور ۱۹۹۲ء میں اپنی ہدایت میں بنی شاہ رخ خان کے ساتھ دل آشنا ہے کے بعد وہ ایک بار نئے سال میں اپنی بیٹی ایشا دیول کو لے کر ایک فلم ڈائرکٹ کرنے جارہی ہیں اوراس فلم کے علاوہ وہ بطور اداکارہ کئی فلمیں بھی سائن کررہی ہیں کیونکہ فلمسازوں کا خیال ہے کہ اپنے وقت کے ہیروز کے کیریکٹر کرداروں میں جوڑی بنانے کے لئے ہیما مالنی سے بہتر آج کوئی دوسری اداکارہ نہیں ہے۔ان کا خیال ہے کہ جس طرح ماضی میں ۲۰ سال تک بحیثیت ہیروئن فلمی پردے پر حکومت کرتی رہی ہیں اسی طرح آنے والے دس پندرہ سالوں تک وہ کیریکٹر کرداروں میں اپنے اس وقت کے ساتھی اداکاروں کے ساتھ جوڑی بناتی رہینگی وہ جس طرح اس وقت بے شمار نوجوانوں کے خوابوں کی ملکہ تھی آج بھی اپنی عمر کے شائقین کی پسندیدہ ہیروئن ہے ۔ہیما مالنی کے سامنے کئی اداکارائیں آئیں اور چلی گئیں لیکن ہیما مالنی کی پوزیشن اپنی جگہ آج بھی اٹل ہے۔شادی شدہ اوردو جوان لڑکیوں کی ماں ہونے کے باوجود وہ آج بھی اسی طرح چست دکھائی دیتی ہیں۔فلم انڈسٹری میں بھی ہیما مالنی کوعزت کی نگاہ سے ہی دیکھا جاتا ہے۔

☆☆☆

شہرۂ آفاق اداکارہ۔نادرہ

جیلانی خان

۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائی میں بالی ووڈ پر راج کرنے والی اداکارہ نادرہ نے طویل علالت کے بعد ۹ فروری کو ہتھیار ڈال ہی دیا۔کافی دنوں سے بستر مرگ پر پڑی نادرہ نے ممبئی کے بھالیہ اسپتال کی انتہائی نگہداشت یونٹ (آئی سی یو) میں آخری سانسیں لیں۔

فلم 'شری ۴۲۰' میں مایوسیوں میں ڈوبے راج کپور کو زندگی، تنہائی اور پیار ومحبت کا فلسفہ سمجھانے والی نادرہ نے خود جب آخری سانس لی تو ان کے پاس ان کا اپنا کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔ ساتھ اگر کوئی تھا تو وہ ان کی تنہائی۔

ویسے تو نادرہ کی موت ۹ رفروری کو ہوئی لیکن درحقیقت یہ محض جسمانی موت تھی۔ان کی زندگی تو برسوں پہلے تبھی مرگئی تھی۔جب بالی ووڈ نے انہیں گمنامی کے اندھیروں میں تن تنہا بھٹکنے اور مایوسیوں کے ساگر میں غوطہ لگانے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ برسوں بالی ووڈ کی شہرۂ آفاق شخصیت مانی جانے والی نادرہ کے ساتھ بھی فلم صنعت اوراس کے ستاروں نے وہی سلوک کیا جو پروین بابی اور ثریا کے ساتھ کیا تھا۔یہاں کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ ان کا حال دریافت کرے۔ پروین اور ثریا نے بھی تنہائی اور گمنامی کے اندھیروں میں گھٹ گھٹ کر دم توڑا تھا۔نادرہ کے ساتھ بھی کچھ ویسا ہی ہوا۔بے حس بالی ووڈ اپنی کھوکھلی چمک دمک میں مست رہا اوراسی کا برسوں حصہ رہی یہ اداکارہ زندگی کے آخری مراحل میں مایوسیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے اپنے ارمانوں کو سینے میں دبائے تنہا روتی اور بلکتی رہیں۔مہیش بھٹ ،گلزار، کمل ہاسن اور دپتی نول جیسی چند ہستیاں ہی نادرہ کی آخری رسومات میں پہنچیں۔المیہ تو یہ ہے کہ ان کے سگے بھائی جو اسرائیل اورامریکہ میں مقیم ہیں وہ بھی نہیں آئے۔

شوخ وچنچل طبیعت کی ملکہ نادرہ نے زندگی کے خوبصورت پل تو اپنی شرطوں پر بتائے لیکن آخری پل بہت تکلیف دہ رہا۔بالی ووڈ کے ذریعہ برسوں قبل فراموش کردی گئی نادرہ کے پاس آمدنی کا ذریعہ کچھ اور نہیں تھا،اس لیے جیسے جیسے کام ملنا بند ہوتا گیا آمدنی گھٹتی چلی گئی اورنوبت فاقہ کشی تک جا پہنچی۔ جب کامیابی کی بلندی پر تھیں تو انسانوں سے کم شراب سے زیادہ دوستی کی اور یہ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ مزید شدت اختیار

کرتی گئی۔ دوست احباب نے بھی بے رخی اختیار کرنا شروع کر دیا اور فلمی دنیا کی چمک دمک سے جیسے دوریاں بڑھتی گئیں شراب کی چاہت بڑھتی گی کیونکہ تنہائی اور گمنامی نے انہیں جن مایوسیوں کی گرفت میں ڈال دیا تھا وہاں ان کا کوئی غمگسار بھی تو نہیں تھا۔ لیکن اسی شراب کی دوستی نے ان سے بہت بڑی قیمت وصول کی اور ان کے جسم کو تپ دق سمیت کئی بیماریوں کا گھر بنا دیا۔

بھالیہ اسپتال میں بھی جب نادرہ بستر مرگ پر تھیں تو ان کے پرسان حال کے لیے وہاں پہنچے بالی ووڈ والوں میں صرف دلیپ کمار، ان کی اہلیہ سائرہ بانو اور اداکارہ دپتی نول تھیں۔ دپتی تو ان سے بے حد قریب تھیں اور تو اور بالی ووڈ کے ستاروں کو نجی زندگی کو نیشنل نیوز بنا دینے والے اور اسٹاروں کی معمولی بیماری کو جان لیوا کی شکل دے دینے والے میڈیا کو بھی نادرہ میں کوئی نیوز آئٹم دکھائی نہیں دیا اس لیے اس نے بھی اس کی جانب دیکھنا گوارہ نہیں کیا۔

۵/دسمبر ۱۹۳۲ء کو اسرائیل کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئی نادرہ کا اصلی نام فلورنس ازاکیل تھا انہیں لوگ فرحت بھی پکارتے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں فلم ''آن'' سے فلمی کیریئر کا آغاز کرنے والی فلورنس اسی فلم سے نادرہ بنیں۔ ہدایت کار و فلم ساز محبوب خان کا بخشا ہوا یہ نام ان کے ساتھ ایسا جڑا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہی نادرہ بن گئیں۔ اس فلم میں دلیپ کمار کی ہیروئن بنی نادرہ جس نے مغرور راج کماری کا کردار اس حسن وخوبی سے ادا کیا کہ راتوں رات وہ اسٹار بن گئیں۔

پھر آئی 'شری ۴۲۰'۔ اس فلم کا گانا 'مڑ مڑ کے نہ دیکھ مڑ مڑ کے''۔ پر تھرکتی تیز طرار، چنچل، شوخ، مغرور مایا کے کردار نے نادرہ کی اداکاری کو شہرہ آفاق پر پہنچا دیا۔ اس کامیابی نے جہاں ان پر ''ویمپ'' کا لیبل چسپاں کر دیا تو وہیں شاید کچھ غرور بھی آ گیا۔ انہوں نے شادی نہیں کی اس لیے آخری لمحہ میں کوئی ان کے ارد گرد نہیں تھا جس سے دکھ درد بانٹ سکتیں۔ ۶۳ فلموں میں اپنی اداکاری کا جلوہ دکھانے والی نادرہ کے بے حد کامیاب فلمی سفر کا اختتام ۲۰۰۰ء میں شاہ رخ۔ ایشوریہ کی فلم 'جوش' سے ہوتا ہے۔ ان کی دیگر مقبول فلموں میں 'دل اپنا'، پریت پرائی، پاکیزہ، لاوارث، امرا کبر انتھونی، جولی، ایک بار چلو اور تمنّا' قابل ذکر ہیں۔

نادرہ نے ویسے تو ہر کردار کو بخوبی پردے پر اتارا لیکن ۱۹۷۵ء میں ریلیز ہوئی 'جولی' میں پھٹے کپڑوں میں اپنی غربت اور خاندان کی عزت وآبرو کو بچانے کے لیے جدوجہد کرتی ہوئی ایک بے بس لاچار اور غریب ماں کا کردار نبھا کر انہوں نے اپنی اداکاری کے ایک اور پہلو سے فلم سازوں وہدایت کاروں کے روبرو کر دیا۔

ان کی اس دمدار اداکاری کے لیے انہیں بیسٹ سپورٹنگ ایکٹریس کا فلم فیئر ایوارڈ بھی ملا۔

ویسے نادرہ نے چھوٹے پردے پر بھی اپنی اداکاری کا لوہا منوایا۔ ۱۹۹۳ء میں ڈی ڈی پر دکھائے جانے والے سیریل 'تھوڑا سا آسمان' میں ایک گھریلو ضعیفہ کے کردار سے وہ نہ صرف ہر گھر میں پہنچ گئیں بلکہ ہر کسی کی من پسند بھی بن گئیں۔ اسی طرح 'مارگریٹہ' سیریل میں بھی انہوں نے خوب داد حاصل کی۔ بقول دپتی 'نادرہ آپا کو ویسے تو بالی ووڈ سے کئی شکایتیں تھیں لیکن سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ کسی نے انہیں وہ رول نہیں دیا جس کے لیے وہ یاد کی جائیں۔

دراصل فلمی دنیا میں نادرہ کی ایک منفرد شناخت تھیں۔ 'ویمپ' کے کردار کو فلم کا اہم حصہ بنانے کا کریڈیٹ نادرہ کو ہی جاتا ہے۔ نادرہ کا ذکر آتے ہی نظروں کے سامنے اس خاتون کا چہرہ آتا ہے جس کے چہرے پر دمک غرور اور حسن پورے جسم سے ٹپک رہا ہو۔ بڑی بڑی آنکھیں ہوں، اینگلو انڈین چہرہ ہو، خوبصورت اور قیمتی کپڑے اور زیورات حسن کو دوبالا کر رہے ہوں، انگلیوں میں کبھی سگریٹ، کبھی ہونٹوں سے دلفریب انداز میں ہیرو کے ارد گرد دھوئیں کے کش لیتی ہوئی قاتل اداؤں والی خاتون اسے ورغلا رہی ہو، حقیقی زندگی میں بھی وہ بے حد بے باک اور صاف تھیں۔ شراب، کتاب اور زیورات ان کی کمزوری تھیں۔

لیکن شاید ان کی انکساری ہے کیونکہ درحقیقت نادرہ کے ذکر کے بغیر نہ تو 'آن' مکمل ہے نہ ہی 'شری ۴۲۰'۔ 'پاکیزہ' ہو یا 'جولی' نادرہ نے جن فلموں میں کام کیا، ان میں سے بیشتر میں وہ کہانی کا اہم حصہ تھیں، اس لیے جب بھی ان فلموں کا ذکر ہوگا نادرہ کا بھی ذکر ہوگا۔

خیر نادرہ تو چلی گئیں لیکن ان کی زندگی اور موت نے ایک مرتبہ پھر بالی ووڈ کے کھوکھلے پن کو اجاگر کر دیا ہے اور ایسی کڑوی سچائی پر سے پھر پردہ ہٹا دیا ہے کہ چکا چوند سے بھری یہ جگہ دراصل بہت تاریک ہے۔ یہاں کے لوگ انسانیت، اخلاق، دوستی اور پیار ومحبت کا پیغام فلموں میں بھلے ہی دیتے ہوں اصل زندگی میں اس کے بالکل برعکس ہیں۔ وہ کھلتی کلیوں اور طلوع ہوتے آفتاب کی تو پرستش کرتے ہیں لیکن مرجھائے ہوئے پھول اور غروب ہوتے ہوئے سورج کے لیے یہاں کسی کے پاس فرصت نہیں۔

☆☆☆

ہندی فلموں کی حسین وجمیل اداکارہ۔ بینا رائے

ڈاکٹر شاہد محمود

۶ر دسمبر ۲۰۰۹ء کو ہندی فلموں کی مشہور ومعروف بلکہ بیحد حسین وجمیل اداکارہ بینا رائے کا ۷۳ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا، وہ کچھ دنوں سے علیل تھیں اور انہیں ممبئی کے ایک پرائیوٹ نرسنگ ہوم میں داخل کیا گیا تھا، انہیں سانس لینے میں تکلیف ہورہی تھی اور ۶ر دسمبر کی دوپہر کو وہ انتقال کرگئیں۔ بینا رائے کو ۱۹۶۰ء۔۱۹۷۰ کی دہائی کی بہترین اداکارہ میں شمار کیا گیا تھا لیکن انہوں نے زیادہ فلمیں نہیں کیں اور اداکار پریم ناتھ سے شادی کرلینے کے بعد انہوں نے فلموں سے ریٹائرمنٹ لے لیا تھا، لیکن ۱۹۷۰ء میں انہوں نے پھر چند فلمیں کیں جن میں ایل وی پرشاد کی معرکتہ الارا فلم ''دادی ماں'' کے نام قابل ذکر ہیں۔

فلم دادی ماں میں اگرچہ لیڈنگ رول درگا کھوٹے کا تھا اور یہ ایک ایسے خاندان کی کہانی تھی جس میں بھائی اور بہن کے درمیان کئی برسوں سے سخت دشمنی چلی آرہی تھی اور درگا کھوٹے کے بھائی کا رول دوارکا پرشاد یعنی اشوک کمار نے ادا کیا تھا اور ان دونوں خاندانوں کے بچے جب جوان ہوتے ہیں تو ان کے نزدیک خاندان کی پرانی دشمنی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی اور فلم کے آخر میں جب بہن بھائی کے لڑکے اور بھائی بہن کے لڑکے کو جان سے ماردینے کا ارادہ رکھتے.... ہیں تو بینا رائے کے سلوک سے دونوں خاندانوں کے درمیان برسوں کی دشمنی محبت میں بدل جاتی ہے اور اس فلم میں بینا رائے کے دو بیٹوں کے رول دلیپ راج اور ڈاکٹر دلاگو نے ادا کیا تھا، فلم پورے خاندان کے ساتھ بیٹھ کر دیکھے جانے کے لائق تھی، بینا رائے کئی برسوں کے بعد اس فلم میں نمودار ہوئی اور اس نے اپنی اداکاری کے ذریعہ اس فلم کو بیحد کامیاب بنادیا تھا۔ دوسری طرف اشوک کمار اور درگا کھوٹے کی اداکاری بھی انتہائی عروج پر تھی۔

بینا رائے نے ۱۹۵۵ء میں جیمنی کی فلم ''انسانیت'' میں دلیپ کمار اور دیوآنند کے مقابل کام کیا تھا۔ اس فلم میں ایک گاؤں کی کہانی فلمائی گئی تھی جہاں اس ملک کے بادشاہ جنگورہ (جیونت) بہت ہی ظالم اور سفاک تھا اور جنگورہ کے ظلم وستم کے شکار معصوم گاؤں والے ہوتے تھے، گاؤں کی حسین لڑکی آرتی (بینا رائے) کو اسی گاؤں کا نوجوان رامو (دلیپ کمار) بیحد چاہتا تھا مگر یہ محبت یکطرفہ تھی اور بینا

رائے کو اس کا احساس تک نہیں تھا کہ راموا سے دل وجان سے چاہتا ہے اور جب جنگورہ کے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والے سینا پتی امرا (دیوآنند) کو جنگورہ کے سپاہی زخمی کرکے جنگل میں پھینک کر چلے جاتے ہیں تو راموہی اُسے اٹھا کر گاؤں لے آتا ہے۔

آرتی اس نوجوان کی تیمارداری کرتی ہے اور وہ صحت مند ہوجاتا ہے ساتھ ہی ساتھ وہ اُسے اپنا دل بھی دے بیٹھتی ہے اور دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگتے ہیں اور جب یہ بات راموکو معلوم ہوتی ہے تو وہ اسے جان سے ماردینے کی کوشش کرتا ہے مگر آرتی ڈھال بن جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ اس نے کبھی بھی اس سے محبت نہیں کی بلکہ وہ امر کو چاہتی ہے، راموکا دل ٹوٹ جاتا ہے مگر آخر میں وہ امر کی جان بچاتے ہوئے جنگورہ کے خاص سینا پتی (جے راج) کے خنجر کا شکار ہوجاتا ہے اس دوران امر بھی تلوار کی لڑائی میں جنگورہ کو مار ڈالتا ہے اور پھر گاؤں کے لوگوں کو آزادی مل جاتی ہے اور سبھی سکھ کی سانس لیتے ہیں مگر گاؤں کے لوگ راموکو مسیحا تسلیم کرلیتے ہیں۔

انسانیت کے بعد بینا رائے نے فلم گھونگھٹ میں بھارت بھوشن، پردیپ کمار اور آشا پاریکھ کے ساتھ کام کیا اور اس فلم میں بہترین اداکاری کے لئے بینا رائے کو فلم فیئر ایوارڈ کے ساتھ قومی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ گھونگھٹ کے بعد بینا رائے نے بادل اور عورت میں پریم ناتھ کے ساتھ کام کیا ان دونوں فلموں کو بھی کامیابی ملی، مگر ۱۹۶۰ء میں جب مغلِ اعظم کو زبردست کامیابی ملی تو اسی کہانی پر فلم ''انارکلی'' فلمائی گئی جس میں بینا رائے اور پردیپ کمار نے کام کیا تھا، بینا رائے کی بہترین اداکاری کی وجہ سے انارکلی بھی سپرہٹ ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ کلاسیک فلموں میں شمار کی گئی۔ اسی دوران پریم ناتھ کے ساتھ اس کا عشق محبت کی انتہائی منزلوں پر پہنچ گیا مگر شادی اس لئے رک گئی کہ ہدایت کار ایم صادق (مرحوم) اسے اپنی بڑے بجٹ کی فلم ''تاج محل'' کے لئے کاسٹ کرچکے تھے جس میں شاہ جہاں مغل شہنشاہ کا رول پردیپ کمار، شہنشاہ عالمگیر کا رول رحمٰن اور نور جہاں کا رول وینا نے کیا تھا۔ فلم تاج محل پورے ملک میں سپرہٹ ہوئی جس کے گیت اور قوّالی نے لوگوں کو مسحور کرکے رکھ دیا تھا۔ بینا رائے کے ساتھ پردیپ کمار نے یکے بعد دیگرے گھونگھٹ انارکلی اور تاج محل میں ہیرو کا رول نبھایا۔ اگرچہ بینا رائے کو اس وقت کے بڑے اداکار دلیپ کمار، راج کپور، دیوآنند وغیرہ کے ساتھ کام کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملتا تھا اور اس زمانے میں نرگس، مینا کماری، مالا سنہا، ثریا، نندہ، آشا پاریکھ،

ہی بڑی ہیروئن مانی جاتی تھیں۔لیکن اس کے باوجود بینا رائے کوکبھی بھی دوسرے درجے کی ہیروئن نہیں مانا گیا بلکہ اس کا وقار اوراس کی انفرادیت اُسے ہمیشہ آگے بڑھائے رکھتی رہی۔

پریم ناتھ بحیثیت ایک شوہر کے ناکام انسان ثابت ہوئے تھے کیونکہ اُنھیں شراب اورنئ نئ عورت کے ساتھ تعلقات قائم رکھنے کی بُری لت تھی اور بہت حدتک وہ ظالم قسم کے شوہر واقع ہوئے تھے اسی بنا پر ۱۹۸۰ء کی دہائی میں پتہ چلا تھا کہ بینا رائے کا دماغی توازن بگڑ چکا ہے اور چند مہینوں کے لئے اُسے مینٹل اسپتال میں بھی رکھا گیا تھا،لیکن بعد میں اس کی صحت بالکل ٹھیک ہوگئی تھی،فروری ۲۰۰۹ء میں اُسے قومی ایوارڈ برائے لائف ٹائم اچیومنٹ کے طور پر دیا گیا جہاں بڑے بڑے نیشنل لیڈران موجود تھے اور سامعین کے درمیان دلیپ کمار اور سائرہ بانو بھی بیٹھے تھے اور اس وقت لوگ ان کی اس خواہش کوسن کر حیران رہ گئے جب اس نے کہا کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ ایوارڈ مجھے دلیپ صاحب اور سائرہ بھابھی کے ہاتھوں دیا جاتا،جس کے بعد ان کی خواہش پوری کی گئی اور دلیپ صاحب اور سائرہ کو اسٹیج پر آنے کے لئے کہا گیا اور پھر یہ ایوارڈ بینا رائے نے دلیپ کمار کے ہاتھوں لیا۔اس موقع پر وہ دونوں کے گلے لگ کر کافی دیر تک روتی رہی اور پھر اپنے بیان میں کہا کہ اپنی فرصت کے اوقات صرف دلیپ صاحب کی فلموں کو دیکھ کر گزارتی ہوں۔اس نے یہ بھی کہا کہ وہ مغل اعظم اور دیوداس کو کم از کم پچیس پچیس مرتبہ دیکھ چکی ہیں اور اس پر بھی ان کا دل نہیں بھرا ہے۔بینا رائے نے چند بہترین فلموں میں مغلِ اعظم ،دیوداس ،میلہ انداز ،دیدار ،رام اور شیام ،شکتی اور ودھاتا کو بتایا اور کہا کہ یہ ایسی فلمیں ہیں جو ہندوستان کی کلاسیک فلموں میں شمار کی جاسکتی ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ ان تمام فلموں کے ہیرو کے ساتھ مجھے یہ ایوارڈ ملا ہے۔

☆☆☆

ہندی فلموں کی حسین باصلاحیت اداکارہ۔گیتا بالی

شکیلہ یعقوب

ہندی فلموں کی حسین ،باصلاحیت اداکارہ اور بہترین رقاصہ گیتا بالی جس کی آنکھیں بھی رقص کرتی ہوئی دکھائی پڑتی تھیں،اس کا حسین چہرہ،گلابی آنکھیں،گداز جسم اور خوبصورت گیسو نے لوگوں کے دل لوٹ لئے تھے،اپنے دس سالہ فلمی کیریر میں اس نے صرف ۷۰ فلمیں کیں،جن میں چند فلمیں یادگار ثابت ہوئیں۔وہ جس وقت شہرت کے بامِ عروج پر تھی اس وقت انھوں نے جدوجہد میں مصروف اداکار شمی کپور کے ساتھ لو میرج کر لی تھی اوراس نے جدوجہد میں بھرپور ساتھ نبھایا تھا مگر افسوس جب شمی کپور کو شہرت ملی اور وہ ٹاپ کے اسٹار بنے تو وہ اپنے شوہر،ایک بیٹا اور ایک بیٹی کو چھوڑ کر دنیا سے منہ موڑ گئیں، گیتا بالی کی موت اس وقت ہوئی جب فلمساز ناصر حسین کی فلم دل دے کے دیکھو اور تم سا نہیں دیکھا میں ہیرو کا رول اداکار شمی کپور سپر اسٹار بنے تھے اور ناصر حسین نے انہیں اگلی فلم ''تیسری منزل'' کے لئے بھی سائن کر لیا تھا مگر فلم کی شوٹنگ شروع ہی ہوئی تھی کہ گیتا بالی کا انتقال ہوگیا اور شمی کپور اپنی شریک حیات کی اچانک موت سے پاگل سے ہوگئے تھے اور انھوں نے فلموں کی شوٹنگ مکمل طور پر بند کردی تھی ،ناصر حسین سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ ان کی فلم تیسری منزل پر کام نہیں کر پائیں گے،لہٰذا بہتر ہے کہ وہ کسی اور اداکار کو لے لیں ،مگر ناصر حسین نے بھی انہیں کہلوا دیا کہ فلم کی شوٹنگ ان کے انتظار میں دس سال رکی رہے گی مگر وہ اس فلم میں کسی دوسرے ہیرو کو نہیں لیں گے،بہرکیف شمی کپور ٦ ماہ کے بعد اس غم آلود فضا سے باہر نکلے اور تیسری منزل کی شوٹنگ شروع کردی اور لوگوں کو یاد ہوگا کہ اس فلم نے پورے ملک میں گولڈن جبلی منائی اور آل ٹائمز بیسٹ فلم قرار دی گئی جس میں شمی کپور،آشا پاریکھ،پریم ناتھ،پریم چوپڑہ، کے این سنگھ،رام اوتار اور افتخار نے کام کیا تھا،موسیقی آر ڈی برمن اور گیت مجروح کے تھے۔

گیتا بالی بحیثیت ایک اداکارہ زیادہ مقبول رہی ،اگرچہ بیشتر فلموں میں اسے بہت ہی معمولی رول دیا گیا تھا،زیادہ تر فلموں میں اسے دیو آنند، بھگوان ، پردیپ کمار، بھارت بھوشن اور راج کپور کے ساتھ صرف ناچنے گانے اور ٹسوے بہانے والی عورت کا رول دیا گیا لیکن اس کے باوجود گیتا بالی نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے اور اس پر فلمائے ہوئے گیت ناقابلِ فراموش ثابت ہوئے

جیسے ''بابو جی دھیرے چلنا پیار میں ذرا سنبھلنا''

گیتا بالی کو فلموں سے متعارف کرانے والے فلم میکر کیدار شرما ہیں، گیتا اپنے خاندان کے لوگوں کے ساتھ ایک ایسے گھٹے ہوئے تنگ کمرے میں رہتی تھی جسے لوگ نہانے کے لئے بھی استعمال کرتے تھے۔ گیتا بالی یہ نام بھی اُسے کیدار شرما نے دیا تھا جبکہ اس کا اصل نام ہری کیرتن کور تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے اُسے چند فلموں میں صرف ایک رقاصہ کے طور پر موقع دیا گیا اور خاص طور پر پنجابی فلموں میں ڈانس سین میں موقع دیا گیا ۔جن میں سے ایک مشہور فلم کا نام ''بدنامی'' ہے جس کے بعد وہ لدھیانہ سے ممبئی چلی آئی۔ اس کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر کیدار شرما نے اپنی فلم ''سہاگ رات'' (۱۹۴۸ء) میں ہیروئن کا رول دیا تھا۔ اس فلم کے ہیرو بھارت بھوشن تھے اور اس فلم میں ناظرین نے گیتا بالی کی اداکاری کو بیحد سراہا تھا۔

اس فلم کی کامیابی کے بعد گیتا کو بہت ساری فلموں کے کانٹریکٹ ملنے لگے۔ اور اس نے بہت ساری فلمیں بیک وقت سائن کر لی تھیں، چند فلموں میں اُسے بڑی ہیروئینوں کے مقابل کام کرنے کا موقع ملا اور سائیڈ ہیروئن بننے سے اس نے کبھی بھی انکار نہیں کیا۔ ۱۹۴۹ء میں اس نے ثریا کے ساتھ بڑی بہن میں اور اسی سال فلم دلاری میں مدھوبالا کے ساتھ کام کیا۔ ۱۹۵۱ء میں گرودت نے اپنی زبردست ہٹ فلم بازی میں دیوآنند کے مقابل ہیروئن بنایا اس فلم کی کامیابی کے بعد گرودت نے اسے اپنی دیگر تین فلموں میں بھی شامل کیا۔ اگرچہ فلم بازی کی ہیروئن کارتک تھی اور فلم میں گیتا بالی کو ویمپ کا رول دیا گیا تھا مگر اس نے اپنے رول کے ساتھ انصاف کیا۔ اس فلم کا ایک ہٹ گانا جو ساحر لدھیانوی کی تحریر کردہ تھا وہ گیتا بالی پر فلمایا گیا ''تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنا لے، اپنے پہ بھروسہ ہے تو یہ داؤ لگا لے'' بیحد پسند کیا گیا تھا۔

اس فلم کے بعد گیتا بالی نے کیدار شرما کی فلم ''باورے نین'' میں راج کپور کے ساتھ ہیروئین کا رول ادا کیا۔ اس دوران اس دور کے مشہور کامیڈین بھگوان کے ساتھ زبردست ہٹ فلم ''البیلا'' تھی اس میں بھی ہیروئین کا رول ادا کیا جب نوتن نے انکار کر دیا تھا۔ اس فلم کا ہٹ گیت ''شعلہ جو بھڑکے........دل میرا دھڑکے'' اور ''شام ڈھلے میری کھڑکی تلے'' بیحد مقبول ہوا تھا۔ اور گیتا بالی کو اس فلم کے ذریعہ بیحد مقبولیت ملی تھی۔ موٹی ناک والی گیتا بالی لوگوں کی ہر دلعزیز اداکارہ بن چکی تھی۔ ۱۹۵۲ء میں گرودت نے دیوآنند کے ساتھ اُسے فلم ''جال'' میں ہیروئن بنا دیا۔ دیوآنند اس فلم میں ایک اسمگلر بنے تھے جو ہر وقت سگریٹ پیتا رہتا

ہے۔ اُس کو ہر وقت پولس کے خوف سے بھاگنا پڑتا ہے۔ اس فلم کا یہ گیت ''یہ رات، یہ چاندنی پھر کہاں'' بیحد مقبول گیت ثابت ہوا تھا۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء کے درمیان گیتا بالی کے عروج کا زمانہ تھا، مشہور اداکارہ مالا سنہا کو فلموں سے متعارف کرانے میں گیتا بالی کا ہی ہاتھ تھا۔ اس زمانے میں گیتا بالی کے سکریٹری سریندر کپور (بونی کپور اور انیل کپور کے والد) ہوا کرتے تھے۔ سریندر کپور نے پران جائے پر وچن نہ جائے۔ ہیرا، پتھر اور پائل جیسی ہٹ فلمیں بنائی تھیں۔

اسی زمانے میں جب کیدار شرما نے رنگیلا رتن نامی فلم شروع کی تو اس میں شمی کپور اور گیتا بالی کو لیا تھا، اسی فلم کی شوٹنگ کے دوران دونوں میں محبت ہو گئی اور فلم کی ریلیز سے پہلے دونوں نے لو میرج کر لی تھی، اگرچہ اس شادی سے ان کے والد پرتھوی راج کپور، بڑے بھائی راج کپور خوش نہیں تھے اور انھوں نے شادی میں شرکت بھی نہیں کی تھی مگر شمی کپور جو ہمیشہ سے باغی اداکار کے طور پر مشہور تھے انھوں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی تھی کہ ان کے خاندان کے لوگ شادی میں شریک نہیں ہوئے تھے۔

گیتا بالی نے اپنے زمانۂ عروج میں بھی کبھی غرور کو اپنے اندر آنے نہیں دیا، اپنی فلم کے پریمیئر کے موقع پر وہ خود کھلی جب گاڑی ڈرائیو کر کے سنیما ہال تک پہنچی تاکہ جو لوگ بھی ان سے ملنا چاہیں ان سے مل سکتے ہیں۔ اسی زمانے میں کیدار شرما نے اپنی فلم میں گیتا بالی کو ہیروئین کے طور پر لیا اور اس سے بہت کم عمر کے شمی کپور کو ہیرو بنایا اس فلم کا نام رنگین راتیں تھی۔ اسی فلم میں کام کرتے ہوئے وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ گیتا بالی نے شمی کپور کے بڑے بھائی راج کپور کے والد پرتھوی راج کپور کے ساتھ بھی آنند مٹھ میں ہیروئن کا رول نبھایا اور اس فلم میں اپنے والد کو اپنی محبوبہ کے ساتھ عشق کرتے دیکھ کر شمی کپور نے کوئی بھی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ ۲۳ر اگست ۱۹۵۵ء کو پروڈیوسر ڈائریکٹر ہری والیا کی موجودگی میں شمی کپور نے بنگان مندر میں شام کے ۴ر بجے گیتا بالی سے شادی کر لی۔ اس شادی میں صرف قریب کے چار پانچ لوگ ہی شریک ہوئے تھے۔

گیتا بالی نے شادی کے بعد بھی چند فلمیں کیں جن میں سہراب مودی کی جیلر (۱۹۵۸ء) ہے جس میں گیتا بالی نے ایک اندھی لڑکی کا رول ادا کیا تھا۔ شمی کپور سے شادی کرنے کے بعد اس نے دو بچّوں ادتیہ عرف مکّی اور کنچن کو جنم دیا گیتا بالی نے اس زمانے میں راجندر سنگھ بیدی کے مشہور ناول ''ایک چادر میلی سی'' میں کام

کیا لیکن وہ فلم ریلیز نہ ہوسکی بعدازاں یہ فلم رشی کپور، ہیما مالنی، پونم اور کل بھوشن کھر بندہ کے ساتھ بنی۔

گیتا بالی کی مشہور فلموں میں چند فلمیں حسب ذیل ہیں:

۱۹۴۸ء سہاگ رات (بلراج ساہنی)

۱۹۴۹ء بڑی بہن (پران، رحمٰن، ثریا)

۱۹۵۰ء باورے نین (راجکپور)

۱۹۵۱ء بازی (دیو آنند)

۱۹۵۱ء البیلا (بھگوان)

۱۹۵۲ء جال (دیو آنند)

۱۹۵۵ء وچن (بلراج ساہنی)

۱۹۵۸ء جیلر (ابھی بھٹا چاریہ)

گیتا بالی ۲۱ر جنوری ۱۹۶۵ء کو چیچک میں مبتلا ہو کر چل بسی۔ بعدازاں اس کی بھانجی یوگیتا بالی نے فلموں میں ہیروئن کا رول نبھایا جس نے پہلے کشور کمار سے شادی کی بعد میں متھن چکرورتی سے کر لی تھی۔

گیتا بالی پر فلمائے گئے چند خوبصورت گیت حسب ذیل ہیں:

(۱) چپ چپ کھڑے ہو ضرور کوئی بات ہے، پہلی ملاقات ہے یہ پہلی ملاقات ہے (فلم بڑی بہن۔ گلوکارہ۔ لتا منگیشکر) (۲) سن بیری بالم سچ بول رے (باورے نین (سنگر راجکماری) (۳) چاندنی آئی بن کے پیار او ساجنا (دلاری۔ گلوکارہ شمشاد بیگم) (۴) تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنالے اپنے پہ بھروسہ ہے تو یہ داؤ لگا لے (بازی۔ گلوکارہ۔ گیتا دت) (۵) سنو گجر کیا گائے (بازی۔ گیتا دت) (۶) شعلہ جو بھڑ کے دل میرا دھڑ کے (البیلا۔ لتا منگیشکر) (۷) بھولی صورت دل کے کھوٹے (البیلا۔ لتا منگیشکر) (۸) چاندنی راتیں پیار کی باتیں (جال۔ لتا منگیشکر) (۹) ہم پیار میں جلنے والوں کو چین کہاں آرام کہاں (جیلر۔ لتا منگیشکر) (۱۰) ساری ساری رات تیری یاد جگائے (اجی بس شکریہ۔ لتا منگیشکر)۔

☆☆☆

فن کی ملکہ۔ شبانہ اعظمی

دلیس راج مضطرؔ

ہندی فلم انڈسٹری میں دو طرح کی فلمیں بنائی جاتی ہیں۔ سماجک اور کاروباری یہ بھی حقیقت ہے کہ فلم انڈسٹری میں دو طرح کے فنکار یا اداکار ہیں۔ ایک تو وہ جو دولت، شہرت کے لئے کام کرتے ہیں اور صرف کاروباری فلموں تک ہی محدود رہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو کاروباری فلموں کے ساتھ آرٹ فلموں میں بھی اپنی حقیقی اداکاری دکھاتے ہیں۔ اور اپنی شہرت کے ساتھ ہندوستان کا نام بھی روشن کرتے ہیں ایسی ہی ایک اداکارہ ہیں شبانہ اعظمی۔ اداکارہ شبانہ اعظمی نے' دوسری اداکاراؤں کے مقابلے میں منتخب فلموں ہی میں کام کیا۔ لیکن انھوں نے جس فلم میں بھی کام کیا اس میں نہ صرف جان ڈال دی بلکہ اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے فلم بینوں کے لئے ایک سوالیہ نشان چھوڑ دیا۔ گزشتہ ۶ ستمبر کو پیونگ یانگ میں ناوابستہ اور ترقی پذیر ملکوں کی جانب سے منعقدہ بین الاقوامی فلم فیسٹیول میں فلم ''لباس'' کی بہترین اداکاری کے لئے ایوارڈ حاصل کیا۔ شبانہ اعظمی نے ایک مرتبہ پھر یہ ثابت کر دیا کہ فلموں خصوصاً آرٹ فلموں کا تعلق شہرت سے نہیں بلکہ اداکاری سے ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اداکارہ شبانہ اعظمی ہندوستان کے مشہور و معروف نظم گو شاعر نغمہ نگار کیفی اعظمی کی صاحبزادی ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایک پیدائشی اداکارہ ہیں تو غلط نہ ہوگا۔

۷ سال پہلے بمبئی فلم انڈسٹری میں آرٹ کا ایک سیلاب سا آ گیا تھا۔ فلم ساز زیادہ سے زیادہ اور بہترین سے بہترین آرٹ فلمیں بنانے میں مصروف تھے، لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اسے المیہ کہا جائے یا فلم بینوں کی عدم دلچسپی کہ اس دوری جتنی بھی آرٹ فلمیں بنیں مقبولیت حاصل نہ کر سکیں جتنی اُنھیں ملنی چاہئے تھی۔ اس کی ایک خاص وجہ شاید یہ بھی ہے کہ کاروباری فلم سازوں نے فلم بینوں کی آنکھوں پر مکروفریب سے لبریز ایک ایسا رنگین چشمہ فٹ کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ حقیقت سے کوسوں دور ہو گئے۔

اداکارہ شبانہ اعظمی کو بھی فلم بینوں کی عدم توجہی کا شکار ہونا پڑا۔

آرٹ فلموں ''پار، منڈی، ارتھ'' میں شبانہ اعظمی نے ناقابلِ فراموش اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ ان فلموں میں بہترین اداکاری کے لئے انھیں ایوارڈ بھی ملے۔ لیکن یہ فلمیں بھی فلم ''لباس'' کی طرح ہندوستان کی

بجائے بیرونِ مما لک میں زیادہ مقبول ہوئیں۔

سمیتا پاٹل کی آرٹ فلموں ''چکر، بازار، منتھن'' کے دور میں بمبئی فلم انڈسٹری میں شبانہ اعظمی اور سمیتا پاٹل کے درمیان مقابلہ آرائی کے چرچے بھی رہے۔لیکن سمیتا پاٹل کے یہ الفاظ ان چرچوں کی پوری پوری تردید کرتے ہیں کہ ''شبانہ میری بڑی بہن ہے'' بات بھی درست ہے کیونکہ ہرادا کار، ادا کارہ کا اپنا الگ ایک انداز ہوتا ہے۔اس لئے مقابلہ آرائی کا سوال ہی پیدانہیں ہوتا۔ بہر کیف سمیتا پاٹل تو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ شبانہ اعظمی کی بطورادا کارہ انفرادیت برقرار ہے۔

افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ باوجود بہترین ادا کاری کے ادا کارہ شبانہ اعظمی کو اب تک وہ مقام نہیں دیا گیا ہے جس کی وہ پوری پوری مستحق ہیں۔توقع ہے کہ ہندوستان کے ماہرین فلم اس حقیقت کو محسوس کریں گے اور توصیفی اسناد حاصل کرنے کے لئے، ملک کے فنکاروں کو بیرونی مما لک کا محتاج نہیں ہونے دیں گے۔

معروف رائٹر محمد خورشید اختر فرازی شبانہ اعظمی کی سماجی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شبانہ اعظمی ایک دردمند دل رکھنے والی سماجی کارکن بھی تھیں اس نے خواتین کے خلاف گھریلو ظلم ،تشدد اور جہیز کے سلسلے میں نئی نویلی دلہنوں پر ہونے والے سسرالی ظلم کے خلاف بھی آواز اٹھائی اس نے ایڈز جیسے خطرناک مرض کو ختم کرنے کے لئے بڑی ہمت کے ساتھ ایڈز میں مبتلا مریضوں کے ساتھ کام کیا۔ ثیر پیشہ عورتوں کے لئے سماج میں کوئی جگہ ہونی چاہیئے اس کے لئے بھی حکومت وقت سے انصاف طلب کیا کئی دنوں تک بھوک ہڑتال بھی کی۔شبانہ اعظمی نے بابری مسجد کے انہدام کے خلاف بھی آوازیں اٹھائیں۔شبانہ اعظمی کا سب سے اہم رول فرقہ پرستی کے خلاف آواز اٹھانا تھی۔ ۲۰۰۲ء میں جب گجرات میں بدترین فرقہ وارانہ فساد ہو رہا تھا۔اس وقت انہوں نے وزیر اعلیٰ نریندر مودی کے خلاف ایک بڑا محاذ کھڑا کیا تھا اور مودی کی گرفتاری کے مطالبہ پر بھوک ہڑتال میں بھی حصہ لیا۔شبانہ اعظمی نے ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کے لئے بھی زبردست تحریک چلائی تھی۔

☆☆☆

بیوٹی کوئن۔سائرہ بانو

شکیلہ یعقوب

سائرہ بانو پرانے زمانے کی مشہور ہیروئن، نسیم بانو کی بیٹی ہے۔سائرہ بانو کو پروڈیوسر، ڈائریکٹر سبودھ مکھرجی نے اپنی فلم جنگلی ۱۹۶۳ء میں بطور ہیروئن پہلی مرتبہ موقعہ دیا۔اس کے ہیرو شمی کپور تھے۔ یہ فلم حیدرآباد کی دلشاد ٹاکیز میں سلور جوبلی منائی۔اس کے گانے کافی مشہور ہوئے، یاہو چاہے کوئی مجھے جنگلی کہے۔احسان تیرا ہوگا مجھ پر آپیا کروں میں کیا سکھو سکھو۔دن سارا گزارا تیرے انگنا۔اس کے بعد سائرہ بانو، دیوآنند کی فلم پیار و محبت میں آئی۔ یہ رائل ٹاکیز میں دکھائی گئی۔اس کے بعد شمی کپور سائرہ بانو بلف ماسٹر میں آئے اس میں ایک گانا کوو فور آلا رے آلا۔اس کے بعد سائرہ بانو اور مکھرجی فلم ساز اور آواز میں آئے۔ یہ فلمیں اشوک ٹاکیز اور دلشاد ٹاکیز میں آئیں اور یہ ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۵ء کی فلمیں تھیں۔اس کے بعد پالیس ٹاکیز میں آئی۔اس کے ڈائریکٹر راجہ نوائے تھے۔اس کا گانا کافی مشہور ہوا۔اے صنم جس نے تمہیں چاندسی صورت دی ہے اس ملک نے تو مجھے محبت دی ہے۔ پھر فلم آئی ملن کی بیلا، سائرہ بانو، دھرمیندر، راجندر کمار ہیرو تھے۔اور دھرمیندر ویلن تھے۔ یہ فلم ۱۹۶۶ء میں زمرد محل ٹاکیز میں سلور جوبلی ہوئی، اس کا یہ گانا کافی مشہور ہوا تمہیں اور کیا دوں میں دل کے سوا۔ پھر اس کے بعد ۱۹۶۹ء میں جھک گیا آسمان، جس میں سائرہ بانو راجندر کمار تھے۔ یہ فلم رائل ٹاکیز میں آئی تھی۔اس کے اندر ایک گانا مشہور ہوا ان سے ملی نظر کہ میرے ہوش اڑ گئے۔ پھر سائرہ بانو راجندر کمار فلم امان میں آئے۔ یہ بھی ۱۹۹۶ء میں رائل ٹاکیز میں آئی۔اس کے بعد سائرہ بانو ۱۹۷۰ء میں فلم پڑوسن میں سنیل دت کے ساتھ آئیں۔اس کے دو گانے کافی مشہور ہوئے۔میرے سامنے والی کھڑکی میں ایک چاند سا ٹکڑا رہتا ہے، میں چلی میں چلی دیکھو پیار کی گلی، پھر ڈائریکٹر اے بھیم سنگھ نے ۱۹۷۰ء میں ہی فلم گوپی، بنائی، جس میں سائرہ بانو اور دلیپ کمار تھے یہ فلم نورنگ ٹاکیز میں سلور جوبلی منائی۔اسی نے ہی فلم گوپی بنائی۔اسی وقت ۱۹۷۱ء میں بی آر چوپڑا کی فلم آدمی اور انسان میں سائرہ بانو دھرمیندر فیروز خان آئے یہ فلم وکرانتی ٹاکیز میں سلور جوبلی منائی۔اسی سال میں منوج کمار نے اپنے پروڈکشن میں ایک فلم بنائی جس کا نام پورب اور پچھّم تھا۔اس میں سائرہ بانو کے ساتھ منوج کمار تھے۔اس سال فلم ریشم کی ڈوری سائرہ اور دھرمیندر تھے یہ فلم رائل

ٹاکیز میں ۱۹۷۳ء میں آئی۔اس کے بعد انٹرنیشنل کروک آئی۔سائرہ بانو کے ساتھ دھرمیندر تھے۔اشوک ٹاکیز میں آئی تھی۔اس کے بعد دھرمیندر اور سائرہ بانو فلم سازش میں آئے۔اس کے بعد سائرہ بانو نوین نیشچل فلم وکٹوریہ نمبر ۲۰۳ میں آئے۔یہ فلم ۱۹۷۵ء میں دلشاد ٹاکیز میں آئی۔اس کے پروڈیوسر ڈائریکٹر برج تھے۔اس کے بعد اسی سال میں فلم مونٹو آئی جس میں سائرہ بانو نوین نشچل تھے۔سائرہ کے ساتھ ونود کھنہ کی ایک فلم ضمیر آئی۔یہ نورنگ ٹاکیز میں ۱۹۷۸ء میں ریلیز ہوئی۔فلم بیراگ، سائرہ بانو دلیپ کمار لینا چندراورکر کی فلم رائل ٹاکیز میں آئی۔اس کے بعد سائرہ بانو نوین نیشچل کی فلم دیش دروہی آئی۔یہ فلم راما کرشنا 70MM میں آئی۔اس کے بعد سگینہ مہاتو آئی۔یہ فلم رائل ٹاکیز میں آئی تھی۔اور ایک فلم سائرہ بانو، ونود کھنہ، ونود مہرا، کی آئی جس کا نام اروپ تھا۔اس کا ایک گانا کافی مشہور ہوا۔نینوں میں درپن ہے درپن میں کوئی ، پروڈیوسر ڈائریکٹر سبودھ مکھرجی نے اپنے لڑکے جوائے مکھرجی اور سائرہ بانو کو لے کر فلم شاگرد بنائی۔اس فلم نے ۱۹۶۸ء میں زمرد وٹاکیز میں سلور جوبلی منائی۔

☆☆☆

شوخ، حسین اور ہنس مکھ رقاصہ۔ہیلن

ہما انور

ہندی فلمی اداکاراؤں میں ایک اہم بلکہ سب سے اہم نام رقاصہ اداکارہ ہیلن کا ہے۔۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۸۰ء کے درمیان ریلیز ہوئی فلموں میں ہیلن بطور ایک اداکارہ اور رقاصہ کے بے حد مقبول رہی اس اداکارہ نے ہر فلم میں اپنی موجودگی کا بھرپور ثبوت پیش کیا۔ہیلن ان ۳۰ بلکہ ۳۵ برسوں کے دوران ہر دوسری تیسری فلموں میں نظر آئی، راج کپور دلیپ کمار دیو آنند، منوج کمار، دھرمیندر، جتیندر، امیتابھ بچن، شتروگھن سنہا، رجنی کانت، ونود کھنہ، شمی کپور، ششی کپور، رشی کپور، راجیش کھنہ سمیت تقریباً سبھی ہیرو کے ساتھ اس نے یا تو محض ایک رقاصہ کے طور پر یا پھر ایک اداکارہ کے طور پر کام کیا اور جس فلم میں بھی اس کو تھوڑی بہت اداکاری کا موقع دیا گیا اس نے اپنی اداکاری کے ذریعہ اپنی گہری چھاپ چھوڑ دی۔

ہیلن کی سب سے بڑی خوبی اس کے اندر یہ تھی کہ وہ اپنا ہر اسٹیپ بالکل موسیقی کی دھن پر رکھتی تھی چاہے کیبرے ہو یا مجرا، وہ اپنے ہر رقص میں بے حد کامیاب رہی اور تین دہائیوں سے بھی زیادہ عرصے تک وہ ہندی فلموں میں سب سے محبوب رقاصہ کے طور پر مانی گئی۔ویسے تو کئی فلموں میں اسے ہیروئن کا چانس ملا فلم ''ہم ہندوستانی'' میں وہ سائیڈ ہیروئن تھی اور جوائے مکھرجی کی محبوبہ بنی تھی اور اسے فلم کی اصل ہیروئن آشا پاریکھ کے مقابلے میں زیادہ موقع ملا تھا۔ڈاکٹر ودیا میں وجنتی مالا کے مقابل اسے رول ملا تھا، اس کے علاوہ پرنس میں بھی شمی کپور اور وجنتی مالا کے برابر رول ملا تھا۔ویسے ہیلن کا یادگار اور ناقابل فراموش رول ''لہو کے دو رنگ'' (ونود کھنہ) اور ناصر حسین کی ایورگرین سپرہٹ فلم تیسری منزل (شمی کپور، آشا پاریکھ)، میں اسے بہت خاص رول میں لیا گیا تھا۔

ہیلن کا مقبول ترین ڈانس پرنس، ڈاکٹر ودیا، اور تیسری منزل کے علاوہ فلم ''ڈان'' (یہ میرا دل پیار کا دیوانہ) شعلے (محبوبہ او محبوبہ) کارواں (پیا تو اب تو آجا) انکار (منگتا ہے تو آجا رسیا) بہو بیگم (نکلے تھے کہاں جانے کے لئے پہنچے ہیں کہاں معلوم نہیں) یقین (بچ بچ کے کہاں جاؤ گے) ہیلن نے جیول تھیف میں دیو آنند کے ساتھ بہت ہی خوبصورت رول ادا کیا تھا۔جس میں اس کے ڈائیلاگ براہ راست اشوک کمار،

وجنتی مالا، فریال، کے ساتھ تھے۔ فیروز خان کے ساتھ اپرادھ، کھوٹے سکے، سنجے خان کے ساتھ سونا چاندی، چنگاری، منوج کمار کے ساتھ دس نمبری، دلیپ کمار کے ساتھ گنگا جمنا، راج کپور کے ساتھ شری ۴۲۰، آوارہ، راجکمار کے ساتھ شرارہ، نیل کمل کاجل، وغیرہ میں بہترین رقص کیئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء کے درمیان تقریباً ۲۵ فلمیں اشوک کمار کی ایسی ہونگیں جن میں اشوک کمار نے کسی نہ کسی رول میں ہیلن کی سفارش کی اور جب ان سے پوچھا گیا تھا کہ آخر وہ اپنی ہر فلم میں ہیلن کو کیوں ترجیح دیتے ہیں تو انہوں نے الٹے سوال کیا تھا کہ کیا ہندی فلم میں ہیلن سے اچھی بھی کوئی اداکارہ اور رقاصہ ہے۔ فلم پیار کا سپنا، دو بھائی، سہارا، مہربان اور اس کے علاوہ بہت ساری فلموں میں ہیلن کو اشوک کمار کے ساتھ بطور اداکارہ دیکھا گیا جس میں سب سے اہم فلم کا نام جیول تھیف ہے۔ فلم چائنا ٹاؤن اور ہوڑہ برج ہیلن کے رقص اور ''میرا نام چن چی چو، چن چی چو'' کو کون بھول سکتا ہے۔

جب ہیلن نے اپنی ۵۰۰ ویں فلم کی تھی تو ۱۹۸۰ء میں اس نے ممبئی کے ہوٹل سن اینڈ سینڈ میں اپنی طرف سے ایک پارٹی دی تھی جس میں دلیپ کمار سے لے کر بسواجیت سبھی ہیروز آئے اور راما نند ساگر، بی آر چوپڑہ، یش چوپڑہ، سبھاش گھئی اور ناصر حسین جیسے بڑے فلمساز، ہدایتکاروں نے بھی شرکت کی تھی، اس پارٹی میں ہیلن کو دلیپ کمار کے ہاتھوں سے ہیروں سے جڑا ایک تاج پہنایا گیا تھا۔

ہندی فلموں کی اچھی رقاصاؤں میں ریکھا، سری دیوی، ممتاز، وجنتی مالا، وحیدہ رحمان، مادھوری دکشت وغیرہ رہی ہیں ان سبھوں کی متفقہ رائے ہے کہ ہیلن کے ڈانس دیکھ کر ہی انہوں نے رقص سیکھے، مادھوری ڈکشت جیسی بہترین رقاصہ کا کہنا ہے کہ ہیلن کا اسٹیپ کبھی بھی میوزک سے الگ ہٹ کر نہیں دیکھا گیا، اس کی ادا کے ساتھ اس کا ہر اسٹیپ موسیقی کی تال پر ہوتا تھا۔ جس سے اندازہ ہوا کہ جس گیت پر اسے رقص کرنا ہوتا تھا اس گیت کے کیسٹ لے کر وہ پہلے گھر میں درجنوں مرتبہ رہرسل کرتی تھی۔ موسیقی کی ایک ایک لے پر اس کا بھر پور دھیان رہتا تھا جس کی بنیاد پر اس کا رقص کبھی بھی موسیقی کی لے سے ہٹ کر نہیں دیکھا گیا۔

شہنشاہ موسیقی نوشاد کا کہنا تھا کہ ہیلن ایک ایسی رقاصہ ہے جس کے ہر انگ انگ میں موسیقی ہے۔ وہ جس طرح سے شنکر جے کشن، ایس ڈی برمن، آر ڈی برمن، اور لکشمی کانت پیارے لال کی موسیقی میں بہترین

رقص کرتی ہے اسی طرح میری کلاسیکی سنگیت میں بھی اس کا رقص غلط نہیں ہوتا۔ فلم گنگا جمنا کے ایک مجرا کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا ہیلن جو ایک شوخ، حسین اور ہنس مکھ اداکارہ اور رقاصہ تھی اس نے میرے جیون ساتھی میں راجیش کھنہ کے ساتھ ایک ویمپ کا کردار نبھایا تھا۔ جو راجیش کھنہ کو قید کر کے صبح وشام کوڑے برسانے کا کام کیا کرتی تھی، ویسے حقیقی زندگی میں ہیلن ایک بہت ہی دکھی عورت تھی جب پی این اروڑہ نام کے ایک فلمساز نے تقریباً بیس برسوں تک اسے اپنا رکھیل Kept بنا رکھا تھا اور ہیلن کی ساری دولت پر اس کا قبضہ تھا۔ ۱۹۷۳ء میں جب پی این اروڑہ ۸۲ سال کی عمر میں چل بسے تو ہیلن کو آزادی ملی، اس نے ۱۹۹۰ء میں مکالمہ نگار اور فلم تیسری منزل فلم کے ڈرم پلیئر سلیم خان کے ساتھ شادی کر لی، سلیم خان جو اداکار سلمان خان، ارباز اور سہیل خان کے والد ہیں۔ ہیلن ان کی سوتیلی ماں ہے لیکن وہ تینوں ہیلن سے بیحد پیار کرتے ہیں۔

☆☆☆

ہندی فلموں کی 'ہنٹر والی' اداکارہ۔ نادیہ

سن ۱۹۳۵ء کے پرانے دور میں ہندوستانی فلم انڈسٹری میں عورتوں کو دھیان میں رکھ کر کم ہی فلمیں بنائی جاتی تھیں۔ خاص طور سے انہیں مرکزی کردار میں رکھ کر سبجیکٹ سوچنا بہت دور کی بات تھی۔ ایسے میں کسی عورت کو ایک ایسے بلیک اینڈ وہائٹ شعبے میں انٹری لینا۔ جہاں مردوں کی اجارہ داری ہو ایک جوکھم بھرا قدم تھا۔ ہنٹر والی نادیہ ان میں سے ایک تھیں۔ جنہوں نے ہندی فلموں میں ماردھاڑ کی شکل میں اپنی شناخت بنائیں۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ اگر آپ کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو رسک لینے ہوں گے۔ لیک سے ہٹ کر سوچنا ہی ہوگا۔ بھیڑ بھاڑ سے الگ کچھ ایسی ہی دوڑ میں شامل ہوئیں نادیہ۔

۸/جنوری ۱۹۰۸ء میں آسٹریلیا میں پیدا ہوئی نادیہ (اصل نام میری این۔ ایوان) کے والد برٹش فوج میں آفسر تھے۔ جب نادیہ ۵/برس کی تھی۔ اسی وقت ان کے والد کو ممبئی آنا پڑا۔ فوجی گھرانے سے رشتے ناطے ہونے کے وجہ سے انہوں نے کئی ایسی چیزیں سیکھیں۔ جنہیں عام لڑکیاں نہیں سیکھ سکتیں۔ پھر انہوں نے شوقیہ گھوڑسواری سیکھیں۔ اسی دور میں غیر ملکوں میں بھی گئیں۔ پھر وہ ۱۹۲۰ء میں انڈیا واپس لوٹ آئیں ہندوستان آنے کے بعد وہ جارکو سرکس سے منسلک ہوگئیں۔ انہوں نے جارکو سرکس میں کام کرتے ہوئے اپنا نام تبدیل کیا تھا۔ سرکس سے شمولیت کے ساتھ ساتھ ان کی دلچسپی تھیٹر اور ایکٹنگ سے ہو چکی تھی۔ ۱۹۳۳ء میں انہوں نے پہلی مرتبہ ہندی فلم ''لال یمن'' میں ہیروئن کا کردار ادا کیا۔ جو واڈیا مووی ٹون کے جے۔ ایچ۔ واڈیا نے بنائی تھی۔ اس پرانے دور میں (اسسٹنٹ ویمن) ماردھاڑ کی شکل میں شناخت بنانے لگی تھیں۔ اس کے بعد انہیں ایک عربک فلم مکھن زینوال او چک سے جڑنے کا موقع ملا۔ جس کے بعد عرب ملکوں کے ساتھ ساتھ ایران، عراق تک ان کی اداکاری کے چرچے عام ہوگئے۔

ہندستان میں ہنٹر والی کے نام سے مشہور نادیہ نے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء کے دہے میں تقریباً ۳۵/ سے زیادہ فلموں میں کام کیا۔ انہوں نے طویل عرصہ تک سنیما کی دنیا میں راج کیا۔ اس کی خاص وجہ یہ بھی تھی کہ اس دور میں ایسی کئی فلمیں بنیں۔ جو ایکشن سے بھرپور تھیں۔ ۱۹۳۵ء میں انہیں فلم ''ہنٹر والی'' میں کام کرنے

کا موقع ملا۔ سنیما کے پردہ سیمیں سے یہ نام ملا اور پردے کے پیچھے بھی ان کا ساتھ نبھاتا چلا گیا۔ اور لوگ انہیں ہندی فلموں کی ہنٹر والی پکارنے لگے۔ دھیرے دھیرے وہ عورتوں کی پسندیدہ ایکٹریس بن گئیں۔ فلم ''ہنٹر والی'' کی بھی ڈائرکشن ہومی واڈیا نے دی تھی، اور یہ اس دور کی بیحد مقبول اداکارہ تھی۔ چند سالوں کے بعد ہنٹر والی سے بڑی کامیابی نے ہی انہیں ''ہنٹر والی کی بیٹی'' بنانے کا خیال آیا۔ فلم ساز ہومی واڈیا سے طویل عرصے سے ان کی محبت کے رشتے قائم رہے۔ دونوں شادی بھی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ہومی واڈیا کی والدہ ایک غیر ملکی پارسی لڑکی کو اپنی بہو بنانے کے خلاف تھیں۔ ۱۹۶۰ء میں ہومی واڈیا کی والدہ کی وفات کے بعد آخرکار دونوں نے شادی کر لی۔ نادیہ کی وفات ممبئی کے قلابہ ہل اسپتال میں ۱۹۹۳ء میں ہوئی۔ اس وقت وہ ۸۸/برس کی تھیں۔ ان کے پوتے نے ان پر ایک لیتھو فلم بھی بنائی۔ جس کا نام ''فیئر لیس: وی ہنٹر والی'' تھا۔ وہ ہندی فلموں کی مشہور و معروف اداکاراؤں میں سے ایک تھیں۔

فلم انڈسٹری میں ان کے کام کے ساتھ ان کے ڈریسنگ اسٹائل کا چرچا بھی خوب ہوا۔ اس دور میں جب عام عورتیں فیشن کو لے کر اتنی فیشن ایبل نہیں تھیں۔ اس وقت وہ بیل باٹم اور بوٹ پہنا کرتی تھیں۔ شاید اس کی بڑی وجہ ان کا ویسٹرن کلچر سے ہونا تھا۔ انہوں نے بہت الگ الگ طرح کے کرداروں کو بخوبی نبھایا۔ اور سلور اسکرین پر وہ محبت بھری کہانیوں پر منحصر فلموں میں کم ہی نظر آئیں لیکن پرسنل لائف میں وہ کئی بار لوگوں کے پیار میں گرفتار ہوئیں۔ ہنٹر والی عرف نادیہ کی پوری زندگی بیحد دلچسپ رہی۔ انہوں نے تقریباً ۴۰/فلموں میں اپنی کردارنگاری سے شائقین فلم کے دلوں پر راج کیا۔

۱۹۷۰ء میں ریلیز فلم ''ایک ننھی منی لڑکی'' ان کی آخری یادگار فلم ہے۔

(بشکریہ۔ اخبار مشرق۔ کلکتہ)

☆☆☆

ناقابلِ فراموش اداکارہ ومغنیّہ۔سلمیٰ آغا

فاریہ قیصر

۱۹۸۰ء کی دہائی میں بی آر چوپڑہ نے اپنی متنازع فلم ''طلاق طلاق طلاق'' بنائی تھی جس میں پاکستان کی غزل سنگر سلمیٰ آغا کو بطور ہیروئن راج ببّر کے ساتھ پیش کیا تھا لیکن فلم کے ریلیز ہونے سے پہلے فلم کے نام پر زبردست تنازع پیدا ہوگیا مسئلہ بالکل شرعی تھا لہذا اس فلم کا نام بعد میں ''نکاح'' رکھا گیا، یہ فلم سپرہٹ ثابت ہوئی تھی۔اس فلم کے ایک گیت ''دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے'' پر سلمیٰ آغا کو بہترین پلے بیک سنگر کے لئے فلم فیئر ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔

سلمیٰ آغا خاموش فلموں کی اداکارہ 1930/40 کے درمیان انوری بیگم کی نواسی تھی جس کی پیدائش ۳/اپریل ۱۹۶۲ء کو ہوئی۔پاکستان کے شہر گجرانوالہ میں اس کی پیدائش ہوئی۔اس کی نانی انوری بیگم نے ۱۹۳۲ء کی پہلی پنجابی خاموش فلم ''ہیر رانجھا'' میں ہیروئن کا رول ادا کیا تھا۔انوری بیگم اس وقت کی پری چہرہ کہلاتی تھی ،بہت کم ہیروئن ایسی حسین تھی جس طرح کا حسن انوری بیگم نے پایا تھا۔اس زمانے کے مشہور سنگیت کار رفیق غزنوی اور سلمیٰ آغا کی والدہ نسرین نے کے ایل سہگل کے ساتھ ۱۹۴۶ء کی بنی فلم شاہ جہاں میں ممتاز محل کا رول ادا کیا تھا نسرین بھی بیحد خوبصورت اور جاپانی گڑیا جیسی لگتی تھی۔نسرین نے کے ایل سہگل کے ساتھ ۱۹۴۷ء کی بنی فلم ''ایک روز'' میں بھی ہیروئن کا رول ادا کیا تھا۔سلمیٰ آغا کے والد کراچی کے ایک دولتمند تاجر تھے جو لندن جا کر بس گئے تھے۔سلمیٰ آغا بھی ۹ سال کی عمر میں لندن منتقل ہوگئی تھی۔

سلمیٰ آغا نے اپنی چھوٹی بہن شبینہ آغا کے ساتھ ایک البم ''آغا'' تیار کیا تھا جو بیحد ہٹ ثابت ہوا۔سلمیٰ اور شبینہ نے ہندی میں ABBA میں بھی گایا اور وہ البم تیار کرنے کے باوجود سلمیٰ آغا کو ہندی فلم میں کوئی خاص بریک نہیں ملا۔راج کپور نے لندن میں جب اپنے بیٹے رشی کپور اور نیتو سنگھ کی شادی کے سلسلے میں ایک پارٹی دیا تھا اس جشن میں راج کپور نے سلمیٰ آغا کی والدہ زرینہ آغا کو بھی بلایا تھا۔

اس جشن میں بہت سارے ہندوستانی فلمساز بشمول بی۔آر چوپڑہ بھی تھے،اس زمانے میں بی آر

چوپڑہ بھی اپنی فلم انصاف کا ترازو (زینت امان۔راج ببّر) کا پریمیئر لندن میں کرنے کے لئے پہنچے تھے۔اسی زمانے میں انہیں اپنی فلم ''طلاق طلاق طلاق'' (نکاح) کے لئے ایک حسین مسلم دوشیزہ کی تلاش تھی۔چونکہ زینت امان نصف مسلم تھی، اسکے والد امان (مکالمہ نگار مغل اعظم) اور ماں انگریز تھی۔اور انہیں اپنی فلم کے کردار نیلوفر کے لئے زینت امان کچھ جچی نہیں تھی۔اس زمانے میں راج کپور کو بھی اپنی فلم ''حنا'' کے لئے ایک مسلم حسین لڑکی کی تلاش تھی۔لیکن بعد میں راج کپور نے حنا بنانے کا معاملہ بھی بعد میں رکھ دیا اور اس سے پہلے پریم روگ (رشی، پدمنی کولہاپوری) بنانے لگے۔جب سلمیٰ آغا کو پتہ چلا کی بی آر چوپڑہ کو ایک مسلم لڑکی کی تلاش ہے تو وہ لندن سے ممبئی چلی آئی۔ممبئی آکر وہ راج کپور کے توسط سے بی آر چوپڑہ سے ملی اور چوپڑہ صاحب نے اسی دن اس کو سائن کرلیا۔

جب چوپڑہ صاحب نے اس کا البم ABBA سنا تو اس کو اس فلم میں گیت گانے کا بھی آفر دیا اور اس وقت چوپڑہ صاحب کو یہ اندازہ نہیں لگا کہ سلمیٰ آغا اتنی اچھی اور بڑی گلوکارہ ہے۔فلم نکاح کے گیت فلم کے ریلیز سے بہت پہلے کافی مقبول ہوگئے تھے جس کے بعد علماء اس فلم کے ٹائیٹل پر اعتراض کرنے لگے تو چوپڑہ صاحب نے فلم کا نام بدل کر نکاح کر دیا۔فلم نکاح سپرہٹ اور کلاسیک فلم ثابت ہوئی تھی۔اس فلم میں سلمیٰ آغا کے دوسرے گیت جیسے ''سماں بھی ہے جواں جواں، سنا رہا ہے داستاں، اور دل کی یہ آرزو ہے کہ دلربا ملے۔بیحد مشہور گیت ثابت ہوئے تھا۔

سلمیٰ نے بہت جلد باندرہ میں ریناراۓ کا اپارٹمنٹ خرید لیا جو اس زمانے میں پاکستانی کرکٹر محسن خان سے شادی کر کے پاکستان چلی گئی تھی۔اس وقت سلمیٰ پوری طرح سے اپنے آپ کو راضی نہیں کرسکی تھی کہ وہ صرف فلموں کی ہیروئن بنکر رہ جائے گی کیونکہ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ہر دن اگر صرف دو گانے ریکارڈ کرائے تو اس کے عوض میں دو لاکھ روپۓ مل سکتے ہیں پھر وہ فلموں کے لئے طویل تاریخیں کیوں دے سلمیٰ کی ملاقات اسی دوران لندن میں ایک مشہور تاجر محمود سپرا سے ہوئی۔جو نیویارک میں ایک بڑے اپارٹمنٹ میں رہتا تھا اور کافی مالدار شخص تھا۔محمود سپرا نے سلمیٰ کے تمام فلمی معاہدوں کو ختم کر دیا اور صرف اپنی فلموں میں اس کو ہیروئن کا کردار دیا محمود سپرا نے دو فلمیں ''بیگم صاحبہ'' اور ''بے بسی'' بنائی۔اسی دوران سلمیٰ سے اس کی محبت

پروان چڑھنے لگی اور محمود سپرا نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دی۔ لیکن محمود سپرا کی دونوں فلمیں سپر فلاپ ہوئیں اور پھر سلمیٰ کا شوہر ہی ملا اور نہ کیریئر۔ لیکن چند مہینوں کے بعد سلمیٰ کو ببّر سبھاش کی فلم ''قسم پیدا کرنے والے کی'' ملی جس میں متھن چکرورتی اور سمیتا پاٹل بھی تھے اس فلم کو سلمیٰ کے بڑے بڑے بینروں کے ذریعہ مشہور کرایا گیا اور فلم سپر ہٹ ثابت ہوئی۔ نکاح کے بعد سلمیٰ کی یہ دوسری فلم تھی جو سپر ہٹ ثابت ہوئی تھی۔ اس فلم میں سلمیٰ کا یہ گیت ''جھوم جھوم بابا'' کو فلم فیئر ایوارڈ کے لئے منتخب کیا گیا تھا مگر ایوارڈ نہیں ملا۔ اس کے بعد سلمیٰ واپس پاکستان چلی گئی جہاں اس کی چھوٹی بہن شبینہ کی کراچی کے ایک تاجر کے ساتھ شادی ہوگئی تھی۔ جب وہ لاہور میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے گئی تو وہاں اس کو پاکستانی فلموں میں ہیروئن کے رول کا آفر ملا۔ وہاں اس نے جاوید شیخ کے ساتھ ایک فلم ''ہم اور تم'' میں کام کیا۔ اس کے بعد جاوید شیخ نے اپنی ۱۵ سالہ بیوی کو طلاق دے دی اور سلمیٰ کے ساتھ شادی کرلی۔ ان دونوں نے شادی میں بیحد جلدی کی جس کی بنا پر وہ فلم ہم اور تم کی ڈبنگ بھی نہ کرسکی۔ جس کے بعد ڈبنگ کسی اور سے کرائی گئی اور فلم سپر فلاپ ہوگئی۔ سلمیٰ آغا کے زبردست کیریئر کے باوجود یہ فلم فلاپ ہوئی تھی۔

سلمیٰ آغا نے متھن چکرورتی کے ساتھ ایک اور فلم ''پتی پتنی اور طوائف'' میں بھی کام کیا۔ اس کے علاوہ راجیش کھنہ کے ساتھ اونچے لوگ اور سلمیٰ نامی فلم میں بھی کام کیا۔ اور یہ فلمیں بھی سپر فلاپ رہیں۔ بعدازاں سلمیٰ نے ایک البم ''حسن'' تیار کیا جسے لندن میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ محمود سپرا اور جاوید شیخ سے شادی اور طلاق ہوجانے کے بعد سلمیٰ نے آغا اسکوائش کوچ رحمت خان سے شادی کرلی جس نے سلمیٰ سے شادی کرنے کے لئے اپنی اس بیوی کو طلاق دیا جس سے ۱۵ سال قبل شادی کی تھی۔

گزشتہ ۲۰۰۷ء تک پتہ چلا کی سلمیٰ لندن میں اپنے تیسرے شوہر رحمت خان کے ساتھ ہے اور وہاں وہ اپنی غزلوں کے کیسٹ تیار کرکے اچھا خاصا منافع کمارہی تھی، لیکن ۲۰۰۸ء کی رپورٹ ہے کہ سلمیٰ آغا شدید بیماری کے بعد فوت ہوچکی ہے۔ لیکن اس کی موت کی خبر آج تک کسی نے نہیں سنی، ایک ٹی وی پروگرام کے دوران سلمیٰ آغا کی ایک غزل پیش کرتے ہوئے ناظم نے سلمیٰ آغا مرحومہ کہا۔ جس پر شدید حیرت ہوئی کہ اتنی مشہور اداکارہ اور مغنیّہ اس دنیا میں نہیں رہی اور کسی کو اس کی موت کے بارے میں پتہ تک نہیں چلا۔ راقم

الحروف اس کا اعتراف کرتا ہے کہ اسے صحیح معنوں میں یہ نہیں معلوم کہ سلمیٰ آغا اب اس دنیا میں ہے یا نہیں ہے۔ ایک ٹی وی پروگرام میں صرف ایک سین میں اسے مرحومہ کہا گیا ہے اور یہ نشاندہی بھی ہوئی کے اس کی موت کوے مہینے گزر چکے ہیں، اس ٹی وی پروگرام میں کمسن اداکاراؤں کے بارے میں بتایا جارہا تھا جو وقت سے پہلے چل بسی ان میں ودیا بھارتی، مدھو بالا، گیتا بالی کی تصویروں کے ساتھ سلمیٰ آغا کی تصویریں دکھائی گئیں جس سے بڑی حیرت ہوئی، اس سلسلے میں کمپیوٹر کی بھی مدد لی گئی اور معلوم کرنے کی کوشش کی گئی کہ اس خبر میں کہاں تک سچائی ہے لیکن کمپیوٹر کے مختلف چینل بھی اس کے بارے میں کچھ بتا نہ سکے، صرف آخر میں اتنا لکھا تھا کہ وہ اس وقت رحیم خان کے ساتھ لندن میں ہے لیکن پروفائیل بھی ۲۰۰۴ء کا ہے اور اسکے بعد کا کچھ بھی پتہ نہیں اور نہ ہی اس کے بارے میں کوئی نشاندہی ہوسکی، اگر فلمی قارئین اس کے بارے میں کوئی سچی خبر دے سکیں تو عین نوازش ہوگی اور ساتھ ہی ساتھ اس کی تصدیق بھی کہ سلمیٰ آغا سچ مچ زندہ ہے؟

☆☆☆

حسینۂ عالم۔ایشوریہ رائے

ثانیہ قیصر

حسینۂ عالم کا خطاب پانے والی اور ممبئی کے سب سے بڑے اسٹار امیتابھ کی بہو ایشوریہ رائے صحیح معنوں میں حسینۂ عالم کے ساتھ ساتھ قتالہ عالم بھی ہے اور اس کے حسن کے شیدائی سبھی، ہندوستان سے لے کر انگلستان تک، اور اس کی شوخ اداؤں کے معترف ملیں گے، ایشوریہ رائے اس وقت اگرچہ شادی شدہ ہے اور ابھیشیک بچن جیسے سپر اسٹار کی بیوی ہے، لیکن اس کے باوجود اسے اہم ترین فلمیں مل رہی ہیں۔ اگرچہ اس کی حالیہ فلم ''راون'' جو ابھیشیک بچن کے ساتھ تھی بُری طرح سے فلاپ ہوئی ہے۔ لیکن ابھی وہ جنوب کے سپر اسٹار رجنی کانت کے ساتھ ایک بڑے بینر کی فلم میں کام کر رہی ہے۔ ایشوریہ رائے کسی زمانے میں سلمان خان کی منظور نظر تھی لیکن درمیان میں وویک اوبیرائے کے پڑنے سے ایشوریہ نے سلمان سے اپنا دامن چھڑا لیا، چونکہ اس زمانے میں وویک کی فلمیں کامیاب ہو رہی تھیں اور دوسری طرف سلمان کی فلمیں ناکام لہٰذا ایشوریہ نے سلمان کا دامن چھوڑ کر وویک کا ہاتھ پکڑ لیا لیکن اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وویک میں کوئی دم نہیں ہے ویسے تو دھوم فلم کامیاب رہی تھی مگر اس کے بعد وویک کی یکے بعد دیگرے نصف درجن فلمیں ناکام رہیں اور مجموعی طور پر اُسے ایک فلاپ ہیرو تسلیم کر لیا گیا لیکن سلمان، وویک کو اپنا رقیب سمجھنے لگا اور دونوں میں ہاتھا پائی تک کی نوبت آئی اور ایشوریہ نے ان دونوں کو جھگڑتا چھوڑ کر ابھیشیک بچن کے ٹوٹے ہوئے دل کو سنبھال لیا جب کرشمہ کپور نے ابھیشیک سے منگنی کرنے کے بعد بھی منگنی توڑ دی اور ابھیشیک سے شادی کرنے سے انکار کر دیا، اس واقعے کے بعد کپور اور بچن فیملی کے درمیان برسوں کے روابط آنِ واحد میں ٹوٹ گئے ۔دوسری طرف ایشوریہ اپنے جیون ساتھی ابھیشیک بچن یا یوں کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ بچن کے ساتھ اپنی زندگی نباہ رہی ہے جب کہ اسے اچھی طرح سے اندازہ ہے کہ ابھیشیک بچن صرف اپنے باپ کے نام کے بل بوتے پر فلم انڈسٹری میں اپنی دھاک جمائے ہوئے ہے۔

ایشوریہ کا ابھیشیک بچن کے ساتھ انگنت فلمیں ہیں جس میں دھوم۔ گرو سپر ہٹ فلمیں ہیں لیکن ان دونوں کی ایک بکواس فلم ''بنٹی اور ببلی'' صرف ایک گیت ''کجرارے کجرارے تیرے کالے کالے نیناں''

کی وجہ سے ہٹ ہو گیا تھا اس فلم کے ایک شراب خانے میں امیتابھ اور ابھیشیک کے درمیان جس انداز میں فحش رقص کرتی ہے اس کی وجہ سے اوسط درجے کے تماش بینوں کو یہ فلم بے حد پسند آئی تھی جب کہ حقیقت یہ ہے کہ فلم سرے سے بکواس تھی۔

ایشوریہ رائے کی بہترین ہٹ فلم ''جودھا اکبر'' ہے جس میں ریتک روشن نے نوجوان مغل شہنشاہ اکبر کے رول میں اپنی بہترین اداکاری کے ذریعہ جان ڈال دی تھی لیکن بطور جودھا، ایشوریہ کوئی خاص متاثر نہ کر سکی جب کہ فلم میں اُسے اپنی اداکاری کے مظاہرے کا زیادہ موقع دیا گیا تھا۔ ایشوریہ نے ابھیشیک کے ساتھ امراؤ جان کی ری میک میں کام کیا اور وہ فلم بُری طرح سے پٹ گئی۔ اس سے پہلے ایشوریہ نے دیوداس کے ری میک میں شاہ رخ خان اور جیکی شروف کے ساتھ کام کیا، جس میں مادھوری ڈکشت نے وجنتی مالا اور ایشوریہ نے سچترا سین کا رول نبھایا مگر وہ پارو کے یادگار رول سے انصاف نہ کر سکی، دوسری طرف چندر مکھی کے رول میں مادھوری کی اداکاری کسی حد تک غنیمت رہی مگر جیکی شروف، موتی لال کے رول میں چنی لال کے رول میں بالکل پھسڈی رہے قصور ان کا نہیں تھا بلکہ فلم کے ڈائریکٹر نے اس فلم کا کباڑہ کر دیا جب کہ شاہ رخ خان نے کروڑوں روپئے اس فلم کی سجاوٹ میں صرف کر دیئے تھے لیکن چنی لال کے رول میں جیکی شروف کا ٹھک ٹھک کر گیت گانا لوگوں کو بہت ناپسند ہوا اور اس طرح سے ایشوریہ کی دونوں ری میک فلمیں امراؤ جان اور دیوداس سپر فلاپ ثابت ہوئیں۔

شاہ رخ، امیتابھ اور ایشوریہ کی فلم ''محبتیں'' البتہ سپر ہٹ ثابت ہوئی تھی جس میں امیتابھ اور شاہ رخ کی اداکاری انتہائی عروج پر تھی، شاہ رخ کی بہن کے رول میں ایشوریہ نے جوش میں کام کیا اور یہ فلم شاہ رخ کی بہترین اداکاری نیز شرد کمار اور چندرا چور کی اداکاری کی وجہ سے بیحد پسند کی گئی اس فلم میں بھی ایشوریہ اپنی اداکاری سے متاثر نہ کر سکی۔ ایشوریہ کی ابتدائی فلمیں آ ؤ پیار کریں اور ڈھائی اکشر پریم کے بھی فلاپ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

اپنے دور کی مقبول ادا کارہ۔سری دیوی

عبیدالرحمان غازیپوری

عزت،دولت،شہرت آپ کسی بھی چیز کا نام لیں،میں زندگی میں وہ سب کچھ حاصل کر چکی ہوں جس کی کوئی بھی شخص تمنّا کرسکتا ہے۔ یہ سب کچھ مجھے فلمی دنیا نے دیا ہے۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں فلموں کی بدولت ہوں۔فلمی دنیا سے نہ مجھے کوئی شکایت ہے اور نہ ہی اس دنیا کا حصّہ بننے پر مجھے کوئی پچھتاوا ہے۔

فلمی اُفق پر ستارے ڈوبتے اور اُبھرتے رہتے ہیں۔جو آج ہے،وہ کل نہیں ہوگا اور جو کل نہیں تھا وہ آج ہے،چہروں کی اس بھیڑ میں چند ایک چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو تادیر لوگوں کی نظروں میں رہتے ہیں اور انھیں نظرانداز کرنا آسان نہیں ہوتا۔عام طور پر فلمی ہیروئنوں کی پروفیشنل عمر چار یا پانچ سال سے زیادہ نہیں ہوتی مگر بعض ہیروئنوں میں اس قدر صلاحیتیں ہوتی ہیں کہ وہ برسوں چلتی رہتی ہیں اور لوگ انھیں دیکھ کر کبھی بیزار نہیں ہوتے۔اس سلسلے میں سری دیوی کی واضح مثال پیش کی جاسکتی ہے۔

آج کے دور میں بہت کم ہیروئنیں ایسی ہیں جو آئیں اور راتوں رات فلمی اُفق پر چھا گئیں یقینی طور پر سری دیوی بھی ایک ایسی ہیروئن ہے۔اس نے جس طرح اپنے آپ کو مستحکم پوزیشن میں لا کھڑا کیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔آج وہ صفِ اوّل کی ہیروئن ہے اور ہر بڑے ادا کار کے ساتھ کام کر رہی ہے۔وہ فلم سازوں کی ضرورت ہے اور لوگ اس کے نام پر فلم دیکھنے آتے ہیں۔

سری دیوی ابتداء میں صحیح روش پر نہیں چل رہی تھی مگر اب اسے اندازہ ہو چکا ہے کہ خود کو فن کے حوالے سے تادیر زندہ رکھنے کے لئے سوچ سمجھ کر فلمیں سائن کرنی ہونگی۔ پہلے وہ ہر قسم کی فلموں میں کام کر لیتی تھی مگر اب وہ ایکشن کی بھر مار والی فلموں سے دور ہوتی جارہی ہے۔ ویسے تو وہ فن کی ہر جہت پر حاوی ہے مگر پھر بھی لوگ اسے سنجیدہ اور بے ہودگی سے پاک کرداروں میں زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جنوبی ہند کی فلموں میں سری دیوی کی امیج ایک بیہودہ لڑکی کی تھی مگر ہندی فلموں نے اُسے ایک صاف ستھری امیج دی ہے اور وہ اس امیج کو زندہ بھی رکھنا چاہتی ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سری دیوی کے فن میں گہرائی آئی ہے۔وہ اپنے آپ کو بہتر طور پر پیش

کرنے کے ہنر سے واقف ہوگئی ہے۔کامیابی نے اس میں اعتماد بڑھا دیا ہے۔وہ ان چند ادا کاراؤں میں سے ایک ہے جن کو ذہن میں رکھ کر فلمیں لکھی گئیں ہیں۔کل کی سری دیوی اور آج کی سری دیوی میں بہت فرق ہے۔وہ اب بہت بدل گئی ہے۔فن کے حوالے سے بھی شخصیت کے حوالے سے بھی۔

عام طور پر لڑکیاں اسٹار بن کر آتی ہیں اور پھر ادا کاری کی سمت اختیار کر لیتی ہیں۔سری دیوی ادا کارہ بن کر آئی بعد میں اسٹار ہوئی۔سولہواں ساون اُس کی پہلی فلم تھی۔اس کے بعد ''صدمہ'' آئی مگر اس کے باوجود اسے قبول نہیں کیا گیا۔''ہمّت والا'' سے وہ ہٹ ہوئی اور ایسی ہٹ ہوئی کہ کامیابی کا سفر آج تک جاری ہے۔

اس حوالے سے وہ کہتی ہے''ابتداء میں مجھے جن دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑا اور جس مایوسی کے عالم سے گزرنا پڑا اب مجھے اس کا کوئی دکھ نہیں ہے جو بیت گیا سو بیت گیا۔ابتداء میں تو تقریباً سب ہی کو مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے مجھے ادا کارہ کی حیثیت سے شروع شروع میں اس لئے قبول نہیں کیا گیا تھا کہ''سولہواں ساون''ایک فلاپ فلم تھی۔اگر یہ فلم ہٹ ہوجاتی تو میں اُس دور میں ہی ہٹ ہوجاتی۔لیکن یہ بھی اچھا ہی ہوا اگر ایسا ہوتا میرے لئے بہت سی دشواریاں پیدا ہوجاتیں تب میرا شعور پختہ نہیں تھا اور میں اتنی چھوٹی عمر میں ملنے والی کامیابی کو برقرار نہیں رکھ پاتی۔ابتداء میں ہی کامیاب ہوجانا سب کی خواہش ہوتی ہے مگر لوگ اس سے پیدا ہونے والی الجھنوں کے بارے میں نہیں سوچتے،خیر اب تو مجھے ادا کارہ کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے۔اب کا ہے کا دُکھ اور کیسا افسوس۔''

سری دیوی نے ہٹ ہونے سے قبل چند اچھے ادا کاروں کے ساتھ کام کیا تھا جن میں امول پالیکر جیسا منجھا ہوا ادا کار بھی شامل تھا۔اس کے بعد وہ جتیندر کے ساتھ آئی اور ہٹ ہوئی۔ان دونوں ادا کاروں کے بارے میں وہ کہتی ہے۔''میں اُس دور میں پیشہ ورانہ طور پر اتنی باشعور نہیں تھی کہ یہ سوچ سکوں کہ باکس آفس پر جتندر کا نام چلتا ہے۔اگر مجھے پہلے اس کا اندازہ ہوجاتا تو بہت پہلے جیتندر کے ساتھ کام کر چکی ہوتی میں ان کی مداح رہی ہوں۔''

اپنے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے سری دیوی نے بتایا میں نے بارہ سال کی عمر میں اسکول چھوڑا تب میں ساتویں جماعت میں تھی۔ مجھے پڑھنے میں اگر چہ بہت مزہ آتا تھا مگر فلموں میں مصروفیت بڑھ جانے کی وجہ

سے میرے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ میں مزید پڑھ سکوں۔

اسکول میں سری دیوی کو کیا دوسرے بچوں پر فوقیت حاصل تھی؟ وہ آخر ایک فلم ایکٹریس تھی؟ ''نہیں، میں نے تو کم از کم ایسا نہیں سمجھا، میں تو ہر وقت خوف زدہ رہتی تھی اور اپنی والدہ کے ساتھ رہنا چاہتی تھی......اسکول میں نے اپنی مرضی سے چھوڑا۔اس سلسلے میں گھر والوں کی طرف سے کوئی دباؤ نہیں تھا۔ میری مرضی سب سے پہلے تھی مگر ہاں' یہ فیصلہ بنیادی طور پر انھوں نے ہی کیا، میری زندگی کے سارے اہم فیصلے میرے والدین نے ہی کئے ہیں۔''

بچپن کی اور خاص طور پر اسکول کی سہیلیوں کے بچھڑنے کا افسوس تو رہا ہی ہوگا؟ ''نہیں، کیونکہ یہ کمی میری بہن نے پوری کردی۔ بچپن ہی سے میری وہ بہترین سہیلی رہی ہے۔اب ہمیں ساتھ ساتھ رہنے کے زیادہ مواقع ملتے ہیں۔ پہلے میں شوٹنگ کے لئے جاتی تھی تو وہ اسکول میں ہوتی تھی۔اب وہ میرے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔اب ہم ایک دوسرے سے بہت زیادہ مربوط ہو چکے ہیں۔''

فلم انڈسٹری میں نئی لڑکیوں کے آنے سے کیا انھیں کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں سری دیوی نے کہا'' مجھے کبھی کسی سے خطرہ محسوس نہیں ہوا۔ میں جہاں تھی وہیں ہوں۔کوئی آئے کوئی جائے۔' مجھے اس سے کیا؟ یہ جو فرضی طور پر مقابلے کی فضاء پیدا کی جاتی ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو اسے کوئی نہیں مار سکتا میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا مجھے کسی سے کوئی خطرہ ہے اور جس دن بھی میں اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھوں گی، ختم ہو جاؤں گی میں آج اگر فلم انڈسٹری میں زندہ ہوں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ میرا اعتماد سانس لے رہا ہے جس دن یہ دم توڑے گا، اُس دن میرا کیریئر بھی دم توڑ دے گا۔

اسکرین پر سری دیوی بہت شوخ و چنچل اور پُر جوش نظر آتی ہے مگر نجی زندگی میں وہ بہت پُر سکون اور خود پسند ہے، نہ کسی سے زیادہ بات کرتی ہے اور نہ ہی لوگوں میں گھل مل کر رہتی ہے اس تضاد کے بارے میں وہ کہتی ہے۔''میں اپنے آپ کو دوسروں سے الگ تھلگ رکھتی ہوں زیادہ گھل مل کر رہنا مجھے پسند نہیں میں اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ کوئی میری نجی زندگی میں دلچسپی لے۔فلموں میں میری جو بھی امیج ہے وہ بس فلموں کی حد تک ہے۔ میں نجی زندگی کو اس امیج سے دور رکھنا چاہتی ہوں۔ فلمیں ہی تو میری زندگی نہیں میری زندگی میں اور بھی بہت کچھ ہے میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ مجھ میں اتنی طاقت ہے

کہ اپنے خیالات اور احساسات کو اپنی ذات تک محدود رکھوں۔

بمبئی کی فلم انڈسٹری کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہیں۔فلم والوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ لڑکیوں کا خاص طور پر استحصال کرتے ہیں۔ یہاں ذاتی مفاد کے لئے دوسروں کے گلوں پر چھری چلانے سے بھی اجتناب نہیں برتا جاتا اس روش کے بارے میں سری دیو کہتی ہیں''اگر بمبئی کی فلم انڈسٹری میں زندہ رہنا ہو تو ایک خاص حد تک خودغرض ہونا ہی پڑتا ہے۔ یہاں سب ایک دوسرے کے خلاف ہیں ہر آدمی اپنے مسائل میں الجھا ہوا ہے۔سب کو اپنی پڑی ہے۔''

کیا اس وقت سری دیوی کسی سے دوستی نبھانے کی پوزیشن میں ہے؟''نہیں بالکل نہیں۔ میں اپنے گھر اور خاندان والوں کو وقت دیدوں' یہی بہت ہے آگے کا حال تو میں نہیں جانتی مگر فی الحال میں کسی کی بھی دوستی نبھانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں''۔

اسٹارڈم کے اپنے چند ایک تقاضے ہوتے ہیں مثلاً اگر کامیابی کا تسلسل باقی رہے تو انسان زندگی کی ہر خوشی اس پر قربان کر دیتا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے کیریئر کو کسی چیز پر قربان کرسکیں۔ اگر سری دیوی کی شادی ہوگئی تو کیا وہ اپنے بھر پور کیریئر سے دستبردار ہونا گوارا کرے گی؟''ہاں! اگر مجھے اپنی پسند کا آدمی مل گیا تو یقینی طور پر میں فلموں کو خیر باد کہدوں گی۔ شادی کے بعد میرا کام کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں اگر چہ ایک کامیاب فلم اسٹار ہوں مگر خوشگوار اور بھر پور ازدواجی زندگی کی خاطر میں اس زندگی کو ترک کرسکتی ہوں''۔

سری دیوی نے اپنے کیریئر کے دوران بہت کچھ پایا۔اب وہ کیا چاہتی ہے؟ کیا وہ مطمئن ہے؟''جی نہیں، میں ہمیشہ اپنے آپ کو منفرد ڈھنگ سے پیش کرنے کے لئے کوشاں رہتی ہوں۔ جو لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں ان میں کام کرنے کا جذبہ رفتہ رفتہ دم توڑنے لگتا ہے''۔

اپنے کیریئر کی خاطر کیا سری دیوی نے کسی چیز کی قربانی کی ہے؟ مثلاً زندگی کی کوئی اور خوشی جوانی کا دور وغیرہ؟''میں نہیں سمجھتی کہ میں نے اپنے کیریئر کے لئے کوئی خاص قربانی دی ہے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے محبت گنوائی ہے۔اگر میرا کوئی بوائے فرینڈ Boy friend ہو تب مجھے اندازہ ہوگا کہ محبت کیسی ہوتی ہے جو لوگ اپنے کیریئر میں گم ہوں انھیں کسی چیز کی محرومی کا احساس نہیں ہوتا''۔

سپنوں کے شہزادے کے بارے میں وہ کیا سوچتی ہے؟ ''وہ اچھا ہو' خوبصورت ہو'اس میں شرافت ہو اور یقیناً پیارا انسان ہو میں فلم انڈسٹری کے کسی مرد سے شادی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی بات یہ نہیں ہے کہ فلم انڈسٹری کے سارے ہی مرد اپنی بیویوں کے وفادار نہیں ہوتے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہاں بے وفائی کرنے کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں.....

''شادی میں گھر والوں کی پسند سے کروں گی یہ محفوظ راستہ ہے میں فلموں کے انتخاب کے معاملے میں تو رسک لے سکتی ہوں مگر زندگی بھر کے معاملے میں رسک لینا میرے بس کی بات نہیں''۔

چلتے چلتے سری دیوی نے کہا ''میں چاہتی ہوں کہ جب میں فلمی دنیا سے رخصت ہوں تو لوگ مجھے یاد رکھیں میں نے دیکھا ہے کہ لوگ بلندیوں پر پہنچنے کے بعد مُنھ کے بل زمین پر آپڑتے ہیں، میں اُس دن سے بہت ڈرتی ہوں جب لوگ مجھے بوجھ سمجھیں گے۔ میں عروج کے دور میں ہی فلموں سے کنارہ کشی اختیار کرلوں گی تاکہ لوگ مجھے طویل عرصہ تک یاد رکھیں۔ اس دن کا میں انتظار نہیں کروں گی کہ جب مجھے ہٹایا جائے۔ میں نے ایسے بہت سے اداکاروں کا بہت گہری نظر سے مشاہدہ کیا ہے جنھوں نے اگرچہ بہت شاندار کیریئر گزارا مگر آخر میں ان کی حالت قابلِ رحم ہوئی''۔

☆☆☆

حسین وجمیل اداکارہ۔ پوجا بھٹ

محمد اکرام

ہماری فلم انڈسٹری بھی کتنی عجیب وغریب ہے کہ یہاں جو بھی ہوتا ہے تھوک میں ہوتا ہے۔ ایک دور تھا جب اس نگری میں کمار ہی کمار نظر آتے تھے اس کے بعد کپور ہی کپور، آنند ہی آنند، گانگولی ہی گانگولی اور اب جدھر دیکھو خان ہی خان نظر آتے ہیں۔ گہری نظر سے دیکھا جائے تو شاید ہر تیسرا ہیرو خان ہی ہوگا۔ اس سے پہلے ایک دور آیا تھا ''اسٹارسنز'' کا یعنی ہر پرانا اداکار اپنے بیٹے کو پردہ سیمیں پر پیش کر کے اسے سپر اسٹار بنانے کے فراق میں تھا۔ اس دور کے گزرے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ڈائرکٹرز کا دور چل پڑا۔

بالی ووڈ بمبئی میں ان دنوں نئی اداکاراؤں کا سیلاب سا آیا ہوا ہے جس کا اچھا خاصا حصّہ اسٹار ڈائرکٹر کا ہے جن اداکاروں اور ہدایتکاروں کی بیٹیاں رنگین پردے پر قہر برپا کررہی ہیں۔ ان میں قابل ذکر ہے ہدایتکار مہیش بھٹ کی بیٹی پوجا بھٹ، جس نے اپنے باپ کی بدولت ایک محفوظ مقام بنالیا ہے۔ کیوں کہ اس کی ریلیز ہوئی تقریباً تمام فلموں کی ہدایت مہیش بھٹ نے دی ہے اور اتفاق ہے ہر فلم کامیاب رہی ہے۔

مہیش بھٹ جب ''ڈیڈی'' کے اسکرپٹ پر کام کررہے تھے تب ان کا خیال ''جنم'' کی طرح ٹیلی فلم بنانے کا تھا تو انہوں نے اپنی بیٹی کو مرکزی کردار ادا کرنے کیلئے دیا۔ ''ڈیڈی'' میں کام کرتے وقت اس کے ذہن میں ایک خوف تھا جو اس کو ہر وقت پریشان کئے رہتا تھا اور وہ تھا ناکامی کا خوف پہلے وہ ''ڈیڈی'' کرنے کے حق میں نہیں تھی مگر ڈیڈی کا کہنا ماننا پڑا اور صرف تجربے کے طور پر اس نے اپنی زندگی کے ساٹھ دن ''ڈیڈی'' کی نذر کردیئے۔ ان ساٹھ دنوں میں اسے نئے تجربے ہوئے کیوں کہ اس میں کام کر کے اسے محسوس ہوا کہ اداکاری کس قدر مشکل ہے یہاں ہر موڑ پر قابلیت اور صلاحیت کے ساتھ ایک نئے چیلنج کا سامنا ہوتا ہے۔ ''ڈیڈی'' میں اس کے سامنے منوہر سنگھ اور انوپم کھیر جیسے بہترین اداکار تھے انہوں نے بھی اس کی بہت مدد کی اور مہیش بھٹ نے بھی اسے اداکاری کرنے کا موقع دیا۔

''ڈیڈی'' میں پوجا کے کام کی بہت تعریف ہوئی اس سے ۱۰۰۰/ امیدیں وابستہ کی جانے لگیں کہ وہ گلیمر کی گڑیوں میں ایک مقام بنا سکتی ہے۔

"ڈیڈی" کے کچھ عرصہ بعد اس کی دوسری فلم "دل ہے کہ مانتا نہیں" ریلیز ہوئی جو انگریزی فلم "اِٹ ہیپنڈ ان ون نائٹ (It Happend In one Night) پر مبنی ہے حالانکہ اس سے پہلے اس پر "چوری چوری" (راجکپور رنرگس) بھی بن چکی ہے۔ فلم پر چوری کا الزام تو لگا مگر کسی نے پوجا کو نرگس نہیں کہا۔ ایک اداکارہ کے طور پر اس کی اپنی علیحدہ پہچان بن گئی۔ "دل ہے کہ مانتا نہیں" کی کاروباری کامیابی کے بعد اس کے پاس متعدد فلموں کے آفرز آئے مگر اس نے چند بہترین فلمیں ہی سائن کیں۔

اس کی فلم "سڑک" بھی انگریزی فلم "پریٹی وومین (Pretty Woman) سے متاثر ہوکر بنائی گئی۔ پریٹی وومین میں ولیارابرٹس نے بہترین اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا مگر پوجا نے اس کی قطعی نقل نہیں کی بلکہ ایک نئے ڈھنگ سے اسے پیش کر کے اپنی فنکارانہ صلاحیت کا لوہا منوالیا۔

ایسا نہیں کہ پوجا میں خوبیاں ہی خوبیاں ہیں خامیاں نہیں، اس میں خامیاں بھی ہیں۔ لیکن اس کی محنت اور لگن کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ خامیاں بہت جلد ختم ہو جائیں گی ایسی امید ہر اس شخص کو ہوگی جو پوجا بھٹ کو پسند کرتا ہے۔ پوجا کو اپنے ڈیڈی پر فخر ہے وہ انہیں حساس اور کامیاب ہدایتکار مانتی ہے اسے اُن کی وہی فلمیں پسند ہیں۔ جنہیں آرٹ فلموں کا خطاب دیدیا گیا ہے جیسے "ارتھ"، "سارانش"، "کاش"، "جنم"، اور "ڈیڈی" جبکہ لہو کے دو رنگ "وشواس گھات"، "ٹھکانہ"، "جرم"، "آوارگی" بنانے والے ہدایتکار مہیش بھٹ کو بالکل پسند نہیں کرتی۔ یہ اس کا فن کے تئیں ایمانداری کا جذبہ ہے۔ یہی جذبہ اس کے مستقبل کو تابناک بنانے میں کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

ہندی فلموں کی ناقابلِ فراموش اداکارائیں

خورشید اختر فرازی

ہندی فلموں میں کئی ایسی اداکارائیں گزری ہیں جنھوں نے اپنی فلمی کیریئر میں ایک ہیرو کے ساتھ زیادہ فلمیں کیں پھر اسی سے شادی کر کے گھر بسا لیا یا زندگی بھر اس کی بن بیاہی بیوی کے طور پر زندگی گزار دی۔ ایسی ہیروئینیں فلم کے ہیرو یا ہدایتکار وفلمساز کے ساتھ ایسی چپکی کہ بس ان کی زندگی وہیں محدود ہو کر رہ گئی یا پھر یوں کہا جائے کہ اس ہیرو یا ہدایتکار نے اسے زندگی بھر اپنے چنگل سے نکلنے نہیں دیا۔ ایسی ہیروئنوں میں سندھیا، بینا رائے، پریہ راج ونش، کلپنا کارتک وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جس میں بینا رائے اور کلپنا کارتک نے تو پریم ناتھ اور دیوآنند سے باقاعدہ ہندو رسم ورواج کے مطابق شادی کر لی تھی لیکن ہدایتکاروں میں شانتارام نے سندھیا کو اور ہدایتکار چیتن آنند نے پریہ راج ونش کو بغیر شادی کے اپنی رکھیل بنا کر رکھ لیا تھا۔ پرانے اداکار کشور ساہو نے بھی اپنی رقاصہ بیوی سے ساتھ شادی نہیں کی تھی جس سے ایک بیٹی نینا ساہو ہوئی جو پونم کی رات، ہرے کانچ کی چوڑیاں وغیرہ میں منوج کمار اور بسواجیت کی ہیروئن بن کر آئی تھی اس کے علاوہ ایک کلی مسکائی میں بھی نینا ساہو جوئے مکھر جی کی ہیروئن بنی تھی۔ پریہ راج ونش کا پانچ سال قبل بہیمانہ طریقے سے قتل ہو گیا تھا اور قتل کے الزام میں چیتن آنند کے بھتیجے نینو آنند اب تک جیل میں ہیں ایک اور ٹینو آنند جو معاون اداکار کا رول کرتے ہیں ان کا آنند فیملی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ شانتارام جو حد درجہ فرقہ پرست تھے فلم سہرا میں انتہائی مجبوری کے عالم میں ایک گیت رفیع کو دیا تھا وہ گیت آج بھی سپرہٹ ہے "تقدیر کا فسانہ جا کر کسے سنائیں"، وہ شانتارام تین دہے قبل گزر چکے ہیں اور ان کی دھرم پتنی جے شری اداکارہ راجشری (سہاگ رات، اراونڈی ورلڈ، سگائی شہنائی) کی ماں سندھیا کو اس کے بنگلے سے نکال کر قبضہ کر بیٹھی ہے اس وقت سندھیا جو کہ قریب ۷۰ سال کی ہے اب تک وارانسی کے ایک مندر میں شانتارام کی یاد میں مالا جپتی رہتی ہے۔ بینا رائے بھی ۸۰ سال کی ہو چکی ہے بیس سال قبل وہ بھی بیوہ ہو چکی ہے اور جب تک پریم ناتھ زندہ رہے اس کے ساتھ کبھی نہیں بنی، کیونکہ پریم ناتھ انتہائی اوباش اور شرابی تھے اور بینا رائے کو پاگل مشہور کر کے کئی برسوں تک آگرہ کے پاگل خانہ میں بھی رکھ چکے ہیں۔

یہاں مسئلہ کلپنا کارتک کا رہ گیا ہے، آیئے اس اداکارہ کے بارے میں چند قیمتی معلومات آپ تک فراہم کی جائیں، پچھلے ہفتے ایک غلطی ہوگئی تھی جس میں شکیلہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ اس نے ثریا کے بچپن کا رول کیا تھا، دراصل وہ رول وینا کے بچپن کا ہے اور ثریا اس فلم ''داستان'' میں راجکپور کی ہیروئن تھی۔اس غلطی کی طرف نشاندہی کرنے پر پرانی فلموں کے انسائیکلو پیڈیا ڈاکٹر الف انصاری کا بہت بہت شکریہ۔انہوں نے اسی مضمون میں دوسری غلطی کی طرف بھی دھیان دلائی کہ جانی واکر کی بیوی نور، شکیلہ کی سہیلی نہیں بلکہ اس کی سگی چھوٹی بہن تھی اور اس کے لئے انصاری صاحب دلی مبارکباد کے قابل ہیں۔

کلپنا کارتک: کلپنا کارتک کی پیدائش ۱۹۳۵ء میں آگرہ کے ایک کاروباری خاندان میں ہوئی اس نے ابتدائی تعلیم لکھنؤ کے سنٹ زیویر چرچ سے مکمل کیا اور ۱۹۵۷ء میں پہلی مرتبہ اسے دیوآنند نے اپنی فلم ''نو دو گیارہ'' میں لیا۔اگرچہ نو دو گیارہ کی ہدایت انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی وجے آنند کے سپرد کی تھی اور دوسری فلم ''فنٹوش'' کی ہدایت اس کے بڑے بھائی چیتن آنند دے رہے تھے اور یہ دونوں فلمیں ایک ماہ کے آگے پیچھے بنکر تیار ہوئیں، دونوں فلموں کی ہیروئین کلپنا کارتک تھی۔نو دو گیارہ ایک سسپنس فلم تھی اور اس فلم کے کئی گیت بیحد مقبول ہوئے تھے جیسے ''ہم ہیں راہی پیار کے، ہم کسی کے ہولئے'' آنکھوں میں کیا تھی۔کسی کا آنچل، سانسوں میں کیا تھی کس کا ہلچل'' اس فلم نے بزنس کا نیا ریکارڈ بنایا تھا۔ایس ڈی برمن کے سنگیت اور مجروح کے گیتوں نے اس فلم کو صحیح معنوں میں سپر ہٹ بنا دیا تھا۔فنٹوش ایک پاگل کی کہانی تھی اور فلم میں کئی سین بہت ہی المیاتی تھے، ساحر کے گیتوں اور ایس ڈی برمن کے سنگیت نے فلم میں چار چاند لگا دیئے تھے۔جو اس فلم کی کامیابی کا ضامن بن گیا تھا۔دیوآنند نے فلم فنٹوش کے بعد صرف گائیڈ، کالا پانی اور بات ایک رات کی، میں بہت ہی اچھی اداکاری کی تھی۔

دیوآنند نے فنٹوش اور نو دو گیارہ کے بعد اپنی کئی فلموں میں کلپنا کارتک کو ہیروئن کے رول میں پیش کیا۔فلم افسر میں اس کو چھوٹا سا رول دیا تھا اور اصل یہ رول نلنی جیونت کو دیا گیا تھا۔فلم کالا پانی اور جعلی نوٹ میں وہ ہیروئن کا رول کرنا چاہتی تھی، لیکن اسی زمانے میں دیوآنند نے اس سے شادی کا پروگرام بنالیا اور ان دونوں فلموں میں مدھوبالا اور نلنی جیونت کو لیا۔

شادی کے بعد کلپنا کارتک نے فلموں کو تیاگ دیا، لیکن چند سال بعد جب دیوآنند دو لڑکوں کے باپ

بن گئے تو رفتہ رفتہ کلپنا سے ان کی رنجش شروع ہوگئی پھر ایسا ہوا کہ ۱۹۷۰ء میں جب دیوآنند جوہو میں رہنے لگے تو دونوں ایک ہی بنگلہ کے اوپر نیچے رہتے تھے لیکن گزشتہ ۴۰ برسوں سے انہوں نے کلپنا کارتک سے بات نہیں کی ہے۔اگرچہ اس کا سارا خرچہ وہ چلاتے ہیں اور وہ انتہائی شان سے رہتی ہے لیکن ۱۹۷۰ء سے ۲۰۱۰ ہوگیا ہے اور ان ۴۰ برسوں کے دوران ان دونوں میں بات چیت بند ہے۔دیوآنند نے اس دوران ظاہرہ، زینت آمان، ہیما مالنی، ریکھا، راکھی، انجو مہیندرو، نیتا (امبانی) سمیت آئی۔ ہیروئنوں سے عشق لڑائے اور ان کے ساتھ ایسی ایسی فلمیں کیں جو اس عمر کے ہیرو کو زیب نہیں دیتا، فلم ہیرا اپنا، کام شاستر، عشق عشق عشق وغیرہ میں زینت امان کو انتہائی فحش لباس پہنایا اور کہا جاتا ہے کہ راجکپور کے بعد دیوآنند ہی ایک ایسے اداکار اور ہدایتکار تھے جو اپنی فلم کی ہر ہیروئن کو ننگا کردیتے تھے۔ راجکپور نے پدمنی، وجنتی، مالا، سادھنا، منداکنی، سمی اگروال وغیرہ، کو یکے بعد دیگرے اپنی فلموں میں ننگا کیا تھا۔اس کے جواب میں دیوآنند نے بھی اپنی بیشتر فلموں میں ہیروئین کو بالکل ننگا کرکے پیش کیا۔

کم کم: پرانی فلموں کی ایک اور ہیروئن کم کم بھی ہے جس نے کوہ نور میں رقاصہ کا رول کیا تھا اور دلیپ کمار، مینا کماری کے ساتھ اس کو متوازن رول ملا تھا۔کم کم نے کم وبیش ۱۰۰ فلموں میں اداکاری کی۔ پہلے وہ زیادہ تر کشور کمار اور دارا سنگھ کی ہیروئین بنکر آتی رہی۔لمبوانِ ہانگ کانگ میں شیخ مختار، ہم سب استاد ہیں میں شیخ مختار، اسمگلر میں شیخ مختار، سنجیو کمار اور گنہگار میں شیخ مختار کے ساتھ نظر آئی، اس کے علاوہ کشور کمار کے ساتھ تقریباً نصف درجن فلموں میں ہیروئن کا رول ادا کیا بعد ازاں ساجد خان اور کرن کمار (پہلی فلم) کے ساتھ سویرا میں ہیروئن کا رول کیا جس کے ہدایتکار رامانند ساگر تھے۔اس کے بعد کم کم رامانند ساگر کی فلموں کی ضرورت بن گئی اور اس کو اس فلم میں اہم رول دیا گیا۔اس سے پہلے کشور کمار کے ساتھ مسٹر ایکس ان بمبئی اور جھوٹا سچا میں اہم رول کیا۔فلم ایک سپیرا ایک لٹیرا میں کم کم، فیروز خان کی ہیروئن بنی جو سپر ہٹ فلم تھی، رامانند ساگر نے اسے آنکھیں میں دھرمیندر کی بہن، گیت میں راجیندر کمار کی بہن کے رول میں پیش کیا اور یہ دونوں فلمیں سپر ہٹ ہوئیں۔پھر پتہ چلا کہ رامانند ساگر نے اس کو ایک بنگلہ خرید کر دے دیا، کم کم نے شادی نہیں کی اور زندگی بھر جب تک رامانند ساگر زندہ رہے وہ ان کی ہر طرح سے دیکھ بھال کرتی رہیں۔

شیاما: شیاما ایک بیحد حسین اور چنچل قسم کی ہیروئن تھی۔گرودت کی فلم آر پار میں اسے ہیروئن

کا رول دیا گیا تھا۔شیاما اس زمانے میں دیو آنند، گرودت، رحمٰن، کرن دیوان کے مقابل ہیروئن بن کر آئی ۔فلم آر پار میں گرودت کے ساتھ اس پر فلمائے گیت ،کبھی آر کبھی پار لاگا تیر نظر'' اور یہ لو میں ہاری پیا تمہیں میرے میت ہو، کاہے کا جھگڑا بالم'' بیحد مشہور ہوا تھا۔فلم'' دل دیا درد لیا'' میں دلیپ کمار اس سے جھوٹی محبت کی اداکاری کرتے ہیں تو اس وقت اس کی جذباتی اداکاری قابل دید ہوتی ہے۔شیاما نے بعد میں کئی فلموں میں ویمپ کے رول بھی کئے عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے موٹاپے میں بیحد اضافہ ہوا۔ راج کپور، نرگس، ثریا وغیرہ کے ساتھ بھی اس نے کئی فلمیں کیں ۔اس نے اپنی زندگی میں کئی طرح کے رول کئے ،لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فلمسازوں نے اس کی صلاحیتوں کا صحیح استعمال نہیں کیا ورنہ وہ اور بھی کئی برسوں تک چل سکتی تھی۔

ہندی فلموں میں سکنڈ گریڈ ہیروئنیں بھی اپنی جگہ پر کافی اہمیت رکھتی تھیں اوران سے چند ہیروئنوں نے عرصے تک بہن کا رول نبھا کر اپنی ایک مخصوص پہچان بنائی، بلکہ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ فلمسازوں نے انہیں ٹاپ بنا کر رکھ دیا اور ہر فلم میں انہیں صرف ہیرو یا ہیروئن کے بہن کے رول میں پیش کیا۔ایسی ہیروئنوں میں ہم یقیناً ناظمہ،فریدہ جلال، کمد چگانی اورارونا ایرانی کا نام بجا طور پر پیش کر سکتے ہیں۔۱۹۶۰ء سے ان ہیروئنوں نے اپنی زندگی یعنی فلمی دنیا کا سفر شروع کیا، پہلے ناظمہ آئی پھر فریدہ جلال، پھر ارونا ایرانی اور اس کے بعد کمد چگانی اور ۶۰ سے ۸۰ کی دہائیوں کے دوران ان چاروں سکنڈ گریڈ ہیروئنوں نے انگنت فلموں میں اپنی بہترین اداکاری کا مظاہرہ کیا،فریدہ جلال اور ارونا ایرانی تو اب بھی فلموں اور ٹی وی سیریلوں میں نظر آتی ہیں۔لیکن ناظمہ اور کمد چگانی بالکل لاپتہ ہیں،مندرجہ ذیل میں شہرت کے اعتبار سے ان متذکرہ ہیروئنوں کا مختصر جائزہ پیش کیا جارہا ہے جو قارئین کیلئے یقیناً دلچسپی کا باعث بنے گا۔

فریدہ جلال: فریدہ جلال اپنے دور کی بیحد حسین اور گڑیا جیسی شکل والی لڑکی تھی اور سب سے پہلے ۱۹۶۶ء کی ریلیز فلم'' دوستی'' میں اسے ستین بوس نے سنجے خان کی نیم پاگل اور بیمار بہن کے رول میں پیش کیا تھا اوراس فلم میں فریدہ جلال کی معصوم اداکاری نے لوگوں کے دل کو چھولیا تھا۔اس کے بعد اسے فلم'' بہاروں کا موسم'' میں مینا کماری اور رحمٰن کی بیٹی کے رول میں پیش کیا گیا جس کے ہیرو دھرمیندر تھے۔ یہ بہت ہی سسپنس فلم تھی جس میں رحمٰن اپنی بیوی مینا کماری کو قتل کر دیتے ہیں اوراس کی جڑواں ہمشکل بہن کو اس کی

جگہ لے آتے ہیں تا کہ اس نیم پاگل اور بیمار کی ساری دولت پر خود قبضہ کرلیں۔اس فلم میں اگرچہ فریدہ جلال کا رول بیحد مختصر تھا لیکن اس کے باوجود اُسے پسند کیا گیا۔۱۹۷۰ء کی ریلیز'' پارس'' میں اسے سنجیو کمار کی بہن کا رول دیا گیا تھا جس کی ہیروئن راکھی اور ویلین شتروگھن سنہا تھے۔اس فلم میں وہ محمود کی ہیروئن بنی تھی۔۱۹۶۸ء کی زبردست کلاسیک فلم'' گوپی'' میں فریدہ جلال کو دلیپ کمار کی بہن کے رول میں پیش کیا گیا جس میں فریدہ کے ہیرو کے رول میں پرانے دور کے اداکار رسدیش کمار تھے۔فلم گوپی میں فریدہ جلال کا سائرہ بانو اور دلیپ کمار کے ساتھ کئی جذباتی سین تھے اور ایک بہن کے رول میں فریدہ جلال نے اپنی اداکاری کے ذریعہ بیحد متاثر کیا تھا۔اس وقت تک فریدہ ایک منجھی ہوئی اداکارہ بن چکی تھی۔فریدہ جلال کو سب سے بہترین بریک ۱۹۷۱ء کی ریلیز شکتی سامنت کی فلم'' ارادھنا'' میں ملا جس میں وہ راجیش کھنہ کی ہیروئن بنی۔اس فلم میں راجیش کھنہ کے ڈبل رول تھے اوراس کی پہلی ہیروئن شرمیلا ٹیگور تھی۔اس فلم میں راجیش کے ساتھ اس کا ایک گیت'' باغوں میں بہاروں،کلیوں میں نکھار ہے،تم کو مجھ سے پیار ہے'' بیحد مشہور گیت ثابت ہوا تھا اس فلم نے پورے ہندوستان میں کامیابی کے نئے ریکارڈ توڑے اور ہر شہر میں یہ فلم پلاٹینم جبلی ہوئی تھی۔

فریدہ جلال بعد میں ماں کے رول میں نظر آنے لگی۔سنّی دیول کی کئی فلموں میں اُسے ماں کا رول دیا گیا اس کے ساتھ ساتھ فریدہ نے چھوٹے بڑے پردے یعنی ٹیلی سیریل میں بھی کام کرنا شروع کیا اور چھوٹے پردے میں بھی اُسے زبردست شہرت ملی، وہ آج بھی کئی ٹی وی سیریلوں میں نظر آتی ہے اور ایک بھوتنی والا سیریل تو کئی برسوں سے مسلسل جاری ہے۔

ناظمہ: من موہنی صورت والی ناظمہ چھوٹے قد کی ہیروئن تھی اوراس کی جذباتی اداکاری کا بھی کوئی جواب نہیں تھا،۱۹۶۳ء میں ہومی واڈیا کی ایکشن تھریلر فلم'' نشان'' میں اسے پہلی مرتبہ ہیروئن کے رول میں پیش کیا گیا اوراس فلم میں سنجیو کمار پہلی مرتبہ ہیرو کے رول میں نظر آئے۔اس فلم میں سنجیو کمار ڈبل رول میں تھے۔اگرچہ اس سے پہلے سنجیو کمار فلم'' ہم ہندوستانی'' میں جس میں سنیل دت، آشا پاریکھ اور جوائے مکھر جی تھے اس میں عدالت کے آخری سین میں سنجیو کمار کو انسپکٹر کے رول میں صرف کھڑا دکھایا گیا تھا اوراس کی زبان سے ایک بھی ڈائیلاگ ادا نہیں ہوا تھا اس فلم کی کاسٹنگ میں ان کا نام سنجیو کمار کے بجائے ہری بھائی کے طور پر لکھا گیا تھا۔بہرکیف نشان نے کلکتہ سمیت کئی شہروں، بشمول ممبئی، بنگلور اور مدراس میں اچھا بزنس کیا اور سنجیو کمار و ناظمہ دونوں کو اچھے اداکار کے طور پر تسلیم کرلیا گیا۔ ناظمہ کو اس کے بعد وجے بھٹ کی فلم راجہ میں

جگدیپ اور پترا تھے سائیڈ رول ملا اور پھر ناظمہ زیادہ تر سائیڈ رول میں نظر آنے لگی ۱۹۶۹ء میں پرمود چکرورتی کی فلم ''ضدّی'' میں اسے آشا پاریکھ کی چھوٹی بہن کا رول ملا جس کے بعد وہ بہن کے رول کے لئے ٹاپ ہوگئی اور انگنت فلموں میں صرف بہن کا رول ادا کیا۔

۱۹۷۰ء میں راما نند ساگر کی سپر ہٹ فلم ''آرزو'' میں اسے راجندر کمار کی بہن کا رول ملا جس میں سادھنا اور فیروز خان بھی تھے۔اس فلم میں ناظمہ کی جذباتی اداکاری بیحد متاثر کن تھی خاص طور پر اس سین میں جب راجندر کمار اسے اپنا کٹا ہوا پاؤں دکھاتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس نے کیوں اس کی سہیلی سے بے وفائی کی۔اس سین میں ناظمہ کے رونے کا انداز بہت ہی نیچرل تھا۔ ۱۹۷۱ء کی ریلیز ''آئے دن بہار کے'' جو موہن کمار کی ہدایت میں بنی تھی اس میں بھی ناظمہ کو آشا پاریکھ کی بہن کا رول ملا تھا۔لیکن ناظمہ کو جلد احساس ہوگیا کہ اس کے ساتھ استحصال ہو رہا ہے اور ہدایتکار اس کی صلاحیتوں کو صرف بہن کا رول دے کر ضائع کر رہے ہیں۔جس کے بعد اس نے فلمی دنیا سے علاحدگی حاصل کر لی اور انڈامان کے ایک خاندان کے لڑکے سے شادی کر لی جو ریڈیو آفیسر تھا۔وہ خاندان انڈامان سے ہجرت کر کے کولکاتا کے خضر پور کے علاقے ابراہیم روڈ میں بس گیا تھا ناظمہ کی نند ساجدہ عندلیب اب بھی وہاں مقیم ہے اور کسی اسکول میں ٹیچر ہے۔ناظمہ اپنے شوہر کے ساتھ دبئی میں جا بسی ہے۔

ارونا ایرانی: ہندی فلموں کی چند بیحد باصلاحیت اداکاراؤں میں ایک نام ارونا ایرانی کا بھی ہے ارونا ایرانی مراٹھی اسٹیج اداکارہ ہے جسے پہلی مرتبہ دلال بوس کی فلم ''انوکھی رات'' میں پیش کیا گیا تھا جس میں اجے ساہنی (پریکشت ساہنی) نے پہلی مرتبہ ہیرو کا رول ادا کیا فلم کی ہیروئن زاہدہ (پریم پجاری، گیمبلر) تھی اس فلم میں سب سے اہم رول میں سنجیو کمار تھے جو ایک خطرناک ڈاکو تھے اور چند رئیس زادوں نے اس کی بیوی کی عصمت دری کی تو اس نے خودکشی کر لی تھی جس کے بعد وہ تمام رئیس زادوں کا قتل کر کے قانون شکن بن جاتے ہیں اور ایک ایسے گھر میں ایک طوفانی رات میں پناہ لیتے ہیں جہاں چند جرائم پیشہ رئیس بھی ہوتے ہیں۔ بہرکیف اس فلم میں ارونا ایرانی کا کردار بہت ہی اہم تھا اور اس نے اپنی اداکاری کے ذریعہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا تھا۔ بعد ازاں ارونا ایرانی نے محمود کے ساتھ اپنی جوڑی بنائی اور لاوارث، سہاگ رات جیسی انگنت فلمیں ارونا ایرانی نے محمود کے ساتھ کی بلکہ وہ دو فلموں بمبئی ٹو گوا اور انصاف میں امیتابھ بچن کی ہیروئن بھی بنی فلم کارواں میں جتندر اور آشا پاریکھ کے ساتھ اس نے

متوازی رول کیا اور فلم بابی میں رشی کپور کے ساتھ اہم رول ادا کیا۔

ارونا ایرانی نے فلم انداز میں شمی کپور اور ہیما مالنی کے ساتھ اہم رول نبھایا۔ بعد ازاں جب ماں بنکر کام کرنے لگی تو فلم بیٹا میں انیل کپور اور مادھوری ڈکشت کے ساتھ کام کیا۔فلم ہم جولی میں محمود کے ساتھ اس کا بہترین رول تھا جس میں محمود کا ٹرپل رول رہا۔فلم دیاوان میں ارونا ایرانی نے فیروز خان، ونود کھنہ اور مادھوری ڈکشت کے ساتھ اہم رول کیا۔اس کے علاوہ قربانی میں وہ شکتی کپور کی بہن کے رول میں بیحد کامیاب نظر آئی۔ ان دنوں ارونا ایرانی چھوٹے پردے میں آرہی ہے اور کئی کامیاب سیریلوں کو اس نے بہت ہی شاندار طریقے سے فلمایا ہے۔

کمد چگانی: کمد چگانی بیحد حسین اداکارہ رہی لیکن اس کا فلمی کیریئر بہت ہی مختصر رہا اور اس نے بہت کم فلمیں کیں، شرط فلم میں اس نے سنجے خان اور ممتاز کے ساتھ متوازن رول ادا کیا تھا بعد ازاں اسے زیادہ تر بہن کے رول میں پیش کیا گیا۔فلم ریشم کی ڈوری میں وہ دھرمیندر کی بہن بنی تھی جس کی ہیروئن سائرہ بانو تھی۔ کمد چگانی چونکہ بے حیائی کا لبادہ اوڑھنے کے لئے تیار نہیں تھی اور اس نے کسی بھی فلم میں ننگے کپڑے اور فحش سین کرنے سے انکار کر دیا تھا لہٰذا فلمسازوں نے بھی رفتہ رفتہ نظر انداز کرنا شروع کر دیا چونکہ وہ ان ہیروئنوں میں سے تھی جسے اپنے جسم کی نمائش کسی بھی قیمت پر پسند نہیں تھی اور کمد چگانی کی طرح سے بہت ساری ہیروئن جو اپنا فلمی کیریر بنا سکتی تھیں وہ پردے سے آؤٹ ہوگئیں اور انہی میں سے ایک کا نام کمد چگانی بھی ہے۔ کمد نے بعد ازاں ایک تاجر سے شادی کر لی اور لندن جا بسی ہے۔

☆☆☆

فلم اور فلمی ہستیوں کی زندگی سے متعلق اہم معلومات

ہندوستان کی پہلی خاموش فلم ''راجہ ہریش چندر'' ۱۹۱۳ء

ہندوستان کی پہلی متکلم (بولتی) فلم ''عالم آرا'' ۱۹۳۱ء

★ ۷/جولائی ۱۸۹۶ء کو لوئر برادرز نے اپنے سینماٹوگراف کی بمبئی کے واٹسن ہوٹل میں نمائش کی جس میں ایک منظر پلیٹ فارم پر ٹرین آنے کا ___ دوسرا کچھ عورتوں کے سمندر میں نہانے کا ___ اور ___ تیسرا کچھ سپاہیوں کا گاڑی میں جانے کا تھا۔

۱۸۹۶ء میں کچھ اور مختصر فلمیں بنائی گئیں جن میں کچھ مناظر دلّی شہر اور لکھنؤ کے بڑے امام باڑے کے دکھائے گئے۔

★ ۱۸۹۸ء میں پروفیسر اینڈرسن نے بمبئی اسٹیشن پر ٹرین آنے اور پونا میں گھوڑ دوڑ کے مناظر فلم میں کر دکھائے۔اسی زمانے میں پروفیسر اسٹیونس نے ایک ناچ ''فلاور آف ایشیا'' اور مختلف ہندوستانی تہواروں کے جلوسوں کے مناظر کی فلمیں بنا کر پیش کیں۔

★ ۱۸۹۹ء میں بھاٹوا ڈیکر نے دو مختصر فلمیں بنائیں جن میں پہلی بار فلم کے لئے مناظر کا بندوبست کیا گیا۔پہلے منظر کے لئے دو پہلوانوں کی کشتی دکھائی گئی ___ دوسرے منظر کے لئے ایک بندر والے سے بندر کو سکھانے کا سین فلمایا گیا۔

★ ۱۹۰۱ء میں کلکتہ کے ہیرالال سین نے اپنے زمانے کے سات بنگالی ناٹکوں کو فلمایا تھا۔

★ ۱۹۰۲ء میں سیٹھ جمشید فرام جی' نے کلکتہ میدان میں ایک خیمے میں بائسکوپ شو دکھانے کا اہتمام کیا تھا۔

★ ۱۹۰۵ء میں کلکتہ کے ایف۔جے۔مدن نے پہلی بار ایک منظّم فلم انڈسٹری بنائی

جس میں آدھے گھنٹے اور پون گھنٹے کی فلمیں تیار کیں جن کو فیچر فلم کہا جا سکتا ہے۔

★ ڈرامائی فلم بنانے کی پہلی کوشش این۔جی چترے نے فلم ''پنڈلک'' کے ذریعہ کی جو مہاراشٹر کے ایک رشی پنڈلک کی زندگی پر مبنی تھی اس فلم کی نمائش ۱۸مئی ۱۹۱۲ء کو کی گئی تھی۔

★ ہندوستانی پہلی خاموش فلم ''راجہ ہریش چندر'' ۱۹۱۳ء میں بنی۔اس فلم کے خالق دادا صاحب پھالکے ہیں۔اس فلم کی لمبائی ۳ ہزار ۷۰۰ فٹ تھی۔

★ پہلی خاموش فلم کے ہیرو ڈی ڈی ڈابکے تھے۔

★ پہلی بولتی فلم 'عالم آرا' کے پہلے ہیرو ماسٹر وٹھل تھے۔

★ پہلی بولتی فلم 'عالم آرا' کی پہلی ہیروئن مس رانی زبیدہ تھی۔

★ پہلی بولتی فلم 'عالم آرا' میں پہلی گلوکارہ کی حیثیت سے رانی زبیدہ نے یہ گانا گایا تھا۔

بدلہ دلائے یارب تو ستم گروں سے

★ پہلی بولتی فلم عالم آرا میں پہلی بار گلوکار کی حیثیت سے ڈبلو ایم خان نے یہ گانا گایا تھا۔

دیدے خدا کے نام پر

★ پہلی خاموش بنگلہ فلم ستیہ وادی ہریش چندر تھی جو ۱۹۱۷ء میں پیش کی گئی تھی۔

پہلی خاموش فلم راجہ ہریش چندر میں عورتوں کے کردار بھی مردوں نے ہی کئے تھے۔اس فلم میں واحد خاتون اداکارہ 'مندا کنی' تھی جو فلم کے پروڈیوسر' ڈائرکٹر' ایکٹر دادا صاحب پھالکے کی بیٹی تھی۔

★ ۱۹۲۱ء میں وھیرن بابو نے ''انگلینڈ ریٹرن'' کے نام سے ہندوستان کی پہلی سوشل فلم تیار کی تھی۔

★ ہندوستان کی پہلی بولتی فلم ''عالم آرا'' ۱۴/مارچ ۱۹۳۱ء کو ریلیز ہوئی۔اس فلم کے خالق آردشیر ایرانی تھے اس فلم میں پہلی بار کل سات گانے پیش کئے گئے تھے۔

★ فلم ''شیریں اور فرہاد'' میں ۴۲ گانے تھے جو ایک ریکارڈ ہے۔

★ ہندوستان کی پہلی رنگین فلم سہراب مودی نے ۱۹۵۳ء میں ''جھانسی کی رانی'' کے نام سے بنائی تھی۔

★ پہلی بولتی فلم 'عالم آرا' کی تکمیل میں چالیس ہزار روپے کی لاگت آئی تھی۔

★ ہندوستان کی دوسری بولتی فلم ''گرہ لکشمی'' تھی۔

★ ہندوستانی فلم کی پہلی ہیروئن گلاب بائی تھی۔

★ خاموش فلم کی پہلی ہیروئن ''پیشنس کوپر'' تھی۔

★ ''سریندری'' پہلی فلم تھی جس میں ہندوستان کی خاتون پہلی بار ہیروئن کے کردار میں جلوہ گر ہوئی۔

★ اداکار نواب کشمیری نے ایک فلم کے کردار میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے اپنے تمام اصلی دانت نکلوا دیئے تھے۔

★ ایک ہدایت کار کے کہنے پر اداکار مظہر خاں نے چلتی ریل سے چھلانگ لگا دی تھی۔

★ فلم ''شبستان'' کے ایک سین میں حقیقت کا رنگ ڈالنے کے لئے ایک منھ زور گھوڑے سے گر کر اداکار شیام کی موت ہو گئی تھی۔

★ ۷/جولائی ۱۸۹۶ء کو ''ٹائمز آف انڈیا'' نے پہلی بار فلم کا اشتہار شائع کیا تھا۔

★ پہلی ہندوستانی فلم ''شیام چی آئی'' (مراٹھی) تھی جسے راشٹر پتی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

★ ہمنسو رائے کی خاموش فلم ''لائٹ آف ایشیا'' ہندوستان کی پہلی فلم تھی جس کا پہلی بار پریمئیر غیر ممالک میں ہوا اور پوری دنیا میں اس کی نمائش ہوئی۔

★ ہندوستان کی پہلی گیوا کلر فلم ''شاہ جہاں'' تھی۔

★ ہندوستان کی پہلی ٹیکنی کلر فلم ''آن'' تھی۔

★ موسیقار اعظم نوشاد وہ پہلی فلم ہستی ہیں ہیں جن کے حیات اور فن پر ایک خاتون نے پی۔ایچ۔ڈی کے لئے مقالہ لکھا ہے۔

★ پرتھوی راجکپور وہ پہلے فلم اسٹار ہیں جنہیں پہلی بار راجیہ سبھا کے لئے ممبر نامزد کیا گیا تھا۔

★ درگا کھوٹے نے اپنی پہلی فلم ''ایودھیا کا راجا'' سے لے کر آخری فلم تک تمام فلموں میں ماں ہی کا رول کیا ہے۔ جبکہ وہ ۲۵ سال کی عمر سے فلم میں کام کر رہی ہیں۔

★ مشہور کامیڈین ''سندر'' ایک اعلیٰ پائے کا سنگر بھی تھا۔ سنگر کی حیثیت سے اُسے ''طوطی

پنجاب'' کا خطاب ملا تھا۔

★ ڈاکٹر ستیہ جیت رائے اور لتا منگیشکر کے والد دینا ناتھ منگیشکر وہ خوش نصیب فلم اسٹار ہیں جن کی یاد میں حکومتِ ہند نے ۱۹۹۴ء میں ڈاک ٹکٹ جاری کیا ہے۔

★ کامیڈین ٹن ٹن فلم ''درد'' میں ایک یادگار گیت ''افسانہ لکھ رہی ہوں دلِ بیقرار کا'' گایا تھا۔ ٹن ٹن بحیثیت گلوکارہ اُوما دیوی کے نام سے مشہور تھیں۔

★ دلیپ کمار نے فلم ''مسافر'' میں اپنی آواز میں ایک بے حد سنجیدہ اور خوبصورت گیت گایا تھا۔

★ گلوکار محمد رفیع نے ہندوستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں میں تقریباً تیس ہزار چھ سو (۳۰۶۰۰) گانے گائے ہیں۔

★ فلم ''کوہِ نور'' کا مشہور کلاسیکی گیت ''مدھو بن میں رادھیکا ناچے رے'' جسے دلیپ کمار پر فلمایا گیا تھا۔ گیت کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے دلیپ کمار نے چھ ماہ تک ایک نامور ستار نواز کی ماتحتی میں ستار بجانے کا ریاض کیا تھا۔

★ فلم ''مغلِ آعظم'' کے شہرہ آفاق گیت ''پیار کیا تو ڈرنا کیا'' کو شکیل بدایوانی نے ایک سو مرتبہ لکھا۔ جب آصف اور نوشاد صاحب مطمئن ہو گئے تو اس گیت کو فلمایا گیا۔

★ شہنشاہِ غزل طلعت محمود کو افغانستان کے بادشاہ ظاہر شاہ نے اپنے ہاں سالانہ جشن کے موقع پر خاص طور پر دعوت دے کر بلایا تھا۔ بادشاہ نے درباریوں کی موجودگی میں طلعت محمود کو اپنی پسند کے بارہ گانوں کی ایک فہرست پیش کی۔ انہوں نے دربار میں وہ تمام گانے گا دیئے۔

★ ستیہ جیت رائے پہلے ہندوستانی فلم ساز ہیں جنہیں ''بھارت رتن'' اور دنیا کا سب سے بڑا فلم ایوارڈ ''آسکر ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔

★ مشہور اداکار اور ویلن پریم ناتھ آزاد ہندوستان کے پہلے ہندوستانی گورنر جنرل سی راج گوپال اچاریہ کی قائم کردہ ''سونتر پارٹی'' کے سرگرم رکن تھے۔ اس کے علاوہ پریم ناتھ نے اُردو، ہندی اور انگریزی زبان میں شاعری بھی کی تھی۔ انگریزی زبان میں فلمستان کی بنائی گئی فلم Three Headed Cobra میں پریم ناتھ نے ایک

ریاست کے مہاراجہ کا کردار ادا کیا تھا۔

★ جنوبی ہند کے مشہور تامل ایکٹر شیواجی گنیشن چھ برس کی عمر سے جنوبی ہند کی تامل اسٹیج پر کام کرنے لگے تھے۔ اس کام کا معاوضہ انہیں روپے کی شکل میں نہیں بلکہ دال، چاول کی شکل میں ملتا تھا۔ یعنی اسٹیج پر کام کرو اور اس کے عوض دال، چاول کھالو۔

★ ہندوستانی فلم کے موجد دادا صاحب پھالکے، راجکپور، دینا ناتھ منگیشکر اور لتا منگیشکر کے نام سے فلم ایوارڈس تقسیم کئے جاتے ہیں۔

★ پہلی بولتی فلم "عالم آرا" سے ہی ٹکٹوں کی بلیک مارکیٹنگ کا آغاز ہوا۔ چار آنے کی ٹکٹ چار روپے میں فروخت ہوئی۔

★ سب سے پہلے جو عشقیہ کہانی پردے پر آئی وہ تھی خاموش فلم "بلوا منگل" جو ۱۹۱۹ء میں بنی تھی۔

★ فلموں میں بوسہ کا سین سب سے پہلے ہیر رانجھا کے ہدایت کار شنکر چودھری نے ۱۹۲۹ء میں دکھائی۔ اس فلم کی ہیروئن تھی سلوچنا اور ہیرو تھے ڈی بلی موریہ ہندی فلموں کے پردے پر بوسہ دینے والی یہ پہلی ہندوستانی جوڑی مانی جاتی ہے۔

★ "شیام سندر" پہلی متکلم عشقیہ کہانی پر مبنی فلم تھی۔ بمبئی کا ویسٹرن تھیٹر جو آج ناز سنیما کے نام سے مشہور ہے اس ہال میں یہ فلم پچیس ہفتے چلی تھی۔ سلور جوبلی منانے والی یہ پہلی ہندوستانی فلم تھی۔ اس فلم کے ہیرو ساہو مودک تھے

★ ۱۹۳۶ء میں ایک فلم بنی تھی "اچھوت کنیا" اس فلم نے سلور جوبلی منائی تھی اس میں اچھوت کنیا بنی تھی دیویکا رانی اس کے کردار کی اتنی تعریف ہوئی کہ پنڈت نہرو نے انہیں 'فین لیٹر' لکھا اور ان کے کام کی تعریف کی تھی۔

★ جس طرح ہنسی مذاق کو عشقیہ کہانیوں کے ساتھ ملایا گیا۔ اسی طرح کبھی غزل کو، کبھی پینٹنگ کو، کبھی گیت کار کو، کبھی موسیقار کو اور کبھی اخبار والے کو پیار کی کہانی کا ہیرو بنادیا گیا۔ اس طرح کی کہانیوں کی شروعات فلم 'ودھیاپتی' سے ہوئی جو ۱۹۳۷ء میں بنی تھی۔

فلم کا ہیرو ودھیاپتی اپنی غزل کے ذریعہ عشق کو پھیلانے والا شاعر تھا۔ رانی شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی اس کی غزل پر عاشق تھی۔

★ طوائفوں کے عشق کی کہانیوں کی شروعات فلم "آدمی" سے ہوئی جو ۱۹۳۹ء میں بنی تھی جہاں طوائف عشق میں اپنا سب کچھ لٹانے کو تیار ہوگئی۔

★ بیکانیر شہر کے تاریخی محلوں میں بیکانیر کے راج گھرانے نے پہلی بار شوٹنگ کرنے کی اجازت دی تھی اُس فلم کا نام "شتریہ" ہے۔

★ ابتک ہندوستان میں سب سے زیادہ دنوں تک چلنے والی فلم 'شعلے' ہے۔ یہ فلم بمبئی کے ایک سنیما منروا میں چھ سال تک متواتر چلتی رہی۔ یہ عالمی ریکارڈ ہے۔ "فلم دل والے دلہنیا لے جائیں گے" نے اس فلم کا ریکارڈ توڑا۔

★ گرودت کی فلم "کاغذ کے پھول" ہندوستان کی پہلی سنیما اسکوپ فلم تھی۔

★ آج دنیا میں سب سے زیادہ فلمیں ہندوستان میں بنتی ہیں۔ ماضی میں یہ سہرا ہالی ووڈ کے سر تھا۔

★ اداکارہ بندیا گوسوامی کے باپ متھرا کے مہاراج تھے۔

★ اداکارہ ریناراۓ کی تین بہنیں تھیں، برکھا راۓ اور انجو راۓ۔ یہ تینوں بہنیں آلہ آباد کے گھروں اور پارٹیوں میں ناچ اور گا کر گزارہ کرتی تھیں۔ وہاں انہیں وہ "تھری سسٹم" (Three System) کے نام سے مشہور تھیں۔

★ مشہور فلم اداکارہ 'زینت امان' کو "مِس انڈیا" کا خطاب ملا۔

★ راج ببر کی شریکِ حیات نادرہ اُردو ادب کی دو عظیم شخصیتوں۔ سجاد ظہیر اور رضیہ ظہیر کی بیٹی ہیں۔

★ مدھو بالا فلم انڈسٹری کی حسین ترین ہیروئن مانی گئی ہے، اسی سبب مدھو کو ہندوستانی فلموں کی حُسن کی دیوی (VENUS) کا خطاب ملا تھا۔ اس کی ایک جھلک فلم مغلِ اعظم میں دیکھنے کو ملی۔

★ خوبصورت گیتوں کے خالق حسرت جے پوری، بمبئی میں دن کے وقت بس کنڈکٹری کرتے تھے اور راتوں کو مشاعرہ پڑھتے تھے۔

★ مشہور ایکٹر' کیریکٹر ایکٹر' نانا پلسکر ۱۹۳۱ء میں فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے۔ ان دنوں نانا پلسکر کو ایک دن شوٹنگ کا معاوضہ صرف ایک روپیہ ملتا تھا۔

★ مشہور کیریکٹر ایکٹر اے کے ہنگل ہندوستان کی آزادی کے سپاہی رہے ہیں۔ وہ قصّہ خوانی بازار (پشاور) میں انگریزوں کے خلاف ہونے والی لڑائی میں شامل تھے۔ انہوں نے مہاراشٹر صوبہ بنانے کی تحریک میں کامریڈ ایس ڈانگے اور بال ٹھاکرے کے والد پربھونکر ٹھاکرے کے شانہ بشانہ حصّہ لیا تھا۔ گوا کو پُرتگالی قبضہ سے آزاد کرانے کی جدوجہد میں وہ پیش پیش تھے۔

★ دادا صاحب پھالکے کے نام سے بمبئی میں' شکیل بدایوانی کے نام سے بدایوان میں' ساحر لدھیانوی کے نام سے لدھیانہ میں اور نرگس کے نام سے بمبئی میں سڑکوں کے نام رکھے گئے۔

★ گیت کار 'فیاض ہاشمی' کے مشہور گیت ''تصویر تیری دل میرا بہلا نہ سکے گی'' کو کسی ریاست کی ایک شہزادی نے اس ریکارڈ کو تین مہینے تک پلٹا نہیں تھا۔ شہزادی اس گانے کے سبب فیاض ہاشمی پر دل وجان سے فدا تھی۔

★ مہاتما گاندھی جی' میرا بائی کے علاوہ اگر کسی کے لکھے ہوئے بھجن سنتے تھے تو یہ شرف صرف فیاض ہاشمی کو ہی حاصل تھا۔ ایک موقع پر گاندھی جی نے کہا تھا۔ ''اگر فیاضؔ جیسے چند شاعر اور پیدا ہو جائیں تو اُردو' ہندی کا سارا جھگڑا مٹ جائے۔''

★ فلم ''اندرسبھا'' میں ۷۱ گانے تھے جواب تک ایک ریکارڈ ہے۔

★ ۱۹۳۶ء میں دو فلمیں ''اچھوت کنیا'' اور ''دھوپ چھاؤں'' آئیں جن میں پہلی بار کسی گلوکار نے پردے پر نظر آنے والے ہیرو' ہیروئن کے لئے اپنی آواز دی۔ فلم ''اچھوت کنیا'' کی موسیقارہ سرسوتی دیوی نے فلمی دنیا کا پہلا گیت ریکارڈ کیا۔ گیت کے بول تھے ''کت گئے ہو کھیون ہار'' جسے اداکارہ چندا پربھا پر فلمایا گیا تھا۔ ہندوستان کی متکلم فلم میں 'آوارہ شہزادہ پہلی فلم تھی جسمیں ساہو مودک نے پہلی بار ڈبل رول کیا تھا۔ یہ فلم ۱۹۳۳ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

★ اردو کی مشہور ومعروف افسانہ نگار عصمت چغتائی نے شیام بینگل کی فلم ''جنون'' میں ایک

اہم کردار ادا کیا تھا۔ فلم ''گرم ہوا'' کی کہانی لکھنے پر انہیں بہترین کہانی کارہ کے لئے صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

★ فلمساز وہدایتکار سبھاش گھئی کی فلم 'کھلنائیک' ۶/ اگست ۱۹۹۳ء کو دہلی میں ریلیز ہوئی تھی' ۷/اگست کی صبح بی بی سی لندن نے ایک خبر نشر کی فلم 'کھلنائیک' کا ٹکٹ دہلی کے ایک سنیما

★ ہال میں ایک ہزار روپے میں فروخت ہوا۔ ہندوستانی فلم کی تاریخ میں یہ ایک ریکارڈ ہے۔

★ فلم 'قسمت' میں گیت کار پردیپ کا تحریر کردہ گیت

آج ہمالہ کی چوٹی سے پھر ہم نے للکارا ہے
دُور ہٹو اے دنیا والو ہندوستان ہمارا ہے

پردیپ کا یہ گیت اسی وقت قومی ترانے کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ برسوں تک آل انڈیا ریڈیو پر اسکی دھن قومی ترانے کے طور پر استعمال کی جاتی رہی تھی۔

★ فلمساز ایل وی پرشاد کرشنا سنیما (بمبئی نیا نام ڈریم لینڈ) میں تھرڈ کلاس کے گیٹ کیپر تھے۔

★ کرشنا فلم کمپنی نے ایک فلم بنائی تھی جس کا نام ''کھاٹ میں کمبل'' اس فلم کے رائٹر اور ہیرو' مشہور مزاحیہ اداکار نور محمد چارلی تھے۔ یہ خاموش فلم تھی مگر پہلی بار اس فلم میں دوریل متکلّم

★ تھے۔ ہندوستان کی پہلی مکمل متکلم فلم 'عالم آرا' آردیشر ایرانی نے بعد میں بنائی۔

★ مشہور مزاحیہ اداکار بھگوان داس' اپولو سنیما' دادر میں مونگ پھلی فروخت کرتے تھے۔

★ ۱۹۴۲ء میں حکومت نے ایک خاص حکم نامہ کے ذریعہ فلموں کی لمبائی محدود کر دی تھی۔

★ بی این سرکار نے کلکتہ میں چترا سنیما تعمیر کرایا تھا اس کا افتتاح نیتاجی سبھاش چندر بوس نے کیا تھا۔

★ موسیقار آر۔ سی بورانی نے سب سے پہلے ۱۹۳۴ء میں فلم ''چنڈی داس'' میں بیگ گراؤنڈ موسیقی دی اس کے علاوہ انہوں نے ہی ۱۹۳۴ء میں پلے بیک گراؤنڈ موسیقی دی اس کے علاوہ انہوں نے ہی ۱۹۳۴ء میں پلے بیک گلوکاری کا چلن فلم ''دھوپ چھاؤں'' سے شروع کیا تھا۔

★ فلموں کے لئے پبلسٹی کا احساس کلکتہ کے فلمساز سیٹھ کرنانی نے اپنی فلم ''لیلیٰ مجنوں'' کی کامیابی کے لئے سنیما گھر میں موتیوں سے آراستہ ایک ساڑی کی نمائش کی تھی جس

میں ایک لاکھ روپے کے نوٹ ٹانکے گئے تھے اور اس کے ساتھ ہی یہ پبلسٹی کی گئی تھی کہ اس فلم کی ہیروئن 'مس کجّن' کو یہ ساڑی بطور انعام دی گئی ہے اس ساڑی کو دیکھنے کے لئے ہر وقت ہزاروں کا مجمع لگا رہتا تھا۔

☆ دیویکا رانی فلمی دنیا کی پہلی تعلیم یافتہ ایکٹریس تھی انہیں دیکھ کر دوسرے صوبوں کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو فلمی دنیا میں آنے کی تحریک ملی ورنہ اس سے قبل فلمی دنیا پر طوائفیں چھائی تھیں۔

☆ ہندوستان کی پہلی بولتی فلم 'عالم آرا' بمبئی کے میجسٹک سنیما میں ۱۴/ مارچ ۱۹۳۱ء کو ریلیز ہوئی۔ لاہور کے کیپٹل تھیٹر' میں نمائش کے لئے پیش کی گئی اس فلم کا انگریزی نام ''Light OF The World'' تھا۔ عالم آرا اس زمانے کے پارسی تھیٹر کا مقبول ڈرامہ تھا اس ڈرامے کو فلم کے لئے مسٹر جوزف نے انگریزی میں ڈھال کر اسکرین پلے لکھا اس فلم کے اردو مکالمے منشی ظہیر نے لکھے۔

☆ متحدہ ہندوستان میں بمبئی سب سے پہلے فلم کا مرکز بنا تھا۔ اس کے بعد کلکتہ اور مدراس میں فلم سازی کا آغاز ہوا۔

☆ آر۔ ایل شوری نے ایک فلم ''City Of Sile'' عرف ''خونی جادوگر'' بنائی۔ یہ شمالی ہند کی پہلی جادوئی فلم تھی۔ اس میں شیاما' ایم اسمٰعیل' ہیر لوئس' ایم ڈی کنور اور ہیرا لال نے کام کیا تھا۔ یہ فلم ۱۹۳۲ء میں بنی تھی۔

☆ سیٹھ سکھ لال کرنانی نے ۱۹۳۵ء میں شیلا عرف پنڈوی کڑی کے نام سے برصغیر کی پہلی پنجابی تھی جسے اندرا پوری پکچر نے بنائی۔

☆ مسٹر بھٹونانی ''دی مل'' عرف مزدور جو ۱۹۳۴ء میں تیار ہوئی تھی۔ یہ پہلی فلم تھی جس کی نمائش کی سنسر بورڈ نے اجازت نہیں دی۔ اس فلم کی کہانی اردو کے مشہور ادیب منشی پریم چند نے لکھی۔

☆ ۱۹۳۵ء میں فلم میں بوسہ کے مناظر کے خلاف عوام نے آواز بلند کی اور حکومت نے فلموں میں بوسہ کے مناظر پر پابندی عائد کردی۔

☆ پرانی فلموں کے ہیرو مظہر خاں' فلم کے مناظر میں حقیقت کا رنگ ڈالنے کے لئے سب کام خود کرتے تھے۔ ایک بار وہ ملیریا بخار میں مبتلا تھے اس حالت میں بھی ایسٹ انڈیا کمپنی نے انہیں کام پر بلایا۔ فلم کے ایک سین میں چلتی ٹرین سے انہیں کودنا تھا۔ ہدایت کار کے اشارے پر ہوڑہ اسٹیشن پر چلتی ہوئی طوفان میل سے کود گئے۔

☆ مظہر خاں نے کیریکٹر ایکٹنگ کا ایسا معیار قائم کیا جس پر پورے اُترنے والے اداکار کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ سر سکندر حیات خاں نے آپ کو ہندوستان کے بہترین کیریکٹر ایکٹر کی حیثیت سے فلم ''بھگت کبیر'' میں کبیر کا رول خوبصورتی سے ادا کرنے پر سونے کا تمغہ عطا فرمایا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب اداکاروں کو کوئی ایوارڈ نہیں دیا جاتا تھا۔

☆ ہدایت کار' گیت کار' مکالمہ نگار' کمال امروہوی' اُردو' فارسی کے ساتھ عربی زبان میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ۱۸ سال کی عمر میں اُنہوں نے عربی' صرف نحو' سے متعلق ایک کتاب لکھی تھی۔

☆ ۱۹۱۸ء میں جب دادا صاحب پھالکے کی خاموش فلم ''لنکا دین'' مدراس میں ریلیز ہوئی تھی تو یہ فلم اسقدر مقبول ہوئی تھی کہ اس کی یومیہ آمدنی بیل گاڑی میں لاد کر پولس کی حفاظت میں لائی جاتی تھی۔ اس فلم نے مدراس میں صرف دس روز میں تیس ہزار روپے کمائے تھے۔ یہ فلم بمبئی میں بننے والی ہندوستان کی پہلی باکس آفس فلم ثابت ہوئی۔

☆ ۱۹۱۹ء میں مدراس کے آرنٹ راجا مدالیار نے ''کیچک ودھم'' نام کی جنوب میں بننے والی پہلی خاموش فلم تیار کر کے اولیت کا سہرا اپنے سر باندھا۔

☆ ۱۹۲۱ء میں دھیرن بابو نے انگلینڈ ریٹرنڈ (England Returned) کے نام سے فلم تیار کی یہ ہندوستان کی پہلی سوشل فلم تھی۔

☆ جی این سرکار اور ہمنسو رائے نے پنجاب میں آرنلڈ کی شہرہ آفاق تخلیق ''لائٹ آف ایشیا'' کو ایک جرمن ہدایت کار' فرامز آسٹن کے تعاون سے پردے پر پیش کیا۔ ہمنسو رائے خود بھی اس فلم کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے۔ فلم کا مرکزی کردار خود نبھایا تھا۔ یہ فلم لندن میں دس مہینے تک مسلسل چلتی رہی۔ اس فلم کی شہرت سن کر انگلینڈ کے بادشاہ جارج پنجم اور جاپان

کے شاہ میکاڈو نے بھی اپنے اپنے شاہی خاندانوں کے افراد کے ساتھ یہ فلم دیکھی۔ بلجیم، اٹلی، اسپین، سوئیڈن اور ڈنمارک کے شاہ اور ملکہ کے علاوہ ان کے شاہی خاندان کے افراد نے بھی یہ فلم دیکھی۔ اس فلم کے چار سو پچیس ۴۲۵ کاپیاں پوری دنیا میں نمائش کے لئے بھیجی گئی تھیں۔ فلم کی تیاری میں نوے ہزار روپے لاگت آئی تھی۔

★ اداکار نواب نہایت پرہیزگار انسان تھے۔ لڑکیوں کی صحبت سے دور رہتے تھے فلم کے ایک سین میں رتن بائی کو گلے لگانا تھا جس کے لئے نواب نے صاف انکار کر دیا تھا مگر فلم میں ضروری سمجھ کر رتن بائی کو سبھوں کے سامنے بہن بنایا اور پھر شوٹنگ کی ایسی مثال کہاں ملتی ہے۔

★ مشہور ہیرو جان کاوس نے ۱۹۳۰ء میں کل ہند مقابلہ میں ''مضبوط ترین انسان'' ہونے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ ماضی میں جان کاوس اور ناڈیا کی جوڑی بہت مقبول ہوئی تھی۔

★ مشہور اناؤنسر امین سہانی جو ریڈیو پر چالیس سال سے ''بناکا گیت مالا'' پیش کرتے آرہے ہیں۔ ایک اناؤنسر کی حیثیت سے یہ ایک عالمی ریکارڈ ہے۔

★ ریڈیو سیلون پر پہلی بار ڈنکا اور جاگیرتی فلموں کی پبلسٹی کی شروعات ہوئی۔

★ ٹیلی ویژن ہندوستان میں ۱۵/ستمبر ۱۹۵۹ء کو آیا جب ہفتے میں صرف تین دن نصف گھنٹے کا پروگرام دکھایا جاتا تھا۔

★ ٹیلی ویژن پروگرام باقاعدہ طور پر ۱۹۶۵ء سے دکھائے گئے۔ ہندوستان میں رنگین ٹیلی ویژن ۱۵/اگست ۱۹۶۲ء کو آیا۔

★ فلموں کے ابتدائی دور میں فلم کی ہیروئن سیتا دیوی کو پانچ روپے اور ہیرو ماسٹر وٹھل کو آٹھ آنہ یومیہ ملتے تھے۔ جس روز شوٹنگ نہیں ہوتی تھی اس روز تنخواہ نہیں ملتی تھی مگر اسی دور میں ایک اداکارہ سندر بالا کو ایک فلم میں کام کرنے کے لئے ایک لاکھ روپیہ معاوضہ دیا گیا تھا۔

★ مشہور اداکار اے کے ہنگل نے آزادی کی جدوجہد میں بڑھ کر حصہ لیا تھا جس کے سبب تیس سال جیل میں رہے۔

★ انمول موتی، ہندوستانی فلم انڈسٹری کی وہ پہلی فلم تھی جس میں پہلی بار پانی کے اندر

شوٹنگ کی گئی تھی۔

★ ہندوستانی فلم کے موجد دادا صاحب پھالکے کو 'بابائے فلم' کا خطاب دیا گیا۔

★ فلم ''سنگم'' (راجکپور۔ وجنتی مالا) ہندوستان کی وہ پہلی طویل فلم تھی جس میں دو بار انٹرویل کیا گیا تھا۔

★ فلم ''میڈم فیشن'' اداکارہ نازنین کی پہلی فلم تھی جسے نرگس کی والدہ جدّن بائی نے ڈائرکٹ کیا تھا۔ نازنین بیگم بہت دولت مند ہیروئن تھی وہ ہیرو سے جڑی رسٹ واچ (گھڑی) اپنی ایڑی کے سینڈل پر باندھے رکھتی تھی جب کوئی ان سے پوچھتا کہ کیا وقت ہوا ہے تو وہ بڑی شان سے اپنا سینڈل اس کے قریب لے جاتی۔

★ اداکارہ نازنین جب بہت مقبول ہوئیں اور دولت قدم چومنے لگی تو وہ ہزار کے نوٹ کو لپیٹ کر اس میں تمباکو بھر کر سگریٹ بناتی تھیں اور دن بھر میں تقریباً ایک درجن سگریٹ پی جاتی تھی لیکن ایک دن وہ صرف ایک رات میں اپنی ساری دولت جوئے میں ہار گئی۔ آخر عمر میں پاگل ہو کر مری۔

★ وجے بھٹ کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے مہاتما گاندھی کو اپنی فلم ''رام راجیہ'' دکھانے کے لئے بمبئی کے برلا گرام آڈیٹوریم میں انتظام کیا تھا اور گاندھی جی نے مشکل سے آدھ گھنٹے کا وقت دیا تھا لیکن فلم اتنی اچھی تھی کہ انہوں نے پوری فلم دیکھ ڈالی۔

★ ایک ڈاکومنیٹری فلم ''باپو نے کہا تھا'' میں سابق وزیراعظم ہند مرارجی ڈیسائی نے وجے بھٹ کی ہدایت میں فلم میں کام کیا تھا۔

★ عربین نائٹ پر جتنی فلمیں بنیں جیسے علی بابا چالیس چور، حاتم طائی، علاؤالدین کا چراغ، ان سبھی فلموں کے ہدایت کار اور فلم ساز غیر مسلم تھے۔

★ اسٹنٹ فلموں کی ملکہ 'ناڈیا' فلموں میں دو گھوڑے استعمال کرتی تھی۔ ایک کا نام پنجاب کا بیٹا' اور دوسرے کا نام راجپوت تھا۔ یہ دونوں گھوڑے تعلیم یافتہ انسانی کلاکاروں کی طرح ذہین اور چالاک تھے۔

- ناڈیا کی فلم 'ہنٹر والی کی بیٹی' عربی زبان میں ڈب کر کے خلیج ممالک میں ریلیز کی گئی تھی۔ وہاں سے مداحوں کے خطوط کے انبار لگ گئے۔ لوگ وقت بے وقت ناڈیا کو فون کر کے پریشان کرنے لگے۔ ناڈیا مجبور ہو کر ٹیلی فون محکمے سے درخواست کر کے ٹیلی فون ڈائرکٹری سے اپنے ٹیلی فون کا نمبر ہی نکلوا دیا تھا۔ ان دنوں ناڈیا کی فلمیں سنگاپور، بنکاک، عرب ممالک، افریقہ اور عرب کے ملکوں میں دکھائی جاتی تھیں۔
- فلمستان نے ہندی، اردو، مراٹھی، پنجابی اور گجراتی فلموں کے علاوہ ایک انگریزی فلم ''بمبئی فلائٹ ۴۱۷'' بھی بنائی جس میں اشوک کمار، پریم ناتھ نے کام کیا تھا۔ موسیقی ہمنت کمار کی تھی۔ یہ فلم ۷/دسمبر ۱۹۶۳ء کو ریلیز ہوئی تھی۔
- راشٹریہ فلم ایوارڈ کا آغاز ۱۹۵۴ء میں ہوا، پہلے اس کا نام اسٹیٹ ایوارڈ تھا۔
- پہلی بار راشٹریہ ایوارڈ ۱۰/اکتوبر ۱۹۵۴ء کو اوشا لیوریٹری ہال میں دیا گیا۔
- ۱۹۵۸ء سے راشٹریہ ایوارڈ پانے والے فنکاروں کو نقد رقم دی جانے لگی۔
- داداصاحب پھالکے ایوارڈ کا آغاز ۱۹۶۹ء میں ہوا۔
- فلم ڈائرکٹر کو پہلی مرتبہ نیشنل ایوارڈ ستیہ جیت رائے کو انکی فلم چڑیا گھر کے لئے دیا گیا۔
- شبانہ آعظمی نے اپنی فلم انکور (۱۹۸۲ء) ارتھ (۱۹۸۳ء) پار (۱۹۸۴ء) کے لئے مسلسل تین بار نیشنل ایوارڈ جیت کر ہیٹ ٹرک کیا۔
- ہیرو کی حیثیت سے پہلی بار نیشنل ایوارڈ اتم کمار کو فلم چڑیا گھر کے لئے ملا۔
- ہیروئن کی حیثیت سے پہلی بار نیشنل ایوارڈ نرگس کو فلم ''دن اور رات'' کے لئے ملا۔
- پہلی بار بچوں کی فلم ''پنچھی ایک ڈال کے'' کو ۱۹۵۷ء میں وزیر آعظم ایوارڈ دیا گیا۔
- لتا منگیشکر کو ۱۹۸۹ء میں داداصاحب پھالکے ایوارڈ ملا۔
- دیویکا رانی کو ۱۹۶۹ء میں داداصاحب پھالکے ایوارڈ دیا گیا۔
- ہندی فلم مرزا غالب' (۱۹۵۴ء) اور فلم دو آنکھیں بارہ ہاتھ (۱۹۵۷ء) کو صدر ایوارڈ سے نوازا گیا۔

- سب سے زیادہ راشٹریہ ایوارڈ 'یسوداس' کو ملا (۶ بار)۔
- آزادی سے قبل ''ایک ہی پھول'' پہلی سوشل فلم تھی جو ۱۹۴۰ء میں بنی تھی۔
- آزادی سے فوراً بعد کی پہلی سوشل فلم ''چاندنی چوک'' تھی۔
- رامائن پر سب سے پہلے ایک مختصر فلم 'رامائن کا ایک کانڈ' کے نام سے بنی جو نومبر ۱۹۱۲ء کو گیٹی تھیٹر میں ریلیز کی گئی۔
- لنکا پر رامائن کی فتح کی سب سے پہلی جھلک ہندوستان فلم سازی کے خالق داداصاحب پھالکے نے ۱۹۱۵ء میں 'لنکا دہن' کے نام سے پیش کی اس فیچر فلم کی لمبائی تین ہزار فٹ تھی اور ایک انگریزی فلم 'Blind Faith' کے ساتھ دکھائی گئی تھی۔ اس فلم نے آمدنی کے اعتبار سے بھارت کی پہلی باکس آفس فلم کا شرف حاصل کیا۔
- ۱۹۱۸ء میں فرینڈز اینڈ کمپنی نے فلم 'رام بن باس' بنائی۔ یہ ہندوستان میں تیار ہونے والی پہلی سیریل فلم تھی اس فلم کی طوالت پچیس ہزار فٹ تھی۔ اس فلم کو تین چار حصّوں میں دکھایا گیا تھا۔ فلم میں رول کرنے کے لئے خاص طور سے کلکتہ سے دولڑکیوں کو بلایا گیا تھا۔
- ۱۹۲۲ء میں کلکتہ میں مدن تھیٹر والوں نے ایک فلم رامائن بنائی اس فلم کے بیس ابواب تھے۔ ہر ہفتے اس فلم کے ساتھ ابواب دکھائے جاتے تھے یعنی اس فلم کا ایک شو تین دن میں مکمل ہوتا تھا اس اعتبار سے ۱۹۲۲ء تک کی یہ طویل فیچر فلم تھی۔
- پرکاش پکچر نے رامائن کی پوری داستان کو چار حصّوں میں بھرت ملاپ، رام راج، رام بان اور سیتا سوئمبر میں فلما کر دھارمک فیچر فلموں میں ایک ایسا ریکارڈ قائم کیا جو اب تک ٹوٹ نہیں سکا۔ ان فلموں میں رام چندر کی پیدائش سے لے کر سیتا کی زمین دوز ہونے تک کے تمام واقعات فلمائے گئے تھے۔ ان چار فلموں میں رام اور سیتا کے کردار پریم ادیب اور نوتن کی ماں، شوبھنا سمرتھ نے ادا کئے۔ ان میں 'رام راج' سب سے اچھی فلم تھی۔ اس فلم کے خصوصی پرنٹ سنسر کرا کر گاندھی جی کو ان کے آشرم میں دکھائی گئی تھی۔
- ۱۹۵۵ء چلڈرن فلم سوسائٹی نے رام راج، بھرت ملاپ، رام بان جیسی فلموں کے ٹکڑے

جوڑ کر بال رامائن تیار کی تھی۔

★ مشہور مصنف رامانند ساگر کے طویل ترین ٹی وی سیریل 'رامائن' کا تذکرہ خالی از بحث نہ ہوگا۔ ۲۵؍جنوری ۱۹۸۷ء میں ٹیلی کاسٹ ہونے والے سیریل رامائن کو اب تک کی سلولائڈ کی تخلیقات میں طویل ترین قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ سیریل مسلسل دو برس تک دکھایا جاتا رہا۔ ٹیلی سیریل 'رامائن' کی مقبولیت کے باعث ہی دیپکا اور ارون ترویدی لوک سبھا کے ممبر منتخب کئے گئے۔

★ اُنیسوی صدی کی آخری دہائی میں سنیما کی ایجاد ہوئی اور پہلی فلم فرانس میں بنی۔ فلم ساز تھا تاوالا نے ۱۹۰۰ء میں ''SPLENDID VIEWS OF BOMBAY'' کے نام سے پہلی مرتبہ ایک مختصر فلم تیار کرکے پیش کی۔ اس میں تابوت، پروسیشن اور بمبئی کی سڑکوں سے محرم کے تعزیوں کا جلوس گذرتے دکھایا گیا تھا۔ اس طرح فلم ساز تھا تاوالا نے پہلی بار ۱۹۰۰ء میں فلم میں مسلم کلچر کو پیش کیا۔

★ جنوری ۱۹۵۲ء میں 'الہٰ دین کا چراغ' اور مارچ ۱۹۵۳ء میں علی بابا چالیس چور' مکمل ڈرامے کی شکل میں پردہ سیمیں کی زینت بنیں۔ یہ دونوں فلمیں غیر ملکی تھیں۔

★ خاموش فلموں کے دَور میں سنت کبیر کی شخصیت اور کردار پر مبنی پہلی فلم ۱۹۱۳ء میں ''کبیر کمال'' کے نام سے بنی۔ اسے اسلامی معاشرے کی پہلی فلم کہہ سکتے ہیں۔ اور اسے ہندوستان کی اولین سماجی فلم بھی قرار دے سکتے ہیں۔

★ جے جے مدن نے ۱۹۲۳ء میں مغلیہ دور کی ایک تاریخی فلم ''نور جہاں'' پیش کی۔ اس فلم کی خوبی یہ تھی کہ اس فلم میں شیر افگن (مسٹر کریڈ) کے ساتھ شیر کی لڑائی دکھائی گئی تھی مسٹر کریڈ نے شیر افگن کا کردار نبھایا تھا۔

★ آردیشر ایرانی کی فلم ''عالم آرا'' کی ریلیز سے ایک ماہ قبل ۴؍فروری ۱۹۳۱ء کو بمبئی کے امپائر سنیما میں مدن تھیٹر نے دو مختصر فلمیں پیش کیں۔ اسمیں بنگالی فنکاروں کے نغمات فلمائے گئے۔ اس کے علاوہ تھیٹر کی دنیا کی نامور اداکارہ 'منی بائی' کا مقبول عام گانا ''اپنے

مولا کی میں جوگن بن جاؤں گی''۔ پیش کیا گیا اور اسے پہلی متکلم مختصر فلم کا نام دیا گیا۔

ہندوستانی فلموں میں اب تک پیغمبرانِ اسلام یا خلفائے دین کی شبیہہ پردے پر پیش نہیں کی گئی ہے۔

★ شیام بینگل نے طوائف پر مبنی فلم ''منڈی'' بنائی تھی۔ اس فلم کی ہیروئن شبانہ آعظمی نے پورے چھ ماہ تک طوائفوں کے کوٹھوں پر جا کر ان کی حرکات وسکنات کا قریب سے مشاہدہ کیا تھا۔

★ ۱۹۷۱ء میں باسو چٹرجی کی فلم ''سوامی'' آئی تھی۔ فلم جب بمبئی میں ریلیز ہوئی تو بمبئی کی عدالت میں اس وقت ایک مقدمہ پیش ہوا تھا۔ میاں بیوی دونوں طلاق کی عرضی کے ساتھ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوئے۔ مجسٹریٹ نے کہا طلاق کا فیصلہ کرنے سے قبل آپ لوگ فلم ''سوامی'' دیکھ لیجئے۔ جو بمبئی میں چل رہی ہے۔ اس کے اخراجات عدالت دے گی۔ میاں بیوی دونوں نے فلم دیکھی۔ ان پر اس فلم کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ انہوں نے آپس میں صلح کر لی اور طلاق کا مقدمہ واپس لے لیا۔ سماج پر فلموں کے اثر کی یہ ایک حقیقی مثال ہے۔

★ جنوبی ہند کے مقبول اداکار کمل ہاسن ہندوستانی فلم انڈسٹری کے واحد اداکار ہیں جنہیں چودہ بار فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یہ ایک ایسا ریکارڈ ہے جسے آج تک کوئی نہ توڑ سکا اور نہ شاید ہی کوئی توڑ سکے گا۔

★ مجروح سلطان پوری ہندوستانی فلم انڈسٹری کے پہلے گیت کار ہیں جنہیں ۱۹۹۴ء میں ہندوستان کا سب سے بڑا فلم ایوارڈ ''داداصاحب پھالکے ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔

★ کمال امروہوی کی فلم 'دائرہ' واحد سنجیدہ فلم تھی جسمیں ہیرو، ہیروئن نے پوری فلم میں آپس میں کوئی بات چیت نہیں کی۔

★ ستیہ جیت رے ہندوستان کے واحد فلم ہدایت کار ہیں جنہیں چار مرتبہ صدر جمہوریہ ہند کا طلائی تمغہ، آٹھ مرتبہ صدر جمہوریہ ہند کا انعام اور تین مرتبہ صدر جمہوریہ کا پیتل کا تمغہ ملا۔

★ خاموش فلموں کے دور میں فلموں میں سچویشن کے مطابق الگ سے موسیقی دیا کرتے

تھے اور ہر منظر کے لئے ایک شخص اسٹیج کے قریب کھڑا ہو کر فلم کی کہانی سنایا کرتا تھا۔

★ ہندوستان میں پہلا بین الاقوامی فلمی میلہ بمبئی میں ۱۹۵۲ء میں منعقد ہوا۔ دوسرا میلہ ۱۹۶۱ء میں دہلی میں لگایا گیا۔

★ کلکتہ میں پہلا فلمی میلہ ۱۹۷۵ء میں لگایا گیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ہر سال لگا تار جاری ہے۔

★ فلم ساز ایس مکھر جی نے ۱۹۵۸ء میں اپنے فلمالیہ اسٹوڈیو میں فلمالیہ ایکٹنگ اسکول کی بنیاد رکھی۔ یہ اپنی طرز کا انوکھا انسٹی ٹیوٹ تھا جہاں اداکاری کی باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی۔

★ فلم 'امر اکبر انتھونی' ہندوستان کی پہلی فلم ہے جس نے بمبئی کے ۹ سینما گھروں میں ایک ساتھ سِلور جوبلی منائی تھی۔ یہ واحد ہندی فلم ہے جسے B.B.C ٹیلی ویژن نے اپنے ''پرائم ٹائم'' میں ٹیلی کاسٹ کیا تھا۔

★ فلم ایکٹریس جہاں آرا کجّن ہندوستان کی واحد اداکارہ تھیں جو اسٹوڈیو آتیں تو دو کاریں ان کے ساتھ ہوتیں۔ ایک میں ان کا پاندان ہوتا اور دوسری میں خود سفر کرتی۔

★ فلموں میں سیکس کی شروعات دادا صاحب پھالکے نے اپنی پہلی فلم راجہ ہریش چندر جو ۱۹۱۳ء میں بنائی سے کی اس میں ایک نہانے کا سین بھی تھا جس کی بہت دھوم رہی۔ پی کے نائر کا کہنا ہے کہ یہ جذبات کو بھڑکانے والا سین تھا۔ اس سین کا سب سے انوکھا پہلو یہ تھا کہ اس میں شامل ساری پُر شباب عورتوں کا رول مَردوں ہی نے کیا تھا۔ اُس زمانے میں ہندوستانی عورتیں فلموں میں کام نہیں کرتی تھیں۔

★ شانتا رام نے کرین اور ٹرالی کے ذریعہ پہلی بار شارٹ لینے کا سلسلہ شروع کیا بیک گراؤنڈ میوزک کا استعمال کیا اور رات کے مناظر کو دن میں فلمانے کا آغاز کیا۔

★ وی شانتا رام کی سب سے اہم اور یادگار فلم ''دو آنکھیں بارہ ہاتھ'' ہے۔ یہ فلم ۱۹۵۷ء میں پیش کی گئی تھی۔ حکومتِ ہند نے اس فلم کو طلائی تمغے سے نوازا صرف یہی نہیں بلکہ اس فلم کو غیر ملکی اعزازات بھی حاصل ہوا۔ برلن کے عالمی فلمی میلہ میں اس فلم کو ''گولڈن بئیر'' کا

اعزاز عطا کیا گیا۔ ہالی ووڈ فارن پریس نے اسے بہترین فلم قرار دیتے ہوئے ''سیموئل گولڈن'' ایوارڈ دیا۔ برسلز کی کیتھولک فلم بیورو نے اسے بہترین ''انسانی دستاویز'' کے خطاب سے نوازا۔

★ عظیم فلمی اداکار دلیپ کمار کے بارے میں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ دلیپ کمار ایک عظیم اداکار ہونے کے ساتھ ایک بہترین فٹبالر بھی تھے اور ہندوستان کے مشہور فٹبال ٹورنامنٹ روورس کپ (بمبئی) میں ایک مقامی فٹبال ٹیم کی طرف سے کھیل چکے ہیں۔

★ جیسلمیر (راجستھان) سے ۹۰ میل دور کڑھا پوچنیہ میں جن دنوں سنیل دت فلم ''ریشما اور شیرا'' کی شوٹنگ کر رہے تھے وہاں پچھلے دس سالوں سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ شوٹنگ کے دوران بارش ہوئی تو اس علاقوں کے بچوں نے پہلی بار آسمان سے پانی برستے دیکھا اور مقامی لوگ سنیل دت کو ''دیوتا'' کہنے لگے۔

★ دادا صاحب پھالکے نے ۱۹۱۳ء میں ہندوستان کی پہلی فلم 'راجہ ہریش چندر بنائی۔ اس فلم میں کام کرنے کے لئے کوئی عورت نہیں ملی جو راجہ ہریش چندر کی بیوی کا رول نبھا لیتی۔ مجبوراً ایک مرد کو بھیس بدل کر عورت کا رول کرنا پڑا۔

★ فلموں میں کام کرنے کے لئے سب سے پہلے جو عورت تیار ہوئی وہ کولہا پور کی گلاب بائی تھی۔

★ سر یندری' ہندوستان کی پہلی متحرک فلم تھی جسے بابوراؤ پینٹر نے بنائی تھی۔

★ لیڈی موسیقار اور گلوکارہ سرسوتی دیوی گائیکی میں اشوک کمار کی استاد ہیں۔

★ ۱۹۱۸ء میں دادا صاحب پھالکے نے اپنی فلم 'کرشن جنم' بنائی تو اس میں بھگوان کرشن کا رول اپنی سات سالہ بیٹی مندا کنی کو دیا۔

★ مس گوہر نے اپنی فلم 'وشوموہنی' میں پہلی بار تین رول نبھائے۔ ان کے بعد للیتا پوار نے ۱۹۳۵ء میں فلم ہمت مرداں میں تین رول ادا کئے تھے۔

★ اداکارہ 'سندر بالا' کو ایک فلم میں زیادہ معاوضہ دینے کے عوض اسے آدھی فلم میں نیم برہنہ

دکھایا گیا تھا جس پر عوام نے اس کا سماجی بائیکاٹ کر دیا تھا۔آخر کار اسے فلموں سے کنارہ کشی اختیار کرنی پڑی تھی۔

★ مشہور فلم اداکارہ دیویکا رانی رشتے میں رابندر ناتھ ٹیگور کی نواسی تھی۔ہیروئن شانتا آپٹے بڑی خوددار اور جرأت مند خاتون تھی۔ایک بار فلم انڈیا کے ایڈیٹر بابوراؤ پٹیل نے اس کے بارے میں غلط بات لکھ دی تو وہ ہنٹر لے کر اس کے دفتر میں پہنچ گئی اور اس کی خوب پٹائی کی۔

★ لاہور میں فلم ''زمیندار'' کی شوٹنگ کے دوران فلم کے ہیرو ایس ڈی نازلگر نے ہیروئن دیویکا رانی کے ساتھ کچھ نازیبا حرکت کی تو اس نے سب کے سامنے اسے تھپڑ رسید کر دیا۔

★ اس بات کا علم بہت کم لوگوں کو ہوگا کہ اداکارہ مینا کماری ایک شاعرہ تھی اور تخلص ناز رکھتی تھیں۔آپ کا ایک مجموعہ کلام ''تنہا چاند'' کے عنوان سے اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔

★ عالمی ریکارڈز کی مشہور کتاب ''گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز'' کے مطابق لتا منگیشکر نے ۱۹۴۸ء سے ۱۹۸۵ء تک تیس مختلف زبانوں میں ۳۵ ہزار سے زیادہ سولو دوگانے اور کورس ریکارڈ کروائے ۲۰۰۰ ہزار سے زیادہ فلموں میں اپنا پلے بیک دیا۔لتا منگیشکر کو سب سے پہلے ۱۹۳۰ء کی دہائی کے شروع میں سہراب مودی نے فلم 'بھروسہ' میں پہلی بار شادی سے پہلے دو جسموں کے ملن کی کہانی چھیڑی تھی۔

★ ایک عورت تھی جس کے پاس سارے بادشاہوں کے آٹوگراف تھے۔اس کلکشن میں کسی نے طلعت محمود کا آٹوگراف دیکھا تو پوچھا کہ بادشاہوں کے دستخطوں کے درمیان آپ نے طلعت محمود کا آٹوگراف کیوں لیا۔تو اس عورت نے کہا کہ وہ غزلوں کے بادشاہ ہیں۔

★ ہندوستان کے چند بڑے صحافیوں کا ایک وفد مصر کے صدر انور سادات سے ملنے گیا۔ وہاں ان لوگوں کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انور سادات کے کلکشن میں طلعت محمود کی کئی فلمی اور غیر فلمی غزلیں ہیں۔پوچھا تو معلوم ہوا اگر چہ کچھ الفاظ کے معنی انور سادات نہیں سمجھتے لیکن آواز کی شیرینی اور موسیقی کے سبب وہ طلعت محمود کے شیدائی ہیں۔

★ وی شانتارام نے ۱۹۳۰ء میں ایک فلم ''رانی صاحبہ'' بنائی اس فلم کی ہیروئن چھ سال کی ایک بچی تھی ۔ ہندوستان کی فلمی تاریخ میں اتنی کمسن ہیروئن آج تک نہیں بنی ۔

★ سنیما یا کنیما یونانی لفظ ہے ۔ ۱۹ویں صدی میں جب سنیما ایجاد ہوا تو اس وقت اسے سینے میٹوگرافی کی جگہ' کینے میٹوگرافی کہا جاتا تھا ۔ یہ یونانی لفظ ان دنوں سنیما کے لئے موزوں ترین سمجھا جاتا تھا دراصل عوام کو سینے میٹوگرافی لفظ بولنے میں دقّت محسوس ہوتی تھی اس لئے اس کا مختصر نام سنیما پڑ گیا ۔

★ ۱۸۷۷ء کے شروع میں ٹامس ایلوا ایڈیشن نے فوٹوگرافی کے ذریعہ آواز کو قید ہی نہیں کیا بلکہ ایک متحرک فلم کا آلہ بھی تیار کرلیا ۔

★ ۱۸۸۵ء میں مشہور سائنس داں مائی برج نے فلم دکھانے کا آلہ یعنی پروجکٹر ایجاد کیا انہوں نے اس کے ذریعہ فلم کو پردے پر چلتے پھرتے دکھایا ۔

★ دنیا کا پہلا سنیما ایڈیشن کا کینے ٹوگرافک تھیٹر تھا لوگ اسے بلیک میریا کے نام سے یاد کرتے تھے ۔ ۲۳/اپریل ۱۸۹۶ء کو نیویارک کے اس تھیٹر میں ایڈیشن نے پچاس فٹ کے سینے میٹوگراف کی پہلی نمائش عوامی طور پر کی ۔ سائنس کے اس کرشمہ کو لوگوں نے جادو کا نام دیا ۔

★ ایڈیشن کی فلموں کا پہلا ایکٹر' فریڈ آٹ' تھا اس کو دنیا کا پہلا ایکٹر بھی کہا جا سکتا ہے وہ انھیں کی لیبارٹری کا ایک مستری تھا ۔ وہ ایک خاص انداز سے چھینکا کرتا تھا اس کا انتخاب اس لئے کیا گیا تھا کہ اس کی چھینک سے جنتا خوش ہوگی اور فلم کا نام ''فریڈ آٹ' کی چھینک'' رکھا گیا ۔ ایڈیشن نے اپنے نئے آلے سے ''ایٹ روم'' نام کی ایک فلم تیار کی اسمیں چلتی پھرتی تصویر دکھائی دیتی تھی ۔

★ ۱۹۰۳ء میں پہلی بار ایک ایسی فلم بنی جس میں ایک واقعہ کو فلم بند کیا گیا تھا اس فلم کا نام ''لائف آف این امریکن فائرمین'' تھا ۔ اس سے قبل جو فلمیں بنیں اس میں نہ کوئی

کہانی ہوتی تھی نہ کوئی واقعہ صرف منظر کو دکھایا جاتا تھا ۔

★ فرانس میں آگسٹن اور لوئی لومیٹر نامی دو تاجر فوٹوگرافی کے آلات تیار کرتے تھے انہوں نے اپنے سینے موٹوگراف سے پیرس کے ایک ریسٹوران میں ایک سنیما گھر کھولا یہ دنیا کا پہلا سنیما گھر تھا جس کی شرح داخلہ ایک فرینک فی کس تھی ۔

★ ۱۸۹۵ء میں شکاگو میں ایک نمائش لگی تھی جس میں چلتی پھرتی تصویریں دکھانے کے لئے ایڈیسن نے ایک پروجکٹر تیار کیا تھا اس کا نام کینے میٹوکراسکوپ رکھا گیا ایڈیسن کو اس کام میں کافی کامیابی ملی اسی باعث امریکن ایڈیسن کو سنیما کا موجد ماننے لگے ۔ جیسے فرانسیسی لومیٹر کو اس میدان کا پہلا مرد تسلیم کرتے ہیں ۔

★ ۱۸۹۵ء میں ٹامس آرمٹ کی ایجاد کو دیکھ کر ایڈیسن نے ویٹن کوپ ایجاد کیا جس سے چلتی پھرتی فلموں کو پردے پر دکھانے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اس کا پہلا کامیاب مظاہرہ ۲۰/جولائی ۱۸۹۶ء کو نیویارک کے سنگیت بھون میں کیا گیا اس وقت ایڈیسن وہاں موجود تھے ۔

★ ڈبلو پال نے سب سے پہلے متحرک فلموں کو پردے پر بڑی صفائی کے ساتھ پیش کیا اس کے لئے انھوں نے پروجیکٹر ایجاد کیا اس کا نام اس وقت تھیٹر وگراف تھا ۔

★ فرانس کے لوئر برادرز نے ایک آلہ ایجاد کیا جس کا نام سینے موٹوگراف رکھا گیا اس آلہ سے فلم سازی اور اس کی نمائش کا کام ایک ساتھ ہوتا تھا ۔ اس آلہ سے ''مارویل آف دی سنچری'' نامی فلم تیار کی گئی اس کی پہلی نمائش ۲۰/فروری ۱۸۹۶ء کو لندن کے رائل پال تھیٹر میں ہوئی ۔

★ لوئر برادرز نے بھی ایڈیسن سے دو ماہ قبل ''مارویل آف دی سنچری'' اور اس سے پہلے ۱۸۶۵ء میں ''گاڑی پہنچتی ہے'' نامی ایک مختصر فلم اور ''پچکاری'' نامی ایک کامیڈی فلم تیار کر لی تھی ۔ جو سویت لائبریری میں موجود ہے جس کی پہلی نمائش ۲۸/دسمبر ۱۸۹۵ء کو پیرس کے ''کرینڈ کینے'' نامی ایک ہوٹل میں تقریباً

ایک سو تماشائیوں کے سامنے ہو چکی تھی۔

★ سن ۱۹۰۰ء میں پہلی خاموش فیچر فلم ''لائٹ آف این امریکن فائر مین'' منظر عام پر آئی۔

۱۶/اگست ۱۹۲۶ء کو نیویارک کے مقام پر وارنر برادرز تھیٹر میں ڈان جان نامی ایک متکلم فلم دکھائی گئی اس فلم کی موسیقی ریکارڈوں کے ساتھ پیش کی جاتی تھی فلم کی نمائش کے ساتھ ریکارڈ بھی بجا کرتے تھے یہی دنیا کی اوّلین متکلم فلم تصوّر کی جاتی ہے۔

★ لوئرادرز کی فلموں کا پہلا اشتہار ۱۳/جولائی ۱۸۹۶ء کو ''ٹائمز آف انڈیا'' میں شائع ہوا جس کا عنوان تھا'' دنیا کے اینی میٹوگرافک پکچرز کا حیرت انگیز مظاہرہ'' مارویل آف دی سنچری''۔

★ ۱۸۹۹ء میں ایک غیر ملکی ادارہ وارویک ٹریڈنگ کمپنی نے جس کا دفتر کلکتہ تھا ۴۷ فٹ لمبی ایک فلم ''پنورما آف کلکتہ'' تیار کرائی۔ اس فلم کا کیمرہ مین ایک بدیشی تھا اور فلم میں بندرگاہوں کے چند مناظر پیش کئے گئے تھے یہ فلم ۱۸۹۹ء میں لندن میں دکھائی گئی تھی۔ کہتے ہیں اس فلم کی ایک پرنٹ وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی پیش کی گئی تھی۔

★ بمبئی کے ایک سیٹھ مانک بی سیٹھنا پہلے ہندستانی فلم صنعت کار تھے جنھوں نے ایک سنیما کمپنی قائم کر کے بمبئی کی سڑکوں میں گھوم گھوم کر لوگوں کو سنیما دکھانا شروع کیا۔

★ ۱۹۱۰ء تک بھارت کے کئی بڑے شہروں میں سنیما گھر کھل گئے ان میں غیر ملکی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ ۱۹۱۱ء تک غیر ممالک میں فلم سازی کا دھندہ گھٹنوں کے بل چل رہا تھا۔ ۱۹۱۰ء میں دنیا کی پہلی فیچر فلم ''کوئن الزبتھ'' پیش کی گئی تھی۔

★ مشہور فلم ساز ایف جی مدن بمبئی سے آکر کلکتہ میں بس گئے اور انگریزی فلموں کی نمائش کے لئے ایک تھیٹر قائم کیا اس تھیٹر کا نام مدن بائسکوپ رکھا گیا جو آگے چل کر ''ایلفنسٹن'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اور آج یہ کلکتہ میں منروا سنیما کے نام سے مشہور ہے۔

★ شری پی بی مہتہ - نے پاتھے کے ساتھ فلموں کی نمائش کا ٹھیکہ لے کر اسپلینڈ' میدان میں فلمیں دکھانی شروع کیں ابھی تک بمبئی میں باقاعدہ طور پر فلمیں نہیں دکھائی جاتی تھیں۔ اس کا سہرا پاتھے کے سر بندھتا ہے۔

★ نگرداس اور بھگوان داس چتر ڈیا کی مدد سے سکھا رام'' نارائن راؤ'' پیشوا سے متعلق ایک فلم تیار کی آوٹ ڈور شوٹنگ کے لئے وہ بہار گئے کوئی پروڈیوسر آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے پہلی بار اپنا یونٹ لے کر باہر گیا تھا۔ اس فلم کی شوٹنگ بہار میں مور کے مقام پر ہوئی تھی۔

★ سنیما کے آغاز میں کوئی عورت فلموں میں کام کرنے کے لئے تیار نہ ہوتی تھی۔ آخر بڑی جدوجہد کے بعد ایک لڑکی کو اس فلم میں کام کرنے کے لئے آمادہ کیا اس کا نام ''نربدا'' تھا۔

★ دادا صاحب پھالکے نے جرمنی میں رہ کر مصوری' اور بلاک سازی میں مہارت حاصل کر لی اس کے بعد یکم فروری ۱۹۱۲ء کو فلم سازی سے متعلق ضروری سامان خریدنے کے لئے لندن گئے۔ دو ماہ بعد وہاں سے ایک ولیم سن کیمرہ ایک فورٹینگ مشین اور ایک پروڈکشن اور چھپائی کی مشین لے کر بھارت لوٹے سب سے پہلے انہوں نے ۵۰۰ فٹ لمبی فلم ''دی گروتھ آف اے پلانٹ'' نامی فلم بنائی تھی دادا صاحب پھالکے نے پہلی فیچر فلم ۱۷/مئی ۱۹۱۳ء میں راجہ ہریش چندر نمائش کے لئے بمبئی کے سینڈ ہرسٹ روڈ پر قائم کارونیشن تھیٹر میں پیش کی۔

★ ہندستانی فلموں میں ان کی بیٹی مندا کنی پہلی ایکٹریس تھی جوان کی فلم'' کایا مردن' اور لیس کرشن جنم'' میں کرشن کے روپ میں آئی اور ان کے بیٹے بھال چندر پھالکے پہلے بال کلاکار تھے انہوں نے راجہ ہریش چندر میں روہت کا رول ادا کیا تھا۔

★ بابوراؤ پینٹر دادا صاحب پھالکے کے شاگرد تھے وہ ۱۹۱۹ء میں فلمی دنیا میں داخل ہوئے انھوں نے یوں تو کئی فلمیں بنائیں لیکن ان میں ایک فلم ''سورندھری''

بھی تھی کہتے ہیں یہ ہماری پہلی رنگین فلم بھی تھی ۔اس فلم کو دیکھ کر لوکمانیہ تلک بے حد متاثر ہوئے تھے اور انہوں نے بابوراؤ پینٹر کو سونے کا مڈل عطا کیا۔اس لئے اس فلم کو پہلی انعام یافتہ فلم بھی قرار دی جاسکتی ہے۔اس فلم کی نمائش ۱۹۲۴ء میں پہلی بار لندن میں کی گئی۔

★ کلکتہ کے ایلفنٹسن سنیما گھر میں امریکہ کی ایک متکلم فلم ''میلوڈی آف لو'' کی نمائش ہوئی یہی وہ فلم تھی جو بھارت میں پہلی بار دکھائی گئی۔

★ ۴ رفروری ۱۹۳۱ء کو امپائر سنیما میں مدن جی کی دو شارٹ فلمیں دکھائی گئی تھیں اس زمانے کی بھارت کی مشہور گائیکی منی دیوی کے گانے کا پروگرام مدن جی کی پہلی فلم میں دکھایا گیا تھا۔ ان کی دوسری فلم میں ماسٹر نثار اور دادا بھائی سرکار کی اداکاری کے مناظر تھے۔

★ مدن جی کی دو فلموں کے بعد ۱۴ رمارچ ۱۹۳۱ء کو امپیریل فلم کمپنی کی فلم ''عالم آرا'' مجیسٹک سنیما میں دکھائی گئی۔اس فلم کے ڈائرکٹر آردیشر ایرانی تھے اس فلم میں ماسٹر وٹھل، پرتھوی راج کپور، زبیدہ، جلوبائی اور جگدیش سیٹھی نے کام کیا تھا۔یہ فلم ۱۱۱۵۲ فٹ لمبی تھی۔اس کے فوٹوگرافر عادل ایرانی اور موسیقار سید زاہد ولد علی تھے، مکالمے اور کہانی جوزف ڈیوڈ نے لکھے۔

★ ہندوستان میں پہلی تھری ڈائمنشن فلم ''مائی ڈیئر کی چیتن'' کمرشیل سنیما میں انقلاب لانے میں پیش پیش رہی یہ فلم ملیالم زبان میں ۱۹۸۴ء میں پیش کی گئی اور اس نے باکس آفس کے تمام ریکارڈ توڑ دئے اس کے پروڈیوسر سراپا چن اور ڈائرکٹر اس کے لڑکے جوجو نے اس فلم کو ہندی میں چھوٹا چیتن کے نام سے پیش کیا تھا۔

★ شاہ رخ خاں جوانی میں اتھیلٹ بھی تھے ۱۰۰، ۲۰۰ اور ۴۰۰ میٹر کی ریس میں چمپئن شپ کا اعزاز حاصل کیا تھا اس کا کہنا ہے کہ میں بہت تیز تھا اور میری اس تیز رفتاری نے Mail Train کی عرفیت دی تھی ۔اسکول میں اس نے بہت سے ایوارڈ

حاصل کئے بارہویں جماعت میں اسے روی سیرا مانیم ایوارڈ ملا جو اسکول کے تمام ۱۳ برسوں میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرتے چلے آئے ہوں۔اس سے قبل اس نے سجیت میموریل انعام بھی حاصل کیا تھا۔ہاکی میں وہ سنٹر فارووڈ کی پوزیشن سے کھیلتا تھا اگرچہ اسے ذاتی طور پر کرکٹ سب سے زیادہ پسند تھی لیکن اس نے زیادہ شاندار کامیابی اور مہارت ہاکی میں حاصل کی ہاکی کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ میں بہت اچھا سنٹر فارورڈ تھا اور کہیں سے بھی گول اسکور کرسکتا تھا۔

★ دنیا کا پہلا ایکٹر فریڈ آٹ تھا یہ اڈیسن کی فلموں کی لیبارٹری کا ایک مستری تھا۔یہ اڈیسن اپنی فلم لیبارٹری کا موجد تھا۔

★ آر جی تورنے کی فلم ''پنڈلیک'' ۱۸ رمئی ۱۹۱۲ء کو ریلیز ہوگئی تھی۔لیکن ہماری فلم تاریخ میں ایک محرک اور انقلابی کے طور پر دادا صاحب پھالکے کا کام سنہری حروف میں لکھا جائے گا کیونکہ انھیں کی کوشش سے فیچر فلموں نے ہمارے یہاں ایک تحریک کی شکل اختیار کی۔ دادا صاحب پھالکے نے ۱۹۱۳ء میں پہلی خاموش فلم ''راجہ ہریش چندر'' بنائی تھی۔

★ ہندستانی فلم کا پہلا ایکٹر جی ڈی تانبے کو کہا جاتا ہے۔

★ پہلے بال کلاکار دادا صاحب پھالکے کے صاجزادے بھال جی پھالکے اور صاجزادی مندا کنی تھے۔

★ ہندستانی فلم کی پہلی دو ایکٹریس تھیں درگا بائی اور کملا دونوں ماں بیٹی تھیں۔

★ ہندستان کی پہلی باکس آفس فلم ''لنکا دین'' تھی۔ جسے دادا صاحب پھالکے نے پیش کیا تھا۔

★ پہلی بولتی فلم آردیشر ایرانی نے ''عالم آرا'' بنائی جو ۱۴ رمارچ ۱۹۳۱ء کو ریلیز ہوئی۔ اس فلم کو دیکھنے کے لئے تماشائیوں کو چھ ماہ تک نمبر لگانا پڑا تھا۔آردیشر ایرانی نے اس فلم سے بیس لاکھ روپے کمائے۔

★ گانوں کے بغیر پہلی فلم ''نوجوان'' تھی جسے واڈیا مودی ٹون نے ۱۹۳۷ء میں بنائی تھی۔

★ مدن تھیٹر نے ۱۹۳۲ء میں فلم ''شیریں فرہاد'' میں ۴۲ گانے پیش کئے۔

★ ہمانشو رائے نے اپنی فلم ''جوانی کی ہوا'' میں پلے بیک گائیکی کو ایک تحریک کی شکل عطا کی یہ فلم ۱۹۳۴ء میں ریلیز ہوئی۔

★ بیک گراؤنڈ موسیقی دینے کا چلن دیوکی بوس کی فلم پورن بھگت سے ہوا۔ اس فلم کے موسیقار آر۔ سی۔ بورال تھے۔

★ فوٹو گرافی میں کلوز اپ دینے کی تحریک سب سے پہلے شانتا رام نے شروع کی انھوں نے ۱۹۳۴ء میں پربھات کے جھنڈے تلے فلم ''امرت منتھن'' پیش کی۔

★ پی سی بروا نے ۱۹۳۱ء میں فلم ''روپ لیکھا'' میں پہلی بار فلیش بیک کا استعمال کیا۔

★ مہیش کول نے انوپم چتر کے بینر میں پہلی سینما اسکوپ رنگین فلم ''پیار کی پیاس'' پیش کی۔

★ ۷۰ ایم ایم کی فلم کا آغاز مشہور و معروف مزاحیہ اور کریکٹر ایکٹر اوم پرکاش کے بھائی پاچھی نے ''اروَنڈ دی ورلڈ'' نامی فلم سے کیا۔

★ ہندوستان میں پہلی تھری ڈائمن فلم ''مائی ڈیر کٹی چیتن'' جو ملیالم زبان میں تھی۔

★ ہندستانی فلم کی سب سے پہلی کامیڈی جوڑی ''ڈیکشٹ اور کیری'' کی تھی اس جوڑی نے لارل اور ہارڈی کی یاد تازہ کر دی۔

★ متکلم فلم کے دور میں نشہ بندی کے پرچار کی خرابیوں کو منظرِ عام پر لانے کا سہرا ۱۹۳۹ء میں ڈائرکٹر ماسٹر ونائک کے سر بندھا انہوں نے نشہ بندی کے موضوع پر ایک مزاحیہ اور طنزیہ فلم بنائی یہ فلم ہندی اور مراٹھی دونوں زبانوں میں تیار کی گئی تھی ہندی فلم کا نام ''برانڈی کی بوتل'' اور مراٹھی فلم کا نام ''برانڈی چ باٹلی'' تھا۔

★ سرت چندر چٹرجی کے شہرہ آفاق ناول ''دیوداس'' کو اب تک آٹھ بار فلمایا جا چکا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں ایسٹرن فلم سنڈیکیٹ نے خاموش فلم کے طور پر فلمایا۔ اس فلم کے ڈائرکٹر نریش مترا اور فوٹو گرافر نتن بوس تھے۔

★ خاموش فلمی دور میں طوائف کی زندگی کو سردار چندولال شاہ اور مس گوہر نے ۱۹۲۸ء میں اپنی فلم ''وشوموہنی'' میں پہلی بار پیش کیا۔ اس فلم میں مس گوہر نے تنہا تین بہنوں کا رول ادا کیا تھا۔

★ بولتی فلموں کے عہد میں طوائف کی زندگی پر مبنی پہلی فلم ۱۹۳۲ء میں مہالکشمی سینے ٹون نے منشی پریم چند کے ناول بازارِ حسن ''سیوا سدن'' کے نام سے بنائی۔

★ فلم انڈسٹری میں کار خریدنے والی پہلی اداکارہ روبی میرز سلوچنا تھی۔

★ سب سے پہلے دادا صاحب پھالکے ایوارڈ دیویکا رانی کو دیا گیا۔

★ مشہور اداکارہ ستارہ دیوی نے جب فلمی زندگی کو خیر باد کہا تو کتھک رقص کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ اس نے کتھک رقص میں عالمگیر شہرت حاصل کی اور مسلسل چھ گھنٹے تک ناچ کر عالمی ریکارڈ قائم کیا۔

★ خاموش دور میں گاندھی جی کی شخصیت اور تحریک پر کوہِ نور فلمز نے ۱۹۲۱ء میں ایک فلم ''بھگت وُدر'' بنائی۔ اس فلم میں ہیرو کا رول 'دوار کا داس' نے کیا تھا۔ اس میں 'پوران کی ایک کہانی کی آڑ میں دیش بھگتی کا پیغام دیا تھا'۔ جس کے نتیجے میں اس فلم پر کئی صوبوں میں پابندی عائد کر دی گئی تھی۔

★ ۱۹۲۹ء میں دھریندر گنگولی نے دیوکی بوس کی کہانی ''فلمیز آف فلیش'' برٹش ڈومینین فلم کمپنی کے جھنڈے تلے بنائی۔ اس کے ہیرو خود تھے ___ بعد ازاں اس کمپنی نے ''پنچ تنتر'' کے نام سے ایک فلم بنائی اس فلم کے مصنف' ڈائرکٹر اور ہیرو خود تھے۔

★ نامور کیریکٹر ایکٹر نانا پلسکر ۱۹۳۰ء میں تحریک آزادی کے دوران ایک برس کے لئے جیل گئے۔

★ فلم ڈائریکٹر ہمن گپتا ۱۹۲۴ء میں ایک انقلابی پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ۱۸ر برس کی عمر ہی میں ایک سیاسی ادارے کے لیڈر رہے۔ کئی بار گرفتار بھی ہوئے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۹ء تک وہ جیل میں رہے۔ جیل ہی میں انہوں نے ایم اے پاس کیا۔ رہا ہونے

کے بعد نوکری کر لی۔اس دوران وہ سبھاش چندر بوس کے سکریٹری بن گئے۔

★ گاندھی جی نے اپنی زندگی میں کوئی فلم نہیں دیکھی تھی لیکن فلم ''رام راجیہ'' کو خصوصی طور پر سنسر کرایا گیا اور وجے بھٹ نے گاندھی جی کو یہ فلم ان کے آشرم میں دکھائی تھی۔

اہم فلمی معلومات

★ خاموش فلموں کا دور ۱۹۱۳ء سے ۱۹۳۱ء تک رہا ہے اس دوران تیرہ سو اکتیس (۱۳۳۱) خاموش فلمیں بنائی گئیں۔ گرچہ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں کمل ہاسن کی فلم ''پسپک'' آئی یہ بھی خاموش فلم تھی۔

★ ہندوستان کی پہلی خاموش فلم ''راجہ ہریش چندر'' میں عورتوں نے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تو ایسی صورت میں عورتوں کا رول مردوں ہی نے کیا تھا۔

★ دادا صاحب پھالکے کی بیٹی منداکنی نے فلم ''راجہ ہریش چندر'' میں کام کیا تھا۔

★ گلوکار مکیش نے ۱۹۴۱ء میں بنی فلم ''نردوش'' میں کام کیا تھا۔

★ مشہور اداکارہ دیویکا رانی رابندر ناتھ ٹیگور کی نواسی تھیں۔

★ دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سب سے پہلے دیویکا رانی کو دیا گیا۔

★ ہندوستان کی پہلی سلور جوبلی فلم ''شیام سندر'' تھی۔

★ کمال امروہوی کی فلم ''دائرہ'' میں ہیرو اور ہیروئن نے پوری فلم میں ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

★ سابق وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی نے فلم ''باپو نے کہا تھا'' میں کام کیا تھا۔

★ فلم ''مغلِ اعظم'' کا گیت ''پیار کیا تو ڈرنا کیا'' کو شکیل بدایونی نے ایک سو مرتبہ لکھا تھا تب کے آصف اور موسیقار نوشاد نے اس گیت کو فلمایا تھا۔

★ معروف اداکار و گلوکار کندن لال سہگل جب کلکتہ آئے تو اداکار اور گلوکار بننے سے قبل انہوں نے صرف ۸۰ روپے ماہوار پر ٹائپ رائٹر درست کرنے کی نوکری کی تھی۔

کندن لال سہگل نے گانے کی ابتدائی تعلیم ایک پیر فقیر صوفی مسلمان یوسف سے حاصل کی۔

★ اداکارہ گلوکارہ ملکہ ترنم نور جہاں نے لاہور میں بنائی گئی ایک پنجابی فلم میں صرف نو سال کی عمر میں ایک کردار ادا کیا تھا تو انھیں برصغیر کی پہلی چائلڈ آرٹسٹ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

★ ملکہ ترنم بیگم اختر معروف اردو شاعرات جدن بائی، ملکہ جان ملکہ اور گوہر جان گوہر سے بیحد متاثر تھیں۔ ۱۹۴۰ء کی آخری دہائی میں پانچ سال تک خاموش رہنے کے بعد انہوں نے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے اسٹوڈیو میں اپنے دوست ملہوترا جو پروگرام پروڈسر تھے۔ ان کے اصرار پر ایک گانا ریکارڈ کرایا۔ ریکارڈنگ کے وقت اسٹوڈیو میں صرف سازندے موجود رہیں اس شرط پر انہوں نے گانا منظور کر لیا۔ جب ریکارڈ کیا گیا گانا انھیں سنایا گیا تو وہ اس قدر جذباتی ہوگئیں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو کے دھارے بہہ نکلے اس کے بعد گانے پر پابندی ختم کر دی گئی۔

★ فلم ''آن'' کا پریمیئر لندن میں ہوا تھا اس موقع پر ہالی ووڈ کے بہت سے فلم اسٹاروں نے شرکت کی تھی اس موقع پر آن میں کام کرنے والے اسٹار بھی موجود تھے اس موقع پر ہالی ووڈ کے ایک ایکٹر ایرول فلائن نے اداکارہ نمّی کے ہاتھ کو بوسہ دینے کے لئے جھکے نمّی نے اپنا ہاتھ یہ کہتے ہوئے کھینچ لیا کہ میں ایک ہندوستانی لڑکی ہوں اس لئے آپ میرے ہاتھ کا بوسہ نہیں لے سکتے۔

★ ڈائرکٹر وی شانتارام ۱۹۱۳ء میں اپنی والدہ کے ساتھ ہبلی آئے جہاں انھوں نے ایک

مقامی سینما گھر میں دربان کی نوکری کی۔

★ ناول نگار منشی پریم چند فلم ''مل'' میں ایک چھوٹا سا رول کیا تھا۔ یہ فلم ۱۹۳۴ء میں بنی تھی۔

★ معروف مزاحیہ اداکار چارلی چیپلن کو ان کی فلمی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۷۵ء میں ''سر'' (SIR) کا خطاب دیا گیا تھا۔

★ مشہور گلوکارہ و اداکارہ اوما دیوی کا فلمی نام ''ٹن ٹن'' موسیقار نوشاد اور دلیپ کمار نے فلم ''بابل'' کی تیاری کے دوران دیا تھا۔

★ ہند و پاک کے غریب' بے سہارا' بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے لندن کی ایک تقریب میں دلیپ کمار کی تصاویر فروخت کی گئیں ان کی ایک ایک تصویر پانچ ہزار پونڈ (ڈھائی لاکھ ہندوستانی روپے) میں فروخت ہوئی۔

★ ہمانسو رائے نے کلکتہ سے بی اے ایل ایل بی کی سند حاصل کی اور بیرسٹری کی تعلیم کے لئے لندن گئے تھے۔

★ لندن میں ہمانسو رائے کی ملاقات بمبئی پریذیڈنسی کے ایک سابق گورنر کے بیٹے رچرڈ ٹمپل سے ہوئی اور دونوں کے اشتراک سے پہلی اینگلو انڈین فلم ''کرما'' بنی یہ ہمانسو رائے کی پہلی بولتی فلم تھی۔

★ ''کرما'' کی ہیروئن دیویکا رانی تھی یہ فلم بیک وقت ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں میں بنی تھی۔

★ ہندوستان میں ہندی ''کرما'' کے پریمیئر کا افتتاح وائس رائے لارڈ ارون نے کیا تھا یہ فلم مئی ۱۹۳۳ء میں لندن میں ریلیز ہوئی تھی۔ ''کرما'' کا ہندی روپ ۲۷ جنوری ۱۹۳۴ء کو ریلیز ہوا۔

★ دیویکا رانی کی فلم ''کرما'' کی ریلیز پر ''کرما'' سے متعلق ایک خصوصی بک لیٹ شائع ہوئی جس کا پیش لفظ سروجنی نائیڈو نے لکھا تھا۔ مسز نائیڈو نے اپنے پیش لفظ میں دیویکا رانی کو ''محبت کا طلسمی پھول'' قرار دیا تھا۔ اس فلم میں دیویکا رانی نے چار گانے

بھی گائے تھے۔ تین ہندی میں اور ایک انگریزی میں۔

★ اشوک کمار اور دیویکا رانی کی مشہور فلم ''اچھوت کنیا'' کی تیاری میں ۲۷ ہزار ایک سو تیرہ روپے چودہ آنے لاگت آئی تھی۔ یہ فلم کلکتہ کے ایک ہی سینما گھر میں ۳۷ ہفتے چلی تھی۔

★ بمبئی ٹاکیز کے زیادہ تر گانے ان فلموں میں کام کرنے والے اداکاروں نے ہی گائے ہیں' اشوک کمار' دیویکا رانی' لیلا چٹنس' میرا دیوی' رینوکا دیوی' ارون کمار' سنہر پربھا' پردھان اور سریش وغیرہ نے اپنے گانے خود ہی گائے تھے۔

★ ڈسپلن کے اعتبار سے ہمانسو رائے اور دیویکا رانی نے بامبے ٹاکیز کو اپنے وقت میں ملک کا ایک منفرد فلم ساز ادارہ بنا دیا تھا۔ اسٹوڈیو کے ہر فرد کو باقاعدہ مکمل لباس پہننے کا حکم دیا۔ ڈاکٹر سوریہ کانت بھٹ ہر تیسرے دن اسٹوڈیو کے تین سو ملازمین کے میڈیکل چیک اپ کے لئے اسٹوڈیو آتے تھے۔ دیویکا رانی نے ان سے ابتدا ہی میں کہہ دیا تھا کہ آپ ایک ذمہ دار عہدے کے مالک ہیں اس لئے آپ کو ہمیشہ ایک مکمل لباس میں اسٹوڈیو آنا ہوگا۔ آپ نوجوان ہیں اور آپ کے پیشے کی ابتدا ہے اس لئے آپ کا کردار بے داغ ہونا چاہئے۔ خصوصی طور پر اسٹوڈیو کی خواتین کے ساتھ۔

مہذب اور شائستہ عادات کی بنا پر دیویکا رانی دلیپ کمار کو بہت پسند کرتی تھیں مگر ایک دن جب دلیپ کمار اسٹوڈیو کے اوقات میں سہ پہر کے شو میں بمبئی کے میٹرو سینما میں دیکھے گئے تو سزا کے طور پر دلیپ کمار کی ایک دن کی تنخواہ کاٹ لی اس شو میں دیویکا رانی خود اپنے غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ موجود تھیں۔ دلیپ کمار کو بلا کر خوشی سے اپنے مہمانوں سے تعارف کرایا۔ اور پھر سختی سے حکم دیا ابھی اسٹوڈیو واپس جاؤ۔

دیویکا رانی پہلی خاتون تھیں جو ہندوستانی سماج کے اونچے طبقے سے نکل کر فلمی دنیا میں داخل ہوئی۔

★ دیویکا رانی پہلی تربیت یافتہ اداکارہ تھیں اور کسی غیر ملکی فلم میں اور غیر ملکی زبان میں بنی

فلم میں کام کرنے والی پہلی ہندوستانی اداکارہ تھیں اسی لئے انھیں فلمی دنیا کی خاتون اوّل کہا گیا بیز پر اس کے نام کے ساتھ بین الاقوامی شہرت یافتہ لکھا جاتا تھا۔

★ سب سے پہلا بین الاقوامی فلمی میلہ ۱۹۵۲ء میں بمبئی میں ہوا۔

★ ہندوستانی فلموں کی پہلی خاتون ہدایت کار فاطمہ بیگم تھیں جنھوں نے ۱۹۲۶ء میں ''بلبلِ پرستان'' کے نام سے ایک خاموش فلم بنائی تھی۔

★ ملیالی فلموں کے اداکار پریم نذیر کا نام گنیز بک میں درج ہے انہوں نے چھ سو سے زائد فلموں میں کام کیا تھا۔

★ دیویکا رانی امریکن سگریٹ پینے کی شوقین تھیں۔لیکن سگریٹ ہمیشہ ہولڈر میں لگا کر پیتی تھیں۔

★ دیویکا رانی گرچہ مغربی تہذیب وتمدن میں پروان چڑھی تھی۔مگر انھوں نے اپنی پوری زندگی میں مغربی لباس کبھی زیب تن نہیں کیا حتّی کہ کسی فلم میں بھی نہیں پہنی۔

★ یوسف خاں کا فلمی نام 'دلیپ کمار' بھگوتی چرن ورما نے دیا۔

★ ۱۹۵۸ء میں دیویکا رانی کو فلمی خدمات کے عوض حکومت ہند نے پدم شری' کے اعزاز سے نوازا۔

۱۹۷۰ء میں داداصاحب پھالکے ایوارڈ اور ۱۹۸۹ء میں سویت لینڈ ایوارڈ بخشا گیا۔

★ فلم 'اچھوت کنیا' کے بعد دیویکا رانی کی دوسری فلم 'ساوتری' جب الٰہ باد میں ریلیز ہوئی تو پوری نہرو فیملی نے ایک ساتھ یہ فلم دیکھی اور بامبے ٹاکیز کے یونٹ نے اس موقع کو قلمبند کیا۔

★ ہفت روزہ اسکرین (بمبئی) میں دیویکا رانی سے متعلق دلیپ کمار کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ'' دیویکا رانی اپنے عہد کی مشہور ترین شخصیت تھیں۔ان ہی کی بدولت میں فلمی دنیا میں آیا انہوں نے مجھے انگریزی فکشن اور ڈرامے کی ٹکنک پر کتابیں پڑھنے کی ہدایت کی انہوں نے چند کارآمد کتابیں مجھے تحفے

کے طور پر دی تھیں جو آج میرا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

★ دیویکا رانی کی وصیّت تھی کہ ان کے آخری رسوم بنگالی براہمن دھرم کے مطابق انجام دی جائیں۔ان کی چتا کی راکھ کا تھوڑا ساحصّہ دریائے بیاس میں بہایا جائے اور بقیہ راکھ کو کلووادی میں ان کے سُسر کے قریب دفن کردی جائے وہاں ایک چھوٹی سی سمادھی بھی بنائی جائے اور اس کے پتھر پر لکھا جائے ''اچھوت کنیا'' یہ اس کی فلم کا نام ہے جس میں دیویکا رانی نے کام کیا تھا جسے اُن کے شوہر ہمانسو رائے نے بنائی تھی۔

★ تقسیم ملک سے قبل لاہور میں اپنے زمانے کے مشہور فلم ساز ہدایت کار اور اداکار رنذیر کے مکان پر ایک فلمی محفل میں موسیقار شیام سندر نے محمد رفیع صاحب کو سُنا اور فوراً ایک پنجابی فلم ''گل بلوچ'' میں گانے کا موقع دیا۔بول یہ تھے ''سوہنئے نی ہیریئے نی''، رفیع کے ساتھ گلوکارہ زینت بیگم نے دیا تھا۔

★ گلوکار آنجہانی سہگل کی یاد میں محکمہ ڈاک تار نے ۴؍اپریل ۱۹۹۵ء کو پانچ روپے کا یادگاری ٹکٹ جاری کیا تھا۔

★ فلم ''نوجوان'' ۱۹۳۷ء میں ریلیز ہوئی تھی۔یہ ہندوستان کی پہلی فلم تھی جس میں ایک بھی گانا نہیں تھا۔

★ پروڈیوسر آر۔سی۔بورال نے ہندوستان کی پہلی کارٹون فلم ''On moonlit Song'' ۱۹۳۶ء میں بنائی تھی۔

★ فلمی شاعر پردیپ کو ایک فلم میں انقلابی نظم لکھنے پر ان کی گرفتاری کا حکم ہوا تو پردیپ برسوں تک فلموں میں کمل بی اے کے نام سے گیت لکھتے رہے جب حالات سازگار ہوئے تو پردیپ کے نام سے لکھنے لگے۔

★ رابندرناتھ ٹیگور اور پنڈت روی شنکر کے بعد فلم اسٹار متھن چکرورتی بنگال کی تیسری شخصیت ہے جسے ۱۹۹۵ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں اعزازی ممبر کی حیثیت سے شامل کیا گیا ہے۔

★ دلیپ کمار اور سائرہ بانو کی شادی کا آنکھوں دیکھا حال آل انڈیا ریڈیو سے نشر کیا گیا تھا اس سے قبل کسی بھی فلم اسٹار کی شادی کا آنکھوں دیکھا حال ریڈیو پر نشر نہیں کیا گیا۔

★ دہلی کے رام لیلا میدان کے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے فرمایا تھا۔ ہندوستان دو جواہر لال نہرو تو پیدا کر سکتا ہے لیکن دو دلیپ کمار نہیں اس سے بڑا اخراجِ تحسین اور کیا ہو سکتا ہے۔

★ فلم 'دیدار' میں دلیپ کمار کے بچپن کا رول بلراج ساہنی کا بیٹا پریکشت ساہنی نے کیا تھا۔

★ ۱۹۳۴ء میں بنی فلم ''دیش دیپک'' سے ۱۹۵۹ء میں بنی فلم ''کارنیول کوئن'' ان پچیس برسوں کے عرصے میں اسٹنٹ کوئن ناڈیا نے کل ۱۴۱ فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے اور ۱۹۵۹ء میں فلمی دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔

★ ۱۹۴۱ء میں صرف ۱۷ سال کی عمر میں ایچ ایم وی نے طلعت محمود کا پہلا ریکارڈ نکالا۔ اس کے ایک طرف ''بن جاؤں گا کیا سے کیا میں'' تو دوسری طرف تھا ''سب دن ایک سمان نہیں'' کافی مقبول ہوا۔

★ عام لوگوں کا خیال ہے کہ بحیثیت گلوکار طلعت محمود کی پہلی فلم ''آرزو'' تھی لیکن خود طلعت محمود کا کہنا ہے کہ ان کی پہلی فلم ''راج لکشمن'' ہے جو کلکتہ میں بنی اور ۱۹۴۵ء میں ریلیز ہوئی تھی اس گیت کے بول تھے۔ ''جاگو مسافر جاگو''۔

★ طلعت محمود کی شخصیت رعب دار تھی اس لئے فلموں میں کام کرنے کے آفر آتے رہتے تھے بلکہ اے آر کاردار تو ان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے انہوں نے ان کی فلم میں کام کرنے کی حامی بھر دی۔ ان کی فلم کی ہیروئن کی تلاش کرنے کے لئے انہوں نے ایک مقابلۂ حسن بھی کرایا تھا' کالی فوز ٹوتھ پیسٹ کے بنانے والے اور اے آر کاردار نے مل کر'' کالی فوز کاردار بیوٹی کانٹیسٹ'' کا انعقاد کیا تھا۔ اس مقابلۂ حسن میں پیش کنول نامی لڑکی اوّل آئی۔ وہی لڑکی بمبئی میں ان کی پہلی فلم ''دلِ ناداں'' کی ہیروئن تھی۔

★ ۱۹۵۶ء میں طلعت محمود نے ایک پروگرام افریقہ میں کیا۔ کسی بھی ہندوستانی گلوکار کے ذریعہ غیر ممالک میں پروگرام کرنے کا پہلا موقع تھا۔

★ فلم ''تین دیویاں'' کے تمام کرداروں کے نام اصل ہیں جسے دیوانند (دیو) آئی ایس جوہر (آئی ایس جوہر) نندہ (نندہ) کلپنا (کلپنا) سیمی (سیمی)۔

★ فلمی شاعر اندیور کا مشہور گیت ''میری پیاری بہنیا بنے گی دلہنیا'' پاکستان کا لوک گیت بن گیا ہے۔ شادیوں کے موقع پر یہ گیت ضرور بجایا جاتا ہے۔

★ فلم ''مدر انڈیا'' میں نرگس کے بیٹوں کے کرداروں میں محبوب خاں نے ایک بیٹے کے کردار کے لئے دلیپ کمار کا انتخاب کیا تھا لیکن دلیپ کمار نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ نرگس اس کی ہیروئن رہی ہے وہ اسے ماں کے طور پر قبول نہیں کر سکتے۔ دلیپ کمار نے محبوب خاں کی ناراضگی کی بھی پرواہ نہیں کی جس نے اس کے فلمی کیریر کو بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

★ اداکارہ زبیدہ نے فلموں کے بعض مناظر کے لئے باقاعدہ تلوار بازی' گھوڑ سواری اور تیراکی کی تربیت حاصل کی تھی۔

★ عذرا امیری کی فلم ''زرینہ'' اداکارہ زبیدہ کی ہندوستان کی پہلی عریاں فلم تھی جس میں زبیدہ کے جسم کی پوری نمائش کی گئی تھی۔

★ ہندوستانی فلم کی تاریخ میں ''یادیں'' واحد فلم ہے جس میں صرف ایک فن کار (سنیل دت) نے کام کیا۔

★ راج کپور کی فلم ''سنگم'' اور ''میرا نام جوکر'' اتنی طویل فلمیں تھیں کہ دوبار انٹرویل کیا گیا تھا۔

★ ۱۹۳۷ء میں اردشیر ایرانی کی ایمپیریل فلم کمپنی میں پہلا کلر لیبریٹری لگایا گیا (Colour Laboratory)۔

★ بحیثیت ہیرو اتم کمار کو پہلی بار نیشنل ایوارڈ فلم ''چڑیا گھر'' کے لئے ملا۔

★ اداکار نانا پلسکر ۱۹۳۱ء میں فلموں میں آئے ان دنوں انہیں ایک دن کی شوٹنگ کا معاوضہ ایک روپیہ ملتا تھا۔

★ پہلی بار بچوں کی فلم ''ہم پنچھی ایک ڈال کے'' کو ۱۹۵۷ء میں وزیراعظم ایوارڈ دیا گیا۔

★ فلموں کے ابتدائی دور میں سیتا دیوی کو پانچ روپے اور ہیرو ماسٹر وٹھل کو آٹھ آنے یومیہ ملتے تھے۔

★ فلم ''رتن'' ۱۹۴۴ء میں ریلیز ہوئی تھی اور خوب چلی تھی فلم کی موسیقی نوشاد نے دی تھی۔فلم کے تمام گیت بہت مقبول ہوئے تھے لیکن اچانک فلم کے نغموں اور نمائش پر حکومت نے پابندی عائد کر دی تھی کیونکہ اس فلم کو دیکھ کر اور نغموں کو سن کر لڑکیاں اپنے عاشقوں کے ساتھ فرار ہونے لگی تھیں۔ یہ لڑکیاں معمولی گھر کی نہیں تھیں۔ بلکہ مہذب خاندان' اور اعلیٰ سرکاری افسران کی تعلیم یافتہ بیٹیاں تھیں۔اس فلم نے ایک نئی تاریخ مرتب کی تھی۔

★ ملکۂ حسن' بیوٹی کوئن' ڈریم گرل' اور بے بی ڈال جیسے خوبصورت القاب کا سلسلہ فلمی دنیا میں نسیم بانو سے شروع ہوا۔نسیم بانو پہلی اداکارہ تھیں جسے 'پری چہرہ' کہا گیا۔

★ نسیم بانو پہلی اداکارہ تھیں۔جس نے ۱۹۳۷ء میں ایک فلم میں کام کرنے کا معاوضہ ایک لاکھ روپیہ لیا تھا۔

★ اکشے کمار فلم ''کھلاڑیوں کا کھلاڑی'' کے آخری منظر میں مشہور پہلوان اداکار'' انڈر ٹیکر'' سے حقیقی ٹکر کر بیٹھے پہلوان کا وزن ۳۵۰ پونڈ تھا اس کو اٹھا کر پھینکنے کی کوشش میں اکشے کی پیٹھ کی ہڈی ٹوٹ گئی علاج کے لئے اسے امریکہ بھیجا گیا تھا۔

★ سب سے پہلا فلمی میلہ' وینس' میں ۱۹۳۲ء میں منعقد ہوا تھا۔

★ فلم ''اگنی پتھ'' باورچی'' اور سزائے کالا پانی'' میں امیتابھ بچن کی آواز

ڈبنگ میں استعمال کی گئی۔

★ فلم ''شعلے'' میں نے پیار کیا'' ہم آپ کے ہیں کون' 'اور دل والے دلہنیا لے جائیں گے' 'ایسی ہندوستانی فلمیں ہیں جو عالمی باکس پر سب سے زیادہ کامیاب ہوئیں۔

★ ہندوستان کی پہلی خاتون ہدایت کارہ ہونے کا شرف فلم اسٹار فاطمہ بیگم کو حاصل ہے فاطمہ بیگم نے چھ فلمیں بنائیں ان فلموں کی ہدایت کاری بھی کی۔

★ اداکارہ جدن بائی نرگس کی والدہ فلمی دنیا کی پہلی خاتون موسیقار ہیں جنہوں نے ۱۹۳۵ء میں فلم ''تلاشِ حق'' کی موسیقی ترتیب دی۔

★ ہندوستان کی پہلی ڈائمنڈ جوبلی فلم ''رتن'' تھی جو ۱۹۴۴ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

★ فلم ''نیا دن نئی رات'' ہندوستان کی پہلی فلم ہے جس میں سنجیو کمار نے نو مختلف رول کیا تھا۔

★ کے آصف نے ۱۹۴۵ء میں فلم ''پھول'' بنائی یہ اپنے زمانے کی پہلی ملٹی اسٹار فلم تھی اس کے ستاروں میں پرتھوی راج کپور' وینا' ستارہ دیوی' ثریا' درگا کھوٹے' جلّو بائی' مظہر خان' یعقوب' واسطی' دکشت' اشرف خان' ایم اسمٰعیل' اور آغا تھے۔فلم پھول' ہندو مسلم اتحاد پر بنائی گئی پہلی ہندوستانی فلم تھی۔جس میں ثریا نے پرتھوی راج کپور کی ہندو بہن کا کردار ادا کیا تھا۔

★ فلم ''مغلِ اعظم'' وہ پہلی فلم ہے جس کے مکالموں اور کہانیوں کا آڈیو کیسٹ ریکارڈ ہندوستان میں پہلی بار تیار کیا گیا تھا۔جو عوام میں کافی مقبول ہوا۔

★ لتا منگیشکر نے ۱۹۴۵ء میں پہلی بار کورس کے ساتھ فلم ''دادی ماں'' میں گیت گایا تھا اس فلم میں انہوں نے کام بھی کیا تھا۔

★ کیدار شرما کی فلم ''نیل کمل'' جو راجکپور کی پہلی فلم تھی اس فلم کا نام پہلے ''Poor God'' یعنی بیچارہ خدا تھا۔جسے بعد میں 'نیل کمل' کے نام سے ریلیز کیا گیا۔

★ فلم 'گاندھی' میں گاندھی کا کردار بین کنگسلے نے کیا تھا۔

★ فلم ''جناح'' میں گاندھی کا رول مشہور اداکار شام دسٹور نے کیا تھا۔

★ پاکستان کا اعلیٰ ترین شہری اعزاز ''نشانِ امتیاز'' ہندوستان کی فلمی شخصیت دلیپ کمار کو ۱۹۹۷ء میں دیا گیا۔

★ ہندوستانی فلمی دنیا میں پرتھوی راج کپور کو ''پاپا جی'' اور اشوک کمار کو ''دادا منی'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

★ فلم ''وچن'' میں موسیقار روی نے روی اور چندرا کے نام سے موسیقی دی تھی چونکہ ان کی بیوی کا نام 'چندرا' ہے اس لئے انہوں نے اپنے نام کے ساتھ اپنی بیوی کا نام بھی جوڑ دیا تھا۔اس کے بعد انہوں نے اپنی ساری فلموں میں صرف روی کے نام سے ہی موسیقی دی۔

★ گیت کار شلیندر فلموں میں آنے سے پہلے ریلوے کلرک تھے۔

★ فلموں میں پہلی بار لیڈی ڈکیٹ (ڈاکو) کا رول کرنے کا شرف ''جے مالا'' کو حاصل ہے۔اس نے فلم ''پتلی بائی'' میں ڈاکو کا رول کیا تھا۔

★ پہلی بار فلموں میں کرکٹ میچ فلم ''لومیرج'' میں دکھایا گیا۔

★ ساس کا رول پہلی بار درگا کھوٹے نے ''فلم چرنوں کی داسی'' میں کیا تھا۔

★ ہندی فلموں میں کام کرنے والے پہلے غیر ملکی اداکار ''ابراہیم شوفر'' تھے انہوں نے ہمانشو رائے کی فلم ''کرما'' میں کام کیا تھا۔

★ ۲۸ر دسمبر ۱۸۹۵ء میں Louise اور Auguste نے پہلی بار لحہ بھر کے لئے تصویر بنائی اور یہ فن اظہار کے افق پر سنگِ میل بن گیا۔

★ کلکتہ میں پہلی بار بائسکوپ کو میدان میں تیار کئے گئے خیمے میں دکھایا گیا تھا اس میں آتش فشاں کا ایک منظر فلمایا گیا تھا' فلم کا رنگ سرخ تھا۔ ناظرین خیمے سے نکل کر بھاگنے لگے انہوں نے سمجھا کہ خیمے میں آگ لگ گئی ہے۔

★ بولتی فلموں کی آمد سے قبل سینما کے پردے پر لگا تار انگریزی عنوان اور الفاظ لکھے ہوئے آئے ادیتیہ بابو اسٹیج کے پیچھے سے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر انگریزی الفاظ کا بنگلہ میں ترجمہ کرتے۔چھوٹے سے سینما گھر میں تمام لوگ اسے سن سکتے تھے۔سامنے ایک موسیقی کا آلہ ہوا کرتا تھا۔جس پر کبھی کبھی بادل دا فلم کی پس منظر موسیقی دیا کرتے تھے۔

★ بولتی فلمیں جب کلکتہ نہیں پہنچی تھیں لیکن مدن تھیٹر کے پاس Weslitzer (ایک قسم کا ساز) تھا اس ساز پر آپ بارش کی آواز سے لے کر سپاہیوں کے مارچ پر طوفان اٹھانے تک بہت کچھ بجایا کرتے تھے۔اننت ناگ بابو فلم کے شروع اور آخر میں ایک گیت گایا کرتے تھے۔

★ جنوری ۱۹۴۳ء میں بمبئی ٹاکیز کی فلم ''قسمت'' کلکتہ کے راکسی سینما ہال میں تین برس تک چلی۔۔۱۹۴۳ء میں وی شانتارام کے قائم کردہ کلامندر کی پہلی فلم ''شکنتلا'' بھی ریلیز ہوئی۔یہ ممبئی کے ایک سینما ہال میں دو برس تک چلی-راج کپور کی سپرہٹ فلم ''برسات'' کی نمائش ۱۹۴۹ء میں ہوئی اور کلکتہ کے ایک سینما گھر میں یہ فلم ۱۰۰ ہفتہ چلی۔پونے میں مراٹھی فلم ''سانگتے آیکا'' بھی ۱۰۰ ہفتے چلی۔فلم ''میں نے پیار کیا'' ملک کے ۵۲ سینما ہالوں میں گولڈن جوبلی اور ۱۵۰ سینما ہال میں بھی یہ فلم ۵۰ ہفتے چلی-۱۵ر اگست ۱۹۷۵ء کو رمیش سپی نے بالی ووڈ میں ایک دھماکہ کیا تھا۔اس دن فلم ''شعلے'' ریلیز ہوئی تھی اور یہ فلم ۱۰ر دسمبر ۱۹۸۰ء تک ممبئی کے سینما ہال میں مسلسل چلی ۱۷۵ ہفتے تک فلم کے ٹکٹ ایڈوانس بک کرائے جاتے تھے۔کلکتہ کے جیوتی سینما میں یہ فلم ۱۰۳ ہفتے تک چلی ''شعلے'' نے ساٹھ سینما گھروں میں گولڈن جوبلی منائی۔لیکن شاہ رخ خاں اور کاجل کی جوڑی والی ادتیہ چوپڑا کی فلم ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' ہندوستانی سینما کے ۹۰ برسوں کی تاریخ میں سب سے زیادہ چلنے والی فلم کے طور پر پچھلے سارے ریکارڈ توڑ چکی ہے۔۲۰ر اکتوبر ۱۹۹۵ء کو ملک بھر میں ریلیز ہوئی

اور D.D.L.J کے نام سے مشہور ہونے والی فلم ۱۰راگست ۲۰۰۱ء کو ممبئی کے مراٹھا مندر ہال میں اپنے ۳۰۰ ہفتے میں داخل ہو چکی ہے۔فلم کی نمائش اب بھی جاری ہے ۔لگاتار چھ برسوں کے اس ریکارڈ نے ہندی کی سدابہار فلم ''شعلے'' کا ریکارڈ توڑ دیا ممبئی کے منروا سنیما ہال میں ۲۶۲ ہفتے تک چلی۔

★ موسیقار روی ایک اچھے سنگیت کار کے ساتھ اچھے گلوکار بھی تھے انہوں نے اپنی کئی فلموں میں مختصر گانے بھی گائے ہیں لیکن دیوندر گوئل کی فلم ''ایک پھول دو مالی'' کے لئے انہوں نے ایک پورا گیت گایا تھا جس کے بول تھے ''قسمت کے کھیل نرالے میرے بھیّا قسمت کا لکھا کون ٹالے میرے بھیّا''۔

★ سنسر بورڈ نے پہلی بار A سرٹیفکٹ فلم ''ہنستے آنسو'' ۱۹۵۰ء کو دیا۔

★ آسکر ٹرافی میں مجسمے کا ڈیزائن لاس اینجلس کے سنگتراش ''جارج اسٹینلی نے تیار کیا تھا۔

★ پہلی بار فلموں میں ٹرالی' اور کرین'' کا استعمال فلم ''چندر سینا'' میں کیا گیا۔

★ ہندی فلموں میں اسٹوڈیو کے اندر لگائے جانے والا اب تک کا سب سے مہنگا سیٹ نئی فلم ''دیوداس'' کا ہے یہ سیٹ اسٹوڈیو فلم سٹی' میں لگایا گیا ہے۔اور اس سیٹ پر ۹ کروڑ کا خرچ آچکا ہے۔

★ راج کپور کی فلم ''آوارہ'' روسی زبان میں ڈب کی گئی تھی جس نے بڑے پیانے پر بزنس کیا تھا۔

★ فلم ''میں نے پیار کیا'' انگریزی زبان میں بھی ڈب کی گئی تھی اس فلم نے بھی مقبولیت حاصل کی تھی۔

★ ہندوستان کی پہلی 3-D فلم ''چھوٹا چیتن'' تھی۔

★ فلم ''Thief of Baghdad'' پہلی غیر ملکی فلم تھی۔جو ہندی میں ڈب کی گئی تھی یہ فلم ۱۹۴۸ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

★ ہندوستان کی فلمی ہیروئن ''کملا بائی گوکھلے'' تھی جو آج کے اداکار وکرم گوکھلے کی دادی اور چندر کانت گوکھلے کی ماں تھی۔

★ معروف افسانہ نگار ''منشی پریم چند نے فلم ''مزدور'' کی کہانی لکھی تھی۔چند ناگزیر حالات کے سبب یہ فلم ڈیڑھ سال بعد ''غریب مزدور'' کے نام سے پیش کی گئی اسمیں مزدور یونین کے صدر کا رول منشی پریم چند نے کیا تھا۔

★ فلم ''دنیا کیا ہے'' میں ہندوستان کی پہلی خاتون فلم ساز وہدایتکار فاطمہ بیگم نے کام کیا تھا۔

★ ۱۹۴۴ء میں ایک فلم ''رام شاستری'' بنی تھی اس فلم میں للیتا پوار نے پہلی بار ایک ظالم ماں کا نگیٹیو کردار ادا کیا تھا۔اس فلم سے قبل مار دھاڑ والی ایک فلم کی شوٹنگ کے دوران للیتا پوار ایک حادثے کا شکار ہوئیں۔جس میں ان کی بائیں آنکھ متاثر ہوئی۔اس حادثے کے بعد للیتا پوار نے ہیروئن کا کردار ادا کرنا چھوڑ دیا تھا بعد میں ان کی بائیں آنکھ نگیٹیو رول والے کردار کے لئے ان کی خاص پہچان بن گئی۔اور اسی آنکھ نے ظالم ساس کی امیج کا چار چاند لگا دیئے فلم جہیز میں للیتا پوار نے ایک ظالم ساس کا کردار ادا کیا تھا اس میں انہوں نے اپنی فلمی زندگی کا ناقابل فراموش کردار ادا کیا تھا۔

★ فلم ''کرودھ'' میں محمد رفیع پر ایک گانا تھا۔اس گانے میں محمد رفیع کی میت کو لے جاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔

★ ۱۹۳۲ء میں ''چار چکرم'' نامی ایک فلم بنی تھی اس میں وکشت اور غوری نے اپنے مزاحیہ کرداروں سے فلموں میں کامیڈی کی بنیاد رکھی تھی۔اس لئے ان کو ہی ہندی فلموں کا پہلا کامیڈین مانا جاتا ہے۔

★ ہندوستانی فلم کی پہلی خاتون ہدایتکار فاطمہ بیگم نے ۱۹۲۶ء میں فلم ''بلبل پرستان'' نام سے ایک خاموش فلم بنائی تھی۔

★ ہندوستانی فلم انڈسٹری کی ایک شخصیت پریم نذیر کا نام گنیز بک میں درج ہے انھوں

نے چھ سو سے زائد فلموں میں کام کیا تھا۔

★ ہندوستان کا پہلا سنیما ہال ۱۹۰۰ء میں خورشید جی باٹلی والا نے بمبئی میں ناولٹی تھیٹر بنوایا تھا۔اسے ہندوستان کا پہلا سنیما ہال مانا جاتا ہے۔

★ پرانی کلاسیکی ہندوستانی فلموں کو اب (C.D. Compact Desk) کی مدد سے کمپیوٹر پر دیکھا جا سکے گا۔۱۹۱۳ء سے ۱۹۹۵ء تک کی آٹھ ہزار فلموں اور آٹھ ہزار سے زیادہ فلمی شخصیتوں کے بارے میں معلومات بٹن دباتے ہی حاصل کی جاسکیں گیں اور انھیں دیکھا بھی جا سکے گا۔ اور ہر طرح کے سوالوں کے جواب بھی حاصل کئے جاسکیں گے۔

★ ۱۹۲۸ء میں ایک بولتی فلم کراؤن سنیما (کلکتہ) میں لگی تھی۔اس فلم میں نذر الؔ نے اپنی آواز میں نظم ''ناری'' پیش کیا۔ گوکھلے گرلس اسکول کی طالبات نے گیت ''پارلے نچان ناچلے جکھون ہے نٹ راج'' کو آرکسٹرا کی دھنوں سے سجایا تھا۔ بولتی فلموں کی متواتر نمائش بنگلہ فلم ''جمائی شاشٹی'' سے شروع ہوگئی۔

★ بردوان کے ناگ اسٹوڈیو کے مالک اور مشہور فوٹو گرافر ارون ناگ نے ایک خاموش فلم ''پروشیا بھا گیم'' بنائی تھی۔ یہ کلکتہ اور بردوان دونوں جگہوں پر نا کام رہی لیکن قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ کلکتہ سے دور ایک قصباتی علاقے میں فلم بنانے کی جرأت کی اس فلم کے اداکار اور اداکارائیں سب اسی چھوٹے سے ٹاؤن کے لوگ تھے۔ کلکتہ میں پہلی بار فلمی صنعت کی طرف توجہ دینے والوں میں J.N.Ganguly_ J.F.Maidan اور P.N.Sarkar تھے۔۱۹۲۳ء میں فیڈن صاحب نے ٹالی گنج میں ایک فلم اسٹوڈیو قائم کیا۔جس کا نام M A I D A N STUDIO رکھا۔یہیں سے پورے ملک اور بنگال میں فلم کی اشاعت کے لئے ایک نئی تحریک کا آغاز ہوا۔اس تحریک کو آگے بڑھانے میں اندراپوری اسٹوڈیو کا نام سرِ فہرست ہے ویسے J.F.MAIDAN ہی کو جدید فلم کا جنم داتا کہا جاتا ہے۔

★ فرانس کے دو افراد لوئی لومیئر اور جارج میلیس نے جو متمول تاجر کے بیٹے تھے فرانسیسی سنیما کی بنیاد رکھی۔۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۵ء کے عرصہ میں لومیئر برادران نے لوئی کی ایجاد کو یورپ اور مشرقی ممالک میں عام کیا ان کا نمائندہ ۱۸۹۶ء میں ہندوستان آیا۔اس فلم کو صدی کا عجوبہ قرار دیا گیا اور سب سے پہلے بمبئی کے وائس ہوٹل میں یہ فلم دکھائی گئی۔ ہمارے ملک میں جے۔ایف مدن اور عبدالعلی یوسف علی نے ۱۹۰۲ء میں بائسکوپ سے فلموں کی نمائش شروع کی۔۱۸۹۶ء کے آخر تک چلتی پھرتی فلمیں مدراس اور کلکتہ میں بھی دکھائی گئیں۔

★ ڈیوڈ وارک گریفتھ نام کے ڈراما نگار نے ۱۹۰۷ء کے بعد فلم سازی کی رفتار میں اضافہ کیا۔۱۹۱۳ء تک اس نے سنیما میں تکنک کے مختلف تجربے کئے گو اس نے کوئی ایجاد نہیں کی مگر اس کے یہاں ڈرامائی شعور بہت گہرا تھا۔اس کی فلمیں بہت مقبول ہوئیں۔اٹلی کی فلمیں کو ویڈیس اور کسپریا سے متاثر ہوکر اس نے خانہ جنگی پر مبنی فلم بنائی۔جس کا نام اس نے ایک قوم کی پیدائش رکھا یہ فلم تھامس ڈکسن کے ناول اور خانہ جنگی کی کہانیوں پر مبنی تھی۔جسے اس نے اپنے والد سے سنی تھی۔اس فلم پر کافی احتجاج ہوا کیونکہ اس کا رجحان نیگرو مخالف تھا۔رسالہ ''ٹائم'' نے اسے ایک مکمل فلم قرار دیا تھا۔گریفتھ نے سنیما کی سطح کو بلند کیا اور اسے ایک طاقتور ذریعہ اظہار بنایا۔

★ چپلن نے سنیما کو ایک ایسی طاقت قرار دیا تھا جو انسانیت کی نجات کا باعث بن سکتی ہے۔

★ اداکار رحمٰن فلموں میں آنے سے پہلے ائرفورس میں ملازم تھے۔

★ پوسٹر اور بینرس کے ذریعہ فلم کے اشتہار کا کام ۱۹۲۰ء سے شروع ہوا۔اس سال بنی فلم ''وتسلا ہرن'' میں پہلی بار پوسٹر کا استعمال کیا گیا۔فلم کے ہدایت کار بابوراؤ پینٹر تھے۔سارے پوسٹر انہوں نے تیار کئے تھے۔کیونکہ آپ ایک آرٹسٹ بھی تھے۔

★ فلم دلی کا ٹھگ، بمبئی کا چور، آشا، ڈھولک اور مغلِ اعظم بلیک اینڈ وائٹ فلمیں تھیں

۔لیکن ان فلموں میں ایک دو مناظر رنگین تھے۔

★ ایکٹر جگدیش راج نے ۱۲۵ فلموں میں پولس انسپکٹر کا کردار ادا کیا ہے جو ایک ریکارڈ ہے۔

★ فلم میں خواب کے سین سہراب مودی کی فلم میں پہلی بار فلمایا گیا۔

★ کشور کمار ایک ایسے فنکار ہیں جو بیک وقت گیت کار، گلوکار، موسیقار، رائٹر، ہدایت کار اور فلم ساز ہیں۔انہوں نے فلم ''دور گگن کی چھاؤں'' اور دور کا راہی میں انجام دیا۔ یہ اعزاز صرف ان ہی کو حاصل ہے۔

★ فلم ''عاشقی'' کے گلوکار کمار شانو کو مسلسل پانچ سالوں تک فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا جو ایک ریکارڈ ہے۔آج تک فلم انڈسٹری کے کسی بھی شعبے میں کسی بھی فلمی شخصیت کو مسلسل پانچ برسوں تک انعام نہیں دیا گیا۔

★ اپنے زمانے کی مشہور ہیروئن کانن دیوی' کو کانن بالا کے نام سے پکارا جاتا تھا ۔انھیں ''بلبلِ بنگال'' کے خطاب سے بھی یاد کیا جاتا کانن دیوی کو رابندر سنگیت میں مہارت حاصل تھی ان کی سحر انگیز آواز میں اپنے چند نغمات سننے کے بعد گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور نے کانن بالا کا نام بدل کر کانن دیوی رکھ دیا تھا۔

★ ۱۹۲۶ء میں کانن دیوی کو جیوتش بندوپادھیائے کی فلم ''جے دیو'' میں ایک چھوٹا سا رول مل گیا تھا۔اس میں انہوں نے رادھا کا کردار ادا کیا تھا۔یہ خاموش فلم تھی۔مدن تھیٹرز کے بینر تلے بننے والی اس فلم کے لئے کنٹرکٹ کے مطابق ان کا معاوضہ صرف ۲۵ روپے طے ہوا تھا۔لیکن انھیں صرف ۵ روپئے ملے تھے۔

★ ۱۹۳۶ء میں کانن دیوی کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا۔جب ڈی ایچ سرکار نے اپنے ادارے نیو تھیٹرز کے لئے کانن دیوی کو ۱۳۶ روپے ماہانہ پر ملازم رکھ لیا۔اور کانن دیوی کی فلم ''ودیا پتی'' میں بطور ہیروئن پیش کیا گیا۔یہ فلم ہندی اور بنگلہ دونوں زبانوں میں بنی تھی۔

★ دلیپ کمار واحد اداکار ہیں جنہوں نے آٹھ بار بہترین اداکار کے لئے فلم فیئر ایوارڈ

حاصل کیا جو ایک ریکارڈ ہے۔

★ پرتھوی راج کپور نے راما نند ساگر سے پونا میں ایک ملاقات کے دوران کہا کہ تم راج کپور کے لئے ایک رومانٹک کہانی لکھو۔ایک دن خود راج کپور نے راما نند ساگر سے پونا جا کر ملاقات کی اور انھیں ۱۵ سو روپے دے کر مہابلیشور جانے کو کہا۔مہابلیشور کے فیڈرک ہوٹل میں راما نند ساگر نے موم بتی کی روشنی میں ایک ہی رات میں ایک کہانی لکھی اسی کہانی پر فلم ''برسات'' بنی اور بہت کامیاب ہوئی۔

★ سیریل 'رامائن' سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی کی ہدایت پر بنایا گیا تھا۔

★ راج کپور کیدار شرما کے ساتھ اسٹنٹ ڈائرکٹر تھے۔ایک دن کیدار شرما نے راج کو آئینہ کے سامنے عجیب وغریب حرکتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا اور اسے ایک طمانچہ رسید کر دیا۔اس کے بعد انہوں نے راج کپور کے چہرے پر جو تاثرات دیکھے اس میں انھیں ایک ایکٹر چھپا ہوا نظر آیا۔انہوں نے راج کپور کو اپنی فلم ''نیل کمل'' میں پہلا موقع دیا۔

★ مغلِ اعظم میں انارکلی کا کردار ادا کرنے والی مدھو بالا ڈانس نہیں جانتی تھی۔اس لئے گوپی کرشن نے مدھو بالا کا کاسٹیوم پہن کر خود ڈانس کے لانگ شاٹ دئے۔

★ ''فلم ٹیکسی ڈرائیور'' میں دیوانند اور کلپنا کارتک کے ساتھ شادی کا ایک سین تھا۔اس لئے شادی کے لئے اصلی پنڈت کو بلایا گیا تھا۔چیتن آنند دیو آنند کے بڑے بھائی دونوں کو آشیرواد دینے کے لئے موجود تھے۔اس فلم کے ڈائرکٹر بھی وہی تھے لوگ یہی سمجھتے رہے کہ فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔لیکن دراصل دونوں کی اصلی شادی ہو رہی تھی۔

★ ۱۹۱۰ء میں دلائی لاما پر ایک شارٹ فلم تیار کی گئی تھی۔یہ بھارت کی پہلی سیاسی فلم تھی۔

★ خواجہ احمد عباس نے فلم 'پردیسی' بنائی تھی تو بھارت روس دوستی کا ایک نیا باب کھلا

بھارت اور روس سے تیار ہونے والی یہ پہلی ہندوستانی فلم تھی۔

- ★ رامائن پر سب سے پہلی فلم مختصر فلم کے طور پر ''رامائن' کا ایک کانڈ'' کے زیر عنوان ۲ رنومبر ۲ ۱۹۱ءکو گیٹی تھیٹر میں ریلیز کی گئی تھی یہ فلم سینما ڈی لکس کے لئے خاص طور پر بنی تھی۔
- ★ دادا بھائی پھالکے نے ۱۹۱۵ء میں رامائن کے موضوع پر 'لنکا دہن' کے نام سے ایک فلم بنائی تھی یہ تین ہزار فٹ لمبی فیچر فلم تھی۔اور ایک انگریزی فلم Blind Faith کے ساتھ دکھائی گئی تھی یہ سینما آرٹ میں بھارت کی ترقی کا ایک لاجواب ثبوت تھا۔ایک ہفتے میں اس فلم نے آمدنی کے تمام ریکارڈ توڑ دئے۔
- ★ بے بی ناز پہلی اداکارہ ہیں جنہیں ''کان'' (جرمنی) فلم فیٹیول میں ''بوٹ پالش'' کے لئے ایوارڈ دیا گیا۔
- ★ فلم 'لنکا دہن'' ۱۹۱۷ء میں رام اور سیتا دونوں کا رول اداکار ''سولنکے'' نے نبھایا تھا۔
- ★ جیون نے اپنے فلمی کیریر کی شروعات فلم ''دار کشمیری'' کے نام سے کیا۔
- ★ ۱۹۲۴ء میں بنی خاموش فلم ''ستی انسویا'' میں اداکارہ سکینہ نے عریاں سین دیا تھا یہ ہندی فلموں کا پہلا عریاں سین تھا۔
- ★ موسیقار ''سی رامچندرن'' فلموں میں چتلکر' کے نام سے گانا گاتے تھے۔
- ★ لکس صابن کا پرچار سب سے پہلے اداکارہ ''لیلا چٹنس'' نے کیا تھا۔
- ★ اشوک کمار نے اپنی پہلی فلم ''جیون نیا'' (۱۹۳۶ء) سے فلم ''ساجن'' (۱۹۴۸ء) تک اپنی تمام فلموں کے گانے خود گائے۔
- ★ ہندی فلموں کا پہلا گانا ''دیدے خدا کے نام پہ دیدے'' وزیر احمد نے اپنی آواز میں گایا تھا۔ یہ گیت فلم ''عالم آرا'' کا ہے۔
- ★ ہندی فلموں میں حاملہ عورت کا کردار سب سے زیادہ شبانہ اعظمی نے ادا کیا ہے۔ان فلموں کے نام یہ ہیں لوری' ہم پانچ' بھاؤنا' تھوڑی سی بیوفائی'

پار' ایک پل' شک اور دوسری دلہن۔

- ★ ہندی خاموش فلموں کا پہلا چائلڈ آرٹسٹ بابا راؤ پھالکے تھا جو دادا صاحب پھالکے کے بیٹے تھے انہوں نے یہ کردار ۱۹۱۳ء میں بنی پہلی خاموش فلم ''راجہ ہریش چندر'' میں کیا تھا۔
- ★ بولتی فلموں کا پہلا کا میڈین ''دکشت'' ہے۔
- ★ فلموں میں پہلی بار ''راک اینڈ رول'' موسیقی کا استعمال موسیقار سی رامچندر نے فلم ''سرگم'' میں کیا گانے کے بول تھے-''میں ہوں خلاصی میرا نام پلاسی''۔
- ★ اداکاراؤں میں سب سے زیادہ فلم ایوارڈ نوتن کو ملا۔یہ فلمیں ہیں سیما' سجاتا' نندنی' ملن اور میں تلسی تیرے آنگن کی''۔اس لئے اس فلم کو بھارت کا اولین باکس آفس فلم کہلانے کا شرف حاصل ہوا۔دادا صاحب پھالکے نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ دس دنوں کے اندر اس فلم سے ۳۲ ہزار روپے کی آمدنی ہوئی۔
- ★ چیتن آنند کی فلم ''ہیر رانجھا'' ہندی فلموں میں پہلی منظوم فلم تھی اس کے تمام مکالمے منظوم تھے۔
- ★ چیتن آنند کی فلم ''نیچا نگر'' نے کنیز فلم فیٹیسول میں اعزاز حاصل کیا بین الاقوامی اعزاز پانے والی یہ پہلی ہندی فلم تھی۔
- ★ جنگ کے موضوع پر بننے والی پہلی ہندوستانی فلم چیتن آنند کی ''حقیقت'' تھی۔
- ★ گیت '' دیکھ تیرے سنسار کی حالت کیا ہوگئی بھگوان'' گیت کار پردیپ نے گایا تھا جو بہت مقبول ہوا تھا۔
- ★ ثریا کی فلم ''دلگی'' کو فلم اسٹار دھرمندر نے چالیس مرتبہ دیکھا تھا۔
- ★ ''نرگس دت'' کو پہلی بار راجیہ سبھا کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔
- ★ مشہور فلمی اداکارہ نوتن ۱۹۷۹ء میں مس انڈیا منتخب ہوئی تھی۔
- ★ دیپا مہتہ کی فلم ''واٹر'' میں ایک بیوہ کا رول ادا کرنے کے لئے شبانہ اعظمی

نے اپنے سر کے بال منڈوائے تھے۔

★ کامیڈین بھگوان داس کی پہلی خاموش فلم ''بے وفا'' کے لئے انھیں صرف ۲۰ روپے ماہانہ دیا جاتا تھا۔

★ فلم ''زینت'' پہلی فلم تھی جس میں پہلی بار قوالی پیش کی گئی۔قوالی کے بول یہ تھے۔

''آہیں نہ بھریں شکوے نہ کئے کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا''

★ دنیا کا سب سے بڑا فلم ایوارڈ ''آسکر ایوارڈ'' پہلی بار ۲۸-۱۹۲۷ء میں فلم ''ونگس'' کو دیا گیا۔

★ فلم ''راستے پیار کے'' میں شبانہ اعظمی کی ماں کا رول ان کی اپنی ماں شوکت اعظمی نے کیا تھا۔

★ مظفرعلی کی فلم ''انجمن'' میں شبانہ اعظمی نے سارے گانے خود گائے ہیں۔

★ ہندی میں کی گئی پہلی ڈب فلم ''چندرلیکھا'' ہے۔

★ گرودت کا اصل نام بسنت تھا لیکن بعد میں گرودت رکھ دیا گیا نام بدلنے کے پیچھے بھی ایک کہانی ہے۔کہا جاتا ہے کہ بچپن میں ایک بار وہ اپنے گھر کے نزدیک ایک کنویں میں گر گئے ان کے گروجی نے ان کی جان بچائی۔اس حادثے کے بعد ہی نام بدلنے کے لئے خاندان والوں نے کہا جس پر ان کی والدہ نے ان کا نام گرودت رکھ دیا۔

★ بیگم اختر (گلوکارہ) کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک بار حج کرنے کے بعد دوسرے سال بھی آپ حج پر جانا چاہتی تھیں مگر سرکاری پابندی تھی ایک خاص مدت کے بعد ہی دوبارہ اجازت مل سکتی تھی۔وہ ضدی تھیں اندرا گاندھی سے براہِ راست اپنی خواہش ظاہر کی اب بھلا کون روک سکتا تھا۔۔اندراجی نے بیگم اختر صاحبہ کو فوراً ان کی خواہش کی تکمیل کا حکم دے دیا۔

★ ہندوستان کی پہلی مزاحیہ فلم ''چار چکرم'' ہے جو ۱۹۳۲ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

★ ہندوستان کا پہلا مزاحیہ اداکار دکشت ہے جس نے فلم چار چکرم میں کام کیا تھا۔

★ موسیقار جے کشن (شنکر جے کشن) نے فلم شری ۴۲۰ میں ایک شرابی کا مختصر رول کیا تھا۔

★ اداکار ڈینی نے کئی فلموں میں گانے گائے ہیں جیسے بلندی' کالا سونا وغیرہ۔

★ ۱۹۴۶ء میں بنی فلم ''بچوں کا کھیل'' کو پہلی ''ٹین ایج لو اسٹوری'' فلم کہا جاسکتا ہے۔

★ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان پہلی بار ٹرین ۲۲/ اگست ۱۹۷۶ء کو چلی اس مبارک موقع پر فلم ''کبھی کبھی'' کا گیت ''کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے'' بجایا گیا۔جب ٹرین چھوٹنے لگی تو فلم ''شور'' کا گانا ''ایک پیار کا نغمہ ہے'' بجایا گیا۔

★ اداکارہ مینا شوری نے چار شادیاں کیں۔یہ چاروں اپنے زمانے کے مشہور ہدایت کار' اور اداکار رہ چکے ہیں۔ان کے نام یہ ہیں۔ظہور راجا' النصیر' روپ کشوری' اور اسد بخاری۔

★ ہنٹر والی کے نام سے مشہور اداکارہ ناڈیہ اور مشہور اداکار جان کوس کی جوڑی نے سب سے زیادہ یعنی ۳۵ فلموں میں ایک ساتھ کام کیا ہے۔اتنی ساری فلموں میں آج تک ایک ساتھ کسی اداکار اور اداکاروں نے کام نہیں کیا ہے۔

★ سنجیو کمار کی زندگی میں فلمساز کے آصف کی فلم ''لو اینڈ گاڈ'' بہت اہم تھی اس فلم میں مجنوں کے کردار کو پرکشش بنانے کے لئے سنجیو کمار نے ایک مہینہ تک کھانا نہیں کھایا صرف جوس' دودھ اور سلاد پر گزارا کیا۔بھوکے رہ کر اپنے جسم کو اس طرح دبلا پتلا کرلیا کہ وہ بالکل بیمار نظر آنے لگیں۔اپنے کردار کو حقیقت کا رنگ دینے کا جذبہ حال کے اداکاروں میں نہیں ہے۔

★ ہندوستانی فلم کے خوبرو ہیرو پردیپ کمار فلموں میں آنے سے قبل کلکتہ کے گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں ماہانہ ۲۵۰ روپے پر نوکری کرتے تھے۔

★ ''میرا کا بھجن'' اے ری میں تو پریم دیوانی۔۔۔یہی بھجن رنجیت کی فلم ''جوگن'' میں اور نیو پریمیئر پکچرس کی فلم ''نو بہار'' میں بھی تھی جوگن میں ''گیتا دت نے بلوسی رانی

کے سنگیت میں اور ''نو بہار'' میں لتا منگیشکر نے روشن کے سنگیت میں گایا تھا۔

★ فلمستان کی فلم ''منیم جی'' میں موسیقار مدن موہن نے ہیرو کے بھائی کا رول کیا تھا۔فلم ''آنسو'' میں بھی انہوں نے کام کیا تھا۔

★ پنڈت گیان شنکر اپنے زمانے کے مشہور ڈانس ڈائرکٹر رہ چکے ہیں۔تقریباً ۱۸۰ ہندی اور پنجابی فلموں میں ڈانس کی ہدایت دے چکے ہیں۔بی آر چوپڑہ کی فلم ''افسانہ'' میں محمد رفیع کی آواز میں یہ گیت ''دنیا ایک کہانی رے بھیّا'' ۔۔۔میں ایک غبارہ بیچنے والا کا رول ادا کیا تھا۔

★ فلم ساز وہدایت کار کے آصف نے اپنی یادگار فلم ''مغلِ اعظم'' کے لئے موسیقار اعظم نوشاد سے ۵۰ دھنیں بنوائیں تھیں جن میں سے کے آصف نے صرف آٹھ دھنوں کا ہی انتخاب کیا تھا۔

★ فلم ساز ہدایت کار محبوب خاں اپنی فلم 'انداز' کے ہٹ ہونے کی خوشی میں دی گئی پارٹی میں مہمانوں کا دل بہلانے کے لئے ایک رقاصہ کا انتظام کیا تھا۔اس رقاصہ کا رقص دیکھ کر اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی اگلی فلم 'آن' کے لئے دلیپ کمار کے مقابل ہیروئن کے طور پر چن لیا۔اس رقاصہ کا نام ''نادرہ'' تھا۔

★ کشور ساہو نے اپنی فلم 'میور پنکھ' کی ہیروئن کے لئے اخبار میں اشتہار دیا تھا۔اشتہار پڑھ کر کرشنا نے خط کے ساتھ ایک فوٹو بھیج دیا تھا اسے ساہو نے اپنی فلم کے لئے چن لیا تھا۔وہ لڑکی ''بینا رائے'' تھی۔

★ عالمی شہرت یافتہ شہنائی نواز بھارت رتن استاد بسم اللہ خاں کو فلموں میں سنگیت دینے کے بہت آفر ملے لیکن انہوں نے ہمیشہ انکار کر دیا اپنے دیرینہ دوست مرحوم وجے بھٹ کے بے حد اصرار پر فلم ''گونج اٹھی شہنائی'' میں وسنت ڈیسائی کے سنگیت میں' شہنائی بجائی تھی یہ فلم سنگیت کے اعتبار سے بہت مقبول ہوئی تھی۔

★ ۸رمئی ۱۹۱۲ءکو آر۔جی۔ٹونی نے ''پنڈلک'' نامی فلم پیش کی اس کے بعد دادا صاحب

پھالکے نے ۳رمئی ۱۹۱۳ءکو 'فلم راجہ ہریش چندر' پیش کی۔

★ دوسری بولتی فلم ''شیریں فرہاد'' تھی جو کلکتہ میں بنی تھی۔

★ ۱۹۳۹ءمیں بمبئی میں ہندوستانی صنعتِ فلم سازی کی سلور جوبلی منائی گئی۔

★ فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا (پونا) اور ریاست تاملِ ناڈو کے انسٹی ٹیوٹ آف فلم ٹکنالوجی مدراس میں فلم سازی کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔F.T.I.I ایک خود مختار ادارہ ہے۔جہاں فلمی ہدایت کاری۔کہانی نویسی' تصویر کشی' اور صدابندی وغیرہ کی ٹریننگ کا نصاب تین سالہ ہے۔

★ ہندوستان میں تیار شدہ بہترین فلموں کو قومی انعامات National Awards دینے کا سلسلہ ۱۹۵۳ءمیں شروع کیا گیا۔

★ ۱۹۶۹ء میں فلمی صنعت کی نمایاں خدمات کا انعام دادا صاحب پھالکے کی یاد میں قائم کیا گیا۔

★ راشٹر پتی کا طلائی تمغہ قومی فیچر فلم کو دیا جاتا ہے۔

★ ۱۹۷۳ء میں وزارت اطلاعات ونشریات حکومت ہند کی جانب سے فلمی میلوں کی نظامت ہندوستان میں قائم ہوئی۔اس کے علاوہ ہندوستانی فلموں کی بین الاقوامی مقابلوں میں شرکت کا اہتمام بھی اس کے سپرد ہے۔

★ ۱۹۶۴ءمیں قومی فلم آرکائیو (Archieves) قائم کیا گیا۔جو آئندہ نسلوں کے لئے بہترین ہندوستانی اور بیرونی فلموں کو محفوظ کرتا ہے۔

★ ہندوستانی فلم دنیا کے تقریباً ۹۰ ملکوں کو برآمد کی جاتی ہے جن میں خلیجی ریاستیں' عرب ممالک' کناڈا' مشرقی افریقہ' فیجی' انڈونیشیا' ایران' ملیشیا' مارشیش' سنگاپور' سری لنکا' تھائی لینڈ' انگلستان' امریکہ' شمالی افریقہ' اور جزائرعرب الہند شامل ہیں۔

★ فلم احتساب کے مرکزی بورڈ (Central board of film censors) سے سرٹیفکٹ حاصل کئے بغیر ہندوستان

میں کوئی فلم نہیں دکھائی جاسکتی بورڈ کا صدر مقام ممبئی ہے۔اور علاقائی دفاتر کلکتہ اور مدراس میں کام کرتے ہیں۔

- ★ فلم ''شاہ جہاں'' میں ایک نغمہ تھا جس کے بول تھے''جب دل ہی ٹوٹ گیا اب جی کے کیا کریں گے''۔اسے کے۔ایل۔سہگل نے گایا تھا۔اس نغمے نے غیر معمولی عوامی مقبولیت تو حاصل کی ہی مگر گلوکار سہگل اس نغمے کے اتنے گرویدہ ہوئے کہ انہوں نے اپنی وفات سے پہلے وصیت کردی کہ یہ نغمہ ان کے جنازے کے ساتھ آخری رسوم کی ادائے گی تک بجتا رہے۔اور ایسا ہی ہوا بھی۔
- ★ مسلم خاندان کی پہلی لڑکی فاطمہ تھی جو ۱۹۱۹ء میں فلم ''بھ منگل'' سے اپنے فلمی سفر کا آغاز کیا تھا اس فلم میں اس کے ساتھ اس کی بیٹی زبیدہ نے بھی کام کیا تھا۔
- ★ دیوندر گوئل کی فلم 'آنکھیں' ۱۹۵۰ء میں موسیقار لکشمی کانت نے ہیروئن نلنی جیونت کے بھائی کا رول ادا کیا تھا۔
- ★ سنت ایک ناتھ کی زندگی پر مبنی پرانی فلم ''دھرماتما'' میں موسیقار وسنت ڈیسائی نے پہلی بار ایک چھوٹا سا رول ادا کیا تھا۔
- ★ ہندوستان میں پہلی بار پوسٹروں کے ذریعہ پبلسٹی کی شروعات ۱۹۳۲ء میں بنی خاموش فلم ''وسلا ہون'' سے ہوئی تھی۔
- ★ ۱۹۳۷ء میں بنی فلم ''لنکا دہن'' میں رام اور سیتا دونوں کا رول اے سالنکے نے کر کے ہندوستانی فلموں میں ڈبل رول کرنے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔
- ★ ہندوستانی سنیما کا پہلا چائلڈ آرٹسٹ بال چندر تھے جو دادا صاحب پھالکے کے بیٹے تھے جس نے ۱۹۱۳ء میں بنی پہلی خاموش فلم ''راجہ ہریش چندر'' میں بطور چائلڈ آرٹسٹ کام کیا تھا۔
- ★ ہندوستان کا پہلا انٹرنیشنل ایوارڈ فلم ''نیچا نگر'' کو ملا تھا۔
- ★ گلوکارہ مبارک بیگم نے فلم ''آئیے'' ۱۹۴۹ء میں ایک چھوٹا سا رول ادا کیا تھا۔

- ★ کامیڈین آغا نے ۱۹۳۲ء میں بنی خاموش فلم ''پروانے'' سے اپنا فلمی کیریر شروع کیا تھا۔
- ★ ۱۹۴۹ء میں ایک فلم ''سانوریا'' بنی تھی۔جس کے ہیرو رحمان تھے اور ان کے مقابل ہیروئن کا رول پاکستانی اداکارہ حفیظ جہاں نے کیا تھا۔
- ★ مشہور ہیرو دیوانند نے خواجہ احمد عباس کے ڈرامے''زبیدہ'' میں کام کیا تھا۔یہ ڈرامہ خواجہ احمد عباس نے اپٹا کے لئے لکھا تھا۔
- ★ ہندوستان کی پہلی خاتون فلم ساز فاطمہ بیگم تھیں۔جنھوں نے ۱۹۲۶ء میں ''بلبلِ پرستان'' نام کی فلم بنائی تھی۔اس فلم میں ان کی ایک ساتھ تین بیٹیاں زبیدہ' سلطانہ اور شہزادی نے بھی کام کیا تھا۔
- ★ ۱۹۴۷ء میں بنی فلم ''سیندور'' میں اداکارہ شمیم نے سب سے پہلے ''بیوہ عورت'' کا رول ادا کیا تھا۔
- ★ ہالی ووڈ کی اداکارہ ''کیتھرین ہپرن'' جنھوں نے اپنی پچاس سالہ فلمی زندگی میں ۴۳ فلموں میں کام کیا اور چار مرتبہ بہترین اداکارہ کا آسکر ایوارڈ حاصل کر کے دنیائے فلم میں نا قابلِ تسخیر ریکارڈ قائم کیا۔
- ★ ۱۹۳۵ء میں بنی فلم ''دیوداس'' میں راجکماری نے پہلی مرتبہ طوائف کا رول نبھایا تھا۔
- ★ فلم ''بھول'' ایسی فلم تھی جس کے ایک گانے میں پہلی بار فلم ''ٹائٹل'' کا نام آیا تھا۔
- ★ کرین کے ذریعہ فلموں کی شوٹنگ سب سے پہلے وی شانتا رام نے شروع کی۔
- ★ فلم 'پونم' اور 'پٹ رانی'' ایسی دو فلمیں ہیں جن کے سارے گیت لتا منگیشکر نے گائے تھے۔
- ★ فلم 'دیوداس' میں مادھوری ڈکشٹ کے لباس کے لئے پندرہ لاکھ روپے کی لاگت آئی تھی اور ایک پیٹی کوٹ (گھاگھرا) کا وزن تقریباً ۳۰ کیلو تھا۔
- ★ فلم 'دیوداس' میں چھ سیٹ بنانے کے لئے بیس کروڑ روپے خرچ کئے گئے جو کہ فلم

انڈسٹری کی تاریخ میں ایک ریکارڈ ہے۔

★ فلم 'دیوداس' کی شوٹنگ کے لئے سات سو لائٹ مینوں نے بیالیس جنریٹروں کی مدد سے کام کیا۔ جن سے تیس لاکھ واٹ بجلی پیدا کی گئی۔

★ فلم 'دیوداس' میں ایک لاکھ بائیس ہزار کانچ کے ٹکڑے سے حویلی میں پارو کا کمرہ بنا۔ جو تیس کروڑ روپے کی لاگت سے تیار کیا گیا۔ اور چندرمکھی کا کوٹھا ماؤنٹ آبو کے دلواڑہ مندروں کے طرز پر بارہ کروڑ روپے کی لاگت سے تیار کیا گیا۔

★ فلم 'دیوداس' کی شوٹنگ کے دوران دو ممبران کی موت ہوگئی۔ اور بھرت شاہ کو ۱۶ مہینے تک جیل ہوا۔

★ فلم 'دیوداس' کے سنگیت کار 'اسمٰعیل دربار نے اس فلم کی تیاری میں تقریباً ۳۲ فلموں کی آفر ٹھکرادی۔

★ سنجے 'لیلا بھنسالی اور اسمٰعیل دربار کے درمیان جھگڑا ہونے سے فلم دیوداس کی بیک گراؤنڈ میوزک نیا موسیقار 'مونٹو' نے دی ہے۔ (بعد میں دونوں میں صلح ہوگئی)۔

★ ہندوستان کی پہلی ڈیجیٹل فلم ''نیل نرجنے'' ہے جو بنگال میں ۲۰۰۳ء میں بنائی گئی تھی۔

★ ۱۹۳۵ء میں پی۔سی بروا نے 'دیوداس' نام کی ایک فلم بنائی تھی۔ جس میں سہگل نے دیوداس 'جمنا نے پارو اور راج کماری نے چندرمکھی کا رول ادا کیا تھا۔ جب یہ فلم کلکتہ کے سنیما ہال میں ریلیز ہوئی تو پی سی بروا بھی پہلا شو دیکھنے گئے۔ سنیما ہال کے ٹکٹ خریدا اور ہال میں بیٹھ گئے۔ ان کی جیب میں پستول تھا کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ اگر فلم شائقین نے فلم پسند نہیں کیا تو سنیما ہال میں خود کو گولی مار خودکشی کرلیں گے لیکن فلم دیکھنے کے بعد فلمی شائقین نے بروا کی اس فلم 'دیوداس' کو کافی سراہا۔ اور ان کی محنت اور صلاحیت کی بھرپور داد دی۔

★ راج کپور کی فلم 'آہ' میں گلوکار مکیش نے ایک گاڑی بان والے کا رول ادا کیا تھا۔ اور اپنی آواز میں یہ گیت گایا تھا۔ ''چھوٹی سی یہ زندگی تیری - چار دن کی

کہانی تیری ہائے رے ہائے۔

★ کیدار شرما کی فلم ''چتر لیکھا'' جو ۱۹۴۱ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم میں موسیقار جھنڈے خاں نے سارے گیت بھیروی راگ میں صدا بند کیا تھا۔

★ وی شانتارام کی فلم ''جھنک جھنک پائل باجے'' جو ۱۹۵۶ء میں ریلیز ہوئی تھی اس میں موسیقار وسنت ڈیسائی نے پہلی بار کشمیری ساز 'سنتور' بجایا تھا۔

★ چیتن آنند کی فلم 'حقیقت' میں موسیقار لکشمی کانت پیارے لال نے پہلی بار 'ماؤتھ آرگن کا استعمال کیا تھا۔

★ سہراب مودی کی فلم 'پکار' جو ۱۹۳۹ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم کا یہ گیت ''زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے''۔ پری چہرہ نسیم بانو' نے خود اپنی آواز میں گایا تھا۔

★ ہندی فلموں میں سب سے پہلے وگ (نقلی بال) کا استعمال مردوں میں موتی لال اور کشور ساہو تھے۔ عورتوں میں نروپا رائے اور شیاما تھی۔

★ ۱۹۱۸ء میں بنی خاموش فلم ''شیر وندھی'' پر سرکار نے پہلی بار پابندی لگائی تھی۔

★ فلموں میں مہمان اداکاروں کی شروعات فلم 'آبشار' سے ہوئی جو ۱۹۵۳ء میں بنی تھی۔

★ راج کپور نے اپنے والد پرتھوی راج کپور کے ناٹک 'دیوار' میں بطور ایکٹر کام کیا تھا۔ اور اپنے لکھے ہوئے دو گیت بھی گائے تھے۔

★ برصغیر کے مشہور و معروف رقاص اودے شنکر نے اپنی زندگی میں رقص پر مبنی ایک فلم 'کلپنا' ۱۹۴۰ء میں بنائی تھی۔ فلساز 'ہدایت کار' اور ہیرو کا کردار انہوں نے خود نبھایا تھا۔

★ مشہور اداکارہ للیتا پوار کی آنکھ میں جو خرابی ہے وہ کامیڈین بھگوان داس کے تھپڑ مارنے سے ہوئی تھی۔

★ مشہور گلوکار سی ایچ آتما نے فلم 'بھائی صاحب' اور فلم 'ولبھ منگل' جیسی دو فلموں میں بطور ہیرو کام کیا تھا۔

★ ۱۹۴۵ء میں نیوتھیٹر کی فلم ''ہمراہی'' میں پہلی بار راشٹر یہ گیت' جن گن من' کو شامل کیا گیا تھا۔

★ گلوکار مکیش نے فلم ''انوراگ'' میں سنگیت دیا تھا۔

★ ۱۹۵۰ء میں بنی فلم ''سرگم'' میں سنگیت کار سی رام چندر نے راک اینڈ رول' سنگیت کا استعمال کیا تھا۔

★ اپنے زمانے کے مشہور اداکار اور کامیڈین بھگوان داس کے نام سے ممبئی کے دادر چوک کی سڑک کا نام موسوم کر ہے۔بھگوان داس اسی علاقے میں رہا کرتے تھے۔اپریل ۲۰۰۳ء میں لوک سبھا کے اسپیکر منوہر جوشی نے ایک سادہ سی تقریب میں اس سڑک کے نام کی رسم انجام دی۔

★ گینیز ورلڈ ریکارڈ بک میں ہندی فلموں میں کیرکٹر رول ادا کرنے والے جگدیش راج کا نام بھی شامل ہے جنہوں نے ہندی فلموں میں پولس انسپکٹر کے کردار ادا کرتے ہوئے اپنا نام ایک انوکھے کارنامے کے ساتھ جوڑنے میں کامیابی حاصل کی۔فلم۔سی۔آئی۔ڈی میں جگدیش راج نے پہلی مرتبہ پولس انسپکٹر کا کردار ادا کیا تھے۔۱۹۹۷ء کے بعد بھی یعنی ۲۰۰۳ء تک انہوں نے مجموعی طور پر ۱۶۷ فلموں میں 'انسپکٹر' کے کردار کئے ہیں جو کہ اپنے آپ میں ایک عالمی ریکارڈ ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کا نام گینیز ورلڈ ریکارڈ بک میں شامل کیا گیا۔

★ بلراج ساہنی،راولپنڈی کو خیر باد کہنے کے بعد لاہور چلے آئے یہاں انہوں نے Monday Morning کے نام سے ہفت روزہ اخبار نکالا پھر یہاں سے شانتی نکیتن چلے آئے جہاں انہوں نے ٹیچر کی حیثیت سے کام کیا۔پھر ایک سال بعد سیوا گرام چلے آئے جہاں گاندھی جی کی تعلیمات واصول کا مطالعہ کیا۔پھر گاندھی جی کی اجازت سے دوسری جنگِ عظیم کے دوران بلراج ساہنی لندن چلے گئے وہاں چار سال تک ہندوستانی B.B.C میں اناؤنسر کی حیثیت سے کام کیا۔جنگِ عظیم کے

خاتمے کے بعد وہ ہندوستان واپس آگئے۔اور بمبئی پہنچے انہوں نے بہت سے ڈرامے لکھے انہیں ڈائرکٹ کیا۔اور ان ڈراموں میں اداکاری بھی کی انہوں نے اپنی پہلی فلم 'دھرتی کے لعل' میں مرکزی کردار ادا کیا۔یہ فلم ۱۹۴۵ء میں بنی تھی۔اس فلم کا موضوع بنگال کا قحط تھا۔اس فلم میں انہوں نے ایک مفلس اور کنگال کسان کا رول کیا تھا اس رول کے لئے انہوں نے کئی دنوں تک محض ایک وقت ہی کھانا کھایا تھا۔تا کہ کسان کے کردار کو حقیقت کا روپ دے سکیں۔

★ انگریزی زبان میں بننے والی پہلی فلم 'نورجہاں' تھی۔

★ قتل پر مبنی پہلی سسپنس فلم 'قانون' تھی۔

★ پربھات مکھرجی ایسے ہدایت کار تھے۔جنہوں نے پانچ ہندوستانی زبانوں میں فیچر فلمیں بنائی تھیں۔

★ ہندوستان کی بغیر نغموں والی پہلی فلم 'نوجوان' تھی۔جس میں ایک نغمہ نہیں تھا۔

★ فلم ''کپال کنڈلا'' پہلی بنگالی فلم تھی جس نے سلور جوبلی منائی تھی۔

★ فلم 'امرت منتھن'' پہلی ہندی فلم تھی جس نے سلور جوبلی منائی تھی۔

★ فلم ''شیوا کا انصاف'' پہلی تھری ڈی' ہندی فلم تھی۔

★ درگا بائی اور ان کی بیٹی کملا بائی وہ خواتین تھیں جنہوں نے ہندی فلم میں پہلی بار عورتوں کے کردار ادا کئے۔

★ مشہور اداکارہ نرگس کی ماں جدن بائی مشہور مغنیہ اور ہندی فلموں کی پروڈیوسر' ڈائرکٹر' میوزک ڈائرکٹر اور ہیروئن تھیں۔جدن بائی ہندوستان کی پہلی مسلم خاتون ہدایت کار تھیں۔

★ ۱۹۹۲ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''بیٹا'' وہ واحد فلم ہے جس کی موسیقی سات موسیقاروں نے مل کر ترتیب دی تھی۔

★ نرگس کی سب سے شہرت یافتہ فلم ''مدر انڈیا ہے'' اس فلم میں نرگس کو بہترین اداکارہ'

کا ایوارڈ ملا تھا۔اس فلم میں نرگس کی بہترین اداکاری سے متاثر ہوکر ہندوستان کے سابق وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی تحریر میں خصوصی مکتوب مسز اندرا گاندھی کے ذریعہ روانہ کر کے نرگس کی خوب تعریف کی تھی۔مسز اندرا گاندھی سے نرگس کی بہت ہی والہانہ دوستی تھی۔چیکو سلواکیہ کے بین الاقوامی فلمی میلہ' کارلودارن' میں 'مدر انڈیا' میں بہترین اداکاری پر نرگس کو ایوارڈ دیا گیا۔ پھر نرگس کو راجیہ سبھا کا ممبر نامزد کیا گیا اور فلم مشاورتی کمیٹی کا رکن بھی بنایا گیا۔نرگس کو ۱۹۵۹ء میں پدم شری کے خطاب سے نوازا گیا۔حکومت ہند نے نرگس کے نام پر ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا تھا۔اور ممبئی میں ایک سڑک کا نام بھی 'نرگس دت روڈ' رکھا گیا۔نرگس کے فن اور شخصیت پر ایک کتاب انگریزی زبان میں شائع ہوئی ہے۔

★ کشور کمار کی اداکاری سے سجی فلم ''بے وقوف'' میں کشور کمار کے بچپن کا رول اداکار رونو دمہرہ نے ادا کیا تھا۔

★ ہندی فلموں میں انگریزی گیت کی ابتداء ۱۹۳۷ء میں دی شانتا رام کی فلم ''دنیا نہ مانے'' میں گلوکارہ اور اداکارہ شانتا آپٹے نے گایا تھا۔

★ مشہور معروف ویلن کے این سنگھ نے ۱۹۳۷ء میں بنی فلم ''سنہرا سنسار'' میں بطور ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔

★ ۱۹۴۹ء میں بنی فلم ''گرلس اسکول'' میں موسیقار انل بسواس نے صرف چار گانوں کی موسیقی ترتیب دی تھی۔

★ کندن لال سہگل اور دلیپ کمار کی دونوں فلم ''دیوداس'' میں بیل گاڑی میں پارو کے گاؤں تک لانے والے بیل گاڑی والے کے رول میں بینا کپور کے والد وکرم کپور نے نبھایا تھا۔

★ مشہور ومعروف موسیقار مدن موہن نے فلم ''منیم جی'' میں ہیروئن نلنی جیونت کے بھائی کا کردار نبھایا تھا۔

پرانی فلم ''اسٹریٹ سنگر'' ۱۹۳۸ء میں کندن لال سہگل کا گایا ہوا نغمہ ''بابل مورا نیہر چھوٹا جائے۔۔۔'' راگ بھیروی سنگیت میں تھا۔یہ نغمہ واجد علی شاہ کے دورِ حکومت میں بہت مشہور تھا۔

★ فلم ''شعلے'' کی فلم بندی پر دو کروڑ روپے کی لاگت آئی تھی۔جب کہ یہ فلم فی علاقہ ۲۰ لاکھ میں فروخت ہوئی تھی جو اس وقت ریلیز ہونے والی فلموں سے دوگنا تھی۔

★ فلم ''مغلِ اعظم'' کے لئے دہلی سے درزی' حیدرآباد سے زیورات' راجستھان سے زرہ بکتر اور دیگر ہتھیار' آگرہ سے اداکاروں کے لئے جوتے منگوائے گئے تھے۔

★ محبوب خاں' کی شاہکار فلم 'مدر انڈیا' پہلی ہندوستانی فلم تھی جو آسکر ایوارڈ کے لئے نامزد ہوئی تھی صرف چند ووٹوں سے انعام کی مستحق نہیں ہوسکی۔

★ راکیش روشن نے اپنی فلم ''کوئی مل گیا'' میں اڑن طشتری اور دوسری دنیا کے جانداروں کو دکھانے کی کوشش ہندوستانی فلم انڈسٹری میں پہلی بار کی ہے۔آج تک اس موضوع پر کوئی فلم نہیں بنی اس اعتبار سے یہ پہلی فلم ہے۔

★ تیرہ سے ۱۶؍سال کے بچوں نے فلم سازی کے میدان میں قدم رکھتے ہوئے ایک نیا کارنامہ انجام دیا ہے۔گورنگی فلم کے پرچم تلے ان بچوں نے اٹھارہ منٹ کی ایک فلم تیار کی ہے۔جس کا نام ''میں کون ہوں'' ہے اس فلم کے تمام شعبوں میں بچوں ہی نے کام کیا ہے۔منظر نامہ' ڈائرکشن' فلم سازی اور اداکاری وغیرہ میں بھی ان کا رول ہے۔

★ اشوک کمار کی فلم ''اچھوت کنیا'' دیکھ کر پنڈت جواہر لال نہرو' اندرا گاندھی سرجنی نائیڈو نے اشوک کمار کی کافی حوصلہ افزائی کی تھی۔

★ مشہور کیرکٹر ایکٹر جانکی داس ایم اے نے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء کے دوران ورلڈ سائکلنگ ریس کے ریکارڈ توڑے۔۱۹۳۶ء کے عالمی اولمپک گیمس برلن میں انہوں نے اڈولف ہٹلر کی قیادت میں منعقدہ ان گیمس میں چمپئن سائکلسٹ کی حیثیت سے ہندوستان کی نمائندگی کی تھی۔اس کے علاوہ ۱۹۳۸ء میں برٹش امپائر گیمس

جوشڈ نی (اسٹریلیا) میں ہوئے اور ۱۹۴۰ء میں ٹوکیو میں منعقدہ ایسٹرن گیمس میں ہندوستان سے واحد نمائندگی کی تھی۔ آل انڈیا سائکلنگ باڈی ملحقہ عالمی تنظیم یونین سائکلسٹ انٹرنیشنل کے پہلے جنرل سکریٹری ہونے کا انھیں اعزاز حاصل ہے۔اسپورٹس مین جانکی داس نے کئی عالمی ریکارڈس قائم کئے۔ان کی تیز سائکل چلانے کی رفتار فی گھنٹہ ۳۰ میل تھی۔اس کے علاوہ آپ ایک اچھے رائٹر بھی تھے۔ان کی دو کتابیں ''مس ایڈونچران فلم لینڈ''،''ایکٹنگ فور بیگ نرس'' کافی مشہور ہوئیں۔

★ سب سے پہلی بار بارش کے مناظر کو راج کپور نے ۱۹۴۱ء فلم ''برسات'' میں فلمایا تھا۔

★ فلم ساز ہدایت کار اوم پرکاش کو اپنی فلم ''آیا ساون جھوم کے'' کا منظر چاندی ولی اسٹوڈیو میں فلمانا تھا۔ نائر بریگیڈ کے انجنوں سے نقلی برسات کی گئی اس نغمے کو فلمانے میں پورے سات دن اور چالس انجن پانی لگے۔

★ مشہور کامیڈین جانی واکر فلموں میں آنے سے قبل انہوں نے مونگ پھلی اور آئس کریم فروخت کیا پھر ممبئی میں کچھ دنوں تک بس کنڈکٹر کی نوکری بھی کی۔

★ ابتدائی دنوں میں راج کپور نے گیت کار شیلندر کو اپنی ایک فلم کے لئے آفر کیا۔لیکن انہوں نے انکار کر دیا تھا۔لیکن جب راج کپور فلم 'برسات' بنا رہے تھے اس وقت شیلندر نے اپنی مجبوری کے تحت راج کپور سے ملاقات کی اور کہا میری بیوی حاملہ ہے اور مجھے پانچ سو روپے کی ضرورت ہے اگر آپ چاہیں تو میں اپنی مرضی کے خلاف آپ کی فلم کے لئے نغمے لکھ سکتا ہوں۔راج کپور نے انھیں پانچ سو روپے دیتے ہوئے کہا آپ اپنی ضرورت پوری کر لیجئے۔اس کے عوض میں آپ سے جبراً گیت لکھواؤں گا۔ایسی بات نہیں۔شیلندر نے جواب دیا۔راج صاحب آپ نے میری ضرورت پوری کر کے مجھے خرید لیا ہے۔فلم برسات' کے لئے دو نغمے باقی تھے۔جنھیں شیلندر نے لکھے نغموں کے بول

تھے۔''برسات میں ہم سے ملو تم اور' ترچھی نظر ہے پتلی کمر ہے''۔

★ گیت کار شیلندر کو فنِ موسیقی سے بچپن ہی سے لگاؤ رہا ہے۔وہ اپنے گھر سے قریب ایک مندر میں اکثر دف بجا کر بھجن گایا کرتے تھے۔راج کپور نے ان سے دف بجانے کا طریقہ سیکھا اور اسے نہایت عمدگی سے اپنی فلم شری ۴۲۰ میں جگہ دی۔

★ ہندی فلموں میں انگریزی گیت کی ابتدا ۱۹۳۷ء میں وی شانتارام کی فلم' دنیا نہ مانے میں گلوکارہ شانتا سے ہوئی۔

★ ۱۹۴۹ء میں بنی فلم ''گرلس اسکول'' میں موسیقار انل بسواس نے صرف چار گانوں کی موسیقی ترتیب دی تھی۔باقی سبھی گیتوں کی موسیقی سی رام چندر نے دی۔

★ ایک مرتبہ گلوکار محمد رفیع صاحب ریکارڈنگ کرا کر آرہے تھے راستے میں اپنے وقت کے مشہور موسیقار بابل مل گئے۔انھیں گاڑی میں بٹھالیا اور خیریت پوچھی گفتگو کے دوران بابل صاحب نے اپنی پریشانیوں کا ذکر کیا۔اس دن رفیع صاحب کو گانے کا معاوضہ آٹھ ہزار روپیہ ملا تھا۔رفیع نے وہ لفافہ جوں کا توں بابل صاحب کی جیب میں ڈال دیا اور انھیں کچھ کہنے کا موقع دئے بغیر دوسری باتوں میں لگا لیا۔پھر انھیں جہاں جانا تھا وہاں تک پہنچا دیا۔اور گھر آ گئے یہ وہی بابل ہیں جنھوں نے فلم ''ریشمی رومال' اور نقلی نواب''، جیسی فلموں کی موسیقی دی تھی۔

★ ایک بار محمد رفیع کے منھ سے گیت' باپو کی امر کہانی' سن کر پنڈت جواہر لال نہرو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے گلے کا ہار محمد رفیع کے گلے میں ڈال دیا۔

★ ۱۹۵۰ء میں ریلیز ہونے والی فلم' ہر ہر مہادیو' سے نروپا رائے کو مقبولیت حاصل ہوئی۔اس فلم میں نروپا رائے نے' دیوی پاروتی' کا کردار ادا کیا تھا۔جو تماش بینوں کو اس قدر پسند آیا کہ لوگوں نے نروپا رائے کی تصویر میں دیوی دیوتاؤں کے درمیان چسپا کر دی تھیں۔

★ اندرا گاندھی کے صاحبزادے سنجے گاندھی نے کشور کمار کو ایک پروگرام کے لئے دہلی طلب کیا تھا۔کشور کمار کے انکار پر سنجے گاندھی نے کشور کمار کے تمام گانوں پر پابندی لگادی۔ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر کئی مہینوں تک کشور کمار کے گانے نشر نہیں کئے گئے۔جب محمد رفیع صاحب سے برداشت نہ ہوا تو انہوں نے دہلی جا کر اندرا گاندھی سے ملاقات کی اور کشور کمار کے نغمے پر سے پابندی ختم ہوگئی۔اور کشور کمار کے گانے دوبارہ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر سنائی دینے لگے۔

★ غالباً ۱۹۳۶ء کی بات ہے تکیہ سیدان میں محفل موسیقی آراستہ کی گئی تھی۔جس میں کے۔ایل۔سہگل اور زہرہ بائی انبالے والی بھی موجود تھیں۔کوئی نو عمر لڑکا گا رہا تھا کہ بجلی گل ہوگئی لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔اور منتظمین نے وقت گزاری کی غرض سے محمد رفیع کو اسٹیج پر کھڑا کر دیا۔انہوں نے کلاسیکل انداز میں گانا شروع کیا تو سامعین کے اکھڑے ہوئے قدم جم گئے۔اسی دوران بجلی آ گئی تمام محفل رفیع کی آواز پر جھوم رہی تھی۔جب وہ گا چکے تو کے ایل سہگل اپنی جگہ سے اٹھے اور رفیع کو شاباشی دی اور بولے حضرات یہ لڑکا ایک دن پورے ہندوستان بلکہ پوری دنیا کے اسکرین کا سورج بنے گا اور سہگل کی پیشن گوئی کو رفیع نے حرف بہ حرف سچ ثابت کر دیا۔

★ ملکۂ ترنم لتا منگیشکر واحد گلوکارہ ہیں جنہیں چھ یونیورسٹیوں نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی ہے۔

★ مشہور فلمی اداکارہ شوبھا کھوٹے نے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۶ء تک مسلسل آل انڈیا سائکل چمپئن شپ جیتی ہیں وہ دو منٹ ۵۸ سکنڈ میں ایک میل کا ریکارڈ بنا کر آل انڈیا سائکلنگ چمپئن ہوئیں۔

★ فلموں میں دیوانند کی اداکاری کا موازنہ ایک فلمی تبصرہ نگار نے سیاست میں جواہر لال نہرو کی شخصیت سے کیا تھا۔

★ فلم ''اندر سبھا'' میں جہاں آرا کجن اور ماسٹر نثار کی ہوش ربا آوازوں میں ۷۲ نغمے پیش

کئے گئے۔یہ فلم ۱۹۳۲ء میں بنی تھی۔اس فلم نے زیادہ گانوں کے اعتبار سے عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔

★ جہاں آرا کجن اور ماسٹر نثار جیسے فنکار ۱۹۳۱ء میں ۱۲۵ روپے پر مدن تھیٹر میں نوکر تھے۔

★ فلمی اداکارہ کم کم کے والد نواب منظور حسن خان پٹنہ کے قریب حسین آباد کے جاگیر دار تھے۔ان کے پاس کافی زمین تھی۔کہتے ہیں کہ اس زمانے میں آدھے سے زیادہ پٹنہ ان کا ہوا کرتا تھا۔جب وقت بدلا تو حکومت نے نوابی چھین لی نوابی ٹھاٹ برقرار رہا لیکن آمدنی ختم ہوگئی تھی۔

★ اداکارہ ثریا کے مداح انہیں ایک جھلک دیکھنے کے لئے بیقرار رہتے تھے۔انہیں دیکھنے والوں کی اتنی بڑی تعداد آتی تھی کہ ٹرافک نظام بھی درہم برہم ہو جاتا تھا۔اس بات کی شکایت اس وقت کے مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ مرارجی ڈیسائی سے بھی کی گئی تھی۔اور کہا گیا تھا کہ ثریا کو اس علاقے سے منتقل کر دیا جائے۔

★ ثریا وہ پہلی اداکارہ تھی جنھیں گلیمر گرل کا خطاب ملا تھا۔ان کا موازنہ ہالی ووڈ کی گلیمر اداکاروں سے کیا جاتا تھا۔

★ ثریا وہ پہلی ہندوستانی اداکارہ تھیں جن کے نام پر ان کے گھر کے سامنے والی سڑک کا نام رکھا گیا تھا۔

★ فلم مرزا غالب کے دو نغمے ''دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے اور یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا''۔بیحد مقبول ہوئے اس فلم کو پہلی مرتب صدر جمہوریہ کے گولڈ مڈل اعزاز سے نوازا گیا تھا۔اور جواہر لال نہرو نے اس موقع پر ان کی تعریف میں کہا تھا۔''تم نے مرزا غالب کی روح کو زندہ کر دیا۔''

★ حکومت ہند نے اعلان کیا کہ ۱۱/اپریل ۲۰۰۴ء کو کے ایل سہگل کا صد سالہ یومِ پیدائش منایا جائے گا۔اور راجیہ سبھا کی ڈپٹی چیئر پرسن اور آئی سی سی آر کی چیئر پرسن

ڈاکٹر نجمہ ہب اللہ نے سہگل کی ایک یادگار تقریب میں کہا کہ امر گائیک کندل لال سہگل کی یاد میں ان کی صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر ۱۱/اپریل کو ایک ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا جائے گا۔ انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ اس موقع پر سہگل کے گائے ہوئے گیت ریڈیو سے نشر کئے جائیں۔ اور دوردرشن پر ان کی فلموں کو ٹیلی کاسٹ کیا جائے۔

★ ایک خبر کے مطابق سہگل کی یاد میں ایک میوزیم بنایا جانے والا ہے جس میں کے ایل سہگل کے سونے کے سگریٹ کیس' ان کی مختلف ٹرافیاں' ہیرے کی انگوٹھی' چاندی کے برتن' ان کی لکھی چٹھیاں اور دیگر ضروری اشیاء رکھی جائیں گی۔

★ موسیقار ماسٹر غلام حیدر کی پہلی فلم خزانچی کی موسیقی کی خصوصیت یہ تھی کہ فلم کے سارے کے سارے گیت شمشاد بیگم نے گائے ہیں۔

★ مشہور پینٹر فدا حسین فلم ڈائرکٹر کے علاوہ ایک شاعر بھی ہیں۔ پینٹنگ سے پہلے آپ شاعری کیا کرتے تھے شاعری کی دنیا میں آپ فدا حسین حیاؔ کے نام سے مشہور تھے انہوں نے اپنی فلم ''تین شہروں کی کہانی'' میں ایک قوالی لکھی ہے جس کا مکھڑا ہے ''نور العلیٰ نور''۔

★ فلم 'پردیسی' وہ پہلی ہندوستانی فلم تھی جو روس کے اشتراک سے بنی تھی۔ اس مشترکہ فلم سازی کی ابتدا خواجہ احمد عباس نے ہی کی تھی۔ یہ فلم ۱۹۵۷ء میں بنی تھی۔ اس کی کہانی ایک روسی سیاح کے سفرنامے پر مبنی تھی۔ جو پندرہویں صدی میں ہندوستان آیا تھا۔ اس میں ایک مشہور روسی اداکار نے نرگس کے مقابل کام کیا تھا۔ فلم میں پرتھوی راج کپور' بلراج ساہنی' اور من موہن کرشن نے بھی کام کیا تھا۔

★ پرانی فلموں کی مشہور اداکارہ انیتا گوہا نے پچاس کی دہائی کے ابتدائی دور میں ''مس کلکتہ'' کا خطاب جیتا تھا۔

★ فلم ''منا'' ہندوستان میں بنائی گئی۔ پہلی فلم تھی جس میں ایک بھی گانا نہیں تھا۔

★ رائل اکیڈمی آف ڈراما انگلینڈ سے ایکٹنگ کی تربیت حاصل کرنے والی پہلی ہندوستانی اداکارہ پریارا جونش تھی اس اکیڈمی میں آج بھی اس کی ایک تصویر بطور یادگار ٹنگی ہوئی ہے۔ یہ مقام کسی دوسری اداکارہ یا اداکار کو حاصل نہیں ہے۔

★ یہ بات بہت لوگوں کو نہیں معلوم ہے کہ مینا کماری نے ابتدائی دنوں میں فلم ''پیا گھر آجا اور بچھڑے بالم'' میں اپنی آواز میں گانے بھی گائے ان کی آواز میں پالی ڈوز کمپنی نے ان کی منتخب نظموں اور غزلوں کا ریکارڈ تیار کیا تھا۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک کی بہترین اداکارہ کے لئے صرف اور صرف مینا کماری کا نام پیش ہوا وہ تینوں فلمیں مینا کماری کی تھیں۔ ''آرتی' میں چپ رہونگی' اور صاحب بی بی غلام'' فلم فیئر ایوارڈ کے جیوری پریشانی تھے ان کی ان فلموں کی بہترین اداکاری پر کس فلم پر انعام دیا جائے آخر کار جیوری نے یہ فیصلہ مینا کماری پر ہی چھوڑ دیا کہ وہ خود انتخاب کرے انہوں نے فلم ''صاحب بی بی غلام'' کا انتخاب کیا۔ فلم ڈویژن نے اپنی تیار کردہ انڈین نیوز ریویو میں دوسرے واقعات کے ساتھ مینا کماری کا آخری سفر بھی فلمایا تھا۔ سہراب مودی نے مینا کماری کی زندگی پر ایک فلم ''مینا کماری کی امر کہانی'' بنائی تھی۔ جو ۱۹۷۹ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

★ اپنے زمانے کی مشہور اداکارہ گلوکارہ خورشید کہتی تھیں کہ اسے اس بات پر فخر ہے کہ اسے علاّمہ اقبالؔ کے گود میں کچھ عرصہ کھیلنے کا شرف حاصل ہے۔ دراصل میرا رہائشی مکان علاّمہ اقبالؔ کے مکان کے عین بالمقابل تھا۔ اسی لئے ان کا خاصا وقت علاّمہ اقبالؔ کے گھر میں گزرا علاّمہ اقبالؔ کی ان پر شفقت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے شرارتوں کا نہ تو کبھی نوٹس لیا اور نہ ہی کبھی اس سے ناراض ہوئے۔ ابتدائی دنوں میں خورشید نے چند فلموں میں مس شیلا کے فلمی نام سے فلموں میں کام کیا۔ شادی کے بعد وہ برقعہ بھی پہننے لگی تھیں۔ امریکہ کی سیاحت کے دوران ان کی صبح نماز فجر سے شروع ہوتی تھی اور عشا تک جاری رہتی۔ قیام پاکستان کے بعد خورشید اپنے شوہر کے ساتھ

۱۹۴۸ء میں ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلی گئیں۔

★ پروفیسر اروند موہن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اداکارہ، گلوکارہ، ثریا کے گھر کے باہر عاشق چکر لگاتے تھے۔ان میں سے ایک ذوالفقار علی بھٹو تھے۔جو بعد میں پاکستان چلے گئے اور پاکستان کے وزیراعظم ہوئے۔

★ بلراج ساہنی نے اپنی بیوی دمینتی کے ساتھ دو فلموں ''دھرتی کے لال اور گڑیا گھر'' میں کام کیا تھا۔یہ فلم ۱۹۴۷ء میں بنی تھی۔

★ بلراج ساہنی کے بیٹے پربکشت ساہنی نے فلم ''ہلچل اور دیدار'' میں دلیپ کمار کے بچپن کا رول کیا تھا۔

★ بلراج ساہنی نے چیتن آنند کی فلم 'بازی' میں مکالمہ اور منظر نامہ خود لکھا تھا۔یہ فلم ۱۹۵۱ء میں ریلیز ہوئی۔

★ بلراج ساہنی نے کئی بار ایک وفد کی حیثیت سے روس کا دورہ کیا انہوں نے ایک 'سیاحت نامہ' میرا روسی سفر نامہ' لکھا تھا۔جس کے لئے انھیں سویت لینڈ ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔۱۹۶۰ء میں بلراج ساہنی نے پاکستان کا دورہ کیا تھا۔واپسی پر مشہور سفر نامہ' میرا پاکستانی سفر' لکھا جو پنجابی میں ان کی پہلی تصنیف ہے۔اس کے علاوہ ان کے مضامین کا مجموعہ ''میری فلمی سرگذشت'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئی۔اس کے علاوہ انہوں نے بہت سی مختصر نظمیں بھی لکھی تھیں۔۱۹۶۰ء میں انھیں حکومت ہند کی طرف سے 'پدم شری' کا اعزاز ملا۔۱۹۷۱ء میں انھیں پنجاب کی گرونانک یونیورسٹی کی سینٹ کا ممبر نامزد کیا گیا۔انھیں راجیہ سبھا کی رکنیت کی پیشکش بھی کی گئی تھی لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا۔

★ راج کپور کا انتقال ۲ رجون ۱۹۸۸ء کی رات ۹ بج کر ۲۰ منٹ پر دہلی میں ہوا وہ دادا صاحب پھالکے ایوارڈ حاصل کرنے کے لئے دہلی گئے ہوئے تھے۔جب اس ایوارڈ کے لئے ان کا نام پکارا گیا تو وہ اسٹیج پر جانے کے قابل بھی نہ

تھے۔ان کی یہ حالت دیکھ کر صدر جمہوریہ ہند خود اسٹیج سے نیچے اتر آئے اور راج کپور کے قریب جا کر ان کو یہ ایوارڈ پیش کیا۔یہ پہلا موقع تھا۔جب صدر جمہوریہ اسٹیج سے نیچے اتر کر ان کو ایوارڈ دینے آئے۔

★ راج کپور کے دادا نے فلم 'آوارہ' میں جج کا رول کیا اور والد نے وکیل کا اور راج کپور کے بچپن کا رول چھوٹے بھائی ششی کپور نے کیا۔

★ فلم اسٹار شاہ رخ خان کے نانا شاہ نواز خان سبھاش چندر بوس کی انڈین نیشنل آرمی میں جنرل تھے۔آزادی کے بعد کانگریس پارٹی میں شامل ہوگئے۔میرٹھ سے لوک سبھا کے لئے کئی بار کامیاب ہو کر مرکزی وزیر بنائے گئے۔ان کی وفات کے بعد ان کے جسدِ خاکی پر قومی جھنڈا اوڑھا کر قومی اعزاز سے نوازے گئے۔

★ ماضی کی حسین اداکارہ نسیم بانو کے والد کپڑے کے بیوپاری تھے اور ماں شمشاد بیگم دہلی کی مشہور مغنیہ تھیں۔نسیم بانو اسکول پالکی میں بیٹھ کر جایا کرتی تھیں۔کیلنڈروں پر تصویروں کا رواج نسیم بانو ہی سے شروع ہوا۔جب نسیم بانو کی خوبصورتی اور اس کی باغ و بہار شخصیت کی دھوم مچی ہوئی تھی تو ان سے شادی کرنے کے لئے راجہ، مہاراجہ، نواب اور شہزادوں نے کوشش کیں۔اور گرانقدر رقم کی بھی پیشکش کی مگر سب ناکام رہے۔لیکن انہوں نے دہلی کے رئیس اعظم محمد احسان صاحب سے شادی کی انہوں نے بیوی کی فرمائش پر ایک فلم کمپنی بھی قائم کی تھی۔اور اس کا نام تاج محل پکچرز فلم کمپنی بمبئی رکھا تھا۔اس فلم کمپنی کے بیز تلے پانچ فلمیں اجالا بیگم' ملاقات 'چاندانی رات اور عجیب لڑکی'' تھیں۔ان پانچوں فلموں کی ہیروئن نسیم بانو تھیں۔نسیم بانو نے فلم پکار میں ایک گیت اپنی آواز میں گایا تھا بول تھے''زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے- بج رہا ہے اور بے آواز ہے۔۔۔'' یہ پہلی ہندوستانی فلم پکار نے حیدرآباد دکن میں سلور جوبلی منائی۔سہراب مودی کی فلم 'خون خون' میں نسیم بانو اور ان کی والدہ شمشاد بیگم دونوں نے کام کیا تھا۔نسیم بانو ۱۹۵۳ء میں پہلی بار لندن گئیں اور ملکہ الزبتھ

کی تاجپوشی کے موقع پر جشن میں شریک ہوئیں۔

- ★ مشہور فلمی گیت کار اندیور نے اپنی نظموں کے ذریعہ وطن کے عوام میں آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی اسی دوران انہوں نے ایک نظم انگریزی حکومت کے خلاف لکھی اس کی پاداش میں اندیور کو ایک سال کی قید ہوگئی۔جیل سے رہائی کے بعد بمبئی چلے آئے اور فلموں میں گیت لکھنے لگے۔
- ★ نوتن کی ماں شوبھنا سمرتھ نے کئی ہندی فلموں میں کام کیا تھا۔۱۹۵۵ء میں بنی فلم انسانیت میں شوبھنا سمرتھ نے دلیپ کمار کی ماں کا رول ادا کیا تھا۔نوتن نے اپنی پہلی فلم ''ہماری بیٹی'' میں ایک گیت بھی گایا تھا بول تھے'' تجھے کیا دولہا بھائی رے۔۔۔'' یہ فلم ۱۹۵۰ء میں ریلیز ہوئی تھی۔اس سے پہلے صرف ۹ سال کی عمر میں نوتن نے چائلڈ آرٹسٹ کی حیثیت سے فلم ''فل دینتی'' میں کام کیا تھا۔یہ فلم ۱۹۴۵ء میں ریلیز ہوئی تھی اس فلم میں ہیروئن نوتن کی ماں شوبھنا سمرتھ تھی۔نوتن نے ایک نظم Smiley and me بھی لکھی ہے۔جو انگریزی اور ہندی میں ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی تھی۔
- ★ فلم ساز اور ڈائرکٹر بمل رائے نے فلم 'جوش محبت' میں پہلی بار بطور اسٹنٹ کیمرہ مین میں حصہ لیا یہ فلم ۱۹۳۲ء میں ریلیز ہوئی۔اس کے بعد جوشِ محبت (۱۹۳۲ء) محبت کے آنسو (۱۹۳۲ء) صبح کا ستارہ (۱۹۳۲ء) یہودی کی لڑکی (۱۹۳۳ء) چنڈی داس (۱۹۳۴ء) میں وہ اسسٹنٹ کیمرہ مین رہے ان کو پہلا موقع پی وی راؤ کی ایک تامل فلم ''تلاّ تھنگل'' کی فوٹوگرافی کی ذمہ داری دی یہ فلم ۱۹۳۵ء میں ریلیز ہوئی۔اس کے بعد مشہور فلم ''دیوداس'' کی شروعات ہوئی۔یہ فلم ایک ساتھ تین زبانوں بنگلہ، ہندی اور تامل میں تیار ہوئی۔ان تینوں فلموں کے فوٹو گرافر بمل رائے تھے۔انہوں نے ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک سات فلموں کی فوٹو گرافی کی جن میں چار ہندی دو تامل اور ایک بنگلہ تھی۔

پہلی ڈائرکشن انہوں نے نیوتھیٹرز کمپنی کے بینر تلے بنی ایک بنگالی فلم ''ادیار پتھ'' کو دی تھی۔پھر ہندی فلم ہمراہی کی ہدایت دی۔یہ فلم ۱۹۴۵ء میں ریلیز ہوئی تھی۔انہوں نے پہلے بنگالی زبان میں ''انجان گڈھ'' بنائی اور بعد میں پھر اسے ہندی میں بنایا انہوں نے لگاتار پانچ بنگالی فلمیں بنائی۔۱۹۵۰ء میں انہوں نے پہلی ہندی فلم بنائی جس کا نام ''پہلا آدمی'' تھا۔فلم فیئر کے بی کے کرنجیا ان کو Strong silentman کہا کرتے تھے۔

- ★ فلم 'آزاد' میں دھرمندر نے ڈپلی کیٹ کا سہارا نہ لے کر فلم کے ایک منظر کے لئے باگھ سے خود مقابلہ کیا تھا۔اس منظر کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے تین دنوں تک شوٹنگ چلتی رہی۔
- ★ عطیہ بیگم فیضی' ستارہ کا رقص دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی تھیں۔ستارہ کی عمر اس وقت چودہ پندرہ برس ہوگی۔عطیہ بیگم فیضی ان دنوں' تھری آرٹس سرکل' چلایا کرتی تھیں۔انہوں نے اپنی تنظیم کی جانب سے گرودیو رابندرناتھ ٹیگور کو خاص طور سے مدعو کیا تھا۔ستارہ کو صرف آدھ گھنٹے کا وقت دیا گیا تھا۔ستارہ مایوس ہوگئی تھی۔پھر بھی ناچنا منظور کرلیا تھا۔ہال میں بیٹھے معزز مہمان خاموشی کے ساتھ ستارہ کا ناچ دیکھ رہے تھے۔ان میں سیاست کی عظیم شخصیت بلبل ہند سروجنی نائیڈو بھی تھیں۔ستارہ کو کھڑا دیکھ کر بے ساختہ بول پڑیں سندر'۔۔۔بہت سندر۔۔۔یونہی ناچتی رہو ستارہ کو حوصلہ ملا۔منھ مانگی مراد پوری ہوئی۔ناچ ختم ہونے کے بعد رابندرناتھ ٹیگور نے تحفہ میں پچاس روپے اور بنارسی ساڑی دینی چاہی تو ستارہ نے کہا کہ میں یہ سب لے کر کیا کروں گی آپ مجھے آسیرواد دیجئے۔وہ میرے ساتھ جیون بھر میری رہنمائی کرے گا۔اس تاریخی پروگرام میں رابندرناتھ ٹیگور نے ستارہ کو 'ملکۂ رقص' کے خطاب سے نوازا تھا۔
- ★ شاہکار فلم 'مغلِ اعظم' پہلی بلیک اینڈ وائٹ فلم ہے جسے رنگین کر کے پیش کیا گیا۔
- ★ ہندوستان کی پہلی سوشل فلم ''انگلینڈ ریٹرن'' تھی جو ۱۹۲۱ء میں ریلیز ہوئی۔

ہندوستان کی پہلی گیوا کلر فلم 'شاہ جہاں' تھی۔

★ اسٹل کیمرہ ۱۷ ویں صدی میں ایجاد ہو چکا تھا۔ اس سائنسی تحریک نے پیش رفت کی اور ایک مووی کیمرہ وجود میں آ گیا۔ جو کردار و واقعات کے حرکاتی عمل کو جوں کا توں فیتے پر اتارے اور اسی کے ساتھ ایسے مشینی آلات بھی تیار کر لئے گئے جو اُسے متحرک کر سکیں۔ اسے Film Processing کے نام سے پہچان دی گئی۔

★ ۱۹ ویں صدی کے آخر میں اس فن کو کیمینا آٹو گراف (Kamina Autograph) کا نام دیا گیا۔ مگر چونکہ کمینا یونان سے مستعار لیا گیا تھا۔ لہٰذا اسے یورپ میں قبول نہیں کیا گیا۔ اور یورپ وامریکہ نے کیمینا کے بجائے سنیما (Cinema) آٹو گراف کے لفظ سے اس فن کو وابستہ کر دیا۔ اور یہی نام آج ہر ملک میں فلمی صنعت کا واضح اور مانوس نام بن چکا ہے۔

★ تصاویر کو متحرک دکھانے کی ایجاد میں کئی نام آئے مگر اس ایجاد میں سب سے پہلے Athanisis Kncher کا نام آتا ہے۔ جس نے اولاً سپر بین Magic Lantern کے توسط سے ہاتھ سے بنائی گئی تصویروں کو پردے پر دکھایا تھا۔

★ ۱۸۷۷ء میں اسٹل فوٹو گرافر ایڈورڈ نے ۳۵ کیمروں کی مدد سے گھوڑے کے دوڑنے کی تصویر اس طرح قید کی کہ اس نے کیمروں کے شٹرز کو دھاگوں سے اس طرح باندھا کہ جب گھوڑا دوڑتا ہوا ان دھاگوں سے دھاگہ ٹوٹتا اور شٹر بند ہو جاتا ان تصاویر کو یکجا کر کے دیکھا گیا تو گھوڑا متحرک دکھائی دیتا تھا۔ ۱۸۸۰ء میں اس کی نمائش بھی کیلی فورنیا میں کی گئی۔

★ ۱۸۹۰ء میں مووی کیمروں کی ایجاد کا سہرا لندن کے سائنس داں ولیم گرین کے سر بندھا۔ ہائڈ پارک (لندن) کی تصاویر لے کر جب ان کو دکھایا تو لندن کے لوگوں نے پہلی بار قدرِ واضح متحرک تصاویر دیکھیں جب اسے پینٹ کرایا گیا تو سوچا بھی نہ ہوگا کہ جب دنیا ترقیاتی دور کی انتہا کو پہنچے گی تو یہی کیمرہ دنیا کا قدیم ترین کیمرہ تسلیم

کیا جائے گا۔ مگر ولیم جب غریبی کا شکار ہوا تو اس نے یہ کیمرہ محض چند پونڈ میں بیچ دیا۔ بہت بعد میں جب ''میجک باکس'' نامی فلم اس کیمرے سے شوٹ کی گئی تو ولیم گرین کو انتہائی غربت میں دکھایا گیا تھا۔ ۱۸۹۱ء میں ایڈیسن نے بھی مووی کیمرہ بنا لیا مگر اس میں کچھ دشواریاں تھیں۔ جنہیں جارج ایسٹ مین نے دور کر دیا۔ یہی شخص ایسٹ مین کلر کا موجد بنا۔ اسی نے سلولائڈ بھی ایجاد کیا تھا۔ اسی کمالِ ہنرمندی سے ایڈیسن نے تجربات جاری رکھا۔ اور فرانس کے لومیتر کے ساتھ وہ پروجکٹ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اور بیک وقت کئی لوگ تصاویر کو دیکھ سکتے تھے۔ اس پروجکٹ کو ایڈیسن ویٹا اسکوپ کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔

★ ۱۹۰۴ء میں ایڈون پوٹر نے The great train robbery نامی فلم بنا کر دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ تھرل اور سسپنس سے بھری یہ دنیا کی پہلی فلم ثابت ہوئی اور پورٹر تاریخ ساز شخصیت بن کر فلمی تاریخ میں امر ہو گیا۔

★ ہندوستان کی پہلی ٹکنی کلر فلم ''آن'' تھی۔

★ ہندوستان کی پہلی رنگین فلم ''جھانسی کی رانی'' تھی۔

★ فلم ''لائٹ آف ایشیا'' سلور جوبلی منانے والی پہلی فلم تھی۔ جس کی نمائش ساری دنیا میں ہوئی۔

★ ہندوستان میں طوائفوں کے عشق کی کہانیوں کی شروعات فلم 'آدمی' سے ہوئی یہ فلم ۱۹۳۹ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

★ ''امر اکبر انتھونی'' ہندوستان کی پہلی فلم ہے جس نے ممبئی کے ۹ سنیما گھروں میں ایک ساتھ سلور جوبلی منائی۔

★ کے آصف کی شاہکار فلم ''مغلِ اعظم'' دنیا کی پہلی فلم ہے جسے ڈالبی ڈی ٹی ایس ساؤنڈ میں مکمل رنگین بنا کر پیش کیا گیا۔ یہ فلم ۱۹۶۰ء میں بلیک اینڈ وائٹ فلم بن کر ریلیز ہوئی تھی۔ ۴۴ سال بعد یعنی ۱۲ نومبر ۲۰۰۴ء میں رنگین کر کے ریلیز کی گئی۔

★ محنت کش طبقہ کی سب سے پہلے نمائندگی ۱۹۳۴ء میں بنی اجنتا مودی ٹون کی فلم ''مل'' (Mill) اور مزدور نے کی تھی۔ جو منشی پریم چند کی کہانی پر مبنی تھی۔

★ چندر موہن اپنے وقت کا بہت بڑا اداکار تھا۔ جس کی شاہکار فلموں کی فہرست طویل ہے جیسے محبوب کی ''روٹی'' سہراب مودی کی ''پکار'' مگر موت کے بعد اس فنکار کے جسدِ خاکی کو سپردِ آتش کرنے کے لئے اداکارہ نرگس کو چندہ اکٹھا کرنا پڑا۔

★ خان مستانہ ایک مشہور موسیقار اور گلوکار تھا۔ مگر حیف کہ اپنے آخری دور میں وہ ماہم پر واقع حضرت مخدوم شاہؒ بابا کی درگاہ کے باہر بھیک مانگتے ہوئے مرا۔

★ ماسٹر نثار کلکتہ کے مشہور اسٹوڈیو نیو تھیٹرز کا وہ واحد اداکار تھا۔ جس کا معاوضہ سب سے زیادہ تھا۔ اس کی شہرت سے متاثر ہو کر رنجیت اسٹوڈیوز کے مالک چندولال شاہ نے اس کو اپنی فلم میں کام کرنے کے لئے ممبئی مدعو کیا۔ وہ دندناتا ہوا رنجیت اسٹوڈیو دادر پہنچا۔ جہاں اس کے استقبال کے لئے نہ صرف چندولال شاہ بلکہ اس دور کے کئی جانے مانے ستاروں کی بھیڑ موجود تھی۔ اس نے گاڑی روکی اور انتظار کرتا رہا کہ چندولال شاہ اس کی کار کا دروازہ کھول کر اس کا خیر مقدم کرے۔ جب ایسا نہیں ہوا تو اس نے اس کو اپنی توہین اور ہتک محسوس کیا اور غصہ میں تن تنہا گاڑی موڑی اور کلکتہ لوٹ گیا اور پھر زندگی میں ایک ایسا دور آیا۔۔۔ایک انقلاب۔۔۔سونامی سے بھی بڑا۔۔۔ کہ جب کلکتہ کی انڈسٹری کے دروازے اس پر بند ہوئے تو قسمت آزمائی کے لئے اس نے بمبئی کا رخ کیا اور بالی ووڈ میں اکسٹرا کا رول کرتا نظر آیا اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب بمبئی سنٹرل اسٹیشن کے سامنے ایک کھولی میں اس کا بسیرا تھا۔ اور لوگوں سے دو دو روپے طلب کر کے اس نے تڑپ تڑپ کر جان دی۔

★ اپنے وقت کی شہرت یافتہ اداکارہ سلوچنا کا جب زوال آیا اور پائی پائی کو محتاج ہوئی تو اس برے وقت میں اس کا ڈرائیور سپاری والا اس کے کام آیا اور اس کو اپنے چھوٹے سے چال نما گھر میں پناہ دی۔

★ اداکار پرسورام مراٹھی فلموں کا جانا پہچانا نام تھا اس کو لوگوں نے باندرہ جنکشن پر لکی ہوٹل کے قریب فٹ پاتھ پر بھیک مانگتے ہوئے دیکھا۔ اور اسی فٹ پاتھ پر زندگی کو خیر باد کہا۔

★ مشہور موسیقار گلشن صوفی ایک مفلس اور نادار موت سے ہمکنار ہوا۔ آج بھی اس کا لڑکا اختر صوفی دردر بھیک مانگتا نظر آتا ہے۔

★ للیتا پوار کو لوگ نہیں بھولے ہونگے۔ گزرے ہوئے کل کی ہیروئن اور ایک دہائی پہلے کی فلموں کی جھگڑالو ساس وہ پونا میں تنہا رہتی تھی۔ جب اس کے فلیٹ سے بدبو آئی اور پولس نے دروازہ توڑا تو اس کی گلی سڑی لاش ملی۔

★ فلم ساز' اداکار' ہدایت کار مسخرے بھگوان داس کو کون نہیں جانتا۔ جس نے ''البیلا'' جیسی کامیاب فلم بنائی۔ جو ایک اسٹوڈیو' بنگلے اور گاڑیوں کا مالک تھا۔ اپنے آخری ایام میں وہ بطور ایکسٹرا سو روپیہ یومیہ پر کام کرتا تھا۔ اور جھونپڑ پٹی کی ایک کھولی میں دردناک موت سے دوچار ہوا۔

★ اپنے وقت کا مشہور ترین ہیرو پردیپ کمار جس کی فلم ''انارکلی' اور ناگن'' نے کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کئے۔ لیکن وہ اپنی بے پناہ کامیابی کو ہضم نہیں کر پایا اور فلم ساز بن کر' پولس' اور نہ جانے کتنی فلمیں بنائیں۔ حتیٰ کہ قلاش ہو گیا اور چھوٹے چھوٹے رول کرتا نظر آیا۔ اور جب وہ گمنامی کی موت سے ہمکنار ہوا تو اس کی میت میں کوئی نامی چہرہ نہیں تھا۔ (راہی بھارتی۔ ماہنامہ' شاندار جون ۲۰۰۵ء)۔

★ مشہور گلوکار سی ایچ آتما ۱۹۵۱ء میں نیروبی جا کر ملک سے باہر پروگرام پیش کرنے والے وہ پہلے ہندوستانی گلوکار تھے۔

★ فلم ساز ہدایت کار اسمٰعیل مرچنٹ امریکی ہدایت کار جیمس ایوری اور ادیبہ Ruth Prawn jhabvala کے ساتھ ایسا اتحاد قائم کیا ان سے چالیس سالہ رفاقت کی بدولت ۴۰ فلمیں بنائیں ان میں سے ۳۱ آسکر ایوارڈ کے لئے

نامزد کی گئیں۔جن میں سے ۶ کو آسکر ایوارڈ بھی ملا اس مثلث نے کئی کامیاب فلمیں دیں۔ان کی پہلی ہی فلم The creation of woman آسکر کے لئے نامزد ہوئی تھی۔

★ اسمٰعیل مرچنٹ ایسے واحد فلم ساز تھے جنہیں ادب کا نوبل انعام پانے والے دی ایس نائپول نے اس کی اجازت دی تھی کہ ان کی کتاب کو بنیاد بنا کر اسمٰعیل فلم بنائیں۔

★ اسمٰعیل مرچنٹ اچھے کھانے کے شوقین تھے۔کھانے خود پکاتے تھے۔وہ کوئی پیدائشی خانساما نہیں تھے۔کھانا پکانے میں ان کی دلچسپی کی بنا امریکہ میں پڑی امریکی دوستوں کی ضیافت کی خاطر انہوں نے باورچی خانے میں قدم رکھا۔اور پھر گویا پکوان کی خوشبوؤں اور برتنوں کے تصادم کی موسیقی کے گرویدہ ہوگئے فلم سازی کے شانہ بشانہ یہ شوق بھی پروان چڑھتا رہا جسے جلا ملنے کا موقع فرانس اوراٹلی کے قیام کے دوران میّسر آیا۔وہ دوسرے کھانوں کے علاوہ بھنا گوشت، بریانی، ادرک والے چیلی کباب اور مسور کی دال لذیذ بنایا کرتے تھے۔وہ اپنے دوست احباب میں فلم ساز، اور خانسامہ دونوں حیثیت سے مشہور تھے۔انہوں نے اس موضوع پر چند کتابیں بھی تصنیف کیں تاکہ لوگ باورچی خانے کے ان کے تجربے سے استفادہ کریں۔ان کی تصانیف کے نام یہ ہیں۔

1. Ismail,Ismail Merchants India Cuisine.
2. Ismail Merchant's Merchant Florenc.
3. Ismail Merchant's Paris.
4. Passionate Meals.
5. Filmig and Feasting in France.

★ دلیپ کمار ۱۹۵۰ء کی عشرے میں ستار اور وائلن بھی بجایا کرتے تھے۔فلم 'کوہِ نور' میں دلیپ کمار نے فلم میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے استاد عبدالحلیم جعفر خاں سے ایک سال تک ستار بجانے کی تعلیم حاصل کی اور پھر فلم 'کوہِ نور' میں گانا 'مدھوبن میں رادھیکا ناچے رے'' میں ستار بجایا۔دلیپ کمار کو موسیقی سے بہت لگاؤ ہے۔کئی بار دلیپ کمار نے نجی محفل میں نیم کلاسیکی غزلیں بھی سنائی ہیں۔۱۹۷۰ء کے عشرے میں تنزانیہ کی دارالحکومت' دارالسلام' میں لوگوں نے رات بھر دلیپ صاحب سے ان کی پسندیدہ غزلیں سنی ہیں۔اس محفل میں چند مخصوص مہمان ہی شریک تھے۔

★ وی شانتارام نے مراٹھی میں ''بول پٹ'' نامی پہلی بولتی فلم بنائی۔

★ وی شانتارام نے فلم سازی سے لے کر فلم تکنک تک کئی انقلابی قدم اٹھائے انہوں نے فلموں کو نہ صرف تھیٹر کے اثرات سے نکالا بلکہ ایک نئے اور بہترین میڈیم کی حیثیت سے بھی پیش کی۔جدید تکنک کے ذریعہ وی شانتارام نے ہی کرین اور ٹرالی کی مدد سے پہلی بار شاٹ لینے کا سلسلہ شروع کیا۔بیک گراؤنڈ میوزک کا استعمال شروع ہوا اور رات کے مناظر دن میں بھی فلمانے کا آغاز کیا گیا۔وی شانتارام چونکہ فلم کی تکنک سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے۔اس لئے چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا کام انجام دیئے۔انہیں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ یہ ساری تکنکی ترقیاں صرف وی شانتارام کے حصّے میں آئیں۔وی شانتارام نے ۶۷ برسوں تک ہندستانی فلم صنعت کی خدمت کی اس مدت کے دوران انہوں نے ۹۶ فلمیں بنائیں۔جن میں ۵۰ فیچر فلمیں اور ۱۱ ڈاکیومنٹری فلمیں بھی شامل ہیں۔

★ تری پورہ اسٹیٹ کا راج کمار جیسے ٹھاٹھ باٹھ چھوڑ کر موسیقار ایس ڈی برمن باؤل گلوکاروں کے پیچھے بھاگتے پھرتے اور گھنٹوں ان کے گیت دل ودماغ پر چھاتا چلا جاتا اور آپ اسی میں کھوئے رہتے۔آپ کے دوست دو تھے رامائن کا پاٹھ کرنے والا نوکر مادھو اور لوک سنگیت کی کوک گلے میں لئے دوسرا

نوکر۔ وہ نوکر نہیں دراصل ان کے گرو تھے۔

★ اسکول کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایس ڈی برمن کو ملایا سے دور میلے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ٹرین میں بغیر ٹکٹ لئے سوار ہوگئے۔ لوٹتے وقت ٹی ٹی کے ذریعہ دبوچ لئے گئے اور سب کے ساتھ برمن دادا بھی ایک اندھیری کوٹھری میں بند کردیئے گئے۔ ڈر سے رونے لگے کہ راجہ کا لڑکا بغیر ٹکٹ پکڑا گیا۔ اس کے دوست موہت نے برمن کو ایک ترکیب بتائی کہ وہ بھٹیالی کی بھاول جیسا کچھ گانا سنادے تو بات بن سکتی ہے۔ بس سچن نے روتے روتے گانا شروع کردیا تو اسی وقت دروازہ کھلا۔ اسٹیشن ماسٹر کی بزرگ والدہ آئیں برمن کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ کچھ ہی دیر بعد ہاتھوں میں لڈو لئے سب کے سب دوست کھلکھلاتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیئے۔

★ مدھوبالا کو فلم انڈیا کے ایڈیٹر بابوراؤ پٹیل نے بجا طور پر ہندوستانی اسکرین کی وینس (Venus) کہا تھا۔ اس اعتبار سے وہ صحیح معنوں میں سائرہ بانو کی ماں پری چہرہ نسیم بانو کی حقیقی جانشین تھی۔ جنہیں راجہ مہدی علی خاں نے اپنی کتاب ''فلمی کلیاں'' میں جو ۱۹۴۴ء میں آئی تھی۔ انہیں انتہائی حسین ہندوستانی فلم ایکٹریس کہا ہے۔

★ امیتابھ بچن کے چاہنے والوں نے ان کی تصویر کلکتہ کے ایک مندر میں لگا کر پوجا شروع کردی تھی۔ پٹنہ شہر میں ان کے چاہنے والوں نے کلب کے ممبروں کے ذریعہ ایک چھوٹی سی کتاب شائع کی ہے جس میں بگ بی کو ایک دیوتا کے مقابل پیش کیا ہے۔ جب امیتابھ بچن کو معلوم ہوا تو انہوں نے اپنی ناراضگی ظاہر کی اور کہا کہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہرگز شائع نہ کیا جائے اور پہلے ایڈیشن کی جو کتاب موجود ہوا نہیں ضائع کردیا جائے۔

★ مینا کماری کے انتقال کے وقت سنٹ الزبتھ نرسنگ ہوم کے کمرہ نمبر ۲۶ میں بالکل

تنہا تھیں۔ حتیٰ کہ اسپتال کا بل ادا کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے معالجین (ڈاکٹرس وغیرہ) نے بل ادا کیا تھا۔ درد کی داستان لکھنے والی عظیم اداکارہ کا دردناک انجام تھا۔

★ سہراب مودی نے ۱۹۳۰ء میں ایک فلم ''بھروسہ'' بنائی تھی۔ جس میں سب سے پہلے انہوں نے ہی فلموں میں دو جسموں کے ملن کی کہانی کو چھیڑا تھا۔

جن دنوں ڈائرکٹر کے آصف کی شاہکار فلم 'مغلِ اعظم' بن رہی تھی۔ ان دنوں دنیائے اردو کے ممتاز اور باکمال شاعر جگر مرادآبادی سے کے آصف صاحب گیت لکھوانا یا ان کی غزلیں فلم میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جگر صاحب نے صاف انکار کردیا تھا۔

★ مشہور اداکار مدھوبالا کا اصل نام ممتاز جہاں بیگم تھا۔ لیکن ممتاز کا فلمی نام 'مدھوبالا' مشہور اداکارہ دیویکا رانی نے دیا تھا۔ مشہور فلمی شخصیت بابوراؤ پٹیل نے مدھوبالا کو ہندوستانی فلم انڈسٹری کی ''زہرہ دیوی'' کا خطاب دیا تھا۔

★ مشہور گلوکار کے ایل سہگل نے گانے کی ابتدائی تعلیم ایک پیر صوفی یوسف صاحب سے لی نوکری کی خاطر سہگل نے جالندھر سے کلکتہ کا رخ کیا جہاں انھیں ماہانہ اسّی روپیہ تنخواہ پر ٹائپ رائٹر درست کرنے کی نوکری کرنی پڑی۔ سہگل نے اپنی آواز کبھی کسی دوسرے فنکار کے لئے نہیں دی۔ ان کے گائے ہوئے تمام نغمے یا تو ان پر فلمائے گئے یا پھر پس منظر میں پیش ہوئے۔ شراب نوشی نے سہگل کو اپنے دامن میں اس قدر گرفتار کر رکھا تھا کہ بغیر شراب پیۓ وہ کوئی نغمہ کی صدا بندی نہیں کرسکتے تھے۔ لیکن موسیقار اعظم نوشاد نے اس عظیم فنکار سے فلم ''شاہ جہاں'' کا نغمہ ''جب دل ہی ٹوٹ گیا تو ہم جی کے کیا کریں گے'' بغیر مئے نوشی کے ریکارڈ کرایا تھا۔

★ کمال امروہوی اور مینا کماری کی شادی میں کمال امروہوی کا سکریٹری اور معتمد خاص باقر علی بھی موجود تھا باقر علی نے وکیل کی حیثیت سے اور قاضی مرگھے کے دو بیٹوں نے گواہ بھی موجود تھا باقر علی نے وکیل

کی حیثیت سے اور قاضی مرگھے کے دو بیٹوں نے گواہ کے طور پر اپنی حاضری درج کی۔ کمال امروہوی چونکہ شیعہ عقیدے کے تھے اور مینا کماری سنی۔ چنانچہ پہلے سنی اور بعدازاں شیعہ عقیدے کے مطابق دونوں کا نکاح قاضی مرگھے نے پڑھادیا۔ ان کی شادی ۱۵ر فروری ۱۹۵۲ء کو ہوئی۔ یہ شادی کا کافی عرصے تک پوشیدہ رہی۔

- ★ ہندوستانی فلم کے موجد دادا صاحب پھالکے' راج کپور' دینا ناتھ منگیشکر کے نام سے فلم ایوارڈس کی شروعات ہوئی اور یہ ایوارڈ آج تک تقسیم کئے جاتے ہیں جو کافی اہمیت کے حامل ہیں۔
- ★ اداکارہ بندیا گوسوامی کے والد متھرا کے مہاراج تھے۔
- ★ سب سے پہلے دادا صاحب پھالکے کے نام سے ممبئی میں شکیل بدایوانی کے نام سے بدایوان میں ''ساحر لدھیانوی'' کے نام سے لدھیانہ میں اور نرگس کے نام سے ممبئی میں سڑکوں کے نام رکھے گئے۔
- ★ متحدہ ہندوستان میں ممبئی میں سب سے پہلے فلم کا مرکز بنا تھا اس کے بعد کلکتہ اور مدراس میں فلم سازی کا آغاز ہوا۔
- ★ سیٹھ سکھ لال کرنانی نے ۱۹۳۵ء میں شیلا عرف ''پنڈی کڑی'' کے نام سے برصغیر کی پہلی پنجابی فلم 'اندراپوری' بنائی تھی۔
- ★ نادرہ نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ دلیپ کمار نے فلموں میں پارس تھیٹر کی لاؤڈ سین کی جگہ آسان اداکاری اور ''انڈر پلے (Under play) کا آغاز کیا۔
- ★ لاہور میں پران کے گھر کتے پلے ہوئے تھے۔ اور ایک تانگا بھی تھا۔ لال رنگ کا تانگا اور سلیٹی رنگ کا گھوڑا۔ وہ اکثر اس تانگے میں لاہور کی سڑکوں پر تفریح کیا کرتے تھے۔ جب وہ تانگہ ایک حادثے میں جل گیا تو لوگوں نے دیکھا وہ سنگ دل شخص جو پردے پر دوسروں کو رُلا کر قہقیہ لگاتا تھا کئی دنوں تک رویا تھا۔
- ★ جب دلیپ کمار اور وجنتی مالا نے فلم 'سنگھرش' میں کام کیا تب ان کے درمیان بول

چال تک ختم ہو چکی تھی۔ تاہم اس وقت تک وہ دونوں اداکاری کے فن میں اتنے ماہر ہو چکے تھے کہ آپ آج بھی 'سنگھرش' کے رومانوی مناظر دیکھیں تو آپ کو یقین نہیں آئے کہ فلم بند کرواتے وقت ان دونوں کے درمیان کوئی جذباتی اور قلبی تعلق نہیں تھا۔ فلم کی تیاری کے دوران وہ ایک دوسرے سے دور بیٹھتے تھے۔ اور صرف ریہرسل یا شاٹ' ٹیک' کروانے کے لئے قریب آتے اور اس کے بعد پھر مختلف گوشوں میں جا کر بیٹھ جاتے۔ اگر ان کے علاوہ کوئی اور شخص نہ بھی ہوتا جب وہ آپس میں بات نہیں کرتے تھے اور ناراض بچوں کی طرح منھ پھلائے رکھتے تھے۔ ان کی خفگی کے باوجود تماشائیوں کو دلیپ اور وجنتی مالا کے رومانوی سین نہایت خوشگوار محسوس ہوئے تھے البتہ آخری مناظر میں یہ تاثر دھیما پڑ گیا تھا۔

- ★ فلم 'آن' کے ایک منظر میں نادرہ نے جس گھوڑے پر سواری کی اس کے بارے میں انھیں علم نہیں تھا کہ یہ وہی گھوڑا ہے جس نے اداکار شیام کی ایک ہفتہ قبل ہی جان لے لی تھی۔ اس گھوڑے پر نادرہ کے سوار ہونے سے ایک منٹ قبل محبوب خاں نے اس بات کا ذکر نادرہ سے کیا تھا۔ وہ گھوڑ سواری نہیں جانتی تھی۔ چنانچہ وہ گر پڑیں بعد میں محبوب خاں کی بیوی ان کی نگہداشت' تیمارداری کرتی رہیں۔
- ★ چالیس برسوں کے طویل انتظار کے بعد ڈائرکٹر کے آصف کی شاہکار فلم ''مغلِ اعظم'' پاکستان میں لاہور کے گلستان سنیما میں بروز اتوار ۲۳ر اپریل ۲۰۰۶ء کو ریلیز کی گئی۔
- ★ بنگلہ میں پہلی بولتی فلم ۱۹۳۱ء میں ''پریم انکوراتارتھی'' نے دینا پونا کے نام سے بنائی۔
- ★ ہندوستانی سنیما کی تاریخ میں ہدایت کار ستیہ جیت رے کی فلم ''پاتھر پنچالی'' وہ پہلی فلم ہے جسے ۱۹۵۵ء میں دنیا کا سب سے بڑا فلم ایوارڈ ''آسکر ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔
- ★ گیت ''جب دل ہی ٹوٹ گیا'' کا گلوکار سہگل کے ذہن پر اتنا اثر پڑا تھا کہ انہوں نے اپنی موت پر نوشاد کی موجودگی میں یہ گانا پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔
- ★ فلم 'مدرانڈیا' میں ایک دن فلم کے ایک منظر کی فلم بندی کے دوران سیٹ پر آگ لگ

گئی آگ کی شدت نے سیٹ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔نرگس آگ کے شعلوں میں گھر گئی کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ نرگس کو ان شعلوں سے اپنی جان پر کھیل کر نکال لاتا مگر سنیل دت نے اپنی جان کی پروانہ کی اور آگ میں کود کر نرگس کو بچانے میں کامیاب ہو گئے سنیل دت کے زخم نرگس کے لئے وفا کا پیغام بن گئے جو محبت میں تبدیل ہو گئی۔سنیل دت کی نرملا بن کر ان کی شریکِ حیات بن گئیں۔

★ ۲۰۰۶ء کے مئی میں ۴۲ برسوں کے بعد پاکستان میں بالی ووڈ کی فلموں کی نمائش ہوئی اس سے قبل صدر جنرل ضیاء الحق نے ۱۹۸۱ء میں مشہور اداکار، ہدایت کار اور فلم ساز شیخ مختار کی فلم 'نور جہاں' کی نمائش کرائی تھی اور ۱۹۸۲ء میں امریکہ میں مقیم پاکستانی ڈاکٹر رفیق خاں کی فلم ''کشش'' کی نمائش کی اجازت دی گئی تھی۔۱۹۶۵ء کے بعد یہ پہلا موقع تھا۔جب بیک وقت چار غیر ملکی فلموں کی نمائش پاکستان میں ہوئی۔

★ ۱۹۳۴ء میں ہمانشو رائے نے اپنی اداکارہ بیوی دیویکا رانی کے اشتراک سے ممبئی کے لاڈ علاقے میں بامبے ٹاکیز کی بنیاد رکھی تو اس کمپنی کی فلموں کے لئے سرسوتی دیوی کو موسیقار کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا گیا۔فلم انڈسٹری کی یہ سب سے پہلی موسیقار خاتون تھیں۔

★ اوم پرکاش بہت اچھی اردو جانتے تھے۔وہ خود بھی بہت اچھے رائٹر تھے۔اردو میگزین میں ان کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔وہ نغمہ نگار بھی تھے۔اور اپنے نغموں کو کمپوز کر کے خود ہی گایا کرتے تھے۔انھیں بہترین کہانیاں ازبر تھیں اور اکثر سنایا کرتے تھے۔کلاسیکل موسیقی پسند کرتے تھے۔ہارمونیم اور طبلہ بجاتے تھے۔اور خود بھی بہت اچھا گاتے تھے۔اسپورٹس سے انھیں دلچسپی تھی۔فرصت کے اوقات میں کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال میچ بہت شوق سے دیکھتے تھے۔فلمیں بھی شوق سے دیکھتے تھے۔

★ بمل رائے کی فلم 'نوکری' میں گیت کار شیلندر اور پریم دھون نے بھی اداکاری کی تھی۔

★ فلم 'باپ بیٹی' پہلی فلم تھی جو Love interest سے محروم باپ بیٹی کے جذباتی رشتوں پر پوری پاکیزگی سے تخلیق کی گئی تھی۔

★ فلم ''دو بیگھہ زمین'' کے ڈائرکٹر بمل رائے تھے۔اس فلم میں رکشہ چلانے کے لئے بلراج ساہنی نے رکشہ کھینچنے کی مشق کلکتہ کی سڑکوں پر کی تھی۔بمل رائے نے کسی کاسٹیوم ڈیزائنر کی خدمات حاصل نہیں کی تھی۔وہ چور بازار سے سین کی ڈمانڈ کے مطابق کپڑے خریدتے، انہیں جگہ جگہ سے پھاڑ کر ضرورت کے مطابق پیوند لگاتے اور پھر اداکاروں کو پہنا کر سین شوٹ کرتے۔اس طرح آزادی کے بعد ہندوستان کی یہ اوریجنل فلم تیار ہوئی۔جسے نہ صرف ۱۹۵۳ء کی بہترین فلم تسلیم کیا گیا بلکہ فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔یہ وہ پہلی فلم تھی جسے کارلووِیری کے فلمی میلے میں بھی بھیجا گیا تھا۔

★ لندن کی ایک بین الاقوامی تنظیم کی جانب سے امیتابھ بچن کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔امیتابھ بچن وہ پہلے ہندوستانی ایکٹر ہیں۔جنھیں اس پروقار ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔اس سے قبل جنوبی افریقہ کے سابق صدر ڈاکٹر نیلسن منڈیلا اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کوفی عنان اور امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر کو یہ اعزاز مل چکا ہے۔

★ کلکتہ کے فلم ساز ادارہ نیوتھیٹرز نے ہندوستانی سنیما کو دیوکی بوس، پی سی بروا اور نتن بوس یہ تین تابناک ہیرے عطا کئے۔

★ نتن بوس نے ۱۹۲۱ء میں کارنیشن اور چورکا نتا نامی خاموش فلموں کی فوٹوگرافی کی اسی سال انہوں نے پوری کے رتھ یاترا کے زیرعنوان نیوز ریل تیار کی اس کام کے لئے نتن بوس کو ایم رپن ڈولف ہرسٹ کی انٹرنیشنل نیوز ریل کارپوریشن سے ۱۰۳ ڈالر ملے۔

★ ہندوستانی فلموں میں پلے بیک موسیقی اور گانوں کی پہلے سے ریکارڈنگ کا سلسلہ نتن بوس نے شروع کیا۔

★ آر سی بورال نے ۱۹۳۵ء میں نیو تھیٹرز کی فلم دھوپ چھاؤں' میں پہلی بار بیک گلوکاری کا سلسلہ شروع کیا۔

★ اولین پلے بیک گلوکار کہلائے جانے کا شرف کے سی ڈے' اور ان کے ساتھیوں کو فلم 'دھوپ چھاؤں' سے حاصل ہوا۔

★ سہراب مودی کی فلم 'مرزا غالب' قومی اعزاز حاصل کرنے والی پہلی فلم تھی جسے ۱۹۵۴ء میں صدر جمہوریہ کے طلائی تمغہ سے سرفراز کیا گیا۔

★ جے راج تحریک آزادی کی مجاہدہ بلبل ہندسروجنی نائیڈو کے بھانجے ہیں۔

★ ایل وی پرشاد کو جنوبی ہند کی فلمی دنیا کا مغلِ اعظم کہا جاتا ہے۔

★ ایل وی پرشاد نے اپنی لیبارٹری میں Three Dimension فلموں کی پروسیسنگ کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا جو ایک کارنامہ سے کم نہیں۔

★ وی شانتا رام نے فلم''دنیا نہ مانے'' میں پہلی بار پوری فلم میں بیک گراؤنڈ موسیقی کے بجائے صوتی اثرات کا استعمال کیا۔

★ وی شانتا رام نے فلم 'پڑوسی' کے آخری منظر میں دریا پر باندھ کا شاٹ ایک چھوٹی سی میز پر فلمایا جو ایک کارنامہ ہے۔

★ فلموں کی شوٹنگ کے لئے کرین اورٹرالی سسٹم وی شانتا رام نے شروع کیا۔ اور اس کے ساتھ دن کے وقت رات کے مناظر فلمانے کا سہرا بھی شانتا رام ہی کے سر بندھتا ہے۔

★ وی شانتا رام نے اپنی اداکاری کو فطری بنانے کے لئے ڈپلی کیٹ کا استعمال نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ فلم 'دو آنکھیں بارہ ہاتھ' میں جیلر کا کردار ادا کرتے وقت آخر میں سانڈ سے مڈبھیڑ کے دوران انھیں اپنی آنکھوں سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا خطرہ مول لینا پڑا تھا۔ چھ ماہ تک اسپتال میں گذارا۔

★ وی شانتا رام نے ۱۹۳۳ء میں ہندوستانی سنیما کو پہلی رنگین فلم''سیر یندھری'' عطا کی

اس فلم کا رنگین پرنٹ برلسن میں تیار ہوا تھا۔

★ بی ناگی ریڈی کو بھی جنوبی ہند کا موؤی مغل کہا جاتا ہے۔

★ پرتھوی راج کپور اور ان کے بیٹے راج کپور فلم انڈسٹری کے واحد باپ بیٹے ہیں جنہیں داداصاحب پھالکے جیسا پُر وقار اعزاز پہلی مرتبہ عطا کیا گیا۔

★ اشوک کمار کا محبوب مشغلہ ہومیو پیتھک کی پریکٹس تھی۔ ایک زمانہ تھا جب انھیں جادوگری کا بھی شوق چڑھا تھا۔ اور وہ ممتاز جادوگر پی سی سرکار کے شاگرد بھی رہے۔

★ اداکار گلوکار کشور کمار اپنے گھر سے باہر''یہ ایک پاگل خانہ ہے'' لکھا ہوا بورڈ لگایا تھا۔ وہ اپنے گھر کے پچھواڑے لگے پیڑوں کے ساتھ باتیں کرتے تھے۔ ان کی ذاتی زندگی کافی المناک تھی۔

★ لتا منگیشکر نے پہلی مرتبہ ۹ رستمبر ۱۹۳۹ء کو نوتن سنگیت میں اسٹیج پر کھڑے ہو کر گانا گایا تھا۔

★ لتا کی آواز میں بلا کا سوز ہے۔ غالبًا اسی لئے ۱۹۶۲ء میں''اے میرے وطن کے لوگوں۔۔۔'' قومی نغمہ سن کر جواہر لال نہرو کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ انہوں نے لتا سے مخاطب ہو کر کہا تھا''بیٹی! تو نے مجھے رُلا دیا۔''

★ ۱۹۶۹ء میں جب دادا صاحب پھالکے کی جنم صدی منائی گئی تو اس موقع پر ایک خصوصی ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا۔

★ پہلا چائلڈ آرٹسٹ ہیرو اور ہیروئن کو سنیما کی دنیا سے روشناس کرانے کا سہرا بھی دادا صاحب پھالکے کے سر بندھا انہوں نے یہ کردار اپنی پہلی فلم ''راجہ ہریش چندر'' میں پیش کیا۔

★ دادا صاحب پھالکے نے فلم 'کالیا مردن' میں اپنی بیٹی مندا کنی کو کرشن کے روپ میں اور کمل کو بھسما سُر میں ہیروئن کے طور پر پیش کیا۔

★ ۱۹۲۲ء میں آردیشر ایرانی نے اسٹار فلم کمپنی قائم کی انہوں نے اس فلم ساز

ادا رے کے تحت اپنی پہلی فلم ''ویرا بھیمنو'' پیش کی یہ فلم صرف دس ہزار روپے کی لاگت سے تیار ہوئی۔انہوں نے اپنی زندگی میں ۱۵۱ فلمیں بنائیں ۔ان میں ۱۳۰ خاموش اور باقی متکلم فلمیں تھیں ۔

★ ہندوستانی سنیما کے پہلے مکالمہ نگار ڈیوڈ یوسف آردیشرایرانی کی دین ہے۔

★ خاں بہادر آردیشر ایرانی نے ہندوستانی سنیما کی ۱۹۳۶ء میں پہلی رنگین فلم ''کسان کنیا'' تیار کی تھی۔

★ ۱۹۳۲ء میں آردیشرایرانی کوحکومت برطانیہ سے خاں بہادر کا خطاب عطا کیا گیا۔

★ گورو دیورابندرناتھ ٹیگور دیویکارانی کے پرنانا تھے۔

★ دیویکارانی کی ۱۹۳۳ء میں انگریزی زبان میں تیار ہونے والی فلم 'کرما' ریلیز ہوئی۔ اس فلم نے پورے یورپ میں دھوم مچادی۔

★ کلکتہ کا چترا سنیما بی این سرکار نے ہی تعمیر کرایا۔جس کا افتتاح نیتا جی سبھاش چندر بوس نے کیا تھا۔

★ قوم کو بندے ماترم کی دُھن موسیقار پنکج ملک کی دین ہے۔

★ سلوچنا ہندوستانی سنیما کی پہلی ایکٹریس تھیں جنہوں نے کار خریدی۔

★ فلم ''لوا مورٹل'' میں فلم ساز ہدایت کار بابوراؤ پینٹر نے سلوچنا کو ۳۵ دن کا معاوضہ پانچ ہزار روپئے دیا تھا۔جوان دنوں ایک ریکارڈ تھا۔

★ دھیرن گنگو نے ایک کتاب ''آمردیش'' لکھی اس کتاب کی وجہ سے انھیں کلکتہ کے سی آئی ڈی ڈپارٹمنٹ میں جاسوسوں کو بھیس بدلنے کی تعلیم وتربیت کے لئے تعینات کر دیا گیا۔آزادی کے بعد بھی محکمہ پولس نے ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا۔

★ غیرمتکلم فلموں کے مقبول دور میں سب سے پہلے ۱۹۲۷ء گریٹ ایسٹرن کارپوریشن (لاہور) پنجاب نے انارکلی ڈرامے کو بنیاد بنا کر انگریزی نائٹل کے ساتھ'' Love of a great Mughal

Prince'' کو اس دور کی سب سے بڑی اور بے حد کثیر سرمائے سے اس فلم کو خاموش زبان میں فلمایا تھا۔شیخو پورہ (لاہور) کے سلطان نے اس فلم کی تکمیل میں ملبوسات اور زیورات کی فراہمی کے ساتھ ذاتی دلچسپی لی تھی اس دور کے محکمہ آثار قدیمہ نے بھی محلات' قلعۓ اور باغات کے علاوہ دیگر تاریخی عمارات میں شوٹنگ کرنے کی خصوصی اجازت دی تھی۔اس فلم کی تکمیل میں ایک سال کا عرصہ لگا تھا۔

★ امپیریل فلم کمپنی (بمبئی) کے مالک خان بہادر آردیشرایرانی تھے جو بیحد موقع شناس اورتجارتی ذہن کے مالک تھے۔آردیشر ایرانی نے بھی ''انارکلی'' کے رومان اور مغل شہنشاہ کے دبدبے کوفلم کا روپ دینے میں دیر نہیں کی۔کاپی رائٹ ایکٹ سے فلم انڈسٹری ناواقف تھی۔''انارکلی'' کے اوریجنل ٹائٹل کے ساتھ آردیشرایرانی نے کامل ایک ہفتے کی ریکارڈ شوٹنگ میں فلم مکمل کرلی۔اور بلاتاخیر عوام کے سامنے پیش کردی۔فلم زبردست کامیاب ہوئی عوام نے پہلی بار انارکلی اورشہزادہ سلیم کی مظلوم محبت اور شہنشاہ اکبر کے جاہ وجلال کوفلم کے پردے پر متحرک دیکھا تو ان کو حیرت زدہ ہونا لازمی تھا۔چند ماہ بعد جب ایسٹرن فلم کارپوریشن کی فلم Love of a great Mughal Prince'' ریلیز ہوئی تو عوام نے فلم کو ''انارکلی'' کا چربہ مان کر ٹھکرادیا۔

★ فلمساز آردیشرایرانی کی فلم ''انارکلی'' میں سلوچنا' ذلّو' طبی موریہ' غلام احمد' آسکر جی' اور کلکتہ کی اینگلوانڈین شاعرہ روبی مئیر نے انارکلی کا رول ادا کیا تھا۔یہ فلم خاموش ضرور تھی مگر اس نے کامیابی کی تاریخ لکھ دی تھی۔

★ ہدایت کار آردیشرایرانی نے اپنی خاموش فلم ''انارکلی'' کو ۱۹۳۴ء میں 'انارکلی' کو زبان دے دی سید امتیاز علی تاج نے اس فلم کا اسکرپٹ لکھا تھا۔اس فلم کو مولانا شوکت علی نے بھی دیکھا تھا۔اورتعریف کی تھی اس فلم کو آگرہ' فتح پورسیکری اور شاہانہ مغلیہ کے قلعوں' باغات اورمحلات میں فلمایا گیا تھا۔

اس فلم کے ستاروں میں ملکہ حسن سلوچنا، ملکۂ جذبات ذلّو، بل موریہ، غلام محمد، آسکر جی، بابا ویاس کے علاوہ موسیقار آنا صاحب مائنکر تھے۔ جب کہ اس فلم میں غالب کی ایک غزل ''نکتہ چیں ہے غم دل'' بھی شامل تھی۔ بنارس کی مشہور ملکۂ موسیقی راجیشوری نے فلم کو اپنی آواز سے سجایا تھا۔

★ یہ تذکرہ بھی باعثِ دلچسپ ہے کہ پہلی خاموش فلم ''انارکلی'' (۱۹۲۷ء) اور بولتی فلم ''انارکلی'' (۱۹۳۵ء) میں ڈلو بائی نے وہی کردار نبھائے تھے۔ جو فلمستان کی فلم ''انارکلی'' (۱۹۵۳ء) میں کلدیپ کور (دل آرام) بائی اور ''مغلِ اعظم'' (۱۹۶۰ء) میں نگار سلطانہ نے بہار کا کردار ادا کئے تھے۔ مغلِ اعظم میں ڈلو بائی نے انارکلی کی بے کس اور مظلوم ماں کا کردار ادا کیا تھا۔

★ یہ بھی دلچسپ حقیقت ہے کہ ایسٹرن فلم کارپوریشن لاہور نے اپنی سب سے بڑے بجٹ اور عالیشان فلم Love Of a great Mughal prince کو ایک سال سے زائد عرصہ میں مکمل کیا تھا۔ مگر امپیرل کمپنی نے صرف ایک ہفتے میں ''انارکلی'' بنا کر پیش کر دی تھی۔ اسی طرح مغلِ اعظم کی تکمیل ۱۴ سال میں ہوئی جب کہ فلمستان نے اپنی فلم ''انارکلی'' کو بہت کم وقت میں بنا کر پیش کر دیا تھا۔

★ فلم ''پکار'' کو منوج کمار نے سابق وزیراعظم لال بہادر شاستری جی کے ''جے جوان جے کسان'' کے نعرہ سے متاثر ہو کر فلمایا تھا۔

★ مشہور فلم اسٹار اشوک کمار جس نے ۶۰ سال فلم انڈسٹری میں گذارے تقریباً چار سو فلموں میں کام کیا۔ انہوں نے شوبھا بنرجی سے شادی کی تھی۔ ان سے اشوک کمار کی تین لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ انہوں نے اپنی بیوی بچوں سے بہت پیار کیا۔ لیکن انتقال سے قبل وہ بہت تنہا ہو چکے تھے۔ ان کی زندگی ویران ہو چکی تھی۔ بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ بچے الگ ہو چکے تھے۔ تنہائی مٹانے کے لئے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہر

روز وسکی پیا کرتے تھے۔ اپنے بڑے سے مکان میں وہ تنہا رہتے تھے۔ جس میں سات بیڈ روم تھے اور ہر روز وہ الگ کمرے میں سویا کرتے تھے۔ ان کے پاس بہت دولت تھی۔ وہ باقی زندگی آرام سے گذار سکتے تھے۔ لیکن آخری لمحات میں انہیں صرف موت کا انتظار تھا۔

★ نتن بوس نے کنندن لال سہگل کو یہ کہہ کر مایوس کر دیا تھا کہ ''اگر میں نے اپنے کیمرے کا رخ سہگل کی طرف کیا تو اس کا لینس (Lence) اس کی بھدّی شکل کو برداشت نہیں کر پائے گا اور ٹوٹ جائے گا۔

★ مجروح سلطان پوری لکھتے ہیں کہ نوشاد صاحب یقیناً ایک صاحبِ طرز فنکار ہیں۔ انہوں نے بڑی ریاضتوں اور مشقتوں کے بعد یہ فن حاصل کیا ہے۔ فن ان کے نزدیک عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ جب بھی کسی دھن کی تیاری کے لئے بیٹھتے تو پہلے باوضو ہو کر دو رکعت نفل نماز ادا کر لیتے۔ تبھی ان کے گیتوں میں نفاست اور پاکیزگی کے اثرات محسوس ہوتے ہیں۔ جو کانوں کے ذریعہ دل کی گہرائیوں میں اتر کر روح کو مدہوش کر دیتے ہیں جیسے کوئی پاکیزہ شراب پی لی ہو۔

★ نرگس راج کپور کے خاندان میں شامل ہونے کے لئے کسی نہ کسی بہانے سے اس کے گھر پہنچ جایا کرتی تھی۔ دیوالی کے موقع پر اس نے کپور فیملی کے گھر والوں میں جذب ہو کر جشن منایا۔ راج کو خوش کرنے کے لئے اس نے لکشمی پوجا بھی کرنی شروع کر دی۔ وہ نجومیوں سے پوچھتی پھرتی کہ وہ راج کو اپنا سکے گی۔ گھر میں بھائیوں کی مار پیٹ اور راج کپور کی جھڑکیاں اور حالات کی مایوسیوں نے اسے بیمار کرنا شروع کر دیا۔ راج کپور کے غصّے اور برتاؤ سے دل برداشتہ ہو کر اس نے خودکشی کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن سمندر کے ساحل پر اس کے بھائی نے بچالیا۔ وہ کبھی کبھی فلم بندیوں کے دوران بے ہوش ہو کر گر جایا کرتی تھی۔

★ سنیل دت فلم اداکار، فلم ساز، اور ہدایت کار کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی اہم

کردار ادا کیا۔سنیل دت نے نرگس کو بے پناہ پیار دیا۔اس کی ہر خواہش کا احترام کیا۔نرگس جب کینسر کے موذی مرض میں گرفتار ہوئی تو سنیل دت نے اپنے اوپر آرام حرام کرلیا۔نرگس کی زندگی بچانے کے لئے کوئی جتن ایسا نہ تھا جو اس نے نہیں کیا وہ مایوس ہوکر رات کے اندھیرے میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا کرتا تھا۔انہوں نے آخری وقت تک نرگس کی تیمارداری کی حتیٰ کے علاج کے لئے نرگس کو یورپ بھی لے گئے۔لیکن بچ نہ سکی۔

- ☆ گیت کار حسرت جے پوری کافی دلچسپ اور رومانٹک آدمی تھے۔تعجب کی بات ہے کہ وہ اسی وقت اچھی شاعری اور گیت لکھ پاتے تھے۔جب سامنے کوئی حسینہ بیٹھی ہو۔ان کا کہنا تھا کہ اچھی شاعری کے لئے خوبصورت حسینہ کا ہونا ضروری ہے۔انہوں نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ جے کشن بھی ان ہی کی طرح رومانٹک تھے۔ان سے ان کی خوب بنتی تھی۔دونوں خوبصورتی کے پجاری تھے۔اس لئے روز روز ''گیلا رڈ'' اور دوسرے ایسے ہوٹلوں میں خوب جاتے اور گھومتے تھے جہاں حسینائیں زیادہ ہوتی تھیں۔''ہوٹل گیلا رڈ'' ہی کی بات ہے کہ اس ہوٹل میں ایک عربی لڑکی آئی تھی۔اور بات بات میں ''اُف اماں'' کہا کرتی تھی۔اسی ''اف اماں'' پر انہوں نے ایک گیت لکھا ''یہ آنکھیں اف امّاں پیار نہ ہو جائے''۔
- ☆ ۱۹۴۶ء میں حسرت جے پوری کی ملاقات راج کپور سے ہوئی اور یہ ملاقات دوستی میں بدل گئی۔اس دوران حسرت جے پوری نے اپنی محبوبہ ''رادھا'' کو ایک محبت نامہ لکھا تھا اتفاق سے وہ خط راج کپور نے پڑھ لیا۔اس خط سے متاثر ہوکر بولے اسے رادھا کو مت بھیجنا۔اسے اپنی کسی فلم میں رکھوں گا۔بعد میں حسرت کا وہی پریم پتر راج کپور نے اپنی فلم ''سنگم'' میں رکھا جو کافی مشہور ہوا۔جس کے بول تھے ''یہ میرا پریم پتر پڑھ کر کہ تم ناراض نہ ہونا کہ تم میری زندگی ہو کہ تم میری بندگی ہو''۔
- ☆ لتا منگیشکر نے ملک کی پندرہ زبانوں کو اپنی آواز کا جادو عطا کیا۔

- ☆ نیپال کے شاہ مہندر کے تحریر کردہ نیپالی نغمات کو اپنی سحر انگیز آواز عطا کرنے کا شرف بھی لتا کو حاصل ہے۔
- ☆ لتا منگیشکر نے نغمہ سرائی کے علاوہ فلمیں بھی بنائیں داول اور کنچن چنگا۔داول کو راشٹر پتی کے اعزاز سے بھی نوازا۔
- ☆ عظیم گلوکار اور موسیقار بڑے غلام علی خاں صاحب نے لتا کی مترنم آواز کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے انھیں ''استادوں کی استاذ'' قرار دیا تھا۔
- ☆ لتا منگیشکر کو کلاسیکی موسیقی پر یکساں قدرت اور ملکہ حاصل ہے۔اسی فوقیت کے باعث انھیں ملکہ ترنم کے ساتھ 'ملکۂ موسیقی' بھی کہا جاتا ہے۔
- ☆ ۶۰ کی دہائی میں ہمارے ملک میں ریڈیو سیلون بہت مقبول تھا۔اس کا دو پروگرام۔بنا کا گیت مالا اور صبح ساڑھے سات بجے سے ۸ بجے تک براڈکاسٹ ہونے والا پرانے گانوں کا پروگرام بہت دلچسپی سے سنا جاتا تھا۔اس پروگرام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ روزآنہ اس کا آخری گیت جو اکثر 7.75 منٹ پر صبح بجایا جاتا تھا۔وہ گیت کے ایل سہگل کا ہوتا تھا۔سہگل کا گیت سامعین کے معمولاتِ زندگی میں صبح ۸/ بجنے کی علامت بن گیا تھا۔ریڈیو سیلون کے اس پروگرام کے آخر میں سہگل کا گایا ہوا گیت بجانا ۱۹۵۴ء میں ریڈیو سیلون پر مامور ہندوستانی نثر اداور ایک افسر وجے کشور نے لازمی کیا تھا۔
- ☆ گوری سے شادی کے بعد شاہ رخ خاں پہلے گھوڑی پر اور ہاتھی پر چڑھ کر سسرال گئے تھے۔دستاویزی فلم /Shah Rukh Khan's inner Out world کے مطابق شاہ رخ خاں اتنے خوش تھے کہ ایک کیلومیٹر تک خود ناچتے ہوئے گئے تھے۔
- ☆ جب ڈانسر ہیلن نے اپنی ۵۰۰ ویں فلم کی تھی تو ۱۹۸۰ء میں اس نے ممبئی کے ہوٹل Sun/Sand میں اپنی طرف سے ایک پارٹی دی تھی جس میں دلیپ کمار سے

لے کر بسوا جیت تک سبھی ہیروز آئے اور راما نند ساگر' بی آر چوپڑہ' یس چوپڑہ' سبھاش گھئی' اور ناصر حسین جیسے بڑے فلمساز و ہدایت کاروں نے شرکت کی تھی۔ اس پارٹی میں دلیپ کمار کے ہاتھوں سے ہیروں سے جڑا ایک تاج ہیلن کو پہنایا گیا تھا۔

☆ اس بات کا علم بہت کم لوگوں کو ہو گا کہ اردو دنیا کے عظیم شاعر ڈاکٹر اقبالؔ نے ایک فلم ''افغان شہزادہ'' کی کہانی لکھی ہے۔

☆ مینا کماری شاید فلم انڈسٹری کی وہ واحد اداکارہ ہیں جن کے انتقال کے بعد ان کی سوانح عمری پر مبنی فلم بنائی گئی۔ ۱۹۷۹ء میں ٹیلی فلم ممبئی کے بیز تلے سہراب مووی کی ڈائرکشن میں بنی فلم ''مینا کماری کی امر کہانی'' منظر عام پر آئی اس فلم میں بھارت بھوشن کے علاوہ ڈولی نے مینا کماری کا کردار اور سونا نے مدھوبالا کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم میں مینا کماری کی فلموں آزاد' شاروا' غزل' چندن کا پالنا' اور پاکیزہ وغیرہ کے ڈائلاگ اور مینا کماری پر فلمائے گئے کچھ گیت بھی شامل کئے گئے تھے۔ اس طرح کی تخلیق مینا کماری کی عظیم شخصیت کی ترجمانی کرتی ہے۔

☆ کے ایل سہگل ایک سرد رات میں کار سے اسٹوڈیو جا رہے تھے کہ سڑک کے کنارے ایک شخص سردی سے کانپ رہا تھا۔ اور سڑک کے کنارے سو رہا تھا۔ وہ کار سے اترے اپنا اون کا قیمتی نیا اور خوبصورت کوٹ اتار کر اس شخص کے جسم پر ڈال دیا۔ اور خامشی سے کار میں آ کر بیٹھ گئے۔ اس وقت سہگل کی دونوں آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا رہی تھیں۔

☆ سہگل پہلے بنگالی تھے۔ جنہیں رابندر سنگیت گانے کا اعزاز ملا۔ اور انہوں نے غزلوں کو ہندوستان میں مقبول کیا۔

☆ جب فلم 'نیا دور' بن رہی تھی تو لوکیشن سے لوٹتے ہوئے رات ہو گئی کھنڈالا کے پاس کار خراب ہو گئی۔ کچھ لوگ اندھیرے سے نکل کر طنچے اور چاکو تانے ہوئے آگے بڑھے اور کہا آپ لوگوں کے پاس جو بھی مال متاع ہے نکالو ورنہ جان گنواؤ گے۔ تبھی

ڈاکوؤں میں سے ایک نے جانی واکر کو پہچان لیا یہ تو جانی واکر ہے۔ سب نے ہتھیار گرا دئے۔ اور میرے چاروں طرف گھیرا بنا کر ناچنے گانے لگے۔ کسی نے کار کے بوریٹر میں پانی بھرا تو کوئی دوڑ کر میکنک کو بلا کر لایا۔ ایک شخص جوان میں خون خوار سا تھا بولا ہونے کو تو ہم ڈاکو ہیں مگر جو ہمیں ہنساتا ہے اس کی جان نہیں لیتے اسے لوٹتے بھی نہیں۔

☆ بمل رائے نے جب فلم 'دو بیگھہ زمین' میں کسان کے کردار کے لئے بلراج ساہنی کے بارے میں سوچا تو ان کے آگے کئی دشواریاں آئیں۔ ساہنی اس وقت اعلیٰ تعلیم یافتہ شخصیت کے مالک تھے۔ جن کے چہرے پر دانشوروں والی چمک تھی۔ کبھی ان کا بی بی سی لندن میں ہندی کے اناؤنسر ہونا بعد میں رابندر ناتھ ٹیگور کے ذریعہ قائم شدہ شانتی نکیتن جیسے عالمی شہرت یافتہ ادارے میں انگریزی کا پروفیسر ہونا اس مزاج کے آڑے آتا تھا جو ایک غیر تعلیم یافتہ گنوار کسان کی امیج میں نظر آتا ہے۔ چلچلاتی دھوپ میں کلکتہ کی کولتار بھری ہوئی سڑکوں پر ننگے پیروں دوڑتے ہوئے رکشا کھینچنے کا کام پروفیسر ساہنی کے بس کی بات نہیں تھی لیکن بمل رائے جو ان دنوں اٹلی کے نی او نیٹلیسٹ سنیما سے بہت متاثر تھے۔ بلراج ساہنی کو ایک اداکار کے طو پر پہچان گئے۔ اپنے کردار کے بارے میں سنتے ہی بلراج ساہنی کام کرنے کے لئے راضی ہو گئے۔ کہ دوسرے ہی دن ننگے پیر کلکتہ کی سڑکوں پر رکشہ چلانے کی مشق کرنے لگے۔ یہ مشقت پورے پندرہ دنوں تک چلتی رہی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس وقت رکشہ میں ان کے دونوں بچّے اور ان کی بہن بیٹھی رہتی تھیں۔

☆ ملک کے ہردالعزیز رہنما پنڈت جواہر لال نہرو سے لے کر تقریباً سبھی سیاسی رہنما محمد رفیع صاحب کی بہت عزت کرتے تھے۔ یہاں تک کے ان سے متاثر ہو کر ان کے گانے پر سے ٹیکس اٹھا دیا تھا۔

☆ بلراج ساہنی کو راجیہ سبھا کی رکنیت کی بھی پیشکش کی گئی تھی لیکن انہوں

نے قبول نہیں کیا۔

★ فلموں میں دیوانند کی اداکاری کا موازنہ ایک فلمی تبصرہ نگار نے سیاست میں جواہر لال نہرو کی شخصیت سے کیا تھا اس بارے میں رابندر ناتھ ٹیگور کے الفاظ میں دیوانند کا فلموں میں آنا گویا فلموں میں بسنت کا آنا تھا۔

★ اسکاچ کی بوتل میں کنٹری بھر کر پینے کا موتی لال کا اور اداکار چندر موہن کا قصہ مشہور ہو چکا تھا۔مگر ان کی رئیسی کے قصّوں کی دھاگ آج بھی ان کے بیشمار مداحوں کے ذہن پر چھائی ہوئی ہے۔ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے وہ وہی موتی لال تھے جن سے مہاراجہ آف کشمیر سے گزارش کی تھی کہ وہ ڈربی ریس میں اول آنے والے گھوڑے کی عزت بخشنے کے لئے اس کی لگام پکڑ کر ڈائس پر لے چلیں تو موتی لال نے مہاراجہ کو یہ کہہ کر ڈانٹ دیا کہ یہ تو سائسوں کا کام ہے رئیسوں کا نہیں۔

★ مشہور اداکارہ نادرہ موتی لال کی عزیز دوست تھیں۔اور فلم ''چھوٹی چھوٹی باتیں'' میں ان کی ہیروئن بھی تھیں۔ان کی موت پر نادرہ آنکھوں میں پانی بھرلائی تھیں۔وہ موتی لال کی موت پر آئے ہوئے صحافیوں کو بتا رہی تھیں کہ ان کی میت اٹھانے کے لئے پیسہ نہ تھا۔حتیٰ کہ ایسے موقع پر گھی کا ڈبّہ ہوتا ہے اس کا بھی انتظام نہیں تھا۔

★ محمد رفیع نے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ۲۶ ہزار سے زائد گیت گائے اور چالس سال تک گاتے رہے۔

★ آوازوں کی ملکہ لتا منگیشکر اب تک ۳۰ ہزار سے زائد گیت گا چکی ہیں اور ان کے لئے سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ ان کا نام عالمی کتاب ''گنیز بک'' میں درج کیا گیا ہے وہ واحد گلوکارہ ہیں جس نے بیس زبانوں میں گیت گائے ہیں۔

★ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اشوک کمار جڑی بوٹیوں کے ایک کامیاب ڈاکٹر بھی تھے اور اکثر جب انھیں فرصت ملتی تھی تو وہ اپنے چمبر میں لوگوں کو گٹھیا اور پیٹھ کے درد کا علاج جڑی بوٹیوں سے کرتے تھے۔وہ ایک اعلیٰ پائے کے مصّور بھی تھے اور

انہوں نے ملکۂ انگلستان سے لے کر اندرا گاندھی تک کی تصویر بنائی تھیں۔

★ او پی نیئر نے سی ایچ آتما کی آواز میں ایک گیت ''پریتم آن ملو دیکھا جیا بلائے پریتم آن ملو'' سہگل کی موت (۱۹۴۶ء) تک یہ گانا ریلیز نہیں ہوسکا نیر اور آتما کو اس مشہور گانے کا کل معاوضہ ۱۵/روپے ملا تھا۔

★ ڈائرکٹر لیکھ ٹنڈن کے والد فقیر چند پچیس روپے ماہوار سرکاری ملازم تھے۔پانچ روپے وہ اپنے والد کو بھیجتے تھے اور ۲۰ روپے میں گھر کا خرچ چلاتے تھے۔جب انھیں معلوم ہوا کہ ان کے دوست پرتھوی راج پشاور سے جا رہے ہیں تو اپنی بیوی کے زیور لے کر ان کے پاس پہنچے کہ اس سے تیرا کام چل جائے گا۔پرتھوی راج اپنے دوست کے خلوص اور ایثار سے آبدیدہ ہوگئے انہوں نے زیور قبول نہیں کیا مگر ان کا یہ احسان ساری زندگی بھلا نہیں سکے۔جب پرتھوی راج کو عروج حاصل ہوا تو بمبئ سے ہر ماہ اپنے دوست کو سال میں دو بار اصلی گھی کے کنستر (ایک کنستر سولہ سیر) پابندی سے بھیجا کرتے تھے۔سرسوں کا ساگ بھی بھیجتے اور ساتھ میں ہر ماہ ۱۵/ روپے بھی اور یہ بہانا کرتے کہ پروڈیوسر نے کام سے خوش ہوکر ماہانہ تنخواہ میں اضافہ کردیا ہے۔اپنے عروج کے زمانے میں ایک بار لاہور گئے۔جہاں شیخ پورہ میں فقیر چند سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے۔اپنی آمد کی اطلاع پہلے سے دے دی تھی۔شیخ پورہ میں یہ خبر عام ہوگئی۔جب پرتھوی راج شیخ پورہ پہنچے تو وہاں کے ڈپٹی کمشنر اور مالدار رئیسوں نے اپنے یہاں ٹھہرا کر ہر طرح کی آسائش مہیا کرانے کی دعوت دی تھی۔لیکن پرتھوی راج نے ان سے معذرت کرلی اور اپنے بھائی جیسے دوست کے خاندان کے گھر رہنے کو اہمیت دی جہاں نہ ٹیبل فین تھا نہ صوفہ سیٹ۔مچھروں کو دور کرنے کا اہتمام بھی نہ تھا۔اس کے باوجود انہوں نے وہاں قیام کیا۔پرتھوی راج کو ان خارجی آسائشوں کی بہ نسبت ان کی بے ریا اور بے لوث محبت میں رہنا پسند تھا۔جو جسم سے زیادہ روحانی تسکین دینے کا باعث تھیں۔

★ مینا کماری نے اپنی آواز میں پہلا گیت فلم 'بہن' میں گایا تھا۔سنگیت کار انیل بسواس کے ساتھ انہوں نے یہ گیت گایا تھا۔اس کے بعد فلم پیا گھر آجا' بچھڑے بالم' پنجڑے کا پنچھی' اور پاکیزہ میں گیت گایا۔ بالی ووڈ کمپنی نے مینا کماری کی آواز میں ان کی منتخب نظموں اور غزلوں کا جو ریکارڈ تیار کیا وہ اب ایک یادگار بن کر رہ گیا ہے۔

★ شمی کپور نے کہا ہم لوگ کلکتہ کے کالی مندر کے پاس ہزارہ روڈ پر رہا کرتے تھے۔پہلی منزل پر پاپا جی والدہ (چائی جی) ہماری بہن ارملا اور راج کپور رہتے تھے۔جب کہ گراؤنڈ فلور پر ہمارے دادا دادی- میری پیدائش کی سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ میں اسپتال میں پیدا ہوا بات کر رہا ہوں ۱۹۳۱ء کی اس زمانے میں بچے گھروں میں پیدا ہوتے تھے۔ہمارے سبھی بھائی بہن گھر ہی میں ہوئے۔ہمارا ششی (ششی کپور) تو باتھ روم میں پیدا ہوا تھا۔

★ ایک شام 'شمی کپور' گیتا بالی سے پوچھ بیٹھا مجھ سے شادی کروگی' آج ہی رات دس گیارہ بجے جب کوئی پنڈت نہیں ملا تو ہم نے ساڑھے پانچ بجے بھری بارش میں بن گنگا میں شادی کی۔میرا دوست ہنی والیا میری شادی کا گواہ تھا۔پنڈت جی نے جب سیندور بھرنے کو کہا تو شمی کپور نے لپ اسٹک سے گیتا بالی کی مانگ بھری۔

★ راج کپور کی فلم 'سنگم' نے باکس آفس پر سونے کی اشرفیاں برسا دیں۔ہدایت کار راج کپور نے وجنتی مالا کے حسن و جذبات کو اس بہترین طریقے سے پردۂ سیمیں پر پیش کیا کہ سارے ملک میں ''میں کا کروں رام مجھے بڈھا مل گیا'' نغمے کی دھوم مچ گئی۔اچھا ہوا یا برا ہوا یہ نہیں کہہ سکتے؟ کیونکہ ریڈیو نے ہمیشہ کے لئے اس نغمے پر پابندی لگادی وہیں لتا منگیشکر نے بھی اپنے اسٹیج پروگراموں میں اسے گانے سے منع کر دیا۔اور اس گیت کو اپنا گایا ہوا سب سے بیکار گیت بتایا۔

★ وجنتی مالا ایک ایسے بکھرے ہوئے خاندان کی لڑکی تھی جسے ان کے والد کی گرفت سے

بچا کر ان کی والدہ یورپ لے بھاگی تھیں۔جہاں چار سال کی عمر میں انہوں نے پوپ کے سامنے رقص پیش کر کے پہلی واہ واہی لی۔

★ مدھو بالا کی فلم ''ہنستے آنسو'' کو پہلی بار بالغ فلم 'A' سرٹیفکٹ دیا۔

★ کشور کمار نے مدھو بالا سے صرف شادی کرنے کے لئے اسلام قبول کیا۔مسلمان بن کر اپنا نام ''عبداللہ'' رکھ کر مدھو بالا سے شادی کی۔ باضابطہ نکاح پڑھایا گیا۔گویا کہ اسلامی طریقے سے شادی ہوئی۔

★ دلیپ کمار' راج کپور' اور دیو آنند نے ایک عرصہ دراز تک فلم انڈسٹری پر حاکمانہ قبضہ جمائے رکھا۔سارا ہندوستان ان کی اداکاری ان کے ہیئر اسٹائل اور ان کے لباس کا دیوانہ تھا۔یہ تینوں عظیم فنکاروں نے مغربی فنکاروں کی تقلید کی۔دلیپ کمار بالی ووڈ کے مایہ ناز اداکار مارلن برانڈو سے متاثر تھے۔دیوانند گری گری پیک کی تقلید کرتے تھے اور راج کپور نے چارلی چپلن کو مشرقی انداز میں پیش کیا۔

★ پرتھوی راج کپور کو بطور ہیرو سائن کرنے کے بعد ایمپریل فلم کمپنی کے مالک اردیشر ایرانی نے سترہ روپے ماہوار پر ملازم رکھا تھا۔آردیشر ایرانی نے انھیں اپنی اور ہندوستان کی پہلی بولتی فلم ''عالم آرا'' میں اہم ترین کردار دیا۔۱۹۳۱ء کی اس فلم میں پہلا مکالمہ ادا کرنے والے پرتھوی راج تھے۔

★ ۱۲ سال کی عمر میں اوپی نیر کو ایک پنجابی فلم ''دولھا بھائی'' میں انھیں پنڈت گوند رام کی ہدایت میں کورس کے روپ میں گانے کا موقع ملا۔گانے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس فلم میں اداکاری بھی کی۔

★ پرتھوی راج نے اپنی پوری فلمی زندگی میں فلم پردے پر کوئی رومانی گیت نہیں گایا۔جس میں مدراس کی ایک فلم ''تین بھورانیاں'' میں انہوں نے باپ اور دادا کا رول ادا کیا تھا۔پرتھوی راج پر ان کی ہی آواز میں ایک مزاحیہ گیت ''آمدنی اٹھنی خرچہ روپیہ'' فلمایا گیا تھا۔

★ کسی فلم کی شوٹنگ کے دوران اے آر کاردار کو محسوس ہوا کہ وہ ان کی ہدایت کے مطابق نہیں کر رہے ہیں تو غصّے سے ان کی جانب مارنے کو لپکے پرتھوی راج نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا ''سنبھل کے ہاتھ میرا بھی بڑا بھاری ہے''۔ یہ جواب سن کر سب لوگ حیران رہ گئے ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کاردار بھی اپنی عادت سے سنبھل گئے۔ اور پھر کبھی اپنی اس عادت کو کسی ایکٹر یا فلم اداکاروں پر دہرایا نہیں۔ ان کی اس کوشش سے فلم انڈسٹری میں خوش گوار تبدیلی آئی۔ فلم کمپنیوں میں بھی انہوں نے ایکسٹراؤں کے ساتھ ظلم زیادتی کے خلاف آواز اٹھائی ان کے جائز حقوق اور معاوضے نیز فلموں میں ان کی اہمیت کے لئے ایکسٹرا یونین کی تشکیل کی اس یونین کے پہلے صدر پرتھوی راج ہی تھے۔

★ پرتھوی راج وہ پہلے اداکار تھے۔ جنھوں نے ملازمت سے انحراف کیا اور ایک آزاد فن کار کی طرح پوری فلم کے معاوضے پر فلمیں لینا شروع کر دیں۔ فلم 'سکندر' کا معاوضہ انھیں چالیس ہزار روپے ملا تھا۔

★ بی ایس سی پاس کرنے کے بعد اشوک کمار نے کلکتہ میں قانون کا مطالعہ کیا۔ جہاں انہوں نے بہت سے بنگالی اسٹیج ڈرامے اور فلمیں دیکھیں۔ تو ان کے دل میں فلم ڈائرکٹر بننے کا شوق پیدا ہوا۔

★ ہمانشو رائے نے اشوک کمار کو اپنی اسٹار بیوی دیویکا رانی کے مقابل فلم ''جیون نیا'' میں ہیرو کا رول کرنے پر آمادہ کر لیا۔ یہ فلم بہت کامیاب ہوئی۔ اس فلم نے اشوک کمار کو شہرت کی بلندی پر پہنچا دیا۔ جواہر لال نہرو، اندرا گاندھی، اور سروجنی نائیڈو نے بھی اشوک کمار کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

★ ۱۹۵۰ء میں ایک خانگی پارٹی میں مشہور صنعت کار آر ڈی ٹاٹا نے مرسڈیز کار تحفہ میں دی تھی۔

★ دلیپ کمار نادرہ کی مشہور فلم 'آن' شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے ٹیمنگ آف

وا شرو'' پر بنائی گئی تھی۔

★ دیویکا رانی نے مدھو بالا' کو مدھو بالا نام دیا تھا۔ اس نام سے وہ اشوک کمار کے ساتھ دیویکا رانی کی بنائی ہوئی فلم ''محل'' میں آئیں۔

★ راج کپور کی فلم ''آوارہ'' ۱۹۵۱ء میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم کو پنڈت جواہر لال نہرو کے علاوہ خروشچیف، ماؤ اور کرنل جیسے اپنے وقت کے عظیم رہنماؤں نے دیکھا اور سراہا تھا۔ عرب ملکوں کے علاوہ، چینی، روسی، اور دیگر سماج وادی ملکوں میں پیش کی گئی۔ یہ پہلی ہندوستانی فلم تھی جسے شمالی خطِ مستقیم پر تعینات سائنسدانوں کی فرمائش پر اس فلم کا مخصوص شو وہاں رکھا گیا تھا۔ اس فلم کو روس کی غیر تسلیم شدہ قومی فلم ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔ ۱۹۸۵ء میں اسے امریکہ کے مختلف شہروں کے سنیما ہال میں بھی ریلیز کیا گیا تھا۔

★ مشہور اداکارہ وگلوکارہ ثریا کو اپنے زمانے میں میلوڈی کوئن کا خطاب دیا گیا تھا۔

★ ثریا کے چاہنے والوں میں ہالی ووڈ کا سپر اسٹار گریگوری پیک انکی مشہور فلمیں (Guns of Novarone اور Mekana's Gold) کا ہیرو گریگوری پیک جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے دنیا پاگل تھی وہ اداکار خود ثریا کا دیوانہ تھا۔ گریگوری پیک جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دیوانند زندگی بھر گریگوری پیک کی نقل کرتا رہا وہی گریگوری پیک دیوانند کے توسط سے بار بار ہندوستان آیا اور محض ثریا سے ملنے اور خود ثریا کئی مرتبہ اس کی دعوت پر انگلینڈ اور امریکہ گئی۔

★ مشہور ہیرو ''دھرمندر'' نے سپر اسٹار ثریا کی فلم ''دلگی'' ۴۰ مرتبہ دیکھی تھی۔

★ ملکۂ ترنم نور جہاں پاکستان کے ان فنکاروں میں سے ایک ہیں جن کے بارے میں ان کی زندگی میں تو بہت کم لکھا گیا۔ اور ان کی موت کے بعد تو جیسے کسی نے ان پر قلم اٹھانے کی بھی ضرورت نہیں محسوس کی۔ اور اگر اس عظیم فنکارہ پر کسی نے قلم اٹھایا بھی تو

اس کا موضوع ان کی شخصیت بنی نہ کہ ان کا فن نور جہاں پر لکھی جانے والی پہلی کتاب کا نام ''نور جہاں سرور جان'' تھی جس کا موضوع تقسیم سے پہلے ممبئی کی فلم نگری میں ان کے شب و روز تھے بعد میں شوکت حسین رضوی کے طویل انٹرویو پر مبنی منیر احمد منیر کی کتاب اور ''نور جہاں کی کہانی میری زبانی'' سامنے آئی۔ جس کا بظاہر مقصد نور جہاں پر کیچڑ اچھالنے کے سوا کچھ نہ تھا۔

☆ فلم ''دو بیگھہ زمین'' کے نام ایک امتیازی ریکارڈ ہے کہ یہ پہلی ہندوستانی فلم ہے جسے بین الاقوامی فلموں کے درمیان نمایاں جگہ دی گئی۔ چین' برطانیہ' کینس سوویت یونین کارلوئی دیری اور ملبورون دکھائی گئی۔

☆ پروڈیوسر ڈائرکٹر شاید لطیف نے ایک دن ساحر سے کہا'' ساحر صاحب آپ کی شعری اور ادبی صلاحیتوں سے ہمیں انکار نہیں دنیائے سخن میں آپ کا امتیازی مقام ہے۔ اس کے باوجود آپ سے فلم کے گانے لکھوانا ایک بڑا خطرہ لینے کے مترادف ہے۔

☆ اداکار سپرو کے والد مہاراجہ ہری سنگھ کے خزانچی تھے۔ اور خود جموں و کشمیر میں پی ڈبلو ڈی میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔

☆ اداکار سپرو ایک باصلاحیت گلوکار اور طبلہ نواز بھی تھے۔ روز صبح وہ ایک گھنٹہ گلوکاری' ایک گھنٹہ طبلہ کا ریاض کرتے تھے۔ گرودت کی پہلی فلم 'لاکھ رانی' تھی جس میں ایک کردار کرتے وقت انہوں نے کوریوگرافی بھی کی تھی۔

☆ شاہ رخ خان کے والد تاج محمد جنگِ آزادی کے مجاہد تھے۔ ان کا نام کم عمر فریڈم فائٹر میں سرِ فہرست رہا آزادی ملتے ہی ۱۹۴۷ء میں وہ ہندوستان آ گئے اور دہلی میں رہائش پذیر ہو گئے۔ تاج محمد ۱۹۴۲ء میں جب لاہور کے ایک اسکول میں ۱۲ویں کلاس کے طالب علم تھے تو بھارت چھوڑو تحریک میں حصّہ لیا اور انگریزوں کے خلاف نعرے اور تقریر کرنے کے جرم گرفتار کر لئے گئے۔

☆ شاہ رخ خان کی محبوبہ گوری جب ۲۱ سال کی ہوگئی تو دونوں نے گوری کے والدین کی رضامندی سے ہندو رسم و رواج کے مطابق ۲۵؍اکتوبر ۱۹۹۱ء میں شادی کر لی۔ پھر بعد میں سیول میرج بھی ہوگئی۔

☆ بینا رائے نے انڈین گڈ ول مشن کے ممبر کے طور پر امریکہ کا دورہ بھی کیا۔

☆ نرگس نے شوشل ورک میں ماسٹر ڈگری اور جغرافیہ آنرز کے ساتھ گریجویشن مکمل کیا۔

☆ فلم ''مدہوش'' کی کامیابی کے بعد راجہ مہدی علی خان کو ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۰ء تک بدنصیبی سے فلمی گانے لکھنے کا موقع نہ ملا گھر کی حالت غربت کا شکار ہوگئی اس کی وجہ سے راجہ میدی علی خاں اور ان کی بیوی میں بحث و تکرار کا سلسلہ روز جاری رہنے لگا جو آخر کار طلاق پر ختم ہوا۔ راجہ مہدی علی خاں کو زیب انساء زیب سے ایک بیٹی بھی ہے جس کا نام نیلوفر ہے۔ راجہ میدی علی خاں تنہا ہو گئے بیوی اور بیٹی کی یاد میں تڑپ تڑپ کر شراب خانے کی راہ پر چل پڑے راجہ مہدی علی خاں ساری ساری رات میخانے میں شراب پیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ وہیں سو جایا کرتے تھے بعد میں راجہ مہدی علی خاں نے ظاہرہ سلطانہ نامی خاتون سے دوسری شادی کر لی۔ ظاہرہ خود بھی اچھی شاعرہ تھیں۔ ان کا تخلص مخفی تھا۔ دوسری بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس کا غم الگ ستا رہا تھا۔ مگر شدتِ غم ان کو دراصل پہلی بیوی سے علیحدگی اور بیٹی سے دوری اور ان کی خوشحالی میں مدد نہ کرنے کا سبب تھا۔ دوسری شادی کے بعد راجہ مہدی علی خاں نے شراب پینا چھوڑ دیا۔ مگر پھر حالت زندگی سے تنگ آ کر دوبارہ شراب کو زہر سمجھ کر پینا شروع کر دیا۔

☆ بالی ووڈ میں رومانی فلمساز و ہدایت کار یس چوپڑہ کے کارناموں کو ایک برطانوی ادیبہ نے ایک کتاب کی صورت میں ڈھال دیا ہے۔ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز (لندن) کی پروفیسر ریچل ڈوائر نے اپنی کتاب ''یس چوپڑہ ففٹی ایرس آف انڈین سنیما'' میں ان کی زندگی فلم اور فن کو تخلیق و تجربے کا موضوع

بنایا ہے۔ یش چوپڑہ کے متعلق تفصیلی معلومات ان کے ہم عصر فلمسازوں وہدایت کاروں تکنیکی ماہرین اور ان کے ساتھ کام کرنے والے اداکاروں سے ملاقات کر کے ان کے تھیم اور تکنک کے لحاظ سے ان کا تجزیہ کیا ہے اس کے علاوہ ان کی خوبیوں اور خامیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اتنا ہی نہیں کتاب میں تصاویر اور پوسٹرس بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کتاب کا پیشِ لفظ لتا منگیشکر نے لکھا ہے۔

★ سپرو کے بیٹے اداکار کشن سپرو مہاراشٹر ریاست کی جونیر بیڈمنٹن شپ جیتنے کے علاوہ سی کے نائڈو ٹرافی میں ممبئی کی کرکٹ ٹیم میں شامل تھے۔

★ این اے انصاری نے ۱۹۶۷ء میں ایک فلم ''وہاں کے لوگ'' بنائی تھی۔ جس میں اڑن طشتری کے ذریعہ مریخ کے لوگوں کا زمین پر اترنا دکھایا گیا تھا۔ حالانکہ اس فلم کی نمائش کے بعد جب اس کے چرچے چاروں طرف ہونے لگے اور این اے انصاری کو اس کامیاب فلم کا کریڈیٹ دیا جانے لگا تو انہوں نے خود ایک پریس کانفرنس طلب کر کے اس کا سارا کریڈٹ ایشیا کے عظیم جاسوسی مصنف ابن صفی کو دیا۔ اور کہا کہ یہ فلم ان کے ناول ''فضا کا ہنگامہ'' کا چربہ ہے۔

★ ۱۹۷۰ء میں جب این اے انصاری بالی ووڈ فلم انڈسٹری کی طرف سے ایک ایوارڈ دلیپ کمار کے ہاتھوں پیش کیا گیا تھا۔ تو انہوں نے اس ایوارڈ کو دلیپ کمار کے ہاتھوں سے لینے کو یادگار لمحہ بتایا اور کہا کہ میری دلی خواہش تھی کہ ایک فلم ہٹلر کی زندگی پر بناؤں اور ہٹلر کا کردار دلیپ کمار کو دوں کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہندی فلم میں ہٹلر کا سب سے اہم رول دلیپ کمار کے علاوہ اور دوسرا کوئی نہیں کر سکتا۔ این اے انصاری کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ دلیپ کمار سے بڑا ویلن کا رول ہندی فلموں میں کوئی نہیں کر سکتا۔ فلم 'دل دیا درد لیا' میں سکنڈ ہاف میں انہوں نے جس انداز میں اینٹی ہیرو کا رول نبھایا تھا۔ ایسا رول شاید ہی ہندی فلموں میں کوئی اور ادا کر سکے۔

★ فلمی دنیا کے مقبول گیت کار شکیل بدایوانی کے بارے میں ممتاز شاعر جگر مرادآبادی کا کہنا ہے کہ ''شکیل ایک ایسا شاعر ہے۔ جسے قدرت کا ایک شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ اس کی قلم نے جب بھی کاغذ کو سیاہ کیا ہے۔ وہ چیز سچائی بن کر دنیا کے سامنے آتی ہے۔''

★ فلم مغلِ اعظم کے سب سے دلچسپ اور مشہور نغمہ ''پیار کیا تو ڈرنا کیا'' کی تخلیق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ شکیل اور نوشاد نے کے آصف کی بنائی ہوئی کہانی کے سچویشن کے مطابق شام ۶ ؍بجے سے ایک بند کمرے میں لکھنا شروع کیا اور سینکڑوں اشعار لکھے گئے۔ لاتعداد مکھڑے تیار ہوئے لیکن یہ دونوں مطمئن نہیں ہوئے۔ کمرے کے ایک گوشے میں کاغذ کے ٹکڑوں کا ڈھیر سا لگ گیا تھا اچانک نوشاد نے کہا 'ارے بھائی اس نغمے میں انارکلی یہ کہنا چاہتی ہے کہ پریم کیا کیا چوری کرے'' اسی پورے جملے کا پورا ہونا ہی تھا کہ چند منٹوں میں شکیل نے پورا گیت کاغذ پر بکھیر دیا جس میں گیت کا سب سے عمدہ اور دل میں اتر جانے والا انترا بھی شامل تھا۔ پردہ نہیں جب کوئی خدا سے۔۔۔ بندوں سے پردہ کرنا کیا۔ اس نغمے کی تخلیق کے بعد جب نوشاد نے کمرے کا دروازہ کھولا تو دوسرے دن کی صبح ہو چکی تھی۔ اس ایک واقعہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور میں لوگ اپنے فن اور پیشے سے کس قدر محبت کرتے تھے۔''

★ شاہ رخ خاں وہ عجیب اداکار ہے جو ۵۰ کروڑ کے بنگلے میں رہ کر ہندوستان کی فلم صنعت کے سب سے بڑے اداکار اور کنگ خان کا مرعوب کن لقب پاکر بھی کہتے ہیں کہ وہ بچوں سے اداکاری سیکھتے ہیں۔ اور ان کے پالتو کتّے ان کے سب سے بھروسے مند مدرس ہیں۔

★ دیویکا رانی ۳۰ ؍مارچ ۱۹۰۷ء کو آندھرا پردیش کی نواحی بستی وال سیئر میں پیدا ہوئی تھیں۔ بنگالی نژاد تھیں۔ ان کے والد کرنل ایم۔ ایف چودھری برٹش آرمی میں ڈاکٹر

تھے۔ ترقی پا کر سرجن جنرل کے عہدے پر مدراس میں تعینات ہوئے تھے۔ ماں لیلا چودھری اس وقت اپنے میکے والی سیٹر میں تھیں۔ جب دیویکا رانی چودھری کی ولادت ہوئی۔ یہ رابندر ناتھ ٹیگور کی بھانجی کی بیٹی تھیں۔

★ مشہور اداکارہ نادرہ نے مرچنٹ ایوری کی چند انگریزی فلموں میں کام کیا تھا۔ جس میں ''دی گرو'' اور ''کاٹن میری'' کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

★ ویلن برے آدمی کا کردار ہندوستانی فلموں کا تخلیقی دور تقریباً سو سال (۲۰۰۶-۱۹۱۳ء) کا آنکڑہ رہا ہے ہندوستانی فلموں کے ابتدائی دور پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ فلم کی ابتدا سے ہی برے آدمی بری عورت کو بھی اپنا کردار بنایا تھا۔ خاموش فلموں کی ابتدا میں دادا صاحب پھالکے کی پہلی خاموش فلم ''راجہ ہریش چندر'' ۱۹۱۳ء کے ساتھ ہی اس برے آدمی (ویلن) نے اپنی تشدد پسند فطرت کو پردۂ فلم پر اجاگر کر دیا تھا۔ (اس فلم میں کنس کا کردار بھی تھا)۔

★ فلم ''انگلینڈ ریٹرن'' ۱۹۲۱ء پہلی سماجک خاموش فلم تھی۔

★ خاموش فلموں کا ۱۷ سالہ دور ۱۹۱۳ء تا ۱۹۳۰ء ہندو مائتھولاجی یا یوں کہیں کہ ہندو مذہب کے دیوی دیوتاؤں کے دیومالائی قصّے کہانیوں کا دور تھا۔

★ متکلم فلموں میں سب سے پہلے بری عورت (ویمپ) کا کردار ڈلّو بائی نے ہی نبھایا تھا۔ ڈلّو بائی نے فلم مغلِ اعظم میں انارکلی (مدھوبالا) کی مظلوم ماں اور فلم مدر انڈیا میں نرگس کی ماں کے یادگار رول نبھا چکی ہیں۔

★ T.Series ہمیش ریشمیا کی فلم ''آپ کا سرور'' کی میوزک پاکستان میں ریلیز کی جارہی ہے۔ یہ پہلی ہندوستانی فلم ہے جس کی موسیقی سرکاری طور پر پاکستان میں ریلیز کی گئی۔ گیت سمیر نے لکھے ہیں۔ جنہیں آشا بھونسلے سنیدھی چوہان اور شیریا گھوشال کے علاوہ خود ہمیش ریشمیا نے آواز دی ہے۔

★ فلمی اداکارہ مہیما چودھری کو خاتون ہاکی کھیل کا برانڈ بنایا گیا۔

★ لینا چندراورکر کی شادی پہلے بھوپال کے ایک راج کمار سدھارتھ سے ہوئی تھی۔ جس نے شادی کی پہلی رات ہی خودکشی کر لی تھی۔

★ کشور کمار کے بارے میں ایک عام بات یہ تھی کہ جب انہیں فلم سائن کرنے کے لئے اور گانے کی بکنگ کے لئے بہت سارے روپے اکٹھے مل جاتے تھے تو وہ تمام نوٹوں کو اپنے بستر پر بچھا کر دروازہ بند کر کے تمام کپڑے اتار کر روپے پر 'رہبا ڈانس' کیا کرتے تھے۔

★ ایک زمانے میں جب سنجے گاندھی نے کشور کمار کے گانوں پر پابندی عائد کی تھی تو محمد رفیع خود اندرا گاندھی سے ملے تھے اور گزارش کی تھی کہ ان کے گانوں پر سے پابندی اٹھالی جائے کیونکہ وہ ایک عظیم فنکار ہیں۔ اور ایک فنکار پر پابندی نہیں لگنی چاہئے۔

★ دلیپ کمار جنہوں نے کبھی بھی کشور کمار سے گانے نہیں گوائے تھے۔ انھوں نے مجبوراً ہو کر ''سگینہ مہتو'' کی ہندی ڈب 'سگینہ' میں کشور کمار کی آواز کا پہلی مرتبہ استعمال کیا۔ اور وہ گانا ''سالا میں تو صاحب بن گیا''۔ بیحد ہٹ ثابت ہوا تھا۔

★ گلوکارہ بیگم اختر نے فلم 'روٹی' میں چھ گانے خود پلے کئے تھے۔

★ ششی کلا اپنے وقت کی خوبصورت اداکارہ تھیں۔ ان کے بال اتنے خوبصورت تھے کہ ان کے بال کا بیما کیا گیا تھا۔

★ ۱۹۸۰ء میں سہراب مودی کو دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا اور ان کی موت کے ایک سال بعد ہی ممبئی کی بدنام زمانہ چور مارکٹ سے اینٹک ڈیلر کے پاس سے وہ ایوارڈ برآمد ہوا۔ اور اس ڈیلر نے دعویٰ کیا کہ یہ ایوارڈ انہوں نے براہِ راست ان کے لڑکے 'مہلی' سے خریدا تھا۔ مہلی نے نہ صرف اپنے والد کے تمام ایوارڈز اور جائدادیں فروخت کر کے دبئی میں سکونت اختیار کر لی بلکہ ہندوستان کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔

★ ۱۹۵۰ء میں ممبئی کی منروا تھیٹر میں سہراب مودی کی ایک یادگار فلم 'شیش محل' کی نمائش

ہوئی تھی۔اس موقع پر سہراب مودی خود بھی تھیٹر میں موجود تھے۔انہوں نے فلم دکھائی جانے کے دوران ایک شخص کو آگے سیٹ پر آنکھ بند کر کے بیٹھے دیکھا۔جس سے سہراب مودی کو تکلیف ہوئی کہ ایک شخص میری فلم آنکھیں بند کر کے دیکھ رہا ہے۔انہوں نے ٹکٹ چیکر سے کہا اس شخص کو ہال سے چلے جانے کو کہیں اور ان کے ٹکٹ کے پیسے واپس کر دیں۔ٹکٹ چیکر نے سہراب مودی سے کہا وہ شخص تو اندھا ہے۔اور صرف سہراب مودی کی ڈائلاگ سننے کے لئے آیا ہے۔

★ مینا کماری کے مداحوں میں ایک ڈاکو بھی تھا۔جو انہیں بہت پسند کرتا تھا۔جب مینا کماری کی فلم کی شوٹنگ جنگلوں میں ہو رہی تھیں تو اس ڈاکو کو اس کا علم ہوگیا۔وہ وہاں پہنچا اور مینا کماری کا اغوا کر لیا۔لیکن اس نے ان کے ساتھ کوئی خراب برتاؤ نہیں کیا۔بلکہ اس ڈاکو نے انہیں ایک جگہ بڑے سلیقے سے بٹھا کر صرف اتنا ہی کہا تھا ''میناجی میں آپ کا بہت بڑا پرستار ہوں میری بس ایک ہی خواہش ہے اور وہ یہ کہ آپ چاقو سے میری ہتھیلی پر اپنا نام کرید دیجئے۔یہ سن کر مینا کماری حیرانی سے اسے دیکھنے لگیں۔ڈاکو نے پھر زور دے کر اپنی تمنا ظاہر کی تب مینا کماری نے ڈرتے ہوئے چاقو اپنے ہاتھ میں لیا اور آنکھیں بند کر کے اس کی ہتھیلی پر اپنا نام کرید دیا۔ڈاکو کی ہتھیلی لہولہان ہوگئی۔باوجود اس کے اس نے ایک چیخ تک نہیں ماری۔بلکہ وہ خوش ہوگیا اتنا خوش جیسے اسے بہت بڑا خزانہ مل گیا ہو۔بعد میں ڈاکو نے مینا کماری کو بڑے احترام سے چھوڑ دیا۔مینا کماری اپنے اس انوکھے مداح کو زندگی بھر بھلا نہیں پائی تھیں۔

★ یہ بات شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ فلم اسٹار راج کمار جب کسی کو مخاطب کرتے تھے تو اپنی مخاطبت سے قبل ''جانی'' کا استعمال کرتے تھے۔یہ بات فلمی دنیا میں بہت کم لوگ ہی جانتے تھے لیکن جو جانتے تھے وہ کہتے ہیں راج کمار پالتو کتوں کے شوقین تھے۔اور انہوں نے اپنے چہیتے کتے کا نام 'جانی' رکھا تھا اور وہ

اسے بہت عزیز رکھتے تھے۔

★ ۱۹۰۴ء میں ''The life of Christ'' بمبئی شہر میں دکھائی جانے والی وہ فلم تھی جس سے Inspired ہو کر دادا صاحب پھالکے نے ہندوستان میں فیچر فلم بنانے کی پلاننگ کی۔یہ فلم حضرت عیسیٰؑ کی زندگی پر مبنی تھی۔اور ۱۹۰۴ء میں ایک ہندوستانی تاجر ڈی این سمیت نے گجرات کے تجارتی شہر سورت میں سب سے پہلے اپنے پیسے سے خرید کردہ پروجیکٹر کی مدد دکھائی تھی۔

★ ۱۹۱۲ء تک آٹھ سال کا طویل عرصہ ڈی این سمیت نے فلم کی تخلیق کے لئے خود کو مکمل طور پر تیار کرنے میں صرف کر دیا۔انھوں نے لندن سے فلم میکنگ سے متعلق کتابیں منگوا کر ان کا مطالعہ کیا۔فلم میکنگ کی باریکیوں کو سمجھا اور جب مطالعہ سے مطمئن نہ ہوئے تو لندن جا کر ٹریننگ حاصل کی۔اور پوری طرح مطمئن ہو کر ۱۹۱۲ء میں بمبئی لوٹ آئے اب ان کے سامنے فلم بنانے کا مسئلہ تھا آمدنی کے ذرائع محدود تھے خودداری نے دیگر ذرائع سے فائدہ اٹھانے سے روکا جب کوئی راہ نہ نکلی تو اپنے بل بوتے پر کمر بستہ ہوگئے بیوی کے زیورات بیچے۔بیمہ پالیسیاں گروی رکھیں۔قریبی اور بھروسے مند لوگوں سے قرض لیا اس طرح ان کے پاس دس ہزار روپے جمع ہوگئے تو انہوں نے ایک Experiment کرنا ضروری سمجھا Plant growth کو انہوں نے اس یقین کے ساتھ فلمایا کہ یہ مختصر فلم ان کی فلم تکنک کی ارتقائی سمت طے کر دے گا۔فلم کی نمائش ہوئی اور پسند کی گئی۔

★ فلم 'راجہ ہریش چندر' میں دادا صاحب پھالکے نے راجہ ہریش چندر کے کردار کے لئے خود کو منتخب کر لیا تھا۔فلم میں خاتون کردار رانی تارامتی کی فلم میں بہت اہمیت تھی۔ان دنوں فلموں میں کام کرنے کے لئے کوئی خاتون تیار نہیں تھی۔حتیٰ کہ طوائف نے بھی فلم میں کام کرنے سے انکار کر دیا تو مجبوراً انھوں نے رانی تارامتی کے کردار کے لئے ہوٹل میں کام کرنے والے معصوم اور نسوانی چہرے

والے لڑکے کو انتخاب کیا اس کا نام لتا سولنکی تھا۔

★ فلم راجہ ہریش چندر بمبئ کے کارونیشن تھیٹر میں ۲۱ اپریل ۱۹۱۳ء کو نمائش کی گئی۔ یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ اس فلم کے ڈانس ڈائرکشن کے لئے امریکہ سے بلائی گئی فنکارہ مس ایرینا ڈ' دملیاڈ کی خدمات لی گئیں۔ اور مزاحیہ مناظر کے لئے میک کلینمٹ سے مناظر اخذ کئے گئے تھے۔ اور ریگز یڈرف نے بازی گری کے کمالات دکھائے تھے۔

★ دادا صاحب پھالکے ۲۰ برسوں تک فلمی صنعت سے وابستہ رہے اور اس عرصہ میں انھوں نے صرف ہندو مائتھولاجی پر ۱۰۰ سے زائد فلمیں بنائیں ان کی کل فلموں کی تعداد ۱۳۰ ہے۔

★ دادا صاحب پھالکے کے ۱۳۲ ویں سالگرہ کے موقع پر ۱۹۸۸ء میں بمبئ فلم سٹی کا نام دادا صاحب پھالکے چترپٹ نگری رکھا گیا۔ یہ تجویز انڈین اسکرین کے سب سے قدآور شخصیت دلیپ کمار نے پیش کی تھی۔

★ سینکڑوں فلموں کے خالق دادا صاحب پھالکے کے جنازے میں فلم انڈسٹری کا کوئی ایک بھی شخص شامل نہیں ہوا تھا۔

★ دادا صاحب پھالکے اکیڈمی کی تنظیم ممبئ میں اس مقصد سے کی گئی کہ اس کے ذریعہ نہ صرف ماضی کے فنکاروں کو اعزاز دیا جائے بلکہ انعام کے طور پر ان کی مالی مدد بھی کی جائے۔ ۲۰۰۱ء میں اسے جولی سینٹر تلک روڈ سانتا کروز (ویسٹ) ممبئ میں قائم کیا گیا۔

★ دادا صاحب پھالکے کے نام مرکزی حکومت نے ۱۹۶۹ء میں ان کے نام سے سرکاری اعزاز جاری کیا جو سب سے پہلے دیویکا رانی کو دیا گیا۔

★ ۱۹۴۳ء میں ہدایت کار جے کے نندہ کی فلم 'اشارہ' میں مشہور ویلن کے این سنگھ نے پرتھوی راج کپور کے والد کا رول کیا تھا۔ حالانکہ کے این سنگھ عمر اور تجربہ میں پرتھوی راج کپور سے بہت چھوٹے تھے۔ اور اس فلم کا کردار ان کی زندگی کے بہترین

کرداروں میں سے ایک بن گیا۔

★ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مشہور ویلن کے این سنگھ کی آنکھوں میں سے ایک آنکھ کانچ کی تھی۔ لیکن وہ اپنی اداکاری سے سامعین کو اس کا احساس ہونے نہیں دیتے۔

★ موسیقار فیروز شاہ ایم شری اور موسیقار بی ایرانی ہندوستانی فلم انڈسٹری کی موسیقاروں کی پہلی جوڑی تھی۔ جنہوں نے ایک ساتھ پہلی بولتی فلم ''عالم آرا'' میں موسیقی دی تھی۔ اس فلم میں انہوں نے صرف سات گیتوں کی موسیقی دی۔ فلم میں صرف سات ہی گانے تھے۔

★ ہندوستانی فلم کے پہلے گلوکار وزیر محمد خاں ہیں جنہوں نے سب سے پہلے فلم 'عالم آرا' میں گیت گایا۔ جس کے بول تھے۔

دے دے خدا کے نام پہ پیارے طاقت ہو گر دینے کی
کچھ چاہے اگر تو مانگ لے مجھ سے ہمت ہے اگر لینے کی

★ بیس سال کی عمر میں زبیدہ پہلی بولتی فلم کی ہیروئن بنی انہوں نے ۳۶ خاموش اور بیس بولتی فلموں میں کام کیا ان کی آخری فلم ''کس کی پیاری تھی'' ۲۶ سال کی عمر میں مہاراجہ دھن راج کور سے شادی کر کے فلموں کو خیر باد کہا اور گرہستی میں مصروف ہو گئیں۔ راجہ دھن راج نے بمبئ کے سب سے امیر ترین علاقہ کولابہ میں اپنا محل تعمیر کیا تھا۔ جو آج بھی اپنے طرز تحریر کے لحاظ سے دیکھنے والوں کو متوجہ کر لیتا ہے۔ یہ محل آج بھی دھن راج محل کے نام سے مشہور ہے۔ زبیدہ اسی محل میں رانی کی طرح راج کرتی رہیں۔ آخری عمر میں آپ ذیابطیس کی شکار ہو گئیں۔ دورانِ علاج کسی غلط دوا کے سبب انھیں گگرین جیسے مہلک مرض میں مبتلا کر دیا۔ اور پاؤں گھٹنے سے کاٹ دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۹۷۰ء یا ۱۹۷۱ء کا ہے جب زبیدہ ۶۰ سال کی تھیں۔ وہیل چیئر پر ان کا وجود سمٹ گیا۔ بیٹے اور بیٹی پہلے ہی ان سے جدا ہو کر مغرب میں جا بسے

تھے۔زبیدہ کا انتقال ۱۹۹۰ء میں ہوا۔۸۲-۱۹۸۱ء میں جب فلموں کی گولڈن جوبلی کا جشن منعقد ہوا تو زبیدہ کو وہیل چیئر پر تقریب گاہ میں لایا گیا۔اس تقریب میں اندرا گاندھی مہمان خصوصی تھیں۔ڈائس سے اتر کرانھوں نے زبیدہ کا استقبال بھی کیا تھا۔اوراعزاز بھی بخشا تھا۔

☆ پری چہرہ نسیم بانو نے فلم ''اجالا'' میں اپنی آواز میں تین گانے گائے۔

☆ گلشن باورا (گیت کار) نے تشکیل پاکستان کے فسادات کے دوران اپنے والدین کوفسادیوں کے ہاتھوں قتل ہوتے دیکھا۔ان دنوں گلشن مہتہ لاہور کے ایک علاقہ شیخ پورہ میں رہتے تھے۔ان کی والدہ کے سر میں گولی ماری گئی تھی۔جب کہ ان کے باپ کے بدن کو تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کردیا گیا۔جسمانی اورذہنی طور پرشدید زخمی گلشن باورا اپنے بھائی کے ہمراہ ایک کھیت میں جا چھپے تھے۔وہ جے پور میں جہاں ان کی شادی شدہ بہن رہتی تھی۔وہاں مہاجر کی حیثیت سے رہتے ہوئے انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

☆ ساحر کی والدہ سردار بیگم ان کے والد فضل محمود کی چوتھی بیوی تھیں۔اور کہا جاتا ہے کہ فضل محمود جو کہ ایک جاگیر تھے۔انہوں نے سردار بیگم سے آخر آخر تک نکاح نہیں کیا تھا۔اور وہ اُن کے ظلم وستم کو برداشت کر کے گھر کے اندھیرے کمرے میں خاموشی سے آنسو پیتے رہتی تھیں۔لیکن ان کے انمول موتی جیسے آنسو ساحؔر سے چھپے ہوئے نہیں تھے آخر ایک دن تنگ آکر اُن کی والدہ نے فضل محمود کو چھوڑ دیا اور ساحؔر کو لے کر چلی گئیں۔

☆ آئی ایس جوہر انگریز زبان میں ماہر تھے۔اگرچہ انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔مگر اکثر وبیشتر وہ مہمان پروفیسر کی حیثیت سے آکسفورڈ یونیورسٹی میں لیکچر دینے کے لئے مدعو کئے جاتے تھے۔

☆ ۱۹۳۵ء میں نتن بوس نے اپنے موسیقاروں آر۔سی۔بورال اور پنکج ملک کے ساتھ مل

کر پلے بیک سنگنگ کا کامیاب تجربہ فلم ''بھاگیہ چکر (بنگلہ) دھوپ چھاؤں (ہندی) سے انجام دیا۔اور یہ تجربہ نہ صرف کامیاب رہا بلکہ اگلی دہائیوں میں پسِ پردہ گلوکاری کے امکانات روشن کردئے۔۱۹۳۵ء کی اس فلم ''دھوپ چھاؤں'' میں رقاصاؤں کے کورس گیت فلم میں ایک نائک کمپنی کے اسٹیج شو کے منظر میں پیش کیا گیا تھا۔اس کی فلم بندی کے دوران گیت کی پہلی دولائن کے بعد ہی سانیال نے Bad singer کے روپ میں گیت ''آج مورے گھر موہن آیو جنم جنم کے سنکٹ تارے'' (آواز کے سی ڈی) کے ابتدائی بول گائے تھے۔اس کے بعد پورا گیت دوبارہ فلمایا گیا تھا۔گیت کے بول تھے ''میں خوش ہونا چاہوں' خوش ہونہ سکوں'' اور اس گانے کی پہلی پلے بیک سنگر تھیں پارول گھوش' سرودا سرکار' اور ہری متی اس گیت میں مردانہ آوازیں بھی شامل تھیں۔اس کورس گیت میں کے سی ڈے کا ''کل سانگ' تیری گھڑی میں لاگا چور مسافر جاگ ذرا'' کا مکھڑا بھی شامل تھا۔کے سی ڈے کے یہ دونوں گانے ایک زمانے تک گھر گھر سنے گئے تھے۔مذکورہ گلوکاروں کے علاوہ پہاڑی سانیال اوراوماششی نے بھی اپنی آوازوں کا استعمال کیا تھا۔ان سبھی دس گانوں کے نغمہ نگار پنڈت سدرن تھے۔نیوتھیٹر کلکتہ کی اس فلم سے ہی پلے بیک سنگنگ کا آغاز ہوا۔اور یہی وہ انقلابی قدم تھا۔جس نے آگے چل کر محمد رفیع' لتامنگیشکر' آشا بھونسلے' مکیش' مناڈے' کشورکمار' سی ایچ آتما' نور جہاں' کے ایل سہگل' جیسے ناقابل فراموش گلوکار ہماری فلموں کو دئے۔

☆ مہاتما گاندھی کے بارے میں یہ سن کر بہتوں کو حیرت ہوگی کہ انہوں نے ایک فلم دیکھی تھی۔وہ پہلی ہندی فلم جومہاتما گاندھی نے دیکھی اس کا نام ''رام راجیہ'' تھا یہ فلم انہوں نے جانکی کیٹر میں دیکھی جہاں ان کے لئے ایک خاص شو کا اہتمام کیا گیا تھا۔اس فلم میں شوبھنا سمرتھ نے سیتا کا کردار ادا کیا تھا۔شوبھنا سمرتھ مشہور اداکارہ نوتن کی والدہ تھیں۔یہ فلم پرکاش پکچر کی تھی۔

★ دلیپ کمار اور کامنی کوشل کی فلم ''شہید'' کے دوران کافی ہنگامہ ہوگیا تھا۔ کامنی کوشل کے بھائی جو فوج میں تھے۔ ''شہید'' کے سیٹ پر ریوالور لے کر آ دھمکے تھے اور انہوں نے دونوں کو دھمکیاں دیں کہ اگر دونوں کی نزدیکیاں ختم نہیں ہوئیں تو وہ کامنی کو ختم کر دیں گے۔

★ کامنی کوشل کے بارے میں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ۸۰ سال کی عمر میں بھی تیراکی کرتی ہیں۔

★ نمّی کی مشہور پہلی فلم برسات کا پریمئیر لندن میں ہوا۔ شرکت کے لئے نمّی لندن گئی۔ وہاں مغربی فلم سازوں سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں۔ جس میں ایرول فلمین جیسی شخصیت نے بھی شرکت کی تھی۔ فلمین نے جب نمّی کے ہاتھوں کا بوسہ لینا چاہا تو نمّی نے اپنے ہاتھ جھٹک لئے اور کہا کہ میں ایک ہندوستانی لڑکی ہوں تم میرے ہاتھ کا بوسہ نہیں لے سکتے۔ اور تب اخبارات کی سرخیاں اس طرح کی تھیں ''ہندوستان کی ایک لڑکی جس نے بوسہ دینے سے انکار کر دیا''۔

★ عظیم گلوکار محمد رفیع کو دوران عمرہ مسجد نبوی کے مناروں سے اذان دینے کا شرف حاصل ہے۔

★ اپنے زمانے میں آواز کا جادو جگانے والی مشہور گلوکارہ مبارک بیگم سرکار سے ملنے والی سات سو روپے کی پنشن پر گزر بسر کرتی تھی۔ جوگیشوری (ممبئی) کے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتی تھیں۔ ان کا بیٹا ٹیکسی ڈائیور ہے۔

★ آشا بھونسلے کے ہاتھوں تباہ ہو کر موسیقار او پی نیّر نے تھانے (ممبئی) کے ایک معمولی گھر میں گزارے۔

★ دلیپ کمار نے لندن کے البرٹ ہال میں لتا کی آواز کو قدرت کا عظیم شاہکار کہہ کر سراہا ہے۔

★ اپنے زمانے کی مشہور ہیروئن اور ویمپ منورما کا حال ہی میں انتقال ہوا۔ ان کے

بارے میں معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری دن نہایت غربت وعسرت میں کاٹے۔ انھیں رہنے کے لئے ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس لئے وہ پبلک پارک کے کسی بینچ پر سو کر رات گزار لیتی تھیں۔

★ فلم 'شہید' میں دلیپ کمار کا نام منوج تھا۔ اس لئے منوج کمار اپنے پسندیدہ ہیرو سے متاثر ہو کر اپنا فلمی نام ''منوج کمار'' رکھ لیا۔

★ ہندوستان کی پہلی میلوڈی کوئن لتا منگیشکر ہمیشہ ہی نور جہاں کی فین رہی۔ یہ واقعہ ۱۹۵۱ء کا ہے جب لتا کو ایک دورے پر امرتسر جانا پڑا۔ وہاں انہوں نے مقامی حکام سے گزارش کی کہ کسی طرح سے واگیہ بورڈر میں نور جہاں سے ملاقات کا بندوبست کرا دیا جائے۔ جس کے بعد لتا کے ایک چاہنے والے پدم اوشا نے اس کا بندوبست کیا۔ اور نور جہاں کو لے کر وہ واگیہ بورڈر پہنچے۔ جہاں لتا نے بلکل تنہائی میں نور جہاں سے ایک خیمے کے اندر دو گھنٹوں تک باتیں کیں دونوں کی یہ ملاقات No Man, Sland میں ہوئی تھی۔ لتا منگیشکر نے ایک بڑ لکھا کہ میں ہمیشہ ہی ملکہ ترنم نور جہاں کی فین رہی ہوں۔ ان پر ساؤتھ شکاگو جاتے ہوئے ۱۹۷۸ء میں ملاقات کا موقع ملا تھا۔ اس زمانے میں وہاں پاکستان کا کوئی بھی سفارت خانہ نہیں تھا۔

★ سہراب مودی کی شاہکار فلم 'پکار' تھی۔ یہ ہندوستان کی پہلی فلم تھی۔ جس کی مکمل کہانی' مکالمے' گانوں کی ریکارڈ ہنر ماسٹر وائس (HMV) نے تیار کیا تھا۔

★ سہراب مودی اپنی بیوی مہتاب اور مبارک کو لے کر ہندوستان کی پہلی کلر فلم ''جھانسی کی رانی'' بنائی تھی جو بری طرح فلاپ ہوگئی تھی۔ اور سہراب مودی کی مالی حالت بھی خستہ ہوگئی تھی۔ تمام اثاثہ ختم ہوگیا۔ مہتاب نے آخر میں ایک بیوٹی پارلر میں نوکری کر لی۔

★ موسیقار مدن موہن جب وہ کسی فلم کے لئے گیت تیار کر رہے تھے۔ تو ایک موسیقار

بہت ہی بے سُرے انداز میں ستار بجارہا تھا۔ اور یہ دیکھ کر انھیں اس قدر غصّہ آیا کہ انہوں نے ہاتھ مار کر ریکارڈنگ روم کا گلاس توڑ دیا۔ انہوں نے انتہائی غصے کے عالم میں اس سے کہا کہ تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ اس قدر بے سُرا بجاتے ہوئے میرے آرکسٹرا پارٹی میں شامل ہوئے۔ بعد میں اس نے معافی مانگی تو مدّن موہن نرم پڑ گئے۔

★ ۱۹۷۳ء میں چیتن آنند کی بیحد جذباتی فلم ''ہنستے زخم'' کے ایک گیت کی ''ریکارڈنگ'' آج سوچا تو آنسو بھر آئے۔ عمر گزری ہمیں مسکرائے'' کے موقع پر لتا منگیشکر بھی بیحد جذباتی ہوگئی تھیں۔ اور گیت کے ختم ہونے سے پہلے ہی وہ رونے لگی تھیں۔

★ فلم 'سنگدل' کے اس گیت ''یہ ہوا یہ رات یہ چاندنی'' کی تیاری پر استاد سجاد خان مدن موہن پر بگڑ اٹھے تھے۔ اورانہوں نے ان پر ان کے انداز کو اپنا لینے کا الزام عائد کیا تھا۔ بعد میں مدن موہن نے خود اس کا اقرار کیا تھا کہ یہ دھن دراصل سجاد حسین ہی کی ہے۔ اور وہ انہیں نئے انداز میں ڈھال کر ایک تجربہ کررہے تھے۔

★ ایک مرتبہ جب بڑے غلام علی خان نے مدن موہن کی راگ بھیروں میں تیار کردہ یہ گیت ''قدر جانے نہ'' سنا تو انھوں نے مدن موہن کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا کہ تمہارے اندر ایک سچی لگن ہے۔ اور تم دنیا میں بہت نام کماؤ گے۔ استاد کی اس بات پر مدن موہن نے کہا تھا کہ یہ الفاظ میرے لئے ''آسکر ایوارڈ'' سے بھی بڑھ کر ہے۔

★ جب موسیقار اعظم نوشاد علی نے مدن موہن کا تیار کردہ یہ گیت ساعت کی ''حسرتوں کے داغ'' اور ''ان کو یہ شکایت ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے''۔ اور جانا تھا ہم سے دور بہانے بنا لئے (فلم عدالت) تو انھوں نے کہا تھا کہ اس دور کا سب سے ذہین اور عمدہ موسیقار مدن موہن ہی ہے۔

★ موتی لال نے ۱۹۳۶ء میں شادی کی تھی۔ جس میں سر جنی نائیڈو جیسی عظیم المرتبت خاتون شریک ہوئی تھیں۔

★ ۱۹۳۷ء میں درگا کھوٹے نے فلم 'ساتھی' کی ہدایت وفلمسازی بھی کی اور ہندوستانی سنیما میں اس طرح وہ پہلی خاتون ہدایت کار بنیں۔ جس کا شور پورے ملک میں ہوا۔

★ درگا کھوٹے نے ٹی وی سیریل ''واگلے کی دنیا'' بنائی۔

★ درگا کھوٹے نے مراٹھی زبان میں اپنی سوانح عمری لکھی جسے انگریزی میں ترجمہ کیا گیا۔ جس کا عنوان ''آئی درگا کھوٹے'' رکھا گیا۔

★ درگا کھوٹے کے بھائی نندو کھوٹے خاموش فلموں میں کام کرتے تھے۔ جن کی بیٹی شوبھا کھوٹے اور بھائی وجو کھوٹے نے فلم ''شعلے'' میں کالیا کا کردار ادا کیا تھا۔

★ موسیقار اے آر رحمٰن نے لاس اینجلس بیورلی ہلز میں فلم ''سلم ڈاگ میلینئر'' (Slum dog millaniar) میں بہترین موسیقی کے لئے ''سالانہ گولڈن گلوب ایوارڈ'' جسے آسکر ایوارڈ کے بعد دوسرا سب سے بڑا ایوارڈ مانا جاتا ہے حاصل کیا۔ نومبر ۲۰۰۸ء میں امریکہ میں نمائش کے لئے ریلیز کی گئی۔ یہ فلم اب تک ۶۴ ایوارڈ حاصل کرچکی ہے۔

★ فلم ساز ہدایت کار کے آصف نے ایک فلم ''جانور'' کے نام سے شروع کی تھی۔ جس میں دلیپ کمار اور ثریا مرکزی رول میں تھے اور فلم کی پانچ چھ ریل بھی تیار ہوچکی تھی۔ لیکن اسی زمانے میں دلیپ کمار اور ثریا کے درمیان ان بن ہوگئی تھی۔ دلیپ یوں بھی کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ چاہے وہ مینا کماری ہو، مدھو بالا ہو، کامنی کوشل ہو یا نرگس ہو لیکن دلیپ صاحب کو ثریا نے کوئی جملہ کہہ دیا تھا۔ پھر دوسرے ہی دن فلم جانور کے ایک سین میں دلیپ کمار کو ثریا کو ایک تھپڑ مارنے کا سین تھا۔ اس دن دلیپ نے اپنا سارا غصّہ حقیقی تھپڑ مار کر پورا کرلیا تھا۔ جب زوردار تھپڑ کے بعد ثریا دور جا گری تھی۔ تو شوٹنگ درہم برہم ہوگئی تھی۔ اور ثریا نے کہلوا بھیجا کہ اس جانور کے ساتھ وہ فلم کی شوٹنگ مکمل نہیں کرے گی۔ کے آصف نے ثریا کو لاکھ سمجھایا پر وہ نہیں مانی تب انھوں نے ثریا کے سامنے دلیپ کمار سے کہا وہ ان سے معذرت کرلے

تو دلیپ کمار نے کہا کہ اگر انھیں فلم مکمل کرنے کے لئے ایسی عورت سے معذرت کرنا پڑے تو اس سے یہی بہتر ہے کہ فلم ڈبّہ میں بند ہوجائے۔ثریا کی موت کے بعد کسی نے دلیپ صاحب سے پوچھا کہ اس کے ساتھ فلم مکمل نہ ہونے کا افسوس تو ہوگا جس پر دلیپ نے کہا تھا اگر وہ فلم مکمل ہوگئی ہوتی تو آج مجھے افسوس ہوتا۔

★ ہدایت کار بھیم سین نے ۱۹۶۹ء میں جب فلم ''آدمی'' دلیپ کمار، منوج کمار، اور وحیدہ رحمٰن کو لے کر شروع کی تو فلم کے ایک گیت کو ڈوئیٹ میں محمد رفیع اور طلعت محمود کو گانا تھا گیت کے بول تھے''کیسی حسین آج خوابوں کی رات ہے۔ایک چاند آسماں پر ہے ایک میرے ساتھ ہے''۔اس گیت کے ریکارڈنگ پہلے محمد رفیع اور طلعت محمود کی آواز میں ہوگئی اور گیت اوکے کردیا گیا۔لیکن جب منوج کمار کو پتہ چلا کہ انہیں طلعت محمود کی آواز میں گیت گانا ہے تو وہ بگڑ گئے۔اور آدھی رات کو نوشاد صاحب کے گھر پہنچے اور ان سے مطالبہ کیا کہ اس گیت میں انھیں طلعت محمود کی آواز پسند نہیں وہ مہندر کپور کو چاہتے ہیں لہٰذا وہ گیت دوبارہ ریکارڈ کرایا جائے۔ورنہ وہ اس فلم میں مزید کام نہیں کریں گے۔اس تنازع پر بھیم سین بھی پریشان ہوگئے جس کے بعد دلیپ صاحب نے طلعت محمود سے ملاقات کی تو وہ بخوشی اس گیت سے الگ ہوگئے۔اور بعد میں مزید چار لاکھ روپے خرچ کر کے مہندر کپور کے ساتھ محمد رفیع نے ڈوئیٹ گایا۔

★ ۱۹۴۶ء میں کے آصف نے چندر موہن، نرگس اور سپرو کو لے کر فلم ''مغلِ اعظم'' شروع کی تھی۔مگر چندر موہن کے اچانک مرنے سے مغلِ اعظم کا پروجیکٹ بند ہوگیا۔انھوں نے اپنا پروجیکٹ تیار کیا نرگس اور سپرو کی جگہ مدھو بالا اور دلیپ کمار کے ساتھ پرتھوی راج کپور کو کاسٹ کیا اور پورے جاہ وجلال کے ساتھ فلم کی شوٹنگ شروع کردی۔

★ 'مغلِ اعظم' میں انارکلی اور سلیم کی لازوال محبت نے جلتی پر تیل کا کام کیا دلیپ

اور مدھو بالا بھی ایسے ہی حالات میں گھرے اپنا گوہرِ مقصود پانے کے لئے بیتاب تھے۔سلیم تو اپنے شہنشاہ باپ سے ٹکرانے کی ہمت رکھتا تھا مگر مدھو بالا کے باپ عطاء اللہ خاں جیسے جلادصفت باپ سے بغاوت کی ہمت نہ تو بیٹی میں تھی اور نہ دلیپ کمار میں چودہ سال تک مغلِ اعظم بنتی رہی اور خاموش محبت کرنے والے اندر ہی اندر سلگتے رہے۔سیٹ پر شوٹنگ کے ہر شاٹ کے بعد مدھو بالا کو اپنے باپ کے حضور میں حاضر رہنا پڑتا تھا۔پیک اپ کے بعد ایک لمحہ ضائع کئے بنا عطاء اللہ خاں مدھو بالا کو لے جایا کرتے تھے۔دلیپ کمار، مدھو سے شادی کے خواہش مند تھے۔اس مقصد سے انہوں نے اپنی بہن سکینہ یعنی بڑی آپا کو عطاء اللہ خاں کے پاس بھیجا۔مگر اس سنگ دل انسان نے انھیں ٹکا سا جواب دے کر الٹے پیروں لوٹا دیا۔

★ ایم صادق کی فلم ''سیّاں'' ۱۹۵۱ء کی اس فلم میں ایک شارٹ تھا۔جس میں سجّن انتہائی غصّے کے عالم میں مدھو بالا کو مارتے ہیں۔اور بالوں کو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے سیڑھیوں پر لے جاتے ہیں۔مدھو بالا تکلیف کی تاب نہیں لاسکیں اور بے ہوش ہوجاتیں۔ہوش میں آنے پر شاٹ لیا جاتا ہے۔پھر بے ہوش ہوجاتی ہیں۔جب وہ تیسری بار بے ہوش ہوئیں تو ایم صادق نے ڈپلی کیٹ لینا چاہا مگر مدھو بالا نے انکار کردیا۔اور آخرکار چوتھے شاٹ میں انھوں نے یہ سین مکمل کیا۔یہ اذیت پسندی ہی انھیں ضد پر آمادہ کرتی رہیں۔آخر میں انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔حتیٰ کہ وہ اپنی فلم کے پریمیئر شو پر بھی نہیں جاتی تھیں۔

★ امیتابھ بچن کو لے کر بنائی فلم ''زنجیر'' سے پرکاش مہرہ اور امیتابھ بچن کی قسمت کا ستارہ چمکا حیران کردینے والی بات یہ ہے کہ پرکاش مہرہ نے صرف ایک روپے میں امیتابھ کو فلم ''زنجیر'' کے لئے سائن کیا تھا۔اسی فلم کے بعد امیتابھ بچن کو ''اینگری ینگ مین'' کا خطاب ملا۔

★ موسیقار نوشاد کا ایک واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔لکھنؤ میں 'مائٹول اینڈ سنس' کی موسیقی کے

آلات کی دکان تھی۔ جسے موسیقی کے دیوانے نوشاد حسرت بھری نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔روز آنہ آنے پر مالک نے پوچھا آپ روز آنہ کیوں کھڑے رہتے ہیں۔نوشاد صاحب نے کہا۔میں آپ کی دکان میں کام کرنا چاہتا ہوں ان کا مقصد تھا کہ وہ کام کے بہانے موسیقی کے آلات پر ریاض کر سکیں۔ایک دن موسیقی کے آلات پر ریاض کرنے کے دوران مالک کی نظر نوشاد پر پڑ گئی۔انہوں نے ڈانٹ دیا کہ تم نے موسیقی کے آلات کو گندہ کر دیا ہے۔لیکن بعد میں انھیں لگا کہ نوشاد نے بہت سریلی دھن تیار کی ہے۔تو مالک نے انھیں نہ صرف موسیقی کے آلات تحفے میں دئے بلکہ انھیں موسیقی سیکھنے کا انتظام بھی کر دیا۔

★ فلمساز دوار کا داس سمپت نے ۱۹۱۸ء میں فلم ''راجہ شری پال'' اور ''رام ونواس'' جیسی خاموش فلموں کی تخلیق کی ''رام ونواس'' ۳۲ حصوں کا طویل سیریل تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس خاموش فلم کے مکالمے موہن لال دوے نے لکھے تھے۔عجیب اس لئے کہ اداکار پردے پر Lipsing کرتا تھا۔اور اسے Lipsing کے لئے مکالمے تیار کرنے پڑتے تھے۔یہ فلم میجسٹک سنیما میں چار ہفتے چلی اس سے قبل خاموش فلموں میں اداکار صرف اداکاری کرتے تھے لیکن سمپت نے ہی اداکاروں کو مکالمے دے کر سب سے پہلے Lipsing کرنے کو کہا تاکہ اداکاری منظر کے مطابق کی جا سکے۔

★ سمپت نے اپنی فلم ''کٹورا بھر خون'' کے سب ٹائٹل چار زبانوں گجراتی، مراٹھی، انگریزی اور اردو میں دئے تھے۔

★ فلمساز سمپت نے کلکتے سے دو عورتوں گڈی اور اوشا کو بمبئی بلا کر فلموں میں اداکاری کروائی فلم تھی۔''کچ دیویانی'' اسی فلم سے پہلی بار فلموں میں گجراتی ماحول دیکھنے کو ملا ''گجراتی گربا'' سے سجی یہ پہلی ہندی فلم تھی۔

★ فلمساز سمپت نے ایک کارنامہ اور کیا خاموش فلموں کو دکھاتے وقت پردے کے پیچھے

سازندوں کو بٹھایا۔پردے پر جب رقص کا منظر آتا تو وہ سازندے کے مطابق گانے گاتے تھے۔جس سے فلم دیکھنے والوں کی دلچسپی اور بڑھ جاتی تھی۔سمپت نے ہی سب سے پہلے ہال میں روشنی کے لئے پیٹرومیکس کا استعمال کیا۔

★ مالا سنہا خود بھی ایک اچھی گلوکارہ تھی۔اور آل انڈیا ریڈیو میں اپنے کئی گیت ریکارڈ کرا چکی تھی۔لیکن کسی بھی فلم میں خود اپنے اوپر فلمائے گیت گانے کا موقع نہیں ملا۔
خواجہ احمد عباس اردو کے مشہور شاعر مولانا الطاف حسین حالؔی کے نواسے تھے اور ان کا شجرۂ نسب مشہور صحابی حضرت ایوب انصاریؓ سے ملتا تھا۔ان کی والدہ مسرور خاتون ایک نیک اور دیندار خاتون تھیں۔

★ بروز سنیچر ۲۶ ستمبر ۲۰۰۹ء کو مشہور سپر اسٹار سلمان خان نے شہرۂ آفاق کلب محمڈن اسپورٹنگ (کلکتہ) کے نئے ٹنٹ کا فیتہ کاٹ کر افتتاح کیا۔جہاں اس تاریخ ساز کلب نے سلمان خان کو تاحیات کلب کی رکنیت عطا کی۔جسے قبول کرنے کے بعد سلمان خان نے کہا یہ میرے لئے بہت بڑا اعزاز ہے۔

★ سورگباشی سنجیو کمار نے فلم ''نیا دن نئی رات'' میں ۹ کردار نبھائے تھے۔بعد میں جنوبی ہند کے اداکار کمل ہاسن نے فلم ''وشواوقار'' میں ۱۰ الگ الگ کردار نبھائے ہیں اس کے بعد اداکارہ پر ینکا چوپڑہ نے فلم ڈائرکٹر اسوتوش گواریکر کی فلم ''وہاٹ از یور راشی'' میں ۱۲ کردار نبھائی۔دنیا کی کسی ہیروئن نے کبھی ایک فلم میں ایک ساتھ ۱۲ کردار نہیں نبھائی۔اس اعتبار سے یہ فلم بالی ووڈ کی تاریخ بن گئی۔

★ ''بڑی ماں'' وہ واحد فلم تھی جس میں لتا منگیشکر اور نور جہاں نے پلے بیک دیا تھا شاید یہی وجہ تھی جس نے لتا کو نور جہاں کی گائیکی کا عقیدت مند بنا دیا تھا نور جہاں کے پاکستان جانے کے بعد لتا پابندی سے نور جہاں کو فون کرتی رہیں اور ہندوستان کی میلوڈی کوئین کی ہر صبح کا آغاز نور جہاں کے گیت سن کر ہوتا تھا۔

★ قوالی ''آہیں نہ بھریں شکوے نہ کئے کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا'' گیت کار نخشب

جار چوی تھے۔اس قوالی کو زہرہ بائی امبالا والی،کلیانی اور نورجہاں نے مل کر آوازوں میں ڈھالا تھا۔یہ قوالی نہ صرف ریکارڈ کی فروخت بلکہ سنجیدہ اور غیر سنجیدہ ہر طبقے کے دلوں پر اس طرح اثر انداز ہوئی کہ زمانہ اس کی مثال دیتا ہے۔اس قوالی سے ہی فلموں میں قوالی کا چلن شروع ہوا تھا اس قوالی کی طرز موسیقار حفیظ خان نے بنائی تھی۔

★ ۱۹۶۱ء میں کراچی پاکستان میں وہاں کی ای ایم آئی نے طلعت محمود کو پہلا سلور ڈسک دیا جو کسی بھی ایشیائی کے لئے یہ پہلا اعزاز تھا اور اس سے زیادہ اعزاز و مقبولیت کی سند یہ رہی کہ اسی سال کراچی میں طلعت محمود کے پروگرام میں ۶۱ ہزار شیدائی اسٹیڈیم میں موجود تھے جن میں ۹۰ فیصد تعداد عورتوں کی تھی۔۱۹۹۴ء تک وہاں کے کسی بھی غزل کے پروگرام میں اتنے شیدائی جمع نہیں ہوئے۔

★ ہندی، تامل اور تیلگو فلموں کے مشہور فلم ساز، ہدایت کار ایل وی پرساد نے ہندوستان کی پہلی متکلم فلم ''عالم آرا''، تامل زبان کی پہلی متکلم فلم ''کالی داس'' اور تیلگو زبان کی پہلی متکلم فلم ''پرہلاد'' میں بھی انہوں نے اداکاری کی تھی۔

★ فلم ساز ایل وی پرساد نے حیدرآباد میں L.V Prasad Eye__ Institute and Hospital کی تعمیر کرائی۔ پورے ملک میں یہ آنکھوں کے امراض کی تشخیص اور علاج کے لئے جدید ترین ہسپتال مانا جاتا ہے۔پرساد صاحب کا یہ ایک عظیم اور یادگار کارنامہ ہے۔

★ بلراج ساہنی جو نہ صرف کمیونسٹ خیالات کے حامل تھے بلکہ کمیونسٹ پارٹی کے ایک بہت ہی سرگرم کارکن تھے۔ایک بار ایک قانون کی خلاف ورزی پر انہیں جیل بھیج دیا گیا تھا۔

★ زیادہ ریکارڈس فروخت کئے جانے پر I.M.I نے ''گولڈن ڈسک'' ۱۹۷۵ء میں پیش کیا۔

★ داداصاحب پھالکے ایوارڈ سب سے پہلے دیویکا رانی کو دیا گیا۔

★ اداکارہ پیس کنول کو لینوس مقابلے میں دوسرے نمبر پر آنے والی حسینہ تھی۔

★ سیتادیوی کی فلم ''کپال کنڈلا'' ہندوستان کی پہلی سلور جوبلی فلم ہے۔

★ بیگم پارہ دوسری اداکاراؤں کی بہ نسبت بیگم پارہ اپنی اپنی ماڈرن امیج کی وجہ سے نیوز میں ممتاز مقام پاتی رہیں۔امریکہ کے مقبول ترین میگزین ''لائف'' کے کور پیج پر جب ان کی مدہوش کن بیباک تصویر شائع ہوئی تو ان کی شہرت اور ان کی مقبولیت بین الاقوامی سطح پر جا پہنچی کہا جاتا ہے کہ امریکہ اور کوریا کی جنگ کے دوران ''لائف'' میں شائع تصاویر امریکی فوجیوں کے بیرکوں کی دیواروں پر چسپاں دیکھی گئی تھیں___اس شہرت کی وجہ سے بیگم پارہ کو "Pinup Girl" کا خطاب دیا گیا تھا۔

★ یہ بات صداقت پر مبنی ہے کہ پروتیما داس گپتا نے جب فلم ''چھمیا'' میں اپنے شوہر حق کو عارف کے نام سے ہیرو بنایا تو بیگم پارہ نے تو اپنے حقیقی بھائی کے مقابل ہیروئن کا رول ادا کیا تھا۔

★ لتا منگیشکر نے اپنے ابتدائی دور میں ''آنند دھن جھدم'' کے نام سے فلموں میں موسیقی بھی دی ہے۔

★ موسیقار ہمنت کمار کے معاون کے طور پر کام کرتے ہوئے فلم ''آنند مٹھ'' کے مشہور حب الوطنی نغمہ ''بندے ماترم۔۔۔'' کے کورس میں موسیقار روی نے بھی اپنی آواز دی ہے۔

★ ملکۂ غزل بیگم اختر کی ماں مشتری بائی درباری گلوکارہ تھیں۔

★ محبوب خان کی فلم ''روٹی'' میں بیگم اختر نے گانے کے ساتھ فلم میں اداکاری بھی کی تھی۔

★ فلم ''ویرگٹو تیج (۱۹۷۰ء) میں مشہور پہلوان چندگی رام کو پہلی مرتبہ فلم میں پیش کیا گیا تھا۔

★ مکالمہ نگار ابرار علوی نے فلم ''بارہ بجے'' (۱۹۵۸ء) میں پولس انسپکٹر کا رول اور ۱۹۷۶ء میں بنی فلم لیلیٰ مجنوں (رشی کپور۔رنجیتا) میں ایک عرب شیخ بدو کا رول کیا تھا اس کے علاوہ اس فلم میں مکالمہ اور اسکرین پلے بھی لکھے تھے۔

★ ایک فلم کی شوٹنگ کے دوران جب ایک کشتی پر ایک گیت فلمایا جارہا تھا تو کشتی اچانک ڈوب گئی اس وقت دیو آنند نے ثریا کو اپنی جان پر کھیل کر ڈوبنے سے بچالیا تھا اس کے بعد ثریا دیو آنند کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔

★ اچلا سچدیو کسی زمانے میں جن وادی لیکھک سنگھ اور ترقی پسند مصنفین میں بے حد مقبول تھیں اور ان کی میٹنگوں میں اکثر و بیشتر شرکت کے لئے کولکتہ آیا کرتی تھیں کلکتہ کی سب سے قدآور اور عظیم ادبی شخصیت حضرت سالک لکھنوی کی رہائش گاہ پر ٹھہری تھیں ان دنوں کیفی اعظمی مرحوم اور پاکستان کی ایک شاعرہ بھی وہاں ٹھہری ہوئی تھیں ان کی موجودگی میں ایک ادبی شام منائی گئی تھی جس میں مشہور افسانہ نگار، صحافی، مبصر اور فلم رائٹر خورشید اختر فرازی بھی موجود تھے۔ اچلا سچدیو نے ۱۹۶۰ء میں کرشن چندر' خواجہ احمد عباس، ساحر لدھیانوی، اور کیفی اعظمی وغیرہ کے ساتھ ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں سرگرم حصہ لیا کرتی تھیں۔

★ اچلا سچدیو نے دہلی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا تھا۔ ۱۹۸۳ء کی ریلیز فلم ''نائن آورس ٹو راما'' (Nine hours to Rama) اور ۱۹۶۳ء کی ریلیز اسمٰعیل مرچنت کی فلم ''دی ہاؤس ہولڈر (The house holder) میں بھی اداکاری کی ان فلموں کا ٹائٹل انگریزی میں تھا۔

★ فلم ایکٹر اتم کمار کشتی' تیراکی' گھوڑسواری' اور ٹینس میں بیحد دلچسپی رکھتے تھے وہ بھوانی پور سوئمنگ ایسوسی ایشن میں لگاتار تین سال تک چمپئن ہوئے۔

★ ریڈیو سیلون کا مشہور پروگرام ''بنا کا گیت مالا'' کی خصوصیت یہ تھی کہ روزآنہ 7-75 بجے صبح پروگرام کا آخری گیت سہگل کا گایا ہوا گیت بجانا لازمی تھا۔ ۱۹۵۴ء میں ریڈیو سیلون پر مامور ہندوستان نژاد ایک افسر وجے کشور نے لازمی کیا تھا۔

★ ڈائرکٹر اور فلم ساز ایل وی پرساد نے پہلی بولتی ہندی فلم ''عالم آرا'' پہلی بولتی تامل فلم ''کالی داس'' اور پہلی بولتی تیلگو فلم ''پرہلاد'' میں بے نظیر ایکٹنگ کی۔

★ دیویکا رانی کی وصیت تھی کہ آخری رسوم بنگالی براہمن دھرم کے مطابق انجام دی جائیں۔ ان کی چتا کی راکھ کا تھوڑا سا حصّہ دریائے بیاس میں بہایا جائے اور بقیہ راکھ کلو وادی میں ان کے سسر کے قریب دفن کردی جائے۔ وہاں ایک چھوٹی سی سمادھی بھی بنائی جائے اور اس کے پتھر پر لکھا جائے ''اچھوت کنیا'' اس فلم کا نام ہے جس میں دیویکا رانی نے کام کیا تھا اور جسے ان کے پہلے شوہر ہمانسورائے نے بنائی تھی۔

★ نور جہاں ذوالفقار علی بھٹو اور اعلیٰ فوجی عہدیداروں کو صرف اس لئے بری طرح پھٹکار دیا کرتی تھیں کہ وہ اونچی آواز میں باتیں کررہے ہوتے تھے اتنا ہی نہیں یحییٰ خاں نور جہاں کے اتنے مرید ہوگئے تھے کہ ایک بار ایک مجرم کو نور جہاں نے عام معافی دلادی تھی جسے پھانسی کی سزا ہوچکی تھی۔

★ نور جہاں کے گائے گیتوں کے لوگ اس قدر دیوانے رہتے تھے کہ کہا جاتا ہے کہ جب نور جہاں نے پہلی بار پاکستان ٹی وی کراچی پر اپنے نغمے پیش کئے تو تمام بازار بند ہوگئے تھے اور سڑک پر چلتا ٹرافک رک گیا تھا۔

★ ایک اندازے کے مطابق گلوکارہ نور جہاں نے ۱۹۳۶ء سے ۲۰۰۰ء تک تقریباً ۶۰۰۰ ہزار اردو اور پنجابی گیت گائے تھے ان کا پہلا گیت پنجابی تھا جو ۹ سال کی عمر میں اپنی پہلی فلم ''پنجاب دی کڑی'' میں ''لنکھ پتن چناؤ دا آجا یار'' اور آخری گیت بھی پنجابی ہی تھی جس کا مکھڑا تھا ''کیا دم دا بھروسہ'' انہوں نے ہندوستان کی ۱۳ اور پاکستان کی ۱۳ فلموں میں ہیروئن کے رول ادا کئے۔

★ جس نور جہاں کے ایک التجا پر فلم صنعت اور سیاست اپنے فیصلے بدل دیا کرتی تھی بعد از مرگ ان کے جنازے میں بہت کم لوگوں نے شرکت کی۔ مسلم رہنماؤں نے نور جہاں کو قبرستان میں دفنانے اور ان کی نمازِ جنازہ پڑھانے پر سخت اعتراض کئے تھے مگر اللہ تعالیٰ کے بھید اللہ ہی جانتا ہے نمازِ جنازہ بھی ہوئی شب قدر کی ۲۷ رشب

بھی انھیں ملی اور رمضان المبارک کا مہینہ بھی انھیں نصیب ہوا۔

★ ماسٹر نثار اپنے زمانے کے بیحد مشہور آرٹسٹوں میں سے تھے لوگ ان کی گلوکاری کی اسٹیج پر فدا تھے ماسٹر نثار نے بہت کم عرصے میں اتنی دولت حاصل کی جتنی کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے اپنے زمانے کی سب سے مہنگی اور خوبصورت موٹر گاڑیاں ان کے پاس تھیں۔ کئی کئی نوکر چاکر غرض کہ عیش و آرام کی ہر چیز موجود تھی ان کے پاس۔ مگر وہ اس دولت کو سنبھال کر نہ رکھ پائے اور ایک دن کنگال ہو بیٹھے حالات نے انھیں در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا خراب دنوں میں ان کے تمام دوست احباب نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ آخری عمر میں کمائی پوری جیسی بدنام بستی کی ایک کھولی میں اپنی زندگی کے باقی دن گزارنے پڑے۔ اور وہیں اندھیری کھولی میں دم توڑ دیا۔ ان کے جنازے میں بھی جانے والا کوئی نہ تھا۔ رام اورنگ آبادی، چندر شیکھر، اختر اور پاکستان میں رہنے والے ماسٹر نثار کے برادرِ نسبتی ہی جنازے میں شریک ہوئے تھے۔

★ دیویکا رانی کے شوہر مسٹر رودک نے جو جائداد اور دولت چھوڑی وہ ۱۴۵۷ ایکڑ زمین جو (تاتا گنی اسٹیٹ کہلاتی ہے) کلّو میں سیب کے کئی باغ، بنگلور میں صندل کے بہت سے درخت، دو پکچر آرٹ گیلری، متعدد سونے کے ہار، سونے کے سکّوں کا ایک ہار، قیمتی پتھروں والی سولہ انگوٹھیاں، قیمتی ملبوسات سمور کے کئی کوٹ، پانچ ٹن صندل کی لکڑی، گوتم بدھ کی تختی اور نیپالی مورتیاں اور سوئزرلینڈ کے ایک بینک میں ۳۴ میلین ڈالر پر مشتمل ہے۔

★ بھگوان رام کی عظیم شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ۱۹۱۲ء سے مسلسل پیش کیا جاتا رہا ہے رامائن پر سب سے پہلی فلم مختصر فلم کے طور پر ''رامائن کا ایک کانڈ'' بنی تھی۔ رام بھگوان کے موضوع پر اب تک اکسٹھ (۶۱) فلمیں بن چکی ہیں ان میں سے سولہ (۱۶) خاموش فلمیں اور ۴۵ فلمیں متکلم تھیں۔

★ ۱۹۲۲ء میں کلکتہ میں مدن تھیٹریکل کمپنی والوں نے ایک فلم رامائن بنائی تھی اس فلم کے ۲۰ ابواب تھے ہر ہفتے اس فلم کے سات ابواب دکھائے جاتے تھے یعنی اس فلم کا شو تین دن میں مکمل ہوتا تھا اس اعتبار سے یہ اب تک کی طویل ترین فلم ہے۔

★ پران نے اپنے کیریئر کی ابتدا میں شملہ کے ایک مقامی ''رام لیلا'' میں سیتا کا کردار نبھا کر اداکاری کی دنیا میں پہلا قدم رکھا۔

ہندی سنیما میں پران پہلے ایسے اسٹائلسٹ ایکٹر ہیں جنھوں نے ہر مرتبہ نئی ورائٹی پیش کرنے کے لئے مختلف گٹ آپ کسٹیوم اور خاص طور سے سگریٹ کا ٹریڈ شروع کیا۔

★ اداکارہ آشا پاریکھ فلم سنسر بورڈ کی چیئر پرسن بننے والی پہلی خاتون ہیں۔

★ ۱۹۳۲ء میں ریلیز فلم ''ششی پونون''، نورجہاں کے سنے کیریئر کی پہلی بولتی فلم تھی۔

★ ۱۹۵۱ء میں نورجہاں فلم ''چانوئے'' کا ڈائرکشن دے کر پہلی خاتون ڈائرکٹر بن گئیں۔

★ موسیقار روی سری لنکا میں اعزاز و انعامات حاصل کرنے والے پہلے موسیقار ہیں۔

★ استاد علی اکبر خان (کلاسیکل سنگیت) پہلے ہندوستانی موسیقار تھے جنھوں نے امریکہ کے ٹیلی ویژن پر نشر کرنے کے لئے سرود کا ایک LP ریکارڈ تیار کیا تھا۔

★ فلم انڈسٹری کی تاریخ میں پہلا موقع تھا جب ایک کردار کے لئے دو اداکاروں (ستیش کوشک اور انوپم کھیر) کو فلم ''رام لکھن'' کے لئے بہترین کامیڈی کا فلم ایوارڈ ملا تھا۔

★ خاموش اور بولتی فلموں کی اداکارہ گوہر جان کی تصویر اس دور میں سلائی کے ڈبے پر امریکہ میں چھپتی تھی۔

★ فلم انڈسٹری کی تاریخ کا پہلا موقع تھا جب مہاتما گاندھی ممبئی کے گالیا ٹینک کے کرانتی میدان میں کرانتی کا نعرہ لگا رہے تھے تو اس سبھا میں پرتھوی راج کپور کے ساتھ ان کا ۶ سالہ بیٹا ششی کپور بھی موجود تھا۔

★ مشہور فلمساز اور کہانی کار خواجہ احمد عباس کو صحافت سے ان کے عشق کا یہ عالم تھا کہ انہوں

نے یہ وصیت کر دی تھی کہ ان کے مرنے کے بعد اردو، ہندی اور انگریزی ''بلٹز'' کے آخری صفحات سے ہی ان کا کفن تیار کیا جائے اور اسی میں انھیں دفنایا جائے۔

☆ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ عظیم ہدایت کار محبوب خان فلم ''علی بابا چالیس چور'' کے چالیس چوروں میں ایک چور کا کردار محبوب خان نے کیا تھا۔

☆ وی شانتا رام نے ۱۹۳۳ء میں ہندوستانی سنیما کو پہلی رنگین فلم ''سیر یندھی'' عطا کی اس کا رنگین پرنٹ برلن میں تیار ہوا تھا۔

☆ ۱۹۵۳ء میں ضیا سرحدی نے فلم ''فٹ پاتھ'' میں مینا کماری کو دلیپ کمار کے مقابل پیش کیا اس فلم میں مینا کماری نے پہلی بار دلیپ کمار کا سامنا کیا تھا یہ فلم جذبات کی خاموش داستان بھی تھی جس میں یہ شناخت کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ کون سب سے بہتر جذباتی اداکار ہے دونوں ہی ایک دوسرے کے مدمقابل تھے۔اس فلم سے مینا کماری کو ''خاتون دلیپ کمار'' کا لقب دیا گیا تھا۔

☆ سیٹھ چندو دلال شاہ کے بارے میں سنا گیا کہ وہ اپنے آخری دنوں میں اپنے ہی اسٹوڈیو کے باہر اپنی بنائی ہوئی فلموں کے فوٹو اور پوسٹر بیچتے ہوئے دیکھے گئے۔

☆ ۱۹۲۰ء میں خاموش فلم ''کرشن سداما'' میں مرکزی کردار خلیل نے ادا کیا تھا اور یہی خلیل فلم انڈسٹری کا پہلا مسلم کردار تھا جس نے فلمی دنیا میں قدم رکھا۔

☆ فلموں میں زبیدہ پہلی مسلم اداکارہ تھی جس نے پہلی بولتی فلم ''عالم آرا'' میں ہیروئن کا کردار نبھایا تھا۔

فلمی ستاروں کے اصل نام

فلمسٹار	اصل نام	فلمسٹار	اصل نام
اشوک کمار	کمند لال گنگولی	ایس ایچ بہاری (گیت کار)	شمس البدیٰ بہاری
امیتابھ بچن	امیتابھ رائے بچن	اے آر۔رحمان (موسیقار)	(پہلا نام شیکھر۔اللہ رکھا خان
اجیت	حامد علی خاں		(ایس دلیپ کمار)
آشا ماتھر	سوہن دھرم سنگھ	اتم کمار	ارون کمار چٹرجی
اکشے کمار	راجیو بھاٹیہ	اوشا کرن	اوشا مراٹھے
امیتا	قمر سلطانہ	اندیور (شاعر)	شیام لال راؤ
آکاش کمار	وحیدالدین خاں	آغا	آغا جان بیگ
آئی ایس جوہر	اندرسین جوہر	این دتا (موسیقار)	نائک دتّہ
امجد خاں	امجد جاوید جاریہ خاں	اسمٰعیل مرچنٹ	اسمٰعیل نور محمد عبدالرحمٰن
ارمان شہابی (مصنف)	جوگندر سنگھ	ایس ڈی رمن (موسیقار)	سچن دیو برمن
او۔پی۔رلہن	اوم پرکاش رلہن	آر ڈی رمن (موسیقار)	راہول ڈے برمن
اسین	اسین بھوٹکل	الکا	فردوس جہاں
ایم اے خاں	محمد عطا خاں	ایل وی پرساد	اکنی لکشمی والا راؤ
ایچ ایس راول	ہرنام سنگھ راول	آر۔سی بورال	رائے چند بورال
ایس ایم ساگر	سید محمد ساگر	او پی نیّر (موسیقار)	اونکار پرساد/اوم کار پرشاد نیّر
آنند بخشی (موسیقار)	آنند پرکاش بخشی	این اے انصاری	نثار احمد انصاری
اسرانی	گوردھن کمار	اسمعیل مرچنٹ	اسمعیل نور محمد عبدالرحمٰن
اے کے ہنگل	اوتار کرشن ہنگل	بی آر چوپڑہ	بلدیو راج چوپڑہ
آدیتہ پنچولی	نرمل	بابی دیول	اجے دیول

فلمسٹار	اصل نام	فلمسٹار	اصل نام
ببیتا دیوی	آئرس گیئر	پردیپ کمار	سنیل بانا پپال
بلراج ساہنی	یدھسٹر	تنویر نقوی	سید خورشید علی
بی آر اشارہ (ہدایتکار)	بابو رام اشارہ	تبّو	تبسّم ناز
بی ناگی ریڈی	بومی ریڈی ناگی ریڈی	تیواری	رمیش تیواری/اربند کمار تیواری
بینا رائے	کرشنا سرین	ٹن ٹن	اوما دیوی
بیگم اختر	اختر بائی	ٹینا مونیم	نوروتی/نپور
بے بی ناز	سلمہ سلطانہ	ٹوئنکل کھنّہ	ٹینا کھنّہ
بی آر مہرہ (ہدایتکار)	برکت امام مہرہ	ثریا	ثریا جمال شیخ
بھگوان داس	اباجی پانڈو	جیون	اُونکار ناتھ در
برج (ہدایتکار)	برج سدانا	جی ایم درانی	غلام مصطفٰے درانی
بی این سرکار	بریندرناتھ سرکار	جے کشن (موسیقار)	جے کشن دیا بھائی نچپال
بی ایم ویاس	برج موہن ویاس	جانی لیور	جان راؤ
پران	پران ناتھ سکند	جانی واکر	بدرالدین
پیشینس کوپر	صابرہ	جبیں	مہہ جبیں جلیل
پریا	پریاراجونش	جیکی شروف	جے کشن
پردیپ (شاعر)	رامچندر نارائن دیو ویدی	جان ابراہم	فرحان
پورنیما	مہر	جگدیپ	اشتیاق احمد
پرمیلا	ایستھر وکٹوریہ	جتیندر	روی کپور
پرتی بالا	قمر سلطانہ/زیب النساء	جینت	محمد زکریا
پولسن	نریندر کمار	جیراج	جے راج پیڈا
پپّو (ہدایتکار)	موسیٰ ناصر علاؤالدین	چاندنی	مرنالی نودیتا کماریا

فلمسٹار	اصل نام	فلمسٹار	اصل نام
چندو آتما (گلوکار)	چندو ہشمت رائے	رینو کا دیوی	خورشید
چارلی	نور محمد	روپ مالا	ممتاز
چترا	افسر بانو	راج کپور	رنبیر راجکپور
چنچل	زیب	رتن کمار	نذیر احمد
حسرت جے پوری (شاعر)	محمد اقبال حسین	ریکھا	کماری بھانو ریکھا گنیش
حسن بانو	روشن آرا	رامانند ساگر	چندر موکول
خورشید	ارشاد بیگم	ریحانہ	مشتری جہاں
خیام (موسیقار)	محمد ظہور خیام ہاشمی	رومی	محمد سلیم
دلیپ کمار	یوسف خاں	رتن بائی	امام باندی
دادا صاحب پھالکے	ڈھونڈی راج گوند پھالکے	راگنی	شمشاد بیگم
	رام چندر گوپال /	رینا رائے	روپا راجپوت
دیوانند	دیودت پشوری مل آنند	روپیش کمار	سید عباس
دھیرن گنگولی	دھرندر ناتھ گنگو پادھیائے	رنجیت	گوپال بیدی
دھرمندر	دھرمندر سنگھ دیول	رحمان	سعید الرحمٰن
ڈینی	ڈینی ڈین جونگپا	رجنی کانت	شیوجی راء گائیکواڑ
ڈولی جینا	وجیہہ جنیا	راکھی ساونت	بندو
ڈی بلوریا	ڈین شاہ بلوریا	راجندکمار	راجندر کمار تلی
ریتو شیوپوری	ریتو شیوپوری	روشن (موسیقار)	روشن لال ناگرتھ
راج کمار	کل بھوشن ناتھ سکند	زیب رحمان	زیب النساء
رنبھا	وجے لکشمی	زینت امان	للتیشوری ٹھاکر
راجیش کھنہ	جتین کھنہ	زبیدہ	زبیدہ ابراہیم

فلمسٹار	اصل نام	فلمسٹار	اصل نام
سنجے	عباس خاں	سورن لتا	سعیدہ بانو
سمّی	سمیتا گریوال	سیتا دیوی	رینی اسمتھ
سادھنا	سادھنا شیو دسا ہنی	سنیل دت	بلراج دت
سریکھا	انیس خاتون	سرسوتی دیوی (موسیقار)	خورشید مانچرشاہ منوچہر
سمیر خاں	احمد خاں	سنگیتا	سکندر جہاں
سونم	بختاور	سنجیو کمار	ہری زری والا
سنّی دیول	اجے سنگھ دیول	سیٹھی (فائٹر)	مدن بابو سیٹھی
ستارہ	دھنو	ساگر سرحدی	گنگا سرحدی
سی ایچ آتما	ہشمت رائے چینانی	شیکھر کپور	چندر شیکھر کپو
ستیہ جیت رے	سیتہ جیت پوری	شیاما	خورشید اختر
ساحر لدھیانوی (شاعر)	عبدالحئی	شیکھر	اندروس رستوگی
سہراب مودی	سہراب مہروانجی مودی	شرمیلا ٹیگور	عائشہ بیگم
سُریس	نظام محمد	شاہد کپور	شاہد
سلوچنا چٹرجی (اینگلو	روبی میئر	شنکر (موسیقار)	شنکر سنگھ رگوونشی
انڈین شاعرہ)		شکیل بدایوانی (شاعر)	شکیل احمد
سچترا سین	روماسین / روماداس گپتا	شکیلہ	بادشاہ جہاں بیگم
ستارہ دیوی	اللہ بندی	شمی کپور	شمشیر راج
سجّن	سید حسن علی	شمشاد بیگم	راگی
سریندر	سریندر ناتھ	شکتی کپور	سنیل کپور
سہیل کمار	محمد بلوچ	عامر خاں	عامر حسین
سعید جعفری	سعید جاوید احمد جعفری	عائشہ ٹاکیہ	عائشہ ٹاکیہ

فلمستار	اصل نام	فلمستار	اصل نام
عمران خاں	عرفان خاں	کجن	جہاں آرا
کمل جیت	سلیم احمد	قادر خان	قادر عبدالمنان
کیفی اعظمی (شاعر)	اطہر حسین رضوی	قمر جلال آبادی	اوم پرکاش بھنڈارل قمر
ککو (ڈانسر)	ونیڈلپن	فیروز خاں	فیروز احمد خاں
کے ایل سہگل (گلوکار)	کندن لال سہگل	گرودت	بسنت
کے۔آصف	کریم آصف	گیتا دت	گیتارائے
کمی کاٹکر	نین تارا کٹکر	گوندہ	گوندہ ارون آہوجا
کنہیالال	کنہیا لال چترویدی	گیتا بالی	ہری کرشن کور
کلپنا	ارچنا	گلزار (شاعر)	گربچن سنگھ دینوی/سمپورن سنگھ
کافی کوشل	اوما کیشپ	گوپ	گوپ کملانی
کمال امروہوی	سید امیر حیدر کمال	گوہر	قیوم ماما جی والا
کمار	سید حسن علی	للیتا پوار	امبا ساگن
کشور کمار	آبھاش کمار گنگولی	مقری	محمد عمر
کم کم	زیب النساء	مکیش (گلوکار)	مکیش چندر ماتھر
کمل جیت	رتی ریکھی	منورما	مس ایرن ڈپنیل
کرن کمار	دیپک کمار دھر	میناکشی ششادری	ششی کلا ششادری
کے اے عباس	خواجہ احمد عباس	ممتا کلکرنی	پدماوتی کلکرنی
کمار گورو	منوج تلی	مہیما چودھری	ریتو
کے۔این۔سنگھ	کرشن نرنجن سنگھ کیدارناتھ سنگھ	مینا شوری	خورشید بیگم
کملیشور	کملیشور پرشاد سکینہ	موتی لال	بھیسن سین راج ونش
کرشنا کماری	راجندر کور	مس گلاب	سرسوتی دیوی

فلمستار	اصل نام	فلمستار	اصل نام
مدن موہن (موسیقار)	مدن موہن کوہلی	نمی	نواب بیگم
ملیکا شراوت	ریما لامبا	نادرہ	فلورنس ازاکیل
مینا کماری	مہہ جبین ناز	ناڈیہ	میری این ایوان
مندا کنی	یاسمین	نور جہاں	اللہ وسی
مس ببّو	عشرت سلطانہ	نسیم بانو	روشن آرا بیگم
محمود	محمود علی	نیتو سنگھ	ہرنیت کور
مینو ممتاز	ملکہ ملکہ	نگار سلطانہ	خورشید سلطانہ
مہتاب	ناظمہ	نازیہ حسن (گلوکارہ)	اشتیاق بیگ
ماسٹر منصور	منصور محمد خاں	وی شانتا رام (ڈائرکٹر)	وان کدرے
مالا سنہا	آلڈا۔مالا مسیح	وحیدہ رحمٰن	وحیدہ رحمٰن
مظہر خاں (پرانا)	فصاحت اللہ خاں	ونود کھنہ	ونود کمار کھنہ
مجروح سلطان پوری	اسرار حسن خاں	وینا	تاجور سلطانہ
مارک زبیر	زبیر احمد صدیقی	وجے کمار	وحیدالدین
مدھو بالا	ممتاز بیگم	وجے چودھری	قریشہ بیگم
منوج کمار	ہری کرشن گوسوامی/ششی گوسوامی	ومّی	ولیس کماری
مادھوری (پرانی)	بیرل کلاسن	وی ایم ویاس	ورج مدہن ویاس
نندا	نندا وناٹک	ہیلن (ڈانسر)	ہیلن بن رچرڈسن خان
نرگس	کنیز فاطمہ	ہمنت کمار (گلوکار)	ہمنت کمار کالی داس مکھرجی
نروپارائے	کوکیلا کشور چندر بلسارا	ہیرالال	کشورمن جوہری
نلنی جیونت	پرشوتم	یعقوب	یعقوب خاں
نازیہ	مہرالنساء	یاتن بٹ	انس یاتن ورما

فلمی ستاروں کی پہلی فلم

فلمسٹار	پہلی فلم	فلمسٹار	پہلی فلم
آشا ماتھر	کالی گھٹا	ابرار علوی (مکالمہ نگار)	آر پار
انور حسین (ویلن)	رومیو جولیٹ	انجم سویرا	رنگا خوش
امریش پوری	پریم پجاری	امیتا	ٹھوکر
اوپی نیّر (موسیقار)	آسمان	ایس ایم نواب	ستیہ وادی راجہ ہریش چندر
اوپی نیّر (بطور اداکار)	دولھا بھائی	امجد خاں (بطور ویلن)	شعلے
امجد خاں	نجمہ۔نازنین (چائلڈ آرٹسٹ)	آردیشر ایرانی (فلمساز)	ویرا بھمیتو (خاموش)
ایس ڈی برمن (موسیقار)	شکاری۔آٹھ دن	اردیشر ایرانی (فلمساز)	عالم آرا (پہلی بولتی فلم)
انل کپور (بحثیت فلمساز)	گاندھی مائی فادر	ایس ڈی نارنگ (ڈائرکٹر)	خزانچی
انیتا راج	پریم گیت	این اے انصاری (ویلن)	بلیک کیٹ۔دریادل
امتیاز خان (ویلن)	ریاست (بطور چائلڈ)	راجندر سنگھ بیدی (مکالمہ نگار)	بڑی بہن
احسن رضوی (مکالمہ نگار)	بہادر کسان	انل کپور	وہ سات دن/ ہمارے
اکبر خاں (بطور ہیرو)	انجان راہیں	(معاون اداکار)	تمھارے/ ایک بار کہو
امر (ویلن)	ڈاکٹر	افتخار (ویلن)	تکرار
امیہ چکرورتی (ڈائرکٹر)	انجان	آرڈی ماتھر (ڈائرکٹر)	گجرے
ایس ڈی برمن (بطور گلوکار)	تاج محل	انل دھون	چیتنا
الطاف (ویلن)	گوالسن	آمنہ شریف	کہیں تو ہوگا
اوپین پٹیل	۳۶ چائنا ٹاؤن	اتم کمار	امانش (ہندی)
آشا بھونسلے (گلوکارہ)	گوکل کا چور	اسرانی	پشپانجلی/گڈی
الکا	واپس	ایشوریا	گروش
اشوک کمار	جیون نیا		

فلم اسٹار	پہلی فلم	فلم اسٹار	پہلی فلم
اجیت (جونیئر)	پریم سنگیت	ارملا ماتونڈکر	کل یگ/معصوم (چائلڈ آرٹسٹ)
اوم پوری	ادھیہ ستیہ	ارملا ماتونڈکر (ہیروئن)	نرسمہا
ایس ڈی برمن	آٹھ دن	ایم ایس سیتھو (ہدایتکار)	گرم ہوا
آرسی بورال (موسیقار)	چنڈی داس/دنیا پاؤ ناتھی	ادنیاش ودھاون	آواز دے کہاں ہے
آصف مہدی حسن	وحشی	ایوب خاں	معشوق
احسان خان	اُجالا	این اے انصاری (ڈائرکٹر)	عورت
امین سیانی (اناؤنسر)	ہوس	اسیش کمار	پھول بنے انگارے
ایس دوبے (ڈائلاگ رائٹر)	گونا	اندر جیت سنگھ تلسی (گیت کار)	بوبی
(ڈائرکٹر)	عورت	ارمیلن	پورن بھگت
انواگروال	عاشقی	اجے دیوگن	پھول اور کانٹے
اتو اگنی ہوتری	آتش۔سر	انیتا ایوب	پیار کا ترانہ
انوری بیگم	ہیر رانجھا (خاموش پنجابی فلم)	انوپم کھیر	سارانش
انیت گوہا	بشرکلا (بنگالی) دنیا گول ہے	ایس خاں (کہانی کار)	کھلاڑی
امیتابھ بچن	سات ہندوستانی	اقبال درّانی (ڈائرکٹر)	دھرتی پتر
انور علی	ساتھ ہندوستانی	اوم پرکاش	داسی (پاکستان میں بنی)
امریش کاپڑیا	زمانے سے پوچھو	اے کے ہنگل	تیسری قسم
اروند	چرتر	ایس ڈی برمن (موسیقار)	راجکماری (بنگلہ)
ارونا ایرانی	گناہوں کا دیوتا/	اوپی رلہن	مجرم
	انوکھی رات	اوم شیو پوری	کوشش
آشو	کب کیوں اور کہاں	آغا	رنگین گناہ/پروانے
اشوک کھنّہ	تنہائی	ابھی بھٹاچاریہ	نوکا ڈوبی (بنگالی)

فلم اسٹار	پہلی فلم	فلم اسٹار	پہلی فلم
اے بھیم سنگھ (ہدایتکار)	امائی اپن	امیشا پٹیل	کہو نہ پیار ہے
ایل وجے لکشمی	شبنم	اوشا کرن (ہندی)	غریبی
امتیاز حسین	دیار مدینہ	ابھیشک بچن	رفیوجی
امینہ صابری	رضیہ سلطان	ارون کول (ہدایتکار)	ایک ادھوری کہانی
ایس ایم یوسف	پھول کا ایکّہ	انوپ جلوٹا (گلوکار)	سونالی
اکبر خاں (بطور ہدایتکار)	حادثہ	ایشوریہ رائے	اور پیار ہوگیا، ایروور (تامل)
ایس ڈی برمن (موسیقار)	رانگی (بنگلہ)	انجلا	ہمالیہ پتر
امرتا سنگھ	بیتاب	اے آر کار (ہدایتکار)	دلِ ناداں
آشا بھونسلے (گلوکارہ)	چنریا/اندھوں کی دنیا	آرڈی برمن (موسیقار)	چھوٹے نواب
انجلی	مدہوش	اسمٰعیل مرچنٹ (ہدایتکار)	محافظ
اشونی کوشل	دامنی	ارباز خان	رام/درار
اندیور (شاعر)	ملہار۔ڈبل فیس	این چندرا	انکش
اجے ساہنی	انوکھی رات	ایس نذیر	باغِ مصر
اشیم کمار	بدیسیا	امرتاراؤ	اب کے برس
انامیکا	یادوں کی بارات	انل بسواس (موسیقار)	دھرم کی دیوی/بھارت کی بیٹی
اشوک شرما	ہماری یاد آئے گی	اودے شنکر	کلپنا
اچلا سچدیو	کشمیر۔فیشن ایبل وائف	ایم ایف حسین (مصوّر)	گج گامنی
اجیت	شاہ مصر۔پریم سنگیت	این دتا (موسیقار)	ملاپ
اقبال قریشی (موسیقار)	پنچائت	ایشا دیول	کوئی میرے دل سے پوچھے
ایل وی پرشاد	شاردا۔/گرہ پرویشم	اوشا کھنّہ (موسیقار)	دل دے کے دیکھو
امیتا ناگیہ	کالج گرل	آشا پاریکھ (بطور چائلڈ)	باپ بیٹی

فلم اسٹار	پہلی فلم	فلم اسٹار	پہلی فلم
آغا	پروانہ (خاموش فلم)	انورا دھایڈوالی (گلوکارہ)	ابھیمان/کالی چرن
ایس ڈی نارنگ	خزانچی	آدیتہ گوسوامی	پاپ
اکشے آنند	ہم نوجواں	امیت کمار (گلوکار)	دور کا راہی
ارباز علی خاں	ناچنے والی گانے والی	ارجن رام پال	پیار، عشق اور محبت۔موکش
ارجن چکرورتی	ذرا سی زندگی	آشمیہ بھلّا	پیار زندگی ہے
انوا گروال	عاشقی	اسین	امان مانا اوتا ملائی (تیلگو)
اتم کمار	درشتی دان (بنگلہ)	اسلم خاں	نئی پڑوسن
اورونا ایرانی (بطور چائلڈ)	سونے کی چڑیا/گنگا جمنا	آریہ من رامسے	فیملی
امیش مہرا (ڈائرکٹر)	ہمارے تمھارے	ارشد وارثی	تیرے میرے سپنے
ای بلموریا	بھوتیا محل	انترا مالی	روڈ
اے آر رحمان (موسیقار)	روجا	آنند بخشی (گیت کار)	بھلا آدمی۔واللہ کیا بات ہے
افضل خاں (ہدایتکار)	مہانتا	اوم پرکاش (فلمساز۔ہدایتکار)	گیٹ وے آف
آنند راج آنند (گیت کار)	معصوم		انڈیا/ دنیا گول ہے
اکشے کمار	سوگندھ/ ہمالیہ پتر	امتیاز علی تاج (اسکرپٹ رائٹر)	انارکلی (پرانی)
اجیت (چائلڈ آرٹسٹ)	پریم سنگیت	احمد صدیقی (فلمساز)	جے سنتوشی ماں
الکا یاگنگ (گلوکارہ)	پائل کی جھنکار	این این سپّی (فلمساز)	قاتل
آفتاب شیودانی	مست	انل کپور (معاون اداکار)	ہمارے تمھارے
اسرانی	ہرے کانچ کی چوڑیاں	اُنشکا شرما	رب نے بنادی جوڑی
ابراہیم اشک (گیت کار)	بہار آنے تک	اشین	گجنی
انیتا گویا	باشیر قلعہ (بنگلہ)	انور علی	بھائی بھائی
ابرار علوی (مکالمہ نگار)	آر پار	اسد بھوپال (گیت کار)	دنیا

فلم اسٹار	پہلی فلم	فلم اسٹار	پہلی فلم
اسینہا پولال	لکی	بسنت	جگری دوست
اسمٰعیل مرچنٹ	The creation	بندیا گوسوامی	جیون جیوتی/ پھول اور کانٹے
(فلمساز۔ہدایتکار)	of woman	بیتا	راز
امیتا ناگیہ (ہیروئن)	کالج گرل	برج (ڈائرکٹر)	دو بھائی
اونیاش وادھوان	جنون	بمل رائے (ڈائرکٹر)	اوپر ہاتھے (بنگلہ)
اتول اگنی ہوتری	سر	بیگم پارہ	چاند
اشوک کوشل	دامنی	بابو جی (ڈائرکٹر)	پرماتما
اپورب جوشی	پردیس	بھگوان داس	بھارت کا لال ۔ بے
اجے چنڈوک جی	نہلے پہ دہلا	(کامیڈین)	وفا عاشق (بولتی فلم)
اکشے کھنّہ	ہمالیہ پتر	بی ناگی ریڈی	شاؤ کارو
اکشے کمار	پھول اور کانٹے	بھومیکا سنگھ	آپ کی خاطر
ابرار علوی (اداکار)	12, o clock	بیگم اختر	کنگ فارا ے ڈے
ابرار علوی (اسکرپٹ)	آر پار	بشیشور ناتھ کپور (پرتھوی	آوارہ
انل کپور (بطور پروڈیوسر)	بدھائی ہو بدھائی	راج کے والد)	
اوم پرکاش (بطور ویلن)	شریف بدمعاش	بینا رائے	کالی گھٹا۔میور پنکھ
اوم پرکاش	لکھ پتی (بمبئی میں بنی)	بھرت ویاس	آنکھیں
ایشا کوپیکر	فضا	پن گیتا (ویلن)	شری رام انوج
امریتا اروڑہ	کتنے دور کتنے پاس	بیر سکوجہ (ویلن)	گناہ
امریش پور	پیار ہی پیار	بھوشن تیواری (ویلن)	اریمیل
اکشے کمار	سوگندھ	بمل رائے (ڈائرکٹر)	دو بیگھہ زمین (ہندی)
بی ایچ واڈیا (فلمساز)	بسنت لیلا	بنیا دیوی	شہری بابو

فلم اسٹار	پہلی فلم	فلم اسٹار	پہلی فلم
بلراج ساہنی	نیچا نگر۔جسٹس۔دھرتی کے لال	بھگوان سنہا(ویلن)	خوشبو
بھپی لہری(موسیقار)	ننھا شکاری/ایک لڑکی بدنام سی	بندو	شان(بطور چائلڈ
بھارتی دیوی	ڈاکٹر	بیگم اختر گلوکارہ(ویمپ)	روٹی
بلبیر کمار(فلمساز)	سنتوش	بالم(ویمپ)	ریاست
بھولا ناتھ(کامیڈین)	شری مان ستیہ وادی	پی ایم۔ویاس(ویلن)	بھرت ہری
بندو	دوراستے/ان پڑھ	بھگوان داس	کریمنل(خاموش فلم)
بی آر چوپڑہ(فلمساز)	کروٹ	بیگم اختر(گلوکارہ)	آئینہ
بھگوان داس(کامیڈین)	قاتل کٹار(چائلڈ آرٹسٹ)	بیلا بوس	سوتیلا بھائی
بابو راجے	ہنومان جنم	بی آر اشارہ(ڈائرکٹر)	انصاف کا مندر/ضرورت
بملا کماری	ملاپ	بھارت بھوشن	بھگت کبیر
بابی دیول	برسات	بھاگیہ شری	میں نے پیار کیا
بیگم اختر(گلوکارہ)	ایک دن کی بادشاہت	بھال چندر پھالکے	راجہ ہریش چندر
	(ہیروئن)		(خاموش)
بسم اللہ خاں(شہنائی)	گونج اٹھی شہنائی	بپاشا باسو	اجنبی
بپاشا باسو	اجنبی	تنوجہ	دو بہنیں
بال کرشنا گیتا(گیت کار)	نئی ریت	پران(ہیرو)	خاندان
برہم چاری	دس لاکھ	پران	یملا جٹ(پنجابی)
بیربل	حسینہ مان جائے گی	پریش راول	ارجن
بے پی فریدہ	سجاتا	پنکج دھیر	پونم
بی ایرانی(موسیقار)	عالم آرا(پہلی بولتی فلم)	پریش راول(ویلن)	نام
بی این ریڈی	گرہ لکشمی	پروین بابی	چرتر

فلم اسٹار	پہلی فلم	فلم اسٹار	پہلی فلم
پی کیلاش(ویلن)	پریم سنگیت	پوجا بترا	وراثت
پرتھما سنہا	میرے محبوب،میرے محبوب	پوجا بھٹ	ڈیڈی
پریم چوپڑہ	مڑ مڑ کے نہ دیکھ	پوجا بیدی	جو جیتا وہی سکندر
پہاڑی سانیال	پورن بھگت(خاموش)	پریما نارائن	ماں،بہن اور بیوی
پی این اروڑہ	ڈولی	پورنیا	رادھے شیام(گجراتی)
پدما کھنہ	گنگا میا تو ہے پیری چڑھیبو	پرکاش مہرہ(ہدایتکار)	حسینہ مان جائے گی
پہاڑی سانیال	یہودی کی لڑکی	پنکج ملک(موسیقار)	یہودی کی لڑکی
پران(ویلن)	بت تراش(ہندی)	پارو(ویمپ)	دھنوان
پونم ملہوترا	اب آئے گا مزہ	پدمنی	کلپنا
پریم ایس للوانی(پروڈیوسر)	تیری پائل میرے گیت	پریہ درشنی	طوفان۔ہنگامہ
پی ایل سنتوشی	ہم ایک ہیں	پولیس	گوکل کا چور
پروین پال(ویلن)	ناگ پنچھی	پینٹل	میرے اپنے
پردیپ کمار	الوکانڈا(بنگلہ)	پارو	شکار
پریم کشن	جان حاضر ہے	پردیپ کمار	آنند مٹھ(ہندی)
	دلہن وہی جو پیا من بھائے/	پونم ڈھلون	نوری/ترشول
پرتھوی راج کپور(بطور ہیرو)	سنیما گرل	پریٹی زنٹا	دل سے
پرتھوی راجکپور	عالم آرا(بولتی فلم چائلڈ آرٹسٹ)	پروتیا	چھمیا
پرتھوی راج کپور(بطور ایکٹر)	چیلنج(خاموش)	پریا گل	تیرے میرے سپنے
پیشنس کوپر	خیبر پاس	پریا تندولکر	انکور
پدمنی کپیلا	انتظار	پدمنی کولہا پوری	عشق عشق عشق(چائلڈ
پرینکا چوپڑہ	انداز	پریم ناتھ(بطور ویلن)	اجیت

فلم اسٹار	پہلی فلم	فلم اسٹار	پہلی فلم
پوجا بھٹ(ہدایتکار)	تمنّا	تنوجہ	چھبیلی(چائلڈ)
پریا	حقیقت	تاراچند برجاتیہ	آرتی
پیش کنول	دل ناداں	تنوی	دوِش
پائل روہتگی	توبہ توبہ	تبریز	زیارت گاہ بند
پریکشت سا ہنی	انوکھی رات	تبّو	ماچس/ہم نوجواں
پہلوان چندگی رام	ویرگوتیج	تنیشا	ش ش ش
ٹوئنکل کھنہ	برسات	تنوشری دتہ	عاشق بنایا آپ نے۔چاکلیٹ
ٹیولپ جوشی	میرے یار کی شادی ہے	تنیشا چڑجی	بارہ آنہ
ٹونی واکر	سمندری ڈاکو	ثریا	تدبیر/شاردا
ٹینا منیم	دیش پردیش۔قرض	ثانیہ سنگھ	آ جا میری جان
تاراچند(فنانسر)	ہم سفر	جان علی خاں	قاتلوں کے قاتل
تنوجہ(بطور ہیروئن)	ہماری یاد آئے گی	جی پی سپی(فلمساز)	میرن ڈرائیو
تمنّا	قاتلوں کا قاتل	جے شری ٹی(ڈانسر)	گونج اٹھی شہنائی
ترلوک ملک	درد کا رشتہ	جے مالا(ڈانسر)	تیرتھ یاترا
ترلوک کپور	چار درویش	جیون	بھگت دھرو/فیسن ایبل انڈیا
تلک راج	چھتیس گھنٹے	جگدیپ	افسانہ(چائلڈ آرٹسٹ)
تپن سنہا(ہدایتکار)	انکش	جانی لیور	یہ رشتہ نہ ٹوٹے/درد کا رشتہ
تشا کپور	مجھے کچھ کہنا ہے	جاوید اختر(اسکرپٹ رائٹر)	انداز
تجسونی	ہم تم اور وہ	جان ابراہم	اس پیار کو کیا نام دوں۔جسم
تیواری(ویلن)	پریم سنگیت	جاوید اختر(نغمہ نگار)	سلسلہ
تنو چندرا(ہدایتکار)	دشمن	جیا پردھا	سرگم

فلم اسٹار	پہلی فلم	فلم اسٹار	پہلی فلم
جانی واکر	بازی/آخری پیغام	جی ایم درانی	صید ہوس
جیکی بھگنانی	کل کس نے دیکھا	جوئے مکھرجی	ہم ہندستانی/لوان شملہ
جگدیش سدانا	دھماکہ	جتن للت(موسیقار)	یارادلدار
جاں نثار اختر(گیت کار)	انارکلی	جانی وہسکی	اوپیراہاؤس
جینت ڈیسائی(ڈائرکٹر)	نورِ وطن	جلو بائی	پورن بھگت
جیامالنی	جیون جیوتی	جوہی چاؤلہ	قیامت سے قیامت تک
جونیر محمود	فرشتہ	جمال سین(موسیقار)	شوخیاں
جلال آغا	سات ہندوستانی	جتندر	سہرا
جے مہتہ	ضد	جان کاؤس	نورِ یمن/ہنٹر والی
جیوتی	بلیٹ	جہاں قدر چغتائی	دی لائٹ میسج
جیاں خان	نشبد	جینی گنیش	مس مالی(تامل)
جے شری	چندراؤ(مراٹھی)	جیکی شروف	ہیرو
جینت	بمبئی کی مونی/ایکٹریس	جے للیتا	عزت(ہندی)
جدن بائی	تلاشِ حق	جمنا	پٹلّو(تلگو)
جمنا	دیوداس(ہندی)	جے شری	نندکمار(ہندی)
جوگل ہنس راج	معصوم	جگدیپ(بطور چائلڈ)	دو بیگھہ زمین
جیا بہادری	گڈی	جال مستری(کیمرہ مین)	برسات
جانکی داس	دولت/خزانچی(خاموش فلم)	جوہی چاؤلہ	سلطنت
جیسل مونیزو	لو آج کل	جگدیش کمل(ویلن)	دھواں
جیا بھارتی	من کا آنگن	جٹیکا موٹووانی	آپ کا سُرور
جہاں آرا کجن	لیلیٰ مجنوں	جگدیش سیٹھی	عالم آرا

فلم اسٹار	پہلی فلم	فلم اسٹار	پہلی فلم
جگدیو بھاٹسری (ویلن)	زلزلہ	خلیل احمد	دولت کا نشہ
جگدیپ (چائلڈ)	دو بیگھہ زمین/راجہ	خاں بہادر آردیسر	عالم آرا (پہلی بولتی فلم)
چاند عثمانی	جیون جیوتی	خورشید	خبردار (ہندی)
چندگی رام	ویر گھٹوتکچ	خواجہ احمد عباس	انہونی
چنکی پانڈے	آگ ہی آگ	(کہانی کار)	
چھایا دیوی	ودیاپتی	خواجہ احمد عباس (رائٹر)	نیا سنسار
چترا	انجام	خیام (موسیقار)	فٹ پاتھ
چاؤلہ (فلمساز)	اپنا دیش پرائے لوگ	خوشبو	دردکا رشتہ
چاندنی	صنم بے وفا	خیام (بطور اداکار)	رومیو اینڈ جولیٹ
چندر چورسنگھ	ماچس	دلیپ کمار	جوار بھاٹا
چاندنی برق (ویلن)	زمین آسمان	دھرمندر	دل بھی تیرا ہم بھی تیرے
حسرت جے پوری (گیت کار)	برسات	دیوانند	ہم ایک ہیں
حسن بانو	ڈاکو منصور	دویا بھارتی	وشوآتما
حنا گپتا	پیار کی دھن	دیویکارانی (فلمساز)	محل
حبیب پہاڑی (ویلن)	پرنس	دلسکھ ایم پنچولی	خزانچی
حنا کوثر	پریورتن	ڈبلو ایم خاں (گلوکار)	عالم آرا (پہلی بولتی فلم)
حنا کماری	سات سوال	دیوکی بوس (فلمساز)	فلم گلیمر آف فلیش
حیدر باندی	شلا عرف پنڈوی	دیوندر	کویتا
جیکلن فرنانڈیز	الہٰ دین	ڈولی جینا	رضیہ سلطانہ
خواجہ احمد عباس (ہدایتکار)	دھرتی کے لال	دارا سنگھ	کنگ کانگ (بطور ہیرو)
خورشید	مرزا صاحبان (پنجابی)	دھیرن گنگولی (ہدایتکار)	فلم گلیمر آف فلیش

فلمسٹار	پہلی فلم	فلمسٹار	پہلی فلم
دوبے	میرے غریب نواز	درگا کھوٹے (فلمساز)	ساتھی
ڈی سہاش (ڈائرکٹر)	بنیاد	دینو ہریش	دھوئیں کی لکیر
داداصاحب پھالکے	راجہ ہریش چندر	دپتی	سوتن کی بیٹی
(ڈائرکٹر)	(پہلی خاموش فلم)	دیا مرزا	رہنا ہے تیرے دل میں
درگا کھوٹے	راجہ ہریش چندر (خاموش)	دلیپ تاہل	شان
	فریبی جال/	دیوانند (بحیثیت ڈائرکٹر)	پریم پجاری
دیپک کمار	آبرو	دیا بانس	پرینیتا
دیپک پوار (فلمساز)	پلیٹ فارم	دیپکا پڈوکون	اوم شانتی اوم
ڈمپل کپاڈیہ	بابی	دلاری	دیوداس
دیپک تجوری	عاشقی	دلاری	پیار کیا نہیں جاتا
درگا کھوٹے	ایودھیا راجہ (مراٹھی)	دوارکا داس سمپت (فلمساز)	راج شری پال
درگا بھائی کا متھ	بھسما سرموہنی	دیویکارانی	ایک جان ہیں ہم
دیویکارانی (ہیروئن)	کرما	دیب مکھرجی	تو ہی میری زندگی
دیوکی بوس (ہیرو)	پنچ تنتر	دیپا مہتا (ہدایت کار)	پانی
دیون ورما	آج اور کل/گمراہ	داداصاحب تورنے (فلمساز)	پنڈولک
دیوکی بوس (بطور ہدایتکار)	پورن بھگت	دوارکا داس سمپت (بحیثیت ہیرو)	بھگت وِدُر
دھومل	چاچا چودھری	ڈیوڈیوسف (پہلا مکالمہ نگار)	عالم آرا (متکلم)
دھریندر گنگولی (ہیرو)	گلیمر آف فلیش	ڈبلوایم خان (کیریکٹر ایکٹر)	عالم آرا (متکلم)
دیوپٹیل	سلم ڈاگ ملینئر	درگابائی کھوکلے	بھسماسُرموہنی
ڈاکٹر شری رام لاگو	پنجرہ	روبی	جھانسی کی رانی
ڈینی	نئی دنیا نئے لوگ	راجیش روشن	آنکھوں آنکھوں میں

فلمسٹار	پہلی فلم	فلمسٹار	پہلی فلم
رجنی کانت	اندھا قانون	رینا رائے	نئی دنیا نئے لوگ
راج پال یادو	جنگل	رنجیت	لیلیٰ مجنوں(نئی)/ساون بھادو
ریتا راج	پونم	روپیش کمار	ہائے میری جان
رتن بائی	صبح کا ستارہ	راج کھوسلہ(ڈائرکٹر)	سی آئی ڈی/ جال
راج شری	استری۔صبح کا تارا	رتن بائی	سہیلی
راجکپور (بحیثیت ڈائرکٹر)	آگ	(بحیثیت پروڈیوسر)	
راجو سریشٹا	پریچے	راج کپور(بطور چائلڈ)	انقلاب
رنجن	چندرلکھی	راج کمار	شاہی بازار/رنگیلی
رحمٰن	ہم ایک ہیں	راجکمارسنتوشی(ڈائرکٹر)	گھائل
رادھیکا	ہمارے تمہارے	ریحانہ	شہنائی
راجن سپّی	آوارہ باپ	راجیو کپور	ایک جان ہیں ہم
رخسار	انتہا پیار کی	راجیش مہر	شبھ دن
روہن کپور	فاصلے	راج ٹنڈن	ایک میں ایک تو
ریتیش	بیس سال بعد	راجن سپی	آوارہ باپ
ریتو پریہ	طبودادا	راگھیٹو ری	ضد
ریشمی	من تیرا تن میرا	ریحانہ سلطان	دستک/ چیتنا
راجندرناتھ	شگوفہ	ریتو پریہ	لمبو دادا
راکیش روشن	جینے دو	رادھا سلوچنہ	لاکھوں میں ایک
فلسٹار	پہلی فلم	روی چوپڑہ(ڈائرکٹر)	ضمیر/کل کی آواز
رندھیر کپور	کل آج اورکل	رحمٰن نوشاد(موسیقار)	مائی فرینڈ
راجیش سیٹھی	جینے دو	رنکو جیسوال	انتظار

فلمسٹار	پہلی فلم	فلمسٹار	پہلی فلم
رینوکا	میرے غریب نواز	رضامراد	ایک نظر
رشی کیش	چپکے سے دل دے دے	راہل ڈے برمن(موسیقار)	چھوٹے نواب
راجکپور	نیل کمل	راکیش پانڈے	رکھوالا
(بطور ہیرو)		رشی کپور	بابی/میرا نام جوکر
راجہ مہدی علی خاں	دو بھائی	رمیش اروڑہ	دھوئیں کی لکیر
(گیت کار)	آٹھ دن/	راج پوری	میرے غریب نواز
راجکمارسنتوشی(ڈبل)	گھائل	راجشری	صبح کا تارا
روشن(موسیقار)	نیکی اوربدی	راجندرکمار	جوگن/وچن
رامیشوری	دلہن وہی جو پیا	ریکھا	ساون بھادو
	من بھائے	راکھی	جیون مرتیو
راج بیّر	سودن ساس کے	راجیش کھنہ	راز/آخری خط
رنجیتا	لیلیٰ مجنوں	راجکماری	کاروانِ حیات
رونت رائے	جان تیرے نام	رمیش کھنہ(فلمساز)	گوپالہ
روبینہ	ابھی ابھی	(کہانی کار)	برسات
ریوتی	لَو	رانی مکھرجی	راجہ کی آئیگی بارات
ریتوشیو پوری	آنکھیں	راج مہرہ(ویلن)	گورو
رتک روشن	کہو نہ پیار ہے	رونیت رائے	جان تیرے نام
رحمٰن(ویلن)	بلیک شرٹ	راجن ہکسر(ویلن)	لکھ پتی
ریاسین	اسٹائل	روی بہل	بوگی ووگی
روشن(موسیقار)	نیکی اوربدی	رمبھا	جلاد
راجے	۵ دشمن	رچا شرما	ہم نوجوان

فلمسٹار	پہلی فلم	فلمسٹار	پہلی فلم
راکیش بیدی	احساس	رشی کیش مکھرجی(فلم ساز)	مسافر
رادھو کرما کار(فوٹو گرافر)	برسات	روبی میئر	انارکلی(پہلی انارکلی فلم)
رینو کا دیوی(چائلڈ)	بھائی	(اینگلو اینڈین شاعرہ)	
رینوکا دیوی(ہیروئن)	نیا سنسار	رام گوپال ورما(ڈائرکٹر)	شیوا
روی(موسیقار)	وچن	راج ہنس بہل(ڈائرکٹر)	صورت اور سیرت
راہول بھٹ	یہ محبت ہے	رام پیاری	گھر کی لکشمی
رفیق غزنوی	شام سویرا	روی شنکر(موسیقار)	دھرتی کے لال
راجیو پٹیل	کانٹے	ریتیش دیشکھ	تجھے میری قسم
ریحانہ	سرگم	رام سنگھ(ویلن)	چاند
روشن آرا(گلوکارہ)	پھول	راج پال یادو	شول
رنبیر ڈی سلوا	قربان	ریگزی ڈرف	راجہ ہریش چندر
رندھیر(ویلن)	پریم سنگیت	زبیدہ	گل بکاؤلی(خاموش فلم)
روی جعفری(اسکرپٹ رائٹر)	رنگ	زبیدہ	عالم آرا(بولتی فلم)
رخسار	سرکار	زینت امان	ہلچل/ہرے رام ہرے کرشنا
رام موہن(ویلن)	رام لکشمی	زرینہ وہاب	چت چور
راجشری	گیت گایا پتھروں نے		عشق عشق عشق/
رنبیر کپور	سانوریا	زید خاں	چرالیا ہے تم نے
راہل رائے	عاشقی	زیبا بختیار	حنا
راکیش مہرا(ہدایتکار)	عکس	زلفی سیّد	تاج محل
رام چندر پال(موسیقار)	کنگن	زرّین خان	ویر
راجندر کرشن(رائٹر اور گیت کار)	بہار	زیب النساء	شکنتلا

فلمسٹار	پہلی فلم	فلمسٹار	پہلی فلم
ثریا	اسٹیشن ماسٹر + تاج محل	سریش اوبرائے	ایک بار پھر
	(جونیر آرٹسٹ)	سادھنا سنگھ	ندیا کے پار
ثریا	ہماری بات(ہیروئن)	سمیتا پاٹل	نشانت
سنیل دت	ریلوے پلیٹ فارم	سائرہ بانو	جنگلی
سنی دیول	بیتاب/غضب	سنجے	ٹارزن کمز ٹو انڈیا/حقیقت
سلمیٰ آغا	نکاح	سمیت بھانجہ	گڈی
ساریکا	گیت گایا پتھروں نے	سنجیو کمار(بحیثیت ہیرو)	نشان۔بادل
سیمی گریوال	سیما	سلمان خاں	وحشی
سہراب مودی	خون کا خون/میٹھا زہر	سچترا کرشنا مورتی	کبھی ہاں کبھی نا
سنجیو کمار	ہم ہندستانی	سندر	بانکے سپاہی
سندھیا رانی	من کا میت	سونی چودھری	پیار کے سائڈ ایفکٹ
سدلیس بھوشلے(گلوکار)	زلزلہ	سوم دت	من کا میت
سیف علی خاں	بے خودی۔پہلا نشہ	ستیش کول	پریم پربت/وارنٹ
سنیل سیٹھی	بلوان/کل آج اور کل	سیٹھی(فائٹ کمپوزر)	منیم جی
سونا	بدنام فرشتے	ساحرلدھیانوی(شاعر)	نوجوان/کھیت
سروپ دت	اُپہار	سعیدہ خاں	اپنا ہاتھ جگن ناتھ
سورن لتا	لیلیٰ مجنوں	سندھیا رائے	اصلی نقلی(ہندی)
سادھنا	لوِان شملہ	سبھاش کیفی	بادشاہ
سیتا دیوی	کپال کنڈال	سردار اختر	عورت/عید کا چاند
سلوچنا(بطور ہیروئن)	ساسرواس(مراٹھی)	سمپل کپاڈیہ	انوروده
سلوچنا(معاون اداکارہ)	چمکیلا سنسار	سونالی بیدرے	رام

فلمسٹار	پہلی فلم	فلمسٹار	پہلی فلم
سونو سود	شہید اعظم	سولنکی	راجہ ہریش چندر
ستیہ جیت رے(فلمساز)	سطرنج کے کھلاڑی (ہندی)		(پہلی خاموش فلم)
سبھاش گھئی (ڈائرکٹر)	کالی چرن	سندھیا رانی	من کا میت
سید زاہد علی (موسیقار)	عالم آرا (پہلی بولتی فلم)	سلکھشنا پنڈت	الجھن
سنجئے دت	راکی	سدیش بیری	گھائل
ستیہ جیت رے(فلمساز)	پاتھر پنچالی (بنگالی)	سنیل آنند	آنند اور آنند
سمیر	گومتی کے کنارے	ساگریکا گھاٹگے	چک دے انڈیا
سچترا اسین	دیوداس (ہندی)	سنجے کپور	راجہ
سلمہ	میرے غریب نواز	سلمان خاں	باغی (بطور ہیرو)
سچترا اسین	سات نمبر قیدی (بنگلہ)	سنجے مودی	پیار میں کبھی کبھی
سندھیا	امر بھوپالی	سدھارت دھون	ملٹری راج
سونیا ساہنی	جوہر محمود ان گوا	سہیل خاں (ڈائرکٹر)	میں نے دل تجھ کو دیا
سنہہ پربھا پردھان	سیول میرج	سمیرا ریڈی	میں نے دل تجھ کو دیا
ستارہ	الہلال	سیریا پاٹھک	کل یگ
سویتا دیوی	ڈاکٹر موہوریکا	سلینا جیٹلی	کھیل کود/ جانشین
سلوچنا	ننھے منّے (ہندی) ویر مالا	سوبھنا سمرتھ	نگاہِ نفرت
ساہو مودک	شیام سندر	سہگل	محبت کے آنسو
سجاتا مہتہ	پرتی گھات	سلوچنا	ساسرورس (بطور ہیروئن)
ساریکا (چائلڈ آرٹسٹ)	بالک	ستارہ	اوشا کرن
ساگر سرحدی(مکالمہ نویس)	اناو بھسو/ بازار	سوہا علی خاں	دل مانگے مور
		سری دیوی	سولہواں سال

فلمسٹار	پہلی فلم	فلمسٹار	پہلی فلم
سیوا شیو امراپورکر	اردھ ستیہ	سمیر آفتاب	چاند سا روشن چہرہ
سونی راز داں	سارنس	سیٹھ جمشید جی فرام جی	ستیہ وادی ہریش چندر
سبودھ مکھرجی	منیم جی	مدن	(پہلی خاموش فلم)
سائی پرانجے	دنیا نا مانے(چائلڈ آرٹسٹ)	سلطان احمد (ہدایتکار)	ہیرا
سریندر(بطور ہیرو و گلوکار)	دکن کیوں	سرسوتی دیوی (پہلی	کنگن
سُریس	نشانِ جنگ	موسیقارہ)	
سمیت سہگل	بہار آنے تک	سوناکشی سنہا	سکندر
شاہد کپور	عشق وشق	ساجد خاں(چائلڈ آرٹسٹ)	مدرانڈیا
سونم رنگا ناتھ	فریب	سونم کپور	سانوریا۔عائشہ
سنیل دت (ہدایتکار)	یہ راستے پیار کے	سعادت حسن منٹو	کسان کنیا
ساجد واجد (موسیقار)	پیار کیا تو ڈرنا کیا	سدھارتھ	میگھنا
سکندر کھیر	سمر آف ۲۰۰۷ء	سجن (ویلن)	لیڈی ڈاکٹر/ دھنواد
سپرو (چائلڈ)	رام شاستری	سی۔ایچ دوجے (ویلن)	داغ
سپرو (ہیرو)	لاکھ رانی/ چاند	سدھو (ویلن)	دل دے کے دیکھو
سویتا	مدہوشی	ساجد خان	ہے بے بی
سیٹھی (ویلن)	علی بابا چالس چور	شیاما	زینت/شری متی جی
سی ایچ آتما (گلوکار)	نگینہ/ بھائی صاحب(ہیرو)	شریفہ بائی	چوں چوں کا مربّہ
سونیا جہاں	تاج محل	شانو خاں	وحشی
سلطانہ	منورما	شلپا شروڈکر	جنم۔بھرشٹاچار
سجاد حسین قریشی(موسیقار)	دوست	شوما آنند	بارود
سونم	وجے/ دلّی 6-	شاداب خان	مہدی

فلمسٹار	پہلی فلم	فلمسٹار	پہلی فلم
شوبھا سمرتھ	آرفیسن آف دی	شیام بینگل	انکور
	سوسائٹی/نگاہِ نفرت	شمشاد بیگم (گلوکارہ)	تقدیر
شہل بھاٹکر (موسیقار)	نیل کمل	ششی کرن	شبھ دن
شمی کپور (چائلڈ)	ریل کا ڈبہ/جیون جیوتی	شیام سندر (موسیقار)	بھائی
شکیل بدایوانی (شاعر)	درد	شیا	یہ آگ کب بجھے گی
شیکھر کپور	عشق عشق عشق ۔	ششمیتا سین	دستک
	جان حاضر ہے	شیام کمار (ہیرو)	خاموش
شکتی سانت (ڈائرکٹر)	انسپکٹر/بہو	شام بینی گل (کہانی کار	رجنی گندھا
شلیندر سنگھ (گلوکار)	دوجاسوس (ہیرو)	شگفتہ علی	ارون کرنم
شیخ مختار	ایک ہی راستہ	شری گھوشل (گلوکارہ)	دیوداس
	/برما روڈ۔چنگیز خاں۔بہن	شادعلی	ساتھیا
شکتی کپور	قربانی۔کھیل کھلاڑی کا	ششی کلا	نظارے (بطور ہیروئن)
شام کمار (ویلن)	شاردا	شمیتا سیٹھی	محبتیں
شیکھر	آنکھیں	شین	شین
شہناز آغا	سات ہندستانی	ششی کپور	چہار دیواری
شاہ رخ خاں	دیوانہ (ایڈیٹ)	ششی کلا	زینت (جونیئر آرٹسٹ)
شبانہ اعظمی	انکور۔فاصلہ	ششی کلا (ویمپ)	چاند
شیخ فتح لال	سنت ٹکا رام (خاموش	ستیش کوشک	مسٹر انڈیا
	گلاب بائی/	شکیلہ بانو بھوپالی (قوالہ)	جاگیر
شویتا اگروال	سپت	شاہ نواز	بھارت کا لال
شمی کپور (بطور ہیرو)	جیون مریتو۔گل صنوبر	ششما مکھرجی	اٹّے پہ اٹّا

فلمسٹار	پہلی فلم	فلمسٹار	پہلی فلم
شرمن جوشی	گاڈ مدر	شاہد کپور	عشق وشق
شرد کپور	دستک	شیکھر سمن	اُتسو
شہزاد خان (اجیت کا لڑکا)	انداز اپنا اپنا	شاعر رام جوشی (ویلن)	زمین آسمان
شریا ثرن	آوارہ پن	شاہزادی	شکاری
شعری بھوپالی (گیت کار)	جگنو	شفل سفاری	تارے زمین پر
شوکت حسین رضوی	نوکر	(جونیئر آرٹسٹ)	
شفیع انعامدار	بھگتی بھیا روئے	شیخ	جہازی لٹیرا
	/ اردھ ستیہ وجیتا	سریش	اقبال
شمی کپور	منورنجن (بحیثیت ہدایتکار	شروتی ہاسن (گلوکارہ)	چاچی ۴۲۰
شوبھنا	دوگز زمین کے نیچے	شلپا شکلا	خاموش پانی
شاکر زوری	میرے غریب نواز	شویتا کمار	قرض
شوبھا کھوٹے	سیما	شروتی ہاسن (اداکارہ)	لک
ششی کپور (بطور چائلڈ	آگ	صحیبہ	انوکھا رشتہ
شاد	بنٹی اور ببلی	صبا	آئی لو یو
شرمیلا ٹیگور	کشمیر کی کلی	صنم	دل کا کیا قصور
شتروگھن سنہا	ساجن۔پیار ہی پیار	صنوبر	مدر ۱۹۹۸ء
شانتا آپٹے	شیام سندر	طلعت محمود	راج لکشمی (بطور ہیرو)
شلپا سیٹھی	کھیل۔جانشین	طلعت محمود	آرزو (بحیثیت گلوکار)
ششما ریڈی	چاکلیٹ	طارق	یادوں کی بارات
شائستی	سِن (SIN)	طلعت محمود (بحیثیت ہیرو)	وارث
شائنی آہوجہ	گنگسٹر۔ہزار خواہشیں ایسی	طلعت محمود	سیمتی (بحیثیت اداکار)

فلمسٹار	پہلی فلم	فلمسٹار	پہلی فلم
ضیاءؔ خاں	شبد	عائشہ ٹاکیہ	سوچا نہ تھا۔
ضیا سرحدی(بطور اداکار)	منموہن		ٹارزن وی ونڈر کار
ضیا سرحدی(ہدایتکار)	ابھیلا شا	عمران ہاشمی	مرڈر۔فٹ پاتھ
ظاہرہ	آلنگن۔کال گرل	عرفان خاں	وعدے ارادے
ضیا سرحدی(گیت کار	جاگیردار۔فٹ پاتھ	عصمت چغتائی (ڈائرکٹر	فریب
ضیا سرحدی (مصنف)	منموہن	عامر علی	انجان
عائشہ جھلکا	قربان	عباس علی مرزا(گلوکار)	روٹی اور رکی
عامر خاں	ہولی/یادوں کی بارات	عاطف اسلم (گلوکار)	زہر
	(جونیئر آرٹسٹ)	غلام حیدر(موسیقار)	خزانچی۔چودھری
علی رضا(اسکرپٹ رائٹر	انداز	فریدہ جلال	پیار کی کہانی/تقدیر
عرفان کمال	چاہوں گا میں تجھے	فیصل	درد
عائشہ دیول	کوئی میرے دل سے پوچھے	فرح	فاصلے۔یتیم
عدنان سمیع(بحیثیت موسیقار	لکی	فردین خاں	پریم اگن
عزیز کاشمیری(رائٹر)	نیلا پربت	فیصل خاں	مدہوش
عیدن	شلا عرف پنڈوی	فیروز شاہ مستری (موسیقار)	عالم آرا(پہلی بولتی فلم)
عمران خان	لک۔جائیں تو جائیں کہاں	اور بی ایرانی(جوڑی)	
عامرخاں	قیامت سے قیامت تک	فرحاخان(ڈانس ڈائرکٹر	میں ہوں نا
	(بطور ہیرو)	فریال (ڈانسر)	برادری
عذرا	مدرانڈیا	فیروزہ	بھارت کالال
عباس مستان	اگنی کال	فاروق شیخ	گرم ہوا
		فرحان خان	دل چاہتا ہے

فلمسٹار	پہلی فلم	فلمسٹار	پہلی فلم
فنی واکر	حقیقت	کنول جیت	داستانِ لیلیٰ مجنوں
فاطمہ بیگم	چندراولی/پرستان	کجن	عالم آرا(پہلی بولتی فلم
فاطمہ بیگم(ہیروئن)	ویرابھی مینو	کرشن چندر(رائٹر)	من کی جیت
فنی مجمدار(اسکرین	ابھاگن	کامنی کوشل	جیل یاترا(ہیروئن)
کم کم	شیشہ	کانن بالا	جوائے دیپ(خاموش فلم
کمل کپور(ویلن)	ڈاک بنگلہ	کانن بالا	رشی پریم(بولتی فلم)
کمل مہرہ	امر کیرتن	کشور کمار(ہیرو)	چھم چھما چھم
کشور ساہو(ویلن)	کنوارا باپ	کیدارشرما(ہیرو)	نیکی بدی
کمال امروہوی(کہانی کار)	جیلر	کرن ویرالے(ہیروئن)	پریم روگ
کمال امروہوی(ہدایت کار)	محل۔دنیا نہ مانے	کیدارشرما(فلمساز)	نیل کمل/رنگین راتیں
کے سی بوکاڈیہ(فلمساز)	رواج+پیار جھکتا نہیں	کمی کاٹکر	پتھر دل/ٹارزن
کملا بھائی	بھسما سرموہنی	کنگنا رناوت	گنگسٹر
کے کے سنگھ	رام تیری گنگا میلی	کنال گوسوامی	کرانتی
کامنی کوشل	نیچا نگر(جونیئر آرٹسٹ)	کملیشور(کہانی کار)	بدنام بستی
کرشمہ کپور	پریم قیدی	کے این سنگھ(بحیثیت ویلن)	سونر سنسار/باغباں
کل بھوشن کھربندا	شان	کلپنا لاجمی	ایک پل
کے۔این۔سنگھ	اناتھ آشرم۔سنہرا سنسار	کرتی ریڈی	تیرا جادو چل گیا
کرن کمار	سویرا۔دوبوند پانی	کشور کمار(گلوکار)	ضدی
کبیرا	کرو	کلپنا	ناٹی بوائے/پیار کی جیت
کے۔آصف	پھول	کرن کپور	لوہا
کندن شاہ(ہدایتکار)	جانے بھی دو یارو	کانن دیوی	خونی کون(ہندی)ودیاپتی

فلمسٹار	پہلی فلم	فلمسٹار	پہلی فلم
کنک مشرا(ڈائرکٹر)	یہ دل کس کو دوں	کنال کپور(چائلڈ)	وجیتا
کوئنہ مترا	روڈ(بطور آئٹم گرل	کانن دیوی(چائلڈ)	جے دیو(بنگلہ)
کانن دیوی	جومیرت	کمل سدانا	بے خودی
	(بنگلہ۔بطور ہیروئن)	کمار شانو(گلوکار)	عاشقی
کرشن کمار	آجا میری جان	کلیان جی آنند جی	سمراٹ چندر گپت
کنال کھیمو	کل یگ	(موسیقار)	
کاردار	ہیر رانجھا	کرن جوہر(ڈائرکٹر)	کچھ کچھ ہوتا ہے
کوشیلا(ہیروئن)	رائے صاحب	کیفی بھوپالی(شاعر)	دائرہ
کلدیپ کور	خاموش نگاہیں(پاکستانی فلم)	کنال کپور(ہیرو	آہستہ آہستہ۔میناکشی
کلدیپ کور(ویلن)	ضدی(ہندستانی فلم)	کلپنا کارتک	نودوگیارہ
کبیر بیدی	ہلچل	کمل	میرے غریب نواز
کیشٹو رانا(ویلن)	ہلاکو	کرن	بچ کے رہنا بابا
کیفی اعظمی(گیت کار)	بزدل	کوٹھاری	پریم اگنی
کیسٹو مکھرجی	بندش	(جونیئر آرٹسٹ)	رام لیلا
کے ایل سہگل(گلوکار)	محبت کے آنسو	کٹرینہ کیف	بوم
کرینہ کپور	رفیوجی	کم شرما	محبتیں
کنچن	صنم بے وفا/فرض	کرشنا کماری	توہت نور تنالو
کمل جیت	سن آف انڈیا	کانتا راؤ	پرتگیا
کونیکا	بیٹی بھئل پردیسی	کوشک رائے(ہدایتکار)	اپنا آسمان
کاجل	بے خودی	کانن دیوی	چار درویش/سری گورنگ
کنہیا لال	ساگر کا شیر/گراموفون سنگر	کمار گرو	لواسٹوری

فلمسٹار	پہلی فلم	فلمسٹار	پہلی فلم
قادر خاں	اگر	لینا چندراورکر	من کا میت
قادر خاں(مکالمہ نگار)	جوانی دیوانی	لتا منگیشکر(ایکٹریس)	پاہیلی منگا لاگور(مراٹھی)
قرۃ العین حیدر(مکالمہ نگار)	ایک مسافر ایک حسینہ	لیکھ ٹنڈن(ڈائرکٹر)	پروفیسر۔مسنرا بیر(مراٹھی)
گیتا دت(گلوکارہ)	بھگت پرہلاد	لتا منگیشکر(بطور اداکارہ)	دادی ماں
گیتا	گرم ہوا	لوتن بائی	یہودی کی لڑکی
گیتا بالی(چائلڈ)	دی کوبلر	لقمان احمد(ہدایتکار)	ہمجولی
گوپ	دنیا ایک تماشہ	للیتا پوار	ہمت مرداں(بولتی فلم)
گرودت(چائلڈ)	لاکھ رانی	للیتا کماری(ویلن)	حسن کا چور
گریسی سنگھ	لگان۔امانت	لیلا نائیڈو	انورادھا
گلشن کمار(فلمساز)	لال دوپٹہ ململ کا	لیلا چٹنس	دھواں دھار
گوتم گھوش	ماں بھومی	لکشمی	جولی
گیتا بسرا	دل دیا ہے	لتا منگیشکر قصور(ہندی)	مجبور۔آپکی سیوا میں۔
گلشن گروور	راکی	لکشمی کانت پیارے لال	پارس منی
گیتا بالی(ہیروئن)	سہاگ رات/رنگین راتیں	لیلا مصرا	گنگا وترن
گوندہ	لو ۸۶ء	لیلا ڈیسائی	مکتی
گرودت(ہدایت کار)	بازی	للیتا پوار	کیلاش۔گیمنی کو(چائلڈ)
گوپی کرشن(ڈانسر)	ساقی	للیتا پوار	چتر سندری۔پتت پاون
گلزار(شاعر)	بندنی	(ہیروئن۔خاموش فلم)	
گلشن کمار(ہدایت کار)	صنم بے وفا	لارا دتا	انداز
گلشن باورا	پکار	لتا سونگی(لڑکا)	راجہ ہریش چندر
لتا منگیشکر	منگلا گور(ہیروئن)	لوسنہا	صدیاں

فلمستار	پہلی فلم	فلمستار	پہلی فلم
ماہی گل	دیو۔ڈی	مس سلوچنا	ویر مالا(خاموش)
محبوب خاں(ڈائرکٹر)	الہلال ۔ خدا کا	منجو	باورے نین
	انصاف (ڈائرکٹر)	محمود(کامیڈین)	ہم سب چور ہیں/سی آئی ڈی
محمد رفیع (گلوکار)	گل بلوچ (پنجابی)+	موہن سہگل	اولاد
	گاؤں کی گوری(ہندی)	مدھو بالا(بطور ہیروئن)	نیل کمل
میکی	ضد/کنوارا باپ	مینا کماری(بطور چائلڈ	فرزندِ وطن
مدن سدہن	سارا آکاش	مینا	سورج اور چندا
میناکشی	برہم چاری	مالا سنہا	بادشاہ۔روشن آرا
مکیش کھنہ	خونی	مالا سنہا	لوہ کپاٹ(بنگلہ
متھو بابا	اگنی ریکھا	مالا سنہا	وشنو دیوی (چائلڈ
مہندر سندھو	خون خون	مٹھو کھرجی	خان دوست
مظہر خاں(نیا اداکار)	شان	ماسٹر نثار	عید کا دریا/شیریں فرہاد
مبارک بیگم(گلوکارہ)	(آیئے)	مونیش بہل	تیری بانہوں میں
	لتا کے ساتھ ڈویٹ	محبوب خاں(ڈائرکٹر)	علی بابا چالیس چور
مبارک بیگم(گلوکارہ)	پھولوں کا ہار		(چائلڈ آرٹسٹ)
محمود(جونیر)	گرم مسالہ	مادھوری ڈکشٹ	ابودھ/اتر دکن
مشیر ریاض	سفر	مینو ممتاز	شکاری
مدھو چندا	شبھ دن	منوج کمار	کانچ کی گڑیا
موتی لال	شہر کا جادو/شہر کی لڑکی	محمد رفیع (گلوکار	پہلے آپ (ہندی)
ماسٹر وٹھل(ہیرو)	عالم آرا (پہلی بولتی فلم)	ممتاز شانتی	سوہنی کمہارن۔ڈنگا
مس گوہر	بیرسٹر کی بیوی	مس سلوچنا	مادھوری(بولتی فلم)

فلمستار	پہلی فلم	فلمستار	پہلی فلم
مہتاب	ویر کنال	مکھرام شرما	سنت دیا نیشور
مکیش وگل	فتح	مینا کماری	ایک ہی بھول(بطور چائلڈ
مدھو بالا (چائلڈ)	بسنت۔ممتاز محل	منا ڈے(گلوکار)	تمنا۔رام راجیہ
من موہن ڈیسائی ہدایتکار)	چھلیا	مکیش(گلوکار)	پہلی نظر(بحیثیت گلوکار
مینا کماری	بچوں کا کھیل(ہیروئن)	مہیما چودھری	پردیس
متھن چکرورتی	پریم وواہ/مرگیہ	مینا شوری	سکندر
مالاسنہا	مٹی گھر(نیپالی)	ملکہ شراوت	خواہش
مدن پوری	دریا۔دیپ اور سونا	مندا کنی	رام تیری گنگا میلی
مرزا مشرف	قزاق کی بیٹی		(نئی ہیروئن)
من موہن	شہید/گمنام	ملن سنگھ	رات کے اندھیرے میں
منصور علی خاں(ڈائرکٹر)	جو جیتا وہی سکندر	میناکشی	پینٹر بابو
موسمی چٹر جی	کچے دھاگے	من من سین	اندر باہر
ممتا کلکرنی	میرا دل تیرے لئے۔	مدھو	پھول اور کانٹے
	ترنگا۔آگ	مالا بھیرانیم	ایک دوجے کے لئے
مجروح سلطان پوری مراد	شاہ جہاں/ایک نظر	مہیش بھوٹ(ڈائرکٹر)	منزلیں اور بھی ہیں
ممتا	عاشق دیوانہ	مدھو بالا	تلاش حق(جونیر آرٹسٹ)
مہیش کشور(موسیقار)	صنم بے وفا	میوری کانگو	پاپا کہتے ہیں
منوج کمار(بطور ڈائرکٹر)	جے ہند	مالا سنہا	اکاوشی(بطور ہیروئن)
مونیشا کوئرالا	سوداگر	مکیش(گلوکار۔ہیرو)	نردوش(ہیرو اور گلوکار)
ممونی	دھرتی پتر	مینا	سورج اور چندا
ماسٹر ستیہ جیت	میرے لال	ملکہ سارابھائی	ایک مٹھی چاول

فلمسٹار	پہلی فلم	فلمسٹار	پہلی فلم
مدھو مالینی	شبھ دن	مدن موہن (موسیقار)	آنکھیں
مدن موہن (موسیقار)	آنکھیں (پرانی) پردہ	مبارک	ویرکنال
ممتاز	گہراداغ۔ داراسنگھ	مشرا	دیوان
مولینا	کروڑپتی	مراد (ویلن)	نادان
منورما	خزانچی	من موہن کرشن (ویلن)	متوالا
منور سلطانہ	پہلی نظر	مزل ابراہم (ویلن)	دھوکہ
مولا	خزانچی	مس ایرینا میلاڈ	راجہ ہریش چندر
مندا کنی	کالیا مردن (پرانی ہیروئن)	(ڈانس ڈائرکٹر)	
مکل ابھینکر (ہدایتکار)	ڈرگس	محمد علی تاج بھوپالی (گیت کار)	جلتے دیپ
معصومی	چپکے سے	ملکہ شراوت	جینا صرف میرے
محمد رفیع (گلوکار)	گاؤں کی گوری		لئے (مہمان اداکارہ)
مارک زبیر	یہ نزدیکیاں	منوج کمار	اپکار (بطور ہدایتکار)
مشتاق خاں	نکسلائٹ	منصور علی	نرگس
مناعزیز (گلوکار)	پھانسی کے بعد	منیشا لاما	گنگسٹر۔ یہاں
میگھنا نائڈو	ہوس	میوہ چکرورتی	جنی
مونیکا کیٹیلنسو	رفتہ رفتہ (بطور ہیروئن)	مرنالی شرما	آوارہ پن
مدن جین	سارنس	مظہر خاں (پرانے اداکار)	نورجہاں
مادھوری	ایک دوجے کے لئے	مس گلاب	حاتم طائی اوّل
مس اختری	محبت کے آنسو	میناکشی ششادری	ہیرو
مہما چٹرجی	مائی باپ	مخدوم محی الدین (شاعر)	سپاہی
میگھنا گجرال	فی الحال	مدھو بھنڈارکر	فیشن

فلمسٹار	پہلی فلم	فلمسٹار	پہلی فلم
محمود جونیر	برہمچاری	نانا پاٹیکر	انکش/آج کی آواز/گمن
مونا لیزا	گجرارے	نور جہاں (بطور ہیروئن)	گل بکاؤلی/ خاندان
منی رتنم	ممبئی	نور جہاں (معاون اداکارہ)	شیلاعرف پنڈی کوڑی (پنجابی)
ملکہ شراوت	دی متھ (بطور ہیروئن)	ناڈیا	دلیش دیپک (ہیروئن)
میرا فائر (ہدایتکار)	سلام بامبے	نینا ساہو	ہماری دنیا (بطور چائلڈ
نمی	برسات۔ سزا	نصیر عبداللہ	دل آشنا ہے
نوتن	ہماری بیٹی	نینا ساہو	ہرے کانچ کی چوڑیاں (ہیروئن)
ناظمہ	لڑکی۔ نشان	نصرت بدر (گیت کار)	دیوداس
نذیر	مسٹریس بنٹت	نکل کپور	تم سے اچھا کون ہے
	(خاموش فلم)	نروپارائے	رانک دیوی (گجراتی)
نلنی جیونت	رادھیکا	نروپارائے	امرراج (ہندی)
نانو بھائی وکیل (کہانی کار)	مہابھارت	ناصر خاں	مزدور
نانو بھائی ڈیسائی	عید کا دریا	نسیم بانو	ہملیٹ/خون کا خون
نینا	ایک رات	نمیتا چندرا	پہلی
نرگس	تلاش حق (بحیثیت چائلڈ	نغمہ	باغی۔ قربان
نرگس (ہیروئن)	تقدیر (بطور ہیروئن) تمنا	ناصر خاں	مزدور
نندہ	چھوٹی بہن/طوفان اور دیا	نڈیاڈوالا (ڈائرکٹر)	انسپکٹر
نول کمار	سات سوال	نشی	ریلوے پلیٹ فارم۔
نازنین	سارے گاما/میڈم فیشن		پاگل خانہ
نادرہ (ہیروئن)	آن	نور جہاں (چائلڈ)	تاج محل
نورجہاں	پنجاب دی کڑی (پنجابی)	نمرتا شروڈکر	جب پیار کسی سے ہوتا ہے

فلمستار	پہلی فلم	فلمستار	پہلی فلم
نازیہ حسن (گلوکارہ)	قربانی	نکھل دویدی	مائی نیم از.....
نیتا مہتہ	پونگا پنڈت	نیتو سنگھ	رکشا والا (بطور ہیروئن)
نرگس فاقری	راک اسٹار	نوین نشچل	ساون بھادو
نینا ساہو	ہرے کانچ کی چوڑیاں	ناڈیا	ہنٹر والی
نیہا	قریب	نوتن	نل دمیتی (جونیئر آرٹسٹ)
ندیم شرون (موسیقار)	ڈُنگل (بھوجپوری)	نوشاد علی (موسیقار)	پریم نگر
نورجہاں (بطور گلوکارہ)	دو پٹہ	نجم الحسن	جوانی کی ہوا
نینا پوری	کھلی کھڑکی	نوشین علی سردار	ایک دن لوٹ کے آئے گا
نیہا کپور	دوش	نیل نتن مکیش	جانی غدار
نارنگ (ڈائرکٹر)	۵/دشمن	نسرین	ایک روز
نیتوسنگھ	ہوش (چائلڈ)	وجے چودھری	دوپھول۔راجہ
نیہا دھوپیا	قیامت	ورجنیا	لواسٹوری
نگار سلطانہ (ویمپ)	رنگ بھومی	ویدنا	لاٹ صاحب
ناصر حسین (ڈائرکٹر)	تم سا نہیں دیکھا	وحیدہ رحمان	سی آئی ڈی
نریندر چنچل (گلوکار)	بوبی	وکرم راز داں	مینا بازار
نواب کاشمیری	سنگرام	ومّی	ہمراز
نیلم	جوانی	وجیتہ پنڈت	لو اسٹوری
نکھل دویری	راون	وی شانتا	نیتا جی پالیکر/
ندیم شرون	عاشقی (ہندی)	رام (ہدایتکار)	ساؤکاری پاس
نیتو چندرا	گرم مسالہ	وجنتی مالا	بہار۔جبری لائف
نشا کوٹھاری (ویلن)	جیمس۔ڈارلنگ۔آگ	وکرم	یادرکھے گی دنیا

فلمستار	پہلی فلم	فلمستار	پہلی فلم
دویک مشران	سوداگر	وڈیا سنہا	راجہ کاکا
وی شانتارام (ہیرو)	ساؤکاری پاش	وینکٹس	اناڑی (ہندی)
وجے شری	کندن	ونود کمار (ڈائرکٹر)	میرے محبوب
وینا	یاد (ہندی)	ونود کھنہ (فلمساز)	ہمالیہ پتر
	گوانڈی (مراٹھی)	وکرم (پرانا ہیرو)	تلوار کی دھار
ونود مہرہ (ویلن)	تپت پاون + ایک	دویک اوبیرائے	کمپنی
	تھی ریتا + اعلان	وانی جے رام (موسیقار)	گڈی
وی شانتا رام (ڈائرکٹر)	دنیانہ ملانے (لِیق فلم) سریکھا	وجنیتی نرملا (ہدایتکار)	کویتا
	ہرن (بطور جونیئر آرٹسٹ)	ونے پاٹھک (بطور فلمساز)	وسوادانیا
وحیدہ رحمان	روجلومرائی (تیلگو)	ہیلن	جوانی کی ہوا
وجے اروڑہ	ضرورت	ہما	آپس کی بات
وی ایم ویاس	نیچا نگر	ہمنسورائے	لائف آف ایشیا
ونود کھنہ	من کا میت		(خاموش فلم)/کرما
ون مالا	چرنوں کی داسی	ہمنت برجے	ٹارزن
وجے کمار	وانٹیڈ	ہیلن (ڈانسر)	بدنام۔چورہا بازار
وکرم سلوجہ	فضا	ہوشنگ گوول	تم پرہم قربان
ودیا بالن	پرینیتا	ہیرا لال (ویلن)	صفدر جنگ/ بانڈزنگ
ورشل سفاری (چائلڈ آرٹسٹ)	تارے زمین پر		ڈانسر/ پوتر گنگا
وزیر محمد خاں (گلوکار)	عالم آرا	ہریش	پریم قیدی
ونے پاٹھک	فائر	ہیرا راج گوپال	ادھیام
وی گوپال	روپ سندری	ہمیا مالنی	سپنوں کا سوداگر۔ابودھ

فلمسٹار	پہلی فلم
ہمانی شیو پوری	آنکھیں
ہمانسو ملک	تم بن
ہومی واڈیا (ہدایتکار)	دلیر ڈاکو (خاموش فلم)
ہرشیتا بھٹ	اشوکا
ہیریندرناتھ چٹو پادھیائے (مصنف)	بھوت بنگلہ
ہنیکا موٹوانی	آپ کا سرور
ہمنت کمار (گلوکار)	پجاری
ہما مالنی (ہدایت کار)	دل آشنا ہے
ہمن گپتا (ڈائرکٹر)	دُوند
ہمیش ریشمیا (اداکار)	آپ کا سُرور
ہری شیوداسانی	برسات (نئی)
ہومی واڈیا	ویر بھارت (بولتی فلم)
ہمنت کمار (موسیقار)	آنند مٹھ
ہمیش ریشمیا (گلوکار)	پیار کیا تو ڈرنا کیا
یوگیتا بالی	پردے کے پیچھے
یکتا مکھی	پیاسا
یعقوب	رومانٹک پرنس
یمینی شرما	میرا دل
یس چوپڑہ (ڈائرکٹر)	دھول کا پھول
یس جوہر	دوستانہ
یونس پرویز	پنجڑے کے پنچھی
یعقوب	رومانٹک پرنس

فلمی ستاروں کی جوڑیاں

آر کے نیّر (ڈائرکٹر)	سادھنا	ابھی بھٹا چاریہ	پرنوتی چودھری
اے آر کاردار (ڈائرکٹر)	بہار اختر	اجے سہانی	ارونا کوہلی
افتخار	حنا	اجے بسواس (ہدایتکار)	راکھی بسواس
انورادھا	ارون پوڈوال	اوم پوری	نندیتا چودھری۔سیما کپور
پڈوال (گلوکارہ)		آئی ایس جوہر	بینا سندھو (مس شملہ)
امرتا سنگھ	سیف علی خاں	اُرملا (بنسی تلوار کی بیٹی)	ستیش
انو پم کھیر	کرن کھیر	اپیتا ناگیا (ہیروئن)	سنجے بنسل
نرملا دیوی	ارون	امرجیت (ہدایتکار)	ریحانہ
انوپ جلوٹہ (گلوکار)	بینا بھاٹیہ	ایس نذیر	سورن لتا
انل بسواس (موسیقار)	مینا کپور (گلوکارہ/آشا لتا)	اوشا کرن	ڈاکٹر منوہر کھیر
انل دھون	ریشمی	انل شرما (ڈائرکٹر)	سُمن
اسرانی (کامیڈین)	منجو	امتیاز	کریتکا
انجو مہندرا	امتیاز	این کبیر (فلمساز)	صبیحہ (مراد کی بیٹی)
امجد خاں	شہلا خاں	آغا جلال	ویلری
امول پالیکر	چترا	ایس ایم ساگر	سید محمد
انور (گلوکار)	ریحانہ بیگم	ارون	نرملا
امان اللہ امان (مکالمہ نگار)	کماری وردھنی	ایس ایم یوسف	نگار
آشا بھونسلے (گلوکارہ)	آرڈی برمن (موسیقار) کلپنا	اتپل دت	گیتا سین۔شوبھا سین
آر۔سی۔بورال	رائے چند بورال	اکبر خاں (ڈائرکٹر)	مریم خاں
امین سیانی (اناؤنسر)	رما کشمیری	ایشوریہ (پرانی)	تنویر احمد

انجنا	ساجد ممتاز	ایس۔ڈی۔برمن(موسیقار)	مہیرا برمن
اپوناش وردھان	چھایا پاریکھ	ارجن رام پال	مہر
آدیتیہ پنچولی	زرینہ وہاب	ارشد وارثی	ماریا گورینی
اوم شیو پوری	سدھا شیوپوری	اُتم کمار	سپریہ دیوی۔گوری گنگولی
اجے دیوگن	کاجل	ارباز خاں	ملائکہ اروڑہ
اکشے کمار	ٹوئنکل کھنہ	اشوک کمار	شوبھا بنرجی
ابھی بھٹا چاریہ	پرونیتی گھوش	اکبر خان(ڈائرکٹر)	مریم خان
ارون کمار آہوجہ	نرملا دیوی	برج(ڈائرکٹر)	کلپنا۔سعیدہ خاں
آسوتوش رانا	رینو کاشانے	باسو بھٹا چاریہ	انل بسواس
ایوب خاں	میاسا	بندو	چمیک لال جاویری
انیتا گوہا	مانک دت(ہدایتکار)	بابی دیول	ثانیہ دیول
انل کپور	سنیتا بھم بانی کپور	بیلا بوس(ڈانسر)	اسیش کمار
اندیا گوسوامی	جے پی دتّہ	بیگم اختر(گلوکارہ)	اشتیاق حسین عباسی
اودے شنکر(رقاص)	ارملا شنکر	بترہ مہندر(ڈائرکٹر)	روپا
اے آر۔رحمان(موسیقار)	سائرہ	بلراج ساہنی	مینیتی ساہنی اور
امیتابھ بچن	جیہ بہادری		سنتوش/ ڈاکٹر پدما
اودت نارائن(گلوکار)	رنجنا نارائن	بھوپندر	میتالی
آدیتیہ چوپڑہ	پائل چوپڑہ	بمل رائے(ڈائرکٹر)	ونودنی رائے
ابھیشک بچن	ایشوریہ رائے	بھاگیہ شری	ہمالیہ دسانی
اوپی نیّر(موسیقار)	سروج نیّر	پریم ناتھ	بینارائے
خورشید	الطاف	پونم	اشوک ٹھکریا
آغا حشر کاشمیری	مختار بیگم	پروین چودھری	موہن کمار اروڑہ

پریکشت ساہنی	اروما کوہلی	ٹینا منیم	انل امبانی
پدما کھنہ	کرشن سدانا	جانی واکر	نور
پوجا بیدی	فرحان ابراہیم	جونیر محمود	لتا
پریش راول	سروپ سمپت	جدن بائی	عبداللہ عرف موہن۔
پرکاش مہرہ	گیتا رانی		اتم چند موہن
پریم دھون(گیت کار)	اُوما بیری	جبیں	اشوک کاک
پری زاد	بومن ایرانی	جے کشن(موسیقار)	پلّاوی
پنکج کپور	نیلما عظیم۔سپریا پاٹھک	جیکی شروف	عائشہ شروف
پران(ویلن)	سلیکھا۔شکلا	جتندر	شوبھا سپّی
پریم ساگر	نیلم	جائے کھرجی	نیلم
پینٹل(کامیڈین)	گیتا	جیونت پاتھر(فوٹو گرافر)	شیلا
پرتھوی راجکپور	رام سرانی کپور/رما دیوی	جمنی گنیش	پشپاوتی۔ساوتری
پدمنی کولہا پوری	پردیپ سرما	جانثار اختر(شاعر)	صفیہ اختر
پردیپ کمار	چھبی(بنگلہ)	جے شری ٹی(ڈانسر)	کرناٹکی
پوجا بھٹ	منیش یکھیا	جی ایم درّانی	مس جیوتی
پردیپ(شاعر)	کنگن	جگجیت سنگھ	چترا سنگھ
تارا چند برجاتیہ	سدھا	جگدیپ(کامیڈین)	صغریٰ بیگم
تنوجہ	سوموکھرجی	جمنا	بروا
تنوکرن	بابا اعظمی	جوہی چاؤلہ	جوئے متا
ٹن ٹن	قاضی اختر عباس	جاوید اختر(نغمہ نگار)	نہی ایرانی۔شبانہ اعظمی
ٹوفی واکر	نزہت ناز	چندولال شاہ	مس گوہر
ٹی این راما راؤ	لکشمی شیو پاروتی	چاند عثمانی	مکل دت(ہدایتکار)

چندر باروت (ہدایتکار)	دیپا	درگا کھوٹے	جے مہتہ۔محمد رشید
چیتن آنند (ہدایتکار)	پریہ راجونش۔ارما آنند	راجکپور	کرشنا
حسرت جے پوری	بلقیس بیگم	ریوتی (ہیروئن)	سریش مینن
خورشید (ہیروئن)	لالہ یعقوب	راجونوشاد	صبا
	(کرکٹر یوسف بھائی)	راجیش بہل	نوتن
خوشہ جلیل	ریاز احمد	راجشری	گریگوری چیپ مین
خیام (موسیقار)	جگجیت کور	روپ کشوری (ہدایتکار)	مینا
دلیپ کمار	سائرہ بانو	راجندر ناتھ	گلوکرپلانی
داداصاحب پھالکے	کاکی۔ساوتری بائی پھالکے	رندھیر کپور	بیتا
دیویکا رانی	ہمنشورائے/ڈاکٹر	رخسار کمال	عزیز مرزا
	ریورچ (آرٹسٹ)	رشی کپور	نیتو سنگھ
داراسنگھ	سرجیت رندھاوا	ریکھا سہائے	سبودھ کانت سہائے
دپتی راول	پرکاش جھا (ہدایتکار)	رنجیت	پشپا۔نازنین
ڈیزی ایرانی	کے کے شکلا	رمیش سپی	کرن جونیجا
دلیپ راج	اَنو	رمیش دیو	سیما
دیوانند	کلپنا کارتک	روی (موسیقار)	چندرا
ڈبلو زیڈ احمد	نینا	روینہ ٹنڈن	انل تھدانی
دیپکا	ہمنت ٹوپی والا	راجیو پٹیل	ڈمپل
دیون ورما	روپا	رینا رائے	محسن خان
دھرمندر	پرکاش کور۔ہیما مالنی	رام گوپال ورما	رتن شری مال سوریہ وتی
دیپا ساہی	کیتن مہتہ (ہدایتکار)	رمیش دیو	سیما
دھیرج کمار	زوبی کے چھار	رام مکھرجی (فلمساز)	کرشنا

روی	سنہا	راجہ مہدی علی خاں	زیب النسا زیب
رشی کیش مکھرجی	رانی مکھرجی	زہرہ بیگم امبالا والی	استاد پیر محمد
راجکمار سنتوشی	منالی شیٹی	زیب رحمان	حسین بگروالا
راجکمار	گائتری دیوی	زاہدہ	کے این سہائے
راجکمار کوہلی (ہدایتکار)	نشی	زیبا بختیار	عدنان سمیع خاں
راجندر سنگھ بیدی	شری متی سونت کور	زینت امان	مظہر خاں
راج ببر	نادرہ۔سمیتا پاٹل	زیدخاں	ملائکہ
راکیش روشن	پنکی	زبیدہ	راجہ دھن راج گیرجی
راجہ مہدی علی خاں	طاہرہ سلطان/مخفی	زرینہ وہاب	آدیتہ پنچولی
(شاعر)	زیب النساء	زبیدہ	مہاراجہ دھن راج
رندھاوا	ملکہ	سنیل دت	نرگس
روپ مالا	سدھیر سین (موسیقار)	سہراب مودی	مہتاب
ریتو	راجن	سری دیوی	بونی کپور
روشنی	رتن چوپڑہ	ساجد نڈیا ڈوالا	دیویا بھارتی
زوپا	کمل رائے	سلمیٰ آغا	رحمت علی خاں۔محمود سپرا
رنجن	کملا لکشمی	سلیم اختر (پروڈیوسر)	شمع سلیم
ریکھا	مکیش اگروال	سمی اگروال	رویندرموہن
راکھی	گلزار۔بسواس	سلطان احمد (پروڈیوسر)	راحت
روی چوپڑہ	رینو	سچن	سپریا پلگاونکر
رنجیتا	راج مند	سنجے لیلا بھنسالی	خاموشی
راجندر کمار	شکلا	سیف علی خاں	امرتا سنگھ
رتھک روشن	سوجن خاں	سچترا سین	دیب ناتھ

سنیل سیٹھی	پروین شاہ۔ماناسیٹھی	سمرتی بسواس	ایس ڈی نارنگ
سردار ملک (موسیقار)	کوثر جہاں	سلوچنا	ڈاکٹر وینگارٹسن ۔
سنگیتا بجلانی	محمد اظہرالدین (کرکٹر)		آبا صاحب چوہان
سلطان احمد	فرح۔راحت	سونالی بندرے	گولڈن بہل
سونیدھی چوہان	بابی خاں	سیر پا پاٹھک	پنکج کپور
ستارہ	پرتاپ باروت	سہیل خاں	سیما۔زرینہ
سبی راج	بے بی ناز	سمیت سہگل	شاہین
سروجہ دیوی	جے کے شری پرشاد	سونیا جہاں	وویک نارائن
سنجے دت	رچا شرما۔مانیتا	سعیدہ	عظیم نور
سادھنابوس	مدھو بوس	ساریکا	کمل ہاسنی
سنیل شنی	سونا	سنی دیول	پوجا دیول۔تانیا
سونم	راجیو رائے	ستارہ دیوی	پرتاپ اروٹ ۔
سریش اوبرائے	تارو چٹرجی		نذیر۔کے آصف
سجیت کمار	کرن	سچن بھومک (کہانی کار)	بنشری
سعید جعفری	مدھوجنیفر	ساون کمارٹک	اوشا کھنہ (موسیقار)
سیٹھی (فائٹ کمپوزر)	ونو	سلوچنا چٹرجی	چٹرجی
سریکھا	داورکر	سونونگم (گلوکار)	مدھو ریما
سردار اختر	بہازاختر	سنجے کپور	مہیپ سندھو
سبھاش مکھرجی	چتورا	سلیل چودھری	تیمیا چودھری
سمّی	روی موہن	شمی کپور	گیتا بالی/ نیلا دیوی
سمیع چودھری	بلرام شری کرشن	شوکت حسین	ریحانہ
سلیم خاں (رائٹر)	سلمٰی	شیاما	فالی مستری

شاہ رخ خاں	گوری چھتر	صونم	راجیورائے
شیام بینگل	نیرا بنگل	صبیحہ مراد	این ایس کبیر
شیلا رمانی	کاؤس جی	طلعت عزیز (گلوکار)	بینا
شوبھا کھوٹے	ڈی ایم بلسور	طاہر حسین	زینت طاہر حسین
ششی کلا	اوم پرکاش سہگل	ظاہرہ (ہدایتکار)	علی مہدی
شتروگھن سنہا	پونم	عامر خاں	رینا خاں/کرن راؤ
شکتی کپور	شیوانگی کولہا پوری	عمران ہاشمی	پروین شاہانی
شاہین	سمیت سہگل	عائشہ ٹاکیہ	فرحان اعظمی
شمّی	سلطان احمد (ہدایتکار)	عصمت چغتائی	شاہد لطیف
شفیع انعامدار	بھگتی بھروے	عدنان سمیع	سلمٰی آغا۔صبا عدنان
شلپا شروؤکر	اپریش رنجیت	فیروز خاں	سندری سہانی
شیبا	آکاش دیپ	فریدہ جلال	تبریز
شکیلہ بانو بھوپالی	باقر علی خاں	فردین خاں	نتاشا
شکیل بدایوانی	سلمٰی	فرحاخان (ہدایتکارہ)	سریس کندے
شادعلی (ڈائرکٹر)	شازنین	فرح	وندیو
شان (گلوکار)	رادھیکا	فانی مجمدار	مونیکا ڈیسائی
شاہی آہوجہ	انوپما آہوجہ	فاطمہ بیگم	نواب آف سچن
شرمیلا ٹیگور	نواب آف سیٹو ڈی	کمال امروہوی (ڈائرکٹر)	مینا کماری
ششی کپور	جنفیر کینڈل	کشورکمار	یوگیتا بالی۔مدھوبالا
شوبھنا سمرتھ	کمارسین		لینا چندراورکر
شرما (پروڈیوسر)	پدمنی	کمار	دیویا بھارتی
شیکھر کپور	سچترا کرشنا مورتی	کلپنا	سچن بھومک

کرن	درشن	کنال	شینا
کشور ساہو	پلاّوی۔سنہا	کے ایل سہگل	آشارانی
	پربھاپردھان	کملابائی گوکھلے	رگھوناتھ گوکھلے
کیفی اعظمی(شاعر)	شوکت خانم	گلشن کررور	بینا
کرن ویرالے	فہد	گریش کرناڈ	ڈاکٹر سوسوتی گپتی
کشورکمار	مدھوبالا۔	گلشن باورا(شاعر)	رنجو پیپوالی
	روما گوہاٹھاکرتا	گووندہ	سنیتا
کے آصف(ڈائرکٹر)	ستارہ دیوی۔	گل حمید	پیشنس کوپر
	اختری خان۔نگار	گرودت	گیتا دت
کمی کاٹکر	شتانو	گوپی کرشن	ساوتری
کمل حسن	وانی گپتی۔ساریکا	لارنس ڈیسوزا	ریٹا
کامنی کوشل	ڈاکٹر سبھاش سُود	للت کپور(فلمساز)	شبنم کپور
کبیر بیدی	پروتیا بیدی/سوزین/نکّی	لکشمی	بھاسکر
کمارگرو	نمرتادت	لینا چندراورکر	یوراج سدھارتھ/کشور کمار
کے کے دھون	منی دھون	لکشمی کانت(موسیقار)	لیپجا
کمارشانو(گلوکار)	ریٹا	للیتا پوار	جی پی پوار
کرشمہ کپور	سنجے کپور	لیکھا سروپ	راجپولال
کانن دیوی	بنول اے ڈی سی ہری	لیلا نائیڈو	دوم سوریاس
	واس بھٹا چاریہ(سابق	لارادتہ	مہیش
	گورنر مغربی بنگال)	محمود(کامیڈین)	مادھوی۔طاہرہ بیگم
کیتن مہتا(فلمساز)	دیپا سا ہنی مہتا	مہیش بھل	ایکتا
کم کم	سجاد اکبر خاں	متھن چکرورتی	یوگیتا بالی

ماسٹر علی بخش(موسیقار)	اقبال بیگم	مجروح سلطان پوری	فردوس
ماسٹر نثار	نواب بیگم	بابو کھرجی	مہما چودھری
ماروتی(کامیڈین)	کنیز فاطمہ	مادھوی	بھپّی سونی(ہدایتکار)
مالاسنہا	سی پی لوہانی	مکیش(گلوکار)	سرل جی دیوی
میرا جوگلیکر(ہیروئن)	اجیت	مادھوری ڈکشٹ	ڈاکٹر شری رام نین
للیتا پوار	جی پی پوار	مینا کشی ششادری	ہریش میسوری
محبوب خاں(ڈائرکٹر)	سردار اختر	ماسٹر غلام حیدر(موسیقار)	امراؤ ضیا
مہیش بھٹ(ہدایتکار)	سونی رازدان	ماسٹر نثار	سعیدہ
موسمی چٹرجی	ریتیس مکھرجی۔جیتو مکھرجی	منوج باجپائی	ڈاکٹر گا گرمبوچے ٹھاکر
ممتاز شانتی	ولی	من موہن ڈیسائی	جیون
محمد رفیع(گلوکار)	بلقیس بیگم	موہن بابو	جدّن بائی
مظہر خاں	روبینہ	نوشادعلی(موسیقار)	عالیہ خاتون
منوج کمار	ششی	نمّی	علی رضا
موہن سہگل(ڈائرکٹر)	آشاماتھر	نگار خاں	اسٹائل خاں
موہن لال جی	پارو	نندیتا	سومیہ سین
ممتاز	میورمادھوانی	نگار سلطانہ	کے آصف۔یوسف
ماسٹر نذیر	ستارہ دیوی	نوین نشچل	نیلو۔گیتا انجلی
مینا شوری	ظہورراجا۔النصیر۔روپ	نسیم بانو	احسان احمد/خاں
	کشوری۔اسدنجاری	نادرہ	نخشب(گیت کار)
مناڈے(گلوکار)	سلوچنا	ناصر خاں	بیگم پارہ
ملکہ شراوت	زاہد خاں۔کرن سنگھ گیل	نرملا	اُرون
منور سلطانہ	شرف علی	ناگ ارجن	املا

نروپارائے	کمل رائے/سیو کا	ونود مہرہ	موسمی۔دیپا بروکا۔ہندیا گوسوامی
	بلسارا	ونود کھنہ	کویتا کھنہ۔گیتانجلی
نیلم	رنبیر	وڈیا سنہا	وینکٹ/رجنی گندھا
نفیسہ علی	میجر سودھی	وحیدہ پنڈت	سمیر مالکن (ڈائرکٹر)
نورجہاں	شوکت حسین رضوی/	وحیدہ رحمان	کمل جیت
	اعجاز درّانی	وی شانتا رام	سندھیا۔جے شری
نشی	راجکمار کوہلی	وندو	فرح
ناظمہ	عرش الرحمٰن	ہمالیہ	بھاگیہ شری
نلنی جیونت	ویریندر ڈیسائی	ہنی ایرانی۔شبانہ اعظمی	جاوید اختر (مکالمہ نگار)
ناڈیا	ہومی واڈیا	ہیلن (ڈانسر)	پی این اروڑہ۔سلیم خاں
ندافاضلی (شاعر)	مالتی	ہردے ناتھ منگیشکر	بھارتی
ندیم شرون (موسیقار)	سلطانہ	(موسیقار)	
نصیرالدین شاہ	رتنا پاٹھک شاہ	لیس چوپڑہ	پامیلا چوپڑہ۔یمیلا سنگھ
وجے کمار	زاہدہ		
وشال	پریہ		
وکرم	ونیتا		
وجے آنند	لولین۔ششما		
وینا	الناصر		
ونودسپّی	انیتا		
وکرم رازداں	ونیتا گوئل		
وجنتی مالا	ڈاکٹر بالی		
وجے لکشمی	سوہن لال کنورہ		

فلمی ستاروں کے ڈبل رول

ارمان کوہلی	انام	آزاد	زمبو کا بیٹا
انوپم کھیر	پرمپرا۔جانے دو یارو	اے سالنکے	لنکا دہن
اسیت سین	دو دونی چار	بسواجیت	کہتے ہیں مجھ کو راجہ
اسین	وشا اوتار	بھارت بھوشن	چاندی کی دیوار
آغا	ایک راز	بے بی سونیا	دوکلیاں
انل کپور	کرشن کنہیا	بینا رائے	چنگیز خاں
آئی ایس جوہر	جانی میرا نام	پرتھوی راج کپور	تین بہورانیاں
امیتابھ بچن	بندھے ہاتھ	پورنیا	سناٹا
اوما	بیراگ	پران	جنگل میں منگل
اکھشے کھنہ	محبت	پیشنس کوپر	کشمیر کی سندری
اکھشے کمار	افلاطون+ٹائم مشین/جے کشن	پروین بابی	باڈی 303
اجے دیوگن	ہندوستان کی قسم	تنوجہ	ایک منزل دوراہی
ایل وجے لکشمی	شبنم	پریم ناتھ	دو بچے دس ہاتھ
اشوک کمار	قانون	پریا راجونش	ہندوستان کی قسم
این اے انصاری	وہاں کے لوگ	پریش راول	انداز اپنا اپنا
ارونا ایرانی	آگ	ٹینو آنند	افسر
آشا پاریکھ	ہتھکڑی اور راکھی	ٹن ٹن	دل دیا درد لیا
اسرانی	بدائی	فلمستار	ڈبل رول
فلمستار	ڈبل رول	ثریا	کاجل
امجد خاں	بمبئی کا راجہ۔دھرم کانٹا	جوئے مکھرجی	ہم سایہ

جتندر	جگری دوست	راجندر کمار	اکیلی مت جئیو
جاگیردار	اپرادھی کون	رندھاوا	اسپائی ان گوا
جونیر محمود	استاد پیڈرو	راجکمار	دل کا راجہ۔کرم یوگی
جیون	امر اکبر انتھونی	ریحانہ سلطان	پجارن
جانی لیور	جج مجرم	رشی کپور	راجہ۔قرض
جیکی شروف	دل ہی تو ہے	رشی کپور	زندہ دل۔بول رادھا بول
جانی واکر	چھومنتر۔پھول بنے انگارے	رتھک روشن	کہو نہ پیار ہے۔کرش
جگدیپ	رکھوالا	راجیش کھنہ	راز۔ارادھنا
جے شری ٹی	بدائی	راکھی	شرمیلی
جیہ پردا	سنجوگ	ریکھا	دھرما
چرنجیوی	میں ہوں رکھوالا	رندھیر کپور	دفعہ 302
چارلی چیلپن	ڈھنڈورا	رضامراد	ادا
دلیپ کمار	رام اور شیام۔	راج ببر	لکشمی۔آنکھیں
دیوانند	ہم دونوں	رنجن	نشان۔کھلاڑی
داراسنگھ	نصیحت	رنبیر کپور	میرا جہاں
دیون ورما	بے شرم	رائما سین	چرچ۔مرچ
ڈینی	بلندی	فلمستار	ڈبل رول
فلمستار	ڈبل رول	سی راج	سلام میم صاحب
دیوکمار	فریب	سنیل دت	بھائی بھائی
دھرمندر	عزت۔یقین	سنجے دت	جان کی بازی
ڈمپل کپاڈیہ	گناہوں کا فیصلہ	سچتراسین	
دیپیکا پدوکون	اوم شانتی اوم	سنجیو کمار	موسم۔نشان۔دوغنڈے

سمیتا پاٹل	تجربہ	شیاما	دو بہنیں
سجیت کمار	آنکھیں	شرمیلا ٹیگور	ان ایوننگ ان پیرس
سلیمان خاں	جڑواں	شکیلہ بانوبھوپالی	جانِ وفا
ساہومودک	آوارہ شہزاد	شیانا گوسوامی	چرچ۔مرچ
سری دیوی	گرودیو	فیروز خاں	ایک سپیرا ایک لٹیرا۔
سنیل سیٹھی	گوپی کشن		ناچے ناگن باجے بین
سادھنا	وہ کون تھی۔میراسایہ	کوکونا سین	چرچ+مرچ
سنہالتا	بجلی	کوئنا مترا	کرن
سادھنا سنگھ	تلسی	کشور کمار	بمبئی کا چور۔دو دونی چار
سیف علی خاں	ہمیشہ۔لو آج کل	کمل حسن	ہندوستانی۔
ساریکا	ہمراز(چائلڈ)		یہ تو کمال ہوگیا
ششی کپور	حسینہ مان جائیگی۔	کامنی کوشل	دوجھوٹ
	پاپ اور پن/ تیری منزل	فلمسٹار	ڈبل رول
شیخ	حاتم طائی	کمی کاٹکر	تحفہ محبت کا
فلمستار	ڈبل رول	کم کم	دوغنڈے
شیخ مختار	گرو اور چیلا	قادر خان	پیار اور محبت
شاہ رخ خاں	ڈپلی کیٹ۔پہیلی۔	گونده	آنکھیں
	اوم شانتی اوم	گوہر ماما جی والا	وش موہنی(ٹرپل رول)
شری دیوی	لمحے	للیتا پوار	کیلاش(ٹرپل رول)تم سے
شاہد کپور	کمینے		اچھا کون ہے۔ہمتِ مرداں
شمی کپور	چائنا ٹاؤن	متھن چکرورتی	ٹیکسی چور
شتروگھن سنہا	ملاپ۔شیطان	مدن پوری	وارنٹ

ممتاز	لڑکی پسند ہے
مس گوہر	وشوموہنی
منوج تیواری	منگل سوتر
مراد	الف لیلیٰ
مالا سنہا	مریادہ
مہیش کمار	راجہ اور رنگ
مہیما چودھری	داغ
ملنی جیونت	ہم سب چور ہیں
فلمستار	ڈبل رول
نرگس	انہونی
نوتن	دل نے پھر یاد کیا
نوین نشچل	ساون بھادو
نارنگ	۵ر دشمن
نشی	ڈاک اسٹریٹ
ندا	میرا قصور کیا ہے
وجنتی مالا	مدہومتی
وجے آنند	ڈبل کراس
ونود مہرہ	بن پھیرے ہم تیرے
وحیدہ رحمٰن	من مندر
	(وقت مل گیا۔تلگو)
وشال	چلتے چلتے
ہیما مالینی	گیتا اور سیتا

کتابیات

سلولائڈ کی دنیا		مصنف پریم پال اشک	1986
وہ بھی ایک زمانہ تھا		مصنف انیس امروہوی	2007
ہماری فلمیں ہمارا سماج		مصنف پریم پال اشک	1980
فلم شناسی		مصنف پریم پال اشک	1990
پھالکے کے وارث		مصنف پریم پال اشک	1991

ماہنامہ شمع دہلی	مدیران یونس دہلوی، یوسف	1988
فلم اور ٹی وی نمبر	دہلوی، الیاس دہلوی	

ماہنامہ بزم سہارا۔نوئیڈا	(چند شمارے)	مینجنگ ایڈیٹر	جے برت رائے
عالمی سہارا۔نئی دہلی	(چند شمارے)	مینجنگ ایڈیٹر	جے برت رائے
ماہنامہ شاندار۔اعظم گڈھ	(چند شمارے)	مدیر	نیاز جے راجپوری
ہفتہ وار اجالا۔کلکتہ	(چند شمارے)	مدیر	احمد سعید ملیح آبادی
روزنامہ اخبارِ مشرق۔کلکتہ	(چند شمارے)	مدیر	محمد وسیم الحق
امنگ۔نوئیڈا	(چند شمارے)		
صدائے اردو۔بھوپال	(چند شمارے)	مدیر	نعیم کوثر
راشٹریہ سہارا۔دہلی	(چند شمارے)		